علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

۸

- بیع سمک (پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت)
- بیع وفاء، موجودہ معاشی تناظر میں
- بیع تقسیط (قسطوں کی بنیاد پر خرید وفروخت)

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تأثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 8

پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت
بیع وفاء، موجودہ معاشی تناظر میں
قسطوں کی بنیاد پر خرید وفروخت

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات و کمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے ۔جزاک اللہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

﴿.......ملنے کے پتے.........﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی

بیت القرآن اردو بازار کراچی

بیت القلم اردو بازار کراچی

مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔انار کلی لاہور و اردو بازار کراچی

مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد

دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور

مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY,14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

قسطوں کی بنیاد پرخرید وفروخت کے شرعی احکام

ملتمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کررہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پاسکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہوکر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کردیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کرسکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کردیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کردیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہوجائے بہرحال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کرکے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کرلیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱...... اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲...... پورے علمی ذخیرے کو ازسرِ نو بڑے سائز میں کمپوز وسیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳...... پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ر نمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴...... ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵...... بحمد للہ! اب ''سلسلۂ جدید فقہی مباحث'' کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶...... اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنادیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی پاکستان

''مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کرسکے۔......فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبہ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدر آباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

''اذا جاء نا امر ليس فيه أمرو لا نهي فما ذا تأمرنا فيه''

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه برای خاص''

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگادی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کردے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہوسکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

"کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا"

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہوجاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگادی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آوازہ بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کرسکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کرسکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم ﷺ نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کرسکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کرسکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کردے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ کو ساتھ بھیجا تاکہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہوگیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کرلیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو ئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کرلیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعتِ نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہوسکتا ہے۔اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور وشغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آ گئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباعِ ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کر لیا...... اتباعِ ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباعِ ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تا کہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہوسکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں جانتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا...... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاهب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہویٰ کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعتاً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہویٰ، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیراور تکراراً اعرض کردی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مد ظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یاکلهن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتادیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروه فی سنبله..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتادیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی...... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کئے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمدللہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور و توجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

بیع تقسیط

قسطوں کی بنیاد پر خرید و فروخت سے متعلق شرعی احکام و مسائل

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

دیباچہ طبع جدید

خرید وفروخت کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں، خریدار قیمت اور بیچنے والا اپنا سامان نقد ادا کردے، یہ صورت نہ صرف جائز ہے بلکہ اگر اثمان یعنی سونا، چاندی یا کرنسی کی خرید وفروخت ہو تو واجب ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرف سے ادائیگی کو ادھار رکھا جائے، یعنی دین کی بیع دین سے ہو، یہ ناجائز ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ قیمت نقد ادا کردی جائے اور خرید کیا جانے والا سامان ادھار ہو، اسے ''سلم'' کہتے ہیں، یہ بھی کچھ شرطوں کے ساتھ جائز ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ سامان نقد دیا جائے اور قیمت ادھار ہو، اس کو اصطلاح میں ''بیع مؤجل'' کہتے ہیں اور اس کی بھی اجازت ہے، نیز ان چاروں صورتوں کے مذکورہ احکام صریح حدیثوں سے ثابت ہیں، قیمت بعد میں ادا کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ پوری قیمت یک مشت مقرر مدت پر ادا کی جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ یک مشت قیمت ادا کرنے کے بجائے معاہدہ کے مطابق مختلف قسطوں میں ادا کی جائے، فقہاء نے اس کے درست ہونے کی بھی صراحت کی ہے۔

آج کل اسلامی مالیاتی ادارے سرمایہ کے خواہش مند لوگوں کو نقد سرمایہ دینے کے بجائے کوشش کرتے ہیں کہ انہیں مطلوبہ اشیاء فراہم کردیں، جیسے مشین، گاڑی وغیرہ، ادارے ان کو کارخانوں سے خرید کرتے ہیں اور سرمایہ کے خواہش مند گاہکوں کو نفع کے ساتھ ادھار فروخت کردیتے ہیں، کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے وہ پیسے دے کر زیادہ پیسے نہیں لے سکتے اس لئے کہ یہ کھلا ہوا سود ہے، البتہ کوئی شے نفع کے ساتھ ان کو فروخت کی جاسکتی ہے جس کو اصطلاح میں ''مرابحہ'' کہا جاتا ہے، نیز حسب ضرورت قیمت کی ادائیگی میں انہیں سہولت بھی دی جاتی ہے کہ یک مشت قیمت ادا کرنے کے بجائے قسطوں میں ادا کریں، اس لئے قسطوار ادھار قیمت پر خرید وفروخت جس کو اصطلاح میں ''بیع مرابحہ موجل بالتقسیط'' کہا جاسکتا ہے۔ خصوصی اہمیت حاصل کرلی ہے اور اس میں قبضہ کا تحقق اور بعض دیگر مسائل شرعی نقطہ نظر سے قابل توجہ ہیں۔

اکیڈمی نے ممبئی میں منعقد ہونے والے دسویں فقہی سمینار بتاریخ ۲۴ تا ۲۷ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کے لئے اس عنوان کا انتخاب کیا تھا، بحمد اللہ موضوع سے متعلق بڑی اہم اور گراں قدر تحریریں مرتب کرکے اہل علم نے اکیڈمی کا تعاون کیا، ان مقالات کا مجموعہ بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی زندگی میں ہی ان کے پیش لفظ سے مزین ہوکر شائع ہوچکا ہے، اب مجلس ادارت کی نگرانی میں محب عزیز جناب مفتی احمد نادر القاسمی صاحب رفیق شعبہ علمی اکیڈمی نے اسے مزید تصحیح کے ساتھ نئے طریقہ پر مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، اس مجموعہ کو پہلے بھی اہل علم نے پسند کیا تھا اور امید ہے کہ اب بھی اسے شوق کے ہاتھوں لیا جائے گا۔

یہ مجموعہ چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب تمہیدی ہے، اس میں مجلہ کی عام ترتیب کے مطابق ''عرض مسئلہ'' نہیں ہے، کیونکہ اس سمینار میں مقالات کی تلخیص پیش کرنے پر ہی اکتفاء کیا گیا تھا، دوسرے باب میں موضوع سے متعلق تفصیلی مقالات ہیں اور تیسرے باب میں مختصر تحریریں ہیں، چوتھا اور آخری باب سمینار کے مناقشات پر مشتمل ہے، موجودہ حالات میں جب کہ ہندوستان میں اسلامک بینکنگ کی قانونی گنجائش فراہم ہونے کے روشن امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ ایک رہنما لٹریچر ثابت ہوگا اور سودی نظام پر مبنی بینک کے حلال متبادل کے لئے ہونے والی کوششوں میں معاون بنے گا۔ وباللہ التوفیق۔

خالد سیف اللہ رحمانی / جنرل سکریٹری

۲ر جون ۲۰۰۹ء / ۸ر جمادی الاخری ۱۴۳۰ھ

پیش لفظ

اللہ کا شکر ہے کہ ''مجمع الفقہ الاسلامی'' (الہند) نے گذشتہ بارہ سالوں میں متنوع قسم کے اقتصادی، تجارتی اور معاشی مسائل کے علاوہ عصر حاضر کے معاملات کی مختلف نئی شکلوں کو غور وفکر کا موضوع بنایا ہے، چنانچہ مچھلی کی پانی میں خرید وفروخت، اسلامی بینکاری، غیر سودی سوسائٹیاں، قبضہ سے پہلے خرید و فروخت، شیئرز و کمپنی، پگڑی، بیع حقوق وغیرہ سے متعلق مختلف عنوانات پر علماء نے فقہ اسلامی کی روشنی میں سینکڑوں صفحات پر مشتمل سیر حاصل وقیع مقالات پیش کئے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی قسطوں پر خرید وفروخت کا موضوع بھی ہے جسے اکیڈمی نے اپنے ایک تفصیلی سوالنامہ کے ذریعہ علماء کے روبرو پیش کر کے تصویر مسئلہ اور تنقیح وعرض کے بعد سنجیدہ فقہی مناقشہ و مذاکرہ اور اجتماعی غور وفکر کر کے قسط کے ذریعہ کی جانے والی لین دین اور خرید وفروخت کا شریعت کے معیار اور میزان کی روشنی میں جائزہ لے کر حکم متعین کرنے کی کوشش کی، اس صورت حال کے تحت اکیڈمی نے ''قسط وار خرید وفروخت'' کے موضوع پر تفصیلی و حقیقی معلومات کی روشنی میں مسئلہ کے مختلف رخ کو سمجھنے کی کوشش کی۔

آج تجارتی دنیا اور بازار میں قسطوں پر لین دین کا عرف جاری ہے اور تمام اشیاء، مکان، مشین، زندگی میں کام آنے والی چیزیں، خدمات، سب قسطوں پر مہیا ہیں، اور فائنانس کرنے والی کمپنیاں اس راہ سے خود تجارت کر رہی ہیں، اور نفع وفائدے کے نام پر دولت اکٹھا کر رہی ہیں، اب انفرادی طور پر بھی ضمانت اور سند ضمانت کے ذریعہ قسطوں پر خرید وفروخت کا سلسلہ بہت آسانی سے ہر جگہ موجود و جاری ہے، مسلم سماج ملک بھر میں اس مسئلہ سے دو چار ہے، اس لیے قسطوں پر خرید وفروخت کی مختلف رائج شکلوں کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لے کر علماء نے پوری تفصیل اور حوالوں کے ساتھ فقہاء کی آراء سے استفادہ کرتے ہوئے یہ تصریحات پیش کیں کہ کون سی صورتیں جائز اور کون سی ناجائز ہیں؟

نیز اس کے جواز وعدم جواز کے دلائل و وجوہات کیا ہیں؟ ہزاروں صفحات کے مطالعہ کے نچوڑ پر مشتمل یہ قیمتی بحثیں کتابی شکل میں عام استفادہ کے لیے پیش کی جا رہی ہیں، امید ہے کہ اہل علم مقالات کے اس مجموعہ سے استفادہ کریں گے، یہ وضاحت ضروری ہے کہ سابقہ روایات کے مطابق علماء نے اس موضوع پر اکیڈمی کو بڑی تعداد میں مقالات ارسال کئے، جن کی کثرت اور طوالت کے مدنظر حسب ذیل انداز سے ان کو مختصر کرنے کی کوشش کی گئی:

الف: طویل اقتباسات کو حذف کر کے حوالے باقی رکھے گئے۔

ب: عربی عبارتوں کے ترجمے کئے گئے۔

ج: تکرار بیان سے بچنے کے لیے طویل جملوں سے ان کا خلاصہ لے لیا گیا۔

د: عبارت کی روح کو سمجھتے ہوئے وضاحت کے لیے ضمائر، اشارات کا اضافہ کر دیا گیا۔

ر: غیر متعلق مباحث کو حذف کر دیا گیا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو دین کی متوازن اور سیدھی راہ پر چلائے اور دین کی سمجھ عطا فرمائے۔

مجاہد الاسلام قاسمی

ذاکر باغ (نئی دہلی)

مارچ ۲۰۰۱ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اکیڈمی کا فیصلہ:

قسط پر خرید و فروخت

۱- خرید و فروخت کے معاملہ میں ادھار فروخت کی صورت میں بمقابلہ نقد قیمت کا اضافہ جائز و درست ہے، اور اس طرح کی خرید و فروخت بھی درست ہے، بشرطیکہ معاملہ کو مکمل کرتے وقت بات اس پر ختم کی جائے کہ یہ خرید و فروخت ادھار اتنی قیمت پر اور اتنی مدت کے لئے ہو رہی ہے۔[۱]

۲- ادھار قیمت یکمشت ادا کی جائے یا چند حصوں و قسطوں میں، دونوں صورتیں درست ہیں۔

۳- اس طرح کی خرید و فروخت کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ معاملہ کو مکمل کرتے وقت قیمت متعین ہو جائے، ابتداء؛ خواہ صرف ادھار قیمت ذکر کی جائے یا نقد و ادھار دونوں۔

۴- ادھار خرید و فروخت میں نقد معاملہ کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی ربا کے تحت نہیں آتی، جیسے نقد خرید و فروخت میں جو بھی قیمت ہو وہ مبیع، یعنی خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے، اسی طرح ادھار خرید و فروخت کے مقابلہ میں بھی طے شدہ قیمت خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے۔

۵- متعینہ مدت میں قیمت یا قسط کے ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کسی طرح کی زیادتی کا مطالبہ اور معاملہ سود کے تحت داخل ہے، خواہ معاملہ کرتے وقت اس طرح کی شرط لگائی گئی ہو، یا یہ کہ بعد میں اس طرح کا مطالبہ کیا جائے۔

۶- جس شخص نے بطور رہن کوئی سامان اپنے پاس رکھا ہو، اس کا رہن رکھے ہوئے سامان سے نفع اٹھانا سود ہے جو کسی حال میں جائز نہیں ہے۔

۷- رہن کا سامان اگر رہن رکھنے والے کے پاس ہلاک ہو جائے تو سامان کی قیمت اگر دَین کے برابر ہے، تو کسی کے ذمہ کوئی حق نہیں رہا، اگر سامان کی قیمت کم ہے، تو دَین کی باقی رقم دین والے (جس کے پاس رہن تھا اس) کے ذمہ واجب ہوگی، اگر سامان کی قیمت زیادہ ہے تو اگر رہن لینے والے کے عمل و لاپرواہی کو اس میں دخل ہے تو دَین سے زیادہ قیمت رہن لینے والے کے ذمہ واجب ہوگی۔

۸- دَین کو وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت میں قرض دار کو بار بار متوجہ کرنے کے بعد جب کہ اس کا ٹال مٹول ظاہر ہو، قرض خواہ کو اجازت ہے کہ سامان کو

---

[۱] تیسرے فقہی سمینار منعقدہ جون ۱۹۹۰ء میں مرابحہ کے ذیل میں فیصلہ نمبر ۴ر کے شق (ب) میں کہا گیا ہے کہ "یہ درست نہیں ہوگا کہ معاملہ کرتے وقت یہ کہا جائے کہ اگر نقد خریدا جائے تو یہ قیمت ہوگی اور ادھار خریدا جائے تو دوسری قیمت، یا ادھار کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے پر قیمت کی کمی اور زیادتی کا ذکر معاملہ کرتے وقت کیا جائے، بلکہ بینک خریدار کو مطلوبہ سامان کا نمونہ دکھا کر وضاحت کرے کہ اس کی قیمت اتنی مدت میں اتنی قسطوں میں ادا کرنی ہوگی، اور بینک کو اس کی لاگت پر اتنا منافع دینا ہوگا (اور یہی بینک سے خریداری کی قیمت ہوگی)"۔

معاملہ کی اصل معیاری اور احسن صورت وہی ہے جس کا ذکر بذیل تجویز مرابحہ کیا گیا ہے، یعنی ادھار اور نقد کی علاحدہ علاحدہ قیمتیں معاملہ کرتے وقت نہیں بتائی جائیں، ایسا کرنا درست نہیں، لیکن اگر اس کے باوجود یہ اصول معاملہ طے کرنے سے پہلے ہوئیں اور مجلس عقد میں ہی معاملہ کسی ایک صورت پر متعین طور پر کر لیا گیا تو یہ عقد صحیح ہو جائے گا۔

یہ واضح رہے کہ ادھار اور قسط وار بیع میں مثلاً تین مہینہ یا ایک سال کی مدت قیمت کی ادائیگی کے لئے مقرر کی گئی اور خریدار نے وقت مقررہ پر قسط ادا نہیں کی اور تین ماہ کے بجائے چھ ماہ یا ایک سال کے بجائے ڈیڑھ سال ادائیگی میں لگ گئے تو اس زائد مدت کی وجہ سے قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

واجبی قیمت پر بیچ کر اپنا حق وصول کر لے۔

۹- قسط وار خرید و فروخت کی صورت میں فروخت کردہ سامان کو اگر بائع اس وقت تک کے لئے روکتا ہے جب تک کہ اس کو تمام قسطیں وصول نہ ہو جائیں، تو یہ درست نہیں، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ فریقین طے کرلیں کہ خرید کردہ سامان بطور رہن فروخت کنندہ کے قبضہ میں اس وقت تک رہے گا جب تک اس کی جملہ اقساط ادا نہ ہو جائیں۔

۱۰- طے شدہ مدت تک بعض قسطوں کو ادا کر دینے کے بعد بقیہ قسطوں کے ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع (فروخت کنندہ) کو یہ حق نہیں ہے کہ فروخت کردہ شئ کو واپس لے لے اور ادا کردہ قسطوں کو واپس نہ کرے۔

۱۱- خرید کردہ سامان کو مشتری (خریدار) کے قبضہ میں دے کر رہن قرار دینا درست نہیں ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ خریدار سے بیچنے والا بطور رہن لے لے، اور اس کے بعد پھر مشتری کو عاریۃً دیدے۔

۱۲- کریڈٹ لیٹر کی اجرت کی بابت کمیٹی نے یہ طے کیا کہ اس سلسلہ میں مزید غور وخوض کیا جائے۔

۱۳- قرض کی دستاویز (رسیدات، پرچیاں وغیرہ) کا کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا کہ اب وہ قرض وصول کرے اور مالک ہو جائے، قرض دینے والا یا واجبات کا مستحق واجب رقم سے کم لے کر اس معاملہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے، اس طرح کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

۱۴- واجب الاداء رقم کی مقدار کم کر کے فوری وصول کر لینا جسے "ضع و تعجل" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اگر اصل معاملہ میں کوئی مدت اداء دین کی معین نہ ہو تو جائز ہے، کہ یہ ایک طرح کا تبرع ہے، اور اگر مدت متعین ہو تو اس طرح کا معاملہ جائز نہیں ہوگا کہ جس پر دین واجب ہے وہ مدت کا فائدہ اٹھا کر واجب الادا دین کو کم کرا رہا ہے۔

۱۵- دین کی ادائیگی کے لئے طے شدہ مدت سے قبل دین کی ادائیگی کا مطالبہ جبکہ قسطیں وقت پر ادا نہ کی جارہی ہوں، درست ہے، اس لئے کہ فریقین نے جو معاہدہ کیا، ایک فریق نے جب اس کی خلاف ورزی کی تو دوسرے پر بھی اس کی پابندی لازم نہیں رہ گئی۔

۱۶- جملہ اقساط کی ادائیگی سے قبل اگر مدیون (خریدار) کی موت ہو جائے تو بھی معاملہ علی حالہ باقی رہے گا، جیسا کہ دائن کی موت کی صورت میں باقی رہتا ہے، بشرطیکہ بائع (دائن) اس پر راضی ہو۔

☆☆☆

سوالنامہ:

قسطوں کی بنیاد پر خرید وفروخت

ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جس کی وجہ سے نت نئی مصنوعات سامنے آتی ہیں، معاملات کی صورتیں رائج ہوتی ہیں اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں، انہیں نئے مروج معاملات میں بیع بالتقسیط کی بنیاد پر خرید وفروخت کا معاملہ بھی ہے، ایک آدمی ایک چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اس کو خریدنا چاہتا ہے، مگر اس کی قیمت اس شخص کے قوت خرید سے زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ضرورت کی چیز خرید نہیں پاتا، عوام کی ضرورت کا احساس رکھنے والے ہوشیار تاجروں نے اس کے لئے یہ حل نکالا ہے کہ خریدار چند قسطوں (جو اس کی حیثیت وحالات کے مطابق ہوں) قیمت کو ادا کر کے اپنی ضرورت کی تکمیل کر لے، یہ معاملہ جس طرح مروج ہے، اس کی بابت متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں، جو پیش خدمت ہیں:

۱- کیا یہ درست ہے کہ جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کردی جائے؟

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری ہے یا اس کی بھی گنجائش ہے کہ ادھار قیمت کو قسطوں میں ادا کیا جائے، مثلاً خرید کردہ مال کی قیمت دس ہزار ہے، دس قسطوں میں (ہر ماہ کے آغاز میں ایک ہزار کی ایک قسط) اس کی ادائیگی طے پاتی ہے۔

۳- ایک شخص یہ کرتا ہے کہ سامان کو نقد وادھار دونوں طرح فروخت کرتا ہے اور وہ یوں معاملہ کرتا ہے کہ نقد قیمت مثلاً سو روپئے اور ادھار سو روپے ہے، معاملہ کی اس صورت کا کیا حکم ہے؟ کیا ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لئے یہ ضروری ہے کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے اور اسی پر معاملہ کیا جائے؟

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربوا کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں، یہ شبہ اس لئے ہوتا ہے کہ زائد قیمت وقت کے عوض محسوس ہوتی ہے۔

۵- ایک تاجر ادھار فروختگی اگر اس طرح کرتا ہے کہ ۶ ماہ میں چھ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت بارہ ہزار روپئے ہے (ہر قسط دو ہزار کی) اور ایک سال میں بارہ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت گیارہ ہزار دو سو روپئے ہے (ہر قسط ۱۱۰۰ رسو روپئے کی) خریدار کے سامنے دونوں صورتیں پیش کرنے کے بعد دونوں ایک صورت طے کر لیتے ہیں تو معاملے کی یہ شکل شرعاً درست ہے یا نہیں؟

۶- ایک چیز کی خرید وفروخت نقد معاملہ کے دس روپئے طے ہوئی اور ساتھ ہی یہ طے پایا کہ یہ دس روپئے ایک ماہ کے اندر ادا نہ کئے گئے تو مزید دو روپئے ادا کرنے ہوں گے، اور اس طرح ہر ماہ کی تاخیر پر دو روپئے کا اضافہ ادا کرنا ہوگا، تو اس کا کیا حکم ہے؟

۷- ادھار فروختگی میں ادھار قیمت طے کی گئی اور مدت بھی طے ہوگئی، خواہ قسطوں میں یا یکمشت، اور اس کے ساتھ یہ طے پایا کہ وقت مقرر پر یکمشت قیمت، یا جملہ قسطیں، یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کچھ رقم ادا کرنی ہوگی، خواہ اس کی مقدار طے کردی جائے یا فیصد کا حساب رکھا جائے، معاملہ کی یہ صورت شرعاً جائز ہے یا نہیں، اس مزید رقم کو 'جرمانہ' اور مالی تاوان قرار دیا جائے گا یا کچھ اور؟

۸- ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لئے بائع بسا اوقات خریدار سے کوئی مال رہن رکھواتا ہے، اس سلسلہ میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:

الف- کیا بائع اس مال مرہون (گروی رکھا ہوا مال) سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

ب- بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے مال مرہون ضائع ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

ج- خریدار کے وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں فروخت کنندہ مال مرہون کے ذریعہ اپنی واجب الاداء قیمت کس طرح وصول کرے گا؟

۹- کیا خرید کردہ سامان کو بائع اپنے پاس اس وقت تک کے لئے روک سکتا ہے جب تک مکمل قیمت یا اس کی چند اقساط جمع نہ کی جائیں، اس صورت میں بائع کا فروخت کردہ سامان کو روکنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی دو جہتیں ہو سکتی ہیں۔

الف- فروخت شدہ سامان کو رہن بنانے کی۔

ب- محض اپنا حق وصول کرنے کے لئے اس کو اپنے پاس روکنے کی یعنی (حبس المبیع لا ستیفاء الثمن) ان دونوں جہتوں کا حکم کیا ہوگا؟ ان میں کسی صورت و جہت کی اگر گنجائش ہے تو اس کے لئے کیا پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں؟

۱۰- قیمت کے لئے طے شدہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع سامان کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور پھر وہ سامان اسی کا ہو جاتا ہے، نیز جو اقساط ادا کی جاچکی ہیں وہ بھی واپس نہیں کی جاتیں، کیا یہ صورت شرعاً درست ہے؟ اگر درست ہے تو ادا کردہ اقساط کی رقم کو کیا حیثیت دی جائے گی؟ اس صورت میں فروخت کردہ سامان بائع کو مل رہا ہے، اور ساتھ ہی قیمت کا ایک حصہ بھی یعنی فروخت کردہ سامان مقررہ طے شدہ قیمت سے کم مل رہا ہے۔

۱۱- کیا ایسے خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس اور اس کے استعمال میں رکھ کر، رہن قرار دیا جاسکتا ہے؟ جس میں فروخت وتصرف کا حق بائع کو ہی ہو، جس کے حق کے لئے اس سامان کو رہن بنایا گیا ہے۔

۱۲- خریدار کی طرف سے گارنٹی وضمانت لینے کی صورت، کفالہ کے مسلّم ومعروف کے تحت آتی ہے، مگر آج کل اداروں اور اشخاص کی طرف سے اجرت ومعاوضہ کا لین دین رائج ہے، اس معاوضہ کا شرعاً کیا حکم ہوگا؟ کیا کسی جہت وتوجیہ سے اس کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ جبکہ "کریڈٹ لیٹر" اس عہد کی ایک عام ومروج چیز بن گیا ہے۔

۱۳- ایک تیسری صورت یہ بھی اختیار کی جاتی ہے کہ ایسے ادھار معاملہ کے مکمل کاغذات تیار کرائے جاتے ہیں، وقت مقررہ پر رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں یا وقت سے پہلے رقم کو حاصل کرنے کے لئے اس دستاویز کی خرید وفروخت بھی رائج ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ دستاویز کی خرید وفروخت میں اس کے اندر تحریر کردہ قیمت ومالیت سے کم پر معاملہ کیا جاتا ہے۔

۱۴- ادھار خرید وفروخت کے معاملہ میں یہ صورت بہت اہم ہے کہ بائع طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگتا ہے کہ اس کا ایک حصہ ہم تم کو معاف کردیں گے، اس کے لئے اصطلاحی تعبیر (ضع وتعجل) کی استعمال ہوتی ہے معلوم ہے کہ طے شدہ رقم کو مقررہ مدت سے آگے بڑھانے پر زیادتی کا مطالبہ ناجائز ہے، اس لئے کہ ربوا ہے، تو اس کی کو کیا حیثیت دی جائے گی۔

۱۵- اگر معاملہ ادھار کیا گیا، مگر قیمت کے لئے صرف یہ طے ہوا کہ بعد میں دے دیں گے اور اس کے لئے وقت طے نہیں کیا گیا، اور اس صورت میں مذکورہ بالا شکل اختیار کی جائے کہ رقم کو کم کر کے نقد وفوری لین دین ہو جائے تو کیا حکم ہوگا؟

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور فوری طور پر ماتقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کیا حکم رکھتا ہے؟

۱۷- بیع بالتقسیط کے مسائل میں ایک نہایت ہی اہم مسئلہ یہ ہے کہ مقررہ وقت سے پہلے اگر فریقین (دائن ومدیون) میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو کیا یہ معاملہ اب بھی اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا جو طے شدہ تھا یا اس معاملہ کی نوعیت میں فرق آجائے گا؟

۱۸- آج کل یہ بات بھی رواج میں آچکی ہے کہ ایسے دکاندار (جو کہ بالاقساط خرید وفروخت کا کاروبار کرتے ہیں) ہر قسط کی ادائیگی کے وقت پر یا ماہ بماہ اور چھ ماہ دو سال بھر اس مدت پر انعام دینے کا نظام بناتے ہیں، اس کے لئے وہ پہلے سے اعلان کرتے ہیں، اور قرعہ اندازی کے ذریعہ کسی ایک خریدار یا چند خریداروں کو انعام دیتے ہیں، بیع بالتقسیط کے ساتھ اس نظام کو جوڑنے اور اس سے مستفید ہونے کا کیا حکم ہے؟ یہ قمار وربوا میں داخل ہے یا نہیں؟

۱۹- اسی طرح یہ بھی رواج پا رہا ہے کہ تمام خریداروں سے ایک متعین مدت پر ایک سامان دینے کے لئے بالاقساط قیمت جمع کرالی جائے، اور ہر قسط کا ایک وقت مقرر ہو، جس کے ادا کرنے کے بعد قرعہ اندازی کی جائے، اور جس خریدار کا نام نکل آئے اس کو وہ سامان نقد دے دیا جائے اور پھر اس سے مزید کسی قسط کا مطالبہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کی ادا کردہ قسط کو کافی سمجھا جائے، خواہ وہ ایک ہو یا مزید اور بقیہ لوگ اپنی اقساط جمع کرتے رہیں، اور اس طرح ہر مرتبہ کی قرعہ اندازی سے ایک آدمی جس کا نام قرعہ اندازہ میں نکلا ہے مال حاصل کرکے معاملہ سے الگ اور باہر ہو جائے اس معاملہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟

تلخیص مقالات:

قسطوں پر خرید وفروخت کے شرعی احکام

مفتی احمد نادر القاسمی

۱- نقد خرید وفروخت کے مقابلہ ادھار فروختگی میں سامان کی قیمت زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

تمام مقالہ نگار حضرات اس بابت ہم خیال اور متفق ہیں کہ نقد کے مقابلہ ادھار فروخت میں قیمت کا اضافہ جائز ودرست ہے۔

مجوزین نے زیادہ تر محدثین اور فقہاء کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے جواز پر استدلال کیا ہے:

''عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة...وقال أبو عيسى: حديث أبي هريرة حسن صحيح، والعمل على هذا عند أهل العلم، قالوا: بيعتين في بيعة أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين، ولا يفارقه على إحدى البيعتين، فإذا فارقه على إحداهما فلا باس إذا كانت العقدة على واحدة منهما''
(جامع الترمذی مع الشرح لابن العربی المالکی ۵/۲۳۹-۲۴۰)

''وقالت الشافعية والحنفية و زيد بن علي والمؤيد بالله والجمهور: أنه يجوز لعموم الأدلة القاضية بجوازه، وهو الظاهر؛لأن ذلك المتمسك هو الرواية الأولى من حديث أبي هريرة (نيل الاوطار للشوكاني :۵/۱۵۲)۔

البتہ مولانا شمس پیرزادہ اور حکیم ظل الرحمن صاحبان اسے غیر درست قرار دیتے ہیں، ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ یہ سودی کاروبار کے محض حیلے ہیں اور اس کے پس پشت سودی ذہنیت ہی کارفرما ہے، اس لئے یہ صورت جائز نہیں ہے۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری ہے یا قسط وار ادا کرنے کی بھی گنجائش ہے؟

تمام مقالہ نگار حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ ادھار قیمت کا چند اقساط میں ادا کرنا جائز ومباح ہے، البتہ شمس پیرزادہ صاحب نے اسے بھی ناجائز کہا ہے، جواز کے لئے مجوزین نے درج ذیل عبارات سے استدلال کیا ہے:

''من باع سلعة بثمن على أن تعطيني كل يوم درهما وكل يومين درهمين'' (منحة الخالق على البحر ۵/۲۸۰، خانيه مع الهندية ۲/۲۶۹) ''و من كانت عليه دنانير منجمة أو دراهم، فأراد أن يقبضها جملة فذلك له'' (حوالہ سابق)

''وفي الملتقط: عليه ألف ثمن جعله الطالب نجوما إن أخل بنجم حل الباقي، فالأمر كما شرط'' (البحر الرائق:۲۸۰)

۳- قسط وار خرید وفروخت میں کیا یہ ضروری ہے کہ صرف ادھار ہی قیمت کا تذکرہ کیا جائے یا نقد وادھار دونوں کے بتانے کی گنجائش ہے؟

بیشتر حضرات کی رائے میں مشتری کو دونوں قیمتوں کے بتانے کا اختیار ہے، البتہ معاملہ کی صحت کے لئے کسی ایک قیمت کی تعیین پر معاملہ کا اختتام اور بائع ومشتری کا اتفاق ضروری ہے۔

''عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة. وفي رواية عن صفقتين في صفقة، وعن شرطين في بيع۔

والعمل على هذا عند أهل العلم قالوا: بيعتين في بيعة أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة و بنسيئة بعشرين ولا يفارقه على إحدى البعيتين، فإذا فارقه على إحدايما فلا بأس إذا كانت العقدة على واحدة منهما''

(الجامع الصحيح للترمذي مع الشرح لابن العربي ۵/۲۲۹-۲۴۰)۔

البتہ مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبد العظیم اصلاحی اور مفتی عبد الرحیم قاسمی (بھوپال) نے مذکورہ صورت کے عدم جواز کی رائے دی ہے اور درج ذیل فقہی جزئیہ سے استدلال کیا ہے:

''رجل باع على أنه بالنقد بكذا، و بالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى شهرين بكذا، لم يجز'' (فتاوی عالمگیری ۳/۱۳۶)۔

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلے سامان کی قیمت زیادہ کرنا ربوا کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟

اکثر مقالہ نگار حضرات نے ادھار فروخت میں قیمت کی زیادتی کو سامان کی اصل طے شدہ قیمت قرار دیا ہے اور ربا کی نفی کی ہے۔

''وقالت الشافعية والحنفية و زيد بن على والمؤيد بالله والجمهور: أنه يجوز لعموم الأدلة القاضية بجوازه وهو الظاهر؛ لأن ذلك المتمسك هو الرواية الأولى'' (نیل الاوطار للشوکانی ۵/۱۵۲)

''قال مالك: أيضا فيمن اشترى سلعة بأجل فباعها مراجحة : أنه لا يجوز حتى يعلم بالأجل'' (بدائع الصنائع ۵/۲۲۴)۔

البتہ مولانا شمس پیرزادہ صاحب نے اس زیادتی کو سود اور ربوا قرار دیا ہے۔

۵- ادھار فروختگی کی صورت اس طرح ہو کہ ۶ ماہ میں چھ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت گیارہ ہزار روپئے اور ایک سال مین بارہ قسطوں میں ادائیگی کی صورت میں بارہ ہزار ہو اور متعاقدین ایک صورت طے کرلیں تو معاملہ کی یہ شکل درست ہے یا نہیں؟

اکثر مقالہ نگاروں نے اس صورت کے جواز کو راجح سمجھا ہے اور درج ذیل عبارات سے استدلال کیا ہے:

''وكذا اذا قال: بعتك هذا العبد بألف درهم إلى سنة أو بألف و خمس مائة إلى سنتين، لأن الثمن مجهول، وقيل: هو الشرطان فى البيع۔ وقدروى أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن شرطين فى البيع، فإذا علم و رضى به جاز البيع؛ لأن المانع من الجواز هو الجهالة عند العقد، و قد زالت فى المجلس'' (بدائع الصنائع)

حکیم ظل الرحمن، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا شمس پیرزادہ اور مولانا عبدالعظیم اصلاحی نے زیادتی کو ربا قرار دیتے ہوئے ناجائز کہا ہے۔

۶- متعینہ مدت میں قیمت یا قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید رقم کا مطالبہ شرعاً کیسا ہے؟

مسئلہ بالا کی بابت جملہ مقالہ نگار ہم خیال اور متفق ہیں کہ متعینہ قسط پر کسی قسم کی زیادتی کا مطالبہ ناجائز اور سود میں داخل ہے، یہ اضافہ خواہ متعین رقم ہو یا شرح و فیصد کے حساب سے ہو۔

البتہ حکیم ظل الرحمن اور مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب نے مذکورہ صورت کو ادھار قیمت میں زیادتی کے ساتھ فروخت کا معاملہ قرار دیتے ہوئے مباح قرار دیا ہے۔

۷- ادھار فروختگی میں ادھار قیمت طے کی گئی اور مدت بھی طے ہوگئی، لیکن یہ شرط لگائی گئی کہ متعینہ مدت میں عدم ادائیگی کی صورت میں مزید رقم ادا کرنی ہوگی، معاملہ کی یہ صورت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس مزید رقم کو جرمانہ اور مالی تاوان قرار دیا جائے گا یا کچھ اور؟

اکثر حضرات اس پر متفق ہیں کہ یہ زیادتی ناجائز ہے اور یہ مزید رقم مالی تاوان نہیں، بلکہ سود اور ربا ہے۔

''عن فضالة بن عبيد صاحب النبى صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جرمنفعة فهو وجه من وجوه الربا'' (السنن الکبری للبیہقی ۵/۳۵۰)۔

''وكان ربا الجاهلية فى الديون أن يكون للرجل على الرجل الدين، فإذا حل قال له: أتقضى أم ترى ؟ فإن قضاه أخذه وإلا زاده فى الأجل'' (المدونہ الکبری ۵/۱۸)۔

جبکہ حکیم ظل الرحمن، محمد ابرار خاں ندوی اور سلطان احمد اصلاحی نے اس زیادتی کو مباح قرار دیا ہے۔

۸- مال مرہون سے مرتہن کا کسی قسم کا نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

اکثر مقالہ نگاروں نے اس بات پر اتفاق ظاہر کیا ہے کہ مال مرہون سے مرتہن کے لئے کسی قسم کا نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔

''عن النبى صلى الله عليه وسلم اذا قرض أحدكم قرضا فاهدى له أو حمله على الدابة، فلا يركبها ولا يقبله إلا أن يكون برى بينه و بينه قبل ذلك'' (سنن ابن ماجہ باب القرض ۱۷۷)

''وفى الاشباه: كل قرض جرنفعا حرام'' (الدر المختار مع الشامی ۴/۱۷۴)۔

''اجمع أهل العلم أن نفقة الرهن على الراهن لا على المرتهن، وأن ليس للمرتهن استعمال الرهن'' (شرح معانی الآثار ۲/۲۵۲)۔

''عن النبي صلى الله عليه وسلم الرهن من الراهن له غنمه و عليه غرمه و منافعه من غنمه'' (المغنی ۱۴۷/۲)۔
البتہ مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد جمال اکبر، مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحبان کے نزدیک مرتہن کو انتفاع کی اجازت دو شرطوں کے ساتھ ہو سکتی ہے:

۱:۔ یہ کہ عقد معاملہ کے وقت انتفاع کی شرط نہ لگائی ہو۔ ۲:۔ بعد میں راہن نے اس کی اجازت دے دی ہو۔

اور شیخ وہبہ زحیلی کا خیال ہے کہ اگر رہن عقد بیع سے متعلق ہے تو مالکیہ اور حنفیہ کے مسلک کے مطابق اجازت کے ساتھ انتفاع درست ہے، مگر وہ انتفاع ثمن کا جز شمار ہوگا، اور اگر رہن کا معاملہ قرض کی وجہ سے ہے تو با اجازت بھی انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ روح شریعت سے میل نہیں کھاتا۔

(ب): مال مرہون اگر بائع (مرتھن) کے قبضہ سے ہلاک ہوجائے تو وہ ضامن ہوگا یا نہیں؟

اس سلسلہ میں مقالہ نگار حضرات باہم متفق نظر آتے ہیں کہ بائع کے قبضہ میں سامان کا ہونا بجائے خود قبضہ ضمان ہے، لہذا اگر اس سامان کی ہلاکت میں بائع (مرتھن) کی تعدی کا دخل ہے اور اس کی عدم توجہی اور لاپرواہی سے مال مرہون ہلاک ہوا ہے تو وہ ضامن ہوگا۔

اور متعدد حضرات نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ ہلاکت میں دین اور سامان کی قیمت برابر ہو تو معاملہ مساوی ہوگا اور اگر رہن زائد اور سامان کی قیمت کم ہو تو بائع مشتری سے بقیہ وصول کرے گا اور اگر اس کے برعکس ہو تو زائد کا بائع امین ہوگا جسے مشتری کو لوٹانا ضروری ہوگا، فقہاء لکھتے ہیں:

''وإذا هلك الرهن في يد المرتهن أو يد العدل ينظر إلى قيمته يوم القبض وإلى الدين، فإن كانت قيمته مثل الدين سقط الدين بهلاكه، وإن كانت قيمته أكثر سقط الدين، وهو في الفضل أمين، وإن كانت قيمته أقل من الدين سقط من الدين قدر قيمة الرهن ويرجع المرتهن على الراهن بفضل الدين'' (الفتاوی الہندیہ ۴۴۷/۵، الکافی لابن قدامہ ۱۳۵/۳)۔

البتہ مولانا عبد الرشید قاسمی نے اپنے مقالہ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ اگر دین اور سامان کی قیمت برابر ہو تو معاملہ مساوی ہوجائے گا اور اگر سامان کی قیمت زائد ہو تو چونکہ وہ زائد کا امین ہے اس لئے اس کے بقدر ضمان بھی ساقط ہوجائے گا۔

وقت مقررہ پر خریدار کی جانب سے قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں فروخت کنندہ مال مرہون سے اپنی واجب رقم کس طرح وصول کرے؟

اس بابت مقالہ نگار حضرات کے دو نقاط نظر ہیں:

پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ مال مرہون کو فروخت کرکے بائع اپنی واجب رقم وصول کرے گا، یہ اکثر حضرات کی رائے ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ مال مرہون کو قاضی کے حوالہ کردے گا اور قاضی اسے فروخت کرکے رقم بائع کو دے گا، اس نقطہ نظر کے حاملین میں درج ذیل اشخاص ہیں:

مولانا عبد اللہ قاسمی، مولانا حبیب الرحمن قاسمی (امارت شرعیہ)۔

مولانا محمد جمال اکبر اور مولانا محمد اقبال قاسمی صاحب کی رائے میں مشتری کی اجازت سے بائع مال مرہون کو فروخت کرسکتا ہے اور مولانا خورشید احمد اعظمی کے نزدیک مشتری کو بیچنے پر مجبور کیا جائے گا۔

جبکہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عبد الجلیل قاسمی اور احمد نادر قاسمی صاحبان نے بائع کے ٹال مٹول کی صورت سے بچنے کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ معاملہ کرتے وقت ہی بائع اور مشتری کسی تیسرے شخص کو بتراضی طرفین اس بات کا وکیل بنادیں کہ اگر وقت پر رقم ادا نہ کی گئی یا بائع غائب ہوگیا تو وکیل سامان (مرہون) کو بیچ کر رقم ادا کرے گا۔

''فإن وكل الراهن المرتهن أو العدل أو غيرهما بيعه عند حلول الدين صح؛ لأن الراهن مالك فله أن يؤكل من شاء من الأهل ببيع ماله مطلقا و منجزا'' (البحر الرائق ۲۵۶/۸، ردالمحتار ۳۲۴/۴، قاضی خاں مع الہندیہ ۶۰۶/۳)۔

۹- کیا خرید کردہ سامان کو بائع اپنے پاس اس وقت تک روک سکتا ہے جب تک سامان کی مکمل قیمت یا چند اقساط جمع نہ ہوجائیں، اس صورت میں سامان کی دو جہتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) رہن بنانے کی (ب) ''حبس المبیع لاستیفاء الثمن'' کی

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے اس سوال کی پہلی شق (الف) کا ذکر کرتے ہوئے یہ وضاحت کی ہے کہ اس فروخت کردہ سامان کو مشتری کے بغیر قبضہ کئے ہوئے رہن قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، البتہ مشتری اس پر قابض ودخیل ہونے کے بعد (خواہ قبضہ حسی ہو یا حکمی) بائع کے پاس رکھ کر اسے رہن بنا سکتا ہے۔

(ب) تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں نے اس بات پر اتفاق رائے ظاہر کیا ہے کہ قیمت کی وصولی کے لئے فروخت شدہ سامان کا روکنا نقد خرید وفروخت میں جائز ہے، ادھار معاملہ کی صورت میں مبیع کا روکنا جائز نہیں ہے، لہذا "بیع بالتقسیط" بھی چونکہ ادھار خرید وفروخت کی فی زمانہ جدید شکل ہے اس لئے اس میں مبیع کا روکنا درست نہیں ہوگا۔

"قال أصحابنا: للبائع حق حبس البيع لا ستيفاء الثمن إذا كان حالا كذا في المحيط، وإن كان مؤجلا فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده" (الفتاوی الهندیه ۱۵/۳)

البتہ مولانا محمد ابراہیم فلاحی صاحب نے مطلقاً "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" کی اجازت کا رجحان ظاہر کیا ہے۔

۱۰- متعینہ مدت میں تمام اقساط کی عدم ادائیگی کی صورت میں اداشدہ قسط کی منسوخی کا کیا حکم ہوگا؟

تمام ہی مقالہ نگار حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قسطوں پر اشیاء کی خرید وفروخت میں طے شدہ مدت تک اقساط ادا نہ کرنے پر اداشدہ قسط مشتری کو واپس نہ کرنا اور اسے سوخت کرنا درست نہیں ہے اور مشتری کو رقم یا سامان واپس نہ کرنا دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے ہڑپ کرنا ہے اور غصب کرنا ہے۔

یأیها الذین آمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراض منکم" (سورۂ نساء:۲۹)۔

"عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيع العربان" (سنن ابی داؤد ۲۸۳/۳)

البتہ مولانا محمد نور صاحب قاسمی نے مذکورہ صورت کو بیع عربون پر قیاس کرتے ہوئے اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کا قول اختیار کیا ہے اور اسے جائز قرار دیا ہے۔

۱۱- ایسے فروخت کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس اور اسکے استعمال میں رکھ کر رہن قرار دیا جاسکتا ہے جس میں فروخت وتصرف کا حق صرف بائع ہی کو ہو؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نویس ہم خیال ومتفق ہیں کہ خرید کردہ شئی کو مشتری کے استعمال میں دے کر اسے رہن قرار دینا درست نہیں ہے، الا یہ کہ مشتری مبیع پر قبضہ کرے اور مبیع کو بائع کے سپرد کرے اور پھر بائع اسے مشتری کو عاریۃً دے دے تو یہ صورت درست ہوگی۔ مختلف حضرات نے درج ذیل فقہی جزئیات نقل کی ہیں:

"ولو تعاقدا على أن يكون الرهن في يد صاحبه لايجوز الرهن، وكذا إذا قبضه المرتهن أو العدل ثم تراضيا على أن يكون في يد الراهن جاز"۔

"وإذا اعار المرتن الرهن للراهن ليخدمه أو ليعمل له عملا فقبضه خرج من ضمان المرتهن لمنافاة بين يد العارية ويد المرتهن، فإن هلك في يد الراهن هلك بغير شئى لفوات القبض المضمون، وللمرتهن أن يسترجعه الى يده؛ لأن عقد الرهن باق" (هدایه ۵۳۰/۴)

البتہ مولانا محمد نور صاحب قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی اور مولانا عزیز الرحمن وغیرہم نے اسے سرے سے رہن نہ مانتے ہوئے ناجائز قرار دیا ہے۔

"ولا يصح أن يكون وكيله هو الراهن؛ لأن المقصود من القبض تأمين المرتهن، ولا يتم القبض مع بقاء الرهن في يد الراهن" (الفقه الاسلامی وادلته ۲۱۶/۵)

۱۲- کریڈٹ لیٹر اور ضمانت وغیرہ پر اجرت لینا رائج ہے اس معاوضہ کا شرعاً کیا حکم ہوگا؟ کیا کسی جہت وتوجیہ سے اس کی گنجائش نکل سکتی ہے؟

اس مسئلہ میں زیادہ تر مقالہ نویس حضرات نے یہ تحریر کیا ہے کہ کفالہ وگارنٹی پر معاوضہ لینا درست نہیں، البتہ موجودہ زمانہ کے تقاضہ اور جذبہ احسان کی قلت کے پیش نظر اجرت لینا مباح ہے۔

"جاز دفع الاجرة للضرورة أو الحاجة العامة لما يترتب على عدم الدفع من تعطيل المصالح... وأساس القول بالجواز فيه أن الفقهاء أجازوا دفع الأجر للحاجة لأداء القربات والطاعات من تعليم القرآن وممارسة الشعائر الدينية كما أنهم أجازوا دفع شئ من المال على سبيل الرشوة للوصول إلى الحق أو دفع الظلم" (الفقه الاسلامی وادلته ۱۶۱/۵)۔

جبکہ مولانا محمد عمر بن یوسف فلاحی، مفتی عبد الرحیم قاسمی (بھوپال) اور مولانا عزیز الرحمن صاحبان نے کریڈٹ اور ضمانت پر اجرت کو بہر صورت

ناجائز قرار دیا ہے۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت کا شرعی حکم کیا ہے؟

اس بابت اکثر مقالہ نگار حضرات نے اس بات پر اتفاق ظاہر کیا ہے کہ دستاویزات کی بیع، بیع الدین مع غیر من علیہ الدین کی قبیل سے ہے جو شرعا ناجائز ہے، البتہ اس صورت کے جواز کے لئے اکثر حضرات نے اس حیلہ کی تجویز پیش کی ہے کہ حامل دستاویز بینک کو مشتری سے رقم وصول کرنے کا وکیل بنادے اور از سرنو معاہدہ کرکے دستاویز پر درج شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض لے لے اور بینک کو اختیار دیدے کہ جب مشتری کے اس دستاویز کے عوض رقم وصول ہوجائے تو اس رقم سے اپنا قرض وصول کرلے تو یہ صورت جائز ہوسکتی ہے۔

البتہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا انیس الرحمن قاسمی، مولانا عامر حسین ندوی، مولانا محمد جمال اکبر، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابرار الحق قاسمی، مولانا عبد العظیم اصلاحی، مفتی محبوب علی وجیہی، حکیم ظل الرحمن، مولانا اختر حسین رضوی، مولانا اختر امام عادل، مولانا فضل الرحمن قاسمی، مولانا اختر ضیاء قاسمی، مولانا محمد عمر بن یوسف فلاحی، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا محمد نور القاسمی اور محمد ابرار خاں ندوی نے ذکر کردہ صورت میں دستاویز کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے۔

''والتعامل بالأسهم جائز شرعا أما التعامل بالسندات فحرام لاشتمالها على الفائدة الربوية''

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۴۷۷)

''ويشترط التماثل والتقابض قبل الافتراق إن اتحدا جنسا وإن اختلفا جودة وصياغة'' (الرد المحتار ۴/۲۶۱)

۱۴، ۱۵- بیع بالتقسیط میں مقررہ وقت سے پہلے سامان کی قیمت وصول کرنے کے لئے متعینہ رقم سے کچھ کمی کرکے فورا مابقی وصول کرنے کا کیا حکم ہے؟ جسے اصطلاحی تعبیر میں ''ضع وتعجل'' کہا جاتا ہے۔

اس بابت مقالہ نگار حضرات کی دو رائیں ہیں:

۱:- یہ کہ اگر کمی تبرعا بائع کی طرف سے ہو تو جائز ہے، یہ رائے اکثر حضرات کی ہے، اس کے حاملین نے عام طور پر حدیث ابن عباس سے استدلال کیا ہے۔

''عن ابن عباس ان النبي ﷺ لما أمر بإخراج بني نضير جاءه ناس منهم فقالوا: يا نبي الله! إنك أمرت بإخراجنا، ولنا على الناس ديون لم تحل فقال رسول الله ﷺ: ضعوا وتعجلوا'' (فقہ السنۃ ۳/۱۶۷)۔

۲:- یہ ہے کہ ''ضع وتعجل'' جائز نہیں ہے، اس رائے کے اپنانے والوں میں درج ذیل حضرات ہیں:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عبد اللہ قاسمی (سہارنپور) مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا عبد اللطیف مظاہری، مولانا سید عقیل احمد قاسمی، مولانا اختر حسین رضوی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا جمال اکبر، مولانا محمد عمر فلاحی اور مولانا محمد جنید احمد فلاحی، ان حضرات نے مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔

''عن ابن المسيب ابن عمر قالا، من كان له حق على رجل إلى أجل معلوم فتعجل بعضه وترك له بعضه فهو ربا. قال معمر: ولا أعلم أحدا قبلنا الا وهو يكره'' (مصنف ابن ابی شیبۃ)۔

البتہ شیخ وہبہ زحیلی، مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا عبد القیوم پالنپوری اور مولانا محمد ابوبکر قاسمی مولانا محمد مصطفی قاسمی، نے دین کی ادائیگی کے لئے اگر کوئی ادھار مدت طے ہو (جیسا کہ بیع بالتقسیط میں ہوتا ہے) تو ضع وتعجل کی صورت کو ناجائز قرار دیا ہے اور اگر دین کی ادائیگی کی کوئی مدت طے نہ ہو (دین حال ہو) تو جائز و درست ہے۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں کسی قسط کی تاخیر پر مہلت ختم کرکے فوری طور پر جملہ قیمت کا مطالبہ کیا حکم رکھتا ہے؟

اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ متعینہ مدت تک دین یا قسط کی عدم ادائیگی پر بائع کو مہلت ختم کرکے فوری مابقی کے مطالبہ کا حق ہوگا، زیادہ تر ان حضرات نے ذیل میں ذکر کردہ عبارت پیش کی ہے۔

''ان المشتري إذا لم يؤد قسطا من الثمن في موعده المحدد، فإن بقية الأقساط تصير حالة ويجوز للبائع أن يطالب بها في الحال'' (مجموعہ فقهية معاصرة)۔

جبکہ مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا محمد ایوب ندوی، مولانا انور علی اعظمی اور مولانا نور القاسمی،

صاحبان نے مہلت باقی رکھنے اور بائع کو فوری مطالبہ نہ کرنے کی رائے دی ہے اور سنن دار قطنی کی روایت سے استدلال کیا ہے:

''عن كثير بن عبد الله المزني عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما'' (السنن الكبرى للبيهقي، ايضا دار قطني)۔

۱۷- ''بیع بالتقسیط'' میں یہ مسئلہ بھی بڑا اہم ہے کہ دین کی ادائیگی کے لئے مقررہ وقت سے پہلے اگر فریقین میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو معاملہ اب بھی علی حالہ رہے گا جو طے تھا یا اس میں کوئی فرق آجائے گا؟

زیادہ تر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ دائن کی موت سے ادھار مدت اپنی جگہ برقرار رہے گی، اور مشتری کی موت سے ادھار مدت باطل ہوکر فوری میں تبدیل ہوجائے گی اور دائن کا حق ہوگا کہ مشتری کے ورثہ سے اپنے دین کا مطالبہ کرے، مختلف حضرات نے درج ذیل فقہی عبارت پیش کی ہے: ''وبموت البائع لا يحل الثمن المؤجل وبموت المشتري يحل ... الخ'' (الفتاوی ر)۔

جبکہ شیخ وہبہ زحیلی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبداللطیف مظاہری، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا سید عقیل احمد قاسمی، مولانا محمد جمال اکبر صاحبان نے مختلف وجوہات کے پیش نظر امام احمد بن حنبل کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے علی حالہ مدت باقی رہنے کی رائے دی ہے، امام موصوف کا قول ہے:

''لا تحل إذا وثق الورثة وہو قول ابن سيرين و عبد الله بن الحسن وأبي عبيد و اسحاق'' (المغني)

۱۸- بیع بالتقسیط میں قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دینے اور بیع بالتقسیط کے ساتھ انعام کو جوڑنے اور اس سے مستفید ہونے کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ قمار و جوا میں داخل ہے؟

اس بابت مقالہ نویسوں کی دو رائیں ہیں: کچھ حضرات کے نزدیک اس انعام سے مستفید ہونا جائز و درست ہے، اور یہ قمار و ربا میں داخل نہیں ہے۔

دلائل: ''وصح التصرف في الثمن قبل قبضه والزيادة فيه والحط منه والزيادة في المبيع'' (البحر الرائق)

البتہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا احمد نادر القاسمی صاحبان نے موجودہ حالات کے پیش نظر چونکہ اسے اس لئے مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کے پس پشت قماری ذہن کارفرما ہے۔

''والاصح عندم صحة البيع مع الإثم وهو قول الحنفية'' (عمدة القاري)

البتہ مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا اخلاق الرحمن، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا جمال اکبر، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ایوب، حکیم ظل الرحمن، مولانا ابو سفیان مفتاحی، مولانا اختر حسین، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا اشتیاق احمد الاعظمی اور مولانا انور علی صاحبان نے مذکورہ صورت کو ناجائز اور قمار و ربا کی قسم قرار دیا ہے۔

۱۹- تمام خریداروں کو متعینہ مدت پر سامان دینے کے لئے بالاقساط قیمتیں جمع کرائی جائیں جس میں ہر قسط کا وقت بھی مقرر ہو، البتہ سامان مشتری کو دینے کے لئے قرعہ اندازی کی شکل اختیار کی جائے اور کسی خریدار کا نام نکلنے پر اس کی جمع کی ہوئی قسط ہی کافی سمجھی جائے اور سامان دے دیا جائے تو شرعا اس معاملہ کا کیا حکم ہوگا؟

اس مسئلہ میں مقالہ نگاروں کی دو رائیں ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ قسط وار خرید و فروخت میں اس طرح کا معاملہ کرنا شرعا ناجائز اور ربا و قمار میں داخل ہے۔ بیشتر حضرات نے یہی رائے اختیار کی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ قسط وار خرید و فروخت میں اس طرح کا معاملہ کرنا شرعا درست ہے اور یہ ربا و قمار کے دائرہ میں داخل نہیں ہے۔

درج ذیل حضرات نے یہ رائے اختیار کی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، شیخ وہبہ الزحیلی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابرار الحق قاسمی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبداللطیف مظاہری، مولانا اختر حسین رضوی، مولانا عبدالفتاح عادل، مولانا فضل الرحمن افضل، مولانا اختر ضیاء قاسمی، مولانا محمد عمر بن یوسف، مولانا جنید احمد فلاحی۔

اور درج ذیل عبارت پیش کی ہے:

''إذا قال بعتك شاة من هذا القطيع، فالبيع فاسد، فإن عين البائع شاة وسلمه اليه و رضي به جاز'' (بدائع الصنائع)۔

جدید فقہی تحقیقات

دوسرا باب: تفصیلی مقالات

ادھار اور بالاقساط خرید وفروخت چند اہم مسائل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی[1]

عہد جدید نے جو شرعی اور فقہی مسائل پیدا کیے ہیں وہ زیادہ تر خرید وفروخت سے متعلق ہیں اور ان میں ایک اہم مسئلہ قسط وار قیمت کی ادائیگی پر خرید وفروخت ہے، نہ صرف افراد واشخاص اس طریقہ کو اختیار کرتے ہیں، بلکہ بہت سے مالیاتی ادارے بھی اس طریقہ کار سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جو مالیاتی ادارے اسلامی بنیاد پر سرمایہ کاری کرتے ہیں، ان کے یہاں نفع کے لیے ایک محفوظ اور جائز راستہ "بیع مرابحہ" کا ہے، اور مرابحہ کی یہ صورت گاہکوں کے لیے زیادہ پرکشش اور قابل قبول ہوتی ہے کہ ان کو بالاقساط قیمت کی ادائیگی کی سہولت دی جائے۔

سوالنامے میں دو باتیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں: اول یہ کہ کن صورتوں میں ربا یا شبہ ربا کا تحقق ہورہا ہے؟ کیونکہ ربا کا پایا جانا بجائے خود اس معاملہ کی حرمت اور نادرستی کے لیے کافی ہے، گو اس میں فریقین کی رضامندی موجود ہو، دوسرے یہ کہ کن صورتوں میں ایسی جہالت، عدم تعین اور ابہام پایا جارہا ہے جو امکانی طور پر باعث نزاع بن سکتا ہے کہ اس درجہ کا ابہام شرعا معاملہ کو فاسد کردیتا ہے، ہاں اگر معمولی درجہ کا ابہام ہو جو عام طور پر باعث نزاع نہیں ہوا کرتا تو کچھ حرج نہیں، اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی ابہام کے قابل برداشت اور ناقابل برداشت ہونے میں عرف ورواج کو بھی خاص دخل ہے، اس لیے اگر معاملہ کی کوئی خاص صورت مروج ہوجائے اور اس میں ایک ابہام موجود ہو تو وہ بھی جائز ودرست ہوگی۔

اسی پس منظر میں ان مسائل پر غور کرنا مناسب ہوگا۔

۱، ۴- ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت:

نقد کے مقابلہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت رکھنا درست ہے، چونکہ یہ فقہ کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے، اس لیے فقہاء نے اصالۃً اس جزئیہ کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن ان کے یہاں اس بابت واضح اشارات موجود ہیں، ملک العلماء علامہ کاسانی کا بیان ہے:

"لا مساواة بين النقد والنسيئة؛ لأن العين خير من الدين، والمعجل أكثر قيمة من المؤجل" (بدائع ۵/۱۸۷)۔

اسی لیے فقہاء نے بیع مرابحہ (نفع کے ساتھ فروخت) میں اس بات کو ضروری قرار دیا ہے کہ فروخت کرنے والے کو اپنی قیمت خرید بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرنا چاہیے کہ اس نے نقد قیمت ادا کر کے خریدا تھا یا ادھار؟ کیونکہ نقد اور ادھار قیمت میں فرق ہوا کرتا ہے۔ کاسانی کہتے ہیں:

"لو اشترى شيأ نسيئة لم يبعه مرابحة حتى يبين؛ لأن للأجل شبهة المبيع، وإن لم يكن جميعا حقيقة؛ لأنه مرغوب فيه ألا ترى أن الثمن قد يزاد لمكان الأجل" (بدائع الصنائع ۵/۲۲۴)

ابن رشد مالکی رقمطراز ہیں:

"قال مالك: أيضا فيمن اشترى سلعة بأجل فباعها مرابحة: إنه لا يجوز حتى يعلم بالأجل" (بدایۃ المجتہد ۲/۲۱۵)۔

فقہاء شافعیہ میں رافعی کا بیان ہے:

"إذا اشتراه بثمن مؤجل وجب الإخبار عنه للتفاوت الظاهر بين المعجل والمؤجل في المالية"

(فتح العزیز علی ہامش المجموع ۹/۱۲)۔

---

[1] خادم، المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

اور ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: ''وإن اشترى شيأ بثمن مؤجل لم يجز بيعه مرابحة حتى يبين ذلك'' (المغنی ۴/۱۳۲)۔

فقہاء کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ نقد اور ادھار قیمت میں فرق ان حضرات کے یہاں ایک درست اور تسلیم شدہ حقیقت ہے، ادھار قیمت زیادہ مقرر کرنے کے بارے میں یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ سود ہے، کیونکہ سود ایسے اضافہ کا نام ہے جس میں ایک شی کا تبادلہ اپنی ہی جنس سے ہو اور دوسرے فریق کی طرف سے اس کا کوئی بدل نہ پایا جائے، یہاں سامان کا تبادلہ پیسے سے ہے نہ کہ ہم جنس سے، اس لیے یہ سود نہیں۔

۲- قیمت کی قسط وار ادائیگی:

ادھار قیمت قسط وار بھی ہوسکتی ہے اور ایک مشت بھی، صرف اس قدر ضروری ہے کہ اجل (مدت ادائیگی) اور ثمن (قیمت) اس درجہ متعین ہوجائے کہ نزاع کا اندیشہ نہ رہے، آج کل بالاقساط خرید وفروخت کا رواج جس درجہ بڑھ گیا ہے، غالباً گزشتہ ادوار میں اتنا زیادہ اس کا رواج نہیں تھا، پھر بھی فقہاء کے یہاں قسطوں میں قیمت کی ادائیگی کا ذکر ملتا ہے، شامی نے ایسے ہی ایک معاملہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ومن باع سلعة بثمن... على أن تعطيني كل يوم درهما، وكل يوم درهمين'' (منحۃ الخالق علی البحر ۵/۲۸۰)۔

شامی نے اس طرح کے بعض اور معاملات کا ذکر بھی کیا ہے (حوالہ سابق ۵/۲۸۱)۔

خود امام شافعی رقم طراز ہیں:

''ومن كانت عليه دنانير منجمة أو دراهم، فأراد أن يقبضها جملة فذلك له'' (کتاب الام ۳/۳۳)

غرض قسط وار قیمت میں خرید وفروخت شریعت کے عام اصول وقواعد کی روشنی میں بلاشبہ جائز ہے، اور بظاہر اس میں فقہاء کا اختلاف بھی نظر نہیں آتا۔

۳، ۵- نقد وادھار دو قیمتیں:

اگر نقد وادھار دو الگ قیمتیں ذکر کی گئیں، اور اس مجلس میں ان دونوں میں سے ایک طریقہ پر معاملہ طے نہ پایا تو بیع درست نہ ہوگی، کیوں کہ معاملہ کی نوعیت غیر متعین ہے، ہاں اگر اسی مجلس میں نقد وادھار میں سے ایک صورت طے پاگئی تو پھر یہ صورت جائز ہے، علامہ کاسانی نے ایسے ہی معاملہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''فاذا علم ورضى به جاز البيع؛ لأن المانع من الجواز هو الجهالة عند العقد، وقد زالت فى المجلس، وله حكم حالة العقد، فصار كأنه كان معلوما عند العقد'' (بدائع الصنائع ۵/۲۵۸)۔

یہی رائے فقہاء شوافع کی ہے، شوافع کے یہاں اگر کسی ایک قیمت کی تعیین نہیں ہوئی یا خریدار نے بیک وقت دونوں قیمتوں کو قبول کرلیا تب یہ معاملہ باطل ہوگا ورنہ نہیں، ''وتخصيص البطلان بقبوله على الإبهام أو لقبولهما معا'' (حاشیہ شروانی وابن قاسم علی تحفۃ المحتاج ۴/۲۹۴)۔

اسی رائے کے حامی فقہاء حنابلہ بھی نظر آتے ہیں، ابن قدامہ کے الفاظ ہیں:

''لا بأس به أن يقول: أبيعك بالنقد كذا وبالنسيئة بكذا فيذهب إلى أحدهما'' (المغنی ۴/۱۶۱)

مالکیہ کے یہاں اس مسئلہ میں مزید وسعت ہے، ان حضرات کا خیال ہے کہ اگر اس مجلس میں نقد یا ادھار میں سے ایک پر معاملہ طے نہیں ہوا تب بھی یہ معاملہ درست ہوجائے گا، اور خریدار کو اختیار ہوگا کہ ان دونوں میں سے جس طریقہ پر چاہے قیمت ادا کرے۔

''وجعله مالك من باب الخيار'' (بدایۃ المجتہد ۲/۱۵۴)

جو حکم نقد اور ادھار کی دو قیمتوں کا ہے وہی حکم دو مدتوں کے لیے دو قیمتوں کا ہے کہ اگر مجلس کے اندر ہی دو صورتوں میں سے ایک معاملہ کے لیے متعین ہوگئی تو درست ہے، کیونکہ کہ ثمن اور اجل میں جہالت باقی نہیں رہ گئی، اور اگر ایک صورت پر معاملہ متعین نہ ہوا تو حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیع درست نہ ہوگی، مالکیہ کے نزدیک درست ہوجائے گی، اور خریدار کو دونوں قیمتوں میں سے کسی بھی ایک کو اس سے متعلق مدت کے ساتھ قبول کرنے کا حق ہوگا۔

کاسانی کی جس عبارت کا اوپر حوالہ مذکور ہوا ہے وہ دراصل ایسے ہی معاملہ سے متعلق ہے۔ (بدائع الصنائع ۵/۲۵۸)

۶، ۷- تاخیر پر زیادہ رقم کی وصولی:

اس طرح معاملہ کرنا کہ وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں دس کے بجائے بارہ روپئے ادا کرنے ہوں گے، کھلا ہوا ربا ہے اور قطعاً جائز نہیں، اور

اس کی حرمت پر تمام ہی فقہاء کا اتفاق ہے، اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں سود کی جو صورت زیادہ مروج تھی وہ یہی صورت تھی، بقول امام مالک:

''وكان ربا الجاهلية في الديون أن يكون للرجل على الرجل الدين، فإذا حل، قال له: أتقضي. أم تربي فإن قضاه أخذه وإلا زاده في الحق وزاده في الأجل'' (المدونة الكبرى ۵/۱۸)

اس سے قطع نظر کہ تعزیر بالمال (مالی جرمانہ) جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے بھی قطع نظر کہ تعزیر کی ولایت خود صاحب معاملہ کو حاصل ہے یا قاضی اور اولوالامر کو؟ اس صورت میں چونکہ ربا کی صورت پائی جارہی ہے، اور ربا ہی نہیں، شبہ ربا سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اسی لیے فقہاء نے ان معاملات کو بھی ناجائز قرار دیا ہے جو بالواسطہ سود کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لیے یہ صورت جائز نہیں۔

۸- مال مرہون سے نفع اٹھانا:

(الف) اصولی طور پر مال مرہون سے فروخت کنندہ کا فائدہ اٹھانا درست نہیں، کیونکہ رہن سے حبس (روک رکھنے) کا حق حاصل ہوتا ہے نہ کہ نفع اٹھانے کا حق ''يفيد ملك الحبس لا ملك الانتفاع'' (بدائع ۱۴۶/۶)، البتہ فقہاء نے عام طور پر اس وقت مال مرہون سے نفع اٹھانے کی اجازت دی ہے جب خود رہن رکھنے والے کی طرف سے اذن حاصل ہو، ابن نجیم لکھتے ہیں:

''ليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون إلا بإذن الراهن'' (البحر الرائق ۸/۲۷۱)

اور امام نووی شافعی کا بیان ہے: ''فليس للمرتهن أن يفعل ذلك بغير إذن الراهن'' (شرح مہذب ۲۳۵/۱۳)

مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں اس میں کسی قدر توسع ہے، امام مالک کا خیال ہے کہ رہن کے مکان اور زمین سے فائدہ اٹھانا اور معاملہ کے وقت اس انتفاع کی شرط لگانا جائز ہے، البتہ حیوانات اور ملبوسات میں جائز نہیں، ابن سحنون نے امام مالک کا مسلک اس طرح بیان کیا ہے:

''إذا باعه وارتهن رهنا واشترط منفعة الرهن إلى أجل قال مالك: لا أرى به بأسا في الدور والأرضين. قال مالك: وأكره في الحيوانات والثياب'' (المدونة الكبرى ۱۶۳/۴)

حنابلہ کے یہاں اس مسئلہ میں خاصی تفصیلات بھی ہیں اور معمول کے مطابق اقوال کی کثرت اور اختلاف بھی، حاصل یہ ہے کہ: (۱) رہن میں نفع اٹھانے کی شرط درست نہیں، بلکہ یہ شرط فاسد ہے، (۲) مال مرہون اخراجات کا متقاضی ہے، اور سواری کے لائق یا دودھ دینے والے جانور کی صورت ہو تو اس کے اخراجات پورا کرنا اور اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، گو رہن رکھنے والے نے اجازت نہ دی ہو، (۳) ایسی چیزیں جو جانور کی قبیل سے نہ ہوں جیسے مکانات وغیرہ ان سے نفع اٹھانا جائز نہیں، نہ بلا اجازت، اور نہ اس کی اجازت سے، ہاں مکان کا مروجہ کرایہ ادا کر کے رہن پر لینے والا خود اس میں قیام کرسکتا ہے۔ (المغنی ۲۵۱/۴)

ان تفصیلات کے بعد عرض ہے کہ شریعت کے مزاج سے قریب تر رائے وہی معلوم ہوتی ہے، جو امام احمد کی مکانات وغیرہ کے بارے میں ہے، اصولی طور پر مال مرہون کے مالک کی اجازت سے بھی اس سے انتفاع جائز نہ ہونا چاہیے، کیونکہ یہ انتفاع ''كل قرض جر نفعا فهو ربا'' (جس قرض سے نفع حاصل کیا جائے وہ سود ہے) کا مصداق نظر آتا ہے، اور سود کا لینا دینا اجازت سے بھی درست نہیں۔

اس لیے مال رہن سے انتفاع کے سلسلے میں یہ تفصیل ہوگی کہ اگر فروخت کنندہ نے مال رہن سے استفادہ کی شرط نہیں لگائی تھی، پہلے اس شخص کا دوسرے خریداروں کے مال مرہون سے انتفاع معلوم و معروف نہ ہو اور اس خطے میں بھی مال مرہون سے انتفاع کا رواج اور چلن نہ ہو تب تو خریدار کی اجازت سے اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، اور اگر مذکورہ تینوں باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے تو انتفاع جائز نہیں، کیونکہ لین دین کے معاملہ میں ایک فریق کی طرف سے ایسے اضافہ کو مشروط کرنا جس کا وہ کوئی معاوضہ نہ ادا کر رہا ہو ربا ہے، اور فقہاء کے نزدیک معروف بھی مشروط ہی کے حکم میں ہے۔ ''المعروف عرفا کالمشروط شرعا'' چنانچہ علامہ ابن ہمام کا بیان ہے:

''والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع، ولو لاه لما أعطاه الدراهم، وهو بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط، وهو مما يعين المنع'' (فتح القدیر ۷۹/۹)۔

مال رہن سے قیمت کی وصولی:

(ب) قیمت مال مرہون سے زیادہ ہو تو باقی ماندہ پیسے خریدار ادا کرے گا، قیمت مال مرہون کے برابر ہو تو دین ساقط ہوجائے گا، اگر مال مرہون کی قیمت

زیادہ ہو تو بھی معاملہ برابر ہو جائے گا، اور فروخت کنندہ کو دین سے زائد پیسے نہیں ادا کرنے ہوں گے، اس لیے کہ وہ ایک درجہ میں امین بھی ہے

(ہدایہ مع الفتح ۱۰/ ۱۴۵، ہندیہ ۵/ ۴۴۷)

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مال مرہون کی حیثیت امانت کی ہے، اگر صاحب دین کی زیادتی کے بغیر وہ مال ضائع ہو گیا تو اس پر اس کی کچھ ذمہ داری نہیں ہوگی۔

(شرح مہذب: ۱۱/ ۱۳۸، المغنی ۴/ ۲۵۷)

البتہ مالکیہ کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ جس چیز کی ہلاکت مخفی ہوا کرتی ہے جیسے سونا، چاندی وغیرہ، اس کا صاحب دین ضامن ہوگا، اور جس چیز کا ہلاک ہونا ظاہر و باہر ہوتا ہے، جیسے جانور اور زمین و مکان، ان کا صاحب دین ضامن نہیں ہوگا۔ (المدونۃ ۴/ ۲۵۲)

حنفیہ کا مسلک راجح ہے، اور اس میں دونوں فریق کی رعایت ہے۔

(ج) خریدار وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرے تو اس سے اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے وکیل سے مطالبہ کیا جائے گا، کہ وہ مال مرہون کو فروخت کر کے دین ادا کرے، اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو قاضی خود فروخت کر کے اس کی قیمت ادا کر دیگا، یہ صاحبین کی رائے ہے، اور اسی پر فتوی ہے، "وتقدم فی البحر أن قولهما به یفتی"۔ (رد المحتار ۵/ ۳۵۹)

دوسرے فقہاء، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کی بھی یہی رائے ہے (المدونۃ الکبری ۴/ ۱۱۶، شرح مہذب، المغنی ۴/ ۲۶۲)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی خود مال مرہون کو فروخت نہیں کرے گا بلکہ مدیون کو قید کرے گا، یہاں تک کہ وہ اسے فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائے

(بدائع الصنائع ۶/ ۱۴۸)۔

اس لیے فروخت کنندہ کو چاہیے کہ وہ معاملہ طے کرنے کے وقت ہی خریدار کی طرف سے کسی ایسے آدمی کو بوقت ضرورت مال مرہون کی فروختگی کا وکیل نامزد کروائے جس پر فروخت کرنے والے کو اطمینان ہو تاکہ خریدار کے غائب ہونے کی صورت میں اسے دشواری کا سامنا نہ ہو۔

۹- قیمت کی وصولی کے لیے سامان روکے رکھنا:

فروخت شدہ سامان کو قیمت کے لیے روک کر رکھنے کی دو صورتیں ہیں، (۱) خریدار اس پر قبضہ کر لے اور پھر بائع اس کو اپنی تحویل میں لے لے، یہ صورت رہن کی ہے، اور جائز ہے، بشرطیکہ فریقین کی رضامندی سے معاملہ طے پایا ہو، علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

"هو المبیع الذی اشتراه بعینه لو بعد قبضه فهو رہن" (الدر المختار علی ہامش الرد ۵/ ۳۵۴)

نیز "فتاوی بزازیہ" میں ہے:

"قال للبائع: أمسك ہذا الثوب حتی أعطیك الثمن فهو عندنا رہن" (بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/ ۵۵)

دوسری صورت یہ ہے کہ خریدار نے ابھی اس پر قبضہ ہی نہ کیا ہو اگر بائع اسے روک لے تو یہ رہن نہیں ہوگا، بلکہ حبس بالدین کے قبیل سے ہوگا،

"ولو قبله لا یکون رہنا به، لأنه محبوس بالثمن" (الدر المختار علی ہامش الرد ۵/ ۳۵۴)۔

حنفیہ کے یہاں نقد خرید و فروخت کا معاملہ طے پانے کی صورت میں فروخت کنندہ کو اس کے روکنے کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ مبیع سامان ہو اور ثمن روپے پیسے، ایک مدت کے بعد قیمت کی ادائیگی طے پائی ہو یعنی قیمت ادھار ہو تو فروخت کنندہ مبیع کو روکنے کا حق نہیں رکھتا۔

"وثبوت حق الحبس لا ستیفاء الثمن، وهذا عندنا، أما شرط ثبوته فشیئان: أحد ہما أن یکون أحد البدلین عینا، والآخر دینا، والثانی أن یکون الثمن حالا، فإن کان مؤجلا لا یثبت حق الحبس" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۹)

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر قیمت وصول نہ ہو پانے کا اندیشہ ہو تو مبیع کو روکنے کی گنجائش ہے، شرح منہاج میں ہے:

"للبائع حبس مبیعه حتی یقبض ثمنه إن خاف فوته بلا خلاف" (تحفۃ المحتاج ۴/ ۴۲۳، المغنی ۴/ ۱۴۱)

اس لیے بہتر صورت یہی ہے کہ قبضہ کے بعد خریدار سے بطور رہن اس سامان کو حاصل کر لیا جائے، ورنہ بغیر قبضہ کے مبیع کو روک لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ عملاً مبیع اور ثمن دونوں ہی ادھار ہو جائیں، اور حدیث میں اسی کو "بیع الکالی بالکالی" کے عنوان سے منع فرمایا گیا۔

۱۰- اگر تاخیر کی صورت میں اداشدہ اقساط سوخت کر دی جائیں:

وصول شدہ اقساط کو واپس نہیں کرنا اور معاملہ ختم کر دینا جائز نہیں، اس کو ''بیع عربون'' اور ''بیع عربان'' بھی کہتے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عمرو سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا: ''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع العربان'' (ابن ماجہ ۲/ ۱۴ طبع ریاض)

بیع عربان یہ ہے کہ کوئی سامان خریدا جائے، قیمت کا کچھ حصہ ادا کر دیا جائے، اور کہا جائے کہ اگر میں نے بقیہ قیمت ادا کر دی تو اس کا حساب قیمت میں کرلیا جائے، اور قیمت نہیں دے پایا تو یہ پیسے تمہارے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۰۸)۔شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ اس میں ایک طرح کا قمار ہے۔

وفيه معنى الميسر (حوالہ سابق) یہی رائے فقہاء شوافع کی اور مالکیہ کی بھی ہے۔(تحفۃ المحتاج ۴/ ۳۲۲، الشرح الکبیر علی ہامش الدسوقی ۳/ ۶۳)

البتہ امام احمدؒ کے نزدیک یہ صورت درست ہے، اور ابن قدامہ نے حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، محمد بن سیرین، اور سعید بن مسیب سے بھی اس کی اجازت نقل کی ہے (المغنی ۴/ ۱۶۰)۔بیع عربون اور اس قسط وار خرید وفروخت کی صورت میں فرق اتنا ہی ہے کہ بیع عربون میں خریدار، خریدنے ہی سے انکار کر جاتا ہے، اور زیر بحث مسئلہ میں قیمت ادا کرنے میں تاخیر کرتا ہے اور وقت کی پابندی نہیں کرتا، لیکن دونوں میں اس بابت پوری مماثلت ہے کہ بائع اداشدہ پیسے بلا معاوضہ روک لیتا ہے، اس لیے یہ صورت جائز نہیں۔

۱۱- مبیع خریدار کے پاس رہن:

اگر فروخت کنندہ سامان پر قبضہ کرلے اور پھر اسے خود خریدار ہی کے پاس بطور امانت رکھ دے، تو ایسا کرنا درست ہے، قبضہ سے پہلے درست نہیں، علامہ کاسانی رقم طراز ہیں:

''ولو تعاقدا على أن يكون الرهن في يد صاحبه لا يجوز الرهن ... وكذا إذا قبضه المرتهن أو العدل ثم تراضيا على أن يكون في يد الراهن جاز'' (بدائع الصنائع ۶/ ۱۳۷)

یہی رائے حنابلہ اور شوافع کی بھی ہے (تحفۃ المحتاج ۶/ ۶۷، المغنی ۴/ ۲۱۶)

مالکیہ کے نزدیک قبضہ کے بعد بھی اگر مال مرہون خریدار کے حوالہ کر دیا تو رہن ہی باطل ہو جائے گا، ابن رشد کا بیان ہے:

''إن من شرط صحة الرهن استدامة القبض وأنه متى عاد إلى يد الراهن بإذن المرتهن بعارية أو وديعة أو غير ذلك فقد خرج من اللزوم'' (بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۷۴، نیز دیکھئے المدونۃ الکبری ۴/ ۱۵۱)۔

۱۲- اجرت کفالت:

کفالت اسلام کی نگاہ میں عقد تبرع، یعنی ایک رضا کارانہ حسن سلوک پر مبنی معاملہ ہے، اور اس پر اجرت لینا، احسان وسلوک کی شان کے خلاف ہے، اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ کفالت انہی لوگوں کی جانب سے معتبر ہے جو تبرع کے اہل ہوں۔

''ولا تصح الكفالة إلا ممن يملك التبرع؛ لأنه عقد تبرع ابتداء'' (مجمع الانہر ۲/ ۱۲۴)

اس لیے ضمانت قبول کرنے اور کریڈٹ لیٹر دینے کی اجرت لینا جائز نہیں، البتہ اگر کوئی شخص کسی چیز کے لینے پر مجبور ہو تو اس قاعدہ کے تحت کہ مجبوریاں ناجائز چیزوں کی گنجائش پیدا کر دیتی ہیں (الضرورات تبيح المحظورات) وہ اجرت ادا کر سکتا ہے، فقیہ العالم الاسلامی ڈاکٹر وہبہ الزحیلی رقم طراز ہیں:

''الكفالة عقد تبرع وطاعة يثاب عليها الكفيل ولو قام المكفول له بتقديم شئى من المال لكفيل هبة أو هدية جاز... لكن إن شرط الكفيل تقديم مقابل أو أجر على كفالة، وتعذر على المكفول عنه تحقيق مصلحة من طريق المحسنين المتبرعين... جاز له دفع الأجر للضرورة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۱۶۱)

۱۳- دستاویز دین کی خرید وفروخت:

ادھار قیمت کی دستاویز کو فروخت کرنا کاغذ کی خرید وفروخت نہیں، بلکہ دستاویز میں لکھی ہوئی رقم کی خرید وفروخت ہے، اور نقد کی قیمت اگر نقد کے عوض ہو تو ضروری ہے کہ دونوں طرف سے فوری ادائیگی اور قبضہ ہو، اور مقدار کے اعتبار سے برابری بھی ہو، بیع صرف کا یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے اور اس پر قریب قریب فقہاء کا

اتفاق ہے (بدائع الصنائع ۵/ ۲۱۵، درمختار مع الرد ۲/ ۵۰۲، تحفۃ المحتاج ۴/ ۲۷۳، شرح مہذب ۵/ ۴۰۳)۔ اس لیے یہ صورت قطعاً جائز نہیں۔

۱۴- مدت میں کمی کی وجہ سے قیمت میں کمی:

یہ صورت دو معاملوں سے مرکب ہے، فروخت کنندہ قیمت میں کمی کردیتا ہے، اور اس کو اس کا حق ہے، خریدار وقت مقررہ سے پہلے ادا کردیتا ہے، اور اس کے لیے یہ درست ہے، لیکن ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مشروط کردینے کی صورت میں یہ نوعیت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ بائع نے جو حصہ قیمت میں سے کم کیا ہے، وہ اس مدت کے عوض ہے جو کم کی گئی ہے، گویا قیمت کا کچھ حصہ، مدت (اجل) کے مقابلہ میں آ گیا، اور اجل فی نفسہ قابل قیمت نہیں اور قیمت لی جائے تو سود ہے، پس یہ سود لینے کی وجہ سے حرام ہے، اسی لیے فقہاء نے اس صورت کو منع کیا ہے، اور وہ اس کی ممانعت پر قریب قریب متفق الرائے نظر آتے ہیں، ابن عابدین شامی کا بیان ہے:

''ولا يصح الصلح عن ألف مؤجل على نصفه حالا؛ لأنه اعتياض عن المؤجل وهو حرام'' (ردالمحتار ۴/ ۵۳۴)

اسی طرح کی بات فقہاء شوافع نے بھی لکھی ہے۔

''صالح عن عشرة مؤجلة على خمسة حالة لغى الصلح؛ لأنه إنما ترك الخمسة في مقابلة حلول الباقي وهو لا يحل'' (حواشی تحفۃ المحتاج ۵/ ۱۵۲)

امام مالک نے خود مؤطا میں اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور اس میں ''ضع وتعجل'' کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے، امام مالک کا خیال ہے کہ اگر فریقین بطور خود تبرعاً ایسا کریں تو حرج نہیں، لیکن مشروط طور پر ایسا معاملہ کرنا جائز نہیں:

''من وجب عليه دين إلى أجل فسأل أن يضع عنه ويعجل له ما بقي لم ينبغ له ذلك؛ لأنه يعجل قليلا بكثير دينا'' (موطا امام مالک)

ابن قدامہ کا بیان ہے: ''إذا صالحه على المؤجل ببعضه حالا لم يجز''۔

پھر ابن قدامہ نے حضرت زید بن ثابت عبداللہ ابن عمر، سعید بن مسیب، قاسم، سالم شعبی، امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور متعدد فقہاء و محدثین سے اس کا ناجائز ہونا نقل کیا ہے، اور عبداللہ ابن عباس، ابراہیم نخعی، محمد بن سیرین اور حسن بصری سے اس کی اجازت بھی نقل کی ہے۔ (المغنی ۴/ ۳۱۶)

غرض ''ضع وتعجل'' کی یہ صورت درست نہیں۔

۱۵- ادھار معاملہ اور قیمت طے نہیں:

جب ادھار معاملہ کیا گیا اور قیمت کی ادائیگی کا وقت طے نہیں کیا گیا تو اجل، یعنی وقت ادائیگی کے غیر متعین ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی، اور جب بیع فاسد ہوگئی اور پھر دوبارہ اس سے کم قیمت پر نقد لین دین ہوگیا تو گویا یہی اصل بیع ہوئی، لہذا یہ صورت جائز ہوگی، اور اس کی حیثیت مستقل اور علیحدہ بیع کی ہوگی۔

۱۶- قسط کی ادائیگی میں تاخیر:

خریدار کی طرف سے قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں فروخت کرنے والا بالاقساط ادا کرنے کی سہولت ختم کر کے فوری طور پر پوری قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں:

''عليه ألف ثمن جعله ربه نجوما إن أخل بنجم حل الباقي'' (شامی ۴/ ۲۶)

''مجلة الأحكام العدلية'' (مرتبہ خلافت عثمانیہ ترکی) کے شارح علی حیدر کا بیان ہے:

''إذا كان لإنسان على آخر ألف ثمن جعله أقساطا إن أخل بقسط حل الباقي'' (درر الأحكام: ۱/ ۲۳۰)

۱۷- فریقین میں سے کسی کا انتقال:

اگر ادائیگی کی متعینہ مدت سے پہلے فروخت کرنے والے کا انتقال ہوگیا تو معاملہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ مہلت کا نفع جس فریق کو پہنچ رہا تھا وہ ابھی زندہ ہے، ہاں اگر خریدار کا انتقال ہوجائے تو مہلت ختم ہوجائے گی، اور متوفی کے ترکہ سے فی الفور اس کے ذمہ باقی کل پیسے ادا کیے جائیں گے۔

''ویبطل الأجل بموت المدیون، لأن فائدة التأجیل أن یتجر فیؤدی الثمن من تمام المال، فإذا مات من له الأجل تعین المتروك لقضاء الدین، فلا یفید التأجیل (بحر من شرح المجمع) وصرح قبله: لو مات البائع لا یبطل الأجل''(شامی ۴/۲۶)

یہی رائے فقہاء شوافع کی بھی ہے:

''انتقل بموت البائع لوارثه، وحل بموت المشتري ولا یضرا لسقوط بموته''(تحفۃ المحتاج ۴/۲۶۷)

۱۸- گاہکوں کے لیے ترغیبی انعام:

چونکہ اس صورت میں مبیع اور ثمن متعین ہے، اور ہر خریدار کو اپنی مبیع حاصل ہوجاتی ہے، انعام کمپنی اپنے منافع میں سے دیتی ہے، اس لیے یہ صورت جائز و درست ہوگی، اگر فریقین میں سے کسی کو ملنے والا عوض مستور العاقبہ، اور نامعلوم ہوتا، کسی کو مبیع ملتی اور کوئی محروم ہوجاتا، تو یہ صورت قمار کی ہوتی، جصاص کے الفاظ میں "إحقاق بعض وإنجاح بعض"(احکام القرآن ۱/۳۲۹)۔ اس لیے یہ صورت قمار میں داخل نہیں، ماضی قریب کے علماء میں مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کی رائے بھی یہی ہے (جواہر الفقہ ۲/۲۴۵ "احکام القمار")

یہ حکم تو مسئلہ کی ظاہری صورت کے اعتبار سے ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کاروبار کے اس طریقہ کے پیچھے ذہن قمار ہی کا کارفرما ہے، اس لیے ایسے معاملات کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے، اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ اس میں کراہت کا پہلو ضرور ہے۔

۱۹- قرعہ میں نام نکلنے پر آئندہ قسط کی معافی:

یہ معاملہ اپنی ابتدائی شکل میں تو فاسد ہے، کیونکہ ثمن متعین نہیں، لیکن جب قرعہ میں اس کا نام نکل آیا، اور پہلی ہی قسط کے بقدر پیسوں میں اسے وہ چیز دیدی گئی تو یہ لین دین مستقل عقد بیع یعنی خرید وفروخت متصور ہوگا، اور چونکہ فریقین رضامند ہیں، مبیع اور ثمن متعین ہے، اس لیے انجام کار یہ معاملہ درست قرار پائے گا۔

''إذا قال: بعتك شاة من هذا القطیع فالبیع فاسد، فإن عین البائع شاة، وسلمه إلیه، ورضی به، جاز ویکون ذلك ابتداء بیع بالمراضاة''(بدائع الصنائع ۵/۱۵۶، ردالمحتار ۴/۱۳)۔

اور کچھ پہلے ہی دفعہ قرعہ میں نام نکلنے والے پر موقوف نہیں، بلکہ ہر بار نام نکلنے اور عوضین کے لینے اور دینے کے بعد ہی خرید وفروخت کا معاملہ مکمل ہوگا، ابتدائی مرحلہ میں قیمت اور مدت کے غیر متعین ہونے کی وجہ سے معاملہ فاسد ہوگا، یہ حکم بھی معاملہ کی ظاہری صورت کے اعتبار سے ہے، ورنہ اس کے پس پردہ بھی وہی قماروالا ذہن کارفرما ہے، اس لیے درحقیقت یہ بھی کراہت سے خالی نہیں۔

☆☆☆

قسط وار بیع وشراء، شرعی نقطہ نظر

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی [1]

بیع بالتقسیط کے مسائل واحکام میں بنیادی اہمیت ادھار فروخت اور اس کی وجہ سے قیمت کی زیادتی کی ہے، اس لیے اس بابت بطور تمہید درج ذیل سطور تحریر کی جاتی ہیں۔

قیمت کے ادھار ہونے کی صورت میں نقد قیمت کے مقابلہ میں قیمت کا زائد ہونا درست ہے۔ اور ادھار کی جانے والی زائد قیمت کا بازار کے عام نرخ سے بہت زائد ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مساوی ہو یا کم بھی۔

علامہ شوکانی کی تصریح کے مطابق چند حضرات کے علاوہ جمہور جواز کے ہی قائل ہیں، جیسا کہ صاحب ''اعلاء السنن'' اور صاحب ''مواقف الشریعۃ ال إسلامیۃ'' دونوں نے ان سے نقل کیا ہے اور امام شوکانی کا اس سے متعلق ایک رسالہ بھی ہے، اس کے عدم جواز کے سلسلہ میں ایک حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے مگر شوکانی نے بچند وجوہ اس استدلال کو مرجوح قرار دیا ہے۔ (اعلاء السنن ۱۴ / ۱۷۳، ۱۷۴، نیل الاوطار ۵ / ۱۷۱-۱۷۳)

فقہاء احناف میں سے صاحب ''ہدایہ'' اور صاحب ''درمختار'' وغیرہ نے ''باب المرابحہ'' میں ایک مسئلہ کے تحت اس کو عرف کہا ہے، اور اس کو تمام شراح ''ہدایہ'' اور شامی وغیرہ نے بدون نقد نقل وقبول کیا ہے۔ (ہدایہ مع الفتح ۶ / ۳۳۰، ردالمحتار ۵ / ۶۴۲)

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمارے عام فقہاء کے یہاں یہ جواز متعین ہے، اگرچہ مولانا تقی صاحب نے مسئلہ سود میں قاضی خاں سے ایسی عبارت نقل کی ہے کہ جس سے اس کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے، مگر جواز مسئلہ کی جو توجیہ وتنقیح کی جاتی ہے اور خود مولانا تقی صاحب نے بھی فرمائی ہے اس کے بعد جواز میں کوئی خفا نہیں رہ جاتا۔

رہ گیا یہ شبہ کہ ادھار خریدنے والا مجبور ہوتا ہے، اور اس سے زائد قیمت لینا اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا ہے، لہٰذا یہ غلط وممنوع ہوگا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر خریدار پر کچھ زائد قیمت کا بوجھ پڑ رہا ہے تو بیچنے والا بھی تو کچھ ایثار ونقصان کر رہا ہے، نقد بیچتا تو اصل پونجی ہی وقتی طور پر حاصل کرکے اس سے کام لیتا ہے اور جتنی مدت کے بعد اس کو یہ ادھار قیمت وصول ہوگی اتنی مدت میں تو نہ جانے کتنی مرتبہ اس مالیت سے وہ سامان خریدنے و بیچنے کا کام کرسکتا ہے۔

البتہ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ دونوں قیمتوں (ادھار ونقد) میں بہت زیادہ فرق نہ کیا جائے کہ جس کو غبن فاحش اور کھلی ہوئی زیادتی قرار دیا جائے۔

دوسرا اہم شبہ اس میں ربا کا ہے کہ زیادتی، مہلت ومدت ووقت کے مقابلے میں اختیار کی جاتی ہے تو اصل قیمت تو اصل سامان وشئے کے بالمقابل ہوئی اور زائد بلاعوض، اس لیے کہ وقت کی کوئی قیمت ومالیت نہیں ہوتی، اور یہی ربا ہے، اس لیے کہ ربا کے طور پر لیا جانے والا مال دراصل وقت کی بنیاد پر لیا جاتا ہے اور اسی حساب سے گھٹتا بڑھتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ فرق ہے، یہاں یہ معاملہ نہیں ہوتا کہ اصل قیمت نوسو روپئے ہے، نقد ادا کرو، نوسو دو، اور ادھار کرو تو اس سے اتنا بڑھا دو یا بڑھاتے رہو، بلکہ یہ معاملہ اس بنیاد پر ہے کہ ایک آدمی کو حق ہے کہ اپنا سامان جتنی قیمت میں چاہے فروخت کرے، یہ آدمی اس کو ایک وقت میں دو حالتوں کے اعتبار سے دو الگ الگ قیمتوں میں بیچتا ہے، خریدنے والا جس کو اختیار کرے اس کے مطابق قیمت ادا کردے۔

ربا و سود میں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک حصہ اصل واجب الاداء رقم کا، اور ایک اس پر اضافہ شدہ رقم کا ہوتا ہے، اگر یہ معاملہ یوں ہو کہ اس سامان کی قیمت سو روپئے ہے، اگر آپ ادھار قیمت ادا کرنا چاہیں تو اس حساب سے اتنا مزید ادا کرنا ہوگا، یا اتنے دن پر اتنا اور اتنے پر اتنا، تو یہ بے شک ربا کہلائے گا، مگر جب معاملہ یکمشت دو حالتوں کے پیش نظر دو قیمتوں کا ہے تو یہ حکم نہیں لگے گا۔

نیز یہ کہ ربا کی اصل حقیقت۔ وقت کے عوض وبالمقابل ہونا نہیں، بلکہ جانبین سے باہم مالی لین دین کے معاملہ میں ایک طرف کے مال کی مقدار کا اس انداز

---

[1] جامعہ عربیہ اسلامیہ، ہتھورہ، باندہ۔

میں دوسرے سے زائد ہونا کہ اس کے مقابلہ میں دوسری طرف کا مال یا اس کا کوئی حصہ نہ پڑ رہا ہو، یعنی اصلا ربا وہ زیادتی ہے کہ جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو، اس لیے ربا صرف ادھار معاملات میں نہیں ہوتا، بلکہ نقد میں بھی ہوتا ہے، کتب فقہ میں ''ربا الفضل'' معروف ہے، اس کا مدار نقد پر ہی ہے، اور مسئولہ صورت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک مال کی ایک مقدار جو نقد ہو، دوسرے کی دوسری جو ادھار ہو۔

جیسے کہ اگر دو الگ الگ دنوں میں آدمی ایک ہی چیز کو قیمت میں کمی وبیشی کر کے فروخت کرے، آج دس کی، کل بارہ کی، حالانکہ خرید اایک ہی قیمت میں تو یہ درست ہے۔ یا یہ کہ ایک ہی دن میں ایک کو دس کی، اور دوسرے کو بارہ کی دے رہا ہے، اسی طرح دو دو کانوں میں اس طرح کا فرق پایا جائے، حالانکہ سب مال ایک ساتھ ایک جگہ سے ایک مالیت میں لایا گیا ہے۔ ''اعلاء السنن'' میں مولانا ظفر احمد صاحب نے اور مسئلہ سود میں مولانا تقی صاحب نے اس انداز کی توجیہات کی ہیں۔ (اعلاء السنن ۱۴ / ۱۷۴۔ ۱۷۵، مسئلہ سود ص / ۱۳۳۔ ۱۳۴)۔

خلاصہ یہ کہ اس فرق وزیادتی پر ربا کی تعریف صادق نہیں آتی، لہٰذا اس کو ربا کہنا درست نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ربا کے مسائل میں انتہائی احتیاط کے باوجود اکثر حضرات نے اس صورت کو درست قرار دیا ہے۔

۱- ادھار سامان کی قیمت زیادہ رکھنا:

یہ درست ہے کہ ایک سامان کی نقد فروخت کی صورت میں قیمت کم اور ادھار میں زیادہ رکھی جائے، مگر معاملہ مکمل ہوتے وقت اور جب مجلس عقد ختم ہو فریقین کا کسی ایک معاملہ و پہلو پر متفق ہونا ضروری ہے، یعنی اس کا واضح ہونا کہ خرید و فروخت نقد ہو رہی ہے، یا ادھار، اور یہ کہ سامان کو لینے کی صورت میں متعین طور پر کیا قیمت دینی ہوگی۔

۲- طے شدہ ادھار قیمت کا قسط وار ادا کرنا:

سامان کی جو قیمت طے ہو جائے اس کی یکمشت ادائیگی ضروری نہیں ہے، اس کو حسب سہولت و معاملہ چند حصوں وقسطوں میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

۳- معاملہ کا اختتام اور گفتگو کی تکمیل ایک قیمت کی تعیین پر ضروری ہے:

اس معاملہ کی صحت کے لیے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ صرف ادھار قیمت ذکر کی جائے۔ اگر چہ بہتر یہ ہے کہ آدمی اسی طرح کے کاروبار کا نظام بنالے، جیسا کہ آج کل رواج بھی ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگ نقد معاملہ کرتے ہی نہیں، نیز ادھار اور قسط وار معاملہ رکھتے ہیں۔

البتہ یہ ضروری ہے، جیسا کہ اوپر آچکا ہے کہ معاملہ کسی ایک حال اور اس کی قیمت کے طے کرنے پر ختم کیا جائے، یعنی بات اس پر ختم کی جائے کہ یہ سامان ادھار ہی خرید اجائے گا، لہٰذا اس کی کل یہ قیمت ادا کرنی ہوگی اور اس کی یہ مدت ہوگی۔

۴- ادھار میں قیمت کی زیادتی اور ربا کا شبہ:

جب ایک سامان کو ادھار بیچا یا خرید اجائے، اور محض اس کی وجہ سے اس کی قیمت نقد سے زیادہ رکھی جائے تو ربا و سود کا شبہ ہوتا ہے، اس لیے کہ زائد قیمت وقت کا معاوضہ و عوض محسوس ہوتی ہے، مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت پر ربا کی تعریف صادق نہیں آتی، تفصیل گزر چکی ہے۔

۵- ادھار فروخت میں الگ الگ مدت پر قیمتوں کا فرق:

اگر ادھار فروخت کرنے والا قسطوں و مدت ادائیگی کی کئی صورتیں تجویز کرے اور ہر صورت کی قیمت الگ الگ رکھے، تو یہ معاملہ بھی درست ہے، بس یہ کہ مجلس عقد میں وضاحت ہو جانی چاہیے کہ خرید و فروخت کس صورت اور مدت و قیمت پر ہو رہی ہے؟

معاصر اہل نظر فقہاء اس کی اجازت دیتے ہیں اور جب ایک ہی صورت و مدت و قیمت والے معاملہ پر ربا کی تعریف صادق نہیں آتی تو اس پر بھی صادق نہیں آئے گی، کہ ربا کی حقیقت میں صرف وقت و مدت کا دخل نہیں ہوتا۔

۶، ۷- طے شدہ مدت واقساط میں تاخیر پر رقم کا اضافہ:

معاملہ میں جو مدت و قیمت طے ہو جائے اور اقساط مقرر ہوں، اس میں کسی طرح کی تاخیر کی وجہ سے مزید کسی رقم کا مطالبہ و معاملہ سود قرار پائے گا۔

۸- قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے ذرائع میں رہن:

(الف)..... مال مرہون سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، یہ ربا کے تحت آجاتا ہے، اس لیے کہ قرض وادھار رقم کے ماسوا یہ نفع ہے، خواہ راہن کی اجازت سے ہو، یا اس کے بغیر، اس لیے کہ اجازت رواج کی وجہ سے اور طیب خاطر کے بغیر ہوتی ہے۔

(ب)..... اگر مال مرہون بائع کے پاس رہتے ہوئے ضائع ہوجائے تو جو حکم معروف ہے، اس کے مطابق معاملہ ہوگا، یعنی قرض ومال مرہون کی مالیت اگر برابر تھی تو معاملہ برابر سرابر قرار پائے گا، اور اگر مال مرہون کی مالیت کم تھی تو قرض کی باقی مالیت ادا کرنی ہوگی، اور اگر مال مرہون کی مالیت زائد تھی تو مرتہن یعنی بائع پر اس کا کوئی ضمان نہیں ہوگا، اس لیے کہ زیادتی امانت تھی، بشرطیکہ اس کی طرف سے کوئی تعدی وحرکت نقصان پہنچانے والی نہ پائی جائے، ورنہ اس کو ضمان ادا کرنا ہوگا۔

(ج)..... خریدار کی ٹال مٹول پر حسب معاہدہ سامان کو فروخت کر کے بائع اپنا حق وقرض وصول کرلے۔

۹- فروخت کردہ سامان کو بائع کا روکنا تاکہ قیمت وصول کر سکے:

چونکہ گفتگو ادھار خرید وفروخت کے متعلق ہے، یعنی یہ کہ سامان کو نقد ادا کیا جاتا ہے، اور قیمت ادھار ادا کی جاتی ہے، یہ معاملہ ہوتا ہے، اس لیے معاملہ کی صحت کے لیے خریدار کا خرید کردہ مال پر قبضہ ضروری ہے، ورنہ یہ معاملہ اس لیے صحیح قرار نہ پائے گا کہ قیمت تو ادھار ہی طے کی گئی مبیع وسامان بھی ادھار کردیا گیا، اور خرید وفروخت میں جانبین سے ادھار کا معاملہ منع ہے، اس کو فقہاء بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں، یہ بالاتفاق منع وناجائز ہے۔ (الفقہ الاسلامی ۴/۴۳۲)

خریدار کے قبضہ کرلینے کے بعد ہی کوئی صورت سوچی جاسکتی ہے، اس لیے بائع یہ نہیں کرسکتا کہ محض اپنا حق وقیمت وصول کرنے کے لیے مبیع کو خریدار کے سپرد نہ کرے، اور اپنے پاس روک لے، اور اگر اس سامان کو رہن کی حیثیت سے رکھنا چاہے، تب بھی درست نہیں ہے، اس لیے کہ مال مرہون، راہن کی ملکیت ہوتا ہے، یہاں راہن خریدار ہوگا، اور خریداری نیز ملکیت خریدار کے قبضہ کے بعد ہی ثابت ہوگی، اس کے بغیر نہیں، بلکہ قبضہ کے بغیر رہن بنانا تو اس کو اوپر والی صورت کے تحت داخل کردے گا، جس کی بابت (عالمگیریہ ۳/۱۵، شامی ۴/۵۶۰) وغیرہ میں صراحت ہے کہ نقد بیع میں تو فروخت کنندہ کو یہ حق حاصل ہے کہ فروخت کردہ مال کو قیمت وصول کرنے کے لیے اپنے پاس روک لے لیکن ادھار فروخت میں کسی طرح یہ حق نہیں ہے۔

البتہ اگر خریدار قبضہ کرلے، اس کے بعد رہن بنانے کی بات اختیار کی جائے تو درست ہے، حتی کہ اگر صلب عقد میں اس کی شرط لگائی جائے کہ سامان پر قبضہ کے بعد اس کو بغرض رہن فروخت کنندہ کے سپرد کرنا ہوگا تو بھی اکثر حضرات کے نزدیک درست ہے۔

بعد القبض وقبل القبض رہن بنانے کے جواز وعدم جواز کی وضاحت وصراحت تفصیل سے درمختار وشامی میں آئی ہے۔

(شامی ۶/۴۹۶ وہدایہ والکفایہ مع الفتح ۹/۹۸، ۹۹ والبحر الرائق ۸/۲۵۲)۔

حتی کہ اگر صلب عقد میں رہن کی شرط کا تذکرہ ہو تو بھی درست ہے، یہ مسئلہ شامی وہدایہ وغیرہ میں بھی اوپر والے مسئلہ سے متصل مذکور ہے، البتہ اس میں مبیع کو رہن بنانے کی شرط نہیں ہے، بلکہ یہ کسی متعین چیز کو رہن بنائے گا یہ شرط لگائی جائے (شامی ۶/۴۹۷، وہدایہ ۹/۹۹ ودرالحکام ۲/۲۵۳) تو متعین چیز خرید کردہ سامان بھی ہوسکتا ہے۔ البتہ المغنی (فی الفقہ الحنبلی) میں مبیع کو رہن بنانے کی شرط کا اور حنابلہ وغیرہ کے یہاں اس کے جواز کا تذکرہ آیا ہے (المغنی)

ضرورت وتعامل کی صورت میں اس رائے کو اختیار کیا جاسکتا ہے پھر یہ کہ فقہ حنفی میں بظاہر کہیں اس کا عدم جواز منقول نہیں ہے، بلکہ فقہاء احناف کی تصریحات جواز کی تائید میں ہیں۔ جیسے غیر مبیع کو رہن بنانے کی شرط ہوسکتی ہے، یہ معاملہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیع کو مکمل کرنے کے بعد مبیع کو رہن رکھ دیا جائے گا، یعنی مبیع پر قبضہ کرلینے کے بعد، عالمگیریہ کے ایک جزئیہ میں مبیع کو رہن بنائے جانے کا تذکرہ یوں آیا ہے۔

''لو دفع المشتری إلی البائع عینا تکون رہنا عندہ مع المبیع بالثمن ہلک العین بحصتہا، کذا فی التتارخانیۃ''
(عالمگیریہ ۵/۴۳۸)۔

قیمت کے بالمقابل رہن کی شرط لگانے اور اس کے جواز کا تذکرہ بدائع (۵/۱۷۱) اور مبسوط (۱۲/۱۸) وغیرہ میں بھی آیا ہے، ویسے اس مسئلہ میں کچھ تفصیل بھی ہے، بعض صورتیں جواز کی اور بعض عدم جواز کی ذکر کی گئی ہیں (ملاحظہ ہوں سابق حوالہ جات نیز الفقہ الاسلامی ۴/۴۷۷-۴۷۹)۔

''المغنی'' کی عبارت میں عدم جواز کے قول میں یہ بات آئی ہے کہ صلب عقد میں اگر مبیع کو رہن بنانے کی شرط لگائی جائے تو معاملہ یہ ہے کہ مال بوقت عقد تو

خریدار کا مملوک نہیں تو اس کو کیسے رہن بنایا جاسکتا ہے، لیکن معاملہ یہ ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے یہ نفاذ رہن کی شرط ہے بس، رہن کے جواز وصحت کی شرط نہیں ہے، اس لیے بعض صورتوں میں اصل مالک کی اجازت کے بغیر بھی اس کا سامان رہن رکھا جاسکتا ہے۔ (شامی ۶/ ۵۱۳ وغیرہ)

لہذا ایسے مشروط معاملہ کے تحت رہن کا معاملہ موقوف رہ کر ثابت ہوگا۔ اور خرید وفروخت کا معاملہ مکمل ہوجانے کے بعد جب شرط کے مطابق رہن کے لیے لین دین ہوگا تو رہن کا معاملہ بھی صحیح ونافذ قرار پائے گا۔

۱۰- جملہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں ادا کردہ اقساط وسامان کا ضبط کر لینا:

فریقین کے درمیان خرید وفروخت کا معاملہ مکمل ہوجانے کے بعد سامان خریدار کا ہوگیا، اب فروخت کنندہ کا حق طے شدہ قیمت ہے، جب خریدار ادا کرے اور ادائیگی کو مکمل کرے، وقت مقرر پر ادائیگی مکمل نہ کرنے کی صورت میں فروخت کنندہ یا تو سامان کو واپس لے لے، اور حاصل کردہ رقم واپس کردے، یا حاصل کردہ رقم کو لے لے اور سامان کسی تیسرے کے ہاتھ فروخت کرکے اپنی باقی رقم لے لے، اور جو بچے وہ خریدار کو دے کہ اس کا حق ہے، سامان کو واپس لینے کی صورت میں یہ بھی درست ہے کہ بوقت فروخت اس کی جو حیثیت تھی اگر اس عرصہ میں استعمال وغیرہ کی وجہ سے اس میں فرق وکمی واقع ہوئی ہے تو اس کی رعایت کی جائے، اور سامان کے ساتھ بقدر کمی رقم ادا کی جائے یا ادا کردہ اقساط سے کاٹ لی جائے (اس لیے کہ یہ معاملہ اقالہ کا ہوگا۔ اور اقالہ اگرچہ اصل ثمن وقیمت پر ہوتا ہے، مگر عیب کی صورت میں کمی کی جاسکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو شامی ۵/ ۱۲۶)۔

لیکن مروج صورت کہ ادا کردہ اقساط اور سامان دونوں کو فروخت کنندہ لے لیتا ہے، یہ کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا "امداد الفتاوی" میں ایک جواب اسی انداز کی صورت کا یہ آیا ہے:

معاملہ مذکورہ ناجائز ہے، مگر ناجائز ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ ادھار میں قیمت زیادہ لے لی، کیونکہ نسیہ میں بہ نسبت نقد زیادہ قیمت لے لینا، جبکہ مجلس عقد میں نقد یا ادھار ہونا متعین ہوجائے جائز ہے، بلکہ ناجائز ہونے کی وجہ دوسری ہے، وہ یہ کہ یہ معاملہ یا بیع ہے یا اجارہ (اگر ماہانہ قسط کے لیے عنوان کرایہ کا اور اخیر میں بیع کا کیا جائے جیسا کہ صورت مسئولہ میں سائل نے ذکر کیا ہے) اگر بیع ہے تو یہ شرط فاسد ہے کہ ادنی جزو قیمت رہ جانے پر واپس کرلیں گے، اور ادا شدہ رقم کو کالعدم سمجھا جائے گا اور اگر اجارہ ہے تو یہ شرط فاسد ہے کہ زر کرایہ کے عوض میں بیع کردیں گے۔ (امداد الفتاوی ۳/ ۱۲۲)

۱۱- خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس رہن قرار دینا:

خرید کردہ سامان کو اگر خریدار کے قبضہ میں لے لینے کے بعد پھر فروخت کنندہ بعنوان رہن واپس لے لے جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ رہن کا معاملہ خریدار اور فروخت کنندہ کے قبضہ کے بعد ہی صحیح ہوگا، اور اس کے بعد پھر وہ خریدار کے قبضہ وتصرف میں دے دے، جس کے لیے عاریت کا ہی عنوان ہوسکتا ہے تو درست ہے، فقہاء نے رہن کے تصرفات میں عاریت کا ذکر کیا ہے۔ (شامی ۶/ ۵۱۱)۔

لیکن اگر فروخت کنندہ نے قبضہ نہیں کیا اور خریدار کے قبضہ میں رہتے ہوئے اس کو رہن قرار دیا گیا، تو یہ معاملہ درست نہیں ہے کہ اگر فروخت کنندہ نے فروخت کرنے کے بعد اپنے قبضہ میں رکھتے ہوئے اس کو رہن بنایا تو درست نہیں تھا، جس مال کو رہن قرار دیا جائے ضروری ہے کہ مرتہن (رہن بنانے والا) اس کو اپنے قبضہ میں لے، ورنہ رہن کا انعقاد نہیں ہوتا۔ (عالمگیریہ ۵/ ۴۳۳)

نیز شامی وغیرہ میں بھی قبضہ کا تذکرہ آیا ہے اور یہ کہ قول راجح میں لزوم رہن کے لیے قبضہ ضروری ہے (شامی ۶/ ۴۷۹، البدائع ۶/ ۱۳۷)

اور پہلی شق میں جبکہ فروخت کنندہ قبضہ میں واپس لے کر پھر خریدار کو دے اور رہن قرار دے تو یہ معاملہ صحیح ہے، لیکن اس کے نتیجے میں مال، فروخت کنندہ کے ضمان سے باہر ہوجائے گا، اور اگر خریدار کے پاس رہتے ہوئے ضائع ہوا تو وہ معاملہ نہیں ہوگا جو مال مرہون کے مرتہن (رہن بنانے والے) کے پاس رہتے ہوئے ضائع ہونے کی صورت میں ہوتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے۔

اور جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ از روئے حکم اس صورت معاملہ کے لیے عاریت کی تعبیر ہوگی، نہ کہ رہن کی، اگرچہ عرف اس کو رہن کہتا ہو۔ عاریت اس لیے ہے کہ جو مال مرتہن (رہن بنانے والے) کو اپنے پاس رکھنے کا حق تھا وہ اس نے خریدار کو بغرض استعمال دیدیا ہے اور خریدار اگرچہ اس کا مالک ہے، مگر صرف استعمال و انتفاع کا حق رکھتا ہے، فروخت وغیرہ کا نہیں، بلکہ اس کی پابندی ہے، اس لیے اس کو اصطلاح میں رہن کا عنوان دیدیا گیا ہے کہ رہن میں مرتہن کو فروخت وغیرہ کا حق نہیں ہوتا۔

اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ آج کل فروخت کنندہ کے قبضہ کے بغیر خریدار کے پاس مال کو رہن قرار دینے اور ماننے کا رواج ہو گیا ہے، اور فقہاء اس کو درست قرار نہیں دیتے، تو یا تو مذاہب اربعہ میں کوئی قول گنجائش کا مل جائے تو اس کو اختیار کیا جائے تعامل کی وجہ سے۔ ورنہ مولانا تقی صاحب نے جو بعض توجیہات ذکر کی ہیں جن کا مبنی ضرورت و تعامل ہے، ان کی بنیاد پر اس کے جواز کو اختیار کیا جائے، جیسا کہ خود مولانا کا رجحان ہے جن میں نہایت مناسب توجیہ خرید کردہ شئے سے متعلق کاغذات کو فروخت کنندہ کے پاس رہن قرار دینا ہے کہ وہ ان کاغذات کو اپنے پاس رکھے اور انکی بنا پر خریدار کو پابند بنائے اور بنایا بھی جاتا ہے، آج کل اس طرح کے معاملات گاڑیوں اور مشینریوں وغیرہ میں ہوتے ہیں جن کے کاغذات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اور آج کل تو ایسے کاغذات ہی کی خرید و فروخت کو اہمیت حاصل ہے، اور ان کو سرمایہ واثاثہ کی حیثیت دی جاتی ہے، بلکہ بینک وبعض ادارے، بکثرت زمین مکان وکھیت وغیرہ کی بنیاد پر قرض دیتے ہیں، اور ان کے کاغذات اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں، تصرف خود مالک کا برقرار رہتا ہے، اور تعلیمی اسناد کو رہن بنا کر ان کی بنیاد پر قرض دیا جاتا ہے، اس لیے یہ بنیاد وجہت توجیہ کی رو سے قوی ہے اور بظاہر دوسرے مذاہب وائمہ کا کوئی قول ایسا نہیں کہ جس کو گنجائش کی بنیاد بنایا جاسکے۔

۱۲- کریڈٹ لیٹر اور ضمانت کی اجرت:

کفالت وضمانت وغیرہ، تبرعات کے قبیل سے ہیں، ان پر کسی طرح کا معاوضہ لینا منع ہے۔ مولانا تقی صاحب نے اپنے مقالات میں اس پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔

لیکن معاملہ وہی ہے کہ آج کل یہ تعامل ہو چکا ہے، اور اس درجہ کہ یہ چیز ایک مستقل کاروبار بن گئی ہے، بینک تو یہ کام کرتے ہیں، اس کے لیے الگ سے ادارے بھی قائم ہونے لگے ہیں، اس لیے ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ اس کا کوئی حل پیش کیا جائے۔

مولانا تقی صاحب کی رائے میں اس کام کی انجام دہی کے واقعی مصارف واخراجات لیے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ اس کے مخصوص کاغذات تیار کیے جاتے ہیں، اس میں وقت لگتا ہے، افراد مشغول رہتے ہیں تو نفس ضمانت وکفالت کی نہیں، بلکہ اس محنت کی اجرت لی جاسکتی ہے۔

اور ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ادارے اگر اس غرض سے کوئی سرٹیفکیٹ تیار کرائیں اور اس کی ایک مالیت طے کر دیں تو اس کی قیمت کی حیثیت سے جو عوض لیا جائے وہ درست ہوگا، اور اس سے ادارے نیز بینک کے ایسے عملے کے اخراجات بھی پورے ہوں گے اور مقصد بھی حل ہو سکے گا۔

۱۳- ادھار خرید و فروخت کے کاغذات ودستاویز کی خرید و فروخت:

قسط وار ادھار خرید و فروخت کی صورت میں فروخت کنندہ کبھی یہ معاملہ کرتا ہے کہ معاملہ کے کاغذات کسی تیسرے شخص کو دے کر اس سے رقم حاصل کر لیتا ہے، ایسا کبھی وہ ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اور کبھی طے شدہ وقت سے پہلے اپنی رقم حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، اور یہ معاملہ طے شدہ قیمت سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے کہ تیسرے فریق کو اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ یہی طے شدہ قیمت اور اس کی طرف سے ادا کردہ رقم کے درمیان فرق کا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب دو آدمیوں کے درمیان معاملہ مکمل ہو چکا ہے، اور فروخت کنندہ خریدار پر واجب الادا قیمت ورقم کو وصول کرنے کے لیے تیسرے سے معاملہ کرتا ہے، تو یہ معاملہ اصولی طور پر حوالہ کا ہے، کہ میرا قرض جو فلاں پر ہے وہ تم اس سے وصول کر لینا اور فی الحال مجھ کو اپنے پاس سے ادا کر دو اور حوالہ میں ضروری ہے کہ کسی طرح کی کمی بیشی کا معاملہ نہ کیا جائے، اس لیے مروج معاملہ درست نہیں ہے، اور اگر اس کو بیع قرار دیں تو اس میں کرنسی کی کرنسی سے بیع ہوگی، اور کمی بیشی کے ساتھ یہ بھی درست نہیں ہے، یا ایک شق اور نکلتی ہے، وہ ہے بیع الدین من غیر من علیہ الدین، یعنی جس آدمی پر کوئی حق واجب ہے، وہ حق اس کے ہاتھ فروخت نہ کر کے کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا، یہ بھی درست نہیں ہے۔

ہاں ایک صورت اس کو درست کرنے کی یہ ہے کہ معاملہ خرید و فروخت کے عنوان سے ہونے کے بجائے اجارہ کے عنوان سے یوں ہو کہ مقررہ رقم کا ایک حصہ کرایہ کا قرار دیا جائے، اور اس کے عوض تیسرے شخص کو اس قرض کے وصول کرنے کا ذمہ دار بنایا جائے، اور فی الحال فروخت کنندہ اپنے حق وحصے کے بقدر تیسرے سے قرض لے لے، اور معاملہ یہ کرے کہ رقم وصول کرنے پر مجرا کر لینا۔ یہ صورت مولانا تقی صاحب نے ذکر کی ہے، اور اس قسم کے معاملہ میں دیگر حضرات کے یہاں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے (فقہی مقالات ص ۹۹، ۱۰۰ وامداد الفتاوی ۳/ ۳۲۲) بلکہ ''امداد الفتاوی'' میں ایک سوال، سوال بالا وصورت بالا کے مطابق بھی آیا ہے اور جواب ممانعت کا ہے اور پھر صورت وحل (امداد الفتاوی ۳/ ۱۶۹)

مگر یہ معاملہ کا حل نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں اصل فروخت کنندہ قرض لینے والا اور تیسرا شخص قرض دینے والا، یعنی معاملہ قرض کا بن رہا ہے اور عین

ممکن ہے کہ تیسرا شخص یہ رقم خریدار سے وصول نہ کر سکے تو کیا حکم ہوگا؟ کیا فروخت کنندہ سے وہ ادا کردہ رقم (جس کو قرض کہا گیا) وصول کرے گا، جبکہ مروج معاملہ یہ ہے کہ فروخت کنندہ اس معاملہ کے بعد بالکل دست بردار و بری ہو جاتا ہے، اور تیسرا شخص بھی معاملہ اسی بنیاد پر اور یہ سمجھ کر کرتا ہے، تو قرض تو اس کو واپس ملنا چاہیے (امداد الفتاوی کے حاشیہ میں اس کی صراحت آئی ہے کہ وصول نہ ہونے پر قرض ادا کرنا ہوگا۔ ۳/ ۳۲۲)

احسن الفتاوی میں بھی توجیہ مذکور کے ساتھ یہ بات ذکر کی گئی ہے (احسن الفتاوی ۷/ ۱۷۶)۔

اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ ''الفقہ الاسلامی'' میں لکھا ہے:

''لا يجوز تمليك الدين من غير من عليه الدين كأن يشتري إنسان فرس زيد مثلا بمئة ليرة على عمرو؛ لأنه لا يقدر على تسليمه إلا في ثلاث صور:

الأولى: إذا سلطه على قبضه فيكون وكيلا قابضا للمؤكل ثم لنفسه، الثانية: الحوالة، الثالثة: الوصية''

(الفقہ الاسلامی ۴/ ۴۱۲، ۴۱۳)۔

(دین کا مالک کسی ایسے شخص کو نہیں بنایا جا سکتا کہ جس پر دین کا وجوب نہ ہو، مثلاً ایک آدمی نے زید کا گھوڑا خریدا اور کہا کہ میرے سو روپے عمرو پر ہیں ان کے بدلے میں دے دو، یہ اس لیے درست نہیں کہ اس آدمی کو اس پر قدرت نہیں کہ طے شدہ قیمت وہ زید کو پہونچائے، ہاں تین صورتیں دوسرے کو ذمہ دار بنانے کی ہیں:

ایک تو یہ کہ اس کو اپنا وکیل بنا دے تو وہ اولا اس کی طرف سے وصول کرے گا، اور پھر اپنے لیے قبضہ کرنے والا مانا جائے گا دوسرے حوالہ اور تیسرے وصیت)۔

اب صرف ''بيع الدين من غير من عليه الدين'' کی ہی ایک شق ہے کہ اگر اس میں بعض ائمہ کے یہاں گنجائش ہو تو یہ مروج معاملہ درست قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بطور دین جو چیز و رقم جس شخص پر واجب ہے، اس کے بجائے کسی دوسرے کو معاملہ کر کے اس کا مالک بناؤ یا جائے جس میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کے ہاتھ اس قرض کو فروخت کر کے اس کی قیمت اس سے نقد وصول کر لی جائے وہ خود بعد میں حسب معاملہ اصل خریدار سے اپنا حق وصول کرے گا، اور صورت حال کے واضح ہونے کی وجہ سے، فروختگی کا معاملہ کرنے والا یعنی اصل دائن و بائع جس نے سامان بیچا تھا، وہ دستاویز کو فروخت کرنے کے بعد کسی طرح کا ذمہ دار نہیں رہ جائے گا، دستاویز کی رقم اس معاملہ کرنے والے کو حاصل ہو، نہ ہو، اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، اس میں غرر و ضرر کا پہلو ضرور موجود ہے، مگر خود معاملہ کرنے والا اس کے تحمل کو تیار ہے تو بائع کی کیا ذمہ داری۔ چنانچہ بعض ائمہ کے یہاں اس کی اجازت ہے جیسا کہ ''الفقہ الاسلامی'' میں بحوالہ ''المہذب واعلام الموقعین'' وغیرہ نقل کیا ہے (الفقہ الاسلامی ۴/ ۴۳۵، ۵۰۴، المہذب ۱/ ۲۶۲ واعلام الموقعین ۱/ ۳۸۸ وشرح المہذب ۹/ ۲۷۲ و ۲۷۳، ۲۷۵)۔ مگر اس کے جواز میں ان حضرات کے یہاں بہت سی قیدیں ہیں جن کا مذکورہ معاملہ میں تحقق نہیں، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اگر اس کو بیع قرار دیتے ہیں تو یہ کرنسی کی کرنسی سے بیع ہو گی جس میں ادھار کی بھی خرابی ہے اور کمی وبیشی کی بھی، جیسا کہ مولانا رشید احمد صاحب نے بھی ایک موقع پر ذکر فرمایا ہے (احسن الفتاوی ۷/ ۱۷۶)۔

امام محمد نے موطا میں اس قبیل کی بعض چیزوں کے ذکر کے بعد فرمایا ہے:

''لا ينبغي للرجل إذا كان له دين أن يبيعه حتى يستوفيه؛ لأنه غرر، فلا يدري أيخرج أم لا يخرج، وهو قول أبي حنيفة''

(موطا، کتاب الصرف، اعلاء السنن ۱۴/ ۲۴۱)

حنفیہ کے یہاں صک وغیرہ کی بیع کا جو مسئلہ آیا ہے جس پر مولانا ظفر احمد صاحب نے تفصیل سے کلام کیا ہے (اعلاء السنن ۱۴/ ۲۳۹۔ ۲۴۶) اس کے تحت بھی کوئی قول اور وسعت نہیں نکل سکی۔

۱۴، ۱۵۔ ''ضع وتعجل'' کا معاملہ یعنی قرض کی فوری ادائیگی کا مطالبہ تخفیف کے ساتھ:

ادھار معاملات میں اب بالخصوص بکثرت یہ ہوتا ہے کہ دائن اور مال کا فروخت کنندہ، مدیون وخریدار سے اپنے دین و رقم کی فوری ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کو یہ چھوٹ وسہولت دیتا ہے کہ واجب الاداء رقم کا اتنا حصہ کم کر دو، اس کی دو صورتیں بنتی ہیں:

ایک یہ کہ دین مؤجل ہے، یعنی اس کے ادا کرنے کی کوئی مدت ووقت مقرر ہے، اور پھر یہ معاملہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ صرف بعد میں دینا طے ہوا ہے، مگر کوئی وقت مقرر و طے نہیں ہے۔

اسی طرح یوں بھی دو صورتیں بنتی ہیں: ایک یہ کہ قرض کا معاملہ ہو، یعنی روپے پیسے ادھار لینے کا، اور دوسرے یہ کہ کسی دوکاندار و تاجر سے کوئی سامان ادھار لینے اور اس کی قیمت کا۔

اگر دین مؤجل نہیں ہے یعنی اس کی ادائیگی کا وقت مقرر نہیں کیا گیا، بلکہ صرف بعد میں دینے کی بات ہے تو اس میں اس کی اجازت ہے، مولانا تقی صاحب کے بیان کے مطابق مالکیہ کے یہاں اس کی صراحت ہے، اور دوسرے حضرات کی عبارات کی دلالت ہے۔

اس طرح اگر معاملہ قرض روپے ادھار لینے کا ہے، تو اس میں بھی یہ اس بنا پر جائز ہے کہ قرض میں دائن (قرض دینے والے) پر تاجیل (مقررہ مدت) کی پابندی لازم نہیں ہے، بلکہ وہ بغیر تعیین مدت اور طے شدہ مدت کے لزوم کے بغیر دیا لیا جاتا ہے، کسی بھی وقت دائن اس کو مانگ سکتا ہے، لہٰذا معاملہ اس دین کا ہوا جو مؤجل نہیں، اکثر فقہاء کے یہاں قرض کی یہی حیثیت ہے۔ مالکیہ کا اختلاف ہے، اور اکثر حضرات کی رائے کے مطابق اس امر کا جواز بخاری وغیرہ کی بعض روایات سے ہے۔

مولانا تقی صاحب کے علاوہ، دیگر بعض معاصر اکابر ارباب افتاء نے بھی اسی امر کو اختیار کیا ہے جیسے مفتی رشید احمد لدھیانوی۔

ہاں دین کے مؤجل ہونے کی صورت میں یہ درست نہیں ہے، ائمہ اس پر متفق ہیں اور ان حضرات نے بھی صراحت کی ہے، اور از خود بغیر شروط و مطالبہ پیشگی ایسا کرنا بالاتفاق درست ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: فقہی مقالات ۱/ ۱۰۰ تا ۱۱۴، واعلاء السنن ۱۴/ ۳۵۰۔ ۳۵۴، ۵۰۸، ۵۱۴، واحسن الفتاوی ۷/ ۱۸۰۔ ۱۸۴)

دین مؤجل کی صورت میں اس معاملہ کی بابت مولانا تقی صاحب نے دو متعارض روایات کا تذکرہ کیا ہے، اور دونوں کو ضعیف بتایا ہے، جیسا کہ بیہقی کی صراحت ہے، اور کچھ اور تفصیل بھی کی ہے، مگر مولانا ظفر احمد صاحب نے مستدرک حاکم وغیرہ کے واسطہ سے جواز وثبوت کی روایت کی تقویت ذکر کی ہے، اور نہی کی روایت کی بھی، اور اس مضمون کی دیگر روایات بھی ذکر کی ہیں (ملاحظہ ہو: اعلاء السنن ۱۴/ ۳۵۱)۔

البتہ چونکہ ایک جماعت دین مؤجل میں بھی اس کو جائز کہتی ہے جن میں امام زفر بھی شامل ہیں، اس لیے تعامل عام کی صورت میں اس قول کی وجہ سے گنجائش نکل سکتی ہے، اور بظاہر تعامل مفقود ہے۔

۱۶- ادائیگی قسط میں تاخیر پر فوری مطالبہ:

قسط وار معاملہ کا خریدار ہر قسط کو وقت پر ادا کرنے کا مکلف و پابند ہے، اگر وہ تاخیر کرے تو اس کو گوارا کرنا ہوگا، معاملہ میں تاجیل اور وقت کی تعیین کی صراحت کی وجہ سے دونوں ہی پابند ہیں۔ اور فروخت کنندہ کو وقت سے پہلے مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، لہٰذا تاخیر کی وجہ سے تاجیل کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ اگر معاملہ میں بطور شرط یہ بات شامل ہے کہ کسی قسط کی تاخیر کی صورت میں تاخیر و تاجیل کی سہولت ختم ہو جائے گی اور فوری ادائیگی لازم ہوگی تو مہلت ختم کرنا اور فوری مطالبہ درست ہے، چنانچہ متعدد فقہاء احناف نے اس کی صراحت کی ہے۔ (خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴، فقہی مقالات ص/ ۱۱۸۔ ۱۲۰)۔

۱۷- قسط وار خرید و فروخت پر انعامی اسکیم:

قسط وار خرید و فروخت کے نظام میں انعامی اسکیموں کا جو رواج ہے کہ ہر قسط کے موقع پر یا مناسب مدت پر بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیے جاتے ہیں، اور یہ سلسلہ معاملہ مکمل ہونے تک چلتا رہتا ہے اس بابت قسط وار معاملات اور دوسرے معاملات میں بظاہر فرق نہیں ہے کہ عام خرید و فروخت میں انعامی کوپن و اسکیم کو اختیار کیا جائے، مفتی شفیع صاحب نے فرمایا ہے کہ ایسے معاملات میں حکم مقصد پر لگے گا، ایک آدمی سامان ہی کو مقصد بناتا ہے، انعام ملا تو ٹھیک ورنہ اہمیت نہیں تو درست ہے، اور ایک محض انعام کی وجہ سے اس کو سوچتا ہے، اور اس کو مقصد و اہم قرار دیتا ہے تو قمار ہے اور منع ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۳۴۵)۔

۱۸- ہر قسط پر انعامی اسکیم کے ذریعہ بعض ممبران و خریداران کی معاملہ سے علیحدگی:

ایک دوسری شکل یہ بھی چل پڑی ہے کہ ہر قسط کے موقع پر قرعہ اندازی کی جائے اور جس کا نام نکل آئے اس کو سامان اسی رقم کے عوض دے دیا جائے، جواب تک اس نے ادا کی ہے اور مزید کوئی قسط و رقم اس پر لازم نہ کی جائے، یہ معاملہ درست نہیں ہے، قمار کے تحت داخل بلکہ کھلا ہوا جوا ہے۔

☆☆☆

بیع بالتقسیط - فقہی نقطۂ نظر

مولانا زبیر احمد قاسمی [1]

۱- سامان کو ادھار فروخت کرنے کی صورت میں اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں زیادہ رکھنا تراضی طرفین کے ساتھ جائز ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں:

''لأن للأجل شبها بالمبيع ألايرى أنه يزاد فى الثمن لأجل الأجل'' (ہدایہ ثالث/۷۶ باب المرابحہ والتولیہ)۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت اور قسطوں میں، دونوں طرح جائز ہے۔ اب جو بھی صورت تراضی طرفین سے بوقت عقد طے ہوجائے اس کی پابندی ورعایت فریقین پر لازم ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں کہ ''المسلمون على شروطهم'' (مشکوۃ کتاب البیوع رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ وترمذی) حدیث پاک کی ہدایت ہے۔

۳- ادھار فروختگی کے وقت اگر بائع قیمت تو دونوں بیان کردے کہ ادھار قیمت اتنی، اور نقد قیمت اتنی، مگر معاملہ کا ایجاب وقبول قطعی انداز سے صرف کسی ایک ہی قیمت پر متعین کر کے ہو تو معاملہ جائز ہوگا، لیکن اگر ادھار ونقد دونوں قیمت کے درمیان تردد کرتے ہوئے ایجاب وقبول ہوگا تو پھر جہالت ثمن کی وجہ سے یہ معاملہ صحیح نہ ہوسکے گا۔

۴- ادھار فروختگی کے وقت، نقد قیمت کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی: اولاً محض صوری اور ظاہری زیادتی ہے ورنہ ''للنقد مزية على النسيئة'' کے معروف اصول کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ درحقیقت حکماً دونوں قیمتیں برابر ہی ہیں۔

ثانیاً یہ زیادتی گو بظاہر وقت واجل کا عوض معلوم ہوتی ہے، لیکن فقہاء لکھتے ہیں: ''لأن للأجل شبها بالمبيع'' اس طرح یہ زیادتی شبہ مبیع کا عوض ہوتی ہے نہ کہ وقت اور اجل محض کا۔

ثالثاً عوض اجل وہاں ربوا بن جاتا ہے جہاں کسی مدیون سے اجل ومہلت کے عوض قدر دین سے زائد لیا جائے، یہاں بوقت عقد کوئی کسی کا مدیون نہیں ہوا کرتا اور نہ کسی سابق قدر دین میں مہلت دے کر اضافہ کیا جاتا ہے، اس لیے ادھار قیمت کی زیادتی پر شبہ ربوا، محض وہم ہے۔

۵- ادھار فروختگی کے وقت قسطوں میں ثمن کی ادائیگی کے لیے دو مدتیں بیان کرتے ہوئے ایک مدت قصیر میں مال کی قیمت کم، اور دوسری مدت طویل میں مال کی قیمت زیادہ ہونے کا بھی تذکرہ کردے مگر معاملہ کا ایجاب وقبول تراضی طرفین کے ساتھ صرف کسی ایک ہی صورت کے قطعی تعین کے ساتھ ایک قیمت اور ایک مدت پر ہی ہو تو پھر یہ صورت معاملہ بھی جائز ہے، کیونکہ ثمن واجل دونوں معلوم ہیں۔

۶- کسی سامان کی خرید وفروخت جب مثلاً دس روپے کے عوض تراضی طرفین سے ہوجائے، اور اس کے ساتھ یہ بات بھی طے پائے کہ اس دس روپے ثمن کی ادائیگی ایک ماہ کے اندر کرنی ہوگی تو یہ معاملہ بھی نقد نہیں، بلکہ ادھار ہی کہلائے گا، شرعی اصطلاح میں اسی کو بیع مؤجل کہا جاتا ہے جو یقیناً جائز ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ دوسری شرط لگائی کہ اگر ایک ماہ کے اندر یہ دس روپے ثمن ادا نہیں کیے گئے تو ہر ماہ کی تاخیر پر مزید دو روپے کا اضافہ کرنا ہوگا، یہ شرط جائز نہیں اگرچہ تراضی طرفین بھی ہوجائے، کیونکہ اس شرط کی وجہ سے یہ معاملہ عقد ربا پر مشتمل ہوجائے گا جو قطعاً حرام ہے، اس کی تفصیل اور وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہاں جب دس روپے سامان کی قیمت طے ہوگئی تو مبیع کا کل عوض دس روپے قرار پاگیا، اور عقد کے مؤجل ہونے کے سبب وہ خریدار اس دس روپے ثمن کا مدیون ہوگیا، اب مدیون سے محض وقت ومہلت کے عوض دس روپے سے زائد وصول کرنا ربا ہی کہلائے گا، خوا

---

[1] اشرف العلوم کنہواں، سیتا مڑھی۔

وہ قدر زائد فیصد کے حساب سے ہی ہو۔

۷- یہ سوال، سوال بالا ہی جیسا ہے، اور یہ صورت بھی بیع مؤجل ہی کی ہوتی ہے، اس کا حکم بھی وہی ہے کہ ابتداءً یہ معاملہ صحیح تھا، مگر دوسری شرط کہ وقت مقررہ پر یکمشت یا جملہ قسطیں، یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کچھ رقم ادا کرنی ہوگی، اب اس مقدار زائد کی تعیین کر دی جائے یا فیصد کا حساب رکھا جائے۔ بہرصورت اس دوسری شرط نے اس معاملہ کو ناجائز بنا دیا، وہ مزید رقم بہرحال ایک مدیون مشتری سے قدر دین سے زائد لینا ہوا، جو فضل اور خالی عن العوض ہو کر رباہی بنے گا۔

۸- (الف):......ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے اگر مشتری کا کوئی سامان بائع اپنے قبضہ میں بطور رہن رکھتا ہے تو تراضی طرفین سے یہ بھی جائز ہے، مگر اصح اور مفتی بہ قول کے مطابق اس مرہون سامان سے بائع (مرتہن) کسی بھی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، نہ مشتری (راہن) کی اجازت سے نہ بلا اجازت۔

(ب):......بائع (مرتہن) کے قبضہ میں چونکہ وہ مال مرہون، امانت کے طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے اگر وہ مال بلا تعدی کے ضائع ہو جائے تو بائع کا جو دین مشتری کے ذمہ تھا وہ ادا شدہ بن جائے گا، مگر مشتری ما زاد علی الدین کے بقدر بائع سے مطالبہ کا بھی حق نہیں رکھے گا۔

ہاں اگر بائع (مرتہن) کی لاپرواہی اور تعدی سے وہ مال مرہون ضائع ہوگا تو دین سے زائد اس مال کی جتنی قیمت ہوگی اس کا مطالبہ بائع (مرتہن) سے یقینا کیا جائے گا، لیکن اگر مال مرہون کی کل قیمت قدر دین سے بھی کم ہوگی تو اس قیمت کے بقدر تو بائع کا دین وصول شدہ ہو جائے گا، اس کے بعد باقی ماندہ قدر دین کا مطالبہ پھر مشتری راہن سے کر کے وصول کرے گا۔ (شامی ۵/ ۳۱۰، بحر ۸/ ۲۳۳)

(ج):......اگر خریدار وقت مقررہ پر قیمت نہ ادا کرے، مطالبہ کے باوجود ٹال مٹول کرے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ مال مرہون کو بیچ کر بائع (مرتہن) کا دین ادا کرے، اس پر بھی وہ تیار نہ ہو تو پھر قاضی شریعت، حاکم وقت یا جماعت مسلمین کے ذریعہ اسے فروخت کرا کے بائع اپنا دین وصول کرے گا۔

۹- (الف):......فروخت شدہ سامان کی قیمت کی ادائیگی اگر حالاً و معجلاً طے ہوئی ہے تب تو بائع کو یہ حق ملتا ہے کہ وہ مکمل ثمن کی وصولیابی تک اس فروخت شدہ مال کو اپنے قبضہ میں رکھے (الہندیہ ۳/ ۱۵، ردالمحتار ۵/ ۳۱۷) اور اس کی حیثیت محض، "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" ہی کی ہو گی، اسے رہن نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ رہن عقد تبرع ہے، اس پر مشتری کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، ہاں اگر خود مشتری ہی یہ کہدے (جبکہ بائع اس مبیع کو حوالگی کے لیے تخلیہ اور رفع مانع عن القبض کر چکا ہے) کہ آپ اس سامان کو اپنے پاس ہی رکھیں جب تک کہ میں ثمن ادا نہ کر دوں تو اس صورت میں وہ مبیع بحکم رہن ہو سکتی ہے ورنہ نہیں (ہدایہ ۴/ ۵۱۸)۔

(ب):......"الرهن بالمبيع باطل" (ہدایہ رابع/ ۵۱۰، ۵۱۱، ردالمحتار ۵/ ۳۱۷) تو جب مبیع فی ید البائع کے بدلے مشتری کا کوئی سامان اس کی رضامندی کے بغیر یا رضا سے بھی رہن نہیں رکھا جا سکتا تو خود اس سامان مبیع ہی کو رہن کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہاں اس مبیع کو بحکم رہن قرار دینے کی ایک ہی صورت ہے کہ بائع تخلیہ اور قبضہ کے مواقع کو رفع کر دے، اس کے بعد خود مشتری پیشکش کرے، "أمسک هذا حتى أعطيك الثمن" اس میں بھی امام ابو یوسف اور امام زفر کا اختلاف ہی ہے (ہدایہ ۴/ ۵۱۹)

۱۰- قیمت کی ادائیگی جب قسطوں میں طے ہوتی ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ بیع مؤجل ہو کر منعقد ہوتی ہے، اور بیع کے مؤجل ہونے کی صورت میں مبیع کو اپنے قبضہ میں محبوس رکھنے کا حق بائع کو نہیں ہوتا۔ اب بائع اس مبیع کو اپنے قبضہ میں رکھ کر گویا پہلے ظلم کرتا ہے، پھر دوسرا ظلم یہ ڈھاتا ہے کہ ادا کردہ کچھ قسطوں کو بھی ہضم کر جاتا ہے، اور اس طرح عوض اور معوض عنہ دونوں ہی کا مالک بن جاتا ہے، حالانکہ "لا يجتمع الوصفان في ملک واحد"، معروف مسئلہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ معاملہ "ظلم فوق ظلم" کے قبیل سے ہو گیا، اور ادا شدہ قسطوں کو ہضم کرنا "أكل بالباطل" میں داخل ہوا جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔

۱۱- عقد رہن کی صحت کے لیے شرط ہے کہ باضابطہ تراضی طرفین سے ایجاب و قبول ہو کر مال مرہون مرتہن کے قبضہ میں آ جائے (ہدایہ رابع/ ۵۰۸)۔ خرید کردہ سامان جب مشتری کے قبضہ و استعمال میں ہوگا تو ظاہر ہے کہ "رهان مقبوضة" کا تحقق نہیں ہوگا، اور جب مال مرہون مرتہن (بائع) کے قبضہ ہی میں نہ آیا تو عقد رہن کا وجود ہی کہاں ہوا، پھر اسے رہن کیسے کہا جا سکتا ہے؟ باقی رہا یہ امر کہ فروخت شدہ سامان مشتری کے قبضہ و استعمال میں

ہوتے ہوئے بھی اس میں مالکانہ فروخت وتصرف کا حق بائع ہی کو حاصل رہے یہ تو بالکل نا قابل فہم وتصور ہے، اگر اس مالکانہ فروخت وتصرف کے حق ملنے اور رہنے کی شرط بائع کی جانب سے بوقت بیع ہی لگادی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ شرط فاسد کے سبب یہ معاملہ بیع ہی اپنی اصل سے ابتداءً بیع فاسد ہوکر واجب الفسخ والرفع ہوجائے گا۔

۱۲- خریدار کی طرف سے ثمن کی تسلیم کی ضمانت لینا کفالہ کا معروف ومسلم معاملہ ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے عقد تبرع ہے حتی کہ اگر خریدار (مدیون) کی اجازت وحکم کے بغیر کسی نے ضمانت لے لی تو ادا کردہ رقم تک کا بھی مطالبہ مدیون (خریدار) سے اس کفیل کو کرنے کا شرعاً حق نہیں، چہ جائیکہ کوئی مزید اجرت ومعاوضہ کا لین دین ہو، اور اگر خریدار (مدیون) کی اجازت وحکم سے وہ کفیل بنا ہے تب بھی ادا کردہ قدر دین سے زائد اجرت ومعاوضہ کسی بھی نام سے یقیناً جائز نہیں، یہ ربا ہی کہلائے گا۔

ہاں اگر معاملہ کی یہ صورت ہو کہ آج کل وہ ادارے اور اشخاص جو اس طرح کا کام کرتے ہیں وہ بائع (دائن) سے معاملہ اجارہ کریں، اور اس کی طرف سے وکیل بالاجرۃ بن کر مشتری (مدیون) سے ثمن ودین وصول کر کے بائع کے سپرد کریں، اور اس عمل تسلیم وتسلم کی اجرت ومعاوضہ جو تراضی طرفین سے طے شدہ ہو وہ لیا کریں تو جائز ہے، گویا یہ معاملہ عقد کفالہ نہیں عقد اجارہ کی حیثیت سے اور اشخاص وادارے کفیل کی حیثیت سے نہیں، بلکہ وکیل بالاجرۃ ہوکر کیا کریں تو شاید حد جواز میں آجائے اور بس۔

۱۳- ادھار خرید وفروخت کے وقت اس معاملہ کے مکمل کاغذات تیار کرائے جاتے ہیں، جس میں غالباً عاقدین عقد بیع، مبیع، ثمن اور ادائیگی ثمن کے وقت وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہوگا، ان کاغذات کی اصل حیثیت محض ایک ثبوت اور وثیقہ وسند کی ہوتی ہے کہ فلاں کے ذمہ فلاں کا اتنا اور ایسا واجب الاداء دین ہے، اب وقت مقررہ سے پہلے یا وقت پر رقم کی عدم ادائیگی کی وجہ سے اس دستاویز میں درج شدہ قیمت مالیت سے کم قیمت کے بدلے اس کی خرید وفروخت کا جو رواج ہے اس کی حیثیت اگر واقعتاً خرید وفروخت ہی کی تسلیم کرلی جائے تو ظاہر ہے کہ اسے جائز کہنا مشکل ہے۔

کیونکہ اس تبادلہ میں اصل مقصود ان کاغذی دستاویزات کی ذات نہیں، بلکہ اس میں درج شدہ ثمن ومال ہی ہوتا ہے تو تبادلہ ثمن بالثمن ہونے کے سبب مساوات ضروری ہوگی، کم وبیش کرنا ربا کو مستلزم ہوگا، ہاں اس معاملہ کی اگر یہ توجیہ کی جائے کہ یہ دراصل نہ اس دستاویز کی بیع ہے، نہ اس میں درج شدہ ثمن ومال کی بیع بلکہ یہ مستقل قرض واستقراض کا معاملہ ہے وہ اس طرح کہ درحقیقت صاحب دستاویز اس دستاویز کی بنیاد پر دستاویز کے ظاہری خریدار سے بزبان حال سے یہ کہتا ہے کہ تم اتنا قرض (دستاویز میں درج شدہ رقم سے کم) ہم کو دو۔ اور ہمارا اتنا دین جو فلاں کے ذمہ ہے جس کا ثبوت وسند یہ دستاویز ہے۔ وہ دین تم ہمارے وکیل بالاجرۃ ہوکر وصول کرلینا اور اسی سے تم اپنا دیا ہوا یہ قرض جو ہم کو آج دے رہے ہو وضع کرلو گے، اس کے بعد جو زائد رقم ہمارے مقروض سے وصول کردہ رقم میں بچے گی وہ تمہارا حق المحنت اور اجرت عمل ہوگی۔ تو اس توجیہ کی صحت کی تسلیم کے بعد یہ معاملہ صحیح ہوسکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

۱۴- خرید وفروخت کے وقت جب یہ طے ہوجائے کہ اس کا ثمن فلاں وقت مقررہ پر دینا ہے تو یہ تاجیل ثمن مشتری کے حق میں سہولت وآسانی کا باعث ہوتی ہے، اور یہ سہولت ویسر گویا مشتری کا ایک حق ثابت ہوجاتا ہے اور کسی کے حق ثابت کو باطل وساقط کرنے کا اختیار کسی دوسرے کو نہیں ہوا کرتا، اس لیے ادھار خرید وفروخت کی صورت میں ثمن کے مؤجل ہوجانے کے بعد بائع وقت مقررہ سے پہلے ثمن کا مطالبہ ہی نہیں کرسکتا، اور اگر مطالبہ کرتا ہے اور مشتری بھی راضی ہوجائے تو ایسا کیا جاسکتا ہے، کیونکہ مشتری نے اپنی رضاء سے خود اپنے حق یسر کو ساقط کرکے عسر کا پہلو اختیار کیا ہے، بہرحال وقت مقررہ سے پہلے بائع اپنے ثمن مؤجل کو گویا حالاً ومعجلاً کرتے ہوئے مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ اگر تم ہمارے حق مؤجل، ثمن مؤجل کا اتنا ہی حصہ (مثلاً دو ثلث) آج کل میں ادا کردو گے تو بقیہ حصہ (ایک ثلث) ہم معاف کردیں گے تو بشرط رضاء مشتری ایسا کرنا صحیح ہے۔ اس کی کو "إبراء عن بعض الحق" اور "إسقاط بعض الحق" کہا جائے گا، صاحب حق کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے اپنا کل حق یا بعض حق معاف کردے۔

یہاں ہلکا سا شبہ وہی مشتری کے حق یسر کے ابطال کا ہوسکتا تھا مگر جب خود مشتری بھی بائع کے مطالبہ معجلا پر راضی [illegible] ہی نہیں ہوسکتا۔

۱۵- اگر معاملہ ادھار کیا جائے مگر قیمت کی ادائیگی کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہ کیا جائے، صرف یہ کہا جائے کہ بعد میں دیدینا، تو یہ بیع مؤجل

نہیں معجّل ہی ہوگی، اور ثمن درحقیقت حالی اور معجّل ہی رہے گی، بائع کو ہر دن ہر وقت مطالبہ کا حق رہے گا۔

اس صورت میں بھی اگر بائع یہ کہے کہ تم ہمارے دین وثمن کا اتنا ہی حصہ (مثلا دوثلث) ابھی دے دو تو مابقی حصہ (ایک ثلث) ہم معاف کردیں گے اور اس طرح فوری لین دین ہوجائے تو یہ معاملہ بھی جائز ہی کہلائے گا۔

۱۶- جیسا کہ معلوم ہے کہ ثمن کی ادائیگی میں اجل ومہلت سے مشتری کو سہولت وآسانی ہوجاتی ہے، اس لیے جب معاملہ بیع کے وقت طرفین کی رضامندی سے ثمن کی ادائیگی میں مشتری کو مہلت دی جاچکی ہے تو یہ مہلت ویسر مشتری کو ایک حق لازم وثابت مل چکا۔

اس لیے طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر اس مہلت ویسر کو یکطرفہ ختم کرکے مابقی جملہ قیمت کا فوری مطالبہ کرنا بائع کے لیے جائز نہیں۔

''لأن الأجل حق المديون، ولا يملك أحد إبطال حق الغير''۔

ہاں اگر معاملہ کے وقت ہی یہ شرط لگادی جائے کہ اگر کوئی بھی قسط اپنے وقت مقررہ پر ادا نہ ہوسکی تو پھر کل مابقی کو فوری ادا کردینا ہوگا۔ تب کسی بھی قسط کی تاخیر سے اپنے آپ مہلت ختم ہوجائے گی اور مابقی جملہ کے مطالبہ کا حق بائع کو حاصل ہوجائے گا (البحر الرائق ۶/ ۱۲۱)۔

۱۷- بیع بالتقسیط یعنی بیع مؤجل میں مقررہ وقت سے پہلے اگر مدیون مرجائے تو اجل باطل ہوجائے گا، دین معجّل ہوکر اس کے ترکہ سے فوراً وصول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر دائن کی موت ہوجائے تو معاملہ علی حالہ اپنی تفصیل کے مطابق مؤجل ہی رہے گا (شامی ۴/ ۲۳، وبحر الرائق ۵/ ۲۸۰)۔

۱۸- آج کل کا یہ رواج کہ بالاقساط خرید وفروخت کرنے والے دکاندار ہر قسط کی ادائیگی پر یا ماہ بماہ یا مثلاً چھ مہینے یا سال پر ایک خاص رقم بنام انعام اپنے خریداروں کے درمیان تقسیم کرتے ہیں، اور اس انعام کے مستحق کی تعیین قرعہ اندازی سے کرتے ہیں، یہ جائز ہے، اسے قمار وربا نہیں کہا جاسکتا۔ دراصل دکاندار اپنی شہرت اپنی ساکھ اور مارکیٹ میں اپنے مال کی کھپت بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ خریداروں کو اپنی طرف مائل کرنے اور رکھنے کے لیے یہ تقسیم انعام کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ مگر ہر خریدار کو انعام دینے میں فائدہ سے زیادہ نقصان محسوس کرکے ضابطہ یہ بنایا جاتا ہے کہ وقت مقررہ پر قسط ادا کرنے والوں میں سے ایک کو یا مثلاً چار کو اتنا انعام دیا جائے گا، اور اسی کا اعلان کیا جاتا ہے، یہ واقعتاً محض تبرع اور انعام ہی ہوتا ہے، مگر تطئیباً للقلوب اس ایک یا چار مستحقین انعام کی تعیین قرعہ اندازی کے ذریعہ ہوتی ہے اور بس۔

اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ معقول نہیں۔ ربا تو اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ انعامی رقم مدیون ہی کو ملا کرتی ہے، کسی مدیون سے زائد رقم نہیں لی جاتی، اور قمار اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ من جانب واحد انعام دینا طے اور معلوم ہے۔ ''تعليق الملك على أمر متردد دائر بين النفع والنقصان'' کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۱۹- بعض دکاندار کا یہ طریقہ کار کہ ایک متعین مدت پر ایک سامان دینے کے لیے چند خریداروں سے بالاقساط قیمت جمع کرائی جائے، اور ہر قسط کا ایک وقت مقرر ہو جس کے ادا کرنے کے بعد قرعہ اندازی کی جائے، اور جس خریدار کا نام نکلے اس کو وہ سامان دے دیا جائے، اور اس کے بعد اس سے کسی قسط کا مطالبہ بھی نہ کیا جائے وہ معاملہ سے الگ سمجھا جائے۔

اسی طرح ہر مرتبہ کی قرعہ اندازی سے جس کا نام نکلتا جائے وہ سامان پاتا جائے، اور معاملہ سے الگ ہوجائے، یہ طریقہ کار بالکل ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ یہ صریح قمار ہے۔

یہ طریقہ دراصل قمار کی ماڈرن شکل ہے جو چالاک جوئے باز دکاندار کی چالبازی ہے۔ اس چالاک دکاندار کو تو ہر دفعہ اپنے سامان کی مکمل قیمت و لاگت کچھ نفع واضافہ کے ساتھ مل ہی جاتی ہے گویا اس نفع کی توگارنٹی ہوتی ہے، مگر خریداروں کا معاملہ ''دائر بين النفع والنقصان'' رہتا ہے۔ چنانچہ کسی کو وہی سامان صرف دو سو میں مل جاتا ہے تو کسی کو دو ہزار میں مل پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھلی ہوئی ''تعليق الملك على الأمر المتردد'' والی صورت ہے، جسے قمار کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

قسطوں پر خرید وفروخت فقہی تناظر میں

مولانا انیس الرحمن قاسمی [1]

انسانی معیشت اور اقتصاد پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے انسانی ضرورتوں کی تکمیل اور معیشت کے فروغ کے لیے بنیادی طور پر لین دین کے طریقوں میں سے ''بیع''، یعنی تجارت کو جائز قرار دے کر اسے اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے اور سودی طریقہ سے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی تاکید کی ہے (۱) بیع (خرید وفروخت) کے دو جز ہوتے ہیں: ایک ثمن اور دوسرا مبیع۔

ثمن بنیادی طور پر سونا چاندی اور روپیہ ہوتا ہے، اور کبھی سامان بھی ہوتا ہے البتہ ''مبیع'' ہمیشہ سامان ہی ہوتا ہے، اس طرح سامان کا ثمن یا سامان سے رضامندی کے ساتھ تبادلہ کا نام بیع ہے (۲)، مگر اس تبادلہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ سامان قابل انتفاع ہو (۳) اور عقد بیع دھوکہ وغرر سے خالی ہو (۴) نیز عقد بیع کے منافی کوئی شرط بھی نہ ہو (۵) اور جس چیز کو فروخت کیا جارہا ہے اس پر قبضہ بھی ہو (۶) اور بھاؤ تاؤ میں ثمن ومبیع کی تعیین بھی ہوجائے اور وہ ربا سے خالی ہو وغیرہ، (۷) اس طرح ان بنیادی امور کی رعایت کرتے ہوئے جو بھی خرید وفروخت ہوگی چاہے وہ نقد ہو یا ادھار، جائز ہے (۸) چنانچہ نقد اور ادھار خریداری کے دونوں طریقے خود رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی ثابت ہیں (۹) اور آپ ﷺ کے بعد بھی ہر دور میں نقد اور ادھار دونوں طریقوں پر خریداری کا تعامل مسلمانوں میں جاری رہا ہے، اس لیے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ مسلمان برابر قسط پر خریداری کا معاملہ کرتے آرہے ہیں اور یہ تعامل گویا ان کی طرف سے اس مسئلہ پر اجماع ہے (۱۰)۔ لیکن ادھار فروختگی کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ قیمت (قسط میں) ادا کرنے کی مدت فریقین کے درمیان متعین وطے شدہ ہوتا کہ کسی طرح کی نزاع نہ پیدا ہو (۱۱) اور جس طرح قیمت کو ایک قسط میں ادا کرنا صحیح ہے، اسی طرح ایک سے زیادہ قسطوں میں بھی ادا کرنا صحیح ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ خرید وفروخت (بیع) کا معاملہ کرتے وقت ہر قسط کی ادائیگی کی مدت متعین ہو (۱۲) لیکن مدت کی ابتداء کس وقت سے شمار کی جائے گی، کیا معاملہ کرنے کے وقت سے یا سامان کی سپردگی کے وقت سے؟ اس بارے میں فقہ حنفی کی کتابوں: ''ردالمحتار اور مجلہ الاحکام العدلیہ'' وغیرہ میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ مبیع (سامان) کی سپردگی کے وقت سے مدت کا شمار ہوگا (۱۳)۔

قسط پر فروختگی کی صورت میں قیمت کی زیادتی:

۱۔ قسط پر خرید وفروخت کی صورت میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بیچنے والا نقد فروختگی کی صورت میں سامان کی قیمت کم رکھتا ہے اور ادھار یا قسطوں پر فروختگی کی صورت میں قیمت زیادہ رکھتا ہے، ایسا کرنا فقہاء اربعہ کے یہاں جائز ہے (۱۴) کیونکہ بائع کو شرعاً یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کرے، بعض اوقات ایک ہی چیز قیمت مقام ووقت کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے، لہذا اگر کوئی شخص اپنی چیز کی قیمت ایک حالت میں ایک مقرر کرے اور دوسری حالت میں دوسری قیمت مقرر کرے تو شریعت اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتی، البتہ کسی کی حاجت ومحتاجی سے فائدہ اٹھا کر اگر بہت گراں فروخت کرتا ہے تو شریعت کے اس عام قاعدے کے مطابق کہ زیادہ گراں نہ فروخت کیا جائے بائع کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہوگا (۱۵)۔

۳، ۴۔ دو قیمتوں میں سے ایک کی تعیین:

نیز ادھار فروختگی کی صورت میں جس طرح قیمت زیادہ کرکے معاملہ کرنا جائز ہے، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ معاملہ کرتے وقت، مثلاً یہ کہا جائے کہ نقد سو روپئے میں اور ادھار سوا سو روپئے میں، مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ مجلس عقد ہی میں کسی ایک صورت پر اتفاق کرلیا جائے، اور مدت ادائیگی متعین ہو جائے، ایسا کرنے میں اگر چہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ مدت کے عوض روپئے کا اضافہ کیا جارہا ہے جو سود ہے، مگر حقیقۃً ایسا نہیں ہے، کیونکہ ادھار میں مدت کی وجہ سے

[1] (ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ)

سامان کی قیمت میں اضافہ کرنا اور مدت (اجل) کا عوض لینا دونوں میں فرق ہے، کیونکہ کسی سامان کی قیمت میں اضافہ کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، کبھی تو سامان کی قیمت مقام کے لحاظ سے بڑھ جاتی ہے، اور کبھی وقت کے لحاظ سے بڑھتی ہے، اسی طرح ہر صاحب مال کو حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال کی قیمت میں اضافہ کرے، اس لیے جب صاحب مال کے لیے نقد فروخت کرنے کی صورت میں بھی قیمت بڑھا کر لینا جائز ہے تو ادھار فروختگی کی صورت میں بھی اضافہ کرنا جائز ہے، جو صورت ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ نقد اور ادھار دونوں صورتوں کو بائع پیش کرے اور خریدار کسی ایک پر اتفاق کیے بغیر اٹھ جائے، اور پھر بعد میں اس کو قبول کرے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: "نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعۃ" (۱۶) اس سے مراد یہ ہے کہ مثلاً بائع خریدار سے یہ کہے کہ میں یہ کپڑا تم سے نقد دس روپے میں بیچتا ہوں اور ادھار بیس روپے میں، پھر کسی ایک قیمت پر اتفاق کیے بغیر جدائی ہوئی تو بیع صحیح نہیں، اور اگر کسی ایک پر اتفاق کر کے دونوں کی جدائی ہوئی تو بیع مکمل ہوگئی، یہ جمہور علماء اور فقہاء اربعہ کا مسلک ہے (۱۷)۔

۵، ۶، ۷- دو مدتوں اور دو قیمتوں میں سے ایک پر اتفاق ضروری ہے:

بعض دفعہ تجار ادھار فروختگی کا یہ طریقہ اپناتے ہیں کہ سامان کو ادھار ہی فروخت کرتے ہیں مگر اس کی قیمت دو یا دو سے زائد طرح کی رکھتے ہیں اور قیمتوں میں فرق ادائیگی کی مدت میں فرق کی وجہ سے ہوتا ہے، مثال کے طور پر فروخت کرنے والا یہ کہتا ہے کہ اگر آپ نے سامان کی قیمت چھ ماہ میں ادا کر دی تو مال کی قیمت گیارہ ہزار ہے، اور اگر سال بھر میں ادا کی تو بارہ ہزار روپے ہے، اور ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہو گیا تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہے، اور اگر کسی ایک پر اتفاق نہ کر کے عاقدین اس خیال سے جدا ہو گئے کہ خریدار ان میں سے جو صورت چاہے اپنے حالات کے اعتبار سے اختیار کر لے تو یہ صورت حرام ہے، اور فریقین پر واجب ہے کہ وہ اس عقد کو ختم کر دیں اور اگر چاہیں تو دوبارہ نیا معاملہ کریں (۱۸)۔

ادائیگی میں تاخیر کے عوض منافع:

ادھار فروختگی میں معاملہ طے کرتے وقت تو قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے، لیکن اگر خرید و فروخت اس طرح کی جائے کہ قیمت طے کر لی جائے اور ادائیگی کی مدت بھی طے ہو جائے، خواہ قسطوں میں ہو، یا یکمشت، اور اس کے ساتھ ہی یہ طے کر لیا جائے کہ یکمشت قیمت یا جملہ قسطیں یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کچھ رقم مثلاً ۲ / فیصد دینی ہوگی تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ قیمت طے ہونے کے بعد خریدار کے ذمہ اسی قیمت کی ادائیگی لازم ہوتی ہے، اور یہ دین ہوتا ہے، اور دین کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر سے کوئی فرق نہیں واقع ہوگا، اگر تاخیر کی صورت میں اس سے مزید رقم لی جائے گی تو یہ مدت کا عوض ہوگا، جو جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ربا ہے جسے اللہ تعالی نے حرام قرار دیا ہے۔ حدیث رسول میں اصلاً مدت کے عوض ہی لینے کو ربا قرار دیا گیا ہے (۱۹) اسی لیے بعض فقہاء نے ربا کی تعریف یہ کی ہے کہ "الربا ھو الزیادۃ علی رأس المال بتاخیر الآجال" (۲۰) اور علامہ ابوبکر جصاص الرازی لکھتے ہیں: "ومعلوم أن ربا الجاهلية انما كان قرضا موجلا بزيادة مشروطة فكانت الزيادة بدلا من الاجل فابطله الله تعالى وجهه" (۲۱) (یہ معلوم ہے کہ عہد جاہلیت کا ربا قرض مؤجل ہوتا تھا جس میں (واپسی) اضافہ کے ساتھ مشروط ہوتی تھی، اور یہ اضافہ اجل (مدت) کے بدلہ ہوتا تھا، اس لیے اللہ تعالی نے اسے باطل و حرام قرار دیا ہے) اسی لیے قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کے بدلے جو بھی اضافی رقم لی جائے گی وہ ربا ہوگی۔

ادائیگی قیمت پر رہن کا مطالبہ:

چونکہ قسطوں میں قیمت ادا کرنے کا معاملہ ایسا ہوتا ہے جس میں بائع کو اندیشہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں خریدار قسط کو متعینہ مدت میں ادا کرے گا یا نہیں، اس لیے وہ خریدار سے ضمانت طلب کرتا ہے جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک یہ کہ خریدار اپنی کوئی مملوکہ شئی بائع کے پاس بطور رہن رکھتا ہے، اور دوسری یہ کہ کوئی دوسرا شخص خریدار کی طرف سے ادائیگی کا کفیل ہوتا ہے، یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، رہن رکھنے کا جواز تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے (۲۲) اسی طرح کفالت و گارنٹی کا جواز قرآن کریم اور حدیث رسول نیز تعامل صحابہؓ سے ثابت ہے (۲۳)۔

رہن سے انتفاع کا حق:

رہا یہ سوال کہ رہن رکھنے کے بعد اس مال مرہون سے مرتہن (یعنی بائع) کے لیے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ امر ذہن نشین کر لینا

چاہیے کہ ایک خریدار اپنی جس چیز کو بائع (فروخت کرنے والے) کے پاس بطور رہن رکھتا ہے وہ چیز خریدار ہی کی ملک ہوتی ہے، اور بائع (جو مرتہن ہے) وہ اس چیز کو اپنے دین کے بدلے قبضہ میں رکھنے کا حق دار ہوتا ہے، مگر اس رہن سے خریدار کی نفس ملکیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اب خریدار (راہن) اس شئ میں گروی رکھنے کی وجہ سے کوئی تصرف نہیں کرسکتا ہے، لیکن اصولاً اس شئ کی منفعت کا حقدار وہی ہوتا ہے، اور مرتہن (یعنی بائع) اس شئ کو اپنا دین وصول کرنے کے لیے بطور ضمانت رکھتا ہے، اس کی بنیاد پر کسی طرح کا نفع اٹھانے کا حق اسے نہیں ہوتا ہے، اسے تو صرف اپنا دین (قیمت) وصول کرنے کا حق ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''کل قرض جر نفعا فھو ربا'' (۲۴) (ہر ایسا قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ سود ہے) نیز فرمایا: ''إذا أقرض أحدكم قرضا فاهدى إليه أو حمله على الدابة فلا يركبها ولا يقبله إلا أن يكون جرى بينه و بينه قبل ذلك'' (۲۵) (جب تم میں سے کوئی کسی کو قرض دے پھر قرضدار اس کو کچھ ہدیہ دے یا اپنی سواری پر بٹھائے تو نہ بیٹھے اور نہ ہدیہ قبول کرے الا یہ کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے تحفہ تحائف دینے کا معمول ہو) اسی لیے جمہور ائمہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور امام مالک (دَین وقرض) کی صورت میں مرتہن کے لیے مال رہن سے نفع اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے ہیں (۲۶) اسی طرح امام احمد بن حنبل بھی مال رہن سے نفع اٹھانے کی اجازت (دَین وقرض کی صورت میں) نہیں دیتے ہیں الا یہ کہ مال رہن سواری یا دودھ والا کوئی جانور ہو اور مرتہن اس پر خرچ کر رہا ہو (۲۷) اس قول کی وجہ وہ حدیث ہے جو اکثر کتب حدیث میں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الظھر یرکب بنفقته إذا كان مرھونا'' (۲۸) مگر احناف وشوافع اس حدیث کی تاویل کرتے ہیں، امام ابوجعفر طحاوی اس حدیث کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ مال رہن سے انتفاع کا یہ جواز اس وقت کی بات ہے جبکہ ربا کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا، جب اس کے حرام ہونے کا حکم آیا تو قرض کی بناء پر ہر طرح کا انتفاع بھی ناجائز ہوا، چنانچہ اصحاب علم کا اس پر اجماع ہے کہ رہن کا خرچہ راہن پر ہے نہ کہ مرتہن پر، اور یہ بھی کہ مرتہن کے لیے رہن کا استعمال جائز نہیں ہے (۲۹)، نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلی حدیث جو ذکر کی گئی اس سے حرمت معلوم ہوتی ہے، اور دوسری حدیث اباحت پر دلالت کر رہی ہے اور جب حلت وحرمت کی نص میں تعارض ہوتا ہے تو حرمت کو ترجیح ہوتی ہے، اس لیے عدم جواز کی روایت ہی راجح قرار پائے گی۔

مالک کی اجازت سے مال رہن سے انتفاع:

البتہ جو سامان رہن کا مالک ہے اگر وہ خود مرتہن کو انتفاع کی اجازت دے دے تو کیا اس کی اجازت سے وہ رہن والے مال سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ اس بارے میں فقہاء اربعہ کے اقوال مختلف ہیں، مالکیہ کہتے ہیں کہ مال رہن سے مرتہن کے لیے استفادہ تین شرطوں سے جائز ہے:

۱۔ مال رہن سے انتفاع کی بات معاملہ کے اندر مصرح ہو، ۲۔ انتفاع کی مدت متعین ہو، ۳۔ مال مرہون کسی دین کی وجہ سے نہ رکھا ہوا ہو۔

پس اگر صلب عقد میں انتفاع مصرح نہ ہو اور راہن نے مفت انتفاع کی اجازت دے دی تو یہ جائز نہیں (۳۰) حنابلہ کے نزدیک سواری اور دودھ والے جانور سے انتفاع اس پر خرچ کے بقدر جائز ہے، اگر چہ راہن سے اجازت نہ لی ہو اسی طرح انتفاع معاوضہ دے کر جائز ہے، جیسے مکان میں کرایہ دے کر رہنا، لیکن اگر دین کے بدلے مال بطور رہن رکھا ہوا ہو تو انتفاع جائز نہیں ہے (۳۱) شوافع کے نزدیک مال مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہے (۳۲)۔

احناف کے یہاں راہن کی اجازت سے انتفاع کے سلسلے میں کتب فقہ میں چار اقوال ملتے ہیں: پہلا قول مطلق جواز کا ہے۔ امام مرغینانی (صاحب ہدایہ) لکھتے ہیں: ''وليس للمرتهن أن ينتفع بالرهن لا بالاستخدام، ولا سكنى، ولا لبس، إلا أن يأذن له المالك'' (۳۳)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ راہن کی اجازت کے بعد مرتہن کے لیے مال رہن سے انتفاع حرام ہے، علامہ ابن عابدین شامی المنح کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''وعن عبد الله بن محمد بن أسلم السمرقندي- وكان من كبار علماء سمرقند: أنه لا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربا، لأنه يستوفي دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا فيكون ربا'' (۳۴)۔

تیسرا قول یہ ہے کہ راہن کی اجازت سے مال مرہون سے انتفاع مکروہ ہے، یہ قول امام ابویوسف سے منقول ہے (۳۵)۔

چوتھا قول یہ ہے کہ اگر رہن رکھتے وقت یا رہن کا معاملہ کرتے وقت اس سے انتفاع کی شرط لگائی گئی تو انتفاع حرام ہے، اور اگر ایسی کوئی شرط نہ لگائی گئی، اور نہ معاشرہ اور سماج میں انتفاع کا رواج عام ہے، اور راہن بعد میں بطیب خاطر اس سے انتفاع کی اجازت دے دے تو درست ہوگا (۳۶)۔

یہی قول اقرب الی الصواب اور راجح ہے، اسی کی طرف علامہ شامی کا رجحان ہے، انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں لوگوں کا عام حال یہی ہے کہ وہ قرض دیتے وقت مال مرہون سے نفع حاصل کرنے کی نیت رکھتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو وہ دراہم (قرض کے طور پر) دیں ہی نہیں، اور یہ شرط ہی کے درجہ میں ہے "المعروف کالمشروط" (معروف مشروط کے حکم میں ہے) اور یہ اس کی ممانعت ہی کو متعین کرتا ہے (۳۷) اس لیے رہن کے مال سے مرتہن کے لیے انتفاع حرام ہے، اور صرف اس صورت میں جائز ہے، جبکہ رہن کے معاملہ میں اس سے انتفاع نہ حقیقۃً مشروط ہو اور نہ حکماً و عرفاً، پھر بعد میں اگر راہن بطیب خاطر قرض دہندہ کو اس سے نفع اٹھانے کی اجازت دے دے (بشرطیکہ وہ اپنے دل میں یہ خیال نہ رکھتا ہو کہ اگر وہ اس کی اجازت نہ دے گا تو آئندہ اسے قرض یا قسط پر مال نہیں ملے گا) تو اس کے لیے انتفاع جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

انتفاع ناجائز ہونے کو اکابر علماء ہند میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۳۸) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی مفتی اول دار العلوم دیو بند (۳۹) نے بھی لکھا ہے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ نے تفصیل کر کے اس چوتھے قول کو اختیار کیا ہے، مگر ان کا رجحان یہی ہے کہ انتفاع کی شرط نہ حقیقۃً ہو اور نہ حکماً (۴۰) حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس مسلک کی بنیاد پر مذکورہ روایتوں اور فقہاء کے اقوال میں تعارض بھی باقی نہیں رہتا، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ روایت جس سے مطلقاً انتفاع جائز معلوم ہوتا ہے، وہ اسی غیر مشروط انتفاع پر محمول ہوگی اور وہ احادیث جن سے عدم جواز مفہوم ہوتا ہے اس سے مشروط انتفاع مراد ہوگا، اسی طرح فقہاء کے اقوال میں بھی تطبیق ہو جائے گی کہ جو حضرات اذن کے بعد انتفاع کو مطلقاً جائز کہتے ہیں اس سے ان کی مراد رہن کا وہ معاملہ ہے جس میں کسی طرح بھی انتفاع شرط نہ ہو اور بطیب خاطر راہن اجازت دے دے، اور جو حضرات اذن کے بعد بھی انتفاع کو حرام کہتے ہیں ان کی مراد انتفاع مشروط اور وہ اذن ہے جس کے پیچھے اکراہ اور مجبوری کام کر رہی ہو اور وہ انشراح صدر کی صفت سے خالی ہو (۴۱)۔

اب رہا بعض فقہاء کا یہ مسلک کہ اذن کے بعد انتفاع مکروہ تنزیہی ہے تو اس سے مراد بھی انتفاع غیر مشروط ہے، لیکن فقہاء کا یہ مسلک احتیاطی ہے، چونکہ یہ انتفاع کسی نہ کسی درجے میں جا کر ربا ہو جاتا ہے اس لیے غیر مشروط ہونے کے باوجود اور صحیح اذن کے بعد بھی اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے (۴۲)۔

مال رہن کا اتلاف:

اگر مال رہن مرتہن کے یہاں تلف ہو جائے، چاہے یہ اتلاف مرتہن سے ہو یا کسی اور سے (۴۳) اس کی قیمت کا ضامن ہوگا، اور مال رہن پر قبضہ کے دن جو قیمت ہوگی اسی قیمت کا اعتبار راہن کے حق میں ہوگا، مثلاً اگر مال رہن کی قیمت اس پر قبضہ کے دن ایک ہزار تھی، اور ضائع ہونے کے دن پانچ سو تو مرتہن ایک ہزار روپے کا ضامن ہوگا، البتہ اگر کسی اور نے ضائع کر دیا تو اس کے اوپر پانچ سو ہی دینا لازم ہوگا اور باقی پانچ سو روپے مرتہن اپنی طرف سے دے گا (۴۴) نیز مال رہن کے ضائع ہونے کی صورت میں اگر اس کی قیمت دین کے برابر ہے تو دین ساقط ہو جائے گا، اور اگر اس کی قیمت دین سے زیادہ ہے تو دین ساقط ہو جائے گا، اور باقی قیمت کے بارے میں اس تفصیل پر عمل ہوگا کہ اگر مرتہن کی تعدی کی وجہ سے ضائع ہوا ہے تو وہ زیادہ کا ضامن ہوگا، اور اگر کسی تعدی کے بغیر ضائع ہوا ہے تو باقی کا ضامن نہ ہوگا، اس میں ودیعت و امانت کا قانون نافذ ہوگا (۴۵) البتہ اگر راہن نے مرتہن کو مال مرہون کے استعمال کی اجازت دے دی اور وہ شئ مرہون حالت استعمال میں ہلاک ہوگئی تو یہ ہلاکت قابل ضمان نہیں، کیونکہ راہن کی طرف سے مرتہن کو اس وقت عاریۃً یہ شئ حاصل تھی، لیکن اس کے استعمال سے پہلے یا استعمال سے فراغت کے بعد وہ شئ ہلاک ہوئی تو قابل ضمان ہوگی۔

درمختار میں ہے: "ولو أذن الراهن للمرتهن فی استعماله أو اعارته للعمل فهلك الرهن قبل أن يشرع فی العمل، أو بعد الفراغ منه هلك بالدين لبقاء عقد الرهن، ولو هلك فی حالة العمل والاستعمال هلك أمانة لثبوت يد العارية حينئذ" (۴۶)۔

قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مال رہن فروخت کرنے کا حکم:

مرتہن کو مال رہن میں راہن کی طیب نفس کے ساتھ اجازت کے بغیر تصرف کا اختیار نہیں، اس لیے خریدار کی طرف سے قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کی

صورت میں مال رہن کو وہ فروخت نہیں کرسکتا ہے، البتہ اگر رکھتے وقت مرتہن راہن کی طرف سے اس کی اجازت لے لے تو پھر مدت ادائیگی کے ختم ہونے پر اسے فروخت کرسکتا ہے، اس صورت میں مرتہن راہن کی طرف سے وکیل ہوگا، اور رہن رکھتے وقت جب اس کی شرط لگائی گئی ہو تو راہن اس کو اختیار سے روک بھی نہیں سکتا ہے، یہ مسئلہ فقہ حنفی کی اکثر کتابوں میں موجود ہے (۴۷)۔

مال رہن فروخت کرنے کی صورت میں مرتہن اپنا دین وصول کرے گا، اور اگر مال رہن کی قیمت زائد ہے تو زائد روپئے راہن کو لوٹائے جائیں گے اور کم ہے تو باقی روپئے راہن پر دین رہیں گے۔

فروخت شدہ سامان کو روک لینے کا حق:

خرید وفروخت کی تکمیل کے بعد نقد خریداری میں جب خریدار قیمت ادا کردے تو سامان کو اس کے حوالہ کردینا لازمی ہوتا ہے اور اگر وہ قیمت ادا نہ کرے تو بائع سامان کو اپنے پاس روک لے گا اور چاہے تو بیع فسخ کردے گا، لیکن ادھار معاملہ میں بائع کو یہ اختیار نہیں ہوتا ہے کہ وہ سامان مکمل یا بعض قیمت ملنے تک روک لے، کیونکہ ادھار معاملہ میں مبیع نقد ہوتی ہے اور قیمت ادھار، اس لیے مبیع کو روکنے کا استحقاق بائع کو نہیں ہے۔

''قال أصحابنا رحمهم الله: للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن، إذا كان حالاً كذا في المحيط وإن كان موجلا فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده'' (۴۸)۔

البتہ اگر بائع کو اندیشہ ہو کہ خریدار وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرے گا تو مبیع (سامان) کو اپنی تحویل میں قسط وصول کرنے کی خاطر روکنے کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ سامان کو پہلے خریدار کے حوالے کرکے اس کے قبضہ میں دے (۴۹)، پھر خریدار اسی سامان کو رہن کے طور پر بائع کے حوالہ کردے تو یہ صورت جائز ہے، کیونکہ خریدار کے لیے اپنی ملکیت کی کوئی بھی چیز رہن رکھنا جائز ہے، چاہے خرید کردہ سامان ہو، یا کوئی دوسری شی، لیکن مبیع پر خریدار کی ملکیت ہوگی، اگرچہ بائع کے قبضہ میں ہو، اور اس پر رہن کا حکم عائد ہوگا (۵۰) لیکن ایسی صورت میں جبکہ مبیع پر قبضہ کے بعد بائع اس کو رہن کے طور پر رکھتا ہے وہ سامان اس کے پاس صرف رہن رہے گا، ملکیت خریدار کی ہوگی، اس لیے اگر خریدار اس کی قیمت (جو دین ہے) ادا نہ کرے تو بائع اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا ہے، اور نہ ہی اسے فروخت کرسکتا ہے جب تک کہ بائع کو خریدار کی طرف سے وکالۃ اس کی اجازت نہ ہو۔

۱۰- بعض جگہ پر تجار یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ طے شدہ قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع سامان کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور پھر وہ سامان اسی کا ہو جاتا ہے، تو یہ صورت رہن رکھنے کی شکل میں صحیح نہیں ہے، اسی طرح خریدار اگر قیمت کی بعض قسط ادا کرکے رک جاتا ہے، اور بائع رہن سے اپنا قرض وصول کرنے کے علاوہ قسط کو وضع بھی نہیں کرتا ہے اور نہ واپس کرتا ہے تو یہ صورت صحیح نہیں ہے۔

۱۱- اور اگر قسط پر خریداری میں یہ صورت اختیار کی جائے کہ سامان فروخت کیا جاتا ہے، اور خریدار اس پر قبضہ کے بعد اسی سامان کو بائع کے پاس رہن رکھ دیتا ہے، اور بائع حق رہن باقی رکھتے ہوئے پھر اسی سامان کو عاریۃً خریدار کے حوالہ یہ کہہ کر کرتا ہے کہ اس کو اپنے استعمال میں لائے، تو خریدار اس کو استعمال کرسکتا ہے، مگر اس کو فروخت نہیں کرسکتا ہے، مرتہن جب چاہے اس کو واپس لے کر رہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے، کیونکہ مال رہن کو محبوس رکھنے کا حق اصلا مرتہن کو حاصل ہوتا ہے، فقہاء اربعہ، احناف، شوافع اور مالکیہ وحنابلہ کا یہی قول ہے (۵۱)۔

گارنٹی پر اجرت:

قسطوں پر ادھار خریداری کی صورت میں خریدار سے اگر بائع کبھی کسی شخص کی یا بینک وغیرہ کی گارنٹی طلب کرتا ہے اور گارنٹر یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ یہ خریدار (جواب مدیون ہے) اگر قیمت ادا کرنے سے قاصر رہے تو یہ ادا کرے گا تو یہ صحیح ہے، فقہ اسلامی کی اصطلاح میں گارنٹر کو کفیل کہا جاتا ہے اور گارنٹی کو ''کفالت'' یہ طریقہ شریعت اسلامی میں محبوب اور پسندیدہ ہے، کیونکہ گارنٹر ایک ضرورت مند شخص کے کام آ کر اس کی ضرورت ومجبوری کو دور کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے، اور فریقین پر احسان کرتا ہے، اسی لیے شریعت میں معاملہ کفالت کو قرض کی طرح، تبرع واحسان کا معاملہ قرار دیا گیا ہے (۵۲) اسی لیے کفالت وگارنٹی پر کسی طرح کی اجرت کا مطالبہ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ آج کل مقامی وبین الاقوامی تجارت میں عام طور پر گارنٹر بینک ہوتا ہے جو تجارتی لین دین میں کریڈٹ لیٹر بھی جاری کرتا ہے، اور اس پر تجارتی مالیت کے لحاظ سے تین چار فیصد رقم لیتا ہے، اور ایسا نہ صرف شخصی لین دین میں ہوتا ہے، بلکہ اسلامی ملکوں کی بین الاقوامی تجارت میں بھی

اس کی ضرورت ہوتی ہے تو ایک مسلمان ایسی حالت میں کیا کرے؟

تو اس کی دو صورتیں ہیں: اول یہ کہ دونوں فریق اگر مسلمان ہوں تو ان کو چاہیے کہ معاملہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرلیں وہ یہ کہ خریدار بینک کو اپنے معاملہ کی تکمیل کے لیے وکیل بنادے، اور اس پر اجرت طے کردے اور اگر دونوں فریق مسلمان نہ ہوں تو بھی اس کی کوشش کی جائے کہ اسی طرح وکیل بنا کر معاملہ کیا جائے اور اگر ایسا نہ ہوسکے تو حتی الامکان اس سے پرہیز کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ اگر توکیل نہ ہو تو بینک لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے کے عوض اپنے واجبی اخراجات ومصارف عمیل سے لے لے۔

بیع مؤجل میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

آج کل بعض تجار ''بیع بالتقسیط'' یا ''مطلق بیع مؤجل'' میں دین کا کچھ حصہ اسی شرط پر چھوڑ دیتے ہیں کہ مدیون (قسط پر خریدنے والا) باقی دین کے روپئے فی الحال ادا کردے، مثلاً خریدار کے ذمہ سو روپئے دو قسطوں میں ادا کرنے تھے، مگر ادائیگی کی تاریخ سے پہلے بائع یہ کہتا ہے کہ تم ابھی ۷۵ روپئے نقد ادا کردو اور ۲۵ میں چھوڑ دیتا ہوں تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں خریدار اپنی حاصل شدہ مہلت (اجل) کے بدلے ۲۵ روپئے حاصل کررہا ہے، کیونکہ اس پر سو روپئے ادا کرنے لازم تھے، احادیث میں ہے کہ حضرت مقداد کے واقعہ میں اس طرح کے دین مؤجل میں نقد ادا کرکے چھوٹ لینے کا معاملہ پیش آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر فرمایا: اے مقداد! تم نے خود بھی سود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا (۵۳)۔

اسی لیے عام طور پر فقہاء اربعہ اور صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابتؓ اور تابعین میں سے امام شعبی، امام محمد بن سیرین، حضرت حسن بصری، اور حضرت ابن مسیب وغیرہ اس کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں، لیکن کچھ دیگر صحابہ وفقہاء مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ امام ابراہیم نخعی، امام زفر بن ہذیل اور امام ابوثور اس کے جواز کے قائل ہیں، ان کا مستدل بنی نضیر کا واقعہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا: ''ضعوا وتعجلوا'' (کچھ ساقط کردو اور جلدی ادا کردو) (۵۴)۔

لیکن اس روایت کے بارے میں علامہ سرخسی کا قول ہے کہ یہ روایت اہل حرب کے بارے میں ہے، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے (۵۵) علاوہ ازیں علامہ واقدی نے مغازی میں اس روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس زائد دین کو ساقط کرنے کو کہا تھا وہ دین میں راس المال سے زائد سود کا حصہ تھا، اس لیے کہ بنونضیر سود لیتے تھے (۵۶) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ سود کی حرمت سے قبل کا ہو، نیز جب دو روایتیں آپس میں متعارض ہوں اور حلت وحرمت کا معاملہ ہو تو حرمت کو ترجیح حاصل ہوتی ہے، اس لیے حرمت ہی کا پہلو یہاں راجح ہوگا (۵۷)۔

نقد معاملہ میں کچھ حصہ چھوڑ دینا:

اوپر جو تفصیل گزری اس کا تعلق ''دین مؤجل'' سے ہے، جہاں تک ''دیون حالہ'' (یعنی نقد معاملہ) کا تعلق ہے جس کی ادائیگی کے بارے میں معاملہ کرتے وقت کسی مدت کو شرط نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ مدیون ان کی ادائیگی میں کسی بھی وجہ سے تاخیر کررہا ہے تو ایسے دیون میں بائع اگر کچھ حصہ چھوڑ دیتا ہے تو جائز ہوگا (۵۸) اسی طرح دین مؤجل میں بھی اگر دائن تبرعاً بلا شرط تعجیل کچھ حصہ چھوڑ دے تو جائز ہوگا، علامہ ابوبکر جصاصؒ نے ''احکام القرآن'' میں اس موضوع پر وارد آثار وروایات کا تجزیہ کرتے ہوئے جواز کی رائے دی ہے (۵۹)۔

مرابحہ مؤجلہ میں دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا:

دین مؤجل اگر ''بیع مساومہ (۶۰) میں ہو تو تعجیل کی شرط کے ساتھ کچھ حصہ ساقط کرنا تو ناجائز ہے، لیکن اگر بیع مرابحہ ہو جس میں بائع مدت کے مقابلہ میں قیمت میں جو اضافہ کررہا ہے اس کو صراحتاً بیان کردیتا ہے، اگر ایسی بیع میں مدیون (خریدار) مقررہ مدت سے پہلے قیمت ادا کردے، مثلاً ایک شخص نے ایک سامان دس روپئے میں خریدا اور وہی چیز دوسرے کو اصل قیمت بتا کر دس ماہ کے ادھار پر بیس روپئے میں فروخت کردی اور خریدار نے پانچ ماہ بعد ہی روپئے ادا کردیئے یا اس کی وفات ہوگئی تو اس صورت میں خریدار سے (یا اس کے ورثاء سے وفات کی صورت میں) بائع اصل ثمن دس روپئے کے علاوہ منافع کے پانچ روپئے لے گا اور پانچ روپئے چھوڑ دے گا، یہ صورت جائز ہے (۶۱)۔

قسط کی ادائیگی میں کوتاہی سے مہلت ختم کرنا:

بیع مؤجل میں اگر ثمن کی ادائیگی قسط میں طے ہو اور معاملہ کرتے وقت ایگریمنٹ میں اس کی صراحت کر لی جائے کہ خریدار اگر مقررہ وقت پر کوئی قسط ادا نہ کر سکا تو اس صورت میں آئندہ کی باقی اقساط کو فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا، اور بائع کے لیے تمام اقساط کا فی الفور مطالبہ صحیح ہوگا تو یہ صورت جائز ہے، اور بائع ٹال مٹول کی صورت میں یا قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں کل ثمن کا مطالبہ کر کے فوری طور پر لے سکتا ہے۔

''ولو قال: کلما دخل نجم ولم تؤد فالمال حال، صح، ویصیر المال حالا(۶۲)۔

حواشی:

۱- قال تعالی شأنہ:أحل اللہ البیع وحرم الربوا''(سورۂ بقرہ:۲۷۵)۔

۲- ''ھو مبادلۃ شئ مرغوب فیہ بمثلہ علی وجہ مفید مخصوص ـــــ علی التراضی''(الدر المختار ۲/۲)۔

۳- ''أن جواز البیع یدور مع حل الانتفاع''(الدر المختار ۱۱۱/۲)۔

۴- ''نھی رسول اللہ ﷺ:عن بیع الغرر''۔

۵- ''نھی رسول اللہ ﷺ:عن بیع و شرط''۔

۶- ''قال رسول اللہ ﷺ: من ابتاع طعاما فلا یبعہ حتی یستوفیہ''(صحیح بخاری ۲۸۶/۱)۔

۷- ''وشرط لصحتہ معرفۃ قدر مبیع وثمن ووصف ثمن''(الدر المختار ۲/۵)۔

۸- ''وصح بثمن حال وھو الأصل ومؤجل إلی معلوم لئلا یفضی الی النزاع''(الدر المختار ۲/۶)، لیکن یہ ان اموال میں ہے جو اموال ربویہ سے نہ ہوں، ورنہ ان میں نقد ہی خرید وفروخت جائز ہے ادھار ناجائز ہے۔

۹- ''اشتری رسول اللہ ﷺ من یھودی طعاما بنسیئۃ أی بالأجل ورھنہ درعا لہ من حدید''۔ بیع مؤجل کا جواز قرآن کریم میں بھی ہے، ارشاد الٰہی ہے:''یایھا الذین آمنوا إذا تداینتم بدین، إلی أجل مسمی فاکتبوہ''(بقرہ/۲۸۲) اس سے مراد ہر ایسا معاملہ ہے جس میں عوضین میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو(تفسیر احکام القرآن۔قرطبی ۳/۳۷۷، نیز فتح القدیر لابن ہمام ۵/۴۶۸)۔

۱۰- ''قال ابن تیمیۃ: والأجماع یدل علی أن البیع بالتقسیط لا بأس بہ، فالمسلمون لایزالون یستعملون مثل ھذہ المعاملۃ وھو کالإجماع منھم علی جوازھا''(مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۲۹/۴۹۹)۔

۱۱- ''ویجوز البیع بثمن حال و مؤجل إذا کان الأجل معلوما لإطلاق قولہ تعالی:''واحل اللہ البیع الخ''وعنہ علیہ السلام أنہ اشتری من یھودی طعاما إلی أجل ورھنہ درعہ''(ھدایہ ۳/۲۱)۔

۱۲- ''وإذا ثبت جواز تأجیل الثمن ثبت جواز تأجیلہ لیدفع قسطا واحدا وأقساطا، لأن الحالتین مشمولتان بالتأجیل''(مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی)۔

۱۳- ''یعتبر مدۃ الأجل والقسط المذکورین من وقت تسلیم المبیع''(مجلہ الاحکام العدلیہ مادۃ/۲۴۶)۔اور در مختار میں ہے:''والأجل ابتداؤہ من وقت التسلیم''(رد المحتار علی الدر المختار ۴/۵۳۵)۔

۱۴- البتہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص صرف ادھار فروخت کرتا ہے اور نقد نہیں فروخت کرتا ہے تو اس کا یہ معاملہ مکروہ ہوگا، اس لیے کہ ایسی صورت میں غالب یہی ہوتا ہے کہ ادھار فروخت کرنے میں بائع ''اجل'' کی بنا پر زیادہ قیمت لیتا ہے(المغنی ۴/۵۳۵) لیکن احناف عام طور پر اس کو ہر حال میں جائز لکھتے ہیں۔علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:''وإن کون الثمن علی تقدیر النقد ألفا وعلی تقدیر النسیئۃ ألفین لیس فی معنی الربوا''(فتح القدیر ۶/۸۱)۔

۱۵- یہی وجہ ہے کہ غذائی اور ضرورت کے سامانوں میں گراں فروشی کو کنٹرول کرنے کے لیے ''تسعیر'' کو جائز قرار دیا گیا ہے، در مختار میں ہے:''إلا إذا تعدی الأرباب عن القیمۃ تعدیا فاحشا فیسعر بمشورۃ أھل الرائي''اور علامہ شامی لکھتے ہیں:'' قولہ: تعد یا فاحشا''بینہ الزیلعی وغیرہ. بالبیع لضعف القیمۃ''(۶/۴۰۰، نیز دیکھئے حجۃ اللہ البالغۃ ۲/۱۷۱)

۱۶- ''وقد فسر بعض أھل العلم:قالوا بیعتین فی بیعۃ:أن یقول: أبیعک ھذا الثوب بنقد بعشر، و بنسیئۃ بعشرین، ولا یفارقہ احد البیعین، فإن فارقہ علی أحدھما فلا بأس إذا کانت العقدۃ علی احد منھما''(ترمذی)۔

۱۷- مبسوط سرخسی ۱۳/۲۸، المغنی ۴/۲۶۹، تحفۃ الفقہاء ۲/۴۶ وغیرہ۔

۱۸- ''إنھم قالوا: لا بأس بأن یقول: ابیعک ھذا الثوب بعشرۃ إلی شھر أو بعشرین إلی شھرین، فباعہ علی أحدھما قبل أن یفارقہ فلا بأس بہ''(المصنف لعبد

الرزاق ۸/۱۳٦)۔

۱۹ - "وقال ﷺ فی حدیث اسامة بن زید الذی رواہ عنه عبدالرحمن بن عباس: انما الربا فی النسیئة، وفی بعض الالفاظ، لا ربا إلا فی النسیئة" (احکام القرآن للجصاص ۱/۴٦۵)۔

۲۰ - الربوا/۴۰، نقلا عن کشف الغطاء عن وجه معنی الربوا۔

۲۱ - احکام القرآن للجصاص ۱/۴٦۷۔

۲۲ - سنن نسائی وصحیح بخاری وغیرہ میں یہ روایت درج ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔

۲۳ - قرآن مجید کے سورہ یوسف میں آیا ہے: "ولمن جاء به حمل بعیر وأنا به زعیم" (آیت: ۷۲) اور حدیث میں آیا ہے: "الغارم ضامن" () تعامل صحابہ میں حضرت ابو قتادہ کا عمل ہے، وہ روایت کرتے ہیں کہ: "أن رجلا من الأنصار اتی به النبی ﷺ لیصلی علیه فقال: إن علی صاحبکم دینا، فقال أبو قتادہ: انا اتکفل به" (سنن ابن ماجه ۲/۲۳۳)۔

۲۴ - فتح القدیر ۸۔

۲۵ - سنن ابن ماجه۔

۲٦ - ردالمحتار ۵/۳۳۸۔

۲۷ - المغنی ۴/۴۲٦۔

۲۸ - رواہ البخاری ۲۔

۲۹ - (شرح معانی الاثار ۲/۲۵۲)۔

۳۰ - بلغة السالک علی الشرح الصغیر ۲/۱۱۲۔

۳۱ - المغنی ۴/۴۲٦ تا ۴۳۲۔

۳۲ - روضة الطالبین ۴/۷۹ ـ ۹۹۔

۳۳ - الهدایه ۴/۵۰٦، نیز دیکھئے الفتاوی الهندیه ۵/۴٦۷، البدائع ٦/۱٦۴، طحطاوی ۴/۲۵۴ وغیرہ۔

۳۴ - ردالمحتار ۵/۳۲۸۔

۳۵ - قنیه/ص ۳٦۲ وغیرہ۔

۳٦ - جامع الرموز للقهستانی/ص ۴۷۰، ایضاً۔ ردالمحتار ۵/۳۳۸ وغیرہ۔

۳۷ - ردالمحتار ۵/۳۳۸۔

۳۸ - امدادالفتاوی ۳/۴۵۴۔

۳۹ - فتاوی دار العلوم (قدیم) ۸/۲۹۳۔

۴۰ - فتاوی رشیدیہ: ص ۴۴۹، سہ ماہی بحث ونظر شمارہ ۲/٦۷۔

۴۱ - سہ ماہی بحث ونظر مقالہ مولانا امانت اللہ رحمانی۔ بعنوان: مال رہن کی آمدنی سے انتفاع، شمارہ ۲/۷۰ ـ ٦۹۔

۴۲ - بحث ونظر شمارہ ۲/۹٦ ـ ۷۰۔

۴۳ - "قال فی الدر المختار: والرهن إن أتلفه أجنبی أی غیر الراهن فالمرتهن یضمنه۔ ای المتلف قیمته یوم هلک، وتکون القیمة رهنا عنده، کمامر، وأما ضمانه علی المرتهن فتعتبر قیمته یوم القبض؛ لأنه مضمون بالقبض السابق" (٦/۵۱۰)۔

۴۴ - ردالمحتار مع الدر المختار ٦/۵۱۰۔

۴۵ - هدایه ۴/۵۱۹۔

۴٦ - الدر المختار ٦/۵۱۲۔

۴۷ - الهدایه ۴/۵۱۹، نیز دیکھئے الدر المختار ٦/۵۰۳، البحر الرائق وغیرہ۔

۴۸-فتاوی ہندیہ۔

۴۹-شریعت میں قبضہ کی کوئی خاص شکل متعین نہیں ہے، بلکہ قبضہ کے بارے میں عرف کا اعتبار ہے، عرف میں قبضہ کی جو صورت ہوگی اس طریقہ پر قبضہ صحیح ہوگا۔

۵۰-هدایه ۴/۵۴۶، درمختار مع ردالمحتار ۶/۴۹۷۔

۵۱-"الید علی المرهون بعد لزوم العقد للمرتهن... وهذا محل اتفاق بین الفقهاء" (موسوعه فقهیه ۲۳/۱۸۶)، قال المرغینانی: إذا أعار المرتهن الرهن للراهن لیخدمه أو لیعمل له عملا فقبضه خرج من ضمان المرتهن لمنافاة بین ید العاریة وید المرتهن، فان هلک فی ید الراهن هلک بغیر شئ لفوات القبض المضمون، وللمرتهن ان یسترده الی یده؛ لأن عقد الرهن باق، إلا فی حکم الضمان فی الحال، ألا تری أنه لو هلک الراهن قبل أن یرده علی المرتهن کان المرتهن احق به من سائر الغرماء" (الهدایه ۴/۵۴۶، نیز الدر المختار ۶/۵۱۰)۔

۵۲-"قال: وأهلها من هو أهل للتبرع" (الدر المختار علی تنویر الابصار ۵/۲۸۴) معاملہ کفالت کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۂ یوسف میں آیا ہے، آیت ہے: ولمن جاء به حمل بعیر و أنا به زعیم (آیت/۷۲) "ای کفیل" اور ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے: "الزعیم غارم" یعنی کفیل پر مطالبہ کے وقت ادائیگی لازم ہے۔

۵۳-"روی عن مقداد أنه قال: اسلفت رجلا مائة دینار ثم خرج سهمی فی بعث بعثه رسول الله ﷺ فقلت له: عجل لی تسعین دینارا، وأحط عشرة دنانیر، فقال: نعم، فذکرت ذلک لرسول الله ﷺ فقال: اکلت ربا یا مقداد وأطعمته" (رواه البیهقی فی السنن الکبری ۶/۲۸ فیه ضعف بالسند)۔

۵۴-دیکھئے: المغنی مع الشرح الکبیر ۴/۱۷۴، ۱۷۵، المصنف لعبد الرزاق ۸/۷۱ تا ۷۴ موطا امام مالک ۱/کتاب البیوع۔ ان حضرات کا مستدل وہ روایت ہے جس میں آیا ہے: "لما أجلی النضیر من المدینة جاء ناس منهم، فقالوا: یا رسول الله: انک امرت بإخراجهم ولهم علی الناس دیون، فقال النبی ﷺ: ضعوا وتعجلوا" (السنن الکبری للبیهقی ۶/۲۸، بسند ضعیف)۔

۵۵-شرح السیر الکبیر ۴/۱۴۱۲۔

۵۶-مغازی الواقدی ۱/۳۷۴۔

۵۷-احناف کے یہاں یہ مسئلہ اکثر کتب متن وشرح میں مصرح ہے، دیکھئے: الهدایه ۳/۱۲۵، ردالمحتار /۶، هندیه ۳/۸۷۔

۵۸-المسوی للشاہ ولی اللہ ۲/۳۸۲۔

۵۹-احکام القرآن للجصاص ۱/۴۶۷۔

۶۰-بیع مساومہ ایسی بیع کو کہتے ہیں جس میں سامان خریدار کے ہاتھ بھاؤ تاؤ کے ذریعے فروخت کیا جاتا ہے، اور بائع اس میں یہ نہیں بیان کرتا ہے کہ اسے کتنا نفع ہو رہا ہے۔

۶۱-ردالمحتار ۶/۷۵۷، باب الحضر والاجاحة۔

۶۲-خلاصة الفتاوی ۳/۵۴۔

قسطوں کی بنیاد پر خرید و فروخت

مولانا شمس پیرزادہؒ، ممبئی

۱- کیا یہ درست ہے کہ جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کردی جائے؟

نقد فروخت کے مقابلہ میں ادھار فروخت پر زیادہ قیمت لینے کے جواز میں کوئی نص صریح موجود نہیں ہے، فقہاء کی رائیں اس میں مختلف ہیں، جمہور فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں، لیکن ایک گروہ اس کو جائز نہیں سمجھتا۔

جواز کے قائلین کے مختصر دلائل درج ذیل ہیں:

(الف)...... اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے: "و احل الله البيع" (سورۂ بقرہ:۲۷۵) اس کی عمومیت میں ہر قسم کی بیع شامل ہے سوائے اس کے جس کے عدم جواز کی کوئی دلیل ہو۔

(ب)...... عقود میں اصل اباحت ہے، اس لیے یہ صورت بھی جائز ہے۔

(ج)...... قیمت میں اضافہ مدت کے عوض نہیں ہے، کیونکہ بعض لوگ اپنا مال، جبکہ بازار میں طلب کم ہوتی ہے ادھار کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔

(د)...... شریعت میں ہر عقد اپنی جگہ مستقل ہے، اس کو دوسرے عقد کے مقابلہ میں نہیں رکھا جاسکتا۔ عقد مع تاجیل الثمن (ادھار قیمت کے ساتھ عقد) بھی اپنی جگہ مستقل عقد (معاملہ) ہے اس میں ربا کا کوئی شائبہ نہیں۔

(ھ)...... بیع کا یہ طریقہ عام طور سے رائج ہے، اور مصلحت اس بات کی متقاضی ہے کہ جمہور کی رائے کو اختیار کیا جائے ورنہ لوگوں کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔

ان دلائل کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جدہ کی "مجمع الفقه الاسلامی" کی مجلس نے اپنے اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء میں اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کے بعد اس کے جواز میں قرارداد منظور کی ہے۔

"تجوز الزيادة في الثمن المؤجل عن الثمن الحال، كما يجوز ذكر ثمن البيع نقدا وثمنه بالأقساط لمدة معلومة. ولا يصح البيع إلا إذا جزم العاقدان بالنقد أو التأجيل، فإن وقع البيع مع التردد بين النقد والتأجيل بأن لم يحصل الاتفاق الجازم على ثمن واحد محدد فهو غير جائز شرعا"۔

(موجودہ قیمت سے ادھار قیمت زیادہ لینا جائز ہے۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ مال کی نقد قیمت کا ذکر کیا جائے اور اس کی قیمت قسطوں میں مقررہ مدت میں ادا کی جائے، یہ بیع اسی صورت میں جائز ہوگی، جبکہ خرید و فروخت کرنے والے نقد یا ادھار کا تعین کرلیں، اگر نقد اور ادھار میں تردد کے ساتھ سودا کیا گیا، یعنی کسی ایک قیمت پر حتمی طور پر اتفاق نہیں ہوسکا تو ایسی بیع شرعاً ناجائز ہوگی)۔

جو علماء جواز کے قائل نہیں ہیں ان کے دلائل کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(الف)...... آیت: "أحل الله البيع وحرم الربوا" (سورۂ بقرہ:۲۷۵) (اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور ربا کو حرام) ہر اس بیع کو جس میں اجل (مدت) کے مقابلہ میں زیادہ رقم لی جائے حرام قرار دیتی ہے، کیونکہ یہ لفظ ربا کے عموم میں داخل ہے۔

(ب)...... قیمت میں یہ اضافہ اجل (مدت) کی وجہ سے ہے، بنابریں یہ عوض (بدل) سے خالی ہے، اس لیے اس پر ربا (سود) کا اطلاق ہوتا ہے جس کی حقیقت ہی بغیر عوض کے زیادتی ہے، مطلب یہ ہے کہ قیمت میں یہ زیادتی اس اجل، یعنی مدت کی بنا پر ہے جو بائع مشتری کو ادائیگی کے لیے دیتا ہے، اور ظاہر ہے مدت کی بنا پر زیادہ رقم وصول کرنا سود ہے، اس نقطۂ نظر کے قائل زین العابدین علی بن الحسین، ناصر، منصور باللہ، ہادویہ، امام یحییٰ اور ابوبکر الجصاص ہیں۔

(ج)...... حدیث میں ایسی بیع سے جس میں بائع کے اضطرار سے فائدہ اٹھایا گیا ہو نیز اس بیع سے جس میں غرر ہو منع کیا گیا ہے (ابوداؤد، عون المعبود ۹/۲۳۵) اور قیمت کی وصولیابی میں تاخیر کی وجہ سے بازار کے نرخ سے زیادہ قیمت لینا استحصال کی صورت ہے، اور یہ آیت: "إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (سورۂ نساء:۲۹) (الا یہ کہ آپس کی رضامندی سے تجارت ہو) کے بھی خلاف ہے، لہٰذا یہ صورت جائز نہیں۔

(د)......جواز کے قائلین کا یہ استدلال کہ ادھار فروخت کی صورت میں بائع کی رقم رک جاتی ہے اور وہ ادھار کی مدت تک اس سے استفادہ نہیں کر پاتا، اس لیے قیمت میں اضافہ جائز ہے۔ اگر یہ استدلال صحیح مان لیا جائے تو پھر قرض پر بھی زیادتی جائز قرار پائے گی، کیونکہ قرض کی رقم بھی تو مقروض کے پاس رک جاتی ہے اور قرض دینے والا اس سے استفادہ نہیں کر پاتا، لیکن شریعت نے اسے سود قرار دیا ہے، اس لیے ادھار کی بیع میں زیادتی بھی سود ہی قرار پائے گی۔

(ھ)......رہی حاجت و مصلحت کی بات تو چونکہ ادھار کی صورت میں قیمت میں زیادتی استحصال (Exploitation) ہے، اس لیے یہ حاجت و مصلحت کے منافی ہے۔

(و)......بیع بالنسیئۃ میں قرض کا شبہ قوی ہے، اس لیے قیمت میں زیادتی سود ہی کی ایک شکل ہوگی۔ ان دلائل کے علاوہ اس صورت حال کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ تاجر ادھار اور قسطوں (Installments) کی فروخت پر اشیاء کی قیمت میں اتنا زیادہ اضافہ کر دیتے ہیں کہ خریدار ادائیگی سے قاصر رہتا ہے۔ وہ بائع سے بدگمان ہو جاتا ہے کہ اس نے اس کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانا چاہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بائع کی اصل رقم بھی بسا اوقات خسارہ میں پڑ جاتی ہے اور نزاع کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، اگر ایک کار بینک کے توسط سے خرید لیں تو جتنا سود ادا کرنا پڑتا ہے اس سے کہیں زیادہ بائع سے قسطوں میں کار خریدنے کی صورت میں رقم ادا کرنی پڑتی ہے، گو اس کا نام سود نہیں ہوتا۔ ایک بھینس اگر دس ہزار میں نقد فروخت ہوتی ہے تو ادھار کی صورت میں قیمت بارہ ہزار یا اس سے زیادہ بھی مقرر کی جاتی ہے۔

علماء نے ادھار فروخت پر قیمت میں اضافہ کے جواز کا جو فتوی دیا ہے اس کے عملاً کیا نتائج نکل رہے ہیں اور کتنے بڑے پیمانہ پر مالی استحصال ہو رہا ہے اس کو بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

راقم سطور کی رائے میں عدم جواز کے قائلین اگرچہ تعداد میں کم ہیں، لیکن ان کے دلائل قوی ہیں، اور اشتباہ سے بچنے کا بھی یہی طریقہ ہے، اس لیے ان کی رائے ہی درست ہے، لہذا ادھار فروخت خواہ اس کی ادائیگی قسطوں میں ہو، یا بغیر قسطوں کے، نقد کی قیمت سے زیادہ قیمت پر جائز نہیں قرار دی جا سکتی، دین میں اصلاً مقاصد کا اعتبار ہے، صرف ظاہری اشکال کا نہیں، ادھار بیع میں قیمت کا اضافہ بظاہر بیع کی صورت معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ معاملہ کی محض ظاہری شکل ہے، اس کے پیچھے جو مقصد ہے وہ رقم کی وصولیابی میں تاخیر (أجل) کا معاوضہ وصول کرنا ہے، ایک تاجر کے سوچنے کا انداز یہی ہوتا ہے کہ ادھار فروخت کی صورت میں سرمایہ رک جاتا ہے، اس لیے خریدار سے اس کا معاوضہ وصول کرنا چاہیے، ظاہر ہے یہ ذہنیت ہی سودی کاروبار کی ہے اور قیمت میں زیادتی پر سود کا اطلاق ہوتا ہے، کسی حرام کو حیلہ کر کے حلال نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مغنی میں ہے:

''والحيل كلها محرمة غير جائزة في شئ من الدين- وهو أن يظهر عقدا مباحا يريد به محرما، مخادعة وتوسلا إلى فعل ما حرم الله، واستباحة محظوراته، أو إسقاط واجب أو دفع حق ونحو ذلك'' (المغنی ۴/۶۲)۔

(دین کے کسی معاملہ میں بھی حیلے خواہ کسی قسم کے ہوں حرام اور ناجائز ہیں، اور حیلہ یہ ہے کہ ظاہری صورت مباح عقد (معاملہ) کی ہو لیکن مطلوب حرام چیز ہو فریب کی صورت میں اور اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حرام کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنا کر اور اس کی محظورات کو جائز قرار دینے یا واجب کو ساقط کرنے یا حق کو دفع کرنے جیسی اغراض کی خاطر)۔

اور بدائع میں ہے:

''فإذا باعه بعشرين ثم اشتراه بعشرة، صار كأنه اشترى ثوبا، وعشرة بعشرة، فيكون العشرة بالعشرة، ويبقى الثوب خاليا عن العوض في عقد المعاوضة فيتمكن شبهة الربا، فلم يبعه مرابحة، والله سبحانه وتعالى أعلم'' (بدائع ۵/۲۲۵)

(اگر اس نے کپڑا بیس (درہم) میں فروخت کیا، اور اس کے بعد دس (درہم) میں خریدا تو گویا کپڑا خریدا، اور دس کے بدلہ دس (درہم) دئے، تو دس درہم دس کے عوض ہوئے، اور معاوضہ کے معاملہ میں کپڑا عوض سے خالی رہا جس سے ربا (سود) کا شبہ پیدا ہو گیا، اور اس نے کپڑا مرابحہ پر فروخت نہیں کیا)۔

موجودہ زمانہ میں نقد کے مقابلہ میں قیمت بڑھا کر مال ادھار فروخت کرنے اور خاص طور سے قسطوں (Instalments) میں ادائیگی کی شرط پر زائد قیمت پر مال فروخت کرنے کا طریقہ بالکل عام ہے، اور اس سے بڑے پیمانہ پر معاشی لوٹ کھسوٹ ہو رہی ہے اور سود کا نام لیے بغیر تاجر سودی معاملہ کر رہے ہیں، اس لیے بیع کی اس صورت پر سخت گرفت کی ضرورت ہے۔

۲- جب ادھار بیع جائز ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قیمت کی ادائیگی قسطوں میں جائز نہ ہو۔ یہ اس صورت میں ہے، جبکہ نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت بڑھا نہ دی گئی ہو، اور قسطوں کی ادائیگی کے لیے وقت کی تحدید معاملہ کرتے وقت طے کر دی گئی ہو۔

۳- سوال نمبر (۱) کے جواب میں واضح کیا جاچکا ہے کہ ادھار فروخت کی صورت میں قیمت میں زیادتی جائز نہیں۔

۴- ادھار فروخت کی صورت میں قیمت میں زیادتی ربا (سود) کے دائرہ میں آتی ہے، جیسا کہ سوال نمبر (۱) کے جواب میں واضح کیا جاچکا ہے، یہ زائد قیمت حقیقۃً ادائیگی میں تاخیر (اجل) ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

۵- یہ سوال معلوم ہوتا ہے غلط طور سے مرتب ہوا ہے چھ ماہ میں ادائیگی کی صورت میں قیمت زیادہ اور بارہ ماہ میں ادائیگی کی صورت میں قیمت کم معاملہ کی صحیح تصویر نہیں ہے۔ بہر صورت نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

۶- یہ صورت سود کی ہے۔ قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اضافہ کرنا سود ہے۔ جدہ کی ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کی مجلس نے اپنے اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء میں جو قرارداد منظور کی اس کی ایک شق یہ ہے:

''إذا تأخر المشتري المدين في دفع الأقساط عن الوعد المحدد، فلا يجوز إلزامه أي زيادة على الدين بشرط سابق أو بدون شرط، لأن ذلك ربا محرم''۔

(اگر ادھار خریدنے والا قیمت کی ادائیگی مقررہ وقت پر نہیں کرتا، اور قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے تو اس پر مزید رقم عائد کرنا جائز نہیں، خواہ وہ دین (ادھار) پر کسی قسم کی زیادتی ہو، اور خواہ پہلے سے طے شدہ شرط کے مطابق ہو یا بغیر شرط کے ہو، کیونکہ یہ حرام سود ہے)۔

حدیث میں آتا ہے: ''مطل الغني ظلم'' (ابوداؤد) (غنی کا قرض کی ادائیگی سے تاخیر کرنا ظلم ہے)، اس صورت میں بلا وجہ ادائیگی میں تاخیر کو ظلم کہا گیا ہے، اس لیے معاصر علماء اس صورت میں جرمانہ کی اجازت دیتے ہیں، لیکن فقہاء نے ایسے شخص کے لیے حبس (قید) کی سزا مقرر کی ہے۔

۷- معاملہ کی یہ صورت جائز نہیں۔ اس مزید رقم کو جرمانہ اور مالی تاوان ہی قرار دیا جائے گا اور یہ سود ہوگا۔

۸- (الف)...... بائع مال مرہون سے فائدہ نہیں اٹھاسکتا، کیونکہ یہ سود ہوگا۔ قرض پر جو فائدہ بھی حاصل کیا جائے سود ہوگا۔

(ب)...... بائع مال مرہون کی حفاظت کا ذمہ دار ہے، اس لیے ضائع ہوجانے پر اسے اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

(ج)...... اس صورت میں فروخت کنندہ مال مرہون کو فروخت کرکے اپنی واجب الادا قیمت وصول کرسکتا ہے، اور جو رقم بچ جائے وہ خریدار کو لوٹادے

۹- (الف، ب):

بائع خرید کردہ مال کو اپنے پاس اس وقت تک کے لیے روک سکتا ہے جب تک مکمل قیمت یا اس کی چند اسقاط جمع نہ کی جائیں، بائع کا یہ روکنا محض اپنا حق وصول کرنے کے لیے ہوگا۔ رہن کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا، پابندیاں ان جائز شرائط کے مطابق ہوں گی جن پر معاملہ طے کرتے وقت فریقین کا اتفاق ہوا ہو۔

۱۰- بیع بالتقسیط کا معاملہ کرتے وقت جو معاہدہ ہوا ہو اس کی پابندی ہونی چاہیے۔ طے شدہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں جو قسطیں ادا کی جاچکی ہیں، ان کو واپس نہ کرنے کا بائع کو اختیار ہے، اور اس کی حیثیت بیعانہ کی ہوگی جس کا واپس کرنا ضروری نہیں، بشرطیکہ قسطیں اسی حد تک ضبط کی جائیں جو مناسب اور منصفانہ ہو۔

۱۱- رہن میں قرض کی واپسی پر شئے مرہون کو لازماً واپس کرنا پڑتا ہے۔ یہ صورت یہاں نہیں ہے، بائع سامان کی قیمت ادا کرکے خریدار سے سامان واپس نہیں لے سکتا، لہٰذا رہن کے قواعد کا اطلاق یہاں نہیں ہوگا۔

۱۲- جو ادارے ''کریڈٹ لیٹر'' جاری کرتے ہیں ان کو ایک کارروائی کرنا پڑتی ہے، جو خدمت وہ انجام دیتے ہیں اس میں دفتری اخراجات بھی شامل ہوتے ہیں، اس لیے کریڈٹ لیٹر کا معاوضہ لینا جائز ہے، اور جب یہ طریقہ رائج اور معروف ہوگیا ہے تو اس کی رعایت ضروری ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ناجائز قرار دیا جائے اور لوگوں کو مشکلات میں ڈالا جائے۔

۱۳- اس میں سود کا احتمال ہے، اس لیے اسے جائز نہیں کہا جاسکتا۔

۱۴- ''ضع وتعجل'' کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے: حضرت عبد اللہ بن عباس، ابراہیم نخعی، زفر بن ہذیل (حنفی)، ابوثور (شافعی) جواز کے قائل ہیں، لیکن عبد اللہ بن عمر، زید بن ثابت، محمد بن سیرین، حسن بصری، ابن المسیب، حکم بن عتیبہ اور شعبی سے اس کا عدم جواز منقول ہے، اور ائمہ اربعہ سے بھی یہی منقول ہے۔

راقم سطور کی رائے میں کمی کی یہ صورت جائز ہے، کیونکہ یہ قرض میں تخفیف اور سہولت ہے، اور اس سلسلہ میں ایک حدیث سے بھی رہنمائی ملتی ہے، حضرت

کعب بن مالک کا عبداللہ بن حدرد اسلمی پر قرض تھا، انہوں نے ان سے مطالبہ کیا اور آوازیں بلند ہوگئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: کعب اور ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ نصف۔ تو انہوں نے نصف قرض لے لیا اور نصف قرض چھوڑ دیا۔ (مقالہ محمد تقی عثمانی۔ بحوالہ بخاری)

اور ''مجمع الفقہ الاسلامی جدہ'' کی مجلس نے اپنے اجلاس منعقدہ مئی ۱۹۹۲ء میں جو قرارداد منظور کی اس کی ایک شق یہ ہے:

''الحطيطة من الدين المؤجل لأجل تعجيله، سواء أكان يطلب الدائن أو المدين (ضع و تعجل) جائزة شرعا. لاتدخل في الربا المحرم إذا لم تكن بناء على اتفاق مسبق، ومادامت العلاقة بين الدائن والمدين ثنائية. فإذا دخل بينهما طرف ثالث لم تجز. لأنها تأخذ عند ئذ حكم حسم الأوراق التجارية''۔

(دین مؤجل کو تعجیل کی وجہ سے کم کرنا خواہ قرض دینے والا ایسا کرنا چاہے یا مقروض (ضع وتعجل) شرعاً جائز ہے۔ حرام سود میں داخل نہیں) جبکہ یہ صورت پہلے سے طے شدہ نہ ہو، اور قرض دینے والے اور مقروض صرف دونوں کی حد تک معاملہ ہو، اگر ان کے درمیان تیسرا فریق شامل ہوا تو جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس صورت میں تجارتی دستاویزات پر کمیشن کا حکم لاگو ہوگا)۔

۱۵- یہ صورت بھی جائز ہوگی۔ اس کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔

۱۶- اس صورت میں ماقبی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا جائز ہے، کیونکہ خریدار نے طے شدہ معاہدہ کی پابندی نہیں کی۔

۱۷- اگر بائع کا انتقال ہو جائے تو معاملہ اسی صورت میں باقی رہے گا جو طے شدہ تھا، البتہ اگر مشتری کا انتقال ہو جائے تو اس کے ترکہ سے فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ ترکہ کے بارے میں اللہ تعالی کا حکم ہے کہ دین (قرض) کی ادائیگی کے بعد ترکہ تقسیم کردیا جائے (من بعد وصية يوصى بها أو دين. سورہ نساء/۱۱)۔

۱۸- یہ طریقہ وہی دکاندار اختیار کرتے ہوں گے جو ادھار فروخت کی قیمت زیادہ مقرر کرتے ہیں، اور جب معاملہ کی یہ صورت سود کے دائرہ میں آتی ہے تو انعام دینے کا نظام بھی اسی سے متعلق ہوگا، جب کلیہ ہی غلط ہے تو جزئیہ کے درست ہونے کا کیا سوال؟

۱۹- یہ طریقہ بھی وہیں اختیار کیا جاتا ہوگا جہاں ادھار فروخت کی صورت میں قیمت بڑھادی جاتی ہے، اور جب یہ صورت سود کی ہے تو یہ نظام ہی غلط قرار پاتا ہے۔

☆☆☆

قسط وار خرید وفروخت کے احکام

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی[1]

شریعت اسلام نے ربا کو حرام اور خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے۔ ربا کی حرمت اور بیع وشراء کی حلت کی صراحت کتاب وسنت میں موجود ہے۔ خرید وفروخت کی مختلف صورتیں ابتداء اسلام سے ابتک رائج ہیں، خاص طور سے ہمارے اس زمانہ میں نت نئی صورتیں سامنے آتی رہتی ہیں، انہیں میں سے ''بیع بالتقسیط'' بھی ہے، یعنی مجلس عقد ہی میں فروخت کرنے والا مبیع خریدار کے حوالہ کردے، اور خریدار اس کی قیمت مجلس عقد میں ادا نہ کرے، بلکہ قسط وار ایک متعین مدت پر ادا کرے، اس صورت کے جواز پر تقریبا تمام علماء وفقہاء کا اتفاق ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر مسلمانوں کے تعامل سے اجماع کا دعوی کیا ہے۔

''والإجماع يدل على أن البيع بالتقسيط لابأس به، فالمسلمون لايزالون يستعملون مثل هٰذه المعاملة وهو كالإجماع منهم على جوازها'' (مجموع الفتاوی لابن تیمیہ ۲۹/۴۹۹)۔

البتہ ''بیع بالتقسیط'' کے جواز کی چند شرطیں ہیں جن کی رعایت بہر حال لازم ہے:

۱۔ معاملہ جو بھی طے ہو وہ تراضی طرفین سے ہو، اس لیے کہ بیع کی جو بھی صورت ہو اس کی حقیقت میں تراضی طرفین، یعنی دونوں فریق کی رضامندی شامل ہے، اور یہ شرط قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

"يايها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (سورہ نساء: ۲۹)۔

۲۔ عوضین معلوم ومتعین ہوں اور ایسی جہالت نہ ہو جو باہم جھگڑے کا سبب بن جائے۔

''ومنها أن يكون المبيع معلوما والثمن معلوما علما يمنع من المنازعة، فبيع المجهول جهالة تفضى إلها غير صحيح كبيع شاة من هذا لقطيع'' (فتاوی ہندیہ ۳/۳)۔

۳۔ ثمن کی ادائیگی کے لیے مدت متعین ہو ایسی جہالت نہ ہو جس سے جھگڑے کا اندیشہ ہو معمولی جہالت نقصان دہ نہیں ہے۔

''وأما الخاصة فمنها معلومية الأجل فى البيع بثمن مؤجل فيفسد إن كان مجهولا'' (فتاوی ہندیہ ۳/۳)۔

۴۔ ثمن اموال ربویہ میں سے نہ ہو جن پر قبضہ مجلس عقد ہی میں ضروری ہوتا ہے، اگر ثمن اموال ربویہ میں سے ہے تو ''بیع بالتقسیط'' جائز نہ ہو گی، اس لیے کہ اس میں ثمن پر قبضہ مجلس عقد میں نہیں ہوتا ہے جبکہ اموال ربویہ میں مجلس عقد ہی میں قبضہ ضروری ہے۔

''ومنها القبض فى الصرف قبل الافتراق'' (فتاوی ہندیہ ۳/۳)۔

۵۔ بدلین مال متقوم ہوں۔

''ومنها فى البدلين وهو قيام المالية حتى لاينعقد متى عدمت المالية، هٰكذا فى محيط السرخسى'' (فتاوی ہندیہ ۲/۴)

۶۔ اس میں غرر اور دھوکہ نہ ہو۔

۱۔ بیع بالتقسیط میں قیمت کا اضافہ:

ہر شخص کو اپنی مملوکہ شی کو اصل قیمت میں کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنے کا اختیار ہے، خواہ نقد فروخت کرے یا ادھار، خرید وفروخت کرنے والے دونوں فریق باہمی رضامندی سے جس قیمت پر بھی اتفاق کر کے خرید وفروخت کا معاملہ کریں معاملہ درست ہوگا۔ ایک روپئے کی چیز کو ایک لاکھ میں بھی

---

[1] صدر مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

باہمی رضامندی سے خرید وفروخت کر سکتے ہیں، جب نقد فروختگی میں قیمت گھٹانے اور بڑھانے کا اختیار ہے تو ظاہر ہے کہ ادھار فروختگی کے سلسلہ میں بھی یہ اختیار ہوگا، شرط یہ ہے کہ خریدار بھی اس پر راضی ہو، بلکہ کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ مدت کے مقابلہ میں قیمت میں اضافہ جائز ہے۔

(ہدایہ ۳/ ۷۴، باب المرابحہ والتولیہ، بدائع الصنائع بیع المرابحۃ ۵ / ۲۲۰۲)۔

''فقہ السنۃ'' میں ہے: ''إذا كان الثمن مؤجلا وزاد البائع فيه من أجل التأجيل جاز؛ لأن للاجل حصة من الثمن وإلى هذا ذهب الأحناف والشافعية وزيد بن علي والمؤيد بالله وجمهور الفقهاء لعموم الأدلة القاضية لجوازه ورجحه الشوكاني'' (فقہ السنۃ ۳/۷۳)

مذکورہ فقہی عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ مدت اگر چہ حقیقۃً مبیع نہیں ہے، لیکن مرغوب فیہ ہونے کی وجہ سے مبیع کے ساتھ ایک گونہ اس کی مشابہت ہے، یہی وجہ ہے کہ مدت کی وجہ سے ثمن میں اضافہ کیا جاتا ہے، یہی مسلک حنفیہ، شافعیہ بلکہ جمہور محدثین اور فقہاء کا ہے، اگر چہ بعض حضرات ایسی صورت میں زیادتی ثمن کو اجل کا عوض قرار دے کر اس کو سود میں شامل کر کے ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، عقل ونقل کی روشنی میں جمہور کا مسلک ہی صحیح وراجح ہے۔ علامہ شوکانی نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

۴- ادھار قیمت کی ادائیگی قسط وار جائز ہے یا نہیں؟

اوپر تمہید میں یہ بات گزر چکی ہے کہ بیع کی حقیقت میں تراضی طرفین شامل ہے۔ بائع اور مشتری دونوں فریق جس بات پر اتفاق کر کے معاملہ طے کر لیں، شرعاً جائز ودرست ہوگا بشرطیکہ معاملہ ربا سے خالی ہو اور کسی طرح کا غرر ودھوکہ نہ ہو، اور باہمی اختلاف کا سبب نہ بنے، ثمن بائع کا حق ہے وہ اپنے اس حق کو بروقت بھی وصول کر سکتا ہے اور بعد میں بھی اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ بعد میں بیک مشت وصول کرے یا قسط وار۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ہر قسط کی ادائیگی کی مدت متعین کر دے تاکہ آئندہ کسی طرح کا اختلاف نہ ہو۔ صاحب ''ہدایہ'' نے لکھا ہے کہ کسی شخص نے نقد ثمن پر اپنا کوئی سامان فروخت کیا، پھر اس نے ثمن کی ادائیگی کو مؤخر کر دیا تو یہ شرعاً جائز ودرست ہے، اور ایسی صورت میں ثمن کی ادائیگی نقد ضروری نہیں ہوگی، بشرطیکہ ادائیگی کی مدت متعین ہو، اس لیے کہ ثمن اس کا حق ہے، وہ اپنے حق کی وصولیابی بعد میں بھی کر سکتا ہے، البتہ اگر ثمن کی ادائیگی کی مدت متعین نہیں ہے، بلکہ مجہول ہے اور یہ جہالت فاحشہ ہے مثلاً اس نے یہ کہا کہ جب ہوا چلے گی تو ادا کر دوں گا تو اس طرح معاملہ کرنا درست نہ ہوگا، اور اگر معمولی جہالت ہے جس سے جھگڑے کا اندیشہ نہیں، مثلاً یہ کہا کہ فلاں فصل کے کٹنے کے وقت ادا کر دوں گا تو یہ صورت شرعاً جائز ہے (ہدایہ باب المرابحۃ والتولیۃ ۳/ ۷۶)۔

جب نقد طے شدہ قیمت کو مؤخر کرنے کا اختیار بائع کو ہے اس لیے کہ وہ اس کا حق ہے تو بوقت عقد قسط وار قیمت کی ادائیگی طے کرنے کا اختیار بھی ہوگا۔

(فتاوی خانیہ علی ہامش، فتاوی ہندیہ ۲/ ۲۶۹، مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، العدد السادس الجزء الاول/ص ۲۷۹)۔

۵،۳- نقد اور ادھار فروختگی پر دو مختلف قیمتوں کا تذکرہ:

کوئی شخص معاملہ اس طرح طے کرتا ہے کہ اگر نقد لو گے تو اس کی قیمت ایک سو روپے ہوگی اور ادھار لو گے تو سوا سو روپے ہوگی تو اس صورت کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مجلس عقد ہی میں دونوں فریق کسی ایک صورت پر اتفاق کر لیتے ہیں، مثلاً خریدار یہ کہتا ہے کہ میں ایک سو روپے میں نقد لوں گا، یا سوا سو روپے میں ادھار لوں گا، کسی ایک صورت پر اتفاق کے بعد مجلس ختم ہوتی ہے تو شرعاً جائز و درست ہے، اس لیے کہ جب اتفاق ہو گیا تو ثمن کی جہالت ختم ہو گئی جو مفسد بیع ہے، اور اگر کسی ایک صورت پر اتفاق کیے بغیر مجلس عقد ختم ہو جاتی ہے تو چونکہ تردد کے ساتھ معاملہ ہوا جس کی وجہ سے ثمن مجہول ہے، اور صحت بیع کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ثمن معلوم و متعین ہو جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا، اس لیے اس صورت میں بیع جائز نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر ادھار فروختگی میں ثمن کی ادائیگی دو مختلف مدتوں میں ہونے کی وجہ سے الگ الگ دو قیمتوں کا تذکرہ ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ چھ ماہ میں چھ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت بارہ ہزار روپے ہوگی، ہر قسط دو ہزار کی، اور ایک سال میں بارہ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت پندرہ ہزار ہوگی، ہر قسط پندرہ سو کی اس طرح اگر معاملہ کیا جائے اور مجلس عقد ہی میں کسی ایک صورت پر دونوں فریق کا اتفاق ہو جائے تو جہالت ختم ہو جانے کی وجہ سے معاملہ درست ہوگا، اور اگر مجلس عقد میں اتفاق نہیں ہوا تو چونکہ ثمن مجہول رہا اس لیے بیع صحیح نہیں ہوگی۔

امام ترمذیؒ ترمذی شریف میں ''باب ماجاء في النهي عن بيعتين في بيعة'' کے تحت حدیث ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"وقد فسر بعض اهل العلم قالوا: بيعتين في بيعة أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة، وبنسيئة بعشرين. ولا يفارقه على أحد البيعين، فإذا فارقه على أحدهما فلا بأس، إذا كانت العقدة على واحد منهم[1]"
(ترمذی شریف ۱/ ۱۴۷، نیز المبسوط للسرخسی ۱۳/ ۸، بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۸، کفایت المفتی ۸/ ۴۰)۔

۴- ادھار فروختگی میں قیمت کا اضافہ سود کے دائرہ میں آتا ہے یا نہیں؟

ادھار فروختگی میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرہ میں نہیں آتا ہے، اس لیے کہ ربا یا تو وہ زیادتی ہے جو قرض کی ادائیگی میں ہو، یعنی کسی نے قرض لیا اور وہ قرض دینے والے کے مطالبہ پر، یا ماحول سے مجبور ہو کر کچھ اضافی رقم دے رہا ہے، یا قرض کی ادائیگی کی مدت متعین ہوگئی، اس مدت پر قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں کچھ اضافی رقم دینی پڑ رہی ہے، اس کو "ربا الجاهلية" یا "رباالنسيئة" بھی کہتے ہیں، یا ربا اس زیادتی کا نام ہے جو کسی عوض سے خالی ہو اور اموال ربویہ (سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور، نمک) میں ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس سے ہو، اور ظاہر ہے کہ یہاں پر نہ تو قرض پر اضافہ دیا جارہا ہے اور نہ ہی اموال ربویہ میں ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس سے ہے، بلکہ سامان کی فروختگی روپے پیسے سے ہو رہی ہے جس طرح اپنا سامان نقد کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنے کا اختیار ہے، اسی طرح ادھار بھی کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنے کا اختیار ہوگا۔

جہاں تک اس شبہ کا تعلق ہے کہ اضافہ وقت کے عوض محسوس ہوتا ہے تو اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی جگہ پر مدت ہی مقصود ہو اور اصلاً اسی کی قیمت لی جائے تو یہ شرعاً ناجائز ہوگا، اس لیے کہ مدت مال نہیں ہے جس کا عوض لیا جائے۔ اور اگر مدت مقصود نہ ہو، بلکہ مقصود کچھ اور چیز ہو اور مدت کا تذکرہ ضمناً ہو تو وہاں پر اضافہ ناجائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہاں پر مدت کا عوض نہیں لیا جارہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مذکورہ صورت میں مدت مقصود نہیں ہے جس کا عوض لیا جارہا ہے، بلکہ اپنے سامان کی قیمت ادھار فروختگی کی صورت میں زیادہ لی جارہی ہے، یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ بہت سی چیزیں اصلاً اور مقصوداً ناجائز ہوتی ہیں لیکن ضمناً اور تبعاً جائز ہوجاتی ہیں۔

"الاصل أنه قد يثبت الشئ تبعا و حكما، وإن كان قد يبطل قصدا" (قواعد الفقہ/ ۱۶)

۶، ۷- ثمن کی ادائیگی میں تاخیر پر مزید رقم لینے کا حکم:

اگر معاملہ اس طرح طے ہو کہ اس سامان کی قیمت دس روپے ہے جس کو ایک ماہ میں ادا کردینا ہے، اگر ایک ماہ میں قیمت کی ادائیگی نہیں ہوئی تو مزید دو روپے دینے ہوں گے، اسی طرح ہر ماہ کی تاخیر پر دو روپے کا اضافہ کرنا ہوگا، یا ادھار فروختگی میں ادھار قیمت طے کرلی گئی جس کی ادائیگی کے لیے یک مشت یا قسط وار مدت بھی طے ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے پایا کہ وقت مقررہ پر مکمل قسط یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید رقم دینی ہوگی، خواہ اس کی مقدار طے کردی جائے، یا فیصد کا حساب رکھا جائے، اس طرح کا معاملہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اس لیے کہ اس میں صریح سود ہے جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، کیونکہ یہ اصلاً اور قصداً مدت کی قیمت لینا ہے جو حرام ہے (کشف الغطاء عن وجہ معنی الربا، بحوالہ الربا/ ۴۰)۔

نیز یہ صورت درحقیقت اس ربا کی ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا، اس لیے کہ زمانہ جاہلیت کا ربا یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے کے ہاتھ سامان فروخت کرتا اور قیمت کی ادائیگی کے لیے وقت مقرر کردیتا، جب خریدار وقت مقررہ پر قیمت ادا نہیں کرتا تو فروخت کرنے والا قیمت میں اضافہ کرکے ادائیگی کی مدت بڑھا دیتا۔ (تفسیر ابن جریر ۳/ ۱۰۱، نیز: المدونۃ الکبری، احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۷)۔

۸- (الف)...... بائع کا مال مرہون سے انتفاع:

شی مرہون راہن (رہن رکھنے والے) کی ملکیت سے نہیں نکلتی ہے، بلکہ اس کی ملکیت میں رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رہن کے تمام اخراجات راہن ہی پر لازم ہوتے ہیں، البتہ قرض کی ادائیگی تک مرتہن (جس کے پاس رہن رکھا جائے) کے پاس وہ شی قرض کے عوض محبوس ہوتی ہے جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مرتہن کو اطمینان رہے اور قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں مرتہن اپنا حق وصول کرلے، چونکہ شی مرہون قرض کے عوض محبوس رہتی ہے اس لیے مرتہن کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا درحقیقت اپنے قرض سے نفع اٹھانا ہے، اور یہ حرام ہے جس کی صراحت تمام کتب فقہ میں موجود ہے۔

"وفی الاشباه: كل قرض جر نفعا حرام" (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۴/ ۱۷۴)۔

احادیث میں تو اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ قرض لینے والا اگر قرض دینے والے کو کچھ ہدیہ دے یا اپنی سواری پر اس کو بیٹھائے تو اس کے ہدیہ کو قبول نہ کرے اور اس کی سواری پر نہ بیٹھے۔الا یہ کہ قرض دینے سے پہلے ہی سے ہدیہ لینے دینے کا معمول ہو۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

''إذا أقرض أحدكم قرضا فأهدى له، أو حمله على الدابة، فلا يركبها ولا يقبله إلا أن يكون جرى بينه و بينه قبل ذلك'' (سنن ابن ماجه باب القرض /۱۷۷)۔

لہذا سامان فروخت کرنے والے کے لیے شئ مرہون سے جو اس کے پاس قرض کے عوض محبوس ہے فائدہ اٹھانا حرام ہے، قطعاً اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، یہ مسلک ائمہ اربعہ اور جمہور کا ہے، البتہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ اگر رہن سواری اور دودھ والا جانور ہو جس پر مرتہن خرچ کرتا ہو تو راہن کی اجازت کے بغیر بھی فائدہ اٹھاسکتا ہے۔جمہور کا قول ہی صحیح اور راجح ہے۔

شرح معانی الآثار میں اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے۔

''أجمع أهل العلم على أن نفقة الرهن على الراهن لا على المرتهن، وإن ليس للمرتهن استعمال الرهن'' (شرح معانی الآثار ۲/ ۲۵۲)۔

یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ راہن نے مرتہن کو شئ مرہون سے انتفاع کی اجازت نہیں دی، لیکن اگر راہن، مرتہن کو شئ مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دے تو ایسی صورت میں مرتہن کو شئ مرہون سے انتفاع کا حق ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں خود فقہاء احناف کے مختلف اقوال کتب فقہ میں ملتے ہیں:

۱۔ چونکہ شئ مرہون پر راہن کی ملکیت رہتی ہے اور ہر شخص کو اپنی مملوکہ شئ سے فائدہ اٹھانے کا حق ہوتا ہے اور اگر وہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق دے دے تو اس کو بھی انتفاع کا حق ہوگا اس لیے راہن کی اجازت کے بعد مرتہن کو شئ مرہون سے انتفاع کا حق ہوگا۔

۲۔ چونکہ شئ مرہون سے نفع اٹھانا اپنے قرض سے نفع اٹھانا ہے، اس لیے راہن کی اجازت کے بعد بھی مرتہن کے لیے شئ مرہون سے نفع اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

۳۔ راہن کی اجازت کے بعد مرتہن کے لیے نفع اٹھانا کراہت کے ساتھ جائز ہوگا۔

۴۔ اگر معاملہ کرتے وقت شئ مرہون سے نفع اٹھانے کی کوئی شرط ذکر نہیں کی گئی اور بعد میں راہن نے کسی خارجی دباؤ اور ماحول سے مجبور ہوئے بغیر محض اپنی خوشی و رضامندی سے انتفاع کی اجازت دے دی تو مرتہن کے لیے شئ مرہون سے انتفاع جائز ہوگا (الدر المختار علی هامش رد المحتار کتاب الرهن ۵/۳۱۰۔ ۳۱۱، نیز دیکھئے البحر الرائق ۸/۲۷۱)۔

چوتھا قول ہی راجح ہے، علامہ شامی کا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے۔البتہ اگر شئ مرہون سے انتفاع کا عام رواج ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ راہن نے اپنے عرف کو سامنے رکھتے ہوئے مجبوراً انتفاع کی اجازت دی ہے، اس لیے ''المعروف کالمشروط'' کے تحت اس کی اجازت کے بعد بھی مرتہن کے لیے انتفاع جائز نہ ہوگا۔اس وقت عام طور سے مرتہن شئ مرہون سے فائدہ اٹھاتا ہے خواہ راہن اس کی اجازت دے یا نہ دے۔کسی جگہ پر اگر راہن اس کی اجازت بھی دیتا ہے تو مجبوراً اس لیے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر انتفاع کی اجازت نہ دی جائے تو کوئی شخص بھی قرض نہیں دے گا، لہذا راقم الحروف کی ناقص رائے میں حالات اور تعامل ناس کے پیش نظر خریدار کی اجازت کے بعد بھی بائع کے لیے شئ مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہوگا، علامہ شامی نے اپنے دور کے حالات اور تعامل ناس کو سامنے رکھتے ہوئے یہی فتوی دیا ہے (رد المحتار ۵/ ۳۱۱)۔

(ب) مال مرہون بائع کے پاس ضائع ہو جائے تو کیا حکم ہوگا:

اب ایک مسئلہ یہ رہا کہ جو شئ خریدار کی طرف سے فروخت کرنے والے کے پاس بطور رہن رکھی ہوئی ہے وہ اس کے پاس سے ضائع ہو جائے تو کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں یہ غور کرنا ہوگا کہ شئ مرہون پر مرتہن کا قبضہ، قبضہ ضمان ہے یا قبضہ امانت؟ یعنی شئ مرہون مرتہن کے پاس بطور ضمان ہے یا بطور امانت۔

روایات و آثار صحابہ اور فقہی عبارتوں پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(الف) بقدر قرض شئ مرہون پر مرتہن کا قبضہ، قبضہ ضمان ہے۔

(ب) اگر شئ مرہون کی قیمت قرض سے زائد ہے تو زائد قیمت پر مرتہن کا قبضہ، قبضہ امانت ہے، یعنی زائد قیمت اس کے پاس بطور امانت ہے۔

(ج) اگر راہن، مرتہن کو شئ مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دے تو اس کے استعمال کی حالت میں وہ شئ بطور عاریت ہوگی، اور اس حالت میں اس کا قبضہ، قبضہ امانت ہوگا۔البتہ استعمال سے قبل اور استعمال کے بعد اس پر اس کا قبضہ، قبضہ ضمان ہوگا۔

(د) کوئی شی کسی شخص کے پاس بطور امانت ہو اور وہ شی امین کی پوری حفاظت کے باوجود ضائع ہوجائے تو پھر امین اس کا ضامن نہیں ہوگا، اور اگر امین کی کوتاہی اور تعدی کی بنا پر ضائع ہوجائے تو امین ضامن ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شی بائع کے پاس بطور رہن رکھی ہوئی ہے وہ بقدر ثمن بطور ضمان ہے اور ثمن سے زائد کی قیمت بطور امانت ہے۔ کتب فقہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ اگر شی مرہون مرتہن کی تعدی اور کوتاہی کے بغیر ضائع ہوئی تو دین اور شی مرہون کی قیمت میں سے جو کم ہوگا اس کا وہ ضامن ہو گا، یعنی اگر ایک ہزار قرض ہے اور ایک ہزار شی مرہون کی قیمت بھی تو معاملہ برابر سرابر ہوگا۔ نہ راہن، مرتہن سے کچھ لے گا اور نہ مرتہن، راہن سے، اور اگر قرض پندرہ سو ہے اور شی مرہون کی قیمت ایک ہزار تو ایک ہزار شی مرہون کی قیمت کے بقدر قرض سے ساقط ہوجائے گا اور پانچ سو روپئے وہ راہن سے وصول کرے گا اور اگر قرض پانچ سو روپئے ہے اور شی مرہون کی قیمت ایک ہزار روپئے تو پانچ سو روپئے بقدر قرض ساقط ہوجائیں گے اور پانچ سو روپئے جو شی مرہون کی فاضل قیمت ہے وہ چونکہ بطور امانت ہے اور مرتہن کی تعدی کے بغیر ضائع ہوئی ہے۔ لہذا مرتہن اس کا ضامن نہیں ہوگا اور اگر اس کی کوتاہی سے ضائع ہوئی ہے تو پانچ سو روپئے مرتہن کو راہن کے حوالہ کرنا ہوگا، اور اگر راہن نے مرتہن کو شی مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دی تھی اور شی مرہون استعمال کی حالت میں مرتہن کی تعدی کے بغیر ضائع ہوئی ہے تو چونکہ اس وقت اس کے پاس بطور امانت تھی، اس لیے مرتہن ضامن نہ ہوگا، اور کچھ بھی قرض سے ساقط نہیں ہوگا، البتہ اگر استعمال سے قبل یا استعمال کے بعد ضائع ہوئی ہے تو اس کا حکم وہی ہوگا جو اوپر عام رہن کا بتلایا گیا ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک کل شی مرہون بطور امانت ہی ہوتی ہے، اس لیے بلا تعدی ضائع ہونے کی صورت میں کچھ بھی قرض ساقط نہ ہوگا۔

(در مختار مع تنویر الابصار، رد المحتار کتاب الرھن ۵/۳۰۹، ۳۱۰، نیز دیکھئے: البحر الرائق کتاب الرھن ۸/۲۶۵، ھدایہ ۴/۵۳۰)۔

کس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا:

اس ذیل میں ضمنی طور پر یہ بحث بھی آتی ہے کہ شی مرہون کی قیمت کے سلسلہ میں کس دن کا اعتبار ہوگا؟ آیا شی مرہون پر قبضہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا یا اس کے ضائع ہونے کے دن کا؟ اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر خود مرتہن سے وہ شی ضائع ہوئی ہے تو پھر قبضہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اگر قبضہ کے دن اس کی قیمت پانچ سو روپئے تھی اور ضائع ہونے کے دن ایک ہزار تو پانچ سو روپئے کا ضامن ہوگا نہ کہ ایک ہزار کا۔ اور اگر کسی دوسرے شخص نے اس کو ضائع کیا ہے تو پھر اس کے ضائع ہونے کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اور ضائع کرنے والا شخص اس کے ضائع ہونے کے دن کی جو قیمت ہے وہ دے گا اور دونوں صورتوں میں قیمت مرتہن کے پاس بطور رہن رہے گی۔ (رد المحتار ۵/۳۰۹، نیز دیکھئے ہدایہ ۴/۵۲۹)۔

(ج) وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں اس کی وصولی کس طرح ہو:

اگر خریدار اپنے خرید کردہ سامان کی قیمت وقت مقررہ پر ادا نہیں کرتا ہے، بلکہ ٹال مٹول کرتا ہے تو اس صورت میں فروخت کرنے والا اپنے سامان کی قیمت کی وصولیابی کے لیے شی مرہون کو فروخت نہیں کرسکتا ہے، جب تک کہ خریدار اس کی اجازت نہ دے دے اور وہ اس کی فروختگی پر راضی نہ ہوجائے، اس لیے کہ شی مرہون پر اسی کی ملکیت ہے، البتہ قاضی شریعت کے پاس اور جہاں دار القضاء کا نظام نہ ہو وہاں جماعت مسلمین کے پاس درخواست دے کر خریدار کو شی مرہون کی فروختگی پر مجبور کرائے اور اس طرح شی مرہون کو فروخت کرا کے اپنا حق وصول کرلے۔ (ہدایہ ۴/۵۲۲، شرح فتح القدیر ۱۰/۱۷۶)۔

البتہ بہتر صورت یہ ہے کہ کوئی شی بطور رہن رکھتے وقت ہی خریدار سے یہ معاملہ طے کرلے کہ وہ کسی دوسرے کو یا خود فروخت کنندہ کو اس بات کا وکیل بنا دے کہ اگر وقت مقررہ پر قیمت کی ادائیگی نہیں ہوئی تو وکیل، خواہ دوسرا شخص ہو یا خود مرتہن شی مرہون کو فروخت کر کے اس کی قیمت ادا کردے گا، اگر اس طرح کی شرط شروع ہی میں لگادی جائے تو پھر خریدار وکیل کو معزول بھی نہیں کرسکتا ہے، بلکہ اس کے انتقال کے بعد بھی وہ معزول نہیں ہوگا، وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں وکیل کو شرعاً یہ اختیار ہوگا کہ شی مرہون کو فروخت کر کے بائع کا قرض ادا کردے، اگر شی مرہون کی قیمت بقدر قرض ہو تو معاملہ برابر سرابر رہے گا اور اگر قرض سے کم ہو تو بقیہ رقم خریدار ادا کردے گا اور اگر قرض سے زائد ہو تو زائد قیمت خریدار کے حوالہ کردی جائے گی۔ (البحر الرائق ۸/۲۹۲)

۹- بائع کا فروخت کردہ سامان کو ثمن کی ادائیگی تک اپنے پاس روک کر رکھنا:

بائع کا اپنے فروخت کردہ سامان کو اپنے پاس اس وقت تک روک کر رکھنا جب تک کہ خریدار پوری قیمت یا چند قسطیں ادا نہ کردے اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) خود بائع اس سامان کو خریدار کے حوالہ کیے بغیر اپنے پاس رکھے، یا خریدار قبضہ سے قبل بائع سے یہ کہے کہ یہ سامان تمہارے پاس رہن ہے۔

(ب) پہلے خریدار کے حوالہ کردے اور وہ اس پر قبضہ کرنے کے بعد اسی سامان کو بائع کے پاس بطور رہن رکھ دے، پہلی صورت "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" کی ہے، یعنی مبیع کو محض ثمن کی وصولیابی کے لیے روک کر رکھنا ہے اور یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بیع کی دو صورتیں ہیں، ایک وہ جس میں ثمن نقد طے پاتا ہے اور دوسری صورت وہ ہے جس میں ثمن ادھار طے پاتا ہے جس کی ادائیگی کے لیے مدت متعین کردی جاتی ہے، خواہ یک مشت ہو یا قسط وار ہو، اگر ثمن نقد طے پایا ہے تو اس صورت میں بائع کو شرعاً یہ اختیار ہے کہ ثمن کی ادائیگی تک سامان کو روک کر رکھے اور اگر ثمن ادھار طے پایا ہے تو پھر بائع کو شرعاً یہ اختیار نہیں ہے کہ ثمن کی ادائیگی تک مبیع کو اپنے پاس روک کر رکھے۔ (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵)

"مبسوط للسرخسی" میں اس کی علت بھی ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ متعینہ مدت کے آنے سے قبل اس لیے روکنے کا حق نہیں ہے کہ اس سے پہلے بائع کو ثمن کے مطالبہ کا حق نہیں ہے، اور مبیع کو روکنے کا اختیار صرف اس ثمن کے بدلہ میں ہے، جس کے مطالبہ کا حق ہو اور متعینہ مدت کے آنے کے بعد مبیع کو روکنے کا حق، اس لیے نہیں کہ ادھار ثمن کی صورت میں مبیع کو روکنے کا حق اصل عقد سے ثابت نہیں ہے، لہذا عقد کے بعد بھی یہ حق ثابت نہ ہو گا۔ (المبسوط للسرخسی ۱۳/ ۱۹۲)

اور اگر مشتری قبضہ سے قبل بائع سے یہ کہتا ہے کہ میرا خرید کردہ سامان تمہارے پاس رہن ہے تو چونکہ قبضہ سے قبل اس میں رہن بننے کی صلاحیت نہیں ہے، نیز یہ حبس المبیع الاستیفاء الثمن کی صورت ہے، اس لیے یہ بھی جائز نہیں ہے، البتہ دوسری صورت میں جبکہ بائع نے سامان کو مشتری کے حوالہ کردیا، اس نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد بائع کے پاس بطور رہن رکھ دیا تو یہ صورت شرعاً جائز و درست ہوگی، اس لیے کہ اس صورت میں خریدار قبضہ کے بعد اس کا مالک ہوگیا اور ہر شخص کو اپنی مملوکہ شئی رہن رکھنے کا اختیار ہے، خواہ وہ مملوکہ شئی خرید کردہ ہو یا دیگر اسباب ملکیت کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو، اب یہ شئی جو بائع کے پاس رہے گی اس پر ملکیت خریدار ہی کی رہے گی، اور اس سے انتفاع یا اس کے ضائع ہونے کی صورت میں تاوان اور ٹال مٹول کی صورت میں فروخت کر کے اپنے حق کی وصولیابی کے سلسلہ میں وہی احکام جاری ہوں گے جو جواب نمبر/ ۸ میں تفصیل سے گزر چکے ہیں۔

درمختار میں صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ مذکور ہے کہ اگر قبضہ سے قبل مشتری بائع سے یہ کہتا ہے کہ یہ سامان تمہارے پاس بطور رہن ہے تو یہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ وہ ثمن کے عوض میں محبوس ہے اور اگر قبضہ کے بعد بطور رہن رکھتا ہے تو یہ جائز و درست ہے، اس لیے کہ قبضہ کے بعد اس پر ملکیت آجانے کی وجہ سے اس میں رہن بننے کی صلاحیت ہوگئی۔ (ردالمحتار ۵/ ۳۲۰، باب مایجوز ارتھانہ ومالا یجوز)۔

۱۰- مقررہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع کا سامان اور ادا کردہ قسطیں ضبط کر لینا کیسا ہے:

بائع کا سامان روک کر رکھنا اور باقی قسطیں ادا نہ کرنے کی صورت میں ادا کردہ قسطوں کو ضبط کر لینا شرعاً حرام ہے، بیع فسخ کردینے کی صورت میں ادا کردہ قسطوں کو خریدار کے حوالہ کرنا ہوگا۔

۱۱- یہ سوال غیر واضح ہے۔ ظاہر ہے کہ خریدار جب خود اس سامان کا مالک ہے تو وہ اس کے پاس رہن کیسے قرار پاسکتا ہے؟ اس لیے کہ سامان خود مالک کے پاس بطور رہن رہے یہ ایک ناقابل فہم حقیقت ہے، رہن تو مدیون کی طرف سے دائن کے پاس توثیق و اعتماد کے لیے ہوتا ہے نہ کہ مدیون کا مال مدیون کے پاس، اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ خریدار جب اس سامان کا مالک ہوگیا تو پھر اس کو فروخت کرنے یا دیگر جائز تصرف سے کیسے روکا جاسکتا ہے اور بائع کو اس میں تصرف کا حق کیسے دیا جاسکتا ہے؟ البتہ اگر اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری نے اس پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ سامان بائع کے پاس بطور رہن رکھ دیا، پھر بائع نے مشتری کو عاریۃً استعمال کے لیے دے دیا تو یہ صورت جائز و درست ہے، اس لیے کہ مرتہن خود راہن کو شئی مرہون سے نفع اٹھانے کی اجازت دے سکتا ہے، اس صورت میں شئی مرہون مرتہن کے ضمان سے نکل جائے گی۔ اگر خریدار کے پاس وہ سامان ضائع ہوجائے تو بائع اس کا ضامن نہیں ہوگا، بلکہ حسب دستور خریدار پر ضروری ہوگا کہ بائع سامان کی قیمت ادا کردے، اس لیے کہ اس صورت میں شئی مرہون مرتہن کے ضمان سے نکل جاتی ہے (ہدایہ ۴/ ۵۳۰)۔

۱۲- گارنٹی وضمانت پر اجرت:

اداروں یا اشخاص کا کسی کے متعلق گارنٹی وضمانت لینا درحقیقت عقد کفالہ ہے۔ اور چونکہ عقد کفالہ تبرع و احسان پر مبنی ہے، اس لیے اس میں اجرت

لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ یہ تبرع واحسان کے منافی ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اداروں یا اشخاص کے لیے گارنٹی اور ضمانت لینے پر اجرت لینا ازروئے شرع جائز نہیں ہے، اس سے احتراز لازم ہے، البتہ اگر ادارے یا اشخاص ضمانت لیتے وقت کچھ سعی بھی کریں مثلاً قرض دلانے اور ضمانت لینے کے لیے بینک تک جا کر بینک سے اپنی ضمانت رقرض دلوائیں، اور اس محنت کی اجرت طے کرلیں تو ایسی صورت میں اپنی اس محنت کی اجرت لینا شرعاً جائز ہے، لیکن یہ اجرت اجرت مثل سے زائد نہیں ہونی چاہیے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے اپنی کتاب ''کفایت المفتی'' میں اس طرح محض ضمانت لینے پر اجرت لینے کو ناجائز اور محنت وعمل کے پائے جانے پر اس عمل کی اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے (کفایت المفتی ۸/۱۵۷-۱۵۸)۔

۱۳- ادھار معاملہ کے لیے تیار شدہ دستاویز کی خرید وفروخت:

جو کاغذات ودستاویز ادھار معاملہ کے لیے تیار کرائے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ اس میں عقد بیع، مبیع، ثمن اور ادائیگی ثمن کی مدت کی تفصیل ہوتی ہو گی۔ ان کاغذات ودستاویزات کی خرید وفروخت درحقیقت اس رقم کی خرید وفروخت ہے جو ان کاغذات ودستاویز میں درج ہے ان کاغذات و دستاویز کی خرید وفروخت مقصود نہیں ہے، اگر ثمن میں کوئی سامان ہے اور وہ اموال ربویہ میں سے نہیں ہے، یا اموال ربویہ میں سے ہے، لیکن روپے پیسے سے اس کو فروخت کیا جارہا ہے تو پھر کمی، بیشی کے ساتھ خرید وفروخت شرعاً جائز ہے اور اگر ثمن میں روپے پیسے ہیں اور روپے پیسے سے خرید و فروخت بھی ہورہی ہے تو چونکہ روپے پیسے ثمن عرفی ہیں، اس لیے اس پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے اور کمی بیشی کے ساتھ اور ادھار خرید و فروخت جائز نہ ہوگی، برابر سرابر اور نقد معاملہ کرنا ہوگا، اس لیے کہ بیع صرف میں ادھار اور کمی بیشی دونوں حرام ہیں۔

البتہ اس صورت میں جواز کا پہلو یہ نکل سکتا ہے کہ جس سے فروخت کرنا مقصود ہو اس سے قرض لے لے، اور اس کو اپنے قرض کی وصولیابی کے لیے اپنا وکیل بنالے، اور اس وکالت پر جو اجرت طے کرنا چاہے کر دے، اس طرح پر کہ اس سے لیے گئے قرض اور وکالت پر طے شدہ اجرت کی رقم دستاویز میں لکھی گئی رقم کے برابر ہو، مثلاً دس ہزار روپے دستاویز میں درج ہیں، اور اس دستاویز کی خرید وفروخت نو ہزار روپے میں کرنا چاہتے ہیں تو ہزار روپے اس سے قرض لے لے اور اس کو بینک سے قرض وصول کرنے کے لیے اپنا وکیل بنادے اور اس وکالت کی اجرت ایک ہزار روپے طے کر دے، اس طرح کا معاملہ درست ہوگا، اس لیے کہ عقد وکالت میں وکیل کے لیے اجرت لینا ازروئے شرع جائز ہے۔ (شرح فتح القدیر، کتاب الوکالۃ ۸/۳)

۱۴- ثمن کے ایک حصہ کی معافی کی شرط پر وقت سے قبل اس کا مطالبہ:

بیع بالتقسیط میں ثمن کی ادائیگی کی مدت متعین ہوگئی کہ فلاں تاریخ تک ثمن ادا کرنا ہے، ظاہر ہے کہ اس تاریخ سے قبل بائع ثمن کا مطالبہ نہیں کرسکتا ہے، لیکن وہ خریدار سے یہ کہتا ہے کہ تم ثمن ابھی یا وقت سے پہلے پہلے ادا کردو، میں ثمن کا کچھ حصہ معاف کردوں گا، اس کے لیے اصطلاحی تعبیر ''ضع و تعجل'' کی استعمال ہوتی ہے، اس صورت کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس صورت میں درحقیقت خریدار مدت کا عوض لے رہا ہے، اس لیے کہ جب ثمن کی ادائیگی کی مدت متعین ہوگئی تو مدت کو اس شرط پر کم کردینا کہ بائع ثمن میں کمی کردے، کم کیا ہوا ثمن درحقیقت اس مدت کا عوض ہوگا جو خریدار نے کم کیا ہے اور اوپر یہ مسئلہ بیان ہو چکا کہ مدت کا عوض لینا حرام ہے۔

کتابوں میں صراحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ اس طرح کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔ امام مالکؒ، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمرؓ کے آثار ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

جس طرح وقت مقرر پر قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں قرض دینے والا مدت میں کچھ اضافہ کردے اس شرط کے ساتھ کہ قرض میں بھی اضافہ کرنا ہوگا ناجائز وحرام ہے، اسی طرح میرے نزدیک اگر قرض دینے والا قرض کا کچھ حصہ معاف کر کے قرض کا فوری مطالبہ کرے تو ناجائز اور حرام ہوگا، دونوں میں صریح ربا ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں: ملاحظہ ہو عبارت:

''قال مالك: والأمر المكروه الذي لا اختلاف فيه عندنا أن يكون للرجل على الرجل الدين إلى أجل، فيضع عنه الطالب ويعجله المطلوب... قال مالك: وذلك عندنا بمنزلة الذي يؤخر دينه بعد محله عن غريمه ويزيد الغريم

فی حقه قال: فهذا الربا بعينه لا شك فيه" (موطا امام مالک کتاب البیوع باب ماجاء فی الربا فی الدین ۱/۶۰۶)۔

امام محمدؒ نے اس کے ناجائز ہونے کی علت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"لأنه يعجل قليلا بكثير دينا، وهو قول عمر بن الخطاب وزيد بن ثابت وعبد الله بن عمر وهو قول أبي حنيفة" (موطا امام محمد باب الرجل يبيع المتاع او غيره نسيئة ثم يقول انقد واضع عنک ۱/۳۳۲)۔

(اس لیے ناجائز ہے کہ وہ اس صورت میں دین کثیر کے بدلے دین قلیل کو جلد طلب کر رہا ہے گو یا کہ وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کر رہا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے، یہی قول عمر بن الخطاب، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور امام ابوحنیفہ کا ہے)۔

علامہ شامی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس طرح کی مصالحت کہ ایک ہزار جو ادھار ہے فوراً پانچ سو دے دو اور پانچ سو معاف کر دیتا ہوں، اجل کا عوض ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔

"ولا يصح (الصلح) (عن دراهم على دنانير مؤجلة) (أو عن الف مؤجل على نصفه حالا) (درمختار) (قوله حالا). لأنه اعتياض عن الأجل وهو حرام" (ردالمحتار ۴/۴۷۹ فصل فی دعوی الدین)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ کہ بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں ثمن کا کچھ حصہ معاف کر دیتا ہوں اور تم ثمن فوراً ادا کر دو حرام ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔

۱۵- ادھار بیع میں ثمن مطلق کو فی الفور ادا کرنے پر چھوٹ دینا:

معاملہ ادھار کیا گیا، لیکن ثمن کی ادائیگی کے لیے مدت متعین نہیں ہوئی، بلکہ مطلق رکھا گیا، خریدار نے کہا کہ میں ثمن ادا کر دوں گا، پھر بائع نے جب دیکھا کہ خریدار ثمن ادا نہیں کر رہا ہے اور بائع کو اس کی ضرورت بھی ہے تو اس نے خریدار سے کہا کہ تم فوراً ثمن ادا کر دو میں ثمن کا کچھ حصہ معاف کر دوں گا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں پہلے مندرجہ ذیل نکتوں پر غور کرنا ہوگا۔

(الف): ادھار معاملہ میں اگر ثمن کی ادائیگی کی مدت متعین نہ ہو، بلکہ خریدار صرف یہ کہے کہ میں ثمن ادا کر دوں گا تو اس طرح کی بیع صحیح ہوگی یا فاسد؟

(ب): اگر یہ بیع صحیح ہوگی تو ثمن کی ادائیگی فوری ضروری ہوگی یا تاخیر کی بھی گنجائش ہوگی؟

(ج): اگر تاخیر کی گنجائش ہوگی تو کتنے دنوں تک؟

اس سلسلہ میں فقہی عبارتیں باہم متضاد نظر آتی ہیں جس کی وجہ سے کوئی ایک قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہوتا ہے، بعض عبارتوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیع فاسد ہو جائے گی، اور بعض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح ہو جائے گی، یہ مسئلہ تقریباً تمام کتب فقہ معتبرہ اور متداولہ میں ہے کہ صحت بیع کے لیے جبکہ ادھار ہو ادائیگی ثمن کی مدت معلوم ہونا ضروری ہے، اگر ادائیگی ثمن کی مدت مجہول ہو، اور یہ جہالت فاحشہ ہو تو بیع فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ خریدار کہے کہ میں ثمن نیروز یا مہرجاں یا صوم نصاری تک ادا کر دوں گا تو ایسی صورت میں جہالت مدت کی وجہ سے بیع فاسد ہو جائے گی۔

"فتاوی ہندیہ" میں ہے: "ومنها الخاصة، فمنها معلومية الأجل في البيع بثمن مؤجل فيفسد إن كان مجهولا"۔ (فتاوی ہندیہ ۳/۳)

ہدایہ میں ہے: "والبيع إلى النيروز والمهرجان وصوم النصارى وفطر اليهود إذا لم يعرف المتبايعان ذلك فاسد لجهالة الأجل" (ہدایہ باب البیع الفاسد ۳/۴۵)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ادائیگی ثمن کی مدت متعین نہیں ہوئی، بلکہ خریدار نے صرف یہ کہا کہ میں ثمن ادا کر دوں گا تو اس صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی۔

اس کے برخلاف علامہ علاء الدین الحصکفی درمختار میں تحریر فرماتے ہیں کہ ثمن نقد مقرر کرنا بھی صحیح ہے اور ادھار بھی، جبکہ مدت معلوم و متعین ہوتا کہ باہمی جھگڑے کا سبب نہ بن جائے۔ اور اگر ثمن کو مطلق رکھا تو مفتی بہ قول کے مطابق ایک ماہ تک مؤجل سمجھا جائے گا۔

"(وصح بثمن حال) وهو الأصل (ومؤجل إلى معلوم) لئلا يفضي إلى النزاع، ولو باع مؤجلا صرف لشهر به يفتى" (تنویر الابصار مع الدر المختار علی ہامش ردالمحتار کتاب البیوع ۴/۲۲، ۲۳)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ادھار بیع میں اگر ثمن کی ادائیگی مطلق ہو تو بیع صحیح ہو جائے گی، اور ثمن کی ادائیگی ایک ماہ تک مؤجل رہے گی۔
اوپر جو مسئلہ بیان کیا گیا یعنی معلومیۃ الاجل اور بیع نیروز وغیرہ اس کو علامہ شامیؒ نے ذکر کر کے اس پر اشکال کیا ہے اور ''فتامل'' کہہ کر غور وفکر کی دعوت دے دی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں میں غور کرنے سے حقیقت میں تضاد نظر نہیں آتا۔ دونوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ثمن کی ادائیگی کی مدت فریقین کی جانب سے مقرر ہے، لیکن اس میں جہالت فاحشہ ہے تو ایسی صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی، اور اگر ادائیگی ثمن کی مدت فریقین کی جانب سے متعین نہیں ہے، بلکہ مطلق ہے کہ ادا کر دیں گے تو اس صورت میں بیع صحیح ہو جائے گی اور ادائیگی ثمن کی مدت ایک ماہ تک مؤجل رہے گی، پہلی صورت میں واقعی جہالت ہے، اور دوسری صورت میں جہالت نہیں ہے، اس لیے کہ مطلق کی صورت میں عرفا اور شرعا ایک ماہ کی مدت متعین ہو جاتی ہے، جیسا کہ بیع سلم اور یمین میں کہ کوئی شخص یہ قسم کھاتا ہے کہ میں تمہارا قرض مؤجلاً ادا کر دوں گا تو دونوں صورتوں میں ایک ماہ کی مدت متعین ہو جائے گی۔ راقم الحروف کی ناقص رائے یہی ہے کہ اگر ادھار بیع میں ثمن کی ادائیگی کی مدت متعین نہ ہو بلکہ مطلق ہو تو بیع صحیح ہو جائے گی اور ثمن کی ادائیگی کی مدت ایک ماہ تک مؤجل رہے گی۔

اس تفصیل کی روشنی میں سوال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں بیع صحیح ہو جائے گی اور ثمن کی ادائیگی ایک ماہ تک مؤجل رہے گی، چونکہ بائع کو ایک ماہ کے اندر اندر ثمن کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا، اس لیے اگر ایک ماہ سے قبل وہ خریدار سے یہ کہتا ہے کہ تم فی الفور ثمن ادا کر دو میں ثمن کا کچھ حصہ معاف کر دوں گا تو جواب ۱۴ کی تفصیل کے مطابق خریدار کے لیے یہ مدت کا عوض لینا ہوگا جو حرام ہے۔ اس طرح کا معاملہ نہیں کر سکتے ہیں، احتراز لازم ہے، اور اگر ایک ماہ کے بعد اس طرح کا معاملہ کرتا ہے تو چونکہ ایک ماہ کے بعد بائع کو ثمن کے مطالبہ کا حق ہے، اس لیے اس وقت یہ ثمن نقد ہو جائے گا اور ثمن نقد میں بائع کو یہ اختیار ہے کہ ثمن کے کچھ حصہ کو معاف کر کے بقیہ ثمن کو فی الفور ادا کرنے پر مصالحت کر لے، یہ مدت کا عوض نہ ہوگا، بلکہ اس کی طرف سے حط وابراء ہوگا جو شرعاً جائز ہے (ہدایہ باب الصلح فی الدین ۳/۲۵۱)۔

۱۶- ایک قسط کی تاخیر پر بقیہ قسطوں کی مہلت کو ختم کرنا:

ادھار بیع میں جب دونوں فریق کی باہمی رضامندی سے مختلف قسطوں میں ثمن کی ادائیگی طے پائی اور ہر قسط کی ادائیگی کی مدت بھی متعین ہو گئی تو محض ایک قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے بقیہ قسطوں کی مہلت کو بائع ختم نہیں کر سکتا ہے، اس لیے کہ مختلف قسطوں میں ادائیگی کی مدت متعین کرنا درحقیقت بائع کی جانب سے خریدار کو یسیر وسہولت دینا ہے، اور یسر وسہولت خریدار کو ہر قسط پر حاصل ہے۔ لہذا محض ایک قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے بقیہ قسطوں کی سہولت کو ختم کرنا انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے، البتہ اگر معاملہ کرتے وقت ہی دونوں فریق باہمی رضامندی سے یہ طے کر لیں کہ اگر کسی قسط کی ادائیگی میں تاخیر ہوگی اور خریدار ٹال مٹول سے کام لے گا تو بقیہ قسطوں کی مہلت ختم کر دی جائے گی، اور بائع کو فی الفور ادائیگی ثمن کے مطالبہ کا حق ہوگا۔ تو پھر بائع بقیہ قسطوں کی مہلت کو ختم کر کے فی الفور ادائیگی کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس کی صراحت کتب فقہ میں موجود ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے: ''ولو جعل المال نجوما بكفيل، أو بغير كفيل، وشرط إن لم يوفه كل نجم عند محله، فالمال حال عليه، فهو جائز على ما شرط، لأنه جعل الإخلال بنجم شرطا لحلول كل المال عليه، وأنه صحيح'' (بدائع الصنائع ۶/۴۵)۔

۱۷- فریقین میں سے کسی کے انتقال سے معاملہ پر اثر:

بیع بالتقسیط کے ذیل میں ایک اہم مسئلہ یہ آتا ہے کہ اگر فریقین (بائع اور مشتری) میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس سے معاملہ پر اثر پڑے گا یا نہیں؟ یا اب بھی معاملہ طے شدہ تفصیل کے مطابق باقی رہے گا؟

اس سوال کے جواب سے قبل یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ثمن کی ادائیگی کو مؤخر کرنے سے بائع کو کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ اصل فائدہ خریدار کو ہے۔ بائع وقت سے پہلے اپنے ثمن کا مطالبہ نہیں کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کی یہ صراحت موجود ہے کہ اگر بائع کا انتقال ہو جائے تو معاملہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، جس طرح خود بائع کو اپنی حیات میں مدت متعینہ سے قبل ثمن کے مطالبہ کا حق نہیں تھا اسی طرح اس کے وارثین کو بھی حق نہیں ہوگا، اس لیے

کہ تاجیل سے جس کو فائدہ پہنچ رہا تھا وہ اب بھی حیات ہے، البتہ اگر خریدار کا انتقال ہو جائے تو پھر جو ثمن ادھار تھا وہ نقد ہو جائے گا، اور فی الفور اس کی ادائیگی خریدار کے ترکہ سے لازم ہوگی، اس کی وجہ فتاوی بزازیہ میں یوں بیان کی گئی ہے کہ تاجیل کا فائدہ یہ ہے کہ خریدار اپنے مال کو تجارت کے ذریعہ بڑھا کر اس سے ثمن کی ادائیگی کرے، لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے ترکہ سے اس کی ادائیگی لازم ہوگئی، لہذا اب تاجیل کا کوئی فائدہ نہیں۔

''وبموت البائع لا يحل الثمن المؤجل وبموت المشتري يحل. ولو أجله الوارث لا يصح. لأن الثمن في الذمة. وكان فائدة التأجيل أن يتجر ويؤدي الثمن من نماء المال، وبالموت تعين الأداء من التركة، فلا فائدة في التاجيل''

(الفتاوی البزازیہ علی هامش الفتاوی الهندیہ نوع آخر فی التاجیل ۴/۵۱۱-۵۱۲)۔

۱۸- دوکانداروں کی طرف سے سامان خریدنے والوں کو ترغیبی انعام:

یہ طریقہ جو رائج ہے کہ بالاقساط خرید و فروخت کا کاروبار کرنے والے دوکاندار ماہ بماہ یا سال بسال ہر قسط کی ادائیگی پر اپنے خریداروں کو قرعہ کے ذریعہ انعام دیتے ہیں اور انعام کی رقم ثمن کا جز نہیں ہوا کرتی ہے، بلکہ محض خریداروں کی ہمت افزائی اور ان کی ترغیب کے لیے ایسا کرتے ہیں تو اس طرح انعام دینا شرعاً جائز و درست ہے، یہ صورت ربا یا قمار کے دائرے میں نہیں آتی ہے، اس لیے کہ اس پر نہ تو ربا کی تعریف صادق آتی ہے، اور نہ ہی قمار کی، دوکاندار تو محض اپنے کاروبار کو چمکانے اور خریدار کو ترغیب دلانے کے لیے اس طرح کے انعام کا اعلان کرتے ہیں:

۱۹- جوا کی ایک شکل:

خریداروں سے قسط جمع کرانا اور ہر قسط پر قرعہ اندازی کے ذریعہ جس کا نام نکل آئے اس کو سامان نقد دینا، پھر دوسری مرتبہ تمام خریداروں سے قسط جمع کرا کے قرعہ اندازی کے ذریعہ دوسرے کو انعام دینا، اس طرح ہر خریدار کو باری باری سے قرعہ اندازی کے ذریعہ سامان دینا اور جس کا نام قرعہ اندازی میں آ جائے اس سے مزید قسط جمع نہ کرانا، یہ سراسر جوا ہے جو شرعاً حرام ہے۔ قطعاً اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔

☆☆☆

قسطوں کی بنیاد پر خرید وفروخت ضرورت ومسائل

مولانا ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام قاسمی اعظمی [۱]

۱- نقد فروختگی کے اعتبار سے ادھار میں قیمت کی زیادتی شرعاً جائز اور درست ہے وہ ربا نہ ہوگی (رد المحتار ۶/۷۵۷، ہدایہ ۳/۵۸)۔

۲و۵- ظاہر ہے آدمی بیع بالاقساط تو اسی لیے کرتا ہے کہ فوری طور پر ثمن کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے، اس لیے بموجب آیت ربانی: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" میں تنوین میسرہ کو عام لے کر نجماً نجماً بیع کے جواز کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

۳- ادھار قیمت کا تذکرہ تو ضروری ہے ورنہ مفضی الی الجہالت ہونے کے باعث بیع کا اہم رکن تراضی فوت ہوجائے گا جس کی وجہ سے وہ معاملہ درست نہ ہوگا، پھر یہ کہ بائع کو اختیار ہے چاہے وہ نقد معاملہ کرے یا ادھار۔

''ولا يمنع الشرع من أن يبيع المرء سلعته بثمن في حالة وبثمن آخر في حالة أخرى''۔

۴- امام زین العابدین ناصر، المنصور باللہ اور ہادویہ کے نزدیک یہ معاملہ جائز نہیں، کیونکہ اجل ایک وصف ہے اور وصف کے مقابل میں ثمن نہیں ہوتا، بنا بریں یہ صورت ربا یا شبہ ربا ہو کر ناجائز ہوگی، جیسا کہ شوکانی کی تحریر ناطق ہے۔

''وقد تكلم الفقهاء في هذه المسئلة قديما و حديثا فذهب بعض العلماء إلى عدم جوازه لكون الزيادة عوضا عن الأجل وهو الربا أوفيه مشابهة للربا. وهذا المذهب مروى عن زين العابدين على بن الحسين والناصر والمنصور بالله والهادوية'' (نیل الاوطار ۵/۱۷۲)۔

مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ ائمہ اربعہ وجمہور علماء کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أما الأئمة الأربعة و جمهور الفقهاء والمحدثين، فقد أجازوا البيع المؤجل بأكثر من سعرانعقد بشرط أن يبت العاقدان بأنه بيع مؤجل بأجل معلوم و بثمن متفق عليه عند العقد'' (قضایا فقہیہ معاصرہ/۷)۔

(ائمہ اربعہ وجمہور فقہاء ومحدثین نے نقد فروختگی کے مقابلہ میں ادھار کے اندر قیمت کے زیادہ کرنے کو اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ متعاقدین عقد کے وقت ہی بیع مؤجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کرکے ایک ثمن پر متفق ہوجائیں)۔

علامہ عثمانی نے جواز کی دلیل میں ترمذی کی ایک روایت ''نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة'' کے تحت امام ترمذی کی تحریر ''وقد فسر بعض أهل العلم قالوا: بيعتين في بيعة أن يقول'' ''أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين'' ولايفارقه على أحد البيعين فإن فارقه على أحدهما فلابأس إذا كانت العقدة على ا أحد منهما''

کا خلاصہ یوں لکھا ہے کہ عدم جواز کی وجہ سے تردد الثمن بین الحالتین ہے جو مفضی الی الجہالۃ ہے، اس کی وجہ ادھار کے باعث قیمت کا اضافہ نہیں ہے، لہذا اگر عقد کے وقت ہی یہ جہالت کسی ایک ثمن کے تعین سے ختم کردی جائے تو جواز میں کوئی مضائقہ نہیں۔

راقم کے خیال میں جواز کی گنجائش ہونی چاہیے، کیونکہ یہ صورت نہ تو ربو یہ ہے اور نہ ہی جهالة فاحشه في الأجل ہے جس کی وجہ سے غرر کثیر پیدا ہوجائے، اس سلسلہ کی ایک عبارت ابن حزم کی بھی نقل کررہا ہوں جس سے جواز ہی کا ثبوت ہورہا ہے۔

''ولا يجوز البيع بثمن مجهول ولا إلى أجل مجهول... وهو قول الشافعي وأبي حنيفة'' (محلی ابن حزم ۸/۴۴۴)۔

سراج العلماء ابوبکر کاسانی کے مطابق ''ومنها أن يكون المبيع معلوما وثمنه معلوما علما يمنع من المنازعة. فإن كان أحدهما مجهولا جهالة مفضية إلى المنازعة فسد البيع وإن كان مجهولا لا تفضى إلى المنازعة لا يفسد'' (بدائع

---

[۱] شیخ الحدیث و پرنسپل دار العلوم مئو۔

الصنائع ۵/۱۵۶) مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو (بدایۃ المجتہد ۲/۱۵۹ تا ۱۷۲، اعلاء السنن للشیخ ظفر احمد العثمانی ۱۴/۱۳۶، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ لعبد الرحمن الجزیری ۲/۲۳۵، مغنی لابن قدامہ و شرح ۴/۲۲۰، مبسوط للسرخسی ۱۳، و قواعد الفقہ از سید عمیم الاحسان/۳۹۹)۔

بہر حال یہ زائد قیمت مبیع کا وصف بن کر ضمناً صحیح ہو جائے گی، نیز ربا اور صورت مسئولہ میں بین فرق ہے۔

۶- اگر ایک چیز کی خرید و فروخت نقد معاملہ کے طور پر دس روپئے طے ہوئی اور ساتھ ہی یہ طے پایا کہ یہ دس روپئے ایک ماہ کے اندر ادا نہ کیے گئے تو مزید دو روپئے ادا کرنے ہوں گے اور اس طرح ہر ماہ کی تاخیر پر دو روپئے کا اضافہ کرنا ہوگا تو احقر کی رائے یہ ہے کہ یہ معاملہ شرعاً درست نہیں، جیسا کہ درج ذیل عبارات سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔

''أما مایفعله بعض الناس من تحدید ثمن البضاعة علی أساس سعر انعقد و ذکر القدر الزائد علی أساس أنه جزء من فوائد التأخیر فی الأداء، فإنه ربا صراح، وهذا مثل أن یقول البائع: بعتك هذه البضاعة بثمانی ربیات نقدا فإن تأخرت فی الأداء إلی مدة شهر فعلیك روبیتان علاوة علی الثمانیة سواء سماها فائدة أولا، فإنه لا شك فی کونه معاملة ربویه . . .'' (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ از شیخ تقی عثمانی/۱۰)۔

بہر حال نقد کو بنیاد بنا کر تاخیر کی وجہ سے ثمن کا اضافہ ربا محرم ہے جو نصوص فقہاء سے ثابت ہے۔

۷- اگر یہ شرط صلب عقد میں ہے تو قطعاً اس کے جواز کی گنجائش نہیں نکلتی، کیونکہ یہ قرض میں منافع کے قبیل سے ہے جس کی حرمت ''کل قرض جر نفعا فهو ربا'' والی حدیث سے ثابت ہے، لیکن اگر اسی مجلس عقد میں بعد انعقاد بیع یعنی بعد ایجاب و قبول متعاقدین اس پر راضی ہو جائیں تو میرے خیال میں بایں وجہ جائز ہونا چاہیے کہ فی زمانہ دائن کے امہال کے باوجود جانب آخر مدیون سے ٹال مٹول اور مطل سے کام لیا جاتا ہے جو شرعاً ممنوع ہے بموجب ''لا ضرر ولا ضرار'' و بنص حدیث صحیح ''مطل الغنی ظلم'' اس لیے اس زائد رقم کو (جو بقدر الدین دائن مدیون کے درمیان معہود ہو) لے کر ایک تیسرے آدمی کو جس کی دیانت و تقوی سے لوگ مطمئن ہوں یہ کہہ کر دے دیا جائے کہ وہ اس رقم کو فلاحی و رفاہی کاموں پر صرف کر دے، جواب مذکور اس صورت میں ہے، جبکہ مدیون ادائیگی کی استطاعت کے باوجود وقت میعاد پر ادا نہ کرے لیکن اگر وہ خدانخواستہ تنگ دست ہے تو اسے تو رب العالمین ہی نے فراخی اور مہلت دے دی ہے: ''وإن کان ذو عسرة فنظرة إلی میسرة'' (سورۂ بقرہ: ۲۸۰) اور جب کبھی بھی اسے استطاعت ہو جائے گی تو ثمن کی زائد رقم نہ دے کر اصل رقم دے گا۔ یہ مالی جرمانہ اور تاوان نہیں ہے جو تقریباً تمام فقہاء کرام قدیم و جدید کے یہاں غیر مشروع ہے۔

۸- (الف)...... جمہور کے نزدیک شئی مرہون سے انتفاع جائز نہیں مگر ایک قوم نے کہا ہے کہ اگر حیوان ہو تو اس سے انتفاع اتنی مقدار میں ہو سکتا ہے جتنا کہ بطور چارہ اس پر خرچ کیا ہے، اور یہ مسلک امام احمد اور اسحاق بن راہویہ کا ہے (بدایۃ المجتہد ۲/۲۹۹)۔

علامہ ابن حزم کی تحریر سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے: ''وأما الرکوب والا حتلاب خاصة لمن أنفق علی المرکوب والمحلوب، فلمارویناه من طریق البخاری عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم قال: الظهر یرکب بنفقته إذا کان مرهونا ولبن الدر یشرب بنفقته إذا کان مرهونا'' (محلی ۸/۹۰)۔

امام مالکؒ بھی راہن سے شرط لگانے کے بعد بعض چیزوں میں انتفاع کے جواز کے قائل ہیں لیکن ابن حزم نے ان پر بایں الفاظ نقد کیا ہے:

''وأما مالك فإنه قال: لا بأس أن یشترط المرتهن منفعة الرهن إلی أجل فی الدور والأرضین وکره ذلك فی الحیوان والثیاب وهذا قول لا برهان علی صحته، وتقسیم فاسد و شرط لیس فی کتاب الله تعالی فهو باطل'' (محلی ۸/۹۱)۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کے نزدیک بدون الشرط انتفاع درست نہیں، ہاں اگر راہن سے لگائی جائے تو بعض اشیاء میں بغیر کراہت اور بعض میں مع الکراہت انتفاع درست ہوگا۔ نیز علامہ ابن عابدین شامی نے فتح القدیر سے نقل کیا ہے کہ

''لایحل له أن یتفع بشئ منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له فی الربا'' (خلاصۃ الفتاوی ۴/۱۸۶)
(اگر راہن مرتہن کو انتفاع کی اجازت دے دے تو بھی انتفاع درست نہ ہوگا کیونکہ یہ اجازت ربا پر مشتمل ہے جس کی حرمت طے ہے)۔

نیز ابن قدامہ حنبلی کی تحریر سے بھی بقدر چارہ جواز کی گنجائش ہے۔ چارہ اضطراراً (راہن کے غائب ہونے یا قدرت نہ ہونے) یا بدون الاضطرار (راہن کی

قدرت کے باوجود یا اس کی اجازت) سے دیا جائے بہر حال دونوں انتفاع درست ہے۔

''فأما المحلوب والمركوب فللمرتهن أن ينفق عليه ويركب ويحلب بقدر نفقته متحر يا للعدل فى ذلك نص عليه أحمد... وهو قول إسحاق وسواء أنفق مع تعذر النفقة من الراهن لغيبته أو امتناعه من الإنفاق أو مع القدرة على أخذ النفقة من الراهن واستئذانه'' (مغنی وشرح ۴/۴۳۲)۔

اس کے بعد ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل سے ایک روایت جمہور علماء وائمہ کے موافق بھی ہے جس میں شئے مرہون کا کسی حالت پر انتفاع درست نہیں۔

''وعن أحمد رواية أخرى لا يحتسب له بما أنفق وهو متطوع بها ولا ينتفع من الرهن بشئ وهذا قول أبي حنيفة و مالك والشافعي لقول النبي صلى الله عليه وسلم: الرهن من راهنه له غنمه وعليه غرمه'' (حوالہ سابق)

اس دعوی کی دلیل میں کچھ اور اقتباسات ائمہ وفقہاء بھی منقول ہیں۔

''وقال الشافعي: جميع منافع الرهن للراهن كما كانت، وقال أبو ثور بذلك قال أبو محمد: وقدروی عن ابن مسعود وابن عمر و شريح أن لا ينتفع المرتهن بشئ من الرهن'' (محلی لابن حزم ۹۳، ۸/۹۱)۔

صاحب بحر الرائق ۸/۲۳۸ پر لکھتے ہیں:

''قال فى المبسوط: وليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون إلا بإذن الراهن، فإن أذن له جاز أن يفعل ما أذن له فيه ولو فعل من غير إذن صار ضامنا بحكم الرهن''۔

(مبسوط میں ہے کہ مرتہن شئے مرہون سے راہن کی اجازت کے بغیر انتفاع نہیں کرسکتا اور اگر راہن نے اجازت دیدی تو اس کا نفاذ صرف انہیں صورتوں میں ہوگا جس کی تخصیص راہن نے کردی ہے اور اگر بدون اجازت انتفاع کیا تو مرتہن پر ضمان لاگو ہوگا)۔

مذکورہ تمام تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ انتفاع کے سلسلہ میں عبارات فقہاء ومسالک ائمہ متعارض ہیں بعض کے نزدیک چارہ کھلانے کے بقدر انتفاع جائز ہے تو بعض کے یہاں مطلقا درست نہیں، اس کا بطور چارہ خرچ کرنا تبرعا ہوگا، بعض کے نزدیک راہن کی اجازت سے انتفاع جائز ہے تو بعض کے یہاں باوجود اجازت کے درست نہیں۔ اگر علامہ ابن قدامہ کی تحریر جو (۴/۴۳۲) پر ہے، اس کو ملحوظ رکھا جائے تو مسئلہ اور آسان ہوجاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل اور امام مالک سے بھی ایک روایت عدم انتفاع ہی کی ہے جو مسلک جمہور کے عین مطابق ہے۔

اس احقر کی تو رائے یہ ہے کہ عدم انتفاع کو عام رکھا جائے اور شئے مرہون اگر حیوان ہو تو اس سے دودھ نکال ہی لیا جائے اور معاملہ اس طرح کیا جائے کہ متعاقدین کے درمیان انتفاع معہود بدون الشرط ہو تاکہ جانور کو دودھ نہ نکالنے کی صورت میں جو تکلیف اور ضیق ہوتی ہے اس سے بچایا جاسکے۔

(ب)......اگر شئے مرہون کی ہلاکت میں بائع کی تعدی کو دخل نہیں یعنی بائع نے شئے مرہون کی حفاظت ونگہداشت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس کے باوجود شئے ہلاک ہوگئی تو یہ ہلاکت مشتری کے مال سے سمجھی جائے گی اور معاملہ فسخ نہ ہوگا اور اگر بائع کی زیادتی وتعدی کو اس کی ہلاکت میں دخل ہے تو اس وقت مرتہن بازار قیمت کا ضامن ہوگا نہ کہ ثمن کا، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''فالمرهون إذا هلك لا يخلوا إما أن يهلك بنفسه وإما أن يهلك بالاستهلاك، فإن هلك بنفسه يهلك مضمونا بالدين عندنا'' (بدائع الصنائع ۶/۱۵۴)۔

مسئلہ مبحوثہ میں کتب فقہیہ کے دیکھنے کے بعد ائمہ کے مذاہب اس طرح ہیں:

امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر، ابن ابی لیلی اور حسن بن صالح کے نزدیک رہن مضمون ہے دین اور اس کی اقل قیمت کے ساتھ ابن وہب نے امام مالک کا مذہب یوں بیان کیا ہے کہ اگر ہلاکت معلوم ہو تو وہ راہن کے مال سے ہوگی اور اگر نا معلوم ہو تو مرتہن کے مال سے محسوب ہوگی۔ ابن القاسم نے جو فقہ مالکی کے ایک بڑے ترجمان ہیں مدونہ میں بھی یہی ذکر کیا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک یہ شئے امانت ہوگی، کسی حالت میں بھی مرتہن پر ضمان نہ ہوگا جبکہ ابوبکر جصاص رازی (بحوالہ احکام القرآن ۲/۳۲۷۔ ۳۳ از مولانا ظفر احمد عثمانی) لکھتے ہیں کہ سارے صحابہ ضمان پر متفق ہیں، ہاں کیفیت ضمان میں اختلاف ہے، اسی کی تائید ابن عابدین شامی کی اس عبارت سے بھی ہورہی ہے جو درج ذیل ہے:

''لأنه حنيئذ يصلح الخ أي لتعين ملكه فيه حتى لو هلك يهلك على المشتري ولا ينفسخ العقد، قوله: لأنه محبوس بالثمن أي و ضمانه يخالف ضمان الرهن، فلا يكون مضمونا بضمانين مختلفين لاستحالة اجتماعهما حتى قال: أمسك المبيع حتى أعطيك الثمن قبل القبض فهلك انفسخ البيع۔ زيلعي'' (ردالمحتار علی الدر ۷ /۹۴ /۶)۔

(قبضہ کی وجہ سے مشتری کی ملکیت کا تعین ہو چکا، اس لیے اگر شئ مرہون ہلاک ہو جاتی ہے تو معاملہ فسخ نہ ہوگا، اس لیے کہ محبوس بالثمن کا ضمان رہن کے ضمان سے مختلف ہے اور ایک ہی شئے دو ضمانوں کے ساتھ مضمون نہیں ہو سکتی حتی کہ اگر مشتری مبیع پر قبضہ کیے بغیر بائع سے کہہ دے کہ جب تک میں تم کو ثمن ادا نہ کردوں مبیع اپنے پاس رکھنا اور اس صورت میں اگر مبیع ہلاک ہو جاتی ہے تو معاملہ بیع بھی فسخ ہو جائے گا)۔

اس حقیر کی بھی وہی رائے ہے جس کی جانب جمہور کا میلان ہے اور جس کی تائید ابو بکر جصاص اور ابن عابدین شامی کی تحریروں سے ہو رہی ہے۔

(ج) اگر خریدار وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کر سکے تو بائع شئ مرہون کو فروخت کر کے اپنی واجب الاداء قیمت لے لے گا اور مابقیہ خریدار کو واپس کر دے گا۔

فتاوی وفقہ کی بیشتر کتابوں میں اس کا حکم یہی مرقوم ہے، لیکن یہ کام اگر قضاء قاضی کے توسط سے ہوتا تو بہتر تھا، ممکن ہے راہن کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ شئے مرہون کم قیمت پر فروخت کر دی گئی ہے، دوسری ایک صورت یہ بھی ہے کہ مرتہن شئے مرہون کسی معتبر آدمی کے حوالہ کر دے اور وہ اسے فروخت کر کے اس پر گواہ بنا لے۔ بندہ کو اس سلسلہ میں مجموع الفتاوی کی عبارت مناسب معلوم ہو رہی ہے۔ جو درج ذیل ہے:

''فأجاب إذا كان أذن له في بيعه جاز وإلا باع الحاكم إن أمكن ووفاه حقه منه، ومن العلماء من يقول: إذا تعذر ذلك دفعه إلى ثقة يبيعه و يحتاط بالإشهاد على ذلك ويستوفي حقه منه'' (مجموع الفتاوی ۲۹/۵۳۸)۔

۹- (الف)...... اس کا جواب سوال ۸ کے جز (ب) کے ذیل میں گزر چکا۔

(ب)...... حبس المبیع لا ستیفاء الثمن کی صورت میں اگر مبیع ہلاک ہو گئی تو یہ معاملہ فسخ ہو گیا اور بائع ثمن مشتری کے حوالہ کرے گا نہ کہ بازار کی قیمت۔ ''فلو هلك المبيع وهو محبوس عنده ينفسخ البيع ولا يكون مضمونا عليه بقيمته السوقية''۔

واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں فروخت شدہ سامان کو بائع اپنے پاس (جبکہ مشتری سے معاملہ ادھار کیا گیا ہے) بطور رہن رکھے گا۔ حبس المبیع لا ستیفاء الثمن بیع تقسیط میں نہیں چل سکتا، کیونکہ وہ بیع مؤجل ہے اور اس کا وجود اس بیع میں ہوتا ہے جو معجّل ہو۔ فتاوی ہندیہ میں ہے:

''قال أصحابنا رحمهم الله تعالى: للبائع حق حبس المبيع لا ستيفاء الثمن إذا كان حالاً كذا في المحيط إن كان مؤجلا، فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده كذا في المبسوط''۔

شئے مرہون کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ مبیع قابل للبیع ہو، دوسرے یہ کہ مرتہن یا اس کے نائب کو مرہون پر قبضہ کرا دیا جائے بوجہ ارشاد ربانی ''فرهان مقبوضة'' تیسری یہ کہ مرہون غیر مرہون سے فارغ اور خالی ہو یعنی اگر مکان وغیرہ گروی رکھا ہے تو اس میں سے سامان وغیرہ راہن نکال لے اور پھر مرتہن کے حوالہ کرے، صاحب بدائع لکھتے ہیں:

''ومنها أن يكون المرهون فارغا عما ليس بمرهون''۔

صاحب بدایۃ المجتہد بھی اسی کی ترجمانی اپنے الفاظ میں کرتے ہیں: ''فأما شروط الصحة المنطوق بها في الرهن: أعني في كونه رهنا فشرطان: أحدهما متفق عليه بالجملة، فأما القبض فاتفقوا بالجملة'' (۲۹۷/۲) (شئے مرہون کی دو شرطوں میں سے ایک شرط متفق علیہ ہے اور وہ مرتہن کا قبضہ ہے)۔ یہی مفہوم محلی ابن حزم (۸۸/۸، احکام القرآن از مفتی ظفر احمد عثمانی ۲/ ۲۳ ۷) کی عبارتوں سے بھی نکلتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مشتری اولاً مبیع پر قبضہ کرے گا اور پھر بائع کو وہ شئے بطور رہن لوٹا دے گا، یہی شکل ادھار کی صورت پر رہن کی ہوگی۔ مبیع پر قبضہ کیے بغیر بائع کا گروی رکھنا درست نہیں ہے۔

۱۱- اگر بائع نے مشتری سے بیع بالاقساط کر کے مبیع اپنے ہی پاس رکھ لی تو اس صورت میں بائع مرتہن ہوا اور مشتری راہن، اس کا تفصیلی جواب گزر چکا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ بائع نے مشتری کے حوالہ مبیع بھی کر دی تو کیا مشتری کو اس میں تصرف کا حق حاصل ہوگا؟ جیسا کہ پہلی صورت میں حاصل تھا جبکہ شئے مرہون بائع کے پاس تھی کیونکہ مرہون کو بائع سے لے کر راہن انتفاع کر سکتا تھا اور پھر اسے مرتہن کے

پاس لوٹانے کا حق تھا۔ صاحب ہدایہ کی اس عبارت کی روشنی میں اس کا حکم واضح ہوجاتا ہے جو نیچے ذکر کی جارہی ہے۔

''وإذا أعار المرتهن الرهن للراهن ليخدمه أو ليعمل له عملا فقبضه خرج من ضمان المرتهن لمنافاة بين يدالعارية ويد الرهن. فان هلك في يد الراهن هلك بغير شئ لفوات القبض المضمون وللمرتهن أن يسترجعه، إلى يده؛ لان عقد الرهن باق'' (هدایہ ۵۳۰/۳)۔

(اگر مرتہن شئے مرہون راہن کو خدمت اور استعمال کے لیے عاریۃ دے دے اور راہن اس پر قبضہ بھی کرے تو وہ چیز مرتہن کے ضمان سے نکل جائے گی، اس لیے کہ یدرہن و ید عاریت دونوں میں منافات ہے۔ اب اگر راہن کے پاس وہ چیز ہلاک ہوگئی تو بغیر کسی ضمان کے ہلاک ہوگی، اس لیے کہ اس چیز پر راہن کا قبضہ مضمون قبضہ نہیں اور مرتہن کے لیے دوبارہ اس چیز کو اپنے قبضہ میں لینا جائز ہے، اس لیے کہ معاملہ رہن ابھی باقی ہے)۔

بہرکیف بائع کو سارے اختیارات رہن کے باقی ہیں اور عدم ادائیگی کی صورت میں مبیع کو فروخت کر کے اس کی قیمت لینے کا تو حق پہلے ہی سے حاصل ہے، اس لیے خود خریدار کے پاس شئے مرہون رکھتے ہوئے بائع کو فروخت وتصرف کا حق حاصل ہوگا، بندہ کے خیال میں اس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے زیادہ سے زیادہ یہی خرابی لازم آئے گی کہ مرتہن کا شئے مرہون پر قبضہ ہونا چاہیے جو یہاں مفقود ہے۔ تو قبضہ حسی نہ سہی قبضہ معنوی تو مرتہن کا ثابت ہی ہے۔

۱۲- گارنٹی محض ایک عقد تبرع ہے، کوئی مادی چیز نہیں جس پر نفع لینا جائز ہو، جب فقہاء نے ''استقراض بالربح'' سے منع فرمایا ہے جبکہ وہ بھی عقد تبرع ہی ہے تو اس کی ممانعت صورت مسئولہ میں بدرجہ اولی ہوگی، کیونکہ کفالت میں مکفول لہ کی طرف سے دین کی ادائیگی کا محض التزام ہوتا ہے، لیکن چونکہ بینکنگ نظام اور تجارت کے عرف میں غیر مادی چیز کو فی زمانہ مال گردانا جاتا ہے اور بالمعاوضہ اس کا لین دین عام سے عام تر ہوتا جارہا ہے، لہذا اب یہ صرف عقد تبرع نہیں رہا بلکہ تجارت کا ایک لازمی عنصر ہوگیا ہے، بنابریں احقر کی رائے یہ ہے کہ اس کی گنجائش نکلنی چاہیے، ظاہر ہے اس دور میں بینک کے علاوہ کوئی پائدار اور مضبوط وثیقہ بن سکتا ہے جس پر سبھی کو اعتماد ہو؟ اس لیے کفیل خواہ بینک ہو یا اشخاص کریڈٹ لیٹر کا واجبی معاوضہ مکفول عنہ سے لیا جاسکتا ہے۔

۱۳- چونکہ دستاویز محض ایک وثیقہ ہے جو ثمن بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے اس کی بیع وشراء نہیں ہونی چاہیے (اعلاء السنن ۲۴۳/۱۴، شامی ۱۵/۴)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتاوی سے بھی اسی کی تائید ہورہی ہے۔ ''والصواب الذى عليه جمهور العلماء أو هو ظاهر مذهب الشافعي أنه يجوز بيع الدين ممن هو عليه، لأن ما في الذمة مقبوض للمدين'' (فتاوی ابن تیمیہ ۵۱۱/۲۹، ۵۱۲)۔

ہاں اگر مدیون ہی سے یہ معاملہ کرلیا جائے تو جواز کی گنجائش ہے، مگر یہ بات ملحوظ رہے کہ اس میں جتنی رقم پر متعاقدین کے درمیان معاملہ طے ہوا ہے اسی قیمت پر فروخت کرنا چاہیے، کیونکہ تداول وتعاطی کے باعث اب اس کی حیثیت ثمن کی ہوگئی تو اگر کمی وزیادتی کے ساتھ معاملہ کیا گیا تو گویا کم دے کر زیادہ یا زیادہ دے کر کم لیا گیا، ساتھ ہی نسیہ بھی ہے اور یہ تینوں ممنوع نہیں جس کے ربا ہونے میں کوئی شبہ نہیں، حاصل یہ کہ تحریر شدہ رقم کے مطابق بدون کمی وزیادتی کے اگر معاملہ کرلیا جائے تو اس کے جواز کا امکان ہے۔ اور یہ معاملہ حوالہ اور استقراض کے قبیل سے ہوجائے گا (اعلاء السنن ۲۴۴/۱۴)۔

جسٹس تقی عثمانی صاحب نے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس معاملہ کو صحیح قرار دیا ہے (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ/۲۹)۔

بندہ کا بھی رجحان جواز ہی کی جانب ہے۔

۱۴- اعلاء السنن (۵۰۸/۱۴ و احکام القرآن ۴۸۳/۱) کی عبارتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دائن کو اپنے قرض کی وصولی میں اختیار ہے چاہے قرض دیون مؤجلہ سے ہوں یا دیون حالّہ سے، جمہور ائمہ کا یہی مسلک ہے، لیکن امام مالک اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ دائن مدیون کے درمیان طے شدہ مدت سے پہلے دائن کو وصولی کا حق نہیں ہے، اتنی گفتگو کے بعد ظاہرا یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ ''ضع وتعجل'' کی صورت انہیں لوگوں کے یہاں ہوگی جو دائن کو وصولی کا حق بہرحال دیتے ہیں، یہ صورت حضرت امام مالکؒ کے یہاں ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ جب مدت سے پہلے وصولی کا

حق نہیں تو پھر ضع وتعجل کا سوال ہی کہاں سے اٹھتا ہے؟

مجوزین وغیر مجوزین نے دومختلف حدیثوں سے استدلال کیا ہے، طائفہ اولی کی دلیل آپ ؐ کی وہ روایت ہے جسے بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی سند سے نقل کیا ہے کہ جب آپ ؐ نے بنی نضیر کو مدینہ طیبہ سے جلاوطن کرنے کا حکم فرمایا تو کچھ لوگ آنحضور ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے بنونضیر کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا ہے، حالانکہ لوگوں پر ان کے دیون باقی ہیں جن کا وقت اداء ابھی نہیں آیا ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ ساقط کردو اور جلدی ادا کردو۔ غیر مجوزین کی دلیل یوں ہے کہ:

''عن المقداد بن الأسود قال اسلفت رجلا مائة دينار ثم خرج سهمي في بعث بعثه رسول الله ؐ فقلت له: عجل لي تسعين دينارا و أحط عشرة دنانير فقال نعم: فذكر ذلك رسول الله ﷺ فقال: أكلت ربا يا مقداد وأطعمته'' (السنن الکبری للبیہقی ۶/ ۲۸)۔

میں نے ایک شخص کو سو دینار قرض دیے اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو وفد بھیج رہے تھے اس میں میرا نام بھی آ گیا، میں نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار فوراً دے دو تو میں دس دینار چھوڑ دیتا ہوں، اس نے منظور کرلیا پھر بعد میں کسی وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اے مقداد تم نے خود بھی سود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔

بہرحال مذکورہ دونوں احادیث کو بیہقی نے نقل فرمانے کے بعد ضعیف الاسناد کہا ہے، اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی قابل استناد نہ رہ جائے گی، اس لیے ضابطہ مشہورہ حلت وحرمت کے بیچ تعارض کی صورت میں حرمت کو ترجیح دی جائے گی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابن قدامہ کی عبارت بھی جو اس سلسلہ میں ائمہ کے اقوال سے متعلق ہے تحریر کردی جائے۔

''إذا كان عليه دين مؤجل فقال لغريمه ضع عني بعضه واعجل لك بقيته لم يجز كرهه زيد بن ثابت وابن عمر والمقداد و سعيد بن المسيب وسالم والحسن و حماد والحكم والشافعي ومالك والثوري وهيثم وابن عطية وإسحاق وأبوحنيفة وقال المقداد لرجلين: فعلا ذلك كلا كما قد آذنا بحرب من الله ورسوله'' (المغنی وشرح ۴/ ۱۷۴)

(اگر کسی شخص کا دوسرے پر دین موجل ہو اور وہ شخص اپنے قرض خواہ سے کہے کہ دین کا کچھ حصہ مجھ سے ساقط کردو تو میں بقیہ دین ادا کردوں گا تو یہ صورت ناجائز ہے، اسے مذکورہ ائمہ وفقہاء نے ناپسند کیا ہے اور ایسے ہی دو شخصوں سے حضرت مقداد ؓ نے کہا کہ تم دونوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا ہے)۔

ہاں اس صورت میں جبکہ دائن اپنے مدیون سے کہے کہ تم میرا دین جلد ادا کردو میں تمہیں کچھ دین معاف کردوں گا، اس صورت میں دائن نے تبرعاً اگر کچھ چھوڑ دیا تو جائز ہے، بالفاظ دیگر بغیر شرط کے دائن کچھ حصہ دین کا ساقط کردے اور مدیون بغیر شرط کے دین جلدی ادا کردے۔ (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ۲۹-۳۰)۔

ابن حزم کی ایک عبارت بھی اسی کی ترجمانی ہوتی ہے (محلی ابن حزم ۸/ ۸۴)۔

خلاصہ کلام اس عاجز کے خیال میں یہ ہے کہ نصوص فقہاء وکتب فتاوی کے مطالعہ کے بعد احوط یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدت کے مقابلے میں دین کے کچھ حصہ کے سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا جائے جبکہ وہ مع الشرط ہو، ہاں بدون الشرط تبرعاً بعض حصہ کا سقوط جائز ہے، اس کے عدم جواز کی ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ جب تاجیل کے مقابلہ میں دین کی زیادتی سے (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) ربا کا ثبوت ہوجاتا ہے تو آخر تعجیل کے مقابلہ میں حط اور کمی ربا کا باعث کیوں نہیں ہوگی۔

۱۵- بندہ کی رائے یہ ہے کہ اگر معاملہ ادھار کیا گیا اور قیمت کی ادائیگی کے لیے صرف یہ طے ہوا کہ بعد میں دے دیں گے اور پھر رقم کم کر کے نقدی وفوری ادا کردی گئی تو یہ ایک ہی معاملہ ہے جو بیعتین فی بیعۃ کے تحت نہیں ہے، اس لیے ایسا کرنا جائز ہے، کیونکہ اسقاط اجل بھی صحیح ہے اور ثمن کی کمی بھی بدون الشرط قابل قبول ہے۔

۱۶- دین چاہے مؤجل ہو یا غیر مؤجل، بہر دونوع دائن اپنا قرض جب چاہے وصول کرسکتا ہے، بیع بالاقساط تو صرف ایک وعدہ ہے، امام ابو

حنیفہ اور ان کے اصحاب امام اوزاعی، ابن منذر، امام شافعی، ابراہیم نخعی اور ابن ابی شیبہ کا یہی مسلک ہے، لیکن امام مالک اور لیث کے نزدیک دین تاجیل سے موجل ہو جاتا ہے حلول سے قبل مطالبہ درست نہیں۔

علامہ ابن قدامہ مغنی تحریر کرتے ہیں کہ:

''وإن أجل القرض لم يتأجل وكان حالا وكل دين حل أجله لم يصر مؤجلا بتأجيله وبهذا قال الحارث العكلى والاوزاعى وابن منذر والشافعى، وقال مالك والليث: يتأجل الجميع بالتأجيل وقال أبوحنيفة: فى القرض وبدل المتلف كقولنا'' (الشرح ۴/۳۵۴)۔

شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی کے نزدیک بھی قرض موجل ہو یا غیر موجل دائن جب چاہے اسے وصول کر سکتا ہے اور ایسے ہی عاریۃ اور اس کے علاوہ اس لیے کہ ان کے نزدیک تاجیل صرف ایک وعدہ اور ہبۃ غیر مقبوض کے مانند ہے۔ ''سواء كان القرض إلى أجل أو غير أجل له أن يأخذه متى أحب وكذلك العارية وغيرہا؛ لأن عندهم من باب العدة والهبة غير مقبوضة'' (عمدۃ القاری ۶/۶۰)۔

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ قرض میں حق فی الفور ثابت ہو جاتا ہے، تاجیل صرف تبرع اور وعدہ ہے۔ لہذا اس سے ایفاء لازم نہیں آتا جیسا کہ کسی کو کوئی چیز عاریتاً دی اور اسے موجل کر دیا۔

''ولنا أن الحق يثبت فى القرض حالا والتأجيل تبرع منه ووعد، فلا يلزم الوفاء به كما لو أعاره شيئا واجله'' (اعلاء السنن ۱۴/۵۰۸)۔

مذکورہ احکام اس صورت میں ہیں جبکہ دائن ومدیون کے درمیان کسی طرح کی کوئی شرط نہ ہو لیکن اگر شرط لگائی گئی کہ تم نے قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی تو یہ معاملہ ختم ہو کر فوری نقدی بن جائے گا تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

''ولو قال: كلما دخل نجم ولم تؤد، فالمال حال صح ويصير المال حالا'' (خلاصۃ الفتاوی ۳/۵۴)۔

اور شرط فاسد کے باوجود بطلان اجل ہو جائے گا۔

۱۷- جمہور فقہاء وائمہ کے نزدیک میت دائن ہو یا مدیون مرتے ہی مہلت کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ دین فی الفور واجب الادا ہو جائے گا۔

''كل من مات وله ديون على الناس مؤجلة أو للناس عليه ديون مؤجلة، فكل ذلك سواء، وقد بطلت الآجال كلها وصار كل ما عليه وله من دين حالا'' (اعلاء السنن ۱۴/۵۱۵)۔

لیکن امام مالکؒ کے نزدیک اگر میت مدیون ہے تو فی الفور واجب الادا ہوگا اور اگر میت دائن ہے تو وہ موجل ہی رہے گا۔

''وقال مالك: أما الديون التى عليه مؤجلة، فقد حلت وأما التى له على الناس فالى اجلها'' (حوالہ سابق)

احناف ودیگر ائمہ کے دلائل ''من كان له دين إلى أجل، فإذا مات فقد حل'' ''إذا مات الميت فقد حل دينه'' ہیں۔

لیکن ابن قدامہ کی تحریر سے جہاں مذاہب ائمہ معلوم ہوتے ہیں وہیں یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ امام مالک کا مسلک بھی وہی ہے جو جمہور ائمہ کا ہے۔

''فأما إن مات وعليه ديون مؤجلة تحل بالموت؟ فيه روايتان إحدا هما لا تحل إذا وثق الورثة وهو قول ابن سيرين وعبيد الله بن الحسن واسحاق وابي عبيد وقال طاؤس وأبوبكر بن محمد والزهرى وسعيد بن ابراهيم: الدين إلى أجله وحكى ذلك عن الحسن والرواية الاخرى أنه يحل بالموت، وبه قال الشعبى والنخعى وسوار و مالك والثورى والشافعى وأصحاب الرأى'' (مغنی لابن قدامہ ۴/۴۸۶)۔

(اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور اس پر دین موجل ہو تو کیا موت کی وجہ سے وہ دین فوری واجب الادا ہوگا؟ اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ اگر ورثاء اس دین کی توثیق کر دیں تو پھر وہ فوری واجب الادا نہ ہوگا، یہ قول محمد بن سیرین، عبیداللہ بن حسن، اسحاق اور ابوعبید کا ہے، البتہ طاؤس، ابوبکر بن محمد، علامہ زہری اور سعید بن ابراہیم کہتے ہیں کہ وہ دین اپنی مدت تک موجل ہی رہے گا اور امام حسن سے بھی یہی منقول ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہو جائے گا۔ یہ قول امام شافعی، امام نخعی سوار امام مالک، امام ثوری اور اصحاب الرائے سے منقول ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ امام مالکؒ کا جمہور کے ساتھ جزئی اشتراک ہے، اس لیے ان کے مسلک کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔
بہرکیف مغنی وغیرہ کے حوالہ سے ائمہ کے مذاہب معلوم ہو گئے لیکن خود علماء احناف کے درمیان قدرے اختلاف ہے، متقدمین احناف کا تو وہی مسلک ہے جو اوپر بیان کیا گیا مگر متاخرین احناف کی رائے اس کے برعکس ہے۔

''قفی المدیون الدین قبل الحلول أو مات فاخذمن ترکتة ۔ فجواب المتاخرین: أنه لا یأخذ من المرابحة التی جرت بینهما إلا بقدر ما مضی من الأیام قیل له: أتفتی به أیضا؟ قال: نعم، وذکر الشارح آخر الکتاب : أنه افتی به المرحوم مفتی الروم أبو السعود وعلله بالرفق من الجانبین'' (ردالمحتار علی الدر ۱۶۰/۵)۔

وہ یہ کہ اگر مدیون نے دین موجل مدت کے حلول سے قبل دے دیا یا اس کا انتقال ہو گیا اور دین میت کے ترکہ سے وصول کیا گیا تو ان دونوں صورتوں میں متعاقدین کے درمیان جو ثمن طے ہوا تھا اس میں سے صرف اسی قدر لے گا جو گزشتہ مدت کے مقابلہ میں ہوگا یہی متاخرین احناف کا جواب ہے۔ آخر کتاب (۷۵۷/۶) پر شارح نے ذکر کیا ہے کہ اسی کے مطابق مفتی روم ابوالسعود کا فتوی ہے اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس میں بائع اور مشتری دونوں کی رعایت موجود ہے۔

ابن عابدین نے اس کی صورت یوں بیان کی ہے:

''اشتری شیئا بعشرة نقد او باعه لاخر بعشرین إلی أجل هو عشرة اشهر فإذا قضاه بعد تمام خمسة أو مات بعدها یأخذ خمسة ویترك خمسة'' (بحوالہ رد المحتار علی الدر ۷۵۷/۶)۔

اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری نے کوئی چیز دس درہم نقد میں خریدی اور پھر مبیع کسی تیسرے کو دس ماہ کی مدت پر ادھار کے ساتھ بیس درہم میں فروخت کر دیا پس جبکہ پانچ ماہ ہوئے مشتری ثانی اس کی قیمت ادا کر دے یا وہ مرجائے تو اس صورت میں بائع صرف نفع کے پانچ درہم وصول کرے گا اور پانچ درہم چھوڑ دے گا، یعنی کل پندرہ درہم وصول کرے گا۔

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی عبارت ''ولعل الصورة الأخیرة أولی للبعد عن تذبذب الثمن بآجال مختلفة التی مشابهة صوریة للمعاملات الربویه'' (قضایا فقهیه/۴۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک حنبلی مسلک پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کے باعث معاملات ربویہ سے مشابہ صورت پائی جاتی ہے اس سے احتراز ہو سکے گا۔ لیکن بندہ کے خیال میں حنبلی مسلک پر عمل کی صورت میں ضمان ورہن کی ضرورت پڑتی ہے، جس کے لیے ممکن ہے ورثاء راضی نہ ہوں، پھر یہ کہ کیا یہ ضروری ہے کہ میت و دائن کے درمیان جو معاملات اور روابط تھے وہی ہم آہنگی دائن اور ورثاء کے درمیان بھی برقرار رہے، اس لیے میرے نزدیک متاخرین احناف کے مسلک پر عمل کیا جانا زیادہ بہتر ہے جو بقول شامی ارفق للجانبین بھی ہے۔

۱۹- یہ معاملہ مفضی الی المنازعت ہے، میری دانست میں اس کی گنجائش نہیں دینی چاہیے، کیونکہ یہ صورت قمار سے ملتی ہے۔

☆☆☆

شرعی نقطۂ نظر سے ادھار قیمت کی بالاقساط ادائیگی

مولانا خورشید احمد اعظمی، مئو

۱- جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں زیادہ کرنا درست ہے (سنن الترمذی ۳/ ۵۲۴، حدیث ۱۲۳۱)۔

۲- ثمن کو متعدد قسطوں میں طلب کرنا بھی درست ہے، آپس میں یہ بات طے پاجائے تو مفضی الی النزاع بھی نہیں ہوگی
(درمختار ۴/ ۲۲، ہدایہ ۲/ ۴، البحر الرائق ۵/ ۲۸۰)

۳- ادھار فروختگی کی صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف ادھار قیمت کا ہی تذکرہ ہو، بلکہ ایسی صورت میں، جبکہ وہ ادھار معاملہ میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں زیادہ قیمت رکھتا ہے اس کا جواز ہے کہ بائع مساومت اور معاملہ کے وقت نقد اور ادھار دونوں قیمتوں کا تذکرہ کرے، اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، البتہ بیع کے صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عاقدین اسی مجلس میں اس کی تعیین کرلیں کہ بیع نقد رہے گی یا ادھار، اگر وہ معاملہ کو مبہم چھوڑ دیتے ہیں کہ مشتری اپنی مرضی سے کسی ایک کی تعیین کرلے گا تو یہ درست نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۲/ ۲۴۳)۔

۴- ادھار بیع کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرہ میں نہیں آئے گا، اگر چہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادتی مدت کے مقابلہ میں ہے پھر بھی یہ ربا کے دائرہ میں اس لیے نہیں آئے گی کہ بیع کے وقت عاقدین کی رضامندی سے جو قیمت مقرر ہوتی ہے وہی ثمن قرار پاتی ہے، اب بائع ہر حال میں اسی ثمن کا مطالبہ کرسکتا ہے، خواہ مشتری وقت مقررہ پر اس ثمن کی ادائیگی کرے یا وقت مقررہ سے بھی تاخیر کرے، وقت مقررہ سے زیادہ تاخیر کی صورت میں اگر کسی اضافہ کا مطالبہ ہوگا تو وہ مدت کے عوض ہوگا، اور ربا کہلائے گا، اسی طرح اگر مشتری اس شرط پر وقت سے پہلے ثمن کی ادائیگی کرتا ہے کہ بائع اصل ثمن میں کچھ کمی کردے تو یہ بھی درست نہیں ہوگا۔ (نیل الأوطار للشوکانی ۵/ ۲۵۰)۔

۵- معاملہ کی یہ شکل شرعا درست ہونی چاہیے، کیونکہ معاملہ کی دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کی تعیین تمام عقد سے پہلے اس عقد کو مفضی الی النزاع ہونے سے بچالے گی، اور اجل یعنی مدت اور ثمن کی جہالت لازم نہیں آئے گی۔

۶- معاملہ کی یہ صورت شرعا درست نہیں ہے، اور تاخیر کی صورت میں اصل ثمن یعنی دس روپئے پر یہ دو روپئے کا اضافہ سود اور ربا ہوگا، اگر چہ نفس عقد کے وقت ہی کیوں نہ یہ طے ہوا ہو (الفقه علی المذاهب الأربعة ۲/ ۲۴۶، تکملة فتح الملهم ۱/ ۵۶۷ بحوالہ احکام القرآن ۱/ ۵۵۷)۔

۷- معاملہ کی یہ صورت شرعا جائز نہیں ہے، کیونکہ وقت مقررہ پر قیمت یا قسط کا ادا نہ کرنا دو وجوہ سے ہوسکتا ہے:

ا- یا تو مشتری تنگدست اور مفلس ہوگا، اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے قول مبین "وإن کان ذو عسرة فنظرة إلی میسرة" (سورۂ بقرہ: ۲۸۰) اور حدیث پاک: "من أحب أن یظله الله فی ظله فلینظر معسرا أو لیضع له" (ابن ماجہ ۲/ ۸۰۸) کے پیش نظر اس کو مزید مہلت ملنی چاہیے، اور اس کے لیے سہولت اور آسانی کا راستہ نکالنا چاہیے، نہ کہ اس کے اوپر مزید مالی بوجھ ڈال کر ظلم کا راستہ اختیار کیا جائے، امیر صنعانیؒ صاحب "سبل السلام" لکھتے ہیں:

"ثم یدل بمفهومه علی أن مطل غیر الواجد وهو المعسر لا یحل عرضه ولا عقوبته، والحکم کذلك عند الجماهیر، وهو الذی دل له قوله تعالی: فنظرة إلی میسرة" (سبل السلام ۲/ ۸۷۶)۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں: "فإذا أعسر المدیون وجب النظارة ولا سبیل إلی ضربه ولا إلی حبسه" (فتح الباری ۴/ ۳۰۹)۔

علماء کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ معسر اور تنگ دست کو عدم ادائیگی کی صورت میں قید کرنا یا سزا دینا درست نہیں ہے، اور مزید رقم جو اس پر مسلط کی جارہی ہے ظاہر ہے کہ وہ صریح ظلم ہے کہ جب وہ اصل مطلوبہ رقم دینے سے قاصر ہے تو یہ اضافہ کہاں سے ادا کرے گا۔

۲- یا مشتری تنگدست نہیں ہے، بلکہ موسر اور مالدار ہے، وقت پر ادائیگی ثمن کی استطاعت رکھتے ہوئے ادا نہیں کررہا ہے تو یہ مشتری کی طرف سے ظلم متصور ہوگا، حدیث پاک میں ہے: "مطل الغنی ظلم" یعنی مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، لیکن اس حالت میں بھی اس پر کسی طرح کا مالی تاوان، جرمانہ وغیرہ عائد کرنا جائز نہیں ہے، اگر چہ اس کو فاسق قرار دیا جائے، قید میں ڈال دیا جائے یا ایسی سزا دی جائے جو اس کی اہانت کا سبب ہو، یہ سب جائز ہوسکتا ہے۔

"لي الواجد یحل عرضه وعقوبته" ودل الحدیث علی تحریم مطل الواجد. ولذا أبیحت عقوبته"

یعنی مالدار کا ٹال مٹول کرنا اس کی ہتک عزت اور سزا کو حلال کر دیتا ہے (سبل السلام ۲/ ۸۷۶) اس کی تفسیر میں مختلف علماء سے منقول ہے کہ بائع کے لیے یہ جائز ہوگا کہ وہ اس کی اس خصلت شنیعہ کو لوگوں میں عام کرے، شکایت کرے کہ مشتری اس کا حق مار رہا ہے، معاملات کا صحیح نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ بلیک لسٹ میں اس کا نام ڈال دیا جائے، تا کہ لوگ اس کے ساتھ معاملہ کرنے سے گریز کریں، اور اس کے کاروبار پر اثر پڑے۔

''قال أحمد: قال وكيع: عرضه شكايته، وعقوبته حبسه'' (نیل الأوطار ۵/۳۶۱)۔

''وإلى جواز الحبس للواجد ذهبت الحنفية وزيد بن علي'' (نیل الأوطار: ۵/۳۶۱)۔

لہذا وقت مقررہ پر عدم ادائیگی کی صورت میں اصل ثمن پر کسی بھی طرح کا اضافہ درست نہیں ہے، خواہ مشتری معسر وتنگدست ہو، یا موسر وغنی۔

۸- (الف)...... بائع کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا اور نفع حاصل کرنا درست نہیں ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک اگر مرتہن کا ضرر نہ ہو تو راہن مال مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے (الإفصاح عن معاني الصحاح لابن هبيرة ۱/۳۷۷)۔

ہاں اگر راہن (مشتری) مرتہن (بائع) کو مال مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دے تو بائع کے لیے اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہوگا، بشرطیکہ انتفاع کی شرط صلب عقد میں نہ ہو، اور اگر نفس عقد میں یہ شرط ہو کہ بائع مال مرہون سے نفع کا حقدار ہوگا تو پھر انتفاع جائز نہیں ہوگا۔

(مجمع الأنہر ۲/ ۵۸۷، درمختار ۵/ ۳۱۰، الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۲/ ۳۳۵)۔

بلکہ عبداللہ بن محمد سمرقندی کا قول تو یہ ہے کہ اجازت کے باوجود مرتہن کیلئے مال مرہون سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ ربا اور سود سے خالی نہیں ہے۔

(ب)...... بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون ضائع ہو جائے تو اگر مال مرہون کی قیمت اور ثمن کی مقدار برابر ہے تو بائع اپنے دین کا مستوفی مانا جائے گا، اور مال مرہون جو ضائع ہو گیا مشتری اس کا مطالبہ نہیں کرے گا۔

اور اگر مال مرہون کی قیمت مقدار ثمن سے زیادہ ہے، تو ثمن سے زائد رقم اس کے یہاں بطور امانت ہے اگر بائع کی طرف سے تعدی وتصرف اور لاپروائی کی وجہ سے وہ مال مرہون ضائع ہوا ہے تو وہ بقیہ قیمت کا ضامن ہوگا (ہدایہ ۲/ ۵۰۲، درمختار ۵/ ۳۱۰ نیز الإفصاح لابن ہبیرہ ۱/ ۳۷۹)۔

اس صورت میں جبکہ بیع ادھار ہے اور متعینہ مدت تک کے لیے مؤجل ہے، مال مرہون کی ہلاکت کی صورت میں بائع اس کی قیمت کا ضامن ہوگا، اور وہ قیمت بطور رہن اس کے پاس رہے گی، اور پھر جب ادائیگی کا وقت آئے گا تو مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق اس قیمت مرہونہ سے اپنا دین (ثمن) وصول کرے گا (ہدایہ ۲/ ۵۲۹)

(ج)...... وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں فروخت کنندہ خریدار سے ادائیگی ثمن کا مطالبہ کرے گا، اور اس کے لیے یہ جواز ہوگا کہ وہ اس کی قید کا مطالبہ کرے اور لوگوں میں اس کی تشہیر کرے کہ وہ حق کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لے رہا ہے، معاملہ کا ٹھیک آدمی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مال مرہون کو بیچ کر اپنا حق وصول کرے، البتہ اگر مشتری بیچنے اور فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہے تو بائع کے لیے اس کا بیچنا جائز ہوگا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسئلہ یہی ہے۔ (ہدایہ ۲/ ۵۲۲، درمختار ۵/ ۳۱۰)۔

امام شافعیؒ کے نزدیک استیفاء دین کے لیے راہن کی اجازت کے بغیر مال مرہون کا بیچنا جائز ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۴۷، فقہ السنۃ ۳/ ۱۵۹)۔

لہذا امام شافعیؒ کے نزدیک یہ صورت ہے کہ حاکم راہن کو مال مرہون کے فروخت کرنے پر مجبور کرے گا، اور اسی کی قیمت سے مرتہن اپنا دین وصول کرے گا۔

۹- (الف)...... بائع مبیع کو بطور رہن اپنے پاس روک سکتا ہے، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ عقد بیع کے بعد مشتری اس مبیع پر قبضہ کرے پھر اس کو بطور رہن بائع کے حوالہ کرے، کیونکہ قبضہ سے پہلے وہ اس کی مملوکہ نہیں ہے، اور کسی دوسرے کی ملکیت پر تصرف کرنا یا اس کا رہن رکھنا جائز نہیں ہے، اور قبضہ کر لینے کے بعد چونکہ وہ مبیع بائع کی ملکیت میں آ گئی، اس لیے اب اس کا اس میں تصرف جائز ہو گیا، اب جس طرح اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس مبیع کو غیر بائع کے پاس رہن رکھے اسی طرح بائع کے پاس بھی رہن کے طور پر رکھنا درست ہوگا (ہدایہ ۲/ ۵۱۸، درمختار ۵/ ۳۲۰)۔

(ب)...... بائع کا محض استیفاء ثمن کے لیے مبیع کو روکنا بیع بالتقسیط میں جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بیع مؤجل ہوتی ہے اور بیع مؤجل یعنی ادھار خرید و فروخت میں بائع کو اس کا حق نہیں ہے، کیونکہ بیع کا مقصد یہ ہے کہ بائع ثمن کو حاصل کرے، اور مشتری مبیع کو حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھائے، ادھار بیع میں بائع اپنے حق کو ساقط کرنے پر راضی ہوتا ہے، لیکن اس کو یہ حق نہیں کہ دوسرے کا حق مارے، اس صورت میں بیع کا مقصد فوت ہو رہا ہے، اس لیے درست نہیں۔

۱۰- قیمت کے لیے طے شدہ اقساط کو جمع نہ کرنے کی صورت میں بائع کا سامان کو اپنے قبضہ میں رکھنا اور وہ اقساط جو ادا کی جا چکی ہیں ان کا واپس نہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے (احسن الفتاوی ۶/ ۵۱۹)۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسے اقالہ کی صورت میں داخل کیا جائے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ مبیع مشتری کے قبضہ میں ہو، اور چونکہ موجودہ عرف میں وہ "سکنڈ ہینڈ" ہوگی جو عرفاً ایک عیب ہے اور اس عیب کی بنا پر قیمت میں کمی آجاتی ہے، اس لیے اقالہ بالأ قل کی گنجائش ہوگی، لیکن اگر مبیع مشتری کے قبضہ میں نہ ہو اور وہ بائع کے پاس ہی ہو تو یہ صورت درست نہیں ہونی چاہیے (ہدایہ ۲/ ۵۴)۔

لیکن اقالہ والی صورت اسی وقت ممکن ہے جبکہ نفس عقد میں وہ شرط نہ ہو، اور اگر ضبط اقساط کی شرط کے ساتھ بیع ہوئی تو پھر یہ درست ہی نہیں ہے۔

۱۱- ایسی صورت میں جبکہ بائع مبیع پر بطور رہن قبضہ کرلے (اس لیے کہ صحت رہن کے لیے مرتہن کا مال مرہون پر قبضہ ضروری ہے) اور پھر اس کے بعد بطور عاریت اس کو مشتری کے حوالہ کردے کہ وہ اسے استعمال کرے اور اس سے انتفاع حاصل کرے تو یہ درست ہے۔

لیکن اگر رہن کے طور پر بائع نے مبیع پر قبضہ نہیں کیا، اور اسے مشتری کے پاس ہی رہنے دیا، اس تصور پر کہ وہ میرے پاس رہن ہے یہ درست نہیں، اسے رہن قرار نہیں دیا جائے گا، اس لیے مبیع کے عندالبائع مرہون ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بائع بطور رہن اس پر قبضہ کرلے، خواہ یہ قبضہ حسی ہو یا قبضہ حکمی، جیسے مبیع کے کاغذات اور دستاویز وغیرہ جن کی وجہ سے مشتری اس پر فروختگی وغیرہ کا تصرف بغیر بائع کی اجازت کے نہیں کرسکے گا (ہدایہ ۲/ ۵۳۰)۔ لہذا جب اس کے فروخت وتصرف کا حق مرتہن کو حاصل ہے مشتری صرف استعمال کا حق رکھتا ہے اور بطور عاریت اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۱۲- خریدار کی طرف سے گارنٹی اور ضمانت لینے کی صورت پر کفالہ کی تعریف صادق آتی ہے "وهي ضم ذمة إلى ذمة في المطالبة" اور کفالہ ایک طرح کا تبرع ہے، شامی میں ہے: "وأهلها من هو أهل للتبرع" (۴/ ۲۵۱)، اس لیے اس پر کسی طرح کی اجرت وغیرہ لینا درست نہیں ہے، ایسا کرنا، "كل قرض جر منفعة فهو ربا" کے تحت سود کے مرادف ہوگا۔

اس لیے کہ کفالہ کی صورت میں وہ ثمن جو مشتری کے ذمہ واجب الاداء تھا، وقتی طور پر ذمہ کفیل کی طرف منتقل ہوگیا، اور جب کفیل یہ ثمن مشتری کی طرف سے بائع کو ادا کردے گا تو اسے اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ مشتری سے اس رقم کا مطالبہ کرے جو اس نے کفالت کی صورت میں ادا کردی ہے، اگر اس پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ جتنا اس نے دین دیا ہے اس پر نفع کا مطالبہ کررہا ہے، جو بعینہ سود ہے (ہدایہ ۲/ ۱۰۲)۔

بینک وغیرہ جو لیٹر آف کریڈٹ جاری کرتے ہیں اس کے متعلق مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے دو صورتیں بیان کی ہیں، لکھتے ہیں:

بینک کے لیے اپنے عمیل سے دو چیزوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

۱:.....لیٹر آف کریڈٹ (Letter of Credit) جاری کرنے کے عمل میں بینک کو جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے

۲:.....امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے سلسلہ میں بینک جو خدمات بجالاتا ہے اس پر بحیثیت وکیل یا بحیثیت دلال یا درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خدمات پر اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز ہے، لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز نہیں۔ (فقہی مقالات/ ص ۹۹)۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت میں اس کے اندر تحریر کردہ قیمت ومالیت سے کم پر جب معاملہ ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ شرعاً یہ خرید وفروخت جائز نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ یہ "بیع یا تو بیع الدين من غير من عليه الدين" کی جنس سے ہوگی، یا کرنسی کی بیع کرنسی کی جنس سے تفاضل کے ساتھ، اور یہ دونوں صورتیں جائز نہیں (تکملۃ فتح الملہم ۱/ ۳۶۳)۔

دستاویز پر موجود رقم جو زیادہ ہے اس کی بیع کم قیمت پر اسی لیے تو کی جارہی ہے کہ وہ کچھ مدت کے بعد ملے گی، اور یہ ربا نسیئہ کی صورت ہے جو جائز نہیں ہے۔

اگر اس معاملہ کی نوعیت تھوڑی سی بدل کر اس طرح کرلی جائے کہ جو شخص دستاویز خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے، بجائے اسے بیچنے کے اس شخص کو دستاویز پر موجود رقم وصول کرنے کا وکیل بنایا جائے اور اس وکالت کے عوض میں اسے اجرت دی جائے۔ نیز دستاویز پر موجود رقم کے برابر اس شخص سے قرض لیا جائے اور اس کو اجازت دی جائے کہ وہ جب مشتری سے دستاویز پر موجود رقم وصول کرے گا تو اسی رقم سے اپنا قرضہ بھی وصول کرلے گا۔ اس طرح یہ دو الگ الگ معاملے ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہوگی، یہ واضح رہے کہ دونوں معاملے ایک دوسرے کے لیے شرط نہ ہوں (تکملۃ فتح الملہم ۱/ ۳۶۳)۔

۱۴- ادھار خرید وفروخت کے معاملہ میں بائع کا مشتری سے طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگنا کہ وہ ثمن کا کچھ حصہ معاف کردے گا، درست نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ تاخیر جو کہ مدیون کا حق ہے، وہ اس حق یعنی تاجیل کے عوض میں بائع سے ثمن میں کمی کے فائدہ کو حاصل کررہا ہے۔

امام محمدؒ نے ابوصالح بن عبید کا واقعہ نقل کرنے کے بعد زید بن ثابتؓ کا فتوی نقل کیا ہے:

''فقال: لا آمرك أن تأكل ذلك ولا تؤكله. قال محمد: وبهذا نأخذ، من وجب له دين على إنسان إلى أجل فسأل أن يضع عنه ويعجل له ما بقي لم ينبغ ذلك، لأنه يعجل قليلا بكثير دينا، فكأنه يبيع قليلا نقدا بكثير دينا وهو قول عمر بن الخطاب و زيد بن ثابت و عبد الله بن عمر و هو قول أبي حنيفة جميعا'' (مؤطا امام محمد: ۳۳۴)۔

مغنی میں ہے: ''إذا كان عليه دين موجل فقال لغريمه: ضع عنى بعضه وأعجل لك بقيته لم يجز'' (المغنی ۴/۱۷۴)۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ مدت معینہ سے پہلے تعجیل کی صورت میں وضع بعض الدین کی شرط ہو، لیکن اگر شرط نہیں ہے، بلکہ مشتری مدت معینہ سے پہلے ثمن کی ادائیگی کرتا ہے اور بائع تبرعا اس کا کچھ حصہ وضع کردیتا ہے تو یہ جائز ہے۔

''ومن أجاز من السلف إذا قال: عجل لي أضع عنك فجائز أن يكون أجازوه إذا لم يجعله شرطا فيه، وذلك بأن يضع عنه بغير شرط ويعجل الآخر الباقي بغير شرط'' (فقہی مقالات/ص ۱۱۴ بحوالہ احکام القرآن للجصاص ۱/۴۶۵)۔

۱۵- اس صورت میں اگر ضع وتعجل والا معاملہ اختیار کیا جائے تو چونکہ ثمن میں کمی مدت کے عوض میں نہیں ہوگی اس لیے یہ صورت درست اور جائز ہے۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور فوری طور پر مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا درست ہے، بائع اس صورت میں بقیہ ثمن کا مطالبہ کرسکتا ہے جیسا کہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے فقہی مقالات میں خلاصۃ الفتاوی (۳/۵۴) کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''ولو قال: كلما دخل نجم ولم تؤد، فالمال حال صح ويصير المال حالا'' (فقہی مقالات/ص ۱۱۹)۔

۱۷- ایسی صورت میں، جبکہ خرید وفروخت کا معاملہ ادھار قسطوں میں طے پایا، اور ادائیگی ثمن سے پہلے فریقین میں سے کسی ایک کا انتقال ہوگیا تو اگر بائع کا انتقال ہوا ہے تو بیع کے مذکورہ معاملہ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، اور اجل باطل نہیں ہوگی، مشتری کو وہ مہلت حاصل رہے گی، لیکن اگر مشتری کا انتقال ہوگیا تو جمہور علماء کا قول یہی ہے کہ اجل کی مہلت ختم ہوجائے گی، اور بائع فوری طور پر مطالبہ کا حقدار ہوگا۔ (البحر الرائق ۵/۲۸۰)۔

کیونکہ مشتری کو مہلت تو اس لیے ملی تھی کہ وہ مبیع کی تجارت سے فائدہ حاصل کرکے ثمن کی ادائیگی کردے گا، لیکن جب وہ خود ہی نہ رہا اور اس کے ترکہ سے ہی قضاء دین کی تعیین ہوگئی تو ایسی تاجیل کا کیا فائدہ؟

حنابلہ کے یہاں مختار اور راجح قول یہ ہے کہ اگر ورثاء مشتری اس دین کی توثیق کردیتے ہیں اور اس کی ادائیگی پر اطمینان دلا دیتے ہیں تو وہ تاجیل کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور بائع فوری مطالبہ کا حقدار نہ ہوگا (فقہی مقالات/ ۱۳۲)۔

۱۸- یہ گویا کمپنی کی طرف سے مبیع میں اضافہ ہے اور بائع کے لیے مبیع کا زیادہ کرنا جائز ہے (البحر الرائق ۶/۱۱۹)۔

اور کمپنی قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کی تعیین کرتی ہے کہ کس خریدار کے لیے مبیع میں اضافہ ہو، قرعہ اندازی کی مشروعیت میں اگرچہ علماء کا اختلاف ہے اور بعض احناف نے اس کا انکار بھی کیا ہے مگر جمہور علماء اس کی مشروعیت کے قائل ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے مابین معیت سفر کے لیے قرعہ اندازی فرماتے تھے (فتح الباری ۵/۲۹۳)۔

لہٰذا خریداروں کے مابین قرعہ اندازی کے ذریعہ اس انعام کی تعیین درست ہے۔ ''ومشروعية القرعة مما اختلف فيه والجمهور على القول بها في الجملة وأنكرها بعض الحنفية وحكى ابن المذر عن أبي حنيفة القول بها''۔

آگے ہے: ''وهي إما في الحقوق المتساوية، وإما في تعيين الملك، فمن الأول عقد الخلافة إذا استووا في صفة الإمامة... ومن صور تعيين الملك الإقراع بين الشركاء عند تعديل السهام في القسمة'' (فتح الباری ۵/۲۹۴)۔

مذکورہ صورت میں چونکہ خریداروں میں سے کسی کا نقصان نہیں ہوگا، البتہ بعض خریداروں کو مبیع سے زائد ایک چیز مل جاتی ہے جس کی تعیین قرعہ اندازی کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لیے جدال کا بھی خطرہ نہیں ہے، اس لیے یہ صورت جائز ہونی چاہیے۔

۱۹- اسی طرح یہ صورت کہ ہر قسط کی ادائیگی کے موقع پر بائع یا کمپنی قرعہ اندازی کرے اور جس خریدار کے نام قرعہ نکلے اس کو وہ سامان نقد دے دے، اور اس کی ادا کردہ قسطوں کو ہی کافی سمجھا جائے اس سے مزید قسطوں کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

یہ صورت بھی ایسی ہے گویا بائع ہر قسط کے موقع پر کسی ایک خریدار کو ثمن میں رعایت دیتا ہے، اور اس کی تعیین کہ وہ کس خریدار کو رعایت دے وہ قرعہ اندازی کے ذریعہ کرتا ہے (البحر الرائق ۶/۱۱۹)۔ اور قرعہ اندازی کی تفصیل گزر چکی ہے (دیکھئے: فتح الباری ۵/۲۹۳، احسن الفتاوی ۶/۵۱۸)۔

☆☆☆

ادھار اور قسط وار خریداری کا شرعی حکم

مفتی شبیر احمد قاسمی [1]

۱- نقدی کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت زیادہ کرنا:

لوکل اور بین الاقوامی مارکیٹ میں یہ دستور ہے کہ نقد معاملہ میں رعایت ہوا کرتی ہے، اور ادھار میں رعایت نہیں ہوتی، بلکہ بازاری بھاؤ سے کچھ زیادہ قیمت کے ساتھ ہی معاملہ ہوا کرتا ہے، اور جانبین اضافہ قیمت کے ساتھ ادھار معاملہ کرنے کے لیے تیار ہوجایا کرتے ہیں، اور لوگوں کے درمیان بڑے کاروبار میں ۵،۷ فیصد معاملہ اضافہ قیمت کے ساتھ ادھار ہوا کرتا ہے، اس لیے شریعت نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے جبکہ مدت کو متعین کرلیا جائے، مگر قیمت کا یہ اضافہ مستقل طور پر مدت کی قیمت تسلیم نہیں کیا جاتا مبیع کی قیمت کے ضمن میں ہی تسلیم کیا جاتا ہے (جواہر الفقہ ۳/ ۱۵۱، احسن الفتاوی ۷/ ۳۱) اور اس اضافہ کو سود میں داخل نہیں کیا جاسکتا بلکہ گراں فروشی کہا جاسکتا ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۷، البحر الرائق ۶/ ۱۱۵، کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ ۲/ ۶۹۴)۔

۲- ادھار قیمت کو قسطوں میں ادا کرنا:

ادھار معاملہ طے ہوجائے اور ساتھ ساتھ ہی مدت اور قسطیں متعین کرلی جائیں اور کسی قسط کی ادائیگی میں تاخیر ہونے پر مزید کسی قسم کا اضافہ نہ ہو تو قسطوں میں ادا کرنے کی شرط پر بھی معاملہ جائز اور درست ہوجاتا ہے (فتاوی محمودیہ ۱۳/ ۳۵۰، ۳۷۳)۔

۳،۵- نقد و ادھار میں قیمت کا تعین:

اس صورت میں اگر بائع و مشتری دونوں کسی ایک قیمت پر اتفاق کیے بغیر لین دین کریں گے تو عقد فاسد ہوجائے گا، اس لیے کہ اس صورت میں کسی ایک کی قیمت متعین نہیں ہوتی ہے، اور قیمت متعین نہ ہونے سے معاملہ فاسد ہوجاتا ہے، اور اگر اسی مجلس میں دونوں ادھار یا نقد میں سے کسی ایک قیمت پر متفق ہو جائیں تو معاملہ شرعا درست ہوجائے گا (امداد الفتاوی ۳/ ۲۰۔ ۳/ ۱۲۲، فقہی مقالات ۱/ ۸۲، مبسوط سرخسی ۱۳/ ۸، ہندیہ ۳/ ۱۳۶، بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ/ ص ۸)۔

۶،۷- تاخیر پر شرح سود کا اضافہ:

اس طرح کا معاملہ قطعاً ناجائز اور حرام ہے (فتاوی محمودیہ ۱۳/ ۳۷۳)۔

اسی طرح اگر ادھار کی مدت متعین ہوگئی اور یکمشت یا قسطوں میں ادائیگی کی بات طے ہوگئی مگر ساتھ ساتھ یہ بھی شرط لگادی گئی کہ وقت مقررہ پر پوری رقم یا کوئی قسط ادا نہ کی جائے تو مزید کچھ رقم ادا کرنا ہوگی تو یہ اضافہ فیصد کے حساب سے ہو یا اس کی مقدار متعین کردی جائے بہت صورت شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہے، اور زمانہ جاہلیت کے سودی معاملہ کی طرح ہے (دیکھئے: تفسیر کبیر ۷/ ۹۱)۔

۸- ادھار کی وصولی کو رہن کے ذریعہ یقینی بنانا:

۱۔ بعض فقہاء نے خریدار کی اجازت سے بائع کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانے کو جائز لکھا ہے، مگر زیادہ صحیح اور راجح یہی ہے کہ بائع کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ خریدار کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے اور خریدار چونکہ بائع کا قرض دار ہے اور قرض دار کے مال سے نفع اٹھانا شرعاً ربا اور سود ہے، اس لیے جائز نہیں ہے (فتاوی محمودیہ ۱۳/ ۳۸۳، درمختار مع الشامی ۱۰/ ۸۳، شامی، زکریا ۱/ ۱۴۸)۔

۲۔ مال مرہون بائع کے یہاں امانت نہیں ہے، بلکہ ضمانت ہے، لہٰذا جب ضائع ہوجائے گا تو بائع کے مال میں سے شمار ہوگا، اس لیے مبیع کے ثمن میں سے مجرا ہوجائے گا (دیکھئے: فتح القدیر ۱/ ۱۵۸، ہدایہ ۴/ ۵۱۲، البحر الرائق ۸/ ۲۴۵، شامی زکریا دیوبند ۱۰/ ۱۳)۔

---

[1] صدر مفتی جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد۔

۸- اگر خریدار شئ مبیع کی قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے یا وہ تنگ دست ہوجائے اور ادھار کی مدت بھی ختم ہوجائے تو بائع کے لیے جائز ہے کہ خریدار کو مطلع کر کے مناسب قیمت میں مال مرہون فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لے، لیکن اگر مال مرہون کی قیمت زیادہ ہو تو زائد رقم خریدار کو واپس کردینا لازم ہوگا۔ (فقہی مقالات ۱/ ۸۷، بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ/ ۱۵، شامی زکریا ۱۰/ ۱۲۷)۔

۹- ثمن کے لیے مبیع کو روک لینا:

دونوں صورتوں میں بائع کو مبیع یا بعض مبیع کو روکنے کا حق ہے، البتہ اگر مبیع کی حیثیت دی جائے گی تو ثمن نہ ہونے کی وجہ سے عقد ختم کردینے کا حق ہوگا اور اگر رہن کی حیثیت دی جائے گی تو ثمن وصول کرنے کے لیے اس کو فروخت کرنے کی صورت میں زائد قیمت خریدار کا حق ہوگا جسے خریدار کو واپس کردینا لازم ہوگا، البتہ رہن قرار دینا اس وقت صحیح ہوگا، جبکہ خریدار نے قبضہ کے بعد بطور رہن دے دیا ہو، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے (شامی، زکریا دیوبند ۷/ ۹۳، ہندیہ ۳/ ۱۵)۔

۱۰- چند قسطیں ادا کر کے بقیہ میں عاجز ہونے سے مبیع اور ادا شدہ رقم کو ضبط کر لینا:

زیادہ سے زیادہ مبیع کو واپس لے کر عقد کو فسخ کردینے کا حق ہے، مگر ادا شدہ قسطوں کو ضبط کرنے کا حق نہیں ہے، ان قسطوں کو واپس کردینا لازم ہوگا، بائع کے لیے وہ حلال نہیں ہوں گی (فتاویٰ محمودیہ ۱۳/ ۳۵، احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۱۹)۔

۱۱- مبیع کو بائع کے پاس رکھ کر رہن قرار دینا:

اگر ادھار خریداری میں مبیع کو بائع کے پاس اس طرح رہن قرار دیا جائے کہ مبیع بائع کے پاس بطور رہن اس وقت تک رہے گی جب تک ثمن ادا نہ ہوجائے تو اس کی دو حیثیتیں ہیں:

۱۔ خریدار نے مبیع پر قبضہ ہی نہیں کیا، بغیر قبضہ کے رہن رکھدیا تو یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ادھار خریداری میں مبیع کو قبضہ سے قبل روک لینا جائز نہیں ہے (فقہی مقالات/ ۸۸)۔

۲۔ خریدار نے مبیع پر قبضہ کرلیا تھا، اس کے بعد بطور رہن رکھتا ہے تو یہ جائز ہے، اس لیے کہ اس میں ادھار معاملہ میں بائع نے مبیع کو حصول ثمن کے لیے نہیں روکا ہے، بلکہ اس نے اس کو خریدار کے حوالہ کردیا تھا، پھر اس کے بعد ثمن کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے خریدار نے بطور رہن بائع کے حوالہ کردیا تھا۔
(درمختار مع الشامی زکریا دیوبند ۴/ ۵۱۸)۔

۱۲- ضمانت لینے والے کی اجرت:

ضمانت ایک فعل تبرع ہے، مگر آج کل بغیر اجرت کے کوئی شخص ضمانت کا بار اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا، تو کیا اجرت پر کفیل اور ضامن بنانا اور کفیل کے لیے اجرت لینا جائز ہوگا یا نہیں؟

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے مقالہ میں کفیل کو قرض خواہ پر قیاس کر کے اس کے لیے اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا ہے اور موصوف نے کفیل اور قرض خواہ کے درمیان بہت دور سے مناسبت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی ہے، مگر اکثر فقہاء کرام نے کفیل کے لیے اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، یہ ان کے نزدیک ''کل قرض جر نفعا'' میں داخل نہیں، اور اس زمانہ میں اس کی ضرورت بھی ہے، اس لیے کریڈٹ لیٹر کے جاری کرنے پر اجرت لینا درست ہوگا، حضرات فقہاء کی عبارت کی روشنی میں اس کو جائز قرار دینا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے (بدائع ۴/ ۲۰۲)۔

۱۳- ادھار معاملہ میں دستاویز کی خرید وفروخت:

حضرات فقہاء کرام نے اس طرح کے معاملہ کو ناجائز لکھا ہے، لہذا ایسا معاملہ جائز نہ ہوگا (درمختار مع شامی کراچی ۴/ ۵۱۷، اعلاء السنن ۱۴/ ۲۴۴، تکملہ فتح الملہم ۱/ ۳۶۲)۔

۱۴- ادھار فروختگی میں ثمن کا کچھ حصہ معاف کر کے بقیہ فوری وصول کرنا:

اگر معاملہ نقدی طے ہوا ہے پھر اس کے بعد فروخت کرنے والا اپنی خوشی سے کچھ زائد رقم دیتا ہے یا ثمن کا کچھ حصہ معاف کردیتا ہے یا خریدار اپنی خوشی سے ثمن میں کچھ اضافہ کردیتا ہے تو یہ بلاتردد جائز اور درست ہے، جیسا کہ (ہدایہ ۳/ ۵۵، بزازیہ ۴/ ۵۰۸) میں اس کی صراحت ہے۔

مگر اس کے برخلاف اگر معاملہ ادھار طے ہوا ہے اور بائع نے کہا کہ ثمن میں سے کچھ حصہ معاف کردیں گے اور بقیہ فوری ادا کردو تو اس طرح کا معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کے دو فریق ہیں:

فریق اول: حضرت ابن عباسؓ، امام زفر، ابراہیم نخعی، ابوثور وغیرہ کے نزدیک ایسا معاملہ جائز ہے، ان کی دلیل امام بیہقی کی سنن کبری میں مذکور حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے:

''عن ابن عباس قال: لما امر النبی ﷺ بإخراج بنی النضير من المدينة جاء ه ناس منهم. فقالوا: يا رسول الله ! إنك أمرت بإخراجهم، ولهم على الناس ديون لم تحل، فقال النبی ﷺ: ضعوا و تعجلوا- الحديث'' (سنن بیہقی ۶/ ۲۸)۔

(حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ نے بنونضیر کو مدینہ سے جلاوطن کرنے کا حکم صادر فرمایا تو ان میں سے کچھ لوگوں نے آ کر کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے ان کو شہر بدر کرنے کا حکم فرمایا، حالانکہ لوگوں پر ان کے قرض ہیں جن کی مدت ابھی باقی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ کم کرا کے بقیہ فوری ادا کردو)۔

فریق ثانی: حضرت عبداللہ بن عمرؓ، زید بن ثابتؓ، حضرات ائمہ اربعہ، حسن بصری، محمد بن سیرین، سعید بن مسیب اور عامر شعبی وغیرہ کے نزدیک ایسا معاملہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ان میں صرف مدت کے عوض میں ثمن کا ایک حصہ آ رہا ہے، نیز حدیث شریف میں اس کی ممانعت آئی ہے، اور اس کو سود قرار دیا گیا ہے۔

''من كان له حق على رجل إلى أجل معلوم فتعجل بعضه وترك له بعضه فهو ربا، الحديث''

جس کسی کا حق دوسرے شخص پر متعین مدت تک ہے پھر بعض حق فوری وصول کر کے بقیہ چھوڑ دے تو وہ سود ہے (مصنف عبدالرزاق ۸/ ۱۷، موطا امام مالک ۵/ ۱۳۳)

''عن المقداد بن الاسود قال: اسلفت رجلا مائة دينا رثم خرج سهمی فی بعث بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت له: يجعل لی تسعين دينارا وأحط عشرة، دينار فقال: نعم، فذكرت ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فقال أكلت ربا يا مقداد وأطعمته'' (الحديث) (سنن بیہقی ۶/ ۲۸)۔

(حضرت مقداد بن اسود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو سو دینار ادھار دیا اس کے بعد جب آپ ﷺ نے ایک وفد روانہ کیا اور اس میں میرا نام آ گیا تو میں نے اپنے مقروض سے کہا کہ نوے دیدو اور دس معاف کر دیتا ہوں، اس نے کہا ٹھیک ہے پھر حضور ﷺ سے اس کا ذکر کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ اے مقداد تم نے سود کھایا اور اس کو بھی کھلایا)۔

بہر حال واقعہ بنونضیر میں بہت سے اشکالات ہیں، مثلاً یہ حدیث شریف سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، نیز بنونضیر کو آیت ربا کے نزول سے قبل جلاوطن کیا گیا ہے، اس لیے اس حدیث شریف سے استدلال درست نہ ہوگا۔ (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ/ ۲۲)۔

لہذا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت جو موطا امام مالک اور مصنف عبدالرزاق میں ہے اور حضرت مقداد بن اسود کی روایت جو سنن بیہقی میں ہے وہی معتبر ہوگی اور حضرات فقہاء نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''ولو كانت له ألف مؤجلة، فصالحه على خمس مائة حالة لم يجز'' (ہدایہ ۳/ ۲۳۵)۔

(اور اگر کسی کے دوسرے پر ایک ہزار ادھار ہوں پھر دونوں پانچ سو فوری دینے اور بقیہ معاف کرنے پر اتفاق کرلیں تو ایسا کرنا جائز نہیں)۔

الغرض ادھار معاملہ میں ثمن کا کچھ حصہ معاف کر کے بقیہ فوری وصول کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر مدت پوری ہو چکی ہے، پھر ادا نہیں کیا ہے اور صاحب حق کہتا ہے کہ بھائی فوری اتنا دے دو بقیہ معاف کر دیتا ہوں تو جائز ہے، کیونکہ مدت اب ہے ہی نہیں۔

۱۵- ادھار معاملہ میں کچھ ثمن معاف کر کے بقیہ فوری وصول کرنا:

اگر اس طرح لین دین کا رواج ہے تو ایسا معاملہ بھی جائز ہے، مگر مدت ایک ماہ تک مانی جائے گی اور بائع کے لیے مزید مہلت دیے بغیر ایک ماہ سے زائد کا حق نہ ہوگا، دیکھئے (درمختار مع شامی زکریا ۷/ ۵۳، تقریرات رافعی ۷/ ۱۱۴)۔

اور اگر بلا بیان مدت ادھار کا معاملہ طے ہوا، پھر آپس کی رضامندی سے ثمن کا کچھ حصہ معاف کر کے فوری ادائیگی پر اتفاق ہو جائے تو اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ حضرات علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ جو ثمن معاف کیا گیا ہے وہ مدت کا عوض نہیں ہے، بلکہ تبرع ہے، کیونکہ مدت کا عوض اس وقت قرار پا

جاسکتا ہے کہ جب مدت متعین ہوجائے، اور یہاں متعین نہیں ہے، لہذا یہ شکل جائز ہوگی (احکام القرآن جصاص ۱/ ۴۶۷، بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرۃ/ ۲۹)۔

نیز اسی طرح اگر مدت متعین تھی اور اس مدت میں ادا نہیں کیا گیا تو صاحب حق نے کہا کہ میں کچھ معاف کر دیتا ہوں بقیہ فوری ادا کر دو تو بھی جائز ہے، کیونکہ یہاں بھی اب مدت باقی نہیں رہی۔

۱۶- قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر پر جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا:

حضرات فقہاء نے خریدار کی لاپرواہی کی وجہ سے بائع کے اکھٹے ادا کرنے کے مطالبہ کو جائز لکھا ہے، لہذا تاخیر کی وجہ سے مہلت کی شرط باطل ہوجائے گی اور فوری وصول کرنے کا حق ہوگا۔ (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ/ ۳۳، حاشیہ جامع الفصولین للخیر الرملی ۲/ ۳)۔

۱۷- ادھار معاملہ کے بعد کسی ایک کا انتقال ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں تین صورتیں پیش آتی ہیں:

۱۔ ذمہ داری میت کے اوپر ہے تو اس کے اوپر ذمہ داری باقی رکھنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ موت کی وجہ سے ذمہ داری فاسد ہوجاتی ہے۔

۲۔ ورثاء کے اوپر ذمہ داری عائد ہوجائے تو یہ بھی درست نہیں، اس لیے کہ ورثاء نے یہ ذمہ داری قبول نہیں کی ہے، اور نہ دائن ورثاء کی ذمہ داری پر راضی ہے۔

۳۔ میت کے مال کے ساتھ اس کا تعلق ہے تو ایسی صورت میں فوری طور پر معاملہ صاف ہوجانا ہی بہتر ہے، اس لیے کہ مدت پوری ہونے تک مال ضائع بھی ہوسکتا ہے، اور بعد میں ورثاء ٹال مٹول بھی کرسکتے ہیں، اس لیے فوری ادائیگی کی شکل زیادہ بہتر ہے، اور یہ حنفیہ کا مسلک بھی ہے (فقہی مقالات ۱/ ۱۳۳)۔

قسط وار خریداری اور انعام:

اس زمانہ میں ایسا بھی خرید و فروخت کا رواج چل پڑا ہے کہ بائع سامان کو قسطوں میں فروخت کرتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ متعدد خریداروں کے ساتھ قسط ادا کرتے وقت قرعہ اندازی کے ساتھ ایک سامان بطور انعام دیا جائے گا، یہ اس لیے کیا جاتا ہے، تاکہ اس کے خریداروں کی تعداد زیادہ ہوجائے تو اس طرح کا معاملہ شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟

تو اس صورت میں جو قسطیں جمع کی جائیں گی ان کے عوض اصل مبیع ہر حال میں ملنی ہی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بطور انعام ایک سامان بھی مل جائے، لہذا ایسی صورت میں انعام کا لالچ دے کر قسط وار فروختگی کا معاملہ کرنا شرعاً درست ہوجائے گا (فتاوی محمودیہ ۱۳/ ۳۵۷)۔

قرعہ اندازی کی اسکیم:

قرعہ اندازی اور اسکیم کا یہ معاملہ شرعی طور پر سود اور قمار دونوں کے دائرہ میں داخل ہے؛ اس لیے اس طرح کی اسکیم میں حصہ لینا اور قرعہ اندازی سے طے شدہ اشیاء کا حاصل کرنا ناجائز اور حرام ہے (فتاوی محمودیہ ۱۱/ ۳۱۱، فتاوی رحیمیہ ۶/ ۱۴۱، ایضاح النوادر ۱/ ۱۲۳)۔

☆☆☆

قسطوں پر خرید وفروخت کا شرعی حکم

مفتی نسیم احمد قاسمی[1]

۱- نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت زیادہ کرنا:

اس سلسلہ میں علماء کے تین مذاہب ہیں:

۱۔ علماء کی ایک جماعت اس زیادتی کو ناجائز قرار دیتی ہے، اس لیے کہ ادھار کی صورت میں ثمن کی زیادتی "اجل" (مدت) کے عوض میں ہے۔ اور جو ثمن "اجل" کے بدلہ میں ادا کیا جائے وہ سود ہے یا کم از کم سود کے مشابہ ضرور ہے۔ زین العابدین، علی بن الحسین، الناصر، المنصور باللہ، الہادویہ، الامام یحیی اور امام ابوبکر جصاص رازی حنفی کا یہی مسلک ہے (نیل الاوطار للشوکانی ۵ / ۱۷۲، احکام القرآن للجصاص ۲ / ۱۸۷)۔

۲۔ جمہور فقہاء ومحدثین اور ائمہ اربعہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی جائز ہے، بشرطیکہ فریقین عقد بیع کے وقت ہی بیع مؤجل کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کرکے کسی ایک ثمن پر اتفاق کرلیں، لیکن اگر بائع معاملہ کرتے وقت یہ کہے کہ میں یہ سامان نقد اتنے میں فروخت کرتا ہوں اور ادھار اتنے میں فروخت کرتا ہوں، اس کے بعد کسی ایک قیمت پر اتفاق کیے بغیر دونوں فریق جدا ہوجائیں تو یہ بیع ناجائز ہوگی۔ اور ممانعت بیع کی علت اجل کے مقابلہ میں ثمن کی زیادتی نہیں، بلکہ ثمن کی جہالت ہے۔

دیکھئے (اختلاف الفقہاء ۳۳، لابن جریر الطبری، المبسوط للسرخسی ۱۳ / ۲۸، معالم السنن ۳ / ۱۲۳، سنن الترمذی تحقیق محمد فواد عبدالباقی ۳ / ۵۲۴، بذل المجہود ۱۵ / ۵۳، تحفۃ الفقہاء ۲ / ۲۶، الشرح الکبیر بہامش حاشیۃ الدسوقی علی الکبیر ۲ / ۵۸، المہذب ۱ / ۲۶۷، نہایۃ المحتاج شرح المنہاج ۳ / ۵۷، مطبعۃ مصطفی الحلبی، المجموع شرح المہذب ۹ / ۳۷۵، المغنی لابن قدامہ حنبلی ۴ / ۲۵۹، الفروع ۴ / ۳۰، مصنف ابن ابی شیبہ ۴ / ۲۰، مصنف عبدالرزاق ۸ / ۱۳۸-۱۳۶، اوجز المسالک الی موطا الامام مالک للشیخ محمد زکریا ۱۱ / ۲۹۱)۔

اس سلسلہ میں جمہور فقہاء ومحدثین اور ائمہ اربعہ ہی کا مسلک کتاب وسنت، اجماع وقیاس اور مقاصد شرع کی روشنی میں راجح ہے۔

۳۔ اس سلسلہ میں تیسری رائے یہ ہے کہ: "مدت" کے عوض ثمن کی زیادتی ناجائز وحرام تو نہیں ہے، البتہ مکروہ ہے، اور اس سے اجتناب اولی ہے، معاصر علماء میں ڈاکٹر رفیق مصری کی رائے یہی ہے (مصرف التنمیۃ الاسلامی / ۱۹۰-۱۸۹)۔

۲- ادھار قیمت کی قسطوں میں ادائیگی:

صحت بیع کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاملہ طے کرتے وقت دونوں فریق نقد یا ادھار میں سے کسی ایک صورت پر اتفاق کرلیں، ادھار کی صورت میں فریقین کو اختیار حاصل ہوگا کہ اگر چاہیں تو ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت طے کرلیں یا قسطوں میں ادائیگی طے کرلیں، ہر دو صورت شرعاً جائز ہوگی، اگر بوقت معاملہ دونوں میں سے کسی ایک صورت کی تعیین نہیں کی گئی تو معاملہ درست نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ اگر فریقین نے معاملہ کے وقت ادھار قیمت کی قسطوں میں ادائیگی طے کی تو یہ بھی ضروری ہوگا کہ ہر قسط کی ادائیگی کی مدت متعین کرلی جائے، مثلاً یہ کہ اس سامان کی قیمت ادھار کی صورت میں بارہ ہزار ہوگی، ہر ماہ ایک ہزار کی قسط کے حساب سے بارہ ماہ میں قیمت کی ادائیگی ہوگی، اس لیے کہ بیع بالتقسیط میں "مدت" کی حیثیت اساسی عنصر کی ہے، مدت کی جہالت سے بیع فاسد قرار پائے گی، "مجلۃ الاحکام العدلیہ" میں ہے:

"یلزم أن تکون المدة معلومة فی البیع بالتقسیط والتأجیل" (مجلۃ الاحکام العدلیہ مادہ / ۲۴۶)

(بیع بالتقسیط والتاجیل میں مدت کا معلوم ومتعین ہونا ضروری ہے)۔

۳- کیا ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے صرف ادھار قیمت کا تذکرہ ضروری ہے؟

---

[1] سابق نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے اور اسی پر معاملہ طے کیا جائے۔ علت تحریم "مدت" کے عوض ثمن کی زیادتی نہیں ہے، بلکہ جہالت ثمن ہے اور ثمن کی جہالت صرف اسی صورت میں باقی رہتی ہے، جبکہ فریقین نقد وادھار میں سے کسی ایک صورت پر اتفاق نہ کرلیں، اتفاق کی صورت میں جہالت دور ہوجاتی ہے، اس لیے عقد درست قرار پائے گا (مبسوط سرخسی ۱۳/ ۲۸، المقنع ۲/ ۱۷)۔

۴- مدت کے عوض ثمن کی زیادتی ربا کے دائرہ میں نہیں آتی ہے:

ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں "مدت" کے عوض ثمن کی زیادتی ربا کے دائرہ میں نہیں آتی ہے، کیونکہ اس پر ربا کی تعریف صادق نہیں آتی ہے، اس لیے کہ اس صورت میں بوقت معاملہ ہی باہمی رضامندی سے نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت زیادہ طے کی جاتی ہے جسے یکمشت یا قسطوں میں ادا کیا جاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا ہے کہ معاملہ طے ہوجانے کے بعد "مدت" کے عوض زائد رقم وصول کی جاتی ہے، یہ صورت تو بالاتفاق ممنوع ہے۔

(تفسیر ابن جریر ۳/ ۱۰۱، تفسیر کبیر ۲/ ۲۵۱)۔

۵- ادھار فروختگی کی صورت میں "مدت" کے فرق سے ثمن میں زیادتی:

اگر خریدار کے سامنے دونوں صورتیں پیش کرنے کے بعد دونوں فریق نے کسی ایک صورت پر اتفاق کرلیا تو معاملہ کی یہ شکل شرعاً جائز ہوگی، البتہ اگر فریقین نے دونوں میں سے کسی ایک صورت پر اتفاق نہیں کیا اور دونوں جدا ہوگئے تو جہالت ثمن کی وجہ سے بیع فاسد قرار پائے گی۔

۶، ۷- قسط کی عدم ادائیگی کی صورت میں مزید رقم کا مطالبہ:

"بیع مؤجل" کی صورت میں سامان کی حوالگی کے بعد خریدار کی ذمہ داری ہے کہ وہ یکمشت یا قسطوں کی شکل میں قیمت کی ادائیگی جیسے طے پائی ہو، قیمت ادا کرے، اگر وہ قیمت ادا نہیں کرتا ہے یا اس کی ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول سے کام لیتا ہے تو اس سے اضافی رقم کا مطالبہ چاہے بوقت معاملہ ہی اس کی شرط کیوں نہ لگادی گئی ہو جائز نہیں ہوگا، اضافی رقم سود ہوگی (دیکھئے: تحریر الکلام فی مسائل الالتزام للحطابی/ ۱۷۶، نیز جدہ فقہ اکیڈمی کے چھٹے سمینار منعقدہ ۱۷ تا ۲۳ شعبان ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۴ تا ۲۰ مارچ کا وہ فیصلہ جو بیع بالتقسیط سے متعلق ہے) بائع کی طرف سے قیمت کی یکمشت ادائیگی یا کئی قسط کی ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں خریدار یا تو:

(الف)...... مالدار ہوگا اور ثمن کی ادائیگی پر اسے قدرت حاصل ہوگی، ایسی صورت میں اگر وہ ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے تو اسے ثمن کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا، اور اگر اس کے پاس ثمن کی ادائیگی کے لیے نقد ہی نہ ہو یا ثمن کی مالیت سے کم ہو تو ایسی صورت میں اسے خرید وفروخت اور اپنے مال وجائداد میں تصرف کرنے سے روک دیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ مقررہ قیمت ادا کردے۔ اور اگر خریدار کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے ثمن کی ادائیگی ہوسکے تو ایسی صورت میں بائع کو اختیار حاصل ہوگا چاہے تو معاملہ کو ختم کردے اور اپنا سامان واپس لے لے اور اگر چاہے تو اس کے صاحب استطاعت ہونے تک صبر کرے۔

(ب)...... یا مفلس وتنگ دست ہوگا اور اپنی مفلسی کی وجہ سے وقت پر قیمت ادا نہیں کررہا ہے تو اسے فراخی ہونے تک مہلت دی جائے گی۔ قرآن کریم میں ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" (البقرہ ۲۸۰)۔ (اگر مدیون مفلس وتنگ دست ہو تو اس کو فراخی ہونے تک مہلت دو)۔

ایسی صورت میں دائن کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ اپنے دین میں اضافہ کردے۔ ایسی صورت میں اضافی رقم کے سود ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں، امام قرطبی نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں تحریر کیا ہے:

"وقال جماعة من أهل العلم: قوله تعالى (فنظرة إلى ميسرة) عامة في جميع الناس، فكل من أعسر أنظر۔ وهذا قول أبي هريرة والحسن وعامة الفقهاء"۔

"وقال ابن عباس و شريح: ذلك في الربا خاصة، فأما المديون وسائر المعاملات، فليس فيها نظرة بل يرده إلى أهلها إذ يحبس فيه حتى يوفيه وهو قول إبراهيم" (تفسیر القرطبی ۳/ ۳۷۲-۳۷۱)۔

(اہل علم کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی کا ارشاد: "فنظرة إلى ميسرة" تمام لوگوں کے بارے میں عام ہے جو شخص بھی تنگ دست ہو اسے مہلت دی جائے گی، حضرت ابوہریرۃ، حسن اور عام فقہاء کی یہی رائے ہے، ابن عباس اور شریح کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم ربا کے ساتھ خاص ہے دیون اور دیگر معاملات میں مہلت نہیں دی جائے گی، بلکہ صاحب حق تک اس کا حق پہونچایا جائے گا یا اسے دین کی ادائیگی تک کے لیے قید کردیا جائے گا، امام

ابراہیم کی یہی رائے ہے)۔

اب رہا یہ سوال کہ تاخیر اور ٹال مٹول کی صورت میں اضافی رقم کو مالی جرمانہ یا مالی تاوان کا عنوان دے کر جائز قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں، بالخصوص اس صورت میں، جبکہ مدیون تنگ دست نہ ہو، بلکہ اس کا اصل مقصد دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ہو، اس سلسلہ میں بعض علماء معاصرین کی رائے جواز کی ہے، ان حضرات نے سود اور مالی تاوان میں مختلف وجوہ سے فرق کیا ہے اور مالی معاوضہ کو ان حضرات نے صرف اس صورت میں مدیون پر لازم کیا ہے، جبکہ وہ مالدار ہو، مدیون کے مفلس و تنگ دست ہونے کی صورت میں اس پر مالی معاوضہ لازم نہیں کیا گیا ہے، مگر ان حضرات کی رائے سے اختلاف کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔
(فقہی مقالات مولانا تقی عثمانی، ۱۲۱ تا ۱۳۲)۔

۸- مال مرہون سے انتفاع:

مال مرہون سے مرتہن کے لیے انتفاع جائز ہے یا نہیں اس سلسلہ میں حنفیہ کے حسب ذیل اقوال ہیں:

ا۔ مرتہن کے لیے مال مرہون سے مطلقاً انتفاع جائز نہیں ہے چاہے یہ انتفاع رہائش کے ذریعہ ہو یا سواری یا کسی اور ذریعہ سے ہو، اور چاہے راہن نے مرتہن کو انتفاع کی اجازت دے دی ہو (رد المحتار ۵/ ۳۳۸)۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ راہن کی اجازت کی صورت میں مال مرہون سے مرتہن کے لیے انتفاع جائز و درست ہے، صاحب الہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

''ولیس للمرتھن أن ینتفع بالرھن لا بالاستخدام ولا سکنی ولا لبس إلا أن یاذن له المالك'' (ہدایہ ۴/ ۵۰۶)۔

(مالک کی اجازت کی صورت میں مرتہن کے لیے مال مرہون سے انتفاع جائز ہوگا) (نیز دیکھئے: عنایہ شرح ہدایہ اور مجمع الأنہر ۲/ ۶۰۲)۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مالک کی اجازت کے بعد مرتہن کے لیے شی مرہون سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے، حنفیہ میں سے امام ابو یوسف کی یہی رائے ہے۔
(قنیۃ المنیۃ / ۳۶۲، الاشباہ والنظائر ۲/ ۱۱۳)۔

۴۔ چوتھی رائے یہ ہے کہ اگر رہن میں انتفاع کی شرط نہ ہو اور بدون شرط راہن (گروی رکھنے والا) مال مرہون سے مرتہن کو بطیب خاطر انتفاع کی اجازت دے دے تو انتفاع درست ہوگا (جامع الرموز للقہستانی / ۴۰۷، رد المحتار ۵/ ۳۳۸)۔

حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اپنے ایک فتوی میں چوتھے مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔

فقہ مالکی میں یہ تفصیل ہے: اگر دین کے عوض رہن رکھا گیا تو چاہے عقد میں رہن سے مرتہن کے انتفاع کی شرط کیوں نہ لگا دی گئی ہو انتفاع جائز نہیں ہوگا اور قرض کے علاوہ بیع وغیرہ کے رہن کی صورت میں انتفاع کی شرط لگانے کی صورت میں فائدہ اٹھانا درست ہوگا، فقہ مالکی کی معروف کتاب ''عقد الجواہر الثمینۃ فی مذہب عالم المدینۃ'' میں ہے:

''ولو شرط مالا یقتضیه مطلق العقد ولا ینافضه لکن یتعلق به غرض کقوله بشرط ان ینتفع به المرتھن لم یصح فی القرض و یصح فی غیرہ إذا عین المنفعة وحدد زمنھا کما فی الإجارۃ'' (عقد الجواھر الثمینة فی مذھب عالم المدینة لابن شاش، ۲/ ۵۸۳)۔

فقہ حنبلی میں راہن کی اجازت یا بوقت معاملہ شرط لگانے کی صورت میں مرتہن کے لیے مال مرہون سے حسب ذیل شرائط کے ساتھ فائدہ اٹھانا درست ہے۔

ا۔ مال مرہون دین کے عوض نہ رکھا گیا ہو۔

۲۔ انتفاع بالعوض کی اجازت دی گئی ہو، لہذا اگر راہن نے دین کی صورت میں مال مرہون سے بغیر عوض انتفاع کی اجازت دی ہو تو اس سے انتفاع جائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ قرض سے فائدہ اٹھانا ہے جو شرعاً حرام ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۳۲)۔

شافعیہ کے نزدیک مرتہن کے لیے مال مرہون میں صرف حق (استیفاء) حاصل ہوتا ہے، شی مرہون سے انتفاع یا اس میں کسی تصرف کا اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے، البتہ راہن کے لیے مال مرہون سے ہر وہ انتفاع جائز ہوگا جس سے مال مرہون کی قیمت میں نقص پیدا نہ ہو، جیسے سواری کرنا یا دودھ حاصل کرنا (روضۃ الطالبین ۴/ ۹۷)۔

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر رہن میں انتفاع کی شرط لگائی گئی ہے تو انتفاع ناجائز اور حرام ہوگا اور اگر کسی بھی جہت سے مال مرہون سے انتفاع کی شرط نہ لگائی گئی ہو اور پھر راہن بطیب خاطر اجازت دے دے تو انتفاع درست ہوگا۔

مال مرہون کے ضیاع کی صورت میں تاوان کا حکم:

بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے مال مرہون ضائع ہوجائے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے۔

(الف)...... مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ کس نوعیت کا ہوگا یہ قبضہ امانت ہے یا قبضہ ضمان؟

(ب)...... مرتہن پر وجوب ضمان کی صورت کیا ہوگی؟

(ج)...... رہن کے استہلاک کی صورت میں تاوان کا حکم؟

(الف) مال مرہون پر مرتہن کے قبضہ کی نوعیت:

مال مرہون پر مرتہن کے قبضہ کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا قبضہ قبضۂ امانت ہے یا قبضۂ ضمان؟ اس سلسلہ میں علماء کے دو اقوال ہیں:

ا۔ پہلی رائے یہ ہے کہ مرتہن کا قبضہ قبضۂ ضمان ہے، حنفیہ کی یہی رائے ہے، حنفیہ کے نزدیک مال مرہون پر قبضہ اس کی عینیت کے اعتبار سے قبضہ امانت ہے، مگر اس اعتبار سے کہ وہ دین کے عوض رکھا گیا ہے، اس لیے دین کی مالیت کے بقدر مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ قبضہ ضمان ہے، مال مرہون کے ضیاع کی صورت میں اگر مال مرہون کی مالیت دین کے مساوی ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ دائن نے اپنا حق وصول کرلیا، اور اگر مال مرہون کی مالیت دین کی مالیت سے زیادہ ہو تو ''زیادتی'' پر مرتہن کا قبضہ قبضہ امانت قرار پائے گا اور اگر مال مرہون کی مالیت دین کی مالیت سے کم ہو تو مرتہن مال مرہون کی مالیت منہا کرنے کے بعد دین کا باقی حصہ راہن سے وصول کرنے کا حقدار ہوگا۔

ہدایہ میں ہے: ''فلو هلك في يده هلك في ضمان المرتهن؛ لأن يده في حق المالية يد المرتهن وهي المضمونة'' (ہدایہ علی ہامش فتح القدیر ۱۰/ ۱۹۳)۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ قبضہ امانت ہے، لہذا اگر مال مرہون مرتہن کے پاس اس کی تعدی کے بغیر ہلاک ہوجائے تو ضامن نہیں ہوگا، البتہ تعدی اور تقصیر کی صورت میں ضمان واجب ہوگا، شافعیہ اور حنابلہ کی یہی رائے ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک اگر مال مرہون ان اشیاء کے قبیل سے ہو جن کا اخفا ممکن ہے، جیسے زیورات، کپڑے، کتابیں، ہتھیار وغیرہ تو ان کی ہلاکت کی صورت میں استحسانا مرتہن کو ضامن قرار دیا جائے گا۔ (المہذب ۱/ ۳۱۶، مغنی المحتاج ۲/ ۱۳۶)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے عدم وجوب ضمان کے قول کو حضرت علیؓ، امام عطاء، زہری، اوزاعی، شافعی، ابوثور اور ابن المنذر کی طرف منسوب کیا ہے، ''المغنی'' میں ہے:

''وأما إن تلف من غير تعد منه ولا تفريط، فلا ضمان عليه وهو من مال الراهن يروى ذلك عن علي رضي الله عنه وبه قال عطاء والزهري والأوزاعي والشافعي وأبوثور وابن المنذر'' (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۳۸)۔

(ب) ضمان کی صورت کیا ہوگی؟

حنفیہ کے نزدیک شیٔ مرہون اپنی مالیت اور دین کی مالیت میں سے جس کی مالیت کم ہوگی اس کے عوض مضمون ہوگی، لہذا اگر مال مرہون کی مالیت دین کی مالیت سے کم ہو تو وہ مضمون بالقیمہ ہوگا اور اس کی مالیت کے بقدر راہن کے ذمہ سے دین ساقط ہوجائے گا اور باقی ماندہ دین راہن سے وصول کرے گا اور اگر دین اور مال مرہون کی مالیت مساوی ہو تو ایسی صورت میں مرتہن اپنے دین کو وصول کرنے والا قرار پائے گا اور اگر رہن کی مالیت دین کی مالیت سے زائد ہو تو زائد مالیت مرتہن کے ہاتھ میں امانت کے حکم میں ہوگی اور اس کا ضمان صرف ایسی صورت میں واجب ہوگا جبکہ مرتہن کی طرف سے تعدی یا اس کی حفاظت میں کوتاہی پائی جائے (البدائع ۶/ ۱۶۰)۔

حنفیہ کے نزدیک وجوب ضمان کی حسب ذیل شرطیں ہیں:

ا۔ شیٔ مرہونہ کی ہلاکت وضیاع کے وقت دین باقی ہو اگر مال مرہون کی ہلاکت سے پہلے ہی دین معاف کرنے یا ادا کرنے کے ذریعہ ساقط ہوگیا ہو تو ایسی صورت میں مرتہن پر ضمان واجب نہیں ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۲۶۹)۔

(ج) راہن کے استہلاک کی صورت میں تاوان کا حکم:

اس مسئلہ میں تمام ہی فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر مال مرہون کو راہن نے ہلاک کر دیا یا اس کی طرف سے تعدی اور تقصیر پائی گئی تو اس پر ضمان واجب ہوگا اور مال مرہون کے ''ذوات القیم'' میں سے ہونے کی صورت میں اس کی قیمت اور ذوات الامثال کے قبیل سے ہونے کی صورت میں اس کا مثل واجب ہوگا، اور قیمت کی ادائیگی کی صورت میں قبضہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس لیے کہ مال مرہون قبضہ کے دن ہی سے اس کے ضمان میں آ گیا، البتہ بدون تعدی وجوب تاوان ہوگا یا نہیں اس سلسلہ میں احقر کا رجحان اس طرف ہے کہ وجوب ضمان ہوگا، کیونکہ لوگوں کے حالات بدل چکے ہیں، حلال وحرام کی تمیز اٹھ گئی ہے، اگر مرتہن کو ضامن قرار نہیں دیا جائے تو لوگوں کی امانتیں اور اموال وحقوق ضائع ہو جائیں گے۔

(د) مال مرہون سے ٹال مٹول کی صورت میں واجب الاداء قیمت کی وصولیابی:

خریدار کے وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں بائع خریدار پر دباؤ ڈالے گا کہ وہ واجب الاداء قیمت ادا کر دے، اگر اس کے بعد وہ قیمت ادا نہ کرے تو بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مال مرہون کو فروخت کر کے اپنا واجب الاداء دین وصول کرے، لیکن بوقت معاملہ سامان کی جو قیمت آپسی رضامندی سے طے ہوئی تھی اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا، اگر شی مرہون کو فروخت کرنے کے بعد اتنی رقم وصول ہوئی ہو کہ بائع کے دین کی ادائیگی کے بعد بھی کچھ رقم فاضل باقی رہ جائے تو وہ بچی ہوئی رقم خریدار کو واپس کرنا ضروری ہوگا۔

۹- فروخت شدہ سامان کو رہن بنانے کی غرض سے روکنا:

فروخت شدہ سامان کو بائع کے پاس ''رہن'' بنا کر رکھنے کی دو صورتیں ہیں:

(الف)...... پہلی صورت یہ ہے کہ خریدار خریدے ہوئے سامان پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع کے پاس سامان کو بطور رہن چھوڑ دے یہ صورت جائز نہیں ہوگی، اس لیے کہ اس صورت میں خریدار کا مبیع پر قبضہ نہیں ہوا ہے، اور قبضہ سے پہلے اسے ''رہن'' کی حیثیت دینا درست نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ بائع حصول ثمن کے لیے ''مبیع'' کو اپنے پاس روک لے اور حصول ثمن کے لیے مبیع کا روکنا بیع مؤجل میں درست نہیں ہے۔

(ب)...... دوسری صورت یہ ہے کہ معاملہ مکمل ہو جانے کے بعد خریدار ''مبیع'' پر قبضہ کر لے اور پھر اسی سامان کو بطور رہن بائع کے پاس رکھ دے، یہ صورت فقہاء کے نزدیک درست ہے، علامہ علاء الدین حصکفی نے درمختار میں اس کے جواز کا تذکرہ کیا ہے (درمختار علی ہامش الرد ۶/ ۴۹۷، ردالمحتار ۶/ ۴۹۷)۔

امام محمدؒ نے اپنی کتاب ''الجامع الصغیر'' میں تحریر فرمایا ہے:

''ومن اشترى ثوبا بدراهم، فقال للبائع: أمسك هذا الثوب حتى أعطيك الثمن فالثوب رهن''۔

(اگر کسی نے دراہم کے ذریعہ کوئی کپڑا خریدا اور پھر خریدار نے بائع سے کہا کہ جب تک میں قیمت ادا نہ کردوں اس وقت تک اسے اپنے ہی پاس روکو، اس صورت میں یہ کپڑا بائع کے پاس رہن سمجھا جائے گا)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قبضہ کے بعد خریدے ہوئے سامان کو بطور رہن بائع کے پاس رکھنا جائز ہے، بشرطیکہ صلب عقد میں رہن کی شرط عائد نہیں کی گئی ہو، اور اگر صلب عقد ہی میں رہن کی شرط لگا دی گئی ہو تو اس صورت کے جواز میں علامہ ابن قدامہ حنبلی نے بعض علماء کا اختلاف نقل کیا ہے، لیکن ان کے نزدیک صحیح اور قابل اعتماد رائے جواز ہی کی ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۲۷)۔

(ب) ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو محبوس کرنا:

بیع مؤجل میں ثمن کی وصولیابی کے لیے بائع کو یہ حق نہیں ہے کہ مبیع کو اپنے پاس روک لے ''بیع مؤجل'' میں مبیع خریدار کے حوالہ کرنا ضروری ہے، بیع بالتقسیط بیع مؤجل ہے، اس میں بائع کو ثمن کے استیفاء کے لیے حبس مبیع کا حق نہیں ہے صرف نقد بیع ہی میں بائع کو استیفاء ثمن کے لیے حبس مبیع کا حق حاصل ہوتا ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے کہ:

''قال أصحابنا رحمهم الله تعالى: للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن، إذا كان حالا كذا في المحيط، وإن كان مؤجلا. فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل وبعده كذا في المبسوط'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵)۔

(ہمارے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نقد بیع میں ثمن کی وصولیابی کے لیے فروخت کنندہ کو حبس مبیع کا حق حاصل ہے، لیکن ادھار بیع میں بائع کو مبیع روکنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ نہ ادائیگی کے وقت سے پہلے اور نہ ادائیگی کے وقت کے بعد)۔

۱۰- اقساط کی عدم ادائیگی کی صورت میں سامان کی ضبطی:

بعض اقساط کی ادائیگی کی صورت میں سامان کو بھی اپنے پاس رکھنا اور ادا کردہ اقساط کو بھی روک لینا بائع کے لیے جائز نہیں ہوگا۔

۱۱- خرید کردہ سامان کو خریدار کے پاس رہن رکھنا:

فقہی نقطۂ نظر سے اس قسم کے رہن کے جواز میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں رہن کے بارے میں "مقبوض" کی شرط لگائی گئی ہے، قرآن کریم میں ہے: "فرهن مقبوضة" (سورہ بقرہ/ ۲۸۳)۔

امام حاکم نے کافی میں تحریر کیا ہے: "لا يجوز الرهن غير مقبوض"

مختصر کرخی میں ہے: "قال أبو حنيفة وزفر وأبويوسف ومحمد الحسن بن زياد: لا يجوز الرهن إلا مقبوضا" (تکملہ فتح القدیر ۱۰/۱۵۶)۔

جبکہ رہن کی مذکورہ صورت میں شی مرہون پر مرتہن کا قبضہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ راہن ہی کے قبضہ میں رہتی ہے، اس لیے اسے رہن قرار دینا درست نہیں ہے، البتہ فقہاء کی بعض عبارات سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے کہ مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ ہوجانے کے بعد راہن عاریت کے طور پر اس سامان کو واپس لے لے، اس صورت میں راہن اس سے انتفاع کرسکتا ہے، اور عاریت کی وجہ سے رہن فاسد نہیں ہوگا۔ بلکہ مرتہن کو بھی یہ حق حاصل رہے گا کہ جب چاہے مال مرہون کی واپسی کا راہن سے مطالبہ کرے۔

اگر وہ چیز راہن کے پاس ہلاک ہوگئی تو اس کی چیز ہلاک ہوگی، ایسی صورت میں مرتہن کو یہ بھی حق حاصل رہتا ہے کہ وہ دین کی ادائیگی کی مقررہ مدت گزرنے کے بعد اس سامان کو فروخت کرکے اپنا دین وصول کرلے (ہدایہ علی ہامش تکملہ ۱۰/ ۲۰۲-۲۰۱)۔

مگر رہن کی مذکورہ صورت کو عاریت قرار دینا اس وجہ سے مشکل ہے کہ اس صورت میں شی مرہون پر مرتہن کا قبضہ نہیں ہوتا ہے، اسے رہن قرار دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ رہن میں قبضہ حسی کو ضروری قرار نہ دیا جائے، بلکہ قبضہ معنوی ہی کو کافی سمجھا جائے، رہن پر مرتہن کے قبضہ کو شرط قرار دینے کی علت یہ ہے کہ مرتہن شی مرہون کو دین کی عدم ادائیگی کی صورت میں فروخت کرکے اپنا دین وصول کرے۔ رہن کی مذکورہ بالا صورت میں قانونا ایگریمنٹ میں مذکورہ شرائط کی بنیاد پر مرتہن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ دین کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے فروخت کرکے اس سے اپنا دین وصول کرلے، مولانا تقی عثمانی کا بھی اسی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے (فقہی مقالات ۹۴-۹۵)۔

۱۲- کفالہ میں معاوضہ کا شرعی حکم:

عقد کفالہ کی صورت میں اجرت یا حق محنت کا مطالبہ اشخاص کی طرف سے ہو یا اداروں کی طرف سے درست نہیں ہوگا، البتہ لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے کے کام میں بینک یا اداروں کے جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں ان کا مطالبہ عمیل سے جائز ہے (فقہی مقالات/ ۹۸)۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت:

غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خرید وفروخت کی مذکورہ صورت ناجائز ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دستاویز کی بیع درحقیقت اس مالیت کی بیع ہے جو دستاویز میں تحریر شدہ ہے اور وہ دین ہے جس کی بیع ایسے شخص کے ہاتھ کی جارہی ہے جس کے ذمہ دین نہیں ہے، جسے اصطلاح فقہ میں "بيع الدين من غير من عليه الدين" کہا جاتا ہے۔ اور یہ بیع درست نہیں ہے، یا اس صورت میں کرنسی کی بیع کرنسی سے لازم آتی ہے جس میں کمی وبیشی اور ادھار دونوں ممنوع ہے۔

مگر اس معاملہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے جواز کی راہ نکل سکتی ہے، جس کی صورت یہ ہے: سب سے پہلے دائن جو حامل دستاویز ہے وہ اپنی طرف سے بینک کو خریدار (دستاویز جاری کرنے والا) سے دین کی وصولیابی کا وکیل بنادے اور اس وکالت پر یہ شخص بینک کو اپنی طرف سے کچھ اجرت بھی دے دے، اس کے بعد بائع جو حامل دستاویز ہے نیا معاملہ کرکے دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض حاصل کرلے اور اپنی طرف سے بینک کو اس کا اختیار دے دے کہ جب خریدار کی طرف سے دستاویز کے عوض رقم وصول ہوجائے تو اس رقم سے وہ اپنا واجب الاداء قرض وصول کرلے، اس طرح سے یہ دو معاملات علیحدہ علیحدہ ہوجائیں

گے۔ اور شرعی اعتبار سے دونوں معاملات جائز قرار پائیں گے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

بایں تاویل جائز ہے کہ اس وکیل سے اس نے قرض لیا پھر اس نے وصول کر کے محسوب کر دیا (امداد الفتاوی ۳/۱۷/۳۱۷)۔

۱۴- ادھار معاملہ میں طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس کے ایک حصہ کی معافی کی شرط پر وصول کرنا:

اس سلسلہ میں فقہاء کی دو رائیں ہیں:

۱۔ پہلی رائے یہ ہے کہ معاملہ کی یہ صورت جائز ہے، اس لیے کہ بائع اپنے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دیتا ہے اور کچھ حصہ وصول کر لیتا ہے جس کا اسے حق ہے، جیسا کہ نقد لین دین میں اسے کچھ حصہ چھوڑ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے، صحابہ میں سے حضرت عبداللہ ابن عباس، فقہاء تابعین میں سے امام ابراہیم نخعی، ائمہ احناف میں سے امام زفر بن الہذیل، اور شوافع میں سے ابوثور اس معاملہ کے جواز کے قائل ہیں۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ معاملہ کی یہ صورت ناجائز ہے، کیونکہ جس طرح دین مؤجل میں تاخیر کی صورت میں دائن کے لیے ''اجل'' (مدت) کے عوض اصل دین سے زائد رقم لینا حرام اور سود میں داخل ہے اسی طرح وقت مقررہ سے پہلے تعجیل کی صورت میں ''اجل'' (مدت) کے عوض مدیون کے لیے اپنے ذمہ واجب الاداء دین کا کچھ حصہ لینا جائز نہیں ہوگا۔

صحابہ میں سے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، زید بن ثابتؓ اور تابعین میں سے امام محمد بن سیرین، خواجہ حسن بصری، حضرت ابن المسیب، امام حکم بن عتبہ، امام شعبی عدم جواز کے قائل ہیں، ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے (مصنف عبدالرزاق ۸/۷۱-۷۴)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے المغنی میں مسالک ائمہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

اگر ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ دین مؤجل ہو، اب وہ شخص اپنے غریم سے مطالبہ کرے کہ مجھ سے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دو، بقیہ دین میں فوراً ادا کر دوں گا تو یہ صورت جائز نہیں ہے۔

حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عمر، حضرت مقداد، حضرت سعید بن المسیب، امام سالم، حسن بصری، امام حماد، امام حکم، امام شافعی، امام مالک، امام ثوری، امام ہشیم، ابن علیہ، امام اسحاق اور امام ابوحنیفہؒ نے اس معاملہ کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے، حضرت مقدادؓ نے ایسے دو شخصوں کو جنہوں نے اس طرح کا معاملہ کیا تھا خطاب کرتے ہوئے فرمایا: تم دونوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس معاملہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام نخعی اور امام ابوثور سے یہی منقول ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں قرض خواہ اپنے حق کا کچھ حصہ وصول کر رہا ہے اور کچھ حصہ معاف کر رہا ہے، لہذا یہ صورت جائز ہے، جیسا کہ دین نقد میں یہ صورت درست ہوتی ہے۔

ہمارے نزدیک چونکہ مذکورہ صورت میں مدت کی بیع ہو رہی ہے، اس لیے جائز نہیں ہے، جیسے کہ اگر قرض خواہ دین میں اضافہ کرتے ہوئے مقروض سے کہے کہ تم میرا سو درہم کا قرض فوراً ادا کر دو، میں تمہیں دس درہم دوں گا (ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں ہے) (المغنی لابن قدامہ)۔

صاحب ہدایہ نے تحریر کیا ہے:

''ولو كانت له ألف مؤجلة فصالحه على خمسمائة حالّة لم يجز'' (هدايه على هامش الفتح ۸/۴۴۸)۔

(اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ ایک ہزار دین مؤجل ہو اور وہ مدیون سے نقدی پانچ سو پر مصالحت کرے تو جائز نہیں ہوگا)۔

امام محمد علیہ الرحمہ نے مؤطا میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''قال محمد: وبهذا نأخذ من وجب له دين على إنسان إلى أجل، فسأل أن يضع عنه ويعجل له ما بقي، لم ينبغ ذلك، لأنه يعجل قليلا بكثير دينا، فكأنه يبيع قليلا نقدا بكثير دينا وهو قول عمر بن الخطاب و زيد بن ثابت وعبد الله بن عمر وهو قول أبي حنيفة'' (موطا امام محمد ۱/۳۳۲)۔

(امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ہمارا مسلک عدم جواز کا ہے اور ہم اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو اور وہ اس سے کہے کہ وہ اس سے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے گا بشرطیکہ وہ بقیہ دین فوراً ادا کرے تو یہ صورت جائز نہیں ہوگی، اس لیے کہ اس صورت میں وہ دین کثیر کے عوض میں دین قلیل کو فوری طلب کر رہا ہے گویا کہ وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کر

رہا ہے، یہی حضرت عمر بن الخطاب، زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا قول ہے، امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے)۔
مذکورہ بالا نصوص فقہیہ اور آثار صحابہ وتابعین کی وجہ سے مدت کے مقابلے میں دَین کے کچھ حصے کو ساقط کرنے کی حرمت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

۱۵- فوری ادائیگی والے دیون میں دین کا ایک حصہ چھوڑ دینا:

بیع مؤجل میں قیمت کی ادائیگی کے لیے وقت اور مدت کی تعین ضروری ہے اگر مدت کی تعین کیے بغیر دونوں فریق جدا ہوجائیں تو معاملہ درست قرار نہیں پائے گا۔

صاحب "ہدایہ" نے اس معاملہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"ولابد أن يكون الأجل معلوما؛ لأن الجهالة فيه ما نعة من التسليم الواجب بالعقد. فهذا يطالبه به في قريب المدة وهذا يسلمه في بعيدها" (هداية على هامش الفتح ۶/۲۴۳)۔

(اور مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ جہالت واجب بالعقد کی حوالگی کے لیے مانع ہوگی، اور دائن اس سے قریبی مدت میں ادائیگی کا مطالبہ کرے گا، جب کہ مدیون اسے دیر اور تاخیر سے ادا کرے گا، لہٰذا یہ صورت جائز نہیں ہوگی)۔

مگر سوال ۱۴/ کی مناسبت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سوال میں شاید تسامح ہوا ہے، سوال ۱۵/ کا منشاء یہ ہو کہ فوری ادائیگی والے دیون میں دین کا ایک حصہ چھوڑنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟ اس صورت میں چونکہ "اجل" کے مقابلہ میں دین کا کوئی حصہ نہیں چھوڑا جاتا ہے، لہٰذا ایسے نقدی دیون میں جن کی ادائیگی کے بارے میں معاملہ کے اندر کسی مدت کی تعیین نہیں کی گئی، بلکہ مدیون دین کی ادائیگی میں کسی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے، ایسے دیون میں فوری ادائیگی کی شرط پر دین کے کچھ حصہ کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، امام دار الہجرۃ مالک بن انس سے اس کے جواز کی صراحت ثابت ہے۔

"المدونة الكبرى" میں ہے: "قلت: أرأيت لو أن لي على رجل مائة دينار و مائة درهم حالّة، فصالحته من ذلك على مائة دينار و درهم نقدا قال: لا بأس بذلك" (المدونة الكبرى ۱۱/۲۷)۔

"المسوی علی المصفی" میں ہے:

اہل علم اس واقعہ اور ان آثار کے درمیان جو "ضع وتعجل" کے بارے میں منقول ہیں۔ اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ ان آثار کا تعلق "دین مؤجل" سے ہے اور یہ واقعہ "دین حال" سے متعلق ہے، اور "کتاب الرحمۃ" میں ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص پر دین مؤجل واجب ہو تو دائن کے لیے مدت مقررہ کے آنے سے قبل یہ جائز نہیں ہے کہ دین کا کچھ حصہ معاف کردے تاکہ دین کا بقیہ حصہ فوری طور پر وصول کرلے، البتہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے اس وقت کچھ دین وصول کرلے اور بقیہ معاف کردے (المسوی علی المصفی ۲/۳۸۲)۔

۱۶- قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں مہلت کو ختم کرنا:

بیع بالتقسیط کے ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر خریدار نے طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی ادائیگی میں تاخیر کردی تو کیا ایسی صورت میں بائع کے لیے مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا، اور فوری طور پر بقیہ تمام اقساط کی ادائیگی کا مطالبہ شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، واضح رہے کہ "بیع بالتقسیط" کے بعض ایگریمنٹ میں اس امر کی صراحت کردی جاتی ہے کہ اگر خریدار مقررہ وقت پر کوئی قسط ادا نہ کرسکا تو اس صورت میں آئندہ کی باقی اقساط کو بھی فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا، اور بائع کے لیے فی الحال تمام اقساط کا مطالبہ کرنا جائز ہوگا، اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "بیع بالتقسیط" میں اس طرح کی شرط لگانا درست ہے؟

بائع کے لیے بیع بالتقسیط میں اس طرح کی شرط لگانا جائز ہے، اور خریدار کی طرف سے طے شدہ اقساط میں سے کسی قسط کی عدم ادائیگی یا اس میں تاخیر کی صورت میں بائع کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ پہلے سے حاصل شدہ مہلت کو ختم کردے۔ فقہ حنفی کی معتبر کتاب خلاصۃ الفتاوی میں ہے:

"ولو قال: كلما دخل نجم ولم تؤد، فالمال حالّ صح ويصير المال حالّا" (خلاصۃ الفتاوی ۳/۵۴)۔

۱۷- کیا فریقین میں سے کسی ایک کی موت کی صورت میں اقساط کا معاملہ اپنی جگہ باقی رہے گا؟

"بیع بالتقسیط" کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اقساط کی ادائیگی کی مقررہ وقت سے قبل ہی اگر فریقین (دائن اور مدیون) میں سے کسی ایک فریق کا انتقال ہوجائے تو کیا یہ معاملہ اب بھی اسی تفصیل اور مہلت کے ساتھ باقی رہے گا جو طے شدہ تھا یا معاملہ کی نوعیت میں فرق آجائے گا۔ یا تو:

(الف)...... دائن کا انتقال ہو جائے۔ دائن کے انتقال کی صورت میں معاملہ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور دائن نے بوقت معاملہ قیمت کی ادائیگی کے لیے جو مہلت دی تھی وہ بدستور سابق باقی رہے گی۔ دائن کے ورثاء اپنے مورث کے قائم مقام قرار پائیں گے۔

ردالمحتار میں ہے: ''ویبطل الأجل بموت المدیون لا الدائن'' (درالمختار ۷/ ۵۳)۔

(ب)...... مدیون کی موت ہو جائے، اس سلسلہ میں فقہاء کے حسب ذیل اقوال ہیں:

۱۔ مدیون کی موت کی صورت میں دین مؤجل فوری واجب الادا ہو جاتا ہے، حنفیہ، شافعیہ اور جمہور فقہاء مالکیہ کا یہی مسلک ہے، امام شعبی، امام نخعی، سوار، مالک، ثوری، امام ابوحنیفہ اور شافعی کا یہی قول ہے۔ امام احمد بن حنبل کا بھی ایک قول یہی ہے، مگر حنابلہ کا قول مختار یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق وتصدیق کر دیں تو ایسی صورت میں مدیون کی موت سے دین کی ادائیگی فوری واجب نہیں ہوگی، بلکہ حسب سابق دین مؤجل ہی رہے گا۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مدیون کی موت کی صورت میں دین کی ادائیگی فوری طور پر واجب الادا نہیں ہوگی، بلکہ دین مؤجل ہی رہے گا، اگر چہ مدیون کے ورثاء دین کی توثیق کر دیں، امام ابن سیرین، عبداللہ بن الحسن، اسحاق، ابوعبید، طاؤس، ابوبکر بن محمد، امام زہری اور سعید بن ابراہیم کا یہی مسلک ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۸۶)۔

مولانا تقی عثمانی نے حنابلہ کی رائے کو ترجیح دی ہے، یعنی مدیون کے ورثاء کی تصدیق وتوثیق کی صورت میں دین مؤجل ہی رہے گا، یہی رائے مناسب اور اشبہ بالفقہ معلوم ہوتی ہے۔

۱۸- اقساط کی پابندی کے ساتھ ادائیگی کی صورت میں انعام دینا:

اگر اقساط کی وقت مقررہ پر ادائیگی کی صورت میں بائع کی طرف سے خریدار کو انعام دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، انعام کی اضافی رقم کو ''اجل'' کے عوض قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۱۹- قرعہ اندازی کے ذریعہ سامان کی حوالگی:

سوال میں مذکور صورت کو ''قمار'' کے دائرہ میں شامل کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ مذکورہ صورت میں ہر خریدار کو لازمی طور پر سامان مل جاتا ہے، البتہ کسی کو زیادہ قیمت پر، اور کسی کو کم قیمت پر، میرے نزدیک معاملہ کی یہ صورت دو وجہوں سے درست نہیں ہے۔

۱۔ یہ بیع بالتقسیط کی صورت ہے اور بیع بالتقسیط میں استیفاء ثمن کی خاطر بائع کو حبس مبیع کا حق نہیں رہتا ہے۔ مبیع کی حوالگی ضروری ہے، قرعہ اندازی کے ذریعہ سامان کی حوالگی کی صورت میں سامان کی حوالگی بوقت معلوم نہیں ہوتی ہے، بلکہ چند یا کل اقساط کی ادائیگی کے بعد قرعہ اندازی کے ذریعہ سامان کی حوالگی ہوتی ہے، گویا بائع استیفاء ثمن کی خاطر اپنے پاس مبیع کو روک لیتا ہے۔ لہذا یہ صورت درست نہیں ہوگی۔

۲۔ بیع مؤجل میں ضروری ہے کہ بوقت معاملہ یہ طے ہو جائے کہ سامان کی قیمت کیا ہوگی، اگر قیمت کی تعیین نہیں کی جائے تو جہالت ثمن کی وجہ سے عقد فاسد قرار پائے گا، مذکورہ صورت میں ثمن مجہول ہوتا ہے، بوقت معاملہ سامان کی ایک قیمت تو ضرور متعین ہو جاتی ہے، مگر اس کی ادائیگی ہر خریدار کے لیے لازم نہیں ہوتی ہے، بلکہ چند اقساط کی ادائیگی کے بعد جس خریدار کا بھی نام قرعہ اندازی کے ذریعہ نکل جاتا ہے اسے سامان ادا شدہ اقساط کے عوض دے دیا جاتا ہے، اس طرح سے ایک ہی سامان ایک شخص کے لیے مثلاً پانچ سو روپے میں پڑے گا، تو وہی سامان دوسرے کے لیے اس سے زیادہ اور تیسرے کے لیے اس سے بھی زیادہ قیمت میں پڑے گا، لہذا جہالت ثمن کی وجہ سے یہ معاملہ درست نہیں ہوگا۔

☆☆☆

قسطوں پر خرید وفروخت

(احکام ومسائل)

مولانا اختر امام عادل [جامعہ ربانی، منوراشریف، بہار۔]

۱- نقد وادھار قیمتوں میں کمی بیشی:

خرید وفروخت کی دوصورتیں ہیں: ۱۔ نقد، ۲۔ یا ادھار، اور یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، پھر نقد وادھار میں بالعموم قیمتوں کے تناسب میں فرق پڑتا ہے، ادھار فروخت میں نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ مقرر کی جاتی ہے، فقہ اسلامی میں اس کی اجازت دی گئی ہے، بشرطیکہ مجلس عقد میں ہی نقد وادھار میں سے کوئی ایک صورت متعین ہوجائے، ورنہ بیع درست نہ ہوگی، عالمگیری میں ہے:

''رجل باع علی أنه بالنقد بکذا وبالنسئية بکذا، والی شهر بکذا أو إلی شهرین بکذا لم یجز. کذا فی الخلاصة'' (عالمگیری ۳/۱۳۶)

اس جزئیہ میں بیع کی وہی صورت ناجائز کہی گئی ہے جس میں نقد وادھار دونوں کی الگ الگ قیمتوں کا ذکر تو مجلس عقد میں ہوگیا مگر معاملہ کسی ایک معین صورت پر نہیں ہوا، بلکہ نقد وادھار یا ادھار ہی کی دو مختلف مدتوں کے درمیان دائر رہا، توثمن کی جہالت کی بناء پر بیع فاسد قرار پائے گی، مبسوط سرخسی میں یہ مسئلہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے:

''وإذا عقد العقد علی أنه إلی اجل کذا بکذا و بالنقد بکذا، أو (قال): إلی شهر بکذا أو إلی شهرین بکذا فهو فاسد. لأنه لم یقاطعه علی ثمن معلوم، ولنهیه علیه السلام عن شرطین فی بیع، وهذا اذا فترقا علی بذا. فإن کانا یتراضیان بینهما ولم یتفرقا حتی قاطعه علی ثمن معلوم واتما العقد علیه فهو جائز. لانهما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحة العقد'' (المبسوط للسرخسی ۱۳/۸)۔

حنابلہ کے یہاں بھی یہ مسئلہ اسی وضاحت کے ساتھ آیا ہے، علامہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

''وقد روی عن طاؤس والحکم وحماد أنهم قالوا: لا بأس أن یقول: ابیعك بالنقد بکذا و بالنسئية بکذا، فیذهب علی أحدهما، وهذا محمول علی أنه جری بینهما بعد ما یجری فی العقد فکأن المشتری قال: آخذه بالنسئية بکذا فقال خذه أو قد رضیت ونحو ذلك، فیکون عقدا کافیا'' (المغنی لابن قدامہ ۴/۲۹۰)۔

اگر مذکورہ شرط کا لحاظ رکھا جائے، یعنی مجلس عقد ہی میں کوئی بات مکمل ہوجائے تو ادھار قیمت نقد سے زیادہ رکھی جاسکتی ہے، اس لیے کہ مالیت کی قدر وقیمت میں وقت کا بڑا دخل ہوتا ہے، ''ہدایہ'' میں ہے:

''أنه یزاد فی الثمن لأجل الأجل'' (باب المرابحہ ۳/۷۴) یعنی وقت کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کی جاتی ہے۔

کفایہ میں بھی یہ مضمون آیا ہے:

''(قوله: لأن الأجل لا یقابله شئ من الثمن) أی حقیقةً أما شبهة المقابلة. فثابتة. ولهذا یزاد فی الثمن لأجل الأجل مالا فی المرابحة'' (کفایہ مع فتح القدیر ۶/۱۳۳)۔

ہمارے اکابر دیوبند اور فرنگی محل کے فتاویٰ میں بھی نقد وادھار قیمتوں میں کمی بیشی کی اجازت دی گئی ہے، بشرطیکہ مجلس عقد ہی میں کوئی ایک صورت متعین ہو جائے۔ (دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ۹۴۳، امداد الفتاویٰ ۳/۱۲، ۳، مجموعہ فتاویٰ عبدالحئی/۳۰۶، کفایت المفتی ۸/۴۰)۔

۲- قسطوں پر خرید وفروخت:

ادھار خرید وفروخت میں قیمت کی یکشت ادائیگی ضروری نہیں، بلکہ اس کی بھی گنجائش ہے کہ قسطوں میں ادائیگی پر معاملہ ہو، مثلاً خرید کردہ مال کی قیمت دس ہزار ہے، اور دس قسطوں میں (ہر ماہ کے آغاز پر ایک ہزار کی ایک قسط) اس کی ادائیگی طے پائے، تو اس کی اجازت ہے، مگر یہ معاملہ بھی مجلس عقد ہی میں طے ہو جانا ضروری ہے۔ ''البیع مع تاجیل الثمن والتسقیط صحیح'' (شرح المجلہ ۲۵، بحوالہ اسلامی فقہ ۲/ ۳۱۳)۔

بعض قدیم کتب فقہیہ میں بھی بیع بالتقسیط کا ذکر آیا ہے، جس سے اس کے جواز کا ثبوت ملتا ہے، البحر الرائق میں خانیہ اور تجنیس کے حوالہ سے ایک مسئلہ ذکر کیا گیا ہے، کہ بائع نے مشتری سے کہا کہ میں اس کپڑے کی بیع تیرے ہاتھ دس درہم کے عوض اس شرط پر کرتا ہوں کہ تم مجھے ہر دن ایک درہم اور ہر دن دو درہم ادا کرو، تو مشتری بائع کو مقررہ قیمت دس درہم چھ قسطوں میں ادا کرے گا، جس کی صورت یہ ہوگی کہ پہلے دن ایک درہم دوسرے دن تین درہم، تیسرے دن ایک درہم، چوتھے دن تین درہم، پانچویں دن ایک درہم اور چھٹے دن ایک درہم ادا کرے گا۔

''فی الخانیہ والتجنیس: رجل قال لآخر: بعت منك ہذا الثوب بعشرة علی أن تعطینی کل یوم درهما وکل یوم درهمین یعطیه عشرة فی ستة أیام فی الیوم الأول درہما وثلاثة فی الیوم الثانی ودرهما فی الیوم الثالث وثلاثة فی الیوم الرابع ودرهما فی الیوم الخامس ودرهما فی الیوم السادس'' (البحر الرائق ۵/ ۲۸۰)۔

منحۃ الخالق میں امام عینیؒ کی منتخب الظہیر یہ کے حوالہ سے امام محمدؒ کا ایک فتوی نقل کیا گیا ہے کہ دو شخصوں میں جنہوں نے باہم بیع وشراء کا معاملہ کیا تھا، ثمن کے بارے میں اختلاف ہو گیا، مشتری کہتا ہے کہ میں نے یہ چیز پچاس درہم میں اس شرط کے ساتھ خریدی ہے کہ پوری قیمت ہر ماہ ڈھائی درہم کے لحاظ سے بیس قسطوں میں ادا کروں گا، جبکہ بائع کہتا ہے کہ میں نے ۱۰۰ درہم میں اس شرط کے ساتھ بیچی ہے کہ ہر ماہ دس درہم کے حساب سے دس قسطوں میں پوری قیمت ادا کرو گے، اور ان دونوں نے اپنی اپنی بات کے لیے بینہ بھی قائم کر دیا، اس صورت میں امام محمدؒ کا فتوی یہ ہے کہ دونوں کی شہادت منجملہ قبول کی جائے گی اور فیصلہ کیا جائے گا کہ مشتری بائع کو چھ ماہ تک ہر ماہ دس درہم کے حساب سے قسط ادا کرے، ساتویں مہینہ ساڑھے سات درہم کی ایک قسط ادا کرے، اس کے بعد ہر ماہ ڈھائی درہم کی ایک قسط کے حساب سے ادا کرے یہاں تک کہ سو درہم پورے ہو جائیں۔

''فی منتخب الظهیرية للإمام العینی: قال محمد بن حسن فی رجلین تبایعا شیئًا واختلفا فی الثمن، فقال المشتری اشتریته بخمسین درهما إلی عشرین شهرا علی أن أؤدی الیك کل شهر درهمین ونصفا، وقال البائع: بعتك بماية درهم الی عشرة اشهر علی أن تؤدی إلی کل شهر عشرة دراهم و أقاما البنية، قال محمد: یقبل شهادتهما ویأخذ البائع من المشتری ستة اشهر کل شهر عشرة، وفی الشهر السابع سبعة ونصفا، ثم یأخذ بعد ذلك کل شهر درهمین ونصفا إلی أن یتم له مائة، وهذه مسئلة عجیبة'' (منحۃ الخالق علی ہامش البحر الرائق ۵/ ۲۸۱)۔

فتاوی خانیہ میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے (دیکھئے خانیہ علی ہامش العالمگیریہ ۲/ ۲۶۹)۔

یہ دونوں مسئلے بیع بالتقسیط کے جواز ہی پر مبنی ہیں، اس لیے کہ حکم جواز کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے، فتاوی (تنقیح الحامدیہ ۱/ ۳۵۶) میں بھی بیع بالتقسیط کا ذکر آیا ہے، مذکورہ حوالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ بیع بالتقسیط جائز ہے، البتہ ہر قسط کی مدت اور مقدار کا معلوم اور متعین ہونا ضروری ہے، ورنہ قسط کے مجہول ہونے کی صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی، عالمگیری میں اس کی صراحت آئی ہے۔

''رجل باع عبدا بألف کل ان ینقده عل أسبوع بعض الثمن حتی ینقده خمس مائة عند مضي الشهر کان فاسدًا'' (عالمگیری ۳/ ۱۴۳ باب الشروط)۔

۳- اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔ کسی بھی چیز کو نقد اور ادھار دونوں طرح فروخت کرنا جائز ہے، اسی طرح نقد اور ادھار کی قیمتوں میں تفاوت رکھنا بھی جائز ہے، دونوں قیمتوں کا مجلس عقد میں تذکرہ آنے میں مضائقہ نہیں، البتہ مجلس کے اختتام سے قبل کوئی ایک شق متعین ہو جانا ضروری ہے۔ نقد قیمت، یا ادھار؟

۴- نقد و ادھار قیمتوں کا تفاوت ربا کے دائرے میں نہیں آتا:

ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرے میں نہیں آتا، اس لیے کہ بائع نے مشتری کے سامنے

اپنا سامان نقد و ادھار کی وضاحت کے ساتھ رکھ دیا ہے وہ جس کو چاہے اختیار کرے، نقد قیمت ہو یا ادھار دونوں ہی مبیع کی پوری قیمت ہے، نوعیت کا فرق ضرور ہے، مگر مبیع کا عوض ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے، بائع کو اختیار ہے کہ وہ اپنے نفع کے لحاظ سے اپنے سامان کی جو قیمت چاہے مقرر کرے، اگر کوئی نقد خریدتا ہے تو اس کو کم قیمت ہی میں نفع محسوس ہوتا ہے، اور اگر کوئی ادھار خریدتا ہے تو اس کو اپنے نفع کا توازن برقرار رکھنے کے لیے زائد قیمت رکھنی پڑتی ہے، البتہ یہ شبہ اس وقت پیدا ہوتا جبکہ دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت متعین نہ ہو اور معاملہ اس طرح ہو کہ اگر آپ نقد خریدیں گے تو مبیع کی قیمت ایک ہزار ہوگی اور اگر ایک ماہ کے بعد آپ قیمت ادا کریں گے تو قیمت پندرہ سو روپے ہوگی، اور اس پر مجلس ختم ہوگئی، اس صورت میں شبہ ربا پیدا ہوگا کہ گویا مبیع کی اصل قیمت صرف ایک ہزار ہی ہے اور فاضل پانچ سو روپے اس صورت میں مشتری کو ادا کرنے ہوں گے جبکہ وہ نقد ادا کرنے کے بجائے ایک ماہ کے بعد ادا کرے، اس طرح اس زائد رقم میں وقت کا عوض ہونے کا شبہ پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اس صورت میں جبکہ بائع نے مشتری کے سامنے دونوں صورتیں رکھ دیں اور مشتری نے قطعی طور پر کسی ایک صورت کا انتخاب کر لیا تو اس صورت میں شبہ ربا پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ نقد یا ادھار جو بھی طے ہوا وہ ہی مبیع کی پوری قیمت ہے، اور عقد کے تمام ہونے کے بعد وقت سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا، مجلس عقد میں قیمت کی مختلف شرحوں کے ذکر کا اعتبار نہیں، مجلس عقد میں تو بائع و مشتری کے درمیان قیمت کی کمی اور زیادتی پر گفتگو ہوتی ہی ہے، اعتبار عقد کے مکمل ہونے کے بعد کا ہے کہ تمام عقد کے بعد قیمت پر وقت کی بنا پر فرق پڑتا ہے، یا جو مجلس عقد میں ایک قیمت طے ہوگئی ہے وہی باقی رہتی ہے، اس لحاظ سے نقد یا ادھار میں سے کسی ایک کو مجلس عقد میں متعین کر لینے کی صورت میں قیمت کی کمی زیادتی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جو قیمت طے ہوگئی ہوگی، نہ بعد میں اس میں کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی۔

ورنہ اگر مجلس عقد میں زیر بحث آنے والی مختلف قیمتوں کا لحاظ کیا جائے تو بڑی پریشانیاں پیدا ہو جائیں گی، بیع کی بہت سی شکلیں ربا میں داخل ہو جائیں گی، بلکہ خود نقد خرید بھی شبہ ربا سے محفوظ نہیں رہ سکے گی، اس لیے کہ ادھار میں اگر وقت کی بنا پر قیمت زائد ہونے کا شبہ ہے تو نقد میں کم ہونے کا شبہ ہے اور یہ کمی ظاہر ہے کہ وقت ہی کا لحاظ نہ کرنے کی بنا پر ہوئی ہے، اور وقت کی بنا پر کمی یا بیشی دونوں ہی ربا میں داخل ہیں، اس طرح نقد خرید بھی درست نہ رہے گی، اصولی بات یہ ہے کہ مجلس عقد کی مختلف باتوں اور قیمتوں کی مختلف شرحوں کے ذکر کا اعتبار نہیں، اعتبار اس کا ہے کہ تمام عقد کے بعد کوئی ایک شرح قیمت متعین ہونے کے بجائے وقت کے لحاظ سے شرح قیمت مختلف رکھی گئی ہو تو یہ سود ہوگا ورنہ نہیں۔

۵- اس کا جواب ماقبل میں گزر چکا ہے، کوئی ایک صورت متعین کر لینے کے بعد یہ درست ہے۔

۶،۷- قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر زیادتی کا مطالبہ:

ایک چیز کی خرید و فروخت نقد معاملہ کے طور پر دس روپے طے ہوئی، اور ساتھ ہی یہ طے پایا کہ یہ دس روپے ایک ماہ کے اندر ادا نہ کیے گئے تو مزید دو روپے ادا کرنے ہوں گے، اور اس طرح ہر ماہ کی تاخیر پر دو روپے کا اضافہ ادا کرنا ہوگا، یہ صورت جائز نہیں، اسی طرح یہ صورت بھی درست نہیں کہ مجلس عقد میں ادھار قیمت اور مدت طے ہوئی خواہ قسطوں میں ہو یا یکمشت، اور اس کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ وقت مقرر پر یکمشت قیمت یا جملہ قسطیں یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کچھ رقم ادا کرنی ہوگی خواہ اس کی مقدار طے کر دی جائے یا فیصد کا حساب رکھا جائے۔

یہ دونوں صورتیں ربا کے دائرے میں آتی ہیں، اس لیے کہ تاخیر پر فیصد کے حساب سے یا متعین طور پر جو رقم لی جارہی ہے اس کے عوض میں وقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور وقت کے عوض جو رقم آتی ہے وہ سود ہے، اسی بناء پر فقہاء نے یہ مسئلہ بھی تحریر کیا ہے کہ اگر کسی نے نقد معاملہ کیا تھا پھر بعد میں اس نے رقم کی مقدار بڑھا کر اس کو ادھار بنا دیا تو یہ جائز نہیں ہے، یہ ربا کہلائے گا، اس لیے کہ نقد معاملہ طے ہو جانے کے بعد مبیع کی ایک قیمت متعین ہو چکی تھی، اس کے بعد جو رقم اضافہ کی گئی ہے وہ اس کی قیمت سے زائد رقم ہے، اس لیے یہ سود قرار پائے گی، یہاں کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے، یہاں بھی مبیع کی قیمت سے الگ تاخیر کی بنا پر جو رقم لی جارہی ہے وہ وقت ہی کے مقابل ہے، اس لیے یہ درست نہ ہوگا۔

"مقابلة الأجل بالدراهم ربا، الأ ترى أن فى الدين الحال لو زاده فى المال ليؤجل لم يجز" (المبسوط للسرخسی ۱۳/۱۲۶)

کفایت المفتی میں بھی اس سے ملتی جلتی ایک صورت مذکور ہے، جس کے عدم جواز کا فتوی حضرت مفتی صاحب نے دیا ہے، مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

اور یہ احتمالی صورتیں کہ اگر مہینہ کے اندر ہو تو ۲ درہم اور مہینہ کے بعد مگر ۴۵ دن کے اندر ہو تو ۳ درہم لوں گا جائز نہیں، بائع اور مشتری دونوں کو لازم ہے کہ قیمت اور ادائے قیمت کا زمانہ متعین کر دیں (کفایت المفتی ۸/۴۰)۔

مالی جرمانہ کا مسئلہ:

رہی "مالی جرمانہ" والی بات تو مالی جرمانہ مالکیہ کے نزدیک تو جائز ہے، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک جائز نہیں، جمہور کہتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں اس کی اجازت تھی جو بعد میں منسوخ ہوگئی۔

"وفيه جواز العقوبة بالمال بحسب الظاهر، واستدل به قوم من القائلين بذلك من المالكية، وعزى ذلك أيضا إلى مالك، وأجاب الجمهور بأنه كان ذلك في أول الإسلام ثم نسخ" (عمدۃ القاری ۵/ ۱۶۴)۔

شامیؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے۔

"وفي شرح الآثار: التعزير بالمال كان في ابتداء الإسلام ثم نسخ، والحاصل المذهب عدم التعزير بأخذ المال" (ردالمحتار ۳/ ۲۴۶)۔

اس لیے اگر مذکورہ رقم کو ربا کے بجائے مالی جرمانہ بھی قرار دیا جائے تو جمہور کے مسلک کے مطابق یہ جائز نہ ہوگا۔

۸- ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے بائع کی طرف سے یہ شرط لگانا درست ہے کہ خریدار کوئی مال بطور ضمانت بائع کے پاس رہن رکھے، البتہ مال مرہون کا معلوم ہونا ضروری ہے، اس میں چاروں ائمہ میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(دیکھئے عالمگیری ۵/ ۴۳۳، مبسوط للسرخسی ۱۳/ ۱۹، المجموع شرح المہذب ۹/ ۳۷۵، المغنی ۴/ ۲۲۴)۔

مال مرہون سے مرتہن کا فائدہ اٹھانا:

اس سلسلہ میں تین سوالات پیدا ہوتے ہیں: پہلا سوال یہ ہے کہ کیا بائع اس مال مرہون (گروی رکھے ہوئے مال) سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

حنفیہ: اس کے متعلق حنفیہ میں دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ مرتہن کا مال مرہون سے فائدہ اٹھانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے، خواہ سبب دین بیع ہو یا قرض، اس لیے کہ مرتہن کو دین کی رقم تو پوری ملے گی ہی، پھر مال مرہون سے یہ انتفاع کس چیز کے بدلے میں ہے؟ اس لیے یہ ربا قرار پائے گا، کیونکہ جس قرض سے نفع حاصل کیا جائے وہ سود ہے۔

۲۔ لیکن دوسرا نقطہ نظر جس کو زیادہ تر احناف نے اختیار کیا ہے کہ باقاعدہ بیع کے وقت مال مرہون سے انتفاع کی شرط لگانا تو درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہ "كل قرض جر نفعا" میں داخل ہے، لیکن اگر اسطرح کی کوئی شرط بوقت عقد نہیں لگائی گئی تو راہن (خریدار) کی اجازت سے مرتہن (بائع) مال مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۳۳۵)۔

مگر صاحب شرح وقایہ کے بیان کے مطابق امام صاحب کسی صورت میں نفع اٹھانے کے قائل نہیں ہیں:

"لاالانتفاع بہ باستخدام ولا سکنی ولا لبس" (شرح وقایہ ۴/ ۷۴)۔

اور مولانا عبدالحئیؒ نے حاشیہ میں اسی عدم جواز کے قول کی بڑی پرزور وکالت کی ہے، جبکہ وقایہ کے مصنف نے عاریۃً استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، اور صاحب "ہدایہ" کی بھی رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ راہن کی اجازت سے استعمال کرسکتا ہے، جیسا کہ انہوں نے "بإذن المالک" کی قید لگائی ہے۔

مالکیہ: مالکیہ کے نزدیک اصولی طور پر مال مرہون کے تمام تر فوائد وثمرات راہن (مشتری) کی ملک ہیں، مرتہن یا بائع کے مال مرہون سے انتفاع کے جواز کے لیے مالکیہ کے نزدیک تین شرطیں ہیں۔

۱۔ بوقت عقد ہی یہ بات طے ہوگئی ہو کہ مرتہن مال مرہون سے فائدہ اٹھائے گا۔

۲۔ فائدہ اٹھانے کی مدت معلوم ہو، ورنہ مدت مجہول ہونے کی صورت میں انتفاع درست نہ ہوگا۔

۳۔ سبب دین بیع ہو نہ کہ قرض یعنی ادھار فروختگی کی صورت میں قیمت کی وصولیابی یقینی بنانے کے لیے رہن رکھا گیا ہو، قرض کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے اگر کوئی رہن رکھا گیا تو اس سے استفادہ جائز نہ ہوگا (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۳۳۳)۔

مغنی میں ایک وضاحت یہ بھی ہے کہ مال مرہون سے انتفاع کی اجازت (مذکورہ تینوں شرائط کے پائے جانے کی صورت میں) اس وقت ہے جبکہ مال مرہون گھر اور زمین جیسی چیز ہو یعنی جس کو استعمال کرنے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو، لیکن اگر مال مرہون جانور یا کپڑا وغیرہ ہے تو اس سے انتفاع مکروہ ہے، اس لیے کہ استعمال سے یہ چیزیں متاثر ہوں گی (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۳۲)۔

شافعیہ: شافعیہ کے نزدیک مال مرہون سے انتفاع کی شرط لگانا درست نہیں، اس سے عقد ہی فاسد ہو جائے گا، اور دوسرے کمزور قول کے مطابق عقد فاسد نہ ہوگا، صرف شرط فاسد ہوگی، اور مال مرہون سے انتفاع درست نہ ہوگا، ہاں بلا اشتراط اس کی اجازت ہے اسی طرح اگر قبل عقد ہی سے مرتہن اس مال سے فائدہ اٹھا رہا ہو تو بعد عقد بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے، خواہ عقد بیع کی صورت میں یہ رہن رکھا گیا ہو یا عقد قرض کی صورت میں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۳۳۴)۔

حنابلہ: حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر سبب دین قرض ہے تب تو کسی صورت میں مال مرہون سے مرتہن کے لیے انتفاع جائز نہیں ہے، لیکن اگر سبب دین بیع یا اجارہ وغیرہ ہے تو راہن کی اجازت سے مرتہن فائدہ اٹھا سکتا ہے، رہی عقد کے وقت شرط لگانے کی بات تو اس سلسلہ میں امام احمد سے دو روایتیں منقول ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ شرط لگانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جبکہ دوسری روایت یہ ہے صرف بیع کی صورت میں شرط لگا سکتے ہیں، بشرطیکہ مال مرہون کی مقدار اور اس سے انتفاع کی مدت معلوم ہو (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۳۲)۔

بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون ضائع ہو جائے:

دوسرا سوال یہ ہے کہ بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون ضائع ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

۱۔ اس سلسلہ میں حنابلہ اور شافعیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رہن اصولی طور پر امانت ہے، اس لیے اگر یہ بائع کی غفلت، یا زیادتی کی بناء پر ضائع ہو گیا تو بائع ضامن ہوگا اور اس کے دین کو اس میں وضع کیا جائے گا، لیکن اگر اس کے ضائع ہونے میں بائع کی غفلت یا عمل کا دخل نہیں ہے تو اس پر کوئی ضمان نہیں، جو ضائع ہوا مشتری کا مال ضائع ہوا، یہی قول حضرت علی سے بھی منقول ہے، اور امام عطاء، زہری اوزاعی، شامی، ابوثور اور ابن المنذر کی رائے بھی یہی ہے۔

۲۔ حضرت شریح، امام نخعی اور امام حسن بصری کا خیال یہ ہے کہ ضمان پورے دین کے عوض مانا جائے گا، نہ بائع مشتری کو کچھ رقم واپس کرے گا اور نہ مشتری بائع کو، خواہ مال مرہون کی قیمت دین سے زیادہ ہو یا کم، اس لیے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: 'الرھن بمافیہ' اس میں "ما" عام ہے اس لیے رہن پورے دین کے عوض کافی ہوگا، خواہ دین کتنا ہی رہا ہو۔

۳۔ امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ اگر مال مرہون کسی سبب ظاہری کی بنا پر ضائع ہوا ہے، مثلاً موت کی وجہ سے یا جل کر، تو اس کی نسبت راہن کے ضمان کی طرف ہوگی، یعنی راہن کا مال برباد مانا جائے گا، اگر وہ دعوی کرے کہ کسی مخفی سبب سے مال مرہون ضائع ہوا ہے تو اس کا دعوی قبول نہیں کیا جائے گا، اور مرتہن ضامن نہیں ہوگا، ہاں اگر کوئی سبب ظاہر سامنے نہیں آیا، تو ایسی صورت میں اس کا ضیاع مرتہن کی طرف منسوب ہوگا، اور مرتہن اس کا ضامن ہوگا۔ (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۱۰)۔

۴۔ حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مال مرہون مرتہن یا کسی تیسرے معتبر شخص کے قبضہ میں رہتے ہوئے اگر ضائع ہو گیا تو دیکھا جائے گا کہ جس دن مال مرہون پر مرتہن یا تیسرے شخص نے قبضہ کیا تھا اس دن اس کی قیمت کیا تھی؟ اور دین سے اس کا تناسب کیا ہے؟ اگر دونوں برابر ہیں تو دین ساقط ہو جائے گا، اور کسی کا کسی پر کچھ باقی نہ رہے گا، اور اگر مال مرہون کی قیمت دین سے زیادہ ہو تو دین تو ساقط ہو جائے گا اور فاضل رقم کا مرتہن پر ضمان نہیں ہوگا، اس لیے کہ دین سے فاضل حصہ امانت ہے، اور امانت میں ضمان نہیں ہے، لیکن اگر مال مرہون کی قیمت دین سے کم ہے تو بائع اپنے دین کے بقدر وضع کرنے کے بعد بقیہ رقم مشتری سے وصول کرے گا (عالمگیری ۵/ ۴۴۲)۔

حنفیہ کے نزدیک مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ، قبضہ امانت نہیں بلکہ قبضہ استیفاء حق، یا قبضہ ضمان ہے، مگر صرف دین کے بقدر، دین سے فاضل مالیت امانت متصور ہوگی (ہدایہ ۴/ ۵۲۰)۔

اگر مال مرہون راہن کی اجازت سے مرتہن کے استعمال میں تھا اور اسی استعمال کے ذیل میں وہ ضائع ہو گیا تو مرتہن پر کوئی ضمان نہیں ہوگا، اور نہ

راہن کے ذمہ سے دین ساقط ہوگا (فتاوی خانیہ علی العالمگیری ۳/ ۶۰۱، ۶۰۲)۔

مشتری کے ٹال مٹول کی صورت میں:

تیسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ خریدار کے وقت مقررہ قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں بائع مال مرہون کے ذریعہ اپنی واجب الاداء قیمت کس طرح وصول کرے گا؟

اس بارے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ مرتہن راہن کی اجازت کے بغیر مال مرہون کو فروخت نہیں کرسکتا، اور نہ خود اس میں سے اپنا حق وصول کرسکتا ہے، البتہ وہ قاضی کی طرف رجوع کرے گا اور قاضی راہن کو دین کی ادائیگی پر یا پھر اپنے مال مرہون کی فروختگی پر مجبور کرے گا، خود قاضی بھی اپنے طور پر راہن کی مرضی کے بغیر مال مرہون کو فروخت کرنا چاہے تو امام صاحب کے نزدیک قاضی کو یہ اختیار نہیں ہے، ہاں قاضی اس کو قید کرسکتا ہے، تاکہ وہ خود مجبور ہوکر اپنا مال مرہون فروخت کرنے پر تیار ہوجائے۔

صاحبین کے یہاں ایسی صورت میں جبکہ راہن دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کررہا ہو اور مال مرہون فروخت کرنے پر تیار نہ ہو، قاضی کو اجازت ہوگی کہ وہ جبراً مال مرہون فروخت کرکے حقداروں کو حق دلائے۔

یہ اختلاف دراصل حجر کے اختلاف پر مبنی ہے، صاحبین کے یہاں بعض حالات میں آزاد، عاقل اور بالغ آدمی کو مجور کیا جاسکتا ہے، اور امام صاحب کے نزدیک کسی حال میں نہیں کیا جاسکتا (بدائع ۶ / ۱۴۸، عالمگیری ۵ / ۴۶۷)۔

زیر بحث مسئلہ کے بارے میں قاضی خاں، صاحب اختیار اور دوسرے بہت سے فقہاء نے کہا ہے کہ فتوی صاحبین کے قول پر ہے، اس کے علاوہ اختلافی مسائل میں قاضی کا فیصلہ وجہ ترجیح یا رفع اختلاف کا باعث بنتا ہے، اس بناپر بھی قاضی کے فیصلہ کے بعد مال مرہون کو فروخت کرنے کی اجازت ہوگی۔

"(سئل) فی الرهن هل يبيعه الحاكم إذا امتنع المديون من بيعه وفاء للدين أم لا؟"

"(اجاب) مذهب الامام تابيد حبسه إلى أن يبيع الراهن بنفسه، لأنه لا يرى الحجر على الحر المديون. وعندهما للحاكم بيعه جبرًا، لأنهما يريان الحجر. وهذه المسئلة فرع ذلك. وصرح قاضي خان وصاحب الاختيار و كثير بأن الفتوى على قولهما. فإذا حكم به حاكم يراه نفذ وارتفع الخلاف۔

(فتاوی خیریہ علی ہامش الفتاوی تنقیح الحامدیہ ۲/ ۲۹۵)

لیکن جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں احیاء حق کی خاطر دو عادل آدمیوں کی موجودگی یا علاقہ کی شرعی پنچایت کی نگرانی میں مرتہن کو اپنے طور پر بھی مال مرہون کو فروخت کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

۹- بائع کو سامان روکنے کا اختیار:

فروخت کردہ سامان کو اگر بائع نے نقد فروخت کیا ہے تو مشتری سے مکمل قیمت وصول ہونے تک سامان کو روک سکتا ہے، یہاں تک کہ اگر مشتری نے قیمت کا زیادہ حصہ ادا کردیا اور صرف تھوڑی سی رقم باقی رہ گئی تو بھی بائع سامان کو قیمت کی وصولی تک روک سکتا ہے۔

"ولو نقد الثمن كله إلا درهما كان له حق حبس المبيع جميعه لاستيفاء الباقي؛ لأن المبيع في استحقاق الحبس بالثمن لا يتجزأ فكان كل المبيع محبوسا بكل جزء من اجزاء الثمن" (بدائع الصنائع ۵/۳۷۰)۔

لیکن اگر بائع نے سامان ادھار فروخت کیا ہے، تو قیمت کی وصولی کے لیے سامان کو روک نہیں سکتا، اس لیے کہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ حبس مبیع استیفاء ثمن کے لیے ہوتا ہے اور یہاں اس نے اپنے حق ثمن کو خود مؤخر کردیا ہے، اس لیے اس کی وجہ سے مشتری کا حق مبیع مؤخر نہیں ہوگا اور بائع کو سامان روکنے کا اختیار نہ ہوگا۔

"فإن كان مؤجلا لا يثبت حق الحبس، لأن ولاية الحبس تثبت حقا للبائع لطلبه المساواة عادة لما بينا. ولو باع بثمن مؤجل فقد اسقط حق نفسه فبطلت الولاية، ولو كان الثمن مؤجلا في العقد، فلم يقبض المشترى المبيع حتى حل الأجل فله أن يقبضه قبل نقد الثمن، وليس للبائع حق الحبس؛ لأنه اسقط حق نفسه بالتاجيل والساقط

متلاشی فلا یحتمل العود'' (بدائع الصنائع ۵/۳۶۹)۔

قسطوں پر فروخت بھی بیع مؤجل کی ایک قسم ہے اس لیے اس صورت میں بھی سامان کو روکنے کا اختیار نہ ہوگا، البتہ نقد قسط کی وصولی کے لیے وہ سامان روک سکتا ہے، اسی طرح اگر اس نے معاملہ کے وقت ہی یہ وضاحت کر دی کہ کسی قسط کی تاخیر کے وقت میں سامان روک سکتا ہوں تو ایسی صورت میں بائع کو سامان روکنے کا اختیار ہوگا، اور شاید اسی مفہوم کو ''فتاوی بزازیہ'' کی اس عبارت میں ادا کیا گیا ہے۔

''وإن بقي من الثمن قليل له حبس كل المبيع وأن بعضه مؤجل له حبس الكل لاستيفاء الحال''
(بزازیہ اول علی ہامش العالمگیریہ ۴/۵۰۵)۔

رہی یہ بات کہ یہ حبس مبیع بطور رہن کے ہے یا اپنا حق وصول کرنے کے لیے، تو مذکورہ بالا فقہی عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حبس وصولی حق کے لیے ہے، نہ کہ رہن کے طور پر۔ بدائع میں ایک جگہ صراحت بھی آئی ہے۔

''وكذا المشتري اذا نقد الثمن كله او أبرأه البائع بطل حق الحبس؛ لأن حق الحبس لاستيفاء الثمن واستيفاء الثمن ولا ثمن محال'' (بدائع الصنائع ۵/۳۷۰)۔

۱۰- اداشدہ قسطوں کو کالعدم قرار دینا:

قیمت کے لیے طے شدہ اقساط ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع سامان کو اپنے قبضہ میں رکھ لیتا ہے، اور پھر وہ سامان اسی کا ہو جاتا ہے، نیز جو اقساط ادا کی جا چکی ہیں وہ بھی واپس نہیں کی جاتیں، یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہ شرط فاسد ہے کہ ایک قسط ادا نہ ہو سکی تو بیع ختم ہو جائے گی، اور اداشدہ قسطیں کالعدم قرار پائیں گی، بائع کی طرف سے یہ ظلم وزیادتی ہوگی، اس لیے اس کی اجازت شرعی نہیں دی جا سکتی، حضرت تھانویؒ کے پاس بھی اسی قسم کی ایک صورت آئی تھی، حضرت تھانوی نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ:

اگر بیع ہے تو یہ شرط فاسد ہے کہ ادنی جزء قیمت رہ جانے پر واپس کر لیں گے۔ اور اداشدہ رقم کو کالعدم سمجھا جائے گا (امداد الفتاوی ۳/۱۲۲)۔

۱۱- مال مرہون سے راہن کا فائدہ اٹھانا:

یہ سوال پوری طرح واضح نہیں ہے اگر مطلب یہ ہے کہ مشتری سامان خریدنے کے بعد وہی سامان بائع کے پاس قیمت کے بدلے رہن رکھ دے، لیکن بائع وہ خرید کردہ سامان اپنے پاس رکھنے کے بجائے خریدار ہی کے حوالہ کر دے اور اس کو مال مرہون استعمال کرنے کی بھی اجازت دے دے، البتہ بنیادی تصرفات مثلاً خرید وفروخت کا حق اپنے پاس محفوظ رکھے، تو شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس لیے بیع وشراء کے بعد خریدار مبیع کا مالک ہو جاتا ہے اور قبضہ کے بعد اس کی ملکیت میں معین طور پر داخل ہو جاتا ہے، اس لیے وہ اس سامان کو بائع کے پاس بطور رہن رکھ سکتا ہے، اس پہلو کے جواز میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بائع جو مرتہن ہے مال مرہون اپنے پاس رکھنے کے بجائے خود راہن (مشتری) کے پاس اس کے استعمال میں رکھ دیتا ہے، اور صرف بنیادی حقوق، مثلاً خرید وفروخت کا اختیار اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تو فقہاء نے اس کی بھی اجازت دی ہے، اور کہا ہے کہ اس سے رہن باطل نہیں ہوتا، اور مرتہن جب چاہے مال مرہون کو واپس لے سکتا ہے، البتہ اس دوران جب تک مال مرہون مشتری کے قبضہ میں ہے اگر مال مرہون ضائع ہو گیا تو اس کا ذمہ دار بائع نہیں بلکہ خود مشتری ہوگا، فتاوی قاضی خاں میں یہ جزئیہ موجود ہے۔

''فإن اذن المرتهن للراهن أن يزرع الأرض المرهونة فزرع، أو سكن الدار المرهونة بإذن المرتهن لا يبطل الرهن وله أن يسترد الرهن، فيعود رهنا ومادام في يد الراهن لا يكون في ضمان المرتهن''
(فتاوی قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۳/۶۵۲)۔

کفالت پر معاوضہ کا مسئلہ:

آج کل بہت سے ادارے اور اشخاص کفالت وضمان کا کاروبار کرتے ہیں جو خریدار یا فروخت کنندہ کی طرف سے گارنٹی لیتے ہیں، اور اس پر

باقاعدہ مقررہ حساب سے وہ اجرت بھی لیتے ہیں اجارہ کے بنیادی قواعد کے لحاظ سے اس کی گنجائش معلوم پڑتی ہے، اس لیے کہ اجارہ کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اجارہ ایسی منفعت پر ہو جس کے اجارے کا لوگوں میں رواج ہو، اور لوگ مستقلاً اجرت پر وہ کام کراتے ہوں، اور تعامل ناس کی بنا پر وہ لوگوں کے لیے ایک طرح کی حاجت بن گیا ہو، تو ایسی صورت میں اجارہ کرنا درست ہوگا۔

بدائع میں ہے: ''ومنها أن تكون المنفعة مقصودة يعتاد استيفاء ها بعقد الإجارة، ويجرى بها التعامل بين الناس، لأنه عقد شرع بخلاف القياس لحاجة الناس، ولا حاجة فيما لا تعامل فيه للناس. فلا يجوز استيجار الاشجار لتجفيف الثياب عليها والاستغلال بها؛ لأن هذه منفعة غير مقصودة من الشجر'' (بدائع الصنائع ۱۹۲/۳، کتاب الاجارہ)۔

اس جزئیہ میں ایک مثال یہ دی گئی ہے کہ درختوں کو کپڑے سکھانے کے لیے اجرت پر لینے کا رواج نہیں ہے اور درخت کا مقصد یہ نہیں ہے، اس لیے یہ اجارہ درست نہیں، لیکن فرض کیا جائے کہ کسی علاقہ میں کپڑے سکھانے کی کوئی جگہ سوائے درختوں کے نہ ہو اور درخت بھی ایسے ہوں جو کسی پھل پھول وغیرہ کے کام کے نہ ہوں اور کپڑے سکھانے ہی کے مصرف میں وہ استعمال ہوتے ہوں تو ایسی جگہوں پر ان کے اجارہ کی اجازت نہ دینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

اسی طرح کسی زمانے میں کفالت وضمانت لوگ اخلاقی فرض سمجھ کر کرتے تھے، لیکن آج یہ مستقل کاروبار بن گیا ہے، اور کچھ باحیثیت لوگ یا ادارے اپنی ساکھ کی بدولت دوسروں کو ضمانتیں دیتے ہیں اور ان کے ادارے کا مقصد ہی یہی ہے اور اس کا رواج بھی بہت ہو گیا ہے، اس لیے اس صورت میں اجارہ کی اجازت نہ دینا مناسب نہ ہوگا۔

خصوصاً اس وقت، جبکہ ضمانت پانے والے لوگوں کو اس سے فائدہ پہونچتا ہے اور اس ادارے یا شخص کو بسا اوقات نقصان پہونچنے کا خطرہ رہتا ہے، اس لیے کہ بالفرض وہ شخص جس کی طرف سے اس ادارے یا شخص نے ضمانت لی ہے وہ فرار ہو جائے اور اپنا دین ادا نہ کرے تو وہ نقصان ضمانتی ادارہ یا شخص ہی کو پورا کرنا ہوگا، ایسی صورت میں ادارہ یا شخص کو اپنے ضمانتی عمل کا معاوضہ لینے کا اختیار ہونا چاہیے۔

فقہاء نے کفالت بالدرک کی بحث کرتے ہوئے ایک اصولی بات لکھی ہے۔ بدائع میں ہے:

''ولأن الكفالة والرهن شرعا للتوثق والتوثق ملائم للأجر'' (بدائع الصنائع کتاب الاجارہ ۶۰۲/۳)۔

یعنی شریعت میں کفالت ورہن کا قانون اعتماد پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اور اعتماد ایسی چیز ہے جس پر اجرت لی جا سکتی ہے، اس اصول کی روشنی میں بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کفالت وضمانت کے عوض اجرت لینے کی اجازت ہونی چاہیے وہ بھی جب کہ اس کا رواج بھی عام ہو گیا ہو۔

۱۳- کاغذات ثمن کی خرید وفروخت:

ادھار فروختگی میں ایک صورت یہ اختیار کی جاتی ہے کہ معاملہ کے مکمل کاغذات تیار کرائے جاتے ہیں، اور وقت مقررہ پر رقم نہ ادا کرنے کی صورت میں یا وقت سے پہلے رقم کو حاصل کرنے کے لیے اس دستاویز کی خرید وفروخت کی جاتی ہے جس میں عموماً اس دستاویز کے اندر تحریر کردہ قیمت ومالیت سے کم پر معاملہ ہوتا ہے، شرعاً یہ معاملہ درست نہیں، اس لیے کہ دستاویز کی فروختگی دراصل مشتری سے اپنے وصولی ثمن کے حق کو فروخت کرنا ہے، اور یہ دستاویز اس مالیت کی نمائندگی کرتی ہے جو اس میں مذکور ہے، اور جس کا تعلق ثمن سے ہے، اس لیے اس دستاویز کی فروخت دراصل اس مالیت کی فروخت ہے جو مبیع کے ثمن کے طور پر طے ہے، اس لیے یہ معاملہ بیع صرف کے دائرے میں آتا ہے، اور بیع صرف میں کمی وبیشی کے ساتھ معاملہ درست نہیں، البتہ اس کو اگر توکیل مع الاجارہ قرار دیا جائے تو اس کا جواز نکل سکتا ہے، مگر اس صورت میں قیمت کی وصولی نہ ہونے کے وقت دستاویز کی واپسی کو یقینی بنانا ہوگا۔

۱۴- قیمت میں کمی کی شرط پر مدت مقررہ میں تخفیف:

ادھار خرید وفروخت کے معاملہ میں اگر بائع طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگے کہ اس کا ایک حصہ ہم تم کو معاف کر دیں گے تو یہ صورت اختلافی ہے، خود صحابہ کے درمیان اس صورت مسئلہ کے بارے میں اختلاف ہوا ہے، حضرت عبد اللہ ابن عمر اس کو جائز نہیں کہتے تھے، اس لیے کہ یہاں وقت کا مقابلہ قیمت سے ہو رہا ہے کہ وقت کم کیا گیا، تو قیمت بھی کم ہو گئی، یہ ربا ہے جس طرح کہ مقررہ وقت کے بڑھانے پر قیمت کی

زیادتی کا مطالبہ سود ہے۔ دوسری طرف حضرت زید بن ثابت اس کو جائز سمجھتے تھے، اس لیے کہ اب جو کچھ معاملہ ہورہا ہے بعد از عقد ہو رہا ہے، ربا اس وقت ہوتا جبکہ عین وقت عقد میں اس طرح کا معاملہ کیا جاتا، مگر حنفیہ نے حضرت عبداللہ ابن عمر کے قول کو اختیار کیا ہے اور اندیشہ سود کی بنا پر احتیاط بھی اسی میں ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ معاملہ تو بعد از عقد کا ہے تو حنفیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قیمتوں میں کمی بیشی خواہ بعد از عقد ہو لیکن وہ وقت عقد کے حکم میں ہوتا ہے، اس میں حضرت امام زفر کے علاوہ ائمہ احناف میں کسی کا اختلاف نہیں ہے (البحر الرائق ۶/۱۱۹)۔

امام سرخسیؒ نے اس مسئلہ کو اپنی شاہکار کتاب "المبسوط" میں جگہ دی ہے۔

"قال: وإذا كان لرجل على رجل دين إلى أجل وهو من ثمن مبيع فحط عنه شيئا على أن يعجل له مابقى فلا خير فيه، ولكن يرد ما أخذ، والمال كله إلى أجله، وهو مذهب عبد الله ابن عمر، وكان زيد بن ثابت يجوز ذلك، ولسنا ناخذ بقوله، لأن هذا مقابلة الأجل بالدراهم، ومقابلة الأجل بالدراهم ربا، الأترى أن فى الدين الحال لوزاده فى المال ليؤجله لم يجز. فكذلك فى المؤجل إذا حط عنه البعض ليعجل له مابقى"

(كتاب المبسوط باب العيوب فى البيوع ۱۲/۱۲۶)۔

۱۵- قیمت میں کمی کی شرط پر مدت غیر مقررہ میں تخفیف:

ادھار معاملہ کے درست ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ قیمت کی ادائیگی کے لیے وقت مقرر و معلوم ہو ورنہ صرف اس طرح معاملہ کرنا کہ قیمت بعد میں دے دیں گے درست نہیں، رہا یہ کہ کوئی عقد کے بعد قیمت کم کر کے نقد لین دین کرنا چاہے تو اس سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ ادائیگی قیمت کے لیے جو وقت مقرر کیا گیا ہو اگر اس کی جہالت زیادہ شدید نہ ہو اور اس کا کوئی تقریبی تخمینہ لگایا جا سکتا ہو، مثلاً گیہوں کٹنے پر قیمت ادا کریں گے فقہاء کی اصطلاح میں یہ جہالت متقاربہ کہلاتی ہے، اس صورت میں مدت تقریبی یا بیع کے فسخ ہونے سے قبل اگر عاقدین مدت مجہول ختم کر کے نئی مدت متعین کر لیں تو سابقہ عقد درست ہو جائے گا (حضرت امام زفر کا اختلاف ہے، ان کے نزدیک جو عقد فاسد ہو گیا وہ درست نہیں ہو سکتا)، لیکن اگر ادائیگی قیمت کی مدت کافی زیادہ مجہول ہو، جیسے کہ مشتری کہے کہ بعد میں دیں گے جس کو فقہاء جہالت متفاوتہ سے تعبیر کرتے ہیں اس صورت میں مجلس عقد ہی کے اندر اگر اس کی اصلاح کر لی جائے اور نئے طور پر کوئی مدت مقرر کر دی جائے تب تو یہ عقد درست ہو جائے گا، ورنہ مجلس عقد کے ختم ہونے کے بعد اس کی اصلاح کی کوئی شکل نہیں ہے، اور بعد میں کسی مدت کی تعیین سے یہ عقد درست نہ ہوگا، اس پر تمام ائمہ احناف کا اتفاق ہے (منحۃ الخالق علی ہامش البحر الرائق ۶/۸۹)۔

اس اصول کی روشنی میں سوالنامہ میں مذکورہ صورت "کہ قیمت بعد میں دے دیں گے" یہ جہالت متفاوتہ کی صورت ہے اس بنا پر یہ عقد ہی فاسد ہے اور بعد میں قیمت کو کم و بیش کر کے اس کو درست کرنے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے، رہا یہ کہ اگر زیر بحث صورت جہالت متقاربہ کے ذیل میں پیش آئے تو کیا یہ جائز ہوگا؟ اصولی طور پر یہ صورت بھی ربا کی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جہالت متقاربہ میں مدت کا یک گونہ تعین ہوتا ہے گو قطعی تعین نہ ہو، پھر اس مدت میں تخفیف اس لیے کی جائے کہ قیمت میں بھی تخفیف ہوگی، یہ وقت کے مقابلہ میں قیمت کم کرنا ہوگا، اس لیے یہ درست نہیں ہوگا۔

۱۶- قسط کی تاخیر کی بنا پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا:

طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور فوری طور پر مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ جب بائع عقد کے وقت ہی مطالبہ قیمت کا اپنا حق ساقط کر چکا ہے، تو مدت مقررہ سے پہلے پوری قیمت کے مطالبہ کا اس کو کوئی حق نہیں رہا، الا یہ کہ بوقت عقد ہی اس کی صراحت کر دی گئی ہو کہ کسی قسط کی تاخیر پر مہلت ساقط مانی جائے گی اور پوری قیمت ایک ساتھ ادا کرنی ہوگی تو اس کارروائی کی حسب معاملہ گنجائش ہے بشرطیکہ اس سے قیمت میں کوئی کمی بیشی پیدا نہ ہوتی ہو، ورنہ درست نہ ہوگا۔

"ولو كان الثمن مؤجلا فى العقد فلم يقبض المشترى المبيع حتى حل الأجل فله أن يقبضها قبل نقد الثمن، وليس للبائع حق الحبس؛ لأنه اسقط حق نفسه بالتأجيل، والساقط متلاشى فلا يحتمل العود" (بدائع الصنائع ۵/۲۴۹)۔

۱۷- وقت مقررہ سے قبل عاقدین میں سے کسی کا انتقال:

قسطوں پر خرید وفروخت کی صورت میں اگر وقت مقررہ سے پہلے بائع کا انتقال ہوگیا تو معاملہ اب بھی اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا، جو طے شدہ تھا صرف یہ ہوگا کہ اب بائع کی جگہ اس کے ورثاء اس معاملہ کی ذمہ داری سنبھالیں گے، لیکن اگر وقت مقررہ سے پہلے بائع کے بجائے مشتری کا انتقال ہو گیا تو معاملہ کی سابق تفصیل باقی نہیں رہے گی، بلکہ مشتری کے ورثاء پر لازم ہوگا کہ مشتری کے ترکہ سے فوراً مبیع کی قیمت ادا کریں، اس لیے کہ مہلت دینے کی اب کوئی وجہ باقی نہیں رہی، مہلت مشتری کو اس لیے دی گئی تھی تا کہ وہ اپنی کمائی سے بسہولت قیمت ادا کرے، لیکن اس کے مرنے کے بعد اب طے ہے کہ یہ قیمت اس کے ترکہ سے ادا کی جائے گی، اس لیے مہلت دینے کی ضرورت نہیں، کتب فقہ میں یہ صورت مذکور ہوئی ہے۔

''وبموت البائع لایحل الثمن المؤجل، وبموت المشتری یحل، ولو اجله الوارث لا یصح، لأن الثمن فی الذمة، وکان فائدة التأجیل أن یتجر، ویؤدی الثمن من نماء المال، وبالموت تعین الأداء من الترکة. فلافائدة فی التأجیل''
(فتاوی بزازیہ جلد اول علی ہامش العالمگیریہ ۴/ ۵۱۲)۔

فتاوی تنقیح الحامدیہ میں تو مسئلہ کی تصویر اور بھی وضاحت کے ساتھ آئی ہے۔

''(سئل) فی رجل باع من زید بضائع معلومة بثمن معلوم أجل بعضه المعلوم علی المشتری إلی أجل معلوم وقسط باقیه أقساطا معلومة، ثم مات البائع فی اثناء مدة التاجیل والتقسیط، فهل یبقی کذلك ولا یحل الثمن بموته. فالحالة هذه۔
(الجواب) بموت البائع لا یحل الثمن المؤجل، وبموت المشتری یحل'' (فتاوی تنقیح الحامدیہ ۱/ ۲۵۶)۔

۱۸- قرعہ اندازی کے ذریعہ خریداروں میں تقسیم انعام:

آج کل یہ بات بھی رواج میں آچکی ہے کہ ایسے دکاندار جو کہ بالاقساط خرید وفروخت کا کاروبار کرتے ہیں ہر قسط کی ادائیگی کے وقت یا ماہ بماہ یا چھ ماہ یا سال پر انعام دینے کا نظام بناتے ہیں، اس کے لیے وہ پہلے سے اعلان کرتے ہیں، اور قرعہ اندازی کے ذریعہ کسی ایک خریدار یا چند خریداروں کو انعام دیتے ہیں، اس نظام کا مقصد محض تجارت کو فروغ دینا ہے، یہ صریح قمار کے دائرہ میں تو نہیں آتا، اس لیے کہ قیمت کے بدلہ میں مشتری کو مقررہ سامان یقینی طور پر مل جاتا ہے، خواہ انعام ملے یا نہ ملے، اس میں کوئی دھوکہ نہیں کہ قمار لازم آئے، انعام ایک زائد چیز ہے جس پر عقد کا مدار نہیں، انعام ملے تب بھی عقد قائم رہتا ہے اور نہ ملے تب بھی، البتہ اس میں مدارنیت پر رہ جاتا ہے، یعنی جو شخص انعام ہی کی غرض سے سامان خریدے تو وہ گویا ایک طرح سے قمار کا ارتکاب کررہا ہے، لیکن جس کا مقصد محض سامان کی خرید ہو انعام اس کا آخری مقصود نہ ہو اتفاقاً انعام بھی مل گیا تو قواعد کی رو سے یہ قمار نہیں کہلائے گا، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کی ''کتاب جواہر الفقہ'' میں مذکور ایک مسئلہ سے اس مسئلہ پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

سوال: چند سال سے کراچی لاہور وغیرہ میں دیکھنے میں آیا ہے کہ مختلف قسم کی نمائش کے اندر داخلہ کا ٹکٹ ہوتا ہے اور نمائش کے منتظمین یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص مثلاً دس روپے کا ٹکٹ ایک مشت خرید لے گا وہ اپنے ٹکٹ کے ذریعہ عام لوگوں کی طرح نمائش میں بھی داخل ہو سکے گا، اور ان ٹکٹوں پر بذریعہ قرعہ اندازی کچھ انعام مقرر ہوتے ہیں جس کا نمبر نکل آوے اس کو وہ انعام بھی ملے گا۔

جواب: یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے کہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے، لیکن اب مدارنیت پر رہ جاتا ہے جو شخص موہوم انعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ یک گونہ قمار کا ارتکاب کرتا ہے، اور جس کے پیش نظر صرف نمائش میں جانا اور انتہائے انعام کی ہوس پیش نظر نہیں، اتفاقاً انعام بھی مل گیا وہ قواعد کی رو سے قمار کے حکم سے نکل گیا (جواہر الفقہ ۲/ ۳۴۵)۔

۱۹- قرعہ اندازی کے ذریعہ تخفیف اقساط:

اسی طرح یہ بھی رواج پا رہا ہے کہ تمام خریداروں سے ایک معین مدت پر ایک سامان دینے کے لیے بالاقساط قیمت جمع کرالی جائے اور ہر قسط کا ایک وقت مقرر ہو جس کے ادا کرنے کے بعد قرعہ اندازی کی جائے اور جس خریدار کا نام نکل آئے اس کو وہ سامان نقد دے دیا جائے اور پھر مزید اس سے کسی قسط کا مطالبہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کی ادا کردہ قسط ہی کو کافی سمجھا جائے، خواہ اس نے ایک ہی قسط جمع کی ہو اور بقیہ لوگ اپنی قسطیں جمع کرتے

رہیں، اور اسی طرح ہر مرتبہ کی قرعہ اندازی سے ایک آدمی جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلا ہے مال حاصل کر کے معاملہ سے الگ اور باہر ہوتا جائے۔

یہ معاملہ شرعی طور پر معلوم ہوتا ہے، بشرطیکہ بائع اس کا پابند ہو کہ جو شخص مال حاصل کرنے سے قبل انتقال کر جائے اس کی ساری ادا کردہ قسطیں واپس کردی جائیں گی، اس لیے کہ اس پورے معاملہ کا حاصل صرف یہ ہے کہ ایک شخص اپنے سامان کو مختلف لوگوں کے ہاتھ مختلف قیمتوں میں فروخت کرنا چاہتا ہے جس کا اصولاً اسے اختیار ہے، لیکن اپنے خریداروں میں کس کو وہ کس قیمت پر دے، اس کا انتخاب وہ قرعہ اندازی کے ذریعہ کرتا ہے، اور جس کے نام کا قرعہ نکل آتا ہے اسی کو اتنی ہی قیمت کے عوض جتنا اب تک وہ جمع کر چکا ہوتا ہے بائع سامان حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح مختلف خریداروں کو ان کی مرضی کے مطابق مختلف قیمتوں پر وہ سامان دیتا ہے، لیکن یہ سب اسی وقت ہے جبکہ بائع وقت سے قبل مرجانے والے خریدار کی جمع کردہ رقم واپس کردینے کا پابند ہو، ورنہ یہ قمار بن جائے گا جو ناجائز ہے۔

نظام الفتاوی میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ نے اسی طرح کے ایک مسئلہ میں جواز کا فتوی دیا ہے۔

سوال: ایک شخص اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ ایک گھڑی کی قیمت سو روپے ہے اور بازار میں بھی اسی قیمت پر ملتی ہے، اس کے واسطے پچاس ممبر بنائے گئے، دس دس روپے کی یہ اسکیم دس مہینے چلائی جائے گی، پہلے مہینہ جس شخص کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا اس کو دس روپے میں گھڑی دے کر اس کا نام ممبری سے خارج کر دیا جائے گا، اسی طرح سے نو ماہ تک جس کا نام آتا جائے گا اس کو گھڑی دے کر ممبری سے خارج کر دیا جائے گا، اور ان سے روپے نہیں لیے جائیں گے، دسویں مہینہ اکتالیس اشخاص جو بچے ان کو ایک ایک گھڑی دے کر اسکیم ختم کردی جائے گی، اس صورت میں کسی کو دس روپے میں، کسی کو بیس روپے میں، کسی کو چالیس روپے میں یہاں تک کہ کسی کو سو روپے میں گھڑی ملے گی، لیکن قرعہ اندازی ضرور ہو گی۔

الجواب: اس طریق کار کا حاصل یہ ہے کہ یہ گھڑی بازار میں سو روپے میں ملتی ہے اور اس دکاندار نے کسی گاہک سے سو روپے سے زائد نہیں لیا، بلکہ اپنی طرف سے پچاس گھڑیوں کا دام جو پچاس سو ہوتا تھا پچاس روپے کے پینتالیس سو روپے لیے تو گو پچاس گاہکوں میں سے بعض کو چھوٹ دی یہاں تک کہ چار سو پچاس روپیہ تک کی چھوٹ دے دی اور کسی گاہک سے سو روپے سے زائد (جو اصلی قیمت تھی) نہیں لیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ گاہک کچھ قسطیں دے کر مرجائے اور گھڑی ملنے سے پہلے مرجائے تو اس کو اس کی دی ہوئی قسط واپس ہوتی ہے کہ نہیں، اگر دی ہوئی قسط واپس کردی جاتی ہو تو یہ محض چھوٹ ہوئی اور ''جوا'' نہیں ہوا، اور معاملہ بالکل جائز رہا اور محض تجارت کو فروغ دینے کا طریقہ ہو گیا اور اگر دی ہوئی قسط (رقم) واپس نہیں دی جاتی ہو تو جوا ہو گیا اور یہ معاملہ ناجائز ہو گیا (نظام الفتاوی ۱/۱۵۱)۔

بیع بالتقسیط کا شرعی حکم

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی[1]

اسلام نے بیع وشراء میں ان تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے جن میں فریقین کے مابین اختلاف ونزاع پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہو یا ان میں ربا پایا جاتا ہو، اسی طرح جس بیع میں مبیع یا ثمن مجہول ہو وہ بیع فاسد ہے (ہندیہ ۳/۳)۔

اسی وجہ سے ادھار بیع جس میں اجل معلوم نہ ہو فاسد ہے، اس لیے کہ بائع مستقبل قریب میں ثمن کا مطالبہ کرے گا اور مشتری اس کو دیر سے دینا چاہے گا۔ اسی طرح اگر شہر میں ایسے نقود رائج ہیں جن کی مالیت مختلف ہے، اور تمام سکوں کا رواج برابر ہے تو اگر کسی خاص سکہ کو بطور ثمن متعین نہیں کیا گیا تو بیع فاسد ہوگی، اس لیے کہ یہ جہالت فی الثمن مفضی الی المنازعۃ ہے، مثلاً ہندوستان و نیپال کے سکے مالیت میں مختلف ہیں، اور دونوں ملکوں میں بارڈر سے متصل علاقوں میں دونوں سکے رائج ہیں، اگر کسی جگہ دونوں سکوں کا برابر رواج ہو تو تعیین ضروری ہوگی، ورنہ بیع فاسد ہوجائے گی۔

۱- بیع کی مختلف صورتوں میں ایک صورت وہ بھی ہے جس میں بائع نہ تو مبیع کی اصل لاگت بتاتا ہے، نہ نفع کی مقدار بتاتا ہے، بلکہ خریدار سے مطلق ثمن طے کرتا ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں بیع مساومہ کہتے ہیں (ایضا ۳/۴)۔

اس میں قیمت کی کوئی حد متعین نہیں ہوتی ہے، بائع مختار ہے کہ جو مال بازار میں ایک سو روپے میں بک رہا ہو اس کو وہ دو سو روپے میں فروخت کرے، اور جس طرح اس کو نقد بیچنے کا اختیار ہے، اسی طرح وہ ادھار بھی بیچ سکتا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادھار خریدنا ثابت ہے (ہدایہ ۳/۲۱، درمختار ۷/۵۲)۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی قسطوں میں بھی صحیح ہے، البتہ ہر قسط کی ادائیگی کا وقت فریقین کے مابین متعین ہو، اس لیے کہ ادھار بیع کی مطلق اجازت دی گئی ہے، اجل کی تعیین کو ضروری قرار دیا گیا ہے، مختلف قسطوں میں ادائیگی کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہے، مختلف قسطوں میں ادائیگی بھی ادھار میں داخل ہے۔ (مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، العدد السادس، الجزء الاول/۲۷۹)۔

۳- اگر اس طرح بیع کی گئی کہ نقد قیمت ایک سو روپیہ اور ادھار ڈیڑھ سو روپے ہے اور کسی ایک صورت کو متعین نہیں کیا گیا تو یہ بیع ناجائز ہے، اس لیے کہ اس صورت میں ثمن میں تردد ہے جس کی وجہ سے ثمن مجہول ہوگیا اور اوپر بحث گزری کہ بیع کے صحیح ہونے کے لیے ثمن کی تعیین ضروری ہے، البتہ دونوں نے مجلس عقد میں کسی ایک صورت پر اتفاق کرلیا تو پھر بیع صحیح ہوجائے گی، اس لیے کہ ثمن کی جہالت جو مفسد بیع تھی باقی نہیں رہی (مبسوط للسرخسی ۱۳/۸)۔

حضرت امام ترمذیؒ ابوہریرہؓ کی روایت "نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة" کے تحت فرماتے ہیں:

"وقد فسر بعض أهل العلم قالوا: بيعتين في بيعة أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين ويفارقه على أحد البيعين، فإذا فارقه على احدهما فلا بأس إذا كانت العقدة على واحد منهما"

(کتاب البیوع تحفۃ الاحوذی ۴/۳۵۷)۔

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا میں داخل نہیں ہے، اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا اور اجل کی قیمت لینا دونوں الگ ہیں، اجل کا معاوضہ لینا ربا ہے جو جائز نہیں، البتہ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ جائز ہے، قیمت میں اضافہ کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، ان میں سے ایک اجل بھی ہے، جس طرح کسی شخص کو یہ حق ہے کہ اگر کوئی مال بازار میں ایک سو روپے میں

---

[1] امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

فروخت ہو رہا ہے تو اس کو وہ ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کرے، اس لیے کہ بیع مساومہ میں فریقین جس قیمت پر متفق ہو جائیں وہ صحیح ہے، کوئی شخص اپنا مال جس کی قیمت بازار میں ایک سو روپے ہے وہ اس کو ڈیڑھ سو روپے میں نقد فروخت کرسکتا ہے، اور جب نقد ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کرسکتا ہے تو ڈیڑھ سو روپے میں ادھار بھی بیچ سکتا ہے، اس لیے کہ ادھار بیع بھی جائز ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ کہا جائے کہ ڈیڑھ سو روپے میں نقد تو بیچ سکتا ہے، مگر ادھار نہیں، اس لیے اضافی رقم کو اجل کی قیمت قرار دے کر اس کو سود کہنا اور ناجائز قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

''وقالت الشافعية والحنفية وزيد بن علي والمؤيد بالله والجمهور: إنه يجوز لعموم الأدلة القاضية بجوازه''

(تحفۃ الاحوذی ۴/۳۵۹)۔

۵- اس سوال کا جواب سوال ۲ کے جواب سے واضح ہے، یعنی یہ صورت جائز ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ متعاقدین کسی ایک صورت پر متفق ہو جائیں، ورنہ ثمن میں تردد ہوگا جس سے ثمن میں جہالت پیدا ہوگی، اور اس کی وجہ سے بیع فاسد ہو جائے گی۔

۶، ۷- وقت مقررہ پر متعین قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں قیمت میں اضافہ کرنا یا اجل کی قیمت ہے، اور یہ سود ہے، اور حرام ہے۔

''الربا هو الزيادة على رأس المال بتأخير الآجال'' (كشف الغطاء عن وجه معنى الربا، بحواله الربا، /۴۰)۔

۸- (الف) ...... مرتہن کا مال مرہون سے نفع اٹھانا فقہاء کے مابین مختلف فیہ ہے، بعض حضرات نے راہن کی اجازت سے انتفاع کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے:

''وليس للمرتهن أن ينتفع بالرهن لا باستخدام ولا سكنى، ولا لبس إلا أن يأذن له المالك، لأن له حق الحبس دون الانتفاع'' (ہدایہ ۴/۵۲۲)۔

لیکن آج کل سود کے لیے ہی رہن رکھا جاتا ہے، اس لیے راہن کی اجازت سے بھی مال مرہون سے مرتہن کا انتفاع جائز نہیں ہوگا، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے پوری تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کا جائزہ لیا ہے (دیکھئے مجلہ بحث ونظر شمارہ ۲)۔

(ب) ...... بائع (مرتہن) کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون ضائع ہو جائے تو چونکہ مرتہن کا قبضہ قبضہ ضمان ہے، یعنی مرتہن ضامن ہے، اس لیے اگر مال مرہون کی قیمت دین کے برابر ہے تو مدیون دین سے بری الذمہ ہو جائے گا، اور اگر شئی مرہون کی قیمت دین سے کم ہے تو بقدر قیمت دین ساقط ہو جائے گا، باقی مرتہن راہن سے وصول کرے گا، اور اگر مال مرہون کی قیمت دین سے زائد ہے تو دین ساقط ہو جائے گا، اور باقی مرتہن کے پاس امانت ہے، اس میں ودیعت کے قانون کے مطابق عمل ہوگا، یعنی اگر مرتہن کی تعدی کی وجہ سے ضائع ہوا ہے تو مرتہن دین سے زائد قیمت کا تاوان دے گا ورنہ نہیں (ہدایہ ۴/۵۱۹)۔

(ج) ...... خریدار اگر وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرے، بلکہ ٹال مٹول کرے تو وصولی کو آسان بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ معاملہ کرتے وقت ہی یہ طے کرلیا جائے کہ راہن کی طرف سے مرتہن شئی مرہون کی فروختگی کا وکیل ہوگا، اور یہ وکالت چونکہ لازم ہوگی اس لیے راہن معزول بھی نہیں کر سکے گا، اور وقت مقررہ پر مرتہن بہ آسانی شئی مرہون کو فروخت کر کے اپنا دین وصول پائے گا، اور اگر قیمت زائد ہوگی تو زائد رقم خریدار کو لوٹا دے گا۔

(ایضا ۴/۵۳۸، درمختار علی ہامش ردالمحتار ۴/۳۲۴، فتاوی قاضی خاں علی ہامش فتاوی ہندیہ ۳/۶۰۶)۔

۹- بیع بالتقسیط میں ثمن کی وصولی کے لیے مبیع کو روک لینا جس کو ''حبس المبيع لاستيفاء الثمن'' کہتے ہیں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بیع بالتقسیط بیع مؤجل ہے، بائع کو حبس مبیع کا حق نقد بیع میں ہوتا ہے ادھار میں نہیں (مبسوط للسرخسی ۱۳/۱۹۲)۔

مبیع کو بطور رہن بائع اپنے پاس روکے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

اول یہ کہ مشتری مبیع پر قبضہ نہ کرے، بلکہ قبضہ سے پہلے ہی بطور رہن بائع کے پاس چھوڑ دے، یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ حبس مبیع استیفاء ثمن کے لیے ہے، جو بیع مؤجل میں جائز نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری اس مبیع کو اپنے قبضہ میں لے لے، پھر اس مبیع کو بائع کے پاس بطور رہن رکھ دے، یہ صورت جائز ہے، اس لیے کہ مشتری اپنا کوئی بھی مال بطور رہن بائع کے پاس رکھ سکتا ہے جس طرح کوئی دوسرا مال رہن رکھا جا سکتا ہے، مبیع کو بھی رکھا جا سکتا ہے، اس لیے کہ قبضہ

کے بعد مبیع کی وہی حیثیت ہوگی جو اس کے دوسرے اموال کی ہے (ہدایہ ۴/ ۵۳۴)۔

اس سے واضح ہوا کہ اگر قبضہ کے بعد مشتری مبیع کو بطور رہن بائع کے پاس رکھ دے تو جائز ہے (درمختار علی ردالمحتار ۵/ ۳۲۰)۔

قبضہ سے قبل مبیع رہن نہیں ہوگا، بلکہ محبوس بالثمن ہوگا (ردالمحتار ۵/ ۳۲۰)۔

۱۰- اوپر کی بحث سے معلوم ہوا کہ بائع بیع بالتقسیط میں مبیع کو ثمن کی وصولی کے لیے نہیں روک سکتا ہے اور اگر مشتری نے قبضہ پانے کے بعد اس کے پاس رہن رکھا ہے تو اب پھر بائع کبھی اس کا مالک نہیں بن سکتا، البتہ اگر مشتری مقررہ اوقات میں ثمن ادا نہ کرے تو بائع جواب ۸ (ج) کے مطابق اپنا دین وصول کرے گا۔

۱۱- جس طرح مشتری کے لیے جائز ہے کہ مبیع پر قبضہ کے بعد اس کو بائع کے پاس رہن رکھ دے، اسی طرح بائع کے لیے جائز ہے کہ شئی مرہون پر قبضہ کے بعد راہن کو بطور عاریت دے دے، جب تک شئی مرہون راہن کے پاس رہے گی، مرتہن اس کے ضمان سے بری رہے گا، اور جب چاہے گا پھر واپس لے سکتا ہے (ہدایہ ۴/ ۵۴۶)۔

حضرت علامہ حصفکی نے بھی درمختار میں اس مفہوم کی عبارت ذکر کی ہے (درمختار علی ردالمحتار ۵/ ۳۰-۳۲۹)۔

واضح رہے کہ شریعت میں قبضہ کی کوئی خاص صورت متعین نہیں ہے، ہر شئی کے مناسب عرف میں قبضہ کی جو صورت ہوگی وہ قبضہ کافی ہوگا۔

۱۲- کفالہ عقد تبرع ہے، اسی وجہ سے کفیل میں تبرع کی اہلیت کا ہونا ضروری ہے، یعنی عقل، بلوغ اور حریت کا ہونا ضروری ہے۔ صبی، عبد مجور اور مجنون کی کفالت صحیح نہیں ہے۔

''ولا تصح الكفالة الا ممن يملك التبرع لانه عقد تبرع'' (مجمع الانہر ۲/ ۱۲۴)۔

''وشرطها في الكفيل كونه من أهل التبرع'' (فتح القدیر ۷/ ۱۵۴)۔

اور جب کفالہ عقد تبرع ہے تو اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہوگا۔

۱۳- اس کے جواز کے لیے حضرت تھانویؒ نے حیلہ تحریر فرمایا ہے، اس کو اختیار کیا جائے، مثلاً دستاویز پر پانچ ہزار رقم تحریر ہے، اور مالک دستاویز چاہتا ہے کہ چار ہزار میں فروخت کردے تو براہ راست چار ہزار روپے لے کر دستاویز کسی کو حوالہ کر دینا کہ وہ دستاویز پر لکھی گئی رقم وقت مقررہ آنے پر وصول کرے جائز نہیں ہے۔ اس کو چاہیے کہ دوسرے کو اپنے دین کی وصولی کے لیے وکیل مقرر کر دے، اور اس کی اجرت ایک ہزار طے کر دے، پھر اس سے چار ہزار روپے قرض لے لے، اور اس کو اختیار دے دے کہ میرا دین وصول کر لو گے، اس میں ایک ہزار روپے اپنی اجرت لے لینا اور باقی ماندہ میری چار ہزار کی رقم اپنے قرض میں وصول کر لینا، یہ جائز ہے۔

۱۴- اوپر بحث گزری کہ اجل کا معاوضہ لینا حرام ہے، یہ بھی اجل کا معاوضہ ہے، اس لیے ناجائز ہے، یعنی جس طرح خریدار اگر وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرے تو تاخیر کی وجہ سے اس سے زائد رقم لی جائے تو جائز نہیں ہے، اس طرح اگر وہ وقت مقررہ سے پہلے ادا کرنے کی وجہ سے چاہتا ہے کہ بائع دین میں کچھ کم کر دے یہ بھی اجل کا معاوضہ ہے اور حرام ہے (ہدایہ ۳/ ۲۵۱، فتاوی قاضی خاں علی ہندیہ ۳/ ۸۷)۔

۱۵- اگر معاملہ ادھار ہے، اور قیمت کی ادائیگی کے لیے وقت مقرر نہیں کیا گیا ہے تو بیع مؤجل ہے، اور اجل معلوم نہیں ہے، اس لیے یہ بیع ناجائز ہے جیسا کہ جواب ا۔ میں واضح کیا گیا۔ اور اگر معاملہ یہ ہے کہ بیع نقد ہے، مگر ابھی تک ادائیگی نہیں ہوئی ہے، اور بائع محسوس کرتا ہے کہ خریدار ٹال مٹول کر رہا ہے، اس لیے وہ فوری ادائیگی کے لیے قیمت کا کچھ حصہ معاف کر دے تو یہ صورت جائز ہے، اس لیے کہ فوری ادائیگی مشتری پر ضروری ہے، اس لیے جو کم کیا گیا ہے وہ ابراء ہے، نہ کہ اجل کی قیمت، اس لیے کہ مشتری اجل کا مستحق تھا ہی نہیں کہ اس کمی کو اس اجل کی قیمت قرار دیا جائے (ہدایہ ۳/ ۲۵۱)۔

۱۶- اگر بیع بالتقسیط میں یہ معاملہ کیا گیا کہ اگر کوئی قسط اپنے مقررہ وقت پر ادا نہیں کی جائے گی تو باقی اقساط میں مہلت ختم کر دی جائے گی، اور بائع کو حق ہوگا کہ باقی تمام اقساط کا فی الفور مطالبہ کرے تو ایسا معاہدہ کرنا جائز ہے، اگر مشتری نے وقت مقررہ پر قسط ادا نہ کی تو بائع کو حق ہوگا

کہ باقی اقساط کا فی الفور مطالبہ کرے۔

۱۷- بیع بالتقسیط میں اگر وقت مقررہ سے پہلے کسی فریق کی موت ہوجائے تو کیا معاملہ کی نوعیت میں فرق ہوجائے گا؟ بیع مؤجل میں دائن کی موت سے کوئی فرق نہیں آتا، جس طرح دائن اپنی حیات میں وقت مقررہ سے پہلے اس دین کی وصولی کا حقدار نہیں تھا، اسی طرح اس کے ورثاء بھی حلول اجل سے قبل اس دین کی وصولی کے حقدار نہیں ہوں گے، اور جب ادائیگی کا وقت آئے گا اس وقت تمام ورثاء اس میں شریک ہو جائیں گے، البتہ مدیون مرجائے تو معاملہ پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے، اس لیے کہ مدیون نے اس لیے مہلت لی تھی کہ وہ اپنے مال میں تجارت کے ذریعہ اضافہ کرے اور دین ادا کرے، مگر جب مرگیا تو اب یہ مقصد فوت ہوگیا، اب تو جو مال اس کے پاس رہ گیا ہے اسی کے ذریعہ دین ادا کیا جائے گا، اور اگر باقی بچے تو ورثاء اس کے مستحق قرار پائیں گے۔

اس لیے جمہور فقہاء کے نزدیک مدیون کے مرنے سے اجل ختم ہوجاتا ہے، علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

''ویبطل الأجل بموت المدیون لا الدائن''

علامہ شامی نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

''لأن فائدة التأجیل أن یتجر فیؤدی الثمن من نماء المال، فإذا مات من له الأجل تعین المتروك لقضاء الدین فلایفید التأجیل'' (ردالمحتار ۷/۵۳)۔

لیکن امام احمد بن حنبلؒ کا مختار مذہب یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کردیں اور ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرلیں تو پھر یہ دین اسی تفصیل کے ساتھ ان کے ذمہ واجب الاداء ہوجائے گا، اس کو حضرت علامہ ابن قدامہ نے ''المغنی'' میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/۴۸۲)۔

اگر اس مسئلہ میں جمہور کے مسلک کو چھوڑ کر حضرت امام احمدؒ کا مسلک اختیار کیا جائے، تو کوئی حرج نہیں ہے، ضرورت کے مواقع میں دوسرے مذہب پر عمل کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

چوں کہ اس میں ابتلاء عام ہے، لہذا امام شافعی کے قول پر عمل کی گنجائش ہے (امدادالفتاوی ۳/۲۱)۔

۱۸- دوکانداروں کی طرف سے اپنے خریداروں کو وقت مقررہ پر ہر قسط کی ادائیگی کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دیا جانا ربا یا قمار میں داخل نہیں ہے، یہ گویا نقد دین کے ایک حصہ کو ساقط کردینا ہے، اوپر گزرا کہ یہ جائز ہے۔

۱۹- اس سوال میں مسئلہ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ قمار ہے، اس لیے جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

قسط پر خرید وفروخت - فقہ اسلامی میں

مفتی انور علی اعظمی [مفتی دار العلوم مئو]

۱- ادھار بیع میں نقدی کے بالمقابل ثمن کی زیادتی درست ہے:

جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اس کی قیمت نقد فروخت کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کردی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ اگر ادھار اور نقد دونوں بھاؤ کا تذکرہ مجلس بیع میں ہو چکا ہے تو جدائیگی سے پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ جانبین میں معاملہ کس پر ختم ہوا ادھار بھاؤ پر یا نقد بھاؤ پر، اگر مجلس عقد میں نقد بھاؤ طے ہو چکا تھا پھر بعد میں مشتری نے اپنی سہولت اور بائع نے اپنے نفع کے پیش نظر ادھار بیع میں تبدیل کرلیا تو یہ درست نہیں ہوگا (ترمذی ۱/ ۱۴۸)۔

۲- ادھار قیمت کو قسطوں میں ادا کرنا درست ہے:

اگر ادھار قیمت کی قسطوار ادائیگی کی سہولت بائع کی طرف سے مل جائے یا عقد کے وقت ہی بالتقسیط ادائیگی پر معاملہ طے ہوا ہو تو اس کے جواز میں کوئی مانع نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ثمن کے ادھار ہونے کی بنا پر قسطوں کی مقدار اور ادائیگی میعاد طے ہو ورنہ ان چیزوں کی جہالت مفضی الی النزاع ہوگی، بائع جلد از جلد بڑی سے بڑی قسط کا مطالبہ کرے گا اور مشتری ٹال مٹول کرے گا، لہذا ثمن کی قسطوار ادائیگی میں ان دونوں امور کی تعیین ضروری ہوگی۔

۳- مجلس عقد میں ادھار اور نقد دونوں قیمتوں کا ذکر جائز ہے:

مجلس عقد میں ادھار اور نقد دونوں قیمتوں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف ادھار قیمت کا ذکر کیا جائے اور اسی پر معاملہ کیا جائے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اگر دونوں قیمتوں کا الگ الگ ذکر آجائے تو اسی مجلس میں طے ہوجائے کہ معاملہ کس قیمت پر ختم ہوا ادھار پر یا نقد پر، اگر اس کی تعین ہوجائے تو ان میں سے کسی قیمت پر معاملہ کرنا درست ہوگا جیسا کہ (ترمذی) کے حوالہ سے گزر چکا، نیز دیکھئے (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲/ ۲۴۳)۔

۴- ادھار بیع میں نقد سے زیادہ قیمت مقرر کرنا ربا نہیں ہے:

ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرہ میں نہیں آتا، کیونکہ یہ زیادتی صلب عقد میں ہورہی ہے، بائع کو اپنی چیز نقد کی صورت میں بھی بازار کے عام بھاؤ سے کچھ زیادہ دام پر فروخت کرنے کا اختیار ہے، اسی طرح اور دوسرے اسباب کی بنا پر نفس عقد میں بائع اور مشتری کی رضامندی کے ساتھ جس قیمت پر معاملہ قطعی اور حتمی صورت اختیار کرلے وہ جائز ہوگی، اور یہ زیادتی سود کے قبیل سے نہیں ہوگی، البتہ اگر ایسا ہوتا کہ ایک معاملہ ایک ماہ کی مدت پر سو روپئے میں ختم ہوگیا اور پھر مدت بڑھا کر قیمت میں اضافہ کیا جائے تو یہ زیادتی وقت کے عوض ہوگی اور سود ہوگی۔

(الفقہ علی المذاہب ۲/ ۲۴۵)۔

۵- چوں کہ صورت مسئولہ میں ثمن اور اجل دونوں کی جہالت مرتفع ہے اس لیے مذکورہ بالا صورت جائز ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۱۶۵)۔

۶- نفس اجل کی بنا پر اضافہ ربا نسیہ ہے جو جائز نہیں:

اس طرح کا معاملہ کھلا ہوا ربا ہے، یہاں پر دو روپئے ماہانہ اضافہ نفس اجل کے مقابلہ میں ہے، لہذا شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، فقہاء کے یہاں صراحت کے ساتھ یہ امر مسلم ہے کہ ربا الفضل اور ربا النسیئۃ دونوں حرام ہیں اور "أحل اللہ البیع وحرم الربوا" میں دونوں قسم کا ربا داخل ہے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ (۴/ ۲۴۵) کا حوالہ گزر چکا ہے۔ محض فریقین کے راضی ہوجانے سے معاملہ کی مذکورہ صورت جائز نہیں ہوسکتی۔

۷- معاملہ کی یہ صورت جائز نہیں، اس رقم کا نام "جرمانہ" یا مالی تاوان رکھا جائے یا اور کچھ، بہر حال یہ سود ہے، اور ربا کا ایک دروازہ ہے جس کی اجازت دینا امت کو سودی لین دین میں مبتلا اور ملوث کرنے کے مرادف ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "اصلاح انقلاب امت" کی دوسری جلد میں تحریر فرمایا ہے: کہ مسلک احناف میں مالی تاوان جائز نہیں اور ایک حدیث سے استدلال کیا ہے کہ کسی مسلمان کا مال دوسرے کے لیے بغیر طیب قلب کے حلال نہیں ہے۔ مذکورہ صورت میں تاوان سے زیادہ خطرناک شئے، یعنی سود کی جھلک ہے، کیونکہ صلب عقد میں اجل کے بالمقابل ایک قسم کی زیادتی کی شرط لگا دی گئی ہے جو ربا النسیئۃ ہے۔

۸- (الف):......مال مرہون سے انتفاع کا حکم فقہاء کی نظر میں:

اس سلسلہ میں جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مرتہن مال مرہون سے کسی طرح کا انتفاع نہیں کر سکتا، یہ مسلک حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور جمہور فقہاء کا ہے:

"قال الشافعي وأبوحنيفه ومالك وجمهور العلماء: ولاينتفع المرتهن من الرهن بشئ بل الفوائد للراهن والمؤن عليه" (نیل الاوطار ۵/۲۳۵)۔

ہاں اگر مالک، یعنی راہن اجازت دے دے تو جائز ہو سکتا ہے، لیکن اس نفع کے لیے بھی ضروری ہے کہ صلب عقد میں انتفاع من المرہون کی شرط نہ لگائی گئی ہو، ورنہ پھر یہ نفع ناجائز ہو جائے گا (فقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/۳۳۵)۔

اس مسئلہ میں بعض فقہاء کا مسلک جمہور سے الگ بھی ہے، اس دوسری جماعت کے نزدیک اگر مرتہن مرہون شئی کی کفالت کر رہا ہو تو بقدر کفالت اس سے نفع اٹھا سکتا ہے، اتنا نفع اٹھانے کے لیے مالک کی اجازت بھی ضروری نہیں ہے، ان حضرات کا مستدل حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ہے:

"عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان يقول: الظهر يركب بنفقة إذا كان مرهونا، ولبن الدر يشرب بنفقة إذا كان مرهونا وعلى الذي يركب النفقة" (رواه الجماعة الا مسلما والنسائی بحوالہ نیل الاوطار ۵/۲۳۴)۔

(ب):......مال مرہون جب مرتہن کے قبضہ میں ہو تو مرتہن ہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ حفاظت خواہ وہ خود کرے یا اپنے ماتحتوں میں سے کسی سے کرائے مثلاً بیوی، اولاد، یا وہ خادم جو اس کی کفالت میں ہو۔ مال مرہون مرتہن کے پاس امانت ہے، لہذا اگر حفاظت کے جملہ اہتمام وانصرام کے باوجود بغیر تعدی کے ہلاک ہو گیا تو مرتہن پر کوئی تاوان نہیں ہے، البتہ تعدی کی صورت میں پورا ضمان واجب ہوگا (مجمع الانہر ۴/۵۸۹، المغنی ۴/۴۳۸)۔

(ج):......اگر خریدار وقت مقررہ پر قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے اور شئی مرہون کو بیچنے کی اجازت بھی دے چکا ہے تو مرتہن اسے بیچ کر اپنی واجب الاداء قیمت وصول کرے گا، مال مرہون کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم مرتہن کی واجب الاداء قیمت سے زائد ہو تو بقیہ رقم راہن کے حوالہ کی جائے گی اور اگر مرہون شئی کی بیع سے حاصل ہونے والی رقم مرتہن کی واجب الاداء سے کم ہے تو جس قدر رقم مل رہی ہے وہ مرتہن کے دین میں ادا کر دی جائے گی اور باقی رقم راہن کے ذمہ واجب الاداء ہوگی۔

اور اگر راہن بیع کی اجازت نہیں دے رہا ہے تو اپنے پاس سے دوسرا مال دے کر دین ادا کرے گا، اور اگر اس کے بس میں یہ بھی نہیں ہے تو حاکم وقت راہن کو رہن بیچ کر مرتہن کو دین ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ فقہ السنہ میں سید سابق لکھتے ہیں:

"ومتى حل الأجل لزم الراهن الإيفاء وأداء ما عليه من دين، فإن امتنع من وفائه ولم يكن أذن له ببيع الرهن أجبره الحاكم على وفائه أو بيع الرهن فإن باعه و فضل من ثمنه شئ فلما لكه، وإن بقي شئ فعلى الراهن" (فقہ السنۃ ۳/۱۵۹)۔

۹- مکمل قیمت یا چند اقساط جمع کرنے تک بائع کا سامان کو روکنا کیسا ہے؟

(الف):......اگر مشتری مذکورہ شکل میں مبیع پر قبضہ کر لے پھر وہی سامان بطور رہن کے بائع کے پاس رکھ دے تو ایسا کرنے کی گنجائش موجود ہے، لیکن قبضہ سے پہلے اس کو رہن بنانا بھی درست نہیں ہوگا۔ قبضہ کے بعد مشتری کی ملکیت ثابت اور متعین ہو چکی ہے، چنانچہ اگر اس کے بعد ہلاک ہو جائے گی تو مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی، اور ہلاکت کی بنیاد پر بیع فسخ نہیں ہوگی۔

(ب):......بیع بالاقساط بیع مؤجل ہے، معجل نہیں، ادھار بیع میں بائع کو یہ حق نہیں ہے کہ ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روکے رکھے، بائع کو یہ حق نقد بیع میں حاصل ہوتا ہے، اور بیع بالتقسیط ادھار بیع ہے (فتاوی ہندیہ، الباب الرابع، کتاب البیوع)۔

لہذا استیفاء ثمن کے لیے یا چند قسطیں جمع کرانے تک بائع کا مبیع کو اپنے پاس روکنا بیع بالتقسیط میں درست نہیں ہے۔

۱۰- مذکورہ صورت اقالہ کی ہے، اور اقالہ ثمن اول پر ہوتا ہے (ہدایہ ۳/ ۵۲) پس بائع جو اقساط لے چکا ہے انہیں واپس کرنا ضروری ہے۔

۱۱- اکثر و بیشتر فقہاء نے رہن کے صحیح اور پورا ہونے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ مرتہن اس شے مرہون پر قبضہ کرے اور اس شرط کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت ہے: "فرهان مقبوضة" (سورہ بقرہ/ ۲۸۳) لیکن فقہاء کے یہاں اس بات کی اجازت بھی ملتی ہے کہ راہن اس چیز کو بطور عاریت لے کر اس سے انتفاع بھی کر سکتا ہے۔

علامہ تقی عثمانی نے اس رہن کو "الرهن السائل" کے نام سے ذکر کیا ہے اور موجودہ دور کی مشکلات میں اس کے جواز کا رجحان پیش کیا ہے، بندہ کی رائے بھی یہی ہے (فقہی مقالات ۱/ ۹۵)۔

اس صورت میں جبکہ راہن شیٔ مرہون کو عاریۃً لے کر نفع اٹھا رہا ہو، یہ ضروری ہوگا کہ اس چیز کی ملکیتی دستاویز پر قبضہ مرتہن کا ہو اور قانوناً دونوں کے درمیان اس طرح کا معاہدہ بھی ہونا چاہیے کہ مرتہن ضرورت کے وقت اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر سکتا ہے۔

۱۲- عقد کفالت محض تبرع ہے، اس پر اجرت لینا کسی طرح جائز نہیں ہے (درمختار ۳/ ۳۴۸)، اگر کوئی ادارہ مثلاً بینک کریڈٹ لیٹر جاری کرتا ہے تو اس کا واقعی خرچ عمیل سے لے سکتا ہے، کفالت کے معاوضہ کے طور پر نہیں، محض لیٹر بنانے بھیجنے، اور متعلقہ امور کا لازمی خرچ، جیسے ڈرافٹ وغیرہ بنانے کا لازمی خرچ بینک لیتا ہے۔

۱۴- دیون مؤجلہ میں طے شدہ رقم کو مقررہ مدت سے آگے بڑھا کر جس طرح زیادتی کا مطالبہ کرنا ناجائز ہے، اسی طرح مدت گھٹا کر کمی کرنا اور عجلت ادائیگی کی بنا پر قیمت کا کچھ حصہ وضع کرنا بھی ناجائز، بلکہ ربا کے دائرہ میں آتا ہے، بعض حضرت نے اس کے جواز پر بنی النضیر کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، علامہ سرخسی اس کے جواز کی بنیاد مسلمان اور حربی کا معاملہ قرار دیتے ہیں، اور بین المسلمین اس قسم کے معاملہ کو ناجائز کہتے ہیں۔

(شرح السیر الکبیر للسرخسی ۴/ ۱۱۲، ۱۴، موطا امام محمد ۱/ ۳۳۲، ۱/ ۶۰۶)۔

۱۵- دیون حالہ میں فقہاء کے یہاں اس کی گنجائش موجود ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب فقہ مالکی سے چند عبارات لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

یہ عبارات اس بارے میں بالکل صریح ہیں کہ علماء مالکیہ کے نزدیک دیون حالہ میں "ضع و تعجل" کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ فقہاء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ متفق ہیں، اس لیے دوسرے علماء نے جہاں کہیں "ضع و تعجل" کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے وہیں دیون مؤجلہ کی قید بھی لگائی ہے، جیسا کہ موطا میں محمد بن حسن کی ذکر کردہ عبارت اور اس پر قائم کیے گئے ترجمۃ الباب سے ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح علامہ ابن قدامہ نے بھی اس مسئلہ کو دین مؤجل کے ساتھ مقید کیا ہے، اور یہ بات بداہتاً کے ساتھ ثابت ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، لہذا اس سے ظاہر ہوا کہ دیون حالہ میں "ضع و تعجل" جائز ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے المسوی علی المصفی میں اس کی صراحت کی ہے۔

"فقال أهل العلم في التطبيق بينه و بين هذه الآثار: إن الآثار في المؤجل وهذا في الحالّ. وفي كتاب الرحمة اتفقوا على أن من كان له دين على إنسان إلى أجل فلا يحل له أن يضع عنه بعض الدين قبل الأجل ليعجل له الباقي على أنه لا بأس إذا حل الأجل أن يأخذ البعض ويسقط البعض" (فقہی مقالات ۱/ ۱۱۱)۔

دیون حالہ میں مدت کی قید نہیں ہوتی، اس لیے دین کا معاف کیا ہوا مدت کے عوض نہیں ہوگا، لہذا اس میں ربا کا مفہوم نہیں ہوگا، بلکہ یہ حقدار کا اپنے حق کو مرضی سے ساقط کرنا ہوگا اس کا اختیار اسے بیع کے وقت بھی تھا اور بعد میں بھی ہے۔

۱۶- اگر معمولی تاخیر پر بھی علی الفور مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی ضروری ہوگی تو لوگ حرج میں پڑ جائیں گے، اس میں کچھ نہ کچھ رعایت کیا جانا اسلامی اصول کی رو سے ضروری ہے، اللہ تعالی نے کہا ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة"۔ اگر ایگریمنٹ میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر مشتری کوئی قسط مقررہ وقت پر ادا نہ کر سکا تو اس صورت میں آئندہ کی باقی اقساط بھی ادا کرنا ضروری ہوگا، اگرچہ فقہاء کی عبارتوں میں ایگریمنٹ میں ایسی شرط لگانا جائز ہے اور اس رو سے بائع کا تاخیر کی صورت میں مطالبہ کرنا بھی درست ہے، لیکن یہ شرط بیع بالتقسیط کے مقصد سے زیادہ میل نہیں کھاتی، مہلت ختم کرنے کی صورت میں اگر معاملہ اپنی ابتدائی پوزیشن میں ہو تو مشتری پر یکبارگی کافی بوجھ پڑے گا، اس لیے فی الفور وہی قسط واجب الادا ہونی چاہیے جس کی مدت گزر چکی اور بقیہ اقساط میں مہلت کو باقی رکھنا چاہیے تا کہ مشتری نے خریداری کے لیے جو نظم قسطوار کیا ہے اس میں زیادہ خلل نہ واقع ہو۔

دوسری بات یہ بھی سمجھ میں آ رہی ہے کہ اس شرط سے نفع صرف بائع کو ہوگا۔ اور بیع بالتقسیط کا جو مقتضاء تھا وہ بہت حد تک متاثر بھی ہوگا، لہذا فقہ کے مشہور قاعدہ: "وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده... إلخ" (ہدایہ ۳/۴۳) کی رو سے بھی ایسی شرط کی اجازت مناسب نہیں معلوم ہوتی، اگر مشتری کی طرف سے قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر کا اندیشہ ہے تو بائع اس کو پابند بنانے کے لیے اس کے علاوہ کچھ دوسری قید لگائے، مثلاً یہ کہ ایک متعین مدت کی تاخیر کی بنا پر مشتری کا عقد ختم کر دیا جائے گا وغیرہ۔

۱۷- بیع بالتقسیط کی صورت میں اگر دائن کی موت واقع ہو جائے تو عند الاحناف مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا (درمختار ۳/۳۱، مجمع الانہر ۴/۸)۔

البتہ اگر مدیون مر جائے تو جمہور فقہاء کے نزدیک وہ دین فی الفور واجب الادا ہو جائے گا، احناف شوافع اور مالکیہ ہر مسلک کے اکثر علماء کی رائے یہی ہے، امام احمد بن حنبل کی بھی ایک رائے یہی ہے، لیکن فقہ حنبلی کا مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کر دیں اور اس کی ادائیگی پر اطمینان دلا دیں تو وہ فوری واجب الاداء نہیں ہوگا، بہرحال اس مسئلہ میں جمہور کا مسلک ہی راجح معلوم ہوتا ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب نے ایک شکل ذکر کی ہے کہ متاخرین حنفیہ کا یہ قول لیا جائے کہ اداء دین کی جو مدت متفق علیہ تھی اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے اس وقت کے مقابلہ میں جتنا ثمن آتا ہو وہ ساقط کر دیا جائے، لیکن ایسا کرنا سود کا ایک دروازہ کھولنا ہے، چنانچہ خود انہوں نے اس کو ناپسند کیا اور حنابلہ کے قول کو ترجیح دی، وہ فرماتے ہیں:

حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے یعنی جس طرح وہ دین مؤجل ہے اب بھی اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے، البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دین کی توثیق کر دیں، شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے (فقہی مقالات ۱/۱۳۷)۔

بہرحال اگر قرض کی ادائیگی ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے اور مرنے والا بری الذمہ ہو جائے تو یہ دوسری شکل زیادہ اچھی ہے، یعنی یا تو پوری قیمت اور تمام قسطیں مدیون کی موت کے بعد ادا کر کے معاملہ کو مکمل کر دیا جائے یا پھر ورثاء وہ قرض اپنے ذمہ لیں، اس کی توثیق کریں اور قسطیں حسب پروگرام اپنے وقت پر ادا کی جائیں۔

۱۸، ۱۹- یہ ربا اور قمار ہی کی ایک جدید صورت ہے، ایک ہی چیز ایک آدمی کو محض ایک قسط مثلاً پانچ سو روپے میں مل رہی ہے اور دوسرے کو مثلاً بیس قسطوں کے بعد بھی دس ہزار روپے میں ملے گی، پہلی قسط میں ہر آدمی لاٹری کی طرح ایک موہوم امید پر مثلاً پانچ سو روپے کا ایک ٹکٹ بیس ہزار کے سامان کی امید پر لے رہا ہے، جو جیت جائے وہ الگ ہو گیا، باقی لوگ بعد کی اقساط میں اسی امید پر پیسے جمع کر رہے ہیں کہ شاید تھوڑے پیسے میں کوئی بہت قیمتی سامان مل جائے، پیسے ہزاروں آدمی جمع کرتے ہیں، اور نفع ایک شخص یا چند اشخاص اٹھاتے ہیں۔ درمیان میں قسطوں پر انعام دینے کا مقصد زیادہ سے زیادہ خریداروں کو اس موہوم امید پر رجھانا ہوتا ہے، اصل بیع ایک ثانوی شی بن کر رہ جاتی ہے اور انعام سے استفادہ اصل مقصد بن جاتا ہے، اس لیے اس کے جوا ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، لاٹری میں جوا صرف ایک بار ہوتا ہے اور اس میں جوا ہر بار ہر قسط پر ہوتا ہے۔

☆☆☆

بالاقساط خرید وفروخت کے احکام

مولانا ابوجندل قاسمی، ٹانڈہ

۱- جس سامان کو فروخت کیا جائے اور وہ بیع ادھار ہو تو اس کی قیمت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں زیادتی کرنا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ عاقدین عقد کے وقت ہی ادھار بیع ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں، لہذا اگر بائع یہ کہے کہ میں نقد اتنے میں بیچتا ہوں اور ادھار اتنی قیمت میں بیچتا ہوں اور اس کے بعد کسی ایک قیمت پر اتفاق نہیں کیا کہ جدا ہو گئے تو یہ بیع ناجائز ہو جائے گی۔

(مرقاۃ شرح مشکوۃ ۶/ ۸۱، دہلی، فتاویٰ ہندیہ ۲/ ۱۳۶، کوئٹہ، ترمذی مع العرف الشذی ۱/ ۲۳۳، تحفۃ الاحوذی ۴/ ۴۲۸، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ہدایہ ۳/ ۵۸، باب المرابحۃ، ردالمحتار ۷/ ۳۶۲، باب المرابحۃ والتولیۃ، بہشتی زیور ۵/ ۸، أحسن الفتاویٰ ۷/ ۳۰، اسلامی فقہ ۲/ ۳۳۷، امداد الفتاویٰ ۳/ ۲۰، فتاویٰ رشیدیہ/ ۴۹۳)۔

۲- ادھار قیمت کو یکمشت ادا کرنا ضروری نہیں، بلکہ بائع اگر بالاقساط ادائیگی پر رضامند ہو جائے تو قسطوں میں بھی ادائیگی کی گنجائش ہے، لیکن مدت متعین کر لی جائے (شرح المجلہ/ ۱۲۵ بحوالہ اسلامی فقہ ۲/ ۳۳۵، ہدایہ وحاشیہ ۳/ ۵۸ باب المرابحۃ والتولیۃ، ردالمحتار ۷/ ۳۶۱، باب المرابحۃ والتولیۃ)۔

۳- سوال نمبر (۱) کے جواب پر قیاس کر کے یہ صورت بھی جائز ہونی چاہیے، اس لیے کہ جب نقد وادھار قیمتوں کا تذکرہ کر کے کسی ایک پر اتفاق کر کے بیع جائز ہے تو بغیر دوسری قیمت کے تذکرہ کیے صرف ایک قیمت کا ذکر کر کے اس پر بھی بیع جائز ہونی چاہیے، البتہ مدت کا تعین ضروری ہے۔

(ہدایہ ۳/ ۴، فتاویٰ ہندیہ ۳/ ۳، ردالمحتار ۷/ ۵۲، زکریا، دیوبند، التعریفات الفقہیۃ ۲۴۴)۔

قرآن کریم کی آیت: "یا أیھا الذین اٰمنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمّی" [بقرہ/ ۲۸۲] سے بھی جواز معلوم ہوتا ہے (معارف القرآن)۔

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا یا شبہ ربا کے دائرہ میں نہیں آتا، کیونکہ سامان کے سودے میں ادھار کا خیال کر کے قیمت میں کچھ اضافہ کر دیا جائے تو وہ براہ راست مدت کا معاوضہ نہیں، بلکہ اس سامان کی ہی قیمت ہے۔

(ہدایہ ۳/ ۵۸، باب المرابحۃ والتولیۃ، ہدایہ کتاب الصلح، باب الصلح فی الدین ۳/ ۲۳۵، حاشیہ ہدایہ ۳/ ۲۳۵)۔

اور ظاہر ہے کہ ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی براہ راست مدت کی قیمت نہیں، بلکہ سامان کے ضمن میں ہے جو حقیقۃً سامان ہی کی قیمت ہے، یہ مسئلہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ زرعی زمین کے لیے آبیاری وغیرہ کا حق ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان حقوق کو تنہا بغیر مکان یا زمین کے فروخت کرے تو یہ بیع ناجائز ہوگی، کیونکہ حقوق کوئی مال نہیں، لیکن مکان یا زمین کو فروخت کرے گا تو یہ حقوق بھی ضمناً خود بخود فروخت ہو جائیں گے اور مکان، دوکان اور زمین کی قیمت میں ان کا معاوضہ بھی شامل ہو جائے گا۔ (ردالمحتار ۷/ ۳۴، مطبوعہ زکریا دیوبند، جواہر الفقہ ۳/ ۱۵۱)۔

۵- یہ صورت بھی سابقہ اقوال پر قیاس کر کے جائز ہونی چاہیے، کیونکہ جب نقد وادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو ادھار ادھار کی بنیاد پر بھی قیمتوں میں اختلاف جائز ہوگا، دونوں صورتوں میں کوئی فرق بظاہر معلوم نہیں ہوتا، لیکن وہ شرط جو نقد وادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف کی صورت میں بیان کی گئی ہے اسے یہاں بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے، یعنی یہ کہ عاقدین کے درمیان عقد بیع کے وقت ہی ذکر کردہ مدتوں اور قیمتوں میں سے کسی ایک کی تعیین ہو جائے، ورنہ بیع جائز نہ ہوگی۔ (فقہی مقالات از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی/ ۸۴-۸۵)۔

۶- یہ صورت قطعاً ناجائز ہے، کیونکہ اس میں عاقدین کے درمیان قیمت تو اس روپے سے متعین ہوگئی اور پھر ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس میں نفع کا اضافہ کیا گیا اور اس کے بعد ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوتی جائے گی نفع میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا، ظاہر ہے کہ یہ اضافی رقم کی شرط لگانا ایسی زیادتی ہے جو "خالی عن العوض" ہے، لہذا یہ اضافی رقم بلاشبہ سود ہے اور ناجائز ہے (عنایہ علی الفتح ۶/ ۱۴۶، کراچی)۔

نیز یہ اضافی رقم براہ راست مدت کے عوض میں ہے، اس لیے بھی یہ ربا میں داخل ہو کر ناجائز اور حرام ہوگی، عنایہ نے ایک روایت ذکر کی ہے، فرماتے ہیں:

"روي أن رجلا سأل ابن عمر فنهاه عن ذلك، ثم سأله فقال: إن هذا يريد أن أطعمه الربا"

(عنایہ علی الفتح، باب الصلح فی الدین، بحوالہ جواہر الفقہ ۳/ ۱۵۰)

(روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے مدت پر قیمت لینے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے اس کو منع فرمایا، اس نے پھر پوچھا تو آپ نے یوں فرمایا کہ یہ شخص چاہتا ہے کہ میں اس کو سود کھانے کی اجازت دے دوں)۔

یہ تحریر فرمانے کے بعد صاحب ''عنایہ'' نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ اس لیے فرمایا کہ سود کی حرمت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس میں مدت کے بدلہ میں مال لینے کا شبہ ہے تو جہاں یہ بات شبہ کی حدود سے آگے بڑھ کر حقیقت بن گئی ہو وہاں حرمت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے (بحوالہ جواہر الفقہ ۳/۱۵۰)۔

۷- ادھار فروختگی میں وقت مقرر پر یکمشت قیمت، یا جملہ قسطیں یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کچھ رقم ادا کرنے کی شرط لگانا درست نہیں، کیونکہ دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں: یا تو خریدار تنگدستی کی وجہ سے پوری قیمت یا قیمت کی کوئی قسط ادا نہیں کرسکا، یا یہ کہ خریدار وسعت والا ہے، لیکن بلا وجہ ٹال مٹول کررہا ہے۔ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے تو ایسے شخص کو تو ادائیگی کی وسعت ہونے تک مہلت دینا واجب اور ضروری ہے، چہ جائیکہ مزید رقم اس سے لی جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" (سورہ بقرہ/۲۸۰)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا مدیون تنگدست اور واقعی مفلس ہو، تمہارا دین ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک کہ وہ دین ادا کرنے پر قادر نہ ہوجائے (معارف القرآن بتغیر جلد اول)۔

اب رہی بات دوسری صورت کی، یعنی خریدار وسعت والا ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرتا ہے، دین ادا نہیں کرتا، تو یہ مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ ہر زمانہ میں تجار اس مشکل سے دوچار رہے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور بعد کے زمانوں میں بھی یہ مسئلہ درپیش رہا، لیکن احادیث وآثار سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس مشکل کے حل کے لیے مماطل پر مالی معاوضہ لازم کیا گیا ہو، لہٰذا حاصل یہ ہوا کہ اس دوسری صورت میں بھی مالی معاوضہ یعنی مزید رقم کی شرط لگانا صحیح نہیں، اور یہ بھی سود ہوگا، کیونکہ مدت کے مقابلہ میں ہے (فقہی مقالات للعلامہ العثمانی مدظلہ ۱۲۰ تا ۱۳۳)۔

نیز ''کل قرض جر نفعا فھو ربا'' بھی اسی کا مقتضی ہے کہ مزید رقم کی شرط لگانا یکمشت قیمت یا وقت مقرر پر کسی قسط کی عدم ادائیگی کو درست قرار نہ دیا جائے، بلکہ اس کا (یعنی مقررہ وقت پر قیمت کی ادائیگی کا) کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے، مثلاً ایک معین رقم خیراتی کاموں میں صرف کرنا (فقہی مقالات ۱/۱۲۹)۔

۸- الف:......رہن سے فائدہ حاصل کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) بغیر راہن (مالک) کی اجازت کے شئ مرہون سے نفع حاصل کرنا، (۲) راہن کی اجازت سے نفع حاصل کرنا۔

پہلی صورت یعنی بغیر مالک کی اجازت کے شئ مرہون سے نفع حاصل کرنا تو بالکل جائز نہیں، بلکہ سراسر سود ہوگا، جس کا استعمال کرنا حرام ہوگا، البتہ دوسری صورت کے سلسلہ میں فقہاء احناف مختلف ہیں:

۱- بعض فقہاء کسی بھی حال میں انتفاع کو جائز نہیں کہتے، خواہ راہن اجازت دے یا نہ دے

(ردالمحتار، زکریا دیوبند ۱۰/۸۳، کتاب الرھن، عمدۃ الرعایۃ حاشیۃ شرح وقایہ بحوالہ اسلامی فقہ ۲/۷۰۴، بدائع الصنائع ۶/۱۴۵ مطبوعہ، کوئٹہ، بدائع ۶/۱۴۶)۔

۲- اور بعض فقہاء نے اذن راہن سے انتفاع کی اجازت دی ہے۔

(ہدایہ ۴/۵۰۶، کتاب الرھن، الدر المختار ۱۰/۸۲-۸۳، کتاب الرھن، تکملۃ البحر الرائق شرح الکنز ۸/۲۳۸، کتاب الرھن)۔

اسی طرح فتاویٰ قاضی خان ۳/۶۰۱، فصل فی الانتفاع بالرھن، فتاویٰ ہندیہ ۵/۶۶ وغیرہ بھی سے اذن راہن سے انتفاع کا جواز مستفاد ہوتا ہے، خود علامہ شامیؒ نے عبداللہ محمد بن اسلم سمرقندیؒ کی عبارت ''منح'' سے نقل کرنے کے بعد صاحب منح کا یہ قول نقل کیا ہے۔

''قلت: وهذا مخالف لعامة المعتبرات من أنه يحل بالإذن'' (ردالمحتار ۱۰/۸۳، زکریا)۔

۳- اور بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر انتفاع کی شرط لگادی گئی تو جائز نہیں، بلا شرط کے جائز ہے۔

(ردالمحتار ۱۰/۸۳، زکریا، فتاویٰ رشیدیہ/۵۲۲، امداد الفتاویٰ ۳/۴۵۹)۔

ب:......اگر بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون ضائع ہوجائے تو دیکھا جائے گا کہ مال مرہون زیادہ قیمت کا ہے، یا دین کی قیمت زیادہ ہے، اگر دونوں کی قیمت برابر ہو تو گویا بائع یعنی مرتہن نے اپنا دین وصول کرلیا، لہٰذا اب مدیون پر کچھ واجب نہ ہوگا، اور اگر دین کی قیمت زیادہ ہو تو زیادتی مرتہن مدیون سے لے گا، اور رہن کی قیمت زیادہ ہو تو بقدر ہلاک یعنی پورا دین ساقط ہوجائے گا، اور رہن کی باقی قیمت مرتہن کے پاس امانت سمجھی جائے گی، مثلاً دین ایک ہزار روپئے ہیں، اور رہن کی قیمت بھی ایک ہزار روپئے ہیں اور رہن ہلاک ہوجائے تو سمجھا جائے گا کہ مرتہن نے

دین وصول کرلیا، اور اگر رہن کی قیمت پانچ سو روپئے ہے تو باقی پانچ سو مرتہن راہن سے لے لے گا، اور اگر رہن کی قیمت پندرہ سو روپئے ہے تو گویا دین تو پورا ساقط ہوگیا، لہذا باقی پانچ سو مرتہن کے پاس امانت ہوں گے۔ (قدوری/ ۸۸، ہدایہ ۴ / ۵۰۲، کفایۃ علی نتائج الافکار تکملہ فتح القدیر ۹ / ۷۵، وھکذا فی الفتاویٰ الہندیہ ۵ / ۴۴۷، وتکملۃ البحر الرائق ۸ / ۲۴۳، ورد المحتار ۱۰ / ۸۰-۸۱، وبدائع الصنائع ۶ / ۱۶۰)۔

ج:......اگر رہن کی مدت ختم ہوجائے اور مشتری وقت مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہوجائے یا ٹال مٹول کرے تو مرتہن رہن کو بیچ کر اپنا دین وصول کرلے، لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لیے جائز نہیں، لہذا اگر شئ مرہون کو بیچنے سے اتنی رقم وصول ہوجائے کہ بائع کے پاس کچھ رقم اپنا دین وصول کرنے کے بعد بھی بچ جائے تو اس رقم کو راہن کو لوٹانا ضروری ہے۔

نیز مرتہن اگر اسلامی حکومت ہو تو قاضی کے سامنے معاملہ پیش کرکے بیع کی اجازت لے کر فروخت کرے گا، بغیر حکومت کی اجازت فروخت نہیں کرے گا، ہاں اگر شئ مرہون کے خراب ہوجانے کا ذرا بھی تاخیر کی وجہ سے سخت اندیشہ ہو تو پھر بلا قاضی کی اجازت کے بھی بیچنا درست ہے۔

(ردالمحتار ۱۰/۱۱۷، الدر المختار مع ردالمحتار ۱۱۸-۱۰/۱۱۷، باب ما یجوز ارتہانہ ومالا یجوز، فقہی مقالات ۱/۸۷، اسلامی فقہ ۴۷۳-۲/۴۷۲)

۹- الف: مبیع کو رہن بنانے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

۱۔ مشتری اپنے قبضہ میں کیے بغیر ہی مبیع کو بائع کے پاس بطور رہن رکھ دے، اس کا حکم تو وہی ہے جو ''حبس المبیع لا ستیفاء الثمن'' کا ہے، لہذا ان دونوں کو آخر میں بیان کیا جائے گا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری پہلے مبیع کو اپنے قبضہ میں لے، اس کے بعد اس کو بائع کے پاس بطور رہن رکھ دے، یہ طریقہ جائز ہے (ھدایہ ۴/۵۱۸، الکنز /۱ ۴۴، کفایہ علی نتائج الافکار ۹۹-۹/۹۸، الدر المختار مع ردالمحتار ۱۱۱-۱۰/۱۱۰، زکریا، ردالمحتار ۱۰/۱۱۱، تکملۃ البحر ۸/۲۵۲، کوئٹہ)۔

اور دوسری صورت یعنی ''ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روک لینا'' تو بیع بالتقسیط میں یہ صورت درست نہیں، کیونکہ بیع بالتقسیط بیع موجل ہے اور ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روکنے کا حق بائع کو صرف بیع حال (نقد بیع) میں ہوتا ہے، بیع موجل میں نہیں (فتاویٰ ہندیہ ۳/۱۵، کوئٹہ البحر ۵/۲۸۰)۔

۱۰- سوال میں مذکور الفاظ ''بائع سامان کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے'' سے معلوم ہوتا ہے کہ تجار کی یہ عادت ہے اور المعروف کالمشروط، لہذا یہ بیع اور بائع کا یہ طریقہ ناجائز ہے، کیونکہ پہلی بیع ہی بشرط فاسد ہے اور بیع بشرط فاسد ربا کے حکم میں ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''یہ شرط فاسد ہے کہ ادنیٰ جزو قیمت رہ جانے پر واپس کرلیں گے اور اداشدہ رقم کو کالعدم سمجھا جاوے گا''

(امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۲۲، احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۱۹، حاشیہ ردالمحتار ۷/ ۲۸۱، زکریا، دیوبند، امداد الفتاویٰ ۳/ ۹۳)۔

اور اس کو تجار کی عادت بھی نہ کہا جائے تب بھی یہ طریقہ ناجائز ہے، کیونکہ اس میں ربا اور قمار دونوں ہیں جن کی حرمت منصوص ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۳/ ۳۵۰)۔

پھر یہ کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل﴾ [نساء/۲۹] (اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ)۔

حضرت ابوحرۃ رقاشی اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ألا لا تظلموا، ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفس منہ'' (مشکوٰۃ/۲۵۵) (توجہ سے سنو کہ ظلم نہ کرو اور کسی آدمی کا مال بغیر اس کی خوشی کے لینا حلال نہیں)۔

بہرحال مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بائع کے لیے یہ طریقہ جائز نہیں اور اس طرح کسی کا مال لینا ہرگز حلال نہیں بلکہ مشتری کو وہ پیسہ واپس کرنا ضروری ہے۔

۱۱- رہن کی یہ شکل بھی جائز ہے، کیونکہ فقہاء نے اگرچہ رہن میں قبضہ کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن صراحت کے ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس شئ مرہون کو راہن مرتہن سے بطور عاریت لے کر اس سے منتفع ہوسکتا ہے اور مرتہن کو یہ حق ہے کہ وہ جب چاہے شئ مرہون کو راہن سے طلب کرلے، اور اگر وہ چیز راہن کے قبضہ میں ہلاک ہوگئی تو اسی کی چیز ہلاک ہوگی (ہدایہ ۴/ ۵۳۰)۔

لیکن یہ صورت اس وقت ہے جب کہ عقد رہن مرتہن کے قبضہ سے مکمل ہوا ہو، اس کے بعد مرتہن نے شئ مرہون راہن کے قبضہ میں دی ہو، لیکن اگر سرے

سے مرہون پر مرتہن کا قبضہ ہی نہیں ہوا، اس کے بعد عاریت پر دے دیا گیا تو عبارات فقہاء سے تو عدم جواز ہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ قبضہ ضروری ہے، لیکن پھر بھی چند وجوہات ایسی ہیں جن سے جواز معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قبضہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ قابض کو اس شئ پر ہر طرح کا اختیار ہو جائے، جیسا کہ "نویں فقہی سیمینار منعقدہ جے پور" (۱۱ تا ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۶ء) کی "بیع قبل القبض" سے متعلق تجاویز کے تیسرے جزئیہ میں اس کی صراحت ہے، لہذا اس کے پیش نظر اس طرح کے رہن کا جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ مرتہن اگرچہ شئ مرہون پر قبضہ نہیں کرتا، لیکن اس شئ کی ملکیتی دستاویزات پر قبضہ کر لیتا ہے جو شئ مرہون پر قبضہ کے قائم مقام ہو سکتا ہے، کیونکہ ان دستاویزات پر قبضہ سے اس کو یہ حق ہو جاتا ہے کہ جب وہ چاہے شئ مرہون کو اپنے پاس منتقل کر لے، نیز ضرورت کے وقت مثلاً وقت مقررہ پر دائن نے قرض ادا نہیں کیا تو مرتہن کو یہ حق ہے کہ وہ شئ مرہون کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے، اور اسی اختیار کا نام قبضہ ہے، اور رہن کا مقصود بھی یہی ہے کہ دائن کے دین کی توثیق ہو جائے اور وہ حاصل ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں عالمی تجارات میں جبکہ بائع اور مشتری الگ الگ شہروں میں بلکہ الگ الگ ملکوں میں مقیم ہوتے ہیں تو شئ مرہون کو منتقل کر کے قبضہ حسی متعذر رہتا ہے جب کہ دستاویزات پر قبضہ کی وجہ سے رہن پر قبضہ سے جو مقصود ہے وہ حاصل ہے، بہر حال قبضہ کی تعریف اور حقیقت کی وجہ سے (جو شئ مرہون پر ہر حال میں مرتہن کو حاصل ہو جاتا ہے) مشتری اور راہن کے پاس بھی شئ مرہون کو رکھا جا سکتا ہے، شرعاً کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

۱۲۔ کفالۃ ایک عقد تبرع ہے اور اسلامی فقہ میں یہ بات معروف و مشہور ہے کہ تبرعات کی اجرت لینا جائز نہیں، جیسا کہ قرض عقد تبرع ہے اور اس پر اجرت وغیرہ لینا جائز نہیں، لہذا کفالۃ پر بھی اجرت لینا جائز نہیں، لیکن چونکہ بنک کو بین الاقوامی تجارات میں اس کی سخت ضرورت رہتی ہے، اس لیے علماء نے اس کی متبادل شکل یہ نکالی ہے کہ:

الف:...... کریڈٹ لیٹر جاری کرنے میں بنک کے جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

ب:...... امپورٹر یا ایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے لیے بنک جو خدمت کرتا ہے اس پر بحیثیت دلال وغیرہ اپنی خدمت پر اجرت مثل کا مطالبہ کرنا بنک کے لیے درست ہے (فقہی مقالات ۱/ ۹۸)۔

۱۳۔ جہاں تک دستاویز اور کاغذات تیار کرنے کی بات ہے جو دین کی توثیق کے لیے ہوتا ہے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے، قرآن حکیم میں فرمایا:

"يأأيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه" (البقرہ/ ۲۸۲)۔

(اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو) (معارف القرآن)۔

رہی بات اس دستاویز کی خرید و فروخت کی (دستاویز کی خرید و فروخت کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بائع جو اصل دائن اور حامل دستاویز ہے وہ بعض اوقات یہ دستاویز تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور ثمن اس دستاویز پر تحریر شدہ دین سے کم طے پاتی ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بائع کو معین تاریخ سے پہلے رقم وصول ہو جائے، اور وہ تیسرا شخص اکثر حالات میں بینک ہوتا ہے۔ بینک اس دستاویز پر تحریر شدہ رقم میں سے فیصد کے اعتبار سے کٹوتی کر کے باقی رقم حامل دستاویز کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اس کو Discounting of the Bill (بل کی کٹوتی کہا جاتا ہے) تو یہ دو وجہوں سے ناجائز ہے:

۱۔ اس لیے کہ یہ دین کی بیع اس شخص سے کی جا رہی ہے جس پر دین نہیں، جس کو فقہاء کی اصطلاح میں "بيع الدين من غير من عليه الدين" کہا جاتا ہے (رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۳۳)۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ کرنسی کی بیع کرنسی سے ہو رہی ہے جس میں ربا فضل اور ربا نسیئہ دونوں پائے جا رہے ہیں، جن کی حرمت منصوص ہے، ان دو وجہوں سے دستاویز کی بیع و شراء ناجائز اور حرام ہے۔

البتہ فقہاء نے اس کے اندر تھوڑی سی تبدیلی کر کے جواز کا حکم لگایا ہے۔ وہ تبدیلی یہ ہے کہ اولاً حامل دستاویز اس تیسرے شخص بنک وغیرہ کو مدیون سے اپنا دین وصول کرنے کا وکیل بنا دے اور اس وکالت پر کچھ اجرت بھی دے دے، اس کے بعد دوسرا معاملہ یہ کرے کہ حامل یعنی دائن دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے مطابق بینک سے قرض لے لے، اور بینک کو اس کا اختیار دے دے کہ جب مشتری سے قرض وصول ہو جائے تو وہ اس رقم سے اپنا قرض وصول کر لے، گویا یہاں دو معاملے الگ الگ ہو گئے۔ ایک وکالت اور اس پر اجرت کا اور دوسرا قرض کا، اور یہ دونوں معاملے شرعاً درست ہیں۔

(احسن الفتاوی ۷/ ۱۷۶، فقہی مقالات/ ۹۹)۔

۱۴- "وضع وتعجل" کا یہ معاملہ کہ دائن کی طرف سے ترک حصہ دین ہو اور مدیون کی طرف سے اسقاط اجل، تو یہ معاوضہ ہے، اور موجب ربا ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ چنانچہ امام محمدؒ حضرت زید بن ثابتؓ کا اثر نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"قال محمد: وبهذا نأخذ من وجب له دين على إنسان إلى أجل فسأل أن يضع عنه ويعجل له ما بقي لم ينبغ ذلك. لأنه يعجل قليلا بكثير دينا فكأنه يبيع قليلا نقدا بكثير دينا، وهو قول عمر بن الخطاب و زيد بن ثابت و عبد الله بن عمر رضي الله عنهما وهو قول أبي حنيفة" (مؤطا امام محمد/۳۳۴، باب الرجل يبيع المتاع وغيره نسيئة ثم يقول انقدني وأضع عنك، رد المحتار على الدر المختار ۸/۲۲-۴۲۱، زکریا بک ڈپو دیوبند "فصل فی دعوی الدين"، ہدایہ ۳/۲۳۵، عنایہ و کفایہ علی ہامش الافکار ۷/۹۶-۳۹۶، بدائع الصنائع ۶/۴۵، احکام القرآن للجصاص، آیت ربا۔ بحوالہ فقہی مقالات/۱۱۴)۔

۱۵- "وضع وتعجل" کی ممانعت صرف دیون مؤجلہ میں ہے، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ جہاں تک دیون حالۃ کا تعلق ہے (یعنی جن کی ادائیگی کے بارے میں عقد کے اندر کسی مدت کو متعین نہیں کیا گیا) تو ایسے دیون میں دین کے کچھ حصہ کے چھوڑنے پر صلح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ جائز ہے۔ اور فرق دیون مؤجلہ وحالۃ میں یہ ہے کہ دین حال میں مدت کی شرط نہیں ہوتی اور تاخیر مدیون کا حق نہیں ہوتا، تو چونکہ اس میں مدت نہیں ہوتی، اس لیے یوں نہیں کہا جاسکتا کہ دین کا جو حصہ معاف کر دیا گیا ہے وہ مدت کے عوض میں ہے۔ لہٰذا یہاں "اعتیاض عن الأجل" نہیں پایا گیا جو حرام ہے۔
(ہدایہ وحاشیہ ۳/۲۳۵، ھکذا فی الکنز/۳۳۶، والبحر الرائق ۷/۲۵۹، ہندیہ ۴/۲۳۱، رد المحتار زکریا ۸/۴۲۲)۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ قرض حنفیہ کے نزدیک مؤجل نہیں ہوتا، جب کہ قدوری میں ہے:

"وكل دين حال إذا أجله صاحبه صار مؤجلا إلا القرض، فإن تأجيله لا يصح" (قدوری/۸۱)

لہٰذا قرض دیون حالہ میں سے ہے۔ اور دیون حالہ میں "ضع وتعجل" جائز ہے۔ چنانچہ قرض کے سلسلہ میں "ضع و تعجل" کا جواز اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے جس کو امام بخاریؒ نے "کتاب الخصومات" میں نقل کیا ہے: واقعہ یہ ہوا کہ حضرت کعب بن مالکؓ کا حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمیؓ پر قرض تھا، جب حضرت کعبؓ کی ان سے ملاقات ہوئی تو ان کو پکڑ لیا اور قرض پر دونوں کی آواز بلند ہوگئی، اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے، آپ کو ان کی گفتگو کا علم ہوا تو آپؐ نے کعبؓ کو مخاطب کر کے ہاتھ سے اس طرح اشارہ فرمایا گویا آپ فرما رہے ہوں کہ نصف قرض لے لو اور نصف چھوڑ دو، چنانچہ حضرت کعبؓ نے ایسا ہی کیا۔ (بخاری شریف ۱/۳۲۷)۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"فقال أهل العلم في التطبيق بينه و بين هذه الآثار: إن الآثار في المؤجل. وهذا في الحال، وفي كتاب الرحمة: اتفقوا على أن من كان له دين على إنسان إلى أجل، فلا يحل له أن يضع عنه بعض الدين قبل الأجل ليعجل له الباقي... على أنه لا بأس إذا حل الأجل أن يأخذ البعض ويسقط البعض"
(المسوی علی المصفی شرح الموطا للإمام مالک ۲/۳۸۲، بحوالہ فقہی مقالات/۱۱۱)۔

۱۶- بیع بالتقسیط میں اگر بائع یہ شرط لگاتا ہے کہ اگر مشتری مقررہ وقت پر کوئی قسط ادا نہ کر سکا تو مہلت کا معاملہ ختم کر دیا جائے گا، اور آئندہ کی باقی اقساط بھی فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا، تو اس قسم کی شرط لگانا صحیح اور بائع کے لیے درست ہوگا کہ وہ فی الحال پوری قیمت کا مطالبہ کرے۔
(در مختار مع الرد المحتار ۷/۵۴، بدائع الصنائع ۶/۴۵، البحر الرائق ۵/۲۸۰)۔

۱۷- اس میں دو مسئلے ہیں:
۱- دائن کے مرجانے سے بیع بالتقسیط کے معاملہ میں کچھ فرق آئے گا یا نہیں؟ ۲- مدیون کی موت سے اس معاملہ میں فرق آئے گا یا نہیں؟۔

تو اس سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ دائن کی موت سے تو اس بیع بالتقسیط کے معاملہ میں کوئی فرق نہیں آئے گا، ہاں البتہ مدیون کے سلسلہ میں حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے دین مؤجل فوراً واجب الاداء ہو جاتا ہے۔
(البحر الرائق ۵/۲۸۰، رد المحتار علی الدر المختار ۷/۳۸۷، زکریا دیوبند، رد المحتار ۱۰/۴۸۹)۔

لیکن بعض علماء نے فرمایا ہے کہ مدیون اگر مرجائے تو اس کا دین بھی مؤجل کرنے سے مؤجل ہو جاتا ہے۔

فائدہ:

مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر چہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے دین مؤجل حال ہوجاتا ہے، لیکن ''بیع بالتقسیط'' اور ''مرابحہ مؤجلہ'' (جن میں مدت کے مقابلہ میں بھی ثمن کا کچھ حصہ ہوتا ہے) میں فوری واجب الاداء کا قول اگر اختیار کیا جائے تو اس صورت میں ورثاء کا نقصان ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ دو قولوں میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرلیا جائے، یا تو متاخرین حنفیہ کا یہ قول لے لیا جائے کہ اداء دین کی جو مدت متفق علیہ تھی اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے اس وقت کے مقابلہ میں جتنا ثمن آتا ہو وہ ساقط کردیا جائے، اور مدیون کے ترکہ میں سے صرف وہ ثمن وصول کرلیا جائے جو ایام گزشتہ کے مقابلہ میں آتا ہو۔

یا پھر حنابلہ کا قول اختیار کرلیا جائے کہ جس طرح وہ دین مؤجل تھا اب بھی مؤجل ہی رہنے دیا جائے، البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دین کی توثیق کردیں۔ شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ مناسب ہو، اس لیے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں تذبذب کی جو صورت ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے صورۃً سودی معاملات سے مشابہت ہوجاتی ہے وہ تذبذب اس صورت میں نہیں پایا جاتا۔

حنابلہ کے مذکورہ بالا قول کی طرح کا قول کچھ علماء حنفیہ کا بھی ہے، مثلاً صاحب محیط و قاضیخاں وغیرہ، جیسا کہ رد المحتار سے معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اگر یہ قول اختیار کیا جائے تو حنفیہ ہی میں سے بعض کا قول اختیار کرنا ہوگا۔ جس کی ورثاء کے نقصان کی صورت میں گنجائش نکل سکتی ہے۔

۱۸- اگر اس انعام کی صورت میں خریدار کا روپیہ ضائع ہونے کی کوئی صورت نہ ہو، قیمت بھی پوری تمام اقساط کی ادا کرے، اور انعام نکلنے پر بقیہ قیمت ساقط ہونے کا کوئی اندیشہ بھی نہ ہو تو گنجائش ہے، ورنہ نہیں (فتاویٰ محمودیہ ۱۳ / ۳۵۷)۔

۱۹- یہ معاملہ اور اسکیم سود اور قمار پر مشتمل ہے، لہٰذا حرام ہے، کیونکہ اس طرح خریدار کو پوری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اور انعام نکلنے پر بقیہ قیمت ساقط ہوجاتی ہے، لہٰذا یہ معاملہ جائز نہیں، چنانچہ حضرت اقدس مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں:

''بلا شبہ مذکورہ اسکیم اور معاملہ سود اور قمار پر مشتمل ہے، لہٰذا حرام ہے، یہ اسکیم چلانا اور شرکت کرنا جائز نہیں'' (فتاویٰ رحیمیہ ۶ / ۱۴۲)۔

☆☆☆

ثمن کی زیادتی مدت کے عوض میں

مولانا محمد ابوبکر قاسمی[۱]

۱- ادھار فروختگی کی وجہ سے ثمن میں اضافہ:

اس سلسلہ میں قدیم وجدید دونوں قسم کے فقہاء نے بحث کی ہے، چنانچہ بعض فقہاء ادھار فروختگی میں ثمن کی زیادتی کو ناجائز کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس صورت میں ثمن کی زیادتی مدت کے عوض میں ہے، اور جو ثمن مدت کے عوض میں دیا جائے وہ سود ہے، یا کم از کم سود کے مشابہ ضرور ہے، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں حضرت زین العابدین علی بن الحسین، ناصر، منصور باللہ اور ہادویہ کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے (نیل الاوطار ۵ / ۱۷۲)۔

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ میں قیمت زیادہ مقرر کرنا جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین عقد بیع کے وقت ہی بیع کے مؤجل وادھار ہونے کے سلسلہ میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہوجائیں (ترمذی کتاب البیوع باب ۱۸، حدیث ۱۳۳۱، ج ۱/ص، فتاوی عالمگیری ۳ / ۲/۷، فتح القدیر ۵ / ۸۴، بحوالہ فتاوی عبدالحئی ۶/ ۲۷۶، واحسن الفتاوی ۷ / ۳۴، کفایت المفتی ۸ / ۳۰، تحفۃ الاحوذی ۴ / ۴۲۹، فقہ السنۃ ۳ / ۷۳، ہدایہ ۳ / ۷۶، مبسوط ۱۳ / ۸/۷، ملاحظہ ہو: المغنی لابن قدامہ ۴ / ۱۷۷، الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳ / ۵۸، ومغنی المحتاج للشربینی ۲ / ۳۱، فقہی مقالات ۱ / ۸۳، ۸۴)۔

۲- کیا ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری ہے؟

ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر عاقدین نے اتفاق رائے سے ادھار قیمت کو قسطوں پر ادا کرنے کا معاہدہ کرلیا ہو، مثلاً خرید کردہ مال کی قیمت دس ہزار ہے دس قسطوں میں یعنی ہر ماہ کے آغاز میں ایک ہزار کی ایک قسط کے حساب سے ادائیگی کا معاملہ طے ہوجاتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ ہر قسط کی رقم کی تعیین کے ساتھ ادائیگی کی مدت بھی متعین کردی گئی ہو، اور اگر قسط کی رقم یا ادائیگی کی مدت مجہول ہوگی تو بیع بھی شرعاً فاسد ہوگی۔

(فتاوی عالمگیری ۳ / ۳، درمختار علی ہامش ردالمحتار ۴ / ۲۶)۔

۳- ادھار بیع میں نقد وادھار دونوں طرح کی قیمت کا ذکر کرنا:

ادھار فروختگی کی صورت میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے یہ ضروری ہے کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے اور اسی پر معاملہ کو طے کرلیا جائے۔

(فتاوی عالمگیری ۳ / ۱۳۶، البنایہ ۳ / ۱۶)۔

۴- کیا ادھار فروختگی کی صورت میں مال کی زیادہ قیمت مقرر کرنا ربا ہے؟

نقد فروختگی کے مقابلہ میں ادھار فروختگی کا معاملہ طے کرتے ہوئے قیمت زیادہ مقرر کرنا ہرگز ربا کے دائرہ میں نہیں آتا اگرچہ زائد قیمت وقت کے عوض ہی میں کیوں نہ ہو، کیونکہ وقت ومدت کی حیثیت بیع کے باب میں تابع کی ہوتی ہے، اصل کی نہیں، ہاں مبیع کی حیثیت اصل کی ہوتی ہے، اور درحقیقت مبیع ہی کی بیع ہوتی ہے، اور ضمناً اسی کے تابع ہوکر مدت کی وجہ سے قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے، ورنہ الگ سے مدت کی وجہ سے اس کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں ہوتی،

(البحر الرائق ۶ / ۱۲۵، ہدایہ ۳ / ۵۸، قواعد الفقہ ۱۶ / ۲۰، مقالات ۱ / ۸۴)۔

۵- ادھار فروختگی کی صورت میں مدت بڑھانے کے سبب قیمت میں کمی کرنا:

شرعاً معاملہ کی یہ شکل جائز ہے (کفایت المفتی ۸ / ۳۱، ہدایہ ۴ / باب الکراہیۃ ۴۵۵)۔

۶- مبیع کی قیمت متعینہ مدت میں ادا نہ کرنے پر اضافہ کی شرط لگانا:

---

[۱] استاذ حدیث وفقہ مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھرواره، دربھنگہ

شرعاً یہ سود ہے جس کی ہرگز گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں مدت کو مستقل حیثیت دے کر اس کا عوض لیا جارہا ہے، جو شرعاً حرام ہے۔

(حاشیہ ہدایہ ۳/ ۵۸، موطا امام مالک ما جاء فی الربا فی الدین/ ۲۷۹)۔

۷- ادھار بیع میں وقت مقررہ پر ثمن ادا نہ کرنے کے سبب مزید رقم واجب کرنا:

شرعاً اس طرح کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ مزید رقم جرمانہ اور مالی تاوان تو ہے ہی، اس کے علاوہ سود کی تعریف بھی اس پر صادق آرہی ہے۔

(حاشیہ ہدایہ باب الربا ۲، ۳/ ۶۱)۔

نیز اس طرح کا جرمانہ عائد کرنا سراسر ظلم ہے، کیونکہ خریدار کے قیمت ادا نہ کرنے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو وہ تنگدست ہے جس کے سبب سامان کی قیمت یکمشت یا قسط وار نہیں ادا کر پارہا ہے، یا وہ تنگدست تو نہیں ہے لیکن خواہ مخواہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے، اب اگر وہ تنگدست ہے، تو قرآن پاک کی تصریح کے مطابق بائع کی طرف سے ادائے ثمن میں مہلت دیا جانا واجب ہے، کیونکہ باری تعالی کا ارشاد ہے:

"وإن کان ذو عسرة فنظرة إلی میسرة" (سورہ بقرہ/ ۲۸۰)۔

اگر ایسی صورت میں بائع اس پر ثمن نہ ادا کرنے کی وجہ سے مزید کچھ رقم لازم کرے گا تو یہ سراسر ظلم ہوگا، نیز اس اضافے کے سود ہونے میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے، نیز ادائے دین میں مہلت دے کر اس کے عوض لینے کو حضرات فقہاء نے حرام قرار دیا ہے۔ (ہدایہ ۳/ ۲۳۵)

اور اگر خریدار ادائے ثمن میں تاخیر لاپرواہی اور ٹال مٹول کی وجہ سے کرتا ہے تنگدستی کی وجہ سے نہیں کرتا ہے، تو یقیناً خریدار کے اس عمل سے بائع کو ضرر عظیم لاحق ہوگا، تاہم لوگوں میں دینی واخلاقی اقدار کی کمی کی وجہ سے ٹال مٹول کی بیماری عام ہوگئی ہے، جو یقیناً ظلم ہے، چنانچہ حضور اکرم کا ارشاد ہے: "مطل الغني ظلم" (صحیح بخاری باب الاستقراض ۱/ ۳۲۳)۔ اور اس صورت میں ٹال مٹول کرنے والا شخص سزا پانے اور بے آبرو ہونے کے لائق ہوجاتا ہے اور ایسے شخص کا شرعاً بائیکاٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ابن ماجہ میں حضور اکرم کا یہ ارشاد منقول ہے: "لي الواجد یحل عرضه وعقوبته" (ابن ماجة ابواب الأحکام باب الحبس في الدین/ ۲، حدیث ۲۴۵۲) (مالدار کا ٹال مٹول کرنا اس کی آبرو کو حلال کردیتا ہے)، لیکن دور حاضر میں معاشرہ کے نظام کے درہم برہم ہوجانے کے سبب کسی شخص کو سزا دینا یا اس کا بائیکاٹ کرنا آسان نہیں ہے، اگر اس پر ثمن کے علاوہ مزید کچھ رقم کی ادائیگی یوں ہی متعین کرکے یا فیصد کے حساب سے بطور جرمانہ لازم کردی جائے تو اس پر عمل تو ممکن ہے لیکن شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے، جن احادیث سے جواز معلوم ہوتا ہے ان سب کو حضرات محدثین وفقہاء رحمہم اللہ تعالی نے منسوخ قرار دیا ہے۔

(احسن الفتاوی ۵/ ۵۵۶، رد المحتار ۳/ ۱۹۶)۔

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ ادائے ثمن میں تاخیر کرنے والوں پر مالی معاوضہ لازم کرنے کی تجویز بھی شرعاً درست نہیں ہے، البتہ بعض علماء نے اسی کی دوسری صورت یہ تجویز کی ہے کہ معاہدہ بیع کے وقت بائع مشتری سے اس بات کا عہد لے لے کہ اگر خریدار نے ثمن کی ادائیگی میں تاخیر وکوتاہی کی تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ ثمن کے تناسب سے ایک معین رقم خیراتی کاموں میں بطور تبرع خرچ کرے گا، اور یہ رقم پہلے وہ بائع کو ادا کرے گا اور پھر بائع خریدار کی طرف سے نیابۃً اس رقم کو خیراتی کاموں میں لگادے گا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں مذکورہ رقم نہ بائع کی ملک ہوگی، اور نہ ہی اس کی آمدنی اور منافع کا حصہ ہوگی، بلکہ خیراتی کاموں میں صرف کرنے کے لیے بطور امانت اس کے پاس وہ رقم محفوظ رہے گی۔ مندرجہ بالا تجویز خریدار کے لیے ادھار ثمن کے وقت پر ادا کرنے کے سلسلہ میں بہترین دباؤ ہے، اور توقع ہے کہ یہ تجویز ٹال مٹول کے سد باب کے لیے مالی معاوضہ والی تجویز کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر ہوگی، نیز بطور تبرع جو رقم خریدار پر لازم کی جائے گی اسے شرعاً سود بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اس رقم کا مالک بائع نہیں ہوگا، نیز اس تبرع والی رقم کے لازم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ رقم ادھار ثمن کے متناسب حصے کے برابر فیصد کے حساب کے متعین ہو یا یونہی ایک رقم متعین کرلی جائے تاکہ خریدار وقت پر ادھار ثمن کے ادا کرنے کا پابند ہوجائے۔

(تحریر الکلام/ ۱۷۶ بحوالہ فقہی مقالات ۱/ ۱۳۱)۔

یاد رہے کہ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ حضرات فقہاء مالکیہ کے قول کے مطابق ہے، لیکن جہاں تک حضرات حنفیہ کی تصریحات کا تعلق ہے تو اگرچہ ان کے نزدیک عام طور سے وعدہ قضاءً لازم نہیں ہوگا، البتہ بعض دعوے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہوجاتے ہیں۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ۴/ ۲۷۵ باب الصرف قبیل کتاب الکفالة)۔

لہٰذا ادھار بیع میں ثمن کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے کو روکنے کی غرض سے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے مندرجہ بالا تبرع کو سوالنامہ کی درج شدہ

صورت میں لازم قرار دینے کی گنجائش ہے (مستفاد از فقہی مقالات ۱/ ۱۳۳)۔

۸- ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے کوئی مال رہن رکھوانا:

شرعاً ایسا کرنا جائز ہے (خانیہ علی ہامش الہندیہ ۳/ ۵۹۶)۔

الف:...... مفتی بہ قول کے مطابق بائع کا مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اس سلسلے میں مسالک فقہاء اور ان کے دلائل کی تفصیل کے لیے۔ دیکھئے: (ہدایہ ۴/ ۵۰۶، بدائع الصنائع ۶/ ۱۶۴، مجمع الأنہر ۲/ ۶۰۶، ردالمحتار ۵/ ۳۴۳، ۳۴۳، الأشباہ والنظائر ۱۶۰، فتاوی سراجیہ ۱۸۸ بحوالہ بحث ونظر شمارہ ۲۵، شرح معانی الآثار ۲/ ۲۳۱، نصب الرایۃ ۴/ ۶۰ حدیث: ۴، ۲ مجموعہ فتاوی عبدالحیٔ/ ۳۰۱، امداد الفتاوی ۳/ ۵۴۳ ۴، کفایت المفتی ۸/ ۱۳۳)۔

ب:...... حضرات فقہاء کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مال مرہون کی قیمت دین کے برابر ہو یا زیادہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں دین ساقط ہو جائے گا، اب نہ بائع مشتری سے ثمن کا مطالبہ کرے گا اور نہ مشتری اپنے مال مرہون کا، اور اگر مال مرہون کی قیمت دین سے کم ہو تو مال مرہون کی قیمت کے بقدر دین ساقط ہو جائے گا، اور جو اس سے زائد دین ہوگا وہ بائع مشتری سے وصول کرے گا (مستفاد از بہشتی زیور پانچواں حصہ صفحہ ۵۷، فتاوی ہندیہ ۵/ ۴۴۷)۔

ج۔ اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کے کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بائع خریدار کو مجبور کرے گا کہ وہ مال مرہون کو فروخت کر کے قیمت ادا کرے، اور خریدار مال مرہون کو فروخت نہ کرے تو قاضی خریدار کا نائب بن کر مال مرہون کو فروخت کر دے گا، اور خود بائع کے لیے بغیر خریدار کی اجازت کے مال مرہون کو بیچنا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کا مالک نہیں ہے (درمختار مع ردالمحتار ۵/ ۳۵۹)۔

اور اگر رہن رکھتے ہی وقت بائع نے مشتری سے کہہ دیا کہ اگر تم نے وقت مقررہ پر قیمت ادا نہیں کی تو مجھے مال مرہون کو فروخت کر کے قیمت وصول کر لینے کا وکیل بنا دو، اور خریدار نے اس کو قبول کر لیا تو وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں خود بائع کو خریدار کا وکیل بن کر مال مرہون کو بیچ سکتا ہے، اور پھر اپنی رقم وصول کر سکتا ہے، اور اگر اس درمیان میں خریدار بائع کو وکالت سے معزول کرنا چاہے تو اس کو ہٹانے کا اختیار نہیں ہوگا (شامی ۵/ ۳۵۸)۔

اور عقد بیع کے وقت مبیع کی جو قیمت مقرر ہوئی تھی بائع کو اسی قدر لینے کا اختیار ہوگا، اس سے زیادہ وہ نہیں لے سکتا، اور مال مرہون کو فروخت کرنے کے بعد مقررہ قیمت سے جو زائد رقم ہو بائع پر ضروری ہوگا کہ وہ اسے خریدار کو لوٹا دے اور مقررہ قیمت زیادہ ہو اور مال مرہون کی قیمت کم ہو تو مشتری سے اپنی مقررہ قیمت کا بقیہ وصول کر لے گا (الدر المختار مع الرد ۵/ ۳۶۲)۔

۹- قیمت کی وصولیابی کے لیے مبیع کو محبوس رکھنا:

ثمن کی وصولیابی کی غرض سے نقد بیع میں مبیع کو روکا جا سکتا ہے، لیکن ادھار بیع میں مبیع کو نہیں روکا جا سکتا، البتہ اگر مبیع پر مشتری نے قبضہ کر لیا تو بائع اسے اپنے پاس رہن رکھ سکتا ہے، لیکن اگر قبضہ نہیں کیا ہے تو بائع مبیع کو اپنے پاس نہ رہن رکھ سکتا ہے اور نہ ہی ثمن کی وصولی کے لیے ادھار بیع میں مبیع کو روک سکتا ہے (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵، درمختار ۵/ ۳۵۴)۔

۱۰- اقساط ادا نہ کرنے کی صورت میں مبیع پر قبضہ کا حکم:

بائع کا مبیع کو رکھنے کے ساتھ اس کی ادا شدہ قیمت کی قسط کو مفت میں رکھ لینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اور حدیث نبوی میں اس کی ممانعت وارد ہے:

''نهى رسول الله عن بيع العربان. قال أبو عبد الله: العربان أن يشترى الرجل دابة بمائة دينار فيعطيه دينارين عربونا فيقول: إن لم أشتر الدابة فالدينار ان لك'' (ابن ماجہ شریف حدیث ۲۲۱۱، ۱/ ۱۵۸)

''قال فى هامش ابن ماجة: نهى عن بيع العربان: وهو أن يشترى السلعة ويعطى البائع درهما أو أقل أو اكثر على أنه إن تم البيع حسب من الثمن وإلا لكان للبائع ولم يرجعه المشتري وهو بيع باطل لما فيه من الشرط والغرر وأجازه أحمد'' (حاشیہ ابن ماجہ ۴، ۱۵۸/ ۱)

''وجاء فى حجة الله البالغة للشاه ولى الله المحدث الدهلوى: نهى عن بيع العربان أن يقدم إليه شئ من الثمن فإن اشترى حسب من الثمن وإلا فهو له مجانا وفيه معنى الميسر'' (حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۰۸)۔

۱۱- خریدکردہ سامان کوخریدار کے پاس رکھ کر رہن قرار دینا:

دور حاضر میں رہن کی ایک نئی قسم کا رواج ہے جس کی رو سے خریدکردہ سامان خود خریدار کے پاس رہتا ہے، اور وہی اس کو استعمال کرتا رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس سامان کو رہن قرار دیا جاتا ہے اور اس میں تصرف کرنے اور اس کو فروخت کرنے کا پورا اختیار بائع کو ہوتا ہے، جس کے حق کے سبب اس مال کو رہن رکھا گیا ہے، اب ایسی صورت میں اس سامان کو شرعاً رہن کہا جائے گا یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں سرسری نگاہ سے حضرات فقہاء کے کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ سامان کو رہن نہ قرار دیا جائے، کیونکہ اکثر فقہاء نے رہن کے صحیح ہونے کے لیے شیٔ مرہون پر مرتہن کے قبضہ کی شرط لگائی ہے جس کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیت ہے: "فرهان مقبوضة"۔

قرآن پاک کی آیت "فرهان مقبوضة" کے پیش نظر رہن کی مذکورہ صورت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ شیٔ مرہون پر مرتہن نے قبضہ نہیں کیا، اس لیے شرعاً اس رہن کو درست نہ ہونا چاہیے، لیکن ظاہر ہے کہ کسی سامان پر بائع یا مشتری کے قبضہ کے تحقق کے لیے حسا قبضہ مشروط نہیں ہے، بلکہ کسی سامان پر جس طرح حسی قبضہ سے قبضہ تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرح قبضہ حکمی کا بھی حضرات فقہاء نے اعتبار کیا ہے، بلکہ فقہاء احناف کے نزدیک تخلیہ اور رفع موانع سے بھی قبضہ ہوجاتا ہے، چنانچہ "الموسوعه الفقهيه" میں احناف کی ظاہر روایت کے مطابق قبضہ کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے:

"اعتبروا التخلية وهي رفع الموانع والتمكين من القبض قبضاً حكمياً على ظاهر الرواية" (الموسوعة الفقهية ۹/۱۳۴)

اور بدائع میں لکھا ہے: "لاخلاف بين أصحابنا في اصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال" (بدائع الصنائع ۵/۲۴۴)۔

مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ رفع موانع سے بھی قبضہ ہوجاتا ہے، لہذا جب مشتری نے بائع کو مبیع پر قابض ہونے کے بعد تصرف کا اختیار دے دیا، اور مبیع اگرچہ بظاہر مشتری کے پاس ہے، لیکن اس میں فروخت وتصرف کا حق بائع کو حاصل ہے، خود مشتری کو یہ حق حاصل نہیں ہے، اس لیے اس صورت میں مبیع پر بائع کا حکماً قبضہ تسلیم کرتے ہوئے اسے رہن قرار دینے کی شرعاً گنجائش ہے، چنانچہ دور حاضر کے فقہاء میں حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی یہی رائے ہے، اس سلسلہ میں مکمل تفصیل حضرت مولانا موصوف کی کتاب "فقہی مقالات" (جلد اول ۹۲ تا ۹۴) میں ملاحظہ فرمائیے، اور اس مسئلہ کی نظیر ہدایہ وغیرہ کتب فتاوی کا وہ مسئلہ ہے جس میں اس بات کی صراحت ہے کہ مرتہن اگر مال مرہون راہن کو بطور عاریت دے دے تب بھی وہ مال رہن رہتا ہے، اور راہن اگر انتقال کرجائے تب بھی مرتہن کے لیے یہ حق باقی رہتا ہے کہ وہ اس مال سے اپنا دین وصول کرلے، چنانچہ "ہدایہ" میں ہے:

"ألا ترى أنه لو هلك الراهن قبل أن يرده على المرتهن كان المرتهن أحق به من سائر الغرماء" (ہدایہ ۴/۵۳۰)

۱۲- دین کی توثیق کے لیے گارنٹی کی جائز صورتیں اوران پر اجرت کا لینا:

کفیل جو لیٹر آف کریڈٹ جاری کرتا ہے اس پر اس کے کچھ اخراجات ہوتے ہیں، نیز کفیل جو بائع کا دین مشتری سے لے کر ادا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، تو اس سلسلہ میں اس کو بحیثیت وکیل یا بحیثیت دلال یا درمیانی ہونے کی حیثیت سے سعی وکوشش اور اجیر رکھ کر دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے جس کا مطالبہ وہ اصیل سے کرتا ہے یا کبھی وہ بائع سے کرتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے اور اسی کو عرف میں کفالت کی اجرت کہا جاتا ہے، اور اس کے جواز کا فتوی مولانا تقی عثمانی صاحب نے بھی (فقہی مقالات ۱/۹۸) پر دیا ہے، لیکن اگر کفالت کی اجرت کا مطلب یہ ہو کہ کفیل اصیل ومکفول عنہ اور مکفول لہ کے درمیان سعی وکوشش تو نہ کرے، البتہ تبرعاً کفیل کی جانب سے مکفول لہ کا دین ادا کرے اور اس کی اجرت کفیل سے یا مکفول لہ سے طلب کرے تو شرعاً یہ جائز نہیں ہے، اور کفالت کی اجرت کا یہی مفہوم مراد لے کر حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب نے (فقہی مسائل جلد اول/ص ۹۶ و ۹۷) میں کفالت کی اجرت کے ناجائز ہونے کے سلسلہ میں طویل بحث کی ہے۔

۱۳- دین کے دستاویز کی خرید وفروخت کا شرعی حکم:

دین کی دستاویز کی خرید وفروخت کم قیمت میں شرعاً جائز نہیں ہے (درمختار ۴/۱۵، اعلاء السنن ۱۴/۲۴۴)، البتہ اگر بائع چاہتا ہے کہ اس کا دین حاصل ہو تو وہ کسی شخص کو دستاویز دے کر اس کو خریدار سے دین وصول کرنے کا وکیل بنادے، اور دین وصول کرنے کی اجرت کے طور پر اس وکیل کے لیے کچھ رقم طے کرلے اور اجرت میں طے شدہ رقم کے علاوہ جتنی رقم دین کی دستاویز میں درج ہو اس کو وکیل سے بطور قرض لے لے، لیکن اس صورت میں اگر وکیل کو خریدار سے دستاویز میں لکھی ہوئی دین کی رقم وصول نہ ہو تو وہ بائع (موکل) سے اپنے قرض کا مطالبہ کرسکتا ہے (احسن الفتاوی/۶/۱۷ جلد ہفتم، امداد الفتاوی ۳/۲۲، ۳ فقہی مقالات ۱/۹۹)۔

۱۴- دھار خرید وفروخت میں مقررہ وقت سے پہلے رقم ادا کرنے پر کچھ معاف کر دینا:

جس طرح طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے آگے بڑھانے پر زیادتی کا مطالبہ کرنا ناجائز ہے، اسی طرح ادھار بیع میں بائع کا طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگنا کہ اس کا ایک حصہ کم کردیں گے شرعاً سود اور ناجائز ہے، البتہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے تو اس وقت تھوڑا دین وصول کرلے اور باقی کو معاف کردے تو یہ شرعاً درست ہے، اسی طرح تعجیل کی صورت میں بلا شرط کے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا جائز ہے، نیز نقد بیع میں بھی ثمن میں کمی کردینا جائز ہے۔اس سلسلے میں صحابہ، تابعین اور ائمہ کرام کے اقوال اور دلائل کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (موطا امام مالک ۲۷۸-۲۷۹، موطا امام محمد ۳۳۴، شرح السیر ۱۴۱۲/۴، المسوی علی المصفی ۲/ ۳۸۲، احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۷، بدائع الصنائع ۶/ ۴۵، ہدایہ ۳/ ۲۳۵، درمختار ۴/ ۵۳۴، احسن الفتاوی ۷/ ۱۸۰)۔

۱۵- ادھار بیع میں دین مطلق کے نقد ادا کرنے پر کچھ کمی کر دینا:

شرعاً بیع کا یہ معاملہ فاسد ہوا، جس کا ختم کردینا ضروری ہے، لہذا بیع کے اس معاملہ میں دین مطلق کے نقد ادا کرنے سے کچھ کمی کرنے اور چھوڑ دینے کا سوال نہیں پیدا ہوتا (فتاوی عالمگیری ۳/ ۳، حاشیہ ہدایہ باب الصلح فی الدین ۳/ ۲۳۵، بدائع الصنائع ۶/ ۴۴)۔

البتہ اگر بیع مطلق ہو اور ادائے ثمن کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا، اور اس صورت میں بائع نے مشتری سے کہا کہ اگر نقد ثمن ادا کردو تو مقررہ ثمن میں کچھ کمی کر دی جائے گی تو شرعاً اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے، کیونکہ مطلق بیع میں ثمن کی ادائیگی فی الحال واجب ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ فوری ادائیگی والے دیون میں وضع و تعجیل کے اصول کو نافذ کرنا یعنی دین کے کچھ حصہ کو چھوڑنے پر صلح کرنا جائز ہے (حاشیہ ہدایہ باب الصلح فی الدین ۳/ ۲۳۵، بدائع الصنائع ۶/ ۴۴، ہدایہ ۳/ ۶۰)۔

۱۶- کسی قسط کی ادائیگی میں تاخیر کرنے پر مہلت کے معاملہ کو ختم کر دینا:

''بیع بالتقسیط'' میں طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کر دینا اور فوری طور پر مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ودرست ہے (خلاصة الفتاوی کتاب البیوع ۳/ ۵۴، ملاحظہ ہو الفوائد الخیریة علی جامع الفصولین ۲/ ۴، مطبوعہ مصر، الدر المختار مع الشامی ۴/ ۲۶، بدائع ۶/)

۱۷- بیع بالتقسیط میں مقررہ وقت سے پہلے فریقین میں سے کسی ایک کا مر جانا:

حضرات فقہاء کی تصریحات کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دائن کے انتقال کرنے کی صورت میں تو بیع بالتقسیط میں قسطوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں معاملہ طے شدہ تفصیل کے مطابق باقی رہے گا، اور مدیون علی حالہ قسط وار دین ادا کرتا رہے گا، اور دائن کے ورثاء کو مدیون سے فی الفور دین کی تمام رقم کے مطالبہ کا حق نہ ہو گا، کیونکہ ادھار بیع میں مدت خریدار کا حق ہوتی ہے، اور مدت کے عوض ثمن کا کچھ حصہ ہوتا ہے، اس لیے دائن یا اس کے ورثاء کو مدت سے پہلے دین کے مطالبہ کا شرعاً حق نہ ہوگا، درمختار میں ہے:

''لزم تأجیل کل دین إن قبل المدیون'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴/ ۱۸۸)۔ (اگر مدیون نے مان لیا تو ہر دین مؤجل ہو جاتا ہے)۔

البتہ اگر مدیون کا انتقال ہو جائے تو دین مؤجل فوری طور پر واجب الادا ہوگا یا نہیں، اور دائن کو مدیون کے ورثاء سے اس دین کی فوری ادائیگی کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کے مختلف اقوال ہیں: حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے دین مؤجل فوری واجب الاداء ہو جاتا ہے، اور حضرت امام احمد بن حنبل سے بھی ایک روایت اس طرح منقول ہے، لیکن حنابلہ کے نزدیک قول مختار یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کردیں اور اس کی ادائیگی پر بائع کو اطمینان دلا دیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت سے فوری واجب الاداء نہیں ہوگا، بلکہ وہ پہلے ہی کی طرح مؤجل رہے گا (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۸۶ کتاب المفلس، فقہی مقالات ۱/ ۱۳۳)، اور فقہاء احناف میں سے صاحب ''محیط'' کے نزدیک اصح یہ ہے کہ مدیون کی وفات ہو جانے کے باوجود دین مؤجل، مؤجل ہی رہے گا، اور اسی پر قاضی خاں نے فتوی دیا ہے (رد المحتار ۴/ ۱۸۹)۔

راقم سطور کی ناقص رائے یہ ہے کہ اگر مذکورہ صورت میں بائع دین مؤجل کے مؤجل رہنے دینے پر رضامند ہو، اور مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دین کی توثیق کردیں تب تو دین مؤجل علی حالہ باقی رہے گا ورنہ دین مؤجل کی فوری ادائیگی واجب ہوگی، اور پورا دین ادا کرنا واجب ہوگا۔

۱۸- بیع بالتقسیط میں بعض خریدار کو قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دینا:

شرعا اس طرح انعام دینا جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں ربا اور قمار نہیں پایا جاتا، اور نہ دیگر کوئی خرابی پائی جاتی ہے، البتہ انعام کی رقم کا ایک ہی جانب سے معاملہ ہونا چاہیے، اور دوسری جانب سے انعام وغیرہ دینے پر کوئی فیس وغیرہ نہ لی جائے تو شرعا جائز ہے، اور بائع پر خریداروں میں تقسیم انعام کے لیے قرعہ اندازی کرنا لازم نہیں ہے، کیونکہ وہ جس کو انعام دینا چاہے اسے اس کا اختیار حاصل ہے، البتہ خریداروں کی دلجوئی کے لیے قرعہ اندازی کر لینا امر مستحسن ہے تاکہ تہمت سے حفاظت ہو، ہدایہ میں ہے: ''والقرعة لتطيب القلوب وإزاحة تهمة الميل'' (ہدایہ ۴/۴۰۰)۔

یاد رہے کہ بائع کا خریدار کو انعام دینا در حقیقت ترغیب و تحریض کے باب سے ہے، چنانچہ بہت سے موقع پر شرعا ترغیب کے لیے انعام دینا جائز و مشروع ہے (ملاحظہ ہو بدائع کتاب ۶/۲۰۶ و عالمگیری کتاب الکراہیۃ باب ۶، ۵/۳۲۴، درمختار ۵/۲۸۵)۔

۱۹- بائع کا خریداروں سے بالاقساط قیمت جمع کرانا اور ہر قسط کی ادائیگی کے موقع پر قرعہ اندازی کے ذریعہ خریدار کو سامان دینا:

یہ معاملہ شرعا سود اور جوا پر مشتمل ہونے کے سبب ناجائز ہے۔ اور اس قسم کی اسکیم چلانا اور اس میں شرکت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

(مستفاد از فتاوی محمودیہ ۱۱/۳۱۱، فتاوی رحیمیہ ۶/۱۴۱ و ۱۴۲، ایضاح النوادر حصہ اول ۱۲۳ تا ۱۲۵)۔

مذکورہ معاملہ کے سود ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بائع کو پیشگی رقم دینا اور مبیع کی وصولی کے لیے مدت متعین ہونے کے باوجود قرعہ اندازی کے ذریعہ مبیع حاصل کرنا گویا قرض دے کر نفع حاصل کرنا ہے جو بنص حدیث نبوی ''كل قرض جر منفعة فهو ربا'' (نصب الرایہ ۴/۶۰) بلاشبہ سود میں داخل ہے (امداد الفتاوی ۳/۲۰، ۲۱) اور جوا اس لیے ہے کہ شرعا جوا ہر اس معاملہ کو کہا جاتا ہے جو نفع و نقصان کے درمیان دائر ہو، اور اس میں ابہام پایا جائے، اور یہاں ابہام یہ ہے کہ قرعہ اندازی کے سبب نہیں معلوم کہ کون سامان کس کو کتنے دام میں اور کتنے دنوں میں ملے گا؟ گویا ثمن کی مقدار اور ادائے مبیع کی مدت دونوں مجہول ہیں، علاوہ ازیں جس کو پہلے سامان ملے گا، اس کو نفع ہے اور جس کو بعد میں ملے گا اس کو نقصان ہے، اور نہیں معلوم کہ کس کو کب سامان وصول ہوگا، یاد رہے کہ مذکورہ معاملہ بیع سلم میں بھی داخل نہیں ہوسکتا، کیونکہ بیع سلم کی شرائط اس میں نہیں پائی جاتیں۔ قواعد الفقہ میں ہے:

''القمار... عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين'' (قواعد الفقہ/۴۳۴)۔

اور امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں جوا کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لا خلاف بين أهل العلم في تحريم القمار وأن المخاطرة من القمار''

(احکام القرآن ۱/۳۸۸، مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو معارف القرآن ۱/۴۷۶ تا ۴۸۱۔ وجواہر الفقہ ۲/۳۳۶ تا ۳۴۵)۔

صاحب ''روح المعانی'' لکھتے ہیں:

''حكم الميسر جميع أنواع القمار... وجميع أنواع المخاطرة والرهان'' (روح المعانی ۲/۱۱۴)

''وعن ابن سيرين: كل شئ فيه خطر فهو من الميسر'' (تفسیر کشاف للزمخشری ۱/۱۹۹)۔

محمد علی صابونی فرماتے ہیں:

''اتفق العلماء على تحريم ضروب القمار وأنها من الميسر المحرم'' (روائع البیان ۱/۲۷۹)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ مسئولہ اسکیم کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

☆☆☆

انعامی نظام کو بیع بالتقسیط سے جوڑنا

مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مئو

۱- جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے، اس کی قیمت، نقد فروختگی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کردی جائے تو ایسا کرنا جائز ہے، بشرطیکہ نقد اور ادھار فروختگی، دونوں میں سے کسی ایک کی تعیین عند العقد ہی ہوجائے، لیکن اگر دونوں میں سے کسی ایک کی تعیین عند العقد نہیں ہوتی، بلکہ یہ معاملہ تعیین، عقد کے بعد تک کے لیے ملتوی رکھا جاتا ہے تو اس صورت میں بیع درست نہ ہوگی۔

امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں ایک باب باندھا ہے: "باب ماجاء في النهي عن بيعتين في بيعة" یعنی یہ باب ہے بیعتین فی بیعۃ سے نہی کے بیان کے بارے میں۔ پھر امام ترمذیؒ نے اہل علم سے بیعتین فی بیعۃ کی تفسیر یوں نقل فرمائی ہے: "وقد فسر بعض أهل العلم فقالوا: بيعتين في بيعة: أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين، ولا يفارقه على أحد البيعين، فاذا فارقه على أحدهما فلا بأس" (جامع الترمذی ۱/ ۱۴۷)۔

امام ترمذی کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اہل علم نے "بيعتين في بيعة" کی تفسیر یہ کی ہے کہ مثلاً کوئی کہے کہ: میں تم کو یہ کپڑا دس روپے میں نقد بیچ رہا ہوں اور بیس روپے میں ادھار اور عند العقد کسی ایک (نقد وادھار) کی تعیین کے بغیر، ایک دوسرے سے مفارقت اختیار کر لیتے ہیں تو اس صورت میں بیع درست نہ ہوگی، لیکن اگر کسی ایک کی تعیین (نقد وادھار میں سے) مفارقت سے پہلے ہوجائے، تو اس صورت میں بیع درست ہوگی۔

مزید دیکھیے: (الفقہ علی المذاہب اربعہ ۲/ ۲۴۳)۔

خلاصہ یہ کہ نقد فروختگی میں قیمت کی کمی اور ادھار فروختگی کی صورت میں قیمت میں اضافہ کے ساتھ بیع بالکل درست اور جائز ہے اور یہ فقہاء اربعہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکشت شرعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کی بھی گنجائش ہے کہ ادھار قیمت کو قسطوں میں ادا کیا جائے (مجمع الأنہر ۴/ ۹)۔

لیکن اگر مشتری، کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا تو بقیہ دین، فوری واجب الادا ہوجائے گا، ہاں قسطوں پر ادائیگی کی صورت میں اتنا ضروری ہوگا کہ ادائیگی کی تاریخ اور رقم، دونوں کا تعین ہوتا کہ ان دونوں کی جہالت، تسلیم ثمن سے مانع نہ ہو جو کہ عقد بیع سے ہی واجب ہوجاتی ہے (ہدایہ مع شرح العینی ۳/ ۱۶)۔

اور ایسے ہی رقم ہر قسط میں کتنی واجب الادا ہو اس کی بھی تعیین ضروری ہوگی تا کہ ادائیگی کے وقت بائع کل ثمن کا یا زائد رقم کا مطالبہ نہ کردے، جبکہ اس نے قسطوں میں ادائیگی کی سہولت کی منظوری پہلے ہی دے رکھی ہے۔

۳- یہ ضروری نہیں کہ ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے صرف ادھار قیمت ہی کا تذکرہ کیا جائے اور اسی پر معاملہ کیا جائے، دونوں صورتوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے، لیکن دونوں میں سے ایک کی تعیین عند العقد ضروری ہوگی جیسا کہ "ترمذی" اور "الفقه على المذاهب الاربعة" کا حوالہ گزر چکا ہے۔

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرہ میں نہیں آتا، کیونکہ قیمت کی یہ زیادتی صلب عقد میں ابتدا ہی سے ہوتی ہے، اور چونکہ بائع کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنی چیز نقد صورت میں بھی بازار کے بھاؤ سے کچھ زیادہ پر فروخت کرے تو ادھار فروختگی کی صورت میں بھی ابتداءً ہی وہ کچھ اضافہ کے ساتھ اپنا سامان فروخت کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ ہی یہ صورت ربا کا مصداق ہوگی، ہاں اگر معاملہ یوں طے پائے کہ ایک ماہ کے ادھار پر قیمت سو روپے ہوگی، اگر ادائیگی میں تاخیر ہوئی اور مشتری ثمن کو بجائے ایک ماہ کے، دو ماہ بعد ادا کرے تو اسے سو روپے کے بجائے ایک سو دس روپے ادا کرنے ہوں گے، تو اس صورت معاملہ میں جو دس روپے زائد تاخیر کی بنیاد پر مانگے گئے ہیں یہ سود ہوگا، اور یہ معاملہ سودی معاملہ ہوگا جو بالکل ناجائز اور حرام ہوگا، معلوم ہوا کہ ادھار بیع میں ثمن کی زیادتی اگر صلب عقد میں ہو تو جائز اور اگر صلب عقد سے باہر، تاخیر کی بنا پر ہو تو ربا کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہوگی، اس لیے کہ یہی ربا النسیئہ ہے (دیکھئے: الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۲۴۵)۔

یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ادھار معاملہ میں قیمت کی زیادتی، اجل کے مقابلہ میں ہو رہی ہے، نہیں، بلکہ یہ زیادتی چونکہ صلب عقد میں ہوتی ہے، اس لیے

اسے مبیع کی پوری قیمت تصور کیا جائے گا، جیسا کہ نقد بیع کی صورت میں عام مارکیٹ سے اگر کچھ زیادہ ثمن لی جائے تو یہ جائز ہوتا ہے، اسی طرح ادھار بیع کی صورت میں اگر نفس عقد میں زیادتی طلب کرلی اور وہ زیادتی اگر مگر کے ساتھ تاخیر پر معلق نہ کی گئی ہو تو جائز ہوگی، اور اسے اجل کے مقابل نہیں سمجھا جائے گا، لیکن زیادتی کو تاخیر پر معلق کردیا جائے تو اس صورت میں زیادتی کا مطالبہ صرف تاخیر اور اجل کے مقابلہ میں ہوگا اور یہ بالکل ناجائز ہوگا۔

۵- چوں کہ صورت مسئولہ میں جہالت ثمن اور جہالت اجل دونوں مرتفع ہیں، اس لیے بیع کی وہ شکل جس میں دوشقوں میں سے کسی کو چن لیا گیا ہو جائز ہوگی۔ (دیکھئے: ہدایہ مع شرح العینی ۳/۱۶، الفقہ علی المذاھب الأربعة ۲/۱۶۵)۔

۶- یہ صورت ''ربا النسیئة'' کی ہے اور ''ربا النسیئة'' بالکل حرام ہے، کیوں کہ اس کی حرمت پر نصوص قرآنیہ دال ہیں، اور وہ یہ ہیں:

"أحل الله البيع وحرم الربا" (سورہ البقرہ/۲۷۵)، "يأيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا مابقي من الربا إن كنتم مؤمنين" (سورہ بقرہ/۲۷۸، نیز دیکھئے: الفقہ علی المذاھب الأربعة ۲/۲۴۶)۔

۷- معاملہ کی یہ صورت شرعاً ناجائز ہے اس مزید رقم کو ''جرمانہ'' اور ''مالی تاوان'' قرار دینا درست نہیں، کیونکہ وہ زائد رقم یقیناً ربا اور سود ہے۔

صورت مسئولہ میں مشتری نے جو سامان، ادھار قیمت پر خریدا اور وقت مقررہ پر قیمت کی ادائیگی نہ کرسکا تو اس کی عدم ادائیگی یا تو واقعۃً تنگ دستی اور اعسار کے باعث ہوگی، یا یہ کہ اس کے پاس مال تو ہے، لیکن ادائیگی میں سستی اور ٹال مٹول کرتا ہے تو ان دونوں صورتوں کا حکم درج ذیل ہے:

اگر مشتری مبیع کی قیمت کی ادائیگی میں تاخیر واقعۃً افلاس وتنگدستی اور اعسار کے باعث کررہا ہے تو اس صورت میں بائع کے لیے شرعاً یہ حکم ہے کہ وہ مشتری کو تنگدستی کے ختم ہونے تک ادائیگی کی مہلت فراہم کرے، لیکن اس مہلت دینے کے صلہ میں بائع کا مشتری سے مزید رقم وصول کرنا اور اس کا مطالبہ کرنا درست نہیں۔ کیونکہ فرمان باری ہے: "وإن كان ذوعسرة فنظرة الى ميسرة" (سورہ بقرہ/۲۸۰)، یعنی اگر مقروض شخص تنگدست ہو تو اسے ادائیگی دین کے لیے خوشحالی اور یسر کے حصول تک مہلت دینی چاہیے، اور اس مہلت کے عوض میں کوئی مالی معاوضہ طلب کرنا درست نہ ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ مقروض شخص واقعۃً تنگدست نہیں، بلکہ اس کے پاس مال موجود ہے، اور وہ اس کے باوجود ٹال مٹول اور دین کی ادائیگی میں تاخیر سے کام لیتا ہے تو ایسے شخص کی طرف سے دین کی ادائیگی میں تاخیر شرعی نقطہ نظر سے بالکل حرام اور ناجائز ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے شخص کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم قرار دیا ہے، حدیث شریف میں وارد ہے: مطل الغنی ظلم (مالدار آدمی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے) (رواہ الجماعة بحوالہ نیل الأوطار ۵/۲۳۶)۔

علامہ شوکانیؒ حدیث کے اس ٹکڑے "مطل الغنی ظلم" کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں: ''والمعنى أنه يحرم على الغني القادر أن يمطل صاحب الدين بخلاف العاجز'' (نیل الاوطار ۵/۲۳۷) (یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مالدار اور ادائیگی پر قادر شخص کا صاحب دین سے ٹال مٹول کرنا حرام ہے، برخلاف ادائیگی سے عاجز شخص کے، کیونکہ حدیث پاک میں ''مطل'' سے مراد قدرت کے باوجود وقت پر عدم ادائیگی ہے، علامہ شوکانی نے لکھا ہے:

''قال في الفتح: والمراد هنا: تاخير ما استحق أداؤه بغير عذر'' (نیل الاوطار ۵/۲۳۷)۔

ایک دوسری روایت میں ہے: ''عن عمرو بن الشريد عن أبيه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لي الواجد ظلم يحل عرضه وعقوبته'' (رواہ الخمسة الترمذی/نیل الاوطار ۵/۲۴۰)۔

''قال أحمد: قال وكيع: عرضه: شكايته، وعقوبته: حبسه'' (نیل ۵/۲۴۰)۔

حدیث بالا کا مفہوم یہ ہے کہ مالدار آدمی کا ٹال مٹول کرنا ایسا ظلم ہے جس کے باعث دوسروں سے اس کی شکایت کرنا اور اسے محبوس کروانا حلال اور جائز بن جاتا ہے، کیونکہ حدیث میں وارد لفظ ''عرض'' کی تفسیر بقول امام احمدؒ، امام وکیع نے شکایت سے اور عقوبتہ کی تفسیر حبس سے فرمائی ہے، اس حدیث کی روشنی میں فقہاء نے مال دار شخص کے ٹال مٹول کرنے کی صورت میں حبس کی سزا متعین فرمائی ہے، تاکہ یہ اس کے حق میں تادیب وتشدید کا سبب بن سکے اور بلاوجہ ٹال مٹول اور تاخیر کرنے والے مالدار لوگ اس سے احتراز کرسکیں، علامہ شوکانیؒ رقم طراز ہیں:

''واستدل بالحديث على جواز حبس من عليه الدين حتى يقضيه إذا كان قادرًا على القضاء تأديبا وتشديدًا عليه''۔

اور آگے تحریر فرماتے ہیں: ''وإلى جواز الحبس للواجد ذهبت الحنفية و زيد بن علي'' (نیل الاوطار ۵/۲۴۱) تو مالدار آدمی اگر ٹال مٹول اور ادائیگی میں تاخیر سے کام لیتا ہے تو بطور سزا اور تادیب اسے قید میں ڈالا جاسکتا ہے، لیکن اس کے اوپر اس سلسلے میں میں مالی تاوان عائد کرنا اور جرمانہ وصول کرنا شرعاً ثابت نہیں، کیونکہ اس قسم کے ٹال مٹول اور ادائیگی میں تاخیر کے معاملے ہر دور میں مروج رہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود

وضاحت سے یہ بات بتادی کہ "مطل الغنی ظلم" اور "لي الواجد ظلم" اور اس ظلم کی بنا پر اس کی دوسروں سے شکایت اور حبس کے جواز کو بیان فرمایا، لیکن مالی تاوان کے جواز کی بات نہیں بیان فرمائی، آپ کے بعد صحابہ کرام اور پھر تابعین، تبع تابعین کے ادوار میں بھی اس طرح کے معاملات اور (Cases) سامنے آتے رہے ہوں گے، لیکن بعد کے ان ادوار میں بھی کسی سے کہیں بھی مالی جرمانہ اور تاوان وصول کیے جانے کی بات نہیں ملتی، اس لیے مدیون کی مالداری کے باوجود ٹال مٹول کرنے کی صورت میں اس پر وقت کے اندر ادائیگی کا دباؤ بنانے کے لیے مالی جرمانہ سے ہٹ کر دوسری صورت سوچنی ہوگی جس کی ایک شکل خود حدیث پاک میں بیان فرمادی گئی ہے: "يحل عرضه وعقوبته" "يحل عرضه" سے بلیک لسٹ میں اس شخص کا نام آؤٹ کرنے کا جواز ہمیں ملتا ہے تو دوسری طرف "وعقوبته" سے اسے جیل کی ہوا کھلانے کا ہتھیار بھی ہاتھ آتا ہے، بلیک لسٹ میں نام کا آجانا ادائیگی کا دباؤ بنانے کے لیے کافی مؤثر طریقہ کار ہو سکتا ہے کہ وہ شخص تجارتی منڈی میں بالکل اچھوت بن کر رہ جائے اور کوئی بھی اس سے معاملہ ہی نہ کرے، لیکن ادائیگی کا دباؤ بنانے کے لیے مالی جرمانہ اور تاوان کا جواز بالکل ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

۸- الف: بائع کے مال مرہون سے انتفاع کا حکم:

بائع یعنی مرتہن مال مرہون سے انتفاع کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مرتہن مال مرہون سے کسی طرح کا انتفاع نہیں کر سکتا، یہ مسلک حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور جمہور فقہاء کا ہے۔ نیل الاوطار میں ہے: "وقال الشافعي وابوحنيفة ومالك وجمهور العلماء: لا ينتفع المرتهن من الرهن بشئ بل الفوائد للراهن والمؤن عليه" (۵/۲۳۵، الفقه على المذاهب الاربعة ۲/۳۳۵، مجمع الأنهر ۲/۵۸۷)

مال مرہون سے انتفاع کے سلسلے میں غیر جمہور کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اگر مرتہن نے ضروریات رہن کی کفالت کی ہو تو بغیر اذن مالک بھی وہ اس رہن سے اتنی مقدار میں انتفاع کر سکتا ہے جتنا اس نے رہن کی کفالت پر خرچ کیا، اور یہ قول امام احمد، اسحاق، لیث اور حسن وغیرہ کا ہے (دیکھئے نیل الاوطار ۵/۲۳۵)۔

ان لوگوں نے اپنے استدلال میں یہ روایت پیش فرمائی ہے: "عن النبي ﷺ أنه كان يقول: الظهر يركب بنفقته إذا كان مرهونا، ولبن الدر يشرب بنفقته إذا كان مرهونا، وعلى الذي يركب النفقة (رواه الجماعة الا مسلما والنسائی/نیل الاوطار ۵/۲۳۴)۔

ب- بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون کے ضائع ہوجانے کا حکم:

مال مرہون جب مرتہن کے قبضہ میں ہو تو اس کے ذمہ اس کی حفاظت لازمی وضروری ہے، حفاظت وہ خود بھی کر سکتا ہے، اس کے علاوہ، دیگر افراد خانہ، مثلاً بیوی، اولاد یا وہ خادم جو اس کی کفالت میں رہتا ہو، مال مرہون کی حفاظت کرنے کے شرعا مجاز ہیں، ان میں کسی کی حفاظت کے باوجود اگر مال مرہون برباد ہوجائے تو مرتہن پر کوئی تاوان نہیں ہوگا، لیکن اگر اس نے حفاظت کی غرض سے مذکورہ بالا افراد کے ماسوا کسی اور کو مال مرہون دے دیا، یا کسی کے پاس امانۃ رکھ دیا، یا یہ کہ اس نے خود مال مرہون میں کوئی ایسی تعدی کردی کہ وہ مال برباد و ہلاک ہوگیا تو اس صورت میں مرتہن پوری قیمت کا ضامن ہوگا، کیونکہ رہن اس کے ہاتھ میں بطور امانت ہوا کرتا ہے اور امانت میں تعدی وزیادتی ہوتی ہے تو پوری قیمت کا ضمان واجب ہوا کرتا ہے (المغنی ۴/۴۳۸، مجمع الأنہر ۲/۵۸۹)۔

ج- خریدار کے وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں فروخت کنندہ کو مال مرہون کے بیچنے کی اگر راہن کی طرف سے اجازت ہے تو اسے بیچ کر اپنی واجب الادا قیمت وصول کرلے، اگر مال مرہون کی فروختگی سے حاصل ہونے والی رقم مرتہن کی واجب الوصول قیمت سے زائد ہو تو مرتہن بقیہ زائد رقم کو راہن کے حوالہ کردے گا اور اگر مال مرہون سے حاصل شدہ رقم مرتہن کے دین کا ایفا نہ کر سکے تو جس قدر رقم مال مرہون سے حاصل ہوئی ہے وہ مرتہن کے دین میں ادا کردی جائے گی اور باقی ماندہ رقم راہن کے ذمہ واجب الاداء ہوگی، یہ صورت اس وقت ہے، جبکہ راہن نے مال مرہون کی بیع کی اجازت دی ہو اور اگر اس کی طرف سے رہن کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ دوسرے مال سے مرتہن کا دین ادا کردو، اگر یہ شکل بھی اس کے اختیار سے باہر ہے تو حاکم وقت راہن کو رہن کے فروخت کرنے پر مجبور کرے گا، اور اس سے مرتہن کا دین ادا کیا جائے گا۔

'فقہ السنة' میں سید سابق تحریر فرماتے ہیں:

''ومتی حل الأجل لزم الراهن الإيفاء وأداء ما عليه من دين، فإن امتنع من وفائه ولم يكن إذن له ببيع الرهن، أجبره الحاكم على وفائه أو بيع الرهن، فإن باعه وفضل من ثمنه شئ فلما لكه، وإن بقي شئ فعلى الراهن'' (۳/۱۵۹)

مذکورہ بالا پوری بحث اور یہ ساری باتیں ہمیں مغنی میں بھی ملتی ہیں، البتہ علامہ ابن قدامہ نے یہ صراحت کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ راہن کے رہن کو فروخت کرنے کی اجازت نہ دینے کی صورت میں حاکم وقت کو رہن کی فروختگی کا حق حاصل نہیں ہے اگر حاکم نے فروخت کر ہی دیا تو اس کی بیع نافذ نہ ہوگی، الا یہ کہ راہن اس کی اجازت دیدے، کیونکہ حاکم کی ولایت صاحب دین (راہن) پر تو چلے گی، لیکن راہن کے مال پر نہیں (المغنی ۴/ ۴۴۷)۔

۹- بائع کا مکمل قیمت یا اس کی چند اقساط جمع نہ ہونے تک اپنے پاس مبیع کو روک کر رکھنا یا تو بطور رہن ہوگا یا فقط استیفاء ثمن کی غرض سے ہوگا۔

الف:...... اگر بائع مبیع کو بطور رہن روک کر رکھنا چاہتا ہے تو اس کے جواز کی صورت یہ ہوگی کہ پہلے مشتری مبیع پر قبضہ کرے، پھر بائع کو بطور رہن حوالہ کردے، کیونکہ قبضہ سے پہلے مشتری جب مبیع کا مالک نہیں بن سکا تو اسے اس میں کسی طرح کے تصرف کا حق نہیں، راہن کے لیے مرہون کا مالک ہونا اگرچہ شرط نہیں تاہم اسے تصرف کا حق حاصل ہونا شرط ہے جو یہاں مفقود ہے (الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۲/ ۳۲۶)۔

دوسری چیز یہ کہ بائع جب مبیع کو بطور رہن رکھنا چاہتا ہے تو صلب عقد میں ہی اگر اسی مبیع کو رہن پر رکھنے کی شرط لگاتا ہے تو اس صورت میں رہن صحیح نہ ہوگا، کیونکہ شرط لگانے کے وقت مشتری مبیع کا مالک نہیں، اس لیے رہن کی یہ صورت صحیح نہ ہوگی، خواہ مشتری یہ بھی کہے کہ میں مبیع پر قبضہ کر لینے کے بعد اس کو رہن رکھ دوں گا (المغنی ۴/ ۴۲۰)۔

لیکن ایک جگہ علامہ ابن قدامہ نے امام احمدؒ سے عقد بیع میں نفس مبیع کے رہن کی شرط لگانے کی صحت کو نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''وروی عن أحمد أنه قال: إذا حبس المبيع ببقية الثمن فهو غاصب ولا يكون رهنا إلا أن يكون شرطا عليه في نفس البيع وهذا يدل على صحة الشرط'' (المغنی ۴/۴۲۰)۔

اوپر کی بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ بائع نفس مبیع کو بطور رہن اپنے پاس روک کر رکھ سکتا ہے بشرطیکہ مشتری نے مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد بائع کے حوالہ کر دیا ہو۔ دوم یہ کہ صلب عقد میں نفس مبیع کے رہن کی شرط نہ لگائی گئی ہو (ہدایہ ۴/ ۵۳۴، مجمع الأنہر ۲/ ۵۹۸)۔

ب: بائع مبیع کو بیع بالتقسیط کی صورت میں محض ثمن کی وصول یابی کے لیے روکے رکھنا چاہتا ہے تو یہ صورت جائز نہیں ہے، کیونکہ جب بائع مبیع کو ادھار فروخت کرنے پر راضی ہے تو پھر اس کی قیمت وصول کرنے کے لیے اسی مبیع کو اپنے پاس روک کر نہیں رکھ سکتا، اس لیے کہ یہ معاملہ ادھار فروختگی کا نہیں بن سکے گا، ہاں اگر نقد بیع ہوتی اور اس میں ثمن کی حصولیابی کے لیے نفس مبیع کو ہی روک لیتا تو اس کا جواز ہوتا جیسا کہ بدائع میں ہے:

''أن للبائع حق حبس المبيع حتى يقبض الثمن إذا كان الثمن حالا'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۷)۔

لیکن ادھار فروختگی میں بائع کو حبس مبیع کا حق حاصل نہیں ہے (فتاوی عالمگیری ۳/ ۹، الدر المنتقی علی ہامش مجمع الانہر ۲/ ۹)۔

۱۰- قسط وار ادائیگی کا معاملہ طے ہوجانے کے بعد اگر چند قسطیں مشتری نے ادا کردیں اور باقی کے وقت مقررہ پر ادا کرنے سے وہ معذوری ظاہر کرتا ہے تو بائع (مرتہن) مال مرہون (مبیع) کو فروخت کرکے بشرطیکہ راہن کی طرف سے اس کو فروختگی کی اجازت حاصل ہو، اپنی بقیہ قسطوں کی رقم وصول کرے گا، لیکن یہ تو بالکل درست نہیں کہ وہ پوری مبیع کو اپنے قبضہ میں بھی لیے رہے اور جو قسطیں مشتری نے ادا کی ہیں ان کو واپس بھی نہ کرے (فقہ السنۃ ۳/ ۱۵۹)۔

چونکہ مذکورہ بالا صورت میں بائع کے پاس بعینہ وہ مبیع موجود ہے جسے اس نے مشتری کو بیچا تھا، اس کے اندر کسی طرح کا کوئی نقص نہیں پیدا ہوا ہے تو لازما وہ مبیع اپنی پوری قیمت رکھتی ہوگی، اس لیے اسے فروخت کرکے اس کی ثمن سے اپنی واجب الوصول رقم لے لے گا اور اسے بقیہ وہ ساری رقمیں جو قسطوں کی ادائیگی میں مشتری سے ملی تھیں مشتری کو واپس کرنی ہوں گی۔

ہاں آج کل کے دور میں مبیع بائع کے شوروم سے نکل جانے کے بعد مشتری کے یہاں پہونچ کر سیکنڈ ہینڈ ہوجاتی ہے خواہ اس نے اسے چند لمحے استعمال نہ کیا ہو اور اس کی بنا پر مبیع کی قیمت میں کمی بھی واقع ہوجاتی ہے، اس بنیاد پر اگر بائع ادا شدہ قسطوں کو واپس نہیں کرتا تو اس کی گنجائش نکل سکتی

ہے، کیونکہ وہ سامان دوسرے کے ہاتھ اب اپنی سابقہ اصلی قیمت پر فروخت نہیں ہوسکتا اور اس وقت یہ صورت معاملہ اقالۃ بالعیب میں داخل ہو گی۔ ''اقالۃ بالعیب'' کی وضاحت کے لیے دیکھئے: (فتاوی عالمگیری ۳/۸۰)۔

اگر مذکورہ بالا صورت کے اندر مبیع میں واقعۃً کوئی عیب مشتری کے یہاں رہتے ہوئے پیدا ہوگیا ہو تو بائع کا اداشدہ قسطوں کو اس عیب میں منہا کر لینا بالکل درست ہوگا، اور اگر ظاہری عیب تو نہیں پیدا ہوا، لیکن معنوی عیب اس مبیع میں پیدا ہو چکا ہے جس کی ایک معروف شکل سکینڈ ہینڈ ہونا ہے جو آج کے عرف عام میں عیب متصور ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے قیمت میں خاصی کمی واقع ہوجاتی ہے، اس لیے اس کے عوض میں اداشدہ قسطوں کو بائع واپس نہ لوٹائے تو یہ اس کے لیے جواز کی صورت ہوسکتی ہے، کیونکہ کوئی ایسا عیب جو قیمت میں کمی کا باعث بن سکتا ہو اگر وہ مشتری کے حق میں مبیع کے رد کرنے کا سبب بن سکتا ہے تو بدرجہ اولی ایسے عیب کے مشتری کے پاس رہتے ہوئے مبیع میں پیدا ہوجانے سے اقالہ کی صورت میں مشتری ہی کو اس کم ہونے والی قیمت کو بھگتنا ہوگا۔

''العیب الذی یجعل للمشتری الحق فی رد المبیع ہو الذی تنقص بہ قیمۃ المبیع'' (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲/۱۸۹)۔

۱۱- بظاہر رہن کی یہ شکل جائز نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ فقہاء کرام نے رہن کی صحت کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ رہن پر مرتہن کا قبضہ ہو اور اس کی دلیل نص قرآنی "فرھان مقبوضۃ" ہے۔

فقہاء احناف کے یہاں رہن پر مرتہن کا قبضہ رہن کی صحت کے لیے شرط لزوم کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ علامہ عبدالرحمن جزیری تحریر فرماتے ہیں:

''أما القسم الثالث وهو شرط اللزوم: فهو قبض المرهون، فإذا حصل الایجاب والقبول مع شرط الانعقاد، انعقد الرهن صحيحا ولكنه لا يكون لازما إلا بالقبض'' (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲/۳۲۷)۔

ہاں مشتری مبیع کو اپنے قبضہ میں لے لینے کے بعد اسے بائع کو بطور رہن کے حوالہ کردے اور بائع اسے لے کر پھر مشتری کو لوٹا دے کہ تم اس سے انتفاع کرتے رہو، لیکن جب ثمن کی ادائیگی کی مدت پوری ہوجائے گی اور تم ثمن ادا نہ کرسکو گے تو مجھے اس رہن کو بیچ کر اپنی ثمن حاصل کرنے کا حق ہوگا تو اس صورت میں یہ رہن جائز اور درست ہوجائے گا، لیکن اتنی بات ہے کہ مال مرہون اس صورت میں مرتہن (بائع) کے ضمان میں نہ ہوگا، اگر بالفرض یہ مال مرہون مشتری کے پاس رہتے ہوئے ہلاک ہوگیا تو یہ مشتری کا مال ہلاک ہونا قرار پائے گا اور بائع پر اس کی کوئی ذمہ داری اس وجہ سے عائد نہیں کی جاسکتی کہ وہ مبیع معنوی طور پر بائع (مرتہن) کے رہن میں تھی (ہدایہ ۴/۵۴۶)۔

۱۲- خریدار کی طرف سے گارنٹی وضمانت لینے کی صورت کفالت کے مسلمہ ومعروف معاملہ کے تحت آتی ہے، مگر آج کل اداروں واشخاص کی طرف سے اجرت ومعاوضہ کا لین دین رائج ہے، شرعاً یہ اجرت ومعاوضہ جائز اور درست نہیں۔ کیونکہ کفالت فی نفسہ ایک عقد تبرع ہے۔ درمختار میں ہے: ''وأهلها من هو أهل للتبرع'' (۳/۳۴۸) (یعنی کفالت وضمانت اور گارنٹی لینے کے اہل وہی لوگ ہوسکتے ہیں جن میں تبرع کی اہلیت وصلاحیت پائی جاتی ہے) اور چونکہ تبرع پہ اجرت ومعاوضہ لینا جائز نہیں، اس لیے کفالت پر بھی اجرت ومعاوضہ لینا جائز نہیں۔ کفالت پر اجرت لینا ایسا ہی ہے، جیسے قرض دے کر اس پر مالی منفعت حاصل کرنا اور قرض پر کسی طرح کی منفعت کا حصول ربا کے قبیل سے ہے: ''وکل قرض جر نفعا فهو حرام'' (شامی ۳/۲۴۲)۔

بین الاقوامی تجارت میں اگر اس طرح کی گارنٹی وکفالت پر اجرت ومعاوضہ کا لین دین رائج ہے تو یہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ ہاں بینک وغیرہ اگر بین الاقوامی تجارت میں امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان واسطہ بنتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ لیٹر آف کریڈٹ (Letter of Credit) جاری کرتے ہیں تو اس لیٹر کے جاری کرنے میں جو حقیقی اور واقعی اخراجات ہوتے ہوں ان کا مطالبہ وہ اپنے کسٹمر سے کرسکتے ہیں، نیز اس کے علاوہ بھی دیگر خدمات اگر بنک انجام دیتا ہو اور کسٹمر حضرات اپنی تجارتوں میں ان امور سے استفادہ کرتے ہوں تو اس طرح کے امور میں بینک ان حضرات کا وکیل دلال یا واسطہ بن کر یہ خدمات انجام دے اور بحیثیت وکیل ودلال یا واسطہ کے اپنی اجرت وصول کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ وکالت ودلالی وغیرہ پر اجرت لینا جائز ومشروع اور مشہور ومعروف ہے، مولانا تقی عثمانی نے اپنے فقہی مقالات میں بینک کے لیے وکیل، دلال اور واسطہ بن کر اجازت لینے کو جائز قرار دیا ہے، لیکن بینک کا ضمانت وکفالت اور گارنٹی پر اجرت حاصل کرنا بالکل حرام بتلایا ہے (ملاحظہ ہو فقہی مقالات/۹۸)۔

۱۳- ادھار معاملہ کے مکمل کاغذات تیار کرنا کرانا ایک مستحسن امر ہے، کیونکہ قرآن کریم نے صراحۃً مسلمانوں کو اس کی ہدایت فرمائی ہے، فرمان باری ہے:

"یأیھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین إلی أجل مسمی فا کتبوہ" (سورہ بقرہ/ ۲۸۲)

(یعنی جب تم ادھار معاملہ کرو ایک میعاد متعین تک تو اس کو لکھ لیا کرو)۔

مدیون وقت مقررہ پر اگر دین کی ادائیگی نہیں کرتا یا یہ کہ دستاویز کا حامل (دائن) اپنی دی ہوئی رقم کو وقت مقررہ سے پہلے حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ اپنے پاس موجود دستاویز (وثیقہ دین) کو تیسرے کے ہاتھ جو عموماً بینک ہوا کرتا ہے، وثیقہ دین میں مندرج رقم سے کم پر فروخت کرتا ہے تو یہ صورت شرعاً ناجائز ہے، اس کے ممنوع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" کا لزوم ہے، جو جائز نہیں، شامی میں ہے: "ولا یجوز تملیک الدین من غیر من علیہ الدین" (۳/ ۲۳۰) (یعنی دین کا مالک بنانا اس شخص کی طرف سے جائز نہیں جس کے اوپر دین نہیں)۔ یہاں پر بائع جس کے پاس وثیقہ دین ہے وہ تو دائن ہے نہ کہ مدیون (من علیہ الدین) اس لیے بائع کا اس وثیقہ دین میں تصرف کرنا اور اس کا دوسرے (بینک) کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں۔

مذکورہ بالا صورت میں دوسری خرابی یہ ہے کہ اس میں وثیقہ دین میں مکتوب، رقم یعنی کرنسی کی کرنسی سے متفاضلاً اور موجلاً بیع لازم آتی ہے، اور یہ معلوم ہے کہ کرنسی کی بیع کرنسی سے کمی وبیشی اور ادھار کے ساتھ ربا ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اس لیے بھی مذکورہ بالا صورت معاملہ یعنی وثیقہ دین کی خرید وفروخت ناجائز ہوگی (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲/ ۲۴۹)۔

لیکن مولانا تقی عثمانی صاحب نے اس معاملہ کے جواز کی ایک صورت تحریر فرمائی ہے کہ اس معاملہ کے طریقہ کار میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر کے اسے جائز بنایا جاسکتا ہے، وہ صورت درج ذیل ہے:

وثیقہ دین کا حامل یعنی بائع ودائن، اپنے دین کی وصولیابی کے لیے بینک کو مدیون (مشتری جس نے وثیقہ دین جاری کیا ہے) سے دین کی وصولیابی کے لیے اجرت پر وکیل بنادے اور بائع یعنی وثیقہ دین کا حامل، وثیقہ دین میں مندرج مقدار کی رقم بینک سے بطور قرض لے لے اور بینک جب مدیون (مشتری) سے قرض وصول کرے تو اس کو بائع کو دیے گئے دین میں سے منہا کر لے۔ خلاصہ یہ کہ یہاں مستقلاً دو الگ الگ معاملے کیے جائیں:

۱- بینک کو مدیون سے قرض وصول کرنے کا وکیل بالاجرۃ بنایا جائے۔

۲- بائع، بینک سے مطلوبہ مقدار میں قرض لے لے، اور دستاویز کے عوض میں وصول ہونے والی رقم کو بینک قرض کی رقم میں چکا لے، اس طرح یہ معاملہ دو شقوں میں بنٹ کر درست ہوسکتا ہے (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ للشیخ تقی العثمانی/ ۲۱)۔

۱۴- مسئلہ ضع وتعجل:

یہ تو معلوم ہے کہ طے شدہ رقم کو مقررہ مدت سے آگے بڑھانے پر زیادتی کا مطالبہ ناجائز ہے، کیونکہ یہ صریح ربا ہے، ٹھیک اسی طرح طے شدہ رقم میں کمی کا معاملہ، مقررہ مدت سے پہلے طلب کرنے کی صورت میں بھی ربا ہے، اس کی حرمت کے قائل صحابہ کرام میں عمر بن الخطابؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ ابن عمرؓ اور مقداد بن الاسود، ائمہ مجتہدین میں امام ابوحنیفہؒ، مالکؒ، احمد اور امام شافعیؒ کا ایک قول، ان کے علاوہ فقہاء تابعین میں سعید بن المسیب، حسن بصری، حکم، ثوری، ہشیم، ابن علیہ اور اسحاق وغیرہ ہیں (اوجز المسالک ۵/ ۱۳۴، موطا امام محمد/ ۳۳۴)۔

لیکن اسی باب میں ایک دوسرا قول جواز کا بھی ہے جو صحابہ کرام میں سے حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے، نیز امام نخعی اور ابوثور سے بھی یہی مروی ہے (ملاحظہ ہو المغنی لابن قدامہ الحنبلی ۴/ ۵۱۰ اور اوجز المسالک الی موطا امام مالک ۵/ ۱۳۳-۱۳۴، اور موطا امام محمد/ ۳۳۴)۔

ان حضرات نے ایک واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے جب بنونضیر کو مدینہ منورہ سے جلاوطنی کا حکم دیا تھا تو یہودیوں نے کہا تھا کہ ہمارے دیگر لوگوں پر دیون ہیں جن کی ادائیگی کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، تو حضور نے فرمایا تھا: "ضعوا وتعجلوا" یعنی اپنے دیون میں سے کچھ رقم کم کر کے دین کو فوری اور نقد وصول کر لو۔

واحتج المجیز بخبر ابن عباس لما امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باخراج بنی النضیر قالوا: لنا علی الناس دیون لم تحل، فقال: ضعوا وتعجلوا" (التعلیق الممجد علی ہامش موطا امام محمد/ ص ۳۳۴)۔

لیکن حرمت کے قائلین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث ربا کی تحریم سے قبل کی ہے، جیسا کہ زرقانی میں موجود ہے:

''وأجاب المانعون باحتمال أن هذا الحديث قبل نزول تحريم الربا'' (كذا في شرح الزرقاني۔ حوالہ سابق)۔

دوسرے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ضع وتعجل کا جواز مسلم وحربی کے مابین درست ہوسکتا ہے نہ کہ مسلم اور مسلم کے مابین ''وذكر شمس الائمة السرخسي هذه القصة، واستدل بها على أنه لا ربا بين المسلم والحربي'' (بحوث فی قضایافقهية معاصرة للشيخ تقی عثمانی/۲۳)۔

تیسرے یہ کہ حضور کے فرمان کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ سود چھوڑ کر اصل رأس المال لے لو، نہ کہ راس المال میں کمی کر کے دین وصول کرنے کی بات آپ نے کہی تھی، اور اس کی تائید واقدی کی عبارت سے ہوتی ہے: ''فأجلاهم (بني النضير) رسول الله صلى الله عليه وسلم في المدينة، وولي إخراجهم محمد بن مسلمة، فقالوا: إن لنا ديونا على الناس إلى آجال فقال رسول الله ﷺ: تعجلوا و ضعوا، فكان لابي رافع سلام بن الحقيق على اسيد بن حضير، عشرون ومائة دينار الى سنة، فصالحه على أخذ رأس ماله ثمانين ديناراً، وابطل ما فضل'' (مغازی الواقدی ۳۷۴/۱/بحوالہ بحوث فی قضایافقهية معاصرة للشيخ تقی العثمانی/ص ۲۴-۲۳)۔

۱۵- اگر معاملہ ادھار کیا گیا مگر قیمت کی ادائیگی کے لیے صرف یہ طے ہوا کہ بعد میں دے دیں گے اور اس کے لیے وقت طے نہیں کیا گیا، مشتری کسی وجہ سے ادائیگی دین میں تاخیر کرتا جارہا ہے تو اس صورت میں اگر بائع ''ضع وتعجل'' کی صورت اختیار کرے اور فوری لین دین ہوجائے تو حضرات مالکیہ کے یہاں اس کے جواز کی صراحت ملتی ہے (۱۱/۲۷، المدونة الكبرى/اخر كتاب الصلح/بحوالہ بحوث فی قضایا فقهية معاصرة للشيخ تقی العثمانی)۔

دیون حالہ میں ''ضع وتعجل'' کے جواز کا قول فقہ مالکی میں بصراحت ملا، لیکن دیگر فقہاء کرام، مثلاً حنفیہ اور حنابلہ وغیرہ کے یہاں ''ضع وتعجل'' کے عدم جواز کی تصریح صرف دیون مؤجلہ میں ہی ملتی ہے جس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ ان حضرات کے یہاں بھی دیون حالہ میں وہ بات نہیں جو دیون مؤجلہ کی ہے، اس سے دیون حالہ کی صورت میں ''ضع وتعجل'' کے جواز کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب نے دیون حالہ میں ''ضع و تعجل'' کے تعلق سے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ (دیکھئے: مسوی شرح موطا/۳۸۲، ۲۷/بحوث فی قضایافقهیہ)۔

رہا یہ معاملہ کہ دیون حالہ اور دیون مؤجلہ میں فرق کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیون مؤجلہ میں اجل کی شرط ہوتی ہے، اور یہ اجل مدیون کا حق ہوتا ہے، چنانچہ جب اجل ختم کر کے فوری دین کا مطالبہ ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ اجل کے عوض میں دین ساقط کیا گیا ہے، لیکن دیون حالہ میں چونکہ اجل کی شرط نہیں ہوتی، اس لیے اس صورت میں دین کا سقوط، اجل کے بالمقابل نہیں مانا جائے گا، اس لیے یہ صورت جائز ہوگی، کیونکہ اس صورت میں ربا کا شبہ نہیں۔ ملاحظہ ہو (بحوث فی قضایافقهیة معاصرة/۲۸)۔

۱۶- کسی قسط کی ادائیگی میں تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کردینے کا حکم:

بائع ومشتری میں طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کر کے بائع کا فوری طور پر مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا جائز ہے (ملاحظہ ہو ۳۲/۴ در مختار مع الشامی، الدر المنتقی فی شرح الملتقی ۸/۲، درمختار ۳۲/۴)۔

۱۷- بیع بالتقسیط کے اندر متبایعین کی موت سے دین کی تاجیل وعدم تاجیل کا مسئلہ:

بیع بالتقسیط کی صورت میں فریقین (بائع ومشتری یا دائن ومدیون) میں سے کسی ایک کا انتقال ہوجائے تو عند الاحناف دائن کی موت سے مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں واقع ہوگا۔ لیکن اگر مدیون کی موت واقع ہوجائے تو اس پر واجب دین فوراً واجب الاداء ہوجائے گا (درمختار مع الشامی ۳۱/۴، مجمع الأنہر ۸/۲)۔

حنابلہ سے مسئلہ بالا میں دو روایتیں ملتی ہیں:

پہلی روایت: اگر مدیون کے دین کی توثیق، اس کے ورثاء کر دیتے ہیں تو وہ دین فوری واجب الادا نہ ہوگا، یہ قول ابن سیرین، عبداللہ بن الحسن، اسحاق، اور ابوعبید وغیرہم کا ہے، مغنی میں ہے: ''فأما إن مات وعليه ديون مؤجلة فهل تحل بالموت، فيه روايتان: إحداهما: لا تحل إذا وثق الورثة وهو قول ابن سيرين وعبد الله بن الحسن وابي عبيد واسحاق'' (المغنی ۴۸۲/۴)۔

دوسری روایت: مدیون کی موت سے اس کا دین فوری واجب الادا ہو جائے گا، اور یہ قول شعبی، نخعی، سوار، امام مالک، ثوری، امام شافعی اور اصحاب الرای کا ہے۔

''والرواية الأخرى: أنه يحل بالموت، وبه قال الشعبي والنخعي وسوار ومالك والثوري والشافعي وأصحاب الرأي'' (المغنی ۴/ ۴۸۲)۔

اس کے بعد علامہ ابن قدامہ نے دونوں کے دلائل کو تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں ترجیح اس کو دی ہے کہ اگر ورثاء دین کی توثیق کر دیں تو وہ دین مؤجل ہی رہے گا اور اگر ورثاء دین کی توثیق سے باز رہیں تو اس صورت میں وہ دین فوری واجب الاداء ہو جائے گا، تاکہ دائن کا حق ضائع اور برباد نہ ہو۔

حنفیہ کا مسلک تو اس بات میں یہی ہے کہ مدیون کی موت سے دین فورا واجب الادا ہو جائے گا، لیکن متاخرین حنفیہ نے اس قول پر مرابحہ مؤجلہ کے باب میں فتوی نہیں دیا ہے، مرابحہ مؤجلہ میں فقہاء احناف نے یہ صراحت کی ہے کہ اجل کے عوض میں جو کچھ ثمن آتی ہے وہ تابع ہونے کی وجہ سے جائز ہے، اس لیے مرابحہ مؤجلہ کی صورت میں اگر متعین اجل سے پہلے مدیون یا میت کے مال سے، دین کی ادائیگی کی جاتی ہے تو صرف دین کی اتنی ہی مقدار ادا کی جائے گی جو ماضی اجل کے عوض میں آتی ہو نہ کہ کل دین (دیکھئے: شامی ۴/ ۷ ۳۰۳)۔

مرابحہ مؤجلہ کے بارے میں ان فتاوی کو مدنظر رکھتے ہوئے، بیع بالتقسیط کے تعلق سے بھی مولانا تقی عثمانی صاحب نے اسی چیز کو معتبر مانا ہے، ورنہ پھر حنابلہ کے قول کو اختیار کرنے کو راجح قرار دیا ہے، یعنی یہ کہ اگر دین کی توثیق مدیون کے ورثاء کر دیں تو دین پوری مدت تک مؤجل ہی رہے گا۔

۱۸، ۱۹- بیع بالتقسیط سے انعامی نظام کو جوڑنے کا حکم:

بیع بالتقسیط کے ساتھ انعام کے نظام کو جوڑنا اور پورے خریداروں میں سے کسی ایک یا چند کو قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دینا یہ بھی مخاطرہ ہے اور قمار کی ایک نئی شکل ہے، جو خود بھی ایک حرام فعل ہے اور اس سے استفادہ بھی حرام ہوگا، کیونکہ ایک آدمی کو مثلاً محض ایک قسط جو سو روپے کی ہے اتنے ہی میں سامان مل جا رہا ہے اور دوسرے شخص کو بیس قسطوں میں دو ہزار پر وہ سامان ملے گا، پہلی اور اس کے بعد کی ہر قسط میں ہر آدمی لاٹری کی طرف ایک موہوم امید کی بنا پر کہ ہوسکتا ہے کہ مجھے ہی وہ سامان پہلی قسط میں مل جائے امید باندھے رہتا ہے، اب جس کے نام قرعہ نکل گیا تو وہ تو جیت گیا اور اس معاملہ سے الگ ہو گیا، باقی لوگ بعد کی اقساط میں اس امید پر قسطیں جمع کرتے رہیں گے کہ ہوسکتا ہے کہ اگلی کسی قسط میں ہم کو بھی سامان کم قیمت پر مل جائے۔ پیسے بے شمار لوگوں کے لگتے ہیں اور فائدہ ایک شخص یا چند اشخاص کو پہنچتا ہے، قسطوں پر انعام دینے کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس طرف متوجہ ہوسکیں، اصل مبیع کی بیع ایک ثانوی حیثیت کی ہو جاتی ہے، اور اصل مقصد انعام سے استفادہ ہو جایا کرتا ہے، اس لیے ان دونوں شکلوں کے جوا ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ایسی تمام صورتیں جن میں مخاطرہ ہو اور نفع ونقصان مبہم ہو وہ قمار اور میسر کا مصداق ہوں گی، اگر اس ابہام کو قرعہ اندازی کے ذریعہ دور کیا جائے تو بھی وہ حرام ہوگا، قرعہ اندازی کا معاملہ، چیزوں کی تقسیم کے وقت تو درست ہوسکتا ہے، لیکن بہت سارے لوگوں میں سے کسی ایک کو مستفید کرنے اور بقیہ کو محروم کرنے کی صورت میں درست نہیں ہوسکتا، ابوبکر جصاص تحریر فرماتے ہیں:

''وما ذكر الله تعالى من تحريم الميسر هو القمار يوجب تحريم القرعة فى العبيد يعتقهم المريض، ثم يموت لما فيه من القمار، وإحقاق بعض، وإنجاح بعض، وهذا هو معنى القمار بعينه، وليست القرعة فى القسمة كذلك، لأن كل واحد يستوفى نصيبه لا يحقق واحد منهم والله اعلم'' (احکام القرآن للجصاص ۱/ ۳۸۸)۔

(اللہ تعالی نے قرآن پاک میں جو میسر کی حرمت بیان فرمائی ہے وہ قمار ہی ہے، اس کی رو سے ایک مریض شخص جو کہ اپنے غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی کر کے چند کو آزادی سے ہمکنار کرتا ہے، پھر مرجاتا ہے تو قرعہ اندازی کی یہ صورت قمار میں داخل ہے، کیونکہ اس صورت میں بعض غلاموں کو تو آزادی مل جاتی ہے اور بعض دوسرے اس نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں، اور یہی بعینہ قمار ہے)۔ ☆☆☆

قسطوں پر خرید وفروخت کا موجودہ عرف

مفتی زین الاسلام قاسمی، الہ آباد

۱- ادھار فروختگی میں نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ کرنا:

جس سامان کو ادھار فروخت کیا جارہا ہے اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں زیادہ کی جاسکتی ہے (کیونکہ بائع کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے بیچے) بشرطیکہ مجلس عقد میں نقد یا ادھار ہونا متعین ہوجائے، اور کسی ایک قیمت پر دونوں اتفاق کرلیں (ہدایہ ۵۸/۳)۔

۲- قسطوں میں قیمت کی ادائیگی:

اگر ادھار قیمت کی ادائیگی قسطوں میں ہو تو یہ درست ہے، بشرطیکہ قسطوں کی ادائیگی کی تاریخ اور قسط کی مقدار متعین ہوجائے (ہدایہ ۴/۳)۔

۳- دو قیمتوں میں سے ایک کی تعیین:

مجلس عقد میں یہ متعین ہوجانا ضروری ہے کہ ادھار فروخت ہورہا ہے یا نقد، اور کس قیمت میں فروخت ہوا ہے؟ عین ایجاب وقبول کے وقت اگر تردد رہے گا تو معاملہ درست نہ ہوگا (فتح القدیر ۲۶۲/۶، فتاوی ہندیہ جلد ثالث/ ۱۵۴، امداد الفتاوی ۳/ ۱۲۰-۱۲۲)۔

۴- مدت کے مقابلہ میں قیمت زیادہ کرنا:

یہ صورت ربا کی نہیں ہے، ربا اس صورت میں ہوگا جب ایک قیمت مثلاً دس روپے پر معاملہ طے ہوگیا، اور بائع نے یہ بھی کہا کہ اگر تم نے ایک ماہ میں قیمت ادا نہ کی تو بارہ روپے دینے پڑیں گے، اس صورت میں دو روپے وقت کے عوض میں ہورہا ہے، اس لیے سود ہوجائے گا۔

۵ -ایجاب وقبول کے وقت معاملہ کی کوئی ایک صورت قطعی طور پر متعین ہوجائے تو جائز ہے جیسا کہ اوپر کے جوابات سے اس مسئلہ کی وضاحت ہوچکی۔

۶- طے شدہ رقم کی ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر مالی تاوان عائد کرنا:

وقت پر قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں ہر مال کی تاخیر پر ۲/ روپے کا اضافہ سود کہلائے گا اور اس کا لین دینا حرام ہوگا (ہدایہ ثالث/ ۶۱)۔

۷- تاخیر کے عوض میں، مشروط طور پر کوئی رقم حاصل کرنا، ناجائز وحرام ہے اور سود میں داخل ہے۔

۸- (الف)...... مال مرہون سے مرتہن کا نفع اٹھانا:

مال مرہون سے بائع کو فائدہ اٹھانے کا اختیار نہیں ہے، فائدہ، خواہ اس مال کو استعمال کر کے حاصل کرے، یا اگر مکان ہے تو رہائش کے ذریعہ اور پہننے کی چیز کی ہے تو پہن کر ہر صورت انتفاع کی ناجائز ہے "کل قرض جز نفعا فھو ربا"۔

اگر رہن رکھتے وقت انتفاع کی شرط لگائی گئی ہو تو سود ہو کر ناجائز ہے، اگر شرط نہیں لگائی گئی بعد میں بطور اباحت مالک نے استعمال کی اجازت دے دی تو انتفاع جائز ہوگا (ہدایہ ۵۰۶/۴، شامی ۳۱۱/۵)۔

(ب)...... بائع کے پاس رہتے ہوئے مال مرہون کے ضائع ہوجانے کا حکم:

بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے اگر مال مرہون ضائع ہوجائے تو مرتہن مبیع اور مال مرہون دونوں کی قیمتوں میں سے جس کی قیمت کم ہوگی اس کا ضامن ہوگا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً اگر مال مرہون اور مبیع دونوں کی قیمت برابر ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنا قرض (یعنی مبیع کی قیمت) وصول کرلیا، اور اگر مال مرہون کی قیمت زیادہ ہے تو زائد رقم اس کے پاس بطور امانت تھی جس کا تاوان واجب نہیں ہوگا۔

''فإنه روی عن صلی الله علیه وسلم أنه قال: المرتهن أمين فی الفضل'' (ہدایہ)۔

اور اگر قرض زائد ہے تو مال مرہون کے بقدر اس نے اپنا قرض وصول کرلیا، اس سے زائد رقم اس کی باقی ہے جس کو وصول کرنے کا حق رہے گا۔ (ہدایہ ۴/ ۵۰۴، شامی ۵/ ۳۱۰)۔

(ج)...... مال مرہون کے ذریعہ واجب الاداء قیمت کا وصول کرنا:

مالک کی اجازت سے مال مرہون کو فروخت کیا جائے گا تا کہ اس سے اپنی بقیہ قسطیں وصول کر لے۔ بدون مالک کی اجازت کے مال مرہون کو فروخت کرنا جائز نہیں، یا یہ کہ ابتدائے عقد (ایگریمنٹ) میں یہ شرط لگالے کہ اگر فلاں وقت تک قسطوں کی ادائیگی نہ ہوگی تو ہم مال مرہون فروخت کر کے اپنا بقایا وصول کرلیں گے (ہدایہ رابع/ ۵۰۶)۔

۹- (الف)...... مبیع کو بطور رہن رکھنا:

مبیع کو بائع کے پاس بطور رہن رکھنا اس وقت درست ہوگا جب مشتری نے مبیع پر قبضہ کرلیا ہو، اور قبضہ کر لینے کے بعد بطور رہن بائع کو دے دیا ہو، ایسی صورت میں وہ سامان ثمن کے بدلے میں رہن ہوجائے گا (ہدایہ ۴/ ۵۱۸، قدامہ ۴/ ۴۲۵، درمختار ۵/ ۳۲۰)۔

(ب)...... قیمت کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روک لینا:

حبس المبیع لاستیفاء الثمن اس وقت صحیح ہوتا ہے جب معاملہ نقد ہوا ہو، ایسی صورت میں قیمت وصول کرنے کی غرض سے مبیع کو روک لینا درست ہے کیونکہ یہ عقد کے مقتضیات میں سے ہے، اور بائع کا ایسی شرط لگانا کہ جب تک تم قیمت ادا نہ کروگے ہم سامان حوالہ نہیں کریں گے درست ہے۔ (شامی ۴/ ۱۲۲، فتاوی ہندیہ ۴/ ۲۵)۔

۱۰- قسطوں کو ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع کے سامان کو اپنے قبضہ میں رکھنا:

قیمت کے لیے طے شدہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع کا سامان کو اپنے قبضہ میں رکھنا پھر وہ سامان بھی اسی کا ہوجائے اور جو قسطیں ادا کی جا چکی ہیں اس کو بھی واپس نہ کرنا درست نہیں ہے، ظلم وحرام ہے۔ "لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (سورۂ نساء: ۲۹)۔

۱۱- خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس رہن قرار دینا:

سامان خریدار کے استعمال میں رہے اور رہن مان لیا جائے، جس میں فروخت وتصرف کا حق بائع کو حاصل ہو، یہ رہن درست نہیں ہے، کیونکہ رہن کے لیے ضروری ہے کہ مفرغ ومحوز کر کے مرتہن کے حوالہ کیا جائے (شامی ۵/ ۳۰۸)۔

۱۲- ضمانت لینے کی اجرت لینا: ضمانت پر کسی قسم کی اجرت لینا ناجائز وحرام ہے۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت:

دستاویز کی خرید وفروخت درحقیقت اس سامان کی خرید وفروخت ہے جس کی یہ دستاویز ہے، اب وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں دستاویز کی خرید وفروخت تحریر کردہ قیمت سے کم پر کرنا، اگر اصل بائع سے ہے تو درست نہیں ہے، کیونکہ یہ اقالہ کی صورت ہے، اقالہ ثمن اول ہی پر ہونا چاہیے، یعنی جتنے میں اس مشتری نے معاملہ کیا ہے اتنے ہی میں سامان واپس کرسکتا ہے، کم کرنا درست نہیں ہے، اور اگر بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ دستاویز فروخت کررہا ہے تو کم پر دینا درست ہوگا۔

واجب الادا رقم کے دستاویز کی خرید وفروخت:

اور اگر دستاویز سے مراد قرض کی دستاویز ہے جو بائع نے قرض کی توثیق کے لیے تیار کرایا ہے، پھر معین تاریخ سے پہلے ہی وہ روپے حاصل کرنا چاہتا ہے اور دستاویز میں تحریر رقم سے کم مقدار میں وہ کسی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور دستاویز کا خریدار کم مقدار میں خرید لیتا ہے اور پھر دستاویز میں

تحریر رقم اصل دائن سے وصول کرلیتا ہے، دستاویز کا خریدار اگر بینک ہوتا ہے تو وہ فیصد کے اعتبار سے کٹوتی کر کے بقیہ رقم دستاویز بیچنے والے کو دے دیتا ہے، یہ صورت ازروئے شرع جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ یا تو دین کی بیع اس شخص کے ساتھ کی جارہی ہے جس پر دین نہیں ہے۔ "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" جو جائز نہیں ہے (موطا امام محمد/ ۳۵۵)۔

یا یہ کرنسی کی بیع کرنسی سے ہورہی ہے جس میں کمی زیادتی اور ادھار دونوں ممنوعات پائی جارہی ہیں، اور احادیث ربا میں اس قسم کی بیع کا ناجائز ہونا منصوص ہے، مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے مقالہ میں تھوڑی ترمیم کے ساتھ ایسی صورت لکھی ہے جس سے معاملہ جواز کے حدود میں داخل ہوجاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اگر دستاویز کا حامل ثالث (بینک) کو دَین وصول کرنے کے لیے اپنا وکیل بنادے اور اس پر اس کو کچھ اجرت دیدے۔ اور دوسرا معاملہ یہ کرے کہ حامل دستاویز بینک سے دستاویز میں تحریر رقم کے بطور قرض لے لے اور بینک کو یہ اختیار دیدے کہ دستاویز رہن سے وصول ہونے والی رقم سے وہ اپنا قرض وصول کرلے، اس طرح دو معاملے کرلیے جائیں: ایک تو "کیل بقبض الدین" کا جس پر اس کو کچھ اجرت دیدے، اور دوسرا خود بینک سے قرض لینے کا تو اس صورت میں معاملہ درست ہوسکتا ہے۔

تو قرض کی دستاویز کو مدیون کے علاوہ دوسرے کسی کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ مفتی تقی عثمانی صاحب کے بقول اگر معاملہ کرلیا جائے تو درست ہوجائے گا۔

۱۴- فوری ادائیگی کی شرط پر دین کے بعض حصہ کو معاف کردینا (ضع وتعجل):

طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگنا کہ اس کا ایک حصہ ہم معاف کردیں گے یعنی ضع وتعجل کی صورت اختیار کرنا درست نہیں ہے۔ (ہدایہ ۳/ ۲۳۵، باب ماجاء فی الربانی الدین، موطا امام مالک ا/ ۲۸۳- ۳۳۴، موطا امام محمد ا/ ۳۳۴)۔

۱۵- ضع وتعجل کی ایک دوسری صورت:

ادھار معاملہ کیا گیا اور قیمت کے لیے صرف یہ کہہ دیا گیا کہ بعد میں دے دیں گے تو یہ صورت دو وجوہ سے جائز نہیں ہے، ایک تو ادھار ادائیگی کا وقت مقرر نہیں کیا گیا، جس سے اجل مجہول ہوگی، جو مفضی الی المنازعت ہوگی، لہذا ناجائز ہے، دوسرے ضع وتعجل والی صورت اختیار کرنا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ مشروط طور پر اجل کے عوض میں دَین ساقط کیا جارہا ہے، البتہ اس معاملہ کو فسخ کر کے ازسرنو معاملہ کرلیا جائے جس سے کم قیمت پر نقد معاملہ ہوجائے اور دونوں کا مقصد پورا ہوجائے۔

۱۶- قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر فوری مطالبہ کا حق:

اگر ایگریمنٹ میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر مشتری مقررہ وقت پر کوئی قسط ادا نہ کرسکا تو اس صورت میں آئندہ باقی اقساط بھی فوراً ادا کرنے ہوں گے، اور بائع کے لیے فی الحال تمام اقساط کا مطالبہ کرنا جائز ہوگا تو ایگریمنٹ کی شرط کے مطابق ازروئے شرع اس کے لیے جائز ہے کہ تمام قسطوں کا فوری مطالبہ کرے۔ (ردالمحتار ۴/ ۱۲۲، خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴)۔

۱۷- مدیون کے انتقال کرجانے سے دائن کو فوری مطالبہ کا حق:

حنفیہ کا مسلک دین مؤجل کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اگر مدیون کا انتقال ہوجاتا ہے تو اجل ساقط ہوکر دَین فوری واجب الاداء ہوجاتا ہے، لہذا یہاں بیع بالتقسیط میں بھی فوری واجب الاداء ہوجائے گا، لیکن چونکہ بیع بالتقسیط میں ثمن کا کچھ حصہ مدت کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اس لیے مذکورہ مسلک پر عمل کرنے میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے، لہذا اس مسئلہ کو مرابحہ مؤجلہ پر قیاس کرتے ہوئے اس طرح سے طے کیا جاسکتا ہے کہ ادائے دین کی جو مدت متفق علیہ تھی، اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے، اس وقت کے مقابلہ میں جتنا ثمن آتا ہو وہ ساقط کردیا جائے، لہذا مدیون کے ترکہ میں سے صرف ایام گزشتہ کے مقابل جو ثمن ہو وہ وصول کرلیا جائے۔ مرابحہ موجلہ میں اس طرح کی صورت جائز ہے (شامی)۔

مدیون کے انتقال کی صورت میں حنابلہ کے یہاں وسعت ہے، چنانچہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کردیں، اور اس کی ادائیگی پر اطمینان دلادیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت سے فوری واجب الاداء نہ ہوگا، بلکہ وہ پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا۔

مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے مقالہ میں ان دونوں باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے یہ صورت سودی معاملات سے مشابہت ہو جاتی ہے وہ تذبذب اس صورت میں نہیں پایا جاتا۔ اس مسئلہ میں علماء کرام کو غور فرمانا چاہیے۔

۱۸- بیع بالتقسیط میں انعامی اسکیم:

اس معاملہ کا ایک جزء تو بیع بالاقساط کا ہے، جو اپنی شرائط کے ساتھ درست ہے، اور دوسرا جزء ماہ بماہ، چھ ماہ یا سال بھر پر اس پر انعام دینے کا نظام ہے جس کو قرعہ اندازی کے ذریعہ تقسیم کیا جاتا ہے، اس دوسرے جزء پر قمار کی تعریف صادق آرہی ہے یعنی "تمليك المال على خطر" اور قمار کا معاملہ کرنا حرام ہے، اور چونکہ دوسرے جزء کو پہلے جز، یعنی بیع بالاقساط کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، لہذا اس قسم کا پورا معاملہ حرام و ناجائز ہوجائے گا۔

گویا مشتری اپنی رقم سے انعام کے سلسلے میں جوا کھیل رہا ہے اور مبیع کے سلسلے میں بیع بالاقساط کر رہا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے ناجائز و حرام ہے۔

۱۹- قرعہ اندازی کے ذریعہ بقیہ قسطیں ساقط کرنا:

جس وقت معاملہ کا آغاز کیا گیا تو مجموعہ قسطوں پر معاملہ ہوا، پھر ہر مرتبہ کی قرعہ اندازی سے ایک خریدار جس کا نام قرعہ میں نکلا اس کو سامان دے دیا گیا، اور بقیہ قسطیں معاف کردی گئیں، اس معاملہ کے فساد کی ایک وجہ یہ ہے کہ مجموعی قسطوں میں سے بقیہ قسطوں کے اسقاط کے لیے خریدار جوا کھیل رہا ہے کہ اگر قرعہ اندازی میں اس کا نام نکل آیا تو قسطیں ساقط اور اگر نہیں نکلا تو قسطیں واجب۔

اور قمار کی حرمت یقینی و بدیہی ہے، دوسری وجہ ثمن کی جہالت ہے، کیونکہ ابتدائے عقد میں وہ مجموعی قیمت جو اس کو دینی پڑے گی، وہ مجہول ہے، کیونکہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اسقاط اس معاملہ کا جزء مشروط ہے۔

بیع بالتقسیط میں اس طرح کا طریقہ اختیار کرنا ناجائز و حرام ہے: "لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (سورۂ نساء: ۲۹)۔

☆☆☆

بیع وشراء میں چند قیمتوں کا تذکرہ

مولانا اختر حسین رضوی، باندہ

۱- فقہاء اسلام کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ آدمی اگر کوئی چیز ادھار فروخت کر رہا ہے اور نقد کے مقابلہ کچھ زیادہ قیمت لے رہا ہے تو بلاشبہ یہ جائز و درست ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۴/۱۷۵، ہدایہ ۳/۵۸، مبسوط ۱۳/۸۰، فتاوی فیض الرسول ۲/۳۸۸، فتاوی رضویہ ۶/۴۷۲)۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں ہے، قسط وار ادا کرنا بھی جائز و درست ہے۔ (ترمذی شریف ۱/۱۴۶، فتاوی مصطفویہ ۳/۱۴۵، کفل الفقیہ الفاہم/۱۱۲، الدر المختار علی ہامش ردالمحتار ۴/۲۴، فتاوی امجدیہ ۳/۱۵۵)۔

۳- حدیث شریف، نیز فقہاء اسلام کے تفصیلی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ بیع وشراء میں دو چند قیمتوں کا تذکرہ بایں سبب ممنوع ہے کہ ایسی صورت میں قیمت کا تعین نہیں ہو پائے گا، اور جب قیمت مجہول ہو تو بیع فاسد و ناجائز ہوتی ہے، لیکن اگر دو چند قیمتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد کسی ایک متعین قیمت پر آپس میں معاملہ طے ہو جائے تو اس میں کوئی حرج و محظور نہیں ہے، لہذا ادھار فروختگی کی صورت میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے صرف ادھار قیمت کا ذکر ضروری نہیں ہے، بلکہ نقد و ادھار میں سے ہر ایک کی قیمت بتا کر کوئی ایک صورت متعین کرنا ضروری ہے (ترمذی شریف ۱/۱۴۶، مرقاۃ ۶/۸۱، فتاوی عالمگیریہ ۳/۸۲، فتاوی امجدیہ ۳/۱۸۱)۔

۴- ہر صورت میں مدت کا معاوضہ حرام نہیں ہوتا، بلکہ دین دے کر پھر مدت کا عوض لیا جائے یا بالقصد مدت کا عوض ادھار خرید و فروخت میں ہو تو ممنوع ہے، لہذا ادھار فروختگی میں زائد قیمت کو ربا قرار دے کر ناجائز و حرام کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ تجارت تراضی طرفین کی قبیل سے ہے کہ شریعت مطہرہ نے آدمی کو اپنا مال کسی بھی قیمت پر بیچنے کا جو حق دیا ہے وہ اسے استعمال کر رہا ہے نہ کہ وہ سود حاصل کر رہا ہے، لہذا یہ زیادتی کسی بھی طرح دائرہ ربا میں نہیں آتی ہے (ہدایہ ۳/۲۳۲، البحر الرائق ۶/۱۲۵)۔

۵- معاملہ بیع میں بائع کو یہ حق ہے کہ اپنے سامان کی جو قیمت چاہے رکھے، اس لیے کہ وقت عقد چند صورتوں کو مشتری کے سامنے رکھ کر دونوں کسی ایک صورت پر معاملہ طے کر لیں تو یہ درست ہے، یہاں سود و ربا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، کہ اس کو ناجائز و حرام مانا جائے۔

۶- بلاشبہ یہ سود ہے، اس کا لینا دینا ناجائز و حرام ہے۔

۷- وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں بوجہ تاخیر جو بھی رقم مدیون سے وصول کی جائے خواہ اس کو مالی جرمانہ کہیں یا ربا و سود، بہرحال وہ ناجائز ہے، مالی جرمانہ کے ناجائز ہونے سے متعلق تفصیلات کے لیے دیکھئے (موطا امام مالک ۲/۶۷۲-۶۷۳، تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک ۲/۱۶۳، ردالمحتار ۳/۱۷۹، فتاوی مصطفویہ ۳/۲۰۳، فتاوی امجدیہ ۳/۲۹۱)۔

۸- مال مرہون سے انتفاع ناجائز و حرام اور سود و ربا ہے (درمختار علی ہامش الرد ۵/۳۳۸، ہدایہ ۴/۵۰۶، فتاوی امجدیہ ۳/۳۴۱، فتاوی رضویہ ۱۱/۲۸۲، غمز العیون بحوالہ فتاوی رضویہ ۱۱/۲۹۱، تہذیب و جامع المضمرات بحوالہ مذکورہ)۔

الف: لہذا بائع کا اس مال مرہون سے فائدہ حاصل کرنا ناجائز و حرام ہے۔

ب: اگر بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے مال مرہون ہلاک ہو جائے تو اس کا جتنا دین مشتری پر آتا تھا ہلاک شدہ مال کی قیمت کے مطابق مشتری کے ذمہ سے اتنا دین ساقط ہو جائے گا (فتاوی عالمگیری ۴/۱۵۶، ہدایہ ۴/۵۰۶)۔

ج: اگر وقت مقررہ کے گزر جانے پر بھی مشتری قیمت کی ادائیگی میں بلاوجہ ٹال مٹول کر رہا ہے تو بائع جبرا اپنے پاس رکھے ہوئے گروی سامان کو مشتری سے فروخت کرا کر اپنا دام وصول کر لے گا اور اگر مشتری مال مرہون کو نہیں بیچ رہا ہے تو بائع قاضی کے ذریعہ اس کو فروخت کرا کر قیمت حاصل کر سکتا ہے (ہدایہ ۴/۵۲۳، کفایہ مع الفتح ۹/۱۰۷، ردالمحتار ۵/۲۵۲، بہار شریعت ۱۷/۵۹)۔

۹- بائع فروخت شدہ سامان کو اس وقت تک روک سکتا ہے جب تک کہ مشتری ثمن نہ دے دے، مگر یہ اس صورت میں ہوگا جب ادائے ثمن کے لیے کوئی

مدت نہ مقرر ہو،اور اگر کوئی مدت مقرر ہو تو نہ قبل مدت روکنے کا حق ہوگا اور نہ ہی مدت گزر جانے کے بعد روکنے کا حق ہوگا (ردالمحتار ۴/ ۴۶، فتاوی عالمگیری ۳/ ۹، بہار شریعت ۱۱/ ۹۳)۔

اب جس صورت میں بائع کو مبیع کے روکنے کا حق حاصل ہو جائے تو مبیع کا روکنا اس کو رہن بنانے کے لیے یا محض اپنا حق وصول کرنے کے لیے ہے، کتب فقہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں صورتیں بن سکتی ہیں، مگر رہن ماننے میں یہ شرط ہے کہ مشتری نے خریدنے کے بعد مبیع پر قبضہ کرلیا ہو اور پھر بائع کو بطور رہن دے دیا ہو، ورنہ یہ رہن صحیح نہیں ہوگا (بہار شریعت ۱۷/ ۵۳)۔

الف: لہذا فروخت شدہ سامان کو رہن بنانے کی جہت بھی ہو سکتی ہے۔

ب: اور محض اپنا حق وصول کرنے کے لیے اس کو اپنے پاس روکنے کی بھی جہت ہو سکتی ہے، مگر انہیں مذکورہ بالا شرائط و تفصیلات کے ساتھ، البتہ دونوں صورتوں میں فرق یہ ہوگا کہ رہن کی صورت میں مرہون شی (مبیع) مضمون بالقیمۃ ہوگی، اگر وہ بائع کے پاس ہلاک ہو جائے تو مشتری کے ذمہ سے دین ساقط ہو گیا، بائع اس سے کچھ نہیں وصول کرسکتا ہے کہ ہلاک شدہ سامان بائع کی واجب الاداء قیمت کے مقابل ہلاک ہوا، اور دوسری صورت میں اگر مبیع ہلاک ہو جائے تو بیع ہی فسخ ہو جائے گی، ہلاک شدہ مال بائع کا ہی ہلاک شدہ مال مانا جائے گا، مشتری پر کچھ لازم نہیں ہوگا۔

۱۰- یہ صراحۃً ظلم وزیادتی ہے اور بائع کے لیے اس رقم کا لینا ناجائز ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (سورۂ نساء: ۲۹)۔ وہ رقم مال مغصوب کہلائے گی اسے مشتری کو لوٹانا واجب ہے (فتاوی رضویہ ۷/ ۸)۔

۱۱- یہ صورت بھی ممکن ہے کہ خرید کردہ شی کو خود خریدار کے استعمال میں رکھ کر رہن مان لیا جائے، لیکن اس کی صورت یہ ہوگی کہ مشتری خرید کردہ شی پر قبضہ کے بعد بائع کو بطور رہن وہی سامان دے دے، اور پھر بائع اس پر قبضہ کرنے کے بعد عاریت وغیرہ کے طور پر مشتری کو دے دے تو ایسی صورت میں خود خرید کردہ شی مشتری کے استعمال میں رکھ کر رہن مانی جا سکتی ہے اور بغیر اذن مرتہن (بائع) مشتری کو اس میں تصرف کا حق نہیں رہے گا۔

۱۲- یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ قرض دے کر مقروض سے کسی طرح کا فائدہ بذریعہ قرض حاصل کرنا ناجائز وحرام ہے، تو جب قرض دے کر نفع لینا حرام ہے تو محض قرض کی ادائیگی کی ضمانت و گارنٹی لینے پر قرضدار سے رقم لینا بدرجہ اولی ناجائز ہوگا، لہذا کفالت کی بناء پر قرض دار سے اجرت ومعاوضہ لینا ناجائز وحرام ہے، البتہ گارنٹی لینے کی صورت میں جو کاغذات ودستاویز تیار کرائے جاتے ہیں اگر گارنٹر ان کاغذات اور ان کو تیار کرنے کا معاوضہ لینا چاہے تو اس کی اجازت ہوگی۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت کا جو رواج ہے اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ کیا یہ معاملہ واقعی بیع وشراء ہے یا کچھ اور؟ اگر اس معاملہ کو بیع وشراء مانیں تو سوال یہ ہے کہ مبیع کیا ہے؟ آیا وہ کاغذ و دستاویز جس میں معاملے کی مکمل تفصیل مندرج ہوتی ہے، یا اس پر لکھی ہوئی تحریر یا اس پر لکھے ہوئے روپئے؟ تینوں میں سے جس کو بھی مبیع قرار دیں، بہر حال محظور لازم آئے گا، کیونکہ اگر دستاویز کی بیع مانتے ہیں تو یہ شرعا باطل ہے کہ دستاویز عرف شرع میں مال ہی نہیں، اور غیر مال کی بیع باطل ہے (درمختار علی ہامش الرد ۴/ ۱۴، نیز فتاوی رضویہ ۷/ ۲۰۶)۔

اور اگر اس میں لکھی ہوئی تحریر کو مبیع تسلیم کریں ان اور دستاویز سے مقصود بھی درحقیقت تحریر ہی ہے، اسی کی وجہ سے خرید وفروخت ہوتی ہے اور اعتبار عقود میں معانی ومقاصد کا ہی ہوتا ہے تو دستاویز کی بیع کا مطلب تحریر کی بیع ہے اور تحریر کا مال نہ ہونا تمام کتب فقہ میں مصرح ہے (فتاوی رضویہ ۷/ ۳۲)۔

اس لیے تحریر کی بیع بھی باطل ہے، اور اگر دستاویز پر لکھے ہوئے روپئے کو مبیع قرار دیں اور روپیوں کی بیع مانیں تو یہ محظور لازم آئے گا کہ روپئے کی بیع روپئے کے بدلے ادھار ہوگی کہ ایک طرف سے تو فوراً دام وصول ہو گیا اور دوسری طرف (بائع کی طرف) سے ابھی ایک میعاد مقرر پر مبیع کی تسلیم ہوگی، اور ایسی بیع ناجائز وحرام ہے کہ "بيع الجنس بالجنس نسيئة" ہے (ہدایہ ۳/ ۶۵)۔

اب تک کی تمام بحثوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ دستاویز کی بیع وشراء کا مروجہ طریقہ درحقیقت بیع وشراء ہے ہی نہیں، بلکہ قرض لین دین کا ایک طریقہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر دستاویز لکھنے والا (مشتری اول) اس پر تحریر شدہ رقم دینے سے انکار کردے تو دستاویز خریدنے والا پوری رقم اسی بائع سے جس نے دستاویز بیچی ہے وصول کر لیتا ہے، اور دستاویز اس کو واپس کر دیتا ہے، اگر یہ معاملہ بیع کا تھا تو بغیر کسی عیب وفساد کے مبیع کیوں واپس کی جاتی ہے، اور بائع بآسانی یہ واپسی کیوں قبول کر لیتا ہے، نیز عیب وفساد کی صورت میں بائع پر صرف اصل ثمن کی واپسی لازم ہوتی ہے، مشتری کو اس پر کسی نفع کا استحقاق نہیں ہوتا، مگر یہاں عرفاً مثلاً پانچ فیصد کا اضافہ

پہلے ہی سے مشروط ہے، چنانچہ اگر ایک ہزار روپے کی مثلاً دستاویز تھی، اور خریدنے والے نے پانچ فیصد کٹوتی کے حساب سے پچاس روپے کم کر کے ۹۵۰ روپے ادا کیے تھے، تو اب دستاویز کی واپسی کی صورت میں وہ پورے ایک ہزار ۱۰۰۰/ روپے واپس لے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دستاویز کی خرید وفروخت کا معاملہ حقیقت میں قرض کا معاملہ ہے، اور چونکہ دستاویز پر لکھی ہوئی رقم وقت قرض سے مثلاً ایک ماہ بعد وصول ہوگی، اس لیے دستاویز کا مشتری جو درحقیقت مقرض ہے، دستاویز کے بائع یعنی مستقرض سے دستاویز پر لکھی ہوئی مالیت سے کچھ کم پر معاملہ طے کرتا ہے اور مستقرض چاروناچار اس معاملہ کو قبول کر لیتا ہے اور پھر مقرض مشتری اول سے دستاویز پر لکھی ہوئی پوری رقم وصول کر لیتا ہے اور چونکہ وہ بائع کا محتال علیہ ہوتا ہے اس لیے وہ پوری رقم ادا کر دیتا ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ دستاویز خریدنے والے (مقرض) نے بائع (مستقرض) کو قرض دے کر مشروط نفع حاصل کیا اور میعاد کے بدلے میں معاوضہ وصول کیا، اس لیے یہ سود حرام ہے، حجۃ الاسلام امام ابوبکر جصاص الرازیؒ نے اس مسئلے کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے (تفسیر احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۷)۔

بالکل یہی حال دستاویز کی خرید وفروخت میں ہوتا ہے کہ میعاد کا معاوضہ وصول کیا جاتا ہے، لہٰذا وہ شرعاً سود وربا اور ناجائز وحرام ہے۔

۱۴- میعادی قرض کو وقت مقررہ سے پہلے وصول کرنے کی غرض سے اگر قرض خواہ کچھ کم پر مصالحت کرلے تو فقہاء اسلام نے اسے بھی سود میں شامل فرمایا ہے، اور اس کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے (تفسیر احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۷، نیز دیکھئے: ہدایہ ۳/ ۲۳۵)۔

لہٰذا بائع کا طے شدہ رقم کو وقت مقررہ سے پہلے کچھ کم کر کے وصول کرنا بھی سود میں داخل اور ناجائز وحرام ہے۔

۱۵- اگر دین کی کوئی مدت نہ مقرر ہو اور دائن فوراً وصول کرنے کی غرض سے کچھ دین معاف کر دے تو یہ جائز و درست ہے، لہٰذا اگر بائع غیر میعادی قیمت کو فوراً وصول کرنے کی خاطر کچھ قیمت کم کر دے تو یہ جائز وصحیح ہے (ہدایہ ۳/ ۲۳۵، درمختار علی ہامش الرد ۴/ ۵۲۷، بہار شریعت ۱۳/ ۱۳۰)، مگر چونکہ ایسی صورت میں قیمت کی ادائیگی کا وقت متعین نہیں ہے لہٰذا اس طرح کی بیع فاسد ہوگی۔

۱۶- قسط بندی درحقیقت ایک قسم کی تاجیل ہے اور بیع وشراء میں تاجیل درست ہے، لہٰذا قسط بندی بھی درست ہے، اور قسط بندی کے معاملہ میں اگر یہ طے ہوا کہ ایک قسط بھی تاخیر سے جمع ہوئی تو پوری رقم یکمشت دینی پڑے گی، ایسا کرنا بھی درست ہے۔ (درمختار علی ہامش الرد ۴/ ۲۶، نیز دیکھئے: بہار شریعت ۱۱/ ۱۸، فتاوی رضویہ ۷/ ۴۸۲)۔

۱۷- بیع بالتقسیط میں اگر بائع (دائن) کا انتقال ہو جائے تو اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں آئے گا، البتہ مشتری (مدیون) کے انتقال سے اس کی نوعیت میں یہ تبدیلی آجائے گی کہ بائع اب اس کے ترکہ سے اپنا بقیہ دین فوراً وصول کر سکتا ہے (بہار شریعت ۱۱/ ۱۸)۔

۱۸- معاملہ مذکورہ کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ یہ قمار وجوا ہے، کیونکہ فقہاء کرام نے جوا کی حقیقت یہ بیان فرمائی ہے کہ: کسی معاملہ میں نفع ونقصان کو غیر معین ونامعلوم بات پر معلق وموقوف کر دیا جائے کہ اگر وہ واقع ہو تو نفع اور اگر نہ واقع ہو تو نقصان، یونہی حرمت قمار کا سبب بیان کرتے ہوئے اس کی حقیقت وبنیاد "تعلیق التملیک بالخطر" سے واضح کی گئی ہے یعنی کسی چیز کا ایک شخص کی ملکیت سے دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہونا کسی ایسی شرط پر موقوف کر دیا جائے جس کا وجود میں آنا نہ آنا دونوں محتمل اور غیر یقینی ہو (عنایہ مع الفتح ۶/ ۵۵)۔

غور کریں جو تاجر اس طرح قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دیتا ہے کیا وہ انعام ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ وہ تو جوا ہے، کیونکہ انعام میں تو جانبین سے مال ہی نہیں ہوتا، جبکہ یہاں جانبین سے مال ہے، اور ہر ایک جمع کرنے والے کو سامان ملنا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ بعض ہی کو مل پاتا ہے، اور کس کو ملے گا یہ بھی پتہ نہیں ہوتا ہے، ہر شخص اسی پس وپیش میں لگا رہتا ہے کہ مجھے ملے گا کہ نہیں اور جس کو نہیں ملا تو اس کی قسط میں جمع شدہ رقم بھی واپس نہیں ملتی بلکہ ڈوب جاتی ہے۔

۱۹- صورت مذکورہ میں بائع ہر خریدار کو مبیع سپرد کرتا ہے اور ان سے قسط وار رقم جمع کراتا ہے، لہٰذا معاملہ کی یہ صورت۔ "مبادلة المال بالمال بتراضی الطرفين" کی قبیل سے ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ کسی خریدار کو ایک ہی قسط جمع کرنے کے بعد سامان مل گیا، اور کسی کو دو چند اور کسی کو پوری قسط جمع کرنے کے بعد مبیع حاصل ہوئی، سامان بہر حال ہر ایک کو ملا، البتہ بائع ومشتری دونوں کے لئے گویا ایک اعتبار سے ثمن مجہول رہتا ہے، کیونکہ مشتری کو یہ نہیں معلوم رہتا کہ کتنی قسط جمع کرنے کے بعد میرا نام نکلے گا، اسی طرح بائع کو بھی نہیں معلوم رہتا کہ میں کس خریدار کو اپنا سامان کس قیمت میں دوں گا، یہ تو نام نکلنے کے بعد معلوم ہوتا ہے، لہٰذا جہالت ثمن کی بناء پر یہ طریقہ ناجائز ہوگا۔ مگر چونکہ یہ جہالت مفضی الی المنازعت نہیں ہے، اس لیے یہ طریقہ بیع وشراء درست ہے۔

☆☆☆

نقد فروخت کے مقابلہ ادھار میں قیمت زیادہ کرنا

مفتی عبدالقیوم پالنپوری، گجرات

۱- ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک ادھار بیع میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں قیمت زیادہ کرنا جائز و درست ہے۔ (المبسوط للسرخسی ۱۳ / ۷ ۔ ۸ فقہی مقالات ۵ / ۳۳۵، البلاغ ۔ ستمبر ۱۹۹۵ء دار العلوم کراچی)۔

۲- بیع مؤجل میں جس طرح ثمن کی یکمشت (مدت کے پورا ہونے پر) ادائیگی کو مقرر کرنا درست ہے، اسی طرح ادھار قیمت کو قسطوں میں ادا کرنے کو مقرر کرنا بھی درست ہے، ''البیع من تأجیل الثمن و تقسیطه صحیح'' (شرح المجلہ / ۱۲۵)۔

۳- اگر کوئی شخص بھاؤ تاؤ کے وقت مختلف قیمتیں بیان کرتا ہے، مثلاً یہ کہے کہ یہ چیز نقد میں ۱۰۰ روپئے میں اور ادھار سوا سو (۱۲۵) روپے میں، لیکن مجلس عقد ہی میں عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کی تعیین پر اتفاق ہوجاتا ہے، تو اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے، اور اگر بھاؤ تاؤ کے وقت بائع مشتری سے کہے کہ اگر تم نقد ثمن ادا کروگے تو اس چیز کی قیمت سو روپئے ہے اور اگر چھ ماہ کے بعد ادا کروگے تو اس کی قیمت ایک سو دس روپئے ہے، اور پھر مجلس عقد میں کسی ایک شق کی تعیین کے بغیر عاقدین اس خیال سے جدا ہوگئے کہ مشتری ان دو شقوں میں سے ایک شق کو بعد میں اپنے حالات کے مطابق اختیار کرے گا تو یہ بیع بالاجماع حرام ہے، اور عاقدین پر واجب ہے کہ وہ اس عقد کو فسخ کردیں اور از سر نو عقد کریں، جس میں ایک شق کی وضاحت کے ساتھ تعیین ہو۔ (فقہی مقالات اول / ۸۲ تا ۸۵)۔

ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بھاؤ تاؤ کے وقت صرف ادھار قیمت کا ہی تذکرہ کیا جائے (بذل المجہود ۱۵ / ۱۳۶)۔

۴- ادھار بیچنے میں نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرے میں نہیں آتا ہے، اس لیے کہ اجل و مدت کی (بیع مرابحہ میں) مبیع کے ساتھ مشابہت ہے، لہذا مبیع کے تابع ہو کر اجل کے مقابلہ میں ثمن کی زیادتی کرنا صحیح ہے (البحر الرائق ۶ / ۱۲۴ ۔ ۱۲۵، فقہی مقالات اول / ۸۳ ۔ ۸۴)۔

۵- سوال میں گیارہ ہزار دو سو کتابت کی غلطی ہے اس کے بجائے تیرا ہزار دو سو ہونا چاہیے تب ہی اس کی بارہ قسط کریں تو ایک قسط میں ۱۱۰۰ / روپے ہوں گے، اور یہ معاملہ شرعاً درست اور جائز ہے جیسا کہ ماقبل میں گزرا۔

۶- یہ صورت شرعاً حرام اور سود میں داخل ہے، اس لیے کہ اس چیز کی اصل قیمت دس روپئے مقرر کردی اور یہ دس روپئے بیع کے نتیجہ میں مشتری کے ذمہ دین ہوگئے، اب تاخیر کی وجہ سے اس دس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا یقیناً سود ہے (فقہی مقالات ۸۵-۸۶)، تفسیر کبیر میں ہے:

''ثم إذا حل الدین طالبوا المدیون برأس المال، فإن تعذر علیه الأداء زادوا فی الحق والأجل، فهذا هو الربا الذی کانوا فی الجاهلیة یتعاملون به'' (۷ / ۹۱)۔

۷- یہ صورت بھی سود میں داخل ہے، اس لیے کہ عقد بیع میں مبیع ایک قیمت مقرر ہوجانے کے بعد تاخیر کی وجہ سے زیادہ رقم لازم کرنا چاہے فی صد کے حساب سے ہو یقیناً سود ہے، اس مزید رقم کو سود ہی کہا جائے گا۔

۸- (الف)...... شئ مرہون سے بائع کے لیے فائدہ اٹھانا اگرچہ راہن کی اجازت سے ہو جائز نہیں، اس لیے کہ یہ منتفع ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے۔ (رد المحتار ۵ / ۷ ۴۲، فقہی مقالات / ۸۷)۔

(ب)...... بائع کے قبضہ میں اگر مال مرہون ہلاک ہوجائے اور مال رہن کی قبضہ کے دن کی قیمت اور مشتری پر واجب ثمن دونوں برابر ہیں تو بائع اپنا دین یعنی ثمن حکماً وصول کرنے والا شمار ہوگا، لہذا مشتری سے ثمن ساقط ہوجائے گا۔ اور اگر رہن کی قیمت ثمن کی مقدار سے کم ہے تو

رہن کی قیمت کے بقدر ثمن کی مقدار میں سے مشتری سے ساقط ہوجائے گا اور بقیہ ثمن بائع مشتری سے وصول کرے گا، اور اگر مال رہن کی قیمت ثمن سے زائد ہے تو اس صورت میں بھی مشتری سے ساقط ہوجائے گا اور ثمن کی مقدار سے جو زائد مال مرہون ہلاک ہوا ہے اسے مشتری بائع سے وصول نہیں کرے گا (اگر بلا تعدی ہلاک ہوا ہو تو اور اگر تعدی سے ہلاک کیا ہے تو مشتری اس زائد کے بقدر وصول کرے گا اور اس صورت میں مال رہن کی ہلاکت کے دن کی قیمت معتبر ہوگی)۔(ردالمحتار مع الدر ۵/ ۴۲۵۔۴۲۶)

(ج)......خریدار اگر وقت مقرر پر ثمن ادا کرنے سے قاصر ہوجائے یا ٹال مٹول کرتا ہے تو اس مال رہن کو بیچ کر بائع (مرتہن) اپنا دین یعنی ثمن کی مقدار وصول کرلے، زائد وصول کرنا جائز نہیں، اور اپنے ثمن سے جو زائد رقم ملے اسے مشتری کو لوٹا دینا ضروری ہے، اصل حکم تو یہ ہے کہ اس وقت بیچنا جائز ہے جبکہ راہن نے اس کے بیچنے کا وکیل بنایا ہو، یا اس کے بیچنے کی اجازت دی ہو، یا عدالت کے حکم سے بیچا جائے، لیکن اگر دین کے وصول ہونے کی امید نہ ہو تو خلاف جنس سے دین وصول کرنے کے جواز پر فتوی ہے، لہذا رہن کو بیچ کر اپنا دین وصول کرسکتا ہے (ردالمحتار ۵/ ۴۵۰، ہدایہ ۴/ ۵۲۲، الجلۃ/ ۱۱۶)۔

۹- (الف)......بائع کا مبیع کو اپنے پاس روکنا رہن بنا کر دو طرح سے ہوسکتا ہے: ایک یہ کہ مبیع پر مشتری قبضہ کرنے کے بعد بائع کو رہن کے طور پر سونپ دے، اس صورت میں یہ مبیع شرعاً رہن ہوجائے گی، اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، اور اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں بیع فسخ نہیں ہوگی۔(کفایہ علی ہامش الفتح ۹/ ۹۹)۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری نے مبیع پر قبضہ نہیں کیا ہے، اور بائع مبیع کو رہن بنا کر اپنے پاس روکے رکھے تو یہ صورت شرعاً رہن کی نہیں، بلکہ "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" کی ہوجاتی ہے اور بیع مؤجل اور بیع بالتقسیط میں "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" جائز نہیں، لہذا یہ صورت جائز نہیں ہے۔ (ردالمحتار ۵/ ۴۴۰)۔

(ب)......اور بائع کا ثمن کی وصولیابی کے لیے نقد بیع میں مبیع کو روکنا جائز ہے اور ادھار بیع میں جس کی ایک قسم "بیع بالتقسیط" بھی ہے، جائز نہیں ہے (ہندیہ ۳/ ۱۵، فقہی مقالات اول ۸۸)۔

۱۰- یہ صورت شرعاً درست نہیں، بلکہ بیع فاسد ہے، اس لیے کہ طے شدہ اقساط ادا نہ کرنے کی صورت میں مبیع بائع کی ہوجائے گی، اور ادا شدہ اقساط ضبط کرنے کی شرط شرطِ فاسد ہے، لہذا عاقدین پر واجب ہے کہ اس معاملہ کو فسخ کردیں، اور بائع نے جو اقساط وصول کی ہیں ان کو واپس کرنا ضروری ہے۔

۱۱- رہن کے صحیح اور جائز ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ مرتہن شئی مرہون پر قبضہ کرے، چنانچہ علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں:

"أفاد أن القبض شرط اللزوم کما فی الهبة، و صحح فی المجتبی أنه شرط الجواز" (درمختار مع الرد ۵/ ۴۲۴)۔

سوال میں مذکور صورت میں مرتہن شئی مرہون پر قبضہ نہیں کرتا ہے، لہذا رہن صحیح نہ ہونا چاہیے۔ لیکن عصر حاضر کے محقق فقیہ مفتی محمد تقی صاحب کا رجحان جواز کی طرف ہے، چنانچہ حضرت مولانا اپنے مقالہ میں "الرهن السائل" کے عنوان کے تحت طویل بحث کے بعد تحریر فرماتے ہیں: بہر حال مندرجہ بالا پانچ ملاحظات کی بنیاد پر میری رائے کا رجحان "رہن سائل" کے جواز کی طرف ہوتا ہے (فقہی مقالات اول ۹۵ رہن صحیح مانا جائے یا نہیں، دونوں صورتوں میں بظاہر احکام میں کوئی فرق نہیں ہوگا، اس لیے کہ جب اس شئی پر راہن ہی کا قبضہ رہے گا تو رہن کے ہلاک ہونے کی صورت میں اس کا ضمان مرتہن پر نہیں آئے گا، بلکہ راہن ہی کی چیز ہلاک ہوگی۔

"فان هلك فی ید الراهن هلك بغیر شئی لفوات القبض المضمون" (ہدایہ مع الفتح ۹/ ۱۱۶)۔

۱۲- ضمانت اور عقد کفالت کی اجرت لینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ کفالت بھی قرض کی طرح ایک عقد تبرع ہے، لیکن بینک اور ادارے بہت سے امور انجام دیتے ہیں جو ان پر لازم نہیں، لہذا ان امور کی انجام دہی پر بحیثیت دلال یا وکیل اجرت لینا جائز ہے، چنانچہ حضرت مولانا تقی صاحب تحریر فرماتے ہیں: حقیقت یہ ہے کہ عقد تبرع ہونے کے اعتبار سے گارنٹی اور قرض میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح قرض پر نفع لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح گارنٹی پر اجرت لینا بھی جائز نہیں ہے، بلکہ گارنٹی پر اجرت کا مطالبہ کرنا قرض پر منافع کے مقابلہ میں بطریق اولی

جائز نہیں، اس لیے کہ کفالت میں مکفول لہ کی طرف سے دین کی ادائیگی کا محض التزام ہوتا ہے، اور جب وہ کفیل اس کی طرف سے دین ادا کرتا ہے، اس وقت اصیل کے ذمہ کفیل کا قرض ہوجاتا ہے گویا کہ کفیل صرف قرض دینے کا التزام اپنے اوپر کرتا ہے اور جب قرض دینے پر کسی منافع کا مطالبہ جائز نہیں تو پھر صرف قرض دینے کے التزام پر منافع یا اجرت کا مطالبہ بطریق اولی جائز نہیں ہونا چاہیے۔ بہرحال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ضمانت پر اجرت لینا کسی حال میں جائز نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کو بین الاقوامی تجارت اور لین دین میں کریڈٹ لیٹر (Credit Letter) جاری کرنے میں اس کی ضرورت رہتی ہے تو پھر اس کی متبادل صورت کیا ہوسکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ بینک کے لیے اپنے عمیل سے دو چیزوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے:

۱۔ ''لیٹر آف کریڈٹ'' جاری کرنے کے عمل میں بینک کے جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں، ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

۲۔ امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے سلسلہ میں بینک جو خدمات بجالاتا ہے، اس پر بحیثیت وکیل یا بحیثیت دلال یا درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خدمات پر اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز ہے، لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز نہیں (فقہی مقالات اول/ ۹۸،۹۷)۔

۱۳- ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان دستاویزات کی بیع نہیں ہے، بلکہ بائع کا مشتری کے ذمہ جو دین (ثمن) ہے اس کو مشتری کے علاوہ سے کمی میں بیچا جارہا ہے، لہذا یہ بیع الدین من غیر من علیہ الدین ہے جو شرعا جائز نہیں ہے۔

''(قولہ: ولا یجوز من غیرہ... الخ) ای لا یجوز تملیک الدین من غیر من علیہ الدین... الخ'' (ردالمحتار ۴/۲۳۰)۔

نیز اس میں کرنسی کی کرنسی کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ بیع ہے جو ناجائز اور حرام ہے (فقہی مقالات/ ۹۹)۔

مفتی تقی صاحب نے اس کا متبادل بتایا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس معاملہ کو تھوڑی سی تبدیلی کے ذریعہ درست کیا جاسکتا ہے، وہ اس طرح کہ اولا حامل دستاویز بینک کو مشتری (دستاویز جاری کرنے والے) سے دین وصول کرنے کا وکیل بنادے اور اس وکالت پر یہ شخص بینک کو کچھ اجرت بھی دیدے، اس کے بعد نئے معاملہ کے ذریعہ یہ شخص (حامل دستاویز) دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض لے لے اور بینک کو اس کا اختیار دے دے کہ جب مشتری سے اس دستاویز کے عوض رقم وصول ہوجائے تو وہ اس رقم سے اپنا قرض وصول کر لے، اس طرح یہ دو معاملات علیحدہ علیحدہ ہوں گے، پہلا معاملہ یہ کہ یہ شخص بینک کو قرض وصول کرنے کے لیے کسی معین اجرت پر اپنا وکیل بنادے، اور دوسرا معاملہ یہ کہ وہ خود بینک سے قرض لے لے، اور بینک کو دستاویز کے بدلے وصول ہونے والی رقم سے قرض وصول کرنے کا اختیار دے دے، لہذا شرعی لحاظ سے یہ دونوں معاملات درست ہوجائیں گے، پہلا معاملہ تو اس لیے درست ہے کہ اس میں اجرت پر وکیل بنانا ہے اور شرعا اجرت پر وکیل بنانا جائز ہے، اور دوسرا معاملہ اس لیے درست ہے کہ اس میں کسی زیادتی کی شرط کے بغیر قرض کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور شرعا یہ بھی جائز ہے (فقہی مقالات اول/ ۹۹، ۱۰۰)۔

۱۴- ادھار خرید و فروخت میں بائع کا طے شدہ ثمن کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگنا کہ اس کا ایک حصہ وہ معاف کردے گا، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ضع وتعجل (کچھ ساقط کرو اور جلدی حاصل کرو) کہا جاتا ہے، اس کے حکم کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، حضرت ابن عباس ؓ، حضرت ابراہیم نخعیؒ، امام زفرؒ اور ابوثورؒ اس کے جواز کے قائل ہیں، اور صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، ابن عمر، زید بن ثابت، حضرت مقدادؓ اور محمد بن سیرین، حسن بصری، حکیم بن عتیبہ اور امام شعبیؒ تابعین میں سے اور ائمہ اربعہؒ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں (مؤطا محمد ۱/ ۳۳۲)۔

البتہ اس کا ممنوع وحرام ہونا صرف دیون مؤجلہ میں ہے، نقد دیون میں ضع وتعجل کا عمل جائز ہے (فقہی مقالات ۱۰۰ تا ۱۱۰)۔

ادھار دیون میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا بیع مساومۃ میں (یعنی ان بیوع میں جس میں بائع اپنا منافع بیان کیے بغیر اپنی چیز مشتری کے ہاتھ بھاؤ تاؤ کے ذریعہ فروخت کرتا ہے) تو جائز ہے، ہاں اگر بیع مرابحہ ہو (یعنی جس میں بائع مدت کے مقابلہ میں ثمن میں جو زیادتی کر رہا ہے اس کو صراحۃً بیان کردے) تو اس کے بارے میں متاخرین احنافؒ کا فتوی یہ ہے کہ اس صورت میں اگر مدیون وقت مقررہ سے پہلے اپنا دین ادا کردے یا مدت مقررہ سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا اور مقررہ مدت

تک جتنے ایام باقی ہیں اس کے مقابل کا ثمن میں سے نفع چھوڑنا ہوگا (ردالمحتار ۶/ ۷۵۷ و ایضاً ۵/ ۱۶۰۔ بحوالہ فقہی مقالات ۱/ ۱۱۵ تا ۱۱۸)۔

لیکن متاخرینؒ کے اس فتوی پر عمل کر کے "ضع وتعجل" کا عمل بیع مرابحہ اور قسطوں پر بیع میں مناسب نہیں ہے، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی تقی صاحب کی رائے ہے، انہوں نے لکھا ہے: ضع وتعجل کے قانون کے عدم جواز پر جو دلائل ہم نے پیچھے ذکر کیے ہیں، وہ ہر دین مؤجل پر ثابت ہوتے ہیں، ان میں بیع مساومہ اور بیع مرابحہ کا کوئی فرق نہیں، اور اگر مندرجہ بالا فتوی پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں بیع مرابحہ اور قسطوں پر بیع کی ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہوگی، جن میں مختلف مدتوں کے ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شک رہتا ہے کہ وہ کم ہوگی یا زیادہ۔ لہذا میری رائے میں "بیع بالتقسیط" اور "بیع مرابحہ" کے وہ معاملات جو اسلامی بینکوں میں رائج ہیں ان میں مندرجہ بالا فتوی پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے (فقہی مقالات/ ۱۱۸)۔

۱۵- ادھار معاملہ میں جب مدت متعین نہیں کی گئی ہے، صرف مشتری نے یہ کہا کہ میں بعد میں دے دوں گا (بائع اس پر راضی ہے) تو مدت کی جہالت کی وجہ سے یہ معاملہ فاسد ہے، لہذا ایسے معاملہ میں عاقدین پر واجب ہے کہ اس کو فسخ کر دیں اور فسخ کرنے کے بعد از سر نو نقد بیع کریں اور اس میں پہلی مقررہ قیمت سے کم قیمت طے کریں تو بھی درست ہے۔

۱۶- "بیع بالتقسیط" میں اس طرح شرط لگانا کہ مشتری کوئی قسط وقت مقررہ پر ادا نہ کر سکا تو اس صورت میں آئندہ کی باقی قسطیں فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا، جائز ہے (خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴)۔ لہذا اگر مشتری نے اس صورت میں کوئی قسط مقررہ مدت پر ادا نہیں کی تو بائع کے لیے یہ جائز ہوگا کہ وہ بقیہ اقساط کا فی الفور مطالبہ کرے۔ (فقہی مقالات/ ص ۱۱۹-۱۲۰)۔

۱۷- بیع بالتقسیط میں مدت مقررہ سے پہلے مدیون کا انتقال ہو جائے تو احناف، شوافع، مالکیہ کا مذہب اور امام احمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ دین مؤجل فوری واجب الاداء ہو جاتا ہے، اور حنابلہ کا مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق رہن یا کفیل سے کر دیں اور اس کی ادائیگی کا اطمینان دلا دیں تو اس صورت میں وہ دین پہلے ہی کی طرح مؤجل رہے گا۔ احنافؒ کے نزدیک مدیون کی موت کی وجہ سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہوگا، لیکن متاخرین احنافؒ نے فتوی دیا ہے کہ اس صورت میں دائن (بائع) مدیون کے ترکہ سے فی الفور نفع میں سے صرف اسی قدر وصول کرے گا جو گزشتہ مدت کے مقابل ہوگا، اور جو نفع مابقی مدت کے مقابل ہوگا اس کو ترک کر دے گا۔

اور مدیون کی موت کی صورت میں دین کا فوری واجب الاداء قول لینے میں متاخرین کے اس فتوی پر عمل کیا جائے، تاکہ مدیون کے ورثاء کا نقصان نہ ہو یا حنابلہ کے مختار قول (کہ مدیون کی موت کے بعد بھی دین مؤجل ہی رہے بشرطیکہ اس کی ادائیگی کی توثیق اس کے ورثاء کی جانب سے ہو جائے) پر عمل کیا جائے تو بھی درست ہے، چنانچہ حضرت مولانا تقی صاحب نے لکھا ہے کہ مدیون کے ورثاء کا نقصان نہ ہو، لہذا مناسب ہے کہ یا تو متاخرین حنفیہ کا قول لیا جائے کہ اداء دین کی جو مدت متفق علیہ تھی اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے، اس وقت کے مقابلہ میں جتنا ثمن آتا ہو وہ ساقط کر دیا جائے، لہذا مدیون کے ترکہ میں سے صرف ایام گزشتہ کے مقابل جو ثمن ہو وہ وصول کر لیا جائے، یا حنابلہ کا قول اختیار کیا جائے کہ جس طرح وہ دین مؤجل تھا اب بھی اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے، البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس کی توثیق کر دیں، شاید حنابلہ کا قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے صورۃً سودی معاملات سے مشابہت ہو جاتی ہے وہ تذبذب اس صورت میں نہیں پایا جاتا ہے (فقہی مقالات/ ص ۱۳۷-۱۳۸)۔ اور اگر بیع بالتقسیط میں مدت مقررہ سے پہلے دائن (بائع) کا انتقال ہو جائے تو دین فوری واجب الاداء نہیں ہوگا بلکہ مشتری وقت مقررہ پر ہر قسط ادا کرتا رہے گا، فوری مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں (ردالمحتار ۴/ ۳۱)۔

۱۸- ایک تاجر کوئی چیز قسطوں پر فروخت کرتا ہے اور اس طرح کی اسکیم بناتا ہے کہ مثلاً پندرہ سو روپے کی سائیکل دس قسطوں میں قیمت کی ادائیگی پر ملے گی اور ہر قسط ڈیڑھ سو روپے کی ہوگی اور ہر ماہ یا چھ ماہ یا سال بھر میں قرعہ اندازی کی جائے گی اور جس خریدار یا خریداروں کا نام قرعہ میں نکلے گا ان کو مخصوص انعام بھی ملے گا، البتہ ہر خریدار کو تمام قسطیں ادا کرنی ہوں گی، یہ صورت جائز ہے اور صریح قمار میں داخل نہیں ہے، لیکن جو خریدار اس موہوم انعام ہی کی غرض سے اس چیز کو خریدتے ہیں وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہے ہیں، اس لیے مسلمان تاجر کے لیے ایسی اسکیم بنانا

اور مسلم خریداروں کو ایسی اسکیم میں انعام کی غرض سے شرکت کرنا مناسب نہیں ہے، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں: ہر ماہ سائیکل انعام میں دینا لالچ دے کر خریداروں کو بڑھانا ہے کہ خریدار بلا ضرورت ۱۲ / روپے ماہانہ جمع کرا دیا کریں پھر ایک سائیکل تو بہر حال ملے گی، ممکن ہے کہ انعام بھی نکل آوے، اگر اس انعام کی صورت میں خریدار کا روپیہ ضائع ہونے کی کوئی صورت نہیں، جیسا کہ عبارت سوال سے ظاہر ہوتا ہے اور قیمت بھی پوری دیتا ہے، یہ نہیں کہ قیمت پوری ہونے سے پہلے (خواہ ایک ہی قسط پر سہی) اگر نام نکل آئے تو سائیکل مل جاوے اور بقیہ قیمت ساقط ہو جائے تب تو بظاہر یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے ورنہ جوئے کی شکل ہو کر نا جائز ہو جائے گی۔ (فتاوی محمودیہ ۱۳ / ۴۵۷)۔

اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ اسی قسم کی ایک صورت کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے، کیونکہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے، لیکن اب مدار نیت پر رہ جاتا ہے، جو شخص موہوم انعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہا ہے، اور جس کے پیش نظر صرف نمائش میں جانا ہے اور انتہائے انعام کی ہوس پیش نظر نہیں، پھر اتفاقاً انعام بھی مل گیا تو وہ قواعد کی رو سے قمار کے حکم سے نکل گیا (جواہر الفقہ ۲ / ۳۴۵)۔

۱۹- یہ صورت سود و قمار پر مشتمل ہے، مسلمان تاجر کے لیے اس قسم کی اسکیم بنانا یا کسی مسلمان کے لیے اس میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب بعینہ ایسے ہی سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: بلا شبہ مذکورہ اسکیم اور معاملہ سود اور قمار پر مشتمل ہے، لہٰذا حرام ہے، یہ اسکیم چلانا یا اس میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے (فتاوی رحیمیہ ۶ / ۱۴۲)۔

اسی طرح حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ بعینہ اسی صورت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہے، وقت عقد ثمن مبیع متعین ہونا چاہیے، وہ یہاں متعین نہیں، بلکہ مجہول ہے، کمی زیادتی ظاہر ہے، جتنی رقم دی ہے اس پر زیادتی کون سے عقد کی بناء پر ہے، اس کو قمار بھی کہا جا سکتا ہے اور ربا بھی (فتاوی محمودیہ ۱۱ / ۳۱۱)۔

چند قسطوں میں ثمن ادا کرنے کی شرعی حیثیت

مولانا اعجاز احمد قاسمی [1]

۱- نقد فروختگی کے مقابلے میں ادھار فروختگی کی قیمت میں اضافہ کردینا شرعاً درست ہے۔ جس طرح کسی تاجر کے لیے یہ جائز ہے کہ دہ ۱۰/ روپے قیمت والی شی کو ۱۲/ روپے میں فروخت کردے، اگر ۱۲/ روپئے میں نقد فروختگی درست ہے تو اتنی قیمت میں ادھار فروخت کرنا بھی درست رہے گا، بشرطیکہ دھوکہ اور فریب کا امکان نہ ہو۔ اور نہ اس کی نیت ہو۔ مشتری کے سامنے صحیح صورتحال آگئی اب اگر اصل قیمت سے کچھ زائد پر سامان خریدنے میں خیر سمجھے گا خریدے گا ورنہ باز رہے گا۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی جس طرح یکمشت جائز ہے اسی طرح چند قسطوں میں بھی ادا کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ اقساط متعین ہوں۔ یعنی اس بات کی تعیین ضروری ہے کہ مشتری کتنی قسطوں میں ادا کرے گا۔ ہر قسط کی مقدار متعین ہو اور قسطوں کی مدت بھی معلوم ہو۔ مندرجہ بالا امور کے بالاتفاق طے ہوجانے کے بعد معاملہ مفضی الی النزاع نہیں رہے گا، قسط وار رقم کی ادائیگی کا عدم جواز اس امر پر مبنی تھا کہ قسطوں کی تاریخ مجہول ہو، ثمن معلوم نہ ہو، مقدار قسط غیر متعین ہو جو نزاع کا باعث ہوسکتا تھا، اور یہاں ایسی صورت نہیں ہے، بائع قسطوں میں ثمن لینے پر راضی ہے اور مشتری قسط کے مطابق ثمن کے ادا کرنے کا پابند ہے، اس طرح آئندہ نزاع کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۳- ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی اس وقت تک جائز نہ ہوگی جب تک عاقدین عقد کے وقت ہی کسی ایک شق پر متفق نہ ہوجائیں۔ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کردینا ادھار بیع کے لیے کافی نہیں، نقد اور ادھار بیع میں قیمتوں کے فرق کے تذکرہ کے بعد اگر عاقدین کسی ایک شق پر متفق نہیں ہوئے تو جہالت فی الثمن کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوجائے گی۔

۴- ادھار قیمت میں مال کی قیمت کی زیادتی "وقت" اور "مدت" کے عوض محسوس ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نقد اور ادھار بیع کے ثمن میں تفاوت بائع کا اپنی شی پر قیمت کے سلسلے میں اختیار کلی کا نتیجہ ہے، مدت کے مقابلہ میں ثمن کی زیادتی پر ربا کی تعریف صادق نہیں آتی۔ اس لیے کہ وہ اموال ربویہ میں سے نہیں ہے اور نہ یہ قرض ہے، جس پر نفع لیا جارہا ہے، بلکہ یہ ایک بیع ہے جس میں ثمن کی زیادتی کو ایک وقت اور حالت کے اعتبار سے عاقدین نے اتفاق سے طے کیا ہے جب بائع اور مشتری دونوں نے دو ثمن میں سے ایک پر اتفاق کرلیا تو جہالت اور تردد فی الثمن ختم ہوگیا۔

"فإن فارقه علی أحدهما فلا بأس إذا كانت العقدة على أحدهما" (ترمذی)

(اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہوگیا تو کوئی حرج نہیں)۔

۵- اوپر تحریر کیا جاچکا ہے کہ اگر فریقین باہم رضامندی سے معاملہ کی کسی ایک صورت پر متفق ہوجاتے ہیں اور دوسری صورت اتفاق سے ختم کرلی جاتی ہے، تو چونکہ تردد اور جہالت کو عاقدین نے باہم رضامندی سے پہلے ہی ختم کرلیا ہے، اس لیے شرعاً اس معاملہ میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اگر چھ ماہ میں چھ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت بارہ ہزار روپے پر اتفاق ہوجاتا ہے تو سامان کی قیمت وہی متعین ہوجاتی ہے بصورت دیگر گیارہ ہزار روپے۔

۶- وقت مقررہ پر دین کی عدم ادائیگی کی صورت میں رقم کا اضافہ سود کہلائے گا، مسلمہ اصل ہے "كل قرض جر نفعا فهو ربا" (ہر وہ قرض جو نفع کھینچ کر لائے وہ سود ہے) یہ اضافہ محض تاخیر کی بناء پر ہے، اور تاخیر کوئی عوض نہیں، پس اضافی رقم خالی عن العوض ہوکر ربا میں داخل ہوگئی۔

۷- مدیون دین یا دین کی کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، تو دین کی ادائیگی میں کوتاہی کی دو جہتیں ہوسکتی ہیں۔

الف:...... مفلسی اور تنگدستی کی وجہ سے دین ادا نہ کرسکا۔

ب:...... وسعت کے باوجود بدنیتی اور خود غرضی کی وجہ سے ٹال مٹول کی راہ اختیار کرتا ہے۔

---

[1] مہتمم مدرسہ محمود العلوم، دملہ، مدھوبنی، بہار۔

پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کو مہلت دی جائے۔ قرآن کہتا ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة الى ميسرة" (سورۂ بقرہ: ۲۸۰) (مدیون اگر تنگدست ہو تو وسعت کے زمانہ تک اس کو مہلت دو)، دائن کو ایسے شخص کو مہلت دینی چاہیے، البتہ دوسری صورت میں جو عام طور پر ہمارے زمانہ میں پائی جاتی ہے، ایسے شخص کو حدیث میں ظالم کہا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مطل الغني ظلم" (بخاری) (مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے)۔

دوسری حدیث میں ہے: "لي الواجد يحل عقوبته وعرضه" (بخاری) (مال دار شخص کا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور آبرو کو حلال کر دیتا ہے)۔

مدیون کا عمل ناپسندیدہ ہے، آدمی شرعاً اس فعل کی وجہ سے مستحق تعزیر بن جاتا ہے۔ مگر کیا اس تعزیر سے تعزیر مالی (مالی تاوان) مراد ہے۔ تعزیر مالی کے جواز وعدم جواز میں اختلاف کے باوجود کسی نے لفظ "عقوبۃ" کی تفسیر مالی معاوضہ اور مالی تاوان سے نہیں کی، اور یہ ٹال مٹول نئے دور کے پیدا شدہ مسائل تو ہیں نہیں، بلکہ ہر زمانہ کے تجار اس مصیبت سے دوچار ہوتے رہے ہیں، مگر کسی زمانہ میں کسی نے ٹال مٹول کے عوض میں مال کو لازم نہیں کیا، اب رہا کہ اس پریشانی کا حل کیا نکالا جائے، ہر شخص اپنی تنگدستی اور مفلسی کو ظاہر کرے گا اور تاجر کے لیے یہ امر نہایت مشکل ہے کہ وہ افلاس کی تحقیق کرتا پھرے، مالداری کو ثابت کرنے کے لیے وہ عدالت کے دروازے کو کھٹکھٹائے اور مقدمہ بازی ہو۔ جتنا حاصل نہیں ہوگا اس سے زیادہ مقدمہ بازی میں خرچ کرے گا۔ کیا اس پریشانی کا حل بائیکاٹ ہو سکتا ہے؟ جواب نفی میں ہوگا۔ اس لیے کہ بائیکاٹ تاجروں اور بینکوں کے درمیان اتحاد کے بغیر ناممکن ہے، دوسرا تاجر رقابت کی وجہ سے اس کی پشت پناہی کرے گا تاکہ مدمقابل کا کاروبار ٹھپ ہو جائے وغیرہ۔

جسمانی تعزیر مثلاً تحبیس وغیرہ ممکن نہیں، بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں اور بھی غیر امکانی عمل ہے، حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب نے اس کا ایک حل پیش فرمایا ہے، حضرت کی رائے سے احقر کو اتفاق ہے، وہ فرماتے ہیں: ایسا ممکن ہے ٹال مٹول کے عوض میں اپنی طرف سے مالی جرمانہ عائد کرنے کے بجائے مدیون سے معاہدہ نامہ پر دستخط لیتے وقت اس پر یہ لازم کر دیا جائے کہ دین کی ادائیگی میں کوتاہی بلاوجہ کرنے کی وجہ سے تم کو دین کے تناسب سے کوئی متعینہ مقدار ادا کرنی ہوگی اور اس رقم کو رفاہ عام اور عام خیراتی کاموں میں تیری طرف سے ادا کیا جائے گا۔ اور مدیون معاہدہ نامہ پر دستخط کر کے اپنے آپ کو پابند کرے۔ اگر بروقت مدیون دین ادا نہ کر پائے گا تو وہ متعینہ مقدار بطور جرمانہ بینک یا تاجر کو ادا کرے گا، اور وہ تاجر کی یا بینک کی نہ ہوگی، بلکہ خیراتی کاموں میں صرف کرنے کے لیے بطور امانت اس کے پاس محفوظ رہے گی۔ اس سے مماطلت کا سد باب بھی ہو جائے گا، اور یہ رقم سود کی نہیں کہلائے گی، اس لیے کہ اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ خیراتی کاموں کے لیے وہ وقف ہے۔ احناف کے نزدیک وعدہ کو قضائی لازم نہیں ہوتا لیکن بعض فقہاء مالکیہ نے قضائی بھی اس کو لازم قرار دیا ہے، بلکہ احناف کے نزدیک بھی بعض وعدے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہو جاتے ہیں اسے "باب بیع الوفاء" شامی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(دیکھئے تحریر الکلام للعلامۃ الحطاب)۔

۸- اپنی کوئی مملوکہ شئ مشتری بائع کے پاس بطور رہن رکھوائے اور بائع اپنے پاس گارنٹی کے طور پر رکھ لے تو ایسی صورت میں شئ مرہون سے انتفاع بائع کے لیے کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔ شئ مرہون سے انتفاع بھی ربا کی صورت ہے۔ شئ مرہون مرتہن (دائن) کے پاس اس لیے رکھی رہے گی تاکہ مدیون اس رہن کے دباؤ میں وقت مقررہ پر دین ادا کر دے۔ ورنہ بائع اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے گا، اگر مدیون نے دائن کے دین کی ادائیگی بروقت نہ کی تو دائن شئ مرہون کو فروخت کر دے گا، اور فروخت کر کے عقد کے وقت جو قیمت شئ کی تھی شئ مرہون کی قیمت سے اتنا وصول کرنے کے بعد جو رقم بچے گی وہ واجب الاداء ہو گی، دین سے زائد لینا دائن کے لیے جائز نہ ہوگا۔

۹- بائع دو طریقوں سے مبیع کو روک سکتا ہے: ۱۔ فروخت شدہ سامان کو رہن کی حیثیت سے، ۲۔ ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روک لینے کی حیثیت سے۔ دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ جب ثمن کی وصولیابی کیلئے مبیع کو حبس کیا جائے گا تو مبیع مضمون بالثمن ہوگی، مضمون بالقیمۃ نہیں، لہٰذا اگر حالت حبس میں مبیع ہلاک ہوگئی تو بیع فسخ ہو جائے گی اور بازاری قیمت کا ضمان بائع پر نہیں ہوگا، اور اگر پہلی صورت میں مبیع بائع کے پاس تعدی کے بغیر ہلاک ہوگئی تو بیع فسخ نہ ہوگی۔ بلکہ وہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا، اور تعدی کی وجہ سے شئ ہلاک ہوئی تو بائع بازاری قیمت کا ضامن ہوگا، ثمن کا ضامن نہ ہوگا۔ جہاں تک دوسری صورت کا سوال ہے وہ "بیع بالتقسیط" میں تو جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بیع مؤجل ہے، اور بائع کو استیفائے ثمن کے لیے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں ہوتا ہے (فتاوی عالمگیری ۱۵/۳)۔

پہلی صورت میں اگر بائع مبیع کو روک لیتا ہے (بطور گروی) اور یہ حبس مشتری کے مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہوا ہے تو یہ صورت بھی پہلی صورت کی طرح درست نہیں ہے، اور اگر مشتری مبیع کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد بطور رہن بائع کو دے دے تو یہ صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز اور درست ہے۔

(کفایہ ۹/۹۹، زیلعی، شامی ۶/۴۹۷)۔

حاصل یہ ہے کہ نقد بیع میں اس مبیع کے رہن (گروی) کے طور پر بائع کے پاس چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ صلب عقد میں رہن مشروط نہ ہو، اگر صلب عقد میں رہن مشروط ہوگا تو اس بیع کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ صحیح قول جواز کا ہے اگر رہن کا رکھنا لزوم بیع کے بعد ہو، ابن قدامہ نے المغنی میں تحریر فرمایا ہے:

''فإن كان بعد لزوم البيع فالأولى صحته، لأنه يصح رهنه عند غيره فصح عنده كغيره'' (۴/۴۲۷)۔

۱۰- قیمت کے لیے طے شدہ اقساط نہ ادا کرنے کی صورت میں بائع سامان کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور پھر وہ سامان اسی کا ہوجاتا ہے اور جو قسطیں ادا کی گئیں وہ بھی واپس نہیں کی جاتیں۔ یہ صورت قطعاً درست نہیں ہے۔ اگر سامان خریدار کو نہیں مل سکا تو اس کی جمع شدہ قسطیں اس کو واپس ملنی چاہیے۔ اس لیے کہ جمع شدہ قسطیں کسی عوض کا بدلہ نہیں ہیں۔

۱۱ -رہن کی ایک صورت اور ملتی ہے جس میں مرتہن شئ مرہون پر قبضہ نہیں کرتا، بلکہ وہ چیز راہن کے پاس ہی رہتی ہے، اور راہن شئ مرہون سے فائدہ حاصل کرنے کا مجاز ہوتا ہے، لیکن راہن جب دین کی ادائیگی سے قاصر ہوجاتا ہے تو پھر دین کے سلسلہ میں راہن سے مطالبہ کرسکتا ہے کہ وہ شئ مرہون کو فروخت کرکے دین ادا کرے، اس رہن کے جواز پر ایک شبہ ہوتا ہے کہ رہن کے جواز کے لیے مرتہن کا قبضہ شئ مرہون پر ضروری ہے، قرآن پاک میں ہے: ''فرہٰن مقبوضۃ'' اگرچہ فقہ حنفی میں شئ مرہون کو بطور عاریت مرتہن راہن کو دے سکتا ہے اور راہن عاریتاً شئ مرہون سے فائدہ اٹھاسکتا ہے، اور شئ مرہون عاریت کی وجہ سے راہن کے ضمان میں آجاتی ہے مگر اس عاریت کے جواز کے لیے بھی قبض مرتہن ضروری ہے۔

مگر ایک بات قابل غور یہ ہے کہ کیا قبضہ کے لیے حسی قبضہ ہی ضروری ہے، قبضہ حکمی کافی نہ ہوگا؟ قبضہ کی شرط کے مقصد پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شئ اس طرح مرتہن کے گرفت میں ہو کہ جب ضرورت پڑے مرتہن مرہون کو فروخت کرکے اپنا حق وصول کرسکے۔ اور یہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے جب رہن کے دستاویزات وکاغذات پر قبضہ کرلیا جاتا ہے، اس لیے کہ قانوناً وہ جب چاہے گا ضرورت پڑنے معاہدہ نامہ کے ذریعہ شئ مرہون کو فروخت کرواسکتا ہے۔ مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ ہر ایک کے حق کی مصلحت اور فائدوں کا لحاظ بھی ہے، راہن کو فائدہ یہ ہے کہ اپنی شئ سے فائدہ اٹھاسکتا ہے جس کی نظیر فقہ میں عاریت کی شکل میں موجود ہے، اور مرتہن کو بھی اپنے دین کے وصول کرنے کا حق کسی ضمان کے لزوم کے بغیر رہے گا، اس طرح سے مسئلہ کی تطبیق میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، اور شرعی مقاصد کا حصول موجود رہتا ہے۔

۱۲- گارنٹی لینا یہ عقد تبرع ہے، اس پر اجرت لینا، یا اس کا مطالبہ کرنا کسی طرح جائز نہیں، گو دور حاضر میں گارنٹی تجارت کا ایک جز بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کام کے لیے مستقل ادارے قائم ہوچکے ہیں، اور اپنی خدمات کے لیے وہ ادارے بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں، اور اجرت کے بغیر گارنٹی دینے والا بھی نہیں ملتا۔ مگر فقہ اسلامی میں ضمانت پر اجرت لینا کسی حال میں جائز نہیں ہے، البتہ کریڈٹ لیٹر جاری کرنے میں جو صرفہ آتا ہے اور بینک کے جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں ان کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ محض ضمانت اور گارنٹی پر اجرت لینا جائز نہیں، تجارتی لین دین میں درمیانی کا کام کرنے والے ادارے اور جماعت کے لیے بحیثیت ''وکیل'' اور ''دلال'' اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے، اس لیے کہ یہ عمل کا بدلہ ہے اور اخراجات کا بدل ہے، اور سمسار (دلال) کے لیے اجرت کے جواز کی صراحت فقہاء نے کی ہے۔

۱۳- شرعاً کسی دستاویز کے ذریعہ دین کی توثیق نہ یہ کہ صرف جائز ہے بلکہ امر مستحب ہے۔

قرآن کہتا ہے: "يا أيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه" (سورۂ بقرہ: ۲۸۲)۔

(اے ایمان والو جب ادھار کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو)۔

مگر آج کل بائع جو اصل دائن ہے بعض اوقات یہ دستاویز کسی تیسری شخص کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے، اور یہ فروختگی عام طور پر تحریر شدہ دین کی مقدار سے کم پر ہوتی ہے تاکہ معین تاریخ سے قبل اس کو رقم حاصل ہوجائے، مندرجہ بالا طریقہ پر بیع کرنا شرعاً ناجائز ہے، اس لیے کہ یہ دین کی بیع ہورہی ہے اور تحریر شدہ رقم سے کم میں ہورہی ہے، اولاً تو یہ بیع ہی درست نہیں ہے، کیونکہ یہ ''بيع الدين من غير من عليه الدين'' کے قبیل سے ہے، اور وہ درست نہیں ہے، ثانیاً یہ کرنسی کی بیع کرنسی سے ہورہی ہے جس میں کمی زیادتی ممنوع ہے، اگر معاملہ میں تھوڑی تبدیلی کردی جائے تو جواز کی صورت نکل سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اولاً حامل دستاویز بینک کو مشتری سے دین کے وصول کرنے کا وکیل بنادے، اور اس وکالت پر بینک کو کچھ اجرت دے۔ اس کے بعد نئے معاملہ کے

ذریعہ دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض لے لے۔ اور بینک کو یہ اختیار دے دے، جب مشتری سے وہ رقم وصول ہو جائے تو وہ اس رقم سے اپنا قرض وصول کر لے اس طرح معاملہ درست ہو جائے گا، پہلا معاملہ تو اس لیے کہ اجرت پر وکیل بنایا گیا ہے اور اجرت پر وکیل بنانا درست ہے۔ دوسرا معاملہ اس لیے کہ اس میں کسی زیادتی کی شرط کے بغیر قرض کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

۱۴- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دائن مدیون سے یہ کہتا ہے کہ ہم دین کا کچھ حصہ اس شرط پر چھوڑ دیں گے جب آپ (مدیون) باقی دین اس سے کم مدت میں یا علی الفور ادا کر دیں، یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی سود میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے تو اسی طرح دین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی درست نہیں ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک "ضع" اور "تعجل" پر دین میں کمی کر دینا حرام ہے۔

"قال مالك: ذلك عندنا بمنزلة الذي يؤخر دينه بعد محله عن غريمه، ويزيد الغرم في حقه، قال: فهذا ربا بعينه، لا شك فيه"۔

(امام مالکؒ نے "ضع اور تعجل" کی صورت تحریر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ یہ صورت ہمارے نزدیک ایسی ہی ہے جیسی کہ کوئی شخص مدیون کو اداء دین کی تاریخ کے بعد اور مہلت دے کر دین میں کچھ اضافہ کر دے۔ یہ صریح ربا ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے)۔

(کتاب البیوع موطا امام مالک ۱/ ۶۰۶، نیز دیکھئے: موطا امام محمد)۔

۱۵- "ضع اور تعجل" کی ممانعت صرف انہی دیون میں ہے جن کے لیے مدت مقرر ہے، البتہ وہ دیون جن کے لیے کوئی اجل مقرر نہیں ہے، بلکہ مدیون اس کی ادائیگی میں کسی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے تو ایسے دیون میں دین کے کچھ حصے کو چھوڑنے پر صلح کر لینا اور وضع کے بعد باقی دین دائن کے فورا حوالہ کر دینا مالکیہ کے نزدیک یہ جائز ہے، امام مالکؒ سے کسی نے پوچھا کہ میرے لیے کسی کے ذمہ ایک سو دینار اور ایک سو درہم فی الحال واجب ہوں، اور میں اس سے ایک سو دینار اور ایک درہم نقد پر صلح کر لوں تو کیا یہ جائز ہے تو آپ نے فرمایا "لا بأس بذلك" اس میں کوئی حرج نہیں (المدونۃ الکبری ۱۱/ ۲۷)۔

دیون غیر مؤجلہ میں چونکہ مدت کی کوئی شرط نہیں ہوتی، اور تاخیر مدیون کا کوئی حق نہیں ہوتا، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ دین کا حصہ جو معاف ہوا وہ حق (مدت) کے عوض میں معاف ہوا۔ اس لیے اس مسئلہ میں ربا کا معنی نہیں پایا گیا، گویا امام محمدؒ کے قول "فكأنه يبيع قليلا نقدا بكثير دينا" (وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کر رہا ہے) کی صورت اس مسئلہ میں نہیں پائی گئی۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کو ختم کر دینا اور فوری طور پر ماقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا درست ہے، اس لیے کہ قسطوں پر بیع کے معاہدہ نامہ میں صراحت ہوتی ہے کہ مقررہ وقت پر اگر کوئی قسط نہ ادا کر سکا تو آئندہ کی باقی قسطیں بھی فورا ادا کرنا ضروری ہوگا۔

(خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴)۔

۱۷- دائن و مدیون میں سے کسی کے انتقال کی وجہ سے دین مؤجل فوری واجب الاداء ہو جاتا ہے، اس مسئلہ میں احناف و شوافع اور مالکیہ کی رائے یہی ہے، دین مؤجل کی فوری ادائیگی میں تھوڑا شبہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے متاخرین حنفیہ نے اس قول پر فتوی نہیں دیا ہے، شبہ یہ ہے کہ مرابحہ مؤجلہ میں ثمن کا کچھ حصہ مدت کے مقابلہ میں ہوتا ہے، لہذا اگر مشتری مدیون کے ترکہ میں سے پورا ثمن فی الفور اداء کرنے کا حکم لگا دے تو اس صورت میں ثمن کا جس قدر حصہ مدت کے مقابلہ میں تھا وہ بلا عوض رہ جائے گا، اس میں مشتری کا نقصان ہے، اسی وجہ سے متاخرین احناف نے فتوی دیا ہے کہ مشتری ثمن مرابحہ میں سے صرف اسی قدر ادا کرے جو گزشتہ مدت کے مقابلہ ہوگا (درمختار)۔

ثمن کی ادائیگی قسطوں میں - احکام و مسائل

مولانا محمد نور القاسمی [1]

۱- ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی:

جس سامان کو ادھار فروخت کیا جا رہا ہے اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کر دینا صحیح ہے۔

(ہدایہ مع الفتح ۶/ ۵۰۷، رد المحتار ۴/ ۱۵۸، امداد الفتاوی ۳/ ۲۰، الحلال والحرام فی الاسلام/ ص ۳۷۹، فقہ السنۃ ۳/ ۱۲۵)۔

۲- ادھار قیمت کی قسطوں میں ادائیگی:

ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ہی ضروری نہیں، بلکہ اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ ادھار قیمت کو قسطوں میں ادا کیا جائے

(فقہ السنۃ ۳/ ۱۲۵، الحلال والحرام فی الاسلام/ ص ۳۷۹، امداد الفتاوی ۳/ ۴۲)۔

۳- نقد و ادھار دونوں قیمتوں کے بیک وقت اظہار کا حکم:

ایک شخص یہ کرتا ہے کہ سامان کو نقد و ادھار دونوں طرح فروخت کرتا ہے، اور معاملہ اس طرح کرتا ہے کہ نقد قیمت مثلاً سو روپئے اور ادھار سوا سو روپئے ہے، اور کوئی ایک قیمت حتمی طور پر طے نہیں ہوتی ہے تو ایسا معاملہ کرنا درست نہیں ہے

(الفتاوی البزازیہ بہامش الہندیہ: ۴/ ۴۳۱، بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۸، نیز ملاحظہ ہو: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۷۲، امداد الفتاوی ۳/ ۲۰)۔

لیکن اگر دونوں صورتوں کا اظہار کیا کہ نقد قیمت مثلاً سو روپئے ہیں اور ادھار قیمت مثلاً سوا سو روپئے ہیں اور پھر بائع اور مشتری نے اسی مجلس عقد میں ایک صورت پر معاملہ حتمی طور پر طے کر لیا تو ایسا معاملہ کرنا جائز ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۷۲، نیز فتاوی رشیدیہ/ ص ۴۹۴)۔

۴- ربا کا شبہ:

ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے بالمقابل مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرہ میں نہیں آتا ہے، جب صرف ادھار زائد قیمت کا تذکرہ کیا گیا، یا نقد و ادھار دونوں صورتوں کی قیمت کا تذکرہ کرنے کے بعد ایک صورت طے کر لی گئی تو گویا اب زائد قیمت ہی مال کی اصل قیمت متعین ہوگئی، لہذا اس میں ربا کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

۵- ادائیگی ثمن کے لیے قسطوں کی دو میعادیں متعین کرنا:

اگر مجلس عقد میں دونوں کسی ایک میعاد پر رضامند ہو کر ایک صورت کو متعین کر لیتے ہیں تو معاملہ بالکل صحیح اور درست ہو جائے گا، اس لیے کہ دونوں میعاد ذکر کرنے کی وجہ سے جو جہالت پیدا ہوئی تھی، اس جہالت کو دونوں نے مل کر جب مجلس عقد ہی میں رفع کر لیا تو عدم جواز کی کوئی علت نہیں رہ جاتی، اس لیے کہ عدم جواز کی علت محض جہالت فی الثمن تھی (مجمع لا ئنبر ۲/ ۸)۔

۶، ۷- میعاد مقررہ پر ثمن کی ادائیگی نہ ہونے پر رقم کی زیادتی:

سوال میں مذکور ان دونوں صورتوں میں معاملہ شرعاً ناجائز قرار پائے گا، اس مزید رقم کو "جرمانہ" یا مالی تاوان قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ سراسر ربا کے دائرہ میں

---

[1] جامعۃ الہدایہ، جے پور راجستھان۔

آئے گا جو شرعا حرام ہے، اس لیے کہ یہ اس قرض کے مشابہ ہے جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے اور اس بابت ایک موقوف حدیث ہمارے سامنے موجود ہے:

''عن فضالة بن عبيد صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا'' (السنن الکبری للبیہقی ۵ / ۳۵۰)۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی فضالہ بن عبید سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہر وہ قرض جو منفعت کھینچ لائے وہ ربا کی قسموں میں سے ایک قسم ہے)، مسئلہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (رد المحتار ۴ / ۱۷۴، نیز الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴ / ۲۴۷)۔

۸- قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے مال رہن رکھنا:

اسلام نے سود کا دروازہ بالکل مقفل کر دیا ہے اور قرض پر بھی کسی طرح کا نفع اٹھانا حرام قرار دیا ہے، پیغمبر اسلام نے اسی کو سود قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''کل قرض جر نفعا فهو ربا'' اور سود کے بارے میں حقیقت سود تو کجا شبہ سود بھی ناقابل برداشت ہے، اس لیے رہن کے سامان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض فقہاء احناف نے مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے (الدر المختار بہامش الرد ۵ / ۳۱۰) لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سود کا حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بہر حال ناجائز ہے، گو رضامندی اور خوشی سے حاصل کیا جائے (رد المحتار ۵ / ۳۱۰)۔

اگر بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون ضائع ہو جائے تو بائع اس کا ضامن قرار دیا جائے گا، یعنی اگر مال مرہون کی قیمت دین کے برابر ہے تو گویا بائع دین کا وصول کرنے والا شمار کیا جائے گا، اور اگر مال مرہون کی قیمت دین کے مقابلہ میں زیادہ ہے تو دین کے برابر منہا کر کے بقیہ قیمت کا بائع ضامن ہوگا اور زائد رقم مشتری کے حوالہ کرنا ہوگا، اور اگر مال مرہون کی قیمت دین کے مقابلہ میں کم ہے تو دین میں سے اتنی مقدار مشتری سے ساقط ہو جائے گی، لیکن بقیہ زائد رقم بائع مشتری سے وصول کرے گا (الدر المختار مع الرد ۵ / ۳۱۰-۳۰۹، نیز ملاحظہ ہو: بدائع الصنائع ۶ / ۱۴۲)۔

وقت مقررہ پر ادا نہ کرنے یا ٹال مٹول کی صورت میں مرتہن راہن کے خلاف دار القضاء میں دعوی پیش کرے گا، قاضی راہن کو ادائیگی کے لیے حکم دے گا پھر بھی ادا نہ کرے تو راہن کو ایک مدت کے لیے قید کر دیا جائے گا، اور اگر اس کے بعد بھی ادائیگی نہ کرے تو قاضی مال مرہون کو فروخت کر کے مرتہن کے دین کی ادائیگی کرے گا، اگر فروخت شدہ مال مرہون کی قیمت دین سے زائد ہوگی تو زائد رقم راہن کو واپس کر دی جائے گی، اور اگر کم ہوگی تو قاضی اس کو اس وقت تک قید میں رکھے گا جب تک کہ وہ مکمل ادائیگی کا انتظام نہ کروادے (ہدایہ مع الفتح ۱۰ / ۱۴۷)۔

قاضی کو فروخت کرنے کا حق اس لیے ہے کہ اس کو عوام الناس پر ولایت عامہ حاصل ہے۔

۹- بائع کی طرف سے مبیع کو روکنے کی حیثیت:

بائع کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ فروخت شدہ سامان کو اپنے پاس اس وقت تک کے لیے روکے جب تک کہ مکمل قیمت یا اس کی چند اقساط جمع نہ کی جائیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بائع کا مبیع کو روکنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ آیا اس کو رہن مانا جائے یا ''حبس المبیع لاستیفاء الثمن'' قرار دیا جائے؟

(الف)......اگر اس کو رہن مان لیا جائے تو اس کا حکم وہی ہوگا جو اسی مقالہ کے سوال نمبر (۸ ب) کے تحت گزر چکا ہے کہ احناف کے مفتی بہ قول کے مطابق رہن مرتہن کے پاس بطور ضمان ہوتا ہے، لیکن یہاں یہ صورت جائز نہیں ہے۔

''فلو هلك المبيع في يد البائع سقط الثمن عن المشتری، فلا يصح الرهن به'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵ / ۱۹۶)۔

(اگر مبیع بائع کے پاس ہی ہلاک ہو جائے تو مشتری سے ثمن ساقط ہو جائے گا، لہذا اسی شی کو بطور رہن رکھنا جائز نہ ہوگا)۔

(ب)......اور اگر اس کو حبس المبیع لاستیفاء الثمن قرار دیا جائے تو علامہ شامی کی تصریح کے مطابق تفصیل یہ ہوگی کہ اگر مبیع خود کسی وجہ سے مثلاً آفت سماوی کی وجہ سے ہلاک ہو گئی تو بیع باطل قرار دی جائے گی، اور ثمن کا جو کچھ حصہ بائع نے وصول کیا ہے بائع پر اس کا واپس کرنا ضروری ہوگا، اور اگر مشتری کے کسی فعل سے مبیع ہلاک ہوئی تو دیکھا جائے گا کہ بیع مطلق تھی یا خیار کے ساتھ تھی؟ اگر بیع مطلق ہو، یا مشتری ہی کو خیار ہو تو مشتری پر ثمن کی ادائیگی واجب قرار پائے گی، اور اگر خیار بائع کو ہو یا بیع فاسد کا معاملہ ہوا ہو تو بائع پر اس مبیع کا ضمان لازم ہوگا، اگر مبیع مثلی ہے تو اس کا مثل دینا ہوگا، اور اگر قیمتی اشیاء میں سے ہے تو اس کی قیمت دینی ہو گی، اور اگر کسی تیسرے شخص کے کسی فعل سے مبیع ہلاک ہوئی ہو تو مشتری کو اختیار ہوگا، چاہے بیع کو فسخ کردے، اس صورت میں ہلاک کرنے والا بائع کے لیے ضامن ہوگا، اور اگر مشتری چاہے تو بیع کو علی حالہ باقی رکھے اور خود جنایت کرنے والے سے ضمان وصول کرلے (ملاحظہ ہو: رد المحتار ۵ / ۴۲)۔ اور یہاں اسی صورت کی

گنجائش معلوم ہوتی ہے، جہاں تک اس صورت میں کسی پابندی کا تعلق ہے تو مناسب یہ ہے کہ اس پابندی کا تعین علماء کی ایک جماعت مل کر مشورہ کے بعد کرے۔

۱۰- بیعانہ (عربون) کی حیثیت:

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قیمت کے لیے طے شدہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع سامان کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور پھر وہ سامان اسی کا ہو جاتا ہے، نیز جو اقساط ادا کی جا چکی ہیں وہ بھی واپس نہیں کی جاتیں، اسی کو ہم اپنی اصطلاح میں ''بیعانہ'' کہتے ہیں اور فقہاء کی اصطلاح میں اسی صورت کو ''بیع العربون'' کہا جاتا ہے (النہایۃ ۳/ ۲۰۲، نیز دیکھئے: موسوعۃ فقہ عبد اللہ بن عمر: ۵۸۴، اور موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب: ۶۴۸)۔

''بیع العربون'' کی بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

''عن عمر و بن شعیب عن أبیه عن جده أنه قال: نهى رسول الله صلى الله علیه وسلم عن بیع العربان''

(سنن ابی داؤد: ۳/ ۲۸۳، کتاب البیوع باب فی العربون، وسنن ابن ماجۃ ۲/ ۷۳۹)۔

(حضرت عمرو بن شعیب سے روایت ہے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے دادا سے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربون کی بیع سے منع فرمایا ہے)۔

لیکن اس کے برخلاف ایک دوسری روایت بھی منقول ہے جسے عبد الرزاق نے ''المصنف'' میں جگہ دی ہے۔

''عن زید بن أسلم قال: سئل رسول الله صلى الله علیه وسلم عن العربان فی البیع فأحله'' (کنز العمال للہندی: ۴/ ۱۵۵)۔

(زید بن اسلم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیع میں بیعانہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جائز قرار دیا)۔

اور حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب سے بھی اس کا جواز منقول ہے، چنانچہ علامہ ابن قیم جوزی نقل فرماتے ہیں:

''عن نافع بن الحارث عامل عمر على مكة أنه اشترى من صفوان بن أمية دارا لعمر بن الخطاب بأربعة آلاف درهم، واشترط علیه إن رضی عمر فالبیع له وإن لم یرض، فلصفوان أربعة مائة درهم''

(اعلام المؤقعین لابن قیم ۳/ ۴۰۱، نیز ملاحظہ ہو: موسوعۃ فقہ عمر: ۶۴۸)۔

(حضرت عمر کی طرف سے مکہ کے عامل نافع بن الحارث نے صفوان بن امیہ سے حضرت عمر کے لیے چار ہزار درہم میں ایک گھر اس شرط پر خریدا کہ اگر حضرت عمر راضی ہو جائیں گے تو بیع نافذ ہو جائے گی اور اگر وہ راضی نہیں ہوئے تو صفوان کے لیے چار سو درہم ہوں گے)۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

''وروى عن ابن عمر وجماعة من التابعین إجازته'' (شرح الزرقانی ۲۵۲/ ۳)۔

حضرت عبد اللہ بن عمر اور تابعین کی ایک جماعت سے اس کا جواز مروی ہے)۔

اسی وجہ سے فقہاء کے درمیان بھی اس بیع کے جواز اور عدم جواز کی بابت اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام مالک اور امام شافعی عدم جواز کے قائل ہیں، چنانچہ علی المتقی الہندی تحریر فرماتے ہیں:

''وقال شارح معالم السنن: وقد اختلف الناس فی جواز هذا البیع، فأبطله مالك والشافعی للخبر، ولما فیه من الشرط الفاسد والغرر، ویدخل فی أكل المال بالباطل وأبطله أصحاب الرأی'' (کنز العمال ۴/ ۱۵۶)۔

(شارح معالم السنن نے فرمایا کہ اس بیع کے جواز کی بابت لوگوں میں اختلاف ہے چنانچہ امام مالک اور شافعی نے حدیث کی وجہ سے اسے باطل قرار دیا ہے، نیز اس لیے بھی کہ اس میں شرط فاسد اور دھوکہ ہے اور یہ اکل بالباطل کے ضمن میں آتا ہے، اور اصحاب الرائے نے بھی اسے باطل قرار دیا ہے)۔

لیکن جمہور کی مخالفت کرتے ہوئے حضرت امام احمد بن حنبل کی رائے ہے کہ یہ بیع جائز ہے، اور اسی قول کے قائل مجاہد، محمد بن سیرین، زید بن اسلم اور نافع بن الحارث ہیں، چنانچہ علامہ ابن قیم جوزی تحریر فرماتے ہیں:

''ومن ههنا قال الإمام أحمد: لابأس ببیع العربون، لأن عمر فعله وأجاز هذا البیع والشرط فیه ومجاهد ومحمد بن سیرین وزید بن أسلم ونافع بن الحارث'' (اعلام المؤقعین ۳/ ۴۰۱)۔

(اور یہاں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ عربون کی بیع میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا کیا ہے، اور مجاہد، محمد بن سیرین، زید بن اسلم اور نافع بن الحارث نے اس بیع اور اس میں شرط لگانے کی اجازت دی ہے)۔

ایک ناقص رائے:

آج کے انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں جہاں بیعانہ کی بیع کا طریقہ خرید وفروخت میں بالکل اساسی اور بنیادی حیثیت اختیار کر گیا ہے اگر امام احمد بن حنبل کے مسلک کو اپناتے ہوئے جواز کا فتوی دے دیا جائے تو مناسب ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۲۱۲)۔

۱۱- مشتری کے استعمال میں رکھ کر مبیع کو رہن بنانا:

فروخت کردہ سامان کو مشتری کے استعمال میں رکھ کر رہن قرار دینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں مشتری راہن قرار پاتا ہے اور بائع مرتہن، اور مرتہن کیلئے ضروری ہے کہ شی مرہون پر وہ خود قبضہ کرے یا اس کا وکیل:

"یتولی قبض الرهن المرتهن أو وكيله" (کتاب مذکور ۵/ ۲۱۶)۔ رہن پر قبضہ کا حق مرتہن کو ہے یا اس کے وکیل کو۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشتری (راہن) بائع (مرتہن) کا وکیل بن سکتا ہے یا نہیں؟ فقہاء کی کتابوں اور عبارات، نیز شرائط رہن وغیرہ کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مشتری (راہن) بائع (مرتہن) کا وکیل نہیں بن سکتا، چنانچہ مشہور عالم دین ڈاکٹر وہبہ زحیلی نقل فرماتے ہیں:

"ولا يصح أن يكون وكيله هو الراهن، لأن المقصود من القبض تأمين المرتهن ولا يتم القبض من بقاء الرهن في يد الراهن" (الفقہ الإسلامی وادلتہ ۶ ۲۱/ ۵)۔

مرتہن کی طرف سے راہن کا وکیل بننا صحیح نہیں ہے، اسلئے کہ قبضہ کا مقصود مرتہن کا مامون ہونا ہے، اور راہن کے قبضہ میں رہتے ہوئے قبضہ مکمل نہیں ہوتا ہے

۱۲- گارنٹی اور ضمانت پر معاوضہ:

خریدار کی طرف سے گارنٹی وضمانت لینا جائز ہے، اس لیے کہ یہ کفالہ کے اصول کے تحت آتا ہے جس کو فقہاء شرع متین نے جائز قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گارنٹی لینے کی صورت میں اس پر اجرت لینا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ فقہاء نے اس سلسلہ میں صاف اور واضح طور پر اس اجرت کے عدم جواز کا قول فرمایا ہے: چنانچہ علامہ سرخسی کی عبارت ملاحظہ ہو:

"لو كفل رجل عن رجل بمال على أن يجعل له جعلا فالجعل باطل، هكذا روى عن إبراهيم وهذا؛ لأنه رشوة، والرشوة حرام، فإن الطالب ليس يستوجب بهذه الكفالة زيادة مال، فلا يجوز أن يجب عليه عوض بمقابلته" (کتاب المبسوط ۳۲/ ۲۰)۔

(اگر کسی شخص نے کسی کی طرف سے مال کی کفالت لی اور اس شرط کے ساتھ کہ اس پر وہ اجرت لے گا تو اجرت باطل قرار پائے گی، حضرت ابراہیم سے اسی طرح مروی ہے، اس لیے کہ یہ رشوت ہے اور رشوت حرام ہے، اس لیے کہ طالب اس کفالت سے زیادتی مال کا خواہاں نہیں ہے، لہذا اس کے مقابلہ میں کسی عوض کو واجب کرنا جائز نہیں ہوگا) (موسوعۃ فقہ عبداللہ بن عمر: ص ۶۴۴)۔

اور مشہور فقیہ ومجتہد حضرت ابراہیم نخعی کا مسلک بھی عدم جواز کا ہے۔

"لا تصح الكفالة بأجر، قال النخعي في رجل طلب إلى رجل أن يكفل به، فأبي حتى يجعل له جعلا؟ قال: لا يصح" (موسوعہ فقہ ابراہیم النخعی ۲/ ۸۱۰)۔

(اجرت پر کفیل بننا جائز نہیں ہے، نخعی نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا جو کسی شخص کو کفیل بنانا چاہتا ہو اور وہ بغیر اجرت کے کفیل بننے کو تیار نہ ہو تو فرمایا کہ ایسے شخص کو اجرت پر کفیل بنانا صحیح نہیں ہے)۔

یہ بات معلوم ہے کہ کفالت عقد تبرع ونیکی سے عبارت ہے اور تعاون علی الخیر کی جیتی جاگتی مثال ہے، اس کا تقاضا ہے کہ کفالت کا عمل بغیر کسی روپئے پیسے اور اجرت کے ہو، ہاں اگر مکفول لہ، یعنی جس کے لیے کفیل بنا ہے، کفیل کو کچھ دے دے تو ہبہ اور ہدیہ سمجھا جائے گا اور یہ جائز قرار دیا

جائے گا، لیکن چونکہ دور حاضر میں لوگوں میں تبرع اور نیکی کا جذبہ مفقود ہو گیا ہے اور محسنین کا گروہ ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے، اس لیے فی زمانہ اگر کفیل اپنی کفالت پر اجرت کا مطالبہ کرے تو اس کو اجرت دے دینا جائز ہوگا، چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''جاز دفع الأجر للضرورة أو الحاجة العامة لما يترتب على عدم الدفع من تعطيل المصالح وأساس القول بالجواز فيه أن الفقهاء أجازوا دفع الأجر للحاجة لأداء القربات و الطاعات من تعليم القرآن وممارسة الشعائر الدينية كما أنهم أجازوا دفع شئ من المال على سبيل الرشوة للوصول إلى الحق أو دفع الظلم'' (الفقہ الإسلامی وادلتہ ۱۶۱/۵)۔

(ضرورت وحاجت کی وجہ سے اجرت دینا جائز ہے، اس لیے کہ نہ دینے میں مصالح معطل ہو کر رہ جائیں گے، اور اس میں جواز کے قول کی بنیاد یہ ہے کہ فقہاء نے حاجت کے وقت عبادات وطاعات پر اجرت دینے کو جائز کہا ہے، مثلاً قرآن کریم کی تعلیم پر یا شعائر دینیہ کی انجام دہی کے لیے، اسی طرح حق وصول کرنے کے لیے یا ظلم کو دفع کرنے کے لیے بطور رشوت کچھ مال دینے کی اجازت دی ہے)۔

نیز عموم بلوی بھی جواز کا ضامن ہوتا ہے، اس لیے بھی ''کریڈٹ لیٹر'' کو جائز ہونا چاہیے۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت:

ادھار خرید وفروخت کا معاملہ کرتے وقت کبھی گارنٹی اور ضمانت کا معاملہ بھی ہوتا ہے اور اس پر معاوضہ کے لین دین کا رواج ہے اور اسی میں کبھی کبھی یہ صورت بھی اختیار کی جاتی ہے کہ ادھار خرید وفروخت کے مکمل کاغذات تیار کرائے جاتے ہیں، جس کو اردو میں دستاویز اور عربی میں ''سندات'' کہتے ہیں۔ وقت مقررہ پر رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں یا وقت سے پہلے رقم حاصل کرنے کے لیے اس دستاویز یا سندات کی خرید وفروخت بھی کی جاتی ہے، شرعی نقطہ نظر سے یہ صورت نادرست ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کہ دستاویز کی خرید وفروخت میں اس کے اندر تحریر کردہ قیمت ومالیت سے کم پر معاملہ ہوتا ہے، جو سراسر ربا کے دائرہ میں آتا ہے، چنانچہ مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر وہبہ زحیلی یوں رقم طراز ہیں:

''والتعامل بالأسهم جائز شرعا، أما التعامل بالسندات فحرام لاشتمالها على الفائدة الربوية''

(حصص میں کاروبار کرنا جائز ہے، لیکن ''بونڈز'' کا کاروبار حرام ہے، اس لیے کہ یہ ربوی فائدہ کو شامل ہے)۔

۱۴- ضع وتعجل کی صورت کا حکم:

ادھار خرید وفروخت کے معاملہ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگتا ہے کہ ثمن کا ایک حصہ ہم تم کو معاف کر دیں گے، اس کے لیے اصطلاحی تعبیر ''ضع وتعجل'' کی استعمال ہوتی ہے، اس کے جواز اور عدم جواز کی بابت دو مسالک ہیں، ایک مسلک جمہور کا ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ صورت جائز نہیں ہے، سید سابق تحریر فرماتے ہیں:

''ذهب جمهور الفقهاء إلى تحريم وضع قدر من الدين نظير التعجيل بالقضاء قبل الأجل المتفق عليه'' (فقہ السنۃ ۱۶۷/۳)

(جمہور فقہاء اس طرف گئے ہیں کہ عاقدین کے درمیان متفق علیہ مدت کے ختم ہونے سے پہلے جلدی حق وصول کرنے کے واسطے دین کے کچھ حصہ کو وضع کرنا جائز نہیں ہے)۔

ان حضرات کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر کی وہ روایت ہے جس میں اس صورت کو ربا سے تعبیر کیا گیا ہے، سعید بن مسیب کی بھی یہی رائے ہے جو حضرت ابن عمر کی ہے، امام شعبی کا بھی یہی مسلک ہے (المصنف لعبد الرزاق ۷۴/۸)، لیکن حسن اور ابن سیرین اس کو مکروہ سمجھتے ہیں (ملاحظہ ہو: السنن الکبری للبیہقی ۳۳۵/۱۰)۔ مشہور محدث عبدالرزاق بن ہمام نقل فرماتے ہیں:

''عن ابن المسيب وابن عمر قالا: من كان له حق على رجل إلى أجل معلوم فتعجل بعضه وترك له بعضه، فهو ربا قال معمر: ولا أعلم أحدا قبلنا إلا وهو يكرهه'' (المصنف ۷۱/۸)۔

(حضرت ابن مسیب اور ابن عمر دونوں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا کسی پر کوئی حق ایک متعینہ مدت تک کے لیے ہے، پھر وہ اس میں سے بعض کو وقت سے پہلے وصول کرے اور بعض کو چھوڑ دے تو یہ ربا کے دائرہ میں آئے گا، معمر کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے بھی فقہاء اسے مکروہ سمجھتے تھے)۔

اس کے برخلاف احناف میں سے امام زفر کا مسلک جواز کا ہے اور اسی مسلک کے حامل حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی تھے، چنانچہ سید سابق نقل فرماتے ہیں:

''ویری ابن عباس وزفر جواز ذلك لما رواه ابن عباس أن النبي ؐ لما أمر بإخراج بني نضير جاءه ناس منهم، فقالوا: یا نبي الله! إنك أمرت بإخراجنا، ولنا علی الناس دیون لم تحل، فقال رسول الله ﷺ: ضعوا وتعجلوا'' (فقہ السنۃ ۳/۱۶۷)

(حضرت ابن عباس اور امام زفر اس کے جواز کے قائل ہیں، اس لیے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریمؐ نے جب بنونضیر کو نکال دینے کا حکم دیا تو ان میں سے کچھ لوگ آئے اور کہا کہ اے اللہ کے نبی آپ نے ہمیں نکال دینے کا حکم دے دیا ہے، حالانکہ ہمارے بعض لوگوں کے ذمہ دین ہیں جن کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی ہے تو نبیؐ نے فرمایا کہ کچھ چھوڑ دو اور باقی جلد وصول کرلو)۔

نیز عبدالرزاق بن ہمام نقل فرماتے ہیں: ''عن ابن عباس سئل عن الرجل یکون له الحق علی الرجل إلی أجل فیقول: عجل لي وأضع عنك فقال: لا بأس بذلك'' (المصنف ۸/۷۲)۔

(حضرت ابن عباس سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کا کسی دوسرے آدمی پر ایک مدت تک کے لیے دین ہو اور وہ (دائن) کہے کہ مجھے جلد واپس کردو میں تجھے کچھ رقم چھوڑ دوں گا، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

احقر کی ناقص رائے میں فی زمانہ فتوی جواز کے قول پر ہونا چاہیے، یہی زیادہ بہتر ہے اور اس کمی کو بائع کی طرف سے ہبہ اور ہدیہ مانا جانا چاہیے۔

۱۵- ''ضع وتعجل'' کی ایک اور شکل:

اس صورت کے شرعی وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس میں بیع سرے سے منعقد ہی نہیں ہوئی، لہذا بائع کا مطالبہ کرنا چہ معنی دارد؟ ہاں اس مطالبہ کو ازسرنو بیع تسلیم کیا جاسکتا ہے اور اب فی الفور جتنے کا مطالبہ کر رہا ہے گویا وہی اس مبیع کی اصل قیمت ٹھہرے گی جب کہ مشتری اس پر راضی ہو جائے، ایسی صورت میں اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

۱۶- قسطوں کی مہلت کو ختم کرنا:

ادھار خرید وفروخت کے معاملہ میں ثمن کی ادائیگی کی جو مدت متعین کی گئی ہے وہ لازم قرار پائے گی، اس لیے کہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

''عن أبي هریرة أن النبي ﷺ قال: المسلمون علی شروطهم'' (السنن الکبری للبیہقی ۶/۷۹، وسنن الدارقطنی ۳/۲۷)۔

(حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے شرط کے پابند ہوں)۔

نیز دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''عن کثیر بن عبد المزني عن أبیه عن جده قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: المسلمون عند شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما'' (حوالہ سابق)۔

(حضرت کثیر بن عبدالمزنی اپنے باپ اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان اپنے شرائط کے پاسدار ہیں سوائے ان شرطوں کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرتی ہوں)۔

اصل میں دین میں تاجیل کی تین قسمیں ہیں: ایک تو وہ معاملے جن میں تاجیل باطل ہوتی ہے مثلاً بیع صرف اور سلم میں ثمن کی ادائیگی کے لیے اجل متعین کرنا، دوسرے وہ معاملے جن میں اجل متعین کرنا صحیح تو ہے البتہ لازم نہیں ہوتی، مثلاً قرض، اقالہ، شفعہ اور میت کے دین میں اجل متعین کرنا، تیسرے ان کے علاوہ وہ معاملے کہ ان میں اجل کی تعیین صحیح بھی ہے اور لازم بھی، بیع بالتقسیط (بیع میں ثمن کی ادائیگی کے لیے مدت متعین کرنا) اس تیسری قسم میں شامل ہے، لہذا طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور فوری طور پر مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ صحیح نہیں ہوگا (الدر المختار مع الرد ۴/۱۷۰)۔

۱۷- دائن اور مدیون کے انتقال کے بعد معاملہ کی صورت:

سنن دارقطنی میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا مات الرجل وعليه دين إلى أجل وله دين إلى أجل فالذي عليه حال والذي له إلى أجله" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان مرجائے اور اس پر ایک مدت کے لیے دین ہو، اور کسی شخص پر اس کا ایک مدت کے لیے دین ہو تو جس پر دین ہوگا اگر وہ مرا تو اس پر فی الفور ایفاء لازم ہوگا اور جس کا ہے اگر وہ مرا تو وہ اپنے اجل تک باقی رہے گا) (سنن دارقطنی ۴/ ۲۳۲)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دائن کا اگر انتقال ہوجائے تو معاملہ علی حالہ باقی رہے گا اور اگر مدیون کا انتقال ہوجائے تو معاملہ علی حالہ باقی نہیں رہے گا، بلکہ مدیون کے ورثاء پر لازم ہوگا کہ وہ فی الفور ترکہ میں سے ثمن کی ادائیگی کردیں، لیکن ائمہ کرام کا مسلک اس سلسلہ میں یہ ہے کہ دائن یا مدیون کا انتقال ہوجائے تو معاملہ میں فرق آجائے گا اور ثمن کی ادائیگی فی الفور لازم ہوجائے گی، چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نقل فرماتے ہیں:

"هل تحل الديون المؤجلة: بالموت؟يرى جمهور العلماء ومنهم أئمة المذاهب أن الديون المؤجلة تحل بالموت وحجتهم أن الله تبارك وتعالى لم يبح التوارث إلا بعد قضاء الدين" (الفقہ الإسلامی وادلتہ ۵/ ۴۷۹)۔

(کیا موت کی وجہ سے دیون مؤجلہ کی فی الفور ادائیگی لازم ہوگی؟ جمہور علماء جن میں ائمہ مذاہب بھی ہیں، کا خیال ہے کہ موت کی وجہ سے دیون مؤجلہ کی فی الفور ادائیگی لازم ہوگی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے توارث کو قضاء دین کے بعد ہی جائز قرار دیا ہے)۔

۱۸- بیع بالتقسیط کے ساتھ انعامات کا مسئلہ:

اگر دوکاندار یا کمپنی کے مالکان کی طرف سے دیے جانے والے انعامات کو اصل معاملہ سے مربوط کرنے کے بجائے ہبہ مان لیا جائے تو اس سے مستفید ہونے میں کوئی حرج نہیں ہوگا (درمختار ۴/ ۱۷۷)۔

۱۹- قرعہ اندازی:

یہ صورت ناجائز قرار پائے گی، اس لیے کہ اس میں بعض لوگوں کو مبیع کی اصل قیمت سے، بہت کم میں مبیع حاصل ہورہی ہے اور بعض کو اصل قیمت سے زائد ادا کرنا پڑ رہا ہے، یہ ربا اور قمار کی شکل معلوم ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ قسطوں میں ادا کرنے کی وجہ سے ثمن کی مقدار متعین نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ حصول مبیع کے لیے زید کا نام پہلی قسط کے بعد ہی نکل آئے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مسلسل کئی قسطیں جمع کرنے کے بعد اس کا نام نکلے، اس وجہ سے ثمن کی مقدار مجہول ہوگئی، لہذا مذکورہ شکل نادرست ہی قرار پائے گی۔

☆☆☆

ادھار قیمت زیادہ مقرر کرنا کیا ربا ہے؟

مولانا اقبال احمد قاسمی [1]

۱- جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اس کی قیمت نقد و فروختگی کے مقابلہ میں زیادہ کرنا زین العابدین علی ابن الحسین، ناصر، منصور باللہ اور امام یحیٰ کے نزدیک جائز نہیں، اس لیے کہ ثمن کی یہ زیادتی حقیقتاً اجل اور مدت کے عوض ہے اور مدت کوئی مال نہیں جس کی قیمت لی جائے، اس لیے ادھار فروخت کرنے کی صورت میں نقد کے مقابلے میں کچھ زیادہ قیمت مقرر کرنا سود ہے جو جائز نہیں (تحفۃ الاحوذی ۴/۴۲۹)۔

جبکہ جمہور فقہاء اور محدثین ادھار میں قیمت کی زیادتی کو جائز قرار دیتے ہیں (فقہ السنہ ۳/۷۳)۔

احناف کی کتابوں میں بھی اس کو جائز قرار دیا گیا ہے (شرح وقایہ، ہدایہ ۳/۵۸، مبسوط سرخسی ۱۳/۷۸)۔

اس بارے میں جمہور فقہاء اور محدثین کی بات فطرت انسانی کے موافق معلوم ہوتی ہے۔

۲- شرعاً اس کی گنجائش ہے (درمختار ۴/۲۶)۔ لیکن اس کے لیے یہ شرط ہے کہ قسط کی رقم اور ادائیگی کا وقت متعین کردیا ہو، ورنہ قسط کی رقم اور ادائیگی کی مدت مجہول ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی (فتاوی ہندیہ ۳/۳)۔

۳- جمہور فقہاء اور محدثین نے نقد فروختگی کے مقابلہ میں ادھار میں قیمت کی زیادتی کو جو جائز قرار دیا ہے، وہ علی الاطلاق نہیں ہے، بلکہ اس شرط پر کہ عاقدین بوقت عقد ہی بیع موجل ہونے، نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہوجائیں (ترمذی شریف ۱/۲۳۳، دیکھئے ہندیہ ۳/۷۲، فتح القدیر بحوالہ فتاوی عبدالحی/۲۷۶، کفایت المفتی ۸/۳۰)۔

۴- یہ بات مسلم ہے کہ اشیاء کی قیمت زمان، مکان، جودت وصنعت اور کثرت قلت کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، اور مالک کو بھی اپنے سامان کے بارے میں مکمل اختیار ہوتا ہے، کہ جب چاہے وہ سستا بیچے اور جب چاہے مہنگا بیچے، اسکو کم یا زیادہ پر کوئی مجبور نہیں کرسکتا، جب یہ بات محقق ہے تو پھر مالک اگر کسی سامان کو نقد سو روپے میں بیچے اور اس سامان کو ادھار زیادہ قیمت پر بیچے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے، نہ اس زیادتی کو سود قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ سود کی تعریف "فضل لا یقابلہ عوض" ہے، جو اس پر صادق نہیں آتی ہے، کیونکہ یہ قرض ہے، اور نہ ہی اموال ربویہ کی بیع ہے، بلکہ یہ ایک عام بیع ہے جس میں بائع کو مکمل اختیار ہے، البتہ بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ زائد قیمت وقت کے عوض معلوم ہوتی ہے، تو اس بارے میں یہ سمجھنا چاہیے کہ کہیں وقت کی حیثیت اصلی اور مقصود حقیقی کی ہوتی ہے، اور کہیں وقت کی حیثیت فرعی اور غیر مقصود کی ہوتی ہے، جہاں وقت کی حیثیت اصلی اور مقصود حقیقی کی ہوتی ہے، وہاں اس کے عوض قیمت کی زیادتی سود ہونے کی بنا پر حرام ہے، کیونکہ وقت مال نہیں ہے جس کی قیمت لی جائے، اس کو فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے (ہدایہ ۳/۲۳۵، بحر ۶/۱۲۵)۔

ہاں اگر وقت کی حیثیت ضمنی ہو اور مقصود اصل کوئی دوسری چیز ہو تو ایسی شکل میں وقت کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کو فقہاء جائز قرار دیتے ہیں، بلکہ وقت جس چیز کے ساتھ وابستہ ہے، اس کی وجہ سے قیمت میں زیادتی ہے، کیونکہ زیادتی وقت کی وجہ سے نہیں ہے (بحر ۶/۱۲۵، ہدایہ ۳/۵۸)۔

اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ کبھی کوئی چیز اصلاً وقصداً جائز نہیں ہوتی لیکن تابع ہو کر ضمنی طور پر جائز ہوجاتی ہے (قواعد الفقہ قاعدہ نمبر ۳/۱۶)۔

اور ادھار بیع میں وقت کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے، اصلاً اس مبیع کو بیچنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے ادھار میں قیمت کی زیادتی جائز ہوگی۔

۵- معاملہ کی یہ صورت شرعاً درست ہے، کیونکہ تاجر اپنے سامان کا مالک ہے، اور مالک کو اپنے سامان میں مکمل اختیار ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے ثمن طے کرنے کا اختیار بھی اسی کو دیا ہے، اور فقہاء نے لکھا ہے کہ عام حالات میں حاکم وقت کے لیے نرخ متعین کرنا اور لوگوں کو اس پر مجبور کرنا مناسب نہیں، ہاں اگر تجار ظلم وستم شروع کردیں اور ہر چیز کی قیمت من مانی لینے لگیں اور یہ غبن فاحش کی حد تک پہونچ جائے تو پھر عوام سے ضرر کو دفع کرنے کے

[1] استاذ مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھرواره، دربھنگہ۔

لیے حاکم نرخ کو متعین کرسکتا ہے (ہدایہ ۴/۵۵۴، نیز کفایت المفتی ۸/۳۱)۔

۶- اس طرح کا معاملہ کرنا سود ہونے کی بنا پر حرام ہے، کیونکہ اس چیز کی جب اصل قیمت دس روپے طے ہوگئی تو مشتری کے ذمہ صرف دس روپے واجب ہوئے، اس کے بعد مشتری کی طرف سے تاخیر کی بنا پر قیمت میں زیادتی صراحتاً وقت کا عوض ہے جو جائز نہیں، اور زمانہ جاہلیت میں سود کی یہی شکل رائج تھی کہ کسی آدمی پر کسی کا کوئی حق ایک متعینہ وقت کے لیے واجب ہوتا، جب ادائیگی کا وقت آجاتا تو صاحب حق کہتا کہ کیا تم حق کو ادا کروگے، یا کچھ اضافہ کروگے، اب اگر وہ حق ادا کردیتا تو ٹھیک، ورنہ وہ اس کے حق میں اضافہ کردیتا اور اس کو مزید مہلت دے دیتا۔

''كان الربا في الجاهلية أن يكون للرجل على الرجل الحق إلى أجل، فإذا حل الحق، قال: أتقضي أم تربي، فإن قضى أخذ، وإلا زاده في حقه، وأخر عنه في الأجل'' (موطا امام مالک باب ماجاء فی الربا فی الدین/۲۷۹)۔

۷- یہ صورت شرعاً جائز نہیں، خواہ اس کی مقدار طے کردی جائے یا فیصد کا حساب رکھا جائے، کیونکہ زائد رقم کی حیثیت یا تو مالی جرمانہ کی ہوگی یا سود کی ہوگی اور دونوں ناجائز ہیں، کیونکہ وقت پر عدم ادائیگی کی وجہ اگر تنگدستی ہو تو وہ شخص بنص قرآنی مہلت دیے جانے کا مستحق ہے۔

''وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة'' (سورہ بقرہ/۳)۔

اس لیے اس کے حق میں اس زائد رقم کو جرمانہ قرار نہیں دیا جاسکتا، ہاں آخر اس کو سود قرار دیا جائے گا، اور اگر وہ شخص غنی ہے جو وقت پر ادا کرنے پر قادر ہے، اس کے باوجود وقت پر ادا نہیں کررہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹال مٹول کررہا ہے، اور وہ لاپرواہی برت رہا ہے جس کی وجہ سے بسااوقات بائع کو پریشانی اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس مجبوری کے تحت مزید رقم لازم کرنے کو یا تو سود قرار دیا جائے گا یا جرمانہ اور مالی تاوان قرار دیا جائے گا، سود تو بنص قرآنی حرام ہے، اس لیے زائد رقم لازم کرنا جائز نہیں، جہاں تک مالی تاوان قرار دینے کی بات ہے تو یہ بھی ائمہ اربعہ کے نزدیک خصوصاً احناف کے نزدیک جائز نہیں (ردالمحتار ۳/۱۸۴)۔

''وفي شرح الآثار: التعزير بالمال كان في ابتداء الإسلام، ثم نسخ، والحاصل أن المذهب عدم التعزير باخذ المال'' (ردالمحتار ۳/۱۸۴)۔

مالی تاوان کے عدم جواز کے سلسلے میں مذاہب اربعہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (احسن الفتاوی ۵/۵۵۲)

البتہ اس طرح ٹال مٹول کرنا مشتری کے لیے جائز نہیں سراسر ظلم اور زیادتی ہے، مسلم شریف میں ہے: ''مطل الغني ظلم'' (مسلم شریف ۲/۱۸) (مالدار آدمی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے)، دوسری حدیث میں ہے: ''لي الواجد يحل عقوبته وعرضه'' (حاشیہ مسلم شریف ۲/۱۸) (مالدار آدمی کا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور آبرو کو حلال کردیتا ہے) جو شخص ایسا کرے تو اس کو شرعاً سزا دی جاسکتی ہے، کہ بوقت عقد بائع مشتری سے وعدہ لے لے کہ اگر وقت پر روپے ادا نہیں کرے گا تو وہ بائع کو قیمت کے علاوہ کچھ مزید رقم دے گا اور بائع اس کے نام سے صدقہ کردے گا، یہ صورت جائز ہے، اس لیے کہ یہ سود بھی نہیں، اور مالی تاوان بھی نہیں، بلکہ یہ عام صدقہ ہے، جس کا ثواب مشتری کو ملے گا، اس طرح صدقہ کو لازم کرنے سے اتنا تو فائدہ ہوگا کہ مشتری ٹال مٹول نہیں کرسکے گا، اور وقت پر ادائیگی کا پابند ہوگا، لیکن صدقہ کو لازم کرنا باری تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں، اس لیے اس پر صدقہ کو لازم کرنا محل تامل ہے۔

۸- بیع مؤجل میں بیع کے مکمل ہوتے ہی مشتری کے ذمہ ثمن دین ہوجاتا ہے، لیکن فی الفور اس کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، اس لیے ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے اور وقت مقررہ پر ادائیگی کے لیے مشتری سے رہن کا مطالبہ کرنا اور مشتری کا اپنی مملوکہ چیز کو بائع کے پاس رہن رکھ دینا جائز ہے، ''الرهن بأي دين كان جائز'' (فتاوی خانیہ علی ہامش الہندیہ ۳/۵۹۶)، البتہ اس بارے میں تین مسائل قابل غور ہیں (الف) مال مرہون سے انتفاع کا مسئلہ (ب) مال مرہون کے ضیاع کا مسئلہ (ج) ٹال مٹول کی صورت میں واجب الاداء قیمت کی وصولیابی کا مسئلہ۔

الف:...... بائع کے لیے شیٔ مرہون سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں، اگرچہ راہن اجازت دے دے، کیونکہ مرتہن کا حق شیٔ مرہون میں صرف حبس ہوتا ہے، منافع اور زوائد راہن کی ملک ہوتے ہیں اور رہن عموماً دین کے بدلے رکھا جاتا ہے، اور دین دے کر مدیون سے یا اس کے مال سے نفع حاصل کرنا، ''كل قرض جر نفعا فهو ربا'' کی بنا پر حرام اور ناجائز ہے، اور سود اذن سے حلال نہیں ہوتا، اس لیے انتفاع کی شرط لگانے یا عرف عام کے دباؤ کی بنا پر اجازت دے دینے سے نفع حاصل کرنا جائز نہ ہوگا اور آج کل عرف عام یہ چل پڑا ہے کہ مرتہن شیٔ مرہون سے نفع حاصل کرتا ہے، مثلاً کھیت سے غلہ پیدا کرتا ہے، اور راہن عدم رضا کے باوجود اس کو روک نہیں سکتا، کیونکہ اس کے بغیر وہ قرض یا دین دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس لیے مجبوراً عرف عام کے دباؤ میں آکر یا انتفاع کی شرط لگانے کی بنا پر اجازت دیتا ہے (دیکھئے: درمختار مع ردالمحتار ۵/۳۴۲، ۳۴۳، امداد الفتاوی ۳/۵۴۴، کفایت المفتی ۸/۳۴)۔

عام متون اور فتاوی کی کتابوں میں مرتہن کے لیے راہن کی اجازت سے نفع حاصل کرنے کو جو جائز لکھا ہے، وہ اس وقت ہے جب کہ اس نے بخوشی اجازت دی ہو، عرف عام کے دباؤ یا شرط کی بنا پر اجازت نہ دی ہو، اور آج کل عموماً عرف عام کے دباؤ میں آ کر اجازت دیتا ہے، اس لیے جائز نہیں (دیکھئے: فتاوی عبدالحی اردو/۳۰۱)۔

ب:......اگر بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے شئ مرہون ضائع ہوجائے تو دیکھا جائے گا کہ اس کی قیمت قبضہ کے دن کیا تھی؟ اگر اس کی قیمت دین مؤجل کے برابر تھی تو دین مشتری کے ذمہ سے ساقط ہوجائے گا، اور اگر قیمت دین سے زائد تھی تو اس صورت میں بھی دین کے بقدر قیمت ساقط ہوجائے گی، اور دین سے زائد جو قیمت ہے، اس میں مرتہن امین ہے، اور امانت کے ہلاک ہونے پر کوئی ضمان نہیں ہوتا لیکن اگر رہن کی قیمت دین سے کم ہو تو قیمت کے بقدر دین ساقط ہوجائے گا، اور جو دین باقی رہ گیا ہے وہ مشتری سے لے لے گا (قدوری/۸۸)۔

ج......بائع کے لیے خریدار کے وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں مال مرہون کے ذریعہ اپنی واجب الاداء قیمت وصول کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ وہ خریدار کو مجبور کرے کہ وہ اپنا سامان بیچ کر قیمت ادا کرے، اگر وہ بیچنے کے لیے تیار ہوجائے تو فبہا ورنہ قاضی اس کو بیچ کر قیمت ادا کرے گا، بائع کے لیے بغیر اس کی اجازت کے بیچنا جائز نہیں (درمختار مع ردالمحتار ۵/ ۳۵۹)۔

اور سب سے آسان شکل یہ ہے کہ بائع خریدار سے بوقت رہن وکالت کی شرط لگائے کہ اگر تم نے وقت پر قیمت ادا نہیں کی تو میں تمہاری طرف سے وکیل ہو کر مال مرہون کو بیچ دوں گا اور اپنی قیمت وصول کرلوں گا، اگر مشتری اس شرط کو قبول کرلیتا ہے تو وقت مقررہ پر ادا نہ کرنے کی صورت میں اس کو بیچ کر قیمت وصول کرسکتا ہے، اور یہ وکالت لازم ہوگی، مشتری وکالت سے معزول کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ اور اس صورت میں قیمت سے زائد جو رقم ہوگی وہ مشتری کو لوٹانا ضروری ہے، اور اگر قیمت سے کم ہو تو بقیہ دین مشتری سے وصول کرلے گا (درمختار ۵/ ۳۶۲)۔

۹- اس صورت میں سامان کو روکنے کی دو جہتیں ہوسکتی ہیں:

الف:......فروخت شدہ سامان کو رہن بنا کر روکنا

ب:......اپنا حق وصول کرنے کے لیے اس کو اپنے پاس روکنا، ان دونوں میں سے پہلی جہت کے اعتبار سے حبس مبیع قبضہ کے بعد جائز ہے، جبکہ دوسری جہت کے اعتبار سے جائز نہیں۔

ان دونوں جہتوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ پہلی جہت یعنی مبیع کو بطور رہن ماننے کی صورت میں اگر مبیع بائع کے پاس سے تعدی کے بغیر ہلاک ہوگئی تو اس کے بقدر دین مشتری کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوگا، بلکہ مشتری کا مال ہلاک ہونا سمجھا جائے گا، اور بیع علی حالہ باقی رہے گی، فسخ نہیں ہوگی، اور مشتری کے ذمہ کل ثمن واجب ہوگا، کیونکہ مبیع کو رکھنا ہی باطل ہے، اس لیے اس کا بطور رہن رکھنا نہ رکھنا دونوں برابر ہیں (ہدایہ ۴/ ۵۱۱)۔

اور اگر تعدی کی بنا پر مبیع ہلاک ہوئی ہو تو بائع اس کی قیمت کا ضامن ہوگا، ثمن کا ضامن نہ ہوگا، لہذا اگر مشتری نے بائع سے اس کو پچاس روپے میں خریدا ہو اور بازار میں اس کی قیمت ساٹھ روپے ہو تو بائع پر لازم ہوگا کہ وہ دس روپے مشتری کو دے (ہدایہ ۴/ ۵۰۶)۔

اور دوسری جہت میں (جبکہ محض اپنا حق وصول کرنے کے لیے اس کو اپنے پاس روکنے کو مانا جائے) اگر مبیع بائع کے پاس سے ہلاک ہوجائے تو وہ مضمون بالثمن ہوگی، اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط ہوجائے گا، مضمون بالقیمۃ نہیں ہوگی، اس لیے بازاری قیمت کا ضمان اس پر عائد نہیں ہوگا (درمختار ۵/ ۳۵۰) مسئلہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (ہدایہ ۴/ ۵۱۱۔ ۵۱۸، درمختار ۵/ ۳۵۴)۔

درمختار کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ قبضہ سے پہلے مبیع کو اپنے پاس روکے رکھنا نہ ثمن کی وصولیابی کے لیے جائز ہے، اور نہ بطور رہن، ہاں قبضہ کے بعد بطور رہن روک لینا جائز ہے، یہ علی الاطلاق جائز ہے، کوئی شرط اور قید ہمارے علماء نے اس بارے میں ذکر نہیں کی ہے، البتہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اس صورت میں امام شافعیؒ سے دو اقوال ذکر کیے ہیں، جبکہ رہن کی شرط صلب عقد میں ہو، ایک قول جواز کا ہے اور دوسرا قول عدم جواز کا ہے۔ لیکن انہوں نے بھی جواز ہی کے قول کو راجح قرار دیا ہے اور اس کو ظاہر الروایہ کہا ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۲۴۷، کتاب الرھن)۔

ہاں! ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روکنا نقد بیع میں تو جائز ہے لیکن ادھار بیع میں مبیع کو روکنا جائز نہیں، کیونکہ ادھار بیع کا مقتضا ہی یہی ہے کہ مبیع سے فی الحال مشتری نفع اٹھا سکے اور ثمن بعد میں ادا کرے اور مبیع کو روک لینا اس کے خلاف ہے، اس لیے حبس مبیع نہ ادائیگی کی مدت آنے سے پہلے جائز ہوگا اور نہ بعد میں (ہندیہ ۳/ ۱۵)۔

۱۰- ایسا کرنا شرعاً ناجائز و حرام ہے، کیونکہ یہ معاملہ یا تو بیع ہے یا اجارہ، اگر اس کو بیع قرار دیا جائے تو سابقہ اقساط کو ضبط کرنے اور مبیع کو واپس لینے کی شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے جس میں بائع کو فائدہ ہی فائدہ ہے کہ اس کو فروخت کردہ سامان بھی مل رہا ہے اور ساتھ ہی قیمت کا ایک حصہ بھی، اور مشتری کا نقصان ہی نقصان ہے کہ سامان بھی نہیں ملا اور اس کی قیمت بھی چلی گئی اور ہر وہ شرط جو مقتضاء عقد کے خلاف ہو اور اس میں متعاقدین میں سے کسی کا فائدہ ہو بیع کو فاسد کر دیتی ہے۔

''وکل شرط لایقتضیه العقد وفیه منفعة لأحد المتعاقدین أو للمعقود علیه وهو من أهل الاستحقاق یفسده (هدایه ۳/۴۳)

البتہ وقت مقررہ پر تمام اقساط ادا نہ کرنے کی صورت میں فسخ بیع کا تو اختیار ہے لیکن قیمت کو ضبط کرنے اور مبیع کو واپس لینے کا اختیار نہیں، کیونکہ اس صورت میں ایک ہی شخص کا مبیع اور ثمن دونوں کا مالک ہونا لازم آئے گا اور شریعت میں ایسی کوئی نظیر نہیں ہے کہ ایک ہی شخص دونوں کا مالک ہو، یہی وجہ ہے کہ مشتری خیار شرط حاصل ہونے کی صورت میں چونکہ ثمن کا مالک رہتا ہے، اس لیے حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک وہ مبیع کا مالک نہیں ہوتا، حالانکہ مبیع بائع کی ملکیت سے خارج ہو چکی ہے تاکہ بدلین کا اجتماع ملک واحد میں لازم نہ آئے (ہدایہ ۳/۱۵)۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کو اجارہ قرار دیا جائے لیکن یہ بھی درست نہیں، کیونکہ اجارہ میں مستاجر منافع کا مالک ہوتا ہے، اعیان کا مالک نہیں ہوتا، اور یہاں اگر تمام اقساط کو وقت پر ادا کر دیتا ہے تو اعیان کا مالک ہو جاتا ہے۔

ایک تیسرا احتمال بھی ہے، وہ یہ کہ اس عقد کو بیک وقت بیع اور اجارہ کا مجموعہ قرار دیا جائے، بایں طور کہ اگر تمام اقساط وقت پر ادا کر دیتا ہے تو بیع ورنہ اجارہ، لیکن یہ احتمال بھی فاسد ہے، اس لیے کہ شریعت میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے کہ کوئی عقد بیک وقت بیع بھی ہو اور اجارہ بھی، بلکہ حدیث میں ایک عقد کے ساتھ دو عقد کرنے کی ممانعت وارد ہے:

''نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة'' (ہدایہ ۳/۴۴، نیز امداد الفتاوی ۳/۱۳۲)۔

۱۱- کسی خریدکردہ سامان کو خود خریدار کے پاس اور اس کے استعمال میں رکھ کر رہن قرار دینے کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں جن میں سے ایک جائز اور دوسری ناجائز ہے، پہلی شکل یہ ہے کہ مشتری نے سامان پر قبضہ کر لیا پھر اس سامان کو بطور رہن بائع کو دے دیا، بائع نے قبضہ کرنے کے بعد پھر اس سامان کو بطور عاریت مشتری کو واپس دے دیا تو یہ رہن کی شکل جائز ہے، لیکن چونکہ عاریت کی بنا پر مشتری کا قبضہ ہو جاتا ہے، اس لیے بائع کا قبضہ شئ مرہون پر سے ختم ہو جائے گا اور اس کے ضمان سے نکل جائے گا، کیونکہ قبضہ عاریت اور قبضہ رہن میں منافات ہے، اب اگر وہ چیز مشتری کے پاس سے ہلاک ہو جائے تو بائع کا دین اس سے ساقط نہیں ہوگا، بلکہ علی حالہ مشتری کو قیمت ادا کرنا ضروری ہوگا (ہدایہ ۴/۵۳۰)۔

دوسری شکل یہ ہے کہ مشتری نے سامان پر قبضہ کر لیا اور بائع نے اس سے عقد رہن کا معاملہ زبانی طے کر لیا کہ مجھ کو مبیع میں ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا اور تم صرف استعمال کر سکتے ہو، لیکن اس نے قبضہ نہیں کیا، اس شکل میں اس کو رہن قرار دینا درست نہیں، کیونکہ رہن کے لیے فقہاء نے قبضہ کو شرط قرار دیا ہے اور اس پر قرآنی آیت سے استدلال کیا ہے: ''فرهان مقبوضة'' (سورہ بقرہ)۔ اور یہاں قبضہ نہیں پایا گیا، اس لیے رہن قرار دینا درست نہیں۔

۱۲- شریعت میں عقد کفالت کی حیثیت محض عقد تبرع کی ہے کہ کفیل مکفول عنہ کے نفع اور فائدہ کی خاطر اپنے اوپر ادائے دین کا التزام کرتا ہے، لہذا اس پر اجرت لینا صحیح نہیں (ہدایہ ۳/۱۰۲)۔

البتہ اگر ادارہ یا اشخاص مدیون کے حکم سے کفیل بنیں اور وہ دین کی رقم ادا کر دیں تو صرف ادا کردہ رقم اس سے لے سکتے ہیں، اس سے زائد رقم لینا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں اس کی حیثیت ابتداءً تبرع کی ہے، اور انتہاءً معاوضہ کی ہے، اس لیے تبرع کی بنا پر عقد کفالت کا عوض نہیں لے سکتا اور معاوضہ کی بنا پر جتنی رقم دی ہے اتنی ہی لینے کا حقدار ہے (ہدایہ ۳/۱۰۷)۔

بالکل یہی حیثیت قرض کی ہے کہ وہ ابتداءً عاریت ہوتی ہے اور انتہائً معاوضہ ہوتی ہے اور قرض میں زیادتی یا زائد رقم لینا حرام ہوتا ہے (ہدایہ ۳/۶۰)۔

حاصل یہ ہے کہ خریدار کی طرف سے گارنٹی اور ضمانت لینے کی صورت میں اداروں اور اشخاص کی طرف سے اجرت و معاوضہ کا لین دین جو رائج ہے وہ ناجائز ہے، البتہ کریڈیٹ لیٹر چونکہ اس عہد کی ایک عام مروج چیز ہے، اس لیے دوسری جہت سے اس کی کچھ گنجائش نکل سکتی ہے جس کو مولانا تقی عثمانی صاحب نے ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ ''بینک کے لیے اپنے عمیل سے دو چیزوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

۱- لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے کے عمل میں بینک کے جو واقعی اخراجات و مصارف ہوتے ہیں ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

۲۔ امپورٹر وایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے سلسلہ میں بینک جو خدمات بجالاتا ہے اس پر بحیثیت وکیل یا بحیثیت دلال، یا درمیانی واسطہ کے اپنی خدمات پر اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز ہے، لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز نہیں (فقہی مقالات/۹۸)، میرے نزدیک اگر اس ضمانت کے لیے کفیل کا وقت صرف ہوتا ہو اور اس کو جدوجہد کرنی پڑتی ہو تو اجر مثل لے سکتا ہے، ''کفایت المفتی'' سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے ''نہیں یہ اجرت جائز نہیں اگر یہ اجرت عمل کی ہو تو اجر مثل ہونی چاہیے'' (کفایت المفتی ۸/ ۱۴۳)۔

۱۳۔ ادھار معاملہ کے مکمل کاغذات تیار کرنا جس میں مبیع کی قیمت، ادائیگی کی تاریخ اور مشتری کا دستخط موجود ہو مندوب اور مستحسن ہے، قرآن پاک میں ہے: "یأیها الذین أمنوا إذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوه"۔

لیکن وقت مقررہ پر رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں یا وقت سے پہلے رقم کو حاصل کرنے کے لیے اس دستاویز کو اس کے اندر تحریر کردہ قیمت و مالیت سے کم پر بیچنا جائز نہیں، خواہ اس معاملہ کو حوالہ قرار دیا جائے، یا بیع، حوالہ کا احتمال اس لیے ہے کہ وہ دستاویز مبیع نہیں ہے، بلکہ وہ اس قرض کی سند ہے جو بائع کا مشتری کے ذمہ ہے، بائع نے دستاویز دے کر جو رقم حاصل کی ہے وہ قرض ہے، بائع نے وہ دستاویز دے کر اس کے قرض کو مشتری پر حوالہ کر دیا، جب یہ عقد حوالہ ہو گیا تو حوالہ کی شرائط کے ساتھ صحیح ہوگا، اور اس میں کمی زیادتی باطل ہوگی، کیونکہ حوالہ صرف اس رقم کا ہوتا ہے جو مدیون کے ذمہ دائن کے لیے واجب ہے، اس لیے جتنی رقم اس نے بائع کو دی ہے اتنی رقم مشتری سے وصول کر کے خود رکھے گا، اور جو رقم زائد ہوگی وہ بائع کو واپس کر دے گا۔

کفایت المفتی (۸/ ۱۴۳) پر ایک استفتاء کے جواب میں اس کو حوالہ قرار دیتے ہوئے کمی زیادتی کو باطل قرار دیا گیا ہے (کفایت المفتی ۸/ ۱۴۳)۔ اور بیع کا احتمال اس لیے ہے کہ وہ اس کو نہیں بیچ رہا ہے، بلکہ اس میں جو رقم لکھی ہوئی ہے اس کو نقد روپے کے بدلے الفاظ بیع کے ذریعہ بیچ رہا ہے، لیکن دین کو مدیون کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں (درمختار مع ردالمحتار ۴/ ۱۵)۔

اور ناجائز ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ رقم کو کم رقم کے عوض بیچ رہا ہے جو سود ہے، الغرض دستاویز کی خرید وفروخت فقہ اسلامی کی روشنی میں بہرحال ناجائز ہے، خواہ اس کو حوالہ کہا جائے یا بیع۔

حیلہ جواز:...... البتہ اس کے جواز کا ایک حیلہ یہ ہے کہ بائع اس شخص کو اپنا دین وصول کرنے کا وکیل بنا دے اور وکالت کی اجرت طے کر دے پھر وہ اپنے وکیل سے پیشگی رقم بطور قرض لے لے اور اس کو کہہ دے کہ جو رقم تم مشتری سے وصول کرو گے اس کو اپنے قرض اور وکالت کی اجرت میں رکھ لینا، اس صورت میں مشتری سے کل رقم وصول کر کے اپنے پاس رکھ لینا صحیح ہوگا، لیکن اگر مشتری سے وہ روپئے اس کو وصول نہ ہوئے تو وہ بائع سے اپنے روپئے واپس کر لے گا۔ (امداد الفتاوی ۳/ ۳۲۲)۔

۱۴۔ یہ بات معلوم ہے کہ اگر معاملہ ادھار طے ہوا اور قیمت کی ادائیگی کی مدت بھی طے ہوگئی ہو تو پھر بائع وقت مقررہ سے پہلے مشتری سے ثمن کا مطالبہ نہیں کر سکتا، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بائع کو رقم کی ضرورت پڑ جاتی ہے، اور مشتری وقت سے پہلے رقم دینے کو تیار نہیں تو ایسے موقع پر بائع مشتری سے کہتا ہے کہ میں تم سے کچھ رقم معاف کرتا ہوں، اس لیے تم مابقی رقم فی الحال ادا کر دو، پھر کبھی طے شدہ رقم میں چھوٹ تعجیل کی شرط کے بغیر دی جاتی ہے اور کبھی تعجیل کی شرط پر دی جاتی ہے، اگر چھوٹ تعجیل کی شرط کے بغیر دی گئی ہو تو یہ چھوٹ جائز ہے، اور اس کو بائع کی جانب سے تبرع سمجھا جائے گا اور تبرع لازم نہیں ہوتا ہے، اسی لیے ادائیگی کی تاریخ آنے کے بعد بائع اگر چھوٹ دی ہوئی رقم واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے (بدائع ۶/ ۴۵)۔

اور اگر رقم میں چھوٹ تعجیل کی شرط پر دی گئی کہ بائع وقت سے پہلے طے شدہ رقم کو اس شرط پر مانگتا ہے کہ اس کا ایک حصہ ہم تم کو معاف کر دیں گے، اس کے لیے عربی میں ''ضع وتعجل'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو یہ چھوٹ شرعی اعتبار سے سود ہونے کی بنا پر حرام ہے، اگر بائع نے ایسا معاملہ کر لیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس رقم کو واپس کر دے، اور وقت آنے پر کل رقم مشتری سے لے لے، اس لیے کہ رقم میں چھوٹ تعجیل کی بنا پر ہے، اور تعجیل کی بنا وقت پر ہے اور وقت کا عوض لینا حرام ہے (بدائع ۶/ ۴۵، مزید دیکھئے: موطا امام محمد/ ۳۳۴، موطا امام مالک/ ۲۷۹)۔

خلاصہ یہ ہے کہ وقت سے پہلے ادائیگی کی شرط پر رقم میں چھوٹ سود ہے اور بغیر شرط کے درست ہے۔

۱۵- میری ناقص رائے میں یہ سوال درست نہیں ہے، کیونکہ سوال یہ کیا گیا ہے کہ اگر معاملہ ادھار کیا گیا مگر قیمت کی ادائیگی کے لیے صرف یہ طے ہوا کہ بعد میں دے دیں گے، اور اس کے لیے وقت طے نہیں کیا گیا تو اس صورت میں رقم کے اندر چھوٹ دی جائے، اس لیے کہ اس صورت میں مدت کے مجہول ہونے کی بنا پر بیع فاسد ہے (ہندیہ ۳/ ۳)۔ اور جب بیع فاسد ہوگئی تو رقم میں چھوٹ دینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے اگر سوال سے ادھار کا لفظ ہٹا دیا جائے اور یوں استفتاء کیا جائے کہ بیع کا عقد ہوا اور قیمت کی ادائیگی کے لیے کوئی بات نہیں آئی کہ کب دے گا اور اس صورت میں رقم نقد ادا کرنے پر کچھ چھوٹ دی جائے تو اب سوال صحیح ہو جائے گا، اسی کو ہم نے دین مطلق سے تعبیر کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قیمت کی ادائیگی ابھی ہوگی یا بعد میں ہوگی، متعاقدین نے اس کا کوئی چرچا نہیں کیا، یہ بیع شرعی اعتبار سے درست ہے، اور یہ نقد بیع میں داخل ہے، اس لیے مشتری پر لازم ہے کہ وہ فی الحال ثمن کو ادا کرے، تاہم اگر تاخیر ہو جائے اور بائع کی طرف سے صراحۃً یا دلالۃً اجازت ہو تو صحت بیع میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، بلکہ اگر مطلق معاملہ ہونے کے بعد بائع مشتری کو غیر متعین وقت تک مہلت دے دے تو یہ مہلت دینا درست ہے، حالانکہ ادھار معاملہ میں مدت مجہولہ تک مہلت دینا درست نہیں (ہدایہ ۳/ ۴۵، بدائع ۶/ ۴۴)۔

اس لیے اس صورت میں نقد ادا کرنے پر کچھ رقم کو چھوڑ دینا شرعاً جائز اور مباح ہے۔

۱۶- اس میں کوئی کراہت وقباحت نہیں ہے (بدائع ۶/ ۴۵)۔

۱۷- اگر تمام قسطوں کی ادائیگی سے پہلے (خواہ کچھ قسط ادا کردی ہو اور کچھ باقی ہو یا بالکل ہی ادا نہ کی ہو) بائع کا انتقال ہو جائے تو معاملہ اس کے بعد بھی اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا جو طے شدہ تھا، مشتری علی حالہ قسط وار رقم ادا کرتا رہے گا، بائع کے ورثاء ایک ہی قسط میں تمام رقوم کا نقد مطالبہ نہیں کر سکتے، کیونکہ بائع نے جب مشتری کو قسط وار ادا کرنے کی اجازت دے دی اور مشتری نے اس کو قبول کرلیا تو یہ مہلت مشتری کے لیے بائع کی جانب سے لازم ہوگئی، اس سے خود اس کو رجوع کا حق نہیں تو ورثاء کو یہ اجازت کہاں ہوگی کہ وہ مہلت کو ختم کر سکیں۔

''ولزم تاجیل کل دین ان قبل المدیون'' (درمختار ۴/ ۱۸۸)۔

اور اگر مشتری کا انتقال ہو جائے تو ادھار معاملہ نقد میں تبدیل ہو جائے گا، اور بائع کو اس کا حق ہوگا کہ وہ اس کے ورثاء سے مکمل دین کا نقد مطالبہ کرے۔ (درمختار ۵/ ۵۳۴)۔

لیکن اگر بائع راضی ہو کہ معاملہ اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہے جو طے تھا اور اس کے ورثاء کو قسط وار ادا کرنے کی مہلت دے دے تو یہ مہلت دینا درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دونوں قسم کی روایتیں کتب فقہ میں موجود ہیں، اور علامہ شامی نے دونوں کو دلیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، چنانچہ انہوں نے ''خلاصۃ الفتاوی، قنیہ اور ذخیرہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ مہلت دینا درست نہیں، کیونکہ وقت دین کی صفت ہے، اور صفت قائم بالغیر ہوتی ہے، اس لیے مدیون کے مرنے کے بعد یا تو وہ دین خود اسی کے اوپر واجب اور ثابت رہے گا، یا اس کے ورثاء کے اوپر واجب ہوگا، یا میت کے مال سے متعلق ہو جائے گا اور تینوں احتمال ممکن نہیں، پہلا احتمال اس لیے ممکن نہیں کہ موت کی وجہ سے اس کا ذمہ ختم ہوگیا، دوسرا احتمال اس لیے ممکن نہیں کہ انہوں نے ادائیگی کو اپنے اوپر لازم ہی نہیں کیا ہے اور تیسرا احتمال اس لیے صحیح نہیں کہ میت کا ترکہ عین ہے، اور اعیان میں تاجیل کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، تینوں احتمالات میں سے کسی احتمال کا امکان نہیں تو پھر اس تاجیل کو دین کے ساتھ کس طرح متعلق کیا جائے گا۔

ردالمحتار (۴/ ۱۸۹) میں ہے: ''اور صاحب محیط کے نزدیک مہلت دینا جائز ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ دین اگرچہ ترکہ سے متعلق ہے، لیکن ثابت ذمہ میں ہے، اور جو ذمہ میں ثابت ہو وہ دین ہوتا ہے، عین نہیں ہوتا، اس لیے دین میں تاجیل درست ہوگی قاضی خاں نے اسی پر فتوی دیا ہے''۔

میرے نزدیک یہ آخر والا قول راجح ہے، کیونکہ دین دائن کا حق ہوتا ہے، اور صاحب حق اگر خود ہی اپنے حق کو تاخیر سے ادا کرنے کی اجازت دے دے تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہے بشرطیکہ صاحب حق کو یقین ہو کہ اس کے ورثاء اس کو قسط وار ادا کر دیں گے اور اس کی رقم ضائع نہیں ہوگی۔

''لان الثمن حقه فله ان یؤخره تیسیرا'' (ہدایہ ۳/ ۶۰)۔

۱۸- جو دوکاندار بالاقساط خرید وفروخت کا کاروبار کرتے ہیں اور ہر قسط کی ادائیگی کے وقت پر یا چھ ماہ اور سال بھر میں انعام دیتے ہیں ان کا

انعام دینا ''بیع بالتقسیط'' سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے، بلکہ بیع بالتقسیط اور انعام میں سے ہر ایک کے احکام جداگانہ ہیں، ایک کو دوسرے کے ساتھ جوڑنا درست نہیں، بیع کا حکم اوپر آچکا ہے کہ بائع مشتری کو مبیع فوراً دے دے اور مشتری قسط وار رقم ادا کرتا رہے قیمت کی بنا پر مبیع کو روکے رکھنا جائز نہیں، اس پر انعام دینا نہ دینا دونوں جائز ہیں، بائع پر کوئی جبر نہیں لیکن اگر بائع اپنی تجارت اور دوکان کو چمکانے اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے انعام دیتا ہے تو وہ انعام اس شرط کے ساتھ درست ہوگا کہ انعام دینے والا خود اپنے پیسے سے انعام دے، خریداروں سے اس کے لیے کوئی فیس یا کوئی معاوضہ نہ لے۔

''كذلك ما يفعله السلاطين وهو أن يقول السلطان لرجلين من سبق منكما، فله كذا فهو جائز لما بينا أن ذلك من باب التحريض''۔

اور اس کے لیے قرعہ اندازی کرنا کوئی ضروری نہیں، بلکہ وہ انعام بائع کی جانب سے ہے وہ جس کو دینا چاہے دے سکتا ہے، البتہ اگر سبھی انعام کے مستحق ہوں، لیکن انعام چند افراد کو دینا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں قرعہ اندازی کر لینا بہتر ہے تاکہ کسی کو بدگمانی نہ ہو۔

''والقرعة لتطييب القلوب وازاحة تهمة الميل''

اور اگر بائع نے شرط لگادی ہو کہ خریداروں میں سے جو وقت سے پہلے مکمل قسط جمع کردے گا وہ انعام کا مستحق ہوگا تو پھر جو پہلے جمع کردے گا وہ مستحق ہوگا اگر چند افراد نے پہلے جمع کردیا ہو تو قرعہ اندازی کر لینا بہتر ہے، یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ انعام کے لیے خریداروں سے کوئی فیس نہ لی گئی ہو اور اگر فیس لی گئی ہو تو پھر وہ انعام نہیں ہے، بلکہ قمار کی مروجہ شکل ہے جس کو لاٹری کہا جاتا ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔

۱۹- سوال میں صورت مسئلہ مکمل طور پر واضح نہیں ہے، اس کی واضح صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی تاجر یا کمپنی یا کوئی پارٹی ممبر سازی کرتی ہے، مثلاً، سائیکل، موٹر سائیکل، ریڈیو، یا ٹی وی وغیرہ کی اسکیم چلاتی ہے اور اس چیز کی اصل قیمت اور قسط وار ادائیگی کی تاریخ فکس کردیتی ہے اور ہر قسط کے ادا کرنے پر قرعہ اندازی کی جاتی ہے، اس قرعہ میں جس ممبر کا نام نکل آتا ہے اس کو وہ چیز صرف اتنی قسط پر مل جاتی ہے جو اس نے اس وقت تک ادا کی ہے، اسی طرح ہر ماہ قرعہ اندازی میں نام نکلنے والے کو وہ چیز ملتی رہے گی، اس میں اسکیم چلانے والے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کو ایک ہی قسط میں بہت ساری رقم مل جاتی ہے اور سامان ایک ہی شخص کو دینا پڑتا ہے جو جمع شدہ قسطوں سے بہت کم قیمت کی ہوتی ہے اور وہ تمام رقم کو اپنی تجارت میں لگا دیتا ہے اور ممبر کا فائدہ یہ ہے کہ قرعہ اندازی میں نام نکلنے والوں کو وہ چیز اصل قیمت سے کم میں مل جاتی ہے اور یہ معاملہ فریقین کی رضامندی سے طے ہوتا ہے۔

اس طرح کی تجارتی اسکیم اور قرعہ اندازی شرعی طور پر قمار کے دائرہ میں داخل ہے، اس لیے اس طرح کی اسکیم میں حصہ لینا اور قرعہ اندازی سے طے شدہ اشیاء کو حاصل کرنا ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ شرع میں قمار وہ معاملہ کہلاتا ہے جو نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہو اور صورت مسئولہ میں یہی بات ہے کہ کسی ممبر کو معلوم نہیں کہ اس کا نام قرعہ میں نکلے گا جس سے نفع ہو یا نہیں نکلے گا جس سے نقصان ہو، نیز ثمن بھی مجہول ہے اگرچہ صورۃ متعین ہے، کیونکہ قرعہ میں جس کا نام نکل آتا ہے اس کو وہ سامان ادا کردہ قسط پر دے دیا جاتا ہے اور بعد میں اس سے مزید رقم نہیں لی جاتی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل قیمت وہ نہیں ہے جو شروع میں طے کی گئی تھی بلکہ اصل قیمت مجہول ہے اور ثمن کے مجہول ہونے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

سامان فروخت کرتے وقت دونوں قیمت بتانا

مفتی احمد نادر القاسمی[1]

ادھار فروخت میں قیمت کی زیادتی:

۱، ۲- اس بابت فقہاء ومحدثین کی دوقسم کی آراء کتب فقہ اور شروح حدیث میں ملتی ہیں، بعض حضرات مطلقاً اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم "نهى عن بيعتين في بيعة" (ابوداؤد ۳/۳۸۷) کے ظاہری مفہوم سے استدلال کرتے ہیں۔

اس روایت کو ان حضرات نے اپنا مستدل بنایا ہے جو نقد کے مقابلہ ادھار فروخت میں قیمت کے اضافہ کو غیر درست قرار دیتے ہیں، زین العابدین، ناصر، منصور باللہ، ہادویہ اور امام یحی کا یہی مسلک ہے (نیل الاوطار الشوکانی ۵/۲۴۹)۔

امام نسائی علیہ الرحمۃ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ ان کے قائم کردہ ترجمۃ الباب سے مترشح ہوتا ہے (سنن نسائی ۷/۲۹۶)۔

دوسری رائے جمہور علماء کی ہے کہ بائع اگر نقد فروختگی کے مقابلہ ادھار فروختگی میں اپنے سامان کی قیمت زیادہ رکھے اور فروخت کرے تو شرعا کوئی قباحت نہیں ہے، بشرطیکہ معاملہ کرتے وقت بائع کی بتائی ہوئی دونوں قیمتوں میں سے کسی ایک پر دونوں کا اتفاق ہوجائے اور معاملہ اسی پر تمام ہو۔

یہی رائے شافعیہ، حنفیہ، زید بن علی، مؤید باللہ، اور جمہور کی بھی ہے (نیل الاوطار للشوکانی ۵/۲۴۹)۔

اس بابت وارد شدہ ادلہ کے عموم اور ظاہر کا مقتضی جواز ہی کا ہے، اس سلسلے میں امام ترمذی کی بحث کے لیے دیکھئے: (السنن للترمذی مع شرح ابن العربی ۵/۲۴۱-۲۴۸)۔

نیز فقہاء مذاہب اربعہ کی آراء کی تفصیل کے لیے دیکھئے (بدایۃ المجتہد للقرطبی ۲/۱۴۱، الشرح الصغیر للدردیر علی اقرب المسالک ۳/۹۳، المغنی ۴/۲۵۹، فتح العزیز علی ہامش المجموع ۹/۱۲، المبسوط للسرخسی ۱۳/۸، الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۲/۲۴۳، فقہ السنہ للسید سابق ۳/۱۴۱، الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴/۶۷۵، بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ/ص ۸)۔

مذکورہ بالا کتب میں بیان کردہ تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ ادھار خرید وفروخت میں بائع اگر نقد کے مقابلہ اپنے سامان کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، اور اضافہ کی یہ صورت ربا اور سود کے زمرے میں نہیں آتی اور نہ اس میں ربا کا شبہ ہے اور نہ یہ صورت قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم "نهى عن بيعتين في بيعة" (حوالہ سابق) میں داخل ہے، لہذا (قسطوں) پر اشیاء وأراضی کی خرید وفروخت میں ادھار معاملہ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا شرعا جائز ومباح اور وہ زیادتی بھی حلال وطیب ہے، البتہ اضافہ نہ کیا جائے تو بہتر ہے تاکہ ضرورت مند اور معاشی لحاظ سے کمزور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ راحت مل سکے، اس بارے میں ابن قدامہ حنبلی کی مندرجہ ذیل عبارت سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے:

"فإن الغالب أن البائع بنسيئة يقصد الزيادة بالأجل ...ولكن البيع بنسيئة ليس بمحرم اتفاقا ولايكره إلا أن تكون له تجارة غيره" (المغنی لابن قدامہ ۴/۱۹۵)۔

(ادھار فروختگی میں عام طور پر بائع زیادتی ہی کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس قسم کی فروختگی بالاتفاق نہ تو حرام ہے اور نہ مکروہ، مگر اس صورت میں کراہت ضرور ہے جبکہ اس کے پاس کوئی دوسری تجارت ہو)۔

خلاصہ یہ کہ ادھار فروخت میں قیمت کا اضافہ اور قسطوار قیمت کی ادائیگی اور وصولی نہ ہی ممنوع ہے اور نہ ہی اس میں سود کا شبہ ہے، بلکہ یہ اضافہ سامان کی قیمت میں ہی اضافہ اور سامان ہی کا بدل ہے، ادھار معاملہ کی وجہ سے اس زیادتی کو وقت اور دین کا بدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۳- ادھار قیمت کی ادائیگی جس طرح یکمشت جائز ہے، اسی طرح بالاقساط بھی جائز اور درست ہے، اس میں شرعا کوئی قباحت اور ممانعت نہیں۔

---

[1] اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

(الفتاوی الخانیۃ مع الہندیہ ۲/۲۶۹)۔

سامان فروخت کرتے وقت نقد و ادھار دونوں قیمت بتانا:

۴- فی زمانہ سامان کی خرید وفروخت اور ان کی قیمتوں کی دو نوعتیں ہوتی ہیں، بعض سامان تو وہ ہیں جن کی قیمتیں ان پر لکھی ہوئی ہوتی ہیں اور عام طریقہ سے لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں، اور بعض سامان وہ ہیں جن کی قیمت عام نہیں ہوتی اور نہ لوگوں کو عموما اس کا پتہ ہوتا ہے، جیسے لکڑی کے سامان، فرنیچر وغیرہ، اول الذکر صورت میں دونوں قیمتیں بتانا ضروری نہیں ہے، کیونکہ معروف ومروج ہونے اور قاعدہ شرعیہ "المعروف کالمشروط" کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بلکہ صرف ادھار ہی کا تذکرہ کرے تو کافی ہے اور ابن قدامہ نے تو لکھ ہی دیا ہے کہ ادھار فروخت میں غالب حد تک بائع کا منشاء اضافہ ثمن ہی ہوتا ہے (المغنی ۴/۱۹۵)، البتہ آخر الذکر صورت میں محض استحسان کی حد تک بائع کے لیے بہتر ہے کہ ادھار قیمت کے ساتھ نقد قیمت بھی مشتری کو بتادے، تاکہ وہ غور و فکر کے بعد جسے چاہے اختیار کرلے، مگر قانونی اور شرعی طور پر بائع کے لیے کوئی بندش نہیں ہے، اسے اختیار ہے چاہے تو دونوں طرح کی قیمت بتائے یا صرف ادھار ہی کی قیمت بتا کر اپنا معاملہ طے کرے اور دونوں اس پر متفق ہوجائیں، اس لیے کہ شریعت نے صاحب سامان کو اس کا مکلف قرار نہیں دیا کہ وہ اپنا سامان اتنے ہی میں فروخت کرے جتنے میں دوسرے لوگ فروخت کرتے ہوں، اس پر کسی کو حق اعتراض نہیں، علامہ ابن حزم نے اس کی صراحت کی ہے:

"یجوز لمن أتی السوق کان من أہلہ أو من غیر أہلہ أن یبیع سلعته بأقل من سعر السوق أو باکثر ولا اعتراض لأہل السوق علیه فی ذلك ولا للسلطان" (موسوعۃ ابن حزم ۱/۱۸۶)۔

(جو شخص منڈیوں اور بازاروں میں اپنا سامان فروخت کرنے آئے اس کے لیے جائز ہے کہ یا تو وہ بازار کی قیمت سے کم میں فروخت کرے یا زیادہ میں، کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں اور نہ صاحب سلطنت کو ہے)۔

اور بالخصوص وہ لوگ جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ ادھار ہی فروخت کرتے ہیں، جیسا کہ فی زمانہ بالاقساط اشیاء کی خرید وفروخت رائج ہے کہ صرف قسطوں اور اس کی قیمت ہی کا اعلان کیا جاتا ہے، اور لوگ بطور ممبر یا خریدار اپنا نام اس اسکیم میں درج کرا کر سامان حاصل کرتے ہیں، اس لیے جب شریعت نے نقد و ادھار دونوں طرح فروخت کی اجازت دی ہے تو ایسا نہیں ہوگا کہ ادھار فروخت کرنے پر محض ادھار ہی کے تذکرہ کا پابند بنایا جائے، بلکہ دونوں کے اختیار کا جواز معلوم ہوتا ہے، بس اتنا ضروری ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہو۔

کسی ایک معاملہ پر اتفاق ضروری:

۵- اس معاملہ کی بھی صورت وہی بنتی ہے جو تفصیل سوال نمبر ایک کے تحت گزری، فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں صرف ایک قیمت کے نقد اور ادھار میں کمی اور زیادتی مقصود تھی، اور یہاں کئی ادھار قیمتوں میں علاحدہ علاحدہ قیمتیں اور زیادہ اقساط ہیں، لہذا شرعا اس کے جواز میں بھی کوئی شبہ نہیں بشرطیکہ دونوں یا جتنی بھی شکلیں ہوں ان میں سے کسی ایک پر اتفاق ہوجائے اور معاملہ کرتے وقت ادائیگی کے تعلق سے کوئی ابہام نہ رہے (دیکھئے: مبسوط للسرخسی ۸/۱۳)۔

وقت پر ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں اضافی رقم لینا:

۶، ۷- ان میں مذکور معاملات کی شکلیں شرعا جائز نہیں، ارشاد نبوی ہے:

"قال: لایحل سلف وبیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح مالم یضمن، ولا بیع ما لیس عندك" (مصابیح السنة للبغوی ۲/۳۳۲) "عن عمرو بن شعیب قال: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة صفقة واحدة" (حوالہ سابق) "من باع بیعتین فی بیعة فله أوکسھما أو الربا" (ابوداؤد ۳/۳۸/۷، مصابیح السنۃ ۲/۳۳۱)۔

اور اگر تعین معاملہ کی وجہ سے اسے درست بھی قرار دیا جائے تو بھی یہ اضافہ خواہ فیصد کی شکل میں ہو یا مقدار ثمن پر متعین رقم کی شکل میں ہو غیر درست ہوگا، اس لیے کہ اس زیادتی کو نہ تو سامان کے عوض میں شامل کیا جاسکتا ہے اور نہ ادھار قیمت کی وجہ سے اس اضافہ کو ثمن کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ ربا محرم ہوگا جس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہے، ورنہ تو تحقق ربا کے لیے کوئی صورت نہیں بن سکتی؟ نیز یہ ناجائز و جبری اور باطل طریقہ سے مشتری کا مال کھانے کے مرادف ہوگا جس سے قرآن کریم نے سختی سے منع کیا ہے:

"یایھا الذین آمنوا لاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم" (النساء/۲۹)۔

نیز بائع اور مشتری کے درمیان جب معاملہ طے ہوگیا اور خرید وفروخت کی تکمیل کے بعد قیمت مقرر ہوگئی تو گویا وہ ادھار ثمن مشتری پر دین ہوا اور دیون وقرض میں دائن کی طرف سے کسی قسم کا اضافہ، خواہ جبری ہو یا رضائی وہ سود ہے اور کسی قیمت پر حلال نہیں ہے۔

"أحل الله البيع وحرم الربا" (البقرہ/ ۲۷۵، نیز دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۴/ ۳۵۴)۔ لہٰذا ایک مسلمان بائع کے لیے تو مذکورہ اضافہ کا مطالبہ قطعاً حرام ہوگا، البتہ بائع غیر مسلم ہے تو ضرورۃً مشتری اس طرح بھی رقم کا اضافہ ادا کر کے مجبوراً سامان حاصل کرسکتا ہے۔

مال مرہون سے انتفاع:

۸- (الف)...... اس سلسلے میں مذاہب اربعہ کے نقطہائے نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک مرتہن کے لیے مال مرہون سے انتفاع جائز نہیں، اور حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک مال مرہون سے انتفاع نہ راہن کے لیے درست ہے اور نہ مرتہن کے لیے، الا یہ کہ اجازت ہو (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح مہذب ۱۳/ ۲۲۹، بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۷۶، الکافی لابن قدامہ ۲/ ۱۴۷، البحر الرائق ۸/ ۲۳۹)، علامہ ابن حزم کی بھی رائے یہی ہے (المحلی ۸/ ۸۹)، دلائل کے اعتبار سے راجح قول عدم جواز ہی کا ہے۔

(ب)...... تمام ہی ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر مال مرہون بغیر تعدی کے ہلاک ہوجائے تو اس پر ضمان نہیں آئے گا، اس لیے کہ مرتہن کی حیثیت اس وقت امین کی ہے، اور امین پر ضمان عائد نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ امانت میں ضمان نہیں ہے، البتہ اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ بغیر تعدی کے ضمان واجب ہوگا یا نہیں تو شافعیہ، امام احمد ابن حنبل، ابوعبید، امام اوزاعی اور عطا، نیز ایک روایت حضرت سیدنا علیؓ کی یہ ہے کہ علی الاطلاق مرتہن پر ضمان لازم نہیں آئے گا، امام مالکؒ اس بارے میں اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کے اعتبار سے فرق کرتے ہیں، مثلاً اموال ظاہرہ میں جانور، مکان وغیرہ کہ چونکہ ان کی ہلاکت کے اسباب عام طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور لوگوں کو ان کا پتہ فوراً چل جاتا ہے، اس لیے اس صورت میں ضمان بغیر اظہار تعدی کے نہیں آئے گا، اور اگر اموال باطنہ ہوں مثلاً سونا چاندی، غلہ وغیرہ، اور ان کی بابت راہن اگر کسی طرح کا دعوی کرے تو وہ قابل قبول ہوگا، اور اس صورت میں ضمان لازم آئے گا، یہی رائے اسحاق ابن راہویہ کی ہے اور یہ حضرت علیؓ کی دوسری روایت ہے، حضرت عمرؓ، امام ابوحنیفہؒ سفیان ثوری اور دیگر ائمہ احناف کی رائے یہ ہے کہ خواہ اظہار تعدی ہو یا نہ ہو بقدر قیمت ضمان واجب ہوگا (شرح مہذب ۱۳/ ۵۰-۲۴۹)۔

خلاصہ:...... آج کے حالات میں، جبکہ بد دیانتی عام ہے، اگر یہ بات ظاہر ہوجائے کہ مال مرہون ایسے حالات میں ہلاک ہوا ہے جس میں مرتہن معذور اور بے گناہ ہے تو اس پر ضمان عائد نہیں ہوگا، اور اگر معاملہ قدرے مخفی ہو اور اس کی ہلاکت کے اسباب وقرائن کا اندازہ سہولت سے نہیں لگایا جاسکتا ہو تو مرتہن پر بقدر قیمت رہن ضمان واجب ہوگا، اور اگر دین اور قیمت رہن دونوں برابر ہوجائیں تو دین ساقط ہوجائے گا، اور اگر بڑھ جائے تو زیادہ رقم راہن کو لوٹانا ضروری ہوگا، اور اگر رہن کی قیمت دین سے کم ہو تو راہن کو بقیہ ادا کرنا واجب ہوگا، یہی راجح معلوم ہوتا ہے (فتاوی ہندیہ ۵/ ۴۴۷، ردالمحتار ۵/ ۳۲۳، الکافی لابن قدامہ ۲/ ۱۳۵)۔

(ج)...... مذکورہ صورت میں اگر یہ ثابت ہوجائے کہ قرض خواہ غریب ہے یا مالدار تو ہے، مگر فی الفور کسی پریشانی سے دوچار ہے تو ایسے لوگوں کی بابت تو صاف قرآن کریم کی ہدایت ہے:

"وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (بقرہ/ ۲۸۰)۔

اور اگر مہلت کے باوجود مدیون دین کی ادائیگی پر قادر نہ ہوسکے تو اس سے اجازت لے کر دائن مال مرہون کی قیمت لگائے گا، اگر اس کے دین کے برابر ہو جائے تو اسی دین میں منہا کر کے چاہے تو اسے اپنے پاس رکھ لے، ورنہ اسے فروخت کر کے قیمت حاصل کرلے، اور اگر اس سے زیادہ ہوجائے تو بچا ہوا مال واپس کردے، بغیر اجازت کے رہن کے ذریعہ دین وصول کرنا جائز نہیں ہوگا خواہ اس کی صورت جو بھی ہو، اس لیے کہ وہ اس کا مالک ہی نہیں ہے، اور اگر راہن غنی ومالدار ہو اور پھر بھی ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو اس صورت میں شریعت کا حکم تعزیر و حبس کا ہے، لیکن رہن کو بیچ کر دین وصول کرنے کی اجازت پھر بھی نہیں ہوگی، مگر اس ظلم وزیادتی کا دفع کرنا بھی ضروری ہے، اس لیے فی زمانہ خیال ہوتا ہے کہ وکالت کی شکل اختیار کی جائے گی، جسے حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ نے بھی اختیار کیا ہے، اس سے ایک طرف مرتہن کو اپنا دین وصول کرنے میں سہولت ہوگی تو دوسری طرف ٹال مٹول کا سد باب ہوگا، جس کی صورت یہ ہوگی کہ رہن کا معاملہ ہوتے وقت ہی یہ طے کرلیا جائے، اگر دین وقت پر ادا نہ کیا گیا تو مرتہن یا کسی دوسرے شخص کو یہ اختیار ہوگا کہ رہن کو فروخت کر کے دین وصول کرے (البحر الرائق ۸/ ۲۵۶)۔

قیمت کی ادائیگی تک سامان کا بائع کے پاس رہنا:

۹- (الف)...... اس کے دو اجزاء ہیں: بائع اور مشتری کے درمیان اگر اس طرح معاملہ ہو کہ سامان کی خرید وفروخت کا معاملہ تو طے اور مکمل ہوجائے، البتہ

سامان بائع ہی کے قبضہ میں بطور رہن رہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ یہ کہ اس سامان پر خریداری کے بعد مشتری کا قبضہ ہو جائے پھر اسے قیمت کی ادائیگی کے وقت تک کے لیے بائع کے پاس چھوڑ دیا جائے، اس میں یہ بات ضروری ہوگی کہ مشتری کو سامان لے جانے کا اختیار ہو، تو چونکہ معاملہ کی نوعیت بدل گئی اور رہن کے شرائط بھی پائے گئے، اس لیے یہ صورت درست ہوگی، جیسا کہ امام محمدؒ کی روایت سے پتہ چلتا ہے جسے صاحب "ہدایہ" نے نقل کیا ہے:

"من اشتری ثوبا بدراهم فقال للبائع: أمسك هذا الثوب حتى أعطيك الثمن فالثوب رهن"

(ہدایہ للمرغینانی ۴/ ۵۱۸، نیز الکفایہ مع الفتح ۹/ ۹۹)۔

کسی شخص نے چند درہم کے عوض کپڑا خریدا اور، بائع سے کہا کہ یہ کپڑا اپنے پاس اس وقت تک رکھو جب تک میں اس کی قیمت تم کو ادا نہ کردوں تو یہ کپڑا رہن قرار پائے گا۔

۲۔ یہ کہ مشتری نے اس پر قبضہ نہیں کیا، صرف اس طرح خریدا کہ وہ سامان بائع کے پاس ہی ثمن کی ادائیگی تک بطور رہن رہے گا، تو چونکہ اس وقت مشتری کا اس سامان پر قبضہ نہیں ہوتا اس لیے اسے رہن قرار نہیں دیا جاسکتا، اور نہ ہی یہ رہن درست ہوگا (دیکھئے: بدائع الصنائع ۶/ ۱۳۷)۔

(ب)...... اس صورت میں بائع کا مبیع کو روکنا اس وقت درست ہوگا جب سامان کی قیمت نقد لگائی گئی ہو اور نقد ہی پر خریدار اور بائع کا اتفاق ہوا ہو، اگر اس کے برعکس ہو اور ثمن ادھار طے پایا ہو تو یہ معاملہ درست نہیں معلوم ہوتا (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵، بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۹، ردالمحتار ۴/ ۴۲)، لہذا بالاقساط بیع میں ثمن اور قسط کی وصولی کے لیے مبیع کو اپنے قبضہ میں روکنا بائع کے لیے جائز نہیں ہوگا، بلکہ فوراً حوالگی اور مشتری کو قبضہ دلانا ضروری ہوگا، ورنہ یہ خرید و فروخت درست نہ ہوگی، اور اگر یہ صورت مروج ہے تو بھی عرف فاسد کے زمرے میں شامل ہے جو نص شرعی (حدیث انسؓ) جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درع رہن میں رکھ کر یہودی سے غلہ لینے کا ذکر ہے، سے متصادم ہے اس لیے شرعاً جائز نہیں۔

قسط ادا نہ کرنے پر معاملہ فسخ کرنا:

۱۰۔ جیسا کہ گزر چکا بیع بالتقسیط میں ادھار معاملہ کی وجہ سے مبیع کو روکنا جائز نہیں، البتہ قسطوں کی عدم ادائیگی کی وجہ سے دونوں کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو معاملہ کو باقی رکھیں یا فسخ کردیں، دوران مدت مشتری نے جو قسطیں ادا کی تھیں، معاملہ کے ختم ہونے کے بعد بائع کے لیے ان کو مشتری کو واپس کرنا ضروری ہوگا، ایسا کرنا کہ اگر مشتری نے متعینہ مدت میں قسطیں ادا نہ کیں تو ادا شدہ قسط ہی واپس نہ ہو اور معاملہ بھی ختم ہو جائے قطعاً جائز نہیں، اور بنص قرآن باطل ہے:

"یأیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم" (سورۂ نساء: ۲۹)۔

نیز یہ معاملہ بیع عربون سے بھی قدرے مناسبت رکھتا ہے کہ اس میں بھی بطور بیعانہ رقم کی کچھ مقدار دی جاتی ہے، اور صورت یہ طے پاتی ہے کہ اگر بیع ہوئی تو ٹھیک، اسے قیمت میں شمار کرلیا جائے گا ورنہ واپس نہیں ہوگا، خرید و فروخت میں اس طریقہ کی بابت امام احمد کوئی حرج محسوس نہیں کرتے (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۳۱۳، حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۰۸، الشرح الصغیر للدردیر ۳/ ۱۰۰)

،ان کے علاوہ جمہور ائمہ بیع عربون کی اس شکل کو ناجائز قرار دیتے ہیں، چنانچہ ابن ماجہ کی روایت ہے:

"عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نهی عن بیع العربون" (سنن ابن ماجہ/ ۱۷۷)۔

۱۱۔ اس کی صورت دراصل یہ ہے کہ سامان تو بظاہر مشتری کے قبضہ میں ہے، مگر معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ اگر اتنے دنوں میں قسط ادا ہوئی تو سامان خریدار کا ہو جائے گا اور اگر ادا نہ ہوئی تو بائع کو واپس کردے گا، ورنہ تو اس سوال کی کوئی صورت نہیں بنتی، اس صورت کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خریدار جب تک پوری رقم ادا نہیں کردیتا اسے انتفاع کی اجازت نہیں ہوگی، صرف خریدار کے قبضہ میں وہ شئی بطور رہن رہے گی تو اسے رہن قرار دینا درست ہوگا، ورنہ نہیں۔

ضمانت وگارنٹی پر اجرت:

۱۲۔ شرعی نقطہ نظر سے کفالت وضمانت کا مسئلہ تبرعات اور تقربات سے متعلق ہے، اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ اس پر کوئی اجرت وغیرہ نہ لی جائے، مگر چوں کہ آج کل یہ کام عام طور سے اسٹاک ایکسچینج کے ذریعہ انجام پاتا ہے، اور لوگوں کے درمیان عرف بھی یہی ہے، نیز اس میں کام کرنے والے عملہ اور افراد اپنا وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح آج کے دور میں اس کے بغیر سامانوں کا حصول بھی دشوار ہوگیا ہے، ان تمام احوال کے پیش نظر اسے بروکر اور

سمسار کی حیثیت دی جاسکتی ہے، چونکہ فقہاء احناف بروکر کی اجرت کو جائز قرار دیتے ہیں، اس لیے کفالت وضمانت پر بھی اجرت لینا جائز اور ضرورۃً دینا اور لینا دونوں مباح ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۱۶۱)۔

ایگریمنٹ پیپر کی خرید وفروخت:

۱۳- توصیات وسندات کی خرید وفروخت کے معاملات تقریباً شیئرز کی خرید وفروخت کے مماثل ہیں، اوران سندات پر وہ قیمت اور مالیت درج ہوتی ہے جتنے میں سامان کی فروخت وخرید ہوتی ہے، گویا سند کی فروختگی نقدین (سونے، چاندی) اور کرنسی کی خرید وفروخت ہے، اس لیے احقر کی رائے میں ان سندات پر بیع صرف اور دین بالدین کے احکام جاری ہوں گے، اور ایک ہی ملک کی کرنسی میں اگر خرید وفروخت ہوتو تماثل جائز ہوگا، زیادتی قطعاً ناجائز ہوگی، اور اگر دوسری کرنسی میں ہوتو حسب قیمت اضافہ اور کمی درست قرار پائے گی، البتہ مذکورہ شرائط کے ساتھ جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

جلد ادائیگی کے لیے واجب رقم کم کرنا:

۱۴- اس سلسلے میں فقہاء مذاہب اربعہ کی تفصیل یہ ہے کہ احناف میں سوائے امام زفر کے سبھی اس شکل کے عدم جواز کے قائل ہیں، چنانچہ امام محمدؒ اپنی کتاب موطا میں تحریر فرماتے ہیں:

''قال محمد: و بهذا نأخذ من وجب له دين على إنسان إلى أجّل فسأل أن يضع عنه ويعجل له ما بقي لم ينبغ ذلك، لأنه يعجل قليلا بكثير دينا فكأنه يبيع قليلا نقدا بكثير دينا وهو قول عمر بن الخطاب وزيد بن ثابت وعبد الله بن عمروهو قول أبي حنيفة'' (موطا إمام محمد بن الحسن الشیبانی ۱/۳۳۲)۔

مالکیہ اس صورت کو اس وقت جائز قرار دیتے ہیں جب یہ معاملہ جانبین سے تبرع اور انسانی ہمدردی پر مبنی ہو، اور اسی جذبہ سے دین کی متعینہ مقدار سے کم کر کے فوری ادائیگی کا تقاضا کیا جائے چنانچہ امام مالکؒ لکھتے ہیں:

''من وجب عليه دين إلى أجل فسأل أن يضع و يعجل له ما بقي لم ينبغ ذلك، لأنه يعجل قليلا بكثير دينا وإن أراد كل واحد... من التبرع فلا بأس به'' (موطا امام مالک مع التعلیق الممجد ۳/۲۰۲)۔

البتہ دیگر تمام مالکیہ اس صورت کو ناجائز ہی قرار دیتے ہیں، خواہ قرض میں ہو یا سامان کی قیمت میں (الشرح الصغیر ۳/۵۳)۔

دین اور قرض میں سے کمی کر کے مابقیہ کی ادائیگی کو حنابلہ بھی ناجائز ہی قرار دیتے ہیں، چنانچہ محقق ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''إذا كان عليه دين مؤجل، فقال لغريمه: ضع عني بعضه وأعجل لك بقيته لم يجز'' (المغنی والشرح الکبیر ۴/۱۸۹)۔

شافعیہ بھی اس کو ناجائز ہی قرار دیتے ہیں۔

علماء متقدمین کا دوسرا گروہ اس صورت کو جائز قرار دیتا ہے، جواز کے قائلین کے پیش نظر یہ بات ہے کہ دین قرض دینے والے شخص کا ذاتی حق ہے اور اپنے حقوق میں سے کمی، زیادتی اور ترک کا صاحب حق کو اختیار ہوتا ہے، لہٰذا یہ جائز ہوگا کہ کوئی شخص اپنے حق سے چاہے تو دستبردار ہوجائے یا کمی کر کے وصول کرلے، مجوزین میں حضرت ابن عباسؓ، ابراہیم نخعی، ابوثور وغیرہ ہیں، چنانچہ موفق ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''وروي عن ابن عباس انه لم يربه بأسا، وروي ذلك عن النخعي وأبي ثور، لأنه أخذ لبعض حقه تارك لبعضه فجاز كما لو كان الدين حالا'' (المغنی ۴/۱۸۹)۔

(ابن عباس سے مروی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور ابراہیم نخعی، ابوثور کی یہی رائے ہے، اس لیے کہ وہ اپنے بعض حق کو لے رہا ہے اور بعض کو چھوڑ رہا ہے، لہٰذا جائز ہوگا جس طرح نقد اور فوری ادائیگی والے دین میں جائز ہے)۔

جن حضرات نے جواز کو اختیار کیا ہے ان کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جس میں بنونضیر سے کم لینے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی، سید سابق پورا واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ويرى ابن عباس و زفر جواز ذلك لمارواه ابن عباس أن النبي صلى الله عليه وسلم لما أمر بإخراج بني نضير جاءه ناس منهم فقالوا: يا نبي الله! إنك أمرت بإخراجنا ولنا على الناس ديون لم تحل، فقال رسول الله صلى الله عليه

وسلم: ضعوا و تعجلوا'' (فقہ السنۃ السید سابق ۳/ ۱۶۷)۔

(حضرت ابن عباس اور امام زفر اسے جائز قرار دیتے ہیں اس حدیث کی بنیاد پر جسے ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنی نضیر کو نکالنے کا حکم دیا تو ان میں سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اے اللہ کے نبی! آپ نے ہم لوگوں کو نکالنے کا حکم فرمادیا ہے، اور ہمارے قرض لوگوں پر باقی ہیں جن کی ابھی مدت پوری نہیں ہوئی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کم کردو اور جو مل جائے فوراً لے لو)۔

احقر کے نزدیک جواز یہی راجح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ آج کی تجارتی دنیا میں کوئی تاجر اپنی بڑی سے بڑی رقم کو اگر اس طرح منجمد رکھے گا تو سامانوں کی فراہمی میں خود تاجر کو بھی خسارہ کا سامنا ہوگا اور لوگوں کی دشواریاں بھی بڑھ جائیں گی، نیز اسقاط حق، یعنی اپنی مرضی سے اپنے حق سے کم لینا شریعت میں سود نہیں ہوتا کہ اسے ناجائز قرار دیا جائے، دوسری طرف ابن عباسؓ کی جواز والی روایت بھی دقتوں ہی پر مبنی معلوم ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ علماء نے اسے صرف مکروہ اور غیر اولیٰ قرار دیا ہے، چوتھے یہ کہ ''بیع بالتقسیط'' میں یہ معاملہ ہو یا دیگر دیون میں، کمی کسی شرط کی بنیاد پر نہیں ہوئی، بلکہ دائن کی طرف سے یہ معاملہ تبرعاً ہی ہوتا ہے، اور تبرع کو جمہور امت جائز قرار دیتی ہے، ابوبکر جصاص رازیؒ نے اسے تبرع ہی پر محمول کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''ومن أجاز من السلف إذا قال: عجل لی وأضع عنك، فجائز أن يكون أجازوه إذا لم يجعله شرطا فيه''

(احکام القرآن للجصاص رازی)۔

(اور بائع کی طرف سے کمی کے بعد جو رقم مشتری سے وصول کی جائے گی وہی باقی ماندہ رقم سامان کی قیمت قرار پائے گی، اور اگر سامان کی قیمت نہیں ہے تو ما بقیہ ہی واجب دین میں تبدیل ہو جائے گا، اور وہ کمی تبرع شمار ہوگی)۔

۱۵- قرآن کریم میں ہے: "إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى" (سورہ بقرہ/ ۲۸۲) جس کا تقاضا ہے کہ معاملہ میں تعین مدت ہو، اور حدیث میں بھی، ''ثمن معلوم وأجل معلوم'' کے الفاظ آئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خرید وفروخت میں اگر ثمن اور مبیع کی ادائیگی کی مدت طے نہ ہو تو اکثر فقہاء اسے فاسد قرار دیتے ہیں اور اس کی دو وجہیں ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر مدت کا تعین نہ ہو تو آئندہ بائع اور مشتری کے درمیان کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا ہے جو فسخ بیع کو لازم کر دے گا، اور اسی کو فقہ کی اصطلاح میں مفضی الی المنازعۃ کہا جاتا ہے، لہذا اس اندیشہ کی بنیاد پر یہ شکل جائز نہیں، یہ نقطہ نظر عام علماء کا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ''كل قرض جر نفعا'' کے قبیل سے ہے جو شرعاً ممنوع ہے، لیکن موجودہ زمانے میں مگر خرید وفروخت کے معاملات میں چونکہ اس طرح کی صورت عام طور سے پیش آتی ہے اور لوگوں میں کسی قسم کا تنازع غالب اوقات میں پیش نہیں آتا، اس لیے یہ صورت بھی جائز معلوم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امام قرطبی نے مذکورہ آیت "إذا تداينتم... الخ" میں معاملہ کو تحریر میں لانے کو استحباب پر محمول کیا ہے اور اسے ہی اصح الاقوال قرار دیا ہے۔

(احکام القرآن للقرطبی ۳/ ۳۸۴)۔

نیز یہ کہ ادھار خرید وفروخت میں مدتوں کا عدم تعین اس وجہ سے بھی حارج نہیں کہ اس میں تبادلہ اموال ربویہ کا نہیں، بلکہ غیر ربویہ کا ہے، اس لیے ''کل قرض جر منفعۃ'' کی ممانعت میں بھی یہ صورت معاملہ داخل نہیں، لہذا معاملہ کی یہ شکل جس میں ادائیگی کی مدت بھی طے نہیں ہوتی اور ''وضع وتعجل'' کی صورت اپنا کر بائع اپنے سامان کی قیمت وصول کرتا ہے، اگر تبادلہ اموال ربویہ کا نہ ہو تو جائز ہوگا، ورنہ درست نہیں ہوگا، اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے فقہ کے اس معروف جزئیہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جسے فقہاء احناف نے ''کتاب الصلح'' میں ذکر کیا ہے۔ صاحب ''ہدایہ'' نقل کرتے ہیں:

''وصورته باع ثوبا معينا مثلا بعشرة دراهم وافترقا من غير قبض الدراهم من غير ذكر الأجل، ثم تصالحا على خمسة دراهم، فإنه يجوز. وإن افترقا من غير قبض بدل الصلح الذي هو خمسة دراهم، لأن هذا الصلح على أنه استوفى بعض حقه وأسقط باقيه'' (ہدایہ للمرغینانی ۳/ ۲۳۵)۔

(تصویر مسئلہ اس طرح ہے کہ بائع نے متعین کپڑا دس درہم کے بدلے فروخت کیا اور مشتری نے کپڑا لے لیا اور بائع نے نہ تو ابھی قیمت لی اور نہ ادائیگی کی مدت طے کی، اور دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، پھر پانچ درہم کی ادائیگی پر بائع اور مشتری نے مصالحت کرلی تو یہ صورت جائز ہوگی، اگر چہ بدل صلح پر قبضہ کے بغیر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے، اس لیے کہ صلح اس بات پر ہوئی کہ اس نے اپنا بعض حق وصول کرلیا اور بعض کو ساقط کر دیا۔

تمام قسطیں بطور جرمانہ ایک ساتھ ادا کرنا:

۱۶- فقہاء کی واضح تشریحات موجود ہیں (رد المحتار ۴/ ۲۶، نیز دیکھئے: خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴)۔

شوافع کے یہاں بھی اس طرح کی جزئیات موجود ہیں (کتاب الأم ۳/۳۳)۔

لہٰذا بالاقساط خرید و فروخت میں بائع کی طرف سے اگر معاملہ اس طرح مشروط ہوتا ہے کہ متعینہ مدت میں مقررہ اقساط اگر ادا نہیں کیے گئے تو رقم کی ساری قسطیں ایک ساتھ ادا کرنی پڑیں گی تو شرعی اور فقہی نقطۂ نظر سے بائع کا معاملہ کو اس طرح مشروط کرنا صحیح اور درست ہوگا، اور خریدار کو اسی کے مطابق جملہ رقم دینا ضروری ہوگا، خواہ ان میں سے کچھ کی ادائیگی ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

کسی ایک کے انتقال پر معاملہ کی نوعیت:

۱۷- اس کی تفصیل فقہ حنفی میں ملتی ہے (الدر المختار مع رد المحتار ۴/۲۶، دیکھئے: فتاوی بزازیہ مع ہندیہ ۴/۵۱۲)۔

کتب فقہ میں مذکور جزئیات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بالاقساط اور ادھار خرید و فروخت میں اگر بائع کا انتقال ہو جائے تو معاملہ متاثر نہیں ہوگا، بلکہ مشتری طے شدہ مدت اور اقساط کے تحت ہی قسط بائع کے ورثاء یا کمپنی کو ادا کرتا رہے گا، اور اگر اس کے ورثاء نہ ہوں تو "السلطان ولی من لا ولی له" کے تحت اسے بیت المال میں جمع کردے گا، اور اگر مشتری کا انتقال ہو جائے تو میت کے متروکہ مال سے فی الفور جس طرح دیگر دیون ادا کیے جائیں گے، اسی طرح اسے بھی ادا کیا جائے گا، تمام اقساط تحلیل ہو کر یکبارگی اور ادھار مدت سے حال اور فی الفور میں تبدیل ہو جائیں گی، مشتری کے ورثاء اگر کسی عارض کے سبب اسی کو برقرار رکھنا چاہیں تو بائع کو اختیار ہوگا وہ جسے اختیار کرے، چاہے تو مہلت دے، ورنہ فوراً اپنا بقایا وصول کرلے، معاملہ کی صورت میں بس یہ مذکورہ فرق آئے گا، جیسا کہ فقہاء احناف نے تشریح کی ہے اور یہی رائے شوافع کی بھی ہے (تحفۃ المحتاج ۴/۶۷)۔

خرید و فروخت میں بطور گفٹ اضافی سامان:

۱۸- سوال میں مذکور شکل نہ تو مبیع میں اضافہ کی ہے اور نہ ثمن و قیمت میں زیادتی کی، بلکہ یہ تبرع کی ایک قسم ہے، اس لیے ان انعامات کو مبیع و ثمن کے ساتھ جوڑنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کمپنیاں خریدار اور ممبر بننے کے صلہ میں کوئی سامان بکری میں اضافہ کی غرض سے دیتی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ممبر بنیں اور خریدیں، اس صورت کا جواز تو شرعاً معلوم ہوتا ہے، جیسے احناف کی کتابوں میں یہ جزئیہ ہے:

"وصح التصرف فی الثمن قبل قبضه والزيادة فيه والحط منه والزيادة فی المبيع" (البحر الرائق ۶/۱۱۹)۔

(ثمن پر قبضہ سے پہلے اس میں تصرف بھی درست ہے اور مبیع و ثمن میں اضافہ بھی جائز ہے اور کمی بھی)۔

اس کو اس مسئلہ کے حل کیلئے نظیر بنایا جا سکتا ہے، مگر بادی النظر میں چونکہ محض ترغیب مقصود ہے، اس لیے کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ یہ ایک طرح کی بیع نجش ہی ہے جسے محدثین اور فقہاء نے علی اختلاف الاقوال جائز و ناجائز اور مکروہ قرار دیا ہے، علامہ عینی شارح بخاری "عمدۃ القاری" میں لکھتے ہیں:

"والأصح عندهم صحة البيع مع الإثم و هو قول الحنفية" (عمدۃ القاری ۹/۲۵۵)۔

(صحیح بات یہی ہے کہ بیع نجش علماء کے نزدیک درست ہی ہے، مگر مع الکراہۃ اور یہی رائے احناف کی ہے)۔

خرید و فروخت میں معاملہ کو مبہم رکھنا:

۱۹- یہ صورت شرعاً جائز معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس طرح معاملہ کرنے میں سامان کی قیمت کا تعین نہیں ہوتا اور خرید و فروخت میں مبیع اور ثمن کا متعین ہونا ضروری ہے جو شرائط صحت میں سے ہے، چنانچہ کاسانی لکھتے ہیں:

"ومنها أن يكون المبيع والثمن معلوما"۔ خرید و فروخت کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ سامان اور قیمت متعین و معلوم ہو۔

اور اگر قرعہ اندازی کے وقت جو قسط ادا کر چکا تھا اسے ہی قیمت تصور کرلیا جائے تو بھی یہ بائع کی طرف سے قیمتوں کا تعین نہیں، بلکہ محض مجبوراً وہ سامان مشتری کو اس وجہ سے حوالہ کر رہا ہے کہ اس نے یہ شرط رکھ رکھی ہے، اگر ایسا ہوتا تو پہلے ہی بغیر کوئی قسط متعین کیے ہوئے اتنی ہی رقم کے عوض اپنا سامان فروخت کرتا اور ایسا ہرگز نہیں ہوتا، اس لیے احقر کی رائے میں یہ صورت سٹہ اور شرط کی ہے اسے سند جواز نہیں دی جا سکتی ہے اگرچہ عام اور مروج ہی کیوں نہ ہو، شرعاً فاسد اور باطل ہوگی۔

☆☆☆

خرید وفروخت میں صرف ادھار قیمت بتانا

مولانا محمد ابرار خاں ندوی[1]

۱- نقد فروختگی کے مقابلہ ادھار میں قیمت زائد مقرر کرنا:

ادھار خرید وفروخت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں قیمت کے اندر کچھ زیادتی اور اضافہ کرنا درست ہے، لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہوگا، کہ جب ادھار کی مدت متعین ہو، اور مجلس عقد کے اندر ہی یہ بھی طے کرلیا جائے کہ معاملہ ادھار ہے یا نقد، یعنی بائع اور مشتری عقد کے وقت یہ طے کرلیں کہ ادھار خریدیں گے یا نقد، یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے، بلکہ ضروری جو شئ ہے وہ یہ کہ معاملہ کے اندر کسی ایک صورت کی تعیین اور مدت کا وقت مقرر ہو، تاکہ نزاع کی صورت نہ پیش آئے، ورنہ بیع جائز نہ ہوگی (ہدایہ مع الفتح ۶ / ۶۲-۲۶۱، مجمع الانہر ۲ / ۸، الدر المنتقی ۲ / ۸، شرح العنایۃ ۶ / ۲۶۲، ردالمحتار ۴ / ۲۷۹، نیز دیکھئے: الحلال والحرام فی الاسلام للقرضاوی / ۳۴۷، الفقہ الاسلامی ۴ / ۷۰۹)۔

۲- قسطوں پر قیمت ادا کرنا:

ادھار خرید وفروخت کی صورت میں قیمت کو قسطوں میں اداء کرنا درست ہے (فقہ السنۃ ۳ / ۱۲۵، نیز دیکھئے: نیل الاوطار ۵ / ۱۵۳، الحلال والحرام فی الاسلام للعسباف / ۳۷۹، وللقرضاوی ۴ / ۳۴۷)۔

۳- نقد وادھار دونوں قیمتوں کا تذکرہ کرنا:

ادھار فروختگی کی صورت میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے، بلکہ ادھار اور نقد دونوں کا ذکر کیا گیا تو اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ مجلس عقد ہی میں کوئی ایک شکل طے کرلی جائے، ورنہ بیع جائز نہ ہوگی (الدر المنتقی ۲ / ۸، نیز دیکھئے: شرح العنایۃ علی الہدایۃ مع الفتح ۶ / ۲۶۲، امداد الفتاوی ۳ / ۲۰)۔

۴- ربا کا شبہ:

ادھار فروختگی میں سامان کی قیمت زیادہ متعین کرنا، رباء یا سود کے دائرہ میں نہیں آتا ہے، اس لیے کہ یہ ثمن میں جو زیادتی کی جاتی ہے یہ اجل کے مقابلہ میں ہوتی ہے، اور فقہاء نے اس زیادتی ثمن برائے اجل کو جائز قرار دیا ہے (ردالمحتار ۴ / ۲۷۹، مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی ۲ / ۱۲۴ نیز دیکھئے: فقہ السنۃ ۳ / ۱۲۵، فتاوی رشیدیہ ۴۹۴، امداد الفتاوی ۳ / ۲۰، کفایت المفتی ۸ / ۳۰)۔

۵- قسطوں کی دو میعادیں متعین کرنا:

اس طرح کا معاملہ شرعا درست ہے (فقہ السنۃ ۳ / ۱۲۵)۔

۶، ۷- مدت کی تاخیر پر ثمن میں اضافہ کرنا:

اس طرح سے معاملہ کرنا جائز ہونا چاہیے، اس لیے کہ مدت متعین ہونے کے بعد مزید تاخیر کرنے میں کچھ رقم کا زیادہ کرنا یہ تاخیر اجل کی وجہ سے ہے، اور یہ اجل مجہول بھی نہیں ہے، بلکہ اجل اور ثمن دونوں ایک طرح سے متعین ہوجاتے ہیں، اور یہ نرخ مالیت کا بیان ہے، کہ جب وہ ثمن کی ادائیگی میں تاخیر کررہا ہے تو مال کی قیمت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، لہذا بیع کی مذکورہ دونوں صورتوں کو جائز ہونا چاہیے۔

آج کل عالمی تجارت ہو یا چھوٹی سطح کی خرید وفروخت ہو، تجار قیمت کی ادائیگی میں بہت ہی ٹال مٹول کرتے ہیں، اگر یہ صورت نہ اپنائی جائے تو قیمت نہ ملنے کی بناء ان کی تجارت ختم ہوجائے گی، اور انہیں پریشانی وخستہ حالی سے دوچار ہونا پڑے گا، لہذا لوگوں کے حالات، اور تجارت پیشہ افراد کے طور طریقہ اور زمانہ

---

[1] استاذ جامعۃ الہدایہ، جے پور راجستھان۔

کی ضرورتوں اور تقاضوں کو دیکھتے ہوئے، اس طرح کی صورت اپنانا درست ہونا چاہیے۔

قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے مال رہن رکھنا:

الف:......مال مرہون سے بائع کے لیے استفادہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ مشتری کی جانب سے اجازت ہو تو جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۲۵۶)۔

رہن سے فائدہ اٹھانے کی شرط لگانا:

لیکن اگر فائدہ اٹھانا یعنی گروی رکھی ہوئی شئ سے انتفاع مشروط ہو تو قطعاً جائز نہ ہوگا، اسی طرح بعض روایات شاذہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجازت کے بعد بھی شئ مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہوگا اس لیے کہ یہ رباء ہے اور ربا اذن سے حلال نہیں ہوتا ہے (الدر المختار مع رد المحتار ۵/ ۳۱۰)۔

حنبلی نقطہ فکر:

لیکن امام احمد بن حنبل، امام اسحاق اور ایک گروہ کا خیال ہے کہ مرتہن اگر شئ مرہون کی دیکھ بھال کرتا ہے تو بلا کسی تفصیل کے اس کو حق ہے کہ وہ اس سے مستفید ہو، اور اس کو انتفاع کا مکمل اختیار ہے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ نے رہن میں رکھے ہوئے جانور پر سواری کرنے، اس کا دودھ نوش کرنے کی اجازت فرمائی ہے، یہ حدیث اس بات کے لیے واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ مال مرہون سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

محدث کبیر شیخ عبدالرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں:

''قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الظهر يركب إذا كان مرهونا، ولبن الدر يشرب إذا كان مرهونا، وعلى الذى يركب ويشرب نفقته، هذا حديث حسن صحيح... وفيه حجة لمن قال: يجوز للمرتهن الانتفاع بالرهن إذا قام بمصلحته ولو لم يأذن المالك وهو قول أحمد وإسحاق وطائفة... وذهب الجمهور إلى ان المرتهن لا ينتفع من المرهون بشئ، وتأولوا الحديث'' (تحفۃ الاحوذی ۴/ ۴۶۱)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رہن میں رکھے ہوئے جانور پر سواری کی جائے گی، اور وہ اونٹنی جو دودھاری ہے اس کا دودھ پیا جائے گا، جبکہ وہ رہن میں رکھی ہوئی ہو، اور اس کا نفقہ سواری کرنے والے اور دودھ استعمال کرنے والے پر ہوگا، یہ حدیث حسن اور صحیح ہے......اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے دلیل ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ رہن سے استفادہ کرنا درست ہوتا ہے، جبکہ وہ اس کی اصلاح و دیکھ بھال کرتا ہو، یہ مسلک امام احمد بن حنبل، امام اسحاق اور ایک گروہ کا ہے، لیکن جمہور کا کہنا ہے کہ شئ مرہون سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے اور انہوں نے اس حدیث کی تاویل کی ہے۔

رہن سے انتفاع مشروط ہو:

اسلامی قانون شریعت کی رو سے رہن میں رکھی جانے والی چیز کی حیثیت محض ایک ضمانت کی ہے، اور رہن رکھنے کے بعد بھی وہ شئ اصل مالک کی ملک ہوتی ہے، اس سے فائدہ اٹھانا درست نہ ہوگا، لیکن فقہاء متقدین نے مالک کی اجازت سے استفادہ کی گنجائش رکھی ہے.....مگر رہن رکھتے وقت انتفاع کی شرط لگانے کو ناجائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ ایک طرح کا رباہے (الدر المختار مع الرد ۵/ ۳۱۰)۔

لیکن اس دور میں رہن سے انتفاع عرف میں داخل ہے، گرچہ زبان سے صراحت نہیں ہوتی ہے، مگر لوگوں کے عرف وعادت میں اس سے استفادہ مشروط ہوتا ہے، اس لیے دور حاضر میں ''المعروف عرفا کالمشروط شرعا'' کے تحت اجازت نہ ہوگی (رد المحتار ۵/ ۳۱۱)۔

اگر بائع کے پاس مال مرہون ضائع ہوجائے۔

گزشتہ صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ رہن اصل مالک کی ہی ملک ہوتا ہے، بائع کے پاس اس کی حیثیت محض ایک ضمانت کی ہے، اس لیے اگر شئ مرہون بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے ہلاک ہوجائے، تو بائع، یعنی مرتہن کے مال سے ہلاک سمجھی جائیگی، اسی کے بقدر راہن دین میں کمی کردے گا، گویا ہلاکت کا ضمان بائع کے ذمہ ہوگا (الکفایہ مع الہندیہ ۳/ ۶۰۲)۔

مال مرہون سے قیمت وصول کرنا:

اگر مشتری ٹال مٹول کرے یا غائب ہوجائے، تو بائع قاضی کے پاس مقدمہ دائر کرے گا، اور قاضی مشتری کو قیمت ادا کرنے پر مجبور کرے گا، بلکہ قاضی کو اختیار ہے کہ اس کو قید کردے، اس کے بعد بھی قیمت ادا کرنے میں سستی وکوتاہی اور ٹال مٹول کرتا ہے تو قاضی مال مرہون کو فروخت کر کے بائع کو اس کی قیمت دلوادے گا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۲۷۵، الدر المنتقی فی شرح الملتقی ۲/ ۶۰۱ مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر ۲/ ۶۰۱)۔

۹- بائع کا سامان کو روکنا:

بائع کو اجازت ہوتی ہے کہ فروخت کردہ سامان کو مشتری کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے ہی پاس روک لے، یہاں تک کہ مشتری ثمن کی چند اقساط یا مکمل قیمت ادا کردے...... لیکن اس سامان کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا یہ روکنا فروخت کردہ سامان کو رہن بنانے کے لیے ہے، یا اس کو "حبس المبیع لاستیفاء الثمن" کہا جائے گا..... تو اس سلسلہ میں یہ بالکل واضح ہے کہ بائع فروخت کردہ سامان کو اپنے پاس روکے، اور اس کو رہن مان لیا جائے اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یعنی اس کو رہن قرار دینا کسی حال میں درست نہیں ہے، بلکہ بائع کا فروخت کردہ سامان کو روکنا "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" کے طور پر ہوتا ہے، فقہاء کرام کے یہاں اس کے جواز کی صراحت موجود ہے (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵، نیز دیکھئے: ردالمحتار ۴/ ۴۲)۔

خرید وفروخت نقد صورت میں ہو یا اس کی ادائیگی قسطوں کی شکل میں ہو مثلاً کچھ قیمت فوراً ادا کر لے، اور کچھ بعد میں قسط وار، تو اس صورت میں بائع اپنا حق، یعنی قیمت کو وصول کرنے کے لیے فروخت کردہ سامان کو روک سکتا ہے، لیکن معاملہ بالکل ادھار طے ہوا ہو تو بائع کے لیے مبیع کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۱۰- مکمل اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں ادا کردہ اقساط کو واپس نہ کرنا:

معاملہ کی اس صورت کو ہم فقہاء کی بیان کردہ "بیع عربون" یعنی بیعانہ کی رقم پر قیاس کرسکتے ہیں، جس میں وثیقہ کی خاطر بائع کو کچھ رقم دی جاتی ہے اور اس میں مشتری اگر ثمن ادا نہ کرے تو بائع پر لازم ہوتا ہے کہ اس کو بیعانہ کے طور پر جو رقم ملی ہے، اس کو مشتری کو لوٹادے، اس کو اپنے پاس رکھنا، اور واپس نہ کرنا درست نہیں ہے، اسی طرح یہاں طے شدہ اقساط ادا نہ کرنے کی صورت میں ادا کردہ اقساط مشتری کو لوٹا دینا ہوگا، ورنہ ربا میں شمار ہوگا جو کہ حرام ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع عربون سے منع فرمایا ہے:

"عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربون"

(موطا امام مالک ۲/ ۶۰۹، ابو داؤد فی: ۲۲، کتاب البیوع / ۶۷، باب فی العربان)۔

عمرو بن شعیب سے مروی ہے وہ اپنے والد سے، ان کے والد عمرو کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع عربون سے منع فرمایا ہے۔

بیع عربون کی صورت:

بیع عربون کی شکل یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک شخص کسی سے سامان خریدتا ہے یا جانور کرایہ پر لیتا ہے، اور اس کو کچھ پیشگی رقم اس طور پر دیتا ہے کہ اگر میں نے یہ سامان خرید لیا، یا سواری کو استعمال کرلیا تو یہ قیمت اور رقم سامان کی قیمت یا سواری کے کرایہ میں شمار ہوگی، اور اگر میں نے سامان کو نہیں لیا یا سواری پر سوار نہیں ہوا تو یہ ادا کردہ رقم آپ کی ہوگی، اس طرح کے معاملہ کو باتفاق فقہاء ناجائز کہا گیا ہے، صرف امام ابن حنبل اس کے جواز کے قائل نظر آتے ہیں:

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

"وإن تركت ابتياع تلك السلعة أو كراء الدابة فما أعطيتك لك باطل، بغير شئ أي لا رجوع لي به عليك، وهو باطل عند الفقهاء لما فيه من الشرط و الغرر وأكل أموال الناس بالباطل، فإن وقع فسخ... فقد أجازه أحمد، وروى عن ابن عمر وجماعة من التابعين إجازته، ويرد العربان على كل حال، قال ابن عبد البر: ولا يصح ماروى عنه صلى الله عليه وسلم من إجازته، فإن صح احتمل أنه يحسب على البائع من الثمن إن تم البيع وهذا جائز عند الجميع"

(شرح الزرقانی علی موطا امام مالک ۳/ ۲۵۱)۔

(اگر میں نے اس سامان کو خریدنا، یا جانور کو کرایہ پر لینا ترک کردیا، تو جو رقم میں نے تم کو دی ہے اس کو واپس لینے کا مجھے اختیار نہ ہوگا، اس طرح کی بیع تمام

فقہاء کے نزدیک باطل ہے، اس وجہ سے کہ اس میں شرط پائی جارہی ہے اور اس میں غرر اور لوگوں کے مال کو باطل طریقہ سے کھانا ہے، اگر اس طرح معاملہ کرلیا گیا تو فسخ سمجھا جائے گا، صرف امام احمد بن حنبل نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اور حضرت ابن عمر اور تابعین کے ایک گروہ سے اس کا جواز نقل کیا گیا ہے، بیع عربون کو ہر حال میں رد کیا جائے گا، ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ آپ ؐ سے اس کا جواز نقل کرنا درست نہیں ہے، اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر بیع مکمل ہوجائے تو بائع کے لیے وہ رقم ثمن میں شمار ہوگی، اور یہ ہر ایک کے یہاں جائز ہے)۔

نیز اس سلسلہ میں رموز شریعت کے نکتہ شناس حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''نہی عن بیع العربان أن یقدم الیه شئ من الثمن، فإن اشتری حسب من الثمن، وإلا فهو له مجانا، وفیه معنی المیسر'' (حجۃ اللہ البالغۃ ۲/۱۰۸، نیز ملاحظہ ہو: فقہ السنۃ ۳/۱۴۰)۔

حضور ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ بائع کو ثمن کا کچھ حصہ دیا جائے کہ اگر اس نے خرید لیا تو وہ قیمت میں محسوب ہوگا، اور اگر نہ خریدا تو بائع کو وہ رقم مفت حاصل ہوجائے گی، اس میں جوا پایا جاتا ہے۔

یہی رائے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بھی ہے، حضرت تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''معاملہ مذکورہ ناجائز ہے، اور ناجائز ہونے کی وجہ دوسری ہے، وہ یہ ہے کہ ادنی جزو قیمت رہ جانے پر واپس کرلیں گے اور اداء شدہ رقم کو کالعدم سمجھا جاوے گا، اور اگر اجارہ ہے تو یہ شرط فاسد ہے کہ زر کرایہ کے عوض میں بیع کردیں گے، اور ایسا کوئی معاملہ شریعت میں نہیں ہے کہ ایک صورت میں بیع ہو، اور ایک صورت میں اجارہ''۔

۱۱- فروخت کردہ سامان کو مشتری کے پاس رہن رکھنا:

خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس رکھنا، جس میں اس کو استعمال کرنے کی بھی اجازت ہو، اور اس کو رہن قرار دینا، جس میں فروخت وتصرف کا حق بائع کو ہی ہو، جس کے لیے اس سامان کو رہن بنایا گیا ہے، جائز نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے رہن کی جو اجازت دی ہے، اس میں بہت بڑی حکمت اور مصلحت کارفرما ہے، کہ مشتری قیمت کی ادائیگی میں کسی طرح کی ٹال مٹول سے کام لے، یا قیمت اداء کرنے سے انکار کردے، تو مال مرہون کے ذریعہ بائع اپنی قیمت وصول کرسکتا ہے اور یہاں جو صورت بیان کی گئی ہے اس میں یہ حکمت مفقود نظر آتی ہے، لہذا خرید کردہ سامان کو راہن کے پاس رکھ کر رہن قرار دینا صحیح نہیں۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۱۶)۔

۱۲- کریڈٹ لیٹر کا حکم:

خریدار کی طرف سے گارنٹی لینا شرعا جائز ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ کفالت کی ایک صورت ہے، کفالۃ کا حکم بیان کرتے ہوئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ضمانت یا دوسرے الفاظ میں کفالت اصیل کے حکم سے ہے تو کفیل بعد میں اپنا روپیہ یا سامان اصیل سے واپس لے سکتا ہے (الدر المختار ۴/۲۸۴، نیز دیکھئے: امداد الفتاوی ۳/۱۲۸)۔

لیکن اگر کفالت، یعنی ضمانت اصیل کے حکم کے بغیر ہے تو اس میں کفیل اصیل سے رجوع نہیں کرسکتا، کہ یہ اس کی جانب سے تبرع تصور کیا جائے گا (ردالمحتار ۴/۲۸۴)۔

لیکن آج کل ''کریڈٹ لیٹر'' اس عہد جدید کی ایک عام اور مروج چیز بن چکی ہے۔ کہ بعض ادارے یا اشخاص اس کی ضمانت اور گارنٹی لیتے ہیں، ساتھ ہی اجرت ومعاوضہ کا لین دین ہوتا ہے، شریعت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت جائز ہونی چاہیے اور اداروں یا اشخاص کی جانب سے اجرت لینا سود کے دائرہ میں نہیں آتا ہے، بلکہ یہ ان کی اجرت ہوگی، اور یہ لینا دینا جائز ہوگا، اور حضرت اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ ضمانت کے کمیشن پر ایجنٹ بنانا درست ہے (امداد الفتاوی ۳/۱۲۹)۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت:

چونکہ اس صورت میں دستاویز کے اندر تحریر کردہ قیمت سے کم پر معاملہ ہوتا ہے، اس لیے یہ ربا ہے اور یہ حرام ہے۔

۱۴- طے شدہ رقم کا وقت سے پہلے مطالبہ کرنا:

مذکورہ صورت ناجائز ہے، اس لیے کہ یہ بعینہ قرض کی طرح ہے۔ شیخ السید السابق نقل فرماتے ہیں:

''ذهب جمهور الفقهاء إلى تحريم وضع قدر من الدين نظير التعجيل بالقضاء قبل الأجل المتفق عليه'' (فقه السنة ۳/۱۶۷)

جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ متفق علیہ اجل کے مکمل ہونے سے قبل، حق کو جلدی وصول کرنے کی غرض سے دین کے کچھ حصہ کو معاف کرنا جائز نہیں ہے۔

ابن عباس اور امام زفر کا مسلک:

لیکن حضرت ابن عباسؓ اور امام زفرؒ کا مسلک جواز کا ہے، اور راقم کا رجحان بھی یہی ہے، اس لیے کہ اس کا قوی امکان ہے کہ بائع کو شدید ضرورت ہو، روپے کا نظم نہ ہو پا رہا ہو، اس لیے مناسب ہوگا کہ اس کی اجازت دے دی جائے، اور قیمت کا کچھ حصہ معاف کرنا، بائع کی جانب سے عطیہ ہے، کیونکہ ادھار میں قیمت کا زائد ہونا یہ اجل کے مقابلہ میں ہے، بائع اپنی رضامندی سے اس اجل میں کمی کر رہا ہے اور مشتری بھی تیار ہے تو قیمت میں کمی کرنا شرعاً درست ہوگا۔

شیخ سید سابق نے عبداللہ بن عباسؓ اور امام زفر کا مسلک نقل کیا ہے:

''ويرى ابن عباس وزفر جواز ذلك لما رواه ابن عباس ﷺ أن النبي لما أمرنا بإخراج بني النضير جاء ناس منهم، فقالوا: يا نبي الله! إنك أمرت بإخراجنا، ولنا على الناس ديون لم تحل. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ضعوا وتعجلوا'' (تفصیل کے لیے دیکھئے: فقہ السنۃ ۳/۱۶۷)۔

(حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور امام زفر نے اس کو جائز کہا ہے، حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بنونضیر کو نکالنے کا حکم دیا، تو آپ کے پاس ان کے چند لوگ آئے، اور انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے ہم کو نکالنے کا حکم دیا ہے، جبکہ لوگوں پر ہمارا قرض ہے، اور اس کی مدت پوری نہیں ہوئی ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تھوڑا چھوڑ دو اور جلدی واپس لے لو۔

۱۵- ادھار معاملہ میں مدت مجہول ہو:

خرید و فروخت کا معاملہ ادھار کیا جائے، مگر قیمت اداء کرنے کی مدت متعین نہ ہو، مطلقاً یہ طے کر لیا گیا ہو کہ قیمت بعد میں دے دیں گے تو یہ صورت ناجائز ہے، اس لیے کہ ادھار فروختگی کے اندر زمانہ کی تعیین ضروری ہے، فقہاء نے مدت متعین کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ اگر قیمت ادا کرنے کا زمانہ مقرر نہ ہو تو بائع قریب ہی مدت میں ثمن کا مطالبہ شروع کر دے گا اور مشتری اس کو بعد میں دینا چاہے گا، اور جس کی وجہ سے دونوں کے مابین نزاع اور اختلاف و انتشار پیدا ہوگا، جو کہ ممنوع ہے، اور شریعت اسلامیہ نے تجارت کے معاملہ کو صاف شفاف اور غیر جانب دار رکھا ہے، کہ انسانوں کی ضروریات بھی پوری ہوں، اور کسی کی دل آزاری، قلوب میں کدورت و نفرت بھی پیدا نہ ہو، اور جو بیع نزاع کا باعث ہو وہ ناجائز ہے، اور اس میں یہ صورت اپنانا کہ رقم کم کر کے فوری لین دین ہو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ معاملہ شروع ہی سے ناجائز ہے، صاحب ''عنایہ'' تحریر فرماتے ہیں:

''والبيع بالثمن الحال والموجل جائز... لكن لابد أن يكون الأجل معلوما لئلا يفضي إلى ما يمنع الواجب بالعقد وهو التسليم والتسليم فربما يطالب البائع في مدة قريبة والمشتري يؤخر إلى بعيدها''

(شرح العنایۃ علی الہدایۃ مع الفتح ۶/ ۲۶۲)۔

''نقد اور ادھار دونوں صورتوں میں بیع جائز ہوتی ہے، لیکن ادھار میں مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے تا کہ عقد کے ذریعہ جو چیز واجب ہوتی ہے اس کے سپرد کرنے میں مانع نہ ہو، بسا اوقات بائع قریبی مدت میں اس کی سپردگی کا مطالبہ کرے گا اور مشتری اس کو مدت بعید میں دینا چاہے گا''۔

۱۶- ادائیگی کی تاخیر میں مہلت کا ختم کرنا:

مشتری طے شدہ اقساط میں سے کسی قسط کو ادا نہ کرے یا اداء کرنے میں بہت تاخیر کرے، تو ایسی صورت میں بائع مہلت کے معاملہ کو ختم کر سکتا ہے، چنانچہ سید سابق امام زفر و عبداللہ بن عباسؓ کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ويرى ابن عباس وزفر جواز ذلك لما رواه ابن عباس ﷺ أن النبي صلى الله عليه وسلم لما أمرنا بإخراج بني

النضير جاء ه ناس منهم، فقالوا: يا نبي الله، إنك أمرت بإخراجنا، ولنا على الناس ديون لم تحل فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ضعوا وتعجلوا'' (تفصیل کے لیے دیکھئے: فقہ السنۃ ۳/۱۶۷)۔

۱۷- اگر بیع بالتقسیط میں کسی فریق کا انتقال ہوجائے:

بیع بالتقسیط کی صورت میں مقررہ وقت سے پہلے اگر بائع کا انتقال ہوجائے تو مدت یعنی اجل باطل نہ ہوگی، بلکہ معاملہ سابقہ شرائط کے ساتھ ورثاء کی طرف منتقل ہوگا، اس کے برعکس اگر مشتری کا انتقال ہو تو اجل ختم ہوجائے گی، لہذا بائع اپنا ثمن مشتری کے مال سے حاصل کرلے گا، کیونکہ متروک میں دین کی ادائیگی لازم ہوتی ہے (مجمع الانہر ۲/۸)۔

۱۸- بیع بالتقسیط میں انعام دینا:

یہ صورت جائز ہے، اس میں نہ ربا ہے اور نہ ہی کوئی شرط فاسد پائی جارہی ہے، بلکہ تجارت کو ترقی دینے کیلئے ایک حسین تدبیر اپنائی گئی ہے۔ البتہ انعام دینے کا مطالبہ کرنا، یا زبردستی اس کو مشروط کرانا درست نہ ہوگا، کیونکہ تجارت میں انسان اتنا ہی مطالبہ کرسکتا ہے جو باہم طے پایا ہے، ہاں تاجر اپنی طرف سے یہ صورت اپناتا ہے تو کوئی حرج نہیں، اس کو فقہاء کے بیان کردہ اس جزئیہ پر قیاس کرسکتے ہیں جس میں فقہاء نے یہ اجازت دی ہے کہ عقد مکمل ہونے کے بعد بائع سودے میں اضافہ کرسکتا ہے، اور مشتری چاہے تو ثمن بائع کو زیادہ دے سکتا ہے (مختصر القدوری/۸۱، باب المرابحة والتولية)۔

۱۹- قرعہ اندازی کے ذریعہ مال حاصل کرنا اور معاملہ سے الگ ہوجانا:

یہ صورت ناجائز ہے، اور ربا و قمار کی ایک شکل ہے، بالفاظ دیگر اس کو زمانہ جاہلیت کے ''ازلام'' سے تعبیر کرنا درست ہوگا، اور اس میں ہوتا یہ ہے کہ ابتداء میں جس کا نام نکل آیا اس کو بہت کم قیمت پر سامان مل جاتا ہے، اور اخیر میں نام نکلنے والے کو سامان کی قیمت زیادہ ادا کرنی ہوتی ہے، بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ افراد کی تعداد کثیر ہوئی تو اخیر میں نام نکلنے والے کو سامان کے مقابلہ قیمت زیادہ ادا کرنا پڑ جائے، اور شریعت نے ایسی تجارت کرنے سے منع کیا ہے جس میں غرر فاحش ہو، اور کسی ایک فریق کی دل آزاری ہو، نیز اس میں سامان کی قیمت ہی مجہول ہے، لہذا مذکورہ طریقہ پر معاملہ کرنا کسی حال میں جائز نہ ہوگا۔

☆☆☆

خرید وفروخت-قسط در قسط

مولانا سید عقیل احمد قاسمی

۱- ادھار فروختگی میں قیمت زیادہ کرنا:

اگر کوئی شخص ادھار فروخت کرنے میں نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ کرتا ہے تو اس زیادتی کے جواز وعدم جواز میں قدیم وجدید دونوں قسم کے فقہاء نے بحث کی ہے، اس سلسلے میں فقہاء، محدثین اور ائمہ اربعہ کے مسالک کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (ترمذی، المغنی لابن قدامہ، المبسوط للسرخسی، الدسوقی علی الشرح الکبیر، ہدایہ ۳/ ۵۸)۔

چونکہ یہ بیع عام ہے اور اس میں ثمن کی جو زیادتی پائی جاتی ہے نہ تو وہ قرض ہے اور نہ ہی اموال ربویہ کی بیع ہے، اس لیے اس زیادتی کو سود نہیں کہا جاسکتا، اور عام بیع میں بائع کو شرعاً اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے فروخت کردے، خواہ بازاری داموں پر فروخت کرے، یا ان سے زیادہ داموں پر فروخت کرے، اس لیے نقد بیع کے مقابلہ میں ادھار بیع کی قیمت میں جو زیادتی ہوگی وہ شرعاً جائز ہے، اور اس کے عدم جواز پر قرآن وحدیث میں کوئی نص نہیں ہے۔

۲- ادھار قیمت کو قسطوں میں ادا کیا جاسکتا ہے:

اگر ادھار بیع کی قیمت کی ادائیگی کے لیے بائع اور مشتری کے درمیان یہ بات طے ہوگئی کہ دس ہزار روپئے کو دس قسطوں میں ادا کرنا ہے، اور ہر ماہ کے شروع میں ایک ہزار روپئے دینے ہوں گے تو یہ شرعاً جائز ہے۔

''ویجوز البیع بثمن حال ومؤجل'' (البحر الرائق ۵/ ۳۰۲، خلاصۃ الفتاویٰ ۳/ ۵۴، ہدایہ ۳/ ۴)۔ نقد اور ادھار دونوں طرح فروخت کرنا جائز ہے۔

۳- نقد اور ادھار دونوں طرح فروخت کرنے کا حکم:

اگر کوئی شخص اپنی کسی چیز کو نقد اور ادھار دونوں طرح فروخت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نقد قیمت سو روپئے ہے اور ادھار قیمت دو سو روپئے ہے اور دونوں قیمتوں کو ذکر کرکے ادھار فروختگی اور اس کی قیمت پر اتفاق ہوجاتا ہے تو یہ ادھار بیع جائز ہوگی (خلاصۃ الفتاویٰ ۳/ ۲۰)۔

ادھار فروخت کرنے کی صورت میں ضروری ہے کہ مجلس عقد ہی میں عاقدین کے درمیان ادھار فروخت کرنے پر اتفاق ہوجائے، اور اس کے لیے ثمن اور مدت کا تعین بھی ضروری ہے۔

۴- ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی ربا نہیں ہے:

چونکہ اجل کو مبیع کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت ہے اور ثمن میں اس کی وجہ سے زیادتی کی جاتی ہے، اس لیے یہ زیادتی ربا نہیں ہے (فتح القدیر ۶/ ۵۰۷)۔

۵- دو قیمتوں میں سے اگر ایک قیمت کو طے کرلیا گیا تو یہ جائز ہے:

یہ شکل شرعاً درست ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں جواز اسی وقت ہے جب عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کی تعیین میں اتفاق ہوچکا ہو۔

۶- ادائیگی ثمن کی تاخیر پر منافع کا مطالبہ جائز نہیں:

یہ صورت سود میں داخل ہے، اس لیے کہ اس میں اصل قیمت جو دس روپئے ہے اس پر اضافہ ہورہا ہے، اب اس اضافہ کو منافع کا نام دیا جائے یا کچھ اور کہا جائے، لیکن اس کے سود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ صراحتاً اس صورت میں مدت کی زیادتی کی بنیاد پر قیمت میں زیادتی ہورہی ہے جو شرعاً جائز نہیں (ہدایہ، باب المرابحۃ، الجوہرۃ النیرۃ ۵/ ۶)۔

۷- ادھار فروختگی میں قیمت ادا نہ کرنے پر مزید رقم کی شرط:

معاملہ کی صورت مذکورہ شرعاً ناجائز ہے، اس لیے کہ قیمت کے طے ہونے کے بعد وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے پر مزید رقم کی شرط لگانا بالکل سود ہے، خواہ اس کو کچھ بھی نام دیا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس چیز کی قیمت طے ہوگئی تو وہ قیمت مشتری کے ذمہ دین ہوگئی، اب کسی شرط کی وجہ سے اس سے زیادہ مطالبہ کرنا سود ہے، اور یہ مدت کی زیادتی کی بنیاد پر قیمت میں زیادتی ہوگی جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''اعتیاض عن الأجل'' سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی حرمت پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

نیز اس شرط کے لگانے کی وجہ سے یہ بات مشتبہ ہوگئی کہ مشتری کو کتنی قیمت دینی ہوگی؟ اس لیے کہ یہ معلوم نہیں ہے کہ کس وقت تک وہ قیمت ادا کرے گا جس کی وجہ سے ثمن مجہول ہوگیا جو فساد بیع کا سبب ہے، لہذا مزید رقم کو منافع سے تعبیر کیا جائے یا مالی معاوضہ سے بلاشبہ سود ہے۔

۸- (الف)......بائع کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا:

بائع کے لیے شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا بھی ربا کی ایک شکل ہے (ہدایہ ۳/۵۰۶)۔

(ب)......بائع کے پاس شئ مرہون کے ہلاک ہونے کا حکم:

بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے اگر گروی رکھی ہوئی چیز ہلاک ہوگئی تو بائع شئ مرہون کی قیمت اور دین میں سے جو چیز کم ہوگی اس کا ضامن ہوگا، یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ مرہون کی بازار میں کیا قیمت ہے اور دین کی کتنی مقدار ہے اگر دین کے مقابلہ میں قیمت کم ہے تو بائع اس کا ضامن ہوگا اور اگر قیمت کے مقابلہ دین کم ہے تو بائع کو اس کا ضمان دینا ہوگا (ہدایہ ۴/۵۰۲)۔

(ج)......وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کی صورت میں قیمت شئ مرہون سے وصول کی جائے گی:

اگر مشتری ثمن کی ادائیگی میں ٹال مٹول کررہا ہے یا وقت مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہوگیا تو بائع کے لیے شئ مرہون کو فروخت کرکے اپنا دین وصول کرنا جائز ہے، لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی اسی کو وصول کرنے کی اجازت ہے، زیادہ وصول کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ''فقہ السنہ'' میں ہے:

''ومتی حل الأجل لزم الراهن الإيفاء وسداد ما عليه فإن امتنع عن وفائه ولم يكن أذن له أجبره الحاكم على وفائه أو بيع الرهن'' (فقہ السنہ ۳/۲۹۸)۔

(وقت مقررہ آنے پر راہن پر ضروری ہے کہ وہ اپنے ادائیگی کے وعدہ کو پورا کرے اور اپنی بات پر جما رہے، اور اگر اس نے دین کو ادا کرنے سے انکار کردیا اور اس کی طرف سے مرتہن کو شئ مرہون فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے تو اولاً حاکم وقت اس کو ادائیگی دین پر مجبور کرے، ورنہ پھر مرہون کو فروخت کردیا جائے اور اس کی قیمت سے دین وصول کرلیا جائے)، نیز دیکھئے: (بدایۃ المجتہد ۲/۲۷۸)۔

قیمت کے وصول ہونے تک بائع کا خرید کردہ سامان کو روکنا:

اگر بائع خرید کردہ چیز کو اس وقت تک اپنے پاس روکتا ہے جب تک مشتری مکمل قیمت ادا نہ کردے یا اس کی کچھ قسطیں جمع نہ کردے تو ان دونوں صورتوں میں مبیع کو روکنے کی مذکورہ صورت دو طریقوں سے ممکن ہے:

(۱) ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روک لیا جائے۔ (۲) بطور رہن مبیع کو روک لیا جائے۔

پہلی صورت میں اگر مبیع بائع کے پاس رہتے ہوئے ہلاک ہوگئی تو وہ مضمون بالثمن ہوگی، اور بائع پر بازاری قیمت کا ضمان نہیں آئے گا۔

دوسری صورت میں اگر بغیر تعدی کے مبیع ہلاک ہوگئی تو وہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی اور بیع فسخ نہیں ہوگی، اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا، لیکن اگر وہ مبیع بائع کی تعدی کی وجہ سے ہلاک ہوئی تو بائع پر اس چیز کی بازاری قیمت کا ضمان آئے گا۔

ادھار بیع میں ثمن کی وصولیابی کے لیے بائع کا مبیع کو روکنا:

بیع مؤجل اور بیع بالتقسیط میں اگر بائع ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو اپنے پاس روکتا ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بائع کو ثمن کی وصولیابی

کے لیے مبیع کو روکنے کا حق صرف بیع معجّل (نقد بیع) میں حاصل ہوتا ہے، ادھار بیع میں اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے (فتاویٰ ہندیہ، کتاب البیوع)۔

ادھار بیع میں بائع کا مبیع کو اپنے پاس رہن رکھنا:

اگر بائع بیع مؤجل میں اپنی قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے خرید کردہ سامان کو اپنے پاس بطور رہن رکھتا ہے تو فقہاء نے اس کی دو صورتیں بیان کی ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ بیع مؤجل میں مشتری نے مبیع پر قبضہ نہیں کیا اور قبل القبض اس خریدی ہوئی چیز کو بائع کے پاس بطور رہن چھوڑ دیا، اس صورت میں چونکہ "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" لازم آرہا ہے جو بیع مؤجل میں جائز نہیں ہے، اس لیے خرید کردہ چیز کو رہن رکھنے کی یہ صورت جائز نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اولاً مشتری اپنی خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کرے، اور بعد القبض بائع کے مطالبہ پر اس چیز کو بائع کے پاس رہن رکھ دے، یہ صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے (فتح القدیر ۹/۹۹)۔

اس لیے کہ جب مشتری نے کپڑا خرید کر اس پر قبضہ کرلیا تو وہ کپڑا صحت رہن میں دوسری تمام اشیاء مملوکہ کے برابر ہوگیا، جس طرح مشتری اپنی مملوکہ شئ کو رہن رکھ سکتا ہے اس کپڑے کو بھی رہن رکھنا جائز ہے (درمختار ۶/۴۹۷، ردالمحتار مع الدر المختار ۶/۴۹۷)۔

۱۱- قسطوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں بائع کا سامان کو اپنے قبضہ میں رکھنا:

بعض مرتبہ یہ مشکل پیش آتی ہے کہ مشتری طے شدہ تمام اقساط کو جمع نہیں کرتا اور بائع سامان کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے، اور پوری قسطیں جمع نہ ہونے کی وجہ سے وہ سامان اسی کا ہوجاتا ہے، اور ادا شدہ قسطوں کو بھی واپس نہیں کیا جاتا ہے، شرعاً یہ شکل درست نہیں ہے۔

۱۲- خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس رہن قرار دینا:

اس مسئلہ کی دو شکلیں ہیں:

۱- اگر بائع نے مشتری کی طرف سے اس خرید کردہ سامان پر بطور رہن کے قبضہ کرلیا اور پھر راہن (یعنی مشتری نے بائع کے پاس رہن رکھے ہوئے اس سامان کو عاریت کے طور پر واپس لے لیا اور اس سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا تو ایسا کرنا جائز ہے اور عاریت کی وجہ سے عقد رہن فاسد نہیں ہوگا اور خریدار کے پاس رہتے ہوئے بھی اس کو رہن قرار دیا جائے گا، اور مرتہن کو یہ حق ہوگا کہ جب چاہے اس مرہون کو راہن سے واپس لے لے، اور مدت ادائیگی دین کے گزرنے کے بعد اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کرلے، لیکن اگر یہ چیز راہن کے قبضہ میں ہلاک ہوگئی تو اسی کی چیز ہلاک ہوگی (هدايه، كتاب الرهن)۔

۲- اور اگر مرتہن نے اس چیز پر قبضہ بالکل نہیں کیا تو اس صورت پر عاریت کا حکم لگانا اور راہن کے قبضے میں رہتے ہوئے اس کو رہن قرار دینا درست نہیں ہے، اس لیے کہ رہن کی صحت کے لیے قبضہ شرط ہے جس کی بنیاد قرآن کی اس آیت پر ہے (فرهان مقبوضة) اور یہاں پر قبضہ نہیں پایا گیا)۔

لیکن اگر موجودہ دور کے حالات کے تقاضوں کے اعتبار سے مرتہن شئ مرہون پر قبضہ کرنے کے بجائے ملکیتی دستاویزات پر قبضہ کرلے اور اس قبضہ سے رہن تام سمجھا جائے، اور چونکہ رہن پر مرتہن کے قبضہ کے مشروط ہونے کی علت یہ ہے کہ بوقت ضرورت اس کو بیچ کر اپنا دین وصول کرلے اور یہ چیز مذکورہ رہن میں قانوناً ایگریمنٹ میں مذکور شرائط کی بنیاد پر مرتہن کو حاصل ہو، اس لیے اس بات کا احتمال ہے کہ مذکورہ صورت میں حسی قبضہ شرط قرار نہ دیا جائے۔

اسی طرح اگر مرتہن عین مرہون کو راہن کے قبضہ میں رہنے دے اور شئ مرہون کے ذریعہ اپنا دین وصول کرنے کا حق باقی رہنے دے تو ان وجوہات اور ضروریات کی بنیاد پر اگر بغیر قبضہ مرتہن کے راہن کے قبضہ میں رہنے والی چیز کو رہن قرار دے دیا جائے تو اس میں شرعاً کوئی رکاوٹ نظر نہیں آرہی ہے، جب کہ اس میں راہن اور مرتہن کو فائدہ بھی ہے، راہن کو تو یہ فائدہ ہے کہ اپنی چیز سے فائدہ اٹھائے گا، اور اس سے محروم نہیں ہوگا اور مرتہن کا فائدہ یہ ہے کہ کسی ضمان کے لزوم کے بغیر اس کے پاس اپنا دین وصول کرنے کا حق محفوظ ہے، یہاں تک کہ راہن کے مفلس ہوجانے کی شکل میں بھی دوسرے غرماء کے مقابلہ میں مرتہن اس چیز کا زیادہ حقدار ہوگا، اس دور کی اصطلاح میں اس کو رہن سایل کہا جاتا ہے جو اسلامی ممالک میں رائج ہے۔

۱۳- ضمانت اور گارنٹی پر اجرت لینا:

موجودہ دورہ میں اداروں اور اشخاص کی طرف سے گارنٹی وضمانت لینے پر اجرت اور معاوضہ کا جو لین دین جاری ہے اس کے بارے میں علماء کے

دو نظریے ہیں:

۱۔ ضمانت اور گارنٹی ایک عقد تبرع ہے اور جس طرح قرض کے عقد تبرع ہونے کی وجہ سے اس پر منافع کا مطالبہ جائز نہیں ہے، اسی طرح ضمانت وگارنٹی پر بھی کسی طرح کی اجرت اور معاوضہ کا مطالبہ درست نہیں ہے۔

۲۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے موجودہ دور میں ضمانت اور گارنٹی تجارت کا ایک لازمی جزء بن گئی ہے، اور یہ صرف عقد تبرع نہ رہ کر ایک تجارتی معاملہ بن گئی ہے جس کی تاجروں کو ضرورت ہے، اور خصوصاً بین الاقوامی تجارت میں یہ چیز لابدی ہے، اسی لیے لوگ اس کام کے لیے بڑی بڑی رقمیں صرف کرکے مستقل ادارے قائم کرتے ہیں جو ان خدمات کو انجام دے رہے ہیں اور بغیر اجرت کے گارنٹی دینے کو کوئی تیار نہیں ہے، اس لیے اس وقت ضمانت اور گارنٹی پر اجرت لینا جائز ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرض بھی اس دور میں عقد تبرع ہونے کے باوجود ضمانت کی طرح تجارت کی ایک ضرورت بن چکا ہے اور قرض فراہم کرنے کے لیے بھی مستقل ادارے اور بینک قائم ہیں، اور اب تو مطلوبہ مقدار میں تبرعاً قرض کا ملنا بھی بہت دشوار ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود کسی نے بھی قرض پر نفع لینے کی اجازت نہیں دی ہے، اور چونکہ عقد تبرع ہونے میں دونوں شریک ہیں، اس لیے جس طرح قرض پر نفع لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح گارنٹی پر بھی اجرت لینا جائز نہیں ہے، اور یہی بات زیادہ بہتر ہے۔

البتہ جو اسلامی بینک بین الاقوامی تجارت اور لین دین میں کریڈٹ لیٹر جاری کرتے ہیں، اور مذکورہ بالا موانع کی وجہ سے شرعاً ان کو اس پر اجرت لینے کی اجازت نہیں ہے تو ان کے لیے یہ صورت جائز ہے کہ لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے میں ان کے جو واقعی اخراجات ہوئے ہیں عمیل سے ان کا مطالبہ کریں یا خرید وفروخت کرنے والوں کے درمیان معاملات کو مکمل کرانے میں انہوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان پر بحیثیت وکیل یا بحیثیت دلال کے اجرت کا مطالبہ کریں، اور دونوں صورتوں میں اس طرح اجرت لینے کی گنجائش ہے۔

۱۴- ادھار معاملہ کے کاغذات کی خرید وفروخت:

بعض مرتبہ ادھار معاملہ کے مکمل کاغذات تیار کرائے جاتے ہیں اور وقت مقررہ پر دین ادا نہ کرنے کی صورت میں یا وقت سے پہلے رقم حاصل کرنے کے لیے اس دستاویز کو اس میں تحریر شدہ رقم سے کم میں فروخت کرنے کی دو شکلیں ہیں:

۱- یا تو یہ دین کی بیع اس شخص کے ساتھ کی جائے جس پر دین نہیں ہے، جس کو فقہاء کی اصطلاح بیع الدین من غیر من علیہ الدین سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس بیع کا فاسد ہونا فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

۲- یا یہ کرنسی کی بیع کرنسی کے ساتھ ہے جس کو اصطلاح فقہ میں بیع صرف کہا جاتا ہے، اور اس بیع میں کمی اور زیادتی کرنا اور ادھار بیچنا دونوں ممنوع ہیں اور صورت مذکورہ میں یہ دونوں چیزیں پائی جارہی ہیں، اس لیے ادھار کاغذات کی بیع جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ لابدی امر ہو تو اس معاملہ میں شرعی اعتبار سے یہ گنجائش نکل سکتی ہے کہ بائع کسی بینک یا شخص کو مشتری سے دین وصول کرنے کا وکیل بنادے، اور وہ دستاویز اس کو سپرد کرنے کے بعد اس بینک یا شخص سے نئے معاملہ کے تحت دستاویز میں تحریر شدہ رقم کی مقدار میں قرض لے لے، اور بینک یا شخص کو یہ اختیار دے دے کہ اس دستاویز کے عوض جب مشتری سے رقم وصول ہوجائے تو اس رقم سے اپنا قرض جو مجھ پر ہے وصول کرلینا، شرعی اعتبار سے اس صورت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

۱۵- ''ضع وتعجل'' کا حکم:

اگر ادھار خرید وفروخت کے معاملہ میں بائع طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگتا ہے کہ اس کا ایک حصہ ہم تم کو معاف کردیں گے، فقہاء کی اصطلاح میں اس معاملہ کو ''ضع وتعجل'' (کچھ ساقط کردو اور جلدی حاصل کرو) سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس معاملہ کے حکم شرعی میں اختلاف ہے۔

حضرات صحابہ میں سے عبداللہ ابن عباس، تابعین میں سے ابراہیم نخعی اور احناف میں سے امام زفر اور شوافع میں سے شیخ ابوثور معاملہ کے جواز کے قائل ہیں جب کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت، تابعین میں سے امام محمد ابن سیرین اور حسن بصری اور ائمہ میں سے امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور جمہور محدثین فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

قائلین ضع وتعجل کے دلائل:

''ضع وتعجل'' معاملہ کو جائز قرار دینے والے حضرات نے امام بیہقی کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے مدینہ سے بنی نضیر کے اخراج کا معاملہ ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''لما أمر النبي صلى الله عليه وسلم بإخراج بني النضير من المدينة، جاء ه ناس منهم، فقالوا: يا رسول الله! إنك أمرت بإخراجهم، ولهم على الناس ديون لم تحل، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ضعوا وتعجّلوا''

(جب حضور ﷺ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکلنے کا حکم فرمایا تو کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکلنے کا حکم فرمایا ہے، حالانکہ ان کے لوگوں پر بہت سے دیون باقی ہیں جن کی ادائیگی کا ابھی وقت نہیں آیا ہے، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: کچھ ساقط کردو اور جلدی ادا کردو) (السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب البیوع)۔

حدیث کے آخری جملہ سے ''ضع وتعجل'' کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جن حضرات نے ضع وتعجل کے معاملہ کو ناجائز کہا ہے ان کے پاس متعدد دلائل ہیں: ان میں سے ایک دلیل حضرت مقداد ابن اسودؓ کی وہ روایت ہے جس کی تخریج بھی امام بیہقی نے کی ہے، فرماتے ہیں:

''أسلفت رجلاً مأة دينار، ثم خرج سهمي في بعث بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: له عجل لي تسعين ديناراً وأحط عشرة دنانير، فقال: نعم فذكرت ذلك لرسول الله ﷺ فقال: اكلت ربا يا مقداد وأطعمته''۔

(حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو بطور قرض ایک سو دینار دیے، اس کے بعد حضور ﷺ نے ایک وفد روانہ کیا جس میں میرا نام بھی آ گیا تو میں نے اپنے مقروض سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار دیدو فوری طور پر تو میں دس دینار چھوڑ دوں گا، اس نے اس طرح ادائیگی کو منظور کرلیا، پھر میں نے اس معاملہ کا تذکرہ حضور ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا، اے مقداد تم نے خود بھی سود کھایا اور اس کو بھی سود کھلایا) (السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب البیوع)۔

اس حدیث کی وجہ سے ائمہ اربعہ نے ''ضع وتعجل'' کے معاملہ کو جائز قرار نہیں دیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا جواب:

جواب اول:...... ائمہ اربعہ نے عبداللہ ابن عباسؓ کی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حدیث ''ضع وتعجل'' کے جواز پر حجت نہیں ہے، اس لیے کہ اولاً تو اس حدیث کی سند ضعیف ہے، جیسا کہ خود امام بیہقی نے اس کی صراحت کر دی ہے۔

جواب دوم:...... دوسرا جواب یہ ہے کہ بنی نضیر کی جلاوطنی کا واقعہ ۲ھ میں پیش آیا ہے اور اس وقت تک ربا کی حرمت کا نزول نہیں ہوا تھا، لہٰذا مقداد ابن اسود کی حدیث عبداللہ ابن عباسؓ کی حدیث کے لیے ناسخ ہوگی۔

جواب سوم:...... شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا تو ان لوگوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ لوگوں پر ہمارے دیون ہیں، تو آپ نے فرمایا: دین کا کچھ حصہ ساقط کردو اور بقیہ فوراً لے لو، اور یہ طے ہے کہ مسلمانوں کے درمیان یہ معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور دین کی ادائیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو تو دائن اگر اس شرط پر دین کا کچھ ساقط کر دے کہ مدیون دین کو فوراً ادا کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں ہے (شرح السیر الکبیر للسرخسی ۴/۱۴۱۲)۔

امام سرخسیؒ کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تو ''ضع وتعجل'' کا معاملہ جائز نہیں ہے، اور بنی نضیر کو یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ وہ حالت جنگ میں تھے، اور اس وقت ان کے پورے مال پر بھی مسلمان اگر قبضہ کر لیتے تو یہ بھی جائز ہوتا، لہٰذا اگر مسلمانوں نے ان کے دین کا کچھ حصہ کم کر دیا تو بطریق اولیٰ جائز ہے۔

جواب چہارم:...... اس سلسلہ میں امام واقدی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے دین کے جس حصے کو ساقط کرنے کا حکم دیا تھا اس سے وہ سود مراد تھا جو راس المال سے زائد تھا، فرماتے ہیں: ''فكان لأبي سلام بن الحقيق على أسيد بن حضير عشرون ومأة دينار إلى سنة، فصالحه

على أخذ رأس ماله ثمانين ديناراً وأبطل ما فضل''۔

(ابورافع سلام ابن الحقیق کے حضرت اسید بن حضیر پر ایک سوبیس دینار تھے جن کی واپسی سال گزرنے پر ہونی تھی، چنانچہ حضرت اسید نے اصل راس المال جواسی دینار تھے اس پر اس سے صلح کرلی اور جوزائد (سود کے) چالیس دینار تھے ان کو چھوڑ دیا) (مغازی الواقدی ۱/۱۷۹)۔

امام مالکؒ اس مسئلہ میں آثار صحابہ کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''والأمر المكروه الذي لا اختلاف فيه عندنا أن يكون للرجل على الرجل الدين إلى أجل، فيضع عنه الطالب ويعجّله المطلوب، قال مالك: وذلك عندنا بمنزلة الذي يؤخر دينه بعد محله عن غريمه في حقه قال: فهذا الربا بعينه لاشك فيه'' (مؤطا امام محمد، كتاب البيوع)۔

(امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وہ امر مکروہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے پر کسی مدت تک دین واجب ہو اور وہ دائن دین کا کچھ حصہ ساقط کر کے بقیہ دین کا فوری مطالبہ کرے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے نزدیک اس صورت ہی کی طرح ہے کہ کوئی شخص مدیون کو دین کی تاریخ کے بعد اور مہلت دے دے اور وہ مدیون اس مہلت کے بدلے دین میں کچھ اضافہ کردے، فرماتے ہیں کہ صریح ربا ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے)۔

امام محمدؒ نے اپنی کتاب مؤطا میں زید ابن ثابتؓ کا اثر نقل کرنے کے بعد مندرجہ گفتگو فرمائی ہے:

اور ہم اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو اور وہ اس سے کہے کہ وہ اس کا کچھ دین ساقط کردے گا، بشرطیکہ وہ بقیہ دین فوراً ادا کردے تو یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں وہ دین کثیر کے بدلے میں دین قلیل کو جلد طلب کررہا ہے گویا کہ وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کررہا ہے، یہ ہی قول عبداللہ ابن عمر اور زید ابن ثابت کا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بھی یہی ہے (مؤطا امام محمد)۔

علامہ ابن قدامہ نے اپنی کتاب ''المغنی'' میں جمہور صحابہ، وتابعین ائمہ اربعہ کا مسلک یہی نقل کیا ہے کہ تعجیل دین کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا جائز نہیں ہے (ملاحظہ ہو: المغنی لابن قدامہ ۴/۵۲)۔

لیکن اگر دائن مدیون کے دین کو جلد ادا کرنے کی صورت میں بلا شرط تعجیل تبرعاً کچھ دین ساقط کردے تو یہ جائز ہے، چنانچہ علامہ جصاصؒ نے ''احکام القرآن'' میں ''ضع وتعجل'' کے جواز پر جتنے آثار ہیں ان کو اسی حالت پر محمول کیا ہے (ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص)۔

۱۶- ادھار خرید وفروخت میں ثمن کی ادائیگی کی مدت کی تعیین ضروری ہے:

اگر ادھار معاملہ میں قیمت کی ادائیگی کے لیے صرف یہ طے ہوا کہ بعد میں دے دیں گے اور کوئی وقت طے نہیں کیا گیا تو یہ بیع ناجائز ہوگی۔
(ترمذی، کتاب البیوع، ہدایہ ۳/۴)۔

۱۷- ادائیگی قسط میں کوتاہی پر مہلت ختم کردینا:

اگر کسی شخص نے بیع بالتقسیط میں یہ شرط لگائی کہ اگر مشتری وقت مقررہ پر کوئی قسط ادا نہیں کرے گا تو مہلت ختم ہوجائے گی اور باقی قسطوں کو فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا، تو شرعی اعتبار سے یہ شرط لگانا جائز ہے (خلاصة الفتاوی ۳/۵۴، وهكذا في البحر والدر المختار)۔

۱۸- دائن اور مدیون کی موت سے مہلت کا ختم ہونا:

بیع بالتقسیط میں ادائیگی کے لیے مقررہ وقت آنے سے پہلے اگر دائن (یعنی حاکم کا انتقال ہوگیا تو اس صورت میں مدیون کو دی ہوئی مدت سابقہ حالت پر برقرار رہے گی اور بائع کے ورثاء قسط وار ہی مشتری سے قیمت وصول کریں گے اور اجل باطل نہیں ہوگی (خلاصۃ الفتاویٰ ۳/۹۵)۔

احناف، شوافع، مالکیہ اور ایک روایت کے اعتبار سے امام احمد بن حنبل کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دین مؤجل فوری واجب الادا ہوگا۔

حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کردیں اور ادائیگی پر اطمینان دلادیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت کی وجہ سے فوری واجب الاداء نہیں ہوگا، علامہ ابن قدامہ نے اپنی کتاب ''المغنی'' میں اس مسئلہ میں ائمہ کے اقوال اسی طرح نقل کیے ہیں
(ملاحظہ ہو: المغنی ۴/۴۸۶، کتاب المفلس)۔

متاخرین احناف کا فتویٰ:

احناف کا اصلی مسلک اس مسئلہ میں وہی ہے جو جمہور فقہاء کا مسلک ہے، لیکن متاخرین احناف نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ مشتری کی موت کی وجہ سے وہ دین فی الفور واجب الادا نہ ہوگا، بلکہ مشتری کے ورثاء مشتری کے ترکہ میں سے صرف اسی قدر ثمن ادا کریں گے جو گزشتہ مدت کے مقابلہ میں ہوگا، اس لیے کہ اگر مشتری کے ترکہ میں سے پورا ثمن فی الفور ادا کرنے کا حکم لگادیں تو اس صورت میں ثمن کا جتنا حصہ مدت کے مقابلہ میں تھا وہ بلاعوض ہونا لازم آئے گا، اور اس میں مشتری کا نقصان ہے، کیونکہ وہ اس ثمن پر اس لیے راضی ہوا تھا کہ وہ ایک مدت کے بعد ادا کرے گا (ردالمحتار ۶/ ۷۵۶)۔

قسطوں کی ادائیگی پر انعام:

ایسے دوکاندار جو بالاقساط خرید وفروخت کا کاروبار کرتے ہیں اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے اور لوگوں کو قسطوں کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لیے ماہ بماہ یا چھ ماہ میں انعام دینے کا نظام بناتے ہیں، اور قرعہ اندازی کے ذریعہ خریداروں کو انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں تو ان انعامات سے خریداروں کو مستفید ہونا جائز ہے، اس لیے کہ جب بیع مکمل ہونے کے بعد مشتری بائع کے ثمن میں زیادتی کرسکتا ہے اور بائع مشتری کے لیے مبیع میں زیادتی کرسکتا ہے تو ثمن میں کمی کرنا بھی جائز ہے (ہدایہ ۳/ ۵۹)۔

اگر بطور انعام مشتری کو کچھ دینا چاہے تو اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، مگر یہ انعام بطور صلہ اور تبرع کے ہوگا، جیسا کہ شوافع نے اور امام زفر نے ثمن اور مبیع میں زیادتی اور کمی کو اصل بیع کے ساتھ لاحق نہ مانتے ہوئے مستقلاً اس کو تبرع مانا ہے، ہدایہ میں ہے:

''وعند زفر والشافعي رحمهما الله: لا يصحان على اعتبار الالتحاق بل على اعتبار ابتداء الصلة'' (هدايه ۳/ ۵۹)۔
(اور امام زفر اور امام شافعی کے نزدیک ثمن اور مبیع میں زیادتی اور کمی باعتبار الحاق بیع صحیح نہیں ہے البتہ ابتداءً صلہ اور تبرع کے اعتبار سے صحیح ہیں)۔

۱۹- لاٹری کا حکم:

سوال نمبر ۱۹ میں لاٹری کی جو شکل ذکر کی گئی ہے وہ حرام ہے، اس لیے کہ اس صورت میں دس روپے کے بدلے مثلاً ایک سو روپے مل رہے ہیں، جب کہ کوئی تجارت وغیرہ نہیں ہو رہی ہے تو سوال یہ ہے کہ نوے روپے کیسے مل رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کو سود یا قمار ہی کہا جائے گا، جو شریعت میں حرام ہیں، لہذا مذکورہ معاملہ بالکل جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

ادھار فروخت میں قیمت کی زیادتی کی حیثیت

مفتی عبداللہ قاسمی[۱]

نقد وادھار قیمتوں میں فرق رکھنا:

شریعت میں نقد اور ادھار فروخت کرنے میں قیمت کے لحاظ سے کمی بیشی کرنا جائز ہے، بشرطیکہ مجلس عقد میں یہ طے ہوجائے کہ بیع نقد ہورہی ہے یا ادھار، قیمت بھی متعین ہوجائے اور ادھار ہونے کی صورت میں ادائیگی کی مدت بھی طے کردی جائے۔

(مصنف عبدالرزاق ۸ / ۱۳۷-۱۳۸، امداد الفتاوی ۳ / ۲۰، ۳۱۲ کفایت المفتی ۸ / ۴۲)۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

اس جگہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے بالمقابل قیمت زیادہ مقرر کرنا کہیں ربا اور سود کے دائرے میں تو نہیں آتا؟ کیونکہ قیمت کی یہ زیادتی مدت ادائیگی کے عوض رکھی گئی ہے، اور مدت کے عوض جو زیادتی ہوتی ہے اسے ربا کہتے ہیں، جیسا کہ صاحب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ شیخ عبدالرحمن الجزیری کی اس عبارت سے سمجھ میں آتا ہے:

"وهو أن تكون الزيادة المذكورة في مقابلة تأخير الدفع" (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲ / ۲۲۱)۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ مدت کی وجہ سے ایک عوض (قیمت) میں زیادتی کی گئی ہے، مگر چونکہ صرف مدت کے عوض یہ قیمت نہیں ہے، بلکہ قیمت تو سامان کے بدلہ میں ہے، مدت کی حیثیت صرف وصف اور کیفیت کی سی ہے، تنہا وصف اور کیفیت متقوم نہیں، ان کا عوض لینا درست نہیں ہوتا مگر کبھی کسی چیز کے ساتھ لگ کر ان کی حیثیت ہوجاتی ہے اور وہ قیمت بڑھا دیتے ہیں (الدر المختار ۴ / ۶۶، جواہر الفقہ ۳ / ۱۴۹-۱۵۲)۔

قیمت قسطوں میں طے کرنا:

قسط وار ادائیگی جائز ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابورافع مولی رسول اللہؐ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مابین ایک مکان کی خریداری کا واقعہ ہے، حضرت ابورافع بیچنے والے اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ خریدار ہیں، ابورافعؓ نے جب پیش کش کی تو حضرت سعد نے فرمایا: "والله لا ازيدك على أربعة آلاف منجمة أو قال: مقطعة" (بخاری ۱ / ۳۰۰)۔ بخدا میں تمہیں چار ہزار درہم سے زائد نہیں دوں گا وہ بھی قسطوں میں ادا ہوں گے، پتہ چلا کہ دور صحابہ ہی سے قسط وار ادائیگی رائج چلی آرہی ہے، کتب فقہ میں بھی قسط وار ادائیگی کے احکام مذکور ہیں (درمختار ۵ / ۳۴۴)۔

قسطوں کی تعداد کے اعتبار سے قیمت میں کمی بیشی:

جس طرح نقد اور ادھار کی قیمتوں میں فرق کرنا جائز ہے، اسی طرح مختصر مدت کے ادھار پر کم قیمت اور لمبی مدت کے ادھار پر زیادہ قیمت مقرر کرنا بھی درست ہے، بشرطیکہ مجلس عقد میں ایک صورت متعین کردی جائے، قیمت کی ادائیگی اگر قسط وار طے پائی ہے تو ان قسطوں میں بھی یہ تفاوت برتا جاسکتا ہے۔ (مصنف عبدالرزاق ۸ / ۱۳۶-۱۳۷)۔ ابن شہاب زہری، طاؤس اور سعید بن مسیب بھی اس کے جواز کے قائل ہیں۔

ادائیگی میں تاخیر سے قیمت میں اضافہ:

---

[۱] جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور۔

یہ مشروط اضافہ یقینا سود ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ وہی سود ہے جو زمانہ جاہلیت سے چلا آ رہا ہے کہ خریدار کے ذمہ واجب شدہ رقم کی ادائیگی میں تاخیر کے عوض اس پر مزید رقم عائد کردی جاتی ہے، اس لیے نہ تو اس کا لینا جائز ہوگا اور نہ دینا (فتاوی محمودیہ ۱۳ / ۳۵۰)۔

مال مرہون سے نفع اندوز ہونا:

فقہاء شیٔ مرہون سے انتفاع ناجائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہ نفع اندوزی اسی قرض کی بدولت ہے جو اس نے دے رکھا ہے۔ فقہاء کا استدلال اس حدیث سے ہے: "کل قرض جر منفعة فهو ربا" (الجامع الصغیر للسیوطی مع شرح المناوی ۵ / ۲۸، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ، نیز دیکھئے: رد المحتار للشامی ۵ / ۳۴۳)۔

مال مرہون کا ضمان:

مرہون کے ضائع ہونے کے بعد دیکھا جائے گا کہ اس کی بازار میں جو قیمت ہے وہ مرتہن کے دین کی مقدار کے بقدر ہے یا اس سے کم یا اس سے زیادہ؟ اگر برابر ہے تو گویا مرتہن نے اپنا دین وصول کرلیا، کچھ لینا دینا نہیں۔ اور اگر کم ہے تو قیمت کے بقدر دین وصول ہوگیا اور بقیہ ابھی مدیون کے ذمہ واجب ہے، مثلاً ایک ہزار پر ادھار بیچا تھا جس کے وثیقہ میں خریدار سے ایک گھڑی بطور رہن رکھوالی تھی، گھڑی ضائع ہوگئی جس کی بازار میں قیمت آٹھ سو تھی (اس دن جس دن اس نے اس پر قبضہ کیا تھا) جب وہ ہلاک ہوگئی تو گویا بائع نے اپنے ثمن کا آٹھ سو وصول کرلیا اور مزید دو سو اس کے خریدار کے ذمہ باقی ہیں، اور اگر مرہون کی قیمت دین کی مقدار سے زائد ہے تو مرتہن نے اپنا دین تو وصول کر ہی لیا اور قیمت کا جتنا حصہ دین کی مقدار سے زائد ہے اسے خریدار کی جانب سے لوٹانا بھی نہیں پڑے گا، کیونکہ اس زیادتی پر اس کا قبضہ امانت کا قبضہ تھا اور امانت کے ضیاع سے ضمان نہیں آتا، مثلاً اگر گھڑی کی قیمت بازار میں بارہ سو روپئے ہے تو مزید دو سو روپئے کا لوٹانا مرتہن پر واجب نہیں ہے۔

ہاں اگر مرتہن شیٔ مرہون کے ساتھ تعدی کرے، مثلاً اس کی حفاظت میں اس نے کوتاہی کی، یا بلا اجازت استعمال کیا اور استعمال کے دوران وہ ضائع گئی یا جان بوجھ کر تلف کردیا تو اب اس کی جو بھی قیمت ہوگی وہ اس کا ضامن ہوگا، اگر اس کی قیمت دین سے زائد ہوگی تو زیادتی کا لوٹانا واجب ہوگا (رد المحتار ۵ / ۳۴۱-۳۴۲)۔

شیٔ مرہون سے دین کی وصولیابی کس طرح ہو؟

بہتر تو یہ ہے کہ رہن کا معاملہ کرتے وقت ہی مدیون سے وکالت نامہ لکھوالیا جائے یا لکھے ہوئے وکالت نامہ پر اس سے دستخط لے لیا جائے (درمختار ۵ / ۳۵۸)۔

ہاں اگر رہن کا معاملہ کرتے وقت وکالت عمل میں نہ آئی تو بعد میں جب تک مدیون (راہن) اجازت نہیں دے دیتا کسی کو بیچنے کا اختیار نہیں ہے، البتہ قاضی کی عدالت میں قرض خواہ چارہ جوئی کرے گا اور قاضی وصولیابی دین کی تدابیر اختیار کرے گا، بلکہ وہ یا اس کا نائب مرہون کو بیچ بھی سکتے ہیں (درمختار ۵ / ۳۵۷)۔

واضح رہے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں جہاں با اختیار اسلامی عدالت نہیں ہے اس معاملہ کو سرکاری عدالت میں بھی لے جایا سکتا ہے، کیوں کہ یہ مسلم پرسنل لا میں نہیں آتا۔

قیمت کی وصولیابی تک مبیع کو روک کر رکھنا:

خرید وفروخت کے معاملہ میں شریعت نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ فروخت کنندہ اپنے بیچے ہوئے سامان کو اس وقت تک روکے رکھے جب تک خریدار کی جانب سے قیمت وصول نہیں ہوجاتی، اس روکنے کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ محض اپنا حق وصول کرنے کیلئے مبیع کو اپنے پاس روکے۔ دوسرے یہ کہ فروخت شدہ سامان کو اپنے پاس رہن کے طور پر روک کر رکھے، ان دونوں صورتوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں مبیع جو روکی گئی ہے وہ مضمون بالثمن ہوگی یعنی ہلاک ہونے پر اس کا عوض (ثمن) خریدار سے ساقط ہوجائے گا، جبکہ دوسری صورت میں بیع جو مرہون ہے دین ثمن اور بازاری قیمت میں سے کم کے عوض مضمون ہوگی۔ ان دونوں صورتوں میں روکنے کا جواز چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلی صورت میں بائع کے لیے اپنی فروخت شدہ چیز کو روکنے کا حق دو شرطوں کے ساتھ ہے:

۱۔ عوضین میں سے ایک عین یعنی متعین سامان ہو اور دوسرا دین یعنی ذمہ پر واجب ہونے والا ہو (درہم، دینار) چنانچہ اگر دونوں عین کے قبیل سے ہوئے یا

دونوں دین ہوئے تو کسی کو یہ حق نہ ہوگا کہ کسی دوسرے کی جانب سے حوالگی ہونے تک اپنا مال روکے رکھے، بلکہ دونوں ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو سپرد کریں، مساوات کا تقاضا یہی ہے۔

۲۔ ثمن جو خریدار کے ذمہ ہے نقد ہو، ادھار نہ ہو، پس اگر ادھار قیمت طے پائی ہے تو فروخت کنندہ کو سامان روکنے کا قطعاً حق نہیں، کیونکہ بائع کو روکنے کا اختیار اس لیے ملتا ہے کہ اس کی چیز تو متعین ہے اور خریدار کے ذمہ جو اس کا بدل ہے وہ غیر معین ہے، جب تک وہ دیتا نہیں معین نہیں ہوتا، نیز دو معاملہ کرنے والے عادۃً مساوی حقوق پانے کے خواہشمند ہوتے ہیں، اس لیے شریعت نے یہ اختیار دیا کہ پہلے وہ اپنا حق وصول کر کے متعین کرے، پھر مبیع حوالہ کرے، کیونکہ مبیع پہلے سے متعین ہے، اب جبکہ اس نے از خود قیمت ادھار رکھ چھوڑی تو حبس مبیع کا اختیار خود ساقط کر دیا (بدائع الصنائع ۵/۲۴۹)۔

رہی دوسری صورت تو ادھار فروختگی میں یہ ممکن ہے، مگر اس کے لیے یہ شرط ہے کہ پہلے بائع فروخت شدہ سامان پر خریدار کا قبضہ کرا دے، پھر اس سے دین ثمن کے وثیقہ میں اپنے پاس بطور رہن رکھوالے (ردالمحتار ۴/۳۵۳-۳۵۴)۔

مبیع کو رہن بنا کر خریدار کے پاس رکھنا:

اس سلسلہ میں کچھ شرائط ہیں جن کا لحاظ رکھ کر معاملہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ رہن کا معاملہ کرنے کے بعد مرہون پر مرتہن کا قبضہ ہونا ضروری ہے، پھر اس سے عاریۃ لینا جائز ہوگا، جب تک بحیثیت مرہون مرتہن کا قبضہ نہ ہوگا وہ شئ مرہون نہیں بنے گی (درمختار ۵/۳۴۰)۔

۲۔ جب بائع (مرتہن) خریدار (راہن) کو مرہون بطور عاریت دے دے گا تو اس کے ضمان سے وہ چیز نکل جائے گی، یعنی اگر خریدار کے پاس سے ہلاک ہوئی تو اس کا اپنا مال ہلاک ہوا اور دین بدستور باقی رہے گا (ایضا ۵/۳۶۳)۔

۳۔ مرتہن جب چاہے واپس لے سکتا ہے، کیونکہ عقد رہن باقی ہے (الہدایہ للمرغینانی ۴/۵۳۰)۔

۴۔ اگر وکالت نامہ میں مرتہن کو بیچنے کا اختیار دیا ہے تو وہ بیچ سکتا ہے، لیکن اگر یہ اختیار دیا ہے کہ وہ مبیع جو کہ مرہون ہے اس کا مکمل مالک ہو جائے گا تو جائز نہیں، کیوں کہ فرمان نبوی ﷺ ہے: ''لایغلق الرهن، لصاحبه غنمه وعليه غرمه'' (المستدرک للحاکم ۲/۵۱)

''والمراد بقوله عليه السلام: لا يغلق الرهن على ماقالوا: الاحتباس الكلي بأن يصير مملوكا له كذا ذكر الكرخي عن السلف'' (الہدایہ ۴/۵۰۱)۔

قسطیں وقت پر ادا نہ ہوں تو سامان واپس لے لینا:

اس طرح کا معاملہ عقود شرعیہ میں سے کسی عقد کے تحت نہیں آتا، اس لیے جائز نہیں (امداد الفتاوی ۳/۱۲۲، فتاوی محمودیہ ۱۳/۳۵۰)۔

مبیع کے کاغذات بیچ دینا:

سوال میں مذکورہ صورت میں مبیع کا غذات نہیں، بلکہ درحقیقت ان میں درج شدہ رقم ہے جو اصل خریدار کے ذمہ باقی ہے اور رقم کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ اس طرح کہ ایک ادھار اور دوسری نقد ہو جائز نہیں، یہ سود ہے، نیز یہ دین (ذمہ پر باقی رہنے والے مال) کی بیع ہے جو مدیون کے علاوہ شخص کے ہاتھ جائز نہیں، البتہ دستاویز میں تحریر شدہ رقم کے برابر رقم لے کر بیچنا درست ہے، اس وقت یہ بیع نہیں، بلکہ حوالہ کی تاویل میں ہوگا، بشرطیکہ حوالہ کی شرطیں ملحوظ رکھی جائیں (الدرالمختار ۴/۱۵)۔

قبل از وقت قیمت کم کر کے وصول کرنا:

اس سلسلہ میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، جمہور فقہاء و محدثین، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور دوسرے حضرات عدم جواز کے قائل ہیں، صحابہ میں ابن عباسؓ اور احناف میں امام زفرؒ اس کو جائز بتلاتے ہیں، موطا امام مالک میں ایسے دو واقعے مذکور ہیں، حضرت زید بن ثابتؓ سے مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے سختی سے منع فرمایا:

''عن عبيد أبي صالح مولى السفاح أنه قال: بعت بزا لي من أهل دارنخلة إلى أجل ثم أردت الخروج إلى الكوفة فعرضوا

علي أن أضع عنهم وينقدونني فسألت عن ذلك زيد بن ثابت فقال: لا آمرك أن تأكل هذا ولا تؤكله''
(موطاامام مالک/۲۷۸)۔

(عبید ابوصالح کہتے ہیں کہ میں نے دارنخلہ والوں کے ہاتھ ایک مدت کے ادھار پر اپنے کچھ کپڑے بیچے، پھر میرا کوفہ جانے کا ارادہ ہوا تو ان لوگوں نے یہ تجویز رکھی کہ میں ان سے کچھ بقایا کم کردوں اور وہ مجھے نقد دیدیں، میں نے حضرت زید بن ثابتؓ سے پوچھا تو آپ نے کہا میں اجازت نہیں دیتا کہ تم اسے کھاؤ یا کھلاؤ)۔

اس کے معاً بعد ایک اور روایت ہے جس میں ابن عمرؓ سے پوچھا گیا ہے تو آپ نے بھی منع فرمایا ہے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ صورت اور زمانہ جاہلیت والی معروف صورت (تاخیر دین کی وجہ سے اضافہ) دونوں برابر ہیں۔

امام محمدؒ اپنی موطا میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اپنا موقف اور اس کی علت تفصیل سے یوں بیان فرماتے ہیں:

''بهذا نأخذ من وجب له دين على إنسان إلى أجل فسأل أن يضع عنه ويعجل له ما بقي لم ينبغ ذلك، لأنه يعجل قليلا بكثير دينا فكأنه يبيع قليلا نقدا بكثيرا دينا وهو قول عمر بن الخطاب و زيد بن ثابت وعبد الله بن عمر و هو قول أبي حنيفة'' (موطاامام محمد/۳۳۲)۔

(ہم اسی (عدم جواز) کو اختیار کرتے ہیں جس کا کسی انسان کے ذمہ بقایا ہو اور وہ اس سے چاہے کہ کچھ کم کر کے مابقیہ فوراً لے لے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ وہ زیادہ مقدار دین کے عوض تھوڑی مقدار دے رہا ہے، گویا کم نقد کو زیادہ دین کے عوض بیچ رہا ہے، یہی قول حضرت عمر، ابن عمر اور زید بن ثابتؓ اور امام ابوحنیفہ کا ہے)۔

یعنی ان آثار صحابہ کے علاوہ ''ضع وتعجل'' کی صورت کا متفق علیہ ربا حرام (ربا جاہلیت) سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونا بھی اس کی حرمت کا متقاضی ہے۔

جو حضرات جواز کے قائل ہیں ان کے پیش نظر حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کو مدینہ چھوڑ کر جانے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا کہ لوگوں کے ذمہ ہمارے دیون ہیں تو آپ نے فرمایا کہ کم کرو اور جلد وصول کرو۔

جمہور اس واقعہ کو تحریم ربا کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا قرار دیتے ہیں، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے: ''وأخرج ابن جرير وابن مردوية عن عمر بن الخطاب أنه خطب فقال: إن من آخر القرآن نزولا آية الربا'' (الدر المنثور فی التفسیر للسیوطی ۲/۱۰۴)

یعنی قرآن پاک کی آیات احکام میں سب سے آخری آیت آیت ربا ہے۔ اور بنونضیر کا اخراج ۴ھ میں ہوا ہے، اس لیے واقعہ بنی نضیر سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ الغرض جمہور کی رائے کے مطابق طے شدہ قیمت میں تخفیف کی شرط لگا کر قبل از وقت ادا کرنا سود ہوگا۔

ہاں اگر مدیون نے دین کی ادائیگی میں جلدی کر دی اور دائن نے تبرعاً کچھ کمی کر دی یا پہلے دائن نے بغیر کسی شرط کے کمی کر دی اور مدیون نے دین جلدی ادا کر دیا تو جائز ہے (مولانا عبدالحئی لکھنوی التعلیق الممجد علی موطا الامام محمد/ ۳۳۲)۔

غیر معین مدت کا ادھار:

قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہونی چاہیے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح معاملہ کرنا ہمیشہ سے مروج و معمول رہا ہے، جیسا کہ ابن عمرؓ سے مروی ہے۔

''عبد الرزاق قال: أخبرنا معمر قال: بلغني أن ابن عمر كان يبتاع إلى ميسرة ولا يسمى أجلا'' (مصنف ۸/۱۳۸)۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یوں مدت معین کیے بغیر عقد کر لینا باعث نزاع ہوسکتا ہے دوسری طرف لوگوں کا یہ معمول بھی ہے اس لیے فقہاء نے سلم پر قیاس کر کے ازخود ایسے معاملوں کی تحدید فرمادی ہے، اور وہ ایک ماہ کی مدت ہے (درمختار ۴/۲۵)۔

اب اگر کوئی شخص اس طرح عقد کرتا ہے پھر بعد میں بائع سے کہتا ہے کہ قیمت کا اتنا حصہ معاف کر دو، بقیہ میں تمہیں ابھی ادا کر دیتا ہوں تو یہ جائز نہ

ہوگا، کیونکہ یہ کمی اس ایک مہینہ کی مدت کے عوض ہوگی جو ادھار قیمت کی ادائیگی کے لیے معین ہے۔

قسط کی تاخیر سے قیمت نقد ہوجانے کی شرط:

ادھار معاملہ کرتے وقت اگر یہ شرط لگائی جائے کہ خریدار طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی ادائیگی اگر اس کے وقت پر نہ کر سکا تو اس کو دی گئی مہلت ختم ہو جائے گی اور فوری طور پر مابقیہ جملہ قسطوں کا ادا کرنا ضروری ہوگا، فقہاء کی تصریحات کے مطابق یہ شرط جائز ہے (درمختار ۴/۲۶)۔

قسطوں پر بیع کے ساتھ انعام کی اسکیم:

اگر اس انعام کی صورت میں خریدار کا روپیہ ضائع ہونے کی کوئی صورت نہیں جیسا کہ عبارت سوال سے ظاہر ہوتا ہے اور قیمت بھی پوری دیتا ہے، یہ نہیں کہ قیمت پوری ہونے سے پہلے (خواہ ایک ہی قسط پر سہی) اگر نام نکل آئے تو سائیکل مل جائے اور بقیہ قیمت ساقط ہوجائے، تب تو بظاہر یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے، ورنہ تو جوئے کی شکل میں ہوکر ناجائز ہوجائے گی (فتاوی محمودیہ)۔

ایک ناجائز شکل:

آج کل قسطوں پر خریداری کی ایک ناجائز صورت تیزی سے مروج ہورہی ہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ پہلے اعلان کیا جاتا ہے کہ مثلاً سال بھر پر ایک موٹر سائیکل خریدار کو ملے گی جس کے لیے اسے ہر ماہ مثلاً ایک ہزار کی قسط جمع کرنی ہوگی اور ہر ماہ قسط جمع ہونے پر تمام خریداروں کے نام میں قرعہ اندازی کر کے جس کا نام نکلے ایک موٹر سائیکل اسے دے دی جائے گی، وہ اس کو لے کر کنارہ کش ہوجائے اب اسے کچھ نہیں جمع کرنا ہے، بقیہ خریدار قسطیں جمع کرتے رہیں گے، ہر ماہ یہ سلسلہ رہے گا، چنانچہ ایک ایک شخص موٹر سائیکل پاسکے گا۔ یہ اسکیم خریداروں کو بڑی پسند آتی ہے، کیونکہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ قرعہ میں میرا نام نکل سکتا ہے جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، نہیں تو بارہ ہزار میں سودا مہنگا نہیں۔

یہ صورت صریح غرر اور قمار کی ہے، شریعت کے مزاج اور قانون کے خلاف ہے، اس لیے اس طرح کی اسکیم چلانا اور اس میں حصہ لینا قطعاً جائز نہیں۔

مدت سے قبل دائن ومدیون میں سے کسی کا انتقال ہوجائے:

ادائیگی ثمن کی مدت آنے سے پہلے یا قسط وار ادائیگی طے پانے کی صورت میں جملہ قسطیں ادا ہونے سے پہلے اگر بائع وخریدار (دائن ومدیون) میں سے کسی ایک کا انتقال ہوجائے تو اس سلسلہ میں فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ بائع کے مرنے سے معاملہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، بلکہ خریدار وقت مقررہ پر ہی ثمن ادا کرنے کا پابند ہوگا، البتہ اگر خریدار وقت سے پہلے مرجائے تو اس کے ترکہ سے ثمن کی نقد ادائیگی ضروری ہوجائے گی، ورثاء کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ جس تاخیر اور تفصیل کے ساتھ مورث کو ادائیگی کا حق تھا یہ اس حق کا استعمال کریں، کیونکہ اختیار محض میں وراثت نہیں چلتی (الدر المختار ۴/۲۶)۔

☆☆☆

سامان کی قیمت مختلف قسطوں میں ادا کرنا

مولانا جمال اکبر مظفر پوری

۱- جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں زیادہ کرنا جائز ہے (مبسوط ۸/ ۱۳)۔

البتہ اس صورت میں بیع کی درستگی کے لیے یہ شرط ہے کہ عاقدین کسی ایک قیمت کو طے کر کے مجلس عقد چھوڑیں، ورنہ بیع فاسد ہوگی۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت بھی جائز ہے، اسی طرح اس کی بھی گنجائش ہے کہ قیمت کو مختلف قسطوں میں ادا کیا جائے، بلکہ تھوڑے تامل کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ''بیع بالتقسیط'' کے جائز ہونے کا عملی اثر یہی ہے کہ اس کے ذریعہ مشتری (خریدار) کو ثمن کے کئی قسطوں میں طے ہونے کی بناء پر ہی سہولت ملتی ہے، اور یہی تقسیط کا فائدہ ہے، اس لیے کہ بیع بالتقسیط میں ثمن کی ادائیگی بعد میں ہوتی ہے اور خود جناب کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیع مؤجل کا جواز ثابت ہے۔ نیز پوری امت کا اتفاق ہے کہ ادھار بیع درست ہے (مجلة مجمع الفقه الاسلامي العدد السادس، الجزء الاول/ ۲۷۹)۔

۳- مذکورہ صورت میں دو ثمنوں میں سے ایک کی تعیین اور اس پر اتفاق کی صورت میں بیع درست ہوگی ورنہ تردد ثمن کی وجہ سے بیع فاسد ہوجائے گی (ترمذی کتاب البیوع ۲/ ۴۷-۱۴۸)۔

(الف)......ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے، دلائل سے بھی یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے، چونکہ اس کی حرمت قرآن وحدیث میں کہیں منقول نہیں ہے۔

(ب)......ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے، بلکہ نقد وادھار دونوں قیمتوں کا ذکر کرنا بھی جائز ہے، البتہ قیمت کی زیادتی کا ذکر ادھار بیع میں دھوکہ دفریب کی غرض سے نہ ہو۔

۴- سوال میں مذکورہ صورت کی بابت قدیم وجدید فقہاء کے درمیان اختلاف رہا ہے، اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ اضافی قیمت ''مدت'' کے عوض میں ہے یا مستقل طور پر اصل ثمن کا جزء ہے۔

جن لوگوں کے نزدیک ادھار بیع میں قیمت کی زیادتی ''مدت'' کے عوض میں ہے ان کے نزدیک یہ زیادتی ناجائز ہے، اس لیے کہ یہ زیادتی مدت کے عوض میں قرار پاتی ہے، اور جو زیادتی مدت کے عوض میں طے ہوئی ہے وہ سود ہے یا کم از کم سود کی طرح ہے، لہذا یہ زیادتی حرام قرار پائے گی۔

یہ زین العابدین بن علی بن الحسین، الناصر، المنصور باللہ اور ہادویہ نیز امام یحیی رحمہم اللہ کا مسلک ہے (تحفۃ الاحوذی ۴/ ۳۵۹)۔

اس کے برخلاف جن لوگوں کے نزدیک ادھار بیع میں زیادتی درست ہے ان کے نزدیک یہ زیادتی اصل قیمت ہی کا جزء ہے (الربا، از مولانا عبید اللہ اسعدی)

۵- اگر خریدار کے دونوں صورتیں ذکر کرنے کے بعد عاقدین ایک صورت کو طے کرلیں تو معاملہ کی یہ شکل شرعا درست قرار پائے گی (ترمذی ۲/ ۱۴۷-۱۴۸)

۶- یہ ربا ہے اور اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، قرآن کا ارشاد ہے: ''وحرم الربا''۔

۷- ''تاخیر مدت'' کی بنا پر جو بھی مزید رقم کا مطالبہ کیا جائے وہ زیادتی سود ہے، لہذا ایسی رقم کا مطالبہ سود کا مطالبہ قرار پائے گا اور اس کو دینا بھی سود دینے میں شمار ہوگا، چونکہ وہ زیادتی ''مدت'' کے عوض ہے، اور یہ صریح سود ہے، نیز اس زیادتی کی مقدار متعین کردی جائے یا فیصد کا حساب رکھا جائے، بہر صورت یہ سودی کاروبار ہوگا جو کہ قطعی حرام ہے۔

اس اعتراف کے باوجود کہ ذکر کردہ صورت حرام ہے آج کے ان مشکلات سے جو عموماً تجار کو لاحق ہوتے ہیں ان سے صرف نظر کرنا بھی ایک مشکل ترین مسئلہ ہے، چونکہ آج دیانت داری، امانت داری کا معیار کافی گر چکا ہے، قرض لینے والا قرض کی ادائیگی میں بہت ٹال مٹول کا عادی ہوچکا ہے جو بائع کے لیے بہت زیادہ نقصان وخسارہ کا ذریعہ بن جاتا ہے، لہذا ان مشکلات کا حل ''سد باب'' کے طور پر نکالنا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں دین کی ادائیگی کے وقت ٹال مٹول کی صورت میں دائن کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ مدیون کی تحقیق کرے کہ آیا تنگدستی کی وجہ سے نہیں دے

پار ہا ہے یا واقعۃ ٹال مٹول کر رہا ہے، اگر وہ تنگدست ہے تو فراخی تک مہلت کا مستحق قرار پائے گا، کیونکہ ارشاد ربانی ہے:

"وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة"

البتہ وہ تنگدست نہیں، بلکہ مالدار ہے تو اس کا یہ عمل ظلم ہوگا، اور ظلم حرام ہے، جیسا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مطل الغني ظلم"۔

قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی وجہ سے جرمانہ یا مالی تاوان، یا کسی اور نام سے کچھ رقم لینا مدت کے عوض میں ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں ہے، ایسا معاملہ شرعاً حرام ہے۔

جہاں تک روایت: "مطل الغني ظلم" کا تعلق ہے تو اس سے صرف مال دار ٹال مٹول کرنے والے کا ظالم ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ اس پر جرمانہ یا مالی تاوان کا عائد ہونا۔

بعض لوگوں نے ایک دوسری روایت "لي الواجد يحل عقوبته وعرضه" سے استدلال کرتے ہوئے اضافی رقم کو مالی معاوضہ کا نام دے کر جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اس روایت سے مالی معاوضہ کے جواز پر استدلال کرنا نہ از روئے لغت درست ہے، اور نہ کسی امام، مجتہد اور نہ کسی محدث سے یہ مفہوم ثابت ہے۔

لیکن اس مشکل کا حل حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔

وہ یہ کہ مرابحہ اور اجارہ کے ایگریمنٹ پر مدیون سے دستخط لیتے وقت اس پر لازم کر دیا جائے کہ مالی واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی اور تاخیر کرنے کی صورت میں وہ دین کے تناسب سے ایک معین رقم خیراتی کاموں میں صرف کر دے گا، اور وہ یہ رقم پہلے بینک کو ادا کر دے گا پھر کوتاہی یا تاخیر کرنے پر بینک اس کی طرف سے نیابتاً سے خیراتی کاموں میں لگادے گا، البتہ یہ رقم نہ بینک کی ملکیت ہوگی اور نہ اس کی آمدنی اور منافع کا حصہ ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: (فقہی مقالات)۔

۸- اس سلسلے میں ائمہ اربعہ کے مسالک کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

مالکیہ صرف ایک صورت میں "شئ مرہون سے انتفاع" کے جواز کے قائل ہیں، وہ یہ کہ عقد بیع میں ہی مرتہن نے انتفاع کی شرط لگائی ہو اور انتفاع کی مدت بھی متعین کر دی گئی ہو تو یہ صورت عقد اور اجارہ ہونے کی وجہ سے جائز قرار دی جائے گی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۵۸)۔

مثلاً بائع کہتا ہے کہ میں اپنی سائیکل ایک ہزار روپے میں اس شرط پر فروخت کروں گا کہ تم اپنی گھڑی ایک ماہ کے لیے استعمال کرنے کے لیے دو، وہ گھڑی میرے پاس بطور رہن ہوگی۔

مسلک شوافع بھی اجمالی طور پر مالکیہ ہی کے مسلک کی طرح ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۵۸)۔

فقہ حنبلی میں اس مسئلہ میں تین رائیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱- اگر شئ مرہون حیوان نہ ہو، یعنی اس کے گروی رکھنے میں کسی قسم کا خرچ مرتہن کے ذمہ نہ آتا ہو، مثلاً گھر، گھریلو سامان یا دوسری کوئی بھی اس طرح کی چیز ہو تو ایسی صورت میں راہن کی اجازت کے بغیر "مرتہن" کے لیے مرہون سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے، چونکہ شئ مرہون، اس کے منافع اور اس کی بڑھوتری راہن کی مملوک ہیں، لہٰذا بغیر اس کی اجازت کے ان سے انتفاع کا حق کسی کو کیسے ہو سکتا ہے۔

"مالا يحتاج إلى مؤنة كالدار والمتاع ونحوه، فلا يجوز للمرتهن الانتفاع به بغير إذن الراهن بحال" (المغني ۴/۴۲۶)۔

۲- راہن نے قرض والے رہن میں مرتہن کو عوض لیے بغیر اجازت دے دی تو بھی مرتہن کے لیے انتفاع جائز نہیں، چونکہ یہ نفع قرض کی بدولت حاصل کرنا ہوا جس کی حرمت ارشاد نبوی "كل قرض جر نفعا فهو حرام" سے واضح ہے (ایضاً)۔

۳- شئ مرہون حیوان ہو اور اس کی ذات پر چارہ وغیرہ میں مرتہن کا سرمایہ بھی خرچ ہوا ہو، اور اس انفاق کی اجازت راہن نے دی ہو تو ایسی صورت میں خرچ کی ہوئی رقم کے بقدر مرہون سے انتفاع جائز ہوگا، خواہ انتفاع کی اجازت ہو یا نہ ہو۔

حنابلہ اس مسئلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "الظهر يركب بنفقة إذا كان مرهونا" سے استدلال کرتے ہیں کہ جب حیوان مرہون کا خرچ مرتہن کے ذمہ ہو تو مرتہن اس پر سواری بھی کرے گا اور اس کے دودھ سے بھی منتفع ہوگا (المغنی ۴/۴۲۷، ترمذی علی تحفۃ الاحوذی ۴/۳۸۵)۔

فقہاء احناف کے یہاں بھی مسئلہ مذکور سے متعلق مختلف اقوال ملتے ہیں۔

۱- مرتہن کے لیے راہن کی اجازت کے بغیر شئ مرہون سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر مرہون غلام ہو تو اس سے خدمت لینا، حیوان ہو تو اس کو سواری بنانا، یا اس کا دودھ استعمال میں لانا، مکان ہو تو اس میں رہائش اختیار کرنا، کپڑا ہو تو پہننا، یہاں تک کہ اگر کتاب ہو تو اس کو

پڑھنا کچھ بھی جائز نہیں (فتح القدیر ۱۰ / ۱۶۹)۔

۲۔ جب راہن انتفاع کی اجازت دے تو بعض احناف کے نزدیک بغیر کسی تفصیل کے مرتہن کے لیے انتفاع درست ہے۔

۳۔ اور بعضوں نے تو بالکل ہی اجازت نہیں دی ہے، کیونکہ یہ ربا ہے یا اس میں شبہ ربا ضرور ہے، اور اجازت یا رضامندی نہ ربا کو حلال کر سکتی ہے، اور نہ شبہ ربا کو مباح کر سکتی ہے۔

۴۔ بعضوں نے تفصیل کی ہے کہ اگر مرتہن نے عقد کے دوران ہی انتفاع کی شرط لگائی ہو تو یہ حرام ہے، اس لیے کہ یہ ربا ہے، اور دوران عقد انتفاع کی شرط نہ ہو، بلکہ بعد میں بغیر کسی دباؤ کے مرتہن نے اجازت لی ہو تو یہ انتفاع درست ہے، کیونکہ یہ راہن کی جانب سے تبرع قرار پائے گا۔

حنفیہ کا آخری قول شریعت اسلامی کی روح سے قریب ہے۔

(ب)......بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے اگر مال ضائع ہو جائے تو فقہ حنفی کے مطابق اگر شی مرہون کی قیمت دین کے برابر ہو تو دین ساقط کر دیا جائے، اور اگر زیادہ ہو تو دین کے برابر قیمت کو ساقط کر دیا جائے اور پھر زائد میں تعدی وغیرہ کی تحقیق کے بعد حکم لگایا جائے۔ اس شکل کے اختیار کرنے میں اموال مسلم کی صیانت اور ضیاع سے بچاؤ ہے۔

(ج)......وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں مرتہن، راہن کو وارننگ دے گا، دین کی ادائیگی کا مطالبہ کرے گا، حسب وسعت اس کو ترغیب دیتا رہے گا، اس نے اگر قبول کر لیا اور ادائیگی بھی کر دی تو بہتر ہے، اور اگر اس نے قبول نہیں کیا، ٹال مٹول کی وجہ سے، یا اپنی تنگدستی کی بناء پر یا لمبے سفر کی وجہ سے اس نے وقت مقررہ پر ادائیگی نہیں کی تو ان تمام صورتوں میں قاضی اس کو مال مرہون کی فروختگی پر مجبور کرے گا جس کے ذریعہ مرتہن اپنی واجب الاداء رقم حاصل کر سکے۔ اس صورت میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

بصورت انکار قاضی خود ہی مال مرہون کو فروخت کر کے مرتہن کو اس کی واجبی رقم دے دے گا، نہ قید کی ضرورت ہے اور نہ مار پیٹ، ڈرانے اور دھمکانے کی۔

اس مسئلہ میں مالکیہ، حنابلہ اور صاحبین کا اتفاق ملتا ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ راہن کی رضامندی کے بغیر خود قاضی کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ قاضی اس کو قید کر کے جیل میں ڈال دے گا یہاں تک کہ وہ خود فروخت کر دے (بدائع الصنائع ۶ / ۱۴۸)۔

۹- بطور رہن مبیع کو روکا جا سکتا ہے، البتہ اس کے لیے کچھ پابندیاں بھی ہیں:

(۱) مشتری کا شرعی قبضہ ہو۔ (۲) عاقدین کی باہمی رضامندی ہو۔ (۳) مبیع رہن کے قابل بھی ہو، مثلاً دونوں عین ہوں یا کم از کم مبیع عین ہو۔

البتہ واضح ہو کہ صلب عقد میں رہن مشروط نہ ہو، گو اس سلسلے میں بھی قابل اعتماد مسلک جواز کا ہی ہے کہ صلب عقد میں رہن مشروط ہونے کے باوجود رہن درست قرار پائے گا (المغنی ۴ / ۴۲۰، الدراہم مکان الدرہم)۔

۱۰- رہن والی صورت میں اس کے شرائط و قیود کا لحاظ کرنے کے بعد یہ معاملہ شرعاً درست ہو جائے گا۔ لیکن مدیون جو اقساط ادا کر چکا ہے وہ اس کی ملک ہے، اگر مشتری نے قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول کیا اور فروخت شدہ چیز کی بیع کی نوبت آ گئی تو پہلے مرتہن اپنا دین وصول کرے گا اور اگر زائد ہو تو بقیہ رقم اور قسطوں میں دی ہوئی رقم راہن کو لوٹا دے گا، چونکہ قیمت و دین سے زیادہ اس کی ملک ہے اور نہ اس کا وہ مستحق ہے اس لیے جو اقساط ادا کیے جا چکے ہیں ان کا واپس نہ کیا جانا صحیح نہیں ہے۔

۱۱- اکثر فقہاء نے ایسے رہن کو ناجائز قرار دیا ہے جس میں مرتہن نے مال مرہون پر قبضہ نہ کیا ہو، کیونکہ قبضہ عقد رہن میں شرط ہے۔

دور حاضر میں ایک نئے قسم کا ''رہن'' اور اس کا حکم:

لیکن آج سرکاری وغیر سرکاری اداروں، بینکوں اور تجار و اشخاص کے مابین ایک نئے قسم کا رہن مروج ہے جس کو انگریزی میں Mortgage,Folting کہا جاتا ہے اور اس کے لیے عربی میں ''الرهن السائل'' کی تعبیر مستعمل ہوتی ہے، اسے اردو میں ''متحرک رہن'' کہہ سکتے ہیں۔ اور اسلامی ممالک کی بہت سی آبادی میں اس کا رواج ہے۔

اس خاص قسم کے رہن میں مرتہن شی مرہون پر قبضہ نہیں کرتا ہے لیکن ''اگریمنٹ پیپر'' (معاہدہ نامہ) کی وجہ سے مرتہن کو اس میں تصرف و فروخت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ معاہدہ کے مطابق قیمت کی عدم ادائیگی کی صورت میں مرتہن کو فروخت کر کے اپنا حق لینے کا پورا پورا حق اور موقع حاصل ہوتا ہے، اس دوران راہن اپنی چیز فروخت نہیں کر سکتا ہے، اور مرتہن کو اختیار رہتا ہے کہ کسی وقت بھی مال مرہون پر قبضہ کر لے۔

اور اس اثناء میں راہن اپنی چیز سے منتفع ہوتا نیز مرتہن بھی ضمان سے بری ہوتا ہے، اگر شئی ہلاک ہوجائے تو اس کی ملک سے ہلاکت قرار پائے گی۔

واضح رہے کہ اس رہن میں اگر چہ شئی مرہون پر مرتہن کا قبضہ نہیں ہوتا ہے، لیکن اس کے دستاویزی کاغذات پر مرتہن کا ہی قبضہ رہتا ہے جس کی بناء پر مرتہن تقریباً مطمئن ہوجاتا ہے۔

نیز آج کی بین الاقوامی تجارت جس میں بسا اوقات بائع امریکہ میں اور مشتری ہندوستان میں رہتا ہے ایسی صورت حال میں شئی مرہون پر حسی قبضہ بہت دشوار ہوجاتا ہے۔ حالانکہ دستاویزی کاغذات پر بدستور مرتہن کا قبضہ ہوتا ہے۔ اور اس میں دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر "رہن سائل" کے جواز کا فتوی دیا جانا چاہیے۔ اس کو جائز قرار دینے کے بعد مذکورہ صورت کو بھی جائز کہا جاسکتا ہے، جس میں فروخت و تصرف کا حق بائع کو ہی ہوگا جس مقصد کے پیش نظر اس شئی کو مرہون بنایا گیا ہے۔

۱۲- چونکہ یہ عقد تبرع ہے، نیز کفالت بھی تبرع ہونے میں بالکل قرض کی طرح ہے، لہذا قرض کی طرح کفالت وگارنٹی پر بھی اجرت ومعاوضہ لینا حرام ہے لیکن آج تجارت کا رخ بدل چکا ہے۔ اس کے نتیجہ میں لین دین اور کفالت وگارنٹی کی بھی نئی نئی صورتیں سامنے آرہی ہیں، اب تو افراد واشخاص سے بالاتر ہو کر کفالت وگارنٹی کے لیے باقاعدہ ادارے اور بینک قائم ہو چکے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ ان اداروں کو کریڈٹ لیٹر جاری کرنے میں مختلف وقتوں میں سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے، اس کام کو انجام دینے کے لیے مستقل ادارے کا قیام، اس کی ضروریات واخراجات اور اس کے عملہ کی تنخواہیں یہ سب کچھ ادارہ کو ہی کرنا پڑتا ہے۔

لہذا اگر اشخاص، افراد اور ادارے واقعی اخراجات اجرت ومعاوضہ لیتے ہوں تو درست ہے، کیونکہ شریعت میں "اعتبار" معنی کا ہے "العبرة للمعنی"۔

۱۳- کیا دستاویز کی بیع درست ہے؟

کاغذی دستاویز پر نہ مال کی تعریف صادق آتی ہے، اور نہ اس کو مال سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ مالیت کی محض سند ہوتی ہے، ان کے ذریعہ صرف یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ فلاں کے پاس اتنی مالیت ہے، بذات خود وہ کوئی مال نہیں۔ لہذا دستاویز کی خرید وفروخت صحیح نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ حاصل ہونے والا مال حرام ہوگا، البتہ دستاویز کی بیع کا حیلہ علماء نے ذکر فرمایا ہے، اگر اس کے مطابق عمل کیا جائے تو درست ہوگا۔

حیلہ کا حاصل یہ ہے کہ مشتری کو اپنا وکیل بنالے اور وکالت کی اجرت بھی متعین کردے۔

دستاویز کی بیع کی درستگی کا یہی حیلہ ہے، اس کو اختیار کرنے سے معاملہ درست ہوجائے گا، البتہ اگر وکیل کو مثلاً مدیون کے افلاس کی بناء پر دستاویز کی رقم نہ مل سکی تو اپنا دیا قرض وصول لے گا (امداد الفتاوی ۳/ ۲۲-۳، فقہی مقالات/ ۹۹)۔

۱۴- دیون موجلہ کو معجلہ بنانے کے لیے دین کا کچھ حصہ چھوڑنا:

صورت مذکورہ کے جواز وعدم جواز کی بابت صحابہ، ائمہ اور دیگر اہل علم حضرات کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے، قائلین جواز میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ ابراہیم نخعی، زفر بن ہذیل اور شوافع میں شیخ ابوثور کا نام قابل ذکر ہے۔

ان حضرات نے اس واقعہ سے استدلال کیا ہے جس میں بنونضیر کی جلاوطنی کا تذکرہ آیا ہے، کہ اس موقع پر کچھ صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے، اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے تو بنونضیر کی جلاوطنی کا حکم فرمایا ہے، حالانکہ ہم میں سے کچھ لوگوں پر ان کے دیون ہیں اور ان کی مدت پوری بھی نہیں ہوئی ہے، آپ نے فرمایا: کچھ نقد دے کر بقیہ ساقط کرالو۔

قائلین عدم جواز میں حضرت عبداللہ بن عمر، زید بن ثابتؓ محمد بن سیرین، حضرت حسن بصری، ابن مسیب، حکیم بن عتبہ اور امام شعبی رحمہم اللہ وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

ان حضرات کی جانب سے "بنونضیر" والے واقعہ کی مختلف توجیہ پیش کی جاتی ہے، بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ واقعہ دوسری ہجری کا ہے، اور ربا کا حکم اس کے بعد نازل ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ضع وتعجل" والا حکم منسوخ ہے۔

نیز بعضوں نے اس روایت کو سند کی حیثیت سے لائق احتجاج تسلیم نہیں کیا ہے۔

ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ: "بنونضیر" عام طور پر سود کا معاملہ کرتے تھے، آپ نے جس حصہ کو ساقط کرنے کا حکم فرمایا تھا وہ سود تھا۔

(شرح الزرقانی علی مؤطا امام مالک ۳/ ۲۰۵، ۲۰۶)۔

ذکر کردہ تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ تعجیل کے مقابلہ میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ یہ چھوڑ نا مدت کی کمی کا عوض ہے۔ اور مدت کے عوض میں رقم کا لینا، دینا دونوں ہی سود میں داخل ہیں جن کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے (ہدایہ مع فتح القدیر ۸/ ۴۴۸)۔

۱۵- اس سوال کا جواب وہی ہے جو جواب ۱۴ میں مذکور ہے، فرق ان دونوں صورتوں میں صرف صورۃً ہے، حکماً کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ دیون مؤجلہ کو کچھ کم کر کے معجلہ بنانا ہی باعث سود ہے، اور یہاں یہی حرمت کا معیار ہے۔

۱۶- کیا کسی قسط کی ادائیگی میں تاخیر مہلت ختم کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے؟

کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے کے بعد بائع کو اختیار حاصل ہے کہ وہ مہلت ختم کر کے فوری طور پر اپنی بقیہ واجب الاداء رقم وصول کر لے۔ یا اس کا مطالبہ کرے (خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴)۔

۱۷- فریقین میں سے کسی ایک کی موت سے بیع بالتقسیط پر کیا اثر ہوسکتا ہے؟

بیع بالتقسیط کے دونوں فریق میں سے ہر ایک کی موت کا اثر الگ الگ ہے، دائن کی موت کا اثر ''اجل'' (مقررہ وقت) پر نہیں پڑتا ہے، کیونکہ اس کی طرف سے مدت کی مہلت کا دیا جانا مدیون کے ساتھ ایک قسم کا یسر اور سہولت پہنچانا ہے، اس کی موت کے بعد اس مقصد میں کوئی خاص فرق واثر نہیں پڑتا ہے، البتہ موت کے بعد یہ دین ان کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

مدیون کی موت:

مدیون کی موت سے معاملہ پر گہرا اثر پڑتا ہے چونکہ مدیون کا ادھار پر معاملہ کرنا اور دین اپنے ذمہ واجب کرنا اس لیے تھا کہ تجارت کر لے اور اس کی بڑھوتری سے ثمن کی ادائیگی کرے۔ ظاہر ہے اس کی موت کے بعد یہ مقصد کیسے پورا ہوسکتا ہے۔

اس مسئلہ میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔

۱- حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت مدت ادائیگی کے دوران ہو جانے کی وجہ سے دین مؤجل فوری واجب الاداء ہو جاتا ہے، امام احمد سے ایک روایت اس طرح کی منقول ہے۔

۲- حنابلہ کا مسلک مختار اس مسئلہ میں یہ ہے کہ مدیون کی موت کے بعد اگر اس کے ورثاء دین کی توثیق کر دیں، اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کر لیں تو وہ دین مؤجل ہی رہے گا۔ فوری واجب الاداء نہیں ہوگا، چونکہ ورثاء کی توثیق اور ان کی ذمہ داری قبول کرنا دراصل اس بات کی خاموش سند ہے کہ ہم اپنے مورث مدیون کے مقصد کے مطابق دین کی تاجیل کا فائدہ لیں گے۔ اور یہ دین کی ادائیگی کا وعدہ بھی ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۴۸۲)۔

احقر کے نزدیک حنابلہ کا مسلک مختار ہی راجح ہے۔

۱۸- صورت مذکورہ میں جس انعام کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ از روئے شرع درست ہے، نہ وہ ربا میں داخل ہے اور نہ اس کو قمار شمار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس پر باد قمار کی تعریف صادق نہیں آتی ہے۔ ممکن ہے ''قرعہ اندازی'' کی تعبیر سے شبہ ہوتا ہو۔ لیکن ہر قرعہ اندازی کا نتیجہ قمار نہیں ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆

خرید و فروخت میں اقساط کا لحاظ

مولانا عبدالفتاح عادل

۱- نقد کے مقابلہ ادھار میں ثمن کی زیادتی کا حکم:

ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ تاجر کے لیے ادھار میں قیمت کا زیادہ کر دینا درست اور جائز ہے۔

(بدائع الصنائع ۵/۲۲۴، المدونة الکبری ۳/۳۲۸، فتح العزیز علی هامش المجموع ۹/۱۲، المغنی لابن قدامه ۴/۲۱)۔

۲- قسط وار رقم کی ادائیگی کا حکم:

ادھار قیمت قسط وار بھی ادا کی جاسکتی ہے اور اس پر بھی ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے (خانیہ/۲۶۹، کتاب الام ۳/۳۳)۔

۳- نقد اور ادھار میں قیمتوں کا فرق:

اگر عاقدین کے درمیان مجلس ہی میں یہ بات طے پاجاتی ہے کہ میں نقد سو روپے دوں گا یا سوا سو دینے پر دونوں کی رضامندی ظاہر ہوگئی تو معاملہ درست ہوگا، اور اگر مبہم ہی چھوڑ دیا تو یہ ناجائز ہے، کیونکہ یہ جہالت باعث نزاع ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات درج ذیل ہیں:

حنفیہ کے نزدیک بیع کی کوئی ایک نوعیت اور قیمت رضامندی سے طے ہوجائے تو جائز ہے (بدائع الصنائع ۵/۱۵۸)۔

کیوں کہ جو جہالت مانع تھی وہ مجلس ہی میں باہمی رضامندی سے ختم ہوگئی (بدایۃ المجتہد ۲/۱۵۴)۔

اگر بیع کسی ایک صورت میں لازم نہیں ہوئی تھی تو یہ صورت امام مالکؒ کے نزدیک درست ہے۔

شوافع کے نزدیک بھی یہی صورت ہے (حاشیہ تحفۃ المحتاج ۴/۲۹۴)۔ حنابلہ کے یہاں بھی یہ صورت جائز ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/۱۶۲)۔

۴- ادھار میں رقم کی زیادتی کا حکم:

ادھار فروختگی کی صورت میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا نہیں ہے، نیز یہ زیادتی وقت کے عوض شمار نہ ہوگی، تمام فقہاء کرام کے درمیان یہ بات تسلیم شدہ ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۷۰۹)۔

۵- قسطوں میں ثمن کی زیادتی کا حکم:

یہ صورت بھی دراصل عاقدین کی سہولت کے لیے ہوتی ہے، اور خاص کر مشتری اس سے بڑی آسانی محسوس کرتا ہے، مجلس ہی میں جب عاقدین کسی ایک معاملہ پر رضامند ہوجائیں تو اس بیع کے جواز میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ چنانچہ چاروں ائمہ اس کے جائز ہونے پر متفق ہیں۔

(بدائع ۵/۱۵۸، المدونۃ الکبری ۳/۲۱۱، المغنی ۴/۱۶۲)۔

۶- مدت کی تاخیر پر زیادتی کا مطالبہ اور اس کا حکم:

بیع میں اس طرح کی شرط، شرط فاسد ہے، جو ربا کے دائرہ میں آتی ہے، اس صورت کے عدم جواز پر فقہاء اربعہ متفق ہیں، کیونکہ یہ ربا بھی ہے اور اس میں شرط فاسد بھی ہے (رد المحتار ۴/۱۹۷، مقدمات ابن رشد ۴/۱۸-۱۹)۔

۷- کسی قسط کی عدم ادائیگی کے سبب زیادتی کے مطالبہ کا حکم:

مبیع کی یکشت قیمت یا جملہ قسطیں، یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں بطور "جرمانہ" کسی زائد رقم کی شرط لگانا مفسد بیع ہے، خواہ اس زیادتی کی تعیین کرد

جائے یا فیصد کا حساب رکھا جائے، اگر بائع خریدار سے اس زائد رقم کو وصول کرتا ہے تو یہ سود ہے جو بالکلیہ حرام ہے، کیونکہ مبیع میں سے اس زیادتی کا کچھ بدل اور مقابل نہیں ہے، ایسی بیع ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے (اس باب میں جواب نمبر ۶ ہی کے حوالہ جات مفید ہوں گے)۔

۸- (الف)...... اس بات پر قریب قریب تمام ہی فقہاء کا اتفاق ہے کہ مال مرہون سے مرتہن فائدہ نہیں اٹھا سکتا، البتہ چند شرائط کے ساتھ مالکیہ اور حنابلہ اس کے جواز کے قائل ہیں، امام صاحب کا ایک قول راہن کی اجازت کے باوجود عدم جواز کا ہے، امام صاحب کا قول مبنی بر احتیاط ہے جو معاملات کے باب میں حددرجہ اہمیت کا حامل ہے (بدائع ۶/۱۴۶، نیز دیکھئے: شامی ۴/۱۹۵)۔

مرتہن کے لیے مال مرہون سے استفادہ کی گنجائش نہیں ہے، مثلاً اگر غلام ہے تو اس سے خدمت لینا بھی اس کے لیے درست نہیں۔

مالکیہ کے نزدیک راہن فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دے یا خود مرتہن مدت کی تعیین کے ساتھ انتفاع کی شرط لگالے تو مال مرہون سے نفع حاصل کرسکتا ہے، البتہ حیوانات، کپڑے اور قرض میں انتفاع کی شرط مکروہ ہے (المدونۃ الکبری ۴/۱۶۳)۔

حنابلہ کے نزدیک اگر جانور دودھ دینے والا ہو یا سواری کے لائق ہو تو اس کے اوپر جتنے اخراجات آتے ہوں اس کے بقدر فائدہ اٹھانا درست ہے۔
(المغنی لابن قدامہ ۴/۲۵۲)۔

(ب)...... ہلاک شدہ مال مرہون کے ضمان کا حکم:

حنفیہ کا اصول یہ ہے کہ مرتہن کا ہر وہ فعل جو مال مرہون کی حفاظت سے متعلق ہو اس فعل کی انجام دہی پر اگر رہن ہلاک ہو جائے تو مرتہن ضامن نہیں ہوگا لیکن مرتہن کا وہ فعل جو اس کے استعمال سے متعلق ہو اور اس کی وجہ سے رہن ہلاک ہوا ہو تو مرتہن ضامن قرار پائے گا، کیونکہ ایسے عمل کے باعث مال مرہون مضمون ہو جاتا ہے (بدائع ۶/۱۴۸، نیز دیکھئے: ہندیہ ۵/۴۴۸، شامی ۵/۵۴۱)۔

شافعیہ کے نزدیک مال مرہون مرتہن کے پاس امانت ہے، لہٰذا اگر مرتہن کی جانب سے رہن کی ہلاکت میں تعدی پائی گئی تو مرتہن ضامن ٹھہرے گا، اور تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو مرتہن پر ضمان نہ ہوگا، کیونکہ امانت کے ہلاک ہونے پر ضمان نہیں ہوتا (کتاب الام ۳/۱۶۷)۔

مالکیہ کی رائے شوافع سے ملتی جلتی ہے، اگر مرتہن رہن کی ہلاکت کا سبب نہ بنے تو ضمان نہ ہوگا اور اگر یہی سبب بن رہا ہو تو ضامن ہوگا (المدونہ ۴/۱۵۲)۔

یہی قول حنابلہ کا ہے (المغنی لابن قدامہ ۴/۲۰۷)۔

گویا ایک درجہ میں نتیجہ کے اعتبار سے سبھی حضرات متفق ہیں، بظاہر کوئی خاص فرق ان کے درمیان واضح نہیں ہوتا۔

(ج)...... قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول کا حکم:

قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول کے سبب مرتہن مال مرہون کو حاکم کے پاس لے جائے، حاکم راہن پر فوری قیمت کی ادائیگی کے لیے دباؤ ڈالے گا، اگر تیار نہ ہو تو اپنی صوابدید کے مطابق فروخت کردے، خواہ راہن بیع پر راضی ہو نہ ہو، اس طرح مرتہن کو اپنی رقم حاصل ہو سکتی ہے
(ردالمحتار ۵/۳۵۷، نیز دیکھئے: بدائع الصنائع ۶/۱۴۸)۔

شافعیہ کے نزدیک مرتہن قاضی کے سامنے مقدمہ دائر کرے، قاضی راہن کو بیچنے پر یا دین کی ادائیگی پر مجبور کرے، اگر وہ انکار کردے تو قاضی خود بیچ دے اور اس کی قیمت سے مرتہن کا دین ساقط کردے (فتح الوہاب ۱/۱۹۷، نیز کتاب الام ۳/۱۶۹)۔

مالکیہ اور حنابلہ دونوں کی رائے ایک ہی ہے، البتہ حنابلہ کا قول تھوڑی تفصیل کے ساتھ یہ ہے کہ اگر مرتہن کو نہ ادا کرنے پر بیچنے کی اجازت تھی تو بیچ کر دین وصول کرلے، اور اجازت نہیں تھی تو کہا جائے گا کہ ادا کرو اور مال رہن بیچو، عدم رضامندی کی صورت میں حاکم وقت مناسب اقدام کرسکتا ہے (المغنی ۴/۲۶۲، المدونۃ الکبری ۴/۱۵۶)، گویا اس مسئلہ میں بھی ان چاروں ائمہ کا طریقہ کار ایک ہی ہے۔

۹- حبس مبیع کا حکم:

اگر بیع (معجل) نقد ہوئی ہے تو بائع کو پوری قیمت کے حصول تک مبیع کے روکنے کا حق ہوگا اور اگر بیع (مؤجل) ادھار ہوئی ہے تو حق حبس نہیں ہوگا، اگر بائع نے مبیع پر خریدار کے قبضہ کرنے کے بعد مبیع کو روکا ہے تو یہ رہن شمار ہوگا، اگر خریدار نے مبیع پر قبضہ نہیں کیا تھا تو بائع کا یہ روکنا اپنا ثمن وصول کرنے کے لیے سمجھا جائے گا، یعنی (حبس المبیع لاستیفاء الثمن) اب بصورت رہن اگر بائع کے پاس مرہون ہلاک ہو جائے تو بائع ضامن ہوگا اور بیع فسخ نہ ہوگی، اور بصورت

وصولی ثمن بائع کے پاس مرہون ہلاک ہوجائے تو بائع پر کوئی ضمان نہیں ہوگا اور بیع فسخ ہوجائے گی، اگر مشتری نے بائع کو ثمن ادا نہیں کیا تھا تو دے گا بھی نہیں اگر کچھ رقم دے چکا تھا تو واپس لے لے گا (رد المحتار ۵ / ۳۵۴)۔

شوافع اور حنابلہ کے نزدیک ثمن کی وصولی کے لیے رہن کو روک سکتا ہے اگر ثمن فوت ہونے کا اندیشہ ہو (المغنی ۴ / ۱۴۱)۔

۱۰- مبیع کی واپسی کے بعد جمع شدہ قسطوں کا حکم:

اس قسم کی بیع، بیع عربون میں شامل ہے اور یہ ناجائز ہے اولاً تو ثمن جب قسط وار ادا کرنے کی بات طے پا چکی تو بائع کا مبیع پر قبضہ کرنا ہی نادرست تھا، دوسرے جو قسطیں مشتری نے جمع کردی تھیں بائع کو اپنے سامان پر قبضہ کرلینے کے بعد اس کی واپسی ضروری تھی، اور اس نے واپس نہیں کیا تو یہ سود شمار ہوگا، کیونکہ ظاہر ہے مشتری کی جانب سے جمع شدہ رقم کا بدل کچھ نہیں ہے، چنانچہ حنفیہ، شوافع، مالکیہ بھی حضرات بیع کی اس صورت کے عدم جواز کے قائل ہیں (ردالمحتار ۴ / ۱۲۸، حاشیۃ الدسوقی ۳ / ۶۳، تحفۃ المحتاج ۴ / ۳۲۲)، البتہ حنابلہ کا موقف جائز ہونے کا ہے، لیکن وہ بھی زائد رقم کا بائع کو مستحق قرار نہیں دیتے بلکہ مشتری کو بائع سے اس رقم کی واپسی کے مطالبہ کا حق دیتے ہیں (المغنی ۴ / ۱۶۰-۱۶۱)۔

۱۱- مبیع کو خود مشتری کے پاس بطور رہن رکھنے کا حکم:

رہن کے درست ہونے کے لیے مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ ضروری ہے (بدایۃ المجتہد ۲ / ۲۷۴)۔

اس لحاظ سے مذکورہ صورت میں خریدار کے لیے خرید کردہ سامان کو بطور استعمال رکھنا رہن متصور نہ ہوگا، کیونکہ بائع نے مال مرہون پر قبضہ نہیں کیا ہے، اگر پہلے سامان پر قبضہ کرلیتا پھر خریدار کے پاس اسے رہن رکھ دیتا تو درست ہونے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

۱۲- ضمانت پر اجرت کا حکم:

کریڈٹ لیٹر اگر اس میں کتابت اور وقت کی حد تک اجرت لی جاتی ہے، تب تو جائز اور درست ہے ورنہ فی نفسہ اس کی وجہ سے اجرت لینا ناجائز ہوگا، اور شاید اس زمانہ میں کتابت اور وقت کی ہی اجرت لی جاتی ہے، اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵ / ۱۶۱)۔

۱۳- دستاویز کی خرید وفروخت کا حکم:

یہ دراصل دستاویز کی بیع نہیں ہوتی، بلکہ دستاویز کے اندر جو مالیت ہے اس کی بیع ہوتی ہے اور اس میں جواز اور عدم جواز کی تفصیل ہے، کیونکہ حقیقۃً دستاویز کی بیع ہی نادرست ہے اس لیے کہ اس میں "مبادلۃ المال بالمال" نہیں پایا جاتا، اب یہاں دو نقد جمع ہوگئے، مالیت دستاویز اور اس کا معاوضہ، اور نقدین کے اندر کمی و بیشی ناجائز ہے، اس میں ادھار بھی درست نہیں، اور مجلس کی شرط بھی ہے، اس لحاظ سے مذکورہ مسئلہ میں اگر کمی بیشی ہے تو ربا کے خانہ میں داخل ہوگا جو حرام اور ناجائز ہے، چنانچہ علامہ شامی نقل کرتے ہیں:

"ویشترط التماثل والتقابض قبل الافتراق إن اتحدا جنسا وإن اختلفا جودة وصياغة"
(الدر المختار علی ہامش الرد المحتار ۴ / ۲۶۱، نیز دیکھئے: بدائع ۵ / ۲۱۵، فتح القدیر ۵ / ۲۸۴)۔

جنس ایک ہو تو برابری، اور مجلس میں قبضہ شرط ہے گو صفت میں مختلف ہو مثلاً ردی اور جید ہو یا بناوٹ و کوالٹی کا فرق ہو، یہ بیع صحت بیع کے لیے مانع نہیں ہے، اور علامہ نووی تحریر فرماتے ہیں:

"وأما ما یحرم فیه الربا فینظر فیه فإن باعه بجنسه حرم فیه التفاضل والنساء والتفرق قبل التقابض"
(المجموع ۹ / ۴۰۳، نیز دیکھئے: تحفۃ علی حواشی الشروانی ۴ / ۲۷۳)۔

(وہ اشیاء جس میں ربا حرام ہے تو اس میں تدبر کریں گے، اگر اس میں جنس کا تبادلہ جنس سے ہو رہا ہو تو کمی بیشی اور قبضہ سے پہلے جدائیگی حرام ہے)۔

۱۴- ادھار معاملہ میں ثمن میں کمی کر کے نقد مطالبہ:

"ضع وتعجل" کی صورت عاقدین کے حق میں ہمدردی اور محبت کا باعث ہے، مشتری اپنی سہولت کی خاطر جہاں ادھار کے بجائے نقد رقم ادا کردے تو اسی طرح اگر بائع نے ادھار معاملہ میں متعینہ مدت سے پہلے قیمت کا مطالبہ کردیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اتنے پیسے، ہم تمہیں معاف کردیں گے تو بے چارے

مشتری کو کیا پڑی ہے کہ اسے قبول نہ کرے، حالاں کہ اب اسے پہلے کے بالمقابل کم ہی دینا پڑے گا، یہ کمی بائع کا تبرع ہے، اور مشتری نے بذات خود اس کمی کی شرط نہیں لگائی تھی کہ شبہ رباہو، نیز بائع اپنے مال میں تصرف کا حق رکھتا ہے چاہے تو پورا دین بھی معاف کر سکتا ہے، اس سلسلہ میں ایک قاعدہ بھی فقہاء کے یہاں مسلم ہے ''تنزيل البائع من الثمن بعد العقد تلحق باصل العقد''۔ لہذا یہ کمی اصل قیمت ہی متصور ہوگی (درر الحکام ۱/۲۴۱)۔

البتہ مدت سے آگے بڑھانے پر زیادتی کا مطالبہ ناجائز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زیادتی اصل میں تاجیل کے سبب ہورہی ہے، اور یہ نادرست ہے۔ ''وبيع التأجيل لا يجوز'' (المغنی ۴/۳۱۶)۔

تعیین مدت پر فوری لین دین:

ادھار معاملہ میں قیمت کی ادائیگی کے لیے مدت کی تعیین نہیں ہوئی اور پھر بعد میں پہلے جو قیمت عاقدین کے مابین طے ہوئی تھی اس سے کم قیمت میں ان کے درمیان مصالحت ہوگئی کہ ابھی اتنے پیسے کم ہی دے کر مبیع لے لو تو یہ صورت جائز ہے، اور ایسی بیع درست ہے (درر الحکام ۱/۲۳۰)۔

۱۶- کسی قسط کی تاخیر پر مابقی قیمت کے مطالبہ کا حکم:

بائع طے شدہ قسطوں کی تاخیر پر پوری قیمت کے فوری مطالبہ کا حق رکھتا ہے، ''درر الحکام'' میں مذکور ہے:

''إذا لم يف الدين بالشرط تحول باقي الدين معجلا'' (درر الحکام ۱/۲۳۰)۔

جب دین متعینہ مدت پر ادا نہیں کیا تو مابقی موجل دین معجل (نقد) ہوجائے گا، یہی رائے شوافع کی بھی ہے (کتاب الام ۳/۳۳)۔

۱۷- فریقین کے انتقال کے بعد طے شدہ معاملہ کا حکم:

دائن کے انتقال سے معاملہ کی نوعیت میں فرق نہیں آئے گا، بلکہ طے شدہ معاملہ برقرار رہے گا، ورثہ مدت کے گزرنے سے پہلے دین کا مطالبہ نہیں کر سکتے، ہاں اگر مدیون کی وفات ہوجائے تو معاملہ کی صورت بدل جائے گی، بائع کو فوری طور پر مطالبہ کا حق ہوگا، اور معاملہ ختم کر دیا جائے گا علی حیدر لکھتے ہیں:

''إذا باع إنسان من آخر متاعا وهو صحيح سلمه إليه ثم توفي فليس لورثته أن يأخذوا الثمن من المشتري قبل حلول الأجل، لأن الأجل الذي هو حق المدين لا يبطل بوفاة الدائن'' (درر الحکام ۱/۲۲۸، نیز دیکھئے: رد المحتار ۴/۲۶)۔

بائع نے مشتری سے کوئی سامان فروخت کیا اور مبیع حوالہ کر دیا اور عقد کے وقت وہ موجود تھا پھر موت ہوگئی تو وارثین کو مدت کے گزرنے سے پہلے مشتری سے ثمن کے وصول کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ اجل مدیون کا حق ہے، یہ دائن کی وفات سے باطل نہیں ہوتا۔

شوافع بھی اسی کے قائل ہیں: ''انتقل بموت البائع لوارثه وحل بموت المشتري ولا يضر بموته؛ لأنه أمر غير متيقن عند العقد فلم ينظر إليه (تحفۃ المحتاج ۴/۲۹۷)۔

بائع کی موت سے معاملہ اس کے ورثہ کی طرف منتقل ہوگا اور مشتری کی موت سے برقرار نہ رہے گا، بلکہ ختم ہوجائے گا، کیونکہ یہ غیر یقینی معاملہ ہے، لہذا اس کی طرف نظر نہیں کی جائے گی۔

۱۸- ماہ بماہ انعام کی حیثیت:

بیع بالتقسیط کے ساتھ ماہ بماہ بذریعہ قرعہ اندازی انعام دینا شرعی نقطہ نظر سے درست معلوم ہوتا ہے، اور اس سے بیع کے اصول وآداب میں کوئی فرق نہیں آتا ہے، مشتری کو اس کی اصل قیمت کے ذریعہ مبیع مل جاتی ہے، اور کسی طرح کا اس کے ساتھ دھوکا نہیں کیا جاتا، یہ ماہ وسال پر انعام دینا لوگوں کو اپنے سامان کی بکثرت فروختگی کی طرف رغبت دلانے کے لیے ہے، اور ہر بائع اپنے سامان کی زیادہ سے زیادہ فروخت کا خواہشمند رہتا ہے، اس کے لیے وہ مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں، یہ انعام کی شکل بھی اسی میں سے ہے، چنانچہ وہ قرعہ اندازی کر کے جس کا نام آیا اسے انعام دیتے ہیں، تاکہ ہر شخص یہ سوچ کر کے کہ انعام مجھے ملے خریدار بن جائیں نہ تو اس انعام کا تعلق ثمن سے ہے اور نہ ہی مبیع سے، لہذا بائع کا اس طرح انعام دینا، اور خریدار کے لیے اس سے مستفید ہونا درست اور جائز ہے۔

۱۹- بطور قرعہ اندازی مبیع کی حوالگی کا حکم:

بیع کی صحت کے لیے مبیع اور ثمن کا معلوم ہونا شرط ہے، اور مبیع وثمن کی جہالت مفسد بیع ہے الا یہ کہ جہالت باعث نزاع نہ ہو، سوال میں مذکور صورت میں اجل اور ثمن میں کسی قدر جہالت ضرور ہے، لیکن اس جہالت سے کوئی نزاع نہیں ہوگا، اور ہو بھی کیوں جبکہ باہمی رضامندی موجود ہے، لہذا بائع کا فروخت کرنا اور مشتری کا خریدنا دونوں درست ہیں، گویا اس کی صورت یہ ہوگی کہ:

زید بائع ہے، اس کے پاس کوئی چیز مبیع ہے، خریدار بکر، عمر، حامد، ساجد وغیرہ ہیں، زید نے چاروں خریداروں کو کسی مدت تک قسط وار ۲۰/۲۰ روپئے جمع کرنے کی ذمہ داری دے دی ہے، خریداروں نے رقم جمع کردی، مگر سامان کسی کو نہیں دیا گیا، بلکہ قرعہ اندازی کے ذریعہ جس کا بھی نام نکل آیا یہ سامان اس شخص کا ہوگیا، اور یہ شخص جو مثلا بکر تھا، خارج از معاملہ ہوگیا، اسی طرح ہر ایک شخص عمر، حامد، ساجد اپنے اپنے نام نکلنے پر معاملہ سے نکل جائیں گے ہر ایک کو مبیع اس کے ثمن کے ساتھ مل جاتی ہے، اس میں علاوہ پہلے کے ہر ایک خریدار کو کافی مدت تک انتظار کرنا پڑتا ہے، چونکہ وہ اس پر راضی ہے اس لیے بیع درست ہوگی۔

صحت بیع کی شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

''ومعلومية المبيع و معلومية الثمن بما يرفع المنازعة'' (ردالمحتار ۴/۶) مبیع وثمن کا معلوم ہونا اس طرح کہ نزاع نہ پائی جاسکے شرط ہے کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ''وإن كان مجهولا جهالة لا تفضي إلى المنازعة لا يفسد... واذا لم تكن مفضية إلى المنازعة لا تمنع من ذلك فيحصل المقصود'' (بدائع الصنائع ۵/۱۵۶)۔

جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہے تو بیع فاسد نہیں ہوگی اور جب جہالت مفضی الی النزاع نہ ہو تو اسے اس بات سے روکنا ممنوع ہے، کیوں کہ مقصود حاصل ہوگیا۔

☆☆☆

قسط وار خرید وفروخت میں ائمہ کا موقف

مولانا ابرار الحق قاسمی

۱- یہ صورت جائز ہے، یہی رائے جمہور ائمہ کی ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''لأن الأجل مرغوب فيه، ألا ترى أن الثمن قد يزاد لمكان الأجل'' (بدائع ۵/ ۲۲۴، نیز دیکھئے: شامی ۵/ ۱۷۷، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۷۰۹)۔

(اس لیے کہ مہلت بھی معاملہ میں رغبت کا باعث ہے چنانچہ ادھار کی وجہ سے کبھی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے)۔

اسی طرح علامہ ابن محمد الرافعی شافعیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''للتفاوت الظاهر بين المؤجل والمعجل في المالية'' (فتح العزیز علی المجموع ۹/ ۱۲- ۱۳، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: المغنی ۴/ ۲۱، ۱۳۲، بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۱۵، المدونۃ الکبری ۳/ ۲۴۶، حاشیۃ الدسوقی ۳/ ۱۶۵، مقدمات ابن رشد علی المدونۃ ۳/ ۳۲۸)۔

۲- ادھار قیمت قسطوں میں ادا کرنی جائز ہے (منحۃ الخالق علی البحر ۵/ ۲۸۰، البحر الرائق ۵/ ۲۸۰)۔

شوافع کے نزدیک بھی یہ صورت جائز ہے (کتاب الام ۳/ ۳۳)۔ یہی رائے جمہور ائمہ بہ شمول مالکیہ اور حنابلہ کی ہے۔

۳- اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی آراء حسب ذیل ہیں:

حنفیہ کا نقطہ نظر:

چوں کہ کسی ایک صورت پر معاملہ متعین نہیں ہوا ہے جس کی وجہ سے کوئی ایک قیمت متعین نہ ہوسکی، اس لیے یہ بیع درست نہ ہوگی، چنانچہ علامہ کاسانیؒ بیوع فاسدہ کے ذیل میں یوں رقم طراز ہیں:

''وجهالة الثمن تمنع صحة البيع'' (بدائع ۵/ ۱۵۸، نیز دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۷۲) قیمت متعین نہ ہونے کی صورت میں بیع صحیح نہیں ہوتی ہے۔ ہاں اگر مجلس عقد ہی میں کسی ایک متعین قیمت پر معاملہ طے کرلیتا ہے تو اس بیع کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے (حوالہ سابق)۔

شوافع کا رجحان:

اس صورت میں کسی ایک قیمت کے متعین ہوئے بغیر اگر بائع ومشتری مجلس عقد سے جدا ہوجاتے ہیں تو یہ بیع درست نہیں ہوگی بلکہ ناجائز وفاسد ہوگی۔ چنانچہ حواشی شروانی وابن قاسم میں تحریر ہے:

''وتخصيص البطلان بقبوله على الإبهام أو بقبولهما معا'' (حواشی علی تحفۃ المحتاج ۴/ ۲۹۴، نیز دیکھئے: المجموع ۹/ ۳۳۸)

(اور بیع کا باطل ہوجانا خاص ہے اس صورت کے ساتھ جبکہ مبہم طور پر یا دونوں کو بیک وقت قبول کرلیا ہو)۔

یہی رائے جمہور فقہاء اور حنابلہ کی بھی ہے (المغنی ۴/ ۱۶۱)۔

مالکیہ کا خیال:

مالکیہ کے نزدیک اگر یہ بیع لازم نہ ہو تو درست اور صحیح ہے اور مشتری کو خیار حاصل ہوگا، اور اگر بائع کسی ایک میں بیع لازم کردے تو بالاتفاق یہ بیع ناجائز ہوگی، چنانچہ محمد بن رشد القرطبی مسلک مالکی کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''إذا لم يكن البيع لازما في أحدهما فأجازه مالك ومنعه أبو حنيفة والشافعي، وجعله مالك من باب الخيار. وأما إذا كان البيع فيه واجبا فلا خلاف في أنه لا يجوز'' (بدایۃ المجتہد ۲/ ۱۵۴، دیکھئے: المدونۃ ۳/ ۲۱۱)۔

(جب ان میں سے کسی ایک میں بیع لازم نہ ہو تو امام مالک اسے جائز کہتے ہیں، ابوحنیفہ وشافعی اسے ناجائز، اور مشتری کو امام مالک کے نزدیک اختیار ہوگا، اور جب بیع ان میں سے کسی ایک میں لازم ہو تو بالاتفاق وہ بیع ناجائز ہوگی)۔

۴- یہ اضافہ ربا کے دائرے میں نہیں آتا، تفصیل سوال نمبر ا کے جواب میں گزر چکی (بدائع ۵ / ۲۲۴، نیز دیکھئے شامی ۵ / ۱۷۷، ہدایہ ۳ / ۷۶)۔

۵- معاملہ کی یہ شکل از روئے شرع درست اور جائز ہے، کیونکہ معاملہ کے ایک صورت پر متعین ہونے کی وجہ سے مبیع کی قیمت (ثمن) بھی متعین ہوگئی، مجہول نہیں رہی (بدائع ۵ / ۱۵۸)۔ یہی رائے امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل اور دیگر فقہاء کرام کی ہے (المجموع ۹ / ۳۳۸، المغنی ۴ / ۱۶۲، المدونہ ۳ / ۲۱۱، بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۵۴، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴ / ۴۷۲)۔

۶- یہ سود ہے، اور سود لینا اور دینا دونوں حرام ہے، لہذا یہ بیع جائز نہیں ہوگی، کیونکہ وہ بیع جس میں ربا یا ربا کا شبہ ہو وہ بیع فاسد ہے (بدائع ۵ / ۱۸۳، نیز دیکھئے: شامی ۴ / ۱۹۷)۔ یہی رائے شوافع، حنابلہ، مالکیہ اور دیگر فقہاء کرام کی ہے (مقدمات ابن رشد علی المدونہ ۳ / ۱۸، المجموع ۸ / ۱۶۲)۔

۷- بیع کی یہ صورت بھی ربا میں داخل ہے، کیونکہ جو قیمت اقساط میں متعین ہے وہ تو مشتری ادا کرے گا ہی، تاخیر کی صورت میں مزید ادا کرنے کی جو شرط لگادی گئی ہے وہ عوض سے خالی ہے، اور جو مال شی عوض سے خالی ہو اسی کا نام ربا ہے اور اس کی حرمت ادلہ شرعیہ سے ثابت ہے۔

یہی رائے حنابلہ و مالکیہ اور شوافع کی ہے (حوالہ سابق)۔

۸- (الف)...... اس سلسلے میں مذاہب اربعہ کی تفصیل یہ ہے:

راہن کی اجازت کے بغیر بائع کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے (بدائع ۶ / ۱۴۶)۔

اگر راہن اجازت دے تو اس کی دو صورتیں نکلتی ہیں: پہلی تو یہ کہ سودا کرتے وقت ہی بائع نے خریدار پر یہ شرط لگادی ہو کہ وہ شی مرہون کو اپنے استعمال میں لائے گا، راہن نے اجازت دیدی، خواہ شرط حقیقی ہو یا شرط حکمی ہو، اس طرح کہ بائع نے شرط تو نہیں لگائی لیکن سماج میں شی مرہون سے فائدہ اٹھانے کا عام چلن ہے تو یہ بھی بمنزلہ شرط کے ہوگا، ایسی صورت میں راہن کی اجازت کے بعد بھی بائع کے لیے شی مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہے

(فتح القدیر ۹ / ۷۹، شامی ۵ / ۳۴۲، نیز دیکھئے: بدائع ۶ / ۱۴۶، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵ / ۲۵۷، حلیۃ العلماء فی مذاہب الفقہاء ۴ / ۴۳۹)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاملہ کے وقت بائع نے انتفاع کی کوئی شرط نہیں لگائی، اور نہ ہی معاشرہ میں اس کا چلن عام ہے، بلکہ راہن اپنی مرضی سے مرتہن کو شی مرہون سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے تو یہ صورت جائز ہے (درمختار علی الردالمحتار ۵ / ۳۴۳-۳۴۲)۔

مالکیہ کے نزدیک خرید و فروخت کے معاملہ میں اگر فروخت کرنے والا معاملہ کے وقت انتفاع کی شرط لگادے یا خوشی سے راہن خود ہی اجازت دے دے تو بائع کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز ہے (المدونہ ۴ / ۱۶۳، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳ / ۲۳۵)۔

شوافع کے نزدیک بھی بغیر راہن کی اجازت کے شی مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہے (المجموع ۱۰ / ۱۴۲)۔

حنابلہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر مال مرہون حیوان ہو تو اپنے خرچ کے بقدر راہن کی اجازت کے بغیر بھی اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے (المغنی ۴ / ۲۵۰، ۲۵۱)۔

(ب)...... مسلک احناف: اگر بائع کے قبضہ میں مال مرہون اس کی تعدی سے ضائع ہوجائے تو بالاجماع بائع ضامن ہوگا، اگر مثلی ہو تو مثل کا اور قیمتی ہو تو اس کی قیمت واجب ہوگی، اور اگر بائع کے قبضہ میں مال مرہون اس کی تعدی کے بغیر ہلاک ہوجائے تو حنفیہ کے نزدیک قیمت اور دین میں سے جو اقل ہو بائع اس کا ضامن ہوگا (بدائع الصنائع ۶ / ۱۶۰-۱۶۳، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵ / ۲۷۲، دیکھئے: تبیین الحقائق ۶ / ۸۷، شامی ۵ / ۳۴۱، حلیۃ العلماء ۴ / ۴۵۸)۔

مسلک شوافع:...... چونکہ شی مرہون مرتہن کے پاس امانت ہے لہذا بائع ضامن نہیں ہوگا (المجموع شرح المہذب ۱۰ / ۱۳۸)۔

حنابلہ کی بھی وہی رائے ہے جو شوافع کی ہے (المغنی ۴ / ۲۵۷)۔

مالکیہ کا رجحان:...... بائع یعنی مرتہن اس وقت ضامن ہوگا جبکہ شی مرہون کی ہلاکت کا سبب پوشیدہ ہو، اور اگر ہلاکت کا سبب واضح اور ظاہر ہو مثلاً حیوان مال مرہون تھا اور وہ ہلاک ہوگیا تو بائع ضامن نہیں ہوگا (حلیۃ العلماء فی معرفۃ مذاہب الفقہاء، المدونہ ۴ / ۲۵۲، الفقہ الاسلامی ۵ / ۲۷۱)۔

(ج)...... مسلک حنفی: خریدار اگر وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرے یا ٹال مٹول کرے، راہن اگر موجود ہو، یا خود تو غائب ہو، لیکن اس کا وکیل موجود ہو، تو راہن یا اس کے وکیل کو بالاتفاق قاضی دین ادا کرنے یا مال مرہون کو بیچنے پر مجبور کرے گا، اور اگر بیچنے سے انکار کردے تو قاضی شی مرہون کو فروخت کردے گا، اور مرتہن اپنا دین اس قیمت سے صاحبین کے نزدیک وصول کرلے گا، امام اعظم کے نزدیک انکار کی صورت میں راہن کو قید کردیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ خود ہی بیچنے پر مجبور ہوجائے، فتوی صاحبین کے قول پر ہے (ردالمحتار ۵ / ۳۵۹)۔

یہی رائے حنابلہ، شوافع، مالکیہ اور دیگر فقہاء کرام کی ہے (المغنی ۴ / ۲۶۲، المجموع ۱۰ / ۱۲۷، المدونہ ۴ / ۱۵۶)۔

۹- اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے مسالک کی تفصیل یہ ہے:

حنفیہ کا مسلک: فروخت شدہ سامان کو بائع اس وقت تک روک سکتا ہے جب تک مکمل قیمت وصول نہ کرلے، اور یہ اس وقت درست ہوگا، جبکہ بائع نے مشتری سے نقد سودا کیا ہو نہ کہ ادھار، اور اگر بائع نے سودا ادھار فروخت کیا ہے تو اس کو اب مبیع کے روکنے کا حق حاصل نہ ہوگا، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''فان کان مؤجلا لا یثبت حق الحبس'' (بدائع ۴/۲۴۹، شامی ۴/۴۷، ہندیہ ۳/۱۵، درر الحکام ۱/ ۲۶۳، مجمع الانہر/ ۲۲)۔ اگر معاملہ ادھار ہو تو بائع کو مبیع کے روکنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

شوافع وحنابلہ کا مسلک:...... ان حضرات کے نزدیک ثمن کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو سامان کو قیمت وصول ہونے تک روک سکتا ہے۔

(تحفۃ علی حواشی ۴/ ۴۲۳، المغنی ۴/ ۱۴۱)۔

فروخت شدہ سامان کو ایک صورت میں رہن بنانے کی بھی گنجائش نکلتی ہے، اور وہ یہ کہ جس سامان کو بائع نے روک رکھا ہے اگر یہ روکنا خریدار کے قبضہ کے بعد ہے تو وہ سامان بائع کے پاس رہن ہوگا، اور رہن کے احکام جاری ہوں گے، اور اگر قبضہ سے پہلے روکا ہے تو وہ سامان محبوس بالدین ہی ہوگا، رہن نہیں ہوگا۔

(درمختار علی الرد ۵/ ۳۵۴، شامی ۵/ ۳۵۴، بدائع ۶/ ۱۵۲، بزازیہ علی ہندیہ ۶/ ۵۵)۔

۱۰- صورت مسئولہ کا حکم فقہی کتابوں میں صراحت کے ساتھ نہیں ملا ہے، تاہم اس بیع کو ''بیع عربون'' پر قیاس کیا جاسکتا ہے، اس لیے بیع عربون کو سمجھنا ضروری ہے، بیع عربون کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''والعربون في البيع هو أن يشتري السلعة فيدفع إلى البائع درهما أو غيره، على أنه إن أخذ السلعة احتسب به من الثمن، وإن لم يأخذها فذلك للبائع''

(خریدار سودا کر کے بائع کو کچھ رقم پیشگی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ سامان لے لوں تو یہ پیشگی رقم اس کی قیمت میں حساب کرلیا جائے اور اگر سامان نہ لوں تو یہ رقم فروخت کرنے والے کی ہوگی)۔

مسلک حنفیہ:...... حنفیہ کے نزدیک یہ بیع درست نہیں ہے (حجۃ اللہ ۲/ ۱۰۸، انجاح الحاجۃ شرح ابن ماجہ/ ۱۵۸)۔

یہی رائے سوائے حنابلہ کے جمہور فقہاء کی ہے (تحفۃ المحتاج علی حواشی ۴/ ۳۲۲، شرح کبیر علی حاشیۃ الدسوقی ۳/ ۶۳)۔

حنابلہ کا نقطۂ نظر:...... حنابلہ کے نزدیک یہ بیع جائز ہے، یہی رائے ابن سیرین اور حضرت ابن عمرؓ کی ہے، تاہم ان کے نزدیک بھی خریدار کے مبیع نہ لینے کی صورت میں فروخت کرنے والا اس پیشگی رقم کا حقدار نہ ہوگا، مشتری کو دی ہوئی رقم واپس لینے کا حق حاصل ہوگا، چنانچہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

''قال أحمد لا بأس به، وفعله عمر ﷺ، وعن ابن عمر أنه أجازه، وقال ابن سيرين: لا بأس به، وإن لم يشتر السلعة في هذه الصورة لم يستحق البائع الدرهم، لأنه ياخذ بغير عوض، ولصاحبه الرجوع فيه'' (المغنی ۴/ ۱۶۰، ۱۶۱)۔

(امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس بیع میں کوئی حرج نہیں ہے، حضرت عمرؓ نے ایسا کیا ہے، ابن عمرؓ سے بھی جواز مروی ہے، اسی کے قائل ابن سیرین بھی ہیں، اس صورت میں اگر مشتری نے سامان نہیں لیا تو بائع کو درہم لینے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ یہ سود ہے، اور مشتری کو بائع سے اپنا ثمن واپس لینے کا حق حاصل ہوگا)۔

خلاصہ کلام یہ کہ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بیع کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے، کیونکہ جائز قرار دیے جانے کی صورت میں سامان نہ لینے پر بائع کے پاس ادا کردہ رقم بغیر عوض کے ہوگی، اور سود لینا دینا دونوں حرام ہیں، اسی طرح جس معاملہ کا تعلق سود سے ہوجاتا ہے وہ بھی حرام ہے۔

۱۱- جہاں رہن کی بہت سی شرائط ہیں وہیں رہن کے جائز ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ شئ مرہون پر مرتہن یا اس کے وکیل کا قبضہ ہو چکا ہو، اور یہ بھی مسلم ہے کہ قبضہ سے مرتہن کا وکیل راہن نہیں ہوسکتا، ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''ولا يصح أن يكون وكيله هو الراهن'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۲۱۶) (قبضہ سے پہلے مرتہن کا وکیل راہن نہیں ہوسکتا ہے)۔

مسئلہ مذکورہ میں چونکہ خرید کردہ سامان پر بائع کا قبضہ نہیں ہوا ہے، نہ حقیقی اور نہ حکمی، لہذا مشتری کے پاس وہ سامان رہن نہیں ہوگا (بدائع الصنائع ۶/ ۷/ ۱۳)۔

ہاں مرتہن یا اس کا وکیل قبضہ کے بعد دوبارہ خریدار کے پاس بطور رہن رکھے تو یہ درست ہے (بدائع ۶/ ۷/ ۱۳)۔

شوافع وحنابلہ کی بھی یہی رائے ہے کہ شئ مرہون پر قبضہ سے پہلے راہن کے پاس رہن رکھنا صحیح نہیں ہے، نیز مرتہن قبضہ میں راہن کو وکیل بھی نہیں بنا سکتا ہے، لہذا صورت مسئولہ میں مرتہن کا اس پر قبضہ سے پہلے اس کو راہن کے پاس بطور رہن رکھنا صحیح نہیں ہے (حواشی تحفۃ المحتاج ۶/ ۶۸۔ ۶۷، المغنی ۴/ ۲۱۶، ۲۲۹)۔

مالکیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شی مرہون جب تک راہن یا عادل کے قبضہ میں رہے تو رہن ہوگا، یعنی ان کے نزدیک رہن کے صحیح ہونے کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس پر مرتہن کا ہمیشہ قبضہ ہو، اگر راہن کے قبضہ میں وہ آجائے چاہے مرتہن کی اجازت سے ہی کیوں نہ آوے پھر بھی رہن باطل ہوجائے گا، لہذا صورت مسئولہ میں راہن کے سامان کو خود راہن کے پاس بطور رہن رکھنا کسی بھی طرح سے جائز نہ ہوگا، چنانچہ ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

''إن من شرط صحة الرهن استدامة القبض وأنه متى عاد إلى يد الراهن بإذن المرتهن بعارية أو وديعة أو غير ذلك فقد خرج من اللزوم'' (بداية المجتهد ۲/۲۷۴، نیز دیکھئے: المدونة ۱۵۱/۴)۔

(رہن کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ شی مرہون پر مرتہن کا قبضہ ہمہ وقت رہے، لہذا اگر وہ مرتہن کی اجازت سے راہن کے پاس آجائے خواہ کسی بھی طریقہ سے آئے، تو وہ رہن لزوم سے نکل گیا اور اب وہ شی مرہون نہیں رہے گی)۔

۱۲- کفالت ایک عقد تبرع ہے، اگر اس پر مشتری اپنی طرف سے کچھ روپئے بطور ہدیہ یا ہبہ دے دے تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر عقد کفالت میں کفیل اجرت ومعاوضہ کی شرط لگادے اور خریدار کے لیے اس سامان کا حصول ضروری ہے تو اس کے لیے اجرت دینے کی بھی گنجائش ہے، لیکن خود کفیل کے لیے اس کا لینا جائز نہیں (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۶۱/۵)۔

۱۳- مذکورہ صورت میں صاحب دستاویز حقیقت میں دستاویز کو نہیں، بلکہ اس قیمت ومالیت کو فروخت کررہا ہے جو اس میں مرقوم ہے، تو گویا نقد کی بیع نقد سے ہورہی ہے، جس کے صحیح ہونے کے لیے چار شرائط ہیں:

۱- نقدین برابر ہوں کسی میں کمی یا زیادتی نہ ہو۔ ۲- اسی مجلس میں نقدین پر قبضہ ہوچکا ہو۔

۳- بائع ومشتری میں کسی کو خیار شرط حاصل نہ ہو۔ ۴- معجّل (نقد) ہو ادھار (مؤجل) نہ ہو۔

ان شرطوں میں سے کوئی ایک بھی شرط فوت ہوجائے تو بیع جائز نہ ہوگی، چہ جائیکہ دو یا تین شرائط کا فقدان ہو، مسئلہ مذکورہ میں ایک تو نقدین پر قبضہ نہیں ہے، اور ادھار ثمن کی بیع نقد ثمن سے ہورہی ہے، لہذا اس دستاویز کی خرید وفروخت ناجائز ہوگی۔

(درمختار ۵۰۲/۲، دیکھئے: ردالمحتار ۲۶۱/۴، البدائع ۲۱۵/۵، فتح القدیر مع العنایہ ۲۸۴/۵، ۳۶۸، الجموع ۴۰۳/۹، تحفۃ علی حواشی ۲۷۳/۴)۔

۱۴- حنفیہ کے نزدیک بطور شرط کے اس طرح کی کمی کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر خوشی سے فروخت کرنے والا (بائع) بطور تبرع کم کردے تو جائز ہے۔

(شامی ۵۳۴/۴، دیکھئے: درمختار ۶۱۳/۲، التعلیق علی ملتقی ۱۳۲/۲)۔

مسلک شوافع: بائع طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگتا ہو کہ اس کا ایک حصہ ہم تم کو معاف کردیں گے، شوافع کے نزدیک اس طرح کی کمی کرنا جائز نہیں ہے (حواشی علی تحفۃ المحتاج ۱۵۲/۵)۔

حنابلہ کا نقطہ نظر:...... ان کے نزدیک بھی یہ صورت جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں ''نقد'' اور ''ادھار'' کی بیع لازم آتی ہے اور یہ جائز نہیں ہے، چنانچہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

''وبيع الحلول والتأجيل لا يجوز'' (المغنی ۳۱۶/۴)۔ حلول اور تاجیل کی بیع جائز نہیں ہے۔

مسلک مالکیہ: مالکیہ کے نزدیک بھی یہ صورت درست نہیں ہے، ہاں اگر بطور تبرع اور احسان کے کم کردے تو یہ جائز ہے۔

(موطا امام مالک مع التعلیق المجد ۲۰۲/۳)۔

ابن قاسم مالکی، ابن سیرین، ابن عباسؓ، سعید بن المسیب اور شافعی کا ایک قول ہے کہ یہ صورت جائز ہے کیونکہ احادیث سے اس طرح کی کمی کرنا ثابت ہے

(موطا امام مالک مع التعلیق المجد ۲۰۲/۳، المغنی ۳۱۶/۴)۔

خلاصہ کلام:

جس طرح مشتری کو یہ حق ہے کہ ادھار خرید کو نقد سودا میں بدل دے، اسی طرح بائع کے لیے بھی جائز ہے کہ کل قیمت سے مشتری کو بری کردے، یا بعض قیمت اس سے کم کردے، مشتری کو قبول کرنے یا نہ کرنے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے (درر الحکام ۲۳۰/۱، ابن عابدین علی البحر)۔

لہذا جب مشتری اس (ضع وتعجل) پر تیار ہے تو عدم جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے جب کہ اصول یہ ہے کہ ''تنزيل البائع من الثمن بعد العقد تلحق بأصل العقد'' (عقد کے بعد بائع نے کچھ قیمت کم کردیا تو یہ اصل عقد کے ساتھ لاحق ہوگا)، گویا اصل عقد میں ہی اس کی اتنی قیمت تھی، اس کا بھی تقاضہ

ہے کہ یہ بیع اور اس طرح کی کمی جائز ہو، بخلاف متعینہ وقت سے آگے بڑھانے پر قیمت میں زیادتی کے، کیونکہ اس صورت میں قیمت میں اضافہ محض تاجیل کی وجہ سے ہورہا ہے، اور محض تاجیل پر زیادتی کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

"وبیع التأجیل لا یجوز" (المغنی ۴/۳۱۶) (محض مہلت کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے)۔

۱۵- اگر اس طرح معاملہ طے کرلیا ہے تو یہ بیع جائز ہوگی، کیونکہ مشتری کو یہ حق حاصل ہے کہ تاجیل (ادھار) کو تعجیل (نقد) میں بدل دے۔

(بحوالہ دُرر الحکام ۱/ ۲۲۹)۔

ابن سیرین، ابن عباس وغیرہما کے نزدیک بھی جائز ہے، چنانچہ المغنی میں ہے:

"روی عن ابن عباس والنخعی وابن سیرین، أنه لا بأس به، ولعل ابن سیرین یحتج بأن التعجیل جائز، والاسقاط وحده جائز، فجاز الجمع بینهما" (المغنی ۴/۳۱۶)۔

(تعجیل جائز ہے، اسقاط محض جائز ہے تو جب دونوں جمع ہوجائیں تو یہ بھی جائز ہے)۔

۱۶- طے شدہ کسی قسط کی تاخیر پر بائع فوری طور پر بقیہ تمام قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے (شامی ۴/ ۲۶، درر الحکام ۱/ ۲۳۰)۔

شوافع کا خیال بھی یہی ہے (کتاب الام ۳/ ۳۳)۔

۱۷- بائع (دائن) کے انتقال سے بیع بالتقسیط میں کوئی فرق نہیں آئے گا، بلکہ معاملہ اب بھی اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا، اور اگر مدیون کا انتقال ہوجائے تو اب بیع بالتقسیط ختم ہوجائے گی اور بائع کو فوری طور پر قیمت کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا، اور مدیون کے ترکہ میں سے قیمت وصول کی جائے گی۔ علامہ ابن عابدین رقم طراز ہیں:

"ویبطل الأجل بموت المدیون لا الدائن (بحر عن شرح المجمع) و صرح قبله بأنه لو مات البائع لا یبطل الأجل"

(درمختار علی الرد ۴/ ۲۶، دیکھئے: درر الحکام ۱/ ۲۲۸)۔

(مہلت مدیون کے انتقال سے باطل ہوجاتی ہے نہ کہ دائن سے، اس سے پہلے یہ صراحت ہے کہ اگر بائع (دائن) کا انتقال ہوجائے تو اجل (مہلت) باطل نہیں ہوگی، مہلت بدستور باقی رہے گی)۔

یہی رائے حضرات شوافع کی ہے، چنانچہ تحفۃ المحتاج میں ہے:

"انتقل بموت البائع لوارثه وحل بموت المشتری ولا یضر السقوط بموته" (تحفۃ المحتاج علی حواشی ۴/ ۲۹۷)۔

(بائع کے مرنے سے مہلت ورثاء کی طرف منتقل ہوجائے گی، اور مشتری کے مرنے سے مہلت ختم ہوجائے گی، اور اس کی موت کے بعد مہلت کے ختم ہونے سے کوئی نقصان نہیں ہے)۔

۱۸- مسئلہ مذکورہ میں مبیع کی قیمت بھی متعین ہے اور اجل (مہلت) بھی متعین ہے، تجار تجارت کو فروغ دینے کے لیے مزید کچھ انعام مقرر کرتے ہیں، اور قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات تقسیم کرتے ہیں، اور یہ بائع کی خوشی پر ہے جسے چاہے انعام دے اور جسے چاہے انعام نہ دے، نفس مبیع یا ثمن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، قمار یا ربا کی تعریف بھی اس پر صادق نہیں آرہی ہے، لہذا یہ انعام جائز ہے، اور یہ قمار اور ربا میں داخل نہیں ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۳۴۵، احکام القمار)۔

۱۹- بیع کی صحت کے لیے یہ شرط ہے کہ مبیع یا ثمن میں ایسی جہالت نہ ہو جو جھگڑے کا باعث بنے۔ مسئلہ مذکورہ میں گو قیمت میں ایک گونہ جہالت ہے اور اجل (مدت) میں بھی جہالت ہے، لیکن عرف میں رواج پانے کی وجہ سے وہ ایسی جہالت نہ رہی جو جھگڑے کا سبب بنے۔

نیز خرید وفروخت کے اندر بائع ومشتری کی رضامندی کو خاص دخل ہے، ایجاب وقبول کا مقصد ہی رضامندی ہے، اسی وجہ سے بیع تعاطی جائز ہے، کیوں کہ ایجاب وقبول اس میں لفظاً نہیں پائے جاتے مگر عملاً خریدار اور بائع دونوں راضی ہوتے ہیں، اس لیے بیع تعاطی جائز ہوگی، لہذا مسئلہ مذکورہ میں جب بائع ومشتری دونوں راضی ہیں تو بیع جائز ہوگی (بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۶، نیز دیکھئے: رد المحتار ۴/ ۱۳، درمختار علی الرد ۴/ ۲۳)۔

☆☆☆

نقد وادھار قیمت میں مساوات کا مسئلہ

مولانا جنید احمد فلاحی

۱- نقد قیمت کے مقابلے ادھار لینے کی صورت میں قیمت زیادہ رکھنا درست ہے، جیسا کہ فقہائے کرام کی تصریحات واشارات سے معلوم ہوتا ہے۔

''لامساواة بين النقد والنسيئة لأن العين خير من الدين والمعجل أكثر قيمة من المؤجل'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۷ نیز ۵/ ۲۲۴)

نقد وادھار کے مابین کوئی مساوات نہیں، اس لیے کہ نقد ادھار سے بہتر ہوتا ہے اور نقد قیمت میں ادھار سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

حضرات شوافع کی بھی اس مسئلے میں یہی رائے ہے، چنانچہ ''فتح العزیز علی المجموع'' میں ہے:

''إذا اشتراه بثمن مؤجل وجب الإخبار عنه للتفاوت الظاهر بين المؤجل والمعجل فى المالية'' (فتح علی المجموع ۹/ ۱۲)۔

اگر کوئی ادھار خریداری کرے تو اس سے باخبر کرنا ضروری ہے، نقد وادھار میں مالیت کے اعتبار سے واضح فرق کی وجہ سے۔

مسلک مالکی کی مستند کتاب ''المدونہ الکبری'' میں امام مالکؒ کا بھی یہی قول مذکور ہے (المدونۃ الکبری ۳/ ۲۱۱)۔

حنابلہ کی رائے بھی یہی ہے (المغنی ۴/ ۱۶۱)۔

۲- اگر بیع ہوجانے کے بعد مستقل گفتگو ثمن کی ادائیگی کی نوعیت پر ہو اور کسی ایک فیصلے پر بائع اور مشتری راضی ہوجائیں تو اقساط میں بھی ثمن کی ادائیگی جائز ہے (البحر الرائق ۵/ ۲۷۹، درر الحکام ۱/ ۲۲۷، منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۵/ ۲۸۱)۔

۳- مذکورہ شکل میں ثمن مجہول رہتی ہے جب تک کسی ایک کی تعیین نہ کردی جائے، اور ثمن میں جہالت عقد میں فساد پیدا کرتی ہے، لہذا اگر تعین نہیں کیا گیا تو بیع فاسد ہوجائے گی، البتہ مجلس عقد ہی میں بیع کی کوئی ایک نوعیت اور اس کے مطابق قیمت طے پاجاتی ہے تو پھر یہ معاملہ درست ہوگا نیز نقد وادھار دونوں قیمتوں کا تذکرہ کرنے سے عقد پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہی رائے ائمہ اربعہ کی بھی ہے (بدائع ۵/ ۱۵۸، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۵۸)۔

۴- صورت مذکورہ میں ادھار ثمن رکھنے کی صورت میں زیادتی ربا کے حکم میں نہیں آتی، زائد قیمت محض وقت کا عوض نہیں اس منفعت کا عوض ہے جو مشتری کو مہلت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۷)، نیز صاحب بدائع فرماتے ہیں: '' للأجل شبهة المبيع، ألا ترى أن الثمن قد يزاد لمكان الأجل'' معلوم ہوا کہ اجل کی وجہ سے ثمن کی زیادتی عقد کی فطرت میں داخل ہے۔

۵- یہ صورت اصول بیع کی روشنی میں جائز معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ مبیع بھی وصول ہوجاتی ہے، اور ثمن واجل دونوں متعین ہیں، اور جب کسی قسم کی جہالت نہ رہے تو عقد مکمل ہونے میں کوئی مانع نہیں، مدت میں زیادتی کی وجہ سے ثمن کی زیادتی ظاہر ہے (لأن الثمن قد يزاد لمكان الأجل) (بدائع) اور بیع میں ثمن کی قسط وار ادائیگی کی اجازت فقہاء نے دی ہے (در علی الرد ۴/ ۲۶)۔

پس اگر ایک معاملہ پر مجلس عقد میں اتفاق ہوگیا تو عقد درست ہوجائے گا، یہی رائے شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کی بھی ہے، جیسا کہ گزر چکا۔

۶- مذکورہ شکل میں اجل کی جہالت کی وجہ سے بیع فاسد ہوجائے گی، ظاہر ہے کہ عقد پورا ہوتے وقت عاقدین میں سے کسی کو یہ علم نہیں ہوتا کہ بیع کتنے ثمن پر منعقد ہوئی ہے۔

''ولا يصح التأجيل إلى أجل مجهول متفاحش'' (مجمع الانہر ۲/ ۸۳)، اجل مجہول رکھ کر ادھار کرنا صحیح نہیں ہے۔

دوسرے سبھی ائمہ کی بھی یہی رائے ہے:

''وهو أيضا باطل وهو قول جمهور، لأنه لم يجزم له بيع واحد'' (المغنی ۴/ ۱۶۱)، صورت بیع کا جزم نہ ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہوگی۔

۷- اصول کی روشنی میں یہ بیع قطعاً درست معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ مزید رقم جو بائع کو مل رہی ہے بے بدل ہے، اور کسی عقد کے ذیل میں بے بدل رقم کو ربا کہا جاتا ہے۔

۸- بیع کی مذکورہ صورت قطعا درست نہیں ہوسکتی اس لیے کہ نہ اجل متعین ہے نہ ثمن۔

"وجهالة الثمن تمنع صحة البيع" (بدائع ۵/۱۵۸)، ثمن کی جہالت صحت بیع کے لیے مانع ہے۔

اور جہالت سے وہ جہالت مراد ہے، جو عقد کے وقت باقی رہے، ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

۹- (الف):......مرتہن کو مال مرہون سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، وہ صرف قابض ہے، اور اگر وہ کوئی فائدہ اٹھاتا ہے جس کی وجہ سے شی مرہون کو کوئی نقصان پہونچے تو اس کا ضمان اسی کے ذمہ ہوگا (البحر الرائق ۸/۲۷۱، ہندیہ ۵/۴۶۷)۔

علامہ نووی شافعی مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فليس للمرتهن أن يفعل ذلك بغير إذن الراهن" (المجموع ۱۳/۲۳۵)

مرتہن کے لیے شی مرہون میں راہن کی اجازت کے بغیر تصرف درست نہیں ہے۔

المدونۃ الکبریٰ میں امام مالکؒ کے مسلک کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"إذا باعه و ارتهن رهنا، واشترط منفعة الرهن إلى أجل قال مالك: لا أرى به بأسا في الدور والأرضين، قال مالك: وأكره في الحيوانات والثياب" (المدونۃ الکبری ۴/۱۶۳)۔

اگر بائع نے کوئی چیز بیچی اور ثمن کے بدلے خریدار سے کوئی رہن رکھ لیا اور دین وصول ہونے تک اس رہن سے نفع اٹھانے کی شرط بھی لگا دی تو امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مکانات اور زمینوں میں تو ایسا کرنا درست ہے، لیکن حیوانات اور کپڑوں میں میں مناسب نہیں سمجھتا۔

حنابلہ کا خیال ہے کہ اگر رہن دودھ یا سواری کا جانور ہو تو انصاف کا خیال رکھتے ہوئے مرتہن کو حق ہے کہ اس جانور پر خرچ کرے اور اپنے خرچ کے بقدر اس پر سواری کرے اور دودھ استعمال کرے، اور اگر رہن دودھ یا سواری کے جانور کے علاوہ کوئی اور چیز ہو، جیسے غلام اور باندی وغیرہ تو ایسی صورت میں ان کے نزدیک ظاہر مذہب یہ ہے کہ مرتہن کا اس پر خرچ کرنا اور اپنے خرچ کے بقدر اس سے خدمت لینا ناجائز ہے (المغنی ۴/۲۵۱)۔

(ب):......مسلک حنفی:......صورت مذکورہ میں اگر مال مرہون کی قیمت دین کے مساوی تھی تو گویا دین ادا ہوجائے گا، اور اگر کم بھی ہو تو مرتہن بقیہ کو راہن سے وصول کرے گا، اور اگر زائد ہو تو فاضل قیمت مرتہن راہن کو نہیں دے گا، اس لیے کہ وہ فاضل اس کے پاس امانت ہے۔

(ہدایہ علی الفتح ۱۰/۱۴۵، ہندیہ ۵/۴۴۷)۔

معلوم ہوا کہ حنفیہ مرتہن کو رہن کا ضامن گردانتے ہیں تاکہ راہن کا حرج نہ ہو، اور یہی رائے اس مسئلہ میں زیادہ صحیح اور حقوق کی حفاظت میں معین معلوم ہوتی ہے۔

جمہور کا مسلک:......جمہور کے یہاں مرتہن رہن رکھی ہوئی چیز کا امین ہے، لہٰذا اگر اس کی تعدی کے بغیر ضائع ہوجائے تو اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی اور وہ اپنا قرض راہن سے پورا پورا وصول کرے گا۔

"لا يضمن الرهن عند جمهور الفقهاء إذا هلك بلا تعد، ولا تقصير، وهو في يد المرتهن"

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۷۱، فتح العزیز علی المجموع ۱۰/۱۳۸، المدونۃ الکبری ۴/۱۵۲)۔

جمہور فقہاء کے نزدیک مرتہن رہن کا ضامن نہیں ہوگا اگر اس کی تعدی کے بغیر شی مرہون ہلاک ہوجائے۔

(ج):......مذکورہ صورت میں راہن کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ رہن رکھی ہوئی چیز کو فروخت کر کے قرض ادا کرے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو قاضی اسے بیچ کر قیمت وصول کرے گا، اور وہ مرتہن کو ادا کردے گا، مرتہن کو بذات خود رہن رکھی ہوئی چیز بیچ کر اپنا حق وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے (بدائع ۸/۱۴۸)۔

دوسرے ائمہ کرام کا بھی یہی مسلک ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۷۶)۔

۱۰- اس صورت میں بائع اپنے فروخت کردہ سامان کو مکمل قیمت وصول ہونے تک روک سکتا ہے۔

الف:......فروخت شدہ سامان کو رہن بنانے کی شکل تو یہاں درست نہ ہوگی، اگر خریدار سامان کو ثمن کی جگہ فروخت کرنے والے کے پاس رہن رکھ دے یا وہ خود ہی رہن بنالے تو عقد ختم ہوجائے گا (ہندیہ ۴/۱۳)۔

ب:......یہ سامان کو روکے رکھنے کی شکل "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" کے قبیل سے ہوگی، اگر ثمن کا ادنی حصہ بھی ادائیگی سے رہ گیا ہے اور عقد معجّل پر ہوا تھا

تو بائع اسے وصول کرنے کے لیے سامان روک سکتا ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے (شامی ۴/۷۴، نیز دیکھئے ہندیہ ۳/۱۵)۔

۱۱- بیع کی یہ صورت متقدمین کی کتب میں نظر نہیں آتی، البتہ اسے اپنی ہیئت کے اعتبار سے بیع عربون پر قیاس کیا جاسکتا ہے، جس میں شکل یہ ہوتی ہے کہ اگر ابتدائی گفتگو ہوجانے کے بعد خریدار سودا نہ لے تو بیعانہ جو اس نے اپنی بات مضبوط کرنے کے لیے بطور ضمان دیا تھا بائع کا ہوجاتا ہے، امام احمدؒ کے علاوہ ائمہ کرام میں کسی کے یہاں یہ صورت درست نہیں ہے (المغنی ۴/۱۶۰)۔

۱۲- اگر خریدار خود اس پر قبضہ کر لینے کے بعد اسے بائع کے پاس بطور رہن رکھ دے اور بائع اس پر بحیثیت مرتہن قبضہ کرکے امانۃً خریدار کو دے دے تو درست ہے، لیکن اگر خریدار نے سامان پر قبضہ ہی نہیں کیا تو غیر مقبوض کو رہن رکھنا درست نہیں، اور اسی طرح مرتہن قبضہ کیے بغیر اسے امانۃً راہن کے حوالے کر دے تو یہ بھی صحیح نہیں۔

''إذا قبضه المرتهن، أو العدل ثم تراضيا على أن يكون في يد الراهن ووضعه في يده جاز، لأن القبض الصحيح قد وجد'' (بدائع ۶/۱۳۷)۔

جب مرتہن یا اس کی طرف سے کوئی عادل شخص شئ مرہون پر قابض ہوگیا پھر راہن و مرہون اس پر رضامند ہوگئے کہ مرہون راہن ہی کے قبضہ میں رہے، اور راہن کے قبضہ میں شئ مرہون دے دی جائے تو جائز ہے، اس لیے کہ عقد کی درستگی کے لیے جس قبضہ کی جو شرط تھی وہ پوری ہوچکی۔

۱۳- اسلام میں کفالہ عقد تبرع ہے اور انسان کے ساتھ تعاون و ہمدردی کے جذبہ سے کیا جاتا ہے (مجمع الانہر ۲/۱۲۴)۔

اگر مجبوری میں دائن کفالہ پر اجرت دینے پر مجبور ہو تو فقہاء کرام نے اس کی اجازت دی ہے لیکن ایسا کوئی کاروبار کرنا کہ کفالہ پر اجرت لی جائے درست نہیں۔

۱۴- اس صورت میں دستاویز خریدنے والے شخص کو نہ تو اصل سودے کا خریدار کہا جاسکتا ہے، اور نہ اس دستاویز کو اتنا قیمتی قرار دیا جاسکتا ہے جتنی مالیت کم کر کے دستاویز کو فروخت کیا گیا ہے۔ یہ اس دستاویز میں لکھی ہوئی رقم کو مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کم قیمت میں فروخت کرنا ہے، اور ایک رقم کو مزید رقم کے عوض تاخیر کا فائدہ اٹھا کر بیچنا یہی اصل ربا ہے، لہذا یہ شکل قطعاً حرام ہوگی۔

۱۵- مذکورہ صورت میں چونکہ مشتری تاجیل کا بدل بائع سے وصول کرتا ہے، اس لیے یہ صورت بھی درست نہیں ہوسکتی۔ علامہ ابن قدامہؒ نے اس کے عدم جواز کی تصریح کی ہے، لیکن اگر بلا عقد کے عاقدین کی طرف سے اپنے حق سے دستبرداری بطور تبرع ہو تو جواز ہوسکتا ہے (المغنی ۴/۳۱۶)۔

۱۶- مذکورہ صورت میں اگرچہ اجل کا صراحتاً تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن عاقدین کے ذہن میں تاجیل ہی کا تصور تھا، اس لیے بیع درست ہوجائے گی، اور اس سے اجل عرفی مراد ہوگی (درر الحکام ۱/۲۳۱)۔

اور نقد و فوری لین دین کی شکل میں ''المغنی'' کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اجل کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے، بلکہ اسی وقت جتنی قیمت پر تراضی ہوجائے عقد مانا جائے گا، گویا گزشتہ عقد ہوا ہی نہیں تھا۔ اصل یہی عقد ہوگا۔ لہذا جواز ہونا چاہیے، فساد وصف کی وجہ سے آیا تھا جو دور ہوگیا (المغنی ۴/۳۱۶)۔

۱۷- مذکورہ شکل میں فروخت کرنے والے کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ خریدار سے فوری ادائیگی کا مطالبہ کرے اس لیے کہ درحقیقت یہاں مقررہ قیمت میں تاجیل ہوئی ہی نہیں ہے (درر الحکام)۔

۱۸- اگر مدت مقررہ کی آمد سے پہلے قرض دینے والے کی وفات ہوجائے تو معاملہ کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس لیے کہ مدت مقررہ کی آمد سے پہلے مہلت سے جس ذات کو فائدہ پہنچ رہا تھا وہ باقی ہے، اس کی مدت پوری کی جائے گی، لیکن اگر خریدار کا انتقال ہوجائے تو مہلت ختم ہوجائے گی، اور اس کے ترکہ سے فوراً ثمن وصول کیا جائے گا (حوالہ سابق ص ۳۳۰-۳۳۱، نیز رد المحتار ۴/۲۶)۔

۱۹- انعام دینے کی یہ صورت، تجارت کو فروغ دینے کے لیے اختیار کی جاتی ہے، اس میں چونکہ مشتری جس سامان کے لیے قسطیں جمع کرتا ہے، وہ سامان اسے حاصل ہوجاتا ہے اور بازار کی عام قیمت ہی میں ملتا ہے، مزید انعام کمپنی اپنی آمدنی کے تناسب سے گاہکوں کو راغب کرنے کے لیے دیتی ہے، خریدنے والوں کی قسط جمع کرتے ہوئے اصل نیت بھی سودا لینے کی ہوتی ہے نہ کہ انعام حاصل کرنے کی، اس لیے اس میں قمار کا شائبہ کم ہی ہے۔

قسطوں پر خرید وفروخت کا معاملہ

مولانا محمد عمر بن یوسف فلاحی

۱- چاروں مسالک کے فقہاء کرام کی تحریروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اجل (ادھار) کے طور پر کسی چیز کا فروخت کرنا اس چیز کی قیمت میں اضافہ کا سبب بن سکتا ہے کیوں کہ اجل ایک ایسا وصف ہے جس کی بنا پر قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے۔
(تحفۃ المحتاج علی حواشی الشروانی ۴/ ۲۹۷، بدائع الصنائع ۵/ ۲۲۴، مقدمات ابن رشد علی المدونہ ۳/ ۳۲۸، المغنی ۴/ ۲۱)۔

۲- حنفیہ اور شافعیہ کے اقوال سے اس امر پر روشنی پڑ رہی ہے کہ اگر خریدار اپنی تنگدستی کی بنا پر یا اس ترقی یافتہ دور میں جہاں ہاتھوں ہاتھ لاکھوں اور کروڑوں کی مالیت کا لین دین رائج ہے اور یکمشت اتنی بڑی رقم ادا کرنے میں بسا اوقات قانونی اعتبار سے بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یکمشت رقم ادا کرنے کے بجائے متعدد متعین قسطوں میں رقم ادا کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔
(فتح العزیز علی المجموع ۹/ ۲۴۰، البحر الرائق ۵/ ۲۸۰، شامی ۴/ ۲۶)۔

۳- ائمہ اربعہ کی عبارتوں پر غور کرنے سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ سوال میں تحریر کردہ صورت کے عدم جواز کی اصل علت مبیع (سامان) کی متعین قیمت کا معلوم نہ ہونا ہے، لہٰذا اگر کوئی عقد ہی میں قیمت کی اس جہالت کو دور کردے اور کسی ایک صورت کو متعین کردے تو پھر اس عقد کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۸، حواشی الشروانی وابن القاسم ۴/ ۲۹۴، بدایۃ المجتہد ۲/ ۱۵۴، المغنی ۴/ ۱۶۱)۔

۴- سوال سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ فروخت کرنے والا (بائع) نقد وادھار فروختگی میں قیمتوں میں جو فرق ہے اس کو خریدار کے سامنے بیان نہیں کرتا بلکہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، وہ نقد کے مقابلہ میں ادھار فروختگی کی صورت میں زیادہ قیمت وصول کرتا ہے تو بائع کا اس طرح کرنا درست ہے، اور یہ ربا کے دائرہ میں نہیں آئے گا، کیوں کہ اجل جس کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کر رہا ہے ایک ایسا وصف ہے جس کو قیمتوں کی کمی زیادتی میں بڑا دخل ہے، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہوا۔

۵- مذکورہ صورت سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ بائع مشتری کے سامنے دونوں صورتوں کو بیان کر رہا ہے، اگر معاملہ یونہی متعین کیے بغیر طے ہوا تو یہ درست نہیں، ہاں! اگر دونوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو دونوں آپس میں طے کر لیتے ہیں تو پھر اس طرح یہ معاملہ درست ہوگا۔ کیوں کہ عدم جواز کی صورت میں ثمن میں جو جہالت تھی تعیین صورت کے بعد وہ جہالت ختم ہوجاتی ہے، اور قیمت متعین ہوجاتی ہے، اس لیے یہ عقد درست ہوگا اور اس عقد کی درستگی میں بھی تقریباً تمام فقہاء متفق ہیں۔

۶- چاروں مذاہب کے فقہاء کی عبارتوں سے اس مسئلہ کی وضاحت ہوتی ہے کہ ثمن مبیع یا قرض کی صورت میں پہلے ہی شرط لگانا کہ فلاں وقت تک ثمن یا قرض ادا نہیں کیا تو اتنی رقم زائد ادا کرنی ہوگی، یہ صورت وہی ہے جس کو زمانہ جاہلیت میں لوگ اپناتے تھے، ان ہی غلط رواج ورسومات کو ختم کرنے کے لیے اور حقیقی دین کی اشاعت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا تھا، اور آپ نے حق کی تبلیغ کو کما حقہ ادا فرمایا، لیکن آج پھر اس طرح کے رواج اور معاملات معاشرہ میں نظر آرہے ہیں، اس لیے آج ایسے معاملات کرنے والوں کو سمجھا بجھا کر ان معاملات سے باز رہنے کی ہدایت دیں تاکہ وہ بھی ایسے صریح خلاف شرع کاموں کے مرتکب نہ ہوں۔ (دیکھئے: فقہ السنۃ ۳/ ۱۳۵، فتح العزیز علی المجموع ۸/ ۱۶۲، تحفۃ علی حواشی ۴/ ۲۷۲، رد المحتار ۴/ ۱۹۷، مقدمات ابن رشد علی المدونۃ ۳/ ۱۸، اعلام الموقعین ۲/ ۱۳۵)۔

۷- جیسا کہ سوال سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی ایک صورت پر معاملہ طے ہوا، اب مزید یہ شرط لگانا کہ وقت مقررہ پر جملہ رقم یا قسط ادا نہ ہوئی تو اصل قیمت سے زائد رقم ادا کرنی ہوگی، شرط فاسد کی قبیل سے ہے، اور یہ صریح ربا کے حکم میں ہوگا۔

۸- الف: فقہاء مذاہب اربعہ کے اقوال پر غور کرنے سے یہ بات قدرے مشترک نظر آتی ہے کہ اگر راہن مرتہن کو مال مرہون سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے تو درست ہے ورنہ نہیں (دیکھئے: المجموع شرح المہذب ۱۳/ ۲۳۵، رد المحتار ۵/ ۳۴۳، المدونۃ الکبری ۴/ ۱۶۳، المغنی ۴/ ۲۵۰ اور بعد کے

صفحات، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵ / ۲۵۹)۔

لیکن انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ مرتہن وقت مقررہ پر اپنا پورا سرمایہ وصول کرے گا، اب مدت رہن میں اس کو مال مرہون سے بھی فائدہ کی اجازت دے دی جائے تو یہ فائدہ اٹھانا ربا وسود ہے، کیونکہ مرتہن نے اپنا سرمایہ تو بغیر کسی نقصان کے مکمل وصول کرلیا، مزید مال مرہون سے بھی فائدہ اٹھایا، یہ بغیر کسی عوض کے ہے۔ اگر موجودہ حالات میں ربا سے بچنا بھی چاہے تو ممکن ہی نہیں، ایسی صورت حال میں اس طرح صریح مال مرہون سے انتفاع کی اجازت دی جائے تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس لیے گرچہ فقہاء کی عبارات سے انتفاع کا جواز مستفاد ہوتا ہے لیکن احتیاطاً اور سد باب کے طور پر صریح انتفاع کی اجازت نہ دی جائے تو مناسب ہوگا۔ جبکہ بعض فقہاء نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے، صاحب فقہ السنہ کا بھی یہی خیال ہے اور علامہ ابن عابدین شامی کے کلام سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ احتیاطاً اسی صورت عدم جواز کو اختیار کرنا چاہیے (الدر المختار ۵ / ۳۴۳)۔

(ب):...... اس مسئلہ میں شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ: مال مرہون مرتہن کے پاس بطور امانت ہے، لہذا اگر مرتہن کی کسی زیادتی وتعدی کے بغیر ہلاک ہوا تو مرتہن پر اس کا ضمان نہیں ہوگا، اور مکمل دین خریدار (راہن) کے ذمہ باقی رہے گا

(فتح العزیز علی المجموع ۱۰ / ۱۳۸، المدونۃ الکبری ۴ / ۱۵۲، المغنی ۴ / ۲۵۷)۔

اس سلسلہ میں حنفی نقطہ نظر یہ ہے کہ مال مرہون مرتہن کے قبضہ میں بطور ضمانت کے ہے، لہذا اگر مرتہن کے قبضہ میں مال مرہون ہلاک ہوا تو دین میں سے مال مرہون کے بقدر منہا کیا جائے گا (فتاوی ہندیہ ۵ / ۴۴۸)۔

(ج):...... فقہائے شوافع مذکورہ صورت میں اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ایسی ہی صورت حال پیش آئی تو معاملہ کو قاضی کے سامنے پیش کرے قاضی خریدار کو دین ادا کرنے پر مجبور کرے گا، یا مال مرہون کے بیچنے پر، اس کے بعد بھی اگر خریدار اپنے قول پر مصر رہے تو مال مرہون کو بیچ کر اس سے مرتہن کا دین ادا کرے گا (فتح العزیز علی المجموع ۱۰ / ۱۲۷ وما بعدہا)۔

اس سلسلہ میں احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قاضی مال مرہون کو ادائیگی دین کے لیے بیچ سکتا ہے، البتہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا کہنا ہے کہ قاضی مال مرہون کو راہن کی اجازت کے بغیر فروخت نہیں کرسکتا، جبکہ صاحبینؒ کا خیال ہے کہ قاضی راہن کی اجازت کے بغیر بھی مال مرہون کو فروخت کرسکتا ہے، اور شامی وغیرہ نے صاحبین کے قول ہی کو مفتی بہ قرار دیا ہے (الدر المختار ۵ / ۳۵۷)۔

اس سلسلہ میں فقہاء مالکیہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے کہ قاضی کو مال مرہون بیچنے کا اختیار حاصل ہے (المدونۃ الکبری ۴ / ۱۵۶)۔

اسی طرح حنابلہ بھی اس مسئلہ میں جمہور فقہاء کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں (المغنی ۴ / ۲۶۲)۔

۹- حنفیہ اور شافعیہ دونوں ہی کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عاقدین نے آپس میں کوئی معاملہ کیا، لیکن بائع کو مشتری کے بارے میں اندیشہ ہوا کہ اگر مبیع اس کے سپرد کردی تو یہ قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرے گا، اور آج کل فساد زمانہ کی بنا پر ان امور کا پیش آنا کوئی بعید نہیں، تو ایسی صورت حال میں مبیع کے ضائع ہونے کے خوف سے ثمن کی ادائیگی تک بائع کو مبیع کو اپنے ہی پاس روک کے رکھنے کا حق دیے جانے میں کوئی قباحت نہیں۔

(تحفۃ المحتاج علی حواشی الشروانی ۴ / ۴۲۳، بدائع الصنائع ۵ / ۲۴۹، رد المحتار ۴ / ۴۷)

۱۰- اس مسئلہ میں علمائے شوافع کا خیال یہ ہے کہ بائع نے جن اقساط پر قبضہ کیا ان اقساط کا واپس کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ مبیع کو بائع نے روک کے رکھا تھا اب مکمل اقساط نہ ادا کرنے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے طے شدہ معاملہ ختم ہورہا ہے، تو مبیع بعینہ بائع کے پاس موجود ہے۔ اب اگر مزید جو اقساط حاصل کی ہیں ان کو بھی اپنے پاس روک کے رکھتا ہے تو یہ رقم بغیر کسی عوض کے اس کے پاس آئی، ہے اور یہ بعینہ ربا وسود ہے، لہذا جو رقم وصول کی ہے وہ مشتری کو واپس کردے، ورنہ سود کے حکم میں ہوگی، جو کہ حرام ہے، یہ وہی صورت ہے جس کو احادیث میں بیع عربون سے تعبیر کیا جاتا ہے (تحفۃ المحتاج علی حواشی ۴ / ۳۲۲)۔

اس سلسلہ میں فقہاء مالکیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ "أکل أموال الناس بالباطل" (لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانا) کے قبیل سے ہے۔

(شرح کبیر علی حاشیہ الدسوقی ۳ / ۶۳)

امام احمدؒ اس مسئلہ میں دیگر فقہاء کے خلاف اس صورت کے جواز کے قائل ہیں (المغنی ۴ / ۱۶۰)۔

مذکورہ صورت کا حکم صراحۃ احناف کی کتب فقہ میں نہیں مل سکا۔ لیکن اصول اور بعض عبارتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فقہاء احناف بھی اس صورت کے عدم جواز کے قائل ہوں گے، اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت کے جواز کی اجازت نہ دی جائے، کیونکہ اس سے بھی ناحق لوگوں کا مال ہڑپ کرنے

دروازہ کھل جائے گا، اور کمزور طبقہ کے لوگوں کو جو کسی مجبوری کی بناء پر مبیع نہ لے سکیں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے عام معتدل حالات میں اس کے جواز کی اجازت نہ دینی چاہیے۔

۱۱- اس سلسلے میں حنفیہ اور شافعیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر مرتہن مال مرہون پر قبضہ کیے بغیر کسی دوسرے کے پاس یا خود راہن کے پاس بطور رہن رکھنا چاہے تو درست نہیں۔ گویا مرتہن کا قبضہ عقد رہن کی تمامیت کے لیے شرط ہے، اگر راہن کے پاس ہی مال مرہون کو رکھنا چاہتا ہے تو اس کے جواز کی صورت یہ ہے کہ پہلے خود مال مرہون پر قبضہ کرلے، پھر وہ مال راہن کے پاس بطور رہن رکھے (تحفۃ المحتاج علی حواشی ۵ / ۶۷ وما بعدہا، بدائع الصنائع ۶ / ۱۴۳)۔

۱۲- اگر سوال میں مذکور صورت سے مراد گارنٹی وضمانت کے لیے آج کل اداروں واشخاص کی طرف سے معاوضہ واجرت لینے کا رواج ہے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک اجرت لینا اور دوسرے اجرت دینا، تو جہاں تک اس ضمانت وکفالت پر اجرت دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو ایسی ضرورت پیش آئے جو ایسے ہی اشخاص کی ضمانت سے پوری ہو سکتی ہو جو معاوضہ لیتے ہوں اور وہ اس کو پورا کرنے پر مجبور ہو نیز شرعاً ضمانت لینے والے جن سے وہ ضرورت پوری ہو سکے نہ مل رہے ہوں تو اب مجبوراً اجرت دے کر اس ضرورت کو پورا کرانے میں کوئی حرج نہیں، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ رشوت تو حرام ہے، لیکن اپنے جائز حق کو وصول کرنے کے لیے ضرورۃً رشوت دینے میں کوئی حرج نہیں، اور جہاں تک اس ضمانت پر اجرت لینے کا تعلق ہے تو اصول کی روشنی میں یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس پر اجرت لینا درست نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ نفس ضمانت وکفالت ایک عقد تبرع ہے، کسی کا ضامن بننا گویا امر خیر پر اس کی اعانت کرنا ہے، اسی لیے کفالہ کے بیان میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص مکفول عنہ کی اجازت کے بغیر کفیل بنے، اور وہ اس مقروض کا قرضہ ادا کرے تو اس کو اس مقروض سے اصل قرض کے مطالبہ کا حق نہیں ہے، اس لیے کہ یہ عقد تبرع ہے، لہٰذا مناسب یہی ہے ایسے اشخاص کو محض نفس ضمانت وکفالت پر اجرت ومعاوضہ نہیں لینا چاہیے۔

۱۳- یہ صورت شرعاً درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس صورت میں گویا ثمن (نقد) کی بیع اپنے ہی جنس (نقد) کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ اموال ربویہ میں جب ہم جنس کے ساتھ بیع ہو رہی ہو تو تفاضل ونسأ (ادھار) حرام ہوتا ہے۔ اور مذکورہ صورت میں تقریباً دونوں ممنوعات کا ارتکاب لازم آ رہا ہے، بایں طور کہ تفاضل تو ظاہر ہی ہے کہ اس دستاویز میں تحریر کردہ رقم سے کم میں فروخت کر رہا ہے، اور ادھار کا ارتکاب بایں طور کہ بیچنے والے نے فوری طور پر رقم حاصل کرلی۔ لیکن خریدار کو دستاویز کی رقم ابھی نہیں ملی، بلکہ وہ تو جب وقت مقرر آئے گا اس وقت حاصل ہوگی، اس صورت حال کے پیش نظر مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دستاویزات کی خرید وفروخت درست نہیں ہونی چاہیے، اور اس میں فقہاء احناف وشوافع سب کے سب عدم جواز کے قائل نظر آتے ہیں۔ (رد المحتار ۴ / ۲۶۱، المجموع شرح المہذب ۹ / ۳۰۴)۔

۱۴- "ضع وتعجل" والی صورت اختیار کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ رقم میں جو کمی ہو رہی ہے وہ محض اجل کے کم کرنے کی بنا پر ہو رہی ہے، اب یہاں پر کسی کو شبہ نہ ہو کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اجل کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو یہاں پر اجل کے کم کرنے کی بنا پر قیمت میں کمی کی جائے تو کیا حرج ہے؟
اس لیے کہ ماقبل میں اجل کی بنا پر قیمتوں میں جو اضافہ ہوتا تھا وہ اصالۃً اجل کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ اصل وہاں مبیع تھی، لیکن جہاں سامان اصل نہ بن رہا ہو تو وہاں محض اجل کی وجہ سے ثمن میں اضافہ یا کمی نہیں کر سکتے، لہٰذا مذکورہ صورت میں کمی جو ہو رہی ہے وہ خالص اجل کے مقابلہ میں ہے، اس لیے اس طرح کرنا درست نہیں ہے (اس سلسلہ میں شافعیہ اور حنفیہ کے نقطہ نظر کے لیے دیکھئے: تحفۃ المحتاج علی حواشی ۵ / ۱۹۲، التعلیق الممجد علی موطا امام محمد ۳ / ۲۰۲)۔

۱۵- سوال سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ادھار معاملہ اجل متعین کیے بغیر ہوا ہے، اب اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو مجلس ہی میں جہالت کو ختم کرے تو عقد درست ہوگا یا اسی جہالت اجل کو باقی رکھ کر مجلس سے جدا ہو جائے، اگر مجلس ہی میں اس جہالت کو ختم کرے تو عقد درست ہوگا۔ لیکن بظاہر یہ صورت یہاں جوڑ نہیں کھاتی، بلکہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح اجل کو مجہول رکھ کر بائع ومشتری دونوں جدا ہو گئے، بعد میں ملاقات ہوئی تو یہ صورت اختیار کی تو اس صورت کے جائز ہونے میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ جہالت اجل کی بناء پر پہلا عقد فساد کے مؤکد ہونے کی وجہ سے فاسد ہو گیا، اب بعد میں ملاقات کے وقت یہ کہے کہ اس معاملہ کو نقد ہی پورا کرلو بایں طور کہ پہلے طے شدہ رقم میں سے کچھ کم کر کے دے دو، تو یہ صورت "ضع وتعجل" کی نہیں ہوگی، کیونکہ پہلے جو عقد ہوا تھا وہ عقد جہالت اجل کی بناء پر فاسد ہو گیا، بعد میں جو گفتگو ہوئی وہ گویا مستقل نیا عقد ہوا، اور یہ سمجھا جائے گا اب دوسرے وقت معاملہ ہی اتنی کم قیمت پر طے ہوا، اگر پہلا عقد درست ہوا ہوتا اور بعد میں اس طرح کہہ کر رقم میں کمی کی جاتی تو "ضع وتعجل" کی صورت ہو سکتی تھی، لیکن یہاں بظاہر یہ صورت دشوار ہے، لہٰذا یہ عقد درست ہونا چاہیے (رد المحتار ۴ / ۱۴۴)۔

۱۶- یہ مطالبہ درست ہے، کیوں کہ قسط وار ثمن کو مقرر کرنے سے وہ مؤجل نہیں ہو جاتی ہے، بلکہ ہر وقت بائع مکمل قیمت کے مطالبہ کا حق رکھتا ہے، لہذا یہ حق مطالبہ درست ہونا چاہیے، یہی رائے حنفیہ وشوافع دونوں کی ہے (دیکھئے: کتاب الام ۳/ ۳۳، الدر علی الرد ۴/ ۲۶)۔

۱۷- حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک دائن کی موت سے اصل عقد ختم نہیں ہوگا، بلکہ وہی عقد ورثاء سے متعلق ہو جائے گا، لیکن مدیون (مشتری) کے مرنے سے اصل عقد ہی ختم ہو جائے گا (دیکھئے: تحفۃ المحتاج علی حواشی الشروانی ۴/ ۲۹۷، ردالمحتار ۴/ ۲۶، درر الحکام ۱/ ۲۲۸)۔

۱۸- جو صورت اختیار کی گئی ہے اس میں یہ ہوتا ہے کہ مبیع بھی متعین ہوتی ہے اور اس کی قیمت بھی متعین ہوتی ہے، لیکن کوئی نئی دکان کھل گئی ہو، یا کسی نئی کمپنی کا وجود ہوا ہو۔ تو دکاندار اور کمپنی والا اپنی اشیاء کی زیادہ سے زیادہ فروخت کے لیے اس طرح کے انعام کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس مقصد سے کوئی تاجر ایک متعین مدت پر اپنی طرف سے انعام کا اعلان کر دے تو یہ گویا بائع کا اپنی طرف سے مبیع میں اضافہ کرنا ہے، اور اس میں بائع کو اختیار ہے کہ جیسے چاہے وہ زائد شی دے یا نہ دے۔ نیز اس طرح کی صورت سے نفع کم اور بکری زیادہ ہوتی ہے، اس کو قمار وغیرہ کے تحت نہیں داخل کر سکتے، کیونکہ قمار نام ہے مستور العاقبت کا اور اس صورت میں مبیع وثمن تو متعین ہی ہے بلکہ انعام ملنے والی چیز کا بھی اعلان ہوتا ہے، کچھ بھی مستور العاقبت نہیں، اس پہلو سے غور کرنے کی بنا پر اس صورت کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے، ظاہر ہے کہ اس صورت کا اصل کتب فقہ میں مذکور ہونا مشکل ہے، اس لیے ایسی صورتوں کا حکم دیگر چیزوں پر قیاس کر کے ہی لگانا ممکن ہے۔

۱۹- بظاہر یہ معاملہ درست نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ مبیع کی قیمت کا علم عقد کے وقت تو ممکن ہی نہیں، حالاں کہ ثمن معلوم ہونا چاہیے، نیز کس خریدار کو کب ملے گی؟ یہ بھی کوئی متعین نہیں، اس اعتبار سے اجل مجہول ہے (الدر علی الرد ۴/ ۲۳)۔

لیکن اسی کو دیکھ کر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ جس جہالت کی بنا پر عدم جواز کا حکم لگ رہا تھا اس جہالت کو بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ جہالت متفاحشہ ہے یا جہالت یسیرہ، اور انعقاد بیع کے لیے مانع جہالت متفاحشہ ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ مفضی الی النزاع ہوتی ہے، نیز بائع ومشتری دونوں اس عقد پر راضی ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ باہمی رضامندی کو معاملات وعقود میں بڑا دخل ہے۔ اس پہلو سے مذکورہ صورت کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں جو جہالت ہے وہ جہالت کوئی مفضی الی النزاع نہیں ہوتی، کیونکہ اس طرح کا ایک عام عرف بن گیا ہے، نیز بائع ومشتری تو بہر صورت رضامند ہیں، اس اعتبار سے عدم جواز کیلئے جو علت تھی وہ باقی نہیں رہتی۔ لہذا باہمی رضامندی اور جہالت یسیرہ کو دیکھ کر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت کے جواز میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے (ردالمحتار ۴/ ۱۳)۔

☆☆☆

جدید فقہی تحقیقات

تیسرا باب: مختصر تحریریں

بیع بالتقسیط کا شرعی حکم

مفتی شیر علی، گجرات

۱- بیع نسیہ تعیین اجل وشرائط صحت کے ساتھ جائز ہے۔

"ویجوز البیع بثمن حال و مؤجل إذا کان الأجل معلوما لإطلاق قوله تعالى: أحل الله البيع، وعنه عليه السلام أنه اشترى من يهودى طعاما إلى أجل ورهنه درعه"۔

اور جواز کی صورت میں بمقابلہ نقد بیع ثمن میں زیادتی بھی جائز ہے۔ "ألا يرى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل" (ہدایہ ۳/۲۱)۔

۲- قسط وار ثمن کی ادائیگی ادھار بیع کی صورت میں جائز ہے، بشرطیکہ وقت اداء متعین کیا جائے خواہ یکمشت ہو، خواہ متفرق اوقات میں ہو۔

"ولو قال: کلما دخل نجم ولم تؤد، فالمال حال، صح ويصير المال حالا في حيل شمس الائمة الحلوانی" (خلاصۃ الفتاوی ۳/۵۴)۔

۳- بائع نے یوں کہا کہ یہ گاڑی نقد دولاکھ اور ادھار سوا دولاکھ میں فروخت کرتا ہوں تو مشتری نے کہا کہ میں نے سوا دولاکھ ثمن پر ادھار خرید لیا تو یہ جائز ہوگا، بائع کا نقد ثمن ذکر کرنا تو صرف مشتری کو بتانے کے لیے ہے، اگر آپ نقد خرید رہے ہیں تو اس کا ثمن یہ ہے، باقی مشتری کے ادھار خریدنے میں نقد ثمن کے ذکر کرنے کو کوئی دخل نہیں۔

۴- صورت مسئولہ ربا کے دائرے میں نہیں آتی بلکہ جائز ہے۔

زیادتی قیمت بعوض مدت اصالۃً جائز نہیں ہے، اور ضمناً جائز ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سائل کو یہ شبہ ربا "ہدایہ" کی اس عبارت سے ہوا ہے۔

"وذلك اعتياض عن الأجل وهو حرام" (کتاب الصلح ۳/۲۵۱)۔

حالاں کہ حرمت زیادتی عبارت مذکورہ میں اس وجہ سے ہے کہ وہ بعض وقت اصالۃً ہے، اور سوال نامہ کی ذکر کردہ صورت میں زیادتی ضمناً ہے، اور بعض چیزوں کا معاوضہ لینا براہ راست جائز نہیں ہوتا، اور کسی دوسرے کے ضمن میں جائز ہوجاتا ہے، اس کی بہت سی نظیریں ہیں: ایک نظیر یہ ہے کہ ہر مکان، دوکان اور زمین کی قیمت پر اس کے محل وقوع اور پڑوس کا بڑا اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی قیمت میں نمایاں امتیازات ہوتے ہیں، ایک محلہ میں ایک مکان دس ہزار روپے کا ہے تو وسط شہر میں بالکل اسی طرح کا اور اتنے ہی رقبہ کا مکان ایک لاکھ میں بھی سستا سمجھا جاتا ہے، قیمت کی زیادتی ظاہر ہے کہ مکان کی ذات کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اس کی خاص کیفیت اور محل وقوع کے اعتبار سے ہے، اور جب کوئی آدمی یہ مکان بیچتا ہے یا خریدتا ہے تو اس کی یہ کیفیت بھی فروخت ہوجاتی ہے، اور قیمت کی جتنی زیادتی ہے وہ اسی کیفیت کے مقابلہ میں ہے، حالانکہ یہ کیفیت وصفت کوئی مال نہیں جس کا معاوضہ لیا جائے، مگر مکان یا زمین کی بیع کے ضمن میں اس کی کیفیت وصفت کا معاوضہ بھی شامل ہوکر جائز ہوجاتا ہے۔

۵- بیع کی یہ صورت بھی جائز ہے، اس لیے کہ جب نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بناء پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز ہے، اس لیے کہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، لہذا یہ بھی سوال ۳ کی طرح جائز ہے۔

۶- یہ صورت سود میں داخل ہے، مثلاً بائع یوں کہے کہ یہ سامان تم کو ۱۰۰ روپے میں نقد فروخت کرتا ہوں، لیکن تم نے اگر ایک ماہ تک یا جو بھی مدت مقرر کرے قیمت ادا نہ کی تو تمہیں مزید ۲۵/ روپے دینے ہوں گے، یہاں چونکہ براہ راست مدت کے عوض قیمت لی جارہی ہے، اس لیے اس کے ربا ہونے میں نہ

کوئی شبہ ہے اور نہ ہی کسی کا اختلاف ہے (دیکھئے: ہدایہ ۳/۲۵۱ تفسیر کبیر ۷/۹۱)۔

۷- مبیع کی یہ صورت بھی ربا میں داخل ہے، اور یہ بھی قمار کی ایک قسم ہے، صرف نام بدلنے سے قمار تاوان یا منافع نہیں بن سکتا، اس لیے کہ یہ معلق بالشرط ہے، اور معلق بالشرط کے قمار ہونے میں کوئی شبہ نہیں، محض چولہ بدلنے سے کسی شئی کی حقیت نہیں بدلتی۔

۸- (الف)...... راہن کی اجازت کے بغیر شئی مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہے۔

''ولیس للمرتهن ان ينتفع بالرهن لا باستخدام ولا لبس ولا سكنى إلا أن يأذن له المالك، لأن له حق الحبس دون الانتفاع'' (کتاب الرہن، ہدایہ ۴/۵۲۲)۔

''ولا ينتفع المرتهن بالرهن استخداما وسكنى ولبسا وإجارة وإعارة، لأن الرهن يقتضي الحبس إلى أن يستوفي دينه دون الانتفاع، فلا يجوز الانتفاع إلا بتسليط منه وإن فعل كان متعديا ولا يبطل الرهن بالتعدي'' (البحر الرائق ۸/۲۳۸)۔

(ب)...... اگر مرتہن (بائع) کے قبضہ میں مال مرہون ہلاک ہوجائے تو مرتہن شئی مرہون کی قیمت اور دین میں سے اقل کا ضامن ہوگا، لہٰذا اگر شئی مرہون کی قیمت دین کے برابر ہو تو مرتہن اپنا حق وصول کرنے والا شمار ہوگا اور اگر شئی مرہون کی قیمت دین سے زائد ہو تو اپنے دین کے بقدر وصول کرنے والا ہوگا، اور زیادتی اس کے پاس امانت ہوگی، اور اگر شئی مرہون کی قیمت دین سے کم ہو تو اپنے دین سے شئی مرہون کی قیمت کے بقدر وصول کرنے والا ہوگا اور بقیہ دین راہن سے وصول کرے گا (البحر الرائق ۸/۲۳۳)۔

(ج)...... اگر مشتری وقت مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہوجائے تو پھر بائع مشتری کی اجازت سے شئی مرہون بیچ کر اپنا دین وصول کرسکتا ہے، اور اگر مشتری (راہن) اجازت نہ دے تو اس کی اجازت کے بغیر خود مرتہن کو شئی مرہون فروخت کرنے کا حق نہیں، البتہ قاضی کو مشتری (راہن) کی اجازت کے بغیر فروخت کرنے کا حق حاصل ہے، جبکہ راہن دین ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے (فتاوی تنقیح حامدیہ برحاشیہ فتاوی خیریہ ۲/۲۵۸-۲۵۹)۔

۹-(الف)...... رہن کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ پہلے مشتری مبیع پر قبضہ کرے، اس کے بعد بائع کے پاس رہن رکھے، صاحب کفایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ''لأن الثوب لما اشتراه وقبضه كان هو وسائر الأعيان المملوكة سواء في صحة الرهن''

(الکفایہ شرح الہدایہ علی ہامش فتح القدیر ۹/۹۹، شامی مطبوعہ بیروت کتاب الرہن ۱۰/۱۱۱)۔

۹- بیع بالتقسیط میں ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روکنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بیع بالتقسیط بیع موجل ہے، اور بائع کو استیفاء ثمن کے لیے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں ہوتا ہے، ادھار میں نہیں۔

''قال أصحابنا رحمهم الله تعالى: للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن إذا كان حالا كذا في المحيط، وإن كان مؤجلا فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده، كذا في المبسوط'' (عالمگیری مطبوعہ ۳/۱۵)۔

۱۰- قیمت کے لیے طے شدہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع کا سامان روکنا درست نہیں ہے، ادا کردہ اقساط کو واپس نہ کرنا بھی شرعا جائز نہیں ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

"يا ايها الذين آمنوا لا تاكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (سورہ النساء: ۲۹)۔

حدیث شریف میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عن أبي حرة الرقاشي عن عمه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا لا تظلموا، ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه'' (مشکوۃ/۲۵۵)

اور اس قاعدہ کی روشنی میں بھی اس کا عدم جواز ظاہر ہے:۔ "لا ضرر ولا ضرار" (قواعد الفقہ /ص ۱۰۶، قاعدہ/ ۲۵۲) (نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ خود نقصان اٹھاؤ)، یہاں مشتری کو ضرر ہورہا ہے

"العوض وجب رده إذا لم يسلم المعوض"۔ (قواعد الفقہ/ ۱۶۳)، قرآن واحادیث اور ان فقہی قواعد وضوابط کی روشنی میں اس کا عدم جواز محتاج بیان نہیں ہے، نیز یہاں شخص واحد کی ملک میں عوض ومعوض کا اجتماع لازم آتا ہے جو جائز نہیں ہے، اس لیے اس طرح کا معاملہ کرنا مسلمانوں کو شرعا جائز نہیں ہے۔

۱۱- یہ رہن صحیح نہیں، اس لیے کہ رہن کی صحت یہاں بیع کی صحت پر موقوف ہے، اور بیع تملیک شئی معوض کا نام ہے جبکہ صورت مسئولہ میں فقط تصرف

بلا تملیک ہے، رہن تو استیفاء ثمن واجب کا وثیقہ ہے، اور یہاں جب دین ہی ثابت نہیں ہوا تو رہن رکھنے کا کیا مطلب؟

''لأن الرهن وثيقة لجانب الاستيفاء وهو أن تكون موصلة إليه'' (ہدایہ ۴/۵۰۱)۔

جب بیع ہی صحیح نہیں ہوئی تو رہن کا کیا سوال؟

۱۲- ضمانت اور گارنٹی پر معاوضہ لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ عقد تبرع ہے، اور عقد تبرع پر کسی طرح کی اجرت اور معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔

رہا لیٹر آف کریڈٹ کا معاملہ تو اس کے جاری کرنے میں بینک اپنے واقعی اخراجات لے سکتا ہے۔

۱۳- شرعاً اس کی خرید وفروخت جائز نہیں، اس لیے کہ یا تو دین کی بیع اس شخص کے ساتھ کی جارہی ہے جس پر دین نہیں، جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''بیع الدین من غیر من علیہ الدین'' کہا جاتا ہے یا یہ کہ کرنسی کی بیع کرنسی سے ہورہی ہے جس میں کمی زیادتی اور ادھار دو دو ممنوعات پائی جارہی ہیں، اور احادیث ربا میں اس قسم کی بیع کا ناجائز ہونا منصوص ہے۔

۱۴- جب صاحب دین اپنی مرضی سے بغیر کسی جبر کے دین کا کچھ حصہ معاف کردے اور مدیون اپنی خوشی سے وقت سے پہلے دین ادا کردے تو یہ صورت جائز ہے، اور مشروط طریقہ پر جائز نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۷، آیت ربا، المحلی ۸/ ۸۴، اعلاء السنن ۱۴/ ۵۲۹)۔

۱۵- عقد اول جو تعیین مدت کے بغیر ہوا وہ تو فاسد ہوگیا، لہذا بعد میں جو نقد کردیا اور ثمن کم کردیا تو گویا نیا عقد ہوا اور اس میں کمی کرنا جائز ہے۔

''ويجوز للمشتري أن يزيد للبائع في الثمن، ويجوز للبائع ان يزيد للمشتري في المبيع، ويجوز أن يحط عن الثمن، ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك، فالزيادة والحط يلتحقان بأصل العقد عندنا'' (ہدایہ ۳/ ۷۵)۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے، اگر شرط لگادی کہ تاخیر کرنے کی صورت میں سارا دین فوری ادا کرنا ہوگا، اب یہ شرط چاہے صراحۃ ہو یا عرفاً ایسا سمجھا جاتا ہو کہ تاخیر کی صورت میں سارے دیون فی الفور واجب الاداء ہوں گے (خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴)۔

۱۷- مدیون کی موت کی وجہ سے دین مؤجل فوری واجب الاداء ہوجاتا ہے، جمہور کا یہی مسلک ہے۔

''كل دين مؤجل يحل بالموت سواء كان له أو عليه۔

فائدة:... من مات وله ديون على الناس مؤجلة أو للناس عليه ديون مؤجلة، فكل ذلك سواء، وقد بطلت الآجال كلها، وصار كل ما عليه وله من دين حال، ا سواء في ذلك القرض والبيع وغير ذلك'' (اعلاء السنن ۱۴/۵۲۹)۔

''قضى المديون الدين المؤجل قبل الحلول أو مات فحل بموته فأخذ من تركته'' (شامی ۱۰/۴۸۹)۔

۱۸- اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اس پر ربا اور قمار کی تعریف صادق نہیں آتی، قمار شریعت میں ایسے معاملے کو کہتے ہیں جو دائر بین النفع والضرر ہو، اور یہاں ایسا نہیں ہے، اس میں مشتری کو بیع ملتی ہے، اور یہ مزید انعام ہوتا ہے، اپنی تجارت کے فروغ کے لیے تجار ایسا کرتے ہیں، نیز یہ شکل ربا میں بھی داخل نہیں ہے، بایں وجہ کہ ربا کی تعریف بھی اس پر صادق نہیں آتی۔

۱۹- یہ بھی جوا ہی کی ایک شکل ہے، چونکہ اس میں ہوتا یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو ممبر بنا کر ان سے ہر ماہ ایک رقم لی جاتی ہے، اور قرعہ اندازی سے نام نکالا جاتا ہے، جس کا نام نکلے اس کو مقررہ سامان مثلاً موٹر سائیکل اسکوٹر وغیرہ دے دی جاتی ہے، اور آئندہ اس سے مزید قسط کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، پھر اسی طرح ایک ایک کا نام نکالتے ہیں، اس میں کسی کو تو صرف ایک ہزار روپے میں موٹر سائیکل یا مقررہ سامان مل جاتا ہے، اور کسی کو دو ہزار میں، کسی کو پندرہ ہزار میں، تو کسی کو بیس ہزار میں ملتی ہے، اور اس کے جوا ہونے میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہاں معاملہ نفع ونقصان کے درمیان دائر ہے، اور جوا شریعت میں اسی کو کہتے ہیں۔

☆☆☆

بیع بالتقسیط-شریعت کی روشنی میں

مفتی محبوب علی وجیہی [1]

۱- ادھار بیچنے کی صورت میں بائع مبیع کی قیمت نقد کے مقابلہ میں زائد لے سکتا ہے، مگر اس زیادتی کو صلب عقد میں داخل نہ کرے، مثلاً یہ کہے کہ اگر نقد لوگے تو اس کی قیمت ایک ہزار روپے اور اگر ادھار لوگے تو اس کی قیمت بارہ سو، اگر لینے والا کہہ رہا ہے کہ یہ میں ادھار لوں گا تو یوں کہے کہ اس کی قیمت بارہ سو روپے ہے (ہدایہ، البحر الرائق)۔

۲- ادھار کی قیمت کی ادائیگی کے لیے وقت کا تعین ضروری ہے، خواہ یکمشت ادائیگی ہو یا بالاقساط۔

۳- اس شخص کا یہ طریقہ کار تصریحات فقہاء کے خلاف ہے، یہ ہم نے پہلے ہی سوال کے جواب میں لکھ دیا ہے کہ اجل کے مقابلہ میں قیمت نہیں آنا چاہیے، اس شخص کو ایک ہی قیمت بتانا چاہیے، عالمگیری میں ہے:

"الشروط التي تفسد البيع: رجل باع أنه بالنقد بكذا، وبالنسية بكذا، أو إلى شهر بكذا أو إلى شهرين بكذا، لم يجز. كذا في الخلاصة"۔

۴- ادھار فروخت کرنے کی صورت میں اگر مبیع اور اجل دونوں کے مقابلہ میں قیمت مقرر کی تو اس میں ربا پیدا ہو جائے گا، اور اگر قیمت مبیع کے مقابلہ ہی میں رکھی اور ثمن کو موجل کر دیا تو اس میں ربا پیدا نہیں ہوگا۔

۵- معاملہ کی یہ شکل جائز ہے، کیونکہ اس میں نقد کا ذکر نہیں ہے، بائع ادھار کی دو شکلیں مشتری کے سامنے پیش کر رہا ہے، اور چھ ماہ یا بارہ ماہ کا ذکر ادائیگی کے وقت کا بیان ہے، اور ہر ایک کے مقابلہ میں قیمت ہے، ہدایہ میں ہے: "ألا ترى أنه يزاد في الثمن يزاد لأجل الأجل"۔

۶- خرید و فروخت کی یہ شکل جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ شرط کہ اگر مہینہ بھر کے اندر جمع نہیں کروگے تو دو روپے مزید دینا پڑیں گے یہ ربا کی شکل ہے۔

۷- یہ صورت بھی ناجائز ہے اور شریعت میں مالی جرمانہ صحیح نہیں ہے۔

۸- الف:...... مرتہن کو مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، البتہ اگر رہن کے وقت طے نہیں ہوا اور بعد کو راہن نے مرتہن کو اجازت دے دی تو مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز ہے (ہدایہ)۔

ب:...... اس صورت میں مال مرہون کی قیمت اور دین ان میں سے جو کم ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، اور اس کی تین شکلیں بنتی ہیں:

۱:...... مال مرہون کی قیمت اور دین برابر ہے، اس صورت میں اگر مرتہن کے پاس مال مرہون ہلاک ہو جائے تو راہن کا دین ادا ہو جائے گا۔

۲:...... مال مرہون کی قیمت زائد ہے اور دین کم ہے۔ اب مال مرہون ہلاک ہو گیا تو بقدر دین مرتہن نے اپنا دین وصول کر لیا، اور باقی قیمت اس کے پاس امانت ہوگی، اب اگر اس میں مرتہن کی تعدی ثابت ہو جائے تو بقیہ رقم راہن کو واپس کرے گا، اور اگر تعدی ثابت نہ ہو تو راہن کو بقیہ رقم نہیں ملے گی، امانت کا یہی حکم ہے۔

ج:...... مرتہن مال مرہون کو فروخت کر کے اپنا دین وصول کر لے، بہتر یہ ہے کہ قاضی (جج) کی اجازت پہلے لے لے، اگر دین اور فروخت شدہ مال کی قیمت برابر ہے تو استیفاء ہو گیا، اور اگر قیمت دین سے کم ہے تو بقیہ رقم کا مطالبہ راہن سے کرے گا، اور اگر قیمت دین سے زائد ہے تو دین کے وصول کرنے کے بعد بقیہ رقم راہن کو واپس کرے گا۔

۹- الف:...... بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ مشتری سے جب تک قیمت وصول نہ ہو جائے اس وقت تک اپنے مال کو اپنے پاس روکے رکھے، اور یہ بطور رہن نہیں ہوگا۔

ب:...... یہ روکنا استیفاء ثمن کے لیے ہے جو بائع کا حق ہے، جیسا کہ (عالمگیری ۹/۳) پر ہے:

"قال أصحابنا رحمه الله: للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن إذا كان حالا، كذا في المحيط"۔

---

[1] ‎

یہ اس صورت میں ہے جبکہ ثمن فی الفور دینا ہو۔ اور اگر مؤجل طے ہوا ہے تو پھر بائع کو مبیع کو روکنے کا حق حاصل نہیں ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے:

''وإن كان مؤجلا فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده، كذا في المبسوط''۔

اور اگر کچھ ثمن فی الفور دینا ہو اور کچھ میں مہلت ہو تو جو قیمت فی الفور دینا ہے اس کی ادائیگی تک بائع کو مبیع کے روکنے کا حق ہے، اگر فوری ادائیگی کی صورت میں تھوڑی سی بھی قیمت رہ جائے تب بھی مبیع کو روکنے کا حق ہے''عالمگیری'' میں ہے:

''ولو كان بعض الثمن حالاً و بعض الثمن مؤجلا فله حبسه ، حتى يستوفي الحال ولو بقي شئ قليل كان له حبس جميع المبيع، كذا في الذخيرة''۔

اور تفرید میں ہے کہ بیع کی دو قسمیں ہیں:

ایک یہ کہ بائع اور مشتری کے درمیان فی الفور قیمت دینا طے ہوئی ہے، اس صورت میں جب تک مشتری کل ثمن بائع کو ادا نہ کردے بائع کو مبیع کے روکنے کا حق ہے، جب بائع جمیع ثمن پر قبضہ کرلے تب مبیع کو مشتری کے حوالے کرے، اس کو ثمن حال سے فقہاء تعبیر کرتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان قیمت مؤجل طے ہوئی ہے، اس صورت میں بائع کو مبیع کے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، بائع مشتری کو مبیع پر فوراً قبضہ دے۔ ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ کچھ قیمت نقد تھی اور کچھ ادھار تو نقد قیمت وصول ہونے تک مبیع کو روکنے کا حق بائع کو ہے۔

۱۰- فروخت شدہ مال مشتری کا ہو چکا ہے، اور جو قسطیں جمع ہوئیں وہ اس مبیع کی جزوی قیمت ہے۔ اور اب اگر مشتری بقیہ قیمت ادا نہیں کرتا تو بائع اس سامان کو فروخت کرکے اپنی طے شدہ قیمت اس سے وصول کرلے، اگر طے شدہ قیمت اس بیع سے حاصل ہوجائے تو مشتری کی جو قسطیں اس کے پاس جمع ہیں وہ ان کو واپس کردے، اور اگر طے شدہ رقم اس بیع سے حاصل نہ ہو تو قسطوں کی رقم میں سے اس کمی کو منہا کرکے بقیہ رقم مشتری کو واپس کردے، اور اگر اس بیع سے رقم طے شدہ رقم سے زائد رقم حاصل ہوتی ہے تو اپنا حق لینے کے بعد زائد رقم بھی مشتری کو ادا کرے۔

''ہدایہ'' میں ہے: ''البيع ينعقد بالإيجاب والقبول إلى آخره''

اور اسی میں ہے: ''وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولاخيار لواحد منهما''۔

۱۱- اگر بائع نے وہ سامان فروخت کردیا تو وہ خریدار کی ملک ہوگیا، اب اس سامان کو خریدار کے پاس رہن نہیں رکھا جاسکتا، کیونکہ مالک اور مرتہن ایک نہیں ہوسکتے۔ اور اگر مالک بائع ہے تو اسے رہن رکھنے کا حق ہے۔

۱۲- کسی قرض سے نفع اٹھانا درست نہیں ہے، لہذا اجرت ہو یا معاوضہ۔ ادھار کی صورت میں ربا میں داخل ہو جائے گا۔

ہدایہ میں ہے: ''كل قرض جر نفعا فهو ربا''۔

۱۳- اسی طرح دستاویز کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ معلوم ہے کہ اس کی قیمت اصلی قیمت سے کم حاصل ہوگی۔

۱۴- ثمن میں زیادتی اور کمی دونوں جائز ہیں۔ البتہ ثمن میں زیادتی مشتری کی رضا سے تعلق رکھتی ہے، اور کمی بائع کی رضا سے، اب اگر بائع وقت معین سے پہلے اپنی رقم لینے کے لیے اس میں کچھ چھوٹ دے دے تو یہ جائز ہے، کیونکہ بائع کو کل قیمت بھی معاف کردینے کا حق ہے۔ اور مقررہ وقت سے آگے بڑھانے کے لیے زیادتی کا مطالبہ اس لیے ناجائز ہے کہ زیادتی اجل کے مقابلہ میں ہوگی، اور زیادتی اجل کے مقابلہ میں ناجائز ہے۔

۱۵- ادھار کی صورت میں ادائیگی کا وقت معین ہونا ضروری ہے، اگر وقت کا تعین نہیں کیا گیا تو بیع فاسد ہے، لہذا دوسرا ایجاب وقبول کیا جائے اور اس میں رقم گھٹادی جائے۔

۱۶- چونکہ مشتری نے طے شدہ معاملہ کی خلاف ورزی کی ہے، اس لیے بائع کو حق ہے کہ اس معاہدہ کو ختم کردے، اب اگر مشتری اس کو لینا چاہیے اور بائع فی الفور رقم لے کر دینا چاہے تو یہ جائز ہے، جو رقم وصول ہو چکی ہے وہ اس میں منہا ہوجائے گی۔

۱۷- چونکہ بیع مکمل ہو چکی ہے، اس لیے یہ معاملہ علی حالہ باقی رہے گا، مشتری کے وارث معاہدہ کی شرائط پر قسطیں ادا کریں گے۔

۱۸- اس کا مقصد اپنے کاروبار کو مشتہر کرنا اور بڑھاوا دینا ہے، کیونکہ اس میں شرط ایک جانب سے ہے، اور انعام کی تقسیم قرعہ اندازی کے ذریعہ ہے، اس لیے یہ نہ قمار ہے نہ ربا، یہ ایسا ہے، جیسا مدارس میں زیادہ نمبر لانے والے طالب علم کے لیے انعام کا اعلان کیا جاتا ہے۔

۱۹- سوال میں جو شکل بیان کی گئی ہے وہ جائز نہیں، کیونکہ یہ قمار کی شکل ہے۔

قسطوں کی بنیاد پر خرید و فروخت کا معاملہ

مفتی عزیز الرحمن مدنی[1]

۱-۵ ’’یصح البیع بثمن حال و مؤجل بأجل معلوم‘‘ (الدر المنتقی ۷/۸)۔

عدم جواز بیع میں اصل وقوع منازعت ہے، اور یہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز مجہول ہو، اور جب مدت کی صراحت اور تعیین کردی گئی کہ ثمن کی ادائیگی اس طرح ہوگی مثلاً ہر مہینہ سو روپے ادا ہوں گے، تو جہالت باقی نہ رہی اور منازعت ختم ہوگئی، ایسے ہی نقد اور ادھار میں بھی مدت کی صراحت ہوجانے سے جہالت اور منازعت دونوں ختم ہوگئی، اور بیع کا انعقاد تراضی طرفین کے ساتھ ہوا۔

لیکن حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس طرح بیع کرنا بشرطیکہ اسی جلسہ میں مقرر ہوجائے کہ نسیۃ لے لے گا، درست ہے، اور بیع صحیح ہے، مال حلال ہے، مگر خلاف مروت کے اور احسان کے ہے کہ فقیر پر احسان چاہیے نہ تشدد بس فعل مکروہ ہے اور بیع صحیح ہے۔ (فتاوی رشیدیہ ۲/۴۲)۔

۶-۷- ظاہر ہے کہ عدم ادائیگی قسط کی صورت ہر ماہ دو روپیہ (مثلاً) اضافہ بلا بدل اور عوض ہے، مشہور کلیہ ہے: ’’کل قرض جر نفعا فهو الربا‘‘۔

۸- الف:...... جب تک بائع نے مبیع کو مشتری کے قبضہ میں نہیں دیا تو یہ مال بائع ہی کا ہے، یہ صورت رہن کی نہیں ہے، بلکہ مشتری نے وصولی کو یا بائع نے ثمن کی وصولی تک ادائیگی مبیع یا قبضہ علی المبیع کو مؤخر کردیا ہے۔

ب:...... یہ خود بائع کا مال ضائع ہوا ہے۔

ج:...... مال بائع ہی کا ہے، یا تو وہ مشتری کو قیمت واپس کردے، خواہ فروخت کر کے بقدر مطالبہ اپنی رقم اپنے پاس رکھے، اور بقدر آمدہ رقم از مشتری، مشتری کو واپس کردے۔

’’وللبائع حبس المبیع الی قبض الثمن ولو بقی منه درهم ولو المبیع شیئین بصفقة واحدة وسمی لکل ثمنا فله حبسهما إلی استیفاء الکل ولا یسقط حق الحبس بالرهن ولا بالکفیل ولا باء براءه من بعض الثمن حتی یستوفی و یسقط بحوالة البائع علی المشتری بالثمن اتفاقا‘‘ (ردالمحتار ۴/۴۶)۔

اس سلسلے میں تمام اجزاء کے جوابات مذکورہ عبارت اور جوابات نمبر ۸ سے ظاہر ہیں۔

۱۰- اگر بائع وصول شدہ اقساط واپس نہیں کرتا تو یہ غصب ہے، یہ مال بائع کا نہیں ہے اور مالی جرمانہ کا اس کو حق نہیں ہے۔

۱۱- کمپنی یا بائع نے جب مبیع مشتری کے قبضہ میں دے دی اگرچہ پوری قیمت وصول نہیں ہوئی تھی، تو بقیہ قیمت مشتری پر قرضہ ہے، اور مبیع کا وہ مالک ہے، یہ رہن کی صورت نہیں ہے۔

۱۲- کفیل تو لے سکتے ہیں، مگر اجرت اور معاوضہ جائز نہیں ہے۔

۱۳- یہ دستاویزات کی بیع نہیں، بلکہ اس شئی کی بیع ہے جو بائع کے قبضہ میں وصولی ثمن تک محبوس ہے، بائع اس چیز کو کم قیمت میں فروخت کرے یا زیادہ میں اس کا مال ہے، لیکن وصول شدہ رقم واپس کرنا اس کو ضرور ہے۔

۱۴- بائع کو وصولی ثمن یعنی کم ثمن وصول کرنے کا اختیار ہے، اسی طرح مدت میں کمی مشتری کی مرضی سے جائز ہے، اس معاملہ میں تراضی طرفین موجود ہے، کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۱۵- جائز ہے (درمختار ۴/۱۸۷)۔

☆☆☆

---

[1]

قسطوں پر خرید و فروخت - فقہاء کی نظر میں

مفتی حبیب اللہ قاسمی

۱- ایک سامان کو نقد فروخت کرنا کمی کے ساتھ اور ادھار فروخت کرنا زیادتی کے ساتھ جائز ہے، بشرطیکہ مجلس عقد میں بتلا دیا جائے کہ یہ بیع نقد ہے یا ادھار، اور اگر ادھار ہو تو مجلس عقد میں قیمت کو متعین کرنا اور ادائیگی کی مدت کو متعین کرنا ضروری ہے، اگر متعین نہیں کیا جائے گا تو ادھار بیع جائز نہیں۔ (کفایت المفتی ۸/ ۳۰)۔

۲- ثمن بائع کا حق ہے، اور مبیع مشتری کا حق ہے، لہذا صورت مذکورہ میں اگر بائع اس بات پر راضی ہو جائے کہ میں ثمن یکمشت نہیں لوں گا، بلکہ دس ہزار میں مثلاً فروخت کیا ہے تو ہر ماہ کے شروع میں ایک ہزار کی ایک قسط لوں گا تو ادھار خریدنے کی صورت میں مشتری پر ہر ثمن کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں۔ (درمختار مع الشامی ۴/ ۲۲، ۲۳)۔

۳- بیع کے وقت ثمن کو دو شقوں میں دائر کرنا اور تعیین نہ کرنا جائز نہیں، البتہ تعیین ہو جائے تو جائز ہے۔

(ملتقی الابحر ۲/ ۳۶، عالمگیری ۴/ ۱۵۴، امداد الفتاوی ۳/ ۲۰، کتاب البیوع)۔

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا و سود کے دائرے میں نہیں آتا۔

۵- جب خریدار کے سامنے معاملہ کی دونوں شکلیں پیش کی گئیں اور مجلس عقد میں ایک شکل کو متعین کر دیا گیا تو بیع کی یہ شکل جائز ہے، کیونکہ یہاں اجل مجہول نہیں ہے، اور ایسی جہالت نہیں جو مفضی إلی النزاع ہو۔

۶- بیع کی مذکورہ شکل ناجائز ہے جس میں وقت مقررہ پر قیمت کی عدم ادائیگی میں اضافہ کی شرط ہے، کیونکہ اس صورت میں ثمن کی تعیین نہیں ہوگی، معلوم نہیں کہ مشتری ثمن ایک ماہ کے اندر ادا کرے گا یا تاخیر کرے گا، اور اگر تاخیر کرے تو پھر کتنی تاخیر کرے گا، چونکہ یہ سب مجہول ہیں، لہذا بیع مجہول ہوئی، اور یہ شرعاً جائز نہیں، اور یہاں ربا کا شبہ بھی ہے۔

۷- صورت مذکورہ میں بھی شبہ ربا کی وجہ سے بیع کی یہ شکل درست نہیں۔

۸- (الف)...... اگر راہن نے مرتہن کو رہن سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی ہو تو مرتہن کے لیے شئی مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، لیکن اگر اجازت انتفاع نہ دی ہو تو مرتہن کے لیے شئی مرہون سے نفع اٹھانا جائز نہیں (ہدایہ ۴/ ۵۰۶ نسخہ ہندیہ)۔

(ب)...... بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے اگر مال مرہون ہلاک ہو جائے تو بائع اس کا ضامن ہوگا یعنی ضمان بائع پر ہوگا (ہدایہ ۴/ ۵۰۱، کتاب الرہن)۔

(ج)...... جب مشتری ثمن کے دینے میں ٹال مٹول کرتا ہے تو بائع جو مرتہن ہے اس کے حق کی وصولیابی اس طرح ہو سکتی ہے کہ مشتری کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ مرتہن کی اجازت سے شئی مرہون کو فروخت کر کے بائع کا ثمن ادا کر دے، ورنہ قاضی وقت فروخت کر کے بائع کا ثمن ادا کر دے گا۔

(درمختار مع الشامی ۵/ ۳۲۵، کتاب الرہن، ہدایہ ۴/ ۵۲۲، ۵۲۳)۔

۹- جب ایجاب و قبول ہو چکا تو اب مشتری مبیع کا اور بائع ثمن کا مالک ہو گیا، اور کسی کو اختیار نہیں، إلا یہ کہ خیار شرط و خیار رویت و خیار عیب وغیرہ حاصل ہو، صورت مذکورہ میں بائع کا اپنے فروخت شدہ سامان کو روکنا تاوقتیکہ اس کی مکمل قیمت یا چند اقساط جمع نہ کی جائیں شرعاً درست ہے، ہاں اگر بیع نقد ہے تو پہلے مشتری ثمن دے اس کے بعد بائع مبیع دے۔

صورت مذکورہ میں اگر بائع فروخت شدہ سامان کو بطور رہن اپنے پاس اس وقت تک رکھے جب تک بائع کو ثمن وصول نہ ہو جائے تو شرعاً یہ درست نہیں۔ (ہدایہ ۳/ ۴، نیز ۴/ ۵۱۰)۔ البتہ "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" (شامی ۴/ ۲۴) کی اجازت ہے۔

۱۰- شریعت کے اصول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بائع اگر اپنے سامان کو روک لے، اس وجہ سے کہ ثمن کے طے شدہ اقساط جمع نہیں کیے گئے، لیکن اگر بعض قسطیں بائع کو مل چکی ہوں اور بائع اپنا سامان نہیں دے رہا ہے تو بائع کے لیے ایسا کرنا درست نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ظاہر ہے کہ اس پر مشتری تو راضی نہیں ہوگا، اور حدیث میں فرمایا گیا: "لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفسه" (مسلم)۔

۱۱- خود خریدار ہی کے پاس اس کے استعمال میں رکھ کر فروخت کی ہوئی چیز کو رہن رکھنا شرعاً درست نہیں، کیونکہ رہن کے صحیح ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں جن میں یہ بھی ہے کہ وہ مضمون ہو یعنی جس کے فوت یا ہلاک ہونے سے ضمان واجب ہو، ظاہر ہے صورت مذکورہ میں مبیع تو مشتری ہی کا حق ہے، لہذا پھر مضمون ہونے کا سوال نہیں (ہدایہ ۴/ ۵۰۱)۔

۱۲- ادارے و اشخاص جو متبائعین کے درمیان ثالث معتمد کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا معاوضہ لینا بظاہر دلالی کے حکم میں ہے، اس طرح اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

۱۳- دستاویز کی خرید و فروخت دراصل اس میں مکتوب و مذکور مال کی خرید و فروخت ہے، دستاویز کی حیثیت ایک وثیقہ کی ہے لہذا اگر بیع و شراء کے جملہ شرائط باہم پائے جاتے ہوں تو ثمن کی کمی وزیادتی میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔

۱۴- صورت مذکورہ میں بائع کا وقت مقررہ سے قبل قیمت کا مطالبہ کرنا اس شرط پر کہ ایک حصہ ہم معاف کردیں گے، اور اس بات پر بائع ومشتری رضامند ہو جائیں تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں، یعنی یہ صورت درست ہے، کیونکہ ثمن بائع کا حق ہے اور اس کو حق حاصل ہے کہ تمام کو یا بعض کو معاف کردے۔

"ويجوز أن يحط البائع من الثمن" (قدوری ص/۸۱ باب المرابحہ والتولیۃ تحت کتاب البیوع)۔

۱۵- صورت مذکورہ میں ثمن کی ادائیگی کی مدت متعین نہ کرنے کی وجہ سے ادھار بیع فاسد ہو رہی تھی، لیکن جب بائع ومشتری نے باہمی رضامندی سے قیمت کم کر کے نقدی بیع کر لی تو اب یہ بیع درست ہوگئی (ہدایہ ۳/ ۴۵)۔

۱۶- بائع ومشتری میں جب یہ بات طے پاچکی ہے کہ ثمن کی ادائیگی قسط وار ہوگی تو بائع کا مشتری کی طرف سے کسی قسط کی تاخیر پر تمام قسطوں کا فی الفور طلب کرنا خلاف معاہدہ ہے، ہاں مشتری کی ذمہ داری ہے کہ جب اس نے وعدہ کیا ہے تو ایفاء وعدہ کے لیے کوشاں رہے یا کسی مجبوری سے ثمن مہیا نہ ہو تو بائع کو چاہیے کہ مشتری کی اس مجبوری کا خیال رکھے۔

۱۷- اہل علم کو غور کرنا ہوگا کہ بیع بالتقسیط میں جو قسطوں پر دینے کا اختیار ہے، کیا وہ ایسی چیز ہے جس کی وراثت چل سکتی ہے؟ یعنی یہ انتقال کو قبول کرتا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہوگا کہ دائن یا مدیون میں سے کسی کے انتقال کی صورت میں معاملہ کی وہی شکل ہوگی جو دونوں کی موجودگی میں تھی یعنی قسطوں پر ثمن کی ادائیگی، یا یہ کہ یہ حق وارثین کو نہیں ہوگا، اور ان پر یکبارگی ثمن کی ادائیگی لازم ہوگی (ہدایہ ۳/ ۱۶، شامی ۴/ ۵۵)۔

۱۸- بظاہر خریداروں کو وقت مقررہ پر قسط کی ادائیگی کی ترغیب دینا ہے، اس زاویہ سے اس میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ باقی اگر کوئی دوسرا مقصد پیش نظر ہو تو اس مقصد کے سامنے آنے کے بعد اس کے شرعی حکم پر غور کیا جاسکتا ہے۔

۱۹- سوال میں بیع بالتقسیط کی جو صورت ذکر کی گئی ہے جائز نہیں، کیوں کہ اس صورت میں ثمن کی کوئی تعیین نہیں ہے کہ کتنے ثمن میں مبیع حاصل ہوگی؟ مذکورہ شکل تو لاٹری ہی کی طرح معلوم ہو رہی ہے جس میں جہالت ہے اور ربا کا شائبہ بھی ہے، لہذا لوگوں کو مذکورہ شکل سے اجتناب کرنا چاہیے۔

☆☆☆

قسطوں کی بنیاد پر خرید وفروخت اور اس کے احکام

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

۱- ادھار سامان کی قیمت نقد کے مقابلے میں زیادہ رکھی جاسکتی ہے۔ہدایہ میں ہے: ''ألا یری أنه یزاد فی الثمن لأجل الأجل'' (ہدایہ ۳/۵۸)۔

۲- قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں۔قسط وار بھی ادا کی جاسکتی ہے۔بائع اور مشتری کے درمیان جس طرح طے ہوجائے۔

۳- نقد اور ادھار دونوں کی الگ الگ قیمت بتائی جاسکتی ہے لیکن بیع کے جواز کے لیے ضروری ہے کہ مجلس عقد میں بائع اور مشتری کے درمیان کسی ایک پر معاملہ طے ہوجائے، ایسا نہ ہو کہ بلا طے ہوئے دونوں الگ ہوجائیں۔

(ترمذی ۱/۲۳۳، باب ماجاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة، تحفة الاحوذی ۲/۲۳۶)۔

اگر بائع اور مشتری کسی ایک قیمت پر معاملہ طے کیے بغیر جدا ہوگئے تو اس کے عدم جواز کی وجہ جہالت ثمن ہے، جس سے بیع فاسد ہوجاتی ہے

(دیکھئے: مرقات المفاتیح الجزء السادس/۸۱ باب المنہی عنہا من البیوع، أشعة اللمعات ۳/۳۵، بذل المجهود ۴/۲۷۶، اوجز المسالک ۵/۱۱۶)۔

۴- یہ ربا نہیں ہے، کیونکہ علت ربا، قدر مع الجنس کا تحقق نہیں۔

۵- اگر دونوں مجلس عقد میں کوئی ایک صورت طے کرکے باہم معاملہ کرلیتے ہیں تو یہ صورت جائز ہوگی۔

۶- اضافہ کی رقم سراسر ربا اور سود ہے۔

۷- یہ مزید رقم بھی ربا ہے، اسے جرمانہ یا مالی تاوان قرار دینے کی احقر کے خیال میں گنجائش نہیں ہے، پھر یہ کہ مالی تاوان جائز بھی نہیں ہے۔علامہ شامی لکھتے ہیں: ''والحاصل أن المذهب عدم التعزیر بأخذ المال''۔(خلاصہ یہ کہ مذہب مختار، مال لینے کے ذریعہ تعزیر کا جائز نہ ہونا ہے)۔

۸- (الف):......بائع اس مال مرہون سے فائدہ نہیں اٹھاسکتا، کیوں کہ یہ بھی ربا ہی ہے ''کل قرض جر نفعا فهو ربا'' کے تحت درمختار میں ہے: ''لا الانتفاع به مطلقا'' (۵/۳۴۲)۔

البتہ اس میں اجازت کے ساتھ گنجائش ہے، جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

''إلا بإذن کل للآخر وقیل: لا یحل للمرتهن، لأنه ربا، وقیل: إن شرطه کان ربا وإلا لا'' (رد المحتار ۵/۳۴۲)۔

(راہن ومرتہن ایک دوسرے کو اجازت دے دیں تو ہر ایک کے لیے انتفاع جائز ہے، اور کہا گیا کہ مرتہن کے لیے حلال نہیں ہے، کیونکہ یہ ربا ہے، اور کہا گیا ہے کہ اگر مرتہن نے شرط رکھی تھی تو ربا ہے ورنہ ربا نہیں ہے)۔

(ب)......بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے مال مرہون ضائع ہوجائے تو اس کا حکم یہ ہے:

''فإن هلك وساوت قیمته الدین صار مستوفیا دینه حکما أو زادت کان الفضل أمانة فیضمن بالتعدی أو نقصت سقط بقدره ورجع المرتهن بالفضل، لأن الاستیفاء بقدر المالیة'' (ردالمحتار ۵/۳۴۲)۔

(اگر مال مرہون ہلاک ہوجائے اور اس کی قیمت، قرض کے برابر ہو تو حکماً مرتہن نے اپنا حق وصول کرلیا، اور زیادہ ہو تو زائد رقم امانت ہوگی (راہن کو واپس کرنی ہوگی) لہٰذا تعدی سے ضامن ہوگا اور اگر رقم کم ہوگی تو اس رقم کے بقدر قرض ادا ہوگیا اور باقی رقم کے بارے میں مرتہن راہن سے رجوع کرے گا، اس لیے کہ وصولیابی مالیت کے بقدر ہوگی)۔

(ج)......رقم وصول کرنے کے لیے مال مرہون فروخت کیا جائے گا، اگر مال مرہون کی قیمت سے قرض ادا ہوجائے تو فبہا، ورنہ کم ہونے پر بقیہ رقم ادا کرنے کی ذمہ داری (قرض دار) کی ہوگی۔اور بڑھ جانے پر فاضل رقم راہن کو واپس کرنی پڑے گی، جیسا کہ جواب ''ب'' کے تحت گزرا۔

---

[1] مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ مبارکپور۔

یہ فروختگی عام حالات میں قرض دار یا اس کے وکیل کی معرفت ہوگی، لیکن اگر وہ فروخت کرنے سے انکار کرے اور قرض ہی ادا نہ کرے تو بالجبر بذریعہ قاضی اسے فروخت کیا جائے گا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۲۷۵)۔

موجودہ زمانہ میں چوں کہ اکثر مقامات پر قضاۃ نہیں ہیں، لہذا عامۃ المسلمین میں سے چند خواص کے ذریعہ اور ان کی نگرانی میں یہ کام کرایا جائے، عامۃ المسلمین بمنزلہ قاضی ہیں (امداد الفتاوی ۲/ ۶۱۵)۔

۹- ادھار بیع میں بائع کو اپنا ثمن وصول کرنے کے لیے مبیع کو روکنے کا حق نہیں ہے۔ صرف نقد بیع میں ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''قال أصحابنا رحمهم الله تعالى: للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن إذا كان حالا كذا في المحيط، وإن كان مؤجلا، فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده، كذا في المبسوط'' (فتاوى عالمگيری ۳/۱۵، الباب الرابع كتاب البيوع)۔

(ہمارے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ بائع کو ثمن حاصل کرنے کے لیے مبیع کو روکنے کا حق اس وقت ہے جب بیع نقد ہوئی ہو، ایسے ہی محیط میں ہے، لیکن اگر بیع ادھار ہو تو بائع کو مبیع روکنے کا حق نہیں ہے، نہ مدت سے پہلے نہ مدت کے بعد)۔

لہذا مکمل قیمت یا چند اقساط کے جمع ہونے تک فروخت کردہ سامان کو روکنا بائع کے لیے جائز نہیں ہے۔

البتہ فروخت کردہ سامان کو بطور رہن رکھنے کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ پہلے مشتری اس سامان پر خود قبضہ کرے، پھر اسی سامان کو بطور رہن، بائع کے پاس رکھ دے (کفایۃ علی فتح القدیر ۹/ ۹۹ کتاب الرھن)۔

۱۰- اگر بائع نے اس فروخت کردہ سامان کو بطور رہن اپنے پاس رکھا تھا اور اس سامان پر پہلے مشتری کا قبضہ ہو چکا تھا، یعنی جواب نمبر ۹ کی تفصیل کے مطابق رہن کی صورت تھی، تو طے شدہ اقساط کو ادا نہ کرنے کی صورت میں وہ سامان فروخت کیا جائے گا، اور ادا کردہ اقساط کے بعد جو رقم باقی رہ گئی ہو وہ اس سامان کی قیمت سے بائع لے لے گا، جو رقم فاضل ہوگی وہ مشتری کا حق ہوگی۔ لیکن بائع کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ادا کردہ اقساط بھی واپس نہ کرے اور سامان بھی خود رکھ لے۔ عوض اور معوض دونوں کسی ایک کی ملکیت میں جمع نہیں ہو سکتے۔

۱۱- اگر بائع ملکیت ثابت کرنے والی دستاویزات پر قبضہ کرلے تو ان پانچ ملاحظات کی بنیاد پر جن کا تذکرہ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب نے کیا ہے، احقر بھی گنجائش سمجھتا ہے۔

علماء کرام کو (فقہی مقالات حصہ اول صفحہ ۹۲ تا ۹۵) پر درج ان ملاحظات وتفصیلات پر غور کر لینا چاہیے۔

۱۲- مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے کے عمل میں بینک کے جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں، ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

امپورٹر اور اکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے سلسلے میں بینک جو خدمات بجالاتا ہے، اس پر بحیثیت وکیل، یا بحیثیت دلال یا درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خدمات پر اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز ہے، لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ جائز نہیں (فقہی مقالات ۱/ ۹۸)۔

۱۳- جائز صورت:

اولاً حامل دستاویز بینک (یا جسے یہ دستاویز فروخت کرنا ہے اس شخص کو) مشتری (دستاویز جاری کرنے والا) سے دین وصول کرنے کا وکیل بنادے اور اس وکالت پر یہ شخص بینک (یا اس شخص کو جسے دستاویز فروخت کرنا ہے) کو کچھ اجرت بھی دے دے۔

اس کے بعد نئے معاملہ کے ذریعہ یہ شخص (حامل دستاویز) دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک (یا اسی آدمی سے قرض لے لے)۔ اور بینک (یا اسی آدمی کو) اس کا اختیار دے دے کہ جب مشتری سے اس دستاویز کے عوض رقم وصول ہوجائے تو وہ اس رقم سے اپنا قرض وصول کرلے۔ اس طرح یہ دو معاملات علیحدہ علیحدہ ہوجائیں گے (فقہی مقالات ۱/ ۹۹)۔

۱۴- یہ صورت جائز نہیں ہے، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اس مسئلہ پر تفصیلی کلام کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

چنانچہ مندرجہ بالا نصوص فقہیہ کی بنیاد پر مدت کے مقابلے دین کے کچھ حصہ کے سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا گیا ہے (کتاب مذکور/ص ۱۰۷)۔

- جوں کہ دین مؤجل نہیں، اس لیے یہ صورت جائز ہوگی (کتاب مذکور/ص ۱۰۸ تا ۱۱۳)۔

۱۶- یہ مطالبہ صحیح ہے: خلاصہ الفتاوی میں ہے:

"ولو قال: كلما دخل نجم ولم تؤد فالمال حال صح ويصير المال حالا" (كتاب البيوع ۳/۵۴۶)۔

(اگر کہے: "جب ادائیگی کا وقت مقررہ آجائے اور تم ادا نہ کرو تو مال نقد ہوجائے گا یہ کہنا صحیح ہے اور مال نقد ہوجائے گا)، یعنی ادھار کی مہلت ختم ہوجائے گی۔

۱۷- معاملہ اپنی طے شدہ تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا بشرطیکہ میت کے ورثاء (خواہ دائن کے ہوں یا مدیون کے) کسی قابل اعتماد طریقہ سے اس کی توثیق کر دیں، اس مسئلہ میں حنابلہ کا مسلک فی زمانہ قابل ترجیح لگتا ہے جو کہ المغنی جلد رابع/ ۴۸۶، کتاب المفلس وغیرہ میں مذکور ہے۔

۱۸- سامان کے ساتھ انعامات:

ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"فالذی یتبین لی أن الجوائز التی توزعها الشرکات والمحلات التجاریة علی عملائها الذین یشترون منها سواء تمثلت فی مبالغ نقدیة ام فی بضائع وأشیاء عینیة، لا تدخل فی دائرة المیسر المنهی عنه، وهو الذی لایخلو من ربح أو خسارة لأحد الطرفین، و منه الیانصب الذی عرفه الغرب ونقل۔ للأسف۔ الی مجتمعا تنا تقلیدا۔ ذلك أن الجوائز التی تدفعها المؤسسات التجاریة إنما هی من طرف واحد، ولا یتحمل الطرف الثانی أیة خسارة أعني العملاء أو الزبائن وأما اختیار البعض بواسطة القرعة فلا حرج فی ذلك شرعا عند جمهور الفقهاء وتدل علیه عدة أحادیث تجیز الترجیح بالقرعة" (فتاوی معاصره ۲/۴۲۰)۔

(جو میرے سامنے ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ جو انعامات کمپنیاں اور تجارتی ادارے اپنے خریداروں کو تقسیم کرتی ہیں، خواہ نقد کی صورت میں یا سامان و اشیاء کی صورت میں وہ ممنوع جوئے کے دائرے میں نہیں آتے، جس میں کسی نہ کسی ایک فریق کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہوتا ہے انہیں میں وہ لاٹری بھی ہے جو مغرب کی تقلید میں افسوس کہ ہمارے معاشرہ تک آ گئی ہے۔

ان انعامات کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ جو تجارتی ادارے انہیں دیتے ہیں وہ صرف ایک طرف سے دیتے ہیں، دوسری طرف گاہکوں کو کوئی خسارہ برداشت کرنا نہیں ہوتا۔ جہاں تک قرعہ اندازی کے ذریعہ انتخاب کا تعلق ہے تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس میں شرعا کوئی حرج نہیں، بہت سی احادیث قرعہ کے ذریعہ ترجیح کے جواز پر دلالت کرتی ہیں)۔

آگے لکھتے ہیں کہ اگر خریدار کا مقصد سامان نہ ہو، بلکہ انعام ہو تو اس صورت میں اس میں قمار یا اس سے قربت کا مفہوم ہوتا ہے۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

"علی كل حال لا أری بأسا من أخذ الجائزة المذكورة مادام القصد الأساسی هو الشراء" (فتاوی معاصرة ۲/۴۲۰)۔

(بہر حال میں انعام کے لینے میں کوئی حرج نہیں دیکھتا، جب تک بنیادی مقصد سامان خریدنا ہو)۔

۱۹- کاروبار کا یہ طریقہ سراسر قمار پر مشتمل ہے جس کی حرمت میں کوئی شک وشبہ نہیں، ملاحظہ ہو (فتاوی رحیمیہ، ۶/ ۱۴۱ و ۱۴۲)۔

☆☆☆

نقد کے مقابلہ ادھار میں قیمت کا اضافہ

مفتی عبدالرحیم قاسمی، بھوپال

۱- جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے، بائع اور مشتری آپسی رضامندی سے اس کی قیمت نقد کے مقابلہ کچھ زیادہ مقرر کرلیں، تو جائز ہے، "اسلامی فقہ" میں ہے بائع کو اختیار ہے کہ نقد کوئی چیز سستی بیچے اور ادھار کچھ گراں مگر اس بارے میں خریدار کو بتادینا اور اس کا منظور کرلینا بھی ضروری ہے اگر بغیر بتائے فروخت کرے گا تو یہ جائز نہیں (اسلامی فقہ ۲/۷ ۳۳، فتاویٰ محمودیہ ۴/۱۷۵)۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی قسطوں میں بھی کی جاسکتی ہے "درزیوں کی مشین قسطوں پر خریدنا" کے زیر عنوان "امداد الفتاویٰ" میں ہے: نسیئہ میں بہ نسبت نقد کے زیادہ قیمت لے لینا جب کہ مجلس عقد میں نقد یا ادھار ہونا متعین ہوجائے جائز ہے (امداد الفتاویٰ ۳/۱۲۲)۔

۳- اس طرح معاملہ کرنا کہ نقد قیمت مثلاً ایک سو روپے اور ادھار سوا سو روپے ہے شرعاً جائز نہیں

"رجل باع علی أنه بالنقد بکذا وبالنسیئة أو إلی شهر بکذا وإلی شهرین بکذا لم یجز" (فتاویٰ عالمگیری ۳/۱۳۶)۔

۴- وقت کے عوض قیمت زیادہ کرنا مطلقاً منع نہیں، بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ سامان کے سودے میں ادھار کا خیال کرکے کچھ قیمت میں اضافہ کیا جائے تو وہ براہ راست مدت کا معاوضہ نہیں، بلکہ اس سامان ہی کی قیمت ہے، بخلاف اس کے اگر براہ راست مدت ہی کا معاوضہ سالانہ یا ماہوار طے کیا جائے تو یہ حرام ہے، چنانچہ جہاں صاحب ہدایہ نے مدت کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کو جائز کہا ہے وہاں پہلی صورت مراد ہے، اور انہوں نے مذکورہ صورت کو اس لیے جائز قرار دیا ہے کہ وہ اصلاً اور براہ راست نہیں، بلکہ ضمناً ہے، اگرچہ قاضی خاں وغیرہ نے اسے بھی ناجائز کہا ہے، اور جہاں پر صاحب "ہدایہ" نے مدت کے مقابلہ میں عوض لینے کو حرام کہا ہے وہاں ان کا مطلب یہ ہے کہ براہ راست مدت کی قیمت نہیں لی جاسکتی (جواہر الفقہ ۳/۱۵۲)۔

۵- اگر سوال میں مذکورہ صورتوں پر غور کرکے مجلس عقد ہی میں بائع اور مشتری باہمی رضامندی سے کسی ایک صورت کو طے کرلیں تو شرعاً یہ جائز ہے (الفتاویٰ الرشیدیہ/ ۴۰۲)۔

۶- یہ سودی معاملہ ہے۔" قال الکاساني: فلأنه اعتیاض عن الأجل، وأنه لا یجوز ،لأن الأجل لیس بمال فلا یجوز الاعتیاض عنه" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۱۵)۔

۷- اگر ادھار فروخت کے وقت قسطوں میں یا یکمشت قیمت یا جملہ قسطیں یا کوئی قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں کچھ مقررہ رقم کی ادائیگی ضروری قرار دی جائے تو یہ سود ہے، اس کا لینا دینا حرام ہے۔

" ذلك اعتیاض عن الأجل وهو حرام" (ھدایہ آخرین باب الصلح في الدین)۔

۸- بائع خریدار سے کوئی مال رہن رکھوالے تو وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا "نفع گرفتن مرتہن را از رہن مکروہ تحریمی است" (مجموعۃ الفتاویٰ شاہ عبدالعزیز دہلوی ۲/ ۲۲، فتاویٰ رشیدیہ/ ۴۴۹، نیز دیکھئے: درمختار ۵/ ۳۳۶، بدایۃ المجتہد، فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۲۱۹، امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۵۴)۔

البتہ امام احمد اور اسحاق بن راہویہ جانور کے بارے میں اس حدیث کی روشنی میں "الرھن مرکوب ومحلوب" یہ کہتے ہیں کہ اپنے چارہ اور اخراجات کے بقدر سواری کرسکتا ہے، مگر امام ابوحنیفہ کسی صورت میں اس کے لیے نفع اٹھانے کے قائل نہیں (اسلامی فقہ ۲/ ۴۶۹)۔

جو چیزیں غیر منقولہ ہیں، مثلاً زمین مکان وغیرہ، یا وہ منقولہ ہیں، مگر ان کے استعمال سے ان کی حیثیت کم ہوجاتی ہے، مثلاً زیور، گھڑی، سائیکل، موٹر وغیرہ ان سے انتفاع تو کسی حال میں جائز نہ ہونا چاہیے، لیکن جانور وغیرہ میں جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں اپنے خرچ کے بقدر راہن کی اجازت سے وہ استعمال کرسکتا ہے، اس لیے کہ جانوروں کے چارہ کی ذمہ داری موجودہ زمانہ میں ایک دقت طلب بات ہے، اس لیے وہ چارہ اور اخراجات کے بقدر استعمال کرلے تو یہ ربا کی حد میں داخل نہیں ہوگا، بشرطیکہ اس کے استعمال سے اس میں عیب پیدا نہ ہو، اس میں استعمال کی حد مقرر کی جاسکتی ہے، جیسا کہ امام مالک فرماتے ہیں (اسلامی فقہ ۲/ ۱۷۰)۔

(ب)......مرتہن کے قبضہ میں مال رہن ضائع ہوجائے تو اس کے قبضہ کے دن کی قیمت اور مبیع کی قیمت دونوں کو پیش نظر رکھ کر اس طرح فیصلہ کیا جائے گا کہ اگر دونوں برابر ہیں تو خریدار قیمت کی ادائیگی سے سبکدوش مانا جائے گا، اور اگر مال رہن کی قیمت مبیع کی قیمت سے زیادہ ہو تو خریدار اس کی ادائیگی سے بری الذمہ ہوجائے گا، باقی زیادتی مرتہن کے پاس امانت رہے گی، اور رہن کی قیمت کم ہونے کی صورت میں اس کے بقدر مبیع کی قیمت ادا مانی جائے گی، اور باقی رقم مرتہن خریدار یعنی راہن سے وصول کرنے کا حق دار ہوگا (فتاویٰ عالمگیری ۵/ ۴۴۷)۔

(ج)......اگر رہن کی مدت پوری ہوجائے اور خریدار قیمت ادا نہ کرے تو مرتہن کو رہن رکھی ہوئی چیز بیچ کر اپنی قیمت وصول کرنے کا حق ہوگا اور جہاں اسلامی حکومت ہوگی وہاں مرتہن قاضی (جج) کے سامنے معاملہ پیش کرکے بیچنے کی اجازت لے گا پھر فروخت کرے گا۔

''إذا حل وقت الأداء وامتنع الراهن عن أدائه فالحاكم يأمر ببيع الرهن'' (المجلہ /۱۱۶ بحوالہ اسلامی فقہ ۲/۴۷۲)۔

۹- بائع قیمت کی وصولی کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرے اور خریدار مبیع کو بائع کے پاس رہن کے طور پر چھوڑ دے تو اس کی گنجائش ہے (ردالمحتار ۴/ ۴۲)۔

(ب)......بائع نے ثمن کی میعاد مقرر کرکے اپنے پاس مبیع روکنے کا حق ساقط کردیا ہے، لہٰذا خریدار کو قیمت کی ادائیگی سے پہلے مبیع پر قبضہ کرنے کا اختیار ہے (بدائع الصنائع ۵/ ۲۵۰)۔ کے لیے بائع مبیع کو روکنے کا حقدار نہیں۔

۱۰- قیمت کی طے شدہ اقساط خریدار مکمل ادا نہ کرسکے اور مبیع بائع کے قبضہ میں ہی ہو تو ادا شدہ قسطوں کی مجموعی رقم بائع مشتری کو واپس کردے اور اس معاملہ کو فسخ کردیا جائے، کیونکہ ادا شدہ قسطیں ''خالی عن العوض'' (بائع) کے قبضہ میں ہیں جب کہ فروخت شدہ سامان بھی اس کے پاس ہے تو قسطوں کی رقم اس کے لیے حلال نہیں اس کا مالک خریدار ہے اس کو واپس کرنا لازم ہے۔

۱۱- جو شخص صرف مرتہن ہو، اس کا قبضہ بطور امانت نیابتاً ہوتا ہے، لیکن خریدار عقد کے ذریعہ ملکیت حاصل کرچکا ہے، اس کے پاس مبیع کو رہن رکھنے کی صورت میں وہ اصالتاً مالکانہ قبضہ کرلے گا، بائع کو اس کا قبضہ باطل کرنے کا اختیار نہیں ہوگا (بدائع الصنائع ۵/ ۲۵۱)۔

۱۲- خریدار کی جانب سے ضمانت اور گارنٹی کفالہ کے اصول پر پیش کی جاسکتی ہے (۴/ ۲۶۸)۔

اور کفیل قیمت ادا کرنے کے بعد اصیل (مشتری) سے وصول کرسکتا ہے (شامی ۴/ ۲۷۲)۔

یہ اخلاقی معاملہ ہے کریڈٹ لیٹر کی قیمت لے کر اس کو جلب منفعت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

۱۳- ادھار معاملہ کے کاغذات بیع نامہ لکھ کر مشتری سے مبیع کی ثمن کے علاوہ مزید قیمت وصول کرکے دیئے جاتے ہیں یا صرف ملکیت کی دستاویز زیادہ قیمت دینے والے عام آدمی کو فروخت کی جاتی ہے، دونوں صورتوں میں دستاویزی قیمت زبانی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے تو ادائیگی کس حساب سے کی جاتی ہے یہ امر وضاحت طلب ہے؟

۱۴- بائع کو قیمت میں کمی کرنے کا اختیار ہے، اور یہ تبرع واحسان ہے (فتاویٰ عالمگیری ۳/ ۱۷۳)۔

۱۵- ادھار معاملہ جائز ہونے کے لیے قسط کی تعیین اور اس کے وقت کا مقرر کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر یہ بیع فاسد ہوجائے گی تو بعد میں رقم کم کرنے کا سوال ہی نہیں ہوگا (شامی ۴/ ۳۲)۔

۱۶- معاملہ کرتے وقت اگر یہ طے کرلیا تھا کہ قسط کی ادائیگی میں تاخیر ہونے پر باقی قسطیں مجموعی طور پر طلب کی جائیں گی تو شرط کے مطابق باقی قیمت فوراً وصول کرنے کا حق ہے (درمختار علی ہامش الرد ۴/ ۲۴)۔

۱۷- خریدار کا انتقال ہوجائے تو قسطوں کی مدت متعینہ ختم ہوجائے گی، اور فوری طور پر کل قیمت ادا کی جائے گی، بائع کا انتقال ہونے سے معاملہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا (ردالمحتار ۴/ ۲۳)۔

۱۸- ہر قسط کی ادائیگی کے وقت یا ماہ بماہ یا چھ ماہ یا سال بھر میں قرعہ اندازی کرکے خریداروں کو انعام دینا شرعاً قمار میں شمار ہے۔

۱۹- تمام خریداروں سے بالاقساط قیمت طے کرالی جائے، ایک متعینہ مدت میں سامان دینے کا وعدہ کیا جائے، خریداروں کو سامان دینے کے لیے قرعہ اندازی کی جائے، جس خریدار کو قرعہ سے منتخب کیا جائے اس کو فوراً وہ سامان دے دیا جائے، پھر اس سے کسی قسط کا مطالبہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کی ادا کردہ قسط کو کافی سمجھا جائے، خواہ وہ ایک ہو یا مزید، باقی لوگ اپنی قسطیں جمع کرتے رہیں، اس طرح ہر مرتبہ کی قرعہ اندازی سے ایک آدمی جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلا ہے مال حاصل کرکے الگ ہوجائے، اس صورت میں قمار ہے، لہٰذا یہ حرام ہے۔

قسطوں پر خرید وفروخت

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

۱- صورت مسئولہ میں جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کردینا جائز ہے۔ بشرطیکہ مجلس عقد میں ادھار ہونے کی صراحت کردی جائے اور ادائیگی کی مدت وغیرہ طے کردی جائے (ہدایہ ۳/ ۵۸، فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۳۶، امداد الفتاوی ۳/ ۲۰)۔

۲- صورت مسئولہ میں ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری ہے اور یہ گنجائش نہیں ہے کہ ادھار قیمت کو چند قسطوں میں ادا کیا جائے (ہندیہ ۳/ ۱۴۳)، البتہ اگر انعقاد بیع کے وقت قسطوں پر ادا کرنے کی بات طے ہوئی ہے تو ادھار قیمت چند قسطوں میں ادا کرنے کی شرعاً گنجائش ہے۔

۳- معاملہ کی یہ صورت ناجائز ہے، اور ادھار فروختگی کی صورت میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے یہ ضروری ہے کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے اور اسی صورت پر معاملہ کیا جائے (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۳۶، امداد الفتاوی ۳/ ۲۰، ۳/ ۱۲۲)۔

۴- صورت مسئولہ میں ادھار فروختگی کی صورت میں نقد کے مقابلہ میں قیمت زائد مقرر کرنا جائز ہے، یہ ربوا کے دائرہ میں نہیں آتا، اور نہ وقت کا عوض ہے، بلکہ ادھار بیع میں اصل ثمن یہی ہے، اور یہ زیادتی نقد فروختگی کے مقابلہ میں ہے (کفایت المفتی ۸/ ۴۲)۔

۵- معاملہ کی یہ شکل شرعاً درست نہیں ہے، ہاں دوسری صورت کے جائز ہونے کی شکل یہ ہے کہ مدت بڑھانے کی وجہ سے قیمت میں کچھ اضافہ کردیا جائے گا، تاکہ نقصان معدوم ہوجائے (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۳۳)۔

۶- صورت مسئولہ میں ہر ماہ کی تاخیر پر دو روپے کا اضافہ کرنا سود ہے جو حرام ہے، لہذا یہ معاملہ ناجائز ہے (قواعد الفقہ ۳۰۲، امداد الفتاوی ۳/ ۹۳)۔

۷- صورت مسئولہ میں مذکورہ معاملہ کی صورت شرعاً جائز نہیں ہے اور یہ مزید رقم سود قرار پائے گی جو حرام ہے (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۷۱، امداد الفتاوی ۲/ ۱۲۲)۔

۸- (الف)...... بائع کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا اگر مشروط یا معروف ہو جیسا کہ آج کل ہے یعنی خریدار نے اجازت دے دی ہو تب بھی جائز نہیں ہے کیونکہ یہ سود ہے، اور سود اجازت دینے سے حلال نہیں ہوسکتا (شامی ۵/ ۳۴۳ و امداد الفتاوی ۳/ ۴۵۴)۔

(ب)...... مال مرہون کی ہلاکت کی صورت میں اگر دَین اور مال مرہون کی قیمت دونوں برابر ہوں تو دَین ادا ہوجائے گا، اور قیمت زائد ہو تو بھی دَین ادا ہوجائے گا، لیکن زائد رقم امانت ہوگی، اور اگر قیمت دَین سے کم ہو تو بقدر قیمت دَین ادا ہوجائے گا، اور باقی خریدار سے وصول کیا جائے گا۔

(ہدایہ ۳/ ۵۰۲، فتاوی ہندیہ ۵/ ۴۴۷)۔

(ج)...... ٹال مٹول کی صورت میں فروخت کنندہ اپنی واجب الادا قیمت وصول کرنے کے لیے قاضی سے عرض کرے گا اور جب قاضی کے نزدیک ٹال مٹول کرنا ثابت ہوجائے گا تو قاضی اس کو قید کرے گا۔ یا قاضی اس پر کوئی جرمانہ لازم کردے گا تاکہ اس کے خوف سے ٹال مٹول سے باز آکر ادا جلد کردے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلاوجہ ٹال مٹول کرنے کو ظلم قرار دیا ہے (ہدایہ ۴/ ۵۰۴، فقہی مقالات ۱/ ۱۲۲، از مولانا تقی عثمانی)۔

۹- قیمت وصول کرنے کی خاطر بائع کے لیے فروخت کردہ سامان کا روکنا جائز ہے جبکہ بیع نقدی ہو، اور اگر بیع ادھار ہو تو بائع کے لیے فروخت کردہ سامان کو روکنے کا اختیار نہیں ہے، نہ مدت کے آنے سے پہلے اور نہ مدت کے گزرنے کے بعد (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵)۔

(الف)...... بائع کے لیے قیمت وصول کرنے کی خاطر فروخت شدہ سامان کو رہن بنانے کی دو صورتیں ممکن ہیں:

اول یہ کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع کے پاس بطور رہن چھوڑ دے، یہ صورت تو جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ وہی صورت بن جاتی ہے کہ بائع حصول ثمن کے لیے مبیع کو اپنے پاس روک لے، اور حصول ثمن کے لیے حبس مبیع بیع مؤجل میں جائز نہیں ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشتری اس بیع کو پہلے اپنے قبضہ میں کرے اور پھر بطور رہن وہی مبیع بائع کے پاس واپس رکھ دے، یہ صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز

---

[1]

ہے(ہدایہ ۳/ ۵۳۴، کفایۃ مع الفتح ۹/ ۹۹، مغنی ۴/ ۴۲۰-۴۲۱)۔

(ب)......صورت مسئولہ میں پہلی جہت کی گنجائش میں یہ پابندی عائد ہوگی کہ اگر بیع نقد ہے تو سامان کو روک سکتا ہے ورنہ نہیں، اور دوسری جہت کی گنجائش میں یہ پابندی عائد ہوگی کہ سامان کی ہلاکت کی صورت میں بائع طے شدہ قیمت اور فروخت شدہ سامان کی اصل قیمت میں جو کم ہوگی اس کا ضامن ہوگا۔

۱۰- قیمت کی وصولیابی کے لیے بائع کا سامان کو اپنے قبضہ میں رکھنا جائز ہے اور پھر وہ سامان بائع کا ہو جائے گا اور بیع فسخ ہو جائے گی اور ادا کی ہوئی اقساط کا واپس نہ کرنا اور ضبط کر لینا جائز نہیں ہے(ابوداؤد ۲/ ۴۹۴، بذل المجہود ۴/ ۲۸۶، شامی ۴/ ۴۷)۔

۱۱- خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس اور اس کے استعمال میں رکھ کر رہن نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ مبیع مشتری کی ملکیت میں نہ تھی، لیکن اس شرط سے رہن رکھنا درست ہے کہ مشتری قبضہ کے بعد بطور رہن رکھے گا(فقہی مقالات/ ۹۱)۔

۱۲- یہ معاوضہ شرعاً باطل ہے، کیونکہ معاوضہ مال کا مال سے ہوتا ہے، اور ضمانت وگارنٹی کوئی مال نہیں ہے، بلکہ یہ تو آدمی کا تبرع واحسان ہے، لیکن مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کو بین الاقوامی تجارت اور لین دین اور کریڈٹ لیٹر جاری کرنے میں اس کی ضرورت رہتی ہے تو پھر اس کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ بینک کے لیے اپنے عمیل سے دو چیزوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے:

۱:......کریڈٹ لیٹر جاری کرنے کے عمل میں بینک کے جو واقعی اخراجات ہوتے ہیں ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

۲:......امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے لیے بینک جو خدمات بجالاتا ہے اس پر بحیثیت وکیل یا دلال یا درمیانی واسطہ ہونے کے اپنی خدمات پر اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز ہے لیکن صرف گارنٹی پر اجرت کا مطالبہ بینک کے لیے جائز نہیں ہے(فقہی مقالات ۱/ ۹۸)۔

۱۳- صورت مسئولہ میں دستاویز کی خرید وفروخت میں اس کے اندر تحریر کردہ قیمت ومالیت سے کم پر معاملہ کیا جانا شرعاً ناجائز ہے، لیکن اس معاملہ کو دو الگ الگ معاملہ کے ذریعہ تھوڑی سی تبدیلی کر کے درست کیا جاسکتا ہے، پہلا معاملہ یہ کہ یہ شخص بینک کو قرض وصول کرنے کے لیے کسی معین اجرت پر اپنا وکیل بنادے تو شرعی لحاظ سے یہ معاملہ درست ہو جائے گا، کیونکہ شرعاً اجرت پر وکیل بنانا جائز ہے۔ اور دوسرا معاملہ یہ کہ وہ خود بینک سے قرض لے لے اور بینک کو دستاویز کے بدلہ وصول ہونے والی رقم سے اپنا قرض وصول کرنے کا اختیار دے دے، شرعی لحاظ سے یہ بھی درست ہے، اس لیے کہ اس میں کسی زیادتی کی شرط کے بغیر قرض کا مطالبہ کیا جارہا ہے جو شرعاً جائز ہے(فقہی مقالات ۱/ ۹۸- ۱۰۰)۔

۱۴- صحابہؓ میں حضرت ابن عباس اور تابعین میں امام نخعی، احناف میں امام زفر اور شوافع میں امام ابوثورؒ جواز کے قائل ہیں، اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت ابن عمر اور زید بن ثابت اور تابعین میں امام ابن سیرین اور امام حسن بصری اور امام ابن مسیب اور حضرت حکم بن عتبہ اور امام شعبیؒ اس کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں، اور یہی ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم کا مسلک ہے، یعنی جمہور علماء ناجائز کہتے ہیں(موطا امام مالک ۲۷۸، موطا امام محمد ۳۳۴، المغنی ۴/ ۵۶)۔

۱۵- ایسے دیون میں دَین کے کچھ حصے چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ مدیون باقی دیون فوراً ادا کردے، علماء مالکیہ نے اس کے جواز کی صراحت کی ہے(المدونۃ الکبری ۳/ ۱۷۳، مسوی ۲/ ۳۸۲، نیز دیکھئے: المغنی ۴/ ۳۴۹، احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۸۳، فقہی مقالات ۱/ ۱۰۰)۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور فوری طور پر ماتقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔
(خلاصۃ الفتاوی ۳/ ۵۴، الفوائد الخیریہ علی جامع الفصولین ۲/ ۴)۔

۱۷- صورت مسئولہ میں حنفیہ کا اصل مسلک تو یہی ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے وہ دَین فی الفور واجب الادا ہو جائے گا، لیکن متاخرین حنفیہ رحمہم اللہ کے مفتی بہ قول کے اعتبار سے اس معاملہ کی نوعیت میں فرق آجائے گا بایں طور کہ ایسی صورت کے پیش آنے کے وقت مشتری ثمن مرابحہ میں صرف اسی قدر ادا کرے گا جو گزشتہ مدت کے مقابل ہو، لیکن مولانا تقی عثمانی صاحب نے حنابلہ کے اس قول کو کہ جس طرح وہ دَین مؤجل ہے اب بھی اسے اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے بشرطیکہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دَین کی توثیق کردیں، زیادہ بہتر کہا ہے، یعنی یہ معاملہ اب بھی طے شدہ تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا، کیونکہ اس صورت میں سود کا تذبذب نہیں پایا جاتا(شامی ۴/ ۱۹۱، ۵/ ۵۳۴، المغنی ۴/ ۸۲، فقہی مقالات ۱/ ۱۳۷)۔

۱۸- بیع بالتقسیط کے ساتھ اس نظام کو جوڑنا قمار میں داخل ہے، لہٰذا حرام ہے۔

۱۹- مذکورہ معاملہ شرعاً قمار میں داخل ہے، لہٰذا حرام ہے۔

☆☆☆

ادھار قیمت کی ادائیگی کے جدید طریقے

مولانا سلطان احمد اصلاحی، علی گڑھ

۱- ہاں یہ درست ہے کہ ادھار فروخت کیے جانے والے سامان کی قیمت کو نقد فروختگی کے مقابلہ میں زیادہ کردیا جائے۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں ہے، یہ قیمت بالاقساط ادا کی جاسکتی ہے، مزید معاملات کے سلسلہ میں حضرت امام محمدؒ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ: ''أحكام المعاملات تدور مع المصلحة وجودًا وعدمًا'' (ڈاکٹر محمد سلامہ مذکور: مدخل الفقہ الاسلامی/۱۰۱، الدار القومیہ للطباعۃ والنشر، القاہرہ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء)۔

جس کی مزید وضاحت مصنف موصوف کے اس بیان سے ہوتی ہے:

''إن الأحكام الشرعية تتبدل بتبدل الزمان مهما تغيرت بتغيره، إن المبدأ الشرعي فيها واحد وهو إحقاق الحق وجلب المصالح ودرء المفاسد وتحقيق ما فيه نفع المجتمع الاسلامى في ضوء مبادئ الإسلام وقواعده العامة'' (حوالہ سابق/۱۱۱)۔

۳- معاملہ کی یہ صورت جائز ہے، ادھار فروختگی میں قیمت کی زیادتی کے جواز کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف ادھار قیمت کا تذکرہ کیا جائے اور اسی پر معاملہ کیا جائے، دراصل ادھار کی صورت میں بائع کی رقم جو پھنستی ہے اس کی تلافی کے لیے وہ اپنے مال کی قیمت کو بڑھاتا ہے، فی زمانہ بوجوہ معاملہ کی یہ صورت بہت عام ہے، اور اس کے سلسلہ میں پابندی اور قدغن لوگوں کے لیے حرج اور باعث ضرر ہے۔

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلہ میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرہ میں نہیں آتا، وقت کے ساتھ ہر زیادتی ہر حال میں ربا نہیں، اور یہ اسی دائرے میں آتا ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ اگر تم نفقہ ماہ کے ماہ فوری لو تو ماہانہ ۵۰۰ / روپے، لیکن اگر چھ ماہ بعد یکمشت لو تو ہر ماہ ۸۰۰ / روپے کے حساب سے ادا کروں گا، یا کوئی آجر اپنے اجیر سے کہے کہ اجرت تم روزانہ نقد لو تو یومیہ ۱۰۰ / روپے اور ایک ہفتہ بعد لو تو ۱۲۵ / روپے کے حساب سے۔ ظاہر ہے اسے کوئی ربا تسلیم نہیں کرتا، اسی طرح یہ مسئلہ بھی ہے۔

۵- معاملہ کی یہ صورت درست ہے، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۶- خرید و فروخت کی یہ صورت بھی جائز ہے، یہ بھی دراصل ادھار کی صورت میں قیمت کی زیادتی کے ساتھ فروخت کا معاملہ ہے، جس کے جواز کی بات آچکی ہے، اصولی طور پر دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۷- یہ صورت بھی شرعاً جائز ہے، جرمانہ یا مالی تاوان جو بھی نام دیا جائے یہ جزئیہ بھی اوپر کے جزئیہ کا ہی ایک حصہ ہے، اس لیے دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہے۔

۸- بحالات موجودہ معاملے کی یہ صورت مفضی إلی النزاع اور خریدار کے لیے ضرر کی موجب ہے، اس لیے اصولی طور پر جائز ہوتے ہوئے بھی تبدیلی احوال کے پیش نظر اس سے بچنا مناسب ہے، کیوں کہ:

۱- دینداری میں اضمحلال اور امانت و دیانت میں عام کمی کے پیش نظر مرہون مال چاندی سونا ہونے کی صورت میں بائع اس میں ملاوٹ کراسکتا ہے اور چوری کرسکتا ہے۔

۲- مال مرہون کے ضائع نہ ہونے پر بھی اس کے ضائع ہونے کا بہانہ کرسکتا ہے۔

۳- سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بائع کی طرف سے اس کا چلن آج نہ ہونے کے برابر ہے، عام کاروباری طبقہ رہن رکھنے کا جھمیلا نہیں رکھتا ہے، یہ کام جوہری لوگ کرتے ہیں یا معاشرہ کے مخصوص افراد، رہن کے ذریعہ ان سے رقم حاصل کرلی جائے، پھر کسی بائع سے نقد یا بالاقساط جیسی دولت ہو خریداری کا معاملہ کیا جائے۔

۹- آج کے حالات میں بائع کے لیے اپنے فروخت کردہ سامان کو روکنے کا اختیار دینا خریدار کے لیے بوجوہ ضرر کا موجب ہے، قیمت کا ایک حصہ پیشگی وصول

ہوجانے کے بعد وہ خریدار کو خراب سامان دینے پر اصرار کرسکتا ہے اور یہ مفضی الی النزاع ہوگا، اس لیے مناسب ہے کہ خریدار کو اپنی پسند کا سامان ہاتھ کے ہاتھ ملے، البتہ بالاقساط رقم کی ادائیگی کو دوسرے ذرائع سے یقینی بنایا جائے۔ آج جو طبقہ یہ کاروبار کرتا ہے وہ رقم وصول کرنے کا طریقہ خوب جانتا ہے، "حبس المبیع لا ستیفاء الثمن" کی اس کو ضرورت نہیں ہے۔

۱۰- جب بائع کو سامان روکنے کا اختیار ہی نہیں ہے تو اس شق کا جواب واضح ہے کہ یہ نادرست ہے، سامان معاملہ کی تکمیل کے ساتھ ہی خریدار کے حوالے ہو، قیمت کی وصولیابی کو دیگر ذرائع سے یقینی بنایا جائے۔

۱۱- جب اس سامان کو روکنا ہی درست نہیں ہے تو اس کے رہن بنائے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

۱۲- سوال پوری طرح واضح نہیں ہوسکا۔

۱۳- معاملے کی یہ صورت ناجائز ہے، اس میں یہ مفہوم ہے کہ سامان بائع کے پاس رکا ہوا ہے، اور اسی کا فائدہ اٹھا کر وہ خریدار سے Bargaining یا Black mail کرنا چاہتا ہے، بیع سے زیادہ یہ قمار کے مشابہ ہے، اور اس پر اسی کا حکم لاگو ہونا چاہیے۔

۱۴- معاملہ کی یہ صورت "ضع وتعجل" جائز ہے، مقررہ مدت سے آگے بڑھانے پر طے شدہ رقم میں زیادتی اگر پہلے سے طے اور واضح ہو تو جائز ہے اور یہ بائع ہے، یہی حکم اس میں کمی کا بھی ہے۔

۱۵- رقم کو کم کرکے نقد فوری لین دین ہوجائے تو یہ جائز ہے، اوپر کی شقوں کا ہی یہ ایک حصہ ہے۔

۱۶- مہلت کے خاتمہ اور فوری ادائیگی کا مطالبہ درست ہے، بشرطیکہ معاملہ کرتے وقت یہ بات واضح اور صاف ہو، بلکہ ضروری ہے کہ یہ بات اسی وقت واضح اور صاف ہوجائے۔

۱۷- یہ معاملہ اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا اور اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا، اس لیے کہ اصلاً معاملہ فرم اور دوکان سے ہوتا ہے اور وہ جوں کی توں باقی رہتی ہے، البتہ بہتر ہے کہ معاملہ کے وقت اس کی بھی صراحت کرالی جائے۔

۱۸- بیع تقسیط کے حوالہ سے اس مسئلہ پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، سال بھر کے اپنے نقد خریداروں کو بھی کوئی فرم یا دوکان ایسا انعام دے سکتی ہے، اسے قمار اور ربا میں شامل کرنا مشکل ہے، ایسی ہی قرعہ اندازی سے دکان دار کسی قسط دار کی رقم میں کمی بھی کرسکتا ہے، اگر یہ تخفیف ناجائز نہیں ہے تو اس انعام کو ناجائز نہ ہونا چاہیے۔

۱۹- یہ صورت مفضی الی النزاع ہے اس لیے ناجائز ہے، بظاہر یہ قسطیں دوکان دار کے پاس جمع ہوں گی اور وہ اس کا فائدہ اٹھا کر متعلقہ فرد کو خراب سامان لینے پر مجبور کرسکتا ہے، مناسب اور بہتر ہے کہ قسطوں کے جمع کرنے کا یہ کام متعلقہ افراد اپنے طور پر کریں، اور قرعہ اندازی سے جس کا نام آجائے وہ سوسائٹی/کمیٹی سے رقم لے کر دوکان/فرم سے نقد یا بالاقساط جیسی اس کی سہولت ہو سامان خرید لے۔

☆☆☆

سامان فروخت کرتے وقت ایک سے زیادہ قیمت بتانا

مفتی سعید الرحمن فاروقی، ممبئی

۱- جن چیزوں کی خرید وفروخت ادھار جائز ہے اس کی نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرر کرنا بھی جائز ہے، کیونکہ مملوکات اور خرید وفروخت کے معاملے میں شریعت مطہرہ نے تسعیر اور قیمت کی تحدید وتعیین کی ہے نہ اس کی کسی کو اجازت دی ہے، اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تسعیر کو ظلم قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے مروی ہے:

''قال: غلا السعر على عهد النبي صلى الله عليه وسلم فقالوا: يا رسول الله! سعر لنا. فقال النبي ﷺ: إن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق وإني لأرجو أن ألقى ربي وليس أحد منكم يطلبني بمظلمة بدم ولا مال'' (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، از مشکوۃ/۲۵۱)۔

۲- بالاقساط ادا کرنے کی سہولت از قبیل انظار وتیسیر ہے، اس لیے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات مستحسن ہے۔

۳- شرعاً یہ پابندی نہیں ہے کہ ادھار خریدنے کی صورت میں صرف ادھار ہی کا تذکرہ کیا جائے، ہاں یہ پابندی ضرور ہے کہ کسی ایک صورت کو طے کرلیا جائے اور قیمت کی جہالت ختم کردی جائے (دیکھئے: مرقاۃ ۶/۶۱ تشریح حدیث: ''نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة'')۔

۴- ادھار کی فروختگی میں نقد کے مقابلے میں قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا کے دائرے میں نہیں آتا، اس کی ایک وجہ اولاً بالتفصیل گزر چکی، دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں اجل کے بالمقابل معاملے کی صحت کے لیے قیمت میں اضافہ ضروری ہے، چنانچہ ہندیہ میں ہے:

''ولو باعه بالف درهم نسيئة الى سنة ثم اشتراه بالف درهم إلى سنتين لا يجوز وإن زاد على الثمن درهما أو أكثر جاز وتجعل الزيادة في الثمن الثاني بمقابلة النقصان المتمكن بزيادة الأجل فينعدم النقصان كذا في المحيط'' (۳/۱۳۳)۔

اس جزئیہ میں صرف اور صرف ایک سال کی مدت کے مقابلے میں قیمت میں اضافہ لازمی اور جواز کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے، اس لیے اگر یہ درست ہے اور ربا میں داخل نہیں ہے تو برضاء بائع ومشتری قیمت کا تعین اور اس میں اضافہ بدرجہ اولی درست ہونا چاہیے۔

۵- یہ صورت بھی درست ہے، کیونکہ بائع ومشتری دونوں ایک متعین صورت پر رضامند ہیں اور بیع اسی کا نام ہے ''مبادلة المال بالمال بالتراضي''۔ پھر جس طرح ان کو قیمت میں اضافہ کا حق اجل کے مقابلے میں ہے کم کرنے کا حق بھی ہے اور بقیہ شرائط خود سوال میں موجود ہیں، اس لیے شرعاً یہ صورت درست ہے۔

۶- یہ صورت سود میں داخل اور ناجائز وحرام ہے جس کی ممانعت ''لا تاكلوا الربا أضعافا مضاعفة'' سے ثابت ہے، حقیقت میں یہ ربوا نسیئہ ہے، اس لیے یہ صورت قطعی ناجائز وحرام ہے۔

۷- مزید رقم کا مطالبہ ''كل قرض جر نفعا فهو ربا'' کے حرام میں داخل ہوکر ناجائز ہے، مالی جرمانہ کا قطعی ثبوت ہے نہ اس کی شرعاً کوئی نظیر ہے، اس لیے تاخیر کی صورت میں اضافی رقم کا مطالبہ اور عقد معاملہ ربا میں داخل ہے۔

۸- (الف)...... بائع کا مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، ابن عابدین عبد اللہ محمد بن سلمہ کی روایت نقل فرماتے ہیں (جو سمرقند کے چوٹی کے علماء میں سے تھے) کہ ان کے نزدیک کسی طرح مال مرہون سے انتفاع جائز نہیں، اگرچہ راہن کی اجازت ہو، کیونکہ یہ انتفاع سود ہے، اور سود اجازت دینے سے حلال نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ اس نے جتنا قرض دیا ہے مکمل وصول کرلے گا، لہذا یہ انتفاع کیسا اور اس کی اجازت کیسی؟ یہ بلاشبہ قرض کے علاوہ قرض پر زیادتی اور فضل ہے، اور یہی تو سود ہے، لہذا یہ معاملہ نہایت خطرناک ہے، علامہ آگے تحریر فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ لوگوں میں بہت رائج ہے، بلکہ ان معاملات میں یہی مقصود بن گیا ہے، اور معروف کالمشروط کے درجے میں ہے، لہذا انتفاع بالمرہون کے جواز کی کوئی صورت نہیں رہتی ہے (شامی ۶/۴۸۲)

(ب)...... بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے اگر مال مرہون ضائع ہوجائے تو اس کی تین صورتیں ہیں: قرض اور رہن، دونوں کی قیمت یکساں ہوگی، یا زیادہ

کم۔ اگر برابر اور یکساں ہے تو دین ساقط ہو جائے گا۔ اگر کچھ زیادہ ہے تو زیادہ میں مرتہن امین ہے، اور امانت پر بلا تعدی ضمان نہیں ہے، اور اگر کم ہے تو رہن کی مقدار قرض سے ساقط ہو جائے گی، اور بقیہ کے مطالبے کا حق باقی رہے گا (ہندیہ ۵/۴۴۷)۔

(ج)...... راہن سے خود کہا جائے کہ مرہون بیچ کر قیمت کے ذریعہ اپنا قرض ادا کردو، اگر کسی طرح وہ راضی نہ ہو اور نہ کوئی دباؤ قبول کرے تو قاضی کے پاس مرافعہ کرے، قاضی کو یہ اختیار اور حق ہوگا کہ راہن کے انکار کرنے پر مال مرہون بیچ کر مرتہن کا قرض ادا کردے (شامی ۶/۵۰۲)۔

اور جہاں قضاۃ کی دشواری ہے جیسے کہ ہندوستان، وہاں کے لیے بہتر صورت بلکہ قابل عمل صورت یہ ہے کہ بوقت معاملہ راہن مرتہن کو وکیل بالبیع بنادے، یا کسی عادل شخص کو جس کے ہاتھ میں رہن بھی ہو اپنا وکیل بنادے، یا پھر کسی ثالث کو وکیل بنادے اور یہ کہہ دے کہ اگر میں فلاں فلاں وقت تک اپنا قرض ادا نہ کرسکا تو آپ کو بیچنے کا اور قرض کی ادائیگی یا وصولیابی کا حق ہوگا، وکیل جس کو بنایا جائے اس میں اہلیت شرط ہے، اس طرح یہ معاملہ بڑی آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔

۹- (الف)...... فروخت شدہ سامان کو رہن بنانے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مشتری اولاً مبیع پر بطریق معروف قبضہ کرلے، ثانیاً بائع کے حوالے کردے، جیسا کہ صاحب "درمختار" کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ اگر مشتری بعینہ مبیع کو روکنے کے لیے بائع سے کہے قبضہ کے بعد تو اس کا رہن قرار دینا درست ہوگا، البتہ قبل القبض رہن بنانا درست نہیں ہے (درمختار علی ہامش الشامی ۶/۴۹۶)۔

(ب)...... محض اپنا حق وصول کرنے کے لیے بیع بالتقسیط میں مبیع کو روکنے کا حق بائع کو نہیں ہے (ہندیہ ۳/۱۵)۔

۱۰- ادھار فروخت کردہ سامان مقررہ طے شدہ قیمت سے کم میں حاصل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی ایک قسط یا اس سے بھی کم قرض باقی رہ گیا ہو اس صورت میں بھی اس سامان کو کم میں خریدنا روا نہیں ہے (ہندیہ ۳/۱۳۲)۔

۱۱- اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے: "لأن الأمور بمقاصدها"، اور فروخت وتصرف کا حق جب بائع کو حاصل ہے تو وہ اپنا مقصد (وصول قرض) بلا ممانعت حاصل کرسکتا ہے، لہذا عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ قبضے کا مقصود یہی ہے۔

۱۲- صرف کفالت پر اجرت کا مطالبہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہ عقد تبرع ہے، البتہ اگر اس کفالت پر کچھ واجبی اخراجات ہوتے ہوں، جیسا کہ آج کل عام ہے تو بقدر خرچ کچھ لینے کی گنجائش ہے، ورنہ کوئی کسی کا کفیل ہوگا نہ کفالت کے معاملات سے فائدہ اٹھانا ممکن ہوگا، لیکن یہ خیال ضروری ہے کہ یہ عقد عقد تبرع ہے، اس لیے بقدر ضرورت واجبی اخراجات ہی لیے جائیں۔

۱۳- ان دستاویزات کی خرید وفروخت جائز نہیں، کیونکہ یہ دَین کی غیر مدیون سے بیع ہے، اور یہ جائز نہیں (درمختار ۴/۵۱۷)۔

۱۴- یہ کمی کرنا اور قبل از وقت وصول کرنا جائز نہیں۔

۱۵- یہ شکل جائز ہے۔

۱۶- اسی شکل میں جائز ہونی چاہیے، جبکہ کچھ مطالبہ میں کمی کردے، جیسا کہ اوپر گزر چکا۔

۱۷- مابقی ایام کا نفع چھوڑ کر فوری مطالبے کا حق ہے۔

مگر حنابلہ کے قول کے مطابق معاملہ اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہے گا، یہی زیادہ اصح وارجح معلوم ہوتا ہے۔

۱۸- یہ صورت قمار اور ربا میں داخل نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کی تعریفیں اس پر صادق نہیں آتیں (التعریفات الفقہیہ/۴۳۴)۔

ربا اس لیے نہیں کہ اس میں خود قرض دار کو فائدہ حاصل ہوگا لہذا "کل قرض جر نفعا" میں داخل نہ ہوگا۔

۱۹- یہ یقیناً قمار میں داخل ہے۔ "لأن فيه تعليق الملك على الخطر وهو عين القمار فلا يجوز" (التعریفات)۔

☆☆☆

قسطوں پر سامان خریدنا اور فروخت کرنا

مولانا عبد اللطیف پالنپوری، گجرات

۱- ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع کے مؤجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں، لہٰذا اگر بائع یہ کہے کہ میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں، اور اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر اتفاق کیے بغیر دونوں جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے (فقہی مقالات/ ۸۲، ۸۳)۔

''ألا یری أنه یزاد فی الثمن لأجل الأجل'' (ہدایہ ۳/ ۵۸، نیز احسن الفتاوی ۳/ ۷۰)۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں ہے، بلکہ ادھار قیمت کی ادائیگی قسطوں کی صورت میں طے کرنا بھی جائز ہے۔

۳- بھاؤ تاؤ کے وقت نقد اور ادھار کی مختلف قیمتوں کا تذکرہ جائز ہے، صرف ادھار قیمت کا تذکرہ ضروری نہیں ہے، البتہ عقد بیع یعنی ایجاب وقبول کے وقت عاقدین کا قیمت اور مدت دونوں کی تعیین پر اتفاق ضروری ہے، لہٰذا بھاؤ تاؤ میں ذکر کردہ مختلف قیمتوں اور مدتوں میں سے کسی ایک کی تعیین کے بغیر بیع جائز نہ ہوگی (فقہی مقالات/ ۸۵)۔

۴- ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلے میں قیمت میں جو زیادتی مقرر کی جاتی ہے اس پر ربا کی تعریف صادق نہیں آتی، کیونکہ وہ قرض نہیں ہے، اور نہ ہی یہ اموال ربا کی بیع ہو رہی ہے، بلکہ یہ ایک عام بیع ہے اور عام بیع میں بائع کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے فروخت کرے (فقہی مقالات/ ۸۴)۔

۵- معاملے کی یہ صورت شرعاً درست ہے، کیونکہ نقد اور ادھار کی بنیاد پر جب قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بنا پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز ہے، اس لیے کہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے (فقہی مقالات/ ۸۵)۔

۶- جب ایک چیز کی اصل قیمت دس روپے طے ہوئی تو بیع کے نتیجے میں یہ دس روپے مشتری کے ذمہ دین ہو گئے، اب اس کی ادائیگی میں ایک ماہ کی تاخیر پر یا ہر ماہ کی تاخیر پر اضافی رقم کا مطالبہ یقیناً سود ہے، اس کے سود ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے (فقہی مقالات/ ۸۵)۔

۷- معاملہ کی یہ صورت بھی شرعاً سود میں داخل ہے۔

۸- ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے مشتری اپنی کوئی مملوکہ چیز بائع کے پاس بطور رہن رکھوائے اور بائع اس چیز کو بطور رہن اپنے پاس رکھ لے تو جائز ہے۔

(الف)...... لیکن اس شئ مرہون سے منتفع ہونا بائع کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ شئ مرہون سے منتفع ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے (ردالمحتار علی الدر المختار ۵/ ۳۱۰)۔

(ب)...... شئ مرہون بائع کے پاس بغیر تعدی کے ہلاک ہو جائے تو وہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی اور بائع دین اور شئ مرہون میں سے اقل کی قیمت کا ضامن ہوگا، اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا، اور اگر بائع کی تعدی کی وجہ سے شئ مرہون ہلاک ہوئی تو مرتہن (بائع) اس چیز کی بازاری قیمت کا ضامن ہوگا، ثمن کا ضامن نہ ہوگا (ہدایہ ۴/ ۵۰۲-۵۰۶)۔

(ج)...... خریدار کے وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول کرنے کی صورت میں بائع (مرتہن) شئ مرہون کو بیچ کر اپنی واجب الاداء قیمت وصول کر لے، لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لیے جائز نہیں، لہٰذا اگر اس شئ مرہون کے بیچنے سے اتنی رقم وصول ہوئی ہو کہ بائع کے اپنا دین وصول کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ جائے تو وہ بچی ہوئی رقم مشتری کو واپس لوٹانا ضروری ہے (فقہی مقالات/ ۸۷، ۸۸)۔

مرتہن کا شئ مرہون کو بیچ کر اپنی واجب الاداء قیمت کا وصول کرنا اس وقت جائز ہے جبکہ راہن نے عقد رہن کے وقت مرتہن کو شئ مرہون کے بیچنے کا وکیل بنایا ہو، اور اگر راہن نے عقد رہن کے وقت مرتہن کو وکیل نہیں بنایا ہے تو مرتہن کے لیے راہن کی اجازت ورضاء کے بغیر شئ مرہون کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

(ہدایہ ۴/ ۵۲۲)۔

۹- ادھار معاملہ میں مکمل قیمت یا چند اقساط وصول ہونے تک بائع کا فروخت کردہ سامان کو روکنا دو حیثیت رکھتا ہے، پہلی حیثیت ''حبس المبیع لا ستیفاء الثمن'' کی ہے (یعنی ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روکنا) اس صورت میں مبیع مضمون بالثمن ہوتی ہے، مضمون بالقیمۃ نہیں ہوتی، لہذا اگر حالت حبس میں وہ مبیع ہلاک ہو جائے تو اس صورت میں بیع فسخ ہو جاتی ہے، اور بازاری قیمت کا ضمان اس پر نہیں آئے گا، لیکن ادھار معاملے میں یا بیع بالتقسیط میں یہ صورت جائز نہیں ہے، کیونکہ بائع کو ثمن کے استیفاء کے لیے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں حاصل ہوتا ہے، ادھار بیع میں یہ حق بائع کو نہیں ملتا۔

(فقہی مقالات / ۸۸، نیز فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵)۔

دوسری حیثیت رہن ہونے کی ہے، یہ صورت دو طریقوں سے ممکن ہے، اول یہ کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع کے پاس بطور رہن چھوڑ دے، یہ صورت تو جائز نہیں، اس لیے کہ یہ وہی صورت بن جاتی ہے کہ بائع حصول ثمن کے لیے مبیع کو اپنے پاس روک لے اور حصول ثمن کے لیے حبس مبیع بیع مؤجل میں جائز نہیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشتری اس مبیع کو پہلے اپنے قبضہ میں لے لے اور پھر بطور رہن کے وہی مبیع بائع کے پاس رکھ دے، یہ صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے، اس صورت میں اگر مبیع بائع کے پاس بغیر تعدی کے ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ نہ ہوگی، بلکہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی، اور بائع دین و رہن میں سے اقل کا ضامن ہوگا اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا، اور اگر بائع کی تعدی کی وجہ سے ہلاک ہوئی تو بائع اس چیز کی بازاری قیمت کا ضامن ہوگا۔

(رد المحتار علی الدر المختار ۵/ ۳۲۰)۔

۱۰- معاملے کی یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ اس شرط کے ساتھ بیع کرنا کہ اگر خریدار نے متعینہ قسطوں میں سے بعض کو ادا نہ کیا تو بائع فروخت کردہ سامان پر بھی قبضہ کر لے گا اور ادا کردہ قسطوں کو بھی واپس نہیں کرے گا فاسد ہے، لہذا عاقدین پر اس بیع کا فسخ کرنا واجب ہے، اور بائع کے ذمہ لازم ہے کہ ادا کردہ قسطیں خریدار کو واپس کر دے (احسن الفتاوی ۶/ ۵۱۹)۔

۱۱- خرید کردہ سامان کو خریدار کے استعمال میں رکھتے ہوئے رہن قرار دینے کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ مرتہن رہن پر قبضہ کر کے راہن کے استعمال میں دیدے یہ صورت جائز ہے (ہدایہ ۴/ ۵۳۰، الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۵/ ۳۲۸)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مرتہن رہن پر قبضہ کیے بغیر راہن کے استعمال میں دیدے، ایسے رہن کو شریعت کی اصطلاح میں ''رہن سائل'' اور ''الذمۃ السائلۃ'' کہا جاتا ہے، فقہی اعتبار سے اس رہن کے جواز میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر فقہاء نے رہن کے صحیح اور پورا ہونے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ مرتہن اس شئ مرہون پر قبضہ کر لے، جبکہ رہن کی مذکورہ صورت میں مرتہن شئ مرہون پر قبضہ نہیں کرتا، اس لیے یہ رہن درست نہ ہونا چاہیے۔

لیکن جیسا کہ فقہاء نے ذکر فرمایا ہے کہ رہن پر مرتہن کے قبضہ کو شرط قرار دینے کی علت یہ ہے کہ مرتہن ضرورت کے وقت اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے، اور مذکورہ ''رہن سائل'' میں مرتہن کو شئ مرہون کی ملکیتی دستاویزات پر قبضہ کرنے کا حق حاصل ہے، نیز ایگریمنٹ میں مذکور شرائط کی بنیاد پر قانوناً مرتہن کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ ضرورت کے وقت اس کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے، لہذا رہن کی یہ صورت جائز ہوگی، اور اس میں حسی قبضہ شرط نہیں قرار دیا جائے گا (فقہی مقالات / ۹۴)۔

۱۲- خریدار کی طرف سے گارنٹی و ضمانت لینے کی صورت میں آج کل اداروں واشخاص کی طرف سے اجرت و معاوضہ کا جو لین دین رائج ہے، یہ جائز نہیں ہے، بلکہ حرام ہے، ہاں کریڈٹ لیٹر جاری کرنے میں بینک یا ادارے کے جو واقعی اخراجات و مصارف ہوتے ہیں خریدار سے ان کا مطالبہ کرنا جائز ہے، نیز بائع و مشتری کے درمیان معاملہ کی تکمیل کرانے میں بینک یا ادارے نے وکالت اور دلالی کی حیثیت سے کوئی خدمت انجام دی ہو تو اس خدمت پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے، لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ جائز نہیں ہے (فقہی مقالات / ۹۷، ۹۸)۔

۱۳- ادھار معاملے کے دستاویز کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے، خصوصاً جبکہ دستاویز میں تحریر کردہ قیمت و مالیت سے کم پر معاملہ کیا جائے، کیونکہ فقہاء کی اصطلاح میں یہ صورت ''بیع الدین من غیر من علیہ الدین'' کی ہے یا کرنسی کی بیع کرنسی سے ہے، جس میں کمی زیادتی اور ادھار دونوں ممنوع ہیں، اور احادیث ربا میں اس قسم کی بیع کا ناجائز ہونا منصوص ہے۔

البتہ اس معاملہ کو اس طرح درست کیا جا سکتا ہے کہ اولاً حامل دستاویز بینک کو مشتری سے دین وصول کرنے کا وکیل بنا دے، اور اس وکالت پر یہ شخص بینک کو کچھ اجرت بھی دیدے، اس کے بعد نئے معاملہ کے ذریعہ یہ شخص دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض لے لے، اور بینک کو اس کا اختیار دے

دے کہ جب مشتری سے اس دستاویز کے عوض رقم وصول ہو جائے تو وہ اس رقم سے اپنا قرض وصول کر لے، اس طرح یہ دو معاملے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے، اور شرعاً یہ دونوں معاملے درست ہیں، پہلا معاملہ تو اس لیے کہ شرعاً اجرت پر وکیل بنانا درست ہے، اور دوسرا معاملہ اس لیے کہ کمی زیادتی کی شرط کے بغیر قرض کا مطالبہ کرنا بھی شرعاً درست ہے (فقہی مقالات/۹۹)۔

۱۴- اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابراہیم نخعیؒ، امام زفرؒ، شیخ ابو ثورؒ اس کے جواز کے قائل ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ، زید بن ثابتؓ، محمد بن سیرین، حسن بصریؒ، سعید بن المسیبؒ، حکم بن عتیبہ، امام شعبی اور ائمہ اربعہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، حضرت مولانا محمد تقی صاحب دامت برکاتہم نے اس سلسلے میں روایتی طور پر طویل بحث کرنے کے بعد مدت کے مقابلہ میں دین کے کچھ حصے کے سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا ہے (فقہی مقالات/۱۰۰)۔

۱۵- ادھار معاملہ میں جب قیمت کی ادائیگی کے لیے وقت طے نہیں کیا گیا تو اجل کے مجہول ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ فاسد ہے، اور عاقدین کے لیے اس معاملہ کو فسخ کرنا واجب ہے (ہدایہ ۳/ ۴۶-۴۷)۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا، اور فوری طور پر مابقی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ چنانچہ خلاصۃ الفتاوی میں ہے کہ "ولو قال: کلما دخل نجم ولم تؤد، فالمال حال صح ویصیر المال حالا" (فقہی مقالات/۱۱۹)۔

۱۷- اس مسئلہ میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دین مؤجل فوری واجب الأداء ہو جاتا ہے، اور حنابلہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کر دیں اور اس کی ادائیگی پر اطمینان دلا دیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت سے فوری واجب الاداء نہیں ہوگا، بلکہ وہ پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا۔ لیکن بیع بالتقسیط میں چونکہ ثمن کا کچھ حصہ مدت کے مقابلہ میں بھی ہوتا ہے، اب اگر ہم اس میں فوری واجب الأداء والا قول اختیار کریں تو اس صورت میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے، لہذا مناسب یہ ہے کہ یا تو متاخرین حنفیہ کا یہ قول لیا جائے کہ ادائے دین کی جو مدت متفقہ علیہ تھی اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے اس وقت کے مقابلہ میں جتنا ثمن آتا ہے وہ ساقط کر دیا جائے، یا پھر حنابلہ کا قول اختیار کرتے ہوئے جس طرح وہ دین مؤجل تھا اب بھی اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے البتہ اس کے لیے یہ شرط ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دین کی توثیق کر دیں (فقہی مقالات/ ۱۳۳)۔

۱۸- نمائشوں کے انعامی ٹکٹ کے سلسلے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک مسئلہ لکھا ہے کہ چند سال سے کراچی، لاہور وغیرہ میں دیکھنے میں آیا ہے کہ مختلف قسم کی نمائشوں کے اندر داخلہ کا ٹکٹ ہوتا ہے اور نمائش کے منتظمین یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص مثلاً دس روپے کا ٹکٹ یکمشت خرید لے گا وہ اپنے اس ٹکٹ کے ذریعہ عام لوگوں کی طرح نمائش میں بھی داخل ہو سکے گا، اور ان ٹکٹوں پر بذریعہ قرعہ اندازی کچھ انعام مقرر ہوتے ہیں، جس کا نمبر نکل آئے اس کو وہ انعام بھی ملتا ہے۔

یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے، کیونکہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے، لیکن اب مدار نیت پر رہ جاتا ہے، جو شخص موہوم انعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہا ہے، اور جس کے پیش نظر صرف نمائش میں جانا ہو اور انتہائے انعام کی ہوس پیش نظر نہ ہو پھر اتفاقاً انعام بھی مل گیا وہ قواعد کی رو سے قمار کے حکم سے نکل گیا (جواہر الفقہ ۲/ ۳۴۵)۔

صورت مسئولہ میں بھی اگر موہوم انعام کی غرض سے قسط وار کوئی چیز خریدی ہے تو ایک گونہ قمار کا ارتکاب لازم آئے گا ورنہ نہیں۔

۱۹- اس معاملہ کا مدار بھی نیت پر ہے، اگر خریدار قرعہ اندازی کے ذریعہ کم قیمت میں سامان حاصل کرنے کی نیت سے اس اسکیم میں شریک ہوا ہے تو وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہا ہے، اور اگر خریدار قسط وار قیمت کی ادائیگی کی سہولت کی وجہ سے اس اسکیم میں شریک ہو رہا ہے، کم قیمت میں سامان حاصل کرنا اس کا مقصود نہیں ہے، گو پھر اتفاقاً مل جائے تو قواعد کی رو سے وہ قمار کے حکم سے نکل گیا (مستفاد از جواہر الفقہ ۲/ ۳۴۵)، فی نفسہ یہ معاملہ جائز ہے، جیسا کہ مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نے احسن الفتاوی میں لکھا ہے۔

☆☆☆

بیع بالتقسیط کے مسائل

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، علی گڑھ

۱- جمہور فقہاء کے نزدیک نقد قیمت کے مقابلہ میں ادھار قیمت زیادہ ہوسکتی ہے، اس لیے ادھار فروختگی کی قیمت زیادہ رکھنا صحیح ہوگا۔

۲- ادھار قیمت کی یکمشت ادائیگی کے وجوب پر کوئی دلیل نہیں ہے، یہ قسطوں میں بھی ادا کی جاسکتی ہے بشرطیکہ دونوں کے مجموعہ میں کوئی فرق نہ ہو، ورنہ یہ فرق وقت کے عوض میں ہوگا جو ربا ہے۔

۳- جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ سامان نقد وادھار دونوں طرح سے فروخت ہوسکتا ہے اور نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت زیادہ ہوسکتی ہے، پھر اس میں کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا کہ آدمی کہے کہ ابھی اگر دام دے دو تو میں سو روپے میں فروخت کرنے کو تیار ہوں، لیکن چھ ماہ بعد ادائیگی کی شکل میں اس کی قابل قبول قیمت ڈیڑھ سو روپے ہوگی، مگر بعض فقہاء نے اس طرح کے معاملہ کو جس میں نقد یا ادھار دو الگ الگ قیمتوں پر ایک ہی وقت میں معاملہ ہو منع کیا ہے کہ اس میں ادھار کی زیادہ قیمت نقد کے مقابلہ میں محض وقت کے عوض رکھی گئی ہوگی جو ربا ہے۔

۴- نقد اور ادھار دونوں طرح کی بیع انسان کی ضرورت ومصلحت رہی ہے اور ان پر ہمیشہ عمل رہا ہے، نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت کو زیادہ رکھنا ربا کے دائرہ میں نہیں آتا، کیونکہ بائع کو اختیار ہے کہ وہ اپنے سودے کو جس قیمت پر چاہے فروخت کرے۔ ربا اس وقت متحقق ہوگا، جبکہ معاملہ بیع ہو چکا ہو اور اس کے بعد مزید مہلت کے عوض مطالبہ ثمن میں اضافہ کردیا جائے۔

۵- صورت مذکورہ میں قیمت میں اضافہ ادائیگی کی مہلت میں اضافہ کے عوض معلوم ہوتا ہے، اس وجہ سے ربا کا شبہ ہوتا ہے۔

۶- یہ معاملہ ربا الجاہلیۃ کے انداز کا ہے جو کھلا ہوا سود ہے۔

۷- اس طرح کے معاملہ میں اگر مشتری "ذو عسرة" (تنگدست) ہے تو اسے موقع دینا ہوگا، اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ادائیگی کی رقم بڑھانا ربا ہوگا لیکن اگر مشتری "ذو میسرة" (مال دار) ہے تو فوری ادائیگی کے لیے وہ اس کو مجبور کرسکتا ہے، تاخیر کی شکل میں قاضی کے ذریعہ اپنے ضرر کی تلافی کے لیے اس پر تاوان لگانے کا مطالبہ کرسکتا ہے، اس لیے کہ "مطل الغني ظلم" اور "لي الواجد ظلم يحل عرضه وعقوبته" (الحدیث)۔ وأصل الشريعة "الضرر يزال" لیکن بائع ومشتری یا دائن ومدیون کے درمیان اس طرح کا پیشگی معاہدہ کرنا کہ تاخیر کی شکل میں اتنی زیادہ رقم یا اسی حساب سے زیادہ رقم دینا ہوگا ناجائز ہے۔

۸ (الف)...... بائع کو مال مرہون سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے، البتہ اگر وہ اس پر کچھ خرچ کر رہا ہے تو اس خرچ کے برابر اس سے استفادہ کرسکتا ہے۔

(ب)...... بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے مال ضائع ہوجائے تو وہ اس کا ضامن ہوگا، اس کے ضیاع پر اس کا حق جاتا رہے گا۔

(ج)...... اگر راہن نے اجازت دے رکھی ہے کہ اگر وقت پر ادا نہ کرے تو گروی رکھی چیز کو فروخت کر کے وہ اپنا حق وصول کرسکتا ہے تو ایسا وہ کرسکتا ہے ورنہ حاکم کے ذریعہ اس کو فروخت کروا کے اپنا حق وصول کرے۔

۹- جمہور کے نزدیک مکمل ادائیگی تک روک سکتا ہے۔ کچھ کے نزدیک جب مطالبہ کا کچھ حصہ رہ جائے تو جزء رہن کو روکے۔ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر شئ مرہون قابل تجزی ہو تو کچھ باقی مطالبہ کے لیے وہ پورے کو رہن رکھنے کے بجائے صرف جزء کو رہن رکھے۔

(الف، ب)...... اس مسئلہ پر فقہاء احناف کا اختلاف ہے کہ بائع کا فروخت کردہ سامان تا وقت ادائیگی اس کے پاس چھوڑ دینا رہن ہوگا، یا امانت، یا حبس المبیع، خاکسار کے نزدیک یہ معاملہ جس میں مشتری نے مبیع کو اپنے قبضہ میں نہیں لیا اور بائع کو ثمن نہیں ملی، ناتمام و معلق ہے۔ شئ

یہ "بیع الکالئ بالکالئ" سے زیادہ مشابہ ہے، کسی وقت بھی بائع مشتری کے خیالات بدل گئے تو معاملہ نزاع کا باعث بن سکتا ہے، اس لیے اس طرح کے معاملہ ہی پر پابندی عائد کردینی چاہیے۔ کم از کم ثمن یا مبیع میں سے ایک کی ملکیت اور قبضہ منتقل ہوجانا چاہیے۔

۱۰- یہ شکل بیع العربون یا بیع العربان سے مشابہ ہے جس میں مشتری کچھ رقم پیشگی دے دیتا ہے اور وقت پر ادائیگی نہ ہونے کی شکل میں بائع اس رقم کو ضبط کرلیتا ہے، ابن ماجہ کی ایک حدیث میں اس کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن امام احمدؒ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ بہت سی جگہوں پر یہ عرف کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔

۱۱- یہ رہن نہیں کوئی اور معاہدہ یا معاملہ ہوا۔ اس لیے کہ رہن میں فروخت اور تصرف یا تو راہن کی اجازت سے ہوسکتا ہے یا نادہندگی کی شکل میں حاکم یا قاضی کے حکم سے ایسا کرسکتا ہے۔

۱۲- او آئی سی کی فقہ اکیڈمی اپنے بارہویں اجلاس منعقدہ جدہ بتاریخ ۲۲-۲۵، دسمبر ۱۹۸۵ء میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ شریعت کی رو سے کفالہ میں کسی نفع یا اجرت کا لینا ناجائز ہے، مسئلہ اجتہادی ہے اور کریڈٹ لیٹر اس وقت بیرونی تجارت کے لیے ناگزیر ہے، اور اس عہد کی عام مروج چیز بن گیا ہے، اس لیے اس حد تک اجازت ہونی چاہیے۔

۱۳، ۱۴- یہ تقریباً یکساں معاملے ہیں اور "ضع وتعجل" کے تحت آتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ اور امام زفرؒ کے نزدیک یہ جائز ہے، یہ لوگ بنی نضیر کے واقعہ سے استشہاد کرتے ہیں جو حقیقت میں تحریم ربا سے پہلے کا واقعہ ہے، جمہور کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ بھی ربا کی قسم ہے۔ اس میں قرض دہندہ کا استحصال ہوسکتا ہے۔ "لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ"۔

۱۵- اگر نیت پہلے سے یہ ہو کہ "ضع وتعجل" کا معاملہ کرنا ہے تو ناجائز ورنہ جائز ہے۔

۱۶- "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" لیکن اگر مالدار ہے تو کرسکتا ہے۔

۱۷- فریقین میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو معاملہ پر نظر ثانی کا اختیار ہونا چاہیے کہ ضروری نہیں کہ ورثاء کے حالات اس طرح کی خرید وفروخت کی اجازت دیں۔

۱۸، ۱۹- یہ سب طریقے گاہکوں کو لبھانے اور بیوقوف بنانے کے ہیں، جس کو انعام ملتا ہے یا قسط سے بری کردیا جاتا ہے اس کی رقم دراصل دوسروں سے وصول کی جاتی ہے، اس طرح اس حصہ تک یہ قمار سے مشابہ ہے، اسی لیے کراہیت سے خالی نہیں، انعام اگر پہلے سے طے نہیں ہے، یا معلوم ہے کہ انعام سے پہلے بھی وہی قیمت تھی تو مباح ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

ادھار فروخت میں قیمت کی زیادتی کا مسئلہ

مولانا عبدالرشید قاسمی، جونپور

۱- مدت کے بدلے قیمت میں اضافہ:

اس مسئلہ پر علماء قدیم اور جدید دونوں نے بحث کی ہے، چنانچہ بعض فقہاء اس اضافہ کو ناجائز کہتے ہیں، اس لیے کہ ثمن کی یہ زیادتی مدت کے عوض میں ہے، اور جو ثمن مدت کے عوض میں دیا جائے وہ سود ہے، یا کم از کم سود کے مشابہ، یہ مسلک زین العابدین ابن الحسین، الناصر المنصور باللہ اور ہادو یہ کا ہے، نیز علامہ شوکانیؒ نے ان فقہاء کی یہی ترجمانی کی ہے (نیل الاوطار ۵/ ۱۷۲)۔

ائمہ اربعہ، جمہور فقہاء اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ میں قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع مؤجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں حتمی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں، لہذا اگر بائع یہ کہے کہ میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں، اور اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر بلا اتفاق کیے ہوئے دونوں جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے، لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک صورت اور کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں تو یہ بیع جائز ہوگی (ترمذی ۱۸/ ۳۰۱، المغنی ۴/ ۱۷۷)۔

۲- اگر عاقدین ایک ہی مجلس میں کسی ایک پر اتفاق کر لیں اور متفق ہونے کے بعد علیحدگی ہو تو جس شکل پر اتفاق ہوا ہے وہی جائز ہے، اور اگر دونوں صورتوں میں سے کسی پر بلا متفق ہوئے علیحدگی ہوگئی تو یہ بیع جائز نہیں ہوگی۔

۳- دو قیمتوں میں سے ایک کا تعین ضروری ہے:

یہ صورت بھی جائز ہے، کیونکہ جب نقد اور ادھار کی بناء پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بناء پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز ہے، لیکن اس کے جواز کے لیے ضروری ہے کہ عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کے تعین پر اتفاق ہو چکا ہو۔

۴- ثمن میں افزونی جائز ہے:

مذکورہ بالا تفصیلات اس بیع کے جواز کے بارے میں تھیں جب نفس ثمن میں زیادتی کر دی جائے، لیکن اگر یہ بیع اس طرح کی جائے جس طرح آج کے تاجر عموماً کرتے ہیں کہ نقد کی صورت میں اس چیز کی ایک قیمت مقرر کر لیتے ہیں اور پھر اس قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی بناء پر اصل قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں یہ صورت سود میں داخل ہے۔

۵- اگر صورت مسئولہ کی کوئی شکل عاقدین کی جدائیگی سے پہلے طے ہوگئی تو یہ معاملہ صحیح اور درست ہوگا ورنہ نہیں۔

۶- صورت مسئولہ میں آج کی اقتصادی پالیسی نظر آرہی ہے اور وہ یہ کہ بائع نے مشتری کو مجبور کر دیا ہے کہ ہر ماہ کی تاخیر پر مزید دو روپے دینے ہوں گے، لہذا یہ شکل سود میں داخل ہے اور شرعاً یہ معاملہ ناجائز ہوگا۔

۷- صورت مسئولہ دو وجوہ سے ناجائز ہے، ایک تو مدیون کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی وجہ سے اور جرمانہ یا مالی تاوان کے نام سے سود حاصل کرنے کی وجہ سے اور یہ دونوں امور شریعت اسلامیہ کی نظر میں قبیح ہیں، لہذا معاملہ کی یہ صورت شرعاً ناجائز ہے۔

۸- ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے رہن رکھوانا یا تیسرے شخص سے گارنٹی کا حاصل کرنا جائز ہے۔

(الف)...... بائع کے لیے مال مرہون سے منتفع ہونا کسی صورت میں جائز نہیں، اس لیے کہ شئ مرہون سے نفع اٹھانا بھی ربا کی ایک صورت ہے (ہدایہ ۳/ ۵۰۶، الفقہ الاسلامی ۴/ ۷۲۵)۔

(ب)...... بائع کے قبضہ میں ہوتے ہوئے مال مرہون اگر ضائع ہو جائے تو اس کا حکم امانت کا ہے۔

ضائع ہونے کی صورت میں اگر مرتہن نے مال مرہون میں اپنا تصرف کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ضائع ہوا ہے تو مال مرہون کا ضامن ہوگا اور ضمان بھی غصب کا یعنی پوری قیمت کے ساتھ، کیونکہ مال مرہون میں دین کی مقدار سے جو مال زائد تھا وہ امانت تھا اور امانت کا حکم یہ ہے کہ اگر امین کے تصرف سے ضائع ہوئی ہے تو اس میں ضامن ہوگا (ہدایہ ۳/۵۰۶)۔

اور اگر امانت کی غیر سے حفاظت کرائی اور وہ ہلاک ہوگئی تو ضامن ہوگا (ہدایہ ۴/۲۵۷)۔

(ج)...... خریدار کے وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے اور ٹال مٹول سے کام لینے کی صورت میں فروخت کنندہ مال مرہون کو فروخت کر کے اپنی واجب الاداء قیمت وصول کر سکتا ہے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اگر مال مرہون مرتہن کے قبضہ میں ہلاک ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ مرتہن کا قرض اور مال مرہون کی قیمت برابر ہیں یا کم وبیش اگر برابر ہیں تو کہا جائے گا کہ مرتہن نے اپنا قرض وصول کر لیا ہے اور اگر قرض کم ہے اور مال مرہون کی قیمت زیادہ ہے تو یہ زائد مرتہن کے قبضہ میں امانت ہوگی۔

۹- اس قسم کے رہن کے جواز میں فقہاء متاخرین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، بشرطیکہ صلب عقد میں یہ رہن مشروط نہ ہو، لہذا صورت مسئولہ (الف) جائز ہے، بشرطیکہ صلب عقد میں یہ رہن مشروط نہ ہو اور صورت مسئولہ (ب) جائز نہیں، کیونکہ بیع بالتقسیط بیع مؤجل ہوتی ہے اور بائع کو حصول ثمن کے لیے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں حاصل ہوتا ہے، ادھار بیع میں یہ حق بائع کو نہیں ملتا (فتاوی ہندیہ ۳/۱۵، فتح القدیر ۹/۹۹، ردالمحتار ۶/۴۹۷)۔

۱۰- ایسی صورت میں بائع پر واجب ہے کہ وہ ادا کردہ قسطیں مشتری کے حوالہ کردے ورنہ یہ معاملہ حرام ہوگا۔

۱۱- صورت مسئولہ میں خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس اور اس کے استعمال میں رکھ کر رہن قرار دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ بائع اس کے استعمال کی خود اجازت دے دے یا خود ہی خریدار کے پاس رہن رکھ دے۔

۱۲- گارنٹی پر اجرت لینا کسی بھی حال میں جائز نہیں، لیکن موجودہ دور میں تاجر حضرات کے لیے کریڈٹ لیٹر جاری کرنے میں واقعتا جو اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں ان کا مطالبہ کرنا جائز ہے، لہذا تجارت کے درمیان بحیثیت وکیل یا دلال یا درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے یہ شخص جو خدمات بجالاتا ہے مثلاً آمدورفت کا خرچ وغیرہ تو اس پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں (فقہی مقالات ۱/۹۶)۔

۱۳- آج کل کی تجارت میں لین دین کے لیے دستاویزات تیار کرائے جاتے ہیں اور یہ دستاویز لین دین میں قابل انتقال آلہ بن چکا ہے، اور بائع جو اصل دائن اور حامل دستاویز ہوتا ہے وہی بعض اوقات اس دستاویز کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ پر تحریر شدہ دین کی مقدار سے کم پر بیچتا ہے تاکہ معین تاریخ سے پہلے اس کو رقم حاصل ہو جائے اس بیع کو بل کی کٹوتی کہا جاتا ہے لہذا حامل دستاویز جب یہ رقم حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ تیسرے شخص کے پاس چلا جاتا ہے اور عموماً یہ تیسرا شخص بینک ہوتا ہے اور وہاں جاکر وہ دستاویز اس کے حوالے کر دیتا ہے اور بینک اس کے اینڈورس مینٹ کے بعد وہ دستاویز قبول کر لیتا ہے اور بینک دستاویز پر تحریر شدہ رقم میں سے فیصد کے اعتبار سے کٹوتی کر کے باقی رقم حامل کے حوالے کر دیتا ہے۔

اینڈورس مینٹ کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ حامل دستاویز اس دستاویز کی پشت پر دستخط کر دیتا ہے جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ دستاویز کا حامل بینک کے حق میں اس رقم سے دست بردار ہو رہا ہے۔

بل آف ایکسچینج:

یہ شرعاً ناجائز ہے، البتہ مولانا تقی عثمانی نے مذکورہ معاملہ کو تھوڑی سی تبدیلی کے ذریعہ درست کرنے کی ایک صورت تجویز کی ہے۔ (فقہی مقالات/۹۹)۔

۱۴- صحابہ میں سے حضرت عبداللہ ابن عباس، تابعین میں سے ابراہیم نخعی، احناف میں سے امام زفر اور شوافع میں سے شیخ ابوثور اس صورت کے جواز کے قائل ہیں، صحابہ میں سے حضرت عبداللہ ابن عمر اور زید ابن ثابت، تابعین میں سے محمد ابن سیرین، حسن بصری، ابن مسیب، حکم ابن عتبہ اور امام شعبی عدم جواز کے قائل ہیں، نیز یہی مسلک ائمہ اربعہ کا ہے (موطا امام مالک ۱/۶۰۶، مصنف عبدالرزاق ۱/۱۷، موطا امام محمد ۱/۶۰۶، ۳۳۲، الواقدی ۱/۲۷۴)۔

۱۵- علماء مالکیہ کے نزدیک دیون حالہ میں ''ضع وتعجل'' کا اصول جاری کرنا جائز ہے (المدونۃ الکبریٰ ۱۱/۲۷)، اور ظاہر یہ ہے کہ فقہاء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ متفق ہیں، اس لیے کہ دوسرے علماء نے جہاں کہیں ''ضع وتعجل'' کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے وہاں دیون مؤجلہ کی قید بھی لگائی ہے، جیسا کہ موطا میں امام محمد کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

نیز یہ بات بھی ثابت ہے کہ کتب فقہیہ میں مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، لہٰذا اس سے ظاہر ہوا کہ دیون حالہ میں ''ضع وتعجل'' جائز ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نصف دین ساقط کرنے کے بارے میں حضرت کعب اور حضرت ابن ابی حدردؓ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اہل علم اس واقعہ کے درمیان اور ان آثار کے درمیان جو ''ضع وتعجل'' کے بارے میں مروی ہیں اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ ان آثار اور روایات کا تعلق دین مؤجل سے ہے اور یہ واقعہ دین حال سے متعلق ہے اور کتاب الرحمۃ میں ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے پر کسی مدت کے لیے دین واجب ہو تو دائن کو مدت کے آنے سے پہلے یہ کرنا جائز نہیں کہ دین کا کچھ حصہ معاف کردے تا کہ بقیہ دین فوراً وصول کرلے، ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے اس وقت کچھ دین وصول کرے اور باقی معاف کردے (المسوی علی المصفی ۲/۳۸۲)۔

دیون مؤجلہ اور دیون حالہ میں فرق اس لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ دین حال میں مدت کی شرط نہیں ہوتی اور تاخیر مدیون کا حق نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں مدت منتفی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ دین کا جو حصہ معاف کردیا ہے وہ مدت کے عوض میں معاف کیا ہے، لہٰذا اس میں ربا کے معنی نہیں پائے جاتے ہیں اور ''ضع وتعجل'' کا اصول اس صورت میں استعمال کرنا جائز ہے۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور فوری طور پر مابقیہ جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا جائز ہے (خلاصۃ الفتاویٰ ۳/۵۴، الفوائد الخیریۃ علی جامع الفصولین ۲/۴۰)۔

۱۷- جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہو جائے گا، لہٰذا صورت مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ دیون مؤجلہ کی ادائیگی فی الفور ہونی چاہیے (تفصیل کے لیے دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۴/۴۸۶)۔

۱۸- صورت مسئولہ میں غور وفکر کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ آج کل عموماً تجار کا یہ معمول ہے کہ مشتری کو بطور انعام کچھ بیع کے ساتھ یا اس کے بعد دیتے ہیں اور اس انعام کو قرعہ اندازی کے ذریعہ ادا کرتے ہیں، لہٰذا صورت مسئولہ سے بظاہر یہی معلوم ہو رہا ہے کہ اس پر تعامل ہو چکا ہے نیز عرفاً بھی اس پر عمل ہوتا ہے تو استحساناً یہ صورت جائز ہے (الفقہ الاسلامی ۴/۴۸۰)۔

اور اگر اس پر تعامل اور عرف نہیں، نیز بیع میں مشروط طور پر طے ہوتا ہے کہ بائع مشتری کو مبیع کے خریدنے پر یہ سامان دے گا تو پھر یہ صورت ناجائز ہوگی، کیونکہ عاقدین میں سے کسی ایک کا شرط لگانا اسلامی فقہ میں ناجائز ہے، کیونکہ عقد میں اضافہ نفع مشروط طور پر ہو تو یہ ربا ہے (الفقہ الاسلامی ۴/۴۸۱)۔

۱۹- یہ صورت دو وجوہ سے جائز ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ اس پر تعامل ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ اس کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ شرکاء نے ایک متعین وقت کے لیے ایک شخص کو قرض دیا اور تنہا اس شخص کے لیے سب کی ادائیگی ایک ہی وقت میں مشکل ہے، لہٰذا قرعہ اندازی کے ذریعہ ہر ایک کو اس قرض کے عوض میں ایک سامان مل جاتا ہے، اور وہ لے کر علیحدہ ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ صورت بھی جائز ہے۔

☆☆☆

قیمت کی ادائیگی میں سہولت کا مسئلہ

مولانا اخلاق الرحمن قاسمی [1]

۱- جس سامان کو ادھار فروخت کیا جائے اگر اس کی قیمت نقد فروختگی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کردی جائے تو درست ہے، کیونکہ یہاں ربا کی کوئی صورت نہیں پائی جارہی ہے، باقی نفس ادھار کا جواز تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ مدت بھی معلوم ہو۔

''ویجوز البیع بثمن حال و مؤجل إذا کان الأجل معلوما'' (ہدایہ ۳/۲۱)۔

۲- ادھار قیمت کی ادائیگی جس طرح یکمشت ہوتی ہے اسی طرح اس میں یہ بھی گنجائش ہے کہ قسطوں میں ادا کی جائے جب کہ قسطوں کی صورت میں زیادتی کا مطالبہ نہ ہو، ورنہ ربا والی بات پائی جائے گی جو درست نہیں ہے، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ کم پونجی والوں کے لیے بائع کی جانب سے ایسی سہولت میں بائع تمام تر نہ سہی، لیکن ایک حد میں اس فضیلت کے مستحق ہوجائیں گے جس فضیلت کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مدیون کو زبوں حالی کے باعث مہلت دے دیتے ہیں یا مطالبہ ہی نہیں کرتے (تفصیل کے لیے دیکھئے: مسلم شریف ۲/۱۸، باب إنظار المعسر)۔

۳- ایک شخص سامان کو نقد و ادھار دونوں طرح فروخت کرتا ہے، اور ہر صورت میں قیمت کے فرق کے ساتھ معاملہ کرتا ہے تو علت ربوی کے نہ ہونے کی وجہ سے دونوں صورتوں کا جواز ہے۔

۴- باقی یہ شبہ کہ زائد قیمت ادھار فروختگی کی صورت میں بظاہر وقت کے عوض محسوس ہوتی ہے سو یہ واقعۃً تاخیر ہی کے سبب قیمت میں بڑھوتری واقع ہوئی ہے، لیکن چونکہ اس میں علت ربوی نہیں پائی جارہی ہے، اس لیے فروختگی کے لیے مانع نہ ہوگی۔

۵- معاملے کی یہ شکل تبرعاً درست ہے، کیونکہ علت ربا کا یہاں گزر نہیں۔

۶- یہ معاملہ ربوی ہے، شرعاً درست نہ ہوگا اور ارشاد نبوی: ''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' کے تحت آئے گا (تکملۃ فتح الملہم ۱/۵۷۴)۔

۷- معاملہ کی یہ صورت بھی شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ ''أخذ الزیادة علی القرض'' اور ''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' کے تحت نمبر ۶ کی طرح یہ معاملہ بھی آتا ہے۔

۸- ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے بائع بسا اوقات خریدار سے کوئی مال رہن رکھواتا ہے تو اس بارے میں واضح رہے کہ:

(الف) بائع اور مرتہن شئ مرہون سے منتفع نہیں ہوسکتا، الا یہ کہ مالک کی اجازت ہو۔

''لیس للمرتهن أن ینتفع بالرهن إلا أن یأذن له المالك لأن له حق الحبس دون الانتفاع'' (ہدایہ ۴/۵۲۲)۔

(ب)...... بائع کے قبضہ میں رہتے ہوئے شئ مرہون ضائع ہوجائے تو دین ساقط ہوجائے گا بشرطیکہ شئ مرہون سے دین ادا ہوجاتے ہوں، کمی کی صورت میں راہن کے ذمہ باقی کی واپسی ضروری ہے۔

''ولو هلك فی یده سقط الدین اذا کان به وفاء بالدین لبقاء الرهن'' (حوالہ بالا)

(ج)...... اگر راہن دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کررہا ہے تو مرتہن اپنا حق وصول کرنے کی خاطر مال مرہون کو اپنے حق کے بقدر فروخت کرسکتا ہے۔

''وإذا حل الدین وهو علی صفة القیمة استوفی المرتهن منها قدر حقه، لأنه جنس حقه ثم إن کان فیه فضل یرده علی الراهن'' (ہدایہ ۴/۵۴۵)۔

۹- خرید کردہ سامان کو یا یہ کہا جائے کہ فروخت کردہ سامان کو بائع اپنے پاس اس وقت تک کے لیے روک سکتا ہے جب تک مکمل قیمت یا اس کی چند

---

[1]

اقساط جمع نہ کردی جائیں، ایسی صورت کو حضرات فقہاء ''حبس المبیع لاستیفاء الثمن'' کا نام دیتے ہیں، لیکن ایسی صورت میں بائع کی ذمہ داری مبیع سے متعلق یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں کرسکتا، مگر دو صورتوں میں بائع کے لیے قبضہ سے پہلے مبیع میں تصرف کی گنجائش ہے۔

(الف)......بائع کے لیے اذن واجازت ثابت ہو۔

(ب)......مقررہ مدت تک ثمن کی عدم ادائیگی کی صورت میں اذن واجازت ہو۔اب اگر بائع مشتری کی اجازت کے بغیر قبضہ سے پہلے مبیع میں تصرف کرتا ہے تو درست نہیں ہے، اور اس کی حیثیت ایسی ہے کہ کسی نے مبیع کو قبضہ سے قبل رہن رکھ دیا ہو تو جس طرح یہ درست نہیں ہے اسی طرح بائع کا تصرف قبل اذن بھی درست نہیں۔

''فلو تصرف فيه البائع قبل قبضه فإما بأمر المشتري أو لا فلو بأمره...صح وصار المشتري قابضا...وتصرفه بلا أمر المشتري كما لو رہن المبيع قبل قبضه'' (شامی ۵/۱۴۹)۔

۱۰- شرعاً یہ معاملہ کہ قیمت طے شدہ ادا نہ کرنے پر بائع کا سامان واپس کرلینا شرط کی بناء پر درست ہے، لیکن طے شدہ اقساط میں سے بعض کے ادا کرنے کی صورت میں اور مکمل ادا نہ کرنے کی صورت میں سامان پر قابض ہونے کے ساتھ اس بنا پر اپنے سامان جیسا تصرف کرکے ادا کردہ قسط واپس نہ کرنا کھلا ہوا ظلم اور غصب ہے جو جائز نہیں۔

۱۱- ایسے خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس اور اس کے استعمال میں رکھ کر کہ جس میں فروخت وتصرف کا حق بائع ہی کو ہو رہن قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ ''رہن المبیع قبل قبضہ'' کے مرادف نہیں تو تقریباً اسی جیسا ہے غرض کہ رہن کے لیے جو باتیں درکار ہیں وہ یہاں نہیں پائی جاتیں ہیں، اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

۱۲- حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں اداروں اور کمپنیوں کی طرف سے اس قسم کی ضمانت اور ذمہ داری اشخاص وافراد کی کفالت وضمانت سے کم نہیں، بلکہ میرے خیال میں اداروں اور کمپنیوں کی کفالت وضمانت موجودہ دور میں اشخاص وافراد کی ضمانت کے بالمقابل زیادہ افادیت پر مشتمل ہے، اور کفالت وضمانت کی مشروعیت جس غرض کے پیش نظر ہے، یعنی متبائعین میں سے جس کسی کے نقصان کا اندیشہ ہو اس کا سدباب، یہ شئ جس طرح افراد واشخاص کی کفالت اور ضمانت سے پوری ہوتی ہے اسی طرح ادارے اور کمپنیوں سے بھی، اس لیے کریڈیٹ لیٹر جو اس عہد کی عام ومروج چیز بن گئی ہے اس کے لیے ''کفالۃ'' کے باب میں گنجائش ہے اور کفالت کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (فتح القدیر ۶/ ۲۸۵)۔

۱۳- اگر یہ صورت واقعی مروج ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان دنوں مبیع ادھار سپرد کرتے وقت ادھار قیمت کی جو دستاویز تیار کرائی جاتی ہے اس دستاویز کی حیثیت عرفی یہ ہوسکتی ہے کہ اگر خریدار کے پاس وہ دستاویز ہے تو وہ سامان اس کا سمجھا جائے گا ورنہ نہیں، گرچہ متعینہ مدت تک مبیع اس کے قبضہ میں ہے لیکن اس پر مشتری اور خریدار کا تصرف تام نہیں ہے، کیونکہ مقررہ مدت میں قیمت حاصل نہ ہونے پر بائع اختیار فروختگی کے سبب یا خریدار کے اذن سے وقت سے قبل رقم حاصل کرنے کی صورت میں خریداروں کے نام کو ساقط کرکے خریدار ثانی کا نام دستاویز پر نامزد کردیتا ہے تو سامان گویا کمپنی اور ادارہ کے نزدیک خریدار ثانی کا ہوتا ہے جو اب تک خریدار اول کے قبضہ میں ہے اور چونکہ مبیع کو اول خریدار کے قبضہ میں دے دینے کی صورت میں استعمال نہ ہونے کا کوئی مطلب نہیں ہے، اس لیے پہلے کی طرح اس کی پوزیشن نہ رہی، بایں وجہ دستاویز کی خرید وفروخت میں اس کے اندر کے تحریر کردہ قیمت سے کم پر معاملہ کیا جاتا ہے۔

اس پہلو سے دستاویز کی فروختگی اور مالیت کے بارے میں غور کرنے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

(الف)......اسے رہن کا درجہ دیا جائے۔

(ب)......یا حبس مبیع کا، لیکن ہم رہن کا درجہ دستاویز کو اس لیے نہیں دے سکتے کہ رہن خریدار کی طرف سے بائع کے سپرد کیا جاتا ہے، یا اس کے جو اس کے قائم مقام ہو، جیسے کمپنی وغیرہ، اور یہاں بائع یا کمپنی دستاویز تیار کرواکر متعینہ مدت تک کے لیے خود اپنے پاس رکھتی ہے، اس لیے دستاویز کے لیے رہن کے معنی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

البتہ دستاویز کو "حبس مبیع" کا درجہ دینے کی گنجائش ملتی ہے، کیونکہ دستاویز میں اتنی طاقت ہے کہ قیمت وصول نہ ہونے پر بشرط اذن دستاویز کو فروخت کرنے کے بعد قیمت وصول ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ حبس مبیع سے بائع کو جو مقصد حاصل ہوتا ہے دستاویز کے اندر بھی یہ چیز ایک حد تک پائی جاتی ہے، لہذا دستاویز کو "حبس مبیع" کا درجہ دینے کی گنجائش ملتی ہے، اور قبضہ سے پہلے مبیع پر بائع کا تصرف واختیار کس دائرہ میں رہ کر ہوگا ان تمام باتوں پر نظر رکھنی پڑے گی۔

۱۴- اس کی تفصیل گزر چکی ہے، یہ صورت ربا کے تحت شامل نہ ہونے کے سبب درست ہے۔

۱۵- اس صورت میں اگر یہ شکل اختیار کی جائے کہ رقم کو کم کر کے نقد فوری لین دین ہو جائے تو درست ہے جس طرح نمبر ۱۴۔

۱۶- طے شدہ قسطوں میں سے کسی قسط کی تاخیر پر مہلت کے معاملہ کو ختم کرنا اور فوری طور پر ماقبی جملہ قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ جب کہ مدیون معسر بھی ہو بہتر نہیں ہے، جواز کی صورت ہر آن ہے، کیونکہ دائن کو اپنا قرض طلب کرنے کا حق ہر وقت رہتا ہے، اس لیے کہ حدیث شریف میں معسر مدیون کو مہلت دینے کی بڑی فضیلت آئی ہے، جس کا تذکرہ اس سے پہلے ہو چکا ہے۔

۱۷- اس سلسلے میں اولاً دین کے بارے میں وضاحت یہ ہے کہ "تعلیق الٲجیل بالشرط صحیح" (شامی ۶ / ۱۵۷)، اور جہاں تک مرنے کے بعد مدیون کے مذکورہ دین کا مسئلہ ہے تو دین مرنے کے بعد ساقط نہیں ہوتا، باقی اگر دائن کے کہنے کے مطابق اور مدیون کے ورثہ کے علم کے مطابق مدیون پر قرض ہے تو ادائیگی میں تو کوئی کلام ہی نہیں (شامی ۶ / ۱۶۰) رہی تاجیل تو قسطوں سے ادا کرنا یہ بھی تاجیل کے تحت آتا ہے، اور جب یہ بات ہے تو تاجیل دین میت صحیح اور غیر لازم ہے، لہذا قسطوں والی صورت کو ترک کر کے اگر ورثہ فوری طور پر ادا کرتے ہیں تو بھی صحیح ہے، اور قسطوں سے بھی ادائیگی صحیح ہے (شامی ۶ / ۱۵۰)۔

باقی دائن کے مرنے کے بعد مدیون کو دو طرح سے دینے کا حق ہے، اور جب تاجیل ہے تو مقررہ مدت سے قبل بھی دائن کے ورثہ کو طلب کرنے کی گنجائش ہے۔

۱۸، ۱۹- مذکورہ دونوں صورتیں قمار میں داخل ہیں، البتہ بعض صورتوں میں "أخذ الزیادۃ" کے باعث ربا کا جو شبہ پیدا ہوتا ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ یہاں زیادتی بعوض سامان ہے۔

☆☆☆

کیا قسطوں میں قیمت کی ادائیگی جائز ہے؟

مولانا محمد ایوب ندوی، بھٹکل

۱- جائز ہے۔

۲- قسطوں میں ادائیگی جائز ہے۔

۳- اگر کوئی شخص دونوں طرح فروخت کرتا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مجلس سے جدائی سے پہلے معاملہ کی نوعیت کو طے کردے، اور نقد یا ادھار قیمت بھی طے کردے۔

۴- یہ ربا کے دائرہ میں بالکل نہیں آتا۔

۵- درست ہے۔

۶، ۷- تاخیر کی صورت میں رقم میں اضافہ ناجائز ہے۔

۸ (الف)...... بائع یعنی مرتہن مال رہن سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

(ب)...... مال رہن امانت ہے یعنی بلا کوتاہی یا غفلت کے ضائع ہو جائے تو ضامن نہیں ہوگا۔

(ج) یہ مقدمہ قاضی شہر یا پنچ پر پیش کیا جائے گا پھر وہ مناسب سمجھیں تو بیچ دیں گے اور بائع کی رقم ادا کریں گے۔

۹- (الف)...... فروخت شدہ سامان کو روک لینے کی حیثیت رہن کی نہیں ہوگی۔

(ب)...... بلکہ حبس المبیع لاستیفاء الثمن ہوگا اور یہ جائز ہے۔

۱۰- اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ اقالہ بیع کیا جائے اور وہ (زمین) دوبارہ فروخت کی جائے پھر اگر اس میں نفع ہو تو بائع و مشتری دونوں کو اس میں حصہ ملے گا اور اگر نقصان ہو جائے تو نقصان مشتری کے ذمہ ہوگا۔

۱۱- رہن راہن ہی کے پاس اس کے زیر استعمال رہ سکتا ہے۔

۱۲- یہ خدمت ہے اور حق الخدمت کی اجرت جائز ہے، لہذا اس کی اجرت بھی جائز ہے۔

۱۳، ۱۴- معلوم نہیں۔

۱۵- یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے۔

۱۶- یہ جائز نہیں ہے۔

۱۷- اگر میت کے ذمہ رقم واجب الوصول ہو تو ورثاء فوری طور پر وصول نہیں کرسکتے اگر میت کے ذمہ واجب الادا ہو تو ورثاء فوری طور پر ادا کریں گے۔

۱۸- یہ قمار و ربا میں داخل ہے۔

۱۹- یہ مکمل ربا ہے۔

☆☆☆

ادھار فروخت میں قیمت کی زیادتی کی حیثیت

مولانا تنویر عالم قاسمی

۱، ۴- مالک کو اختیار ہے کہ اپنی چیز کم قیمت پر فروخت کرے، یا زیادہ قیمت پر، نقد بیچے یا ادھار، اسے ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے، حالات و وقت کے اعتبار سے اگر وہ اپنے سامان کو ادھار اس طرح فروخت کرے کہ نقد فروختگی کے مقابلہ میں اس کی قیمت بڑھی ہوئی ہے تو یہ فروخت جائز ہے، ادھار شکل میں زائد رقم کو ربا کہہ کر حرام نہیں کہہ سکتے۔

''لأن للأجل شبها بالمبيع، ألا يرى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل'' (هدايه ۳/۷۶)۔

مذکورہ بالا بیان سے سوال نمبر ۴ کا جواب بھی معلوم ہو چکا، یہ شبہ کہ زائد رقم وقت کے عوض محسوس ہونے کی وجہ سے ''ربا'' ہے ناشی بلا دلیل ہے، کیونکہ بعوض اجل مدیون سے کچھ زائد لینا ربا ہوتا ہے، یہاں ابھی کوئی کسی کا مدیون ہی نہیں ہوا ہے۔

۲- بائع نے مبیع کی فروختگی ادھار اس شرط کے ساتھ کی ہے کہ فلاں وقت میں ثمن کی حوالگی ہوگی تو یہ شرط بیع کو فاسد نہیں کرے گی، وجہ یہ کہ مذکورہ شرط اختلاف و نزاع اور ضرر و غرر کا باعث نہیں، کیونکہ ثمن کی مقدار معلوم ہے، اور اس کی ادائیگی کی تاریخ متعین ہے (الاشباہ/۲۱۰ قدیم نسخہ)۔

اسی طرح یہ صورت بھی جائز ہوگی کہ ادھار ثمن کو قسطوں پر ادا کیا جائے، جو قسطوں کی مقدار و وقت کی تعیین کے ساتھ متعاقدین کے درمیان طے ہوئی ہے جس پر دونوں یعنی بائع و مشتری رضامند ہو چکے ہیں، مثلاً خرید کردہ مال کی قیمت دس ہزار روپے ہے دس قسطوں میں ہر ماہ کے آغاز میں ایک ہزار کی ایک قسط ادائیگی طے پائی ہے۔

قسطوں کی ادائیگی میں بھی تاجیل ثمن مختلف اوقات میں معلوم ہونے کی وجہ سے متعاقدین کے درمیان اختلاف و نزاع اور ضرر و غرر کا احتمال جاتا رہا۔

۳- بائع سامان کو نقد و ادھار دونوں طرح فروخت کرے اور وہ اس طرح معاملہ کرے کہ نقد قیمت سو روپے اور ادھار قیمت سوا سو روپے، مذکورہ تردد کے ساتھ ثمن مجہول ہو جانے کے سبب اس سامان کا خرید نادرست نہیں، ہاں اگر بائع نقد و ادھار کی صورت میں قیمت کے تفاوت کو بتلانے کے بعد متعین شکل نقد یا صرف ادھار میں معاملہ طے کر لیوے تو یہ شراء درست ہوگی، کیونکہ اس صورت میں ثمن سے جہالت ختم ہو چکی (امداد الفتاوی ۳/۳۰)۔

۵- اگر بائع ایک طریقہ قسط پر ثمن کی مقدار زیادہ رکھتا ہے، اور دوسرے طریقہ قسط پر ثمن کی مقدار کم رکھتا ہے، اور خریدار کے سامنے دونوں صورتیں پیش کرنے کے بعد کسی ایک متعین طریقہ قسط پر معاملہ کر لیا جاتا ہے تو یہ خریدگی جائز اور درست ہوگی، کیونکہ ثمن مجہول نہ رہا، لیکن اگر کسی صورت کو متعین نہ کیا جائے بلکہ بلا تعیین طریقہ قسط پر معاملہ کر لیا جائے تو یہ خریدگی جائز اور درست نہ ہوگی، کیونکہ ثمن مجہول رہا۔

۶- ثمن مؤجل ہے، اس کے بعد یہ طے ہوا کہ اگر وقت مقررہ پر ثمن ادا نہ کیا گیا تو بوجہ تاخیر ہر ماہ دو روپے یا پانچ روپے کی زیادتی کے حساب سے ثمن ادا کرنا ہوگا، شریعت میں اس طرح کا معاملہ جائز نہیں، بلکہ حرام ہے، کیونکہ مذکورہ صورت میں ''حقیقی ربا'' اس طرح موجود ہے کہ مدیون سے زائد از دین بعوض اجل لیا گیا ہے جو داخل ''ربا'' ہے۔

۷- تاجیل ثمن کے بعد وقت مقررہ پر ثمن کی تاخیر کی صورت میں زائد متعین یا غیر متعین رقم کی زیادتی مبیع کا عوض نہیں، بلکہ وہ زائد رقم خالی عن العوض ہے، لہٰذا اس زائد رقم کو بھی ''ربا'' ہی کہا جائے گا، جرمانہ اور مالی تاوان کہہ کر اسے جائز نہیں کہا جا سکتا۔

۸- ادھار قیمت کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے لیے بائع مشتری سے طرفین کی رضامندی کے ساتھ مال بطور رہن رکھوائے تو یہ رہن درست ہے۔

(الف):...... لیکن مرتہن یعنی بائع اس مال مرہون سے مفتی بہ قول کے مطابق راہن کی اجازت کے باوجود بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، کیونکہ یہ انتفاع من جنس الربا ہی ہے (شامی ۵/۳۱۰)۔

(ب):...... اگر مال مرہون بائع کے یہاں سے بغیر نقدی و زیادتی کے ضائع اور ہلاک ہو جائے تو بائع بقدر دین ضامن ہوگا، اور باقی زائد رقم امانت ہوگی

جس کا اس پر ضمان نہیں، ورنہ تعدی کی صورت میں زائد رقم کا بھی ضامن ہوگا۔

شئی مرہون کی قیمت قدر دین سے کم ہونے کی صورت میں بائع قدر دین کا ضامن ہوگا، اور باقی زائد دین وہ مشتری سے وصول کرے گا لیکن شئی مرہون کی قیمت قدر دین کے برابر سرابر ہونے کی صورت میں مال مرہون کی ہلاکت گویا اس کے مکمل دین کی ہلاکت قبضہ میں آنے کے بعد ہوئی ہے، اب دوبارہ بائع مشتری سے دین وصول نہیں کر سکتا (درمختار بر شامی ۵/۳۱۰)۔

(ج):...... ثمن کی حوالگی کا وقت آچکا مشتری ثمن کی ادائیگی سے ٹال مٹول کر رہا ہے وہ اس طرح کہ وعدہ پر وعدہ کرتا ہے اور اسے پورا نہ کرے، تو ایسی صورت میں راہن سے کہا جائے گا کہ شئی مرہون بیچ کر دین ادا کرو، اگر ایسا بھی نہ کرے تو راہن کی رضامندی کے بغیر قاضی، یا حاکم وقت شئی مرہون کو زبردستی بیچوائے گا، حاصل شدہ رقم سے ثمن کی ادائیگی کی جائے گی، اور باقی زائد رقم اصل مالک، یعنی راہن کو واپس کردی جائے گی (شامی ۵/۳۲۵)۔

۹- الف:...... بائع کا خرید کردہ مال پر پابندی اور اسے روکے رکھنا محض اپنا حق وصول کرنے کے لیے ہے، بائع کو مبیع روکنے کا حق اس وقت ہے جبکہ ثمن معجّل ہو (فتاویٰ ہندیہ ۳/۱۵)، اس کی حیثیت "حبس المبیع لاستفاء الثمن" کی ہوگی، اسے رہن نہیں کہا جا سکتا، "الرھن بالمبیع باطل" (ہدایہ ۴/۵۱۸)۔

(ب):...... بائع کا مبیع کو "رہن" کی حیثیت وجہت سے روکنا نہیں ہو سکتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ رہن کی درستگی کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ شئی مرہون مضمون بنفسہ ہو، یعنی ہلاکت کی صورت میں اس کا "مثل" یا "قیمت" ذمہ میں لازم آوے، اور جو شئی مضمون ہو بنفسہ اسی کے وصول کو گارنٹی بنانے کے لیے رہن رکھا جاتا ہے، مبیع فی ید البائع چونکہ مضمون بنفسہ نہیں، بلکہ بغیرہ ہے، اس لیے اس کے بدلے رہن رکھا نہیں جا سکتا، تو خود اسی مبیع مضمون بغیرہ کو رہن کی حیثیت کیسے دی جا سکتی ہے۔

۱۰- جب ثمن کی ادائیگی مؤجل قسط وار ہے تو بائع کو دین کی وصولیابی تک مبیع کو روکنے کا حق نہیں، جیسا کہ سوال ۹ کے تحت بات آچکی ہے، کیونکہ بیع کے نتیجہ میں ثمن فی الحال مشتری کے ذمہ لازم ہوا تھا، اس حق تعجیل کو خود اس نے برضاء و رغبت ترک کردیا جس سے حبس مبیع کا حق جاتا رہا۔ اس کے باوجود بائع مبیع کو ناحق روک لے پھر اس عرصہ میں مشتری نے ثمن میں سے ایک دو قسط حسب معاہدہ رقم ادا کردی، پھر ایسی صورت پیدا ہو کہ مبیع بھی بائع کے قبضہ میں رہے اور جو قسطیں ادا کی گئی ہیں اس پر بھی قبضہ جمائے رکھے، وہ مشتری کو واپس نہ کرے تو ابتداءً یہ معاملہ درست تھا، لیکن انتہاءً درست نہیں، بائع کی طرف سے زیادتی ہے، ادا کردہ قسطیں واجب الاعادہ ہیں، کیونکہ وہ قسطیں اس مبیع کا عوض ہیں جو معوض، یعنی مبیع بائع ہی کے قبضہ میں موجود ہے۔

۱۱- رہن کی صحت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ "شئی مرھون فی قبض المرتھن ھو لم یشرع إلا مقبوضا لقوله تعالی فرھان مقبوضة"، مذکورہ بالا شرط سے یہ بات واضح ہو چکی کہ خرید کردہ سامان کو خود خریدار کے پاس اس کے استعمال میں رکھ کر رہن قرار نہیں دیا جا سکتا، "لأن الرھن ینبئ عن الحبس الدائم" (ہدایہ ۴/۵۰۱)۔

اس کے علاوہ بنیادی طور پر خود مبیع رہن بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی (تفصیل سوال نمبر ۹ میں گزر چکی)۔

۱۲- خریدار کی طرف سے ثمن کی ادائیگی کی ضمانت "عقد کفالہ" ہے اس قسم کی ضمانت محض تبرع ہے جس پر اجرت و معاوضہ نہیں ہوتا ہے۔

الا یہ کہ وہ ادارہ یا اشخاص بائع (دائن) سے معاملہ اجارہ کرلے، اور یہ کہے کہ تمہارا جو ثمن و دین فلاں کے ذمہ ہے اس کے تسلیم و تسلم کا میں ذمہ دار ہوں جس کی حوالگی کی ذمہ داری پر اتنا معاوضہ اور اجرت لوں گا، پھر یہ تراضی طرفین سے طے ہو جائے تو یہ جائز ہوگا، اب یہ معاملہ عقد کفالہ کا نہیں، بلکہ عقد اجارہ کا بن جائے گا، یہ معاملہ اسی طرح جائز ہوگا جس طرح توکیل بالاجرۃ جائز اور درست ہے۔

۱۳- ایسے کاغذات جو دین کو وصول کرنے میں مکمل ہیں، جن میں کسی ادھار فروخت شدہ اشیاء کی رقم لکھی ہوئی ہے، وقت مقررہ پر رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں یا وقت سے پہلے رقم کو حاصل کرنے کے لیے اس دستاویز کی خرید و فروخت اس شرط کے ساتھ درست ہے کہ جتنی رقم کاغذات پر درج ہے اتنی ہی مقدار میں فروخت کیا جائے ورنہ ربا لازم آئے گا جو حرام ہے، کیونکہ یہاں پر دستاویز رقم کے حصول کا ایک مستند وسیلہ اور ذریعہ ہے، دستاویز بذات خود مبیع نہیں بلکہ اس پر درج رقم مبیع ہے، اس لیے یہاں پر ایک ہی جنس سے ثمن کا تبادلہ ثمن سے ہو رہا ہے، جس میں "بیع صرف" کے احکام کے مطابق دونوں میں تساوی ضروری ہے۔

۱۴- ادھار خرید و فروخت میں بائع طے شدہ رقم کو مقررہ وقت سے پہلے اس شرط پر مانگے کہ اس کا ایک حصہ ہم تم کو معاف کردیں گے، اور اس حصہ کی مقدار

بتلادی گئی، مشتری اس تجویز پر رضامند ہے تو ایسی صورت میں یہ معاملہ درست ہے، اس کمی کے ساتھ فروختگی کو ''استیفاء بعض الحق وإبراء وإسقاط بعض الحق'' کہا جاتا ہے۔

۱۵- اگر معاملہ ادھار کیا گیا، مگر قیمت کی ادائیگی کے لیے صرف یہ طے ہوا کہ بعد میں دیدیں گے اور اس کے لیے وقت طے نہیں ہوا، اس صورت میں مذکورہ بالاشکل (سوال ۱۴) اختیار کی جائے کہ رقم کو کم کر کے نقد لین دین ہو جائے جس پر متعاقدین رضامند ہوں تو اس طریقہ سے ثمن کی کمی کے ساتھ اشیاء کی فروختگی صحیح اور درست ہے، اور یہ کمی ابراء عن بعض الحق کے قبیل سے ہوگی، جس کی نظیر یہ ہے۔

''فلو قال رب الدين لمن عليه ألف حالة: إن دفعت إلي غدا خمس مائة، فالخمس مائة الأخرى مؤخرة عنك إلى سنة، فهو جائز كذا في الذخيرة'' (البحر الرائق ۱۲۱/۶)۔

۱۶- جس وقت قسط وار ثمن کی ادائیگی کے لیے گفتگو ہو رہی ہے اسی وقت بائع اگر یہ شرط لگائے کہ اگر کوئی قسط متعینہ وقت پر ادا نہ کی گئی تو دین نقد ہو گا، تاجیل باطل ہوگی، اس طرح کی شرط صحیح ہے، وجود شرط سے تاجیل رخصت ہو جائے گی اب دین نقد ہوگا (البحر الرائق ۶/ ۱۲۲)۔

لیکن اگر معاملہ یہ ہے کہ قسطوں پر صرف ثمن کی ادائیگی طے ہوئی اس کے علاوہ کسی دوسری شرط کا تذکرہ نہیں ہوا، اب اس کے بعد مشتری نے وعدہ کے خلاف کسی قسط کی ادائیگی میں تاخیر کردی، تو وعدہ کے خلاف قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے بائع کو کیا یہ حق ہوگا کہ تاجیل کو ختم کر کے مابقی جملہ دین وثمن کی ادائیگی کو فی الفور لازم کردے، یعنی کیا بائع کو تاجیل باطل کرنے کا حق ملے گا۔

جواب یہ ہے کہ بائع مذکور کو یہ حق نہیں ملے گا کہ تاجیل باطل کردے اور دین کی ادائیگی نقد لازم کردے۔ کیونکہ یہ مہلت ویسر مشتری کے لیے حق لازم ہے جسے کوئی باطل نہیں کرسکتا۔ ''لأن الأجل حق المديون ولا يملك أحد إبطال حق الغير''۔

۱۷- اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مدیون مرجائے تو تاجیل باطل ہو جائے گی وجہ یہ ہے کہ مدیون کو دین کی ادائیگی میں مہلت اس لیے دی گئی کہ تجارت کے ذریعہ آمدنی حاصل کرے اور اس طرح دین کو ادا کرسکے، ظاہر ہے کہ موت کی وجہ سے تاجیل کا مقصد فوت ہو چکا تو تاجیل بھی باطل اور رخصت ہو جائے گی، اب مدیون کے متروکہ مال سے تجہیز وتکفین کے بعد دین کی ادائیگی فوری اور نقد ہوگی۔

اس کے برخلاف اگر دائن مرجائے تو تاجیل باطل نہیں ہوگی، کیونکہ دائن کے انتقال سے تاجیل کا مقصد باقی ہے (شامی ۴/ ۲۳ وایضاً فی البحر ۵/ ۲۸۰)۔

۱۸- جو دوکاندار قسطوں کے ساتھ خرید وفروخت کا کاروبار کرتے ہیں، ہر قسط پر انعام دینے کا نظام بناتے ہیں، اور قرعہ اندازی کے ذریعہ کسی ایک خریدار یا چند خریدار کو انعام دیتے ہیں، ''بیع بالتقسیط'' کے ساتھ یہ نظام عطیہ وہبہ کے حکم میں ہوگا، اس انعام کو قمار یا ربا نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس پر قمار وربا کی تعریف صادق نہیں آتی۔

کمپنی کی طرف سے انعامات اس لیے دیئے جاتے ہیں، تاکہ کمپنی کا زیادہ سے زیادہ مارکیٹ میں نام اور اس کی تشہیر ہو، یہ انعامات دراصل تشہیر کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں جتنی شہرت ہوگی اسی حساب سے کمپنی کے مال کی کھپت مارکیٹ میں ہوگی۔

۱۹- تمام خریداروں کو ایک متعین مدت پر ایک سامان دینے کے لیے بالاقساط قیمت جمع کرائی جائے، ہر قسط کی ادائیگی پر قرعہ اندازی کے ذریعہ وہ سامان، یعنی مبیع کسی ایک ہی شخص کے حوالہ اس طور پر ہو کہ آئندہ اس سے کسی قسط کا مطالبہ نہ ہو اس کے بعد باقی لوگ قسط کی ادائیگی کرتے رہیں اور قرعہ اندازی کے ذریعہ مبیع دیئے جانے کا فیصلہ ہوتا رہے، شرعاً یہ شکل قمار پر مشتمل ہے، کیونکہ ایک سامان بعض خریدار کو نہایت کم قیمت پر اور دوسرے کو نہایت زیادہ قیمت پر ملے گا، مبیع ملنے سے پہلے کسی خریدار کو معلوم نہیں کہ کتنی رقم میں وہ مبیع ہمیں ملے گی، اس لیے مذکورہ صورت اور طریقہ بیع جائز اور درست نہ ہوگی۔

☆☆☆

ادھار معاملہ میں شیٔ مرہون سے انتفاع

مولانا حبیب الرحمن قاسمی، پٹنہ

۸- (الف)......شیٔ مرہون سے انتفاع:

بائع (مرتہن) کا شیٔ مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ وہ سود ہے، کیونکہ سود نام ہے کسی چیز سے اس کا عوض دیئے بغیر فائدہ اٹھانے کا، اور یہاں مرتہن قرض میں محسوب کیے بغیر مرہون چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس سلسلے میں چاروں امام متفق ہیں (بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۰۸)۔

البتہ امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہ جانور کے بارے میں کہتے ہیں کہ اپنے چارہ اور اخراجات کے بقدر وہ استعمال کرسکتا ہے، اسی طرح ضرورت کے وقت سواری کرسکتا ہے، اور دلیل میں یہ حدیث نبوی ﷺ پیش کرتے ہیں: ''الرھن مرکوب ومحلوب'' (ایضا)، مگر امام ابوحنیفہ کسی صورت میں نفع اٹھانے کے قائل نہیں ہیں (شرح وقایہ، ہدایہ ۲/ ۵۲۲)۔ یعنی خدمت لے کر یا مکان میں رہ کر یا کپڑے پہن کر کسی صورت میں مرتہن کو فائدہ اٹھانا جائز نہیں، اور صاحب ''ہدایہ'' کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے، مگر مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اس جزئیہ پر شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء احناف کسی صورت میں مرہون سے فائدہ اٹھانے کو جائز نہیں سمجھتے، باوجودیکہ وقایہ کے مصنف نے بھی عاریۃً استعمال کی اجازت دی ہے (مولانا کی عبارت کے لیے دیکھئے: حاشیہ شرح وقایہ ۴/ ۴۷)۔

البتہ جو چیزیں غیر منقول ہیں، مثلاً زمین، مکان وغیرہ، یا وہ منقولہ ہیں، مگر ان کے استعمال سے ان کی حیثیت کم ہوتی ہے، مثلاً گھڑی، سائیکل، موٹر وغیرہ، تو ان سے انتفاع تو کسی حال میں جائز نہ ہونا چاہیے، لیکن جانور وغیرہ میں جیسا کہ امام شافعی اور امام احمدؒ حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں، ان سے اپنے خرچ کے بقدر راہن کی اجازت سے وہ استعمال کرسکتا ہے، اس لیے کہ جانوروں کے چارہ کی ذمہ داری موجودہ زمانہ میں ایک وقت طلب بات ہے، اس لیے وہ چارہ اور اخراجات کے بقدر استعمال کرے تو یہ ربا کی حد میں داخل نہیں ہوگا، بشرطیکہ اس کے استعمال سے اس میں عیب پیدا نہ ہو، اس میں استعمال کی حد مقرر کی جاسکتی ہے جیسا کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ اسی طرح مکان کو اگر بالکل مقفل کردیا جائے تو اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے اس کی صفائی اور مرمت کے بقدر رہنے کی گنجائش ہونی چاہیے، یہ بات اس لیے عرض کی گئی ہے کہ حدیث میں بعض چیزوں کا استثناء موجود ہے۔ احقر کی ناقص رائے یہی ہے۔

(ب)......امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بائع کے قبضہ میں رہ کر شیٔ مرہون ضائع ہوجائے تو شیٔ مرہون کی قیمت دیکھی جائے گی، اگر شیٔ مرہون کی قیمت دَین کے برابر ہے تو دَین بالکلیہ ساقط ہوجائے گا، اور اگر شیٔ مرہون کی قیمت دَین سے کم ہے تو شیٔ مرہون کی قیمت کے بقدر وضع ہوجائے گا، اور باقی مشتری پر دَین قائم رہے گا، اس کی ادائیگی مشتری کے ذمہ باقی رہے گی، البتہ اگر شیٔ مرہون کی قیمت دَین سے زیادہ ہے، تو بقدر دَین تو ساقط ہوجائے گا باقی جو زائد رقم ہے وہ بائع کے پاس امانت ہوگی، اور امانت کا حکم یہ ہے کہ بلا تعدی ہلاکت کی صورت میں امین ضامن نہیں ہوتا ہے، اور تعدی کی صورت میں ضامن ہوتا ہے۔ (فتاوی ہندیہ ۵/ ۴۴۷)۔

اس کے برخلاف امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیٔ مرہون بائع کے پاس امانت ہے، شیٔ مرہون کے ہلاک ہوجانے سے دَین ساقط نہیں ہوگا (شامی ۵/ ۳۰۹)۔

اس کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے علامہ ابن رشد بدایۃ المجتہد میں رقم طراز ہیں:

''الرهن أمانة وهو من الراهن والقول قول المرتهن مع يمينه أنه ما فرط فيه وما جنى عليه وممن قال بهذا القول الشافعي وأحمد وأبوثور وجمهور أهل الحديث'' (بداية المجتهد ۲/۲۰۸)۔

اگر بلا تعدی ہلاک ہو جائے، مثلاً ایک بکری تھی اور وہ طبعی موت مر گئی تو مرتہن اس کا ضامن نہیں ہوگا، اسی بنا پر بائع کا دَین اس کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا، راقم الحروف کی ناقص رائے یہی ہے۔

(ج)...... اگر رہن کا وقت ختم ہو جائے اور مشتری (راہن) ادا کر کے اپنی چیز نہ لے جائے تو بائع (مرتہن) کو اسے قاضی کے حکم سے بیچ کر اپنا دَین وصول کرنے کا حق ہوتا ہے، لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی اس سے زیادہ وصول کرنا بائع کے لیے جائز نہیں ہے، لہٰذا اگر اس شیٔ مرہون کے بیچنے سے اتنی رقم وصول ہوتی ہے کہ بائع کے پاس اپنا دَین وصول کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ جائے تو وہ بچی ہوئی رقم مشتری کو واپس لوٹانا ضروری ہے:

''إذا حل أجل الدين وامتنع الراهن عن أدائه فالحاكم يأمره ببيع الرهن وأداء الدين'' (شرح المجلہ / ۴۱۹، بدایۃ المجتہد ۲ / ۲۰۸)۔

احقر کو اس سے اتفاق ہے۔

۹- ادھار بیع میں بائع کا مبیع کو محبوس کرنا:

یہ صورت دو طریقے سے ممکن ہے، جیسا کہ سوالنامہ میں بھی مذکور ہے، ایک یہ کہ ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روک لیا جائے، دوسرے یہ کہ بطور رہن کے مبیع کو روک لیا جائے۔

دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں جب ثمن کی وصولی کے لیے فروخت شدہ سامان کو محبوس کیا جائے گا اس وقت مبیع مضمون بالثمن ہوگی، مضمون بالقیمۃ نہیں ہوگی، لہٰذا اگر حالت حبس میں وہ مبیع ہلاک ہو جائے گی تو اس صورت میں بیع فسخ ہو جائے گی، اور بازاری قیمت کا اس پر ضمان نہیں آئے گا۔

دوسری صورت، یعنی رہن کی صورت میں اگر وہ مبیع بائع کے پاس تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ نہیں ہوگی، بلکہ وہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی، اور (راہن) مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہیں ہوگا، اور اگر بائع کی تعدی کی وجہ سے ہلاک ہوئی تو مرتہن (بائع) اس چیز کی بازاری قیمت کا ضامن ہوگا، ثمن کا ضامن نہیں ہوگا، جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے، یعنی ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع کو روکنا، یہ صورت بیع بالتقسیط میں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بیع بالتقسیط ادھار بیع ہے، اور بائع کو ثمن کے استیفاء کے لیے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں ہوتا ہے، ادھار بیع میں یہ حق بائع کو نہیں ملتا (فتاویٰ ہندیہ ۳ / ۱۵، کتاب البیوع)۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ مشتری کے ذمہ اس مبیع کا جو ثمن واجب ہو چکا ہے اس کے عوض میں بائع اسی کو مبیع کے طور پر اپنے پاس رکھے، اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ کرنے سے قبل ہی بائع کے پاس رہن کے طور پر رکھ دے، یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ وہی شکل بن جاتی ہے کہ بائع نے حصول ثمن کے لیے مبیع کو اپنے قبضہ میں رکھا، اور حصول ثمن کے لیے حبس مبیع بیع مؤجل میں جائز نہیں ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری اس مبیع کو پہلے اپنے قبضے میں لے اور پھر اسی مبیع کو بطور رہن بائع کے پاس رکھ دے، یہ صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے، جیسا کہ امام محمدؒ ''الجامع الصغیر'' میں رقم طراز ہیں:

''ومن اشترى ثوبا بدراهم، فقال البائع: أمسك هذا الثوب حتى أعطيك الثمن فالثوب رهن'' (الجامع الصغير)۔

''ردالمحتار'' (۱۰ / ۱۱۰-۱۱۱) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے رہن کے جواز میں بعد کے فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے، بشرطیکہ صلب عقد میں یہ رہن مشروط نہ ہو، لیکن اگر صلب عقد میں رہن مشروط ہو تو اس صورت کے جواز میں اختلاف ہے، جیسا کہ مغنی کی عبارت سے پتہ چلتا ہے، لیکن علامہ ابن قدامہؒ کے نزدیک قابل اعتماد مسلک جواز ہی کا ہے (المغنی لابن قدامہ ۴ / ۴۲۷، کتاب الرھن)۔

احقر کی رائے بھی جواز ہی کی ہے۔

☆☆☆

ادھار قیمت کی قسطوار ادائیگی

مولانا محمد انور بن طاہر القاسمی، پٹنہ

۱- ادھار بیع میں زیادہ قیمت وصول کرنا:

زین العابدین علی بن الحسین، الناصر، المنصور باللہ اور ہادویہ کہتے ہیں کہ نقد قیمت کے مقابلہ ادھار خریداری میں زیادہ قیمت وصول کرنا درست نہیں، بلکہ یہ زیادتی مدت کے عوض ہے، اس لیے ربا ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اس کے برخلاف شافعیہ، حنفیہ اور زید ابن علی موید باللہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد سے زیادہ قیمت وصول کرنا درست ہے، اور یہ زیادتی ربا نہیں ہے (نیل الاوطار ۵ / ۱۵۲)۔

اور دوسرا مذہب ہی صحیح ہے، کیونکہ ہر بیچنے والا شرعاً خود مختار ہے کہ وہ اپنا سامان جتنی قیمت پر چاہے فروخت کرے، البتہ اتنی زیادہ قیمت وصول کرنا کہ غبن فاحش کے درجہ میں آجائے مروت اور انسانیت کے خلاف ہے، تاہم بیع درست ہے۔

۲- ادھار قیمت کو قسطوار ادا کرنا:

درحقیقت بیع بالتقسیط یہ ''بیع مؤجل'' ہی ہے، جیسا کہ ''درر الحکام'' میں ہے کہ تقسیط اور تاجیل میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے بایں طور کہ ہر تقسیط میں تاجیل لازمی ہے، جبکہ ہر تاجیل کے لیے تقسیط ضروری نہیں، معلوم ہوا کہ تقسیط تاجیل ہی ہے (درر الحکام ۲ / ۱۱۰)۔

اور ادھار بیع کا جواز کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان "أحل الله البيع" میں ''بیع'' مطلق وارد ہوا ہے جو ادھار بیع و نقد بیع دونوں کو شامل ہے، پس یہ آیت دلیل بن گئی بیع کے جواز کی خواہ وہ بیع ادھار ہو یا نقد، اور جناب نبی پاک ﷺ کا ایک یہودی سے ادھار قیمت کے عوض سامان خریدنا ثابت ہے (درر الحکام ۲ / ۱۹۴)۔

اور جب ''بیع مؤجل'' قرآن وحدیث سے ثابت ہے تو بیع بالتقسیط بھی ثابت ہوگئی کیونکہ بیع بالتقسیط بھی بیع مؤجل ہی ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، فرق اتنا ہے کہ بیع بالتقسیط میں ادھار قیمت کو یکمشت ادا کرنے کے بجائے متعدد حصوں میں ادا کیا جاتا ہے، اور بیع مؤجل میں قیمت کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں، بلکہ متعدد حصوں میں بھی اسے ادا کر سکتے ہیں، اور یہی بیع بالتقسیط ہے (مجلۃ الفقہ الاسلامی العدد السادس، الجزء الأول / ۱۷۹)۔

لیکن ادھار بیع کے لیے ضروری ہے کہ عاقدین مجلس عقد ہی میں ہر قسط کی ادائیگی کا وقت، نیز مکمل قسطوں کی ادائیگی کی مدت متعین کرلیں (درر الحکام ۲ / ۱۹۵)۔

۳- ایک قیمت کا متعین کرنا ضروری ہے:

الف۔ اگر بائع خریدار کے سامنے نقد وادھار دونوں قیمتوں کا تذکرہ کرے اور پھر دونوں متفق ہوکر کسی ایک قیمت پر معاملہ کرلیتے ہیں تو یہ درست ہے، اور اگر عاقدین کسی ایک کو متعین کیے بغیر اس طرح معاملہ کرتے ہیں تو تردد وجہالت ثمن کی وجہ سے اس طرح کا معاملہ کرنا درست نہیں۔

(المغنی ۴ / ۲۵۸-۲۵۹، درر الحکام ۲ / ۱۹۵، نیز دیکھئے: بدایۃ المجتہد)۔

لیکن امام مالکؒ کے نزدیک اس مسئلہ میں وسعت ہے بایں طور کہ اگر مشتری دو قیمتوں میں سے کسی ایک قیمت کو اپنے اختیار سے ادا کردے اور یہ عقد معاملہ ہی کے وقت طے ہوگیا ہو تو مالکیہ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے۔

مگر جمہور علماء، حنفیہ وشوافع کا مسلک واضح ہے، اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

ب- خریدار کے سامنے قیمتوں کا تذکرہ:

ادھار خرید وفروخت ہو یا نقد بہر دوصورت اگر بائع مرابحۃً (نفع لے کر) فروخت کرتا ہے تو فقہاء نے اس کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ خریدار کے سامنے راس المال (سامان کی قیمت خرید) اور نفع کا تذکرہ الگ الگ کردے، نیز یہ بھی خریدار کے سامنے واضح کردے کہ اس نے مبیع (سامان) کو نقداً خریدا ہے یا ادھار، کیونکہ نقد قیمت اور ادھار قیمت میں فرق ہوا کرتا ہے (دیکھئے: المغنی ۴/ ۱۹۹، بدایۃ المجتہد ۲/ ۱۶۱، فتح العزیز للامام الرافعی، بدائع ۵/ ۲۲۴)۔

۴- اس کا جواب سوال اول کے جواب میں گزرچکا۔

۵- اس کا جواب سوال ۳ کے جواب میں گزرچکا (دیکھئے: مبسوط سرخسی ۸/ ۱۳، بدائع ۵/ ۱۵۸)۔

۶، ۷- ثمن کی ادائیگی میں تاخیر کے عوض منافع:

صورت مسئولہ میں تاخیر کے عوض منافع حاصل کرنا قطعاً درست نہیں۔ یہ ربا میں داخل ہے (دیکھئے: احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۵)۔

۸- مرتہن کا شیٔ مرہون سے انتفاع:

(الف) مالکیہ کے نزدیک مرتہن تین شرطوں کے ساتھ شیٔ مرہون سے منتفع ہوسکتا ہے:

۱:..... صلب عقد میں اس کی صراحت کردی گئی ہو کہ مرتہن شیٔ مرہون سے منتفع ہوگا۔

۲:..... شیٔ مرہون سے مرتہن کے منتفع ہونے کی مدت متعین ہو۔

۳:..... رتہن کے پاس رہن قرض یا دَین کے عوض نہ ہو، ان میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو مرتہن کے لیے شیٔ مرہون سے منتفع ہونا درست نہیں۔

حنابلہ شیٔ مرہون میں فرق کرتے ہیں، ان کے نزدیک اگر شیٔ مرہون ایسا جانور ہے جو سواری کے کام آتا ہے یا دودھ دینے والا جانور ہے تو مرتہن ایسے مرہون جانور سے اس قدر منتفع ہوسکتا ہے جتنا کہ وہ اس جانور پر خرچ کرتا ہے، یعنی بقدر نفقہ دودھ نکال سکتا ہے اور سواری کا کام لے سکتا ہے، اگرچہ راہن نے اس کی اجازت نہ دی ہو، اور اگر شیٔ مرہون مذکورہ (مرکوب ومحلوب) جانور کے علاوہ ہے تو مرتہن شیٔ مرہون سے راہن کی اجازت سے اس شرط کے ساتھ منتفع ہوسکتا ہے کہ رہن دَین یا قرض کے عوض نہ ہو، نیز مرتہن بالعوض منتفع ہو رہا ہو، اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی ایک مفقود ہو تو مرتہن کا شیٔ مرہون سے انتفاع درست نہیں (کشف القناع ۲/ ۱۶۸)۔

"الموسوعة الفقهية" میں شافعیہ کا مسلک اس طرح مذکور ہے کہ مرتہن کو شیٔ مرہون روکنے کا حق ہے، اس سے کسی قسم کا انتفاع مرتہن کے لیے درست نہیں

"وقالت الشافعية: ليس للمرتهن في المرهون إلا حق الاستيثاق فيمنع من كل تصرف أو انتفاع بالعين المرهونة" (۲۳/۱۸۵)۔

کتب فقہ احناف میں اس مسئلے کے متعلق مختلف اقوال ملتے ہیں:

۱:..... پہلا قول یہ ہے کہ مرتہن کا شیٔ مرہون سے انتفاع درست نہیں (رد المحتار ۵/ ۳۱۰)۔

۲:..... دوسرا قول یہ ہے کہ اگر راہن مرتہن کو شیٔ مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دے تو وہ منتفع ہوسکتا ہے (ہدایہ ۴/ ۵۰۶)۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مرتہن کے لیے شیٔ مرہون سے انتفاع مکروہ ہے (رد المحتار ۵/ ۳۱۱)۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اگر صلب عقد میں مرتہن کے لیے شیٔ مرہون سے انتفاع کی شرط ہو تو مرتہن کا شیٔ مرہون سے انتفاع درست نہیں، اور اگر صلب عقد میں اس کی شرط نہ ہو اور نہ ماحول ومعاشرہ اس طرح کا ہے کہ لوگ شیٔ مرہون سے انتفاع کی غرض سے قرض دیتے ہیں اور پھر بعد میں چل کر راہن بطیب خاطر مرتہن کو شیٔ مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دے تو مرتہن کے لیے انتفاع درست ہے، لیکن اگر راہن بطیب خاطر اجازت نہ دے، یا

معاشرہ اس طرح کا ہے کہ لوگ شئ مرہون سے منتفع ہوتے ہیں تو پھر "المعروف کالمشروط" کی بنیاد پر مرتہن کا منتفع ہونا درست نہیں (ردالمحتار ۵/ ۳۱۰، ۳۱۱)۔

علامہ شامی کا رجحان آخری قول کی طرف معلوم ہوتا ہے، یہی درستگی کے زیادہ قریب ہے۔

بائع کے قبضہ میں شئ مرہون کا اتلاف:

(ب)...... اگر شئ مرہون مرتہن کے قبضہ میں ضائع ہو جائے تو شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک اگر شئ مرہون مرتہن کی تعدی کے بغیر ضائع ہوئی ہے تو مرتہن (بائع) ضامن نہیں ہوگا، اور اگر مرتہن کی تعدی سے ضائع ہوئی ہے تو ضامن ہوگا، دراصل شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک شئ مرہون پر مرتہن کا قبضہ امانت کا قبضہ ہوتا ہے، اس لیے یہ حضرات امانت کا قانون نافذ کرتے ہیں جو اوپر مذکور ہوا (المغنی ۴/ ۴۳۸، شرح مہذب ۱۳/ ۲۴۹)۔

مالکیہ شئ مرہون میں فرق کرتے ہیں کہ اگر شئ مرہون ان اشیاء میں سے ہے جن کو چھپانا ممکن ہے اور مرتہن اس کے بلا تعدی ضائع ہونے پر بینہ قائم کرنے سے عاجز ہے تو ضامن ہوگا، اور اگر شئ مرہون ان اشیاء میں سے ہے جن کو چھپانا ممکن نہیں تو ایسی اشیاء مرہونہ کے ضائع ہونے پر مرتہن ضامن نہیں ہوگا، الا یہ کہ مرتہن کی تعدی سے ضائع ہوئی ہو (بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۰۸)۔

حنفیہ کے نزدیک مذکورہ دونوں صورتوں میں دَین اور رہن میں جس کی قیمت کم ہے اس کا ضامن ہوگا، اگر دَین اور رہن کی قیمت برابر ہے تو راہن کے ذمہ سے دَین ساقط ہو جائے گا، اور اگر شئ مرہون کی قیمت کم تھی اور دَین کی زیادہ تو ایسی صورت میں مرتہن کو باقی رقم کا راہن سے مطالبہ کا حق ہوگا لیکن اگر شئ مرہون کی قیمت زائد تھی تو اس صورت میں زائد رقم مرتہن راہن کو واپس کر دے گا، لہٰذا ضائع ہونے پر دَین سے زائد رقم پر امانت کا قانون نافذ ہوگا، اگر مرتہن کی تعدی سے ضائع ہوئی ہے تو وہ ضامن ہوگا ورنہ نہیں (ہندیہ ۵/ ۴۴۷)۔

(ج)...... شئ مرہون سے دین کی وصولیابی:

اگر راہن وقت مقررہ کے اندر دین ادا نہ کرے تو مرتہن راہن سے ایفاء دین کا مطالبہ کرے گا، اگر ادا کر دیا تو فبہا، اور اگر ادا نہیں کیا یا ادا کیا مگر بعض دَین کو ادا کیا تو اب راہن یا اس کے وکیل پر ضروری ہے کہ مرہون کو فروخت کر کے دَین ادا کرے، یہاں تک تمام ائمہ متفق ہیں، لیکن اگر راہن مرہون کو فروخت کرنے پر آمادہ نہیں ہے، نیز دین کبھی ادا نہیں کرتا ہے تو ایسی صورت میں حنابلہ وشافعیہ فرماتے ہیں کہ معاملہ کو قاضی جس طرح مناسب سمجھے حل کرے، خواہ قاضی راہن کو اس کے انکار کی وجہ سے حبس یا تعزیر کے ذریعہ فروخت کرنے پر آمادہ کرے یا خود فروخت کر کے یا اپنے امین کے ذریعہ فروخت کرا کر دَین ادا کر دے (المغنی ۴/ ۴۴۷، نہایۃ المحتاج ۴/ ۲۷۳)۔

مالکیہ کے نزدیک قاضی راہن کو قید وبند نہ کرے بلکہ خود مرہون کو فروخت کر کے دَین ادا کر دے (بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۰۷)، حنفیہ میں سے صاحبین کا رجحان اسی طرف ہے، البتہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ قاضی فروخت نہ کرے بلکہ راہن کو قید وغیرہ کے ذریعہ فروخت کرنے پر آمادہ کرے (بدائع ۶/ ۱۴۸)، صاحبین کے قول پر فتوی ہے (ردالمحتار ۵/ ۳۵۹)۔

بہتر صورت یہ ہے کہ بوقت معاملہ مرتہن راہن کی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کروالے تا کہ راہن کے ٹال مٹول کرنے پر وکیل کے ذریعہ معاملہ حل ہو سکے۔

☆☆☆

قسطوں کی بنیاد پر بیع وشراء

مولانا فضل الرحمن فضل قاسمی

۱- کسی شئی کی ادھار قیمت بمقابلہ نقد قیمت کے زیادہ رکھنا درست ہے (بدائع الصنائع ۵ / ۲۲۴)۔
شوافع کے نزدیک بھی یہ جائز ہے (فتح العزیز علی ہامش المجموع ۹ / ۲۱، ۱۳)، اسے امام مالکؒ بھی جائز قرار دیتے ہیں (بدایۃ المجتہد ۲ / ۲۱۵)۔
حنابلہ کے نزدیک بھی جائز و درست ہے (المغنی ۴ / ۱۳۲)۔

۲- مجلس عقد میں کسی ایک صورت پر معاملہ طے ہوجائے تو جائز ہے (بدائع ۵ / ۱۵۸)۔
شوافع کے یہاں بھی کسی ایک صورت پر معاملہ طے ہوجانے کی صورت میں جائز ہے (حواشی علی تحفۃ المحتاج ۴ / ۲۲۴)۔
مالکیہ کے نزدیک بھی یہ صورت درست ہے (بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۵۴)۔
حنابلہ کے یہاں بھی یہ صورت جائز و درست ہے (المغنی ۴ / ۱۶۱)۔

۳- احناف کے یہاں اس قسم کی بیع درست ہے (البحر الرائق ۵ / ۲۸۰)۔ یہی رائے جمہور ائمہ، شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کی بھی ہے (کتاب الأم ۳ / ۳۴)۔

۴- ادھار کی صورت میں قیمت کی زیادتی جائز و درست ہے اور یہ زیادتی محض ادھار کی وجہ سے ہے، یہ ربا میں داخل نہیں ہے (بدائع ۵ / ۲۲۴، شامی ۵ / ۱۷۷)۔ یہی رائے شوافع کی بھی ہے (فتح العزیز علی ہامش ۹ / ۱۲، ۱۳)۔ حنابلہ کے یہاں بھی درست و جائز ہے (المغنی ۴ / ۲۱)۔
مالکیہ بھی یہی فرماتے ہیں (بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۴۰)۔

۵- یہ بیع جائز ہے (بدائع الصنائع ۵ / ۱۵۸)۔ یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے (بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۵۴)۔
امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ بھی اسے جائز قرار دیتے ہیں، ملاحظہ ہو (المجموع شرح المہذب ۹ / ۳۳۸، المغنی ۴ / ۱۶۲، المدونۃ الکبری ۳ / ۲۱۱۔ ۲۵۰)۔

۶- بیع میں اس قسم کے اضافہ کی شرط شرط فاسد ہے، اور یہ اضافہ ربا ہوگا، لہٰذا بیع درست نہیں ہوگی (بدائع الصنائع ۵ / ۱۸۳)۔
امام شافعیؒ کے یہاں بھی جائز نہیں ہے (المجموع ۸ / ۱۶۲)۔ یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے (المدونۃ الکبری ۵ / ۱۸)۔

۷- مذکورہ شرائط کے ساتھ بیع جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ شرائط فاسدہ ہیں، اور وہ اضافہ مالی تاوان یا جرمانہ نہ ہوگا، بلکہ وہ ربا شمار ہوگا (بدائع الصنائع ۵ / ۱۸۳)۔

یہی رائے جمہور ائمہ بشمول امام شافعیؒ، اور امام مالکؒ کی بھی ہے (دیکھئے: المجموع ۸ / ۱۶۲، المدونۃ الکبری ۵ / ۱۸)۔

۸- الف: ...... بائع کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے (بدائع / ۱۴۶)۔
شوافع اور مالکیہ کے نزدیک بائع راہن کی اجازت سے مال مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دیکھئے: (المجموع ۴ / ۲۵۱، المدونۃ الکبری ۴ / ۱۶۳)۔
حنابلہ کے یہاں اجرت مثل کے ساتھ فائدہ اٹھانا مطلقاً درست ہے، ملاحظہ ہو (المغنی ۴ / ۲۵۱)۔

(ب): ...... ایسی صورت میں اگر قیمت مال مرہون کے برابر ہے تو دین ساقط ہوجائے گا، لیکن اگر مال مرہون کی قیمت زائد ہے تو باقی مال کا بائع ضامن ہوگا۔ (شامی ۵ / ۳۴۲، بدائع ۶ / ۱۴۹)۔
ائمہ ثلاثہ کی رائے یہ ہے کہ اگر مال مرہون کے ضائع ہونے کا سبب مرتہن بنا ہو تو اس پر ضمان ہوگا، ورنہ نہیں (دیکھئے: المدونۃ الکبری ۴ / ۱۵۲)۔

(ج):......صورت مسئولہ میں راہن اگر موجود ہو یا وہ غائب ہو لیکن اس کا وکیل موجود ہو تو راہن یا اس کے وکیل کو قاضی دین ادا کرنے یا مال مرہون کو بیچنے پر مجبور کرے گا، اگر انکار کرے تو قاضی شئی مرہون کو فروخت کردے گا، اور مرتہن اس سے اپنا دین وصول کرے گا، یہ صورت صاحبینؒ کے نزدیک ہے، اور اسی پر فتوی ہے، امام اعظمؒ کے یہاں انکار کی صورت میں راہن کو قید کر دیا جائے گا حتی کہ وہ خود بیچنے پر مجبور ہو جائے (رد المحتار ۵/ ۳۵۱)۔

یہی رائے جمہور ائمہ بشمول شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کی بھی ہے۔ (دیکھئے: المجموع ۱۰/ ۱۲۷، المدونہ الکبری ۵/ ۱۱۶، المغنی ۴/ ۲۶۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۲۷۵)۔

۹- فروخت شدہ سامان کو روکنے کی دو صورتیں ہیں:

۱:......یہ کہ مشتری نے مبیع پر قبضہ کرلیا پھر اس کے قبضہ کے بعد بائع وہ مال اپنے پاس روکتا ہے۔

۲:......یہ کہ فروخت شدہ مال پر مشتری نے ابھی قبضہ نہیں کیا ہے، قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع اسے روک لیتا ہے۔

پہلی صورت میں بائع کا فروخت شدہ مال کو روکنا رہن سمجھا جائے گا، اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، مثلاً اگر اب بائع کے قبضہ میں اس کی زیادتی کے بغیر وہ مال ہلاک ہو جائے تو بائع اس کا ضامن نہیں ہوگا۔

دوسری صورت میں بائع کا اپنے پاس مبیع کو روکنا رہن نہیں ہوگا، بلکہ اس کی حیثیت محبوس بالدین کی ہوگی۔

بائع مبیع کو ایسی صورت میں روکنے کا حق رکھتا ہے، جبکہ مبیع عین ہو اور قیمت ادھار، جبکہ مشتری کے ذمہ قیمت نقد واجب ہو۔

(بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۹)۔

شوافع اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اگر بائع کو قیمت وصول نہ ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں وہ جب تک مکمل قیمت وصول نہ کرلے اپنے پاس فروخت شدہ مال کو روکنے کا حق رکھتا ہے (ملاحظہ ہو: تحفۃ المحتاج علی حواشی ۴/ ۴۲۳، المغنی ۴/ ۱۴۱)۔

۱۰- یہ صورت جائز نہیں ہے، بائع نے جو اقساط وصول کی ہیں ان کا واپس کرنا ضروری ہے، اگر واپس نہ کیں تو وہ سود شمار ہوگا، کیونکہ اس کا فروخت کردہ سامان اسی کے پاس موجود ہے، لہذا جو اقساط وصول کی ہیں، وہ سود ہونے کی بنا پر حرام ہیں (شامی ۴/ ۱۲۸)۔

شوافع اور مالکیہ کی رائے ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے (دیکھئے: تحفۃ المحتاج علی حواشی ۴/ ۳۲۲، شرح کبیر علی حاشیہ الدسوقی ۳/ ۶۳)۔

البتہ حنابلہ کے یہاں یہ صورت درست ہے (المغنی ۴/ ۱۶۰)۔

۱۱- مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ ہونا ضروری ہے، بغیر قبضہ کے خریدار کے پاس ایسے سامان کو رہن قرار نہیں دیا جاسکتا، ہاں مرتہن قبضہ کے بعد دوبارہ خریدار کے پاس بطور رہن رکھ دے تو یہ صورت درست ہے (بدائع الصنائع ۶/ ۱۳۷)۔

شوافع کے نزدیک بھی مرتہن کا قبضہ کرنا ضروری ہے ورنہ وہ مال رہن کے طور پر نہیں رکھا جاسکتا (تحفۃ المحتاج علی حواشی ۵/ ۶۸)۔

مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ مال مرہون پر قبضہ کرنا ضروری ہے، نیز رہن کے درست ہونے کے لیے قبضہ کا دائمی ہونا بھی ضروری ہے۔

(بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۷۴)۔

۱۲- ضمانت و کفالت یہ تبرعات کی قسم سے ہے، جس سے کسی بھائی کی اعانت مقصود ہوتی ہے، اس پر معاوضہ حاصل کرنا شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، کیوں کہ معاوضہ لینا تبرع اور احسان کی شان کے خلاف ہے، مگر جب نوبت یہاں تک پہونچ جائے کہ کوئی بغیر معاوضہ کے راضی نہ ہو تو مشہور قاعدہ "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت خریدار کے لیے معاوضہ دینا درست ہوگا لیکن خود ان اشخاص یا ادارے کے لیے درست نہیں ہوگا۔

کریڈٹ لیٹر میں اگر کتابت اور وقت کی حد تک اجرت لی جاتی ہے تو جائز و درست ہے (فقہ اسلامی وادلتہ ۵/ ۱۶۱)۔

۱۳- یہ بیع دراصل دستاویز کی نہیں، بلکہ اس مالیت کی ہے جو اس دستاویز میں تحریر ہے، تو اس طرح یہ نقد کی بیع نقد سے ہو رہی ہے جس کے درست ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں:

۱۔ نقدین پر مجلس عقد میں قبضہ ہو چکا ہو، ۲۔ کسی میں کمی زیادتی نہ ہو، ۳۔ ان میں سے کسی کو خیار شرط حاصل نہ ہو، ۴۔ اس میں ادھار نہ ہو۔ ان شرائط کا بیک وقت پایا جانا نقدین کی بیع کے لیے ضروری ہے، کوئی ایک بھی شرط نہ پائی گئی تو بیع درست نہ ہوگی۔ صورت مذکورہ میں چونکہ ادھار ثمن کی بیع نقد ثمن سے ہو رہی ہے، اس لیے یہ صورت ناجائز ہے۔

(الدر المختار ۲/ ۵۰۲، البدائع ۵/ ۲۱۵، المجموع ۵/ ۴۰۳، تحفۃ علی حواشی ۴/ ۲۷۳)۔

۱۴- بائع کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ بیع کی تکمیل کے بعد مکمل قیمت یا بعض قیمت معاف کردے، بالکل اسی طرح جیسے کہ مشتری کے لیے یہ درست ہے کہ وہ معاملہ ہونے کے بعد ادھار کو نقد میں بدل دے، بائع کے قیمت معاف کرنے یا کم کرنے میں مشتری کے قبول یا عدم قبول کو کوئی دخل نہیں ہے (درر الحکام ۱/ ۲۳۰)۔

''ضع وتعجل'' کی یہ صورت جائز و درست ہے، برخلاف اس صورت کے کہ بائع طے شدہ رقم کو مقررہ مدت سے آگے بڑھانے پر زیادتی کا مطالبہ کرے، یہ صورت جائز نہیں ہے (المغنی ۴/ ۳۱۶)۔

۱۵- مذکورہ بالا صورت جائز و درست ہے، کیونکہ مشتری کو ادھار کو نقد میں بدل دینے کا حق حاصل ہے (درر الحکام ۱/ ۲۲۹)۔

حضرت ابن عباس اور ابن سیرینؒ وغیرہ کے یہاں بھی جائز ہے (ملاحظہ ہو: المغنی ۴/ ۳۱۶)۔

۱۶- طے شدہ اقساط میں سے کسی قسط کی تاخیر پر بائع کا ماقی جملہ قسطوں کا مطالبہ جائز ہے (رد المحتار ۴/ ۲۶، درر الحکام ۱/ ۲۳۰)۔

شوافع بھی اسی نظریہ کے قائل ہیں (کتاب الام ۳/ ۳۳)۔

۱۷- مذکورہ صورت میں اگر دائن کا انتقال ہو جائے تو معاملہ اس کے وارثین کی طرف منتقل ہو جائے گا، معاملہ ختم نہیں ہوگا، لیکن اس کے برعکس یعنی اگر مدیون مر جاتا ہے تو پھر معاملہ سرے سے ختم کر دیا جائے گا (شامی ۴/ ۲۶)۔

شوافع بھی اسی کے قائل ہیں (تحفۃ علی حواشی ۴/ ۲۹۷)۔

۱۸- صورت مذکورہ میں قیمت اور سامان دونوں متعین ہوتے ہیں، بس دوکاندار زیادہ بکری کی غرض سے انعام کی تقسیم کا ایک نظم بناتا ہے، پہلے سے اس کا اعلان بھی کر دیتا ہے کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ایک یا چند خریداروں کو انعام دیا جائے گا، اس قسم کی صورتوں کا اختیار کرنا بائع کے لیے جائز و درست ہے جس سے مقصود نفع کم، بکری زیادہ ہو، نیز اس میں مبیع اور ثمن میں سے کوئی مجہول نہ ہو، لہذا اس طرح کا معاملہ درست ہے، اور یہ قمار میں داخل نہیں ہے، کیونکہ قمار کہتے ہیں مستور العاقبت کو اور اس صورت میں ثمن اور مبیع دونوں متعین ہونے کی وجہ سے کچھ بھی مستور العاقبت نہیں ہے، لہذا اس قسم کا معاملہ درست اور جائز ہونا چاہیے۔

۱۹- بیع کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مبیع یا ثمن میں ایسی جہالت نہ ہو جو جھگڑے کا سبب بن سکے، یہاں اگرچہ قیمت اور اجل میں من وجہ جہالت ہے لیکن معاشرہ میں مروج ہونے کی وجہ سے یہ جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہے۔

نیز کسی بھی معاملہ میں بائع ومشتری کی رضامندی کو خاص دخل ہے، اور یہاں اس صورت میں ایجاب وقبول کے ذریعہ ان کی رضامندی معلوم ہے، لہذا یہ بیع جائز و درست ہوگی (بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۶)۔

☆☆☆

قسطوں پر خرید وفروخت

مولانا انیس احمد قاسمی، پٹنہ

۱- صورت مسئولہ میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع مؤجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہوجائیں، لیکن اگر کسی ایک بھاؤ پر اتفاق کیے بغیر دونوں جدا ہوجائیں تو یہ بیع ناجائز ہے (ہدایہ ۳/ ۲۱، کتاب البیوع، مبسوط للسرخسی ۱۳/ ۸)۔

۲- صورت مسئولہ میں ادھار قیمت کی ادائیگی یکمشت بھی جائز ہے اور قسطوں میں بھی، قسطوں پر بیع کا مطلب وہ بیع ہے جس میں فروخت کرنے والا اپنا سامان مشتری کو اسی وقت دے دے لیکن مشتری اس چیز کی قیمت فی الحال ادا نہ کرے، بلکہ طے شدہ قسطوں کے مطابق اس کی قیمت ادا کرے، لہذا جس بیع میں مذکورہ بالا صورت پائی جائے اس کو بیع بالتقسیط کہتے ہیں، چاہے اس چیز کی طے شدہ قیمت بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم وبیش ہو، بہر دو صورت بیع جائز ہے بایں وجہ کہ:

''وإذا ثبت جواز تأجيل الثمن ثبت جواز تأجيله ليدفع قسطا واحدا أو أقساطا. لأن الحالتين مشمولتان بالتأجيل'' (مجله مجمع الفقه الاسلامی ۶/۲۷۹)۔

۳- (الف)..... مسئولہ صورت کی ایک شکل جائز و درست ہے اور ایک صورت درست نہیں ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ اگر عاقدین مجلس عقد ہی میں کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن پر اتفاق کرلیں تو یہ بیع جائز و درست ہے، دوسری صورت اگر بائع مشتری سے یہ کہے کہ مبیع نقدا اتنے روپے میں اور مؤجل اتنے روپے میں فروخت کرتا ہوں اور اس کے بعد کسی ایک نرخ پر اتفاق کیے بغیر دونوں جدا ہوجائیں تو یہ بیع ناجائز ہے۔

(ب)..... بائع کو چاہیے کہ ادھار فروختگی اور نقد فروختگی دونوں کا تذکرہ کردے اور اگر بائع صرف ادھار فروختگی کا تذکرہ کرتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ مذکورہ صورت میں مشتری کو غبن فاحش ہے یا نہیں؟ اگر مشتری کے لیے غبن فاحش ہے تو مذکورہ بالا صورت ناجائز وحرام ہے، اور اگر مشتری کے لیے غبن فاحش نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ بیع جائز و درست ہے۔

۴- مسئولہ صورت میں اختلاف ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ثمن کی زیادتی مدت کے عوض ہوتی ہے، اس لیے مسئولہ صورت جائز نہیں ہے، کیونکہ ثمن کی کثرت مدت کے عوض ہونا سود میں داخل ہے اور ربا بالاتفاق ناجائز وحرام ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''الربا هو الزيادة على رأس المال بتأخير الآجال'' (هدایه ۳/ کتاب البیوع)۔

اور بعض لوگوں کے یہاں مسئولہ صورت جائز وحلال ہے، اس لیے کہ قیمت کی زیادتی مدت کے عوض نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ ثمن کا جز ہوتی ہے، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ اگر ثمن کی زیادتی مدت کے عوض ہوگی تو مسئولہ صورت بالاتفاق ناجائز وحرام ہوگی۔

''يحرم بيع الشئ بأكثر من سعر يومه لأجل النسا'' (تحفة الاحوذی ۴/ ۳۵۹)۔

۵- صورت مسئولہ کی دونوں شقیں جائز و درست معلوم ہوتی ہیں، اس بارے میں فقہاء کی کوئی عبارت تو نظر سے نہیں گزری، البتہ فقہاء کرام کے سابقہ اقوال پر قیاس کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسئولہ صورت جائز و درست ہے، کیونکہ نقد اور مؤجل کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہو تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بنا پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز و درست ہونی چاہیے، اس لیے کہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

۶- کسی شئی کی خرید وفروخت نقد معاملہ کے طور پر دس روپے طے ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ طے ہوا کہ یہ دس روپے ایک ماہ کے اندر ادا نہ کیے گئے تو مزید ۲/ روپے ادا کرنے ہوں گے، اور اسی طرح ہر ماہ کی تاخیر پر دو روپے کا اضافہ ادا کرنا ہوگا۔

یہ صورت ناجائز وحرام ہے، اس وجہ سے کہ یہ اضافہ مدت کے عوض ہے، اور یہ بات طے ہے کہ جو عوض مدت کے مقابلے میں ہو وہ ربا ہے (ہدایہ ۳/ کتاب البیوع)

۷- مسئولہ صورت ناجائز وحرام ہے، اس مزید رقم کو جرمانہ یا مالی تاوان نہیں قرار دیا جائے گا، بلکہ یہ سود میں داخل ہے، مثال کے طور پر اگر بائع مشتری سے یہ

کہے کہ فلاں چیز تم کو دس روپے میں نقد فروخت کرتا ہوں، لیکن اگر تم نے ایک ماہ تک قیمت ادا نہ کی تو تمہیں دو روپے مزید ادا کرنے ہوں گے، اب اسی دو روپے کو منافع کا نام دیا جائے یا کچھ اور لیکن اس کے سود ہونے میں کوئی شک نہیں، اس لیے کہ اس شئی کی اصل قیمت دس روپے مقرر تھی، اور یہ دس روپے بیع کے نتیجہ میں مشتری کے ذمہ دَین ہوگئے، اب اس دس روپے سے زیادہ کا مطالبہ کرنا یقینا سود ہی ہے۔

۸- (الف)......بائع کے لیے شئی مرہون سے فائدہ اٹھانا بلا اجازت ناجائز وحرام ہے، کیونکہ اس شئی مرہون سے منتفع ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے، انتفاع کی حرمت اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کل قرض جر نفعا فهو ربا" (ارشاد نبوی، نیز دیکھئے: ہدایہ ۴/ ۵۲۲)۔

(ب)......اگر رہن بائع کے پاس ہلاک ہوجائے تو دیکھا جائے گا کہ اگر بغیر تعدی کے ہلاک ہوا ہے تو بیع فسخ نہیں ہوگی، اور وہ ہلاکت مشتری کے مال سے سمجھی جائے گی، مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا، اور اگر تعدی کی وجہ سے ہلاک ہوا تو بائع ضامن ہوگا، واضح رہے کہ مرتہن بازاری قیمت کا ضامن ہوگا نہ کہ ثمن کا ضامن ہوگا۔

(ج)......اگر مشتری مقررہ وقت پر دَین ادا نہیں کر رہا ہے اور ٹال مٹول کر رہا ہے تو ایسی صورت میں بائع شئی مرہون فروخت کر کے اپنی قیمت لے لے گا، واضح رہے کہ بائع وہی قیمت لے سکتا ہے جو عقد کے وقت مقرر ہوئی تھی، مزید رقم مشتری کو لوٹانا واجب ہے۔

۹- (الف، ب):......ادھار بیع میں بائع کے لیے مبیع کو روکنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ بائع مبیع کو ثمن کی وصولیابی کے لیے روک لے، دوسری صورت یہ ہے کہ بائع کوئی شئی بطور رہن رکھے، اس میں سے پہلی صورت تو بیع بالتقسیط میں جائز ہے، بایں وجہ کہ نقد بیع میں ثمن کی وصولیابی کے لیے بائع مبیع کو روک سکتا ہے، لیکن بیع موجل میں بائع مبیع کو نہیں روک سکتا ہے (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵)۔

البتہ رہن کی صورت میں اگر بائع مبیع کو مشتری کے قبضے سے پہلے روک لے تو یہ صورت جائز نہیں ہے، اور اگر مشتری مبیع پر قبضہ کرے اور قبضہ کے بعد مشتری بائع کے پاس مبیع کو بطور رہن رکھ دے تو یہ صورت جائز وحلال ہے، امام محمد علیہ الرحمہ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں:

"ومن اشترى ثوبا بدراهم فقال البائع: امسك هذا الثوب حتى أعطيك الثمن فالثوب رهن" (الجامع الصغیر: ص ۴۱۹)۔

۱۰- یہ صورت از روئے شرع ناجائز وحرام ہے، اس لیے کہ مبیع اور کچھ ادا کردہ اقساط بائع کی ہوجاتی ہیں، یہ تو مشتری پر ظلم ہے، اس لیے یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے، مذکورہ صورت میں ایک شکل جائز کی نکل سکتی ہے وہ یہ کہ بائع اولاً مشتری کو وکیل یا قاضی کے ذریعہ بقیہ اقساط ادا کرنے پر مجبور کرے، اگر پھر بھی مشتری بقیہ اقساط ادا کرنے سے قاصر ہو تو ایسی صورت میں بائع مبیع کو فروخت کر کے ادا کردہ اقساط مشتری کو لوٹا دے اور بقیہ اقساط بائع خود لے لے۔

☆☆☆

جدید فقہی تحقیقات

چوتھا باب: اختتامی امور

مناقشہ:

قسطوں پر خرید وفروخت سے متعلق شرعی احکام

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب

احسان صاحب یہ بتائیں کہ یہ جو (Sale on installment) ہے، یعنی بیع بالتقسیط، اس مسئلہ کا موجودہ بینکنگ سے کیا ربط ہے، یا آج کی جو بین الاقوامی تجارت ہے اس میں اس اصول کا کیسے استعمال کیا جارہا ہے؟ تصویر واقعہ احسان صاحب آ کر جو نیشنل بینک کے بینکنگ لا سے واقف بھی ہیں، ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں، اور چند منٹ میں اس بات کی وضاحت کریں، جو موضوع ابھی زیر بحث ہے ''بیع بالتقسیط'' کا اس کا موجودہ معاملہ اور جو آج بازار میں رائج ہے، اس کے جائز اور ناجائز ہونے کی بات آپ سے نہیں پوچھی جارہی ہے، بلکہ واقعہ کیا ہے؟ صورت حال کیا ہے؟ اس کی وضاحت کریں۔

ڈاکٹر احسان الحق:

جہاں تک قسطوں پر سامان کے فروخت کا سوال ہے، اس میں معاملہ صرف یہی ہے کہ ایک آدمی فوری قیمت ادا نہیں کرسکتا، لہذا اس کو سہولت دی گئی کہ وہ قسط وار اس چیز کی قیمت ادا کردے اور ایسی صورت میں اس سے بینکنگ کے اعتبار سے تو وہ انٹریسٹ کہا جاتا ہے، جو کہ ہر مہینہ اتنا روپیہ وہ ادا نہیں کرسکا، اس کے اوپر سود لگتا رہتا ہے، طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جتنا قرض وہ ادا کردیتا ہے، اس کی اصل رقم اس لیے الگ الگ رکھی جاتی ہے کہ اصل کی رقم منہا کردی جاتی ہے اور سود اپنی آمدنی میں شامل کرلیا جاتا ہے، اگلے مہینے میں پھر جو قسط آئے گی جتنی رقم اصل منہا ہوچکی ہے، اس کے پاس اس رقم کا سود لگے گا، بینک کا طریقہ تو اس معاملہ میں یہی ہوتا ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

دوسرا میں نے یہ جاننا چاہا تھا کہ آج اس کا استعمال کیسے ہوتا ہے، اس کے لیے ڈاکٹر کھٹکھٹے صاحب سے بات کرنی ہے، یہ تو معلوم اور معروف بات ہے کہ آج ساری دنیا میں جو معاشی اور تجارتی نظام ہے، اس کی بنیاد سود پر ہے، اس لیے موجودہ معاشی اور تجارتی نظام کے کسی جزئیہ کو سود کے پس منظر سے خالی کرکے سوچنا ممکن نہیں، ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ یہ کہ اس طرح کے مالیاتی ادارے۔ میں قصداً لفظ بینک استعمال نہیں کررہا ہوں، اس طرح کے مالیاتی ادارے جو استثمار کا (Investment) کا جو رقوم جمع کرکے آگے کا کام کررہے ہیں، ان اداروں میں جو اسلامی اصول تجارت ہیں ان کا استعمال کیسے کیا جائے، مثلاً مرابحہ کا استعمال، مضاربہ کا استعمال، شرکہ کا استعمال، یہ سارے امور دراصل آہستہ آہستہ الحمد للہ بڑھ رہے ہیں، اس نظام کی طرف اس معاشی وتجارتی نظام کی طرف جو مجھے یقین ہے انشاء اللہ اگلے چند برسوں میں اسلامی اصول پر تجارت، معاملات، استثمار اور انویسمنٹ کے مواقع فراہم کرے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ ماہرین جو آج کی معاشیات پر نظر رکھتے ہیں، اور اپنے دل میں اللہ کا خوف رکھتے ہیں، وہ شریعت کے مطابق ایک ایسے نظام کی تشکیل کرسکیں گے، جو اسلام کے اصول تجارت اور اسلام کے اصول معاملات پر مبنی ہو، اور سود سے پاک ہو، ہم آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہے ہیں اس کی طرف، ساری مشکلات کے باوجود۔ بیع بالتقسیط کا جو موضوع آپ کے سامنے ہے کہ عام طور پر اس کی سیدھی سادی صورت یہ ہے کہ جو ایک انفرادی زندگی میں واقعہ پیش آتا ہے کہ ہم نے آپ کی دوکان سے سامان خریدا اور کہا کہ اس وقت میرے پاس پیسہ پورا نہیں ہے، میں دو روپے مہینہ تم کو دے دیا کروں گا، پانچ قسطوں میں یا چار قسطوں میں میں پوری قیمت ادا کردوں گا، اس طرح کا ادھار معاملہ، عام طور پر سادہ معاملہ زندگی میں روز پیش آتا ہے، ادھار خرید وفروخت اور ادھار بھی اقساط کے ساتھ خرید وفروخت، تو جہاں تک اس کے بیع ہونے کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بیع ہے اور بیع حلال ہے، اپنی اس سادہ صورت میں اس کی حلت پر کہیں پر کوئی دشواری نہیں ہے، لیکن اس

کا استعمال اگر کسی ہیئت اجتماعی کے ذریعہ اور کسی انویسٹمنٹ کمپنی کے ذریعہ ہو، تو وہاں یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ وہ عام طور پر جو قیمت نقد کی لیتے ہیں، اس سے زیادہ ادھار کی لیتے ہیں، پھر اس کی دو صورتیں ہیں، جو ایگریمنٹ ہوتا ہے، اس ایگریمنٹ میں اگر معاملہ آمنے سامنے کا ہے، اور طے ہوا کہ اگر چھ مہینہ میں ادا کرو گے تو چھ ہزار دام اور بارہ مہینے میں اگر ادا کرو گے تو ۹ ہزار دام، اگر وقت عقد میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ باعتبار زمانہ قیمت میں ہم فرق کریں گے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے یہ کہا کہ ہم کو چھ مہینہ کے بعد ادا کرنا ہے اور آپ ہم کو دے دیجئے اس میں نقد کی قیمت کچھ اور ادھار کی قیمت کچھ اور، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج خاص کر جو اسلامی طریقہ پر کچھ اس طرح کا معاملات کرنے کا جواز بنتا جا رہا ہے، یعنی بین الاقوامی تجارت میں بھی بالاقساط ادائیگی کا عام رجحان ہے، خود اب ہندوستان میں بھی اس طرح کے بالاقساط ادائیگی کے کاروبار ہو رہے ہیں، اس میں اس اصول کا کس طرح استعمال کیا جاتا ہے؟ موجودہ بینکنگ سسٹم میں اور موجودہ تجارتی سسٹم میں اور ان اداروں میں جو ادارے اسلامی بنیادوں کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ کھٹکھٹے صاحب "بیت النصر" کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں وہ ہمیں اس بارے میں رہنمائی کریں گے، مجھے خوشی ہے کہ یہاں پر کئی ماہرین موجود ہیں ابھی میری نظر پڑی ہے، ہوسکتا ہے کہ ہم کسی وقت ان کی معلومات سے بھی استفادہ کریں۔............آواز صاف نہیں ہے۔

ایک آواز:

......یہ تو صحیح ہے کہ سود نہیں لیا جا سکتا اور جو دین ہے اس کے اوپر اس میں اضافی رقم نہیں لی جا سکتی، مگر جس صورت میں جس سے لینا ہے وہ جان کر اور اپنے پاس روپئے رکھتے ہوئے بھی اگر دیر کرتا ہے، اور روپیہ نہیں دیتا ہے تو اس میں گیا کیا جا سکتا ہے اور اس کے اوپر کیا کوئی تاوان رکھا جا سکتا ہے اور اگر رکھا جا سکتا ہے تو وہ کس طرح کا ہوگا اور اس کا مصرف کیا ہوگا؟ یہ کچھ سوالات ہیں اگر اس سمینار میں طے کئے جائیں تو اسلامی مالیاتی اداروں کو اس سے مدد ملے گی اور ایک نشاندہی ہوگی۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

دوسرا سوال یہ ہے کہ مطلق بیع نسیئہ کا ثبوت تو خود جناب رسول اللہ ﷺ سے ہے، یہاں تک کہ یوم وصال نبی ﷺ میں حضور کی ذرہ ایک یہودی کے یہاں رہن تھی، حضور نے اس کو نسیئۃ یعنی ادھار اس سے لیا تھا، ادھار کی بیع تو خود عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اب رہی بہت اہم بات جو ہمارے ......صاحب نے کہی ہے: "الامور بمقاصدها ولا عبرة للالفاظ والمباني والعبرة للمعاني" یہ ہمارے یہاں قواعد کلیہ فقہیہ نہیں، ان کے ساتھ ساتھ مقاصد کے مختلف درجات ہو سکتے ہیں، اس میں ایک اہم درجہ جس کی طرف شیخ وہبہ زحیلی صاحب نے اشارہ کیا ہے، وہ ہے "بیع سلم"، بیع سلم میں آج ایک کاشتکار جس کے پاس اناج موجود نہیں ہے، چھ مہینے کے بعد جب اس کے کھیت سے فصل آئے گی تو وہ مالدار ہو جائیگا اور آج ہے وہ فقیر، آج اسے وہ شئی اس قیمت پر فروخت کرنی پڑتی ہے کہ اگر اس کو یہ مجبوری نہ ہوتی تو جس وقت کھیت سے فصل آ جاتی تو اس کو پچاس سو روپئے من بیچتا، آج اسے اس کو چالیس روپئے من بیچنا پڑ رہا ہے، ایڈوانس پیسہ لینے کے لیے آج اس کو ضرورت ہے، کاشتکاری نہیں چلا سکتا، اس مجبوری کے لیے کسی صاحب سرمایہ سے وہ دس ہزار روپئے لے لیتا ہے، تاکہ ہم کھیتی بھی کریں گے اور گھر بھی چلائیں گے اور جب فصل ہمارے پاس آئے گی، تو اگرچہ مارکیٹ میں اس وقت پچاس روپئے من کا ہو، لیکن آج بھی ہم اس کو چالیس روپئے من پر فروخت کر رہے ہیں، یہ بھی اس استحصال کی تعریف میں آتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا ہمارے جناب شمس پیرزادہ صاحب نے اور اسی لیے اس کو "بیع المفالیس" بھی کہا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جس درجہ کا بھی استحصال ہو مجھے اس کو ماننے میں کوئی دشواری نہیں ہے، لیکن حدیث نبوی ﷺ اور جملہ فقہاء امت کے اجماع کے ذریعہ سے بیع سلم کو جائز قرار دیا گیا ہے، بیع سلم میں "بیع الآجل بالعاجل" ہے، یعنی جو مبیع ہے وہ بعد کو دیا جائے گا اور قیمت پہلے لے لی جاتی ہے اور بیع بالتقسیط میں بیع لاٰ جل ہے یہاں پر جناب والا قیمت بعد کو دی جائے گی، شئی پہلے لے لی جائے گی، ایک نوع کا استحصال اگر دیکھا جائے تو دونوں میں پایا جاتا ہے، لیکن شرع میں جو توازن ہے کہ حاجات ناس کی رعایت اور ساتھ ساتھ ممکن حد تک استحصال سے تحفظ، میں سمجھتا ہوں کہ شرع محمدی ﷺ کا سلم کو مباح قرار دینا اور خود حضور ﷺ کا بیع نسیئہ کرنا، ان دونوں چیزوں کو سامنے لا کر دیکھا جائے تو شاید مسئلہ کو حل کرنے میں مدد ملے۔

پھر میں معافی چاہتا ہوں، میں قصداً اپنی رائے کا اظہار کرنا نہیں چاہتا، میں پھر سوال کی صورت میں آپ حضرات کے سامنے اس مسئلہ کو رکھنا چاہتا ہوں، ایک بحث تو یہ ہو گئی، جو حدیث اس سلسلہ میں وارد ہے اس میں جو صورت خود سیدنا امام شافعیؒ نے جو بیشک عارف بمعانی الحدیث ہیں انہوں نے اس حدیث کا جو مفہوم سمجھا ہے اس پر بھی نظر رکھنی چاہئے اور ان کی تفصیلات شیخ صاحب کے مقالے میں موجود ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس مقالے کی کاپیاں ہمارے ہارون بھائی

صاحب کروادیں، تاکہ علماء کو یہ دولت مل جائے، چھپنے میں تو بہت وقت لگے گا توان حالات میں اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے اور ہم کو کسی پر اپنی رائے تھوپنے کے بجائے واقعتۃً جو شرع کی رہنمائی ہے، اور اللہ یہ توفیق دے کہ ہم خیر پر اور صحیح راستہ تک پہونچ سکیں، ان مسائل کا حل کرنا چاہئے، ان مختصر الفاظ کے بعد کے بعد میں اپنی بات ختم کرتا ہوں اور کوئی صاحب اظہار رائے کرنا چاہیں توان سے درخواست کروں گا۔

ایک آواز:

’’بیع سلم‘‘ میں قیمت پہلے ادا کردی جاتی ہے اور مال بعد میں حاصل کیا جاتا ہے اور یہ جو ادھار کی فروخت ہے اس میں اس کے بالکل برعکس معاملہ ہوتا ہے، اس لیے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، ایک تو بات یہ ہے، اب علت وفرق سمجھ میں آیا، وہاں پہلے سامان دیا جاتا ہے پیسہ بعد کو لیا جاتا ہے، اور دوسری جگہ پر پیسہ پہلے دیا جاتا ہے اور سامان بعد میں لیا جاتا ہے تواس میں کونسی ایسی صفت ہے جس کو ہم علت حکم قرار دے کر دونوں کے درمیان فرق کرسکیں؟

............آواز صاف نہیں ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

اگر دیہات میں جا کر آپ تماشہ دیکھئے! بیع سلم تو بہت مبارک صورت ہے، دیہات میں سوایا ڈیوڑھا اور دوگنا یہ اصطلاحات ہیں، دیہات کے کاشتکاروں کے بیچ، سوایا دیوڑھا اور دوگنا ایک من چاول ایک من دھان دیا ایک من نہیں دو من لیں گے یا ڈیڑھ من لیں گے یا سوا من لیں گے، یعنی پہلے بہت زیادہ اس کا رواج تھا اور ابھی بھی ہے وہ تو صورۃً بیع ہے کیونکہ جنس کا جنس کے ساتھ تبادلہ ہوتا ہے، اس کو تو ہم لوگ منع کرتے ہیں اور الحمدللہ اس میں کچھ صورت حال بھی اچھی بنتی چلی جارہی ہے، لیکن اولاً تو یہ صورت اموال ربویہ کے باہمی تبادلہ کی نہیں ہے، یہ بھی ایک بہت اہم نقطہ آپ کے غور کرنے کا ہے......

بہرحال اگر آپ کا یہ کہنا ہے کہ یہ اسلامی مالی ادارے ان کو ہم یہ ہدایت کریں کہ اس طرح جن پر تھوڑی ہماری بات چل سکتی ہے کہ ’’بیع بالتقسیط‘‘ میں اگرچہ ظاہر ہے کہ نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت زائد ہوگی، لیکن یہ زیادتی عادلانہ ہونی چاہئے، نہ کہ جناب استحصال والی ہو تواس حد تک ہم سب سے زیادہ آپ سے اتفاق کریں گے، کیوں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟............آواز صاف نہیں ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

استحصال............اور اس کا ایک نصاب متعین کرنا بہت مشکل ہے............استحصال تو صحیح نہیں ہوگا لیکن ایک سرمایہ دار مان لیجئے وہ کچھ لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر قیمتوں کو بہت بڑھادے تو آپ کے یہاں کم از کم یہ چیز ضرور موجود ہے، ایک تو ’’احتکار‘‘ کو آپ نے ممنوع قرار دیا ہے............اور حکومت اسلامی کو آپ نے بھی اجازت دی ہے، بازار کے ریٹ کو کنٹرول کرنے کے لیے آپ کی حکومت اسلامی اگر اللہ کبھی وجود میں لادے تو وہ ایسے قواعد ایسے قوانین عائد کرسکتی ہے کہ مارکیٹ میں تجار کسی شیٔ کی قیمت کا اتنا زیادہ اضافہ نہ کردیں جس کی وجہ سے عام لوگ جبر و پریشانی کا شکار ہوجائیں............

............بہرحال ضرورۃً آدمی خریدتا ہے صحیح ہے، لیکن آج اس ضرورت کا ایسا استعمال نہ کیا جائے کہ جس کے نتیجہ میں اس کو زیادہ سے زیادہ مجبور کردیا جائے، بہت قیمت بڑھا کر یا خاص کر اپنے ان اسلامی اور مالیاتی اداروں کو تو کہہ سکتے ہیں، کہ صاحب قیمت ایسی رکھئے جس سے آپ کا بھی کام چلے اور اس کا بھی کام چلے، جو سودکی ذہنیت ہے، یا جو ربوی نظام کی ذہنیت ہے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا خون چوسو، وہ ہمارے اسلامی مالیاتی اداروں میں نہیں آنا چاہئے، یہ اگر تھوڑی روک آپ کی طرف سے لگتی ہے تو میرے خیال سے اچھا رہے گا۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم:

استحصال کی ایک مثال آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی روشنی میں خاص طور سے جو اسلامی مالی ادارے کام کررہے ہیں، اس پر غور کریں، گاڑی کے لیے قرضہ اسلامک بینک بھی، اسلامک مالی ادارے بھی اور سودی کاروباری ادارے بھی دیتے ہیں، قسطوں پر، میری معلومات کی حد تک بغیر نام لیے ہوئے کسی ادارے کا، اور میں نے بھی کچھ اس طرح کی چیزیں کی ہیں، لیکن جو سودی ادارے ہیں اور جب وہ ادارے سے کوئی گاڑی خریدتا ہے اور جو وہ قسطوں میں ادا کرتا ہے وہ قیمت اور جو اسلامی مالی اداروں سے قسطوں میں لیے گئے ہیں وہ قیمت دونوں میں بڑا فرق ہے، سودی والے حصہ میں قسطوں میں جو ادا کیا گیا ہے وہ کم اور جو غیر سودی ہے اس میں جو قسطوں میں ادا کیا گیا ہے، وہ زیادہ ہے، یہاں پر جو چیز بڑی اہم ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ غیر اسلامی مالیاتی اداروں میں نہیں

جانا چاہتے سود کی وجہ سے، میرے خیال سے، کیونکہ وہ سود کے ذریعہ سے چیزوں کو نہیں لینا چاہتے انہیں قیمت زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے، کیونکہ وہاں غیر سودی طریقہ سے ادا کیا جارہا ہے، تو میرا اپنا خیال ہے کہ یہ استحصال کا ایک بہت اہم پہلو ہے کہ چونکہ ہم سود سے پاک ہونا چاہ رہے ہیں، اسلیے اگر ہمیں زیادہ قیمت ادا کرنا پڑے اور میرا اندازہ ہے کہ بہت سے لوگ اسی لیے اسلامی ادارے کی طرف نہیں جارہے ہیں تو میں خاص طور سے ان حضرات کو جو اس میں شامل ہیں اور جو یہ کام کررہے ہیں میں ان کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ وہ براہ کرم اس پر توجہ دیں تاکہ اگر آپ کم نہیں کرسکتے تو سودی ادارے سے تو برابر کم از کم رکھئے، اس سے زیادہ ادا نہ کرائیے تاکہ اسلام کا ٹیکس نہ محسوس ہو۔ جزاکم اللہ خیرا۔

ایک آواز:

......محترم یہ استحصال اور اس کے تمام پہلوؤں پر ابھی غور کیا گیا، درمیان میں موضوع سے بھی بہت دقیق موضوع پر اور اس کی باریکیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی، کیونکہ اس وقت بیع بالتقسیط کا سوال چل رہا ہے، اس وقت ہمارا تعلق بھی ایک مالی ادارے سے ہے، اب ہم یہ محسوس کررہے ہیں کہ ہم عوام کا کم عوام ہمارا زیادہ استحصال کرنا چاہتا ہے، اور وہ کن کن طریقوں سے کرنا چاہتا ہے، وہ بہت طویل فہرست ہے، بہرحال ایک پہلو جس پر منظور عالم صاحب نے بھی روشنی ڈالی ہے کہ ''بیع بالتقسیط'' میں تاخیر کے دو اسباب ہیں، ایک تو مجبوریاں انسان کی، دوسرے یہ کہ وہ اپنے اور مالیاتی نظام کو مضبوط کرنے کے لیے اس سرمایہ کو اپنے پاس محفوظ رکھ رہا ہے اور یہ سراسر ادارے کا استحصال ہے، اس سے ادارے میں جو خرابی آرہی ہے اور معاشرے میں جو نظام بگڑ رہا ہے وہ ہمارے پاس جملوں میں اور لوگوں کے تاثرات میں وہ آرہی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ جب فلاں شخص نے روپیہ برحق نہیں دیا اور اس کا کچھ نہیں بگاڑا گیا تو ہم ہی کیوں صحیح وقت پر روپیہ ادا کریں، تو میں علماء کرام کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہوں گا کہ یہ جو معاشرے میں ان صورتحال کی وجہ سے بیع بالتقسیط میں تاخیر کے سبب یہ (معاشرے کے) اداروں کے ساتھ رویہ اختیار کیا جارہا ہے، اس رویہ کے لیے عوام میں جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس عوام کے بگاڑ کی اصلاح کے لیے ہمارے علماء ہمیں کیا رہنمائی عنایت فرماتے ہیں۔..........؟

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

ضرور اجازت دیں گے۔ آپ کو کیسے نہیں دیں گے، مشکل ہوجائے گی۔

ایک آواز:

حضرات! میں نے جیسا ابھی عرض کیا تھا مشینوں اور پرزوں کے خریداروں کے لیے خاص طور سے.......... آپ حضرات ان چیزوں کو بہت اچھی طریقے سے جانتے ہیں، معاملے کے دو جز ہیں، ایک فائنانس کمپنی کو جو اپروچ کرتے ہیں کہ ہمیں گاڑی خریدنی ہے وہ فائنانس کمپنی ہمیں گاڑی کی قیمت کا ڈرافٹ بنا کر اس کمپنی کے نام دے دیتی ہے، یہ معاملہ ہوا ہمارے اور کمپنی کے درمیان قرض کا، وہ کمپنی قرض کی رقم ہمارے نام پر ڈال دیتی ہے، پھر وہ قرض ہم سے وصول کرتی ہے، ہم اس ڈرافٹ کو لے کر کمپنی میں جاتے ہیں، جو اصل قیمت ہوتی ہے، کار کی.......... وہ اس کو دیدیتے ہیں وہ مشینری ہمیں دیدیتی ہے، یہ معاملہ کے دو جز کو ایک معاملہ مانیں گے، یا بیع کا معاملہ علیحدہ مانیں گے اور قرض کا معاملہ علیحدہ مانیں گے، اگر بیع کا معاملہ علیحدہ ہے تو بیع جائز ہوگئی، اس لیے کہ ہم نے اس کو جا کر کے ڈرافٹ دیا اور اس نے ہمیں مال دے دیا جائز، کمپنی کا قرض ہم پر باقی رہا اور کمپنی اپنے قرض کو وصول کررہی ہے، ان دونوں چیزوں کو آپ ایک معاملہ مانیں گے یا دونوں کو علیحدہ علیحدہ مانیں گے، اگر دو علیحدہ علیحدہ مانیں گے تو بیع کو جائز قرار دیں گے، اس کو کیا کہیں گے جو صورت حال ہوا اس کو بتادیں۔

ایک آواز:

..........حضرت قاضی صاحب نے جو سوالات اٹھائے تھے، اس میں پہلا سوال یہ تھا کہ بدلین میں تعیین کی شرط ہے یا نہیں، ہر جگہ ہے یا کچھ جگہوں پر ہے، غالباً یہی بات تھی اگر بیع مقارضہ ہو، یعنی اس میں دونوں طرف مبیع ہو، بدلین، یعنی ثمن اور مبیع دونوں طرف جو ہے سامان ہی ہو، تو اس صورت کے اندر تعیین ضروری ہے چونکہ دونوں میں ثمن ہونے کا امکان ہے اور مبیع ہونے کا بھی امکان ہے تو مبیع کی حیثیت سے اس میں تعین ہونا چاہئے۔..........

اور یہ جو بیع صرف ہوا کرتی ہے، اس میں چونکہ دونوں طرف ثمن ہے، اسی لیے مجلس ہی میں قبضہ شرط ہے، تاکہ ''بیع الکالی بالکالی'' نہ ہونے پائے۔

یہ سوال نہیں تھا میرا، پتا نہیں کیسے بات الجھ گئی؟ میں نے کہا کہ تحقق ربا کے لیے اموال ربویہ ہونا ضروری ہے یا نہیں یا مطلق ہر معاملہ میں ربا ہو جائے گا۔

ایک آواز:

ربا جو ہے امام ابوحنیفہؒ کے یہاں قدر مع الجنس ہے اور قدر مع الجنس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کیلی ہو یا موزونی ہو۔

ایک آواز:

ابھی یہ بحث ہی نہیں ہے، ہم ربا پر بحث نہیں کر رہے ہیں، صرف اتنی بات کہ کیا ربا کے تحقق کے لیے اموال ربویہ ہونا چاہئے، چاہے وہ منصوصہ فی الحدیث ہو یا مستنبطہ بالمجتہدین ہو، بیع سے بات ختم ہوگئی۔

............آواز صاف نہیں ہے۔

ایک آواز:

ابھی جو استحصال کے سلسلہ میں بات ہوئی تھی سود کے سلسلہ میں، تو اس میں صرف یہ بات ہوئی ہے کہ کم اور زیادہ، میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کو یہ بھی شامل کرنا چاہئے کہ سود جو ہے متعین ہوتا ہے اور اسکے برعکس جو غیر سودی معاملات ہیں اس میں تعین نہیں ہوتا ہے، یہ بات تو ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی جگہوں میں جہاں وہی چیز اگر سود کے پیسے سے فائنانس کریں گے، جیسے کہ یہ عام ہے کہ عرب ممالک میں سود کی شرح بہت کم ہے، اگر بزنس مین خود اس چیز کو کرتا ہے اس سے مال لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتا ہے تو اس کو کہیں زیادہ اس میں منافع ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ دس بیس پرسنٹ منافع ہوتا ہو، جبکہ سود کی شرح اگر وہ سود لے کر ادا کرتا ہے تو............ پانچ پرسنٹ اس کو ادا کرنا پڑے گا، تو یہ جو مقید اور غیر مقید جو اس کا جز ہے سود اور غیر سودی خود ان کو اسکا بھی لحاظ رکھنا چاہئے، جہاں تک اس وقت قسطوں میں دینے کی بات ہے اس میں میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ہم کو سوچنا چاہئے کہ قسطوں پر اگر ہم دے رہے ہیں تو اس میں یہ چیز بالکل متعین ہو رہی ہے، یا اس میں کچھ رسک باقی ہے، اگر رسک باقی ہے.........اگر متعین ہوجاتا ہے تو پھر ہوسکتا ہے کہ سود سے بہت قریب ہوجائے تو یہ ایک دوسری چیز ہے۔

............آواز صاف نہیں ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

مولانا کا دوسرا سوال ہے مسئلہ سے متعلق ہے، میں آپ حضرات کے سامنے اس کو رکھ دیتا ہوں۔

مولانا کا پہلا سوال تو وہی ہے جو بار بار آچکا ہے، ایک ہے مدیون مماثل وہ شخص جس کے ذمہ واجب ہے قیمت کا ادا کرنا اور وہ دین ہے تو اس کو دین ادا کرنے میں وہ اپنی صلاحیت کے باوجود ٹال مٹول کرتا ہے تو اس سے دین کی وصولیابی کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ اس پر علماء کو غور کرنے کو فرما رہے ہیں، مولانا کا دوسرا سوال یہ ہے کہ شئی مرہون جو شئی آپ نے رہن رکھی ہے اگر اس پر قبضہ نہ ہو تو ابھی وہ مرہون ہوسکتی ہے یا نہیں، اس پر رہن کے احکام لازم ہوں گے یا نہیں، جس کے سمجھانے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں مولانا پر ہے۔ بدون قبضہ، یعنی شئی مرہون، مرہون ہوسکتی ہے یا نہیں ہوسکتی، اور اس پر رہن کے احکام لاگو ہوں گے یا نہیں مولانا کا کہنا ہے کہ ہمارا خیال ہے کہ متعین طور پر اولاً مذکورہ بالا دو نمبر پر بحث کرائی جائے۔

ایک آواز:

............جہاں تک وہ بات ہے کہ قیمت زیادہ کر کے طے کرلیا جائے اور نقد کی قیمت کم ہو اور ادھار کی زیادہ ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ تعیین اس بات کی ہوجائے کہ سودا نقد ہو رہا ہے یا سودا ادھار ہو رہا ہے، لیکن اس میں کئی صورتیں سامنے آئیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات ان پر بھی توجہ دیں، کچھ حضرات نے یہ کاروبار بنالیا کہ مثلاً ٹیکسی وغیرہ دلا دیا، ایک لاکھ کی ٹیکسی ہے اور ہم قسطوں پر سوا لاکھ آپ سے لیں گے، لیکن ان کا خود کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ غیر سے قرض لیتے ہیں، بینک سے ٹیکسی نکالتے ہیں تو خود تو سود میں ملوث ہیں اور دوسرے کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے وہ غیر سودی، یعنی انہوں نے بارہ پرسنٹ دے دیا بینک کو سود پر لے کر کہ ٹیکسی اور ۱۲ یا ۱۳ پرسنٹ ان کا نفع جو ملا تو یہ ایک شکل جو سامنے آرہی ہے، عام طور سے سامنے آتی ہے، یہاں کئی لوگ اور ادارے انفرادی طور سے کر بھی رہے ہیں تو یہ زیر بحث رہنا چاہئے، اس پر توجہ دینی چاہئے، یہ ایک شکل کیسی ہے؟

اچھا اتفاق کی بات یہ ہے کہ اگر ان سے کہا بھی جاتا ہے کہ تم سودی معاملہ کر رہے ہو تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ہمارا معاملہ ہے آپ کو تو ہم غیر سودی دے رہے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ادھار میں اگر زیادہ قیمت طے ہوتی ہے تو یہ ربا میں آتا ہے یا نہیں آتا، میں سمجھتا ہوں کہ ربا تو کہا جاسکتا ہے، لیکن صحیح ربا نہیں ہے،

اس کی تعریف کے لحاظ سے بھی اگر ہم غور کریں تو ربا نہیں اور حقیقت کے لحاظ سے بھی ربا نہیں، دوسری ایک بات یہ کہ آپ سے جو آدمی سامان لے کر دو سال میں آپ سے قیمت لیتا ہے، تو بنیادی نقطہ توجہ دینے کا یہ ہے کہ یہ چیز جو آپ کو آج ۱۰۰ روپئے میں دے رہا ہے وہ شخص دو سال کے بعد یہی چیز سوا سو یا ڈیڑھ سو کی ہو سکتی ہے اور جو رفتار گرانی کے بڑھنے کی ہے کہ یہ چیز اتنے کی ہوگی، تو اگر یہ ادھار میں زیادہ لیتا ہے تو وہ قیمت آج وصول نہیں کر رہا ہے، اس کو جب قیمت وصول ہوگی تو یہ چیز جب نئی لینے جائے گا تو اتنے ہی کی یا اس سے زیادی یا کم کی پڑ سکتی ہے، تو اگر اس پہلو کو مد نظر رکھا جائے تو میرے خیال سے ربا د الا شبہ دور ہو سکتا ہے لیکن جو میں اصل بات کہنا چاہتا تھا اور جو کاروبار لوگوں نے اپنا لیا ہے اس کو خاص طور سے ذہن مین رکھ کر اس سلسلہ میں مزید گفتگو کریں۔

............آواز صاف نہیں ہے۔

ایک آواز:

سوال نمبر ۵ یہ ہے کہ ایک تاجر ادھار فروختگی اگر اس طرح کرتا ہے کہ چھ ماہ میں اگر چھ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت ۱۲ ہزار روپئے ہے، اور ایک سال میں بارہ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت تیرہ ہزار دو سو روپئے ہے، خریدار کے سامنے دونوں صورتیں پیش کرنے کے بعد وہ دونوں ایک صورت طے کر لیتے ہیں، تو معاملہ کی شکل شرعاً درست ہے یا نہیں؟ یہ سوال ہے؟ آپ کا کہنا کیا ہے، قیمت جیسے جیسے بڑھائی گئی ویسے ویسے پیسہ بڑھا دیا گیا...... جو تلخیص آئی ہے کہ متعینہ مدت میں قیمت یا قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید رقم کا مطالبہ ہے (یہی نا) تو اس میں جملہ مقالہ نگار حضرات اس پر متفق ہیں کہ متعینہ قسط پر کسی قسم کی زیادتی کا مطالبہ ناجائز اور سود ہے، ادھار فروختگی کی صورت اس طرح ہوگی کہ چھ ماہ میں چھ قسطوں میں ادا کرنے کی صورت میں مال کی قیمت گیارہ ہزار اور ایک سال میں بارہ قسطوں میں ادائیگی کی صورت میں ۱۲ ہزار اور متعاقدین ایک صورت طے کر لیں تو معاملہ کی شکل شرعاً درست ہے یا نہیں؟

اکثر مقالہ نگاروں نے اس صورت کے جواز کو راجح سمجھا ہے اور مندرجہ ذیل عبارات سے استدلال کیا ہے:

''وکذا إذا قال: بعتك ہذا العبد بالف درہم إلى سنة أو بألف و خمس مائة إلى سنتين، لان الثمن مجهول، و قيل: ہو الشرطان فی البیع وقدروی أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن شرطين فی البیع. فإذا علم ورضی به جاز البیع. لان المانع من الجواز والجهالة عند العقد، وقد زالت فی المجلس''

تو اس سلسلہ میں آپ کا جو سوال ہے اس کی روشنی میں اس میں اپنی رائے نہیں دے سکتا، لیکن آپ کے سوال کی روشنی میں میرے ذہن میں جو بات آتی ہے کہ اگر بوقت بیع جو عقد بیع ہوا ہے عقد بیع میں یہ رکھا جائے کہ تم چھ مہینہ میں دو گے تو چھ ہزار دینا ہوگا، اور اگر گیارہ مہینہ میں دو گے تو اتنا دینا پڑے گا تو یہ بیع میں ثمن مشروط مختلف حالتوں میں الگ الگ ثمن ہے، اس لیے ثمن مجہول رہے گا، لہذا بیع صحیح نہیں ہوگی، اور اگر پیش کش ہوتی ہے اور آفر یہ ہے کہ اتنے دنوں میں دو گے تو یہ دام اور اتنے دنوں میں دو گے تو یہ قیمت، لیکن معاملہ طے ہوا کسی ایک بات پر، اور ایجاب وقبول ہوا، بیع کا عقد جو ہوا وہ کسی ایک بات پر ہوا کہ صاحب میں تم سے دس ہزار میں مال لیتا ہوں چھ مہینہ میں میں تمہیں ادا کروں گا، اس میں کوئی شرط نہیں ہے تو یہ صورت اس حدیث میں جو نہی کی صورت ہے اس میں آتی ہے یا نہیں؟

سوال یہ ہے کہ ادھار فروختگی کے وقت قسطوں میں ثمن کی ادائیگی کے لیے دو مدت بیان کرتے ہیں، ایک مدت قصیر میں مال کی قیمت اور دوسری مدت طویل میں مال کی قیمت کے زیادہ ہونے کا بھی تذکرہ کر کے، مگر معاملہ ایجاب وقبول پر متعین ہو جاتا ہے، ان کے ساتھ صرف ایک ہی صورت ہے کہ قطعی تعیین کے ساتھ ایک قیمت اور ایک مدت پر ہو تو یہ جائز ہے۔

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

بیع السمک

پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید و فروخت

(مچھلی کی خرید و فروخت اور غور و فکر کے بنیادی اصول)

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اُردو بازار ٥ ایم اے جناح روڈ ٥ کراچی پاکستان

پیش لفظ

شریعت اسلامی کا ایک امتیازی پہلو اس کی ہمہ گیریت اور جامعیت ہے، اس نے جس طرح عقیدہ وعبادت اور اخلاق کے میدان میں انسانیت کی رہنمائی کی ہے اسی طرح وہ معاشرت اور معاملات کے باب میں بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے، اور ان شعبوں میں خاص طور پر شرعی احکام کی بنیاد سماجی اور معاشی مصالح، مفادات اور تمام لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف پر ہے، معاملات کا ایک اہم حصہ اشیاء کی خرید وفروخت سے متعلق ہے، ہر انسان کے پاس اس کی تمام ضروریات مہیا نہیں، بہت سی ضروریات کے لئے ہمیں ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے، اس طرح تاجر اور گاہک دونوں ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرتے ہیں، تاجر خریدار کو اس کی مطلوبہ اشیاء فراہم کرتا ہے اور خریدار کے ذریعہ خود اس کو نفع حاصل ہوتا ہے۔

اسی لئے معاملات کا سب سے اہم عنوان ''خرید وفروخت'' ہے، بازار کی رونق اور انسانی زندگی میں سہولتوں کی فراوانی اسی کی رہین منت ہے، اسی لئے معاملات کے دوسرے شعبوں کے مقابلہ خرید وفروخت کے احکام، قرآن وحدیث میں زیادہ تفصیل سے ملتا ہے اور فقہاء نے بھی ان کو اپنے فکر ونظر کا خاص مرکز بنایا ہے، خرید وفروخت کے سلسلہ میں ایک اصولی بات یہ بھی پیش نظر رکھی گئی ہے کہ کوئی فریق دھوکہ نہیں کھائے، جو چیز موجود ہی نہ ہو، جو شئ ابھی ملکیت ہی میں نہ آئی ہو اور جس پر انسان نے ابھی قبضہ نہ کیا ہو، اگر انسان اس کو دوسروں کے ہاتھ بیچے، تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ اس شئ کے حوالہ کرنے کا وعدہ پورا نہیں کر پائے اور خریدار دھوکہ سے دو چار ہو۔

اسی لئے بیع کے اصولوں میں سے یہ ہے کہ جو چیز بیچی جارہی ہو، وہ معاملہ طے پاتے وقت موجود ہو، معدوم نہ ہو، نیز اسے اس پر ملکیت اور قبضہ بھی حاصل ہو، البتہ فقہاء نے بعض مخصوص صورتوں کو لوگوں کی ضرورت اور تعامل کو دیکھتے ہوئے اس اصول سے مستثنیٰ رکھا ہے، جیسے سلم اور استصناع، گویا فی الجملہ لوگوں کی ضرورتیں اور رواجات کو بھی اس اصول کے منطبق ہونے اور نہ ہونے میں دخل ہے۔

اسی پس منظر میں مچھلی کی خرید وفروخت کا مسئلہ فقہاء کے یہاں زیر بحث رہا ہے، جو مچھلی انسان کے قبضہ میں نہ ہو، بلکہ تالاب میں ہو، وہ کب انسان کی مملوکہ سمجھی جائے گی، کب ان پر قبضہ کا تحقق متصور ہوگا، اور کس صورت میں اس کی خرید وفروخت درست ہوگی، یہ اہم مسائل ہیں، موجودہ دور میں مچھلی کی افزائش پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہو رہی ہے، بڑے بڑے تالاب یہاں تک کہ سمندر کے حصے میں فروخت کئے جاتے ہیں، مچھلی کو پکڑنے کے جال بھی بمقابلہ پہلے کے اب زیادہ وسیع بننے لگے ہیں اور مچھلیوں کو گرفت میں لانے کے لئے، ان جالوں سے منسلک مشینیں بھی کام کرتی ہیں، غرض کہ مچھلیوں کی افزائش اور ان کو اپنے قبضہ میں لینے کی نئی، آسان اور ترقی یافتہ صورتیں وجود میں آگئی ہیں، ان حالات میں مچھلیوں کی خرید وفروخت یا تالاب کرایہ پر لینے کے احکام کیا ہوں گے؟ یہ اہم سوالات ہیں اور صرف فرضی مسائل نہیں ہیں۔

اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے نویں سمینار منعقدہ جامعۃ الہدایہ، جے پور، بتاریخ ۱۱ رتا ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۹۶ء میں اس مسئلہ کو غور وفکر کا موضوع بنایا تھا اس موقع پر جو مقالات اور مختصر جوابات اکیڈمی تک پہنچے، یہ مجموعہ انہیں پر مشتمل ہے، جو چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں موضوع سے متعلق سوالنامہ ہے، سمینار میں طے پانے والی تجاویز ہیں، مقالات کی تلخیص ہے اور موضوع سے متعلق عرض مسئلہ ہے گویا یہی باب پورے مجموعہ کا نچوڑ ہے اور جو تجاویز طے پائی ہیں وہی اکیڈمی کے نقطۂ نظر کو واضح کرتی ہیں، دوسرے باب میں موضوع سے متعلق تفصیلی مقالات ہیں، تیسرا باب بعض اکابر اہل علم اور دیگر علماء کی طرف سے آنے والے تفصیلی جوابات پر مشتمل ہے۔ چوتھے باب میں مختلف مدارس میں زیر تربیت شعبۂ افتاء اور تخصص فی الفقہ طلبہ کے جوابات ہیں، جو بطور تربیت کے لکھائے جاتے ہیں، اسی باب میں اس موضوع پر ہونے والے مباحثات ومناقشات بھی شامل ہیں۔

یہ مجموعہ پہلی بار شائع ہو رہا ہے، اس کی ترتیب یا ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ وغیرہ کی خدمت اکیڈمی کے شعبۂ علمی کے رفیق مفتی احمد نادر القاسمی نے بہتر طریقہ پر انجام دی ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور جدید دور میں پیدا ہونے والے احکام ومسائل کے حل کے سلسلہ میں جو کاوشیں یہاں سے انجام پارہی ہیں، ان میں دوام واستمرار باقی رہے، وللہ الحمد أولاً وآخراً۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۱۵ ر ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ / ۲۶ / ۱۱ / ۲۰۰۷ء

اکیڈمی کا فیصلہ:

پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی میں موجود مچھلیوں کی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے، فی زمانہ مچھلیوں کے کاروبار کی بعض ایسی صورتیں مروج ہوگئی ہیں جن کے اس زمرہ میں شامل ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے نویں سمینار منعقدہ جامعۃ الہدایہ جے پور میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی اور درج ذیل امور طے پائے:

۱- ندی، نالے، نہریں جو کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہوتیں بلکہ سرکار ان کو اشخاص یا کوآپریٹو سوسائٹی یا گرام پنچایت کو مخصوص مدت کے لئے بندو بست کر دیتی ہے، یہ مچھلی کے حق شکار پر ہوتا ہے، اس لئے یہ معاملہ عقد اجارہ کی صورت ہے اور جائز ہے۔ لیکن سرکار کے لئے مناسب ہے کہ ایسے تالاب کا بندوبست نہ کرے جس سے عام لوگوں کو ضرور پہنچ سکتا ہو۔

۲- پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کو فروخت کر دینا جائز نہیں ہوگا۔ اگر بائع تالاب کی ان مچھلیوں کا مالک ہو تو اس صورت میں یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر بائع حسب حکم شرع ان مچھلیوں کا مالک بھی نہیں اور اسے پانی سے نکالے بغیر فروخت کرتا ہے تو یہ بیع باطل ہوگی، البتہ اگر حوض چھوٹا ہو اور وہ مچھلیاں آسانی کے ساتھ نکال کر خریدار کو حوالہ کی جاسکتی ہوں تو ایسی صورت میں پانی میں رہتے ہوئے مچھلی فروخت کی جاسکتی ہے۔

۳- مچھلی کے مالک ہونے کی تین صورتیں ہیں:

(الف) تالاب میں مچھلیاں قدرتی طور پر آگئی ہوں اور تالاب کے مالک نے ان مچھلیوں کو روکنے کی تدبیر کی ہو۔

(ب) مچھلیوں کی غرض سے تالاب بنوایا گیا ہو۔

(ج) کسی شخص نے تالاب میں مچھلی کی افزائش کے لئے مچھلی کے زیرے ڈالے ہوں۔

نوٹ:...... مولانا شاہین جمالی صاحب (مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ) کے نزدیک موجودہ وسائل ماہی گیری، تعامل اور حاجات انسانی کی رعایت کے نقطۂ نظر سے مملوکہ مچھلیاں پانی کے اندر ہوں اور تالاب ایسا ہو کہ جال اس کا احاطہ کر لے، تب ان کو پانی کے اندر بھی فروخت کرنا جائز ہے۔

☆☆☆

سوالنامہ:

پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت

آج کل جو مچھلیاں منڈی میں فروخت کی جاتی ہیں ان کا ایک بڑا حصہ ان ندیوں اور نالوں سے آتا ہے جنکے مختلف رقبے حکومت کی طرف سے مختلف افراد کو ٹھیکے پر دے دئے جاتے ہیں، اور بہت سی مچھلیاں وہ ہوتی ہیں جن کی گڑھوں اور تالابوں میں افزائش کی جاتی ہے، یہ گڑھے اور تالاب کبھی شخصی ملکیت ہوتے ہیں اور کبھی عوامی ملکیت ہوتے ہیں، جنہیں مختلف جگہوں پر خاص مدت کے لئے ٹھیکے پر دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں آپ ان سوالات کا تشفی بخش جواب کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں تحریر فرمائیں گے۔

۱- عام طور پر آج یہ متعارف ہے کہ ندی نالے اور نہریں جو کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہیں، بلکہ سرکاری ہیں، ان کو حکومت کسی خاص شخص، کوآپریٹیو سوسائٹی، یا مقامی پنچائتوں کے ہاتھ معین مدت کے لئے بندوبست کر دیتی ہے، اور یہ لوگ سرکار کو معاوضہ دے کر ہی خاص حصہ سے حاصل ہونے والی مچھلی نکالتے ہیں اور خود استعمال کرتے ہیں یا اس کو فروخت کر دیتے ہیں، یہ مچھلی ضروری نہیں کہ اس ندی نالے یا تالاب میں پرورش کی گئی ہو، سیلاب کی آمد ورفت کے ساتھ یہ مچھلیاں آتی اور جاتی رہتی ہیں، اس طرح ہاٹ بازار کا بھی سرکار نیلام کرتی ہے، سڑکوں کے کنارے سرکار کی طرف سے لگائے گئے درخت یا سرکاری زمین میں پیدا ہونے والے خودرو درختوں کے جلاون نیلام کئے جاتے ہیں، اس طرح کے معاملات عرف میں عام ہیں، لیکن خاص کر سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر ان مچھلیوں کے نکالے ہوئے شرع کے عام اور معروف اصولوں کے مطابق بیع کے مجہول ہونے یا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ممنوع ہونا چاہئے، موجودہ عرف کو دیکھتے ہوئے آج کے حالات میں اس مسئلہ پر کیا فتوی دیا جانا چاہئے۔

۲- اگر مذکورہ بالا صورت معاملہ شرعاً نا جائز ہو تو ٹھیکے دار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان شخص کا (پوری صورت حال جانتے ہوئے) ایسی مچھلی کو خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

۳- جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے اگر وہ شخص اس میں باقاعدہ مچھلی پال کر اس حوض یا تالاب کی تمام مچھلیاں شکار کرنے سے پہلے کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، تاکہ وہ دوسرا شخص ایک خاص مدت میں اس حوض یا تالاب کی تمام مچھلیاں نکال کر فروخت کرے تو شرعاً اس صورت معاملہ کا کیا حکم ہے؟ تالاب یا حوض کی مچھلیوں کو شکار کرنے سے پہلے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۴- کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو، یا عوامی ملکیت کا اس میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے از خود آگئی ہیں انہیں کسی کے ہاتھ فروخت کرنا یا اس حوض یا تالاب کو کسی خاص مدت کے لئے ٹھیکہ دینا اس طور پر کہ اس مدت میں ٹھیکہ لینے والے ہی کو اختیار ہو کہ وہ اس تالاب کی مچھلیاں شکار کر کے فائدہ اٹھائے، یہ صورت معاملہ شریعت کی نگاہ میں کیا حکم رکھتی ہے؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت

۱-ندی نالے اور نہریں جو کسی خاص شخص کی ملک نہیں، بلکہ سرکاری ہوں اور ان میں سیلاب کی آمدورفت کے ساتھ مچھلیاں آتی جاتی رہتی ہوں، حکومت انہیں کسی خاص شخص، سوسائٹی یا پنچایتوں کے ہاتھ معین مدت کے لئے اسطور پر بندوبست کردے کہ وہ سرکار کو معاوضہ دے کر اس خاص حصہ سے حاصل ہونے والی مچھلیاں نکال کر خود استعمال کریں یا فروخت کریں، اس صورت مسئلہ کے تعلق سے مقالہ نگار علماء کرام آراء میں مختلف جہتوں سے اختلاف ہوا ہے۔

بنیادی طور پر یہ آراء جواز اور عدم جواز دو قسم کی ہیں۔ ذیل میں دونوں نقطہائے نظر اور ان کے دلائل وبنیاد بیان کی جارہی ہیں:

عدم جواز:

اس رائے کے اپنانے والے علمائے کرام نے ایسی بیع وشراء کے عدم جواز کی علاحدہ علاحدہ وجوہات ذکر کی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ کی موقوف حدیث ہے جس میں صراحتاً پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت سے منع کیا گیا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں: ''لا تشتروا السمك في الماء. فإنه غرر'' مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے ہیثمی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام احمد نے اس حدیث کو مرفوعاً بھی نقل کیا ہے اور موقوفاً بھی اور موقوف کے رواۃ کو بخاری کے رواۃ قرار دیا ہے، مولانا موصوف نے سند مرفوع کے راویوں پر کلام کرتے ہوئے مرفوع روایت کو بھی حسن کے درجہ کی مقبول حدیث قرار دیا ہے، اس حدیث کی رو سے پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت صریحاً ممنوع ہے اور علت ممانعت غرر ہے۔

متعدد حضرات نے ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء کی آراء کا جائزہ لیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کی ممانعت پر قریب قریب اتفاق ہے، اور ابن قدامہ حنبلی کے بقول اس میں کوئی اختلاف رائے نظر نہیں آتا ''لا نعلم لهم مخالفا''۔

بعض حضرات نے حضرت عمر بن عبدالعزیز ابن ابی لیلیٰ اور اصحاب ظواہر کے نزدیک جواز کی رائے بھی ذکر فرمائی ہے۔

فقہاء حنفیہ کے نزدیک کسی سامان کی فروختگی کی صحت کے لئے درکار شرائط میں فروخت کئے جانے والے سامان پر فروخت کنندہ کی ملکیت، سامان کو حوالے کرنے کی قدرت اور تنازعات کا سبب بننے والی جہالت سے دوری بھی شامل ہیں، زیر بحث مسئلہ میں علماء حضرات کے نزدیک علاحدہ علاحدہ طور پر یہ شرائط بھی مفقود ہیں۔

یہ وہ مجموعی بنیادیں ہیں جو مختلف مقالات میں علاحدہ علاحدہ ذکر ہوئی ہیں اور ان وجوہات سے صورت مسئولہ میں عدم جواز کا فتوی دیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ بعض دوسری بنیادیں بھی چند مقالات میں بیان ہوئی ہیں۔

سرکاری ندی نالے وغیرہ کی مچھلیاں کسی کی ملک نہیں ہیں، عدم جواز کی علت غیر مملوک ہونا ہے، لہذا اگر جہالت مرتفع ہوجائے اور مقدور التسلیم ہوجائے تو بھی اس کی بیع درست نہیں ہے (مولانا زید صاحب، مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب وغیرہ)۔

سرکار کا بالعوض بندوبست کرنا فعل عبث لاحاصل ہے، سرکار کا عوض لینا ظلم اور ٹھیکیدار کا عوض دینا اپنے مال کا نقصان وضیاع ہے۔ مچھلیاں مباح الاصل ہیں اور مباح الاصل ہی رہیں گی (مولانا زبیر قاسمی صاحب)۔

اس کے علاوہ ۲۸ / مقالہ نگار حضرات عدم جواز کے قائل ہیں۔

جواز:

دوسری رائے جواز کی ہے، اس رائے کے قائلین علمائے کرام نے علاحدہ علاحدہ مختلف بنیادیں ذکر فرمائی ہیں، جو مجموعی طور پر درج ذیل ہیں:

☆ حدیث شریف میں علت ممانعت ''غرر'' کو قرار دیا گیا ہے، فقہائے کرام کی مختلف تعریفات سے غرر کی حقیقت علامہ کاسانی کے الفاظ میں ایسا اندیشہ جس میں وجود وعدم کے دونوں پہلو برابر ہوں' هو الخطر الذي استوى فيه طرف الوجود والعدم'' قرافی مالکی کے الفاظ ہیں: ''هو الذي لا يدري هل يحصل أم لا'' اور نووی شافعی کی زبان میں: ''ما انطوى عنه أمره وخفي عليه عاقبته'' قرار پاتی ہے، پھر غرر کی دو قسمیں، یسیر اور کثیر ہیں، اس کے تعین کا مدار عرف ورواج پر ہے، علامہ بہوتی کے الفاظ ہیں:

''إذا غبن في البيع يخرج عن العادة، لأنه لم يرد الشرع بتحديده فرجع فيه إلى العرف''

معمولی اورادنی درجہ کے غرر کے قابل انگیز ہونے پر علامہ قرطبی نے علماء کا اتفاق نقل کیا ہے: ''واجمعوا على جواز حقير'' ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

''وبالجملة فالفقهاء متفقون، على أن الغرر الكثير في المبيعات لا يجوز وأن القليل يجوز. لأن الغرر اليسير الذي لا تنفلت البيوع منه مستخف و مستجاز'' فقہی احکام میں غرر یسیر کی بناء پر جواز کی بے شمار مثالیں ہیں۔

اس دور میں موجودہ دریافتوں اور اس کاروبار سے وابستہ لوگوں کے تجربات کی روشنی میں پانی کے مخصوص حصوں میں مچھلیوں کی پیداوار کے تقریباً صحیح تخمینہ کے پیش نظر اب اس میں غرر نہیں رہ گیا ہے، یا بالکل معمولی درجہ کا غرر ہے، جو تجارت میں قابل انگیز ہے۔

☆ ایسی تجارت کا اب عرف عام عموم بلوی اور تعامل ناس ہو گیا ہے، تعامل ناس کی بنیاد پر بہت سے مسائل میں جواز کی مثالیں کتب فقہ میں موجود ہیں، امام سرخسی لکھتے ہیں: ''وتعامل الناس من غير نكير أصل من الأصول كبير''۔

عقد کے لئے مفسد صرف ایسی جہالت ہے جو باعث نزاع ہو اگر کوئی جہالت نزاع باقی نہ رہے تو عقد کے جواز پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا،

''وما كل جهالة تفسد البيع، فإن كثيراً من الأمور يترك جهلاً في البيع، واشتراط الاستقصاء ضرر، ولكن المفسد هو المفضي إلى المنازعة'' (حجة الله البالغة).

مچھلی کی مذکورہ تجارت اب باعث نزاع نہیں رہ گئی ہے، ٹھیکہ کا معاملہ خوشی خوشی انجام پاتا ہے۔

☆ ایسی تجارت اس وقت اس قدر عام ہوگئی ہے کہ اس سے لوگوں کو روکنے میں انتہائی مشقت، حرج اور ضرر ہے، لاکھوں مسلمانوں کے اس ذریعہ معاش سے جڑے ہونے کی وجہ سے حاجت کا درجہ اختیار کرلیا ہے، لہٰذا ازالہ مشقت اور دفع ضرر وحرج کے قواعد عامہ کی بنیاد پر اس کے جواز کا فتوی دیا جانا چاہئے۔

☆ جواز عقد کے لئے بیع کا حقیقۃ مقدور التسلیم ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ حکماً مقدور التسلیم ہونا ہی کافی ہے، اس لئے مجلس عقد میں مبیع کو حاضر کرنا بیع کے شرائط جواز میں سے نہیں ہے، علامہ شامی نے بھی اس نقطہ نظر کو ترجیح دی ہے، موجودہ دور میں ماہی گیری کے ترقی یافتہ وسائل وذرائع بڑے بڑے جالوں کے پھیلاؤ اور دواؤں کے ذریعہ مچھلی کے شکار کی سہولت کی بنا پر حکماً ''مقدور التسلیم'' ہے۔

☆ جواز یہ نقطہ نظر بالکل اصل نہیں ہے۔ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں: ''رخص في بيع السمك في الآجام اقوام''۔

حضرت عمر بن عبد العزیز اور ابن ابی لیلیٰ سے بھی جواز کی رائے منقول ہے، اصحاب ظواہر بھی جواز ہی کے قائل ہیں۔

جواز کی رائے اختیار کرنے والے درج ذیل علماء کرام کے نزدیک جواز کی یہ مشترکہ وجوہات اور بنیادیں ہیں:

مولانا مفتی شاہین جمالی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا عزیز اختر قاسمی، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا محمد ارشد، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا قمر الزماں، مولانا محمد ایوب سنبھلی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا شاہد قاسمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا ابرار خان قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ کا خیال ہے کہ یہ درحقیقت بیع وشراء کا معاملہ نہیں ہے، عوامی ملکیت سے استفادہ کا جو حق حکومت کسی شخص یا سوسائٹی کو دیتی ہے اس کے بالمقابل انتظامی امور کے مصارف اور مفاد عامہ کے لئے بطور عطیہ ایک معاوضہ وصول کرتی ہے۔

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی صاحب اور حکیم ظل الرحمن صاحب کی رائے میں یہ صرف حق شکار ہے، جو ایک خاص مدت اور پیمائش کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا اسے حق شکار کے طور پر بیچنے یا خریدنے کی گنجائش ہے۔

درج ذیل حضرات نے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ اس بیع کو اجارہ تصور کیا جائے اور زمین کو اجارہ پر حاصل کر کے اس سے مچھلی نکالی جائے (مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا نسیم احمد قاسمی)۔

۲- ٹھیکے دار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان شخص کا پوری صورت حال جانتے ہوئے ایسی مچھلی کو خریدنا تقریباً تمام مقالہ نگار علمائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔

جن علمائے کرام کے نزدیک سوال نمبر (۱) جائز ہے، یہ سوال ان کے نزدیک زیر بحث آتا ہی نہیں۔ لیکن جن علمائے گرامی قدر نے پہلے سوال میں عدم جواز کی رائے اختیار کی ہے، ان کے نزدیک بھی چونکہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں جو بھی ان کو پکڑ لے گا وہ ان کا مالک ہو جائے گا، لہٰذا ٹھیکہ دار اگر مچھلیاں شکار کرنے کے

بعد دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو مملوک اور مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے فروخت کرنا جائز ہے اور دوسرے مسلمان کے لئے خریدنا بھی درست۔

چند استثنائی آراء درج ذیل ہیں:

مولانا ابراہیم بڑودوی کے نزدیک اس طرح بیچنا یا مسلمان شخص کا خریدنا ناجائز، مولانا حامد کمال صاحب اور مولانا اختر عادل صاحب کی رائے میں کسی مسلمان شخص کا خریدنا مکروہ تحریمی ہے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب کی رائے میں بیع ثانی کی مسلمان کے لئے گنجائش ہے۔

۳- ذاتی ملکیت کے حوض یا تالاب میں پالی گئی مچھلیاں شکار کرنے سے پہلے دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دینا کہ وہ ایک خاص مدت میں مچھلیاں نکال کر فروخت کرے، تقریباً ان تمام حضرات کے نزدیک جائز ہے، جنہوں نے پہلے سوال کی بابت جواز کی رائے دی ہے، (باستثناء مولانا عزیر اختر قاسمی، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا اقبال قاسمی اور مولانا محمد ارشد قاسمی)۔

بقیہ تمام حضرات کے نزدیک شکار کرنے سے قبل ان مچھلیوں کی فروختگی درست نہیں ہے، اگر حوض یا تالاب اتنا چھوٹا ہو کہ بغیر کسی حیلہ کے مچھلیاں بآسانی پکڑی جاسکتی ہوں تو شکار سے قبل فروختگی جائز ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا اسماعیل قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی اور مولانا قمر عالم سبیلی کی رائے میں تالاب کو ایک مقررہ مدت کے لئے کرایہ پر دینا جائز ہے۔

مولانا شکیل احمد سیتاپوری صاحب کی رائے میں ٹھیکہ پر دینے کے بجائے تالاب کے مالک اور مچھلیاں نکال کر فروخت کرنے والے شرعی اصول کے مطابق ایک دوسرے کے شریک ہو جائیں یا مالکان خود مچھلیاں نکلوا کر فروخت کریں تو حرام سے بچنے کی شکل ہو سکتی ہے۔

۴- نجی یا عوامی ملکیت کے تالاب یا حوض میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے از خود آ گئی ہوں انہیں کسی کے ہاتھ فروخت کرنا یا اس حوض یا تالاب کو کسی خاص مدت کے لئے ٹھیکہ پر دینا درج ذیل حضرات کے نزدیک مطلقاً درست و جائز ہے (مولانا اخلاق الرحمان قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا مجاہد الاسلام، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، حکیم ظل الرحمن، مولانا اسماعیل)۔

مندرجہ ذیل حضرات نے اس مسئلہ کی بابت یہ تفصیل کی ہے کہ اگر اسی مقصد سے تالاب یا حوض بنایا گیا ہو یا اس مقصد سے تو نہیں بنایا گیا ہے، لیکن مچھلیاں آجانے کے بعد ان کی واپسی کا راستہ بند کر دیا گیا ہو، تو ایسی صورت میں وہ مچھلیاں اس کی مملوک ہو جائیں گی، اب اگر مقدور التسلیم ہوں، یعنی بغیر کسی ادنی مشقت کے مچھلیاں حاصل کی جاسکتی ہوں تو ان کی فروختگی درست ہے، لیکن مقدور التسلیم نہ ہوں تو ان کی بیع فاسد ہوگی اور ان کا ٹھیکہ پر دینا بھی صحیح نہیں ہوگا (مولانا اشتیاق احمد قاسمی، مولانا عبدالرحیم، مولانا احمد دیولوی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عبیداللہ اسعدی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا مجیب الغفار اسعد، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا نور قاسمی، مولانا اسماعیل بھدکودروی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ایوب سبیلی، مولانا عبداللطیف، مولانا نعیم رشدی، مولانا منظور احمد، مولانا عبدالقیوم، مولانا نعیم نسیم الدین قاسمی، مولانا ابراہیم بڑودوی، مولانا اختر امام عادل، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی انور علی اعظمی)۔

درج ذیل حضرات کے نزدیک مچھلیوں کی فروختگی کی بابت تو یہی تفصیل ہے، لیکن ٹھیکہ پر دینا اجارہ اراضی کے بطور درست ہے (مولانا حامد کمال، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا عزیر اختر، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہین جمالی، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید و فروخت

مفتی انور علی اعظمی[1]

۱- سرکاری ندی، نالے اور نہروں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں تقریباً ۴۱ مقالہ نگاروں کے جوابات موصول ہوئے ان میں سے ۳۱ حضرات نے اس بیع کے ناجائز اور ممنوع ہونے کی رائے دی ہے، اور بقیہ ۱۰/ حضرات نے بیع کو جائز قرار دیا ہے۔

جواز کے قائلین کے اسماء گرامی:

مولانا شمس پیرزادہ، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا مجاہد الاسلام حیدرآباد، مولانا ابرار احمد خان ندوی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا ایوب سنبھلی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن اشاعت العلوم۔

عدم جواز کے قائلین کے اسماء گرامی:

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا اختر امام عادل، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا خورشید انور مظہر العلوم بنارس، مفتی انور علی اعظمی، مولانا اسماعیل قاسمی، مولانا محمد زید، مولانا شکیل احمد سیتاپوری، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا شاہین جمالی، مولانا مجیب الغفار اسعد، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا ابو الحسن علی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا اسماعیل، مولانا حامد کمال، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا نعیم اختر، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا احمد، مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی نسیم احمد قاسمی۔

قائلین جواز کی دلیل:

اکثر قائلین جواز نے عرف کو دلیل بنایا ہے، لیکن عرف کی بنیاد پر ان کا استدلال زیادہ مضبوط نہیں، کیونکہ یہ عرف چند عام نصوص سے اور ایک نص خاص سے متعارض ہے اور عرف کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں نص خاص کا ترک لازم آرہا ہے، حالانکہ علماء اصول نے اس بات کی صراحت کی ہے جو عرف نص خاص سے متعارض ہو وہ معتبر نہیں ہوگا، چنانچہ ''نشر العرف'' (ص ۱۱٦) پر علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''إذا خالف العرف الدليل الشرعي فإن خالفه من كل وجه بأن لزم منه ترك النص فلا شك في رده'' ۔ شیخ مصطفی زرقاء اعتبار عرف کی شرائط میں اپنی کتاب ''المدخل'' میں ذکر کرتے ہیں: ''أن لا يعارض العرف نص شرعي بحيث يكون العمل العرف تعطيلا له''۔

نیز یہ کہ نص عام سے تعارض کے وقت بھی، عرف عام ہی موثر ہوتا ہے اور عرف عام وہ عرف کہلاتا ہے جو تمام لوگوں اور تمام شہروں میں رائج ہو اور اسے عوام وخواص سارے لوگوں نے قبول کیا ہو، مسئلہ مذکورہ میں ایسا عرف معدوم ہے، جسے عرف عام کا درجہ دیا جاسکے، اس لئے یہ عرف ''بیع مالا یملک'' اور ''بیع غرر'' سے نہی والی عام نصوص سے تعارض کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا تو نص خاص ''لا تشتروا السمك في الماء. فإنه غرر'' کے مقابلہ میں کیسے قبول کیا جاسکتا ہے۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

اس بیع کو ناجائز کہنے والے حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱ ''لا تبع ما ليس عندك'' (ترمذی ۱/۱۴۸)۔

۲ ''عن أبي هريرة نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر وعن بيع الحصاة''، وقال الشافعي: من بيع

---

[1] مفتی دار العلوم مئو۔

الغرر بیع السمك فی الماء'' (ترمذی ۱/۱۴۷)۔

۳ ''عن ابن عمر و ابن مسعود رضی اللہ عنہما قالا: لا تشتروا السمك فی الماء فیه فانه غرر'' (مسند احمد ۱/۱۹۸)۔

آخر الذکر حدیث کا مرفوع و موقوف ہونا علامہ بیہقی اور بعض دوسرے محدثین کے نزدیک مختلف فیہ ہے، لیکن اس حدیث کی شاہد ایک دوسری مرفوع حدیث ہے، جو ''نیل الاوطار'' میں مذکور ہے، علامہ شوکانی تحریر فرماتے ہیں: ''قد روی أبو بکر بن عاصم عن عمران بن حصین حدثنا مرفوعًا، وفیه النهی عن بیع السمك فی الماء، فهو شاهد لهذا'' (نیل الاوطار ۵/ ۱۴۷) ''مسند احمد'' کی موقوف روایت مذکورہ مرفوع حدیث کی تائید کے بعد قابل استدلال ہوجائے گی۔ یہ حدیث مسئلہ مذکورہ میں نص خاص کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا عرف کی وجہ سے اسے ترک کرنا درست نہیں ہوگا۔

انعقاد بیع کے لئے فقہاء کے یہاں جو شرائط معتبر ہیں ان میں ایک بنیادی شرط مبیع کا مملوک ہونا بھی ہے، بیع سلم کے علاوہ کہیں اور غیر مملوک کی بیع درست نہیں، مسئلہ مذکورہ میں مبیع کے غیر مقدور التسلیم اور مجہول ہونے کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بائع کی ملک نہیں ہے، بلکہ قبضہ سے پہلے سب کے لئے مباح الاصل ہے، لہذا یہ بیع، غیر مملوک کی بیع ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

عدم جواز کے قائلین میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا محمد نور القاسمی صاحبان نے مسئلہ بیع میں فساد بیع کی صراحت کی ہے، جبکہ سترہ حضرات نے بطلانِ بیع کی صراحت کی ہے، بقیہ دس حضرات نے فساد و بطلان کی وضاحت کئے بغیر اس کو ناجائز کہنے پر اکتفا کیا ہے، لیکن دلائل کے اعتبار سے ان کا رجحان بھی بطلان ہی کی طرف معلوم ہوتا ہے، فساد کے قائلین میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور فساد کے لئے بنیادی وجہ غیر مقدور التسلیم ہونا قرار دیا ہے، لیکن مبیع کے غیر مملوک ہونے سے کوئی بحث نہیں کی ہے، چنانچہ اپنے مدعا پر علامہ ابن ہمام کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے: ''الوجه عندي أن عدم القدرة علی التسلیم مفسد لا مبطل''، علامہ شامی کی بھی بعض عبارتیں ذکر کی ہیں، مگر وہ مدعا پر واضح نہیں ہیں، علامہ زیلعی کی ایک عبارت بھی ذکر کی ہے جس میں انہوں نے عبد آبق کی بیع کو فاسد کہا ہے اور اس کے لوٹ آنے کے بعد بیع کو صحیح مانا ہے، لیکن مسئلہ مبحوث عنہا پر کوئی واضح عبارت ذکر نہیں کی، بحث کے آغاز میں یہ ضرور کہا ہے کہ ظاہر روایت بیع کے بطلان کی ہے، راقم السطور اور اکثر مقالہ نگاروں کی رائے، ظاہر روایت پر مبنی ہے، ان حضرات نے فقہ کی صریح اور اصح روایتوں سے استدلال کیا ہے، مثلاً شامی کی یہ عبارت ہے:

''وفیه أن بیع ما لیس فی ملکه باطل کما تقدم؛ لأنه بیع المعدوم والمعدوم لیس بمال، فینبغی أن یکون بیعه باطلًا'' (شامی ۴/۱۴۷)۔

''البحر الرائق'' میں بھی صراحت موجود ہے: ''والسمك قبل الصید أی لم یجز بیعه لکونه باع ما لا یملکه، فیکون باطلًا'' (۷۶/۶)، خود علامہ ابن الہمام کا میلان بھی اس مسئلہ میں بطلان ہی کی طرف ہے، کیونکہ انہوں نے بیع کے عدم جواز کے لئے غیر مقدور التسلیم کو علت بنانے کے بجائے، عدم ملک کو علت بنایا ہے، چنانچہ ''فتح القدیر'' کی عبارت اس طرح ہے:

''بیع السمك فی البحر أو النهر لا یجوز فإن کانت له حظیرة فدخلها السمك فإما أن یکون أعدها لذلك أو لا. فإن کان أعدها فما دخلها ملکه. وإن لم یکن أعدها لذلك قد یملك ما یدخل فیها. فلا یجوز بیعه لعدم الملك'' (فتح القدیر ۶/۴۹)۔

الغرض ظاہر روایت اور فقہاء کی ان صریح عبارات کی بنیاد پر اس بیع کو باطل کہنا ہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆

باب دوم

مچھلی کی خرید وفروخت اور غور وفکر کے بنیادی اصول

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی[1]

خرید وفروخت کے اصول میں سے یہ ہے کہ جو چیز فروخت کی جائے وہ معاملہ طے ہوتے وقت فروخت کنندہ کی ملکیت میں بھی ہو اور قابو میں بھی، کہ اگر چاہے تو فی الفور حوالہ کردے، فقہاء کی تصریحات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوائے ظاہریہ کے قریب تمام ہی فقہاء وائمہ مجتہدین کے یہاں متفق علیہ قاعدہ ہے۔

فقہاء حنفیہ میں کاسانی کا بیان ہے:

''منها أن يكون مقدور التسليم عندالعقد، فإن كان معجوز التسليم عنده لا ينعقد، و إن كان مملوكاً له'' (بدائع الصنائع ۵ / ۱۴۷)۔

(ان شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ معاملہ طے پاتے وقت مبیع کو حوالہ کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اگر اس وقت قادر نہ ہو تو گو وہ اس کی ملکیت میں ہو پھر بھی بیع منعقد نہ ہوگی)۔

ہاں مشائخ حنفیہ کے یہاں اختلاف صرف اس میں ہے کہ اگر ایجاب وقبول کے وقت سامان کی سپردگی پر قادر نہیں تھا، لیکن اس مجلس میں قادر ہوگیا تو کیا حکم ہوگا؟ عام مشائخ کے یہاں تو پہلے کیا گیا ایجاب وقبول بے نتیجہ ہوگا، لیکن امام کرخیؒ اور طحاوی کے نزدیک خرید وفروخت درست ہوجائے گی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴ / ۴۳۰)۔

علامہ قرافی مالکی نے معاملہ کے درست ہونے کے لیے پانچ شرطیں ذکر کی ہیں، ان میں تیسری شرط یہ ہے کہ اس کے حوالہ کرنے پر قادر ہو'' أن يكون مقدور على تسليمه'' اور پانچویں شرط یہ ہے کہ قیمت اور سامان پر خریدار اور فروخت کنندہ کی ملکیت ہو۔

'' أن يكون الثمن مملوكين للعاقد والمعقود له'' (كتاب الفروق ۳/۱۴۰)۔

فقہاء شوافع میں ابواسحاق شیرازی کہتے ہیں:

''ولا يجوز ما لا يقدر على تسليمه'' (المهذب مع المجموع ۹/۲۸۳) (ایسی چیز کی فروخت جائز نہیں جس کو حوالہ کرنے پر قادر ہی نہ ہو)۔

یہی کچھ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے (المغنی ۴ / ۱۹۴)۔

مچھلی جو پانی میں موجود ہو، بعض اوقات تو اس پر ملکیت ہی ثابت نہیں ہوتی اور ملکیت ثابت بھی ہوجائے تو مقدور التسلیم نہیں ہوتی، یعنی اس کو شکار کیے بغیر حوالہ کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس کیفیت کا نام ''غرر'' ہے، سرخسی نے ''غرر'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''الغرر ما يكون مستور العاقبة'' (المبسوط ۱۲/۱۹۴)۔ (غرر یہ ہے کہ جس کا انجام معلوم نہ ہو)۔

اسی غرر کی صراحت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت کو منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ ارشاد نبوی ہے:

''لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر'' (مسند احمد مع تحقیق احمد محمد شاکر)۔ (پانی میں موجود مچھلی فروخت نہ کرو کہ یہ غرر ہے)۔

علامہ ہیثمیؒ نے ''طبرانی معجم الکبیر'' کا بھی حوالہ دیا ہے (مجمع الزوائد ۴ / ۸۰)، ہیثمی نے لکھا ہے کہ اس روایت کو امام احمد نے مرفوعاً بھی نقل کیا ہے اور موقوفاً بھی،

[1] ناظم ''المعہد العالی الاسلامی (حیدرآباد) وجنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کا ارشاد ہے اور بعض روایات سے ظاہر ہے کہ خود حضرت ابن مسعود کا فتوی ہے اور موقوف روایت کی بابت کہا ہے کہ اس کے رواۃ بخاری کے رواۃ ہیں ''ورجال الموقوف رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد ۴/۸۰)، نیز شیخ احمد عبدالرحمن نے بیہقی اور دار قطنی سے بھی حدیث موقوف کا صحیح وراجح ہونا نقل کیا ہے (الفتح الربانی ۱۵/۳۵)۔

لیکن غور کیا جائے تو حدیث مرفوع کی سند بھی درجۂ اعتبار سے کم تر نہیں، سند یوں ہے:

''محمد بن سماك، عن يزيد بن أبي الزياد، عن المسيب بن رافع عن عبد الله بن مسعود''

یہ سبھی راوی ثقہ ہیں، علامہ ہیثمی نے محمد بن سماک کے علاوہ سبھوں کو ثقہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ صرف امام احمد کے ان استاذ کے ترجمہ سے واقف نہ ہوسکا، باقی سب ثقہ ہیں (مجمع الزوائد ۴/۸۰)، لیکن شیخ احمد محمد شاکر نے لکھا ہے کہ ''محمد بن سماک'' کا اصل نام ''محمد بن صبیح'' ہے یہ ثقہ راوی ہیں، ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے اور بخاری نے ''تاریخ کبیر'' میں اور خطیب نے ''تاریخ بغداد'' میں ان کا ترجمہ لکھا ہے (حاشیہ احمد محمد شاکر ۵/۲۴۹)، البتہ خود شیخ نے اس روایت کو اس لیے ضعیف قرار دیا ہے کہ مسیب بن رافع گو ثقہ راوی ہیں اور تابعی ہیں، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کی ملاقات ثابت نہیں، اس لیے حدیث کی سند میں انقطاع ہے (حوالہ مذکور) لیکن ظاہر ہے کہ یہ اعتراض انہی محدثین کی رائے پر درست ہوسکتا ہے جو مراسیل تابعی کو حجت خیال نہیں کرتے، حنفیہ، مالکیہ اور اکثر قدیم محدثین کے نزدیک مراسیل ثقات معتبر ہیں، اس لیے یہ حدیث بھی مقبول ہے اور حسن سے کم درجہ نہیں۔

فقہاء کی رائیں:

اب اس اصول اور حدیث کی روشنی میں مچھلی کی خرید وفروخت سے متعلق فقہاء کے خیالات کا جائزہ لینا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کی ممانعت پر قریب اتفاق ہے، اسی لیے ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف رائے نظر نہیں آتا ''لا نعلم لهم مخالفًا لما ذكرنا من الحديث'' (مغنی ۴/۱۲۴)، البتہ امام ابو یوسفؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت دی اور اس کو ''حبس'' سے موسوم کیا (کتاب الخراج/۸۷)، اسی طرح اصحاب ظواہر اور اس مکتبۂ فکر کے ترجمان ونقیب علامہ ابن حزم نے بھی اس کی اجازت دی ہے (محلی ۸/۴۴۹)۔

فقہاء مالکیہ نے نہروں اور تالابوں کی خرید وفروخت کو مطلقاً منع کیا ہے (الثمر الدانی/۴۲۸)، خود امام مالک سے صراحۃً اس کی ممانعت منقول ہے، امام مالک نے اس بابت فرمایا: ''لا خير فيه'' (المدونۃ الکبری ۳/۲۱۸)۔

شوافع کا خیال ہیکہ اگر تالاب اتنا چھوٹا ہو کہ بلا مشقت ودشواری تالاب سے مچھلی نکالنا ممکن ہو تو بیع صحیح ہے، بشرطیکہ پانی اتنا صاف ہو کہ مچھلی نظر آتی ہو اور اگر تالاب بڑا ہو کہ شدید تکان ومشقت کے بغیر مچھلیوں کا نکالنا ممکن نہ ہو تو اس بابت دو قول ہیں، اور زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں خرید وفروخت درست نہیں (شرح مہذب ۸/۱۲۶-۱۲۷)۔

حنابلہ کے نزدیک تین شرطوں کے ساتھ جائز ہے، تالاب مملوکہ ہو، پانی اتنا صاف ہو کہ مچھلی نظر آتی ہو، ان مچھلیوں کا شکار کرنا اور ان کا روک رکھنا ممکن ہو (المغنی ۴/۱۴۲)، شرف الدین مقدسی نے اسی کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ تالاب نہر سے متصل نہ ہونا چاہیے، یہ اس کے باوجود جائز ہے کہ ایک مدت کے بعد مچھلی حاصل کرنا مقصود ہو (الاقناع ۲/۶۲)۔

حنفیہ کا نقطۂ نظر:

حنفیہ کے یہاں پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت کی بابت تفصیل یہ ہے:

مچھلی کے مالک ہونے کی تین صورتیں ہیں:

۱- کسی نے مچھلی ہی کے لیے تالاب کھدوایا ہو اور اس میں مچھلی آگئی ہو۔

۲- اس مقصد کے لیے زمین تیار تو نہ کی گئی ہو، لیکن پانی کے ساتھ مچھلی آنے کے بعد واپسی کا راستہ بند کردیا گیا ہو۔

۳- خود اس نے پانی میں مچھلیاں ڈالی ہوں تاکہ ان کی افزائش ہو ان ہر سہ صورتوں میں اس وقت مچھلی کو مقدور التسلیم تصور کیا جائے گا کہ بلا شکار مچھلی کا حصول ممکن ہو ''أمكنه بلاحيلة'' (رد المحتار ۵/۶۱)۔

اسی حکم میں نہر اور سمندر وغیرہ بھی ہے (البحر الرائق ۶ / ۷۳)، امام ابویوسف نے آجام میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کی اجازت اس وقت دی ہے کہ شکار کے بغیر محض ہاتھ سے مچھلیوں کا پکڑ لینا ممکن ہو (حوالہ سابق)۔

پس مچھلیوں کی خرید وفروخت کی بابت نص اور فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں درج ذیل احکام ہوں گے:

۱- سرکاری تالاب یا ندی نالوں کی مچھلیوں کی خرید وفروخت درست نہیں، البتہ اگر عرصہ کے لیے سرکار ایسی زمین کا بندوبست کرتی ہے تو اس کو بیع کی بجائے "اجارہ" تصور کرنا چاہیے، گویا یہ زمین کا اجارہ ہے تاکہ اس سے مچھلی حاصل کی جاسکے، فقہاء شوافع کے یہاں اس سلسلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر پانی میں موجود مچھلی کے شکار کے لیے اجارہ کا معاملہ طے کریں تو جائز نہیں، کیوں کہ اجارہ سے نفع حاصل کیا جاتا ہے نہ کہ خود اشیاء اور اگر اس لیے زمین کرایہ پر لی کہ وہ اس میں پانی روکیں گے تاکہ مچھلیاں جمع ہوں اور ان کا شکار کرسکیں تو قول صحیح ومفتی بہ کے مطابق اس کا کرایہ پر لین دین درست ہے (شرح مہذب ۹ / ۲۸۵)، گویا تالاب میں موجود مچھلیوں کا اجارہ درست نہیں، لیکن فارغ زمین کا اجارہ اس مقصد کے لیے درست ہے کہ اس میں پانی رو کے گا اور اس وجہ سے مچھلیاں آئیں گی۔

فقہاء احناف نے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے اور رجحان اس کے عدم جواز کا ہے، کیوں کہ اجارہ سے عین شئی کا مالک نہیں ہوا جاتا، بلکہ نفع کا مالک ہوا جاتا ہے، لیکن امام ابویوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں ابوالزناد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عراق کے بحیرہ کی بابت، جس میں مچھلیاں جمع ہوتی تھیں، حضرت عمر سے دریافت کیا، تو آپ نے اس کی اجازت دے دی، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز سے "صید آجام" کی بیع کا جواز نقل کیا ہے، اس روشنی میں ابن نجیم مصری نے یہ رائے قائم کی ہے کہ بیت المال اور وقف کی اراضی کا اس مقصد کے لیے اجارہ درست ہے، دوسری اراضی کا نہیں (البحر الرائق ۶ / ۷۳) گو خود ابن نجیم نے بعد کو "ایضاح" میں دیکھا کہ اس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور صاحب "نہر" نے "ایضاح" کی روایت کو ترجیح دیا ہے (منحۃ الخالق علی ہامش البحر ۶ / ۷۳)۔

اسی طرح کا ایک مسئلہ چراگاہ کو کرایہ پر حاصل کرنے کا ہے تاکہ اس کی گھاس سے نفع اٹھایا جاسکے، یہ بھی جائز نہیں کہ گھاس خود عین ہے، لیکن فقہاء نے غالبًا اپنے زمانہ کے تعامل کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے یہ تدبیر بتائی ہے کہ زمین جانور وغیرہ ٹھہرانے کے لیے کرایہ پر لی جائے اور ضمنی طور پر گھاس بھی اس میں داخل ہوجائے گی۔

"الحیلۃ أن یستاجر الأرض لضرب فسطاط أو لإیقاف دوابہ أو لمنفعۃ أخریٰ کمقیل الراح" (بدر الملتقی بہامش مجمع الانہر ۴ / ۵۷)۔

فقہاء حنابلہ نے بھی تالاب (برکۃ) کے اجارہ کو درست قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں جو مچھلیاں آجائیں، کرایہ دار اس کا مالک ہوگا (المغنی ۴ / ۱۴۳)۔

مالکیہ کے یہاں اس بابت صریحًا گفتگو نہ مل سکی، تاہم انہوں نے بھی اجارہ کے اصول میں یہ بات ذکر کی ہے کہ اجارہ خود "عین" کے لین دین کو شامل نہیں ہوسکتا (الشرح الصغیر ۴ / ۱۰)۔

لیکن علامہ صاوی نے اس اصول سے دو صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے، ایک یہ صورت کہ ایسی زمین اجارہ پر لی جاسکتی ہے جس میں کنواں یا چشمہ ہو کہ اس کا پانی لیا جائے اور ظاہر ہے کہ پانی عین ہے، اور بکری کرایہ پر لی جاسکتی ہے کہ اس کا دودھ لیا جائے اور دودھ بھی عین ہے۔

"وکذلک استثنوا إیجار أرض فیہا بئر أو عین واستئجار شاۃٍ للبنہا إذا وجدت الشروط، فإن فیہا استیفاء عین قصدًا وھو الماء فی الأولی واللبن فی الثانیۃ" (حوالہ سابق)۔

ان مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مچھلی کے حصول کے لیے تالاب وغیرہ کا اجارہ درست ہے، مالکیہ کے نزدیک اصولی طور پر یہ جائز نہیں لیکن ان کے یہاں اس اصول سے بعض مستثنیات موجود ہیں، حنفیہ کے نزدیک بھی قول مشہور وراجح کے مطابق اس کی گنجائش نہیں، تاہم سرکاری املاک کی حد تک بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔

اس اجارہ کے ناجائز ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اجارہ معاوضہ ادا کر کے کسی شئی کی منفعت حاصل کرنے کا نام ہے، خود کسی شئی کو حاصل کرنے کا نہیں، اسی سلسلہ میں وہ بات قابل غور ہے جو حنابلہ وشوافع نے کہی ہے کہ اگر کسی آبی خطہ میں موجود مچھلی کے لیے اجارہ کیا جائے تو یہ جائز نہیں، کیوں کہ یہ عین کی لین دین کا عقد ہے اور اگر اجارہ اس بنیاد پر طے ہو کہ کرایہ دار اس میں مچھلیوں کے زیرے ڈال کر مچھلیوں کی افزائش کرے یا اس میں باہر سے پانی لانے کی تدبیر کرے یا رواں پانی کے ایک حصہ میں مچھلی آنے کے بعد اس کے روکنے کا انتظام کیا جائے تاکہ ان کے ساتھ مچھلیاں آسکیں تو اجارہ درست ہے، کیوں کہ یہ مچھلیوں کا اجارہ نہیں، بلکہ اس خطہ زمین کا اجارہ ہے جس میں مچھلیوں کی پرورش وافزائش کی جائے گی، اس طرح یہ خطہ گویا ایک ایسے جال کے درجہ میں ہے جس کو کرایہ پر حاصل کیا گیا

ہو اور اس کے ذریعہ مچھلیوں کا شکار کیا جاتا ہو، امام نووی کے الفاظ ہیں: ''لأن البركة يمكن الاصطياد بها فجازت إجارتها كالشبكة'' (شرح المہذب ۹/۲۸۵) اور بقول ابن قدامہ: ''إذا آجر بركة أو مصفاة ليصطاد فيها السمك فحصل فيها سمك ملكه؛ لأنه آلة معدة للاصطياد فأشبه الشبكة'' (المغنی ۴/۱۴۳)۔

غور کیا جائے تو احناف نے جس قاعدہ کی بنا پر مچھلیوں کے اجارہ کو ناجائز قرار دیا ہے، وہ اجارہ کی اس صورت میں موجود نہیں ہے اور پھر سرکاری تالاب کے اجارہ پر لیے جانے کی ایک نظیر خود فقہ حنفی میں موجود ہے، نص میں بھی بیع سمک کی ممانعت ہے نہ کہ اس آبی خطہ کے اجارہ کی، جس میں مچھلیوں کی افزائش کی جائے، لہٰذا:

اگر تالاب، ندی نالے اور نہر کے کسی حصہ میں موجود مچھلی خرید کی جائے تو جائز نہیں اور اگر اس حصہ کو متعین مدت کے لیے کرایہ پر لیا جائے تا کہ اس میں مچھلی کے انڈے ڈال کر مچھلی کی افزائش کی جائے، جیسا کہ آج کل رواج ہے، یا برسات وسیلاب وغیرہ میں آنے والے پانی کو روک کر یا کسی اور راستہ سے پانی لا کر مچھلی حاصل کی جائے تو یہ اجارہ ہے اور اس طرح اجارہ پر لینا اور دینا درست ہے۔

بیع باطل ہے یا فاسد؟

۲- سوال نمبر (۱) کے جواب سے واضح ہے کہ اجارہ کا معاملہ درست ہے، البتہ اگر تالاب ونہر وغیرہ میں موجود مچھلیوں ہی کو فروخت کرنا مقصود ہو تو یہ جائز نہیں اب دوسروں کا ان مچھلیوں کو خرید کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ یہ اس بات پر مبنی ہے کہ یہ ناجائز بیع، بیع باطل شمار ہوگی یا بیع فاسد؟ اگر بیع باطل ہو اور خریدار مسلمان ہو تو دوسروں کا اس سے خرید کرنا جائز نہیں، کیوں کہ بیع باطل سے باوجود قبضہ کے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ''وحكمه عدم إفادة الحكم وهو الملك قبضه أولا'' (البحر الرائق ۶/۶۹ طبع کراچی) اور اگر خریدار غیر مسلم تھا، تو اس سے خریدنے کی گنجائش ہے، کیوں کہ حنفیہ کے یہاں کفار حکم دینوی میں مخاطب بالفروع نہیں ہیں، اس لیے ان کے افعال کے بارے میں مسلمان خریدار جوابدہ نہیں۔

اگر یہ بیع فاسد ہے تو قبضہ کے بعد ملک حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے اب دوسروں کا اس سے خرید کرنا درست ہوگا

''والفاسد يفيد الملك عند اتصال القبض به ويكون المبيع مضمونا في يد المشتري فيه'' (ہدایہ مع الفتح ۶/۴۰۴)

اس لیے دیکھنا چاہیے کہ یہ بیع اصطلاحی اعتبار سے بیع باطل کے زمرہ میں آئے گی یا بیع فاسد کے؟

مشائخ کے یہاں اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ پانی میں موجود مچھلی کی خرید وفروخت کس زمرہ میں آتی ہے؟ اور ظاہر روایت بیع کے باطل ہونے کی ہے لیکن امام محمد کی ایک روایت کے مطابق امام صاحب کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے، بعض فقہاء نے بیع بالعرض اور بیع بالنقد میں فرق کیا ہے (درمختار ۴/۱۱۹) اور زیلعی نے اس پر گفتگو کی ہے، فرماتے ہیں:

''فلو سلم بعد ذلك ينبغي أن يكون على الروايتين اللتين في بيع الأبق على باطل أو فاسد'' (تبیین الحقائق ۴/۴۵)۔

(اگر اس کے بعد حوالہ کر دے تو دو روایتیں ہونی چاہئیں جو مفرور غلام کی بیع کی بابت ہے کہ بیع باطل ہے یا فاسد)؟

پھر بھاگے ہوئے غلام کی خرید فروخت کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

''اگر ایسے غلام کو فروخت کیا اور بیع فسخ کرنے سے پہلے غلام واپس آجائے تو چوں کہ محل بیع نہ ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہو چکی تھی، اس لیے اب بیع صحیح ہوگی

امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت ہے کہ بیع درست ہو جائے گی، اس لیے کہ اس میں مالیت موجود ہے، لہٰذا وہ بیع کا محل ہے، بس بیع منعقد ہو جائے گی، البتہ چوں کہ اس کی سپردگی سے عاجز ہے، اس لیے فاسد ہوگی، لہٰذا اگر فسخ معاملہ سے پہلے غلام لوٹ آئے تو مانع کے ختم ہو جانے کی وجہ سے بیع درست ہو جائے گی کرخی اور ہمارے اصحاب کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے اور پہلے قول پر ابوعبداللہ ثلجی اور مشائخ کے ایک گروہ کا فتویٰ ہے'' (تبیین الحقائق ۴/۵۰)۔

ان دونوں آراء میں ترجیح کے لیے ہمیں باطل وفاسد کی اصطلاح کی طرف رجوع کرنا چاہیے، عام طور پر فقہاء نے بیع باطل وفاسد کی جو تعریف کی ہے خاصی مبہم ہے کہ جو بیع اصل کے اعتبار سے ہی مشروع ودرست نہ ہو وہ باطل ہے اور جو کسی خارجی وصف کی وجہ سے نادرست قرار دی گئی ہو، وہ فاسد ہے (فتح القدیر وعنایہ ۶/۴۰۲)، لیکن عمدۃ الفضلاء علامہ شامی نے اپنے مزاج ومذاق خاص کے مطابق اس عقدہ کو بھی حل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''جو باتیں بیع کے رکن میں خلل پیدا کر دیں، وہ بیع کے باطل ہونے کا باعث ہیں اور بیع کا رکن ایجاب وقبول ہے، مثلاً پاگل اور بے شعور بچہ کی طرف

ایجاب یا قبول ہو یا محل بیع، یعنی مبیع میں خلل ہو، تو یہ خلل بھی باعث بطلان ہے، جیسے مبیع مردار خون، آزاد آدمی یا شراب ہو'' (ردالمحتار ۴/ ۱۱۲ طبع کوئٹہ)۔

اس طرح بیع باطل وہ ہے جس میں ایجاب وقبول ہی درست نہ ہو، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایسے اشخاص سے ایجاب وقبول کا صدور ہوا ہو جو اس کے لیے اہل ہی نہ ہوں، یا ایسی چیز کو بیع کا محل بنایا گیا ہو جس میں محل بیع ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو، ''محل بیع'' بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اس سے کیا مراد ہے؟ اس کو شامی ہی کی ایک اور عبارت واضح کرتی ہے:

''فاسد باطل میں امتیاز کا ضابطہ یہ ہے کہ مبیع اور قیمت میں سے کوئی ایسی شئ ہو جس کو کسی بھی مذہب آسمانی میں ''مال'' تسلیم نہ کیا گیا ہو تو بیع باطل ہے، لہذا مردار، خون اور آزاد آدمی کی بیع باطل ہے اور یہی حکم اس کو ''ثمن'' بنانے کی صورت میں بھی ہے، اور اگر بعض مذاہب آسمانی میں مال ہو اور بعض میں اس کو مال تسلیم نہ کیا گیا ہو تو اگر اس کو قیمت کا درجہ دینا ممکن ہو، جیسے غلام اور شراب کی ایک دوسرے کے عوض، تو بیع فاسد ہوگی اور اگر اس کا مبیع ہی ہونا متعین ہو تو جیسے: شراب اور درہم کی ایک دوسرے سے بیع ہو تو بیع باطل ہے'' (ردالمحتار ۴/ ۱۱۲ طبع کوئٹہ)۔

اس اصول کی روشنی میں ان لوگوں کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے جن کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے، کیوں کہ اس عقد کے ایجاب وقبول میں کوئی خلل نہیں، معقود کا کسی دین سماوی میں مال تسلیم کیا جانا تو بہت فروتر ہے، شاید کوئی دین سماوی نہیں جس نے مچھلی کو مال شمار نہ کیا ہو، مقدور التسلیم نہ ہونا ''مبیع'' سے متعلق ایک خارجی وصف ہے، اس لیے صحیح یہی ہے کہ یہ بیع فاسد ہے اور قبضہ کے بعد مفید ملک ہے، زیلعی کی روایت گذر چکی ہے کہ امام کرخی جیسے فقیہ نے اس کو ترجیح دیا ہے، مزید باعث تقویت یہ ہے کہ ابن ہمام بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

''الوجه عندي أن عدم القدرة على التسليم مفسد لا باطل'' (فتح القدیر ۶/ ۴۲۲)۔

(میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مبیع کی سپردگی پر قادر نہ ہونا بیع کے فاسد ہونے کا باعث ہے نہ کہ باطل ہونے کا)۔

اس لیے خریدار اول سے دوسرے لوگوں کا اس مچھلی کو خرید کرنا جائز و درست ہوگا۔

۳- جیسا کہ مذکور ہوا، سرکاری تالاب وغیرہ میں تو بعض فقہاء کے یہاں مچھلی کی خرید وفروخت کی بابت کسی قدر رعایت بھی ہے، گو وہ بھی قول مرجوح ہے، جیسا کہ ابن نجیم کا قول مذکور ہوا، لیکن شخصی حوض وتالاب کی بابت کوئی استثناء نہیں، اس لیے تالاب وغیرہ میں موجود مچھلیوں کے نکالے بغیر خریدنا اور بیچنا درست نہیں، سوائے اس کے کہ مچھلیاں اس قدر کثیر تعداد میں ہوں کہ ان کے حصول میں شکار کی حاجت نہ ہو، گو مشاہدہ میں ہندوستان میں شاید ہی ایسا تالاب آسکے۔

ہاں اگر تالاب ایک مقررہ مدت کے لیے کرایہ پر دیا جائے کہ کرایہ دار اس میں مچھلیوں کے انڈے وغیرہ ڈال کر مچھلیوں کی افزائش کرے تو ایسا کرنا جائز ہے۔

۴- اس صورت میں ملکیت کے لیے ضروری ہے کہ مالک اراضی نے خاص اسی مقصد کے لیے تالاب بنایا ہو، یا کم سے کم مچھلیوں کے آجانے کے بعد ان کی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا ہو اور ''مقدور التسلیم''، یعنی سپردگی پر قادر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مچھلیاں اس کثیر مقدار میں ہوں کہ جال وغیرہ استعمال کیے بغیر ادنی مشقت سے مچھلیاں حاصل کی جاسکتی ہوں، اگر یہ دونوں شرطیں پائی جاتی ہوں تو ان کا فروخت کرنا درست ہے، ورنہ نہیں۔

☆☆☆

مچھلی کی خرید وفروخت کے چند مسائل

مولانا انیس الرحمن قاسمی [1]

ندی نالوں کا اجارہ:

یہاں دو قسم کے سوال پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ اس طرح کے اجارہ کی حیثیت کیا ہے؟ اور دوسرے ان سے مچھلیاں جس طرح نکالی جاتی ہیں اور ان کو فروخت کیا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں اور ان مچھلیوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔

شرعی نقطہ نظر سے اجارہ کے صحیح ہونے کے لیے فقہاء احناف نے ''محل اجارہ'' کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ اجارہ کا محل ''منفعت'' ہو اور وہ منفعت بھی متقوم و مقصود ہو، اور بلا قیمت مباح نہ ہو، منفعت کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو اجارہ پر لیا جا رہا ہے اس کے عین کا استہلاک نہ ہو۔

''قال: الإجارة إذا وقعت علی العین لا تصح'' (ردالمحتار ۶/ ۶۳)۔

البتہ بعض دیگر فقہاء نے اس میں توسع کی ہے اور بعض صورتوں میں ''استہلاک عین'' کے باوجود تبعاً جائز قرار دیا ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱/ ۲۵۹)، اس پہلے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ندی نالوں اور سمندر کا اجارہ مچھلی نکالنے کے لیے جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ ان سے انتفاع ہر ایک کے لیے جائز ہے اور اس اجارہ میں عین شی یعنی مچھلی کا استہلاک ہے۔ البتہ بعض دیگر فقہاء اور خود بعض فقہاء حنفیہ نے پانی کے ساتھ دریا اور نالوں کو اجارہ پر دینے کی اجازت دی ہے، شیخ علاء الدین حصکفیؒ نے ''درمختار'' میں ''مضمرات'' کے حوالہ سے ''عموم بلویٰ'' کے پیش نظر اس کے جواز کا فتویٰ نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''وجاز إجارة القناة والنهر مع الماء به يفتى لعموم البلوى'' (درمختار مع ردالمحتار ۶/ ۶۳)۔

اس لیے عموم بلویٰ کے پیش نظر جب ''پانی'' کے استہلاک کی صورت میں اس اجارہ کو درست قرار دیا گیا ہے تو موجودہ دور میں مچھلی کا خرید وفروخت اور اجارہ میں جو ابتلاء عام ہے، اس کے پیش نظر دریا کے پانی کے ساتھ ساتھ مچھلی کا اجارہ بھی جائز ہوگا، فقہاء احناف میں علامہ خیر الدین الرملی نے امام ابو یوسف کی اس روایت پر کلام کرتے ہوئے جسے انہوں نے ''کتاب الخراج'' میں نقل کیا ہے:

''عن أبي الزناد: قال كتبت إلى عمر بن الخطاب في بحيرة يجتمع فيها السمك بأرض العراق أن يوجرها فكتب إلي أن افعلوا'' (ردالمحتار ۴/ ۱۰۴)

(حضرت ابوالزناد کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس عراق کے ایک بڑے تالاب کے بارے میں دریافت کیا جس میں مچھلیاں جمع ہوتی ہیں کہ کیا اس کو اجارہ پر دے دیا جائے تو انہوں نے ایسا کرنے کا حکم دیا)۔

پھر یہ لکھا ہے کہ ''کتاب الخراج'' کی جو عبارت گزری وہ بھی ''قواعد'' سے بعید نہیں ہے، کیوں کہ اس کا مرجع ایسا اجارہ ہے جو ایک خاص جگہ اور معلوم منفعت، یعنی شکار سے متعلق ہے (الدر المختار مع الرد ۶/ ۶۲)۔

اس لیے یہ مسئلہ چاہے ''اجارہ کے قواعد'' کے متعلق ہو، جیسا کہ علامہ کی رائے ہے، یا اس کے برخلاف ہو، جیسا کہ علامہ شامی کا رجحان ہے، جس طرح دریا اور تالاب کے پانی کا اجارہ ''ابتلاء عام'' کے پیش نظر جائز قرار دیا گیا ہے، اسی طرح دریا اور تالاب کے پانی کے ساتھ اس کی مچھلی کا ٹھیکہ بھی ''عموم بلویٰ'' کے مدنظر جائز ہونا چاہیے۔

ندی نالوں کی مچھلیاں:

اور اگر اس اجارہ کو درست تسلیم نہ کیا جائے، جیسا کہ فقہاء احناف کا عام رجحان ہے، تو بھی ندی نالوں یا سمندروں سے اس طرح ٹھیکہ پر حاصل کر کے مچھلیاں شکار کی جاتی ہیں، چاہے شکار کرنے والے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ان کے لیے ان مچھلیوں کو فروخت کرنا اور مسلمانوں کے لیے خرید کر کھانا بھی بلاشبہ جائز

[1] ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

ہے، کیوں کہ ندی نالے اور سمندر "مباح الاصل" ہیں ان سے جو بھی شکار کرلے وہ اپنے شکار کا مالک ہوگا، اس لیے چاہے ان کو کوئی شخص اجارہ پر لے یا اجارہ پر لینے والا کسی دوسرے کے ہاتھ بغیر شکار کیے ان کی مچھلیوں کو بیچ دے، ہر دونوں صورت میں مچھلی کا شکار کرنے والا مچھلیوں کا مالک ہوگا اور اگر یہ صورت ہو کہ ٹھیکہ پر لینے والا یا اس کی مچھلیوں کو خریدنے والا خود سے مچھلیوں کا شکار نہ کرے، بلکہ اجیر رکھ کر دوسرے سے شکار کرائے تو بھی جائز ہوگا۔

"قال استأجره ليصيد له أو يحتطب له، فإن وقت لذلك وقتا جاز ذلك وإلا لا" (الدر المختار مع الرد ۶/ ۶۲)

(کسی نے کسی شخص کو شکار کرنے یا لکڑیاں کاٹنے کے لیے اجیر رکھا اور اس کام کا وقت بھی متعین کردیا تو یہ اجارہ جائز ہے، ورنہ نہیں)۔

مچھلی کی افزائش کے لیے تالاب کا اجارہ:

تالاب کو عام طور پر مچھلی کی افزائش وشکار کے لیے اجارہ پر دیا جاتا ہے جس کی مدت متعین ہوتی ہے اور اجارہ پر لینے والا کبھی تو اس میں پہلے سے موجود مچھلیوں کی افزائش کرتا ہے اور عام طور پر مچھلی کا زیرہ ڈال کران کی پرورش کرتا ہے، اس طرح تالاب کو مچھلیوں کی افزائش کے لیے اجارہ پر لینا جائز ہے، فقہاء نے پانی کے استعمال کے لیے تالاب اور نہر ودریا کے اجارہ کی اجازت دی ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

"جاز إجارة القناة والنهر مع الماء به يفتى لعموم البلوى" (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۶۲)۔

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت:

تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت کے بارے میں عام طور پر دو طریقے رائج ہیں، اول یہ کہ تالاب کے اصل مالک یا ٹھیکیدار جو مچھلیوں کے مالک ہوتے ہیں وہ عموماً تالاب سے مچھلیاں نکلوا کر فروخت کرتے ہیں، مچھلیوں کی خرید وفروخت کی یہ صورت بلاشبہ جائز ہے، چاہے ان تالابوں کے مالک مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اس لیے کہ یہاں مبیع (مچھلیاں) متعین بھی ہیں اور مقدور التسلیم بھی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تالاب سے مچھلیوں کو نکالے بغیر فروخت کیا جاتا ہے اور خریدار ان مچھلیوں کا شکار کرکے پھر ان کو بیچتا ہے، یہ طریقہ بہت کم رائج ہے، اس طرح کی خرید وفروخت کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں تفصیل ہے، ایک صورت یہ ہے کہ تالاب میں پانی برائے نام رہ گیا ہو اور مچھلیاں پکڑنے میں کسی جال یا شکار کے طریقوں کو استعمال میں لانے کی ضرورت نہ ہو اور مچھلیاں بغیر کسی حیلہ وتدبیر کے پکڑی جاتی ہوں۔ تو یہ صورت بہر حال جائز ہے، علامہ ابن ہمام کہتے ہیں:

"ثم إن كان يؤخذ بغير حيلة اصطياد جاز بيعه، لأنه مملوك مقدور التسليم، مثل السمكة في جب، وإن لم يكن يؤخذ إلا بحيلة لايجوز بيعه لعدم القدرة على التسليم عقيب البيع" (فتح القدیر ۶----)۔

(اگر مچھلی شکار کے لیے کسی تدبیر کے بغیر پکڑی جاسکتی ہو تو اس کی بیع جائز ہے کیوں کہ وہ مچھلی ملکیت میں بھی ہے اور اس کو خریدار کے سپرد کرنا ہاتھ میں ہی ہے، جیسے کہ مچھلی "گڈھے" میں ہو، اور اگر فروختگی کے فوراً بعد اس کو سپرد کرنا ممکن نہ ہو تو پھر جائز نہیں ہے)۔

مچھلی کی ملکیت کی شرط کے ساتھ خرید وفروخت کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ فروخت کرنے والا فروختگی کے بعد خریدار کے حوالہ کرنے پر قادر ہو، اگر تالاب میں پانی ہو تو پانی کی مچھلی کو بغیر شکار کیے وہ حوالہ نہیں کرسکتا ہے، اس لیے یہ صحیح نہیں ہے۔

فقہاء احناف نے اس کے لیے دو طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں، صاحب "عنایہ" علامہ کمال الدین البابرتی نے "حظیرۃ صغیرۃ" کا لفظ استعمال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"الحظيرة إذا كانت صغيرة أخذ من غير حيلة جاز وإلا لا"۔

اور علامہ ابن ہمام نے "جب" کا لفظ استعمال کیا ہے، مگر اس کی تحدید نہیں کی ہے کہ وہ اس قدر لمبا چوڑا ہو، مگر دونوں سے مراد ایسا چھوٹا گڑھا ہے جس کی مچھلیوں کو پکڑنے میں کسی حیلہ وتدبیر یا شکار کی ضرورت نہ پڑے اور اگر بڑے تالاب میں بھی یہی کیفیت کبھی پائی جائے کہ اس کا پانی برائے نام ہو تو یہی حکم ہوگا، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک سوال کے جواب میں "حظیرۃ صغیرۃ" کے بارے میں یہ لکھا ہے:

"حظیرہ صغیرہ کی حد کسی پیمائش سے نہیں ہے کہ "يمكن الأخذ منها بلا تكلف واحتيال" (امداد الفتاوی ۳/ ۴۸)۔

اور اگر تالاب میں مچھلیوں کو فروخت کرنے کی یہ صورت ہو کہ تالاب بڑا ہو اور پانی سے بھرا ہو اور فروخت کرنے والا اس کی مچھلیوں کو فروختگی کے بعد بلا کسی

حیلہ وتدبیر کے خریدار کے حوالہ کرنے پر قادر نہیں ہو تو یہ بیع جائز نہیں ہوگی، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "بیع غرر" سے منع کیا ہے۔

اس طرح اس قسم کے بیع کے بطلان پر اجماع ہے، جیسے پیٹ میں جنین کی بیع، یا ہوا میں پرندہ کی بیع، یہ مسئلہ ہے کہ غرر کی وجہ سے کونسی بیع باطل ہے اور کون سی نہیں، اس بارے میں علماء کے اقوال کا مدار وہی ہے جو میں نے بیان کیا اور یہ کہ: "حاجت ارتکاب غرر" کی داعی ہو، اور اس قسم کی بیع جائز ہے، ورنہ نہیں۔

اور اس باب کے کچھ مسائل میں "بیع کی صحت وفساد" کے بارے میں علماء کے درمیان جو اختلاف رائے ہے، جیسے عین غائب (یعنی ایسی شئی جو سامنے نہ ہو) کی بیع تو یہ اختلاف اسی قاعدہ پر مبنی ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس میں "معمولی غرر" ہے، اس لیے غرر نہ ہونے کے درجہ میں ہے لہذا بیع صحیح ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے میں "غرر معمولی نہیں ہے" اس لیے وہ اس بیع کو باطل قرار دیتے ہیں" (شرح مسلم للنووی ۲/ ۲)۔

فقہاء احناف نے بھی "حقیر غرر" کو نہ ہونے کے درجہ میں قرار دے کر بیع کو جائز قرار دیا ہے، اسی لیے وہ "حوض" میں مچھلی کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں، (تفصیل کے لیے دیکھئے: شرح العنایہ مع الفتح ۶/ ۴۰۹)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ تالاب جس کی مچھلیوں کو پانی ہونے کی وجہ سے پانی سے نکالے بغیر یا جال ڈالے بغیر ہاتھ سے پکڑا نہ جاسکتا ہو پانی کے اندر ایسی مچھلیوں کی خرید وفروخت جائز نہیں، اور جس کی مچھلیوں کو پکڑنے میں پانی نکالنے یا جال ڈالنے کی ضرورت نہ ہو، اس حوض کی مچھلیوں کو حوض کے اندر خرید وفروخت کرنا جائز ہے، مگر اس صورت میں ہر ہر مچھلیوں کو پکڑ کر خریدار کے حوالہ کرنا "بائع" کی ذمہ داری ہوگی (تفصیل کے لیے دیکھئے: حوالہ سابق)۔

موقوفہ تالاب کی مچھلیاں:

علامہ ابن نجیم مصری نے "البحر الرائق" میں اراضی بیت المال، اور اراضی موقوفہ کی مچھلیوں کی (تالاب میں) خرید وفروخت کے بارے میں لکھا ہے:

"لا يجوز بيع السمك في الآجام إلا إذا كان في أرض بيت المال. ويلحق به أرض الوقف"

اس روایت کی بناء پر گڈھوں کی مچھلیوں کی بیع جائز نہیں ہوگی، بجز اس صورت کے جب یہ اراضی بیت المال یا موقوفہ میں واقع ہو۔

اور اس کی اصل حضرت عمر بن عبد العزیز کا قول ہے، اسے امام ابو حنیفہ نے اپنے شیخ حماد کے ذریعہ روایت کیا ہے، جسے امام ابو یوسف کے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے۔

"عن أبي يوسف عن أبي حنيفة عن حماد عن عبد الحميد بن عبد الرحمن أنه كتب إلى عمر بن عبد العزيز يسأله عن بيع صيد الآجام فكتب إليه عمر أنه لا بأس به وسماه الحبس"۔

حضرت عمر بن عبد العزیز سے عبد الحمید نے آجام کی مچھلیوں کی بیع کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور لیکن شیخ خیر الدین رملی نے اس روایت پر عمل کو مشکل بتایا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"أقول الذي علم مما تقدم عدم جواز البيع مطلقا سواء كان بحرًا أو نهرا أو أجمة وهو بإطلاقه أعم من أن يكون في أرض بيت المال أو أرض الوقف"۔

اوپر کی بحث سے (پانی میں) ہر طرح کی مچھلیوں کی بیع کا ناجائز ہونا معلوم ہوگیا، چاہے وہ سمندر میں ہوں، یا دریا میں یا گڈھوں میں یہ عدم جواز مطلق ہو یا اراضی موقوفہ میں۔

اور اس روایت کی یہ تاویل کی ہے:

"ويجاب بأنه في آجام لذلك وكان السمك فيها مقدور التسليم"

یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ ایسے گڈھوں کے بارے میں ہے جس کو اسی مقصد کے لیے بنایا گیا ہو اور ان کی مچھلیوں کو پکڑنا آسان اور وہ مقدور التسلیم ہو۔

اور یہی تاویل علامہ ابن ہمام نے کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ومعلوم أن الآجمة قد يؤخذ منها السمك باليد"۔ (گڈھوں کی مچھلیوں کو بھی ہاتھ سے پکڑا جاتا ہے)

اور اس بارے میں انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"وقال أبو يوسف في كتاب الخراج: رخص في بيع السمك في الآجام أقوام. فكان الصواب عندنا في قول من كرهه"

(امداد الفتاوی ۳/۴۹)۔

ایسے حوض یا تالاب جنہیں مچھلیاں پالنے کے لیے نہیں بنایا گیا ہو چاہے وہ نجی ملکیت کے ہوں یا عوامی ملکیت کے ہوں اس میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش سے از خود پیدا ہو جاتی ہوں یا ندی وغیرہ کے پانی کے ساتھ اس میں آجاتی ہیں تو کیا ایسے تالاب کی مچھلیوں کا مالک تالاب والا ہی ہوگا یا نہیں، اور ان کی مچھلیوں کو تالاب کا مالک کسی دوسرے سے فروخت کرسکتا ہے یا اجارے پر دے سکتا ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ''امداد الفتاوی'' میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے:

اس مقام میں دو کلام ہیں ایک مچھلی کے مملوک اور غیر مملوک کے متعلق دوسرے اس کے جواز بیع وعدم جواز کے متعلق سو امر اول میں تین صورتیں ہیں اور ہر صورت کا جدا حکم ہے ایک صورت یہ ہے کہ مچھلی پکڑ کر یا خرید کر تالاب میں چھوڑنے اس کا حکم یہ ہے کہ وہ مچھلی اور اس کی نسل سب چھوڑنے والے کی مملوک ہیں، دوسرے بلا اذن پکڑنا درست نہیں۔

دریا اور سمندر میں مچھلی کی بیع:

اوپر چھوٹے اور بڑے تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت کا ذکر تھا جس کا تفصیلی حکم بیان کیا گیا، اسی طرح اگر کسی نے دریا اور سمندر میں پائی جانے والی مچھلیوں کو بغیر شکار کیے کسی سے فروخت کر دیا یا ایسے تالاب کی مچھلیوں کو فروخت کیا جن کا وہ مالک نہیں ہے، نہ مچھلی کا مالک ہے اور نہ تالاب کا، یا تالاب کا تو مالک ہے، لیکن مچھلیوں کا مالک نہیں، تو اس طرح کی بیع جائز نہیں ہوگی۔ شیخ ظہیر الدین مرغینانی صاحب ''ہدایہ'' لکھتے ہیں:

''ولا يجوز بيع السمك قبل اصطياد ولأنه باع ما لا يملكه'' (الہدایہ مع فتح القدیر ۶/۴۰۹)۔
مچھلی کا شکار کرنے سے پہلے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں، کیوں کہ یہ ایسی شئی کی بیع ہے جس کا وہ مالک نہیں۔

اور علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

''بيع السمك في البحر أو النهر لا يجوز'' (سمندر اور دریا میں مچھلی کی بیع جائز نہیں ہے)۔

مگر خریدار نے اگر مچھلیوں کا شکار کیا یا اجیر رکھ کر شکار کرایا تو وہ ان مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا، اور اس طرح کی تمام مچھلیاں جو بازار میں فروخت ہوتی ہیں بلا کراہت مسلمانوں کے لیے ان کی خرید وفروخت واستعمال جائز ہوگا، یہی حکم ان تالابوں کا ہے جن کی مچھلیاں مالک تالاب کی ملکیت میں نہ ہوں، مگر اس نے فروخت کر دیا تو پھر مچھلی پکڑنے والا ان کا مالک ہو جائے گا۔

☆☆☆

مچھلی کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

مولانا زبیر احمد قاسمی [1]

درج ذیل عنوان کے تحت مرسلہ سوالوں کے مختصر اور اجمالی عنوان اور مقصود یہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ آج کل مارکیٹ ومنڈی میں فروخت کی جانے والی مچھلیوں کا کسی مسلمان کے لیے خریدنا اور استعمال کرنا شرعاً جائز اور حلال ہے یا نہیں؟ کیوں کہ ان مچھلیوں کا بائع ان کے حاصل کرنے میں بسا اوقات ایسے ذرائع بھی اختیار کرتا ہے جنہیں شرعاً بیع فاسد یا بظاہر بیع باطل ہی کہا جاسکتا ہے، اور یہ دونوں ذریعے از روئے اسلام موجب اثم، واجب الاحتراز، لازم الفسخ ہیں، یا پھر مفید للملک بھی نہیں۔

میرے نزدیک اس سوال کا مختصر اور اجمالی جواب یہی ہے کہ منڈی میں مچھلی فروخت کرنے والا مسلم ہو یا غیر مسلم بلا تجسس وتفتیش ہر ایک مسلمان کے لیے بھی اس سے مچھلی خریدنا اور استعمال کرنا جائز وحلال ہے، کیوں کہ واقعہ یہی ہے کہ برائے فروخت منڈی میں لائی جانے والی مچھلیاں عام حالات اور اکثر صورتوں کے اعتبار سے شرعاً جائز وصحیح اور مفید للملک ذریعہ ہی سے حاصل کر کے لائی جاتی ہیں۔

اقل قلیل اور شاذ ونادر ہی وہ صورت اور ذریعہ متحقق ہو پاتا ہے جس سے اس مچھلی میں خباثت پیدا ہو جائے، گو وہ خباثت بھی غیر متعدیہ بماء یا وہ ذریعہ حصول بائع کے لیے مفید للملک ہی نہ بن سکے، اس لیے "العبرة للأغلب" اور "النادر کالمعدوم" پر نظر رکھتے ہوئے حکم شرعی یہی بیان کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں پر تجسس وتفتیش لازم نہیں، وہ مارکیٹ میں فروخت کی جانے والی مچھلیاں بعقد صحیح خرید کر استعمال کرسکتا ہے۔

اس مختصر واجمالی جواب کی دلیل درج ذیل مقدمات ہیں:

۱- اپنی جگہ یہ امر طے اور مسلم ہے کہ بیع وشراء کے انعقاد کے لیے شریعت نے جو شرطیں لگا رکھی ہیں، مثلاً عاقدین میں اہلیت اور مبیع میں محلیت وغیرہ ان کی رعایت وپرواہ کے بغیر جو بیع وشراء ہوگی وہ بیع باطل کہلائے گی، جو بعد القبض بھی مفید للملک نہیں ہوگی، اور اس کی حرمت اور شناعت وخباثت علم واطلاع کے بعد شخص آخر تک متعدی بھی ہوتی رہے گی۔

۲- لیکن جس بیع وشراء میں شرائط انعقاد وعقد کی رعایت ہو جائے مگر شرائط صحت عقد کا لحاظ نہ رکھا جائے وہ بیع فاسد ہوگی، مثلاً مبیع مجہول القدر اور غیر مقدور التسلیم وغیرہ ہو تو ایسے عقد سے متعاقدین عاصی وگنہگار ہوتے ہیں، اس لیے ایسا عقد واجب الفسخ ہوتا ہے، لیکن بایں ہمہ اگر جانبین سے عوضین کا تسلیم وتسلم ہو جائے تو عاقدین اپنے اپنے عوض کے مالک بن جاتے ہیں، گو ملکیت میں خباثت ہوتی ہے، اور اس کے بعد دونوں کا اپنے عوضین پر ہر ایک کا تصرف جدید بشکل بیع وہبہ اور اجارہ وغیرہ شرعاً صحیح ہوا کرتا ہے، اور کسی تیسرے شخص کا علم واطلاع کے باوجود بعقد صحیح سے حاصل کرنا جائز ہی ہوا کرتا ہے، اس کی معصیت اور شناعت وخباثت متعدی نہیں ہوا کرتی۔

۳- مچھلیاں اپنی ذات سے مباح الاصل ہیں جب تک ان مچھلیوں پر کسی نہ کسی سبب ملک کے ذریعہ کسی شخص کی ملکیت ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک جو بھی ان مچھلیوں کا شکار کرلے گا وہ اس احراز واصطیاد کے سبب شرعاً مالک بن جائے گا اور وہ اس کی بیع وشراء بلا قباحت وشناعت کرسکتا ہے، کیوں کہ مباح الاصل کا احراز واصطیاد مستقل سبب ملک ہے۔

۴- حوض، یا تالاب اگر کسی کی شخصی اور نجی ملکیت میں ہے تب بھی اس کی مچھلیاں صاحب حوض کی مملوکہ نہیں ہو جاتیں جب تک امور ذیل میں سے کسی صورت کا تحقق نہ ہو جائے:

الف- وہ حوض، تالاب بنایا ہی گیا ہو مچھلی کی پرورش کے لیے، اب اس میں باضابطہ رکھ کر مچھلیاں پالی بھی جاتی ہیں یا از خود مچھلیاں کسی طرح ان میں جمع ہو جاتی ہیں اور پلاتی ہیں۔

---

[1] ناظم اشرف العلوم، کنہواں، سیتامڑھی، بہار۔

ب- یا گو حوض و تالاب اس مقصد کے لیے نہ بنایا جائے مگر حوض و تالاب کے مالک نے باقاعدہ باہر سے مچھلیاں لاکر اور پکڑ پکڑ کر اس میں جمع کر رکھا ہے۔

ج- یا مچھلیاں ازخود کسی طرح آکر جمع ہو گئیں ہوں، مگر مالک حوض نے ان کے روکنے اور حفاظت کی تدبیریں (سد مدخل) وغیرہ کے ذریعہ اختیار کی ہو۔

اگر ان میں سے کوئی صورت نہ پائی جائے تو پھر اس تالاب کی مچھلیاں صاحب تالاب کی مملوکہ نہ ہوں گی، بلکہ مباح الاصل ہی کہلائیں گی جو بھی شکار کرے گا وہ مالک قرار پائے گا، کیوں کہ مباح الاصل اشیاء کے لیے احراز و اصطیاد مستقل سبب ملک ہے، کما قلنا فی مقدمۃ ثانیۃ۔

وھذہ کلھا مصرح فی الکتب الفقھیۃ المتداولۃ (بحرالرائق ۶/ ۷۳، فتح القدیر ۶/ ۴۹ پاکستان)۔

ان متقدمات بالا کی روشنی میں مرسلہ سوالوں کا علی الترتیب مفصل جواب حسب ذیل ہوگا:

سوال ۱- جوندی نالے اور نہریں کسی بھی فرد حقیقی یا اعتباری کی ملک نہیں، بلکہ سرکاری تحویل میں اراضی حیاز کے قبیل سے ہیں، اب خواہ اس کا مالک سرکار ہی کو تسلیم کر لیا جائے، تاہم جبکہ ان ندیوں، نالوں اور نہروں کو مچھلی پالن کے لیے بنایا ہی نہیں گیا ہے، اور نہ کبھی کوئی سرکاری عملہ باہر سے مچھلی لا لا کر اس میں رکھتا ہی ہے، اور نہ ازخود آتی ہوئی مچھلیوں کی حفاظت و رکاوٹ کے لیے سرکار یا اس کا عملہ کوئی تدبیر ہی اختیار کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ ان ندیوں، نالوں اور نہروں میں موجود مچھلیاں کسی کی بھی مملوکہ ہی نہیں بنیں، اس کی بیع لعدم الملک بیع باطل ہوگی، اسی طرح سرکار کی طرف سے بالعوض بندوبست و نیلام کرنا اور بیچنا اور ٹھیکیداروں کا اسے خریدنا اور عوض ادا کرنا سب ہی فعل عبث لا یعنی یہ ہوا، عوض لینا سرکار کا ظلم اور فعل حرام ہوا اور عوض دینا ٹھیکیدار کا اپنا نقصان اور مال کا ضیاع ہوا، گو اس ضیاع مال کے سبب عند اللہ یہ لوگ مجرم نہ قرار پائیں، کیوں کہ دراصل مباح الاصل اشیاء سے استفادہ اور اس کے احراز و اصطیاد کا جو حق شرعاً حاصل تھا ظالم سرکار سے اپنے اس حق کو حاصل کرنے اور دفع ظلم کے لیے انہوں مال خرچ اور ضائع کیا ہے "فکما یجوز الرشوۃ لدفع الظلم یجوز ھذا أیضًا"۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیع و شراء بندوبست و نیلام وغیرہ کا جو بھی معاملہ بظاہر کیا گیا وہ درحقیقت عقد باطل "کأن لم یکن" رہا۔ اور مچھلیاں فی نفسہ علی حالہ مباح الاصل ہی رہ گئیں، اب اس کے بعد ٹھیکیداروں نے ازخود یا اپنے وکیل واجیر کے ذریعہ جو مچھلیوں کا شکار کیا یہ مستقل عمل جدید احراز و اصطیاد کا پایا گیا جو سبب ملک ہے، اس لیے ٹھیکیدار ان مچھلیوں کا شرعاً جائز مالک بن گیا، اس کا ان مچھلیوں کو منڈیوں میں فروخت کرنا بھی صحیح اور ہر کسی کا اس سے خریدنا اور استعمال کرنا بھی صحیح، اگر ٹھیکیداروں کو اسی عقد باطل کے نتیجے میں مالک اور فروخت کرنے کا مجاز قرار دیا جاتا تو پھر بحکم مقدمہ اولی حرمت و شناعت و خباثت متعدی ہوتی۔ أما لا فلا۔

جواب ۲- اس کا جواب تفصیل بالا سے نکل آیا کہ جب ٹھیکیدار احراز و اصطیاد کے نتیجے میں مچھلیوں کا مالک بنا ہے تو مسلمانوں کا اس سے خریدنا اور استعمال کرنا بلا غبار جائز و حلال ہی ہوگا۔

جواب ۳- جو حوض و تالاب کسی کی ذاتی ملک ہے اور اس میں باضابطہ مچھلیاں پالی گئیں ہیں تب تو ظاہر ہے کہ صاحب حوض ان مچھلیوں کا مالک بن چکا ہے مگر قبل الاصطیاد مبیع مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہے، اس لیے یہ بیع فاسد ہوگی، اب جبکہ وہ خریدار ٹھیکیدار مچھلیوں کو نکال کر، یعنی قبضہ میں لاکر فروخت کرتا ہے تو اس کا یہ تصرف بھی صحیح، مسلمانوں کا اس سے خریدنا بھی بالکلیہ صحیح "بحکم مقدمۃ ثانیۃ"۔

جواب ۴- کوئی حوض و تالاب اگر فرد حقیقی یا حکمی و اعتباری کی ملک ہو مگر اس کی مچھلیوں پر اسباب ملک میں سے کسی سبب ملک (مھیا للسمک، احراز، سد مدخل) کے نہ پائے جانے کے سبب ملکیت ثابت نہ ہو سکی تو مچھلیاں مباح الاصل رہ گئیں، اب اس کا فروخت کرنا مالک حوض کے حق میں عقد باطل کے ذریعہ عوض لینا حرام و سحت ہوگا، اور دوسروں کو شکار سے روکنا خلاف انسانیت و مروت ہوگا، تاہم ٹھیکیدار اپنے عمل مستقل احراز و اصطیاد کے سبب مچھلیوں کا مالک بن جائے گا، تو پھر ان سے دوسرے لوگوں کا مچھلیاں خریدنا بلا غبار جائز ہی ہوگا "بحکم مقدمۃ ثالثۃ ورابعۃ"۔

مارکیٹ و منڈی میں فروخت کی جانے والی مچھلیاں عموماً انہیں مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی نہ کسی طرح حاصل کی جاتی ہیں اور سب ہی کی بیع و شراء بہ تفصیل بالا جائز ہی ہوگی، اقل قلیل اور شاذ و نادر صورت بس یہ رہ جاتی ہے کہ منڈی میں مچھلی کے فروخت کنندہ کسی کی مملوکہ مچھلیوں کو غصب و سرقہ کر کے لائے اور بیچے "وھذا نادر جدا"۔

اس لیے میرے نزدیک بلا تفتیش و تجسس منڈی میں فروخت ہونے والی تمام ہی مچھلیوں کی خریدگی ہر مسلمان کے لیے جائز ہی کہلائے گی۔

☆☆☆

مچھلی کی بیع وشراء

مفتی احمد دیولوی[1]

مچھلیوں کی بیع وشراء کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی طور پر ضروری ہے:

۱-اس کا مالک ہونا۔ ۲-مشتری کو سپرد کرنے پر قادر ہونا۔

سوال میں مذکور شکلیں انہی شرائط کے ماتحت جائز ہوں گی۔

۱- مالک ہونے کی مختلف شکلیں ہیں: (۱) مچھلی کی پرورش اور نشوونماء کے لیے ہی تالاب میں رکھا گیا ہو۔ (۲) کسی آدمی نے مچھلیاں تو نہیں ڈالیں لیکن ندی یا تالاب میں آنے جانے والی مچھلیوں کو روکنے اور واپس نہ جانے کی کوئی تدبیر کی۔ (۳) مچھلی کا شکار کر کے اس کو اپنے برتن میں حفاظت سے رکھ دے۔

اور بھی ایک شکل فقہاء کرام نے ذکر فرمائی ہے کہ کسی کے تالاب میں مچھلیاں بغیر کسی محنت ومشقت کے خود آجائے تو صرف آجانے سے وہ اس کا مالک نہیں ہو جائے گا، مثلاً کسی کے کھیت میں پرندہ کے بچے یا انڈے دینے سے زمین والا اس کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ جو بھی اس بچہ یا انڈا کو اٹھالے وہ اس کا مالک ہوجائے گا

''کما لو باض الطیر فی أرض إنسان أو فرخت، فإنه لا یملك لعدم الإحراز'' (عنایه شرح ہدایه ۶/۲۱۰)۔

۲-مقدور التسلیم ہونا۔

۱-اس کی شکل تو یہ ہے کہ شکار کر کے برتن میں رکھ دیا جائے۔

۲-کسی ایسے چھوٹے گھڑے میں رکھی جاوے جس سے نکالنا آسان ہو۔

جس شکل میں آدمی مالک ہی نہ ہو تب تو خرید وفروخت درست ہی نہیں ہے۔

''نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع ما لیس عند الإنسان'' (بدائع ۵/ ۱۴۷)۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کے بیچنے سے منع فرمایا ہے جو آدمی کے پاس موجود نہ ہو)۔

''عن حکیم بن حزام قال: یا رسول الله! یأتینی الرجل فیرید منی البیع لیس عندی أفأبتاعه له من السوق. فقال: لا تبع ما لیس عندك، أخرجه ابوداؤد وسکت عنه'' (اعلاء السنن ۱۴-۱۵۱)۔

(حکیم بن حزامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ایک آدمی مجھ سے ایک سامان خریدنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے، تو کہا کہ اس بنیاد پر میں سودا کر سکتا ہوں کہ بازار سے خرید کر اس کو دیدوں؟ آپ نے فرمایا: جو سامان تمہارے پاس نہیں ہے اس کا سودا مت کرو)۔

۲- اسی طرح مالک تو ہو، لیکن سپردگی پر قادر نہ ہو تو بھی حدیث شریف میں منع فرمایا گیا۔ ''کتاب الخراج'' میں امام ابویوسف نے روایت لکھی ہے:

''حدثنا یزید بن أبی زیاد عن المسیب بن رافع عن عبد الله بن مسعود أنه قال: لا تبیعوا السمك فی الماء، فإنه غرر.

قال أبو یوسف: حدثنا ابن أبی لیلی عن عامر الشعبی قال: نهی النبی ﷺ عن بیع الغرر'' (کتاب الخراج ص ۹۴/ ۹۵)۔

(ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے: پانی کے اندر مچھلی کا سودا نہ کرو، کیوں کہ یہ دھوکہ کا سودا ہے، امام ابویوسف نے امام شعبی کا ارشاد نقل کیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غرر ودھوکہ کی خرید وفروخت سے منع کیا ہے)، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: (فتح القدیر لابن ہمام ۶/ ۴۰۹، البحر الرائق ۶/ ۷۹، العنایہ للبابرتی ۶/ ۴۰۹)۔

علامہ شامی نے بھی اسی طرح تفصیلات فرمائی ہے کہ مچھلی جب گڈھے میں داخل ہو تو یا تو اس کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا ہوگا یا نہیں (۱) تو اس صورت میں وہ اس کا مالک ہوجائے گا اور کسی کو اس کے لینے کا حق نہ ہوگا، پھر اگر کسی حیلہ کے بغیر اس کا لینا ممکن ہو تو اس کو فروخت کرنا بھی درست ہوگا، کیوں کہ وہ مملوک بھی ہے اور مقدور التسلیم بھی، ورنہ درست نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کو حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

---

[1] جامعہ علوم القرآن، جمبوسر، گجرات۔

۲- دوسری صورت میں وہ اس کا مالک نہیں بنتا، لہذا بیع بھی جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ گڈھے میں مچھلی داخل ہونے کے بعد وہ اس کا راستہ بند کردے، اب وہ اس کا مالک ہوجائے گا، پھر اگر کسی دشواری کے بغیر اس کا لینا ممکن ہو تو بیع درست ہوگی ورنہ نہیں، اور اگر اس نے گڈھا تو خود نہیں بنایا لیکن مچھلی لیکر اس میں چھوڑ دی تو اب بھی وہ اس کا مالک قرار پائے گا اور اگر کسی دشواری کے بغیر اس کا لینا ممکن ہو تو بیع جائز ہوگی، اس لیے کہ اس کو حوالے کرنا ممکن ہے اور اگر حوالگی میں دشواری ہو تو اب بیع جائز نہ ہوگی، کیوں کہ وہ اس کی ملک میں تو ہے، لیکن اس کا حوالے کرنا ممکن نہیں ہے (رد المحتار ۴/۱۰۶)۔

مذکورہ بالا فقہی عبارات اور قواعد فقہیہ کے پیش نظر سوال میں مذکور خرید وفروخت مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہی ہوگی۔

البتہ بعض فقہاء کرام فساد بیع کی تقسیم کرتے ہیں کہ کبھی فساد حق شرعی کی وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ معاملہ گناہ پر مبنی ہے اور کبھی فساد حق شرع کی وجہ سے نہیں، بلکہ مفضی الی المنازعہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، ایسی شکل میں جب باہمی منازعت کا اندیشہ نہ ہو تو دیانۃً درست ہے، دیکھئے: (فیض الباری علی صحیح البخاری ۳/۲۵۸-۲۵۹)۔

بیع سمک کے سلسلہ میں بھی علت غرر ہی معلوم ہوتی ہے، جیسے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر بن الخطابؓ کی روایات میں صراحۃً مذکور ہے:

''لا تبايعوا السمك في الماء، فإنه غرر''۔

جواب ۲: ٹھیکہ دار کا فاسد طریقہ سے حاصل کی ہوئی مچھلیاں بیچنا۔

یہ بیع فاسد ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ وہ معقود علیہ میں ملکیت کا فائدہ صاحب ملک کی رضامندی کے بغیر نہیں دیتا ہے اور مبیع مشتری کے قبضہ میں قبضۂ ضمان کے ساتھ ہوتا ہے اگر اس کے قبضہ میں ہلاک ہوجائے تو مثل یا قیمت کا ضامن ہوتا ہے (الالتزامات ص ۱۸۴)۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

ثم إنه وإن أفاد الملك وهو مقصود في الجملة لكن لا ينعقد تمامه إذ لم ينقطع به حق البائع من المبيع ولا المشتري من الثمن إذ لكل منهما الفسخ بل يجب عليه (فتح القدیر ص ۴۰۱)۔

(اس صورت میں اگر چہ مالک کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور وہ فی الجملہ مقصود عین ہے، لیکن بیع تمام نہیں ہوگی، کیوں کہ خرید کردہ سامان سے بائع کا حق ختم نہیں ہوا اور مشتری کا ثمن سے، کیوں کہ ان میں سے ایک کو حق فسخ حاصل ہے بلکہ فسخ واجب ہے)۔

''ہدایہ'' میں ہے: ''وإذا قبض المشتري المبيع في البيع الفاسد بأمر البائع وفي العقد عوضان كل واحد منهما مال ملك المبيع ولزمته قيمته (ہدایہ ۳/۴۷)۔

(اور جب مشتری بیع فاسد میں مبیع پر قبضہ کرلے بائع کے حکم سے اور معاملہ میں دونوں عوض مال ہوں تو مشتری خرید کردہ سامان کا مالک ہوجائے گا اور اس پر قیمت لازم ہوگی)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب اس طرح کے جواب میں فرماتے ہیں: البتہ بغیر پکڑے اور قبضہ میں لائے فروخت کرنا ''بیع مالم یقبض'' ہوکر بیع فاسد ہوگی اور مملوک رہنے کی وجہ سے بیع باطل نہ ہوگی اور بیع فاسد ہونے کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اگر مالک کے قبضہ میں آئے بغیر فروخت ہوجائے اور مشتری پھر اس کو فروخت کرے اور مالک کو اعتراض نہیں تھا، بلکہ اجازت تھی تو یہ دوسری بیع جو ہوگی وہ صحیح اور ''سمک بیبع لہذا البیع'' کا استعمال کرنا درست رہے گا (نظام الفتاوی ۱/۲۴۴)۔

حاصل یہ کہ بیع فاسد کے سلسلہ میں اصول احناف کے پیش نظر بائع کی اجازت سے ٹھیکے دار مالک ہوجائے گا اور پھر اس کا دوسرے کو بیچنا اور دوسرے کا خریدنا بھی جائز ہوجائے گا۔

جواب ۳: حوض یا تالاب چاہے سرکاری ہوں یا کسی شخص کی ذاتی ملکیت والے ہوں ان کی مچھلیاں شکار کرنے سے پہلے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے حکم کی علت غرر اور غیر مقدور التسلیم ہونا ہے، لہذا سوال نمبر (۱) کی طرح ہی اس میں فساد کا حکم لگے گا۔

جواب ۴: نجی ملکیت کے حوض یا تالاب میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے از خود آگئی ہوں تو دیکھا جائے گا کہ اگر اس شخص نے یہ حوض یا تالاب اسی واسطے بنایا تھا تو وہ اس کا مالک ہوجائے گا اور کوئی اس کو لے نہیں سکتا پھر اس کے اندر کی مچھلیاں شکار کیے بغیر پکڑی جاسکے تو اس کی بیع جائز ہے، اور بغیر شکار کے پکڑی نہ جاسکے تو اس کی بیع جائز نہیں ہے (عالمگیری)۔

''عنایہ'' میں ہے: ''اس صورت میں ارشاد ہے کہ اگر حوض و تالاب کا مالک اس کا منہ بند کردے تو وہ مچھلیوں کا مالک ہوجائے گا اور محض اس کے اندر پہنچ جانے

کے آجانے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا، جیسے کسی کی زمین میں اگر کوئی پرندہ انڈا دے یا بچے تو زمین کا مالک اس کا مالک نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کی طرف سے احراز نہیں پایا گیا اس پر اس سے اشکال نہ کیا جائے کہ شہد کی مکھی اگر چھتہ لگائے تو زمین کا مالک محض اتصال کی وجہ سے مالک ہوجائے گا، اگر چہ اس کی طرف سے احراز وغیرہ نہ پایا جائے، کیوں کہ شہد کا اتصال زمین سے درخت کے مانند ہے جو اگنے کے بعد کہیں نہیں جاتا، مکھیاں چلی جاتی ہیں مگر شہد برقرار رہتا ہے، برخلاف پرندہ و مچھلی وغیرہ کہ ان کا آنا رہنا عارض ہوتا ہے مستقل و مستند نہیں ہوتا" (عنایہ مع الفتح ۶/۴۱۰، شرح ہدایہ ۳/۸۳)۔

لہٰذا صورت مسؤلہ میں مچھلیاں از خود آگئیں تو وہ احراز کی اور اسی نیت سے حوض بنانے کی وجہ سے مالک ہوجائے گا اور اس کے لیے فروخت کرنا جائز ہوگا، دوسرے کو ٹھیکہ پر دینے کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ ٹھیکہ پر دینے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ مجھے تالاب (بحیرہ) کے کرایہ پر دینے کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کتابوں میں تفتیش کی، لیکن سوائے "کتاب الخراج" (ابو یوسف) کے یہ مسئلہ کہیں نہیں مجھے ملا۔ "امام ابو یوسفؒ نے فرمایا:

"حدثنا عبد الله بن علي عن اسحاق بن عبدالله عن أبي الزناد قال: كتبت عمر بن الخطاب رضي الله عنه في بحيرة يجتمع فيها السمك بأرض العراق أن تؤجرها فكتب أن أفعلوا. قال: وحدثنا أبو حنيفة عن حماد قال طلبت إلى عبد الحميد بن عبد الرحمن فكتب إلى عمر بن عبد العزيز يسأله عن بيع صيد الآجام فكتب إليه عمر أنه لا بأس به، وسماه الحبس لكن بعد مدة رأيت في الإيضاح عدم جواز إجارته"۔

علامہ شامی "منحۃ الخالق" میں "النہر الفائق" کے حوالے سے (وکذا فی رد المحتار) ابن نجیمؒ کی عبارت پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ایضاح" کی عبارت قواعد فقہیہ سے زیادہ قریب ہے (جس میں عدم جواز کا قول ہے) علامہ رملی نے دونوں عبارتوں کے تضاد کو دور کرتے ہوئے فرمایا ہے: عدم جواز مطلق ہے، چاہے دریا نہر یا جھاڑی ہو اور چاہے بیت المال کی زمین ہو یا وقف کی ہو، اور امام ابو یوسف کا قول (جواز) بھی قواعد کے خلاف نہیں ہے، لیکن وہ مخصوص شکل اور معلوم منفعت کے لیے (شکار کے لیے) تھا، البتہ امام صاحب کی حضرت حماد سے جواز کی روایت کی تطبیق مشکل ہے، کیوں کہ وہ شکار سے پہلے مچھلی کی بیع کرنا ہے، اس کا جواب بھی یہ دیا گیا کہ وہ ایسی جھاڑی اور گنجان درختوں کے بارے میں ہے جو اسی مقصد کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ اور اس میں مچھلی کی سپردگی مقدور التسلیم تھی (منحۃ الخالق علی البحر ۶/۸۰)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس طرح کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

سوال: تالاب یا دریا ماہی گیروں کو دیدیا جاتا ہے اور دوسروں کو اس تالاب سے مچھلی پکڑنے نہیں دیتا ہے، یہ بیع باطل ہے- وفیہ بعد اسطر- بلکہ سب کو مچھلیاں پکڑنے کا شرعاً حق حاصل ہے، ازیں مسئلہ زیدی گوید کہ بدون اطلاع مالک تالاب خفیہ اگر تالاب سے مچھلیاں پکڑ لاوے تو کچھ گناہ نہیں ہوگا، کیوں کہ شرعاً اس میں سب کا حق ہے تو حضرت یہ قول زید کا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: زید کا قول صحیح ہے اور خفیہ مچھلی پکڑنا تالاب سے درست ہے، لیکن اگر مالک تالاب نے مچھلیاں کسی سے لاکر اپنے ہاتھ سے چھوڑی ہوں تو وہ مچھلیوں کا مالک ہوگا اور پھر خفیہ پکڑنا درست نہیں، لیکن بیع کرنا بدون پکڑے ہوئے پھر بھی درست نہیں (امداد الفتاوی ۳/۵۰)۔

اس مسئلہ پر سوال نمبر (۲) کے ضمن میں مزید کلام ہو چکا ہے۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت

مفتی شاہین جمالی [1]

سرکاری، نیم سرکاری، عوامی یا شخصی زمرہ ملکیت میں آنے والے سمندروں، دریاؤں، نہروں، نالوں اور تالاب، یا حوضوں میں پانی کے اندر مچھلی کی خرید و فروخت کے مسئلہ میں ذوالگ حیثیتوں سے شرعی نقطہ نظر دریافت کرنا ضروری ہے۔

۱-ان کو مخصوص مدت کے لیے ٹھیکہ یا اجارہ پر دینا۔ ۲-ان میں پائی جانے والی مچھلیوں کو پانی کے اندر ہی خرید وفروخت کرنا۔

پہلی صورت میں ان کے مخصوص حصوں یا گڈھوں کو مچھلی پالنے کے لیے ٹھیکہ یا اجارہ پر دینا چوں کہ پانی کے اجارہ کا معاملہ ہے، اس لیے اس کے جواز یا عدم جواز پر شرعی نقطہ نظر کی وضاحت مناسب ہے۔

اس سلسلہ میں عام فقہاء حنفیہ کا رجحان عدم جواز کا ہے، علامہ شامی، ابن نجیم حنفی، اور صاحب ''ہدایہ'' وغیرہ حضرات کے یہاں بھی یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

ابن نجیم نے لکھا ہے: ''میں نے ''کنز الدقائق'' کی شرح ''البحر الرائق'' کے ''کتاب البیوع'' کی تصنیف کے زمانہ (۹۶۸ھ) میں ''وقف یوسفی'' کے تحت واقع ''کوم الشمس'' کے علاقہ کے دریا کو مچھلیوں کے شکار کے لیے اس کے نگراں سے اجارہ پر حاصل کرنے کے جواز کے سلسلے میں اپنے پاس موجودہ کتابوں میں تحقیق وتلاش کی تو مجھے یہ مسئلہ نہیں ملا، البتہ صرف امام ابویوسف کی ''کتاب الخراج'' میں یہ روایت ملی:

''حدثنا عبد الله بن علي عن إسحق بن عبدالله عن أبي الزناد قال: كتبت إلى عمر بن الخطاب رضي الله عنه في بحيرةٍ يجتمع فيها السمك بأرض العراق أن يواجرها، فكتب إليّ أن افعلوا''۔

(ابوزناد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو سرزمین عراق کے دریا کے بارے میں جس میں مچھلیاں جمع ہوجاتی ہیں، لکھا کہ کیا اس کو اُجرت لیا جاسکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ ایسا کرو)۔

اس روایت سے بیت المال یا سرکاری وقف کی زمینوں میں (مچھلی پالنے کے لیے) اجارہ کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن ایک عرصہ کے بعد مجھے ''ایضاح'' میں اس کے اجارہ کے عدم جواز کی صراحت ملی۔

''لكن بعد مدة رأيت في الإيضاح عدم جواز إجارته'' (البحر الرائق ۶/ ۷۳)۔

صاحب ''النہر الفائق'' نے مصر کے چھوٹے گڑھوں کے بارے میں صاحب ''بحر الرائق'' کے مذکورہ بالا حوالہ سے عدم جواز اجارہ کا حکم لگایا ہے، اور پھر یہ صراحت کی ہے:

''وما في الإيضاح ألحق بقواعد الفقهيه'' (منحة الخالق علی ہامش بحر الرائق ۶/ ۷۲) (اور جو کچھ ایضاح میں ہے وہی قواعد فقہیہ سے قریب تر ہے)

لیکن علامہ خیر الدین الرملی نے اس کے جواز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحب ''النہر الفائق'' سے اختلاف کیا ہے۔

''وما تقدم عن كتاب الخراج غير بعيد أيضًا عن القواعد الفقهية ومرجعه إلى إجارة موضع مخصوص لمنفعة معلومة هي الاصطياد'' (منحۃ الخالق علی ہامش بحر الرائق ۶/ ۷۲)۔

اور ''کتاب الخراج'' کے حوالہ سے جو بات (جواز اجارہ) کی پہلے کہی گئی ہے وہ بھی قواعد فقہیہ سے بعید نہیں ہے اور اس کا مدار کسی مخصوص جگہ کو معلوم نفع کے لیے کرایہ پر دینا ہے، اور وہ ہے مچھلی کا شکار۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ علامہ شامی نے ''منحۃ الخالق علی بحر الرائق'' کے حاشیہ میں خیر رملی کے اس قول پر کوئی تنقید نہیں کی، گویا یہاں جواز اجارہ کے قول کو قابل قبول تصور کیا اور ''رد المحتار علی در المختار'' میں اس پر تنقید کرتے ہوئے یہ لکھا:

''لكن قوله غير بعيد الخ فيه نظر، لأن الإجارة واقعة على استهلاك العين وسيأتي التصريح، فإنه لا يصح إجارة

[1] شیخ الحدیث دار العلوم صدر بازار میرٹھ۔

المراعی. وهذا كذلك لذا المقدسی لعدم الصحة واعترض البحر بما قلنا ـــ والله اعلم'' (شامی ۴/ ۱۰۷)۔

مگر خیر رملی کے قول ''غیر بعید'' میں اشکال ہے، کیوں کہ اجارہ مادی محسوس چیز کو ختم کرنے پر ہوا ہے اور عنقریب یہ صراحت آرہی ہے کہ مراعی (چراگاہ میں گھاس چرانے) کا اجارہ صحیح نہیں ہے، اور یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے، اسی واسطے مقدسی نے عدم صحت کا یقین ظاہر کیا ہے اور صاحب ''بحر'' نے اس کے جواز پر اعتراض کیا ہے، جیسا کہ ہم نے بھی کہا ہے۔

علامہ شامی کا اعتراض اور جواب:

شامی کے اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ چراگاہ کی گھاس کا اجارہ اس لیے درست نہیں کہ اس میں عین مباح (گھاس) کو ختم کرنے پر اجارہ ہو رہا ہے، جبکہ عین مملوک مثلاً (گائے کو دودھ پینے کے لیے اجرت پر لینے کی شکل میں) دودھ کا اجارہ صحیح نہیں ہے تو عین مباح (گھاس) کا اجارہ بدرجہ اولی جائز نہیں ہوگا۔

''أما الإجاره فلأنها عقدت على استهلال عين مباح ولو عقدت على الاستهلاك عين مملوك بأن استاجر بقرةً يشرب لبنها لا يجوز فهذا أولى'' (ہدایہ ۳/ ۵۴)۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عقد اجارہ میں صراحت کا تعلق عین سے حاصل ہونے والے منافع سے ہوتا ہے، نہ کہ خود عین (محسوس شئ) سے، ''لأن المستحق لعقد الإجارة على الأجر المنافع لا الأعيان'' (کفایہ علی ہامش فتح القدیر ۵/ ۱۹۸)، کیوں کہ عقد اجارہ سے جس چیز کا وہ مستحق ہوا ہے وہ منافع ہے، نہ کہ عین شئ کا۔

''شامی'' کے نزدیک ہو بہو یہی صورت ندی، نالوں اور نہروں کے اجارہ کی ہے کہ اسکندریہ میں متاجران کے پانی کا مالک بن جاتا ہے، جبکہ عقد اجارہ سے اس کو صرف پانی کے منافع کا مستحق ہونا چاہیے، بنابریں ندی، نالوں اور نہروں کا اجارہ درست نہیں، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ندی، نہروں کے اجارہ یا ٹھیکے میں سرکار یا شخص پانی کو ٹھیکے پر نہیں دیتے، بلکہ اس کے پورے رقبہ کو پانی کے ساتھ ٹھیکے پر دیتے ہیں، اور ٹھیکہ دار کا مقصود پانی کا ٹھیکہ لینا نہیں ہوتا، بلکہ مچھلی کی پرورش ہوتا ہے اور فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ جہاں عین ہی نفع کے حصول کا ذریعہ ہو، جس کے لیے عقد اجارہ ہوا ہے تو وہاں عین کا اجارہ درست ہے:

''إلا إذا كانت الأعيان آلة لإقامة العمل المستحق بالإجارة، كالصبغ فی استيجار الصباغ، واللبن فی الاستيجار الظئر لكونه آلة للحضانة والظئورة'' (کفایہ علی ہامش فتح القدیر ۵/ ۱۹۸)۔

(مگر (اس وقت عین کا اجارہ بھی جائز ہے) جب اعیان (مادی محسوس شئ) اس عمل کو قائم کرنے کا آلہ ہو جس کا متاجر عقد اجارہ سے مستحق ہوا ہو، جیسے رنگ رنگریز کو اجارہ پر لینے کی شکل میں، یا جیسے دودھ دایہ کو اجارہ پر لینے کی صورت میں، کیوں کہ دودھ یہاں بچے کی پرورش اور دایہ بننے کا آلہ اور ذریعہ ہے)۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ندی، نہروں کو اجارہ پر لینے کی شکل میں بھی پانی مچھلی کی پرورش اور اس کے شکار کی منفعت کے حصول کا آلہ اور ذریعہ ہے، لہذا ٹھیکہ داران کو ٹھیکہ پر لینے کے بعد مچھلی کے شکار کے واسطے سے تبعاً پانی کا مالک ہو جائے گا۔

اور اس طرح اس کا عقد اجارہ درست قرار پائے گا، اور امام ابویوسفؒ کی ''کتاب الخراج'' کی روایت اور علامہ رملی کی صراحت کے مطابق شکار کی منفعت معلومہ کے لیے موضع مخصوص کی اجارہ داری قواعد فقہیہ کے قریب تر ہو جائے گی۔

جواز اجارہ کی دوسری دلیل:

مذکورہ بالا صورت مسئلہ میں جواز اجارہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جہاں قواعد فقہیہ کے بالمقابل کوئی حدیث (مرفوع یا ماثور) موجود ہو تو وہاں قواعد فقہیہ کے برخلاف استحسان پر عمل درست ہوتا ہے۔

چنانچہ مغرب کی نماز کے بعد جس مسبوق کی دو رکعتیں چھوٹ گئی ہوں ان کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد حسب قواعد فقہیہ اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ ایک رکعت پڑھ کر قعدہ کرے پھر کھڑا ہو کر دوسری رکعت ادا کر کے قعدہ اخیرہ پر سلام پھر لے، لیکن مسبوق اگر دونوں رکعتیں ادا کر کے ایک ہی قعدہ اخیرہ کر کے نماز پوری کرے تو اس پر سجدہ سہو اور نماز کا اعادہ اس لیے واجب نہیں کہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں اس صورت کا جواز منقول ہے (مجمع الزوائد ۱/ ۱۷۶)۔

شیخ ابراہیم حلبی لکھتے ہیں:

''ويقعد فی أولها؛ لأنها ثنائية ولو لم يقعد جاز استحسانًا لا قياسًا ولم يلزم سجود السهو'' (غنیۃ المستملی / ۵۵۷)۔

اس کو ان دونوں میں پہلی رکعت پر قاعدہ کرنا چاہیے، کیوں کہ مسبوق کی یہی دوسری رکعت ہے، لیکن اگر اس نے قعدہ نہیں کیا تب بھی خلاف قیاس استحسانا جائز ہے، سجدہ سہو لازم نہیں۔

صاحب ''غنیۃ'' کا یہی قول خود علامہ شامی نے بھی نقل کیا ہے اور اس پر کوئی تنقید نہیں کی (شامی ۱/ ۵۵۸)۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

''وقول الفقيه من الصحابة رضي الله تعالى عنهم مقدم على القياس'' (المبسوط ۱۰/۱۲۹) (فقیہ صحابیؓ کا قول قیاس پر مقدم ہے)۔

پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت:

دوسرا مسئلہ ندی، نالوں اور نہروں کے پانی میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کا ہے جس کی شرعی حیثیت معلوم کرنا ضروری ہے۔

پانی کے اندر مچھلیوں کی موجودگی کی چند صورتیں ہیں اور فقہاء نے ان کی موجودگی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے مختلف احکام صادر فرمائے ہیں۔

۱- ندی، نالوں، اور نہروں میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ مچھلیاں آتی جاتی رہتی ہوں، یا ایسے برساتی تالاب یا گڑھے میں ہوں جن کا راستہ سیلاب اور بارش کے پانی کے لیے کھلا ہوا ہو اور اسی راستے مچھلیاں ان میں از خود جمع ہوگئی ہوں اور مچھلیوں کو روکنے کے لیے جائے دخول پر کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی گئی ہو، خواہ وہ تالاب کسی شخص کے ذاتی ملک میں ہو اور خواہ انہیں بلا حیلہ پکڑنا بھی ممکن ہو ان صورتوں میں فقہاء کے نزدیک عدم ملک اور بیع معدوم یا بیع غرر (دھوکہ) ہونے کے سبب سے مچھلیوں کی خرید وفروخت باطل ہے۔

امام احمد نے مرفوعاً روایت کی ہے:

''لا تشتروا السمك في الماء. فإنه غرر'' (بحر الرائق ۶/۷۳)۔ (پانی میں مچھلی مت خریدو، اس لیے کہ وہ دھوکہ ہے)۔

۲- خاص طور پر مچھلی کی پرورش کے لیے بنائے گئے حوض یا تالاب میں مچھلیوں کو ڈالا گیا ہو یا ان میں بلا کسی تدبیر کے مچھلیاں خود ہی جمع ہوگئی ہوں، مگر ان کو بلا کسی حیلہ کے پکڑنا ممکن نہ ہو تو صاحب حوض بالا جماع اگر چہ اس کا مالک ہو جائے گا، لیکن غیر مقدور التسلیم ہونے کی بنا پر خرید وفروخت کا معاملہ فاسد ہوگا۔

۳- کسی افتادہ زمین کے حوض یا تالاب میں جس پر کسی کی ملکیت نہ ہو کسی شخص نے مچھلیاں ڈالی ہوں یا ان میں از خود جمع ہوگئی ہوں، لیکن اس نے ان کو روکنے کے لیے یا ان میں مچھلیوں کو جمع کرنے کے لیے کوئی حیلہ کیا ہو تو ایسی صورت میں وہ شخص ان کا مالک ہو جائے گا، لیکن بلا حیلہ پکڑنا ممکن نہ ہو تو اس کی فروختگی غیر مقدور التسلیم ہونے کی بنا پر فاسد ہوگی۔

۴- کسی شخص نے اپنی زمین میں کوئی چھوٹا گڑھا یا کنواں کھود کر ان میں مچھلیوں کو ڈالا ہو یا بڑے تالاب میں چلمن کے اندر مچھلیوں کو محبوس کر رکھا ہو اور انہیں شکاری حیلے کے بغیر پکڑ سکتا ہو تو وہ شخص ان کا مالک قرار پائے گا اور مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ان کی بیع بھی جائز ہوگی (البحر الرائق ۶/ ۷۳، فتح القدیر ۵/ ۱۹۱، رد المحتار ۴/ ۱۰۶)۔

فقہاء کی تصریحات کے مطابق ان ساری تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ معدوم یا بیع غرر یا غیر مقدور التسلیم ہونے کے سبب باطل یا فاسد ہیں اور چوتھی صورت میں اگر چہ عام فقہاء کے نزدیک بیع جائز ہے، لیکن علامہ ابن ہمام کے مطابق بیع مکروہ ہے۔

''فكان الصواب عندنا في قول من كرهه'' (فتح القدیر ۵/ ۱۹۱)۔

مگر دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ صورت حال میں کیا فقہاء متقدمین کے قول پر عدم جواز کا ہی فتوی دیا جائے گا؟ یا حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر جواز بیع کی گنجائش پیدا کرنا مناسب ہوگا۔

مذکورہ بالا احکام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم جواز کی علت عدم ملک یا بیع غرر یا معدوم کی بیع یا بیع غیر مقدور التسلیم ہونا ہے، اور ان سب علتوں کا حاصل یہ ہے کہ مبیع اپنے اوصاف اور وجود کے اعتبار سے نامعلوم اور مجہول ہے اور ان سب کا جامع غرر ہے اور ضابطۂ شرعی کے مطابق مجہول ومغرور کی بیع ناجائز ہونی چاہیے۔

پانی میں مچھلی کی بیع کے جواز کے دلائل:

پہلی دلیل:

لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو ایسی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن میں بیع مجہول ہونے کے باوجود فقہاء نے عام لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر جواز کا فتوی دیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ کافی وشافی بحث علامہ طیبیؒ نے اپنی شرح ''مشکوۃ'' میں حضرت ابوہریرۃؓ کی اس حدیث مرفوع:

''عن أبي هريرة قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر وبيع الحصاة'' (مشکوۃ المصابیح ۱/ ۱۴۷)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر اور کنکری پھینکنے والی بیع سے منع کیا ہے) کے ذیل میں فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

بیع غرر سے ممانعت ''کتاب البیوع'' کے اصولوں میں عظیم ترین اصل ہے اور اس میں بہت سارے بے شمار مسائل داخل ہیں، جیسے معدوم ومجہول کی بیع، اور وہ بیع جس میں مبیع کی سپردگی پر قدرت نہ ہو، یا جس بیع پر بائع کی ملکیت مکمل نہ ہو اور اسی قسم کے مسائل جن میں غرر بلا حاجت لازم آتا ہو۔

اور علماء نے غرر حقیر کے جواز پر اجماع کیا ہے، مثلاً روئی سے بھری ہوئی بنڈی کی بیع جائز ہے اور صرف اس کے اندر کے بھراؤ کو بیچنا جائز نہیں اور گھر اور جانور اور کپڑے کو ایک مہینے کی اجرت پر بیچنے کے جواز پر بھی علماء نے اجماع کیا ہے، حالاں کہ مہینہ کبھی تیس دن اور کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے، اسی طرح حمام (غسل خانہ) میں اجرت پر داخل ہونے کے جواز پر علماء کا اجماع ہے، باوجودیکہ پانی بہانے اور ان میں ٹھہرنے کی مقدار پر لوگوں کی عادتیں مختلف ہیں اور پانی کی سبیل سے معاوضہ دے کر پینے کے جواز پر علماء کا اجماع ہے، حالاں کہ پینے کی مقدار مجہول ہے اور پینے والوں کی عادتیں مختلف ہوتی ہیں (نفع قوت المغتذی حاشیہ ترمذی لجلال الدین السیوطی ۱/ ۱۴۷)۔

دوسری دلیل:

خلاصہ تحریر یہ ہے:

بیع کے باطل ہونے کا دارومدار غرر بلا ضرورت پر ہے، ورنہ اگر غرر کے باوجود اس کے ارتکاب کی حاجت ہو اور اس سے بلا مشقت بچنا ممکن نہ ہو یا غرر معمولی ہو تو بیع جائز ہوگی، اس مسئلہ میں جواز بیع کی ایک اور دلیل ''تعامل ناس'' بھی ہے، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

''وتقابل الناس من غير نكير أصل من الأصول كبير لقوله صلى الله عليه وسلم: ما رآه المسلمون حسنًا فهو عند الله حسن، وقال صلى الله عليه وسلم: لا تجتمع أمتي على ضلال وهو نظير دخول الحمام بأجرته جائز لتعامل الناس، وإن كان مقدار المكث وما يصيب من الماء مجهولا، وكذلك شرب الماء من السقاء بفلس والحجامة بأجرة جائز لتعامل الناس'' (المبسوط ۱۰/ ۱۴۹)۔

(اور بلا نکیر لوگوں کا تعامل ایک بہت بڑا اصول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی وجہ سے کہ جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ عند اللہ بھی اچھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، اور وہ نظیر ہے اجرت پر حمام میں داخل ہونے کی کہ یہ تعامل ناس کی وجہ سے جائز ہے، اگرچہ اس میں ٹھہرنے اور پانی بہانے کی مقدار مجہول ہے، اسی طرح سبیل سے پانی پینا پیسوں کی اجرت پر اور حجامت بنوانا اجرت پر جائز ہے تعامل ناس کی وجہ سے۔

ایک فقہی نظیر:

غرر حقیر کی بنیاد پر جواز بیع کی دوسری مثال سنار کی راکھ کی بیع ہے جس میں خریدار کا مقصود راکھ لینا نہیں، بلکہ اس موجود سونے چاندی کے ذرات کو حاصل کرنا ہے، جس کی مقدار مجہول ہوتی ہے، دیکھئے: (فتاوی قاضی ۲/ ۳۵۸)۔

ایک اور نظیر:

اس مسئلے کی دوسری نظیر اخبارات ورسائل کی سالانہ خریداری اور لائف ممبری بھی ہے، جبکہ ان کے صفحات کی تعداد ان کے سائز، کاغذ کی کوالٹی، نیز مضامین خبریں جو خریدار کی مطلوبہ صفحات سے تعلق رکھتی ہیں ان کے سالانہ مخصوص نمبرات کی تعداد اور ایام تعطیل میں ان کی عدم اشاعت ساری چیزیں مجہول ہوتی ہیں

اس کے باوجود جواز کا فتوی دیا جاتا ہے۔

مفتی عبدالرحیم صاحب (فتاوی رحیمیہ ۱/ ۸۰) میں تحریر فرماتے ہیں: اخبارات اور ماہناموں کی خریداری جائز ہے اس قسم کی جہالت ''مفضی إلی النزاع'' نہیں ہے، مفسد بیع وہ جہالت ہے جو ''مفضی إلی النزاع'' ہو (فیض الباری علی صحیح البخاری ۳/ ۲۵۹)۔

''وما كل جهالة لا تفسد البيع، فإن كثيرًا من الأمرر يترك مهلا في البيع و اشتراط الاستقصاء ضرر، ولكن المفسد هو المفضي إلى المنازعة'' (حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۳۲۵)۔

ہر جہالت بیع کو فاسد نہیں کرتی، کیوں کہ بہت سے امور بیع میں مہمل چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور ایک ایک چیز کو جاننے کی شرط لگانے میں ضرر ہے، البتہ جو جہالت جھگڑے کی طرف پہنچائے وہ مفسد بیع ہے۔

جہالت غیر مقدور التسلیم:

رہ گئی پانی میں موجود مچھلی کے غیر مقدور التسلیم ہونے کی بحث تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی چیز کے غیر مقدور التسلیم ہونے کی دو صورتیں ہیں:

۱- غیر مقدو التسلیم حقیقۃً ۲- غیر مقدو التسلیم حکمًا

ان میں بیع کے صحیح ہونے کی شرط دوسری قسم ہے، نہ کہ پہلی، یہی وجہ ہے کہ مجلس عقد میں مبیع کو حاضر کرنا بیع کے شرائط جواز میں سے نہیں ہے، اور فقہاء میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں، چنانچہ بھاگے ہوئے غلام کی بیع کو جن فقہاء نے سپردگی کی قدرت نہ ہونے کی بنیاد پر ناجائز قرار دیا ہے، اس پر علامہ شامیؒ نے بعض فضلاء کے اس اعتراض کو ہی حق بجانب قرار دیا ہے:

''قلت هو وجيه فهو نظير بيع العبد المرسل في حاجة المولى، فإنه يجوز وعللوه بأنه معذور التسليم وقت العقد حكما، إذ الظاهر عوده'' (منحۃ الخالق علی ہامش بحر الرائق ۶/ ۷۴)۔

(بعض فضلاء نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ بیع کے فوراً بعد مبیع کی سپردگی کی قدرت سے مراد اگر قدرت حقیقیہ ہو تو یہ ممنوع ہے، ورنہ تو بات یہ ہے کہ مجلس عقد میں حضور مبیع کی شرط نہیں لگائی جاتی اور نہ کوئی اس کا قائل ہے)۔

اور اگر سپردگی کی قدرت سے مراد حکما سپردگی کی قدرت ہو، جیسا کہ خود مؤلف ''نہر الفائق'' نے اس کے بعد ذکر کیا ہے تو زیر بحث مسئلہ میں بھی ایسا ہی ہے غلام کے عادۃً واپس آجانے کی وجہ سے۔

میں (ابن عابدین شامی) کہتا ہوں کہ یہی بات راجح ہے اور اس کی نظیر آقا کے کام بھیجا ہوا غلام ہے جس کی بیع جائز ہے، اور علماء نے اس کی علت یہ قرار دی ہے کہ بوقت عقد حکمًا مقدور التسلیم ہے، کیوں کہ ظاہر یہی ہے کہ وہ لوٹ آئے گا)۔

جواز بیع کی وجہ:

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں موجودہ دور کے ماہی گیر کے ترقی یافتہ وسائل، ذرائع مثلاً مچھلیوں کے بیج اور پانی کی بیرونی، درمیانی اور اندرونی سطحوں میں اس کی پرورش اور بڑے سے بڑے تالاب اور ندی نالوں پر جالوں کے پھیلاؤ اور دواؤں کے ذریعہ مچھلی کے شکار کی سہولیات پر غور کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کے دور میں پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت حکمًا مقدور التسلیم ہونے کی بنا پر جائز ہے۔

جہاں تک غرر کے سوال کا تعلق ہے تو اس میں بھی موجودہ دریافتیں اور اس کاروبار سے وابستہ لوگوں کے تجربات کی روشنی میں پانی کے مخصوص حصوں میں مچھلیوں کی پیداوار کے تقریباً صحیح تخمینہ کے پیش نظر ''بيع السمك في الماء'' بیع الغرر نہیں رہ گیا ہے۔

بلکہ یہ غرر حقیر یا معمولی جہالت کے درجہ کی چیز بن گئی ہے، اس لئے علی الاطلاق اس کے جواز کا فتوی دیا جانا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اور اگر اسے غرر وجہالت کثیرہ ہی ثابت کیا جائے تب بھی انسانوں کی ۹۰ / فیصدی غذائی ضرورت کی کفالت میں مچھلی کی تجارت کا جو اہم رول ہے، اسے دیکھتے ہوئے علامہ طیبیؒ کے قول پر ہی فتوی دیا جانا موجودہ حالات کا تقاضہ ہے۔

''وإن دعت حاجة إلى ارتكابه ولا يمكن الاحتراز عنه إلا بمشقة أو كان الغرر حقيرا جاز البيع''۔

(اگر حاجت غرر کے ارتکاب کی داعی ہو، یا اسے بچنا مشقت کے بغیر ممکن نہ ہو، یا غرر حقیر ہو تو بیع جائز ہے)۔

اور یہ واقعہ ہے کہ عصر حاضر میں پانی میں مچھلیوں کی تجارت کے تعامل اور غذائی حاجت اور اس سے پرہیز کی صورت میں لوگوں کے مشقت میں مبتلا ہونے اور موجودہ وسائل ماہی گیری کے اعتبار سے اس میں غرر حقیر پائے جانے کے اسباب کی بنیاد پر بیع کے جواز کا فتوی دینا ضروری ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ لاکھوں مسلمان اس ذریعہ معاش سے جڑے ہوئے ہیں، بیع کو ناجائز قرار دے کر انہیں روزی روٹی سے محروم کر کے ضرر شدید میں مبتلا کرنا ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ''إنما بعثتم میسرین ولن تبعثوا معسرین'' (ترمذی شریف ۱/۲۱)۔

(تم آسانیاں پیدا کرنے کے لیے اٹھائے گئے ہو، سختیاں پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے ہو) کے خلاف ہے، اگر فقہاء متاخرین کے سامنے موجودہ دور کے جدید حالات ہوتے تو ان حالات میں وہ بھی جواز کا ہی فتوی دیتے۔

پھر جواز بیع کا یہ فتوی بالکل بے اصل بھی نہیں ہے، بلکہ اس کی بہت حد تک تائید حضرت عمر بن عبد العزیز اور قاضی ابو یوسف کے فتووں سے ہوتی ہے۔

''قال أبو یوسف فی کتاب الخراج أرخص فی بیع السمك فی الأجام أقوام'' (فتح القدیر ۵/۱۹۱)۔

(امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں فرمایا کہ پانی کی جھاڑی میں مچھلی کی بیع کے سلسلے میں کچھ لوگوں نے رخصت دی ہے)۔

''قال وحدثنا أبوحنیفة عن حماد قال: طلبت إلی عبد الحمید بن عبد الرحمن، فکتب إلی عمر بن عبد العزیز یسألہ عن بیع صید الأجام، فکتب إلیه عمر أنه لا بأس به وسمّاہ الحبس'' (البحر الرائق ۶/۷۳)۔

(امام ابو یوسف نے فرمایا کہ مجھ سے امام ابوحنیفہ نے بیان کیا اور انہوں نے حماد سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا: مجھے عبد الحمید بن عبد الرحمن کے پاس طلب کیا گیا، انہوں نے چلمنوں میں مچھلی کے شکار سے متعلق مسئلہ دریافت کرتے ہوئے عمر ابن عبد العزیز کو خط لکھا تو انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کو حبس قرار دیا)۔

اسی طرح علامہ خیر الدین رملی نے مچھلی کے شکار سے منفعت مخصوصہ کے حصول کی بنا پر اجارہ کے جواز کا جو رجحان ظاہر فرمایا ہے وہی آج کے دور میں پہلے سے زیادہ راجح ہونا چاہیے، دیکھئے: (منحۃ الخالق علی ہامش بحر الرائق ۶/۷۳)۔

مفتی نظام الدین صاحب (مفتی دار العلوم دیوبند) نے ایک استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا:

ظاہر ہے کہ دریائی مچھلیوں کا یہ ٹھیکہ (بمعنی بیع وشراء) ہوتا ہے اور اس کی حقیقت شرعیہ یہ ہوتی ہے کہ بوقت ٹھیکہ بھی دریا میں مچھلیاں موجود ہوتی ہیں اور پکڑی بھی جاتی ہیں اور اگرچہ ان کی مقدار معلوم نہیں ہوتی، اس لیے اس معاملہ بیع کو معدوم کی بیع کہہ کر باطل نہیں کہہ سکتے، بلکہ بیع غیر مقبوض یا بیع موجود غیر معلوم المقدار کہہ سکتے ہیں اور ایسی بیع فاسد ہوتی ہے، اور اس کا اقالہ (ختم کرنا) واجب ہوتا ہے، اگر اقالہ نہ کرے، بلکہ بیع صحیح کر دی جائے تو بیع صحیح ہو جاتی ہے اور اس کا مالک بملک صحیح ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

''فإن باعه المشتری نفذ بیعه، لأنه ملکه فملك التصرف فیه'' (ہدایہ مع الفتح والعنایہ ۵/۲۳۲)۔

اس لیے اگر مسلمان بھی اس طرح ٹھیکہ لے کر اور خود مچھلیاں پکڑ کر یا اپنے مزدوروں سے پکڑوا کر فروخت کر دے تو اس کی یہ بیع بلاشبہ صحیح و نافذ ہو جاتی ہے، لیکن مسلمان ترک اقالہ کرنے سے مبتلائے معصیت ہوگا، اس لیے مسلمان کے لیے اعلی بات یہ ہوگی کہ چوں کہ غیر مسلم ان جزئیات کا مخاطب نہیں ہوتا ہے، اس لیے کسی غیر مسلم سے کہے کہ تم اپنے نام سے خرید لو پھر میں تم سے خرید لوں گا پھر جب وہ مسلم خریدے تو اس سے یہ مسلمان خرید کر ان مچھلیوں کو خود پکڑ کر یا اپنے مزدوروں سے پکڑوا کر فروخت کرے، تو بلاشبہ یہ بیع وشراء ہر طرح درست وصحیح رہے گی (فتاوی نظامیہ اوندرویہ ۱/۲۱۰)۔

میں اس مسئلہ میں حضرت مفتی صاحب سے صرف اتنا اختلاف کرنے کی جرأت کروں گا کہ میرے نقطہ نظر سے یہ مسئلہ بیع فاسد کے زمرے میں نہیں آتا، جیسا کہ دلائل کے ساتھ اوپر نقل کیا جا چکا ہے تو اس کے واجب الاقالہ ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری گورنمنٹ اگرچہ ویلفیر اسٹیٹ کے درجہ میں ہے تاہم قانون سازی کے معاملہ میں خالص کافرانہ مزاج رکھتی ہے، لہذا اس سے مسلمانوں کا ٹھیکہ لینا براہ راست درست ہے، بالواسطہ طور پر کسی غیر مسلم کو ٹھیکہ دلوا کر پھر اس سے ٹھیکہ لینے کے حیلے کو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصۂ بحث:

اب تک کی پوری بحث کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلے سے متعلق سوالات کے جوابات یہ ہیں:

۱- سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء ان مچھلیوں کو پانی سے نکالے بغیر غذائی ضرورت وحاجت اور اس سے احتراز کی صورت میں مشقت میں مبتلا ہونے اور وسائل ماہی گیری کے اعتبار سے مقدور التسلیم حکمًا ہونے کی وجوہات کی بنا پر جائز ودرست ہے اور آج کے دور میں اسی پر فتوی دیا جانا چاہیے۔

۲- ٹھیکہ دار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان کا ایسی مچھلی کو خریدنا جائز ہے۔

۳- مذکورہ بالا دلائل کی روشنی مین جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے جو مچھلیوں کے لیے ہی کھدوائے گئے ہوں اگر وہ شخص اس میں باقاعدہ مچھلیاں پال کر اس حوض یا تالاب کی تمام مچھلیاں شکار کرنے سے پہلے کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تاکہ وہ دوسرا شخص ایک خاص مدت میں اس حوض یا تالاب کی مچھلیاں نکال کر فروخت کرے تو ایس کرنا شرعًا درست اور جائز ہے۔

۴- کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو یا عوامی ملکیت کا جو مچھلیوں کی پرورش کی غرض سے تیار نہیں کرائے گئے، بلکہ مملوکہ زمین میں پائے گئے اس میں جو مچھلیاں بارش کی وجہ سے از خود آگئی ہیں، انہیں ٹھیکہ پر کسی دوسرے کو دینا درست ہے، اور ٹھیکہ دار کو اس کی مچھلیاں فروخت کرنا بھی جائز ہے، لیکن خود اس شخص یا عوام کو جن کی ملکیت میں یہ حوض یا تالاب واقع ہے، دوسرے کے ہاتھ مچھلیاں فروخت کرنا جائز نہیں ہے (غالبًا مقالہ نگار کی از خود مچھلیاں فروخت کرنے کی ممانعت سے مراد ٹھیکہ پر دینے کے بعد ہے، محقق ۱۲)۔

برساتی مچھلیاں اس کی ملک نہیں ہیں تاہم اگر اس نے تالاب یا حوض میں پانی کے ساتھ مچھلیوں کے داخل ہونے کی جگہ پر کوئی روک لگا دی ہو، جیسا کہ عام طور پر چلمن کھڑا کرنے کا رواج ہے یا مچھلیوں کو تالاب میں داخل کرنے کی کوئی تدبیر اختیار کی ہو یا مچھلیوں کے بیج خرید کر ڈال دیئے ہوں تو ان صورتوں میں وہ مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا، اور دوسروں کے ہاتھ ان کو فروخت کرنے کی شرعًا اجازت ہوگی۔

☆☆☆

تالاب سے بغیر نکالے مچھلیوں کی خرید وفروخت

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی [1]

۱- تالاب اور حوض میں موجود مچھلیوں کا مالک کون:

اس سلسلہ میں کتب فقہیہ میں یہ تفصیل موجود ہے کہ اگر تالاب اور حوض کسی کے ذاتی ملک ہیں اور مالک نے ان کو مچھلیوں کے پالنے ہی کیلیے تیار کر رکھا ہے اور مچھلیاں ان میں ندی، نالے وغیرہ سے آگئیں، یا مچھلیوں کے پالنے کے لیے تیار نہیں کیا، لیکن الگ سے مچھلیاں لاکر ڈال دیں یا مچھلیاں باہر سے آئیں اور اس نے کوئی ایسی تدبیر کی جس سے مچھلیاں باہر نہ نکل سکیں، مثلاً تالاب یا حوض کا منہ بند کردیا تو ان تمام صورتوں میں وہ مچھلیوں کا مالک ہوجائے گا، اور اگر مالک نے نہ تو ان کو مچھلیوں کے پالنے کے لیے تیار کیا ہے، نہ الگ سے مچھلیاں ڈالی ہے، اور نہ ہی مچھلیوں کے آنے کے بعد ان کا منہ بند کیا ہے اور مچھلیاں کہیں سے آگئیں تو محض تالاب یا حوض کے مالک ہونے کی وجہ سے مچھلیوں کا مالک نہیں ہوگا، بلکہ جو بھی شکار کرکے مچھلیوں پر قبضہ کرلے وہ ان مچھلیوں کا مالک ہوجائے گا، اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر کسی زمین میں کوئی پرندہ بچہ یا انڈا دے دے تو مالک زمین کے مالک ہونے کی وجہ سے اس بچہ یا انڈا کا مالک نہیں ہوگا، بلکہ جو بھی اس بچہ یا انڈا کو اٹھالے وہی مالک ہوگا، اسی طرح اگر مجلس میں چھوہارا لٹایا جائے اور کسی کی گود میں آکر گرجائے تو وہ اس چھوہارے کا مالک نہیں ہوگا، یا کسی نے جال خشک کرنے کیلیے پھیلا رکھا ہے اور اس میں کوئی شکار پھنس جائے تو وہ اس کا مالک نہیں ہوگا، البتہ اگر دامن چھوہارے اور جال شکار ہی کے لیے پھیلایا ہے تو اس صورت میں وہ چھوہارے اور شکار کا مالک ہوجائے گا۔ علامہ شامی نے ''فتح القدیر'' کے حوالہ سے اس کی تفصیل لکھی ہے، (دیکھئے: ردالمحتار ۴/ ۱۰۶، تبیین الحقائق ۴/ ۴۶، بحر الرائق ۶/ ۷۹)۔

۲- سرکاری تالابوں اور ندیوں میں موجود مچھلیوں کا مالک کون؟

مذکورہ بالا تفصیل سے سرکاری تالابوں اور ندیوں کے اندر موجود مچھلیوں کا حکم بھی معلوم ہوگیا ہے کہ اگر چہ وہ تالاب اور ندیاں سرکاری ملک ہیں، لیکن چوں کہ سرکار نہ تو ان تالابوں اور ندیوں کو مچھلیوں کی نشوونما کے لیے تیار کر رکھا ہے، نہ الگ سے ان میں مچھلیاں ڈالتی ہے اور نہ ہی مچھلیوں کے آنے کے بعد ان کے نہ نکلنے کی کوئی تدبیر کرتی ہے، لہذا ان سرکاری تالابوں اور ندیوں میں موجود مچھلیوں کی مالک سرکار نہیں ہے، وہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں جو بھی شکار کرلے ان مچھلیوں کا مالک ہوگا، یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ان سے مچھلیوں کا شکار کیا جاتا ہے اور سرکار کی جانب سے کوئی ممانعت نہیں ہوتی ہے۔

۳- تالاب یا ندیوں کو ٹھیکہ پر دینا:

ایک بحث قابل ذکر یہ ہے کہ تالاب، خواہ سرکاری ہوں یا نجی، اسی طرح ندیاں ان کو اجارہ اور ٹھیکہ پر دینا درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ تالاب اور ندیوں کو اجارہ اور ٹھیکہ پر دینے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ان کو اس مقصد کے لیے اجارہ پر دیا جائے تا کہ اجارہ پر لینے والا شخص ان میں موجود مچھلیوں کا شکار کرلے تو یہ اجارہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں استہلاک عین لازم آتا ہے۔ یعنی شئ (تالاب وغیرہ میں موجود مچھلیوں) کو ختم کرنے پر اجارہ ہورہا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اجارہ منافع پر ہوتا ہے نہ کہ عین پر، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام کی یہ صراحت موجود ہے کہ چراگاہ کو مویشی چرانے اور تالاب وغیرہ کو مچھلی کے شکار کے لیے اجارہ پر دینا صحیح نہیں ہے، البتہ علامہ ابن نجیم مصری نے اپنی کتاب ''البحر الرائق'' میں امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' سے حضرت عمر فاروق کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ تالاب وغیرہ کو مچھلیوں کے شکار کے لیے اجارہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں، گرچہ علامہ ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' میں اور علامہ شامی نے ''ردالمحتار'' میں عدم صحت اجارہ والے قول کو راجح اور

---

[1] مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

قواعد فقہ حنفی کے مطابق قرار دیا ہے، لیکن جہاں عرف عام ہو تو حالات کے پیش نظر ضرورۃً حضرت عمرؓ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہونی چاہیے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تالاب یا ندی وغیرہ کی زمین اجارہ پر دیدی جائے اور اس میں جو کچھ ہے اس سے انتفاع کا حق دیدیا جائے یا خشک تالاب کو مچھلی کی نشوونما کے لیے اجارہ پر دیدیا جائے یہ صورت جائز و درست ہے، اس لیے کہ یہ اجارہ اراضی کا ہے جو درست ہے۔ فقہاء کرام نے جہاں یہ جزئیات نقل کیا ہے کہ چراگاہ کو مویشی چرانے اور تالاب وغیرہ کو مچھلیوں کے شکار کے لیے اجارہ پر دینا صحیح نہیں ہے وہیں پر جواز کی ایک صورت بھی بتلائی ہے کہ زمین کسی مخصوص کام کے لیے اجارہ پر دیدی جائے اور زمین میں جو کچھ ہے اس سے انتفاع کا حق دیدیا جائے۔

(دیکھئے: ردالمحتار ۴ / ۱۰۶ تا ۱۰۷، البحر الرائق ۶ / ۸۰، ردالمحتار ۵ / ۳۹، ۹ / ۱۱۰-۱۱۱)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہے کہ سرکاری تالابوں، ندیوں اور نہروں میں موجود مچھلیاں کی مالک سرکار نہیں ہے، بلکہ وہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں، لہٰذا اگر سرکار ان مچھلیوں کی بیع کرتی ہے تو یہ بیع باطل ہے، اس لیے کہ غیر مملوک شئی کی بیع ہے جو از روئے حدیث ممنوع اور باطل ہے البتہ چوں کہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں، اس لیے بیع باطل ہونے کے باوجود خریدار ان مچھلیوں کا شکار کرلے تو ان کا وہ مالک ہو جائے گا۔

سرکاری تالاب وغیرہ کو ٹھیکہ پر دینا اور ان کی مچھلیاں خریدنا:

دوسری صورت سرکاری تالاب وغیرہ کو ٹھیکہ پر دینے کی ہے، یعنی سرکار ان مچھلیوں کی خرید و فروخت نہیں کرتی ہے، بلکہ تالاب یا ندی و نہر کا مخصوص حصہ کسی کو ٹھیکہ پر دیتی ہے، سوالنامہ سے اسی صورت کی وضاحت ہوتی ہے اور عام طور سے یہی صورت رائج بھی ہے، میرے خیال میں یہ صورت جائز ہے، اس لیے کہ یہ اراضی کا اجارہ ہے اور اراضی کا اجارہ جائز و درست ہی اگر یہ تسلیم کرلیں کہ مچھلیوں کو شکار کرنے کے لیے ندی وغیرہ اجارہ پر دیتے ہیں اور یہ عین کا اجارہ ہے نہ کہ منافع کا اور استہلاک عین پر اجارہ جائز نہیں ہے تو پھر چوں کہ یہ طریقہ عام طور سے رائج ہے اس لیے ضرورۃً حضرت عمر فاروقؓ کے قول پر عمل کی گنجائش ہونی چاہیے، جیسا کہ تمہید میں تفصیل گذر چکی ہے، بہر حال، خواہ مچھلیوں کی بیع ہونے کی صورت میں بیع باطل ہو، یا ٹھیکہ کی صورت مان کر اس کو جائز قرار دیا جائے بہر دو صورت خریدار ان مچھلیوں پر قبضہ کرلینے کے بعد ان کا مالک ہو جائے گا۔

اور جب خریدار یا ٹھیکہ دار ان مچھلیوں کا مالک ہو گیا تو اس کے لیے دوسروں سے فروخت کرنا اور دوسرے مسلمانوں کا پوری صورت حال جانتے ہوئے ان مچھلیوں کا خریدنا شرعاً جائز و درست ہے۔

نجی تالاب یا حوض میں موجود مچھلیوں کی بیع:

جن صورتوں میں تالاب یا حوض کا مالک اس میں موجود مچھلیوں کا مالک ہے، یعنی تالاب یا حوض کو مچھلیوں کے پالنے کے لیے تیار کر رکھا ہے یا الگ سے مچھلیاں ڈالی ہے یا مچھلیوں کے آنے کے بعد کوئی ایسی تدبیر کی ہے جس سے مچھلیاں تالاب یا حوض سے نہ نکل سکیں تو ان تمام صورتوں میں وہ ان مچھلیوں کا مالک ہے، جیسا کہ پورے حوالہ کے ساتھ تفصیل گذر چکی ہے، اس صورت میں اگر تالاب یا حوض چھوٹا ہے بغیر شکار کیے ہوئے ان مچھلیوں کو پکڑ کر خریدار کے حوالے کر سکتے ہیں تو ان مچھلیوں کی بیع شرعاً جائز و درست ہے، اس لیے کہ مبیع بھی مملوک ہے اور مقدور التسلیم بھی۔ اور اگر تالاب یا حوض اتنا بڑا ہے کہ ان کو شکار کیے بغیر پکڑ کر خریدار کے حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر مچھلیوں کا شکار کرنے سے قبل ان کی بیع فاسد ہے، اس لیے کہ مبیع مملوک تو ہے، لیکن مقدور التسلیم نہیں ہے اور اس صورت میں بیع فاسد ہوتی ہے اور اگر مالک نے نہ تو تالاب اور حوض کو مچھلیوں کے پالنے کے لیے تیار کر رکھا ہے، نہ اس میں الگ سے مچھلیاں ڈالی ہے اور نہ ہی مچھلیوں کے داخل ہونے کے بعد ان کو روکنے کی تدبیر کی ہے تو اس صورت میں وہ ان مچھلیوں کا مالک نہیں ہے۔ اگر شکار کرنے سے قبل ہی فروخت کرتا ہے تو یہ بیع باطل ہے۔

نجی تالاب اور حوض کو ٹھیکہ پر دینا:

اگر تالاب یا حوض میں موجود مچھلیوں کی بیع نہ ہو بلکہ مالک تالاب یا حوض کو مچھلی پالنے کے لیے ٹھیکہ پر دیدے یا کچھ حصہ مچھلی پالنے کے لیے ٹھیکہ پر دیدے اور بقیہ حصہ کی مچھلیوں سے انتفاع کا حق دیدے تو اس صورت میں تالاب یا حوض کو ٹھیکہ پر دینا اس کی شرطوں کے ساتھ یعنی مدت بھی متعین ہو اور اجرت بھی متعین ہو شرعاً جائز و درست ہے، اس لیے کہ اراضی کو اجارہ پر دینا درست ہے اور اگر تالاب یا حوض میں موجود مچھلیوں کے شکار کے

لیے تالاب یا حوض کو ٹھیکہ پر دیا تو چوں کہ جارہ استہلاک عین پر ہو رہا ہے اور یہ عام قواعد فقہ حنفی کے خلاف ہے، اس لیے عام قواعد کے مطابق یہ اجارہ صحیح نہیں ہونا چاہیے، لیکن حالات کے پیش نظر حضرت عمر فاروقؓ کے قول جواز پر جس کو علامہ ابن نجیمؒ نے ''البحر الرائق'' میں امام ابو یوسفؒ کی ''کتاب الخراج'' سے نقل کیا ہے، اگر عمل کرلیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ٹھیکہ دار کا دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا:

اگر تالاب یا حوض میں موجود مچھلیوں کی بیع ہے اور مچھلیوں کے مملوک، لیکن غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہے تو اس صورت میں خریدار ان مچھلیوں پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے ان مچھلیوں کا مالک ہے، وہ دوسروں سے ان مچھلیوں کو فروخت کرسکتا ہے، دوسرے مسلمان پوری واقفیت کے باوجود ان کو خرید سکتے ہیں اور اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں البتہ خریدار از خود ان مچھلیوں کو اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا، اس لیے کہ بیع فاسد میں خریدار بائع کی اجازت سے مبیع پر قبضہ کر لینے کے بعد مبیع کا مالک تو ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے دوسروں سے بیع جائز ہوتی ہے، لیکن خود اس کے لیے اس مبیع سے انتفاع جائز نہیں ہوتا، اس لیے کہ بیع فاسد ہونے کی وجہ سے شرعاً وہ اس بات کا مکلف ہے کہ معاملہ بیع کو ختم کر کے گناہ کو دور کرے، اور اگر مچھلیوں کے غیر مملوک ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہے تو گرچہ اصولاً بیع باطل میں خریدار مبیع پر قبضہ کرنے کی وجہ سے اس کا مالک نہیں ہوتا ہے، لیکن چوں کہ مذکورہ صورت میں مچھلیاں مباح الاصل ہیں، اس لیے خریدار ان مچھلیوں کا شکار کر لینے کے بعد ان کا مالک ہو جاتا ہے اور وہ جب مالک ہو جاتا ہے تو اس کے لیے دوسروں سے فروخت کرنا اور دوسروں کے لیے خریدنا جائز ہے، اور اگر ٹھیکہ کی صورت ہے تو ٹھیکہ درست ہونے کی وجہ سے وہ مچھلیوں کو شکار کر کے دوسروں سے فروخت کرسکتا ہے اور دوسرے لوگ اس سے خرید سکتے ہیں۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی بیع

مولانا شکیل احمد سیتاپوری

سوالنامے میں "بیع قبل القبض" اور "بیع سمک فی الماء" کے عنوان سے اٹھائی گئی جتنی شقیں ہیں ان میں سے کسی بھی شق کے جواز کے بارے میں راقم سطور مطمئن نہیں ہو سکا، حدیث وفقہ اور اصول فقہ کی ورق گردانی اور اس کی روشنی میں غور وخوض کے بعد راقم سطور جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام صورتیں ممنوع ہیں اور اگر ہمارے ملک میں یہی صورتیں رائج ہیں تو ہم اس ناگفتہ بہ صورتِ حال سے دوچار ہیں کہ "اطبق الأرض الحرام" حرام کاروبار نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

"عن ابن مسعود أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تشتروا السمك في الماء فإنه غرر" (رواہ احمد)۔

(مچھلی کو پانی میں رہتے ہوئے مت خریدو، اس لیے کہ وہ تذبذب اور دھوکہ ہے) (نیل الاوطار ۵/۱۴۷)۔

"عن أبي سعيد قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن شراء ما في بطون الأنعام حتى تضع، وعن بيع ما في ضروعها إلا بكيل، وعن شراء العبد وهو آبق، وعن شراء المغانم حتى تقسم، وعن شراء الصدقات حتى تقبض، وعن ضربة القابض" (رواہ احمد وابن ماجہ والترمذی، نیل الاوطار ۵/۱۴۹)۔

(چوپایوں کے حمل کو جب تک وہ اسے نہ جنیں، اور تھنوں میں بھرے ہوئے دودھ جب تک اسے دوہ کر پیمانے سے نہ ناپا جائے خریدنے سے منع فرمایا ہے، اور مالِ غنیمت جب تک تقسیم نہ ہو اور وہ غلام جو بھاگا ہوا ہو، اور وہ صدقات جن پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا ہو، اور شکاری کے ایک بار جال ڈالنے میں جتنی مچھلیوں کے آنے کی توقع ہو ان سب کی خریداری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

پہلی حدیث میں تو صراحۃً مچھلیوں کی خریداری سے جبکہ وہ پانی میں ہوں منع کیا گیا ہے اور اس کی علت بھی ذکر کر دی گئی ہے کہ اس میں دھوکا ہے۔ جہل ہے، فریب ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس تالاب میں اتنے من، اتنے سیر اور اتنی چھٹانک مچھلیاں ہیں، اس لیے یہ بیع مجہول اور بیع جزاف ہے جس کی مستقلاً ممانعت وارد ہے، نیز وہ مقدور التسلیم بھی نہیں، اس لیے یہ "بیع الطير في الهواء" کے مشابہ ہے، علاوہ بریں ایسا کوئی تالاب فی الحال موجود نہیں ہے جس کے بارے میں دعویٰ کیا جا سکے کہ اس میں قدرتی مچھلیاں شامل نہیں ہیں اور قدرتی مچھلیاں پکڑنے کے بعد ہی مملوک ہوتی ہیں، لہذا اس سے پہلے ان کی بیع، بیع غیر مملوک ہے، نیز جب تالاب، ندیاں اور جھیلیں ٹھیکہ پر دیجاتی ہیں تو پوری میعاد تک نہ جانے کتنی افزائش ہوتی ہے، یہ حمل اور حمل کے حمل کو فروخت کرنا ہے جو ممنوع ہے۔

دوسری حدیث میں اگر چہ پانی کی مچھلیوں کی بیع کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ جن بیوع کا ذکر ہے وہ مجہول اور غیر مقدور ہونے میں "بیع السمک فی الماء" سے اہون ہیں۔ اور جب اہون ممنوع ہے تو اشد بدرجہ اولی ممنوع ہوگا۔

شمس الائمہ سرخسیؒ نے ان مچھلیوں کی بیع کو بھی باطل قرار دیا ہے جو ایک محدود حصہ میں محصور ومحبوس ہو جائیں، چہ جائے کہ وہ مچھلیاں جو پورے تالاب میں آزاد پھر رہی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"یعنی ایک شخص نے وہ مچھلیاں فروخت کیں جو پانی کے اندر کسی احاطہ جھاڑی میں محصور ہیں، تو یہ بیع باطل ہے، کیوں کہ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ پانی میں مچھلیوں کو نہ فروخت کرو، اس لیے کہ اس میں دھوکہ اور تذبذب ہے، پھر یہ بات بھی ہے کہ بیچنے والے نے اگر انہیں پکڑ کر نہیں چھوڑا ہے تو وہ ایسی چیز بیچ رہا ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے، حالاں کہ ملک پہلے ہے اور تملیک بعد میں ہے، پہلے خود مالک ہے بعد میں دوسرے کو مالک بنائے، لہذا یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ فضا میں اڑنے والے پرندہ کی بیع کرنا، اور اگر اس نے مچھلیاں پکڑ کر چھوڑی ہیں، تو وہ پانی میں بھاگ گئی ہیں، لہذا ان کی بیع ایسی ہے جیسے بھاگے ہوئے غلام کی بیع" (مبسوط سرخسی ۱۳/۱۱۱-۱۱۲)۔

اس مسئلہ میں ابن قدامہ نے قدرے تفصیل سے بحث کی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ اگر تالاب نجی ملکیت میں ہو اور اس کا پانی بہت تھوڑا اور صاف وشفاف ہو کہ تمام مچھلیاں دکھائی دیں اور ان کو پکڑنا آسان ہو تو ان تین شرطوں کے پائے جانے کے بعد ان مچھلیوں کی بیع پانی میں رہتے ہوئے درست ہے، اگر اس شق

سے فائدہ اٹھایا جائے تو صرف ان مچھلیوں کا جواز ثابت ہوتا ہے جو بیع کے فوراً بعد شکار کرلی جائیں، لیکن اس سے اس مروجہ بیع کا جواز نہیں ثابت ہوتا جس میں مہینوں اور برسوں کے لیے مچھلیاں فروخت کی جاتی ہیں یا ٹھیکہ پر دیجاتی ہیں، اور وہ اتنے گہرے پانی میں ہوتی ہیں کہ ان کی مقدار کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر وہ پانی جاری ہوتا ہے تو ان مچھلیوں کو ایک جگہ قرار بھی نہیں ہوتا۔ حاصل یہ ہے کہ مروجہ بیع میں جہالت در جہالت ہے ابن قدامہ کہتے ہیں:

"جھاڑیوں میں محصور مچھلیوں کی بیع جائز نہیں ہے، یہی اکثر اہل علم کی رائے ہے، حضرت ابن مسعود سے منقول ہے کہ انہوں نے اس سے منع کیا اور کہا: اس میں جہل اور تذبذب ہے، اور حسن بصری، ابراہیم نخعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام ابویوسف اور امام ثور نے بھی اس بیع کو ناپسند کیا ہے اور ہم نہیں سمجھتے کہ اس مسئلہ میں ان سے کسی نے اختلاف کیا ہو اور مقصود یہ ہے کہ "بیع سمک فی الماء" تین شرطوں کے ساتھ درست ہے:

اول یہ کہ وہ تالاب اور مچھلیاں نجی ملکیت میں ہوں۔

دوم یہ کہ پانی اتنا صاف وشفاف ہو کہ تمام مچھلیاں دیکھی جاسکیں۔

سوم یہ کہ ان کا پکڑنا آسان ہو۔

اگر یہ تینوں شرطیں مجتمع ہیں تو ان کی بیع درست ہے اور اگر ایک شرط بھی مفقود ہے تو بیع درست نہیں ہے اور عمر بن عبدالعزیز اور ابن ابی لیلیٰ سے منقول ہے کہ اگر پانی میں کسی نے بانس وغیرہ سے کچھ حصہ گھیر لیا ہے اور اس میں مچھلیاں ہیں تو ان کی بیع جائز ہے، کیوں کہ وہ مچھلیاں مقدور التسلیم ہیں اور ہماری دلیل وہ اثر ہے جو ابن عمر اور ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ پانی میں مچھلیاں نہ خریدو، اس لیے کہ یہ مذبذب اور غیر یقینی چیز ہے، اور اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع سے منع فرمایا ہے جس میں غرر ہے اور اس لیے بھی کہ بائع جب تک شکار نہ کرے اس کو حوالے کرنے پر قادر نہیں ہے، لہذا یہ بیع "الطیر فی الھواء" کے مشابہ ہے" (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۲۲۳)۔

اور اس لیے بھی کہ وہ مجہول ہے، لہذا یہ گٹھلی کو کھجور میں رہتے ہوئے اور دودھ کو تھن میں رہتے ہوئے بیچنے کے مشابہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے اور غرر یہ ہے کہ کسی چیز کے انجام میں دونوں طرح کے امکانات ہوں، جیسے فضاء میں اڑنے والے پرندے اور پانی میں تیرنے والی مچھلی کی بیع اور وقایہ میں ہے کہ جس مچھلی کا شکار نہیں کیا گیا ہے یا شکار کیا گیا پھر وہ حوض میں ڈالدی گئی کہ بغیر حیلہ وتدبیر کے اس کو نہیں پکڑا جاسکتا تو اس کی بیع جائز نہیں ہے اور اہل علم اسی رائے پر ہیں" (مسوی شرح موطا/ ۱۶۵)۔

ملخص:

مچھیروں نے پانی سے نکالنے کے بعد جو مچھلیاں فروخت کی ہیں ان کی فروختگی تو اصول کے تحت ہوئی ہے، یعنی شکار کرنے کی وجہ سے وہ مالک ہو گئے اور انہوں نے اپنی مملوکہ چیز فروخت کردی، رہی یہ بات کہ اس کے عوض میں انہیں حکومت کو پیسے دینے پڑے ہیں تو یہ حکومت کا جبر اور اس کا ذاتی عمل ہے جس میں ان کا دخل نہیں ہے، لہذا مچھیروں سے مچھلی کی خریداری اور اس کا استعمال کسی قدر اہون محسوس ہوتا ہے، لیکن ذاتی ملکیت والے تالابوں کا مسئلہ مشکل معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ یہاں نہ حکومت کا جبر ہے، اور نہ مچھیروں کا اصطیاد ان کے لیے سبب ملک ہے، اور نہ یہ عوامی تالاب ہیں جن میں مچھیروں کا بھی فی الجملہ حق ہوتا ہے، لہذا نجی تالابوں میں صرف شرکت کا طریقہ سمجھ میں آتا ہے، یعنی تالاب کے مالکوں اور ان سے مچھلیاں نکال کر فروخت کرنے والوں کے لیے حرام سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ دونوں شرعی اصول کے مطابق ایک دوسرے کے شریک ہوجائیں یا ٹھیکہ دینے کے بجائے مالکان خود مچھلیاں نکلوا کر فروخت کریں۔

علامہ ابواسحاق شاطبی نے "الموافقات" میں لکھا ہے کہ حلال وحرام کے درمیان ایک تیسری کڑی "عفو" کی بھی ہے اور عفو سے مراد یہ ہے کہ امید کی جاتی ہے کہ مؤاخذہ نہیں ہوگا، اگر بیع سمک کی مذکورہ صورتیں حلال کے بجائے عفو کی فہرست میں آجاتی ہیں تو بھی غنیمت ہے۔

☆☆☆

بغیر شکار کیے ہوئے مچھلی کی بیع

مولانا سلطان احمد اصلاحی

۱- فقہ کی اب تک کی معروف اور مسلم رائے کے مطابق شکار سے پہلے مچھلی کی خرید وفروخت جائز نہیں، اس لیے کہ اس صورت میں وہ اس چیز کو بیچتا ہے جو اس کے قبضے میں نہیں ہے، اسی طرح اگر مچھلی کسی حوض یا گڈھے میں ہو، لیکن شکار کی زحمت اٹھائے بغیر اسے پکڑا نہ جا سکتا ہو تو اس صورت میں بھی اس کی فروخت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ- اور دیگر صورت- اس کا حوالہ کیا جانا دشوار ہے (ہدایہ ۳/ ۴۴ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)۔

اس ممانعت کی کئی وجہیں ہیں، ایک تو اس میں دھوکہ ہے جبکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے:

''أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر

(راوہ الجماعۃ إلا البخاری، نیل الأوطار ۵/ ۱۴۷، مکتبۃ التراث، القاہرہ، سبل السلام ۳/ ۸۰۷، مکتبہ عاطف بحوالہ الأزہر (مصر) تحقیق وتعلیق: عبدالعزیز الخولی)۔

دوسرے یہ کہ وہ اس چیز کو بیچتا ہے جو اس کے قبضے میں نہیں ہے، جبکہ حضرت حکیم بن حزم کی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی بھی ممانعت ہے:

''لا تبع ما ليس عندك'' (رواه الخمسة، نيل الاوطار: ۵/۱۵۵، محوله)۔

دوسرے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع بیع کی جو قسمیں بتائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے: ''لا يحل ... ولا ربح ما لم يضمن، ولا بيع ما ليس عندك'' (رواہ الخمسۃ وصححہ الترمذی وابن خزیمۃ والحاکم، روایت: عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سبل السلام: ۳/ ۹۰۸)۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں دھوکہ کے حوالہ سے خاص پانی میں مچھلی کی خرید کی ممانعت ہے: ''لا تشترط والسمك في الماء فانه غرر'' (رواہ احمد، بحوالہ: نیل الاوطار ۵/ ۱۴۷، نیز: المغنی لابن قدامہ: ۴/ ۲۲۲، مکتبۃ الکلیات الازہر، مصر)۔

اس لحاظ سے مسئلہ کی سادہ صورت کے مدنظر سوال نامہ میں مذکور گڈھے اور تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت کو ممنوع ہونا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کے دوسرے پہلو اور اس کی دوسری تفصیلات بھی ہیں جس سے اس کے جواز کی گنجائش نکلتی ہے، بلکہ اس کی ترجیح کا اشارہ نکلتا ہے۔

''بدایۃ المجتہد'' میں گڈھے اور تالاب کی مچھلی کی فروخت کے سلسلے میں حضرت امام اعظمؒ سے مطلق جواز کی روایت ہے:

''ومن هذا الباب بيع السمك في الغدير أو البركة اختلفوا فيه أيضًا. فقال أبو حنيفة: يجوز''

(بدایۃ المجتہد: ۲/ ۱۷۵، ۵۸۱ دار المعرفہ، بیروت، جگہ، سادس ۱۹۸۳ء ۱۴۰۳ھ)۔

صاحب ''مغنی'' ابن قدامہ حنبلی م ۶۲۰ء کی اس سلسلے کی پیش کردہ تفصیلات سے بھی اس مسئلہ میں نرمی سامنے آتی ہے، جبکہ سب سے زیادہ تفصیل اس مسئلہ کی انہی کے یہاں ملتی ہے، اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ حسن، نخعی، مالک، ابوحنیفہ، شافعی، ابو یوسف، اور ابوثور جن ائمہ کی طرف سے اس کی ممانعت ہے انھوں نے اس کو صرف مکروہ کہا ہے، دوسرے یہ کہ پانی کی مچھلی کی بیع کی یہ کراہیت جواز میں تبدیل ہو جائے گی اگر اس کے ساتھ تین شرطیں جمع ہو جائیں:

۱- گڈھا یا تالاب آدمی کی ملکیت ہو۔

۲- پانی صاف شفاف ہو جس سے کہ اس کی جڑوں کو دیکھنے اور پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔

۳- مچھلی کا مرد فی اور اس کا شکار کرنا ممکن ہو۔

یہ تینوں شرطیں اکٹھی ہو جائیں تو اس طرح کی مچھلی کی بیع جائز ہوگی، اس لیے کہ یہ معلوم زیر ملکیت اور حوالہ کے قابل چیز ہے، تو اس کی بیع اسی طرح جائز ہوگی جیسے کہ کوئی چیز جو طشتری میں رکھی ہوئی ہو۔

''فإن اجتمعت هذه الشروط جاز بيعه؛ لأنه مملوك معلوم مقدر على تسليمه، وجاز بيعه كالموضوع في الطست''
(المغنی ۴/۲۲۳/بحوالہ بالا)۔

صاحب ''مغنی'' کی آگے کی تفصیل سے سوال نمبر ا کے ابتدائی حصے کے گڈھے، تالاب میں آنے والی مچھلیوں کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو گڈھا یا تالاب کسی کی انفرادی یا اجتماعی ملکیت یا اس کے زیر تصرف ہو اس میں جو مچھلی بھی اپنے آپ آجائے گی وہ اس کی ملکیت ہوگی۔

''إذا أعد بركة (گڈھا) أو مصفاة (تالاب) ليصطاد فيها السمك فحصل فيها سمك ملكه. (المغنی: ۴/۲۲۴)۔

آگے ہے: ولو أعد لمياه الأمطار مصانع (جمع مصنع الأرض يحفظ فيها الماء تشبه الحوض) أو بركًا أو أدنى ليحصل فيها الماء ملكه بحصوله فيها؛ لأنها في باب الإعداد كالشباك للاصطياد'' (مغنی، حوالہ سابق)۔

ظاہر حدیث سے ہٹ کر فقہ حدیث کے حوالہ سے بعض دوسرے مسائل سے بھی مسئلہ زیر نظر کے لیے رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ''بخاری و مسلم'' کی روایت سے پھل کے کارآمد ہونے سے قبل اس کی بیع ممنوع ہے:

''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها نهى البائع والمبتاع'' (سبل السلام ۳/۸۶۰)۔

دیگر روایات کے لیے دیکھئے: (نیل الاوطار: ۵/۱۷۲، ۱۷۳ مجولہ صدر)۔

لیکن حضرات حنفیہ کے یہاں کارآمد ہونے سے قبل اس کی بیع جائز اور اسی رائے کو زیادہ صحیح کہا گیا ہے۔

''ومن باع ثمرة لم يبد صلاحها أو قد بدأ جاز البيع... والأول أصح'' (ہدایہ ۳/۲۱۰ طبع مذکور)۔

حدیث کی رو سے بیع کی ممنوع صورتوں میں سے ایک ''بیع معاوضہ'' ہے، یعنی کہ پیڑ کو ایک ہی ساتھ کئی سالوں کے لیے بیچ دیا جائے۔

''وقد روى عنه ﷺ: ''أنه نهى عن بيع السنين وعن بيع المعاومة، وهي بيع الشجر أعوامًا'' (بدایۃ المجتہد ۲/۱۴۹)۔

لیکن حضرت عمر بن الخطابؓ اور ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ وہ اس طرح سے پھلوں کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں۔

''إلا ما روى عن عمر بن الخطاب وابن الزبير أنه كان يجيز أن بيع الثمار سنين) (بدایہ، حوالہ مذکور)۔

اسی طرح بیع کی ناجائز صورتوں میں سے ایک تھن کے دودھ کی بیع ہے جس کی حدیث میں صاف ممانعت ہے:

''وعن شراء مافي ضروعها'' (بدایہ: ۲/۱۵۸)، لیکن حضرت امام مالکؒ ایک بکری میں تو نہیں، لیکن بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے دودھ کی متعین دنوں کے لیے فروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔

''وأجاز مالك بيع لبن الغنم أيامًا معدودة إذا كان ما يحلب منها معروضًا في العادة'' (بدایہ، حوالہ سابق)۔

اس تفصیل کی روشنی میں سرکاری ندی، نالے اور نہر میں بعض حکومت کی طرف سے کسی خاص شخص، کوآپریٹو سوسائٹیوں یا مقامی پنچائتوں کے لیے بالمعاوضہ بندوبست کیا جاتا ہے، ان میں آنے یا پائی جانے والی مچھلیاں متعلقہ افراد اور اداروں کی ملکیت ہوں گی اور تفصیلات بالا کی روایت سے ان افراد اداروں کی ملکیت ہوں گی اور تفصیلات بالا کی رعایت سے ان افراد اور اداروں کے لیے ان کا بیچنا جائز ہوگا۔ اور یہی صورت موجودہ عرف کے مطابق ان ندی نالوں اور نہروں کی مچھلیوں کی خرید و فروخت کے جواز کا فتوی دیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے، آخری وضاحت کے ساتھ اس نمبر کے جواب کو ختم کیا جاتا ہے۔

مسئلہ زیر نظر کے جاری عرف کو رد کرتے ہوئے ممانعت کی پہلی رائے پر اصرار کا مطلب مصلحت کا ازالہ اور ضرر کی تائید ہوگا، اس لیے کہ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب ہوگا کہ پہلے تمام مچھلیاں گڈھے، تالاب سے نکلوائی جائیں، پھر ان کی فروخت کے سلسلے میں سوچا جائے، کوآپریٹو سوسائٹیوں اور پنچائیتوں کی طرف سے تو ان مچھلیوں کے نکالنے کا حشر معلوم ہے کہ گھوم پھیر کر اس کا سارا فائدہ سوسائٹی اور پنچایت کے ممبران کی جیب میں جائے گا، اول یہ کہ ان مچھلیوں کے نکالنے کے لیے قرار واقعی دلچسپی کون لے گا، مطلوبہ مہارت کے ساتھ یہ کام اس پیشے کے ماہرین کے علاوہ دوسرا نہیں کر سکتا، اور ان کا دستور ہے کہ یہ اس کام میں جان لگا کر محنت اسی صورت میں کرتے ہیں جبکہ نہر، تالاب کا کل مال ان کے زیر تصرف تسلیم کیا

جائے۔ مزدوری یا مال کے کسی تناسب، نصف تہائی، چوتھائی، وغیرہ پر ان کے لیے اس میں مطلوبہ دلچسپی پیدا کرنا بہت مشکل ہے، اس سے بڑی کمزوری سوسائٹی، پنچایت کے بچولیہ ممبران کی ہے، جنہیں جہاں اس معاملے میں اس طرح دخیل ہونے کا موقع ملا ان سے بچ کر سرکار کے خزانے میں کچھ پہنچ پانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ سی۔ بی۔ آئی۔ جیسی سخت گیر تنظیم کی تیز نظر کے باوجود اس وقت ملک میں مالی خرد برد اور گھوٹالوں کا جو حال ہے اس کے پیش نظر اس خصوص میں کسی ہوش مند کے لیے کسی نہیں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے، نتیجے کے طور پر خسارہ سرکار کا، دوسرے لفظوں میں ملکی عوام کا ہوگا۔ ضرر اور ضرار سے آخری سطح تک بچاؤ اور انتہائی درجے میں مصالح کا حصول جس شریعت مطہرہ کا امتیاز ہو، وہ بدلتے حالات میں مفاد عامہ کی ان دیکھی کر کے مسائل کی جامد صورتوں پر قناعت پذیر نہیں ہوسکتی، اور یہی صورت جو دشواری سوسائٹی اور پنچایت کے لیے ہے گڈھے، تالاب سے باہر نکال کر ہی مچھلی فروخت کرنے میں ہوسکتی ہے، افراد کا معاملہ اس خصوص میں اس سے بہت مختلف نہیں ہے، جبکہ ان میں ایک تعداد ان افراد کی بھی ہوسکتی ہے جو اپنی دوسری شدید مصروفیات کے ساتھ آمدنی کے اضافہ کی ایک ضمنی صورت کے طور پر اسے اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے بھی سہولت اسی میں ہے کہ وہ گڈھے، تالاب کو یکمشت فروخت کردیں اور اس کی رقم سے اپنے دین دنیا کی بہتری کا سامان کریں، اوپر کی پھنسان کے ساتھ ان کے لیے اس کاروبار میں پڑنا بہت مشکل ہے اور اس کے دروازے کو ان کے لیے بالکل بند کردینا ہرگز قرین مصلحت نہیں ہوسکتا ہے۔

آخری بات ان نہروں، تالابوں کی خریداری کرنے والے پیشہ ور ماہرین کے امکانی نقصان کی کہی جاسکتی ہے، لیکن جو لوگ خرید وفروخت کے اس طرح کے کاروبار میں اپنے کو لگاتے ہیں، وہ اس طرح کے امکانی خساروں کے سہنے کے عادی ہوتے ہیں، اور ایک جگہ کی کمی کی تلافی دوسری جگہ سے ان کے لیے ہوتی رہتی ہے، اس موقف کو تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ پھل پر آفت آجانے کی صورت میں خریدار سے کچھ نہ لینے کی حدیث میں جو تاکید آئی ہے:

''لو بعت من أخيك ثمرًا فأصابته جائحة، فلا يحل لك أن تأخذ منه شيئًا. بم تأخذ مال أخيك بغير حق''

(روایت مسلم بحوالہ: سبل السلام ۳/ ۸۶۳)، اس میں اس ممانعت کو استحباب پر محمول کیا گیا ہے (سبل السلام ۳/ ۸۶۴، طبع مذکور)۔

۲- مسئلہ کی اس تنقیح کے بعد مسلمان کے لیے اس طرح کی مچھلی بیچنا اور خریدنا دونوں جائز ہوگا۔

۳- تنقیح بالا کی روشنی میں ذاتی ملکیت کے حوض یا تالاب سے مچھلی نکالے بغیر اس کا بیچنا متعلق شخص کے لیے جائز متعین مدت کے لیے جس شخص یا اشخاص کے ہاتھ وہ اسے فروخت کرے گا اسے یا انھیں ہی اس سے مچھلیاں نکالنے کا اختیار ہوگا۔

۴- نجی یا عوامی ملکیت کے حوض تالاب میں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے جو مچھلیاں اس میں آجائیں گی وہ متعلق فرد یا عوام کی ملکیت ہوگی، اور ان کے لیے اس معین تالاب کا فروخت کرنا یا ٹھیکے پر دینا جائز ہوگا، متعین مدت کے اندر خریدنے یا ٹھیکے پر لینے والے ہی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوگا۔

نہر اور تالاب کی مچھلیوں کو فروخت کرنا

مفتی شبیر احمد قاسمی[1]

نہریں اکثر سرکاری ہوتی ہیں اور تالاب کبھی سرکاری ہوتا ہے اور کبھی علاقہ کی پنچایت کے ماتحت ہوتا ہے اور کبھی شخصی ہوتا ہے سب کا حکم ایک ساتھ سات شکلوں میں پیش کیا جارہا ہے، نہر و تالاب کی مچھلیاں صاحب تالاب کی ملکیت میں داخل ہوتی ہے یا نہیں؟ اور ان کو پکڑنے سے قبل فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے میں غور کر کے دیکھا جائے تو اس کی سات شکلیں سامنے آتی ہیں۔

شکل (۱) تالاب کو مچھلیوں کے لیے تیار نہیں کیا گیا اور نہ ہی مچھلیوں کے بارے میں اس میں کوئی خاص اہتمام کیا گیا ہے، بلکہ سیلاب وغیرہ کے ذریعہ سے مچھلیاں خود بخود اس میں داخل ہوگئی ہیں اور نکلنے کا راستہ بھی اس میں موجود ہے کہ راستہ بند نہیں کیا گیا ہے تو ایسی آزاد مچھلیاں صاحب تالاب کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ہیں، کسی کے لیے بھی ان مچھلیوں کو پکڑ کر لے جانے کا حق ہے، پکڑنے سے پہلے ان کو فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس کو حضرات فقہاء نے اس قسم کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''وإن لم يكن أعدها لذلك لا يملك ما يدخل فيها، فلا يجوز بيعه لعدم الملك'' (فتح القدیر ۶/۴۱۰)۔

(اور اگر تالاب کو مچھلی کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا تو اس میں جو مچھلیاں خود بخود داخل ہوجائیں گی ان کا صاحب تالاب مالک نہیں ہوتا ہے، لہذا ان کو پکڑنے سے پہلے فروخت کرنا بھی صاحب تالاب کے لیے جائز نہیں)۔

شکل (۲) تالاب کو صاحب تالاب نے مچھلیوں کے لیے تیار نہیں کیا ہے اور نہ ہی مچھلیوں کے واسطے کوئی خاص اہتمام کیا ہے، بلکہ مچھلیاں خود بخود داخل ہوگئی ہیں لیکن صاحب تالاب نے مچھلیاں داخل ہوجانے کے بعد نکلنے کا راستہ بند کردیا ہے تو ایسی صورت میں صاحب تالاب ان مچھلیوں کا مالک ہوجاتا ہے، اسی طرح نہر و ندی کے خاص کنارہ یا خاص حصہ میں اسی طریقہ سے بند لگادیا ہے کہ اس حصہ کے اندر جو مچھلیاں موجود ہوتی ہیں وہ باہر نہیں نکل سکتی ہیں تو ایسی صورت میں نہر اور ندی کے اس حصہ کی مچھلیاں بند لگانے والے کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہیں، مگر بغیر حیلہ اور کوشش کے ان کا پکڑنا ممکن نہیں ہے، اس لیے ایسی مچھلیاں غیر مقدور التسلیم اور مجہول ہوتی اس لیے پکڑنے سے پہلے ان مچھلیوں کو مالک کے لیے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، مگر مالک کی اجازت کے بغیر دوسروں کے لیے بھی ان مچھلیوں کو پکڑنا جائز نہیں ہے (مستفاد امداد الفتاوی ۳/۴۸)۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''اور اگر تالاب کو مچھلی کے لیے تیار نہیں کیا تھا تو جو مچھلی اس میں داخل ہوجائے گی وہ اس کی ملکیت میں داخل نہ ہوگی، لہذا عدم ملک کی وجہ سے پکڑنے سے پہلے اس کی فروختگی بھی جائز نہ ہوگی، لیکن اگر مچھلیاں داخل ہونے کے بعد نکلنے کا راستہ بند کردیا ہے تو ایسی صوت میں داخل شدہ مچھلیاں اس کی ملکیت میں شمار ہوں گی'' (فتح القدیر ۶/۴۱۰)۔

شکل (۳) آزاد مچھلیاں تالاب میں خود بخود داخل ہوگئیں اور صاحب تالاب نے تالاب کو مچھلیوں کے لیے مہیا نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس میں مچھلیوں کا کوئی انتظام کیا ہے، بلکہ باہر سے مچھلیاں خود بخود آکر داخل ہوگئی ہیں اور کسی دوسرے آدمی نے آکر بند لگادیا ہے تو ان مچھلیوں کا مالک وہی بند لگانے والا ہوگا صاحب تالاب نہیں ہوگا (مستفاد امداد الفتاوی ۳/۴۸)۔

اسی طرح نہر کے کنارے کو مچھلیوں کے لیے بند لگا رکھا ہے اور اس میں مچھلیاں جمع ہوگئیں ہیں اور نکلنے کا راستہ بند کردیا ہے یا نہر کے کسی خاص حصہ کو بند لگا کر گھیر دیا ہے اور اس میں مچھلیاں آکر جمع ہوگئی ہیں اور نکلنے کا راستہ بند کر رکھا ہے تو ایسی صورت مین جس شخص نے اس میں بند لگایا ہے وہ مچھلیاں اس کی ملکیت میں شمار ہوں گی، دوسرے آدمی کے لیے اس کی اجازت کے بغیر ان مچھلیوں کو پکڑنا جائز نہیں ہے۔

اور اسی طرح ساحلی علاقہ میں رہنے والے لوگ سمندر کے کنارے کسی خاص حصہ پر بند لگادیتے ہیں اور سمندر کا پانی چوبیس گھنٹہ میں دومرتبہ اوپر کو آتا ہے اور دومرتبہ نیچے کو جاتا ہے اور بعد میں پانی جب کم ہوجاتا ہے تو مچھلیاں بند حصہ کے اندر محفوظ ہوجاتی ہیں اور پانی نیچے کو اتر جاتا ہے اور بند حصہ سے پانی نکل جانے

---

[1] ادارالافتاء شاہی، مرادآباد۔

کے لیے ایک راستہ رکھا جاتا ہے اور اس راستہ میں ایسا انتظام کیا جاتا ہے کہ پانی تو نکل جائے مگر مچھلیاں نہیں نکل سکتی تو ایسی صورت میں یہ تمام مچھلیاں شرعاً اسی کی ملکیت میں ہوتی ہیں جس نے بند لگا رکھا ہے دوسروں کو یہ مچھلیاں پکڑنے کا حق نہیں ہے (حوالہ سابق) اور ایسی صورت میں اگر اس بند میں سے آسانی کے ساتھ مچھلیاں ہاتھ سے پکڑی جاسکتی ہیں تو ان کو پکڑنے سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے اور اگر جال وغیرہ یا کسی آلہ کے بغیر پکڑی نہیں جاسکتی ہیں تو پکڑنے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

شکل (۴) صاحب تالاب نے تالاب کو مچھلی کے لیے تیار کر رکھا ہے تو ایسی صورت میں آزاد مچھلیاں جو اس تالاب میں داخل ہوجاتی ہیں یا قدرتی طور پر اس میں مچھلیاں پیدا ہوجاتی ہیں تو ان مچھلیوں کا مالک صاحب تالاب ہی ہوگا، دوسروں کے لیے صاحب تالاب کی اجازت کے بغیر ان مچھلیوں کو پکڑنا جائز نہیں ہے، مگر بلا کسی مشقت وحیلہ کے ان کو ہاتھ سے پکڑا نہیں جاسکتا، اس لیے غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے پکڑنے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

"فإن كان أعدها لذلك فما دخلها ملكه، وليس لأحد أن يأخذه" (فتح القدیر ۶/۴۰۹)، لو أن رجلا اتخذها حظيرة في أرضه فدخل واجتمع فيه السمك فقد ملك السمك وليس لأحد أن يأخذه" (بنایہ شرح ہدایہ ۳/۸۳، بحر الرائق ۶/۷۳)۔

(اگر تالاب کو مچھلی ہی کے لیے تیار کیا گیا ہے یا نہر کے کنارے کو مچھلی کے لیے بند لگا رکھا ہے تو جو مچھلیاں اس میں داخل ہوجائیں گی وہ اس کی ملکیت میں شامل ہوجائیں گی، دوسروں کے لیے ان مچھلیوں کو پکڑنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی آدمی اپنی زمین میں کوئی تالاب بنائے یا نہر کے کنارے کو گھیر دے، پھر اس میں مچھلیاں جمع ہوجائیں تو وہ شخص ان مچھلیوں کا مالک ہوجاتا ہے دوسروں کے لیے ان کو پکڑنا جائز نہیں)۔

شکل (۵) تالاب کو مچھلیوں کے لیے تیار نہیں کیا تھا لیکن بعد میں مچھلیاں کہیں سے پکڑ کر اس میں لا کر ڈال دیا ہے تو ایسی صورت میں یہ مچھلیاں اس کی ملکیت ہوں گی مگر تالاب کافی بڑا ہونے کی وجہ سے آسانی سے ان مچھلیوں کو پکڑنا ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان مچھلیوں کو پکڑنے سے پہلے فروخت کرنا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، لیکن چوں کہ اس کی ملکیت ہے، اس لیے دوسروں کو پکڑنے سے منع کرسکتا ہے۔

شکل (۶) تالاب کو مچھلی ہی کے لیے تیار کر رکھا تھا اور صاحب تالاب نے مچھلیوں کو کہیں سے لا کر ڈال دیا ہے تو ایسی صورت میں وہ مچھلیاں بہر حال صاحب تالاب کی مملوک ہیں، دوسروں کے لیے ان مچھلیوں کو پکڑنا جائز نہیں، لیکن تالاب بہت بڑا ہونے کی وجہ سے مچھلیاں آسانی کے ساتھ پکڑی نہیں جاسکتی ہیں، لہذا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے پکڑنے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا (مستفاد امداد الفتاوی ۳/۴۹) اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

"اور اگر تالاب کو مچھلیوں کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا، لیکن مچھلیوں کو پکڑ کر تالاب میں ڈال دیا گیا ہے تو صاحب تالاب مچھلیوں کا مالک ہوجائے گا، لیکن بلا کسی حیلہ اور مشقت کے وہ پکڑی نہیں جاسکتی ہیں، اس لیے بیچنا جائز نہیں اگرچہ وہ اپنی ملکیت کی مچھلی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ یہ مقدور التسلیم نہیں ہے، اگر مچھلیوں کو شکار کر کے تالاب میں ڈالدیا ہے اور تالاب بڑا ہے تو ان کو پکڑنے سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ وہ غیر مقدور التسلیم ہے" (فتح القدیر ۶/۴۱۰)۔

شکل (۷) تالاب چھوٹا ہے اور اس کو مچھلیوں کے لیے تیار کیا گیا ہو، یا مچھلیوں کے لیے تیار نہ کیا گیا ہو، مگر صاحب تالاب نے مچھلیوں کو کہیں سے پکڑ کر لا کر اس میں ڈال دیا ہے اور تالاب چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس میں مچھلیوں کو پکڑنے میں کسی قسم کی مشقت اور پریشانی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، تو ایسے تالاب کی مچھلیوں کو پکڑنے سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے (مستفاد امداد الفتاوی ۳/۴۹)، اس کو حضرات فقہاء نے اس قسم کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

"وإن كانت صغيرة جاز، لأنه باع مقدور التسليم، فإن كان يؤخذ بلا حيلة جاز بيعه، لأنه مملوك مقدور التسليم" (فتح القدیر ۶/۴۱۰، عنایہ علی ہامشہ ۶/۴۰۹)۔

(اگر تالاب حوض کی طرح بہت چھوٹا ہے تو اس کی مچھلی کو بیچنا اس لیے جائز ہے کہ وہ مقدور التسلیم ہے اور اگر بغیر کسی حیلہ اور مشقت کے پکڑی جاسکتی ہے تو ان کو بیچنا جائز ہے، اس لیے کہ یہ ایسی مچھلیاں ہیں جو صاحب تالاب کی مملوک اور مقدور التسلیم ہیں)۔

تالاب کو ٹھیکہ پر دینے کی مشہور ومعروف شکل:

آج کل کے زمانہ میں تالاب کو ٹھیکہ پر دینے کا سب سے معروف اور مشہور طریقہ جو لوگوں میں زیادہ تر رائج ہے وہ یہی ہے کہ تالاب میں پہلے سے مچھلیاں

پرورش کی ہوئی نہیں ہوتی ہیں، بلکہ خالی تالاب یا جھیل کو خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دیا جاتا ہے اور باہر سے مچھلیوں کو جال وغیرہ سے پکڑ کر حاصل کیا کرتا ہے تو اب یہاں مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اس طرح خالی تالاب یا خالی جھیل کو مچھلیوں کی پرورش کرنے کے لیے ٹھیکہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرات فقہاء تعامل ناس اور عموم بلویٰ کی وجہ سے اس طرح تالابوں اور جھیلوں کو مع ان کے حاشیہ اور کناروں کے ٹھیکہ پر دینے اور لینے کو جائز قرار دیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: تقریرات رافعی ۵/۱۴۰، ہندیہ ۴/۴۴۱)۔

نیز صاحب بحر نے حضرت امام ابو یوسفؒ کی ''کتاب الخراج'' سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایسے بڑے تالاب اور جھیل کے بارے میں خط لکھا گیا کہ جس میں مچھلیاں جمع ہو جاتی ہیں تو ان کو اجارہ پر دینا جائز ہے یا نہیں، تو حضرت عمرؓ نے اس کی اجازت لکھی ہے نیز امام ابو حنیفہؒ امام حمادؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے عبدالحمید بن عبدالرحمن سے اس مسئلہ سے متعلق تبادلہ خیال فرمایا تو انہوں نے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے پاس جھیل اور تالاب کی مچھلیوں کی بیع سے متعلق سوال لکھ کر بھیجا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ ایسا معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن صاحب بحر نے اخیر میں ''ایضاح'' کے حوالہ سے عدم جواز نقل فرمایا ہے اور علامہ شامیؒ نے اس کے ذیل میں منحۃ الخالق میں ایضاح کے قول کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے، لیکن چوں کہ اس زمانہ میں زیادہ تر لوگ اس قسم کے معاملات میں مبتلاء ہیں اس لیے ایضاح کے قول ارجح کو ترک کر کے عموم بلویٰ کے پیش نظر حضرت عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خط کو بنیاد بنا کر تالاب کو ٹھیکہ پر دینے کے مروج طریقہ کو جائز قرار دینا مناسب ہوگا۔

نیز صاحب ''درمختار'' اور ''ہدایہ'' کی عبارت بھی اس کے لیے مؤید ہے، لہذا عدم جواز کا قول کرنا مناسب نہ ہوگا صاحب بحر کی طویل عبارت میں سے اقتباس کر کے مختصر عبارت یہاں نقل کرتے ہیں:

''عن أبي الزناد قال كتبت إلى عمر بن الخطاب في بحيرة يجتمع فيه السمك بأرض العراق أن يواجرها فكتب أن افعلوا (إلى قوله) فكتب إلى عمر بن عبد العزيز يسئله عن بيع صيد الآجام. فكتب إليه عمر أنه لا بأس به (إلى قوله) لكن بعد مدته رأيت في الإيضاح عدم جواز إجارته (وقول الشامي) وما في الإيضاح بالقواعد الفقهية أليق''

(ابو الزناد فرماتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطابؓ کے پاس ایسے بڑے جھیل کے بارے میں خط لکھ کر معلوم کیا کہ جن میں مچھلیاں جمع ہو جاتی ہیں جو جھیل عراق کی سرزمین میں ہے، ان کو اجارہ پر دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ صاحب بحر فرماتے ہیں: تو حضرت عمرؓ نے اپنے مکتوب میں لکھا کہ اجارہ کا معاملہ کر سکتے ہو، پس عمر بن عبدالعزیز کے پاس خط لکھا گیا جس میں جھیل و تالاب کے شکار کی بیع سے متعلق سوال کیا گیا تھا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے مکتوب میں لکھا کہ ان کے بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے، صاحب ''بحر'' فرماتے ہیں: لیکن ایک مدت کے بعد ''ایضاح'' کے اندر اس کے اجارہ کے عدم جواز کی بات دیکھی گئی ہے اور علامہ شامیؒ ''منحۃ الخالق'' میں فرماتے ہیں کہ ایضاح کی عبارت زیادہ مناسب ہے)۔

سرکاری نہروں کو ٹھیکہ پر لینا

سرکاری نہروں کے مخصوص حصہ کو ٹھیکہ پر لینا اور اس مخصوص حصہ سے ٹھیکہ دار کا مچھلیاں مارنا اور کسی کو اس سے مچھلیاں مارنے نہ دینا شرعی طور پر کیا حکم رکھتا ہے؟

تو فقہی جزئیات کی روایات کا استقصاء کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس طریقہ سے مچھلی ہی کے لیے نہروں کو ٹھیکہ پر لینا شرعی طور پر جائز نہیں، اس لیے کہ اس میں غیر مملوک اشیاء کو فروخت کرنا لازم آتا ہے، کیوں کہ جو مچھلیاں نہروں میں ہوتی ہیں وہ آزاد مچھلیاں ہوتی ہیں کہیں سے آتی ہیں اور کہیں چلی جاتی ہیں کسی کی مملوک نہیں ہوتی تو ایسی صورت میں غیر مملوک اشیاء کی فروختگی لازم آتی ہے جو کہ شرعاً باطل ہے، ایسی بیع منعقد ہی نہیں ہوتی ہے اور ایسی صورت میں ہر شخص کو اس میں سے مچھلیاں مار کر حاصل کرنے کا اختیار ہوگا، شرعی طور پر ٹھیکہ داروں کو روکنے کا حق نہ ہوگا، اس کو صاحب ''فتح القدیر'' نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے۔

''ولا يجوز بيع السمك قبل أن يصطاد. لأنه باع ما لا يملكه و تحته في الفتح بيع السمك في البحر أو النهر لا يجوز''

(فتح القدیر مع الہدایہ ۶/۴۰۹)۔

(اور شکار کرنے سے پہلے مچھلیوں کو فروخت کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ اس میں ایسی چیزوں کا فروخت کرنا لازم آتا ہے جن کا وہ خود مالک نہیں اور فتح القدیر میں ہے کہ دریا میں یا نہر میں مچھلیوں کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے)۔

اور امام شمس الائمہ سرخسیؒ نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''ولا يجوز إجارة الآجام والأنهار لصيد السمك ولا لغيره؛ لأن المقصود استحقاق العين. ولأن السمك صيد مباح فكل من أخذه فهو أحق به'' (مبسوط سرخسی ۶ / ۲۳)۔

(اور بڑی بڑی جھیل اور نہروں کو مچھلی یا دوسری چیز کے لیے اجارہ پر دینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں مقصود عین کو حاصل کرنا ہوتا ہے (اور اجارہ منافع پر ہوتا ہے نہ کہ عین پر) اور اس لیے کہ مچھلی ایسی شکار ہے جو ہر شخص کے لیے مباح ہے، لہذا جو بھی پکڑے گا وہی اس کا حق دار ہوگا)۔

جواز کی متبادل شکل:

نہروں کو ٹھیکہ پر لینے کے لیے متبادل شکل یہ ہے کہ سرکار سے یہ طے کرلیا جائے کہ نہر اور اس نہر سے متعلق اس کے کنارے کو بھی کرایہ پر خاص مدت کے لیے لیا جائے اور ٹھیکہ دار کو یہ حق بھی حاصل ہوجائے کہ نہر کے کناروں سے وہ کسی قسم کی پیداوار یا خودرو گھاس یا پیڑ وغیرہ سے فائدہ اٹھا سکے تو اسی ضمن میں نہر کے اس مخصوص حصہ کو وہ اپنی تحویل میں لے سکتا ہے اور وہاں لوگوں کو آنے جانے سے منع کرسکتا ہے، اور اسی کے ذیل میں نہر کے اس حصہ سے جو مچھلیاں وہ حاصل کر لے گا وہ اس کی ملکیت ہوجائیں گی، اب اس کے لیے اس کو بیچنا خود کھانا اور خریدنے والوں کے لیے مچھلیاں خریدنا سب کچھ جائز ہوجائے گا، اس کو حضرات فقہاء نے لوگوں کے درمیان تعامل اور عموم بلویٰ کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے اور علامہ حصکفیؒ نے ''الدر المختار'' کے اندر اس کو مفتی بہ قرار دیا ہے، علامہ حصکفیؒ کی عبارت حسب ذیل ہے:

''وجاز إجارة القناة النهر مع الماء به يفتي لعموم البلوى'' (الدر المختار کراچی ۶ / ۶۳)۔

(نالے اور نہروں کو پانی کے ساتھ اجارہ پر دینا جائز اور درست ہے اور عموم بلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے)۔

''ہندیہ'' میں اس مسئلہ کو ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

''نہروں نالیوں اور کنوؤں کے پانی کو اجارہ پر دینا جائز نہیں ہے اور نہر اور نالیوں کو اگر پانی کے ساتھ اجارہ پر لیا جائے تو بھی جائز نہیں، اس لیے کہ اس کے اندر اصلاً عین کا استہلاک لازم آتا ہے اور اجارہ کا انعقاد عین پر نہیں ہوتا ہے، بلکہ منافع پر ہوتا ہے، لیکن عموم بلویٰ کی وجہ سے فتویٰ جواز پر ہے'' (ہندیہ ۴ / ۴۴۱)۔

فقہاء کی مذکورہ تشریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہروں کے اندر جو مچھلیاں ہوتی ہیں ان کو ٹھیکہ پر لینا شرعی طور پر جائز نہیں ہے، لیکن اگر نہر کے کناروں کو عقد میں شامل کرکے نہر کے مخصوص حصہ کے پانی کو ٹھیکہ پر لے لیا جائے تو عموم بلویٰ اور تعامل ناس کی وجہ سے عقد اجارہ جائز ہوجاتا ہے اور اس کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ نہر کے اس حصہ پر آنے سے دوسروں کو روک دے اور خود نہر کے اس حصہ سے مچھلیاں مار مار کر اپنے استعمال میں لائے یا فروخت کرے۔

بیع فاسد میں مشتری ثانی کا تصرف:

تالاب، جھیل اور نہروں کو ٹھیکہ پر لینے یا ان کی مچھلیوں کو پکڑنے سے پہلے فروخت کرنے کی جو صورتیں ماقبل میں تفصیل سے آچکی ہیں ان میں سے جن صورتوں میں مقدور التسلیم نہ ہونے کی وجہ سے عقد فاسد ہوجاتا ہے اور رفع فساد کے لیے جو حیلے اور طریقے بتلائے گئے ہیں ان میں سے کوئی حیلہ بھی اختیار نہ کیا گیا ہو تو ایسی صورت میں عقد اپنی جگہ فاسد ہی رہے گا، لیکن عقد فاسد کی وجہ سے مبیع مشتری کی ملکیت سے باہر نہیں ہوتی ہے، بلکہ ملکیت میں آجاتی ہے مگر اس کے لیے صحت کی شرائط کو اختیار کرنے سے پہلے تصرف کرنا جائز نہیں ہو ہے تاہم اگر مشتری اول نے دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیا ہے یا ہبہ کردیا ہے یا صدقہ کردیا ہے تو ان تمام صورتوں میں مشتری ثانی اور موہوب لہ اور متصدق علیہ کے لیے اشیاء مذکورہ جائز اور حلال ہوجاتی ہیں اس کے حق میں کسی قسم کی خرابی باقی نہیں رہتی ہے، لہذا تالاب اور جھیل وغیرہ کے مذکورہ مسائل میں اگر معاملہ فاسد اختیار کیا گیا ہے اس کے بعد ٹھیکیدار اور یا مشتری اول سے دوسرے لوگ مچھلیاں خرید لیں یا وہ مچھلیاں بزار اور مارکیٹ میں آجائیں تو وہاں سے جو شخص بھی خرید دے گا تو اس کے لیے خریدنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا سب کچھ بلاتردد جائز اور حلال ہے اس کے حق میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہے گا (تفصیل کے لیے دیکھئے: درمختار ۵ / ۹۸، عنایہ مصری نسخہ ۵ / ۲۳۲، البحر الرائق ۶ / ۹۵، بدائع الصنائع ۵ / ۳۰۱)۔

☆☆☆

بیع کے چند مسائل

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

۱- سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر ان مچھلیوں کے نکالے ہوئے بیع کے مجہول ہونے یا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ممنوع وناجائز ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''ولا يجوز بيع السمك قبل أن يصطاد؛ لأنه باع ما لا يملكه ولا فی خطيرة إذا كان لا يؤخذ إلا بصيد، لأنه غير مقدور التسليم، ومعناه إذا أخذ ثم ألقاه فيها، ولو كان يؤخذ من غير حيلة جاز إلا إذا اجتمعت فيها بأنفسها، ولم يسد عليها المدخل لعدم الملك'' (ہدایہ ۳/ ۳۴، نیز درمختار ۴/ ۱۱۹)۔

ان مذکور الصدر عبارت سے یہ واضح ہوا کہ ندیوں اور تالابوں میں مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر شکار کیے ہوئے اور بدون نکالے ہوئے ناجائز ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ فتح القدیر (۶/ ۴۹) میں لکھتے ہیں:

''فإن كانت له خطيرة فدخلها السمك فإما أن يكون أعدّها لذلك أولا. فإن كان أعدّها لذلك فما دخلها ملكه، وليس لأحد أن يأخذه ثم إن كان يؤخذ بغير حيلة اصطياد جاز بيعه، لأنه مملوك مقدور التسليم وإن لم يكن يؤخذ إلا بحيلة لا يجوز بيعه لعدم القدرة على التسليم عقيب البيع۔ ۔۔ الخ'' (۶/ ۹۷، الدر والرد ۴/ ۱۱۹)۔

علامہ ابن ہمامؒ کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ سرکاری تالاب یا ندی نالوں یا اپنی ملکیت کے حوض وگڈھے میں مچھلیاں ہیں بغیر ان کو نکالے ہوئے ان کی بیع وشراء جائز ہونے کے لیے مملوک ومقدور التسلیم ہونا ایک ساتھ شرط ہے، اگر مملوک ومقدور التسلیم ہیں تو پانی میں ان کی بیع وشراء جائز ہے، جیسے اپنی ملکیت کا حوض وگڈھا جو مچھلی کے لیے بنایا گیا ہے کہ جس سے بغیر شکار کے حیلہ کے مچھلی پکڑی جاسکتی ہے، اور اگر ملکیت کا ہی حوض وگڈھا ہے، لیکن بغیر حیلہ کے مچھلی پکڑی نہیں جاسکتی تو گوکہ مملوک ہے، لیکن مقدور التسلیم نہیں ہے، اس لیے اس کی بیع وشراء ناجائز ہے۔

اسی طرح سرکاری تالاب یا ندی نالے مملوک سرکاری ہیں، لیکن مچھلیاں چوں کہ بغیر حیلہ شکار پکڑی نہیں جاسکتیں، اس لیے وہ مقدور التسلیم نہیں ہیں، لہذا بغیر ان کو نکالے ہوئے پانی میں ان کی بیع وشراء ناجائز ہے، اور اگر مقدور التسلیم ہیں، لیکن مملوک نہیں تب بھی پانی میں بیع وشراء ناجائز ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ نے (۶/ ۹۷) میں ''مسند احمد'' کی ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ ''نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پانی میں مچھلی کی بیع وشراء نہ کرو کیوں کہ وہ دھوکا ہے''۔

لہذا صورت مسئولہ میں سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر ان مچھلیوں کے نکالے ہوئے اصول شرع کے اعتبار سے ناجائز ہے، لیکن چوں کہ ہمارے ملک میں یہ بیع وشراء عام ہے اور ابتلاء بھی عام ہے، اور یہ عرف اہل ھنود کا ہے جو احکام شریعت میں حجت نہیں، لہذا عدم جواز ہی کا فتوی دیا جائے، چنانچہ ہمارے اکابر علماء ہند رحمہم اللہ کے سامنے یہ سوال آیا تو ناجائز کا فتوی دیا، چنانچہ مولانا عبدالحئی فرماتے ہیں: ''شکار کرنے سے پہلے تالاب کے اندر مچھلی کا فروخت کرنا جائز نہیں، لیکن اگر کسی نے شکار کرنے سے پہلے ہی ان کو کسی سامان کے عوض فروخت کردیا تو بیع فاسد ہے، اور اگر دراہم ودنانیر کے بدلے فروخت کیا تو بیع باطل ہے، اور اگر مچھلی شکار کرکے ایسی جگہ چھوڑ دیا کہ وہاں سے حیلہ تدبیر سے پکڑنا ممکن نہیں تو بھی بیع فاسد ہوگی، اور اگر حیلہ سے پکڑنا ممکن ہو تو صحیح ہوجائیگی، اور بیع باطل میں خریدار کے قبضہ کرلینے کے باوجود ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور بیع فاسد کو ختم کرنا واجب ہے'' (مجموعہ فتاویٰ ص/ ۲۷۵)۔

---

[1] خادم الحدیث النبوی فی الجامعۃ العربیۃ مفتاح العلوم، مئو۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: ''جن صورتوں میں داخل ملک ہی نہیں ہوئے اس میں بدون پکڑے ہوئے بیع کرنا مطلقاً جائز نہیں، اور جن صورتوں میں داخل ملک ہوگئی اس میں دیکھنا چاہیے کہ اگر پکڑنے کے لیے کچھ حیلہ وتدبیر کی ضرورت ہے تب بھی بیع جائز نہیں، ''لأنه غير مقدور التسليم'' اور اگر بلا کسی تدبیر کے پکڑنا آسان ہو تو بیع جائز ہے، مثلاً کسی چھوٹے گڈھے یا برتن میں ہو کہ ہاتھ ڈال کر پکڑ لیں (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹)۔

خلاصہ یہ کہ صورت مسئولہ میں سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں مچھلیوں کی بیع وشراء بدون نکالے اور شکار کیے ہوئے ناجائز ہے اور موجودہ عرف چوں کہ نص کے خلاف ہے، اس لیے حجت نہیں بن سکتا۔

۲- ٹھیکیدار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان کا پوری صورت حال جانتے ہوئے ایسی مچھلی کو خریدنا جائز ہے، چنانچہ حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں: ''جہاں تک ٹھیکہ دار کی بیع وشراء کا سوال ہے تو فرماتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ دریائی مچھلیوں کا یہ ٹھیکہ، یعنی بیع وشراء ہے اور اس کی حقیقت شرعیہ یہ ہوتی ہے کہ بوقت ٹھیکہ بھی دریا میں مچھلیاں موجود ہوتی ہیں اور پکڑی بھی جاتی ہیں اگرچہ ان کی مقدار معلوم ومتعین نہیں ہوتی، اس لیے اس معاملہ بیع کو معدوم کی بیع کہہ کر باطل نہیں کہہ سکتے، بلکہ ''بیع غیر مقبوض'' یا ''بیع موجود غیر معلوم المقدار'' کہہ سکتے ہیں اور ایسی بیع فاسد ہوتی ہے اور اس کا اقالہ (ختم کرنا) واجب ہوتا ہے، اگر اقالہ نہ کرے بلکہ بیع صحیح کردے تو بیع صحیح ہوجاتی ہے اور اس کا مالک بملک صحیح ہوجاتا ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

''فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه وسقط عن الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني و نقض الأول لحق الشرع، وحق العبد لعدم الحاجة. ولأن الأول مشروع بأصله دون وصفه. والثاني مشروع بأصله وصفه. فلا يعارضه مجردا لوصف. ولأنه مصل بتسليط من جهة البائع'' (ہدایہ مع فتح ۶/ ۹۸، فتاوی نظامیہ ۱/ ۲۱۱)۔

حضرت مفتی نظام الدینؒ آگے فرماتے ہیں: ''اس لیے اگر مسلمان بھی اس طرح ٹھیکہ لے کر اور خود مچھلیاں پکڑ کر یا اپنے مزدوروں سے پکڑوا کر فروخت کردے تو اس کی یہ بیع بلا شبہ صحیح ونافذ ہوجاتی ہے، لیکن مسلمان ترک اقالہ نہ کرنے سے مبتلائے معصیت ہوگا، اس لیے مسلمان کے لیے اعلیٰ بات یہ ہوگی کہ چوں کہ غیر مسلم ان جزئیات کا مخاطب نہیں ہوتا ہے، اس لیے کسی غیر مسلم سے کہے کہ تم اپنے نام سے خریدو پھر میں تم سے خریدوں گا پھر جب وہ غیر مسلم خریدے تو اس سے یہ مسلمان خرید کر ان مچھلیوں کو خود پکڑ کر یا اپنے مزدور سے پکڑوا کر فروخت کرے تو بلا شبہ یہ بیع شراء ہر طرح درست وصحیح رہے گی'' (فتاوی نظامیہ ۱/ ۲۱۱)۔

خلاصہ یہ کہ صورت مسئولہ میں اس فتویٰ کی روشنی میں ٹھیکہ دار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان کا ایسی مچھلی کو خریدنا دونوں جائز ہے۔

۳- جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے اگر وہ شخص مچھلی پکڑ کر حوض یا تالاب میں چھوڑ دے تو وہ اس مچھلی کا مالک ہے تو اگر وہ مچھلیاں بغیر حیلۂ شکار کے پکڑی جاتی ہیں تو شکار سے پہلے کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، کیوں کہ وہ مچھلیاں مملوک ومقدور التسلیم ہیں اور دوسرا شخص ایک خاص مدت میں اس حوض یا تالاب کی مچھلیاں نکال کر فروخت کردے تو شرعاً یہ صورت معاملہ جائز ہے، اور تالاب یا حوض کی مچھلیوں کو شکار کرنے سے پہلے کسی کے ہاتھ شرط مذکور کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، اور اگر حیلۂ شکار سے پکڑی جاتی ہوں تو شکار سے پہلے بیع ناجائز ہے، کیوں کہ اگرچہ وہ مملوک ہیں، لیکن مقدور التسلیم نہیں ہیں اور جواز کے لیے دونوں کا ہونا شرط ہے۔

چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''ولو لم يعدها لذلك ولكنه أخذه ثم أرسله في الحظيرة ملكه، فإن كان يؤخذ بلا حيلة جاز بيعه لأنه مملوك مقدور التسليم أو بحيلة لم يجز؛ لأنه وإن كان مملوكا فليس مقدور التسليم'' (فتح القدیر ۶/ ۴۹، نیز دیکھئے: شامی ۴/ ۱۱۹)۔

خلاصہ یہ کہ جو حوض یا تالاب کسی کی ذاتی ملکیت ہے تو اگر وہ مچھلی پکڑ کر پالنے کے لیے اس میں چھوڑے تو وہ چوں کہ اس کا مالک ہے اور مچھلی بغیر حیلۂ شکار کے پکڑ سکتا ہے تو شکار سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، اور وہ دوسرا ایک خاص مدت میں اس کی مچھلیاں نکال کر فروخت

کرے تو یہ معاملہ جائز ہے۔

۴- اگر کسی کی ذاتی ملکیت یا عوامی ملکیت کا حوض یا تالاب ہو اور اس میں بارش وغیرہ کی وجہ سے مچھلیاں از خود آ گئی ہوں تو اگر مالک نے حوض یا تالاب کو مچھلی آنے کے لیے بنایا ہے تو جو مچھلیاں اس میں آ جائیں گی وہ ان کا مالک ہو جائے گا اور کسی کے لیے ان کا پکڑنا جائز نہیں ہوگا، پھر اگر وہ مچھلیاں بغیر حیلہ شکار کے پکڑی جا سکتی ہوں تو انہیں کسی کے ہاتھ فروخت کرنا یا اس حوض یا تالاب کو کسی خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا اس طور پر کہ اس مدت میں ٹھیکہ والے ہی کو اختیار ہوگا کہ وہ اس تالاب کی مچھلیاں شکار کر کے فائدہ اٹھائے تو یہ صورت معاملہ شرعاً جواز کا حکم رکھتی ہے، کیوں کہ وہ مملوک ومقدور التسلیم ہیں، اور اگر مچھلیاں بغیر حیلۂ شکار کے پکڑی نہیں جا سکتیں تو بیع کے بعد مقدور التسلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان کا فروخت کرنا اور ٹھیکہ پر دینا جائز نہیں۔

اور اگر مالک نے حوض یا تالاب کو مچھلی آنے کے لیے نہیں بنایا ہے تو اس صورت میں آ جانے والی مچھلیوں کا مالک نہیں ہوگا، لہٰذا مملوک نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو ان کا فروخت کرنا جائز ہے اور نہ تو ٹھیکہ پر دینا، البتہ اگر مچھلیاں آ جانے کے بعد حوض یا تالاب کو بند کر دے تو اس وقت ان آنے والی مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا، پھر اگر وہ مچھلیاں بغیر حیلۂ شکار کے پکڑی جا سکتی ہیں تو ان کو فروخت کرنا اور ٹھیکہ پر دینا جائز ہے، ورنہ نہیں۔

اور اگر مالک نے حوض یا تالاب کو مچھلی آنے کے لیے نہیں بنایا ہے، لیکن اس نے مچھلیاں پکڑ کر اس میں چھوڑ دیا تو اس صورت میں ان کا مالک ہو جائے گا، پھر اگر وہ مچھلیاں بغیر حیلۂ شکار پکڑی جا سکتی ہیں تو ان کو فروخت کرنا اور ٹھیکہ پر دینا جائز ہے، کیوں کہ وہ مملوک ومقدور التسلیم نہیں ہیں (فتح القدیر ۶/۴۹، بحر الرائق ۴/۹۷)۔

نیز علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی نے گڈھا کھودا تو اس میں مچھلیاں آ گئیں تو اگر اس نے گڈھا مچھلی کے شکار کے لیے بنایا ہے تو وہ ان مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا اور کسی کے لیے ان کا پکڑنا جائز نہیں ہوگا، اور اگر گڈھا مچھلی کے شکار کے لیے نہیں بنایا ہے تو اس صورت میں جو پکڑ لے گا وہ مچھلیاں اسی کی ہونگی (فتح القدیر ۶/۴۹، بحر الرائق ۶/۹۷)۔

خلاصہ یہ کہ کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو یا عوامی ملکیت کا اور اس میں بارش وغیرہ کی وجہ سے مچھلیاں آ گئی ہوں تو تفصیل مذکور فی الجواب کے ساتھ مالک حوض یا تالاب کے لیے ان مچھلیوں کا مالک ہو کر کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے یا کسی کو خاص مدت کے لیے ٹھیکہ کے طور پر دینا بھی جائز ہے۔

خلاصۂ بحث:

۱-صورت مسئولہ میں سرکاری تالاب یا ندی، نالوں میں مچھلیوں کی بیع وشراء بدون نکالے اور بدون شکار کے ناجائز ہے، اور موجودہ عرف چوں کہ نص کے خلاف ہے، اس لیے وہ حجت نہیں بن سکتا۔

۲-صورت مسئولہ میں اس فتویٰ کی روشنی میں ٹھیکہ دار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان کا ایسی مچھلی کو خریدنا دونوں جائز ہے۔

۳-جو حوض یا تالاب کسی کی ذاتی ملکیت ہے تو اگر وہ مچھلی پکڑ کر پالنے کے لیے اس میں چھوڑے تو چوں کہ وہ اس کا مالک ہے اور مچھلی کے بغیر حیلۂ شکار پکڑ سکتا ہے تو شکار سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے اور وہ دوسرا ایک خاص مدت میں اس کی مچھلیاں نکال کر فروخت کر سکتا ہے اور یہ معاملہ جائز ہے۔

۴-کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو یا عوامی ملکیت کا اور اس میں بارش وغیرہ کی وجہ سے مچھلیاں آ گئی ہوں تو تفصیل مذکور فی الجواب کے ساتھ مالک حوض یا تالاب کے لیے ان مچھلیوں کا مالک ہو کر کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، یا کسی کو خاص مدت کے لیے ٹھیکہ کے طور پر دینا بھی جائز ہے۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کا مسئلہ

مولانا خورشید انور اعظمی [1]

شریعت اسلامیہ نے دریا، ندی اور نالے میں پائی جانے والی مچھلیوں کو ہر شخص کے لیے مباح قرار دیا ہے، جو بھی اپنے حیلہ اور تدبیر سے ان کا شکار کرلے وہ ان کا مالک شمار کیا جاتا ہے، اور اسے ان پر تصرف کرنے کا پورا حق ہوتا ہے، اور جب وہ پانی کے اندر ہوتی ہیں، اور شکار کے ذریعہ ان پر قبضہ نہیں ہوا رہتا ہے، وہ کسی فرد خاص کی ملک نہیں ہوتیں، اسی بنا پر شکار کیے بغیر ان کا کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہوتا، کیوں کہ ابھی تک وہ کسی کی مملوک نہیں ہیں، معدوم ہیں، اور معدوم کی بیع باطل ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''ردالمحتار'' میں رقم طراز ہیں:

''فسد بیع سمك لم یصد، وفیه أن بیع مالیس فی ملکه باطل کما تقدم، لأنه بیع المعدوم والمعدوم لیس بمال'' (ردالمحتار ۴/۱۱۹)۔

(اس مچھلی کی بیع فاسد ہے جس کو شکار نہ کیا گیا ہو اور اس میں کبھی آیا ہے اسی چیز کی بیع باطل ہے جو آدمی کی ملکیت میں ہو، جیسا کہ گزر چکا ہے، اس لیے کہ یہ معدوم کی بیع ہے اور معدوم مال نہیں ہے)۔

صاحب ''ہدایہ'' نے بھی اس کی صراحت فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

''ولا یجوز بیع السمك قبل أن یصطاد، لأنه باع ما لا یملکه'' (ہدایہ ۳/۵۰)۔

(اور مچھلی کی بیع شکار سے قبل جائز نہیں ہے، اس لیے کہ آدمی نے ایسی چیز بیچی ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے)

(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: عنایہ ۵/۱۹۱، بحر الرائق ۶/۷۳، فتح القدیر ۵/۱۹۱، عالمگیری ۳/۹۰)۔

قاضی ابو یوسف نے اس طرح کی مچھلیوں کی بیع کے عدم جواز کی علت غرر بتائی ہے اور انہیں اعیان مباحہ میں سے قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

''وسألت یا أمیر المؤمنین عن بیع السمك فی الأجام ومواضع مستنقع الماء فلا یجوز بیع السمك فی الماء. لأنه غرر وهو الذی یصیده'' (کتاب الخراج/۹۵)۔

(اور اے امیر المؤمنین آپ نے دریافت کیا ہے کہ جو مچھلیاں پانی کے اندر جھاڑیوں مین اور پانی کے جمع ہونے کی جگہوں میں رہتی ہیں تو پانی کے اندر رہتے ہوئے مچھلی کا بیچنا درست نہیں ہے اور یہ مچھلی اس کے لیے ہے جو اس کا شکار کرے)۔

جب اس طرح کی مچھلیاں مباح الاصل ہیں، کسی کی مملوک نہیں ہیں، جو انھیں پکڑ لیتا ہے وہی ان کا مالک ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اگر کوئی شخص ان مچھلیوں کا شکار کیے بغیر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو یہ بیع درست اور جائز نہیں ہوگی، بلکہ باطل اور کالعدم شمار کی جائے گی، اور جو شخص بھی ان کا شکار کرے گا ان کا حقیقی مالک قرار پائے گا، چنانچہ اس طرح کا معاملہ ہوجانے کے بعد اگر مشتری نے شکار کر کے انھیں فروخت کر دیا تو اس کا فروخت صحیح اور خریداروں کا ان کو خرید کر استعمال کرنا صحیح ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ مشتری ان مچھلیوں کا مالک شکار کرنے کے سبب ہوا ہے نہ کہ سابقہ بیع باطل کے سبب۔

تالاب میں مچھلی کی بیع اور اس کا حکم:

حوض یا تالاب میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء کے بارے میں فقہاء کرام نے بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اور ان کی مختلف

[1] جامعہ مظہر العلوم بنارس۔

صورتیں ذکر فرما کر ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حکم تحریر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ تالاب یا حوض اسی کام کے لیے تیار کیے گئے ہیں یا نہیں، اگر اسی کام کے لیے وہ بنائے گئے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں: اگر مچھلی کا پکڑنا بغیر کسی تدبیر کے ممکن ہو تو اس کی بیع جائز ہے، اس وجہ سے کہ وہ مملوک بھی ہے اور مقدور التسلیم بھی، اور اگر بغیر کسی تدبیر کے پکڑی نہ جا سکتی ہو تو اس کی بیع جائز نہیں ہے، اس وجہ سے کہ وہ مملوک تو ضرور ہے، لیکن مقدور التسلیم نہیں ہے، اور وہ حوض یا تالاب اس کام کے لیے تیار نہیں کیے گئے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں: یا تو مچھلی از خود اس میں آ گئی ہے، یا کسی نے پکڑ کر اس میں چھوڑا ہے، اگر کسی نے پکڑ کر اس میں چھوڑا ہے اور بغیر کسی حیلہ اور تدبیر کے اس کا پکڑنا ممکن بھی ہے تو جائز، ورنہ ناجائز، اور اگر از خود کسی طرح آ گئی ہے اور حوض کے دہانے کو بند کر کے اس کو روکنے کا پورا بندوبست کیا گیا ہے تو دیکھا جائے گا کہ بغیر کسی تدبیر کے اس کو پکڑا جا سکتا ہے یا نہیں، اگر پکڑا جا سکتا ہے تو جائز، ورنہ ناجائز۔

علامہ ابن ہمام نے اپنی گرانمایہ تصنیف ''فتح القدیر'' میں اس پر تفصیلی کلام کیا ہے، دیکھیے: (فتح القدیر ۵ /۱۹۱)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے اسی بات کو ''فتح القدیر'' ہی کے حوالے سے نقل فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

''اگر مچھلی تالاب میں آ جائے تو یا تو آدمی نے اس کو مچھلیوں کے لیے تیار کیا ہوگا یا نہیں، پہلی صورت میں آدمی مچھلی کا مالک ہو جائے گا، اور کسی تدبیر کے بغیر پکڑنا ممکن ہو تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے، کیوں کہ مچھلی ملکیت میں اور سپردگی قدرت میں ہے، ورنہ مچھلی کا بیچنا جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ سپردگی پر قدرت نہیں ہے اور دوسری صورت میں آدمی اس کا مالک نہیں ہوگا تو ملک نہ ہونے کی وجہ سے اس کا بیچنا جائز نہیں ہوگا، الا یہ کہ مچھلی کے داخل ہونے کے بعد تالاب کا منہ بند کر دے تو مالک ہو جائے گا، اس کے بعد اگر بغیر کسی تدبیر کے اس کا پکڑنا ممکن ہو تو بیچنا جائز ہے، ورنہ نہیں، اور اگر اس کے لیے تیار نہیں کیا، لیکن مچھلی پکڑ کر اس میں ڈال دی تو مالک ہو جائے گا، پھر اگر بغیر تدبیر کے پکڑنا ممکن ہو تو بیچنا جائز ہے، اس لیے کہ اس کی سپردگی قدرت میں ہے اور اگر حیلے و تدبیر کے ساتھ پکڑی جا سکے تو جائز نہیں ہے، کیوں کہ اگرچہ مملوک ہے لیکن سپردگی پر قدرت نہیں ہے'' (دیکھیے: رد المحتار ۴ /۱۱۹)۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تالاب کی مچھلیوں کی بیع کے لیے ان کا مملوک ہونا اولین شرط ہے، اور مملوک ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ حوض یا تالاب مچھلی پالنے ہی کے مقصد سے بنائے گئے ہوں یا مچھلیاں پکڑ کر ان میں چھوڑی گئی ہوں، یا اگر از خود آ گئی ہوں تو ان کے روکنے کا پورا بندوبست کیا گیا ہو تب جا کر یہ مچھلیاں کسی کی ملک میں آتی ہیں اور وہ شخص ان کے فروخت کرنے کا حق دار بنتا ہے، لیکن اگر ایسا کچھ بھی نہیں کیا گیا تو صرف ان مچھلیوں کے کسی کے حوض میں آ جانے سے ملکیت ثابت نہیں ہوگی۔

''عینی شرح کنز'' میں ہے:

''فإن اجتمع السمك فی الحظیرة بنفسه من غیر صنعه ولم یسد علیه المدخل لا یجوز بیعه. سواء أمكنه الأخذ بحیلة أو بغیرها'' (عینی شرح کنز ۳ /۵۲)۔

(اگر مچھلی تالاب میں خود بخود بغیر کسی محنت کے آ جائے اور راستہ بند نہ کرے تو بیچنا جائز نہیں ہے، خواہ پکڑنا کسی تدبیر سے ممکن ہو یا اس کے بغیر)۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (بحر الرائق ۶ /۷۳، عنایہ ۵ /۱۹۱)۔

یہ اس وجہ سے کہ جو چیزیں مباح الاصل ہیں، ان کے مالک ہونے کے لیے ان کا پکڑنا یا پکڑنے کی مناسب تدبیر اختیار کرنا ضروری ہے، محض کسی کی زمین میں آ جانے سے اس کی ملکیت کا ثبوت نہیں ہو جاتا۔

صاحب ''ہدایہ'' نے اس طرح کی چیزوں کے بارے میں صراحت فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

'' وإذا فرخ طیر فی أرض رجل فهو لمن أخذه، وكذا إذا باض فیها، وكذا إذا تكنس فیها ظبی''۔

(اور اگر کوئی پرندہ کسی آدمی کی زمین میں بچے پیدا کرے تو وہ بچے اس کے ہوں گے جو ان کو پکڑ لے، اسی طرح اگر انڈا دیدے تو بھی یہی حکم ہوگا، یا جب کسی کی زمین میں کوئی ہرن اپنا مسکن بنائے)۔

علامہ ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں اس پر تفریع کرتے ہوئے فرمایا:

''ومن جنس هذه المسائل لو اتخذ في أرضه حظيرة للسمك، فدخل الماء والسمك ملكه، ولو اتخذت لغيره فمن أخذ السمك فهو له، وكذا في حفر الحفيرة إذا حفرها للصيد فهو له أو لغرض أخر فهو للآخذ'' (فتح القدیر ۵ / ۳۶۷)۔

(اسی قبیل کے مسائل میں یہ ہے کہ اگر کسی انسان نے اپنی زمین میں مچھلیوں کے لیے گڑھے کھودا، اور اس میں پانی اور مچھلی دونوں آجائیں تو وہ اس کا مالک ہوجائے گا اور اگر کسی دوسری غرض سے گڑھا بنایا تو جو مچھلی پکڑے گا اسی کی ہوگی، اسی طرح گڑھا کھودنے کا حکم ہے کہ اگر شکار کے لیے کھودے تو شکار اس کے لیے ہوگا، اور اگر کسی دوسرے کام کے لیے ہو تو شکار اس کا ہوگا جو اس کو پکڑے)۔

لہذا اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے حوض کی مچھلی پکڑ لیتا ہے، جبکہ وہ حوض نہ تو اس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے اور نہ اس میں مچھلی چھوڑی گئی ہے، اور نہ اس میں آنے والی مچھلیوں کے روکنے کا بندوبست کیا گیا ہے، تو اس شخص کا پکڑنا درست ہوگا اور وہ اس مچھلی کا مالک ہوگا۔

تالاب کے ٹھیکے کا مسئلہ:

سب سے پہلے اصولی طور پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ تالاب یا حوض کے متعینہ مدت کے لیے ٹھیکے پر دینے کا مسئلہ اصطلاحی زبان میں اجارہ کا مسئلہ ہے، اور فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ اجارہ منافع پر ہوتا ہے اعیان پر نہیں۔

''اعلاء السنن'' میں ہے:

''قال الموفق: المعقود عليه في الإجارة المنافع، هذا قول أكثر أهل العلم منهم مالك وأبو حنيفة وأكثر أصحاب الشافعي'' (إعلاء السنن للتھانوی ۱۶ / ۱۵۲)۔

(موفق کا قول ہے: اجارہ میں معقود علیہ منافع ہوتے ہیں یہ اکثر اہل علم کا قول ہے جن میں امام مالکؒ و امام ابوحنیفہؒ اور اکثر اصحاب شافعی ہیں، لہذا اگر کوئی شخص منافع کے بجائے اعیان پر اجارہ کرتا ہے تو وہ اجارہ باطل ہوگا)۔

''فتاوی خیریہ'' میں بھی ایسا ہی ہے۔

چوں کہ مچھلی کے شکار کے لیے تالاب یا حوض کا ٹھیکے پر دینا بھی منفعت پر اجارہ کرنا ہے، اس وجہ سے علماء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔

''ردالمحتار'' میں ہے:

''نہر'' میں ہے جان لو کہ مصر میں بہت سے چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں جیسے فہادہ کا تالاب جن میں مچھلیاں جمع ہوجاتی ہیں تو کیا ان تالابوں کو مچھلی کے شکار کے لیے کرایہ پر دینا جائز ہے؟ ''بحر'' میں ''ایضاح'' سے عدم جواز نقل کیا ہے'' (ردالمحتار ۴ / ۱۹۹، نیز تفصیل کے لیے دیکھئے: بدائع الصنائع ۴ / ۱۷۵، عالمگیری ۴ / ۴۴۲)۔

تفصیلات بالا سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تالاب کا اجارہ بغرض شکار صحیح اور درست نہیں ہے، کیوں کہ اس میں اجارہ منفعت پر ہونے کے بجائے عین پر ہورہا ہے اور اجارہ کی حقیقت ہی فوت ہوجارہی ہے، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے اس سے بچنے کی تدبیر تحریر فرمائی ہے، تاکہ اگر اس طرح کی صورت حال پیش آجائے تو اسے اختیار کرکے ایک ناجائز امر کے ارتکاب سے بچا جاسکے، اور معاملہ کے جائز طریقے کو اپنایا جاسکے۔

''عالمگیری'' میں ہے:

''والحيلة في جوازها أن يستأجر موضعا من الأرض ليضرب فيه فسطاطا أو ليجعله حظيرة لغنمه فتصح الإجارة ويبيح صاحب المراعي له الانتفاع بالمرعى كذا في المحيط'' (عالمگیری ۴ / ۴۴۲)۔

جواز کا حیلہ یہ ہے کہ زمین کا ایک حصہ کرایہ پر لیا جائے تاکہ اس میں کوئی خیمہ لگایا جائے یا بکریوں کا باڑہ بنایا جائے، تو اجارہ صحیح ہے، اس کے ساتھ چراگاہ کا مالک چراگاہ سے نفع اٹھانے کی اجازت دے دے (مزید جواز حیلہ کے لیے دیکھئے: ردالمحتار ۵ / ۴۴)۔

یعنی اگر صاحب تالاب، تالاب کی زمین کو بطور اجارہ دے دے اور اس کے اندر پائی جانے والی تمام چیزوں کو مستاجر کے لیے مباح کردے تو یہ

درست ہوگا، اور اجارہ کے جواز کی شکل پیدا ہو جائے گی۔

لیکن آج جبکہ اس طرح کا ٹھیکہ عام طور پر ہوتا ہے اور صورت حال عموم بلوی کی سی ہو چکی ہے تو راقم الحروف کی ناقص رائے یہ ہے کہ بغیر حیلہ کے اس کے جواز کا فتوی دیا جانا چاہیے، جیسا کہ بعض مسائل میں اصلاً عدم جواز کے باوجود مخصوص حالات کے تحت فقہاء نے جواز کا فتوی دیا ہے، مثلاً پانی کے ساتھ ندی، نالے کے اجارہ کو عام طور پر ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

''بدائع الصنائع'' میں ہے:

'' فإن استأجر القناة والعين والبئر مع الماء لم يجز أيضا، لأن المقصود منه الماء''

(اگر نہر و چشمہ اور کنواں، پانی کے ساتھ کرایہ پر لیا جائے تو بھی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مقصود پانی اور اس سے انتفاع ہے)۔

مگر عموم بلوی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے جواز کا فتوی دیا گیا ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے:

''وإن استأجر النهر والقناة مع الماء لم يجز أيضا، لأن فيه استهلاك العين أصلا والفتوى على الجواز لعموم البلوى''

(اور اگر دریا و نہر کو پانی کے ساتھ کرایہ پر لے تو بھی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں قصداً ایک عین کا استعمال و ختم کرنا ہے، البتہ اب عموم بلوی کی وجہ سے جواز کا فتوی ہے)۔

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ جواز کا فتوی ضرورت کی بنیاد پر ہوا کرتا ہے، اور یہ ضرورت جب ''حیلہ'' سے پوری ہو جا رہی ہے تو اس کو جائز قرار دیے جانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لیکن صورت حال کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں میں جہالت عام ہے جس کے سبب عامۃ الناس اولاً تو حیلہ سے بے خبر ہیں، پھر اگر انھیں اس کی واقفیت بھی ہو جائے تو اس کے حدود کی پوری رعایت بھی سب کے بس کی بات نہیں ہے، یا بصورت دیگر ایک ناجائز امر کا ارتکاب کرتے رہیں گے، لہذا اگر اس تنگی کو رفع کرنے کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ جب کہ فقہ کا عام قاعدہ ہے:

''إذا ضاق الأمر اتسع، والمشقة تجلب التيسير، والحرج مدفوع''۔

خلاصۂ بحث:

۱- شکار کیے بغیر مچھلی کی بیع جائز نہیں ہے، باطل ہے۔

۲- چوں کہ وہ مچھلی کسی کی ملکیت نہیں ہے، لہذا جو بھی اس کا شکار کر لے وہ اس کا مالک تصور کیا جائے گا، اب اگر ٹھیکہ دار ہی اس کا شکار کر کے لاتا ہے تو اس کا فروخت کرنا جائز اور مشتری کا اسے خریدنا جائز ہوگا، ٹھیکہ دار کی سابقہ بیع کا اعتبار نہیں ہوگا۔

۳- نجی ملکیت کے حوض یا تالاب میں مچھلی پال کر بغیر شکار کیے ہوئے فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ مقدور التسلیم ہو۔

۴- ذاتی ملکیت کے حوض یا تالاب میں اگر از خود مچھلیاں چلی آئیں، اور وہ حوض یا تالاب مچھلی پالنے کی غرض سے نہ بنائے گئے ہیں اور نہ ان مچھلیوں کے روکنے کا بندوبست کیا گیا ہے تو بغیر شکار کیے ہوئے ان کا فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، خواہ مقدور التسلیم ہوں یا نہ ہوں، اس وجہ سے کہ وہ مملوک ہی نہیں ہیں، اور اگر اسی کام کے لیے بنائے گئے ہیں یا مچھلیوں کے روکنے کا بندوبست کیا گیا ہے تو ان کی بیع جائز ہوگی بشرطیکہ بائع مشتری کے حوالہ کرنے پر قادر ہو، حاصل کلام یہ کہ اگر مچھلی مملوک مقدور التسلیم ہو تو اس کی خرید و فروخت جائز ہے، ورنہ نہیں۔

۵- حوض یا تالاب کو ٹھیکہ پر دینا جائز نہیں ہے، اس کے لیے فقہاء کے بتائے ہوئے حیلہ کا سہارا لینا چاہیے، ہاں راقم الحروف کی ناقص رائے یہ ہے کہ عموم بلوی کے پیش نظر اس کے جواز کے بارے میں اصحاب فقہ و فتاوی کو غور کرنا چاہیے، جبکہ اس کی نظیر بھی موجود ہے۔

☆☆☆

ندی، نالے اور تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت کا مسئلہ

مولانا اسماعیل بھدکودروی قاسمی [1]

شریعت مطہرہ نے باہمی رضامندی سے مال کے باہمی تبادلہ کو جائز فرمایا ہے، باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ'' (سورۂ نساء:۲۹)۔

لہذا تراضی طرفین کے تحقق وتحفظ کے لیے غرر وغش، سود وقمار اور مفضی الی المنازعۃ جہالت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور ان چیزوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شریعتِ اسلام نے مبیع کے مملوک، مقدور التسلیم اور جہالت فاحشہ سے خالی ہونے کو شرط قرار دیا ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مملوک مال کے بیچنے سے منع فرمایا ہے:

''عن حكيم بن حزام قال: يا رسول الله! يأتيني الرجل فيريد مني البيع ليس عندي أفأبتاعه له من السوق فقال: لا تبع ما ليس عندك'' (أخرجه أبوداود وسكت عنه، إعلاء السنن ۱۴/ ۱۵۱)۔

(اے اللہ کے رسول! ایک آدمی مجھ سے ایسی چیز کا سودہ کرنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے، تو کیا میں اس سے سودا کرکے بازار سے خرید کر دے سکتا ہوں؟ فرمایا: تمہارے پاس جو چیز نہیں ہے اس کا سودا مت کرو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے:

''عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر'' (رواه مسلم)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکر کی بیع اور دھوکے کی بیع سے منع فرمایا ہے)۔

غرر کی تفسیر اور بیع غرر کی صورتوں کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ العالی نے یوں نقل فرمایا ہے:

''ابن الاثیر نے ''جامع الاثیر'' میں غرر کی تفسیر آتے ہوئے فرمایا ہے ''غرر وہ معاملہ ہے جس کے ظاہر کو تم پسند کرو اور باطن کو ناپسند کرو، اس کا ظاہر خریدار کو دھوکہ دیتا ہے اور باطن مجہول ہوتا ہے، احادیث وآثار میں غرر کی بہت سی مثالیں آئی ہیں، امام احمد نے اپنی مسند میں عبد اللہ بن عباس سے روایت کیا ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع الغرر سے منع کیا ہے'' ایوب کا بیان ہے کہ یحییٰ نے بیع غرر کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ غرر کی شکلوں میں شکاری کا شکار ہے کہ جو شکار کرے (اور اس کا سودہ کیا جائے) اس کی اقسام میں سے ہوا میں پرندے کا اور پانی کے اندر مچھلی کا بیچنا ہے، ان شکلوں میں جو چیز سب کو جامع ہے وہ یا تو مبیع کا مجہول ہونا ہے، یا بائع کا سپردگی پر قادر نہ ہونا ہے، یا مبیع کا خطرہ وتردد میں ہونا ہے'' (تکملۃ فتح الملہم ۱۲/ ۳۱۹)۔

علامہ سرخسیؒ نے غرر کی یہ تفسیر فرمائی ہے: الغرر مايكون مستور العاقبة (المبسوط ۱۲/۱۹۴)۔ (غرر وہ معاملہ ہے، جس کا انجام واضح نہ ہو)۔

شیخ مصطفی احمد الزرقاء نے بیع غرر کی یہ تفسیر لکھی ہے:

''هو بيع الأشياء الاحتمالية غير المحققه الوجود أو الحدود لما فيه من مغامرة و تغرير يجعله أشبه بالقمار، والغرر الذى يبطل البيع: هو غرر الوجود: وهو كل ماكان المبيع فيه محتملا للوجود و العدم: أما غرر الوصف فمفسد للبيع'' (المدخل الفقهي العام ۱/ ۹۷)۔

شیخ ابن ہمامؒ نے غرر کی یوں تفسیر فرمائی ہے

''والغرر الخطر وغير المملوك على خطر ثبوت الملك وعدمه، فلذا جعل (بيع السمك فى الماء) من بيع الخطر''

---

[1] خادم حدیث وافتاء دار العلوم کنتھاریہ، بھروچ، گجرات۔

(فتح القدیر ۶/۴۹)۔

"سمک فی الماء" کی بیع کو حدیث شریف میں بیع غرر فرمادیا گیا ہے، اور غرر کا مفہوم خطرے کا ہے اور غیر مملوک چیز میں ثبوت ملک اور عدم ملک دونوں کا خطرہ ہوتا ہے، اسی لیے پانی کے اندر مچھلی کی بیع کو غرر فرمایا گیا ہے۔ اور صراحۃ اس سے نھی وارد ہوئی ہے:

"وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ أن النبی ﷺ قال: لا تشتروا السمك فی الماء فإنه غرر" (رواہ احمد، اعلاء السنن ۱۴/۱۱۷)۔

(حضور ﷺ نے فرمایا ہے پانی کے اندر مچھی کو مت خریدو، کیوں کہ یہ غرر دھوکہ کا معاملہ ہے)۔

مذکورہ بالا نصوص کی وجہ سے بیع کی ایسی تمام صورتیں کہ جن میں عقد کے وقت مبیع بائع کی ملکیت میں نہ ہو یا ملکیت میں ہوتے ہوئے مشتری کو سپرد کرنا اس کی قدرت میں نہ ہو اور آئندہ مملوک ہونا، یا مقدور التسلیم ہونا احتمال اور علی وجہ الخطر ہو ان کو فقہاء کرام نے بیع غرر میں شامل فرمایا ہے اور ان کے عدم جواز پر حضرات فقہاء کرام کا اتفاق ہے، دیکھئے: وہبہ زحیلی کی کتاب: "الفقہ الاسلامی وادلتہ" (۴/۴۳۸)۔

علامہ زحیلی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"بیع غرر ایسی چیزوں کا فروخت کرنا ہے جن کا وجود احتمالی اور غیر محقق ہو، یا ان کے حدود کا پتہ نہ ہو، کیوں کہ اس میں دھوکہ وخطرہ کا معاملہ ہوتا ہے جو اس کو قمار وجوا کے درجے میں کر دیتا ہے، اور جو غرر مبیع کے بطلان کا باعث ہوتا ہے وہ وجود کا غرر ہے جس کا مطلب ایسی بیع ہے جس میں مبیع کے وجود وعدم دونوں کا احتمال ہو اور وصف کا غرر مبیع کو فاسد کرتا ہے" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۴۴۰)۔

"اسلامک فقہ اکیڈمی" کی جانب سے پیش فرمودہ سوالنامہ میں ندی، نالے، حوض اور تالاب کی مچھلیوں کی بیع کی جو مختلف صورتیں پیش کی گئی ہیں ان کے جواز وعدم جواز کے متعلق تفصیل بالا کے مطابق بنیادی بات یہی ہے کہ جس صورت میں مچھلیاں بائع کی مملوک اور اس کے لیے مقدور التسلیم ہوں، اس صورت میں بیع جائز ہے اور جس صورت میں یہ شرائط مفقود ہوں، اس صورت میں بیع جائز نہیں ہے۔

اس اصولی بحث کے بعد "فقہ اکیڈمی" کی جانب سے پیش فرمودہ سوالنامہ سے مچھلیوں کی بیع کی جو مختلف صورتیں مفہوم ہوتی ہیں ذیل میں ان صورتوں کا حکم تفصیل وتجزیہ کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے:

۱- سرکاری ندی، نالوں کی وہ مچھلیاں جن کی پیدائش و پرورش میں اور ندی، نالے کے پانی میں ان کی آمد میں کسی انسانی کوشش کا عمل دخل نہیں ہوتا ہے، بلکہ خدائی وفطری نظام کے تحت پیدا ہوتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہیں، ایسی مچھلیوں کی بیع باطل اور ناجائز ہے، کیوں کہ وہ سرکاری مملوک نہیں ہے اور کسی تدبیر سے پکڑے بغیر مقدور التسلیم بھی نہیں ہے اور یہ مچھلیاں ہر ایک کے لیے مباح الاخذ والاستعمال ہیں، لہذا کوئی شخص سرکار سے مذکورہ مچھلیاں خریدنے کے بعد اس کو جال وغیرہ کی تدبیر سے پکڑ کر اس کو حاصل کر لیگا تو وہ مباح الاخذ ہونے کی وجہ سے ان مچھلیوں کا مالک ہوگا اور قادر علی التسلیم بھی ہوگا، لہذا شکار کرنے کے بعد اس کا اپنی مملوکہ مچھلیوں کو بیچنا جائز ہے اور مسلمان کے لیے ایسی مچھلیوں کا خریدنا بھی جائز ہے۔

سرکاری، ندی، نالے کی مچھلیوں کی بیع تو جائز نہیں ہے، لیکن اس معاملہ کو جائز شکل دینے کی یہ تدبیر ممکن ہے کہ سرکار سے ندی، نالا کے قریب کوئی ایسی جگہ کرایہ پر لے لی جائے جہاں کوئی خیمہ نصب کیا جائے یا جھونپڑی بنادی جائے تاکہ کرایہ دار اس جگہ اپنا سامان وغیرہ رکھ سکے اور کشتی وغیرہ ٹھہرا سکے اور بوقت ضرورت خود یا اس کے مزدور وہاں آرام بھی کر سکیں، اس صورت میں نہ مچھلیوں کی خرید وفروخت ہے نہ استھلاک علی العین کا اجارہ ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے: (التحریر المختار ۲/۱۴۰)۔

فقہاء اس پر متفق ہیں کہ بیع غرر جائز نہیں ہے، جیسے دودھ تھن میں رہتے ہوئے اور بدن پر موجود اون، اور سیپ کے اندر معصوم موتی، پیٹ کے اندر حمل، پانی کے اندر مچھلی، ہواء میں پرندہ شکار سے قبل، اور غیر کا مال اس شرط پر کہ اس کو خرید کر سپرد کرے گا، یعنی جس چیز کا آئندہ مالک ہوگا اس کو مالک ہونے سے قبل بیچنا، اس لیے کہ بیچنے والے نے وہ سامان بیچا ہے جس کا وہ فی الحال مالک نہیں ہے، خواہ سمندر میں ہو یا نہیں ہو یا تالاب میں کہ جس کو بغیر شکار کے پکڑا نہ جاسکے اور خواہ غرر بیع میں ہو، یا ثمن میں۔

۲- سرکاری بڑے حوض یا تالاب کی وہ مچھلیاں جو دریا، ندی اور بارش کے پانی کے ساتھ آئی ہیں اور یہ بڑے حوض وتالاب پانی کے ذخیرہ کے لیے

بنائے گئے ہیں اس میں آئی ہوئی مچھلیوں کو روکنے کی غرض سے یا مچھلیوں کو اس میں داخل کرنے کی غرض سے کوئی تدبیر نہیں کی گئی ہے تو ایسی مچھلیاں سرکار کی غیر مملوک وغیر مقدور التسلیم ہیں، ان کی بیع بھی ناجائز ہے، البتہ سرکار سے خریدنے والے کے لیے اس کا پکڑنا اور مالک بننا مباح الاخذ والاستعمال ہونے کی وجہ سے جائز ہے اور مالک بن کر مقدور التسلیم ہونے کی صورت میں ان مچھلیوں کی خرید وفروخت بھی جائز ہے۔

۳- اگر سرکاری تالاب وحوض میں از خود آئی ہوئی مچھلیوں کو بند لگا کر روکنے کی سرکار کی جانب سے محنت ہوئی ہے، یا باہر کے پانی کی مچھلیوں کو حوض و تالاب میں لانے کی سرکار نے کوئی تدبیر کی ہے، یعنی یہ تالاب وحوض مچھلیوں کو گھیرنے اور جمع کرنے کے لیے بنائے ہیں، یا مچھلی کے بچے (بیج) ڈال کر سرکاری حوض وتالاب میں سرکار نے پرورش کی ہے تو ان تمام صورتوں میں حوض وتالاب کی مچھلیاں سرکار کی مملوک ہیں، اور مملوک ہونے کے ساتھ اگر وہ ایسی مقدور التسلیم بھی ہیں کہ بغیر کسی تدبیر کے اس کو پکڑنا آسان ہے تو ایسی صورت میں ان مچھلیوں کی خرید وفروخت جائز ہے اور اگر بغیر تدبیر کے ان کو پکڑنا مشکل ہو تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع فاسد ہے، لیکن خریدار جب ان مچھلیوں پر قبضہ کر لے گا تو مانع جواز (عدم تسلیم) کے زائل ہونے کی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ایک روایت کے مطابق اس عقد کے جائز ہونے کی گنجائش ہے یا از سر نو بیع تعاطی کے طور پر عقد ہونے کی گنجائش ہے۔

''والحاصل عدم جواز قبل أخذه لعدم ملكه. فإن أخذه ثم ألقاه في حظيرة كبيرة فعدم جوازه لكونه غير مقدور التسليم، فإن سلمه بعد ذلك فكالروايتين في بيع الآبق إذا سلمه '' (البحر ۶/ ۷۳، نیز کتاب مذکور ۵/ ۷۹)۔

بیع غرر کے فی الجملہ صحیح نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکری والی بیع سے اور بیع غرر سے منع کیا ہے اور عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مچھلی کو پانی کے اندر مت خریدو، اس لیے کہ یہ غرر کا معاملہ ہے اور اس کی سپردگی پر بھی قدرت نہیں ہے۔

تالاب وحوض سے مچھلیوں کے پکڑنے کو درخت کو پھلوں کے کاٹنے اور کشتی سے سامان باہر نکالنے کے مشابہ قرار دے کر اس ذمہ داری کو مشتری کو سپرد کرنے کے متعلق بھی غور کیا جاسکتا ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے: (درمختار ۴/ ۴۲)۔

اس پہلو سے بھی غور کرنے کی گنجائش ہے کہ شرط تسلیم ساقط ہونے کا احتمال بھی رکھتی ہے، دیکھئے: (عطر ھدایہ ص ۱۴۱ پر) مسئلہ ہے: ''زید نے بکر سے کہا کہ تو اپنے اڑتے ہوئے کبوتر یا تالاب کی مچھلیاں اپنی ملک سے خارج کر کے ہر پانے والے کے لیے مباح کر دے اور دس روپے لے لے، زید نے قبول کیا بیع ہوگئی، اس لیے کہ شرط تسلیم ساقط ہے''۔

۴- اگر شخصی حوض یا تالاب کی مچھلیاں مذکورہ بالا سرکاری حوض یا تالاب کی صورت نمبر ۲/ کے مانند غیر مملوک اور غیر مقدور التسلیم ہو تو ان کی بیع بھی ناجائز ہے اور ان مچھلیوں کو پکڑنے کے بعد ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔

۵- اگر مذکورہ بالا صورت نمبر ۳/ کی طرح شخصی حوض یا تالاب کی مچھلیاں اگر جمع وحبس کی تدبیر کی وجہ سے یا باہر سے پکڑ کر یا بیج خرید کر اس میں ڈالنے کی وجہ سے مملوک ہوں اور حوض وتالاب کے چھوٹے ہونے اور پانی کم ہونے کی وجہ سے بغیر تدبیر کے اس کا پکڑنا آسان ہونے کی وجہ سے مقدور التسلیم بھی ہو تو ان کی خرید وفروخت جائز ہے، اور اگر مملوک تو ہے، لیکن حوض وتالاب کے بڑے ہونے اور پانی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے بلا تدبیر اس کا پکڑنا آسان نہ ہونے کی وجہ سے غیر مقدور التسلیم ہو تو اس میں وہی تفصیل ہوگی جو نمبر ۳/ میں مذکور ہوئی۔

ندی، تالاب اور حوض کی مچھلیوں کی بیع کے متعلق مذکورہ بالا مختلف صورتیں اور ان کے احکام کو فقہاء کرامؒ نے اسی تفصیل کے ساتھ تحریر فرمادیا ہے، مثلاً:

''سمندر ، دریا وغیرہ کے اندر رہنے والی مچھلی کی فروخت جائز نہیں ہے، اب اگر کسی آدمی کا کوئی حوض یا تالاب ہے اور اس میں مچھلیاں آئیں تو دیکھا جائے گا، اس نے اسی غرض سے اس کو تیار کیا ہے یا نہیں، اگر تیار کیا ہے تو اس میں داخل ہونے والی مچھلیاں اس کی ملک ہوں گی اور کوئی ان پر قبضہ کر نہیں سکتا، پھر اگر ان مچھلیوں کو شکار کے قبیل کی تدبیر کے بغیر پکڑا جاسکتا ہے تو فروخت درست ہے، کیوں کہ مچھلی مملوک اور مقدور التسلیم ہے، جیسے کہ کسی گڑھے میں مچھلی ہو، اور اگر تدبیر کے بغیر پکڑنا ممکن نہیں تو فروخت جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں فروخت کے بعد سپردگی پر قدرت نہیں ہے۔

اور اگر حوض و تالاب کو مچھلی پکڑنے کی غرض سے نہیں بنایا گیا تو اس میں آنے والی مچھلیوں کا وہ مالک نہیں ہوگا اور پھر عدم ملک کی وجہ سے فروخت کرنا بھی درست نہیں ہوگا، اور اگر تیار تو اس مقصد سے نہیں کیا گیا، لیکن مچھلی پکڑ کر اس میں ڈال دی، تو مالک ہو جائے گا، پھر اگر اس تالاب وغیرہ سے کسی تدبیر خاص کے بغیر پکڑنا ممکن ہے تو اس کا فروخت کرنا درست ہے، کیوں کہ مچھلی مملوک ہے اور سپردگی تحت القدرت ہے اور اگر کسی تدبیر کی ضروت ہے تو فروخت جائز نہیں، اس لیے کہ مملوک ہونے کے باوجود سپردگی ممکن نہیں ہے"، تفصیل کے لیے دیکھئے: (فتح القدیر ۶/ ۴۹، مجمع الانہر ۲/ ۵۵، تبیین الحقائق ۴/ ۴۵)۔

سرکاری یا شخصی تالاب یا حوض کا معاملہ جائز طریقے سے کرنے کی بے غبار و بے غرر صورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس میں مچھلیاں از خود آنے یا لانے سے پہلے یا قدرتی طور پر اس میں پیدا ہونے سے پہلے یا اس میں مملوکہ مچھلیاں ڈالنے سے پہلے، مچھلیوں کے کاروبار کرنے والے کو جتنی مدت کے لیے حوض و تالاب کی ضرورت ہو اتنی مدت اور کرایہ متعین کرکے مالک حوض و تالاب سے کرایہ پر لے لے، اور اس کے بعد مچھلیوں کے مملوک ومقدور التسلیم ہونے کے مذکورہ بالا جائز طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کرکے مچھلیوں کا مالک بن کر حوض و تالاب میں ان کو جمع رکھ کر اور ان کی پرورش کرکے کرایہ دار کی مدت متعینہ پوری ہونے تک مچھلیاں پکڑنے کا انتظام کرکے خرید و فروخت کرتا رہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں بائع کی مملوک ومقدور التسلیم مچھلیوں کی بیع ہوگی اور مچھلیاں خریدنے کے بعد اپنی خرید کردہ مچھلیوں کی فروختگی سے فارغ ہونے تک اپنی مچھلیوں سے مالک کے حوض و تالاب کو مشغول رکھنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوگا۔

احقر کی ناقص دانست میں سرکار حوض و تالاب بنا کر اس میں آنے والی یا پیدا ہونے والی اور پرورش کی جانے والی مچھلیوں کی بیع کا معاملہ نہیں کرتی ہے، بلکہ سرکاری فاضل زمینوں کے پلاٹ بنا کر مچھلی مار حرفت (پیشہ) کے خواہش مندوں کو وہ پلاٹ کرایہ پر دیتی ہے، پھر کرایہ دار خود محنت کرکے اس پلاٹ میں حوض و تالاب بنا کر اس میں مچھلی کی پرورش کرکے خرید و فروخت کا کاروبار کرتے ہیں۔

☆☆☆

بیع واجارہ کے چند مسائل

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

شرائط بیع:

بیع کے شرائط انعقاد میں سے یہ بھی ہے:

۱-مبیع اور ثمن مال ہوں۔

۲-مبیع موجود ہو، معدوم نہ ہو، نہ اس کے عدم کا خطرہ ہو۔

۳-مبیع، ندرت خود ملکیت بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

۴-مبیع، بائع کی ملکیت میں ہو۔

''شرائط بیع کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (فتاوی ہندیہ ۳/۲-۳)

سرکاری تالاب، ندی و نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی، بغیر ان کو نکالے ہوئے بیع و شراء، اسی طرح نجی حوض و تالاب، پوکھرا وغیرہ کی مچھلیوں کی، بغیر ان کو نکالے ہوئے خرید و فروخت پر بھی مذکورہ اصول و قواعد کی روشنی میں غور کیا جائے گا۔

وہ چیزیں جو سب کی ہیں:

''ابوداؤد شریف'' کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''المسلمون شركاء في ثلاث: في الماء والنار والكلاء'' (ابوداؤد ۲/۴۹۲ کتاب البیوع)

(تمام مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں: گھاس، آگ اور پانی میں)۔

اسی وجہ سے ان تینوں کو مباح الاصل کہا جاتا ہے، ان تینوں سے ہر ایک کو استفادہ و انتفاع کا حق ہوتا ہے، یہ چیزیں کسی کی ملکیت نہیں ہوتیں، اسی لیے ان کی بیع و شراء اور اجارہ جائز نہیں۔

''وإن المقصود من الملك يحصل بلا بيع إذ تملكه بدونه'' (فتح القدیر ۶/۵۵، نیز العنایہ علی الفتح ۶/۵۶)۔

(اس لیے کہ ملکیت سے جو مقصود ہے وہ بغیر بیع کے حاصل ہو جائے گی، کیوں کہ وہ ان کا، بغیر بیع کے مالک ہو جائے گا۔

مذکورہ مباحث میں جن چیزوں کو مباح الاصل کہا گیا ہے، ان میں پانی بھی ہے، ندی، نالے، حوض، کنویں، سب کا پانی، سب کو استعمال کی اجازت ہے، ظاہر ہے کہ جب پانی سب کا ہوا تو پانی کے ذریعہ پانی میں نشو و نما پانے والی چیزیں سب کی ہوئیں، جو چاہے لے لے، جو چاہے استعمال کرے۔

یہیں سے ندی، نالوں، کنوؤں اور تالابوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کا حکم بھی معلوم ہو گیا، وہ یہ کہ یہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں، جس کو مل جائیں اس کی ہیں۔

لیکن یہاں دو صورت ہے:

۱- ندی، نالوں اور حوض و تالاب میں موجود مچھلیوں کی خرید و فروخت۔

۲- ندی، نالوں اور حوض و تالاب کو مچھلیاں شکار کرنے کے لیے ٹھیکہ، یعنی کرایہ پر دینا۔

دونوں صورتوں کو بالتفصیل الگ الگ بیان کیا جاتا ہے:

پانی میں موجود مچھلیوں کی خرید و فروخت:

---

[1] مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نوادہ، مبارک پور اعظم گڈھ۔

وہ مچھلیاں جو پانی میں ہوں اور پانی سے نکالے بغیر فروخت کی جائیں، ان کی خرید وفروخت کی درج ذیل صورتیں ہوں گی:

۱- کسی آدمی نے مچھلی پالنے کے لیے گڑھا بنوایا، اس میں سیلاب وغیرہ میں پانی کے ساتھ مچھلیاں آگئیں، ان مچھلیوں کا مالک وہی آدمی ہوگا جس نے گڑھا بنوایا ہے۔

۲- گڑھا، مچھلی پالنے کے لیے نہیں بنایا تھا، بلکہ گڑھا اس کی زمین میں پہلے سے موجود تھا، یا گڑھا خود بنوایا تھا مگر کسی اور کام کے لیے، اور مچھلیاں اس گڑھے میں پانی کے ساتھ آگئیں تو وہ شخص ان مچھلیوں کا مالک نہیں ہوگا، البتہ اگر مچھلیوں کے آنے کے بعد راستہ بند کردے، وہ مچھلیاں وہاں سے واپس نہ جاسکیں تو وہ ان مچھلیوں کا مالک ہوجائے گا۔

پھر اگر وہ انھیں، پانی میں رہتے ہوئے فروخت کرے تو بیع اسی وقت جائز ہوگی جب بغیر کسی تدبیر کے ہاتھ سے پکڑی جاسکیں اور اگر انھیں پکڑنے کے لیے جال ڈالنا پڑے یا ڈور کانٹا وغیرہ لگانا پڑے تو بیع جائز نہ ہوگی۔

۳- گڑھا، مچھلی کے لیے نہیں بنایا تھا، مگر مچھلیاں لاکر ڈال دی ہیں، خود سے پانی کے ساتھ نہیں آئی ہیں، اس صورت میں مچھلیوں کا مالک وہی ہوگا جس کا گڑھا ہے، اور بیع کے جواز وعدم جواز میں وہی حکم ہے جو نمبر ۱ و ۲ کے تحت گزرا، خیال رہے کہ مچھلیوں کو بغیر حیلہ وتدبیر کے ہاتھ سے پکڑنا اسی وقت ممکن ہوگا جب گڑھا بہت چھوٹا ہو، بڑے گڑھے اور تالاب، ندی ونہر میں یہ ممکن نہیں۔

علاوہ ازیں صورت میں پانی میں مچھلیوں کی بیع جائز ہے، مچھلی نکالنے کے بعد، خریدار کو خیار رویت حاصل ہوگا۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ مچھلیوں کی اس خرید وفروخت میں سرکاری ندی، نالے، حوض، پوکھرے اور نجی حوض، پوکھرے، تالاب سب کا یکساں حکم ہے۔

اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

''مچھلی کی بیع دریا میں یا کنویں میں جائز نہیں، اگر کسی آدمی کا کوئی گڈھا تھا اور مچھلی اس میں داخل ہوگئی، پس یا تو وہ گڈھا اس کے لیے تیار کیا تھا تو جو مچھلی اس میں چلی گئی ہے اس کا وہ مالک ہوگیا اور کسی کو اسے لینے کا حق نہیں، اگر وہ مچھلی بغیر شکار کی تدبیر کے پکڑلی جاسکے تو اس گڈھے میں رہتے ہوئے، اس کی بیع جائز ہوگی، لیکن اگر بغیر حیلہ وتدبیر کے نہ پکڑی جاسکے تو اس کی بیع جائز نہ ہوگی اگر وہ گڈھا اس کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا جو مچھلی اس میں داخل ہوگی اس کا مالک نہیں ہوگا، پس اس کی بیع بھی جائز نہ ہوگی، مگر یہ کہ گڈھے (کا راستہ) بند کردے، اب جو مچھلی اس میں داخل ہوچکی ہے اس کا مالک ہوجائے گا، پھر دیکھا جائے گا کہ اگر بغیر حیلہ کے پکڑی جاسکتی ہے تو بیع جائز ہوگی ورنہ ناجائز ہوگی، اگر گڈھا اس کے لیے نہیں بنایا تھا، لیکن مچھلی پکڑی اور اس میں چھوڑ دی تو اس کا بھی مالک رہے گا، اب اگر بغیر حیلہ کے پکڑی جاسکے تو بیع جائز ہوگی اور حیلہ سے پکڑی جائے تو بیع ناجائز ہوگی، ایسے ہی ''فتح القدیر'' میں ہے، اور جس حال میں پانی میں مچھلی کی بیع جائز ہوتی ہے، جب مشتری اس پر قبضہ کرے گا اور دیکھے گا تو اسے خیار رویت حاصل ہوگا اور اگر مچھلی بڑے دریا میں ہو تو اس کی بیع کسی حال میں جائز نہیں، ایسے ہی اگر مچھلی کا مالک ہوا اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گرگئی تو بھی اس کی بیع جائز نہ ہوگی، البتہ اس صورت میں بیع کے بعد، بائع اور مشتری کی بیع فسخ کرنے سے پہلے حوالہ کرنے پر قادر ہوجائے تو بیع جائز ہوگی اور مشتری کو خیار رویت حاصل ہوگا، خواہ اس سے پہلے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، امام ابوالحسن کرخیؒ سے نزدیک ہے اور مشائخ بلخ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس کی بیع جائز نہیں گرچہ حوالہ کرنے پر قادر ہو، ایسے ہی ینابیع میں ہے'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۱۳)۔

نیز امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''فقال أبو يوسف فى كتاب الخراج: رخص فى بيع السمك فى الآجام أقوام فكان الصواب عندنا فى قول من كره حدثنا العلاء ابن المسيب بن رافع عن الحرث العكلى عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: لا تبايعوا السمك فى الماء، فإنه غرر، وأخرج مثله عن ابن مسعود ومعلوم أن الأجمة قد يؤخذ منها السمك باليد والغرر الخطر وغير المملوك على خطر ثبوت الملك وعدمه، فلذا جعل من بيع الخطر'' (فتح القدير ۶/ ۴۹)۔

(امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں فرمایا ہے کہ کچھ لوگوں نے جھاڑیوں میں مچھلی کی بیع کی رخصت دی ہے، لیکن ہمارے نزدیک درست ان لوگوں کا قول ہے جنھوں نے اسے ناپسند کیا ہے، حدیث بیان کی ہم سے علاء ابن مسیب بن رافع نے، انھوں نے حارث عکلیؒ سے انھوں نے حضرت عمر بن خطابؓ سے، انھوں نے فرمایا کہ پانی میں مچھلی مت بیچو اس لیے کہ اس میں غرر (دھوکہ) ہے، اسی کے مثل عبد اللہ بن مسعودؓ سے تخریج کی ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ جھاڑی میں سے مچھلی ہاتھ سے بھی پکڑی جا سکتی ہے اور غرر، خطر (جس کے ہونے نہ ہونے دونوں کا امکان ہو) کو کہتے ہیں، اور غیر مملوک میں ملکیت ہونے نہ ہونے، دونوں کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی لیے غیر مملوک کی بیع کو بیع الخطر کہتے ہیں)۔

جن صورتوں میں مچھلیوں کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی، بیع کے عدم جواز کی وجہ ملک ہے اور ملکیت ہونے کے بعد اگر مچھلیاں بغیر کسی تدبیر شکار، ہاتھ نہ آئیں، عدم جواز کی وجہ غیر مقدور التسلیم ہونا ہے، یعنی پہلی صورت میں جس چیز کو بیچ رہا ہے اس کا وہ مالک نہیں، دوسری صورت میں مالک تو ہے، مگر مبیع کو مشتری کے حوالہ کرنے پر قادر نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان صورتوں میں سے کس صورت میں بیع کو باطل کہا جائے اور کس صورت میں فاسد۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ اس کا جواب دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

"صاحب درمختار کا قول "بغیر شکار کی ہوئی مچھلی کی بیع جو سامان سے خرید لی جائے، بیع فاسد ہے، بظاہر اس کا یہ مطلب ہے کہ مچھلی کی بیع فاسد ہے اور وہ قبضہ کرنے سے مالک ہو جائے گا۔ اس میں ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ اس چیز کی بیع ہے جو ملکیت میں نہ ہو، بیع باطل کہلاتی ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے، اس لیے وہ معدوم کی بیع ہے اگر چہ اس پر باء داخل ہو، اور مچھلی ثمن بن جائے گی، پس یوں ہو گیا گویا کہ اس نے سامان فروخت کیا ہے اور ثمن سے سکوت اختیار کیا ہے، یا تو اسے ام ولد کے ذریعہ فروخت کیا ہے، بلکہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ سامان کی بیع بھی باطل ہے، اس لیے کہ سمک (مچھلی) مال نہیں ہے، لہذا گویا اس نے سامان کو مردار یا خون کے عوض میں فروخت کیا، لیکن اس مچھلی کو "ام ولد" کی طرح رکھنا زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ وہ فی الجملہ مال ہے، اس لیے کہ اگر وہ اس کے بعد شکار کرے تو اس کا مالک ہو جائے گا، ہاں! یہ اس وقت ظاہر ہوگا جب متعین مچھلی کو شکار کرنے سے قبل فروخت کرے، لیکن اگر مچھلی غیر متعین ہو، پھر کسی مچھلی کا شکار کرے تو یہ مچھلی، عین وہ مچھلی نہیں ہوئی جو سامان کا ثمن قرار پائی تھی، یہاں تک کہ کہا جائے کہ وہ شکار کرنے سے مالک ہو گیا، حاصل یہ ہے کہ مناسب یہ ہے کہ جانبین سے بیع باطل ہو، جیسے مردار کی بیع سامان سے یا سامان کی بیع، مردار سے اور اگر مچھلی متعین ہو تو مچھلی میں بیع باطل ہے، کیوں کہ غیر مملوک ہے، اور سامان میں فاسد ہے، کیوں کہ مچھلی فی الجملہ مال ہے، اسی کے مثل وہ صورت ہے جب بیع، مچھلی کے گوشت پر ہو، کیوں کہ گوشت مثل چیز ہے، اور اگر مچھلی کو درہم کے بدلے فروخت کرے تو بیع باطل ہے، کیوں کہ اس صورت میں مچھلی کا مبیع ہونا متعین ہے اور وہ غیر مملوک ہے، یہ وہ بات ہے جو اس مقام کی تقریر میں مجھے ظاہر ہوئی اور میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے ان میں سے کسی چیز سے تعرض کیا ہو" (رد المحتار ۴/۱۱۹)۔

مولانا عبد الحی فرنگی محلی ابن عابدین کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"شکار کرنے سے پہلے مچھلی کو فروخت کرنا جائز نہیں، لیکن اگر کسی نے شکار کرنے سے پہلے ہی ان کو کسی سامان کے عوض فروخت کیا تو بیع فاسد ہے، اور اگر دراہم و دنانیر کے بدلے فروخت کیا تو بیع باطل "كذا في الدر المختار وفي البرجندي ذكره المصنف أن بيع السمك قبل أن يصطاد باطل إن كان بالدراهم والدنانير، وفاسد إن كان بالعرض انتفى" (فتاوی عبد الحی/۲۷۵)۔

اور اگر مچھلی کو شکار کر کے ایسی جگہ چھوڑ دیا کہ وہاں سے حیلہ و تدبیر سے پکڑنا ممکن نہیں تو بھی بیع فاسد ہوگی اور اگر حیلہ سے پکڑنا ممکن ہو تو صحیح ہو جائے گی، اور بیع باطل میں خریدار کے قبضہ کے باوجود ملکیت ثابت نہیں ہوتی، اور بیع فاسد کو ختم کرنا واجب ہے، لیکن اگر بائع کی اجازت سے خریدار نے قبضہ کر لیا تو مالک ہو جائے گا، اور پھر مشتری کے تصرفات وغیرہ اس شئی میں نافذ ہو جائیں گے اور دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دینا بھی مشتری کے لیے جائز ہوگا، مگر بیع فاسد کی صورت میں مشتری کے لیے خریدی ہوئی شئی کا کھانا درست نہیں۔

آگے "ہدایہ، نہایہ اور درمختار" وغیرہ کے حوالوں سے مذکورہ باتوں کو مبرہن کیا گیا ہے۔

ندی، نالے اور تالاب کا ٹھیکہ:

رہی یہ بات کہ مچھلیاں نکالنے کے لیے ندی، نالے، پوکھرا، تالاب کا ٹھیکہ، خواہ یہ چیزیں سرکاری ہوں یا نجی، قدرتی ہوں یا بنائی گئی ہوں، شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ یوں عام طور پر ایسے تالاب و پوکھرا وغیرہ کو خریدنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ چیزیں خرید وفروخت نہیں ہوتیں، بلکہ ان سے مچھلی شکار کرنے کا حق واختیار فروخت ہوتا ہے، جو خریدتا ہے، ایک محدود مدت تک کیلیے خریدتا ہے، اس مدت میں اسے حق ہوتا ہے کہ مچھلیاں نکال کر خود کھائے یا فروخت کردے۔

اگر اس مسئلہ کو یوں دیکھا جائے کہ یہ مچھلیوں کی بیع ہے تو اس کے احکام وہی ہیں جو گذشتہ صفحات میں بیان کردئے گئے، لیکن اگر اسے تالاب، پوکھرا، ندی، نالہ کا ٹھیکہ (اجارہ) قرار دیا جائے تو اس پر احکام اجارہ کی حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اب فقہاء عظام کی آراء ملاحظہ فرمائیں!

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

''ولا يجوز إجارة الأجام والأنهار للسمك ولا لغيره، لأن المقصود استحقاق العين، ولأن السمك صيد مباح، فكل من أخذه فهو أحق به، وإنما يستحق على المؤاجر بالإجارة ما كان مستحقا له، ولأن المؤاجر يلتزم ما لا يقدر على ايفائه به، فإن أجرها للزراعة فهي ليست بصالحة لذلك، وإن أجرها للسمك فربما يجده المستأجر وليس في وسع الأجر أن يملكه من تحصيل ذلك''

(مچھلی وغیرہ کے شکار کے لیے جھاڑی وندی وغیرہ کا اجارہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مقصود عین کا استحقاق ہے اور مچھلی، مباح شکار ہے، جبکہ اجارہ کے ذریعہ اجرت پر دینے والے پر وہ چیز واجب ہوتی ہے جو اس کا حق رہا ہو، اور اس لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اجرت پر دینے والا اس چیز کا التزام کرتا ہے جس کی ادائیگی پر قادر نہیں، پس اگر وہ اسے زراعت کے لیے اجارہ پر دے تو وہ اسی کے لائق نہیں، اور اگر مچھلی کے لیے اجارہ پر دے تو کبھی مستاجر مچھلی پائے گا، کبھی نہیں، اور اجرت لینے والے کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کی تحصیل پر قادر بنادے)۔

اسی سے ملتی جلتی تفصیل امام کاسانی نے بھی لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اجارہ نفع کی بیع ہے، نہ کہ عین کی، لہذا اجارہ میں عین کا استہلاک نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اجارہ صحیح نہ ہوگا، دیکھئے: (بدائع الصنائع ۴/ ۱۷۵)۔

اجارہ کے مباحث دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں مذاہب اربعہ متفق ہیں، چنانچہ ''الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' کے مصنف لکھتے ہیں:

ومما تقدم في المذاهب الأخرى تعرف العقود التي خرجت عن التعريف كالبيع والهبة والصدقة ونحو ذلك مما يكون العقد فيها على العين لا على المنفعة'' (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳/ ۹۹)۔

(دیگر مذاہب کے بارے میں جو بات گزری، اس سے وہ معاملات بھی جان لیے گئے، جو اجارہ کی تعریف سے نکل گئے جیسے بیع، ہبہ، صدقہ، وغیرہ جن میں عقد، عین پر واقع ہوتا ہے نہ کہ منفعت پر)۔

اسی کتاب میں مسلک شوافع کے تحت لکھتے ہیں:

''اجارہ کی شرائط میں ہے کہ عقد اجارہ سے عین مقصود نہ ہو، مثلاً کوئی آدمی گائے کو دودھ کے لیے اجارہ پر لے، یہ عقد اس بات کو متضمن ہے کہ مقصود، دودھ حاصل کرنا ہے، اور دودھ عین ہے، عقد اجارہ کے ذریعہ اس کا بالقصد مالک نہیں ہوا جاسکتا، اس لیے کہ اعیان کی ملکیت، عقد اجارہ سے تبعاً حاصل ہوتی ہے (حوالہ بالا)۔

مزید آگے نقل کرتے ہیں:

''اسی کے مثل وہ صورت ہے جب کوئی کسی باغ کو پھل کے لیے اجارہ پر لے یا پانی کا گڑھا، مچھلی وغیرہ ان چیزوں کے لیے اجارہ پر لے جن میں منفعت عین مقصود ہو'' (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳/ ۱۱۴)۔

اس سلسلے کے عام مباحث تو یہی ہیں جو مذکور ہوئے، لیکن امام ابن نجیمؒ اور دوسرے فقہاء کرام نے مچھلیاں شکار کرنے کیلیے تالاب وغیرہ کے ٹھیکہ میں کچھ اور باتیں بھی ذکر کی ہیں، جن کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

امام ابن نجیم فرماتے ہیں:

''مجھ سے اس شرح کی ''کتاب البیوع'' کی تالیف کے وقت ۹۶۸ھ میں سوال کیا گیا ایک جھیل کے بارے میں جو ''کوم الشمس'' کے کنارے میں واقع تھی اور حالیہ ''اوقاف یوسفی'' میں سے تھی کہ اس جھیل کا اجارہ، ناظم ونگراں کی طرف سے ان لوگوں کے لیے جائز ہے یا نہیں جو اس سے مچھلی شکار کرنا چاہیں؟ چنانچہ میں نے میرے پاس جو کتابیں تھیں، ان میں تلاش کیا، مجھے یہ مسئلہ نہیں ملا، سوائے امام ابو یوسفؒ کی ''کتاب الخراج'' کے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا عبداللہ بن علی نے، انھوں نے اسحاق بن عبداللہ سے، انھوں نے ابوالزناد سے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کے پاس ایک جھیل کو اجارہ پر دینے کے متعلق خط لکھا جو عراق میں تھی اور جس میں مچھلیاں تھیں، حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اجارہ پر دیدو۔ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ ہم سے امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا، ان سے حمادؒ نے، حمادؒ کہتے ہیں کہ میں نے عبدالحمید بن عبدالرحمن سے کہا کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس لکھ کر سوال کریں کہ جھاڑیوں میں شکار کی بیع جائز ہے یا نہیں، عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں لکھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں اور انھوں نے اس کا نام ''حبس'' رکھا، لہذا اس بنا پر جھاڑیوں میں مچھلی کی بیع جائز نہیں ہے، الا یہ کہ بیت المال کی زمین میں ہو، اسی کے ساتھ اراضی اوقاف بھی ملحق ہوں گی، لیکن ایک مدت کے بعد میں نے ''ایضاح'' میں اس کے اجارہ کا عدم جواز دیکھا'' (البحر الرائق ۶ / ۷۳)۔

علامہ شامیؒ ''منحۃ الخالق'' میں لکھتے ہیں:

''''النہر الفائق'' میں ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مصر میں ایک چھوٹا حوض ہے، ''برکۃ الفہادۃ'' کے نام سے، اس میں مچھلیاں جمع ہوتی ہیں، کیا مچھلیاں شکار کرنے کے لیے اس کا اجارہ جائز ہے، ''البحر الرائق'' میں ''ایضاح'' سے اس کا عدم جواز منقول ہے، اور اس سے پہلے امام ابو یوسفؒ کی ''کتاب الخراج'' سے ابوالزنادؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اجازت دی تھی، لیکن جو بات ''ایضاح'' میں ہے وہ قواعد فقہیہ کے زیادہ مناسب ہے، رملیؒ کہتے ہیں کہ ماسبق کی باتوں سے بیع کا مطلقاً عدم جواز ثابت ہوا، خواہ مچھلیاں سمندر میں ہوں یا دریا میں یا جھاڑیوں میں اور وہ اپنے اطلاق کے اعتبار سے عام ہے، خواہ بیت المال کی زمین میں ہو یا وقف کی زمین میں، اور جو ''کتاب الخراج'' میں امام ابو یوسف سے منقول ہے وہ بھی قواعد سے بعید نہیں، اس کا مرجع ایک مخصوص جگہ کا منفعت معلومہ ''شکار'' کے لیے جائز ہونا ہے اور جسے امام ابوحنیفہؒ نے حمادؒ سے بیان کیا ہے اس کی توجیہ مشکل ہے، اس لیے کہ وہ شکار سے پہلے مچھلی کی بیع ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ وہ جھاڑیاں اسی کے لیے بنائی گئی تھیں، اور مچھلی اس میں مقدور التسلیم تھی، پس غور کرلو اور اس تحریک کو سامنے رکھو، کیوں کہ مسئلہ کثیرۃ الوقوع ہے، اس کے بارے میں سوالات بہت ہوتے ہیں'' (منحۃ الخالق علی ہامش البحر الرائق ۶ / ۷۳)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے یہ ساری عبارتیں اور مباحث ''ردالمحتار'' میں بھی نقل کی ہیں اور خیر رملیؒ کی توجیہ وتاویل پر اشکال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لكن قوله غير بعيد الخ فيه نظر، لأن الإجارة واقعة على استهلاك العين، وسيأتي التصريح بأنه لا يصح إجارة المراعي، وهذا كذلك، ولذا جزم المقدسي بعدم الصحة واعترض البحر بما قلنا والله اعلم'' (ردالمحتار ۴ / ۱۱۹)۔

(رملیؒ کا قول ''امام ابو یوسفؒ کا بیان قواعد سے بعید نہیں ...... الخ'' اس میں اعتراض ہے، کیوں کہ اجارہ، استہلاک عین پر واقع ہوا ہے اور عنقریب صراحۃً آجائے گا کہ چراگاہ کا اجارہ صحیح نہیں، یہ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے، اسی لیے مقدسی نے یقین کے ساتھ عدم صحت کی بات کہی ہے اور ''البحر الرائق'' پر وہی اعتراض کیا ہے جو ہم نے کیا، واللہ اعلم)۔

خلاصہ یہ کہ ندی، نالے، تالاب، خواہ وقف یا بیت المال کے ہوں یا نجی اور ذاتی ہوں، اجارہ صحیح نہ ہونے میں سب برابر ہیں، قواعد فقہیہ کی روشنی میں کسی کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ مچھلیوں کے شکار کے لیے اجارہ جائز ہو، اور حضرت عمرؓ کے فتوی کی بظاہر کوئی توجیہ وتاویل سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ کہا جائے کہ وہ بعض صورتوں میں استہلاک عین کے باوجود، اجارہ کے جواز کے قائل تھے۔

ہاٹ بازار کا نیلام۔

ہاٹ بازار کا نیلام جو سرکار کی طرف سے ہوتا ہے وہ بیع نہیں ہے، بلکہ اجارہ ہے، وہ جگہ اور زمین کی منفعت کا کرایہ ہے، نیلامی میں بسنے والا اس زمین کو یک مشت رقم پر کرایہ پر لیتا ہے اور دوکانداروں سے مختلف انداز سے تھوڑا تھوڑا اس طرح وصول کرتا ہے کہ ادا کردہ رقم سے زیادہ رقم اسے حاصل ہوجاتی ہے اور یہ اصل مالکان کی اجازت سے ہوتا ہے۔

چوں کہ اس میں استہلاک عین نہیں، بلکہ تحصیل منفعت ہے اس لیے جائز ہے۔

سرکاری زمین میں پیدا جلاون کی فروختگی:

۱- سڑکوں کے کنارے یا کسی بھی سرکاری زمین میں جو درخت سرکار کی طرف سے لگائے گئے ہوں، سرکار ان کی مالک ہے، لہذا اس کی بیع وشراء درست ہے۔

۲- لیکن مذکورہ زمینوں میں جو درخت خودرو ہوں، کسی کے لگائے نہ ہوں، شرعاً ان کا کوئی مالک نہیں، جو لے لے اس کا ہے، ان درختوں کی نیلامی جائز نہیں ہے، نجی زمینوں میں اس قسم کے درخت ہوں تو ان کا بھی یہی حکم ہے، اس صورت میں یہ درخت مباح الاصل ہوجائیں گے، کسی کی ملکیت نہ ہوں گے جو لے لیگا مالک ہوجائے گا ''کأخذ الحطب والثمار من الجبال کالجوز والتین والفشق وغیرہا'' (فتح القدیر ۵/۴۰۹)۔

۳- اگر ان خودرو درختوں کی سرکار نے دیکھ بھال شروع کردی، ان کی نشونما اور حفاظت کا بندوبست کردیا، اسی طرح جس کی زمین میں یہ درخت نکلے ہیں اس نے ان کی دیکھ بھال (پانی دینا، کھاد ڈالنا، دوا چھڑکنا) وغیرہ شروع کردیا۔ تو وہ اس کا مالک ہوگیا، فروخت کرسکتا ہے، دوسرے کو لینے کا حق نہیں ہے۔

سوالنامہ کے جوابات:

اولاً۔ جس عرف کا سوال میں تذکرہ ہے وہ قواعد شرع سے متصادم ہے، لہذا غیر معتبر ہے، یہ بیع جائز نہیں ہے، لیکن ندی نالوں اور تالابوں میں پائی جانے والی مچھلیاں چوں کہ مباح الاصل ہوتی ہیں، جو شکار کرے، اسی کی ہوجاتی ہیں، اس لیے ٹھیکہ دار جن مچھلیوں کو شکار کرکے فروخت کرے گا، ان کی خرید فروخت جائز ہوگی۔

۳- مچھلیاں شکار کرکے فروخت کرنے کے لیے تالاب حوض وغیرہ کا اجارہ جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ عین کا استہلاک ہے، جبکہ اجارہ عقد منفعت ہے یہ جواب ہر صورت میں ہے، خواہ حوض وتالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہو اور اس نے اس میں مچھلیاں پالی ہوں، یا سرکاری ہو اور سرکار کی طرف سے اس میں مچھلیاں پالی گئی ہوں۔

۴- ٹھیکہ واجارہ، دینا لینا تو اس صورت میں بھی جائز نہیں، البتہ مچھلیوں کے آنے کے بعد حوض یا تالاب کا راستہ بند کردیا، جس سے وہ مچھلیاں واپس جانے پر قادر نہیں رہیں تو وہ ان مچھلیوں کا مالک ہوگیا، نکال کر فروخت کرسکتا ہے، پانی میں رہتے ہوئے فروخت کرنا جائز نہیں، لیکن اگر راستہ بند نہ کیا تو ان مچھلیوں کا مالک نہیں ہوا، شکار کرنے کے بعد مالک ہوجائے گا، لہذا فروخت کرسکتا ہے۔ پانی میں رہتے ہوئے، غیر مملوک اور مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے بیع جائز نہیں ہوگی۔

☆☆☆

مچھلی کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

مولانا اشتیاق احمد اعظمی[1]

عام طور پر آج یہ متعارف ہے کہ ندی، نالے اور نہریں کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہیں، بلکہ سرکاری ہیں ان کو حکومت کسی خاص شخص کو کوآپریٹیو سوسائٹی، یا مقامی پنچایتوں کے ہاتھ متعین مدت کے لیے بندوبست کردیتی ہے اور یہ لوگ سرکار کو معاوضہ دے کر ہی خاص حصہ سے حاصل ہونے والی مچھلی نکالتے ہیں اور خود استعمال کرتے ہیں، یا فروخت کردیتے ہیں، یہ مچھلی ضروری نہیں کہ اس ندی، نالے یا تالاب میں پرورش کی گئی ہو، سیلاب کے آمد ورفت کے ساتھ یہ مچھلیاں آتی اور جاتی رہتی ہیں، آیا ان مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر انہیں نکالے ہوئے جائز ہے یا ناجائز؟

ان مچھلیوں کی بیع وشراء کے جواز یا عدم جواز کو جاننے کے لیے ہمیں بیع کے سلسلے میں ان ضوابط اور اصولوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا جن کا فقہاء کرام نے اس سلسلے میں ذکر کیا ہے، مچھلیاں یہاں چوں کہ مبیع بن رہی ہیں، اس لیے ہمیں سب سے پہلے بیع سے متعلق اصول وضوابط یا شرائط کو دیکھنا ہوگا کہ فقہاء کرام نے نہ صرف مبیع، بلکہ دیگر امور سے متعلق بھی شرطوں کو بہ تفصیل ذکر فرمایا ہے، چنانچہ شامی میں ہے:

''وذكر في البحر أن شرائط البيع أربعة أنواع شرط انعقاد ونفاذ وصحة لزوم'' (شامی ۴/۸)۔

چنانچہ شرط انعقاد کے ذیل میں عاقد، نفس عقد، مکان عقد اور معقود علیہ میں سے ہر ایک سے متعلق شرطیں ہیں۔ ہم یہاں صرف معقود علیہ سے متعلق شرائط کا ذکر کریں گے۔

مبیع سے متعلق شرائط:

فقہاء احناف کے نزدیک معقود علیہ سے متعلق چند شرطوں کا ذکر ہمیں ملتا ہے، جو حسب ذیل ہیں:

۱- یہ کہ مبیع موجود ہو، لہذا معدوم کی بیع منعقد نہ ہوگی۔

۲- یہ کہ مبیع ایسی شئ ہو جس سے ملک متعلق ہوتی ہو، چنانچہ گھاس کی بیع منعقد نہ ہوگی، اگرچہ وہ کسی کی مملوکہ زمین میں ہو، کیوں کہ وہ مباح الاصل ہے۔

۳- یہ کہ مبیع بائع کی ملکیت میں ہو اگر وہ خود بیع کررہا ہو یا اس کے مؤکل کی ملکیت میں ہو، چنانچہ بیع سلم کے علاوہ کسی اور جگہ غیر مملوک کی بیع منعقد نہ ہوگی (اس کے لیے بھی از ابتداء تا انتہا بازار میں پایا جانا ضروری ہے)

۴- یہ کہ مبیع شرعاً مال متقوم ہو، چنانچہ خمر وغیرہ کی بیع منعقد نہ ہوگی کہ جس سے شرعاً انتفاع مباح نہ ہو۔

۵- یہ کہ بائع مبیع کی حوالگی وتسلیم پر فوری طور پر قادر ہو (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/۱۶۶، شامی ۴/۷)۔

مذکورہ بالا شرائط کو سامنے رکھکر مچھلیوں کی بیع وشراء جن کا ذکر سوال نمبر ۱ میں ہے، جائزلیا گیا تو معلوم ہوا کہ مچھلیوں کو شکار کیے بغیر بیچنے کی صورت میں شرائط نمبر ۱ و نمبر ۳ اور نمبر ۵ کا فقدان ہے۔

ندی، نالے اور تالاب کی مچھلیاں شکار سے پہلے کسی کی مملوک نہیں ہیں:

ندی، نالے سے مچھلیاں شکار کیے بغیر فروخت کردی جائیں تو نہ صرف یہ کہ غیر مملوک کی بیع ہے، بلکہ معدوم کی بیع ہے، جیسے غیر مملوک کی بیع درست نہیں ہے، ایسے ہی معدوم کی بیع ناجائز ہے۔

وہ تالاب، ندی اور نالے جنھیں مچھلی پالنے اور شکار کے مقصد سے نہیں بنایا گیا ہے، ان میں پائی جانے والی مچھلیاں شکار کیے بغیر کسی کی مملوک نہیں بن سکتیں، ''فتح القدیر شرح ہدایہ'' میں ہے:

''سمندر یا دریا میں پائی جانے والی مچھلی کی بیع جائز نہیں ہے، سو اگر کسی کے پاس تالاب ہو اور مچھلیاں ان میں داخل ہوگئی ہوں تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو

[1] مدرس شعبۂ عربی، دار العلوم مئو۔

اس نے اس تالاب کو مچھلی کے شکار کے لیے بنایا ہوگا یا نہیں، اگر اس نے اسی مقصد کے لیے بنایا اور مچھلیاں اس میں داخل ہوگئیں تو وہ اس کا مالک ہوجائے گا اور کسی کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ وہ بغیر مالک کی اجازت کے اس کا شکار کرے اور اگر اس مقصد کے لیے نہیں بنایا تو جو مچھلیاں ازخود اس میں داخل ہوں گی وہ ان کا مالک نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کا فروخت کرنا جائز ہوگا، کیوں کہ وہ اس کا مالک نہیں ہوا'' (فتح القدیر ۶/۴۹)۔

درمختار میں ہے: اگر اس تالاب کو مچھلیوں کے شکار کے لیے بنایا ہے اور مچھلیاں اس تالاب میں داخل ہوگئیں تو وہ شخص ان مچھلیوں کا مالک ہوگا، اور کسی کو ان مچھلیوں کو لینے کا حق نہیں ہوگا، لیکن اگر اس نے تالاب اس مقصد کے لیے نہیں بنایا ہے تو داخل ہونے والی مچھلیاں اس کی مملوک نہ ہوں گی اور اسی عدم ملک کے باعث ان مچھلیوں کی بیع جائز نہ ہوگی۔

''وفسد بیع سمك لو بالعرض، وإلا فباطل لعدم الملك'' معلوم ہوا کہ بغیر شکار کی گئی مچھلی کی بیع اگر عرض (سامان) کے عوض میں ہو تو بیع فاسد ہوگی اور اگر عرض کے عوض میں نہ ہو تو یہ بیع باطل ہوگی، کیوں کہ مبیع اس صورت میں مملوک نہیں (درمختار مع شامی ۴/۱۴۶)۔

علامہ شامی نے ''درمختار'' کی مذکورہ بالا عبارت کے موقعہ پر تحریر فرمایا:

''ظاهره أن الفاسد بيع السمك بالقبض، وفيه أن بيع ما ليس في ملكه باطل كما تقدم، لأنه بيع المعدوم، والمعدوم ليس بمال، فينبغي أن يكون بيعه باطلا'' (شامی ۴/۱۴۷)۔

''درمختار'' کی عبارت کا ظاہری مفہوم تو یہ ہوا کہ مچھلی کی بغیر شکار کیے ہوئے بیع فاسد ہے، اور اس کے بیچنے میں اگر مشتری اس پر قبضہ کرلے تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا، لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ مچھلی کے شکار سے پہلے بیع تو غیر مملوک کی بیع ہے۔ تو اسے بیع باطل ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ معدوم کی بیع ہے اور معدوم مال نہیں ہوتا تو مناسب ہے کہ یہ بیع باطل ہو، ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ مچھلیوں کی خرید وفروخت انہیں شکار کرنے سے پہلے غیر مملوک اور معدوم کی بیع ہے اور معقود علیہ جب غیر مملوک اور معدوم ہو تو بیع کا انعقاد ہی نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ مذکورہ بالا صورت میں مبیع غیر مقدور التسلیم بھی ہے اور بیع کے انعقاد کے منجملہ شروط میں سے مبیع کا مقدور التسلیم ہونا بھی ہے۔ ''ہدایہ'' کی شرح ''فتح القدیر'' میں ہے: ''وإن لم يؤخذ إلا بحيلة لا يجوز بيعه لعدم القدرة على التسليم عقيب البيع'' (فتح القدیر ۶/۴۹)۔ (اگر مچھلیوں کو بغیر حیلہ کے نہ پکڑا جاسکتا ہو تو ان کی بیع جائز نہ ہوگی، کیوں کہ اس صورت میں بیع کے بعد مبیع کی تسلیم اور حوالگی پر بائع کو قدرت نہ ہوگی)، نیز مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: (المغنی ۴/۲۲۴، سبل السلام للصنعانی ۳/۸۰۷)۔

غیر مملوک کی بیع احادیث کی روشنی میں:

کتب احادیث میں ہمیں دو طرح کی روایتیں ملتی ہیں ایک تو عام احادیث جن سے کسی بھی غیر مملوک کی بیع ناجائز معلوم ہوتی ہے، دوسرے خصوصی احادیث جن میں مچھلی کے پانی میں رہتے ہوئے خرید وفروخت سے روکا گیا ہے۔

پہلی قسم کی حدیث میں سے حکیم ابن حزم سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''لا تبع ما ليس عندك'' (رواه الخمسه بحواله منتقى الاخبار مع نيل الاوطار ۵/۱۵۵)۔

علامہ شوکانی ''نیل الاوطار'' میں ''ما لیس عندک'' پر تحریر فرماتے ہیں: ''أي ما ليس في ملكك و قدرتك'' (جو چیز تمہاری ملکیت اور قدرت میں نہ ہو وہ حرام ہے)

دوسری روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے ہے جس میں یہ الفاظ وارد ہیں:

''قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل سلف و بيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن ولا بيع ما ليس عندك'' (سبل السلام ۳/۸۰۹)۔

''وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيع الحصاة و بيع الغرر'' (رواہ مسلم ۲/۲ صحیح مسلم مع النووی)۔

علامہ نووی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''رہی بات غرر سے نہی تو کتاب البیوع کے اصولوں میں سے ایک بہت بڑا اصول اور ضابطہ ہے، اس ضابطہ کے ماتحت بے شمار مسائل آتے ہیں۔ جیسے بھاگے ہوئے غلام، معدوم، مجہول اور غیر مقدور التسلیم کی خرید وفروخت اور ایسی چیز کی بیع جس پر بائع کی ملکیت قائم نہ ہو اور ماء کثیر کے اندر مچھلی کی بیع'' (شرح

النووی علی صحیح مسلم)۔

معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ نے خرید وفروخت کے سلسلے میں ان ضوابط وقوانین کو بروئے کار لانے کی ہدایت کی ہے جس سے متعاقدین میں سے کسی کو نقصان اور خسارہ وغیرہ کی نوبت نہ آنے پائے، چنانچہ ان تدابیر کو اختیار کر کے جن کا ذکر شرائط انعقاد کے اندر ہوا، متعاقدین میں سے ہر ایک خسارہ سے بچ سکتا ہے اور جانبین میں سے ہر ایک اپنے دامن کو دوسرے کے مال ومتاع کو باطل اور ناجائز طور سے استعمال کرنے کے بدنما داغ سے بچا جا سکتا ہے، بیع غرر سے نہی کا ورود اسی منشا کی تکمیل کا متقاضی ہے، چنانچہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اقسام بیوع سے واضح طور پر منع فرما دیا جن کا رواج دور جاہلیت میں تھا۔ بیع مزابنہ، محاقلہ، مخابرہ، ملامسہ، مخاصرہ، اور نہ جانے اس جیسی کتنی بیوع جاہلی دور میں مروج تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی نہی فرما دی۔

مذکورہ بالا عمومی احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کسی غیر مملوک، معدوم اور غیر مقدور التسلیم کی بیع درست نہ ہوگی۔ مچھلی کی ماء کثیر کے اندر رہتے ہوئے خرید وفروخت بھی غیر مملوک بلکہ معدوم اور غیر مقدور التسلیم شئ کی بیع ہے، لہذا شکار سے پہلے ان کی خرید وفروخت درست نہ ہوگی۔ رہی خصوصی احادیث، تو اس ضمن میں ہمیں عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ملتی ہے جسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں نقل فرمایا ہے:

''عن ابن مسعود أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا تشتروا السمك فی الماء، فإنه غرر'' (مسند احمد ۱/۳۸۸)۔

(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانی کے اندر موجود مچھلی کو نہ خریدو، کیوں کہ اس میں غرر ہے)۔ اس باب سے متعلق مزید مباحث کے لیے دیکھئے: (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/۱۶۷، شامی ۴/۷، فقہ السنہ ۳/۶۳)۔

خلاصہ بحث:

ندی، نالے اور ایسے تالاب جن کو بطور خاص مچھلی پالنے اور شکار کے مقصد سے نہ بنایا گیا ہو ان میں موجود مچھلیوں کی خرید وفروخت شکار سے قبل ناجائز ہوگی، کیوں کہ اس شکل میں یہ بیع معدوم اور غیر مملوک کی بیع ہے، نیز مبیع غیر مقدور التسلیم ہے اور مزید برآں مبیع مجہول بھی ہے ان خرابیوں کے پیش نظر یہ بیع مطلقاً صحیح نہیں مانی جاسکتی اگرچہ عرف میں اس کا کتنا ہی رواج کیوں نہ ہو، کیوں کہ یہ عرف ان نصوص شرعیہ سے براہ راست متصادم اور متعارض ہے جن کا ذکر (غیر مملوک کی بیع احادیث کی روشنی میں) کیا گیا ہے۔ مجموعۂ رسائل ابن عابدین میں ہے:

''إذا خالف العرف الدلیل الشرعی فإن خالفه من کل وجه بأن لزم منه ترك النص فلا شك فی رده کتعارف الناس کثیرًا من المحرمات من الربا وغیر ذلك مما ورد تحریمه نصًا'' (مجموعہ رسائل ابن عابدین ۲/۱۱۶)۔

ٹھیکیدار کا ندی، نالے اور تالاب کی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد بیچنے کا حکم:

اوپر کی مکمل بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مذکورہ بالا صورت معاملہ میں سرکار کا ندی، نالے، اور تالاب کی مچھلیوں کو شکار کیے بغیر بیچنا درست نہیں ہے۔

اس سے قبل یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ندی، نالے اور تالاب جن کے اندر مچھلیوں کو پالنے کا نظم نہیں کیا گیا ہے یہ مچھلیاں، شکار سے قبل کسی کی بھی ملکیت نہیں، بلکہ مباح الاصل ہیں، جو شخص آگے بڑھ کر انہیں پکڑ لے اور شکار کر لے ان کا مالک بن جائے گا، تفصیل کے لیے دیکھئے: (شامی ۴/۱۴۷)۔

تصریحات بالا کی روشنی میں یہ واضح ہو گیا کہ سرکار یا کوئی بھی دوسرا شخص ندی، نالے اور عوامی تالاب کی مچھلیوں کا شکار سے قبل مالک نہیں ہوا کرتا جو شخص ان مچھلیوں کا شکار کرے وہی اس کا مالک بن جائے گا۔

ٹھیکہ دار کا سرکار سے مچھلیوں کا خریدنا تو بیکار اور کالعدم رہا، البتہ جب اس نے مچھلیوں کو شکار کر لیا تو وہ ان کا مالک بن گیا، اس لیے وہ ان مچھلیوں کو دوسروں کے ہاتھ بیچنے میں حق بجانب ہوگا۔ اور کسی مسلمان کا پوری صورت حال کو جاننے کے باوجود خریدنا بھی درست ہوگا۔

ٹھیکہ دار کے اس بیع کے جواز کا فتویٰ ''فتاوی دار العلوم دیوبند'' (۶، ۷/۲۴) میں مذکور ہے، نیز حضرت مولانا تھانویؒ نے بھی اس کا جواز تحریر فرمایا ہے (امداد الفتاوی ۳/۴۸-۴۹)۔

نجی تالاب یا حوض میں پالی ہوئی مچھلیوں کے بیع کا حکم:

جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے اگر وہ شخص اس میں باقاعدہ مچھلیاں پالتا ہے تو وہ اس کی مملوک ہیں، ان مچھلیوں کی فروخت اسوقت جائز ہوگی جب کہ ان کے پکڑنے میں کسی حیلہ کی ضرورت نہ ہو، کیوں کہ مبیع اس صورت میں مملوک ہونے کے ساتھ ساتھ مقدور التسلیم بھی ہے، لیکن مشتری کو خیار رویت

حاصل ہوگا۔

"مجمع الانہر" میں یہ عبارت مذکور ہے:

"وأمكن أخذه بلا حيلة صح بيعه لكونه مقدور التسليم لكن إذا سلمه إلى المشتري فله خيار الرؤية" (۲/۵۵)۔

شامی میں ہے:

"وإلا فلا لعدم القدرة على التسليم" (شامی ۴/۱۴۷)۔

اور اگر نجی حوض یا تالاب کی مچھلیاں بدون حیلہ نہیں پکڑی جاسکتی ہوں تو ان کی بیع درست نہ ہوگی، کیوں کہ اس صورت میں مبیع غیر مقدور التسلیم ہے۔

حنابلہ کے یہاں نجی حوض یا تالاب کی مچھلیوں کے بیع کے جواز کا قول ملتا ہے، لیکن ان کے یہاں اس جواز کیلیے تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے، علامہ ابن قدامہ حنبلی کے الفاظ میں:

"پانی کے اندر مچھلی کی بیع کے جواز کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں: ۱ مچھلی مملوک ہو، ۲ پانی اس قدر رقیق اور صاف وشفاف ہو کہ مچھلیوں کے مشاہدہ اور معرفت میں کسی طرح کی روکاوٹ نہ ہو، ۳ یہ کہ ان مچھلیوں کا (بغیر حیلہ کے) پکڑنا اور شکار کرنا ممکن ہو اور اگر یہ ساری شرطیں پائی جارہی ہوں تو مچھلیوں کی بیع حنابلہ کے نزدیک جائز ہوگی، ورنہ نہیں" (المغنی ۴/۱۴۲)۔

ذاتی اور عوامی تالاب از خود پیدا ہونے والی مچھلیوں کی بیع کا حکم:

تالاب یا حوض، خواہ نجی ملکیت کے ہوں یا عوامی زمرہ کے ان میں جو مچھلیاں پالے بغیر از خود بارش وغیرہ کیوجہ سے آجایا کرتی ہیں وہ کسی کی مملوک نہیں ہوا کرتیں، بلکہ وہ مباح الاصل ہوتی ہیں، اس لیے شکار سے قبل ان کی بیع باطل ہوگی، کیوں کہ یہ غیر مملوک کی بیع ہے۔

نجی تالاب وحوض ہوں یا عوامی ان میں مچھلیوں کے داخل ہوجانے کے بعد اگر ان کے روکنے کی کسی شخص کی طرف سے کوئی سبیل کرلی گئی ہو تو وہ ان کا مالک ہو جائے گا، اب اگر ان مچھلیوں کو بغیر حیلہ کے شکار کرنا اور پکڑنا ممکن ہو تو ان کی بیع وشراء بھی جائز ہوگی، اس لیے کہ اس صورت میں مبیع مملوک ہونے کی ساتھ مقدور التسلیم بھی ہے۔

"شامی" میں ہے:

"إلا أن يسد الحظيرة إذا دخل فحينئذ يملك، ثم إن أمكن أخذه بلا حيلة جاز بيعه، وإلا فلا" (شامی ۴/۱۴۷، نیز دیکھئے: فتح القدیر ۶/۴۹)۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مچھلیاں جب تالاب یا حوض میں داخل ہوجائیں اور ان کے روکنے کی سبیل اختیار کرلی گئی ہو تو وہ مملوک ہو جائیں گی، اس صورت میں اگر تالاب یا حوض اس انداز کا ہو کہ مچھلیاں بغیر حیلہ کے پکڑی جاسکتی ہوں تو ان کی بیع درست ہوگی

"لكون المبيع مملوكا ومقدور التسليم"

اور اگر تالاب یا حوض کا مدخل بند تو کردیا گیا، لیکن مچھلیاں بغیر حیلہ کے نہیں پکڑی جاسکتیں تو اس صورت میں بیع فاسد ہوگی، کیوں کہ مبیع غیر مقدور التسلیم ہے، اور اگر مچھلیوں کو روکنے کی کوئی سبیل اختیار نہیں کی گئی تو اس صورت میں ان مچھلیوں کی بیع باطل ہوگی "لكون المبيع غير مملوك"۔

☆☆☆

مچھلی کی بیع وشراء

مولانا خورشید احمد اعظمی [1]

۱- آج کل جو مچھلیاں منڈی میں فروخت کی جاتی ہیں ان کا ایک بڑا حصہ ان ندی اور نالوں سے آتا ہے جن کے مختلف رقبے حکومت کی طرف سے کسی خاص شخص کو کوآپریٹیو سوسائٹی یا مقامی پنچایتوں کے ہاتھ معین مدت کے لیے ٹھیکہ پر دیئے جاتے ہیں اور یہ لوگ سرکار کو معاوضہ دے کر خاص حصہ سے حاصل ہونے والی مچھلی نکالتے ہیں، حالاں کہ ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیاں نہ اس غرض سے پالی گئی ہوتی ہیں اور نہ ان کے روکنے کا کوئی بندو بست کیا جاتا ہے، بلکہ وہ سیلاب کی آمد ورفت کے ساتھ آتی اور جاتی رہتی ہیں، یہ مچھلیاں چوں کہ کسی کی ملک نہیں ہوتیں، اس لیے بغیر شکار کیے ہوئے پانی کے اندر ہی ان کی بیع بیع باطل ہے، کیوں کہ بیع کے لیے مبیع سے متعلق کچھ شرائط ہیں ان میں سے ایک مبیع کا بائع کی ملک میں ہونا بھی ہے، نیز مبیع کا مقدور التسلیم ہونا بھی شرط ہے، ''شامی'' میں ہے:

''معقود علیہ کی شرط یہ ہے کہ وہ موجود اور مال متقوم ہو، نیز فی نفسہ مملوک ہو اور اس پر اس شخص کی ملکیت ہو جو اس کو اپنے لیے بیچ رہا ہے، نیز اس کی سپردگی زیر قدرت ہونا بھی ہے'' (شامی ۴/۵)۔

علامہ صنعانی نے بھی ''سبل السلام'' میں اس کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

''وقد جعلوا شروط البيع أنواعا فيها في العاقد وهو أن يكون عاقلا مميزًا وفيها في الآلة وهذا أن يكون بلفظ الماضي وفيها في المحل وهو أن يكون مالا متقوما وأن يكون مقدور التسليم'' (سبل السلام/۷۸۸)۔

(فقہاء نے بیع کی شرطیں کئی طرح کی رکھیں ہیں ان میں بعض عاقد کے حق میں ہے اور وہ یہ ہے کہ عاقد (معاملہ کرنے والا) عاقل اور صاحب تمیز ہو اور بعض الفاظ وصیغہ سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ لفظ ماضی کا ہو اور بعض شرطیں محل سے متعلق ہیں وہ یہ ہے کہ محل بیع مال متقوم ہو اور اس کی سپردگی قدرت میں ہو)۔

مذکورہ بالا صورتوں میں چوں کہ مچھلیاں ٹھیکہ دینے والے یا بائع کی ملک نہیں ہوتیں اور نہ ہی مقدور التسلیم ہوتی ہیں، اس لیے ان کی بیع درست نہیں ہے، جیسا کہ ''ہدایہ'' میں ہے:

''ولا يجوز بيع السمك قبل أن يصطاد؛ لأنه باع مالا يملكه ولا في حظيرة إذا كان لا يؤخذ إلا بصيد؛ لأنه غير مقدور التسليم'' (ہدایہ ۳/۴۴)۔

(مچھلی کی فروخت شکار سے قبل جائز نہیں ہے، کیوں کہ آدمی ایسا سامان بیچ رہا ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے اور نہ ہی تالاب کے اندر کی مچھلی کا بیچنا درست ہے، جبکہ اس کو شکار کے عمل کے بغیر حاصل نہ کیا جاسکے، کیوں کہ اس صورت میں وہ زیر قدرت نہیں)۔

نیز علامہ شامیؒ نے بھی اس کی وضاحت کی ہے (دیکھئے: شامی ۴/۶)۔

حکیم بن حزامؓ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں:

''قلت يا رسول الله! يأتيني الرجل فيريد مني البيع ليس عندي فاتباع له من السوق قال: لا تبع ماليس عندك''

(ابوداؤد ۳/۳۵۰)۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن ولا بيع ما ليس عندك'' (ابو داؤد ۴/۳۵۰)۔

(مبیع اور قرض نیز بیع دو شرطوں کے ساتھ اور جو چیز ضمان میں داخل نہ ہو اس کا نفع اور جو سامان اپنے پاس نہ ہو اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے)۔

---

[1] خادم التدریس، جامعہ تعلیم الدین، رگھوناتھ پورہ، مئو۔

نیز کثیر پانی کے اندر والی مچھلیوں کی بیع قبل شکار درست نہیں ہوگی، کیوں کہ بیع غرر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے:

''عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيع الحصاة و عن بيع الغرر'' (صحیح مسلم ۱۰/۴۵۶)۔

اس کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''بیع غرر اور دھوکہ کی بیع سے ممانعت پر بیع کے اصول میں ایک بڑی اصل ہے اسی لیے امام مسلم نے اس کو پہلے ذکر فرمایا ہے، اس میں بہت سے ان گنت مسائل داخل ہیں، جیسے بھگوڑے غلام کی فروخت اور معدوم و مجہول کی، نیز اس کی جس کی سپردگی زیر قدرت نہ ہو اور جس پر بائع کی ملکیت مکمل نہ ہو، اسی طرح مچھلی جو پانی کے اندر ہو اس کی فروخت'' (دیکھئے: صحیح مسلم مع شرح نووی ۱۰/۴۵۶)۔

حافظ ابن حجرؒ نے بھی ''بيع السمك في الماء'' کو بیع غرر میں شمار کیا ہے (فتح الباری ۴/۳۵۷)۔

نیز امام ترمذیؒ نے مذکورہ حدیث کی روایت کے بعد امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے:

''وقال الشافعي من بيع الغرر بيع السمك في الماء'' (سنن ترمذی)۔

بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں صراحۃً پانی کے اندر مچھلیوں کی بیع سے منع کیا گیا ہے:

''عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ: لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر'' (مسند احمد ۱/۳۸۸)۔

اگر چہ اس حدیث کے متعلق ''بیہقی و دار قطنی'' وغیرہ کا کلام موجود ہے اور ان لوگوں نے اسے موقوف قرار دیا ہے، لیکن علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں:

''وقد روى أبو بكر بن أبي عاصم عن عمران ابن حصين رضي الله عنه حدثنا مرفوعًا، وفيه النهي عن بيع السمك في الماء، فهو شاهد لهذا'' (نیل الاوطار ۵/۲۴۳)۔

مذکورہ بالا صورت اگر چہ ٹھیکہ اور اجارہ کی نوعیت رکھتی ہے اور یہ اجارہ حدیث معلومہ میں منفعت مخصوصہ معلومہ، یعنی شکار کے لیے ہوتا ہے، لیکن چوں کہ یہ اجارہ مستلزم لاستہلاک العین ہے اس بنا پر یہ صورۃ اجارۃ بھی درست نہیں ہوگی۔

''الإجارة إذا وقعت على العين لا تصح فلا تجوز على استئجار الآجام والحياض لصيد السمك'' (شامی ۵/۳۹)۔

(اجارہ اگر عین سامان پر ہو تو صحیح نہیں ہوتا، لہٰذا پانی کے حوض وغیرہ کا اجارہ مچھلی کے شکار کے لیے درست نہیں ہے)۔

''ولم تجز إجارة بركة ليصاد فيها السمك'' (شامی ۴/۱۰۶)۔ (اور کسی تالاب کا اجارہ مچھلی کے شکار کی غرض سے جائز نہیں ہے)۔

رہا یہ مسئلہ کہ آج کل مچھلیوں کی بیع اور ٹھیکہ داری کی یہ صورت ایک عرف عام بن چکی ہے، لیکن چوں کہ یہ عرف نصوص صریحہ مذکورہ ''لا تبع ما ليس عندك، ونهى عن بيع الغرر، لا تشتروا السمك في الماء، نهى عن بيع السمك في الماء'' سے متصادم ہے، اس لیے اس عرف کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

''إذا خالف العرف الدليل الشرعي فإن خالفه من كل وجه بأن لزم منه ترك النص فلا شك في رده'' (نشر العرف لابن عابدین/۱۱۶)۔

(جب کوئی عرف دلیل شرعی کے خلاف ہو تو اگر پورے طور پر مخالف ہو کہ اس کی وجہ سے نص کا ترک لازم آتا ہو تو ایسے عرف کے مردود ہونے میں شک نہیں)، نیز دیکھئے: (المدخل الفقہی العام/۸۷۷)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ندی، نالے یا نہروں میں پائی جانے والی مچھلیوں کا شکار سے پہلے بیچنا یا ٹھیکہ پر دینا درست نہیں، کیوں کہ اس سے درج ذیل خرابیاں لازم آتی ہیں:

۱- بیع مالا یملک۔ ۲- بیع مالا یقدر علی تسلیمہ۔ ۳- بیع غرر۔ ۴- نص صریح کی مخالفت۔

اس لیے مذکورہ بالا صورت بیع یا اجارہ باطل ہوگی۔

۲- ندی، نالے یا نہریں جو کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہوتیں اور سرکار ان کو معاوضہ پر شکار کرنے کے لیے دیدیتی ہے اگر چہ ٹھیکہ داری درست نہیں ہے، مگر چوں کہ ان میں پائی جانے والی مچھلیاں مباح الاصل ہوتی ہیں جو ان کا شکار کرلے وہی ان کا مالک ہوجاتا ہے، اس لیے جب ٹھیکہ لینے والا یا کوئی بھی شخص ان مچھلیوں کا شکار کرلے اور اس طرح اپنی تحویل میں لے لے کہ مشتری کے حوالہ کرسکے تو پھر اس کا ان مچھلیوں کو بیچنا درست ہوگا۔ اور کسی مسلمان شخص کا اس ٹھیکہ دار

سے پوری صورت حال جاننے کے باوجود خریدنا جائز ہوگا۔

”غیر شکار شدہ مچھلی کی فروخت فاسد ہے اگر سودا سامان کے عوض ہو اور اگر نقد کے عوض ہو تو باطل ہے، کیوں کہ ایسی مچھلی مملوک نہیں۔ اسی طرح جس کو شکار کر کے ایسی جگہ رکھدیا جائے کہ وہاں سے بغیر تدبیر کے حاصل نہ کیا جاسکے تو بھی یہی حکم ہے، کیوں کہ اس صورت میں سپردگی سے عجز پایا جارہا ہے۔ اور اگر تدبیر کے بغیر پکڑنا ممکن ہے تو صحیح ہے اور خریدنے والے کو خیار رویت حاصل ہوگا، البتہ اگر خریدنے والا خود پکڑ سکے تو صحیح ہے“ (درمختار مع ردالمحتار ۴/۱۰۶)۔

اس طرح ٹھیکہ پر حاصل کی ہوئی ندی نہروں سے شکار کے بعد مچھلیوں کی خرید وفروخت کا جائز ہونا فتاویٰ دار العلوم (۷/۲۴) وامداد الفتاویٰ (۳/۴۸، ۴۹) میں بھی مذکور ہے۔

۳- ایسے حوض یا تالاب جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں اور وہ شخص باقاعدہ ان میں مچھلیاں پالتا ہے تو اس صورت میں وہ ان مچھلیوں کا مالک ہے، بغیر اس کی اجازت کے کسی اور شخص کا کسی بھی طرح کا تصرف ان مچھلیوں پر جائز نہیں۔

لیکن خود اس شخص کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ ان حوض یا تالاب کی مچھلیوں کو نکالنے سے پہلے پانی کے اندر ہی کسی اور کے ہاتھ فروخت کرے یا معاوضہ لے کر کسی اور کو ان مچھلیوں کے شکار کا ٹھیکہ دے، کیوں کہ یہ صورت اگرچہ ”بیع مالیس عندک“ کو متضمن نہیں ہے، مگر غرر سے خالی نہیں اور عجز عن التسلیم کو متضمن ہے۔

البتہ اگر اس طرح کے نجی تالاب یا حوض اتنے چھوٹے ہیں کہ مچھلیاں نظر آتی ہوں اور بغیر حیلہ کے انہیں پکڑا جاسکتا ہے تو پھر ان مچھلیوں کی بیع پانی کے اندر بھی درست اور جائز ہوگی، تفصیل کے لیے دیکھئے: (فتح القدیر ۶/۴۹)، نیز اس بحث کے لیے ”مغنی مع الشرح الکبیر“ (۴/۱۸۱) کو بھی دیکھا جائے۔

”پانی کے اندر کی مچھلی کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ تین شرطیں پائی جائیں: ایک یہ کہ مملوک ہو، دوسرے یہ کہ پانی رقیق ہو جس کی وجہ سے اندر کی مچھلی کا دیکھنا اور سمجھنا ممکن ہو، تیسرے یہ کہ اس کا شکار اور اس کا حاصل کرنا آسانی ممکن ہو۔

جب یہ تینوں شرطیں پائی جائے گی تو فروخت درست ہوگی اور اگر ایک شرط بھی کم ہوئی تو جائز نہیں“ (المغنی مع الشرح الکبیر ۴/۱۸۱)۔

۴- ایسے حوض یا تالاب جو مچھلیاں پالنے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں، بلکہ ان میں مچھلیاں از خود بارش وغیرہ کے پانی کے ساتھ آجاتی ہیں وہ تالاب یا حوض، خواہ نجی اور شخصی ملکیت کے ہوں یا عوامی، ان میں پائی جانے والی مچھلیاں کسی کی ملکیت نہیں ہوتیں، ایسی مچھلیوں کا پانی میں رہتے ہوئے بیچنا درست نہیں ہے اور نہ ایسے تالاب یا حوض کو ٹھیکہ پر دینا ہی جائز ہے۔

البتہ اگر نجی اور شخصی حوض جن میں مچھلیاں از خود آگئی ہیں اگر ان کا مالک مچھلیوں کے آنے کے بعد ان کو روکنے کا بندوبست کرتا ہے تو پھر وہ ان کا مالک ہوجائے گا، اب اگر وہ حوض یا تالاب اتنا چھوٹا ہے کہ ان میں مچھلیوں کی مقدار مجہول نہ رہ جائے اور بغیر حیلہ اصطیاد کے ان مچھلیوں کو مشتری کے حوالہ کرنا آسان ہو تو پھر ان حوض یا تالاب کی مچھلیوں کی بیع قبل الاصطیاد درست ہوگی۔

اور اگر وہ نجی حوض یا تالاب بڑے ہیں جن میں مچھلیوں کی مقدار معلوم نہ ہوسکے اور بغیر حیلہ اصطیاد (شکار کی تدبیر کے بغیر) انہیں مشتری کے حوالہ بھی نہ کیا جاسکے تو قبل اصطیاد (شکار سے قبل) ان کا بیچنا درست نہیں ہوگا (فتح القدیر ۶/۴۹، نیز شامی ۴/۱۰۶)۔

☆☆☆

شکار سے قبل مچھلیوں کی خرید وفروخت

مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی

''بیع کے چند مسائل'' کے تحت شکار سے قبل مچھلیوں کی خرید وفروخت اور اس سلسلہ میں ندی، نالے، تالاب وغیرہ کے اجارہ اور ٹھیکہ سے متعلق سوالنامہ پر کتب حدیث وفقہ وفتاویٰ کی تصریحات کی روشنی میں غور وخوض کے بعد جو باتیں سمجھ میں آئیں وہ عرض ہیں:

۱- میں عدم جواز کا فتویٰ دینا چاہیے، کسی غلط یا حرام شئ کا رائج ہوجانا کوئی شرعی حجت نہیں ہے، جب یہ ندی، نالے اور نہریں کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہیں، بلکہ سرکاری ہیں تو وہ اصلاً وقف عام اور مباح الاصل کے قبیل سے ہوئے، لہذا ان کے اندر کوئی شخص بیع وتملیک وغیرہ تصرفات کا شرعاً مجاز نہیں:

''قال ابن قدامة: الأنهار التابعة في غير ملك كالأنهار الكبار لا تملك بحال ولا يجوز بيعها'' (اعلاء السنن طبعه قديم ۱۴/۱۲۲)۔

اسی طرح ان کی مچھلیاں بھی شکار سے قبل کسی کی مملوک نہیں، اس لیے ان کی بیع از روئے شرع باطل ہوگی جو کسی حال میں بھی مفید ملک نہیں۔

''وفي البرجندي ذكره المصنف أن بيع السمك قبل أن يصطاد باطل، إن كان بالدراهم والدنانير، وفاسدا إن كان بالعرض'' (مجموعۃ الفتاویٰ ۲/۱۴۰)۔

اسی طرح ان ندی، نالوں، نہروں کا اجارہ اور ٹھیکہ پانی سے مچھلیاں نکالنے کے لیے بھی مندرجہ ذیل تصریحات کی بنا پر درست نہیں، ''درمختار'' میں ہے:

''ولم تجز إجارة بركة ليصاد منها السمك'' (درالمختار ۴/۱۴۷)۔

شامی میں ہے کہ یہ اجارہ چوں کہ استہلاک عین پر ہوتا ہے، اس لیے ناجائز ہے (رد ۴/۱۴۸)۔

دلائل:

حديث: عن ابن مسعود ''أن النبي ﷺ قال: لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر'' رواه احمد (نیل الاوطار ۵/۲۴۳)۔

(حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو مچھلی پانی کے اندر ہواسے مت خریدنا اس میں غرر اور دھوکہ ہے (کیا معلوم ملے نہ ملے)

(قال الشوكاني: حديث ابن مسعود في اسناده يزيد بن أبي زياد عن المسيب ابن رافع عن ابن مسعود، قال البيهقي: فيه إرسال بين المسيب وعبد الله والصحيح وقفه، وقال الدار قطني في العلل: اختلف فيه، والموقوف أصح. وكذلك قال الخطيب وابن الجوزي، وقد روى أبو بكر ابن أبي عاصم عن عمران بن حصين حديثا مرفوعا، وفيه النهي عن بيع السمك في الماء فهو شاهد لهذا) (نيل الاوطار ۵/۲۴۳)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

''شکار سے قبل اگر کوئی شخص مطلق، یعنی غیر معین مچھلی عرض (سامان) کے عوض بیچے تو یہ بیع جانبین سے باطل ہے، جیسے کوئی مردار کی بیع عرض (سامان) کے عوض کرے یا عرض وسامان کی بیع مردار کے عوض کرے اور اگر شکار سے پہلے کوئی شخص معین مچھلی کی بیع عرض وسامان کے عوض کرتا ہے تو یہ بیع مچھلی کے حق میں بوجہ اس کے غیر مملوک ہونے کے باطل ہوگی اور عرض وسامان کے حق میں فاسد ہوگی، کیوں کہ مچھلی فی الجملہ مال ہے، اگر شکار سے پہلے کسی نے مچھلی درہم ودنانیر کے عوض فروخت کیا تو بیع باطل ہوگی، کیوں کہ اس صورت میں مچھلی کا مبیع ہونا متعین ہے اور چوں کہ وہ غیر مملوک ہے، اس لیے بیع باطل ہوگی'' (ردالمحتار ۴/۱۴۷)۔

علامہ شمس الدین السرخسی کی ''المبسوط'' میں ہے:

''کسی آدمی نے ایسی مچھلی فروخت کی جو کسی حظیرہ میں محصور ہے تو یہ بیع باطل ہے اور فقیہ ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ بیع جائز ہے بشرطیکہ بائع نے مچھلی پکڑنے کے بعد حظیرہ میں چھوڑا ہو، کیوں کہ اب چھوڑنے سے اس کی ملکیت زائل نہیں ہوگی گو اسے بدون شکار کے پکڑنے کی قدرت نہ ہو، لیکن ہمارا استدلال اس فتوے سے ہے جو حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ان حضرات نے فرمایا ہے کہ جو مچھلی پانی کے اندر ہو اس کی بیع مت کرو، اس لیے کہ

اس میں غرر اور دھوکہ ہے'' (المبسوط للسرخسی ۱۳/۱۱-۱۲)۔

حضرت مولانا محمد عبدالحی فرنگی محلیؒ لکھتے ہیں:

''مچھلی کا شکار سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے، پس اگر اس کی بیع عرض وا۔باب کے عوض میں ہوئی ہے تو فاسد ہے اور اگر دراہم ودنانیر کے عوض میں بیع ہوئی ہے تو باطل ہے جیسا کہ درمختار میں ہے:

''وفی البرجندی ذکره المصنف أن بیع السمك قبل أن یصطاد باطل إن کان بالدراهم و الدنانیر، وفاسدًا إن کان بالعرض''۔

(اور برجندی میں ہے مصنفؒ نے کہا ہے کہ شکار سے پہلے مچھلی کو بیچنا اگر دراہم ودنانیر سے ہو تو باطل ہے اور اگر عروض سے ہو تو فاسد ہے)۔

''ہدایہ میں ہے مچھلی کو شکار کرنے سے پہلے پانی میں بیچنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں اس چیز کی بیع ہے جس کی ملک ثابت نہیں، اسی طرح تالاب میں بھی مچھلی کو فروخت کر ڈالنا درست نہیں ہے، جبکہ بغیر شکار کے وہ پکڑی نہ جاسکتی ہوں، کیوں کہ تسلیم پر قدرت نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مچھلیاں پکڑ کے تالاب میں ڈالیں تو اگر تالاب سے بلا کسی مدد کے نکالی جاسکتی ہے تو یہ بیع جائز ہے، مگر اس صورت میں کہ مچھلیاں خود سے تالاب میں آئی ہوں، پھر ان کے واپس جانے کا راستہ روک دیا گیا ہو ناجائز ہے، کیوں کہ ملک ثابت نہیں ہے اور دوسری جگہ ہے: ''اور جب مشتری مبیع فاسد پر قابض ہوجائے اور عقد میں دو عوض ہوں اور دونوں مال ہوں تو مشتری مبیع کا مالک ہوجائے گا۔ اور قیمت لازم ہوگی'' اور دوسری جگہ ہے: ''اور متعاقدین میں سے ہر ایک کو حق فسخ ہے۔ فساد کے دفع کرنے کے لیے۔ اور اگر مشتری نے بیچ ڈالا تو بیع نافذ ہوگی، کیوں کہ وہ اس چیز کا مالک تھا تو تصرف کا بھی مالک تھا اور حق استرداد ساقط ہوجائے گا۔

اور ''درمختار'' میں ہے: ''اور مالک ہونے کے بعد اس کے لیے پانچ کے سوا اور سب احکام ملک ثابت ہوں گے، اسے اکل، لبس، وطی جائز نہیں، اور بائع کے ساتھ اس کی شادی کرنا، اور پڑوسی کو شفعہ کا حق حاصل نہ ہوگا'' ۔ (جوہرہ) اور شرح مجمع میں ہے: اور اسے خود بھی شفعہ کا حق حاصل نہ ہوگا یہ چھٹا استثناء ہے'' (مجموعۃ الفتاویٰ ۲/۱۴۰)۔

۲- کے جواب میں عرض ہے کہ مذکورہ بالا صورت معاملہ، یعنی ندی، نالوں کی مچھلیاں بدون شکار فروخت کرنا یا ٹھیکہ پر دینا بر بناء عدم ملک گو شرعاً ناجائز اور باطل ہے، لیکن چوں کہ وہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں انہیں کوئی بھی حاصل کرسکتا ہے انہیں میں ٹھیکہ دار اور مشتری وغیرہ بھی ہیں، لہٰذا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان شخص کا ایسی مچھلی کو خریدنا جائز ہے، شامی میں ہے:

''لا شتراك الناس فیه اشتراك إباحة لا ملك، ولأنه لا یحصل للمشتری فیه فائدة، لأنه یتملكه بدون بیع'' (درالمختار ۴/۱۵۲)۔

''وحمل فعل المسلم علی الصحة والحل واجب ما أمكن، إلا أن تقوم البینة'' (مبسوط ۱۷/۷۲۵)۔

(حتی الامکان مسلمان کے معاملہ کو درست اور حلال صورت پر محمول کرنا واجب ہے، الایہ کہ معاملہ کا شرعاً نادرست ہونا دلیل سے ثابت ہوجائے)۔

''اعلاء السنن'' میں ہے:

''امام ابویوسفؒ اپنی کتاب ''الخراج'' میں فرماتے ہیں: پانی جب برتنوں میں ہو تو اس کو فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ یہ پانی وہ ہے جسے بائع نے اپنے برتن کے اندر جمع اور ذخیرہ کیا ہے، لہٰذا ایسے پانی کو بیچنا جائز ہے، اسی طرح اگر کسی نے حوض بنایا اور اپنے برتن سے پانی کھینچ کھینچ کر اس میں ڈالا یہاں تک کہ خاصا پانی اکٹھا ہوگیا، پھر اس حوض سے پانی فروخت کیا تو بر بناء احراز یہاں بھی بیع درست ہے، لیکن اگر پانی حوض کے اندر خود بخود سیلاب کی وجہ سے جمع ہوگیا ہے تو اس بیع میں ذرہ برابر بھی خیر نہیں ہے، اگر پانی کنویں یا چشمے میں ہے تو خواہ اس کا پانی بڑھتا رہتا ہو یا نہ بڑھتا ہو اس کی بیع میں بھی ذرہ برابر خیر نہیں، اگر کوئی بیچے تب بھی بیع جائز نہ ہوگی اور جو اس سے پانی کھینچے گا وہ اس کا پانی ہوگا، یعنی وہ اس کا مالک ہوگا'' (إعلاء السنن طبعہ قدیم ۱۴/۱۲۳)۔

۳- اس صورت میں مچھلیاں بائع کی مملوک ہیں، لیکن ان کے غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے یہ بیع ناجائز، یعنی فاسد ہوگی جو واجب الرفع ہے، لیکن بایں ہمہ اگر مشتری بائع کی رضامندی سے مچھلیوں پر قابض ہوجائے تو مالک ہوجاتا ہے اور اس مبیع میں مشتری کا تصرف جیسے ہبہ وغیرہ نافذ ہوگا اور کسی کے ہاتھ مشتری کا بیچنا بھی نافذ ہوگا، مگر مشتری کو اس مبیع کا کھانا درست نہیں، جیسا کہ نہایہ میں ہے: ''ہدایہ میں ہے جب مشتری مبیع فاسد پر قابض ہوجائے اور عقد میں دو عوض ہوں اور دونوں مال ہوں تو مشتری مبیع کا مالک ہوجائے گا اور قیمت لازم ہوگی اور دوسری جگہ یوں ہے کہ متعاقدین میں سے ہر ایک کو حق فسخ ہے فساد کو دفع کرنے کے

لیے اگر مشتری نے بیچ ڈالا تو اس کی بیع نافذ ہوگی، کیوں کہ وہ اس چیز کا مالک تھا تو تصرف کا بھی مالک تھا اور حق استرداد ساقط ہو جائے گا'' (دیکھئے مجموعہ فتاویٰ مولانا محمد عبدالحی ۲/ ۱۴۰ مطبوعہ مطبع قیومی کانپور)۔

۴- میں تفصیل ہے، یعنی اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) یہ کہ اگر یہ حوض و تالاب اسی لیے بنائے گئے ہوں کہ اس میں بارش وغیرہ کی وجہ سے مچھلیاں آکر محصور ہو جائیں تب تو اس صورت میں مچھلیاں مملوک ہوں گی، اب اگر انہیں بدون حیلہ شکار کے پکڑنا ممکن ہو تو بیع جائز ہے، اس لیے کہ وہ مملوک بھی ہیں اور مقدور التسلیم بھی، ورنہ غیر مقدور التسلیم ہونے کی بناء پر بیع ناجائز ہوگی۔ (۲) یہ کہ یہ حوض و تالاب اس لیے نہیں بنائے گئے تھے کہ بارش وغیرہ کی وجہ سے ان میں مچھلیاں آکر محصور ہو جائیں تو گو ان میں مچھلیاں آگئی ہوں، لیکن چوں کہ حوض اور تالاب والے شرعاً ان کے مالک نہیں ہیں، اس لیے عدم ملک کی بناء پر بیع ناجائز ہوگی۔

شامی میں ہے:

والحاصل كما فى الفتح أنه إذا دخل السمك فى حظيرة، فإما أن يعدها لذلك أولا. ففى الأول يملكه، وليس لأحد أخذه، ثم إن أمكن أخذه بلا حيلة جاز بيعه، لأنه مملوك مقدور التسليم، وإلا لم يجز لعدم القدرة على التسليم، وفى الثانى لا يملكه، فلا يجوز بيعه لعدم الملك'' (ردالمحتار ۴/ ۱۴۷)۔

تالاب کو ٹھیکہ پر دینے کا حکم:

اب رہ گیا اس حوض یا تالاب کو کسی خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا، سو یہ بھی جائز نہیں، ''درمختار'' میں ہے:

''ولم تجز إجارة بركة ليصاد منها السمك بحر'' (حوالہ سابق)۔

☆☆☆

پانی سے مچھلیوں کو بغیر نکالے فروخت کرنا

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

ہمارے دیار میں پانی کے بہنے کی دو جگہیں ہیں: ندیاں، نہریں۔

۱- ندیاں قدرتی ہوتی ہیں، اس میں انسانی عمل کو کوئی دخل نہیں ہے اور وہ ہمیشہ یکساں راہ پر نہیں چلتی ہیں، کبھی کبھی اپنی جگہ تبدیل کرتی رہتی ہیں ان ندیوں میں جو پانی بہتا ہے وہ بھی قدرتی ہوتا ہے، کہیں وہ زمین کے چشموں سے ابلتا ہے اور کہیں وہ پہاڑ کے جھرنوں سے گرتا ہے، ان میں جو مچھلیاں ہوتی ہیں وہ بھی قدرتی ہوتی ہیں، ندیوں کا آخری سرا سمندر سے ملتا ہے سیلاب کے ساتھ مچھلیاں آتی جاتی رہتی ہیں ان میں مچھلیاں پالی نہیں جاتی ہیں، بلکہ اس کا امکان بھی نہیں ہوتا ہے۔

۲- یہ ندیاں سرکار کی ملکیت تسلیم کی جاتی ہیں جس وقت ندیاں اپنی جگہ تبدیل کر کے کسانوں کی زمین میں اپنا راستہ بنا لیتی ہیں اس وقت بھی زمین کے جس حصے پر پانی بہتا ہے سرکار کی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے۔

۳- ان ندیوں میں بہنے والا پانی مباح عام سمجھا جاتا ہے اس پر کسی حکومت کو اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان ندیوں کے پانی سے جو لوگ اپنی اراضی کی سینچائی کرتے ہیں کوئی حکومت ان سے اس پانی کی قیمت وصول نہیں کرتی ہے۔

۴- نہریں بھی سرکاری ملکیت ہیں حکومت کسانوں کی زمین کا معاوضہ دے کر نہریں کھدواتی ہیں ان نہروں میں جو پانی بہتا ہے وہ بھی سرکاری ملکیت تصور کیا جاتا ہے، اس لیے کہ پانی اگر چہ مباح عام ہے، لیکن احراز سے اس میں ملکیت آجاتی ہے، اگر کسی نے اپنی کاشت کی زمین میں پانی گھیر رکھا ہے تو دوسرے کو حق نہیں ہے کہ اس پانی کو اپنے کھیت میں لے جائے یا اگر کسی نے اپنے برتن میں پانی محفوظ کر لیا وہ اس کا مالک ہوگا اور اس کی اجازت کے بغیر دوسرے کو استعمال کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اسی طرح ان نہروں میں بہنے والا پانی قدرتی نہیں ہوتا ہے، بلکہ انسانی عمل کو اس میں دخل ہے خاص طریقہ سے ندیوں میں بند لگا کر حسب ضرورت موقع نہروں میں پانی لایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ندی کی طرح نہر میں پانی ہمیشہ نہیں بہتا ہے، بلکہ جب جب کاشت میں سینچائی کی ضرورت ہوتی ہے اس میں پانی لایا جاتا ہے اور جب پانی سرکار کی ملکیت ہے تو جو لوگ اس پانی سے اپنی اراضی کو سینچائی کرتے ہیں حکومت ان سے پانی کی قیمت وصول کرتی ہے ان نہروں میں پانی کے ساتھ مچھلیاں آجاتی ہیں۔

۵- نہروں میں پائی جانے والی مچھلیاں سرکار کی ملک نہیں تسلیم کی جاتی ہیں اسی وجہ سے کوئی حکومت نہ مچھلیوں کو فروخت کرتی ہے اور نہ مچھلی کا شکار کا کرنے کے لیے کرایہ پر نہریں دیتی ہے اور جو لوگ ان مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں حکومت کی طرف سے نہ تو اس کو شکار سے منع کیا جاتا ہے اور نہ اس پر ان سے کوئی معاوضہ لیا جاتا ہے۔

۶- ندی میں پائی جانے والی مچھلیاں سرکار کی ملکیت ہوں گی یا نہیں؟ اس پر غور کی ضرورت ہے، میری ناقص رائے میں مچھلیاں کسی حکومت کی ملک تسلیم نہیں کی جائیں گی۔

اول: اس لیے کہ اگر ندی میں پائی جانے والی مچھلیاں سرکار کی ملک ہوتیں تو جس طرح ندی سے حکومت جب پانی نہر میں لاتی ہے اور احراز کی وجہ سے مالک ہو جاتی ہے، جب کہ ندی میں بہتے ہوئے اس پانی کی مالک حکومت نہیں تھی تو نہر میں آنے والی مچھلیوں کی مالک بھی حکومت بدرجہ اولیٰ ہوتی۔ لیکن ابھی اوپر بحث گذری کہ نہر کی مچھلیاں سرکاری ملک نہیں سمجھی جاتی ہیں۔

دوم: اس لیے کہ آگے بحث آرہی ہے کہ جو گڈھے اور تالاب کسی کی ملک ہیں، لیکن اس نے ان کو مچھلی کے حصول کے لیے نہیں کھودا ہے تو سیلاب کیساتھ پانی میں آنے جانے والی مچھلیاں احراز کے بغیر اس کی مالک نہیں ہوں گی تو ندیاں تو کھودی بھی نہیں گئی ہیں، بلکہ قدرتی ہیں اس لیے ان میں پائی جانے والی مچھلیاں کسی کی ملک نہیں ہونی چاہیے۔

---

[1] قاضی شریعت امارت شرعیہ، پٹنہ۔

سوم: اس لیے کہ حکومت ان ندیوں کو خاص موسم میں محدود جگہ تک ٹھیکہ داروں کو مچھلی کے شکار کے لیے دیتی ہے، اس موسم کے علاوہ دوسرے ایام میں اور ان محدود جگہوں کے علاوہ ان جگہوں میں جن کو کسی ٹھیکہ دار نے نہیں لیا ہے ندی میں مچھلی کے شکار کو منع نہیں کیا جاتا ہے اور نہ حکومت شکار کرنے والوں سے کوئی معاوضہ لیتی ہے۔ اس لیے میری ناقص رائے ہے کہ ندی میں پائی جانے والی مچھلیاں کسی حکومت کی ملک نہیں ہوں گی۔

۷- اس بحث کی روشنی میں یہ طے کر لینا مشکل نہیں رہا کہ ندی کی مچھلیوں کی بیع جائز نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ بیع ''مالا یملک'' ہے، جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔

۸- اگر ندی کی مچھلیاں سرکار کی ملک سمجھی جائیں تو بھی ان کی بیع صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ مبیع مجہول ہے اور غیر مقدور التسلیم بھی ہے اور ایسی بیع فاسد ہوتی ہے۔

۹- ان دونوں صورتوں میں ٹھیکہ دار شکار کے بعد ان مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا، اگر مچھلیاں سرکار کی ملک نہ ہوں تو ظاہر ہے مباح عام ہوں گی، اور جو بھی شکار کرے گا مالک ہو جائے گا تو ٹھیکہ دار بھی مالک ہوگا۔

اور اگر مچھلیاں سرکاری ملک ہوں تو بیع فاسد ہوں گی اور بیع فاسد اگرچہ واجب الفسخ ہے، لیکن اگر فریقین بیع کو فسخ نہ کریں اور مشتری بائع کی اجازت سے مبیع پر قابض ہو جائے تو مالک ہو جائے گا اور اس کو فروخت کرنا اور ہبہ کرنا بھی جائز ہوگا، اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (الموسوعۃ الفقہیہ ۹/ ۱۰۷، ہدایہ ۳/ ۴۶، بحر الرائق ۶/ ۹۹)۔

۱۰- آج کل عام طور پر ندی نالوں میں مچھلیاں فروخت نہیں کی جاتیں بلکہ ندی نالے مچھلیوں کے شکار کے لیے اجارہ پر دیے جاتے ہیں۔

۱۱- اجارہ میں منافع کی بیع ہوتی ہے، اس لیے اجارہ کی وہ تمام صورتیں جن میں عین کا استہلاک ہو فقہاء ان کو ممنوع قرار دیتے ہیں، مثلاً چراگاہ کا اجارہ مویشی کے چرانے کے لیے یا کسی جانور کا اجارہ دودھ حاصل کرنے کے لیے ان میں چوں کہ عین کا استہلاک ہے، اس لیے یہ اجارہ فاسد ہے۔

۱۲- چوں کہ آج کل ندی نالوں کو مچھلی کا شکار کے لیے اجارہ پر دینے کا عام رواج ہو چکا ہے اور قواعد فقہیہ کی رو سے اس کو صحیح نہیں ہونا چاہیے لیکن میرے خیال میں اگر حضرت عمر بن الخطابؓ کی طرف منسوب اس قول کی وجہ سے جس کو علامہ ابن نجیم مصری نے امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' سے نقل کیا ہے اس اجارہ کی اجازت دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیں: (بحر الرائق ۶/ ۷۹-۸۰)۔

اسی عبارت کو بحر سے علامہ ابن عابدین شامی نے ''رد المحتار'' اور ''منحۃ الخالق'' میں نقل کیا ہے اور عام قواعد فقہیہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی دونوں نے اپنی رائے اس کے خلاف دی ہے، لیکن ابتلاء عام کی وجہ سے میری رائے ہے کہ اس کو صحیح قرار دیا جائے۔

۱۳- بہر حال اجارہ صحیح ہو یا فاسد ٹھیکہ دار قبضہ کے بعد ان مچھلیوں کا مالک ہوگا اور اس کی بیع صحیح قرار دی جائے گی اس قسم کی مچھلیوں کو خریدنا اور کھانا جائز قرار پائے گا۔

حوض یا تالاب:

حوض اور تالاب کے سلسلے میں دو امور قابل بحث ہیں، ملکیت اور بیع

یعنی حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے، تو اس میں پائی جانے والی مچھلیاں اس کی ملک ہوں گی یا نہیں، پھر ان دونوں صورتوں میں ان کی بیع جائز ہوگی یا نہیں؟

ملکیت:

۱- حوض یا تالاب کو اس کے مالک نے مچھلی کے حصول کے لیے ہی تیار کیا ہے تو اس میں پائی جانے والی تمام مچھلیاں اس کی ملک ہوں گی۔

۲- اگر مالک حوض و تالاب اس غرض کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور مچھلیاں سیلاب کے پانی کے ساتھ از خود اس میں داخل ہوئیں اور صاحب حوض و تالاب نے بند باندھ کر ان مچھلیوں کو تالاب یا حوض میں محفوظ کر دیا تو اس صورت میں بھی وہ مچھلیوں کا مالک ہوگا۔

۳- مالک حوض و تالاب نے شکار کر کے یا خرید کر مچھلیاں اس میں ڈالا ہے تو بھی وہ ان کا مالک ہوگا۔

۴- اگر مالک نے حوض و تالاب کو اس غرض کے لیے مہیا نہیں کیا ہے اور از خود اس میں مچھلیاں کہیں سے آ گئی ہیں اور اس نے مچھلیوں کی آمد و رفت پر بند لگا کر ان کو محفوظ نہیں کیا ہے تو اس صورت میں وہ مچھلیوں کا مالک نہیں ہوگا اور اس کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ دوسروں کو شکار سے منع کرے۔

اس کی مثالیں فقہی مسائل میں موجود ہیں:

۱- اگر کوئی شخص جال خشک کرنے کے لیے پھیلائے اور اس میں کوئی شکار پھنس جائے تو وہ احراز کے بغیر صرف جال میں پھنس جانے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا، دوسرے کے لیے جائز ہوگا کہ اس کو پکڑ لے۔ اور اگر اس نے جال شکار کے لیے پھیلا دیا ہے تو شکار پھنس جانے پر ہی اس کی ملکیت میں آجائے گا اور دوسرے کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ اس کو حاصل کر سکے۔

۲- مجلس میں چھوہارے یا روپے لٹائے جا رہے ہوں تو اگر کوئی شخص ان چھوہاروں اور روپیوں کے حصول کے لیے اپنا دامن پھیلائے تو دامن میں گرنے والے روپیوں اور چھوہاروں کا مالک ہو جائے گا اور کسی دوسرے کے لیے اس کا لینا جائز نہیں ہوگا لیکن اگر اس نے دامن اس غرض سے نہیں پھیلایا تھا تو دامن میں پڑنے والے روپیوں اور چھوہاروں کا مالک وہ نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی طرف سے احراز وامساک نہ پایا جائے، احراز سے قبل دوسرے کے لیے جائز ہوگا کہ اس کے دامن سے روپیہ اور چھوہارے لے لے۔

۱- جن صورتوں میں مالک حوض مچھلیوں کا مالک نہیں ہے اگر اس نے اپنے حوض وتالاب کی مچھلیاں شکار کرنے سے قبل تالاب ہی میں فروخت کر دیا تو یہ بیع جائز نہیں ہوگی، بلکہ باطل ہوگی، اس لیے کہ یہ "بیع مالا یملک" ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

"نص الفقها على أن من شروط انعقاد البيع أن يكون المبيع مملوكا للبائع أو مؤكله أو موليه" (موسوعہ فقہیہ ۹/۱۵۸)۔

۲- بیع باطل بیع ہی نہیں ہوتی ہے، اس لیے فریقین کو قبضہ کے بعد بھی ملکیت حاصل نہیں ہوتی ہے، یعنی نہ تو بائع ثمن کا مالک ہوگا اور نہ مشتری مبیع کا مالک ہوگا۔

"لا ينعقد البيع الباطل أصلا وليس له وجود معتبر شرعا، وإذ قبض المشتري المبيع فلا يكون ملكا له. وقال الكاساني، ولا حكم لهذا لبيع أصلا، لأن الحكم للموجود ولا وجود لهذا البيع إلا من حيث الصورة الخ" (موسوعہ فقہیہ ۹/۳۳۵)۔

"شامی، بحر، بدائع" اور فقہ وفتاویٰ کی تقریباً تمام ہی کتابوں میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

۳- اس مسئلہ خاص میں کہ مالک حوض وتالاب نے غیر مملوک مچھلیاں تالاب میں فروخت کی ہیں، بیع کے باطل ہونے کا اثر صرف ثمن پر ہوگا، یعنی بائع اس ثمن کا مالک نہیں ہوگا اور ثمن میں اس کا کسی طرح تصرف کرنا صحیح نہیں ہوگا لیکن خریدار بہر حال مچھلیوں کا مالک ہوگا، اس لیے کہ اس نے مباح الاصل مال کا شکار کر کے احراز کیا ہے، جس طرح کوئی دوسرا شخص ان مچھلیوں کا شکار کرنے کی وجہ سے ان کا مالک ہوتا اسی طرح یہ مشتری بھی مالک ہو جائے گا اور مچھلیوں میں اس کا تصرف بالکل جائز اور حلال ہوگا۔

۴- جن صورتوں میں مالک حوض وتالاب مچھلیوں کا مالک ہے اگر تالاب ہی میں اس نے مچھلیاں فروخت کر دی ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں:

اول: یہ ہے کہ وہ حوض یا تالاب اتنا چھوٹا ہے کہ شکار یا کسی بھی حیلہ کے بغیر بآسانی اس کی مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہیں تو اس صورت میں بلا شبہ بیع صحیح ہوگی۔

دوم: یہ ہے کہ وہ حوض یا تالاب اتنا بڑا ہے کہ آسانی کیساتھ شکار کیے بغیر ان مچھلیوں کا حصول ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں بیع فاسد ہوگی، کیوں کہ مبیع مقدور التسلیم نہیں ہے تفصیل کے لیے دیکھئے: (موسوعہ فقہیہ ۹/ ۱۶۴-۱۶۵)۔

۵- یہ بیع واجب الفسخ ہے، لیکن اگر فریقین نے فسخ نہیں کیا تو قبضہ کے بعد ملکیت آجائے گی، یعنی بائع ثمن کا مالک ہوگا، اور مشتری مبیع کا مالک ہوگا عبارتیں اوپر مذکور ہو چکی ہیں۔

یہ تفصیلات علامہ ابن ہمامؒ کی "فتح القدیر" اور علامہ بابرتی کی "عنایہ" سے ماخوذ ہے ملاحظہ ہو: (فتح القدیر ۶/ ۴۰۹-۴۱۰، عنایہ للبابرتی علی ہامش فتح القدیر ۶/ ۴۰۹-۴۱۰)۔

۶- حوض یا تالاب کی مچھلیوں کو فروخت کرنے کا حکم اوپر مذکور ہوا، البتہ ان کو مچھلی کے شکار کے لیے اجارہ پر دینا جائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس میں عین کا استہلاک ہے، البتہ مچھلی کی افزائش یا مکھانہ کی کاشت یا کسی دوسرے غرض کے لیے اجارہ پر دینا جس میں عین کا استہلاک نہ ہو جائز ہوگا، پھر جب اجرت پر لینے والا اس میں مچھلی کی بیج ڈال کر اس کی پرورش کرے گا، اگر اس میں از خود کچھ مچھلیاں باہر سے آجائیں تو ان کا بھی مالک ہوگا جس طرح کوئی شخص خودرو گھاس کا مالک نہیں ہوتا لیکن اگر وہ گھاس کی کاشت کرے تو اس کے ساتھ خودرو گھاس کا بھی مالک ہو جائے گا۔ ☆☆☆

تالاب میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع

مولانا محمد ظفر عالم ندوی[1]

۱- موجودہ دور میں سرکاری تالاب یا ندی نالے کی مچھلیوں کی خرید وفروخت کا جو رواج مچھلیوں کے نکالے بغیر ہو گیا ہے، بلاشبہ یہ رواج اور عرف اصول شرع کے خلاف ہونے کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے اور فتویٰ عدم جواز پر دیا جائے گا، کیوں کہ یہ عرف ایسے اصول شرع سے متصادم ہے جو نصوص شرعیہ پر مبنی ہیں، اس کے علاوہ اس طرح کی مچھلیوں کی بیع وشراء کی ممانعت پر نص شارع موجود ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے:

''أن رسول اللہ ﷺ قال: لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر'' (مجمع الزوائد ۴/۸۰، نیل الاوطار ۴/۷)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مچھلی کو پانی میں نہ خریدو اس لیے کہ اس میں غرر ہے)۔

اسی طرح کی ایک روایت علامہ ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں نقل کی ہے جو حضرت عمر بن الخطاب سے مروی ہے:

''لا تبايعوا السمك في الماء، فإنه غرر'' (فتح القدیر ۶/۴۱۰)۔ (پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت نہ کرو، اس لیے کہ اس میں غرر ہے)۔

ان روایات میں جو ''الماء'' کا لفظ آیا ہے، اس کی وضاحت فقہاء نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد غیر محصور ماء ہے، البتہ اگر محصور ماء ہو، یعنی پانی اس طرح محصور ہو کہ اس سے مچھلیوں کا پکڑنا آسان ہو۔ مثلاً چھوٹا تالاب ہو یا گڈھا ہو تو ان تالابوں اور گڈھوں میں موجود مچھلیوں کی بیع حنفیہ وشوافع کے نزدیک درست ہے۔

''اس پانی سے مراد جس میں کہ مچھلی کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے غیر محصور پانی ہے، جیسے سمندر اور نہر کا پانی اور اگر پانی محصور ہو، جیسے کہ تالاب کا پانی تو حنفیہ اور شوافع کا خیال ہے کہ اگر اس میں مچھلیوں کا پکڑنا بغیر شکار کیے اور بغیر کسی تدبیر کے ممکن ہو تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے'' (بدائع الصنائع ۵/۲۱۵)۔

یہاں جو سوال کیا گیا ہے وہ ماء غیر محصور سے متعلق ہے، اسی طرح علامہ ابن ہمام نے روایات کے اندر مذکور لفظ ''غرر'' کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''ومعلوم أن الأجمة قد يؤخذ منها السمك باليد. والغرر الخطر وغير المملوك على خطر ثبوت الملك و عدمه، فلذا جعل من بيع الخطر''

(اور یہ معلوم ہے کہ جھاڑیوں سے مچھلیاں ہاتھ سے پکڑی جاتی ہیں اور غرر دراصل خطر اور غیر مملوک کے ثبوت وعدم ثبوت کا نظر ہے، اسی وجہ سے اسے مبیع علی خطر کے قبیل سے مانا جاتا ہے)۔

اور بیع علی الخطر کی روایات صحاح ستہ میں موجود ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اشیاء کی خرید وفروخت سے منع فرمادیا جن میں غرر پایا جاتا ہو یا معاملہ علی خطر ہو۔

غرض کہ شکار کیے بغیر مچھلیوں کی خرید وفروخت کا جو رواج موجودہ دور میں ہو گیا ہے وہ نصوص شرعیہ میں ممانعت کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے اور فتویٰ عدم جواز پر ہوگا۔ نیز عرف کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ یہ عرف نص شارع کے خلاف ہے اور فقہاء نے صراحت کردی ہے کہ جو عرف نص شارع کے خلاف ہو وہ غیر معتبر ہوگا، علامہ سرخسیؒ نے ''مبسوط'' میں صراحت کی ہے:

''كل عرف ورد النص بخلاف فهو غير معتبر'' (المبسوط ۱۲/۱۹۶)۔ (ہر وہ عرف جس کے خلاف نص وارد ہو غیر معتبر ہے)۔

۲- ان تالابوں یا ندی نالوں سے حاصل کی ہوئی مچھلیوں کی فروخت ٹھیکہ داروں کے لیے اسی طرح ان کی خریدگی کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز اور درست ہے، کیوں کہ ٹھیکہ داروں کے لیے اس طرح کے تالاب یا ندی نالوں کو ٹھیکے پر لینا اگرچہ صحیح نہیں ہے، تاہم جو مچھلیاں انہوں نے حاصل کی ہیں عام اصول شرع کی بنیاد پر ان کا حصول مباح ہے اور ان پر ملکیت صحیح ہے، لہذا اس میں خرید وفروخت بھی بلا کسی تردد کے درست ہے۔

۳- حوض عام طور پر چھوٹا ہوتا ہے، اس لیے حوض اور چھوٹے تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت مچھلیوں کے نکالنے سے قبل درست ہے، کیوں کہ ان حوض اور چھوٹے تالاب سے مچھلیوں کا نکالنا اور پکڑنا ممکن ہوا کرتا ہے جو مقدور التسلیم کے حکم میں ہے، علامہ ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں وضاحت کی ہے:

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

''ثم إن كان يؤخذ بغير حيلة واصطياء جاز بيعه؛ لأنه مملوك مقدور التسليم مثل السمكة في حب''
(پھر اگر بغیر حیلہ وشکار کے ان مچھلیوں کا حاصل کرنا ممکن ہو تو اس کی بیع جائز ہے، اس لیے کہ یہ مملوک بھی ہے اور مقدور التسلیم بھی جیسا کہ کسی بڑے گھڑے کی مچھلیاں ہوگی)۔

لیکن تالاب اگر بڑا ہو اور اس میں مچھلیاں آسانی سے گرفت میں نہ آتی ہوں تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ان کی بیع جائز نہیں ہے۔

''وإن لم يؤخذ إلا بحيلة لا يجوز لعدم العدة على التسليم عقيب البيع'' (فتح القدیر ۶/ ۴۰۹-۴۱۰)۔

اور اگر کسی حیلہ وتدبیر ہی سے مچھلیاں حاصل ہوسکیں تو بعد مبیع ان کے سپرد کرنے پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے بیع جائز نہیں۔

۴-حوض یا تالاب میں جو مچھلیاں پالے بغیر جمع ہوجاتی ہیں ان مچھلیوں کی خرید وفرخت کے سلسلے میں دیکھا جائے گا کہ اگر حوض یا تالاب کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا ہے کہ مچھلیاں ان میں داخل ہوجائیں اور مچھلیوں کے داخل ہونے کے بعد مدخل کو بند کردیا ہو تو ان پر مالکان تالاب وحوض کی ملکیت ہوگیا، اگر ان کو پکڑنا ممکن ہو تو ان کی خرید وفروخت جائز ہے، علامہ عینی نے ''ہدایہ'' کی عبارت:

''إلا اجتمعت فيها بأنفسها ولم يسد عليها المدخل'' کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''لو سد موضع الدخول حتى صار بحيث لا يقدر على الخروج فقد صار أخذا له بمنزلة ما وقع في شبكة، فيجوز بيعه'' (ہدایہ کتاب البیوع)

مگر یہ کہ مچھلیاں خود ہی اس میں جمع ہوجائیں اور اس کے مدخل بند نہ کیا ہو اور اگر مچھلیوں کے داخل ہونے کی جگہ کو اس طرح بند کردیا ہو کہ مچھلیاں داخل ہونے کے بعد نکل نہیں سکتیں تو گویا کہ اس نے مچھلیاں حاصل کرلیں، پس اسی طرح جس طرح کے مچھلیاں جال میں ہو، لہذا ایسی صورت میں بیع درست ہے۔

اسی طرح اس طرح کے حوض اور تالابوں کو ٹھیکہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ ان میں مالک کا بھی وجود پایا جاتا ہے اور مچھلیاں مقدور التسلیم بھی ہوا کرتی ہیں۔

☆☆☆

پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت کا مسئلہ

مولانا محمد حنیف [1]

زمین کی طرح تالاب کی بھی تین قسمیں ہیں:

۱-شخصی۔ ۲-عوامی، جس سے ضروریات عامہ وابستہ ہوں۔ ۳-عوامی، جس سے ضروریات وابستہ نہ ہوں۔

شخصی تالاب:

اس میں پائی جانے والی مچھلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں: ۱-مملوک۔ ۲-غیر مملوک

تالاب میں جو مچھلیاں پائی جاتی ہیں ان کے مملوک ہونے کی تین صورتیں ہیں:

۱-مچھلیوں کو پکڑ کر یا خرید کر تالاب میں ڈال دیا ہو ۲۔ مچھلیوں کے لیے تالاب کو تیار کیا ہو، خواہ اسی لیے نیا تیار کیا ہو، یا پرانا ہو، لیکن اس میں مچھلیوں کی رہائش کے لیے کچھ عمل کیا ہو، مثلاً مٹی نکال دی ہو، آنے کا راستہ بنایا ہو ۳۔ آنے کے بعد راستہ بند کردیا ہو، یعنی پہلے سے نہ تو مچھلی ڈالی اور نہ ہی اس کے لیے تیار کرایا، بلکہ جب مچھلیاں آ گئی ہوں تو جانے کا راستہ بند کردیا ہو، مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت پائی جائے تو مچھلیاں مملوک ہو جائیں گی۔ بغیر اسکی اجازت کے مچھلیوں کے پکڑنے اور شکار کرنے کا اختیار کسی کو نہ رہے گا، اگر پکڑے گا تو غصب ہونے کی بنا پر ضمان اس کے اوپر اس کی قیمت لازم ہوگی، تالاب میں جو مچھلیاں مملوک ہیں ان کی بیع کے سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بغیر کسی حیلہ کے ان مچھلیوں کو پکڑا جاسکتا ہے تو بیع جائز اور درست ہے، اگر بغیر حیلہ کے پکڑنا ناممکن ہو تو غرر انفساخ عقد مبیع کے غیر مقدور التسلیم ہونے کی بناء پر بیع باطل ہے۔

حیلہ:

اس میں بھی وہی گھاس والا حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے، صاحب تالاب صرف تالاب کو سنگھاڑا وغیرہ لگانے کے لیے اجارہ پر دیدے اور مچھلیوں کو مباح کردے اس صورت میں جو پیسہ لے گا وہ تالاب کے اجارہ کا مالک ہوگا، اس حیلہ کے اختیار کرنے میں کوئی قباحت بھی معلوم نہیں ہوتی ہے۔

مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہ پائی جائے، یعنی نہ تو مچھلی کو ڈالا ہو اور نہ مچھلی کے لیے بنایا ہو، اور نہ ہی آنے کے بعد راستہ بند کیا ہو، بلکہ از خود آ کر رک گئی ہوں تو ایسی مچھلیاں مملوک نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ایسی مچھلیاں گھاس پانی وغیرہ کی طرح مباح الاصل ہیں جو پکڑ لے اس کی مملوک ہیں، اس لیے بغیر پکڑے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں، کیوں کہ بغیر پکڑے مملوک نہ ہونے کی بنا پر بیع باطل ہوگی۔

مباح الاصل ہونے کی بنا پر سب کو شکار کرنے کا اختیار رہے گا کسی کو روکنا جائز نہیں۔ البتہ صاحب تالاب کو اپنے تالاب میں داخل ہونے سے روکنے کا اختیار رہے گا۔

اس لیے جب تک کسی قریبی جگہ میں اس کو مفت مچھلی شکار کرنے کا اختیار ہے تو منع کرنے کا حق ہوگا اور اگر قریبی جگہ میں کوئی ایسا تالاب نہ ہو جس سے مفت مچھلی شکار کرنے کا اختیار ہو تو صاحب تالاب سے کہا جائے گا، خود نکال کردے، یا پھر شکار کرنے کی اجازت دیدے۔ غیر مملوک مچھلی اگر صاحب تالاب کی زمین میں بغیر داخل ہوئے کوئی شخص شکار کرے تو صاحب تالاب کو شکار سے روکنے کا کوئی حق نہ ہوگا، کیوں کہ جو مچھلیاں مملوک نہیں ہوتی ہیں اس میں سب مشترک ہوتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھئے: بنایہ ۱۱/۳۶۰-۳۹۵، بحر الرائق ۶/۷۷، شامی ۴/۱۰)۔

۲-عوامی تالاب:

وہ تالاب جس سے لوگوں کی لابدی ضرورتیں وابستہ ہوں، مثلاً آبپاشی وغیرہ تو اس تالاب میں بھی امام وحاکم کو ایسے تصرف کی اجازت نہ ہوگی جس سے لوگوں

---

[1] مدرسہ ریاض العلوم، گورینی جونپور۔

حرج وتنگی ہو، مثلاً تالاب کسی کو مچھلی پالنے کے لیے مخصوص کرنا کہ اس صورت میں جس کے نام تالاب مخصوص ہے وہ لوگوں کو آبپاشی سے منع کرے گا، حالاں کہ پانی مباح الاصل ہے، جس سے روکنے کا نہ تو امام وحاکم کو اختیار ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اپنے لیے مخصوص کرا کے دوسرے کو انتفاع سے روکنا جائز نہیں (دیکھیے: بنایہ ۱۱/۳۳۰)۔

اس میں پائی جانے والی مچھلیاں مباح الاصل ہیں جس میں سب کا حق برابر ہوتا ہے، کسی کو شکار کرنے سے روکنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر کسی شخص نے ایسے تالاب میں ڈالی ہو، یا اس کا راستہ روک لیا ہو کہ مچھلیاں نکلنے نہ پائیں، یا تالاب میں مچھلیوں کے رہنے اور ان کے آنے کے لیے کچھ عمل کیا ہو تو وہ مچھلیاں اس کی مملوک ہوں گی لیکن اگر اس کی مملوک مچھلیوں کے رہنے سے لوگوں کو حرج وتنگی ہو تو ان کے لیے اس شخص کو مجبور کرنا جائز ہے کہ وہ اپنی مچھلیاں نکال کر تالاب کو خالی کرے گا اور اگر خالی نہ کرے تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں، مچھلیوں میں کوئی قباحت نہ آئے گی، کیوں کہ مچھلیوں کی پرورش مباح الاصل پانی اور مٹی سے ہوئی ہے، اس لیے مچھلیوں میں کوئی قباحت نہ ہوگی، البتہ لوگوں کو حرج وتنگی میں مبتلا کرنا جائز نہ ہوگا۔

سرکاری تالاب:

وہ تالاب جس سے لوگوں کی ضرورت خواہ کسی وجہ سے بھی متعلق نہ ہو، یعنی لوگ اس سے آبپاشی وغیرہ نہ کرتے ہوں تو اس کا حکم ارض موات کا ہے اور حاکم کو عوامی مصلحت کے مطابق اس میں ہر طرح کے تصرف کا حق ہوگا کہ لوگوں کو ٹھیکے پر دے وغیرہ۔

''وللإمام أن يقطع كل موات وكل ما كان ليس لأحد فيه ملك وليس في يد أحد يعمل فيه ذلك بالذي يرى أنه خير للمسلمين وأعم نفعًا (کتاب الخراج لابی یوسف ص/۶۶)۔

اس تالاب کو مخصوص کرا کر مچھلیوں کا پالنا جائز ہے۔ البتہ اگر اس میں مچھلیاں مملوک نہ ہوں، یعنی نہ تو پالی گئی ہوں اور نہ روکی گئی ہوں اور نہ ہی ان کے رہنے کے لیے تالاب میں پہلے سے کچھ عمل کیا گیا ہو تو مچھلیاں مباح الاصل ہیں، اس میں سب کا حق برابر ہے کسی کو منع کرنے کا اختیار نہیں، لیکن ٹھیکہ پر لینے کے بعد اس تالاب میں داخل ہونے سے روکنے کا حق ہوگا بشرطیکہ اس سے لوگوں کی لابدی ضرورت، مثلاً جانور کو پانی پلانا نہلانا وغیرہ متعلق نہ ہو۔

جواب (۱):

نوٹ:...... بڑے تالاب وندی وغیرہ جس کی مچھلیاں مملوک نہیں ہوتی ہیں ان مچھلیوں کو حاصل کرنے کے لیے سرکار سے تالاب کی زمین کا ٹھیکہ لے تو اس حیلہ سے تالاب وندی کو ٹھیکے پر لینا جائز ہوگا، لیکن دوسرے لوگوں کو مباح الاصل مچھلیوں کے شکار سے روکنے کا حق نہ ہوگا۔ جو شکار کرلے اس کی ہوگی، اگر روکے گا تو ایسا کرنا جائز نہیں، جو مچھلیاں اس سے خود شکار کرلے گا وہ تو اس کی مملوک ہوں گی اس کی خرید وفروخت میں کوئی قباحت نہیں، اور اگر ایسے تالاب وندی سے مچھلیوں کا شکار کسی دوسرے شخص سے اجرت دے کر کرائے تو اس صورت میں اجارہ فاسد ہے، مچھلیاں شکار کروانے والوں کو دیتے ہیں تو دینے کے بعد وہ اس کے مالک ہوجائیں گے، پھر ان سے خریدنا بیچنا جائز ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چوں کہ مباح الاصل چیزوں کے حصول کے لیے کسی کو وکیل بنانا، خواہ اجرت پر وکالت ہو، یا بغیر اجرت کے یہ وکالت درست ہے، وکیل جو حاصل کرے گا وہ مؤکل کی ہوگی، لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وکالت درست نہیں، اس لیے وہ مباح الاصل چیز جس کو وکیل نے حاصل کیا اسی کی مملوک ہوگی مؤکل کا اس میں کوئی حق نہ ہوتا (تفصیل کے لیے دیکھیے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۸۹-۹۰)۔

جواب (۲):

حاصل یہ ہے کہ بڑے تالاب وندی سے جو مچھلیاں حاصل ہوتی ہیں، خواہ خود شکار کیا ہو یا کسی دوسرے سے کرایا ہو ان مچھلیوں کے مملوک ہوجانے کی بنا پر ان کی خرید وفروخت جائز ہے، کیوں کہ اگر کسی دوسرے سے اجرت دے کر شکار کروایا تو شکار کرنے والا چوں کہ برضا ورغبت مچھلیاں اس کے حوالے کر دیتا ہے، اس لیے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ مچھلیاں انتہائی شکار کرانے والے کی ملک ہوجاتی ہیں، اور حضرت ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اجارہ درست ہونے کی بنا پر وہ مچھلیاں ابتداءً ہی شکار کرانے والوں کی ہوجاتی ہیں اور ضرورۃً ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، اس لیے بڑے تالاب وندی سے حاصل ہونے والی مچھلیوں کی خرید وفروخت جائز ہے، کیوں کہ مچھلیاں نتیجۃً شکار کرانے والوں کی مملوک ہوتی ہیں۔

جواب سوق:

بازار جن زمینوں میں لگتا ہے دو طرح کی ہوتی ہیں:

۱- شخصی مملوکہ

۲- غیر شخصی جس پر حکومت کا بازار لگانے کے لیے استیلاء و احراز ہوتا ہے، شخصی زمین لگنے والے بازار کا حکم یہ ہے کہ جس کی زمین ہے وہ بازار کے لیے زمین کو اجارہ پر دیتا ہے، اس لیے اس کا نیلام لے کر بازار لگانے والوں سے اجرت وصول کرنا جائز ہے، کیوں کہ اجرت زمین کی ہوگی۔

غیر شخصی بازار۔ حکومت نے جن زمینوں کو بازار کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور اس کے حق اجارہ کا نیلام کرتی ہے کہ کوئی شخص زمین کو ٹھیکے پر لے کر بازار لگانے والوں سے اجرت وصول کرے، چوں کہ استیلا کی بنا پر اس کی مملوک ہوگئی ہے، اس لیے اس کا نیلام لے کر اجرت وغیرہ وصول کرنا جائز ہے، کیوں کہ اجرت زمین کی ہوگی اور مدت کی جہالت کی بناء پر اجارہ فاسدہ کا شبہ ہوسکتا ہے تو یہ عرف کی وجہ سے مندفع ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: رد المحتار ۵/۲۹)۔

مچھلیوں کی خرید و فروخت کے مروجہ نظام کی تحقیق:

تالاب کے ٹھیکہ کے جواز کی پوری تفصیل سے فارغ ہونے کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ مختصر طور پر مچھلیوں کی خرید و فروخت کے مروجہ صورت کی تحقیق ہوجائے تاکہ صحیح حکم واضح ہوسکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تالاب کی مچھلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں: مملوک اور غیر مملوک۔

جواب نمبر (۴):

مملوک مچھلیوں کی خرید و فروخت کی چند صورتیں رائج ہیں:

۱- اس تالاب میں جتنی مچھلیاں ہیں سب کو اس تالاب کی اتنی مقدار معین مچھلیاں آپ کے ہاتھ میں نے اتنے روپے میں فروخت کیا، اتنے دن میں نکال لیجئے۔ یا میں نکال کر دے دوں گا۔ اس صورت میں اگر مچھلیوں کا بغیر حیلے کے پکڑنا ممکن نہ ہو تو مبیع کے مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی بنا پر اس طرح بیع کرنا بیع فاسد ہے

۲- اس تالاب میں سب مچھلیاں یا اتنے اتنے وزن کی اتنی مقدار معین مچھلیوں کو نکال لیجئے فی کلو یا فی من اتنے روپے قیمت ہوگی یا یہ کہ میں نکال کر دیدونگا اور اتنی قیمت ہوگی۔ تو اس صورت میں اولاً مچھلیوں کے پکڑنے کی وکالت ہے، پھر بیع کا وعدہ ہے، لہٰذا یہ معاملہ انتہاءً بیع تعاطی بن کر درست ہوجائے گا، اس طرح بیع کرنا جائز ہے۔

غیر مملوک مچھلیوں کی خرید و فروخت:

اس سلسلے میں مچھلیوں کو پکڑنے کے لیے تالاب وغیرہ اجارہ پر لینا جائز ہے، لیکن زمین کے اجارہ کا حیلہ اختیار کر کے تالاب کو اجارہ پر لینا درست ہوگا۔ اور اس کی مچھلیاں اگر خود شکار کریگا تو اس کی مملوک ہوں گی، اور اگر دوسرے سے شکار کرائے گا تو پکڑنے والے کی مملوک ہوں گی، لیکن چوں کہ پکڑنے والا اپنی رضا سے مچھلیاں دیدیتا ہے، اس لیے اس کے دینے کے بعد وہ مملوک ہوجاتی ہیں۔ نیز ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق پکڑنے والے کی مملوک ہوتی ہیں اور اس کا رواج بھی ہے، اس لیے اس کی خرید و فروخت علم کے باوجود جائز ہے، ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے۔

نوٹ: ...... مارکیٹ میں جو مچھلیاں پہنچتی ہیں اکثر مملوک ہوتی ہیں، کیوں کہ یا تو بیع فاسد کے ذریعہ سے وہ مچھلیاں مارکیٹ میں آتی ہیں یا بیع صحیح کے ذریعہ سے۔ اور چوں کہ یقینی طور پر تحقیق نہیں ہوتی ہے، اس لیے اس کی خرید و فروخت بلا کراہت جائز ہے، البتہ اگر بیع فاسد کے ذریعہ سے حاصل ہونا یقینی طور پر معلوم ہو تو خریدنا تو نفس کراہت سے خالی نہیں، لیکن اس کا استعمال طیب و حلال ہے (کما فی الشامیہ ص/۱۳۰) اور اگر بیع باطل کے ذریعہ سے مچھلیوں کا حاصل ہونا معلوم ہو تو اس کی خرید و فروخت جائز نہیں، اگر کوئی علم نہ ہو تو جائز ہے۔

''لقول رسول اللہ ﷺ رفع عن أمتی الخطاء والنسیان''، تحقیق واجب نہیں، البتہ از روئے تقوی اور احتراز محمود و پسندیدہ ہے۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

مولانا ابوبکر قاسمی [1]

تالاب کو ٹھیکہ پر دینا:

یہاں سب سے پہلا غور طلب امر یہ ہے کہ تالاب کو مچھلی پالنے کی غرض سے ٹھیکہ پر دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں، تو اس سلسلہ میں فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے:

''لا تجوز إجارة الآجام والأنهار للسمك وغيره'' (فتاوی عالمگیری ۴/ ۴۴۲)

(مچھلی وغیرہ (پالنے یا شکار کرنے) کے لیے نہروں اور تالابوں کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے)۔

اسی طرح ''مبسوط سرخسی'' میں مرقوم ہے:

ولا يجوز إجارة الآجام والأنهار للسمك ولا لغيره، لأن المقصود استحقاق العين، ولأن السمك صيد مباح، فكل من أخذه فهو أحق به'' (مبسوط باب الاجارۃ الفاسدۃ ۱۶/ ۳۳)۔

نیز ''تنویر الانوار'' کی شرح ''الدر المختار'' میں بھی مچھلی کے تالاب کو کرایہ پر دینے کا عدم جواز مکتوب ہے،

ولم تجز إجارة بركة ليصاد منها السمك (الدر المختار مع رد المحتار ۴/۱۱۹)۔

(مچھلی کا شکار کرنے کے لیے حوض کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے)۔

اجارہ کی تعریفات کو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں عقد اجارہ عوض دے کر کسی چیز سے منافع حاصل کرنے کا نام ہے، اب ظاہر ہے کہ عقد اجارہ کی یہ تعریف جس طرح مکان ودوکان کے اجارہ پر صادق آتی ہے، اسی طرح مچھلی پالنے کے لیے تالاب کو ٹھیکہ واجارہ پر دینے پر بھی صادق آتی ہے، اس لیے بظاہر تالاب کے ٹھیکہ پر لینے یا دینے کو اجارہ کی تعریف سے خارج کرنا صحیح نہیں ہے، اور اگر بالفرض تالاب کو اجارہ وٹھیکہ پر دینے سے استھلاک عین بھی لازم آتا ہو تب بھی دور حاضر میں عرف عام کی بنیاد پر تالاب وحوض کو ٹھیکہ پر دینا شرعاً جائز ہونا چاہیے، کیوں کہ تالاب وحوض کو مچھلی پالنے کی غرض سے ٹھیکہ پر دینے کا مسئلہ کوئی منصوص مسئلہ نہیں ہے، کہ اس کو جائز قرار دینے سے کسی شرعی نص کی مخالفت لازم آئے، زیادہ سے زیادہ قیاس کی مخالفت ہوسکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عرف کی وجہ سے قیاس کو ترک کردیا جاتا ہے، چنانچہ بہت سے فقہاء نے اپنے اپنے زمانہ میں تالاب وحوض کو کرایہ وٹھیکہ پر دینے کو جائز قرار دیا، چنانچہ خود علامہ شامیؒ جنہوں نے تالاب وحوض کو اجارہ وٹھیکہ پر دینے کے عدم جواز سے بحث کی ہے، اور الایضاح نامی کتاب کے حوالہ سے مچھلی کے تالاب کو اجارہ پر دینے کو ناجائز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''وما في الإيضاح بالقواعد الفقهية أليق'' (رد المحتار ۴/ ۱۱۹) لیکن خود حضرت علامہ موصوف نے البحر الرائق کے حوالہ سے مچھلی کے تالاب کو کرایہ وٹھیکہ پر دینے کو حضرت امام ابویوسف علیہ الرحمہ کی کتاب الخراج کے حوالہ سے جائز لکھا ہے۔

علاوہ ازیں صاحب ''در مختار'' وغیرہ فقہاء متاخرین نے عموم بلویٰ کی وجہ سے تالاب کے اجارہ کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

جاز إجارة القناة والنهر مع الماء، به يفتي لعموم البلوى، مضمرات، انتهى

(پانی کے ساتھ نالی اور نہر کو کرایہ پر دینا عموم بلویٰ کی وجہ سے جائز ہے)۔

علامہ حصکفی کے مندرجہ قول کے حاشیہ میں حضرت علامہ شامی علیہ الرحمہ نے، چراگاہ اور تالاب وغیرہ کو کرایہ پر دینے کے سلسلہ میں مختلف فقہاء کرام کے اقوال کو نقل فرما کر قدرے بحث کیا ہے، لیکن آخر میں بطور نتیجہ کے تالاب وچراگاہ وغیرہ کے کرایہ پر دینے کے جواز سے متعلق ایک حیلہ کا ذکر فرمایا ہے، جس کا

---

[1] شکر پور بھرواره، دربھنگہ۔

حاصل یہ ہے کہ مدت متعینہ کے لیے تالاب وغیرہ کو دے، اور تالاب میں مچھلی پالنے وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ نہ کہے تو پھر تالاب کا اجارہ شرعاً جائز و درست ہے۔

''استاجر نهرا يابسا أو أرضا أو سطحا مدة معلومة ولم يقل شيئا صح، وله أن يجرى فى الماء (قلت: أو يرسل فيه السمك)''(شامی ۵/۴۴)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دور حاضر میں مچھلی کے تالاب کو ٹھیکہ اور اجارہ پر دینا شرعاً جائز و درست ہے، اور اوپر جس طرح علامہ حصکفی کے حوالہ سے عموم بلویٰ کے سبب تالاب کے ٹھیکہ پر دینے کا جواز بیان کیا گیا اسی طرح فتاوی ہندیہ میں بھی عموم بلویٰ کی وجہ سے تالاب کو ٹھیکہ پر دینے کا جواز صاف صراحت کے ساتھ مذکور ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۴/۴۴۱)۔

لہٰذا تالاب میں مچھلی ہو یا نہ ہو تالاب کو مچھلی کی غرض سے یا دیگر کسی اور مقصد سے کرایہ وٹھیکہ پر دینا شرعاً جائز ہونا چاہیے، یہی رائے دار العلوم دیوبند کے مفتی حضرت مولانا نظام الدین صاحبؒ کی ہے، ان کا فتویٰ ملاحظہ ہو! وہ لکھتے ہیں:

''اگر تالاب اس قسم کا ہے کہ اس میں مچھلیاں محفوظ ہیں، از خود باہر نہیں نکلیں گی تو مچھلی پالنے کے لیے اس کا ٹھیکہ پر دینا درست رہے اور جو مچھلیاں اس میں پائی جائیں گی وہ مملوک ہو جائیں گی (نظام الفتاوی ۱/۲۴۴، نیز تفصیل کے لیے دیکھئے: الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳/۱۹۶، فتاوی عالمگیری ۳/۱۱۳، بوادر النوادر ۱/۲۱۸)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دور حاضر میں بلاشک وشبہ کے تالاب کو مچھلی پالنے کی غرض سے کرایہ پر دینا جائز ہے، اور یہی مفتی بہ قول ہے۔

تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت:

اس جگہ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حوض یا تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت کا شرعی حکم کیا ہے، تو اس سلسلہ میں عام طور پر فقہاء کرام نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جن صورتوں میں انسان تالاب کی مچھلی کا مالک ہو جاتا ہے، اگر وہ مچھلیاں بغیر کسی حیلہ وتدبیر کے اور بغیر شکار کیے ہوئے مقدور التسلیم ہوں اور بآسانی پکڑی جاسکتی ہوں تو ان کی بیع اور خرید وفروخت تالاب میں رہتے ہوئے جائز ہے، اور بعض علماء نے مچھلی کے بآسانی مقدور التسلیم ہونے کی دو صورتیں لکھی ہیں، ایک یہ ہے کہ شکار کرنے کے بعد مچھلی کو بائع کسی برتن میں رکھ لے، جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے، یا مچھلی کو کسی ایسے چھوٹے گڑھے میں رکھے جس سے نکالنا آسان اور سہل ہو (جدید فقہی مسائل ۱/۲۲۰)۔

لیکن اگر بغیر کسی تدبیر وحیلہ کے مچھلیوں کو پکڑنا آسان نہ ہو، تو ایسی صورت میں تالاب میں رہتے ہوئے مچھلیوں کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح جن صورتوں میں انسان مچھلیوں کا مالک نہیں ہوتا ان صورتوں میں بھی تالاب وغیرہ میں رہتے ہوئے مچھلیوں کو بیچنا جائز نہیں ہے (مزید تفصیل بوادر النوادر اور جدید فقہی مسائل میں دیکھی جائے، نیز الکوکب الدری ۱/۳۵۹)۔

چنانچہ علامہ شمس الدین السرخسی نے ''المبسوط'' باب البیوع الفاسدہ (۱۳/۱۲) کے تقریباً آخر میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں تفصیلی بحث کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

۱- اگر مچھلی کسی جھاڑی یا تالاب وغیرہ میں خود بخود پیدا ہوگئی ہو اور اس کا کسی نے شکار نہیں کیا ہے اور نہ اس تالاب وغیرہ کو مچھلی وغیرہ کی غرض سے تیار کیا گیا ہے اور نہ اس تالاب وجھاڑی وغیرہ سے مچھلی کو کسی نے پکڑا ہے تو اس قسم کی مچھلی کو تالاب میں رہتے ہوئے فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیوں کہ بیع کی حقیقت مبادلۃ المال بالمال کے سبب تملیک کی ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کی تملیک بغیر ملک کے نہیں ہوسکتی، یعنی جب تک کہ انسان اس چیز کا جس کو بیچ رہا ہے مالک نہ ہوگا اس وقت تک اس چیز کو بیچ کر کسی کو مالک نہیں بنا سکتا، اس لیے مذکورہ قسم کے تالاب میں خود بخود پیدا ہونے والی مچھلی کو فروخت کرنا غیر مملوک ہونے کی وجہ سے شرعاً بیع باطل کے حکم میں ہے۔

۲- ہاں اگر مچھلی کو برتن یا گڈھا یا حوض وغیرہ میں پکڑ کر رکھا گیا ہے اور اس مچھلی کو بغیر شکار کے پکڑنا ممکن ومقدور ہو تو اس قسم کی مچھلی کو فروخت کرنا شرعاً جائز ودرست ہے۔

۳- اسی طرح اگر مچھلی کو گڑھا یا حوض وغیرہ میں پکڑ کر رکھا تو نہیں گیا ہے، بلکہ خود بخود مچھلی اس حوض وتالاب میں آگئی ہے، البتہ اس حوض وتالاب کے دہانہ ومنہ کو اس طرح بند کر دیا گیا ہے کہ مچھلی اس سے نہیں نکل سکتی تو شرعاً یہ بھی پکڑنے کے حکم میں ہے، جیسا کہ مچھلی بنسی کے ذریعہ (یعنی اس کانٹے میں جس میں مچھلی کو پھنسایا جاتا ہے) پھنس گئی تو ان صورتوں میں مچھلی کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے۔

۴- لیکن اگر مچھلی مملوک تالاب میں داخل ہوئی مگر اس حوض وتالاب کے دہانہ کو بند نہیں کیا گیا تو ایسی صورت میں اس مچھلی کو فروخت کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

کیوں کہ صرف حوض و تالاب میں داخل ہو جانے سے مچھلی مملوک نہیں ہوتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ''مبسوط'' میں ذکر شدہ تفصیل کے مطابق تالاب میں مچھلی کے ہونے یا پائے جانے کی چار صورت ہے:

۱- حوض و تالاب میں خود بخود مچھلی پیدا ہو گئی

۲- مچھلی کو حوض و تالاب میں پکڑ کر یا خرید کر رکھا گیا ہے اور پھر اس مچھلی کو وہاں سے بغیر شکار کیے ہوئے نکالنا مقدور ہو۔

۳- مچھلی کہیں سے تالاب میں آگئی اور تالاب کے منہ کو بند کر دیا گیا۔

۴- مچھلی کہیں سے تالاب میں آگئی مگر تالاب کے منہ کو بند نہیں کیا گیا ہے، پہلی اور چوتھی صورت میں بیع باطل ہے اور دوسری و تیسری صورت میں شرعاً بیع درست ہے۔

اور ''شرح وقایہ'' کے حاشیہ میں مچھلی کی بیع کی پانچ صورت مرقوم ہے، (تفصیل کے لیے دیکھئے: شرح وقایہ ۳/ ۴۱، نیز درمختار ۴/ ۱۱۹)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر بائع نے مطلق طریقے سے مچھلی کو سامان کے عوض فروخت کیا تو دونوں جانب سے بیع کو باطل ہونا چاہیے، جیسے مردار کو سامان کے عوض فروخت کرنا یا اس کے برعکس سامان کو مردار کے عوض فروخت کرنا اور اگر مچھلی متعین ہوگی تو مچھلی میں بیع باطل ہے اس لیے کہ اس صورت میں مچھلی غیر مملوک ہے اور سامان میں بیع فاسد ہے، اس لیے کہ مچھلی فی الجملہ مال ہے اور اسی کے مثل یہ صورت بھی ہے کہ اگر مچھلی کے گوشت کی بیع ہو اس لیے کہ مچھلی مثلی چیز ہے اور اگر مچھلی کی بیع ثمن یعنی روپیہ سے کی گئی تو بیع باطل ہے، کیوں کہ اس صورت میں مچھلی کا مبیع ہونا متعین ہے اور وہ غیر مملوک ہے، آگے علامہ شامی فرماتے ہیں کہ یہ جو کچھ میں نے کہا میں نے کسی کے کلام میں نہیں پایا، بلکہ یہ بات مجھ پر (منجانب اللہ) ظاہر ہوئی ہے (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹)، اور پہلی و دوسری صورت کے باطل و فاسد ہونے کی صراحت صدر الشریعہ نے کی ہے (شرح وقایہ ۳/ ۴۱)۔

اور ''درمختار'' میں مچھلی کی بیع کی چوتھی شکل میں مشتری کو شرعاً جو خیار رویت حاصل ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی میں مچھلی کو دیکھنے اور پانی سے باہر دیکھنے میں فرق ہے۔

''قال فی در المحتار: قوله وله خيار الرؤية ولا يعتد به برؤيته وهو فى الماء؛ لأنه يتفاوت فى الماء وخارجه شرنبلالية اھ (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹)۔

اور ''درمختار'' میں مچھلی کی بیع کی جو چھٹی شکل بیان کی گئی ہے اس کے متعلق علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اگر مچھلی بغیر حیلہ کے پکڑی جا سکتی ہے تو بیع صحیح ہے اور اگر بغیر حیلہ کے نہیں پکڑی جا سکتی تو بیع فاسد ہے ''(قوله فلو سد ملكه) أي فيصح بيعه إن أمكن أخذه بلا حيلة، وإلا فلا على القدرة على التسليم'' (شامی ۱۱۹/۴)۔

آگے علامہ شامی فرماتے ہیں کہ مچھلی کی بیع کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا حاصل وہ ہے جو فتح القدیر میں مرقوم ہے:

۱- اگر مچھلی بغیر حیلہ کے پکڑی جا سکتی ہے تو بیع جائز ہے، کیوں کہ مچھلی مملوک اور مقدور التسلیم ہے۔

۲- اور اگر مچھلی بغیر حیلہ کے نہیں پکڑی جا سکتی ہے تو بیع جائز نہیں بلکہ فاسد ہے۔

۳- اور اگر مچھلی کسی تالاب میں داخل ہوئی اور وہ تالاب مچھلی کی غرض سے تیار نہیں کیا گیا ہے تو پھر بیع جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں مچھلی کسی کی مملوک نہیں ہے، ہاں اگر مچھلی کے تالاب میں داخل ہوتے ہی تالاب کے دہانہ کو بند کر دیا گیا تو اس صورت میں مچھلی مملوک ہو جائے گی، البتہ اگر بغیر کسی حیلہ مچھلی کا پکڑنا ممکن ہے تو بیع جائز ہے ورنہ بیع فاسد ہوگی۔

۴- اور اگر تالاب تیار نہیں کیا گیا ہے لیکن مچھلی کو پکڑ کر اس میں رکھا گیا ہے تو مچھلی کو پکڑ کر اس تالاب میں رکھنے والا اس مچھلی کا مالک ہوگا، البتہ اگر مچھلی کا بغیر حیلہ کے پکڑنا ممکن ہے تو بیع جائز ہے، اس لیے کہ وہ مقدور التسلیم ہے اور اگر حیلہ کے ذریعہ پکڑنا ممکن ہے تو بیع جائز نہیں ہے بلکہ بیع فاسد ہے اگر چہ مچھلی مملوک ہے، لیکن مقدور التسلیم نہیں ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: شامی ۴/ ۱۱۹)۔

یہاں تک مندرجہ بالا سطور میں مچھلی کی فروخت کے سلسلہ میں جو تفصیلات ذکر کی گئیں ان کا مقصد جہاں یہ ہے کہ مچھلی کی بیع سے متعلق ساری

تفاصیل واضح ہو کر سامنے آجائے، وہیں یہ بات بھی عیاں ہو جائے کہ اس سلسلہ میں عام فقہاء کا نظریہ کیا اور انہوں نے مچھلی کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل کو بیان کرتے ہوئے کس قدر باریک بینی سے کام لیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان مسائل کا زیادہ تر دارو مدار قیاس پر ہے اور عوام کے لیے فقہاء کرام کی بیان کردہ باریکیوں پر عمل کرنا دشوار ہے، دوسری طرف جب کسی زمانہ میں اس کے خلاف تعامل ہو جائے تو اس زمانے کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں قیاسی مسائل پر جمود کے بجائے روح شریعت اور اصول فقہاء کو پیش نظر رکھ کر عرف کے مطابق جہاں تک ہو سکے امت کے لیے سہولت کی راہ نکالیں، لہذا عام فقہاء کے نظریہ کو تحریر کرنے کے بعد دور حاضر کے بدلتے ہوئے حالات میں راقم سطور اپنی رائے درج کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن صورتوں میں انسان تالاب کی مچھلی کا مالک ہو جاتا ہے ان صورتوں میں تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع جائز ہے بشرطیکہ تالاب کی حد بندی ہو اور مچھلی کا وہاں سے نکل کر بھاگ جانا ممکن نہ ہو، نیز وہ تالاب وغیرہ مچھلی ہی کے لیے مخصوص ہو اور مچھلی مقدور التسلیم ہو، خواہ حیلہ وتدبیر اور جال وغیرہ ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو، چنانچہ علامہ شامی نے تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع کا جواز حضرت امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو: رد المحتار ۴/ ۱۱۹)۔

آگے چل کر علامہ شامی نے علامہ خیر الرملی کا قول نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ گزشتہ سطور سے تو مطلقاً تالاب میں مچھلی کی بیع کا عدم جواز معلوم ہوا لیکن حضرت امام ابوحنیفہ سے جو کچھ منقول ہوا اس کا انطباق اگرچہ قواعد پر مشکل ہے، کیوں کہ شکار سے قبل ہی مچھلی کی بیع تالاب میں اس کے رہتے ہوئے ہو رہی ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ تالاب چوں کہ اسی غرض سے بنایا گیا ہے اور مچھلی کی بیع کے بعد مچھلی مقدور التسلیم ہے، اس لیے جائز ہے علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اس تحریر پر غور کرلو کیوں کہ یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور اس کے سلسلہ میں بکثرت سوال کیا جاتا ہے (دیکھئے: رد المحتار ۴/ ۱۱۹)۔

اور راقم سطور کے نزدیک تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع کے جواز کے لیے درخت پر رہتے ہوئے پھل کے فروخت کرنے کے جواز کو نظر بنایا جائے، یعنی جس طرح فقہاء کرام نے درخت پر رہتے ہوئے پھل کی بیع کو جائز قرار دیا ہے اسی طرح تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع بھی شرعاً جائز ہونا چاہیے خواہ حیلہ وتدبیر کے بعد ہی خریدار کو مچھلی سپرد کیوں نہ کرنے پڑے بلکہ جس طرح حضرت امام محمد نے پھل کی بیع کی بعد اگر پھل تیار ہو تو اسے درخت پر چھوڑنے کی عرف کی وجہ سے اجازت دی ہے اسی طرح مچھلی کی بیع کے بعد بھی تالاب میں مچھلی کے کچھ دنوں چھوڑے رکھنے کا رواج ہے اور فریقین میں سے کسی کو کوئی ناگوار نہیں ہوتی اس لیے یہاں بھی مچھلی کی بیع کے بعد تالاب میں کچھ دنوں مچھلی کے چھوڑے رکھنے کی عرف کی وجہ سے اجازت ملنی چاہیے (دیکھئے: الدر المختار ۴/ ۴۲، ۴۳، ۴۴)۔

بلکہ جس طرح علامہ شامی نے پھل کی بیع کو بیع سلم کے ساتھ ملحق کر کے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے (کمافی رد المحتار ج ۴ ص ۴۳)۔

اسی طرح حضرات فقہاء نے مچھلی میں بھی سلم کی اجازت دی ہے (ہدایہ ۳/ ۷۷، ۷۸)۔

تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کا جواز اوپر جس طرح میں نے حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے نقل کیا ہے اسی طرح علامہ سرخسی نے امام ابن ابی لیلہ سے تالاب میں مچھلی کی بیع کا جواز نقل کیا ہے (دیکھئے: المبسوط للامام السرخسی ۱۳/ ۱۱)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس طرح حضرات فقہاء نے عبد آبق کی بیع کو جب کہ وہ مقدور التسلیم ہو جائز قرار دیا ہے، اسی طرح تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی اگر مقدور التسلیم ہو تو اس کی بیع بھی جائز ہے۔ اور علامہ سرخسی نے حضرت ابن عمر اور ابن مسعودؓ سے جو پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع کا عدم جواز نقل کیا ہے وہ اثر راقم سطور کے نزدیک اس صورت پر محمول ہے، جبکہ تالاب غیر محور ہو یا مچھلی غیر مملوک ہو، اسی طرح بعض حضرات فقہاء نے تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع کو بیع غرر کے تحت داخل کر کے ناجائز قرار دیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیع غرر اس وقت منع ہے جبکہ بلا ضرورت ہو، لیکن اگر ضرورۃً یا تبعاً بعض غرر کو برداشت کرنا پڑ رہا ہو تو پھر ایسی صورت میں بیع غرر ممنوع نہیں ہے۔

''قال العلامة النووي في شرح المسلم عند ذكر ''بيع الغرر نصه'': لأنه غرر من غير حاجة، وقد يحتمل بعض الغرر تبعا إذ دعت إليه حاجة'' (وانظر لمزید التفصیل حاشیہ المسلم للنووی ۲/ ۲)

یہاں پہنچ کر یہ مسئلہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ مچھلی کی بیع اگر تالاب میں مچھلی کے رہتے ہوئے کی جائے تو اگر بیع کا معاملہ وزن کے ساتھ ہو تو تالاب سے مچھلی نکلوا کر خریدار کے سپرد کرنا بائع کی ذمہ داری ہے اور اگر کیل و وزن کی شرط کے بغیر اٹکل اور اندازہ سے بیع کا معاملہ کیا جائے تو پھر مچھلی کو تالاب سے نکلوانا بائع کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ خود خریدار تالاب سے مچھلی کو نکالے (ردالمحتار ۴/ ۴۳)۔

جوابات:

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں فقہ اکیڈمی کے مرسلہ سوالوں کا بالترتیب جواب یہ ہے: یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج کل جو مچھلیاں منڈیوں اور بازاروں میں فروخت کی جاتی ہیں ان کا ایک بڑا حصہ ان ندیوں اور تالابوں سے آتا ہے جن کے مختلف رقبے حکومت کی طرف سے مختلف افراد کو ٹھیکہ پر دئے جاتے ہیں اور بہت سی مچھلیاں وہ ہوتی ہیں جن کی گڈھوں اور تالابوں میں افزائش کی جاتی ہے، یہ گڈھے اور تالاب کبھی شخصی ملک ہوتے ہیں اور کبھی عوامی ملکیت کے ہوتے ہیں، جنہیں مختلف افراد کو مختلف جگہوں پر خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دیا جاتا ہے۔

اب یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ آج عام طور پر ان ندی، نالوں اور نہروں کے سلسلہ میں جو کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہیں یہ بات متعارف ہے کہ ان کو حکومت کسی خاص شخص، کوآپریٹو سوسائٹی یا مقامی پنچایتوں کے ہاتھ سے متعین مدت کے لیے بندوبست کر دیتی ہے اور یہ لوگ سرکار کو معاوضہ دے کر ہی خاص حصہ سے مچھلی نکالتے ہیں اور خود اس کو استعمال کرتے ہیں یا اس کو فروخت کر دیتے ہیں یہ مچھلی ضروری نہیں ہے کہ اس ندی یا تالاب میں پرورش کی گئی ہو، بلکہ سیلاب کی آمد کیساتھ یہ مچھلیاں آتی اور جاتی رہتی ہیں، اسی طرح بازار کا بھی سرکار نیلام کرتی ہے، نیز سڑکوں کے کنارے سرکار کی طرف سے جو درخت ہیں یا سرکاری زمین میں پیدا ہونے والے خودرو درخت ہیں جن کے جلاون نیلام کیے جاتے ہیں اور اس طرح کے معاملات عرف میں عام ہیں۔

تو کیا عرف میں عام ہونے کی صورت میں جس طرح ہاٹ، بازار یا سرکاری درخت کے جلاون کے نیلام کو فقہاء کرام نے شرعی بنیادوں پر جائز قرار دیا ہے (امدادالفتاوی ۳/ ۱۲۱)، اسی طرح سرکار تالاب میں سیلاب کی آمد کے ساتھ آنے والی مچھلیوں کے نیلام کو شرعاً جائز قرار دیا جائے گا، تو اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح یاد رہنی چاہیے کہ اگر سرکار نے تالاب کو ٹھیکہ پر دیا ہے اور اس میں خود بخود پیدا ہونے والی مچھلی کو یا سیلاب کی آمد کیساتھ آنے جانے والی مچھلی کو ٹھیکہ دار شخص تالاب سے نکال کر فروخت کرتا ہے تو شرعاً ایسی مچھلیوں کو خرید و فروخت بلا خیار جائز ہے، ہاں اگر سرکاری تالاب کو ٹھیکہ پر لیکر ٹھیکہ دار شخص اس میں خود بخود پیدا ہونے والی مچھلی کو بغیر نکالے ہوئے تالاب میں رہتے ہوئے ہی فروخت کر دیتا ہے تو شرعاً بیع باطل یا فاسد ہے، کیوں کہ اس صورت میں تالاب میں جو مچھلی پائی جاتی ہے وہ غیر مملوک ہے، نیز مجہول بھی ہے اور غیر مقدور التسلیم بھی، اس لیے یہ بیع باطل ہے، کیوں کہ یہ ایسی بیع ہے جس میں مبیع بائع کا مملوک مال نہیں ہے اور جس بیع میں مبیع بائع کی مملوک نہ ہو شرعاً ممنوع ہے: قال النبی ﷺ علی رجل بیع فیما لا یملك، اھ (رواہ النسائی ۲/۲۲۵)۔

لہذا صرف موجودہ عرف کو دیکھ کر اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا: "لأن العرف غير معتبر في المنصوص عليه" (قواعد الفقہ/ ۹۲)، ہاں اگر ٹھیکہ دار نے سرکاری یا عوامی یا شخصی تالاب کو ٹھیکہ پر لیکر اس میں مچھلی خرید کر یا پکڑ کر رکھا ہو یا سیلاب میں آنے والی مچھلی کے تالاب میں رکنے کا انتظام کیا ہو تو پھر ان صورتوں میں وہ تالاب کی مچھلی کا مالک ہو جاتا ہے، البتہ اس صورت میں اگر وہ تالاب سے مچھلی نکال کر فروخت کرتا ہے تو بالاتفاق بیع جائز ہے اور اگر تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کو فروخت کر دیتا ہے تو اگر چہ عام فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق یہ بیع فاسد ہے لیکن خرید لینے کے بعد مشتری مچھلی کو نکال لے اور فروخت کرے تو شرعاً سابق بیع بھی درست ہو جائے گی، چنانچہ حضرت مفتی نظام الدین نے غیر مقبوضہ مچھلیوں کی بیع کے سلسلہ میں ایک فتویٰ کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ "اگر تالاب اس قسم کا ہے کہ اس میں مچھلیاں محفوظ ہیں از خود باہر نہیں نکلیں گی تو مچھلی پالنے کے لیے اس کا ٹھیکہ پر لینا درست ہوگا اور جو مچھلیاں اس میں پالی جائیں گی وہ مملوک ہو جائیں گی، البتہ بغیر پکڑے ہوئے مقبوضہ نہ ہوں گی اس لیے خود پکڑ کر یا اپنے کسی ملازم یا اجیر (مزدور) سے پکڑوا کر فروخت کرنا بھی جائز ہو جائے گا، البتہ بغیر پکڑے اور قبضہ میں لائے فروخت کرنا بیع مالم یقبض ہو کر بیع فاسد ہوگی اور مملوک رہنے کی وجہ سے بیع باطل نہ ہوگی اور بیع فاسد ہونے کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اگر مالک کے قبضہ میں آئے

بغیر فروخت ہو جائے اور مشتری پھر اس کو فروخت کرے اور مالک کو اعتراض نہیں تھا بلکہ اجازت تھی تو یہ دوسری بیع جو ہوگی وہ صحیح اور سمک مبیع لہذا المبیع'' کا استعمال درست رہے گا۔اھ (نظام الفتاوی ۱/ ۲۴۴)''کتبہ العبد نظام الدین عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند''۔

البتہ راقم سطور کے نزدیک مملوک مچھلی کی بیع تالاب میں رہتے ہوئے بھی شرعاً درست ہے۔

۲- اب جس صورت میں حضرات فقہاء نے تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع کو ناجائز و باطل قرار دیا ہے اگر ٹھیکہ دار سے خرید کر اور تالاب سے مچھلی نکال کر مشتری بازار یا دوکان میں رکھ کر مچھلی کو فروخت کرے گا تو اگرچہ بیع باطل کے معروف اصول کے مطابق اس کے لیے اس مچھلی کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔''کما ھو حکم البیع الباطل''،لیکن اگر ٹھیکہ دار کی اجازت سے اس نے ایسا کیا ہے تو بعض فقہاء کے کلام کے مطابق خریدار کا اس مچھلی کو فروخت کرنا اور لوگوں کا اس سے مچھلی خریدنا جائز ہے (حاشیہ شرح وقایہ ۳/ ۳۹)۔

۳- جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے اگر وہ شخص اس تالاب میں باقاعدہ مچھلی پال کر شکار کرنے سے قبل ہی مچھلیوں کو فروخت کر دیتا ہے تاکہ وہ دوسرا شخص خاص مدت میں اس حوض یا تالاب کی مچھلیاں نکال کر فروخت کرے تو فقہاء کرام کی مشہور تصریحات کی روشنی میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر بغیر کسی حیلہ کہ مچھلیاں تالاب سے نکالنا مقدور التسلیم ہو تو شرعاً اس طرح کی خرید و فروخت جائز ہے اور اگر بغیر کسی حیلہ کے مچھلیاں تالاب سے نکالنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں تالاب یا حوض میں رہتے ہوئے شکار سے قبل مچھلیوں کو کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے (شرح وقایہ ۳/ ۴۱)۔

لیکن راقم سطور کے نزدیک جن صورتوں میں انسان مچھلیوں کا مالک ہو جاتا ہے اگر تالاب محصور و مخصوص ہو اور مچھلی حیلہ ہی کے ساتھ مقدور التسلیم کیوں نہ ہو، پھر بھی تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع جائز ہے (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹)۔

۴- اگر کوئی حوض یا تالاب نجی و شخصی ملکیت کا ہے یا عوامی و سرکاری ملکیت کا ہے اور اس میں مچھلیاں بغیر پالے ہوئے بارش و سیلاب کی وجہ سے از خود آ گئی ہیں تو ایسے تالاب کو اس طور پر کسی کو ٹھیکہ پر دینا کہ ایک خاص مدت تک ٹھیکہ پر لینے والے ہی کو اختیار ہو کہ وہ اس تالاب کی مچھلیوں کا شکار کر کے فائدہ اٹھائے تو اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے۔(نظام الفتاوی ج ۱ ص ۲۴۴) البتہ تالاب میں رہتے ہوئے مچھلی کو فروخت کرنا اس صورت میں جائز نہیں ہے۔ہاں اگر مچھلی کو روکنے کے لیے ٹھیکہ دار نے انتظام کیا تو پھر اس صورت میں ظاہر روایت میں یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ اگر اس تالاب سے مچھلی نکال کر فروخت کرلے یا وہ تالاب ایسا ہے کہ بغیر حیلہ کے اس سے مچھلی نکل سکتی ہو تو تالاب ہی رہتے ہوئے مچھلی کو فروخت کرنا جائز ہے، ورنہ نہیں (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹)۔

لیکن احقر کے نزدیک تالاب میں رہتے ہوئے بھی مچھلی کی خرید فروخت جائز ہے۔

☆☆☆

مچھلی کا شکار اور تجارت کی مشکلات کا حل

مولانا محمد محی الدین القاسمی بڑودوی

مچھلی کی بیع:

۱- ندی، نالے جس کا سرکار بندوبست کرتی ہے، اور مقامی پنچایتوں وکوآپریٹیو سوسائیٹیوں کو معاوضہ لے کر ٹھیکہ پر دیتی ہے، جہاں مچھلیوں کا وجود وعدم کچھ یقینی نہیں ہے، علی خطر ہے، پھر سرکار ان مچھلیوں کی مالک بھی نہیں ہے، کیوں کہ جب تک پانی سے مچھلیوں کو پکڑ نہ لیا جائے وہ کسی کی ملک نہیں ہیں، تو سرکار کی ٹھیکہ داروں کے ہاتھ یہ بیع باطل ہے، البتہ ٹھیکہ داروں نے اپنے اس ٹھیکہ کے ماتحت ان ندی نالوں کی مچھلیوں کو پکڑ لیا تو ٹھیکیدار مالک ہو گئے ہیں، ان سے جو شخص خریدے گا اس کی بیع صحیح ہوگی، اسی طرح ٹھیکیدار سے خریدار کی بیع دوسروں کے ہاتھ جائز ہوگی۔

صاحب "درمختار" فرماتے ہیں کہ وہ مچھلیاں جو ابھی شکار نہیں ہوئیں ہیں اگر کسی سامان کے عوض بیچی جائیں تو بیع فاسد ہوگی، اور (نقد کے بدلہ فروخت ہوں) تو بیع باطل ہوگی، ملک نہ ہونیکی وجہ سے۔ صدر الشریعہ کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی کی بیع مذکورہ صورت میں فاسد ہے، اور مچھلی قبضہ کے بعد مملوک ہو جاتی ہے، لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ جو چیز اپنی ملک میں نہیں ہے اس کی بیع تو باطل ہوتی ہے، جیسے پہلے گزرا، کیوں کہ یہ بیع معدوم ہے اور معدوم (بیچنے والے کے حق میں) مال نہیں ہے، تو لازم ہے کہ یہ بیع باطل ہو، اور عرض جو (ثمن ٹھہرا ہے) کی بیع فاسد ہو، کویں کہ اگر چہ عرض کو ثمن ٹھہرایا گیا اور "باء" عوض اس پر داخل ہے، مگر کسی درجہ میں عرض مبیع ہے، تو اس شکل میں، ہم مچھلی کو ثمن قرار دے لیں گے، تو اب صورت یہ ہوگی کہ عرض کو سمک غیر مملوک کے بدلہ فروخت کیا جارہا ہے جو مال نہیں ہے، گویا عرض فروخت ہو رہا ہے اور ثمن کا ذکر نہیں ہے، (اور ثمن مقصود بیع نہیں ہوتا، اس لیے ثمن کے عدم ذکر سے بطلان بیع لازم نہیں آتا) یا یوں کہہ لیں گے جیسے عرض کو ام الولد کے عوض فروخت کیا جارہا ہے (درمختار)۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عرض کی بیع بھی اس صورت میں باطل ہو (جیسے سمک کی بیع باطل ٹھہری) کیوں کہ سمک جب مال ہی نہیں ہے تو عرض کو میتہ اور دم کے عوض فروخت کرنے جیسی صورت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن موجودہ شکل کو عرض کو ام الولد کے بدلہ بیع کے ساتھ تشبیہ دینا زیادہ ظاہر ہے۔ کہ جس طرح ام الولد فی الجملہ مال ہے اسی طرح مچھلی پکڑ لیے جانے کے بعد مال ہے، اور اگر مچھلی کو بے شکار نقد کے عوض فروخت کیا جائے تو بیع باطل ہے۔

۲- مذکورہ صورت، یعنی سرکار کی ٹھکیداروں کے ساتھ مچھلی کی بیع باطل ہے، مگر ٹھیکیداروں کا اس ندی نالے سے مچھلیاں پکڑ کر فروخت کرنا جائز ہے اور مسلمانوں کے لیے صورت حال جانتے ہوئے بھی ان مچھلیوں کو خریدنا جائز ہے، جس کی تفصیل جواب ۱ میں درج ہوئی ہے۔

۳- جو حوض یا تالاب کسی کی ذاتی ملکیت میں ہیں اور مچھلیاں بھی اس نے پالی ہیں، خواہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لاکر ڈالی ہیں یا مچھلی کے انڈے ڈالے ہیں تو اس صورت میں مچھلیاں اس شخص کی مملوک ہیں اور صاحب تالاب کے سوا دوسرے شخص کو یہ مچھلیاں پکڑنے کا حق نہیں ہے۔

پھر اس کی دو صورتیں ہیں: اگر مچھلیاں مقدور التسلیم ہوں کہ مالک یا مشتری بلا کسی تدبیر کے مچھلیاں جس قدر مطلوب ہیں بسہولت پکڑ سکتا ہے تو یہ بیع جائز ہے، البتہ مشتری کو خیار رویت حاصل رہے گا، اور اگر حوض یا تالاب کے بڑا یا گہرا ہونے کی وجہ سے کسی کانٹے یا جال ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہو یا مختلف ومشقت کے بعد پکڑی جاسکتی ہوں تو مقدور التسلیم نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیع جائز نہ ہوگی یعنی فاسد ہوگی۔ جیسے اس پرندہ کی بیع جسکو پکڑ کر فضا میں چھوڑ دیا گیا ہو جو خود واپس نہ ہوتا ہو۔

"والحاصل كما في الفتح أنه إذا دخل السمك في حظيرة فإما أن يعدها ذلك أول افغي الأول يملكه وليس لأحد أخذه ثم إن أمكن أخذه بلا حيلة جاز بيعه لأنه مملوك مقدور التسليم وإلا لم يجز لعدم القدرة على التسليم" (رد المحتار ۴/ ۱۱۹)

بیع فاسد میں رفع فساد:

رہی یہ بات کہ اس بیع فاسد کی صورت میں بائع اگر کسی طرح مچھلیاں نکال کر مشتری کے سپرد کردے تو اب یہ فساد رفع ہو جائیگا کہ نہیں؟ تو اس صورت میں دو رائے ہیں۔

مشائخ بلخ کہتے ہیں کہ تسلیم کے بعد یہ فساد رفع نہ ہوگا اور حضرت کرخیؒ اور امام طحاویؒ کے قول کے مطابق فساد رفع ہو جائے گا اور بیع جائز ہو جائے گی (تفصیل کے لیے دیکھئے: ردالمحتار ۴/۱۲۰)۔

۴- اگر کسی حوض یا تالاب میں مچھلیاں از خود آگئی ہوں تو کوئی شخص اگر حوض یا تالاب کا راستہ بند کردیتا ہے تاکہ مچھلیاں محبوس ہو جائیں تب یہ شخص ان مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا، خواہ کسی حوض یا تالاب اس کی ملکیت میں ہو یا نہ ہو۔

پھر حوض اس قدر چھوٹا ہو کہ پکڑنے کے لیے کسی حیلہ کی ضرورت نہیں رہتی تو ان مچھلیوں کو فروخت کرنا جائز ہے اور اگر مچھلیوں کا پکڑنا حیلہ پر موقوف ہے تو پکڑنے سے قبل بیع فاسد ہے۔

حضرت علامہ شمس الدین سرخسیؒ "مبسوط" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر مچھلیاں چھوٹے گڈھے میں ہوں جن کا بلا شکار پکڑ لینا ممکن ہو تو اگر اس آدمی نے مچھلیاں پکڑ کر اس گڈھے میں ڈال دی ہیں تو یہ مالک ہو جائے گا، جس طرح اس نے مچھلیاں پکڑ کر بڑے مٹکے (کوٹھے) میں ڈالدی ہوں اور اگر مچھلیاں پکڑی نہیں، بلکہ پانی کے ساتھ از خود مچھلیاں گڈھے میں داخل ہوگئی ہوں اور اس شخص نے گڈھے میں پانی داخل ہونے کی جگہ بند کردی ہو کہ اب مچھلیاں اس جگہ سے نکلنے پر قادر نہ ہوں تو یہ آدمی ان مچھلیوں کو پکڑنے والا شمار ہوگا جیسے جال میں مچھلی پھنس جائے تو جال والا مالک ہو جاتا ہے، تو اب ان مچھلیوں کا بیچنا جائز ہوگا، (اگر مقدور التسلیم ہوں) اور اگر اس شخص نے پانی داخل ہونے کی جگہ کو بند نہ کیا تو بیع جائز نہیں ہوگی (بلکہ باطل ہوگی)، اس لیے کہ صرف گڈھے میں مچھلی آجانے سے مملوک نہیں ہو جاتی ہے جب تک کہ یہ آدمی اس کو پکڑ نہ لے، خواہ حقیقۃً، خواہ حکماً" اھ (المبسوط للسرخسی ۱۳/۱۲)۔

یہاں ایک اور صورت پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ کسی نے غیر مملوک حوض یا تالاب میں مچھلیاں پکڑ کر ڈالدی ہوں تو انکی بیع کا کیا حکم ہے؟

ہمارے یہاں اس کی بیع باطل ہے، اور ابن ابی لیلیٰؒ فرماتے ہیں جائز ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ پکڑ کر چھوڑ دینے سے اسکی ملک زائل نہیں ہوتی، اگرچہ پکڑنے کے لیے از سر نو شکار کرنا پڑ جائے۔

ہماری دلیل حضرت ابن عمر اور حضرت بن مسعود رضی اللہ عنھما کا اثر ہے، ان دونوں نے فرمایا کہ مچھلی کو پانی میں نہ بیچو کہ یہ بیع غرر ہے، چنانچہ پکڑے بغیر ہی بیع پانی میں کر رہا ہے تو یہ بیع باطل ہے غیر مملوک کی بیع ہے اور خود مالک بننے سے قبل دوسرے کو مالک نہیں بنا سکتا، لہذا یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی اڑتے پرندہ کو (بلا پکڑے) فضاء میں بیچ ڈالے تو یہ بیع باطل ہوگی۔

اور اگر پکڑ کر پھر چھوڑ دی ہے تو یہ مچھلی آبق فی الماء ہے تو یہ بھگوڑے غلام کی بیع کے حکم میں ہے، اور اس لیے بھی کہ مقدور التسلیم نہیں ہے، بلکہ اس مچھلی کو پکڑنے کے لیے اسی سبب ملک کو اختیار کرنا پڑیگا جس سے از سر نو ملک ثابت ہوتی ہے، یعنی شکار کرنا پڑے گا تو نتیجۃً یہ بھی فضا میں پرندہ کی بیع کے حکم میں رہے گی (تفصیل کے لیے: المبسوط للسرخسی ۱۳/۱۲)۔

ٹھیکہ (اجارہ):

حوض یا تالاب کو ٹھیکہ پر دینے کا مسئلہ اجارہ سے متعلق ہے۔

اجارہ تملیک المنافع کا نام ہے، یعنی کوئی مملوک شئی سے انتفاع کے لیے اجارہ کی وضع ہوتی ہے، اور حوض یا تالاب کو ٹھیکہ پر دینا مچھلی مارنے اور نکالنے کے لیے، اجارہ کی حقیقت، یعنی تملیک المنافع سے میل نہیں کھاتا ہے، کیوں کہ اس ٹھیکہ میں حوض سے کوئی انتفاع نہیں ہو رہا ہے، بلکہ عقد، حوض و تالاب میں مچھلی پر واقع ہو رہا ہے، اور معقود علیہ (مچھلی) پوری بذاتہ عاقد کو مل رہی ہے، اس کو استہلاک عین کہا جاتا ہے، اور اجارہ کی حقیقت یہ ہے کہ عین مالک کی ملک پر باقی رہتے ہوئے منافع دوسرے کو مل جائیں، اور استہلاک عین پر اجارہ جائز نہیں ہے، جیسے کسی زمین پر بانس یا درخت لگے ہوئے ہوں تو ان کے کاٹنے پر اجارہ درست نہیں، زمین میں پانی ہو تو پانی جانوروں کو پلانے کے لیے اجارہ درست نہیں ہے، گھاس ہو تو جانور چرانے پر اجارہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ بانس، درخت،

گھاس اور پانی عاقد کو بذاتہ مل رہا ہے اور نفس زمین سے اس میں عاقد کو انتفاع نہیں ہو رہا ہے، اور نہ نفس زمین پر کوئی عقد ہو رہا ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: بزازیہ علی ہندیہ ۵/۴۸)۔

حیلہ جواز:

علامہ شامی نے حیلہ جواز بیان کیا ہے کہ زمین کے حصہ معینہ کو جانور بٹھانے اور باندھنے کے لیے اجارہ پر لے لیا جائے اور صاحب زمین پانی اور گھاس لینے کی اجازت دیدے مستاجر کو، اور اس اجازت کی اس وقت ضرورت ہوگی جب پورا پانی لے لینا ہو، اگر ضرورت کے مطابق جانوروں کو پلانا ہے یا تھوڑا استعمال کرنا ہے جس سے کنویں یا نہر کے حریم (ماحول) کو نقصان نہ پہونچتا ہو تو ضرورت کی مقدار لے لینے میں اجازت کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

لہذا اس حیلہ کے مطابق یہ جائز ہے کہ حوض یا تالاب کی زمین اجارہ پر دیدی جائے، اور پھر مالک زمین مستاجر کو مچھلیاں مارنے کی اجازت دیدے، لیکن نفس حوض و تالاب کو مچھلیاں مارنے کے ٹھیکہ پر نہیں دیا جاسکتا، یہ جائز نہیں ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۴/۱۱۹-۱۲۰)۔

مچھلی کے شکار کے لیے کسی گڈھے کو اجارہ پر دینا جائز نہیں ہے (درمختار)۔

اس پر علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں: ''نہر'' میں لکھا ہے، جان لیجئے کہ متصرفین چھوٹے چھوٹے گڈھے میں جیسے ''برکۃ الفھادۃ'' اس میں مچھلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں، تو کیا مچھلی کا شکار کرنے کے لیے ان کو اجرت پر دیا جاسکتا ہے، بحر میں ''ایضاح'' سے منقول ہے کہ جائز نہیں ہے، اور پہلے حضرت ابو یوسفؒ سے نقل کیا ہے کہ کتاب الخراج میں ابوالزناد سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو ایسے بحیرہ کے بارے میں لکھا جو عراق میں واقع ہے اور اسمیں مچھلیاں جمع ہو جاتی ہیں، کیا ہم اس کو اجرت پر دے سکتے ہیں، تو انہوں نے مجھے لکھا ایسا کرلیا کرو (ردالمحتار ۴/۱۱۹)۔

اور ''ایضاح'' میں جو لکھا ہے (عدم جواز) وہ قواعد فقہیہ کے زیادہ لائق ہے، اور بحر میں بھی حضرت ابو یوسفؒ عن ابی حنیفۃ عن حماد عن عبدالحمید بن عبدالرحمن روایت کیا ہے کہ عبدالحمید نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا گڈھوں (حوض) کی مچھلیوں کے شکار کے بارے میں پوچھتے ہوئے تو عمر بن عبدالعزیز نے لکھا کہ لاباس بہ (حرج نہیں) اور اس کو حبس کے نام سے موسوم کیا......اھ

تو بحر میں کہا کہ اس بنیاد پر گڈھوں (تالاب) میں مچھلی کی بیع جائز نہیں ہے، مگر جب کہ بیت المال کی زمین ہو تو جائز ہے اور وقف کی زمین کا بھی یہی حکم ہے۔

اور خیر رملیؒ (علامہ خیر الدینؒ) نے کہا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ ماتقدم سے تو مطلقاً عدم جواز بیع معلوم ہوتا ہے سمندر میں یا ندی میں ہو یا تالابوں میں، خواہ بیت المال کی زمین ہو یا وقف کی زمین ہر صورت میں جائز نہیں ہے۔ اور ''کتاب الخراج'' میں جو کچھ گزرا ہے وہ بھی قواعد فقہیہ سے بعید نہیں ہے، اس کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ایک مخصوص جگہ مقررہ منفعت (شکار) کے لیے اجرت پر لی جائے۔ اور ابو حنیفہ نے حماد سے جو روایت بیان کی ہے وہ قابل اشکال ہے، اس لیے کہ یہ شکار سے پہلے ہی مچھلی کی بیع ہے، البتہ اس کا جواب دیا جاسکتا ہے کہ یہ ایسے تالابوں کے بارے میں ہے جو مچھلی کی غرض سے ہی تیار کیے گئے ہوں اور مچھلی پکڑنے پر پوری قدرت ہو۔ علامہ نسائیؒ فرماتے ہیں: غور کے قابل مسئلہ ہے، ہماری اس تحریر کو غنیمت سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور اس کے بارے میں بہت سوال ہوتے ہیں۔اھ

علامہ شامیؒ علامہ رملیؒ کے قول پر اشکال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: رملیؒ کا یہ کہنا ہے کہ عمر بن الخطاب جو اجازت دی ہے۔ وہ زمین کے ایک حصہ معینہ کو اصطیاد کے لیے اجارہ پر دینے پر محمول ہے یہ درست نہیں ہے، اس میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ اجارہ استہلاک عین ہو رہا ہے اور جلد ہی تصریح آجائے گی کہ چراہ گاہوں کو اجارہ پر دینا صحیح نہیں ہے اور اصطیاد کے لیے تالاب کو اجارہ پر دینا بھی استہلاک عین ہے، اسی لیے مقدسی نے اسکے صحیح نہ ہونے کا قطعی فیصلہ کیا ہے اور صاحب بحر نے بھی ہماری طرح اعتراض کیا ہے (دیکھئے: شامی ۴/۱۱۹-۱۲۰)۔

خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ''بزاز'' کی طرح علامہ شامی، صاحب ''بحر'' اور دیگر فقہاء کرام نے ایسے اجارہ کو درست قرار نہیں دیا ہے، اس لیے حوض یا تالاب کو ایک معینہ مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

سرکاری ندی، نالے اور نہروں کو ٹھیکہ پر دینا

مفتی نسیم احمد قاسمی [1]

صورت مسئولہ میں فقہی نقطۂ نظر سے غور وفکر کرنے کے بعد اس میں تین احتمالات نکلتے ہیں:

۱- اس میں پہلا احتمال یہ نکلتا ہے کہ ہم اسے عقد بیع تسلیم کریں، گویا سرکار تالاب، ندی نالے اور نہروں میں پائے جانے والی مچھلیوں کی بیع کرتی ہے، مگر یہ احتمال اصول شرع کی رو سے درست نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح کا معاملہ چند برسوں کے لیے بھی ہوتا ہے، تو جس وقت معاملہ طے پا رہا ہے اس معاملہ میں وہ مچھلیاں بھی شامل ہوں گی جو اگر چہ وقت معاملہ موجود نہیں ہیں مگر آئندہ ان کے پیدا ہونے یا بارش اور سیلاب کی آمد ورفت کے ساتھ ان کے آنے کا امکان ہے تو اس صورت میں بیع معدوم لازم آئے گی جو اصول شرع کی رو سے باطل ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے جو موجود نہیں ہیں، اسی بنیاد پر حمل اور نتاج کی بیع سے منع کیا گیا ہے (فتح القدیر ۶/ ۳۷۵)۔

یا پھر وہ مچھلیاں (موجود ہونے کی صورت میں) مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہوں گی، لہذا مبیع کے مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے یہ عقد فاسد قرار پائے گا۔

حضرت امام ابو یوسف نے ''کتاب الخراج'' میں حضرت عمرؓ بن الخطابؓ کا اثر نقل کیا ہے کہ انہوں نے غرر کی وجہ سے پانی میں مچھلیوں کی بیع سے منع فرمایا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی فتویٰ ہے، چنانچہ راحث العکلی نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے نقل کیا ہے:

''لا تبایعو السمك في الماء، فإنه غرر'' (کتاب الخراج/ ۸۷)۔

اور مسیب بن رافع نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے: ''لا تبیعو السمك في الماء فانه غرر'' (حوالہ بالا/ ۸۸)۔

عامر الشعبی کی روایت کے مطابق بیع غرر کی ممانعت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے (حوالہ بالا/ ۸۸)۔

امام احمد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ آپ نے غرر کی وجہ سے پانی میں مچھلی کی بیع سے منع فرمایا ہے

''لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر''

۲- دوسرا احتمال یہ نکلتا ہے کہ اسے اجارہ علی استہلاک العین قرار دیا جائے، گویا ٹھیکہ پر لینے والا شخص یا کوآپریٹو سوسائٹی یا پنچایت، ندی، نالے اور نہروں کو مچھلیوں کے خاطر اجارہ پر لیتی ہے۔ اور اس اجارہ سے بقائے عین کے ساتھ اس سے منفعت مقصود نہیں ہے، بلکہ خود عین ہی مقصود ہے جو بدون استہلاک ممکن نہیں، اس طرح سے یہ اجارہ علی استہلاک العین قرار دیا جائے گا جو از روئے اصول شرع فاسد ہے۔

اجارہ کی صحت کی ایک شرط یہ ہے کہ اس سے عین مقصود نہیں، بلکہ بقائے عین کے ساتھ اس سے منفعت مقصود ہے، مثلاً دودھ کی خاطر اجارہ پر جانور کو لینا یا پھل کی خاطر باغ اجارہ پر لینا یا مچھلی کے خاطر تالاب اجارہ پر لینا ان تمام صورتوں میں چوں کہ اجارہ میں عین مقصود ہوتی ہے، اس لیے اجارہ فاسد قرار پائے گا۔

صاحب ''الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' نے شرائط اجارہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صحت اجارہ کی ایک شرط یہ ہے کہ عقد اجارہ سے عین مقصود نہ ہو، مثلاً کسی نے دودھ کی خاطر اجارہ پر گائے لی تو اس اجارہ کا مقصد صرف استیفاء لبن ہے اور لبن عین ہے جس پر ملکیت عقد اجارہ کے نتیجہ میں حاصل نہیں ہو سکتی ہے، کیوں کہ اجارہ کے ذریعہ اعیان ملکیت تبعاً تو حاصل ہو سکتی ہے مگر اصالۃً نہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳/ ۹۹)۔

''فتاویٰ ہندیہ'' میں اجارہ علی استہلاک العین کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھا گیا ہے:

''ایک شخص نے دریائے فرات کے کنارے مشرعہ (پانی پلانے کی جگہ) بنایا تاکہ سقہ اس سے لوگوں کو پانی پلائیں اور یہ اس سے اجرت وصول کرے، پس

---

[1] سابق نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

اگر اس نے اسے اپنی مملوکہ زمین پر بنایا اور پھر اسے استقاء (پانی پلانے) کی خاطر اجارہ پر دیا تو اجارہ درست نہیں ہوگا، اس لیے کہ اجارہ اصالۃً استہلاک العین پر واقع ہوگا (فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۵۳)۔

۳- اسے مطلقاً زمین کا اجارہ قرار دیا جائے:

میرے نزدیک اس میں تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ نہ تو عقد بیع ہے اور نہ ہی اجارہ علی استہلاک العین، بلکہ سرکار تالاب، ندی، نالے اور نہروں کی مخصوص متعین زمین کے حصوں کو اجارہ پر دیتی ہے تا کہ اس زمین سے اجارہ پر لینے والا منفعت حاصل کر سکے اس اجارہ میں چوں کہ زمین کا حصہ مخصوص اور متعین ہوتا ہے اس کی اجرت اور اجارہ کی مدت بھی معلوم و متعین ہوتی ہے اور منفعت بھی معلوم و متعین ہوتی ہے، اس لیے اجارہ درست قرار پائے گا، زمین کے اجارہ کے جواز میں اہل علم کا اتفاق ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے "المغنی" میں لکھا ہے: "زمین کے اجارہ کے جواز کے بارے میں اہل علم کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے (المغنی ۵/ ۴۴۹)۔

زمین کے اجارہ کی صورت میں اس کی وضاحت ضروری ہوتی ہے کہ زمین کس نوعیت کے کام کے لیے اجارہ پر لی جارہی ہے اس میں کاشت کی جائے گی، یا درخت لگائے جائیں گے، یا کوئی تعمیری کام کرے گا، اسی طرح تالاب اور نہر کی زمین بھی مچھلی پالنے، یا مکھانے کی کاشت کے لیے اجارہ پر لی جاسکتی ہے، اگر کام کی نوعیت کی صراحت نہیں کی گئی تو اجارہ فاسد قرار پائے گا، البتہ اگر بوقت معاملہ مالک زمین نے کرایہ دار کو زمین سے ہر قسم کے انتفاع کی اجازت دے دی ہو تو پھر اجارہ درست قرار پائے گا، دیکھئے: (بدائع الصنائع ۴/ ۱۸۳)۔

سرکاری تالاب، ندی اور نالوں کی زمین کو اجارہ (ٹھیکہ) پر دینے کی صورت میں سرکار کی طرف سے کرایہ دار کو ہر قسم کے انتفاع کی اجازت حاصل ہوتی ہے، ٹھیکہ کی مدت کے دوران کرایہ پر حاصل کی گئی زمین سے چاہے تو کرایہ دار مچھلی نکال کر یا اس میں مکھانے یا کسی اور چیز کی کاشت کر کے انتفاع حاصل کرے۔

"المجموع شرح المہذب" میں ہے:

"زمین کا اجارہ درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے کہ اس زمین میں کاشت کی جائے گی یا درخت لگائے جائیں گے یا تعمیری کام ہوگا" (المجموع شرح المہذب ۱۵/ ۱۳)۔

مذکورہ بالا فقہی عبارت سے مطلقاً اراضی کے اجارہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، یعنی کسی بھی متعین کام کی صراحت کے ساتھ زمین کو اجارہ پر دیا جاسکتا ہے، اگر بوقتِ معاملہ کام کی نوعیت کی وضاحت نہیں کی گئی، مگر مالک اراضی نے ہر قسم کے انتفاع کی اجازت دے دی تو بھی اجارہ درست قرار پائے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ خاص طور پر مچھلیوں کے حصول کی خاطر زمین کے اجارہ کی صراحت فقہاء کے یہاں ملتی ہے، یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں "فتاویٰ ہندیہ" میں یہ جزئیہ لکھا ہے:

"مچھلیوں کے حصول کی خاطر تالاب اور نہروں کا اجارہ اسی طرح محض گھاس کی خاطر چراگاہ کا اجارہ درست نہیں ہے، البتہ اس میں یہ حیلہ ممکن ہوسکتا ہے کہ مطلقاً زمین اجارہ پر لی جائے پھر اس سے وہ گھاس کی صورت میں یا جانوروں کو اس جگہ باندھنے کے ذریعہ فائدہ اٹھائے تو یہ شکل درست ہوگی"۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہی حیلہ تالاب اور نہر کی زمین کے بارے میں بھی کرنا درست ہوگا کہ اجارہ مچھلیوں پر استہلاک کی وجہ سے نہ کیا جائے، بلکہ زمین کے مخصوص و متعین حصہ کو متعینہ مدت اور متعینہ اجرت کیساتھ اجارہ پر لیا جائے، پھر اس سے کرایہ دار چاہے مچھلیوں کی صورت میں یا مکھانے وغیرہ کی کاشت کے ذریعہ انتفاع کرے، مچھلیوں کی خاطر تالاب یا نہر کی زمین کے اجارہ کا مسئلہ دور حاضر کا جدید مسئلہ نہیں ہے، بلکہ علامہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے کہ جب میں ۹۶۸ھ میں "بحر الرائق" کی "کتاب البیوع" کی تالیف میں مصروف تھا تو میرے سامنے یہ سوال آیا کہ مچھلیاں نکالنے کی خاطر تالاب اور نہر کا اجارہ درست ہوگا یا نہیں، میرے پاس جو کتابیں تھیں ان میں یہ مسئلہ مجھے نہیں ملا، مگر "کتاب الخراج لابی یوسف" میں ابی الزناد کے حوالہ سے لکھا ہے (کتاب الخراج/ ۸۷) کہ میں نے عمر بن الخطاب کے پاس لکھا کہ سرزمین عراق میں ایسے تالاب اور نہریں ہیں جن میں مچھلیاں جمع ہوتی ہیں تو کیا ایسے تالاب اور نہروں کو اجارہ پر دینا درست ہوگا، انہوں نے فرمایا کہ ہاں، ایسا کر سکتے ہو، اسی طرح عمر بن عبد العزیز کا فتوی بھی جواز کا ہے، ان دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن نجیم نے اپنی رائے دی ہے کہ اراضی بیت المال اور اراضی وقف کو اس غرض سے اجارہ پر دینا درست ہوگا، مگر اخیر میں "ایضاح" کے حوالہ سے عدم جواز پر اکتفا کیا ہے (البحر الرائق ۶/ ۸۱)، علامہ ابن عابدین نے "ردالمحتار" اور "حاشیہ البحر الرائق منحۃ الخالق" میں صاحب "البحر الرائق" کی عبارت نقل کرنے کے بعد "ایضاح" کے حوالہ سے ابن نجیم نے جو عدم جواز کا قول ذکر کیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وما في الإيضاح بالقواعد الفقهية أليق'' (ردالمحتار/ ۲۴۹؛ باب البیع الفاسد، حاشیۃ منحۃ الخالق علی البحر ۶/ ۷۹)۔

''ایضاح'' میں جو عدم جواز کا قول ہے وہ قواعد فقہیہ کے زیادہ موافق ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی کا رجحان اس مسئلہ میں عدم جواز کی طرف ہے، مگر علامہ الخیر رملی کے حوالہ سے لکھا ہے۔

''وما تقدم عن كتاب الخراج غير بعيد ايضًا عن القواعد و مرجعه الى اجاره موضع مخصوص لمنفعة معلومة هى الاصطياد'' (ردالمحتار ۷/ ۲۴۹)۔

یعنی ''کتاب الخراج'' کا قول جواز بھی قواعد فقہیہ کے مخالف نہیں ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس صورت میں مخصوص جگہ کا مخصوص منفعت کے لیے اجارہ کیا جاتا ہے اور مخصوص منفعت سے مراد شکار کرنا ہے۔

علامہ الخیر الرملی کا مذکورہ بالا قول نقل کرنے کے بعد علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے:

''فتأمل واغتنف بهذا التحرير، فإن المسألة كثيرة الوقوع و يكثر السوال عنها'' (حوالہ بالا)۔

(اس بارے میں اچھی طرح غور وفکر کرلو، اور اس تحریر کو غنیمت جانو، کیوں کہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور اس کے بارے میں بہت زیادہ سوال کیا جاتا ہے)۔

پھر علامہ رملی کے قول ''غیر بعید'' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ محل غور ہے، کیوں کہ اس صورت میں اجارہ استہلاک عین پر واقع ہوتا ہے جو جائز نہیں ہے۔

ان عبارات کی روشنی میں میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ سرکار کی طرف سے تالاب، نہر، ندی، اور نالوں کی اراضی کو جو ٹھیکہ پر دیا جاتا ہے تو چوں کہ اراضی، مدت اور منفعت کی تعیین ہوتی ہے اور اس میں اجارہ کے جواز کی شرطیں پائی جاتی ہیں، اس لیے یہ صورت مخصوص اور متعین جگہ کو مخصوص منفعت کے عوض اجارہ پر لینے کی ہے جو بلاشبہ جائز ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے آثار اور خیر رملی کے قول سے ثابت ہوتا ہے، جہاں تک علامہ شامی یا دیگر فقہاء کا یہ کہنا کہ یہ اجارہ علی استہلاک العین ہونے کی وجہ سے فاسد ہے تو یہ اس صورت میں درست ہوتا جب ہم تالاب کو مچھلی کے خاطر اجارہ پر لینے کو تسلیم کرتے، یہاں پر تو مطلق زمین کا اجارہ کیا جارہا ہے اور اجارہ بھی مخصوص منفعت کے لیے، اس لیے عدم جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ اجارہ علی استہلاک العین کی وجہ سے فاسد ہے تو بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے آثار کی وجہ سے ابتلاء عام، عموم بلوی اور تعامل ناس کی بنیاد پر اسے درست قرار دیا جاسکتا ہے، ''کتاب الخراج'' میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ایک اثر ابوالزناد کے حوالہ سے منقول ہے کہ انہوں نے عمر ابن عبدالعزیز کے پاس لکھا:

''كتبت إلى عمر بن عبد العزيز في بحيرة يجتمع فيها السمك بأرض العراق أنواجرها؟ فكتب أن افعلوا''

دوسرا اثر حمید ابن عبدالرحمن سے منقول ہے کہ انہوں نے لکھا:

''يسأله عن بيع صيد الآجام فكتب إليه عمر أنه لا بأس به'' (كتاب الخراج مع موسوعة الخراج/ ۸۷)۔

پانی اور گھاس کے ساتھ اراضی کے اجارہ کے جواز کے بارے میں ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں لکھا ہے:

''اس کے جواز پر فی الجملہ علماء کا اتفاق ہے، البتہ اصالۃً حنفیہ مچھلی کے خاطر نہر، یا تالاب کے اجارہ اور گھاس کے لیے چراگاہ کے اجارہ کو جائز قرار نہیں دیتے ہیں، البتہ اس کے لیے صرف زمین اجارہ پر لی جاسکتی ہے پھر مالک کرایہ دار کو اس زمین سے گھاس (یا مچھلی کے شکار) کے ذریعہ انتفاع کو مباح کردے گا، دیگر فقہاء کے یہاں ایک ساتھ زمین اور گھاس پر عقد اجارہ ہوسکتا ہے'' (الموسوعۃ الفقہیہ کویت ۱/ ۲۷۷)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کی صراحت کے مطابق اصطیاد کی غرض سے تالاب اور نہر کو اجارہ یا عاریت پر لینا جائز ہے اور اس طرح جو مچھلیاں شکار کی جائیں گی ان پر ملکیت ثابت ہوگی ''المغنی'' میں ہے:

''لو استأجر البركة أو الشبكة أو استعارها للاصطياد جاز وما حصل فيها ملكه'' (المغنی ۴/۲۲۴)۔

۲- ٹھیکہ پر لیے ہوئے تالاب، ندی اور نہروں کی مچھلیوں کو فروخت کرنا:

اصطیاد (شکار) کی خاطر سرکاری تالاب، ندی، نالے اور نہروں کی زمین کا اجارہ، شرائط اجارہ کے پائے جانے کی وجہ سے جائز اور درست ہے، اس

لیے مدت اجارہ کے حاصل کے دوران کرایہ دار (چاہے وہ کوئی شخص ہو یا کوآپریٹو سوسائٹی یا پنچایت) کے لیے اس زمین سے منفعت حاصل کرنا جو اصطیاد کی شکل میں ہوگا درست قرار پائے گا، اور جب کرایہ دار مچھلی شکار کرکے تالاب، ندی، اور نہروں سے باہر نکالے گا تو مملوک ومقبول ہونے کی وجہ سے ان مچھلیوں کا بیچنا اور ہر شخص کے لیے خریدنا چاہے وہ مسلمان کیوں نہ ہو، جائز اور درست قرار پائے گا۔

جو لوگ ٹھیکہ پر لیے ہوئے تالاب وغیرہ کے معاملہ کو عقد بیع یا اجارہ علی استہلاک العین کی وجہ سے اس معاملہ کو فاسد قرار دیتے ہیں ان حضرات کے نزدیک بھی چوں کہ مچھلیوں کا شکار کرنا ہر شخص کے لیے مباح ہے، اس لیے جو بھی شکار کرکے مچھلی نکالے گا اس کا مالک اور قابض بن جائے گا اور مملوک و مقبوض اشیاء کی خرید وفروخت بلا شبہ جائز و درست ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین نے قبضہ کی صورت میں ملکیت کو معتبر تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وأنه يملك بالقبض'' (رد المحتار ۲۴۸/۷)۔

یعنی جب ٹھیکہ پر لینے والا شخص شکار کرکے مچھلیوں پر قبضہ کرلیگا تو اسے ان مچھلیوں پر ملکیت حاصل ہوجائے گی اور حصول ملک کے بعد بیع جائز قرار پائے گی۔

''المغنی لابن قدامہ'' میں ہے: ''ومن سبق إليه فأخذه ملكه كالأرض التي لم تعد للاصطياد مثل أرض الزرع إذا دخلها ماء فيه سمك ثم نضب عنه'' (۲۲۴/۴)۔

صاحب ''البنایہ'' شارح ''ہدایہ'' نے لکھا ہے کہ اگر تالاب مچھلیوں کی پرورش کی خاطر نہ بنایا گیا ہو، بلکہ کسی اور مقصد کی خاطر کھدوایا گیا تو ایسے تالاب کی مچھلی کا جو شخص شکار کرلے گا وہی اس کا مالک قرار پائے گا، ''البنایہ شرح ہدایہ'' میں ہے:

''ولو اتخذ لحاجة أخرى فمن اتخذ السمك فهو له'' (البنایہ شرح الہدایہ ۳۸۴/۶، نیز دیکھئے: فتح القدیر ۳۷۵/۶)۔

۳- نجی حوض یا تالاب کی مچھلیوں کو شکار کرنے سے پہلے فروخت کرنا:

تالاب کی مچھلی کے سلسلہ میں بھی یہی تفصیل ہے کہ اگر مچھلی بیچنے والے کی ملکیت میں داخل ہے اور وہ اس کے بآسانی حوالہ کرنے پر قادر بھی ہے تو اس کی بیع درست ہوگی اور اگر مچھلی اس کی ملک میں نہ ہو یا ملک میں تو ہو مگر غیر مقدور التسلیم ہو تو اس کی بیع درست نہیں ہوگی، دیکھئے: (فتح القدیر ۶ / ۳۷۵، رد المحتار ۷ / ۳۴۹، البنایہ شرح ہدایہ ۶ / ۳۸۳)۔

۲- تالاب مچھلیوں کی پرورش کی خاطر نہیں کھودا گیا اور نہ اس نے مچھلی اس میں ڈالی، مگر مچھلیوں کے تالاب میں لانے یا آنے والی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کے لیے اس نے کوئی تدبیر کی ہو، مثلاً تالاب کا وہ راستہ بند کردیا جس سے پانی اور پانی کے ساتھ کی آمد ورفت ہوتی ہے تو اس صورت میں بھی وہ تالاب کی مچھلیوں کا مالک قرار پائے گا، پھر اگر وہ تالاب اتنا چھوٹا ہو کہ اس میں سے بغیر حیلہ اصطیاد مچھلی پکڑنا ممکن ہو تو مچھلی کے مملوک اور مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے بیع درست ہوگی اور اگر تالاب اتنا بڑا ہو کہ بغیر شکار کیے ہوئے مچھلی پکڑنا ممکن ہی نہ ہو تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع درست نہیں ہوگی، البتہ اگر اس صورت میں اس شخص نے مچھلی کے تالاب میں لانے یا آنے والی مچھلیوں کے واپس جانے کیلئے کوئی تدبیر اور کوشش نہیں کی تو وہ اس کا مالک نہیں قرار پائے گا اور عدم ملکیت کی وجہ سے اس کی بیع درست نہیں ہوگی، جو شخص بھی تالاب سے مچھلی شکار کرے گا وہی اس کا مالک قرار پائے گا، فتح القدیر میں ہے:

''اور اگر کسی نے مچھلیوں کی خاطر تالاب نہیں کھدوایا تو وہ مچھلی کا مالک نہیں ہوگا اور عدم ملک کی وجہ سے مچھلی کی بیع درست نہیں ہوگی، البتہ اگر اس نے تالاب کا راستہ بند کردیا تو اس کا مالک ہوجائے گا اور اس صورت میں اگر بغیر حیلہ اصطیاد مچھلی پکڑنا ممکن ہو تو اس کی بیع درست ہوگی، ورنہ نہیں'' (رد المحتار ۶ / ۳۴۹)۔

۳- تیسری صورت یہ ہے کہ تالاب مچھلیوں کی خاطر نہیں کھدوا گیا، مگر اس نے دوسری جگہ سے مچھلی پکڑ کر یا خود اسی تالاب سے مچھلی پکڑ کر اسی تالاب میں دوبارہ ڈالدیا تو وہ اس کا مالک ہوجائے گا۔ اور اگر بغیر حیلۂ اصطیاد اس کا پکڑنا ممکن ہو تو مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے درست ہوگی (تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح القدیر ۶ / ۳۷۵، رد المحتار ۷ / ۳۴۹)۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوال نمبر ۳/ کا جواب یہ ہے کہ جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے اگر وہ شخص اس میں باقاعدہ مچھلیاں پالتا ہے اور مچھلیوں کی نشوونما کی خاطر حوض یا تالاب استعمال کرتا ہے تو بلا شبہ اس تالاب اور حوض کی مچھلیوں کا وہ مالک ہے، پس اگر وہ حوض یا تالاب اتنا چھوٹا ہو کہ اس میں سے بغیر حیلۂ اصطیاد مچھلی پکڑنا ممکن ہو تو مملوک اور مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع درست ہوگی، اور اگر تالاب اتنا چھوٹا ہو کہ اس میں سے بغیر حیلۂ اصطیاد مچھلی پکڑنا ممکن ہی نہ ہو تو مچھلیوں کے غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے بیع فاسد قرار پائے گی، البتہ اس صورت میں اگر مشتری باضابطہ مچھلی کا شکار کر کے اس پر قبضہ کرے گا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا، کیوں کہ بیع فاسد بعد القبض مفید ملک ہوتی ہے۔ پس جب مشتری اس کا مالک ہو جائے گا اور مچھلی اس کے قبضہ میں آجائے گی تو اس کی بیع درست ہوگی، "فتح القدیر" میں بیع فاسد کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"والفاسد يفيد الملك عند اتصال القبض به، ويكون المبيع مضمونا في يد المشتري فيه" (فتح القدیر ۶/۳۷۱)۔

۴- نجی یا عوامی ملکیت کا وہ حوض یا تالاب جس میں مچھلیاں پالے بغیر بارش یا سیلاب وغیرہ کی وجہ سے خود آگئی ہوں مگر مالکان نے ان مچھلیوں کو واپس نہ جانے دینے کے لیے کوئی تدبیر کی ہو، مثلاً یہ کہ اس تالاب یا حوض کا منہ بند کر دیا تا کہ مچھلیاں باہر نہ نکل سکیں تو اس صورت میں مالکان تالاب وحوض کو ان مچھلیوں پر مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے، پھر اگر وہ تالاب یا حوض اتنا چھوٹا ہو کہ بغیر حیلۂ اصطیاد مچھلی پکڑنا ممکن ہو تو مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے بیع درست ہوگی، اور اگر بغیر حیلہ اصطیاد مچھلی پکڑنا ممکن نہ ہو تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع فاسد ہوگی۔ مگر خریدار اب مچھلی شکار کر کے اپنے قبضہ میں کرے گا تو اس کا مالک ہو جائے گا، یہ صورت بیع کی ہوئی۔

یہ بھی جائز ہوگا کہ حوض یا تالاب کی زمین مخصوص مدت، متعینہ اجرت اور متعینہ منفعت کے لیے اجارہ پر دے دی جائے، اجارہ پر دینے کی صورت میں کرایہ دار کو اس حوض یا تالاب سے مچھلی کے شکار یا مکھانے وغیر کی کاشت کے ذریعہ انتفاع کا حق حاصل ہوگا، اس کے لیے بہتر صورت یہ ہوگی کہ مالکان حضرات حوض یا تالاب کو اجارہ پر دیتے وقت کرایہ دار کو ہر قسم کے انتفاع کی اجازت دے دیں، مدت اجارہ میں صرف کرایہ دار کو اس تالاب یا حوض سے انتفاع کا حق حاصل ہوگا کسی دوسرے شخص کے لیے اس سے منفعت حاصل کرنا یا اس کی مچھلی پکڑنا درست نہیں ہوگا۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کا مسئلہ

مولانا اختر امام عادل

تالاب یا نہر کی ٹھیکہ داری یا اس میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کی مختلف شکلیں ہیں:

۱- ایک شکل یہ ہے کہ نہر یا تالاب پانی سمیت فروخت کردیا جائے، یا معینہ مدت کے لیے کرایہ پر دے دیا جائے اس میں کسی خاص مقصد کی تعیین نہ کی جائے، تو یہ شکل فقہاء کے نزدیک جائز ہے، خواہ وہ نجی ملکیت کا ہو یا عوامی یا سرکاری ہو، اکثر کتب فقہ میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

''جاز إجارة القناة والنهر مع الماء، به يفتى لعموم البلوى'' (درمختار علی ردالمحتار ۵/ ۴۳ کذا فی العالمگیری ۵/ ۴۴۱، فتاویٰ القرویہ ۲/ ۲۹۹ وغیرہا)

۲- دوسری شکل یہ ہے کہ عمومی طور پر نہر یا تالاب فروخت نہ کیا جائے یا ٹھیکہ پر نہ دیا جائے، بلکہ اس کے پانی یا اس کے اندر موجود مچھلیوں پر معاملہ کیا جائے وہ اس طرح کہ پہلے سے پائی جانے والی مچھلیوں کے شکار کے لیے یا سینچائی کے لیے نہر اجرت پر لی جائے، یہ صورت فقہاء کے نزدیک جائز نہیں، یہ مسئلہ بھی کتب فقہ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

''ولا تجوز إجارته (الماء)، لأن الإجارة تمليك المنفعة لا تمليك العين، ولو استاجر حوضًا أو بئرًا يسقى منه ماء لا يجوز، لأن هذا استيجار الماء، وكذا لو استاجر النهر ليصيد منه السمك، لأن هذا استيجار السمك'' (بدائع الصنائع ۶/ ۱۸۹، وکذا فی الشامی ۵/ ۴۶، والطحطاوی علی الدرالمختار ۳/ ۶۷)۔

۳- تیسری شکل یہ ہے کہ تالاب کے اندر کی مچھلیاں فروخت کی جائیں۔

مبیع کی شرائط:

مسئلہ شرعی یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع کے جواز کے لیے اس کا مال متقوم ہونا، بائع کی مکمل ملکیت میں ہونا اور مقدور التسلیم ہونا ضروری ہے (ردالمحتار ۴/ ۶، بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۶)۔

حدیث پاک میں بھی اس سلسلہ کی بنیادی ہدایت ملتی ہیں۔

۱- حضرت حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں:

''نهى رسول الله ﷺ أن أبيع ما ليس عندى كالآبق أو ما لم يقبض، وقال الترمذي: هذا حديث حسن، وأيضا نهى النبي ﷺ أن أبيع ما ليس عند الإنسان'' (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳/ ۲۲۴ وبعضہ فی المشکوۃ ۳۴۸)۔

(مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز بیچنے سے منع کیا ہے جو میرے پاس نہ ہو، جیسے بھاگا ہوا غلام یا جو چیز قبضے میں نہ ہو)۔

۲- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکہ کی بیع اور کنکر پتھر والی اٹکل کی بیع سے منع فرمایا ہے۔

''عن أبي هريرة قال نهى رسول الله ﷺ عن بيع الغرر وبيع الحصاة'' (ترمذی ۱۱۳)۔

خاص مچھلی کے بارے میں روایت ملتی ہیں۔

۳- حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا تشتروا السمك فى الماء، فإنه غرر'' أخرجه أحمد والطبراني والبيهقي والدار قطني (الفتح الربانی ۱۵/ ۳۵)۔

(پانی کی مچھلیوں کو نہ خریدو، اس لیے کہ اس میں دھوکہ ہے)۔

۴- حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف بھی اسی مفہوم کا فتوی منسوب کیا گیا ہے (مبسوط للامام محمد ۵/ ۹۳ وکذک فی المبسوط للسرخسی ۳/ ۱۱-۱۲)۔

تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت کی مختلف شکلیں:

ان روایات کی روشنی میں اتنی بات طے ہے کہ مچھلیوں کی بیع اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ انسان کی ملکیت میں مکمل طور پر، یعنی قبضہ کے ساتھ موجود نہ ہو، دوسرے یہ کہ مشتری کو حوالہ کرنا بہ آسانی ممکن ہو، تیسرے یہ کہ کوئی ایسی جہالت نہ ہو جو باعث نزاع ہو، تالاب کے اندر کی مچھلیاں شکار سے قبل انسان کی ملکیت میں ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہوتی ہیں تو کب؟ اور کیا وہ مقدور التسلیم ہوتی ہیں؟ اس لحاظ سے مسئلہ کی کئی ذیلی شکلیں بن جاتی ہیں:

۱- بائع نے شکار کر کے مچھلیوں کو اپنے برتن میں محفوظ کر لیا ہو اس صورت میں ان مچھلیوں پر ملکیت بھی کامل ہے اور مقدور التسلیم بھی ہے، اس لیے ان کی بیع درست ہے۔

۲- مچھلیاں اس کے ذاتی تالاب میں ہیں، اور تالاب ایسا ہے جو مچھلیوں کی پرداخت ہی کے لیے بنایا گیا ہے تو اس صورت میں بھی مچھلیاں مالکِ تالاب کی ملکیت میں ہیں، خواہ اس نے مچھلیاں پالی ہوں یا باہر کہیں سے آگئی ہوں۔

۳- تالاب تو کھلا ہوا تھا، لیکن سیلاب یا بارش کی وجہ سے مچھلیوں کے اس میں آنے کا احساس ہوا تو اس نے ہر چہار طرف سے اس کو بند کر دیا تا کہ مچھلیاں بھاگ نہ سکیں، اس شکل میں بھی مچھلیوں کا مالک تالاب والا ہوگا۔

۴- اور اسی ذیل میں وہ شکل بھی آئے گی کہ کوئی کھلی نہر یا تالاب جو کسی کی ملکیت میں نہیں ہے اور نہ سرکار نے کوئی بندوبست کیا ہے، ایسے تالاب میں کوئی شخص اپنا گڈھا کھودے اور اس میں آئی ہوئی مچھلیوں کو محفوظ کر دے تو اس شکل میں بھی مچھلیاں اس کی ملکیت میں آجائیں گی۔

۵- لیکن جس صورت میں تالاب کھلا ہوا ہو محفوظ نہ ہو اور مچھلیاں باہر سے آتی جاتی رہتی ہوں یہ مچھلیں تالاب والے کی ملکیت نہیں ہیں (فتح القدیر ۶/ ۴۹، شامی ۴/ ۱۱۹، کنز الدقائق/ ۲۳۹، عالمگیری ۳/ ۱۱۲، بدائع ۵/ ۱۳۸)۔

آخری شکلیں جس میں کہ مچھلیوں کا انسان مالک ہی نہیں ہوتا بیع کرنا صحیح نہیں، اگر کرے گا تو بیع باطل ہوگی، اس لیے کہ جو مملوک نہیں وہ معدوم ہے اور معدوم کی بیع باطل ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر مچھلیوں کی بیع روپے پیسے اور دراہم و دینار کے بجائے عروض کے عوض کی جائے تو یہ بیع باطل نہیں، بلکہ بیع فاسد ہوگی، اس لیے کہ خود سامان میں بھی مبیع بننے کی صلاحیت ہے، اس بنا پر یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ مبیع مچھلیاں نہیں خود عروض ہیں اور ثمن مسکوت عنہ ہے، اس طرح فساد محل بیع کے بجائے وصف بیع میں پیدا ہوتا ہے جس سے بیع باطل نہیں ہوگی، بلکہ بیع فاسد ہوگی، تفصیل کے لیے دیکھئے: (عنایہ علی الفتح ۶/ ۴۹، کذا فی الشامی ۱/ ۱۱۹)۔

اس کے علاوہ درمیان کی تین شکلیں جن میں مچھلیوں پر ملکیت حاصل ہوتی ہے، اگر مچھلیوں کو پکڑنا بآسانی ممکن ہو تو بیع جائز ہوگی، اور اگر مچھلیوں کو پکڑنا آسانی ممکن نہ ہو بلکہ اس کے لیے حیلہ وتدبیر کرنا پڑے تو یہ بیع فاسد ہوگی، کیوں کہ مچھلیاں مجہول غیر مقدور التسلیم ہیں (جامع صغیر/ ۲۶۹، شامی ۴/ ۱۱۹، عرف الشذی ۱/ ۲۳۴)۔

اس تفصیل کی روشنی میں اصولی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس تالاب یا نہر میں مچھلیاں محفوظ یا مقدور التسلیم نہ ہوں ان مچھلیوں کی بیع شکار سے قبل درست نہیں، رہا یہ کہ آج کے دور میں اس کا بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے اور یہ ایک طرح کی ضرورت بن گئی ہے تو صحیح ہے کہ شریعت اسلامیہ میں عرف کی بڑی اہمیت ہے اور: ''الثابت بالعرف کالثابت بالنص'' قرار دیا گیا ہے، مگر یہ اسی وقت جبکہ عرف یا ضرورت کسی نص کے خلاف نہ ہو، یعنی عرف یا ضرورت پر عمل کرنے سے کسی نص کا بالکلیہ ترک نہ لازم آتا ہو، عرف عام سے کسی نص کی تخصیص تو کی جاسکتی ہے، مگر کسی نص کا مکمل ترک درست نہیں، رہا عرف خاص تو وہ نص کی مخالفت نہ ہونے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ خاص علاقہ میں مؤثر ہوسکتا ہے، عام طور پر نہیں (نشر العرف ۲/ ۱۱۶، رسم المفتی/ ۳۸، الاشباہ ۱/ ۲۷۱)۔

یہاں زیر بحث مسئلہ میں اگر عرف کا خیال کیا جائے تو اوپر مذکورہ نصوص کا ترک لازم آتا ہے، اس لیے خیال یہ ہوتا ہے کہ عرف اس مسئلہ میں مؤثر نہیں ہے، پھر یہ مسئلہ کوئی آج کا نیا نہیں ہے اور نہ اس کا عموم وشیوع نیا ہے، بلکہ یہ قدیم سے چلا آرہا ہے، جیسا کہ احادیث پاک، آثار صحابہ اور شامی اور دیگر فقہاء کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے (شامی ۴/ ۱۱۹)۔

اس کے باوجود سلف سے لے کر خلف تک کے فقہاء نے شکار سے قبل تالاب میں آنے جانے والی مچھلیوں کے بیع کا جواز کا فتوی دیا، ہمارے اکابر دیوبند میں حضرت تھانوی اور مولانا عبدالحیؒ کے یہاں یہ مسئلہ آیا تو انہوں نے بھی انہیں فقہاء کے تقلید کی (امداد الفتاوی ۳/ ۴۸، فتاوی عبدالحی/ ۲۹۵)۔

ناجائز طور پر حاصل کردہ مچھلیوں کو خریدنا:

یہاں اہم ترین مسئلہ بازاروں سے ایسی مچھلیوں کی خرید کا ہے، ظاہر ہے کہ جن شکلوں میں تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت جائز ہے (اور یہ اس وقت جبکہ مچھلیاں مکمل مملوک اور مقدور التسلیم ہوں) تو اس طریق پر حاصل کردہ مچھلیوں کے خریدنے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ وہ مچھلیاں جو ناجائز طور پر حاصل ہوتی ہیں ان کو بازاروں یا ٹھیکہ دار سے باوجود پوری صورت حال جانتے ہوئے خریدنا کیسا ہے؟ مذکورہ مباحث میں ناجائز طور پر حاصل کردہ مچھلیوں کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں:

۱- بعض صورتوں میں تالاب کی مچھلیوں کا معاملہ بیع باطل کے ضمن میں آتا ہے اور یہ اس وقت جبکہ مچھلیاں مکمل ملکیت میں نہ ہوں اور ان کی خرید وفروخت دوہم درہم ودینار یا کرنسی کے بدلے ہوئی ہو، اس طور پر حاصل کردہ مچھلیوں کو خریدنا جائز نہیں، پہلا معاملہ ہی باطل ہے تو اس پر جس معاملہ کی بنیاد رکھی جائے گی وہ بھی باطل ہوگا، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ بیع باطل (جس کے رکن یا محل میں خلل ہو) ملکیت یا کسی قسم کے حق تصرف کا فائدہ نہیں دیتا، خواہ صاحبِ معاملہ نے مبیع پر قبضہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، اور جب مال خود مشتری اول کی ملکیت میں نہیں آیا تو مشتری ثانی مال غیر مملوک پر اس سے معاملہ کیسے کر سکتا ہے؟ (بدائع الصنائع ۵/ ۱۲۶، ہدایہ ۳/ ۴۹)۔

۲- البتہ بعض صورتوں میں تالاب کی مچھلیوں کا معاملہ بیع باطل کے بجائے بیع فاسد کے ضمن میں آتا ہے اور یہ اس وقت جبکہ مچھلیاں مملوک نہ ہوں اور عروض کے عوض حاصل کی گئی ہوں یا مملوک ہوں مگر مقدور التسلیم نہ ہوں۔

بیع فاسد کے طور پر جو معاملہ ہوتا ہے اس کو فسخ کرنا ضروری ہے، لیکن اگر مشتری فسخ کرنے اور حاصل کردہ سامان واپس کرنے کے بجائے اس میں کوئی تصرف کردے، مثلاً اس کو کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کردے یا کسی کو ہبہ کے طور پر دے دے وغیرہ، تو تصرف نافذ ہوجائے گا اور بائع اول کا جو حق استرداد اس مبیع کے ساتھ وابستہ تھا وہ ختم ہوجائے گا، اس لیے کہ بیع فاسد باوجود فساد عقد کے مفید ملک ہے، اس بناء پر مشتری اول کا تصرف فی نفسہ درست ہے اور تصرف کے بعد اس مال کے ساتھ چوں کہ حق عبد وابستہ ہوجاتا ہے اور بنا پر حق استرداد جو شریعت کی جانب سے بائع کو ملتا ہے وہ ختم ہوجائے گا، اس لیے کہ بندہ کمزور ہے اور کمزور کے حق کی رعایت مقدم ہوتی ہے (کنز الدقائق/ ۲۲۳، فتاوی بزازیہ ۱/ ۴۰۰، فتاوی خانیہ ۳/ ۱۴۲، ۴/ ۱۴۵)۔

البتہ چند تصرفات جائز نہیں، مثلاً خود کھانا یا خود پہننا، باندی ہے تو خود وطی کرنا، بائع کے ہاتھ فروخت کرنا یا باندی ہو تو شادی کرانا، اسی طرح اس صورت میں اس کے پڑوسی کو حق شفعہ بھی حاصل نہیں ہوتا (فتاوی بزازیہ ۱/ ۳۹۹، درمختار ۴/ ۱۳۹)۔

یہ تو مشتری اول کے لیے مسئلہ ہے، رہی یہ بات کہ کسی مسلمان کو جان بوجھ کر بیع فاسد کے طور پر حاصل کردہ سامان کو خریدنے کا کیا حکم ہے؟ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جان بوجھ کر ایسا مال خریدنا مکروہ تحریمی ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان خرید لے تو وہ مال اس کی ملک میں آجائے گا اور شرعاً وہ ہر طرح کے تصرف کا مجاز ہوگا اس پر لازم نہیں کہ وہ اس معاملہ کو فسخ کرے، البتہ خریدنے سے پہلے احتیاط کرنا ضروری ہے (منحۃ الخالق علی بحر الرائق ۶/ ۹۵، ردالمحتار ۴/ ۱۴۵-۱۴۶)۔

اس تفصیل کے مطابق بیع فاسد کے طور پر حاصل کردہ مچھلیوں کو جان بوجھ کر خریدنا باعث گناہ ہے، لیکن اگر کوئی خرید لے تو ان کا استعمال حلال وطیب ہوگا۔

خلاصۂ جوابات:

۱، ۳، ۴: سرکاری یا غیر سرکاری ندی نالے کی مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر ان مچھلیوں کے نکالے ہوئے شرع کے عام اور معروف اصولوں کے مطابق مبیع کے غیر مملوک یا مجہول یا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے اور عرف اس باب میں مؤثر نہیں ہے، اس لیے کہ یہ مسئلہ منصوص ہے اور عرف پر عمل کرنے سے نص کا بالکلیہ ترک لازم آتا ہے۔

۲- جس صورت میں مچھلیاں ملکیت میں نہیں آتیں اور ان کی بیع کردی جائے تو ایسی بیع باطل ہے اور اگر معلوم ہو کہ مچھلیاں بیع باطل کے طور پر حاصل کی گئی ہیں تو ان کو خریدنا بالکل جائز نہیں اور اگر کوئی خرید لے تو بھی ان کا استعمال جائز نہ ہوگا، البتہ جن صورتوں میں مجہول یا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے معاملہ فاسد ہوجاتا ہے، اس طور پر حاصل کردہ مچھلیوں کو جان بوجھ کر خریدنا مکروہ تحریمی ہے، لیکن اگر کوئی خرید لے تو ان کا مالک ہوجائے گا اور ان کا استعمال اس کے لیے جائز ہوگا۔

☆☆☆

مچھلیوں کے مالک ہونے کی صورتیں اور خرید وفروخت کے احکام

مولانا وحید الدین قاسمی [1]

مچھلیوں کے مملوک ہونے کی چار صورتیں ہیں:

۱-اخذ

۲-اعداد

۳-انسداد

۴-پکڑ کر یا خرید کر ڈالنا (ارسال بعد الأخذ أو الاشتراء)

تالاب میں چار صورتیں متعارف ہیں اور ندی نالوں وغیرہ میں عموماً پہلی صورت پائی جاتی ہے، اگر کسی جگہ تیسری صورت، یعنی انسداد اور احراز متحقق ہوتو اس سے بھی مچھلیاں مملوک ہوجائیں گی۔

مچھلیوں کے مملوک ہونے کے لیے استیلاء حقیقی یا استیلاء حکمی کا ہونا کافی ہے، لہذا:

۱- اس بارے میں عرض ہے کہ ندی، نالے اور سرکاری تالاب کی مچھلیوں میں یہ دیکھا جائے گا کہ آیا صرف یہ مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہی ہیں یا غیر مملوک بھی ہیں، اگر غیر مملوک بھی ہوں تو ان کی بیع باطل ہوگی، یعنی سرے سے بیع منعقد ہی نہیں ہوگی، اور اگر وہ مملوک تو ہوں، لیکن غیر مقدور التسلیم ہوں تو اس بیع کے بطلان اور فساد میں احناف کے یہاں اختلاف ہے جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

لیکن ندی، نالوں کی مچھلیوں کی بیع کا جو طریقہ متعارف ہے اس صورت میں مچھلیوں کے سرکار کی مملوک ہونے کی کوئی شکل نہیں ہوتی ہے، اس لیے کہ نہ تو سرکار کی طرف سے ان میں مچھلیاں پکڑ کر ڈالی جاتی ہیں اور نہ ندی، نالوں کا اعداد مچھلیوں کے لیے من جانب سرکار ہوتا ہے، اسی طرح احراز اور انسداد کا بھی سرکار کی طرف سے کوئی انتظام نہیں پایا جاتا ہے، لہذا ندی، نالوں کی مچھلیوں کی بیع متعارف طریقہ پر یقیناً باطل ہوگی۔

ہاں سرکاری تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت کا جو طریقہ متعارف ہے عموماً تالاب کی مچھلیاں سرکار کی ملک ہوتی ہیں، اس لیے کہ اب عموماً سرکاری تالابوں میں مچھلیوں کی پرورش یا کم از کم ان کے آنے کے بعد احراز اور انسداد کا انتظام کیا جاتا ہے، لہذا مچھلیاں سرکار کی مملوک ہوجائیں گی، اس صورت میں ان کی بیع غیر مملوک ہونے کی وجہ سے باطل نہ ہوگی، اس لیے کہ مملوک ہیں، ہاں مقدور التسلیم اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی بحث یہاں بھی ہوگی، الا یہ کہ اگر کوئی سرکاری تالاب ایسا ہے جس میں سرکار کی طرف سے مچھلیوں کے آنے کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی ہے یا آنے کے بعد ان کے احراز اور انسداد کا کوئی نظم نہیں کیا گیا ہے تو پھر مچھلیاں سرکار کی مملوک نہیں ہوں گی اور ان کی بیع باطل ہوگی، اس لیے کہ شرائط انعقاد میں سے ایک شرط مبیع کا مملوک ہونا بھی ہے، لہذا جب یہ شرط منتفی ہے تو انعقاد عقد بھی منتفی ہوگا۔

''لا يجوز بيع السمك قبل أن يصطاد لعدم الملك'' میں صاحب ہدایہ نے ''لعدم الملك'' سے عدم جواز کے بطلان کے معنی میں ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس صورت میں، جبکہ مچھلیاں غیر مملوک ہوں اور مباح ہوں تو ان کی بیع کے بطلان اور عدم انعقاد پر احناف اور دوسرے ائمہ سب کا اتفاق ہے گویا معقود علیہ کا مملوک ہونا انعقاد عقد کے لیے بالاتفاق شرط ہے، لہذا ندی، نالے اور ان سرکاری تالابوں کی مچھلیاں جو سرکار کی مملوک نہ ہوں، یعنی اسباب ملک میں سے کوئی سبب نہ پایا گیا ہو، ان کی بیع غیر منعقد اور باطل ہوگی۔

۲- مچھلیوں کے غیر مملوک ہونے کی صورت میں گرچہ بیع باطل اور غیر منعقد ہوگی اور بیع باطل میں قبضہ کے بعد بھی مشتری کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور نہ مبیع میں مشتری کوئی تصرف کرسکتا ہے، لیکن صورت مسئولہ میں جب ٹھیکیدار یا خریدار ندی، نالے اور ان تالابوں سے جن کی مچھلیاں مملوک نہیں ہیں مباح ہیں

---

[1] دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر، گجرات۔

ان کو پکڑ کر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرے یا کوئی مسلمان پوری صورت حال جانتے ہوئے خریدے تو جائز ہے، اس لیے کہ وہ مچھلیاں مباح ہیں، ہر شخص کے لیے ان سے انتفاع جائز ہے، جو چاہے شکار کر کے ان کو پکڑ سکتا ہے، اور پکڑنے کے بعد اس کی مملوک ہو جائیں گی۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''الصيد لمن أخذه أو كما قال'' (یعنی شکار پکڑنے والے کا ہے) (ہدایہ ۴/)۔

یعنی استیلاء علی المباح جس کی ایک صورت اصطیاد (شکار کرنا) بھی ہے حصولِ ملک کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، جیسا کہ ''الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۶۸'' میں مذکور ہے۔

لہذا اس طرح کے ندی نالوں اور تالابوں سے مچھلیاں پکڑ کر لانے والوں کا ان مچھلیوں کو مارکیٹ میں فروخت کرنا اور دوسروں کا ان سے خریدنا بلاکسی کراہت کے جائز ہے۔

''صاحب تنویر الابصار'' نے شکار کو مستقل تجارت اور پیشہ بنا لینے کو ناجائز اور مکروہ لکھا ہے لیکن صاحب ''درمختار'' شارح ''تنویر الابصار'' نے اس کے ذیل میں لکھا ہے کہ مصنف نے خود یہ کہا ہے کہ میں نے یہ اضافہ صاحب ''اشباہ'' وغیرہ کی اتباع میں کیا ہے، ورنہ میرے نزدیک تحقیق اس کو مستقل تجارت اور پیشہ بنا لینے کی اباحت ہی کی ہے، اس لیے کہ یہ بھی کسب کا ایک طریقہ اور اس کی ایک قسم ہے اور کسب کی تمام مباح قسمیں اباحت میں صحیح مذہب کے اعتبار سے برابر ہیں۔

تاتارخانیہ میں ہے امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ جب شکار کو لہو ولعب کے لیے پکڑا تو اس میں کوئی خیر نہیں ہے اور میں اس کو مکروہ سمجھتا ہوں اور اگر شکار کو ضرورۃً پکڑا، بیچنے یا سالف یا کسی دوسری ضرورت کے لیے تو کوئی حرج نہیں ہے (ردالمحتار ۵/ ۲۹۷)۔

لہذا ندی، نالوں اور ایسے تالابوں سے جن کی مچھلیاں مملوک نہ ہوں مباح ہوں تو ان کو پکڑنا اور بیچنا اور دوسروں کو ان سے خریدنا، نیز اس کو پیشہ بنا لینا بھی بلا کراہت جائز ہے۔

پیشہ کے طور پر اس کو اختیار کرنے کی بات تو ضمناً آ گئی اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ غیر مملوک اور مباح مچھلیوں میں یہ باطل عقد ہوا تو اس کے بعد جب مشتری مچھلیوں کو ندی، نالوں اور تالاب سے پکڑ لے گا تو اس کی ملکیت ان پر ثابت ہوگی یا نہیں؟ پھر اس کے لیے ان مچھلیوں کو فروخت کرنا اور دوسروں کا اس سے خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ یعنی عقدِ باطل کی وجہ سے ان مباح مچھلیوں کی اباحت میں کوئی فرق آئے گا یا نہیں تو جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ اس عقدِ باطل کی وجہ سے مشتری کے حق میں ان مچھلیوں کی اباحت میں کوئی فرق نہیں آیا، جیسے پہلے مباح تھیں اس عقد کے بعد بھی وہ مباح ہی ہیں پکڑنے کے بعد پکڑنے والے کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور اس کے لیے اس میں تصرف کرنا جائز ہوگا۔

ہاں اس عقدِ باطل کی وجہ سے سرکار نے مباح چیز کے عوض میں جو معاوضہ لیا ہے وہ اس کے لیے درست نہیں، مباح چیز پر عوض لینا حرام ہے، لہذا سرکار کو یہ شرعاً حق نہیں تھا کہ وہ اس کا معاوضہ لے، لیکن وہ لے رہی ہے تو یہ اس کا ظلم ہے: ''يتركهم وما يدينون عليه''۔

۳- تیسرا سوال مملوک غیر مقدور التسلیم مچھلیوں کی بیع سے متعلق ہے، اس لیے کہ سوال کی عبارت سے یہی ظاہر ہو رہا ہے وہ شخصی تالاب اتنا بڑا ہوتا ہے کہ بلا اصطیاد کے مچھلیاں پکڑی نہیں جاسکتیں، اگر اتنا چھوٹا تالاب ہے جس میں مچھلیاں بلاحیلہ کے آسانی سے پکڑی جاسکتی ہوں تو ان کی بیع کے جواز میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔

شرائط انعقاد بیع کی تفصیل میں یہ بات مذکور ہے کہ انعقاد عقد کے لیے مبیع کا موجود ہونا، مال ہونا، مملوک ہونا، جہاں شرط ہے اسی طرح عقد کے وقت مبیع کے مقدور التسلیم ہونے کی بھی شرط ہے اگر عند العقد مبیع مقدور التسلیم نہیں ہے تو بیع منعقد نہیں ہوگی، دیکھئے: (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۷)۔

علامہ کاسانیؒ کی تشریح کے مطابق جب مبیع عقد کے وقت مقدور التسلیم نہ ہو گرچہ مملوک ہو تو ظاہر الروایات کے اعتبار سے بیع منعقد ہی نہیں ہوگی اور امام کرخیؒ کے نزدیک منعقد ہو جائے گی، لیکن نافذ نہیں ہوگی گویا ''ظاہر الروایات'' میں انعقاد عقد کے لیے مبیع کا عند العقد مقدور التسلیم ہونا ضروری ہے اور امام کرخیؒ کے نزدیک انعقاد عقد کے لیے مقدور التسلیم ہونا عقد کے وقت شرط نہیں ہے۔

صاحب ''البحر الرائق'' اور علامہ شامیؒ نے ''بيع الطير في الهوا'' کے ذیل میں امام کرخیؒ کے ساتھ امام طحاویؒ کو بھی ذکر کیا ہے، یعنی کے وقت مملوک تو ہو، لیکن غیر مقدور التسلیم بعد العقد سے بیع صحت اور جواز کی طرف نہیں لوٹے گی اور امام کرخیؒ وطحاویؒ کے نزدیک تسلیم کے بعد صحیح ہو جائے گی (شامی ۴/ ۱۰۷، البحر الرائق/ ۷۳)۔

صاحب ''فتح القدیر'' علامہ ابن ہمامؒ نے ''بیع آبق'' کے ذیل میں اس اختلاف کو ذکر کیا ہے، عبارت یہ ہے:

”اگر آبق واپس آ گیا اور حال یہ کہ مالک نے اس کو ایسے شخص سے بیچ دیا تھا جس کے پاس وہ نہیں تھا تو کیا اب بعد البیع تسلیم سے بیع جائز ہو جائے گی؟ تو ظاہر الروایۃ کے مطابق صحیح نہیں ہوگی، اور یہی امام محمدؒ سے مروی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیع باطل ہے اور یہی مشائخ بلخ اور ثلجی کے نزدیک مختار ہے، اس لیے کہ شرط کا وجود عند العقد ہونا ضروری ہے اور ایک دوسری روایت میں امام محمدؒ کی ہے جو امام ابوحنیفہ سے روایت ہے کہ آبق میں مالیت اور ملک کے قیام کی وجہ سے بیع جائز ہو جائے گی۔ امام کرخیؒ اور مشائخ کی جماعت نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اس قول کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہو (باطل نہ ہو)“ (فتح القدیر ۵/۲۰۰)۔

پھر علامہ ابن ہمامؒ نے اس اختلافِ رایت یا اختلاف مشائخ کی بنیاد اور منشاء کو ذکر کیا ہے:

”پس حق یہ ہے کہ اس مسئلہ میں روایت اور مشائخ کا اختلاف اس اختلاف پر مبنی ہے کہ یہ باطل ہے یا فاسد ہے، کیوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ بیع فاسد میں ارتفاع مفسد سے بیع صحیح ہو جاتی ہے، اس لیے کہ فساد کے ساتھ بھی بیع کا قیام (شرعاً) ہوتا ہے، اور ارتفاع مبطل سے بیع صحیح نہیں ہوتی، اس لیے کہ صفت بطلان کے ساتھ بیع کا شرعاً وجود ہی نہیں ہوتا، بلکہ بیع معدوم ہوتی ہے“ (ایضا)۔

ان تمام عبارات کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب مبیع مملوک تو ہو، لیکن غیر مقدور التسلیم ہو تو اس کے بطلان اور فساد میں مشائخ کا اختلاف ہے اور روایت بھی مختلف ہے۔

لہذا مچھلیاں بھی جب مملوک ہوں، لیکن غیر مقدور التسلیم ہوں تو ان کی بیع کے باطل یا فاسد ہونے میں بھی اختلاف ہوگا، مشائخ بلخ اور ثلجی وغیرہ کے نزدیک یہ بیع باطل ہوگی اور اما کرخیؒ اور طحاویؒ اور مشائخ احناف رحمہم اللہ کی ایک جماعت کے نزیک یہ بیع فاسد ہوگی۔

جیسا کہ صاحب ”بحر“ نے لکھا ہے:

”والحاصل أن عدم جوازه قبل أخذه لعدم ملكه، فإن أخذه ثم ألقاه في حظيرة كبيرة فعدم جوازه لكونه غير مقدور التسليم، فإن سلمه بعد ذلك فكالروايتين في بيع الآبق إذا سلمه“ (البحر الرائق ۶/۷۳)۔

(حاصل یہ کہ شکار کو پکڑنے سے پہلے اس کی بیع کا عدم جواز اس کے غیر مملوک ہونے کی وجہ سے ہے، لیکن اگر شکار کو پکڑا پھر اس کو ایک حوض برے حوض میں ڈال دیا تو پھر سے بیع کا عدم جواز اس کے غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ہے، پھر اگر اس کو اس عقد کے بعد حوالہ کر دیا تو اس صورت میں بھی وہی دو روایتیں ہوں گی جو بیع آبق میں ہیں جب کہ بیع بعد العقد اس غلام کو مشتری کے حوالہ کر دے، اب دونوں لوگوں اور روایتوں سے کون سا قول اور کون سی روایت راجح ہے)۔

صاحب ”فتح القدیر“ علامہ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں:

”والوجه عندي أن عدم القدرة على التسليم مفسد لا مبطل“ (۵/۲۰۰)۔

(میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ غیر مقدور التسلیم ہونا مفسد عقد ہے عقد کو باطل کرنے والا نہیں)۔

جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے:

لہذا جب اس مسئلہ میں اختلاف ہے روایتیں مختلف ہیں مشائخ کے دو قول ہیں صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام نے اس قول کو راجح قرار دیا ہے کہ غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے بیع باطل نہیں ہوگی بلکہ فاسد ہی ہوگی۔ حضرت تھانویؒ اور صاحب ”اعلاء السنن“ کا رجحان بھی اسی طرف ہے اور احناف کے یہاں معاملات میں توسع بھی ہے، لہذا اس قول کے مطابق فتوی دیا جاسکتا ہے۔

یعنی مچھلیاں جب تالاب میں موجود ہوں اور مملوک بھی ہوں تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ان کی بیع فاسد ہوگی۔ باطل نہیں ہوگی۔

۴- اس سوال کا جواب ماسبق سے واضح ہو گیا، اس لیے کہ حوض یا تالاب میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے آ جائیں اگر مالک تالاب یا کسی شخص نے ان کے آنے کی کوئی تدبیر نہیں کی ہے یا آنے کے بعد ان کے احراز اور انسداد کا کوئی نظم نہیں کیا گیا ہے، نیز وہ تالاب مچھلیوں کی پرورش کے لیے تیار کیے گئے ہیں تو وہ مچھلیاں غیر مملوک اور مباح ہیں ان کی بیع کا وہی حکم ہوگا جو سوال نمبر (۱) کے جواب میں تحریر کیا گیا۔

اور اگر ان کے آنے کی کوئی تدبیر کی گئی ہے یا آنے کے بعد ان کے احراز اور انسداد کا سامان کیا گیا ہے یا تالاب اسی لیے بنائے گئے ہیں تو ان کی مچھلیاں تدبیر کرنے والے کی مملوک ہوں گی، ان کی بیع کا حکم وہی ہوگا جو سوال نمبر (۳) کے جواب میں ذکر کیا گیا، یعنی غیر مملوک ہونے کی صورت میں ان کی بیع باطل

ہوگی، لیکن شکار کے بعد مشتری کے لیے ان مچھلیوں کو بیچنا اور دوسروں کا باوجود صورت حال کو جانتے ہوئے خریدنا جائز ہوگا، اس لیے کہ وہ مچھلیاں مباح تھیں، لہذا پکڑنے کے بعد اس کی مملوک ہوجائیں گی اور اس میں اس کے لیے تصرف کرنا جائز ہوگا۔ ہاں بائع کے لیے ثمن کو استعمال کرنا جائز نہیں، بلکہ واپس کرنا ضروری ہے۔

اور مملوک ہونے کی صورت میں ان کی بیع فاسد ہوگی۔ بائع کی اجازت سے قبضہ کے بعد مچھلیاں مشتری کی ملک بن جائیں گی اور اس کے لیے ان کو فروخت کرنا جائز ہوگا اور دوسرے لوگ اس سے خرید بھی سکتے ہیں۔

خلاصۂ جوابات:

ندی، نالے، نہروں، تالابوں کی مچھلیاں جو کسی کی مملوک نہ ہوں وہ صید البحر ہیں۔ ہر ایک کے لیے ان کا پکڑنا شکار کرنا مباح ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ'' (سورۂ مائدہ:۹۶)۔
(تمہارے واسطے دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے فائدے کے لیے اور مسافروں کے لیے حلال کیا گیا)۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''الصيد لمن أخذ'' (ہدایہ /۴)۔ (شکار پکڑنے والے کا ہے)۔

لہذا یہ مچھلیاں جب تک مملوک نہ ہوجائیں، خواہ حقیقی استیلاء کے ذریعہ، یعنی شکار کرکے یا حکمی استیلاء سے، یعنی کسی ایسے فعل کے کرنے سے جو مچھلیوں کو فرار سے عاجز کردے اس وقت تک ان کی بیع غیر منعقد اور باطل ہوگی، یعنی شرعاً بیع کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جائے گا، لہذا اس پر بیع کے نتائج ثمرات اور احکامات مرتب نہیں ہوں گے، اس لیے کہ انعقاد عقد کے لیے مبیع کا مملوک ہونا بالاتفاق شرط ہے۔

۲- اگرچہ مذکورہ صورت معاملہ شرعاً ناجائز ہے، لیکن پھر بھی ٹھیکہ دار کے لیے ندی، نالے، نہروں اور ان تالابوں سے مچھلیوں کے شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا جائز ہے اور ہر مسلمان کے لیے پوری صورتِ حال جانتے ہوئے ایسی مچھلیوں کو خریدنا جائز ہے۔

۳- ایسے تالاب یا حوض کی مچھلیاں جس میں مچھلیوں کے روکنے کا کوئی نظم کیا گیا ہو یا تالاب کو مچھلیوں کے پالنے ہی کے لیے بنایا گیا ہو یا اس میں مچھلیاں لاکر چھوڑی گئی ہوں تو وہ مچھلیاں ان وجوہاتِ مذکرہ کی وجہ سے مملوک ہوجائیں گی، لیکن شکار سے پہلے غیر مقدور التسلیم رہیں گی۔

ظاہر الروایہ کے اعتبار سے بیع کے انعقاد کے لیے مبیع کا مقدور التسلیم ہونا بھی شرط ہے اگر مبیع غیر مقدور التسلیم ہے تو بیع غیر منعقد اور باطل ہوگی (بدائع الصنائع ۵/۱۴۷)۔

لیکن امام کرخیؒ امام طحاویؒ اور مشائخ احناف کی ایک جماعت کے نزدیک اگر مبیع عند العقد مقدور التسلیم نہ ہو اور عقد کے بعد وہ مقدور التسلیم ہوجائے تب بھی بیع منعقد ہوجائے گی، لیکن فساد کے ساتھ (شامی ۴/۱۰۷، البحر الرائق/ ۷۳)۔

۴- اس سوال کا جواب سابقہ جوابوں سے معلوم ہوگیا کہ اگر بارش وغیرہ کے ذریعہ مچھلیوں کے آجانے کے بعد ان کے احراز اور انسداد وغیرہ کا کوئی نظم نہیں کیا گیا اور آنے کے لیے بھی کوئی تدبیر نہیں کی گئی اور نہ تالاب کو مچھلیوں کے پالنے کے لیے بنایا گیا تھا تو وہ مچھلیاں غیر مملوک ہوں گی، ہر شخص کے لیے ان کا پکڑنا مباح ہے، اس صورت میں ان کی بیع غیر مملوک اور مباح ہونے کی وجہ سے باطل ہوگی۔

اور اگر احراز وانسداد وغیرہ کی کوئی صورت پائی گئی ہے تو یہ مچھلیاں مملوک ہوجائیں گی، لیکن قبل الاخذ (تالاب کے بڑا ہونے کی صورت میں) غیر مقدور التسلیم ہیں، لہذا ان کی بیع فاسد ہوگی، بائع کی اجازت سے قبضہ کرلینے کے بعد مشتری کی ملکیت ثابت ہوجائے گی، لیکن چوں کہ یہ ملکیت خلاف شرع طریقہ سے حاصل ہوئی ہے اس لیے اس مشتری کے لیے اس مبیع کو خود استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، ہاں اگر وہ دوسرے سے فروخت کردے تو دوسرے کے لیے خریدنا اور استعمال کرنا درست ہے۔

☆☆☆

تالاب مچھلی کی بیع فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا اختر حسین قادری

باب اول:

۱- مچھلیوں کے شکار کے لیے ندی نالوں تالابوں اور نہروں کا ٹھیکہ لینا اس مسئلہ سے متعلق عام فقہ کی کتابوں میں عدم جواز کا حکم مذکور ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: رد المحتار ۵ / ۴۳، درمختار ۴ / ۱۱۸، فتاوی رضویہ ۸ / ۱۵۷)۔

فقیہ اعظم مولانا امجد اعظمی لکھتے ہیں تالابوں جھیلوں کا مچھلیوں کے شکار کے لیے ٹھیکہ دینا جیسا کہ ہندوستان کے بہت سے زمیندار کرتے ہیں ناجائز ہے (بہار شریعت ۱۱ / ۸۷)۔

علت عدم جواز کی وضاحت:

اصل کلی یہ ہے کہ جس طرح عقد بیع اعیان پر وارد ہوتا ہے، یونہی اجارہ ایک عقد ہے کہ خاص منافع پر وارد ہوتا ہے، جس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ ذات شئی بدستور ملک مالک پر برقرار رہتی ہے اور مستاجر اس سے نفع حاصل کرتا ہے، جو اجارہ خاص کسی عین وذات کے استھلاک پر وارد ہو محض باطل ہے، اسی لیے اگر باغ کو بغرض سکونت اجارہ میں لیا تو جائز اور پھل کھانے کے لیے ناجائز کہ سکونت منفعت اور ثمر عین، یونہی گائے کو لادنے کے لیے اجارہ پر لیا ہے تو جائز، دودھ پینے کے لیے ناجائز کہ لادنا منفعت اور دودھ عین ہے۔

اب تالاب وغیرہ کے ٹھیکہ میں دیکھئے کہ کس چیز کا ہے، پانی کا یا مچھلیوں کا، یا پانی کے نیچے کی زمین کا، اگر پانی کو مانیں تو یہ اجارہ استھلاک عین پر ہوا ہے کہ پانی کو ضائع کیے بغیر فائدہ نہیں مل سکتا، لہذا یہ ناجائز ہوا، یونہی اگر مچھلی کو کہیں تو یہاں بھی استھلاک عین ہے، یہ بھی ناجائز اور پانی کے نیچے کی زمین کا اجارہ بھی ناجائز کہ وہ فی الحال انتفاع کی صلاحیت نہیں رکھتی، اور صحت اجارہ کے لیے فی الحال معقود علیہ کا قابل انتفاع ہونا ضروری ہے امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں

''أن الإجارة تعتمد صلاحية الانتفاع بالنفع المقصود المعتاد في الحال لا في المآل'' (فتاوی رضویہ ۸ / ۱۵۸)۔

بالجملہ مچھلیوں کے شکار کے لیے تالاب وغیرہ کا ٹھیکہ بمطابق اصل مذہب وموافق قواعد فقہیہ ناجائز وممنوع ہے۔

۲- بازاروں، سرکاری درختوں، سرکاری زمین میں خودرو درختوں کی نیلامی کا بیان ان مسائل کے متعلق کچھ تحریر کرنے سے قبل یہ وضاحت خالی از فائدہ نہ ہوگی کہ ٹھیکہ اور نیلامی اجارہ کے اقسام سے ہیں، یا دونوں کا مفہوم جدا جدا ہے۔

فقیر کے نزدیک نیلامی کا مفہوم عام ہے جس کا تحقق کبھی ٹھیکہ کے ضمن میں ہوتا ہے، اور کبھی بیع کے ضمن میں ہوتا ہے، مگر ٹھیکہ تو وہ اجارہ ہی کی ایک قسم ہے، جیسا کہ ''بہار شریعت'' میں ہے ٹھیکہ اور کرایہ اور نوکری یہ سب اجارہ ہی کے اقسام ہیں (دیکھئے: بہار شریعت ۱۴ / ۱۰۱)۔

اس مختصر سی وضاحت کے بعد عرض ہے کہ بازار اور درخت کی نیلامی سے مراد اگر اس کی بیع وشراء ہے کہ گورنمنٹ انہیں فروخت کرتی ہے اور لوگ بولی لگا کر خریدتے ہیں تو یہ جائز ہے کہ "أحل الله البيع وحرم الربوا" (سورہ بقرہ) اور: "إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" کا یہی مفاد ہے، اس نیلامی کو ''بيع فيمن يزيد'' اور ''بيع مزايدة'' کہتے ہیں احادیث میں بھی اس کے جواز کا بیان ہے:

''عن أنس بن مالك أن رسول الله ﷺ باع جلسا بدرهم، فقال النبي ﷺ من يزيد على درهم فأعطاه رجل درهمين فباعها منه'' (ترمذی ۱ / ۲۳۱)۔

علامہ محشی فرماتے ہیں: ''بيع من يزيد اي نيلام'' (ترمذی ۱ / ۲۳۱)۔

''بخاری شریف'' میں ہے:

''أن رجلا اعتق غلاما له عن دبر فاحتاج فأخذه النبي صلى الله عليه وسلم فقال من يشتريه مني فاشتراه نعيم بن

عبدالله بكذا أو كذا فدفعه إليه''

(بخاری ۱/ ۲۸۷، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح الباری ۴/ ۲۸۲، نزہۃ القاری ۵/ ۲۱۹، نووی مع المسلم ۲/ ۳، بہار شریعت ۱۴/ ۱۴۶، ردالمحتار ۵/ ۴۳)۔

شکار کیے بغیر مچھلیوں کی بیع وشراء فقہاء کرام کی نظر میں:

کسی شئی کو فروخت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو چیز بیچی جارہی ہے وہ بائع کی مملوک ہو اور مقدور التسلیم ہو، یعنی اس کی حوالگی اور سپردگی ممکن ہو۔

اب جو مچھلیاں پانی سے شکار کیے بغیر فروخت کی جارہی ہیں اگر وہ مملوک اور مقدور التسلیم ہیں تو بلا ریب اس کی بیع پانی میں بھی جائز و درست ہے اور ان دونوں امر میں سے کوئی ایک مفقود ہو، یا دونوں مفقود ہوں تو بیع جائز نہ ہوگی (تفصیل کے لیے دیکھئے: ہدایہ ۳/ ۵۰)۔

بیع کے عدم جواز کی صورت میں مچھلیوں کا حکم:

کسی شئی کی بیع کا فساد و عدم جواز اگر اس مبیع کے مجہول، یا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ہو تو اس بیع کے ناجائز ہونے پر تمام ائمہ کرام کا اتفاق ہے، مگر فساد و بطلان میں اختلاف ہے، امام شیخ الاسلام و مشائخ بلخ اور اساتذہ شمس الائمہ سرخسی سے ایک جماعت کے مذہب پر ایسی بیع باطل ہے۔

اس مذہب پر مشتری کے قبضہ کے باوجود مبیع اس کے لیے جائز وحلال نہ ہوگی۔

اور امام اعظم وامام محمد رضی اللہ عنہما سے ایک روایت پر ایسی بیع صرف فاسد ہوتی ہے نہ کہ باطل۔

اس مذہب پر اگرچہ عقد ناجائز و ممنوع ہے اور عاقدین پر فسخ واجب ہے، لیکن اگر انہوں نے فسخ نہ کیا اور مبیع پر قبضہ مشتری ہو گیا تو اب وہ بیع کہ فاسد تھی صحیح ہو گئی کیوں کہ سبب فساد کہ تعذر تسلیم تھا، نہ رہا کہ ان سے جو مقصود تھا، یعنی مشتری کا قبضہ وہ حاصل ہو گیا (تفصیل کے لیے دیکھئے: ردالمحتار ۴/ ۱۴۲، فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۷۶، الفتاوی الرضویہ ۴/ ۱۳۸ ملخصا)۔

بالجملہ یہ دو قول ہیں، قول اول پر، یعنی بیع کے باطل ہونے کی صورت میں وہ روپیہ کہ بنام ثمن مشتری لے گا، اس کے لیے حرام مچھلیاں کہ مشتریوں نے لیں ان کے لیے حرام کھائیں، تو حرام کھلائیں، تو حرام بیچیں تو حرام بیچ کر جو ثمن حاصل کریں وہ حرام، یہ عالمگیر دقتیں ہیں، بخلاف قول ثانی، یعنی فساد ابتدائی وصحت انتہائی، کہ اس میں یہ ساری خرابیاں مرتفع ہیں، تو مسلمانوں کی آسانی کے لیے اسی قول پر فتوی دینا انسب والیق ہے۔

اس تقدیر پر خلاصہ حکم یہ ہوگا کہ بائع ومشتری اس بیع سے گناہ گار ہوں گے، مگر مچھلیاں شکار کرلی جائیں گی تو مچھلیوں اور قیمتوں کا وہی حکم ہوگا جو بیع صحیح میں تھا کہ سب کے لیے حلال۔

غرض اس مذہب پر مشتریوں اور ان سے خریدنے والوں کے لیے مچھلیاں بہرصورت حقیقتاً وحکماً حلال رہتی ہیں۔

خلاصہ ابواب ومباحث:

اب تک کی تمام تفصیلات ومندرجات سے چند امور واضح طور پر سامنے آئے ہم انہیں نمبر وار درج کرتے ہیں

۱- جنگلوں اور تالابوں وغیرہا کا ٹھیکہ اصل مذہب اور قیاس کے اعتبار سے ناجائز ہے، اور علت عدم جواز استہلاک عین ہے۔

۲- مبیع وغیرہ کی جہالت اسی وقت مفسد عقد ہوتی ہے، جبکہ ان کی جہالت مفضی الی المنازعہ ہو، اور اگر جہالت عرف وتعامل سے ختم ہو جائے، یعنی ''مفضی الی النزاع'' نہ ہو تو وہ مانع صحت عقد نہیں رہ جاتی۔

۳- صحت بیع کے لیے مبیع کا حقیقۃً مقدور التسلیم فی الحال ہونا کسی کے نزدیک ضروری نہیں، بلکہ حکماً مقدور التسلیم ہونا کافی ہے۔

۴- جس شئی کے سپرد کردینے کا ظن ہو وہ حکماً مقدور التسلیم ہوتی ہے۔

۵- بیع فاسد میں علت فساد کے ارتفاع سے بیع صحیح ہو جاتی ہے۔

۶- فقہاء کرام نے بہت سے مسائل میں اصل مذہب اور قیاس کے خلاف پر بناء عرف وتعامل وغیرہ فتوی دیا ہے۔

۷- جو اجارہ استہلاک عین پر ہو وہ بمطابق اصل مذہب ناجائز ہے۔

۸- فقہاء کرام نے عموم بلوی اور تعامل کی وجہ سے استہلاک عین پر اجارہ کو بھی جائز فرمایا۔

۹- تالاب وغیرہ کا ٹھیکہ بعض علماء کرام کے نزدیک بوجہ عرف وتعامل جائز ہے۔

اور مقاصد شرع کا ماہر خوب جانتا ہے کہ شریعت مطہرہ رفق وتیسیر پسند فرماتی ہے، نہ کہ معاذ اللہ تضیق وتشدید "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید العسر" (سورہ)۔

اسی طرح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا'' (مشکاۃ/۳۲۲)۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایسی دقتیں پیش آئیں علماء کرام انہیں روایات کی طرف جھکے جن کی بناء پر مسلمان تنگی سے بچیں، ان تمام امور کو سامنے رکھتے ہوئے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

جوابات:

۱- مچھلیوں کے شکار کے لیے سرکاری تالاب وغیرہ کا ٹھیکہ گو کہ بمطابق اصل مذہب وقیاس ناجائز ہے، مگر اب عرف وتعامل اور عموم بلوی کے پیش نظر فقیر ان تمام کا ٹھیکہ جائز سمجھتا ہے (جیسا کہ دلائل اوپر مذکور ہوئے) اور اگر ٹھیکہ لینے کے بجائے خاص کر مچھلیوں کی بیع وشراء کا مسئلہ دریافت طلب ہے تو یہ بھی بمطابق اصل و قیاس فاسد وناجائز ہے (کما مر فی بیع السمک)۔ اب اگر عدم جواز کی علت مبیع کا مجہول ہونا قرار دیں تو جیسا کہ باب دوم میں گزرا کہ جو جہالت مفضی الی النزاع نہ ہو وہ مفسد عقد نہیں رہ جاتی، اس لیے پانی میں مچھلیوں کی بیع وشراء میں گو کہ جہالت ہے، مگر تعامل کے سبب وہ جہالت باعث نزاع نہیں رہ گئی، اس لیے پانی سے نکالے بغیر بھی مچھلیوں کی بیع جائز ہونی چاہیے۔

اور اگر عدم جواز کی علت مچھلیوں کا غیر مقدور التسلیم ہونا قرار دیں تو اس میں یہ تفصیل ہونی چاہیے:

مچھلیاں اگر تالاب کی ہیں اور تالاب ایسا ہے کہ مچھلیاں اس میں سے آ جا نہیں سکتی ہیں اور ان کا سپرد کرنا مظنون ہو، گو کہ جال وغیرہ ہی سے سہی، تو ایسی مچھلیوں کی بیع وشراء پانی سے نکالے بغیر بھی صحیح ہونی چاہیے، کیوں کہ مبیع حکما مقدور التسلیم ہے ''وھو کاف لصحۃ العقد کما مر''۔

اور اگر تالاب ایسا ہے کہ مچھلیاں اس میں سے ادھر ادھر آ جا سکتی ہیں، جیسا کہ ندی نالوں میں ہوتا ہے تو چوں کہ ایسی صورت میں مبیع کا سپرد کرنا مظنون نہیں ہے، لہٰذا وہ حقیقۃ مقدور التسلیم ہیں نہ حکما، اس لیے ایسی مچھلیوں کی بیع وشراء تالاب کے اندر ہی رکھتے ہوئے ناجائز ہوگی، اور یہی حال ندی نالوں کا بھی ہوگا۔

۲- اگر ٹھیکہ لیکر مچھلیاں حاصل کرتا ہے تو جواب اول سے ہی اس کا حکم واضح ہے کہ ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

اور اگر خود ان مچھلیوں کو مذکورہ طریقہ پر خریدا ہے جن صورتوں میں یہ بیع جائز ہے اس کا حکم ظاہر ہے۔

اور جن صورتوں میں یہ بیع ناجائز ہے تو چوں کہ یہ بیع باطل نہیں، بلکہ فاسد ہے، ''کما مر التحقیق'' لہٰذا جب ان مچھلیوں کو شکار کر کے باذن بائع ان پر قابض ہو گیا تو اب ان مچھلیوں کو ٹھیکہ دار سے کوئی دوسرا خریدے، خواہ مسلم ہو، یا غیر مسلم اس کا خریدنا درست رہے گا (کما ھو مذکور من قبل)۔

۳- چوں کہ مذکورہ صورت میں وہ شخص ان مچھلیوں کا مالک ہے، جیسا کہ باب دوم میں اس کی تفصیل گزر چکی، لہٰذا اگر ان مچھلیوں کا سپرد کرنا مظنون ہو تو تالاب و حوض میں بھی انکا بیچنا درست ہے، (کما ھو التحقیق) اور اگر ٹھیکہ پر دیتا ہے تو اس کا حکم اول سے واضح ہو چکا۔

۴- مچھلیوں کے مالک بننے کی جو صورتیں ماقبل میں مذکور ہوئیں اگر ان میں سے کسی کے ذریعہ مالک بن گیا تو اگر ان کا سپرد کرنا مظنون ہو تو ان کی بیع درست ہوگی، ورنہ نہیں۔

اور اگر نجی تالاب، یا حوض کو ٹھیکہ پر دیتا ہے تو اس کا حکم ظاہر ہو چکا ہے اور اگر عوامی تالاب ہے تو کسی فرد واحد کا کسی فرد واحد کو اس کا ٹھیکہ دینا اسی وقت درست ہوگا، جبکہ عوام اس ایک کو وکیل بنا دیں، ورنہ وہ تالاب اور اس کی مچھلیاں اپنی اباحت اصلیہ پر باقی رہیں گی اور کسی ایک خاص فرد کا ہی اس سے انتفاع ناجائز ہوگا۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلیوں کی بیع

مولانا اسماعیل قاسمی [1]

اصول شرع اور عرف کے تناظر میں:

جہاں تک تالاب میں مچھلیوں کی فروختگی کے جواز اور عدم جواز اور دور حاضر میں اس قسم کی بیع وشراء کے عمومی رواج کی بابت غور وفکر کا سوال ہے تو سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہوگا کہ یہ مسئلہ ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے، حضور علیہ السلام نے اس پر نکیر فرمائی، پھر صحابہ کرام نے، پھر تابعین نے پھر تبع تابعین نے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے: ''قال رسول اللہ ﷺ لا تشتروا السمك في الماء فإنه غرر'' (اخرجه الطبراني والبيهقي والدار قطني واحمد الفتح الرباني ۱۵/۳۵ لترتيب مسند الامام احمد بن حنبل الشيباني)۔

نیز اسی قسم کا فتوی عمر بن الخطاب اور عبداللہ بن مسعودؓ کی جانب بھی منسوب ہے ملاحظہ ہو:

عن عمر ابن الخطاب و عبد الله بن مسعود رضي الله عنهم قالا: ''لا تبيعوا السمك في الماء، فإنه غرر'' (وبه أخذ أبوحنيفة و يعقوب و محمد رحمهم الله تعالى)، (مبسوط لمحمد ۵/۹۳)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں، ہم زیر بحث مسئلہ میں اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ تالاب سے مچھلیاں نکالے بغیر فروخت کرنا درست نہیں جس کے اسباب کی وضاحت یوں ہیں۔

۱- جہالت مبیع: ''وكل جهالة هذه صفتها أي تفضي المنازعة تمنع الجواز وهذا هو الأصل الكلي''۔
(یعنی ہر وہ جہالت جو مفضی الی المنازعۃ (ممکن ہو) جواز کے لیے نافع بنے گی اور معاملات کے باب میں یہ بہت ہی اہم کلیہ ہے) (ہدایہ ۳/۲۱)۔

۲- ''(ومن الوجوه الفاسدة) وكذا إذا وقع الخلل فيه (في المبيع) من جهة كونه غير مقدور التسليم'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعه ۲/۲۲۴) یعنی مبیع ملکیت میں ہو، مگر قدرت علی التسلیم نہ ہو تو بیع فاسد ہوگی۔

۳- عرف کا نصوص شرعیہ کے من کل وجہ مخالف ہونے کی وجہ سے: ''قال عليه السلام: لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر'' (اخرجه الطبراني والبيهقي والدار قطني واحمد (الفتح الرباني ۱۵/۳۵)۔

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن البيع الغرر والحصاة. وقال الشافعي ومن بيع الغرر بيع السمك في الماء'' (ترمذی ۱/۲۳۲۔ وتکملہ فتح الملہم ۱/۳۲۰)۔

اور پھر ضرورت شدیدہ بھی اس کی متقاضی نہیں، باوجودیکہ ضرورت اس وقت مؤثر ہوتی ہے، جبکہ نص صریح اس کے خلاف موجود نہ ہو۔

''المشقة والحرج إنما يعتبران في موضع لا نص فيه'' (لاشباہ لابن نجیم ۱/۲۷۱)۔

اس لیے مذکورہ بالا وجوہات کے پس منظر میں جواز کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور اسی کی تصویب ماضی قریب کے علماء راسخین کی تصانیف سے بھی ہوتی ہے، فقیہ العصر ابوالحسنات، حضرت مولانا عبدالحئی لکھنوئی لکھتے ہیں: ''شکار کرنے سے پہلے مچھلی کو فروخت کرنا جائز نہیں، نیز مجدد الملۃ، حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں: دوسرا حکم مملوک مچھلیوں کا بیع کرنا سو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ مملوک مچھلی مقدور التسلیم ہو تو بیع جائز ہے، ورنہ نہیں، ملاحظہ ہو: (فتاوی عبدالحئی مبوب ص ۲۹۶، امداد الفتاوی ۳/۵۰)۔

---

[1] دار العلوم حیدرآباد۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ تالاب سے مچھلیاں نکالے بغیر فروخت کردینا جائز نہیں عرف اور تعامل ناس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، چوں کہ نص شارع موجود ہے۔

۳- کسی حوض یا تالاب کو اجارہ پر دینا تو جائز ہے، جیسا کہ ہم چوتھے سوال کے ذیل میں نقل کریں گے، مگر تالاب سے مچھلیاں نکالے بغیر فروخت کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں، الا یہ کہ مقدور التسلیم ہوں، مگر یہ صورت بالکل ہی چھوٹے گڑھے میں ممکن ہوسکتا ہے (اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ نظر رہنا ضروری ہے کہ قدرت علی التسلیم کے معنی یہ ہیں کہ کسی حیلہ کے احتیاج کے بغیر ہی قبضہ ممکن ہوجائے، کسی طرح کا بھی حیلہ قدرت کے منافی ہے)۔

قدرت علی التسلیم نہ ہوتے ہوئے مچھلیاں فروخت کرنا شریعت کی نگاہ میں اصولی حیثیت سے فساد کا حکم رکھتا ہے، چوں کہ یہ "بیع مالم یقبض" ہے جس کی بیع فاسد ہے، اس لیے اس پر سپردگی عند العقد ممکن نہ ہونا رکن عقد میں نقص ہے:

"عن حکیم بن حزام قال نهی رسول الله ﷺ عب بیع ما لیس عند الانسان (حال العقد)" (رواہ الترمذی ۱/ ۲۲۳)

یعنی حضور علیہ السلام نے اس چیز کی خرید و فروخت کرنے سے منع فرمایا جو انسان کے پاس معاملہ کے وقت) نہ ہو۔

اور یہی کچھ صورت حال تالاب میں مچھلیاں فروخت کرنے میں ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر صراحۃ نہیں وارد ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل الشیبانیؒ روایت نقل کرتے ہیں:

"عن ابن مسعود رضی الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: "لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر"

(اخرجہ الطبرانی والبیہقی والدارقطنی واحمد الفتح الربانی لترغیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی ۱۵/ ۳۵)۔

اور اسی کے ساتھ ظاہر الروایۃ بھی ہے، دیکھئے: (السمک لمحمد ۵/ ۹۳، المبسوط للسرخسی ۱۳/ ۱۲-۱۲، جامع الصغیر ۲۶۹)۔

حاصل جواب یہ ہے کہ تالاب یا حوض کسی کی نجی ملکیت میں ہو اس میں چاہے مچھلیاں پالی ہوں یا اور کسی طرح ملک میں داخل ہوگئی ہوں، الغرض ان کا مالک صاحب تالاب ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تالاب کی مچھلیاں بغیر شکار کیے فروخت کرے، ہاں ایک صورت ہے جسے اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ تالاب کو زمین اور پانی سمیت اجرت پر دیدیا جائے، تو یہ صورت درست ہوگی (تفصیل جواب نمبر ۴ میں آرہی ہے)۔

۴- اجارہ کہتے ہیں اجرت معلومہ کے عوض منافع معلوم کے مالک بنانے کو "(الاجارۃ) ھی بیع منفعۃ معلومۃ بأجر معلوم" (کنز الدقائق)

"الاجارۃ عقد یفید تملیک منفعۃ معلومۃ مقصودۃ من العین المستاجرۃ بعوض" (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳/ ۹۴)۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اجارہ میں منفعت کا مالک ہوا جاتا ہے، لہذا جن صورتوں میں استہلاک عین لازم آئے گا اجارہ فاسد ہوجائے گا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد درپیش مسئلہ میں غور وخوض کرنا ہے کہ کن صورتوں میں تالاب کو اجارہ پر دینا صحیح ہے اور کن میں نہیں، چوں کہ فقہی عبارات کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ تالاب کو اجرت پر دینے کی مختلف صورتیں ہیں اور حکم بھی ہر ایک کا جداگانہ ہے۔

۱- ایک صورت یہ ہے کہ تالاب کسی کی ذاتی ملک ہے یا حکومت وقت کو اس پر استیلا حاصل ہے، اگر زمین اور پانی سمیت تالاب کو اجارہ پر دینا چاہے تو یہ اجارہ درست ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے: (درمختار ۵/ ۴۳، فتاوی انقرویہ ۲/ ۲۹۹، فتاوی عالمگیری ۴/ ۴۴۱، کتاب الفقہ ۳/ ۲۹)۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ تالاب کو مچھلیاں شکار کرنے کے لیے اجرت پر دیا جائے، اسی کا ذکر سوالنامہ میں ہے تو چوں کہ اس صورت میں استہلاک عین لازم آتا ہے جو کہ بیع کی صفت ہے، اس لیے اجارہ فاسد ہوجائے گا اور مآلاً چوں کہ بیع ہے، اس لیے حضور علیہ السلام کی ایسی بیع پر نہی صریح وارد ہونے کی وجہ سے عرف اور تعامل کا بھی اعتبار کرسکتے اور نہ ہی مشقت وحرج موثر ہوسکتی ہے، اس لیے کہ نص کے ہوتے ہوئے عرف اور مشقت وحرج کا اعتبار فقہاء نے نہیں کیا ہے، مگر جبکہ عرف عام سے نص کی محض تخصیص لازم آئے، ملاحظہ ہو:

(نشر العرف ۱۱۶، رسم المفتی ۳۸، الاشباہ لابن نجیم ۲/ ۲۷۱)، ولم یجز اجارۃ برکۃ لیصاد منها السمک (درمختار ۳/ ۴۶)۔

۳- تیسری صورت یہ ہے کہ تالاب کا پانی یا مچھلیاں ہی اجارہ پر دے دیا جائے، یہ صورت بھی جائز نہیں ہے

"ولم یصح إجارة الشرب بوقوع الإجارة على استهلاك العين" (ردالمحتار ۵/ ۴۶ مکتبہ ماجدیہ، نیز دیکھئے: بدائع الصنائع ۶/ ۱۸۹، کتاب

الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳/۱۲۹)۔

جائز صورت:

اس سلسلہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کی ایک اجازت بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔

''ونقل عن أبي يوسف في كتاب الخراج عن أبي الزناد قال: كتبت إلى عمر بن الخطاب في بحيرة يجتمع فيها السمك بأرض العراق أنوجرها؟ فكتب إلي أن افعلوا''

(امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں ابوالزناد سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں نے سرزمین عراق میں ایک تالاب کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو لکھا جس میں مچھلیاں جمع ہوا کرتی تھیں کہ کیا ہم اس کو اجرت پر دے سکتے ہیں؟ تو حضرت عمر فاروقؓ نے ہمیں اثبات میں جواب دیا)۔

یعنی تالاب کو اجارہ پر شکار کے لیے دے اور معین کرلے تو یہ صورت جائز ہونی چاہیے۔

جیسا کہ علامہ شامی کی رائے سے معلوم ہوتا ہے اور پھر اس سلسلہ میں عرف وعادت کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تالاب میں مچھلیاں فروخت کرنے کی اجازت دی جائے، چوں کہ وہ اور شئی ہے جس میں بہت سی خرابیوں کے ساتھ نصوص قطعیہ کی مخالفت بھی ہے۔

خلاصہ جواب یہ کہ کوئی حوض یا تالاب کسی کی نجی ملکیت میں آچکی ہو تو جگہ اور مدت کی تعین کیساتھ شکار کے لیے اجارہ پر دے سکتے ہیں، جیسا کہ شامی کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے، اور اگر عوامی ملکیت کا تالاب کسی کمیٹی کے تحت ہے تو بھی مذکورہ بالا شرط کے مطابق اجارہ پر دینا درست ہوگا اور دونوں صورتوں میں ٹھیکہ دار کو ہی مکمل نفع حاصل کرنے کا حق ہوگا اور دوسروں کو منع بھی کرسکتا ہے اگر ٹھیکہ دار نے اجارہ پر لیا ہے۔

☆☆☆

مچھلی کی بیع

مولانا اقبال قاسمی[1]

اکیڈمی کے ارسال کردہ سوالوں کے جواب سے پہلے ہم تین چیزوں کی تحقیق کریں گے اس کے بعد اصل جواب کی طرف ہم اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔
(۱) تالاب یا نہر کو ٹھیکہ پر دینا، (۲) مچھلی کا مملوک اور غیر مملوک ہونا، (۳) مچھلی کے خرید فروخت کا جائز اور ناجائز ہونا۔

۱-تالاب یا نہر کو ٹھیکہ پر دینا:

حوض، تالاب، ندی، نالے اور نہروں کو ٹھیکہ پر دینا احناف کے ''ظاہر الروایہ'' کے مطابق جائز نہیں، کیوں کہ ٹھیکہ اور اجارہ منافع پر ہوتا ہے اور وہ چیز بعینہ باقی رہتی ہے، یعنی ٹھیکہ پر دینے والا ٹھیکیدار کو معاوضہ لیکر ایک خاص مدت کے لیے ایک چیز سے نفع حاصل کرنے کا مالک بناتا ہے اور مدت ختم ہونے کے بعد اس چیز کو اصلی حالت کے مطابق مالک کو واپس کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

''الإجارہ عقد یردُ علی المنافع بعوض'' (ہدایہ ۳/۲۷۷)۔

اور یہ تعریف حوض یا تالاب کو مچھلی وغیرہ کے لیے اجارہ پر دینے پر صادق نہیں آتی، کیوں کہ اس تالاب سے نفع مچھلی کو بیچ کر یا استعمال کر کے حاصل کیا جاتا ہے اور اس صورت میں استہلاک عین لازم آئے گا، لہذا اس پر شرعی اجارہ کے تحقق نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ٹھیکہ درست نہ ہوگا، جس طرح فقہائے احناف نے چراگاہ کو گھاس کے لیے یا جھاڑی کو شکار کرنے کے لیے ٹھیکہ پر دینا استہلاک عین کی وجہ سے ناجائز لکھا ہے، اس کا بھی یہی حکم ہے، ''الفتاوی الہندیہ'' میں ہے:

''نہر نالے یا کنویں کو اجارہ پر لینا درست نہیں اور اگر پانی کے ساتھ نہر نالے کو اجارہ پر لیا تب بھی جائز نہیں، اس لیے کہ اس میں اصلاً استہلاک عین ہے اور جھاڑی یا نہروں کو مچھلی وغیرہ کے لیے یا چراگاہ کو اجارہ پر لینا جائز نہیں مانا (فتاوی ہندیہ ۴/۴۴۱)۔

''درمختار'' میں ہے: ''ولم تجز إجارۃ برکۃ لیصاد منھا السمك'' (درمختار ۴/۱۱۹)۔ (مچھلی کے لیے تالاب کا اجارہ نہیں)

لیکن اس زمانہ میں، جبکہ تالاب وغیرہ کو عموماً ٹھیکہ پر لیا جاتا ہے اور اس کو آمدنی اور تجارت کا بہت بڑا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے اور اس کے عدم جواز کی کوئی دلیل شرعی نصوص صریحہ میں موجود نہیں ہے اور متقدمین سے ظاہر الروایہ کے خلاف روایات مروی ہیں اور انہوں نے اس کے جواز کے فتوی کو ابتلاء عام اور عرف کی وجہ سے درست لکھا ہے'' مبسوط سرخسی میں ہے''

''ہشام نے امام محمد سے روایت کیا ہے کہ اگر اس کام کے لیے کسی متعین کو اجارہ پر لیا جائے تو جائز ہے، اس لیے کہ جگہ کی تعین سے جہالت ختم ہوجاتی ہے اور وہ منفعت مقصود ہے بنابریں اس مقصد کے لیے اجارہ درست ہے'' (مبسوط ۱۶/ ۳۳)۔

''وجاز إجارۃ القناۃ والنھر مع الماء، بہ یفتی لعموم البلوی'' (درمختار ۵/۲۴۳)۔

۲-مچھلی کا مملوک اور غیر مملوک ہونا:

اس کی تین صورتیں ہیں اور ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے:

۱- مچھلی پکڑ کر یا خرید کر تالاب میں چھوڑے، اس صورت میں مچھلی اور اس کی نسل سب اس چھوڑنے والے کی مملوک ہیں دوسرے کو بلا اذن پکڑنا درست نہیں۔

۲- خود پکڑ کر یا خرید کر انہیں چھوڑی، لیکن مچھلیوں کے آنے کی کوئی خاص تدبیر یا آجانے کے بعد ان کے روک لینے کا کوئی خاص انتظام کیا ہے، اس صورت میں اس اعداد اور سامان انسداد سے بھی اس شخص کی ملکیت ہوجاتی ہے۔

۳- مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی نہیں، بلکہ قدرتی طور پر مچھلیاں پیدا ہوگئیں یا بارش میں کہیں سے آگئیں، نہ ان کے جمع کرنے کا کوئی خاص اہتمام کیا اور نہ روکنے کا انتظام کیا، اس صورت میں پکڑنے سے پہلے کسی شخص کی ملکیت نہ ہوگی۔

---

[1] مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھر وارہ، دربھنگہ۔

۳- مچھلی کی خرید وفروخت کا جائز اور ناجائز ہونا:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جن صورتوں میں مچھلی داخل ملک ہی نہیں ہوئی، ان میں تو بدون پکڑے ہوئے بیع کرنا غیر ملک ہونے کی وجہ سے مطلقا جائز نہیں اور جن صورتوں میں داخل ملک ہوگئی اس میں یہ غور کرنا چاہیے کہ اگر پکڑنے کے لیے کچھ حیلہ اور تدبیر کی ضرورت ہو تو بیع غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں اور اگر بلا کسی تدبیر کے پکڑنا آسان ہو، مثلاً کسی چھوٹے گڑھے یا برتن میں ہو کہ ہاتھ ڈال کر پکڑ سکیں تو بیع جائز ہے اور جن کتب میں مطلقا ناجائز لکھا ہے تو اس سے عدم جواز کی خاص صورتیں مراد ہیں۔

اور صاحب ''فتح القدیر'' نے آخر کی دونوں صورتوں پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ علامہ شامی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''حاصل یہ ہے کہ (جیسا کہ فتح القدیر میں ہے) جب مچھلیاں کسی تالاب میں داخل ہوئیں، تو یا تو اس تالاب کو اسی مقصد سے بنایا ہے یا نہیں، پہلی صورت میں صاحب تالاب مچھلی کا مالک ہو جائے گا اور کسی کے لیے اس کا بغیر اجازت پکڑنا جائز نہیں ہوگا، پھر اگر وہ مچھلیاں بغیر کسی حیلہ اور تدبیر کے پکڑی جا سکتی ہیں تو اس کی بیع جائز ہے، اس لیے کہ وہ مملوک بھی ہے اور مقدور التسلیم بھی اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو سپردگی پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے''
(رد المحتار ۴/۱۱۹)۔

سوالوں کے جوابات:

مذکورہ بالا تفصیلات کو سامنے رکھ کر جواب پیش خدمت ہے اور یہ جواب مرسلہ سوالوں کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔

۱- حوض یا تالاب، نہر ندی یا نالے ذاتی ہوں یا سرکاری ایک خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا شرعاً جائز ہے، اور یہ ٹھیکہ اصلاً تالاب اور نہر کا ہے اور مچھلیاں منافع معلومہ ہیں یا تبعاً اس کا بھی ٹھیکہ ہے، اور تابع تابع ہی رہتا ہے مستقل بالحکم نہیں ہوتا، یہ فقہ کا ایک اصول ہے، ''التابع تابع لا یفرد بالحکم'' اور ''درمختار'' کے حوالہ سے گذر چکا ہے:

''وجاز إجارة القناة والنهر مع الماء، به يفتى لعموم البلوى'' (درمختار ۵/۴۳)۔

لہٰذا ابتلائے عام اور موجودہ عرف کو دیکھتے ہوئے عدم جواز کا فتوی دینا بغیر کسی شرعی نصوص اور ضرورت کے عوام کو تنگی اور حرج میں ڈالنا ہے جو مقاصد شریعت کے متصادم ہے، حالاں کہ اصول فقہ کی رو سے اور متقدمین اور بعض متاخرین کے فتوی سے اس کے جواز کی تصریح گذر چکی ہے، ہاں صرف مچھلی کا ٹھیکہ درست نہیں ہے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ تالاب وغیرہ کو صرف ٹھیکہ پر لے لینے سے نہ مچھلیوں کا مالک ہوگا، نہ اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی، اس کے مملوک اور بیع کی تفصیل جواب (۳) کے تحت آرہی ہے۔

۲- تالاب کو ٹھیکہ پر دینا چوں کہ جائز ہے، اس لیے اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان شخص کا اس کو خریدنا جائز ہے۔

۳- اگر حوض یا تالاب میں مالک نے از خود مچھلیاں خرید کر یا پال کر چھوڑی ہوں، یا مچھلیوں کے آنے کی کوئی خاص تدبیر کی ہو، یا خود سے آنے کے بعد اس کے روک لینے کا انتظام کیا ہو تو ان سب صورتوں میں مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا اور اس کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے لیے شکار کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن خود مالک یا ٹھیکہ دار کے لیے شکار کرنے سے پہلے تالاب کی مچھلیوں کو بیچنا غیر مقدور التسلیم ہونے کی بنا پر درست نہ ہوگا اگر چہ اس کی مملوک ہے، ہاں اگر وہ بالکل چھوٹے گڑھے یا برتن میں ہو کہ بآسانی ہاتھ ڈال کر پکڑ سکیں تو پھر کوئی حرج نہیں، کیوں کہ مملوک ہونے کے ساتھ وہ قابل تسلیم بھی ہے اور اگر قدرتی طور پر از خود مچھلیاں پیدا ہو گئیں یا انکے جمع کرنے کا کوئی خاص اہتمام کیا اور نہ روکنے کا، اور تالاب بھی اس مقصد کے لیے نہیں بنایا تھا تو محض تالاب کے مالک ہونے سے مچھلیوں کا مالک نہیں ہوگا اور ٹھیکہ پر تالاب لینے سے اس کی ملکیت شکار کرنے سے پہلے ثابت نہ ہوگی، لہٰذا اس صورت میں مچھلیوں کے شکار کرنے سے قبل خرید وفروخت مطلقاً ناجائز ہوگی، چاہے تالاب سے بآسانی پکڑ سکیں یا حیلہ اور تدبیر کی ضرورت پڑے۔

۴- جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے، اور وہ اس میں باقاعدہ مچھلی پالنے کے بعد شکار کرنے سے پہلے اگر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ تمام مچھلیوں کو بیچنا چاہے تا کہ وہ دوسرا آدمی ایک خاص مدت میں اس حوض یا تالاب کی مچھلیاں نکال کر فروخت کرے اور تالاب مالک کے حوالہ کر دے تو ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیوں کہ مچھلیاں غیر مقدور التسلیم ہیں، اگر چہ وہ مالک ہے، لہٰذا ایسے شخص کو چاہیے کہ تالاب کو ٹھیکہ پر دے دے تا کہ وہ متعین مدت میں تالاب سے مچھلیاں نکال کر تالاب کو مالک کے حوالہ کر دے صرف مچھلی کو نہ بیچے۔ ☆☆☆

مچھلی کی خرید وفروخت

مولانا محمد عزیر اختر قاسمی [1]

زیر بحث مسئلہ مچھلی کی خرید وفروخت ہے جوندی نالوں اور تالابوں میں ہوتے ہوئے فروخت کی جارہی ہے اور پورا معاشرہ اس قسم کی مچھلیاں بازاروں سے پوری فراخی کے ساتھ خرید کر استعمال کررہا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس قسم کی بیع شریعت کی نگاہ میں درست ہے کہ نہیں اس کے متعلق پوری تفصیل کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اولاً شرائط صحت بیع کی فقہاء کرام نے جو تفصیل ذکر فرمائی ہیں انہیں سامنے رکھا جائے اور حقیقت بیع بھی مدنظر ہو۔

شرائط کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شامی نے مختلف قسم کی شرطوں کی وضاحت فرمائی ہے، چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ اس کیلیے چار قسم کی شرطوں کا محقق ہونا ضروری ہے شرائط انعقاد، شرط نفاذ، شرط صحت اور شرط لزوم، پھر شرط انعقاد کی چار قسموں میں سے مملوک اور مقدور التسلیم ہونا بھی ہے، اگر ان میں سے کوئی شرط مفقود ہوجائے تو بیع کا انعقاد نہ ہوگا۔

مسئلہ زیر بحث میں مچھلی کے مالک ہونے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: اول یہ کہ مچھلیوں کی نشوونما کے لیے اس کو بطور خاص کسی نے تالاب میں رکھا ہو تو اب اس مچھلی کا اور اس کے انڈے بچے کا وہی شخص مالک ہوگا جس نے تالاب وغیرہ میں باقاعدہ ڈال کر پرورش کیا ہے، دوسری مملوک ہونے کی یہ ہے کہ مچھلی تو اس نے ڈالی نہیں، بلکہ از خود مچھلیاں تالاب وغیرہ میں آگئیں، لیکن مچھلیوں کے تالاب میں آنے یا لانے والی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کے لیے اس نے کوئی حیلہ وتدبیر کیا ہو وہ کسی طرح واپس نہ جاسکیں تو اب اس تالاب میں آنے والی مچھلیوں کا وہی شخص مالک قرار دیا جائے گا جس نے یہ تدبیر کیا ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مچھلی کا شکار کر کے اپنے خاص برتن میں محفوظ کرلے۔

اور اگر کوئی تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت کا ہو اور وہ شخص اس میں مچھلی باقاعدہ پرورش نہ کررہا ہو، بلکہ مچھلیاں از خود آگئی ہوں، لیکن اس شخص نے واپس جانے واپس جانے کے راستہ کو مسدود نہ کیا ہو، یا وہ تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت کا نہ ہو، اور نہ اس کو اجارہ صحیحہ کی شرطوں کے ساتھ اجارہ پر لیا ہو، تو ان تمام صورتوں میں وہ شخص جو اس کی بیع کرنا چاہتا ہے مالک ہی نہیں ہوگا، خواہ وہ تالاب اس کی ذاتی ملک ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ تالاب وغیرہ میں از خود آنے والی مچھلیوں کی مثال مال مباح کی سی ہے جس نے اولاً اس پر قبضہ کرلیا وہی اس کا مالک قرار دیا جائے گا جیسا کہ "ہدایہ" میں یہ عبارت درج ہے: "إذا فرخ طير في أرض رجل فهو لمن أخذه" (ہدایہ ج ۳)۔

تو مچھلی کے مالک ہونیکی یہ مذکورہ صورتیں ہوئیں، مقدور التسلیم ہونا بھی ضروری ہے، اکابر امت نے مچھلی کے مقدور التسلیم ہونے کی دو صورتوں کا ذکر کیا ہے، ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مچھلی کا شکار کر کے اس کو کسی برتن وغیرہ میں محفوظ کرلیا ہو، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ ماہی گیر وغیرہ مچھلی کا شکار کر کے اس کو کسی برتن وغیرہ میں محفوظ کرلیتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مچھلی کا شکار کر کے کسی برتن میں تو نہ رکھا، لیکن کسی چھوٹے سے حوض میں رکھا ہو کہ اس حوض سے بہ آسانی مچھلی کا بغیر کسی حیلہ وتدبیر کے پکڑنا بالکل آسان وسہل ہو گیا تو ایسی مچھلیوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ مچھلی مقدور التسلیم ہے اور اس کا فروخت کرنا جائز ہوگا (حلال وحرام/ ۳۶۰، نیز تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح القدیر ۴/ ۱۰۶)۔

اگر بجائے مچھلی کی خرید وفروخت کے تالاب وغیرہ ہی کو کوئی شخص بندوبست کرالے یا ٹھیکہ پر لے لے جو اجارہ کی ایک صورت بنتی ہے تو اس کے متعلق فقہاء کرام کی عمومی رائے یہی ہے کہ یہ صورت بھی ناجائز ہوگی، کیوں کہ تالاب وغیرہ کا کرایہ پر دینا لینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ "درمختار" کی

---

[1] مدرسہ اسلامیہ محمود العلوم۔

عبارت سے سمجھ میں آرہا ہے، عبارت اس طرح ہے: ''اعلم أن فی مصر برکة کبرکة الفهادة تجتمع فیها الأسماك، هل تجوز إجارتها لصید السمك منها، نقل فی البحر عن الإیضاح عدم جوازها'' (رد المحتار ۴/۱۴۷)۔

لیکن وہیں حضرت امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے درج ہے کہ اس کا اجارہ پر دینا لینا درست ہے، چنانچہ فقہ وفتاویٰ کی اکثر کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوزنادؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں یہ استفتاء بھیجا کہ سرزمین عراق میں کچھ تالاب ایسے ہیں کہ ان میں مچھلیاں ہوتی ہیں تو کیا اس کو اجارہ پر دیا جاسکتا ہے، تو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے اجازت دیدی کہ اجارہ پر دے سکتے ہو (ردالمحتار ۴/ ۱۴۷، بحرالرائق ۶/ ۷۳، فتح القدیر ۶/ ۴۹)۔

اس زمانہ میں عام فقہاء کی رائے کے مقابلہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ کی رائے راجح معلوم ہوتی ہے جس کی چند وجہیں میری سمجھ میں آرہی ہیں ایک تو اسی وجہ سے جو اوپر عمر فاروقؓ کا اثر نقل کیا گیا کہ بہرحال وہ قیاس کے مقابلہ ترجیح ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ یہ شکل اجارہ کی حد میں داخل بھی ہے، پھر اس اجارہ کو غلط قرار دینے کی کوئی وجہ معقول سمجھ میں نہیں آرہی ہے، بلکہ اس کے اجارہ صحیحہ ہونے کی جہت واضح ہے کیوں کہ عقد اجارہ باعتبار شریعت اسی کا نام ہے کہ کسی شخص کو کسی شئی کی منفعت کا کسی عوض کے مقابلہ میں مالک بنادیا جائے اور منفعت یہی نہیں ہے کہ غیر مستقل بالذات شئی کو نفع قرار دیا جائے، بلکہ منفعت ہر شئی کی وہی شئی کہلائے گی جو اس سے مقصود ہو (بحرالرائق ۷/ ۲۹۸)، نیز اس وجہ سے بھی اس قسم کے بندوبستی کو جائز قرار دینا چاہیے کہ اس طرح تالاب وغیرہ کو بندوبست کرنا عرف میں عام ہے اور عرف سے ثابت شدہ شئی نص سے ثابت شدہ شئی کی طرح ہوتی ہے ''الثابت بالعرف کالثابت بالنص'' (مجموعہ رسائل ابن عابدین ۲/ ۱۱۳)۔ اسی وجہ سے زندگی کے روزمرہ کے افعال اور باہمی معاملات و معاہدات کے فیصلے میں عرف کو اہم مقام حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم نے فرمایا کہ ''جعلوا ذلك أصلاً'' (الاشباہ/ ۱۵۰)۔

لہذا جب مچھلی کے ساتھ بھی لوگوں کا یہی تعامل ہوگیا ہے تو مچھلی کی بیع، یا اجارہ تالاب وغیرہ کو استحسانا جائز قرار دینا راجح ہے، نیز مارکیٹ میں جو مچھلیاں آتی ہیں وہ عموماً اسی طریقہ سے آتی ہے، اگر اس قسم کے معاملہ کو ناجائز قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مچھلی کا استعمال کرنا ہی حرام ہو جائے گا، تو گویا کہ امت مشقت وحرج میں مبتلا ہوجائے گی، اور گویا اس قسم کے معاملہ نے شرعی ضرورت نہیں تو کم ازکم حاجت شرعی کا درجہ تو اختیار کر ہی لیا ہے، اس لیے جہاں شریعت نے حاجت کی بناء پر دوسرے معاملہ میں تخفیف کی ہے، وہیں مچھلی کی بیع اور اجارہ تالاب کے معاملہ میں بھی تخفیف کرنا لازم وضروری معلوم ہوتا ہے، اس لیے تالاب میں موجود مچھلیوں کی فروختگی گرچہ درست نہ ہو، لیکن اس کا اجارہ (ٹھیکہ) پر لینا درست ہوگا۔

۳- ذاتی تالاب کی مچھلیوں کا شرعی حکم:

وہ تالاب جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت کا ہو اور اس نے اس میں باقاعدہ مچھلی ڈال کر پرورش کیا ہے اور اب وہ شخص ان مچھلیوں کو شکار کرنے سے قبل فروخت کرتا ہے تو اس قسم کی مچھلیوں کا حکم قدرے تفصیل طلب ہے وہ یہ کہ وہ تالاب جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے اور اس نے مچھلیوں کو پکڑ کر باضابطہ پرورش کیا ہے تو ایسے شخص کی ملکیت تو ثابت ہوگئی، اب اگر اس کو بغیر کسی حیلہ کے آسانی کے ساتھ پکڑنا اور قبضہ میں لینا ممکن ہو، ایسی مچھلیوں کو بغیر شکار کیے ہوئے فروخت کرنا بلاکراہت جائز ہوگا، اور اگر آسانی سے بغیر کسی حیلہ کے پکڑنا ممکن نہ ہو تو ایسی بیع درست نہ ہوگی (تفصیل کے لیے دیکھئے: درمختار ۴/ ۱۴۸، فتح القدیر ۵/ ۴۹، حلال وحرام/ ۳۶۰، البحرالرائق ۶/ ۷۳)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں صاحب تالاب مچھلیوں کا مالک تو ضرور ہوگا، لیکن انہیں فروخت کرنا انہیں صورتوں میں جائز ہوگا جو دو صورتیں مقدور التسلیم ہونے کی ذکر کی گئی ہیں، اگر مذکورہ دونوں صورتوں کے علاوہ کوئی ایسی صورت ہو جس میں آسانی کے ساتھ اسے مشتری کے حوالہ کرنا ممکن نہ ہو تو بیع درست نہ ہوگی۔

ایسی مچھلیوں کی بیع کی درستگی کے لیے اجارہ تالاب کی صورت اور اس کا حیلہ اختیار کیا جانا اچھا ہے۔ جیسا کہ بعض فقہاء کرام نے کنویں وغیرہ کو کرایہ پر لے کر جانوروں کو پانی پلانے کی اجازت دی ہے (دیکھئے: المبسوط ۱۶/ ۶۳- اجارہ فاسد)۔

۴- بارش وسیلاب کے ذریعہ آئی ہوئی مچھلیوں کا حکم:

متقدمین اکابر نے اپنی اپنی تالیفات وتصنیفات میں یہ جزئیہ درج ذیل ذکر فرمایا ہے، جس چیز کا حاصل یہ ہے کہ کسی نے اس مقصد سے تالاب

کھودوایا کہ اس میں باقاعدہ مچھلی کی پرورش کرے گا، اور اس میں بارش یا سیلاب وغیرہ کے ذریعہ بہت سی مچھلیاں آگئیں تو یہ مچھلی ایسے شخص کی مملوک شمار کی جائے گی، جیسے کسی شخص نے پرندوں کو پھنسانے کے لیے ایک جال کسی جگہ لگا دیا تو جو پرندہ اس میں پھنسے گا وہ اسی شخص کی ملک ہوگا، اور اگر یہ تالاب اس مقصد کے لیے نہیں بنوایا گیا، بلکہ دوسرے کسی مقصد سے تالاب بنوایا اور مچھلیاں ازخود اس میں آگئیں تو یہ مچھلیاں اس شخص کی ملکیت نہ ہوگی، بلکہ جو شخص بھی اس کو پکڑ لے گا وہی اس کا مالک ہوگا۔ اور بلا اجازت صاحب تالاب اس کا شکار کرنا بھی جائز ہوگا، محض تالاب کا کسی کی ملکیت میں ہونا مچھلیوں کے مالک بننے کے لیے کافی نہیں ہے، جیسے کوئی پرندہ کسی شخص کی مملوکہ زمین میں انڈا، بچہ دیدے تو صرف مالک زمین ہونے کی وجہ سے اس پرندہ کا انڈا بچہ اس شخص کا مملوک نہیں ہوگا، بلکہ جو شخص اس کو اٹھائے گا وہی اس کا مالک ہوگا،

''إذا أفرخ في أرض رجل فهو لمن أخذه، وكذا اذا باض فيها الخ'' (البحر الرائق ۶/۸۳، هدايه ج ۳)۔

اس لیے ضروری ہوگا کہ تالاب وغیرہ میں ازخود آئی ہوئی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کی کوئی تدبیر بھی کی گئی ہو، تو ایسی صورت میں صاحب تالاب ان مچھلیوں کا مالک ہوگا۔

اب ان مچھلیوں کو فروخت کرنا ایسی صورت میں جائز و درست ہوگا، جبکہ اس کو مشتری کے حوالہ کرنا بلا کسی حیلہ کے آسان و سہل ہو اگر بلا کسی حیلہ کے حوالہ کرنا آسان نہ ہو تو ایسی صورت میں فروختگی درست نہ ہوگی (تفصیل کے لیے دیکھئے: شامی ۴/ ۱۴۸)۔

☆☆☆

باب سوم

بیع سمک کے چند مسائل

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی [1]

۱- عرف وعام ہوجانے کے بعد اس قسم کی بیع کی بعض شکلوں میں جواز کی گنجائش ہے، پھلوں کی فصل کی بیع پر قیاس کرتے ہوئے، حالاں کہ اکثر صورتیں فصل کی بیع کی اصولاً ناجائز ہیں، مگر عرف عام کی بنیاد پر حضرت تھانویؒ نے ''شامی'' کے حوالہ سے بشروط بعض شکلوں کے جواز کا فتوی دیا ہے، اس میں ایک اہم شرط ''مؤدی الی المنازلہ'' نہ ہونا ہے۔

۲- بیع ثانی کی تو مسلمان کے لیے گنجائش معلوم ہوتی ہے، یعنی مچھلیاں پکڑنے والے سے پہلے تو کسی غیر مسلم نے مچھلیاں خریدیں پھر اس سے کسی مسلمان نے خرید لیں تو ''درمختار'' میں مذکور ایک جزئیہ سے اس کا جواز نکلتا ہے۔

(وهو هذا: بخلاف البيع الفاسد، فإنه لا يطيب له لفساد عقده ويطيب للمشترى منه لصحة عقده) (درمختار بر حاشیه ردالمحتار ۴/۱۳۰ طبع دیوبند)۔

پھل آنے سے قبل کی بیع کا حکم ''امداد الفتاوی'' میں یہ لکھا ہے: پہلا عقد غیر مسلموں نے کیا تو بیع ثانی کے بعد مسلمان کے لیے استعمال جائز ہے (۶۵/۳)، لیکن اگر پہلی بیع (پھل آنے سے قبل کی بیع) کے متبایعین مسلمان ہوں تو پھر ان سے کسی مسلمان کا خریدنا جائز نہیں (ایضاً ملخصاً)۔

۳- شخصی ملکیت والا حوض اگر ایسا ہے کہ اس سے بغیر شکار کے مچھلیاں پکڑنا دشوار نہیں اور مچھلیاں حوض والے کی مملوکہ ہوں تو ان کا فروخت کرنا اور خریدنا (اہل کا اہل کے ہاتھ) بلاشبہ جائز ہے، جیسا کہ ''ہدایہ'' کی عبارت ذیل سے مفہوم ہوتا ہے:

''ولا يجوز بيع السمك قبل أن يصطاد، لأنه باع ما لا يملكه ولا فى حظيرة إذا كان لا يؤخذ إلا إذا اجتمعت فيها بأنفسها ولم يسد عليها المدخل لعدم الملك'' (۳/۴۳)۔

۴- یہ شکل جائز نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ اس میں ''بیع مالم یکن'' کا احتمال ہے، غیر مقدور التسلیم شی کی بیع ہے، خود آنے والی مچھلیاں غیر مملوک ہیں (تو یہ ''بیع مالم یملک'' ہوئی) عوامی ملکیت والے حوض کا ٹھیکہ دینے کی صورت میں مزید ایک 'محظور' لازم آتا ہے۔

☆☆☆

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

بغیر شکار کئے مچھلی کی خرید وفروخت

مولانا محمد عبیداللہ اسعدی[1]

ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی خرید وفروخت ناجائز ہے اس میں مختلف قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں، پانی کے اندر سے نکالنے سے پہلے یہ کسی کی ملک ومملوک نہیں ہوتیں، اور تمام فقہاء اس قسم کی خرید وفروخت کی حرمت پر متفق ہیں

(بدائع ۵ / ۱۳۸، ۱۴۶، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴ / ۳۵۸، ۳۸۸)۔

۲- جو لوگ حکومت وپنچائیتوں وغیرہ سے ندی ونالوں کی مچھلیوں کا معاملہ کرتے ہیں خرید وفروخت یا ٹھیکیداری کے عنوان سے، اور اس کے بعد وہ مچھلیاں نکال کر اور شکار کے بعد ان کو فروخت کرتے ہیں تو ان کی یہ فروخت اور ان سے خریدنا اور کھانا جائز ہے، اس لیے کہ ٹھیکہ دار اور حکومت کے درمیان معاملہ تو درست نہیں، اس لیے کہ مچھلیاں ملک سرکار نہیں تو اس ٹھیکیداری اور معاملہ کی وجہ سے مچھلیاں ٹھیکیدار کی ملک نہیں بنیں۔

بلکہ مچھلیاں اس معاملہ سے باوجود حسب اصل وحسب سابق مباح الاصل رہیں جو شخص بھی ان کا شکار کر کے ان کو قبضہ میں کرے وہ مالک ہے، لہذا اس کا کھانا، بیچنا اور اس سے خریدنا سب درست ہے، امام ابو یوسفؒ نے ''کتاب الخراج'' میں یہی فرمایا ہے، اسی کو فقہاء نے بھی ذکر کیا ہے (تقریر الرافعی مع الشامی ۵ / ۱۳۹ وامداد الفتاوی ۳ / ۵۰) اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں: ''لا یجوز بیع السمك فی الماء لأنه غرر وهو الذی یصیده'' (الخراج ص / ۸۷)۔

۳- حوض وتالاب میں پائی جانے والی مچھلیاں جو کہ باقاعدہ پالی گئی ہیں۔ ان کی خرید وفروخت ان کو نکالے بغیر منع ہے، اس صورت میں مچھلیاں اگرچہ مالک حوض وتالاب کی ملک ومملوک ہوتی ہیں، مگر کئی خرابیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً مبیع کی جہالت کہ کچھ پتہ نہیں کہ کتنی مچھلیاں پانی کے اندر ہیں اور سود ونفع کا ہو رہا ہے یا نقصان کا، اور اسی طرح ایک خرابی یہ ہے کہ یہ مچھلیاں مقدور التسلیم نہیں ہیں، بیچنے والے کی ملک تو ہیں، مگر اس حال میں نہیں کہ وہ بے تکلف خریدنے والے کو دے سکے، یا خریدنے والا اس کو حاصل کر سکے، بلکہ خریدنے والے کو خریدنے کے بعد اچھی خاصی زحمت ومحنت برداشت کرنی پڑتی ہے، ان دونوں خرابیوں کی وجہ سے معاملہ پر بطلان وفساد کا حکم لگتا ہے، اور ظاہر ہے کہ بیع باطل وفاسد دونوں ہی منع ہیں اگرچہ دونوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔

(البدائع ۵ / ۱۴۷ و ۱۴۸، ۱۵۷ شامی ۵ / ۶۰، امداد الفتاوی ۳ / ۴۷، واحسن الفتاوی ۶ / ۴۸۰)۔

یہ حکم نجی وعوامی تالاب دونوں کا ہے۔

۴- بارش کے پانی کی وجہ سے جو مچھلیاں حوض وتالاب میں آجاتی ہیں۔ خواہ تالاب نجی وذاتی ملکیت کا ہو یا عوامی وسرکاری، ان مچھلیوں کا فروخت کرنا بھی درست نہیں ہے، اس لیے کہ اگر تالاب کے اندر مچھلیوں کو لانے اور روکنے کی کوئی صحت وتدبیر اختیار نہیں کی گئی تو مچھلیاں مملوک نہیں بلکہ مباح الاصل ہیں اور اس صورت میں حکم وتفصیل وہ ہے جو کہ جواب اول کے تحت مسطور ہے، یعنی تالاب کی فروخت اور اس کا ٹھیکہ درست نہیں، مگر اس سے مچھلیاں نکال کر بیچنا اور خریدنا وکھانا سب درست ہے۔

اور اگر تالاب کے اندر مچھلیوں کو لانے اور آنے کے بعد روکنے کا نظم بنایا جائے تو مچھلیاں مملوک تو ہو جائیں گی، مگر سوال وجواب (۳) کی خرابیاں پائی جائیں گی اور وہی حکم ہوگا، اس لیے کہ اس صورت میں مچھلیاں مجہول المقدار اور غیر مقدور التسلیم ہیں۔

بارش سے تالاب کے اندر آنے والی مچھلیوں کے مملوک ہونے نہ ہونے کی صورت وتفصیل عموماً فقہاء نے ذکر کی ہے، ''کتاب الخراج'' میں بھی کچھ تذکرہ ہے (شامی ۵ / ۶۰-۶۱، فتح القدیر ۶ / ۴۹، کتاب الخراج ص / ۸۷ مبسوط السرخسی ۱۳ / ۱۱-۱۲)۔

خلاصہ یہ کہ جو مچھلیاں مملوک نہیں، یعنی ندی ونالے کی مچھلیاں اور تالاب میں آنے والی، جبکہ ان کو روکا نہ جائے، تو سرکار یا مالکان تالاب کی طرف سے ان کی فروخت اور ان سے خرید، بصورت ٹھیکہ درست نہیں ہے، اور ان مچھلیوں کو پکڑ کر اور شکار کر کے بیچا جائے، خواہ مالکان بیچیں یا خریدنے وٹھیکہ لینے والے تو درست ہیں، اس لیے کہ یہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں جو شکار کرے وہ ان کا مالک ہے، اس لیے یہ صورت تو حکماً ہوں گے۔

---

[1] شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ وسکریٹری برائے سمینار وبرنامج اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

اہم معاملہ تالاب وحوض کی مملوک مچھلیوں کا ہے کہ مملوک ہونے کے باوجود ان کی خرید وفروخت منع ہے، اور یہ ممانعت اسی لیے ہے کہ پہلے معاملہ، یعنی براہ راست خریدار پر موقوف نہیں، بلکہ اس سے آگے بھی اس کا اثر ہوگا، "بدائع" کی تصریح تو بطلان کو بتاتی ہے، اس لیے کہ اس میں عدم انعقاد اور عدم صحت وفساد کا تذکرہ کیا گیا ہے (البدائع ۵/ ۷، ۲۱۴، ۱۴۸، ۱۵۶)۔

اور امام ابویوسف وامام محمد وغیرہ بغیر تفصیل کے "لا یجوز" کا لفظ فرماتے ہیں، جیسے کہ "ہدایہ" وغیرہ میں بھی آتا ہے۔

(ہدایہ مع الفتح ۶/ ۴۹، کتاب الخراج ص/ ۸۷، الجامع الصغیر ص/ ۳۲۸)۔

بلکہ "مبسوط" میں آیا ہے: "وإذا باع سمكا محظورا في أجمة فإن البيع باطل لا يجوز" (كتاب المبسوط ۹۳/۵)۔

ظاہر ہے کہ بیع کے باطل ہونے کی صورت میں مبیع (فروخت کو وہ مال) تملک کا اور پھر ٹھیکہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا، مالک وتالاب سے خریدنے والا خود مالک نہیں بنا اور نہ بن سکتا ہے تو دوسرے کی طرف کسی طرح ملکیت منتقل نہیں ہوگی، بیع باطل ملکیت کا فائدہ نہیں دیتی (شامی ۵/ ۴۹)۔

شامی وغیرہ کے یہاں فساد کی تعبیر وتصریح آئی ہے اور بیوع فاسدہ کے ساتھ ہی اس کا ذکر ملتا ہے (شامی ۵/ ۶۰، الفقہ الاسلامی ۴/ ۱۷۸-۱۷۹)۔

"احسن الفتاویٰ" میں بھی اس کو اختیار کیا گیا ہے، اور صاحب "فتح القدیر" نے فساد کو ہی ترجیح دی ہے، اس لیے کہ مالیت اور ملکیت دونوں پائی جارہی ہے تو بطلان کے حکم کا کوئی محل نہیں ہے، یہ بحث انہوں نے عبد آبق (بھاگے ہوئے غلام) کی خرید وفروخت کے تحت کی ہے، اگرچہ ظاہر الروایۃ اور اکثر علماء مذہب کا رجحان و بطلان کا ہے مگر ایک جماعت فساد کی قائل ہے (فتح القدیر ۶/ ۵۹، ۶۰) بیع باطل و فاسد کی تعریف بھی صاحب "فتح القدیر" کی تائید کرتی ہے (شامی ۵/ ۴۹)۔

بہر حال فاسد مانا جائے تو بھی مسئلہ اہم ہے، اس لیے کہ بیع فاسد اگرچہ قبضہ کے بعد ملکیت کا فائدہ دیتی ہے، مگر خریدنے والے کو کسی طرح کا تصرف منع ہے، اگر بیچ ڈالے تو گناہ کا کام کیا، توبہ کرے، اور اس سے جس نے خریدا اس سے وہ طے شدہ قیمت کے بجائے صرف بازار کی قیمت لینے کا حق رکھتا ہے، اور مزید کچھ خرابیاں و پابندیاں بھی لازم آتی ہیں (شامی ۵/ ۸۸-۹۸)۔

مفتی نظام الدین صاحب نے جو گنجائش لکھی ہے وہ خرابی سے خالی نہیں ہے اور حضرت تھانوی فرماتے ہیں بیع فاسد بتصریح فقہاء ربو یعنی معاملہ سود میں داخل ہے (امداد الفتاویٰ ۳/ ۹۳)۔

اور یہ فساد شرط کی وجہ سے نہیں ہے کہ تعارف کی بنا پر اس میں گنجائش ہو۔ جب کہ فقہاء نے متعارف شروط فاسدہ کے حق میں ذکر کیا ہے (شامی۔ ۵/ ۸۵) بلکہ صلب عقد اور نفس معاملہ کی نوعیت میں فساد ہے، اور اس صورت میں یہ گنجائش نہیں ہو سکتی، بیع کا فساد صرف شرط لگانے پر موقوف نہیں، بلکہ دوسری وجوہ کی بناء پر بھی ہوتا ہے (شامی ۵/ ۴۹، ۵۰، ۶۰ و مابعد، فتح القدیر ۶/ ۴۱، ۴۲ وغیرہ)۔

البتہ قابل غور پہلو یہ ہے کہ غرر یا جہالت، اس میں کچھ وسعت بھی ہے جس کا مبنی یہ ہے کہ باعث نزاع نہ بنے، لوگ اس کو گوارا کر رہے ہوں اور اس سے صرف نظر کر رہے ہوں۔ جب کسی چیز کا تعارف وتعامل ہو جاتا ہے تو یہ بات پیدا ہو جاتی ہے، یہاں یہی صورت ہے کہ رواج عام ہو چکا ہے، پھر جہالت اور غیر مقدور التسلیم ہونے کا معاملہ بھی یہ ہے کہ خرید وفروخت کرنے والے بالکل اندھیرے میں نہیں ہوتے، معاملہ کے متعلق خود ان کو بصیرت ہوتی ہے، یا اصحاب بصیرت سے مدد لے کر وہ مچھلی کی مقدار کا ایک اندازہ قائم کرتے ہیں جو بڑی حد تک صحیح ہوتا ہے، جیسے کہ باغ کے پھل کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس میں بھی قطعی تعیین نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔

اور غیر مقدور التسلیم ہونے کا معاملہ یہ ہے کہ تالاب کی مچھلیاں بہر حال ایک محدود دائرے کے اندر ہوتی ہیں ان کا معاملہ بھاگے ہوئے غلام، اور فضاء مملوک پرندے کا نہیں ہوتا۔ کہ ان کو ہاتھ وقبضہ میں لانا اتنا آسان نہیں جتنا کہ تالاب کی مچھلیوں پر قبضہ حاصل کر لینا اور ان کو حاصل کرنا۔

مزید یہ کہ بعض حضرات کے یہاں اس خرید وفروخت کی گنجائش رہی ہے جن میں عمر بن عبد العزیز، ابن ابی لیلیٰ کا نام آتا ہے، ابن حزم کا مذہب بھی یہی ہے، اگرچہ ان کے دلائل فراہم نہیں ہیں، یعنی محقق طور پر ان کا علم دشوار ہے، ابن حزم نے جو کچھ دلیل دی ہے وہ کچھ قوی نہیں ہے، "اعلاء السنن" میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ (الخراج ص/ ۸۷، مبسوط السرخسی ۱۳/ ۱۱ و ۱۳، المغنی ۴/ ۲۷۳، المحلی ۸/ ۳۸۸-۳۹۲، اعلاء السنن ۴/ ۴۶۱، ۴۶۲)۔

ان حضرات کے مذاہب کی بنیاد پر تو نہیں، ہاں تعامل اور مذکورہ بالا تفصیل کی بنا پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اور ان مذاہب کو مؤید بنایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

بیع کے چند مسائل کے جوابات

مولانا عبدالرحمن پالنپوری

۱- سرکاری تالاب، ندی نالے اور نہریں جو کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہیں، ان میں مچھلیاں چھوڑی نہ گئی ہوں، بلکہ سیلاب کی آمدورفت کے ساتھ مچھلیاں آتی اور جاتی ہوں تو ان مچھلیوں کی خرید وفروخت بغیر ان مچھلیوں کے نکالے ہوئے شرعاً جائز نہیں ہے، کیوں کہ شرعاً یہ مچھلیاں مملوک ہی نہیں ہیں (ردالمحتار ۵/ ۶۰-۶۱)۔

عرف عام کی وجہ سے جواز کا فتوی دینا مناسب سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ اس طرح کے معاملات عرف میں عام اسی زمانہ میں نہیں ہوئے، بلکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے ایسا عرف معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ ''ردالمحتار'' میں ہے: ''فالمسألة كثير الوقوع ويكثر السوال عنها'' لیکن آج تک کسی نے بھی عرف کی وجہ سے جواز کا فتوی نہیں دیا۔

۲- مذکورہ بالا صورت میں مچھلیاں مملوک ہی نہیں ہیں، لہذا ان کی خرید وفروخت شرعاً باطل ہے، لیکن اس صورت میں مچھلیاں مباح الاصل ہیں جو شکار کرلے گا وہ شرعاً مالک ہوجائے گا، لہذا مچھلیاں شکار کرلینے کے بعد دوسرے کے ہاتھ بیچنا اور دوسروں کے لیے خریدنا شرعاً جائز ہوگا جیسا کہ خودرو گھاس کا حکم ہے کہ جو کاٹ لے گا وہ شرعاً مالک ہوجائے گا۔

۳- حوض یا تالاب اگر ابتداء ہی سے مچھلیاں پکڑنے کے لیے تیار کیا گیا ہو، یا اس میں مچھلیاں خود مالک نے چھوڑی ہوں یا نہر وغیرہ سے مچھلیاں تالاب میں آئیں اور تالاب کے مالک نے پانی کا راستہ بند کرکے مچھلیاں تالاب میں محبوس کرلیں تو یہ مچھلیاں اس کی مملوک ہیں، مگر غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع فاسد ہے، البتہ اگر تالاب اس قدر چھوٹا ہو کہ بدون تکلیف وحیلہ اس سے مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہوں اور مچھلیوں کی مقدار بھی معلوم ہو تو بیع درست ہے (احسن الفتاوی ۶/ ۴۸۰)۔

۴- حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو، عوامی ملکیت کا، اگر یہ حوض وتالاب شروع ہی سے مچھلی کے لیے تیار کئے گئے ہیں تو یہ مچھلیاں شرعاً مملوک نہیں ہیں اور غیر مملوک کی بیع باطل ہے، اور حوض یا تالاب کو کسی خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا بھی جائز نہیں ہے۔

''لأن الإجارة واقعة على استهلاك العين'' (رد المحتار مصری ۵/ ۶۱)۔

☆☆☆

ٹھیکہ پر لیے گئے تالاب کی مچھلیاں خریدنا

مفتی محبوب علی وجیہی[1]

حضرات فقہاء نے خصوصاً فقہاء احناف نے قرآن وحدیث کی روشنی میں جو اصول اور قواعد احکام مقرر کئے اور ان پر مسائل آمدہ کا استخراج کیا، ان میں بیع کے مسائل میں چند چیزیں خاص طور سے ان کے پیش نظر ہیں۔

۱- بیع اس طرح کی نہ ہو جس سے آئندہ باہم تنازعات پیدا ہوں، جہاں تک ممکن ہو سکے ایسے راستوں کو بند کر دیا جائے۔

۲- ۔بیع میں غرر اور دھوکہ کسی طرح کا نہ ہو جس کی وجہ سے مشتری کو نقصان سے دوچار ہونا پڑے۔

۳- ربا اور سٹہ جیسی مہلک چیزیں مسلمان کی بیع میں داخل ہونے نہ پائیں، لیکن بعض ایسے ناگزیر حالات بعض وقت پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے ان اصول وقواعد میں سہولت پیدا کرنا پڑتی ہے، کیوں کہ انسان وہاں بے بس نظر آتا ہے، یہ چیز خواہ عام عرف وعادت کی وجہ سے ہو یا حکومت کے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے ہو، یا حکومت تو مسلمانوں کی ہو، لیکن نظام حکومت فاسقوں اور ایسے کارندوں کے قبضہ میں ہو جو اسلام پر عمل پیرا نہ ہوں، اس وقت بلوی کے عام ہونے کی وجہ سے کوئی راستہ اس سے مفر کا نظر نہ آتا ہو تو بحالتِ مجبوری ان اصول کے مقابلہ میں دوسرے اصول سے کام لے کر آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں، اس کی صدہا مثالیں فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں:۔"الضروات تبیح المحظورات"،"المشقۃ تجلب التیسیر"،"الضرر العام یزال وغیرھا"، پس تالاب کی مچھلیوں وغیرہ میں عام اصول فقہ تو ممانعت پر دلالت کرتے ہیں، جیسے عام طور پر کتب فقہ میں مذکور ہے کہ بعض صورتوں میں ملکیت نہیں اور بعض صورتوں میں مبیع مجہول ہے اور بعض صورتوں میں مقدور التسلیم نہیں، اور یہ سب صورتیں وہ ہیں جو دلائل اور اصولِ شریعت کے مطابق عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں:۔"کما بین فی کتب الفقہ" لیکن حالات وزمانہ اور تغیرات نظام عالم مجبور کر رہے ہیں کہ ان دلائل واصول کے مقابلہ میں دوسرے ان دلائل کی روشنی میں غور کیا جائے جو اس بگڑے ہوئے نظام خصوصاً کافرانہ نظام میں مسلمانوں کو ارتکاب حرام اور مکروہات سے بچالیں، اگر چہ ان دلائل میں کچھ ضعف بھی ہو مگر وہ مستند اور معتبر شریعت میں تسلیم کئے گئے ہوں، جیسے "الضرورات تبیح المحظورات" یا "المشقۃ تجلب التیسیر" وغیرہ۔

نیز ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں بہت سے مقامات پر ان سے کام لیا گیا ہے، جیسے امام اعظمؒ ۔درس دینی اور امامت وغیرہ پر اجرت کو حرام قرار دیتے ہیں، مگر بعد کے آنے والے علماء کبار نے دیکھا کہ اگر اس پر عمل قائم رکھا گیا تو دین کی بقاء اور اشاعت کا کام فیل ہو جائے گا، لہذا انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے بیان کردہ مسئلہ کو اور دلائل کو قوی ہونے کے باوجود چھوڑ کر دوسرے دلائل کی روشنی میں اس کے جواز کا فتوی دیا اور تمام عالم اسلامی میں اسی پر عمل ہوا اور آج تک ہو رہا ہے، ایسے ہی "استصناع" ہے کہ مبیع مجہول اور معدوم ہے، مگر ضرورت اور عرف کی وجہ سے اس کے جواز کا فتوی دیا گیا۔

اب ہم آج کل کے عرف وعادت اور زمانہ کے بدلے ہوئے حالات میں دیکھتے ہیں کہ تالابوں، نہروں، ندیوں کی مچھلی کے ٹھیکے جو دیئے جاتے ہیں گو وہ چند وجوہ سے جائز نہیں ہیں، مگر دنیا میں یہی طریقہ اپنا لیا گیا ہے، لینے والا خوشی سے لیتا ہے اور دینے والا خوشی سے دیتا ہے اس میں عام عرف یہی ہے، اب اگر ہم عدم جواز کا فتوی دیتے ہیں جیسے ہماری کتب فقہ میں عام طور سے یہی درج ہے اور ہمارے سلف صالحین کے عام طور سے فتاوی بھی یہی بتاتے ہیں تو ٹھیکہ دینے والا بھی گنہگار اور ٹھیکہ لینے والا بھی اور دونوں ایسے عمل کے مرتکب ہو رہے ہیں جو بیع کے بعض جگہ باطل ہونے اور بعض جگہ فاسد ہونے یا مکروہ ہونے پر منتج ہے اور یہ ابتلاء عام ہے، اس کے خلاف میں مشقت ہے، لہذا اگر ہم مندرجہ ذیل دلائل کی بناء پر جواز کا فتوی دیں تو شریعت سے انحراف لازم نہیں آئے گا، بلکہ شریعت کے حدود میں، ہی شریعت کے دلائل سے ہی جواز ثابت ہوگا پس جواز کا فتوی دینا چاہیے۔

---

[1] رام پور، یوپی۔

بہر حال اگر ٹھیکہ ناجائز بھی مانا جائے تب بھی بیچنے والے سے خریدنا تو جائز ہے، کیوں کہ وہ مال مباح الاصل کو بیچ رہا ہے، اگر خرابی ہوگی تو ٹھیکہ لینے میں ہوگی بیچنے اور خریدنے میں نہ ہوگی۔

وہ تالاب جو کاشتکار اپنی زمین میں بناتا ہے (خواہ وہ کرایہ کی ہو یا ذاتی) اور اس میں مچھلی پالن کرتا ہے وہ مچھلیاں اس کی ملک میں داخل ہیں، یہ تالاب چاروں طرف سے بند ہوتے ہیں ان میں دوسری مچھلیوں کے آنے کا راستہ نہیں ہوتا، نہ ان مچھلیوں کے جانے کا راستہ ہوتا ہے، یہ مچھلیاں جو چھوٹی ڈالی جاتی ہیں اس میں بڑھ جاتی ہیں ان کی بیع درست ہے، میرے نزدیک یہ مقدور التسلیم بھی ہیں، لیکن جو لوگ عادی ہوتے ہیں وہ مچھلی ہاتھ سے پکڑ لیتے ہیں، میں خود بنگال اور آسام کے ان طلبہ کو جو میرے ساتھ پڑھتے تھے دیکھا کہ وہ تالاب یا نہر سے جس وقت پانی ذرا کم ہوتا تھا ہاتھ سے مچھلیاں پکڑ لیتے تھے باہر ایک طالب علم کھڑا رہتا اور وہ طالب علم جو پانی میں ہوتے اس کی طرف پھینک دیتے وہ اٹھا لیتا تھا۔

بارش وغیرہ کسی طریقہ سے جو مچھلیاں کسی کے ذاتی تالاب میں آگئیں تو اگر وہ تالاب اسی کام کے لیے اس نے بنایا ہے تو اس کی ملک میں داخل ہو جائیں گی اور اگر اس کام کے لیے نہیں بنایا ہے یا گڑھے وغیرہ ہیں اس میں آگئیں تو یہ اس کی ملک میں داخل نہیں ہوں گی، یہ مباح الاصل ہیں، البتہ اگر اس کا راستہ بند کر دیا کہ اب اس میں اور نہ آسکتی ہیں اور نہ یہ جاسکتی ہیں تب بھی اس کی ملک میں داخل ہو جائیں گی، اس کا مسئلہ پہلے تفصیل سے گزر چکا کہ فقہاء کی تصریحات کے مطابق ان کی بیع مقدور التسلیم نہ ہونے کی وجہ سے درست نہ ہوگی، مگر عموم بلوی اور ضرورت زمانہ کو دیکھتے ہوئے ان تمام صورتوں میں جو نمبر (۴) میں درج ہیں بیع کے جواز کا فتوی ان ہی دلائل کی روشنی میں دیا جانا چاہیے جو پہلے مذکور ہو چکے۔

رہا بازار، ہاٹ، سڑکوں اور جنگلات کے درختوں کا مسئلہ تو اس کا ٹھیکہ درست ہے، اس لیے کہ سرکار تو اس زمین کی اجرت لیتی ہے جس پر بازار لگتی ہے اور وہ زمین چوں کہ سرکاری ہے اس لیے اس کو ٹھیکہ پر دینا جائز اور اس سے منفعت حاصل کرنا درست ہے، اسی طرح جو جنگل میں یا سڑکوں کے کنارے درخت اگتے ہیں وہ اپنے اتصال کی وجہ سے اسی کی ملک ہیں جس کی زمین ملک ہے، جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اسی کی ملک ہیں تو اس کی جلاون کا یا کاٹنے کا ٹھیکہ دینا جائز ہے۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی بیع کے چند مسائل

مولانا شمس پیرزادہؒ

۱- ندی، نالوں کی مچھلیوں کی خرید وفروخت:

سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کے سلسلہ میں حکومت معاوضہ حاصل کر کے جو معاملہ کرتی ہے وہ درحقیقت بیع وشراء کا معاملہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ عوامی ملکیت سے استفادہ کا جو حق کسی شخص یا سوسائٹی کو دیتی ہے اس کے بالمقابل اس سے معاوضہ (Compensation) وصول کرتی ہے تاکہ انتظامی امور وغیرہ کے مصارف بھی پورے ہوں اور استفادہ کرنے والوں کی طرف سے مفادِ عامہ کے لیے کچھ عطیہ (Contribution) بھی ہو، یہ موجودہ عرف کے مطابق ہے اور حالات بھی اسی کے متقاضی ہیں اس لیے یہ معاملہ کرنا بالکل درست ہوگا۔

سڑکوں کے کنارے سرکار کی طرف سے لگائے گئے درخت یا سرکاری زمین میں پیدا ہونے والے خودرو درختوں کے نیلام وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔

۲- ٹھیکے دار کا اس طرح حاصل کردہ مچھلیوں کو بیچنا اور کسی مسلمان کا اس سے خریدنا:

جب ٹھیکہ جائز ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا تو مچھلیوں کی بیع وشراء کے ناجائز ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، اور اگر بالفرض بیع ناجائز ہے تو خریدنے والے پر ایسے امور کی تحقیق کی کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جب کہ موجودہ دور میں کاروبار اور تجارت ایک پیچیدہ اور اجتماعی عمل ہے، ہمیں کریدنے اور فقہی موشگافیاں کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ ''یسّروا ولا تعسروا'' (آسانی پیدا کرو، سختی نہ کرو)۔

۳- شکار سے پہلے مچھلیاں فروخت کرنا:

ذاتی ملکیت کے حوض یا تالاب کی مچھلیاں شکار کرنے سے پہلے فروخت کی جاتی ہیں وہ معدوم چیز کی بیع نہیں ہے، بلکہ تالاب میں موجودہ مچھلیوں کی بیع ہے، جن کی تعداد یا مقدار کا اندازہ لگایا جاتا ہے، تخمینہ کی بیع کی بعض صورتیں جو ضرورت کے اعتبار سے ہیں جائز ہیں، مثلاً درختوں پر پھلوں کی بیع جن کی تعداد ٹھیک سے معلوم نہیں ہوتی، اسی طرح ''بیعِ جزاف'' (اندازہ سے مال کی بیع) جس کے بارے میں صاحب ''فتح الباری'' نے حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت:

''لقد رأيت الناس في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم يبتاعون جزافا يعني الطعام''

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ غذائی اشیاء تخمینہ سے خریدتے تھے) کی تشریح میں لکھا ہے کہ:-

''وفي هذا الحديث جواز بيع الصبرة جزافا سواء علم البائع قدرها أم لم يعلم'' (فتح الباری ۴/۲۷۹)۔

(اس حدیث میں جواز ہے تخمینہ کی بنیاد پر مال کے ڈھیر کی بیع کا، خواہ بائع کو اس کی مقدار معلوم ہو یا نہ ہو)۔

اور ''فقہ السنہ'' میں ہے:

''الجزاف: هو الذي لا يعلم قدره على التفصيل۔ وهذا النوع من البيع كان متعارفا عليه۔ بين الصحابة على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقد كان المتبايعان يعقدان العقد على سلعة مشاهدة لا يعلم مقدارها الا بالحزر والتخمين من الخبراء، وأهل المعرفة الذين يعهد فيهم صحة التقدير، فقلما يخطئون فيه، ولو قدر أن ثمة غررا فإنه يكون يسيرا يتسامح فيه عادة لقلته'' (فقہ السنہ لسید السابق ۳/۱۵۶)۔

(جزاف وہ چیز ہے جس کی مقدار تفصیلی طور پر معلوم نہ ہو، اور اس نوعیت کی بیع عہد رسالت میں صحابہ کے درمیان متعارف بھی تھی، چنانچہ بائع اور مشتری ایسے مال کا سودا کرتے تھے جو دیکھا تو جا سکتا تھا، لیکن اس کی مقدار معلوم نہیں ہوتی تھی بجز اس کے کہ تجربہ کار اور ایسے جاننے والے لوگوں کے ذریعہ جو صحیح اندازہ لگانے میں ماہر تھے اندازہ اور تخمینہ لگایا جاتا تھا، اس میں غلطی بہت کم ہوتی تھی، اور اگر اس میں غرر ہوتا بھی تھا تو تھوڑا جس کو معمولاً نظر انداز کیا جاتا ہے)۔

''قال ابن عمر رضي الله عنهما: كانوا يتبايعون الطعام جزافا بأعلى السوق، فنهاهم الرسول ﷺ أن يبيعوه حتى ينقلوه''

(ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ لوگ غذائی اجناس کا بھرے بازار میں اندازہ سے لین دین کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں منع کیا کہ جب تک اسے دوسری جگہ منتقل نہ کر دیں فروخت نہ کریں)۔

''فالرسول أقرهم على بيع الجزاف، ونهى عن البيع قبل النقل فقط''

(تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تخمینہ کی بیع پر قائم رکھا اور صرف اس بات سے منع فرمایا کہ مال کی منتقلی سے پہلے اس کو (پھر) نہ بیچیں)۔

''قال ابن قدامة: يجوز بيع الصبرة جزافا لا نعلم فيه خلافا، إذا جهل البائع والمشتري قدرها''

(ابن قدامہ کہتے ہیں: ڈھیر لگے ہوئے مال کی بیع تخمینہ لگا کر جائز ہے، اس میں کسی اختلاف کا ہمیں علم نہیں، جبکہ بائع اور مشتری کو اس کی مقدار معلوم نہ ہو)۔

کہا جا سکتا ہے کہ مال کا ڈھیر ایک مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے جبکہ تالاب کی مچھلیاں مشاہدہ میں نہیں آتیں، لیکن اس فرق کے باوجود دونوں کی بنیاد تخمینہ ہی ہے اور تالاب کی مچھلیوں کے سلسلہ میں ضرورت اس بات کی داعی ہے کہ تخمینہ کی بنیاد پر ان کی بیع کا معاملہ کسی کے ساتھ کیا جائے اور موجودہ زمانہ کا عرف بھی یہی ہے، اگر اس کو جائز نہیں قرار دیا گیا تو تالاب کی مچھلیوں کی فروخت کی کوئی عملی شکل غالباً نکالی نہیں جا سکے گی، اس لیے رفعِ حرج کے لیے اسے جائز قرار دینا ہوگا۔

۴- بارش کی وجہ سے تالابوں میں آنے والی مچھلیاں:

عوامی ملکیت کے تالاب وغیرہ میں بارش وغیرہ کی وجہ سے جو مچھلیاں آگئی ہوں ان کو ٹھیکہ پر دینا جائز ہوگا، جیسا کہ سوال نمبر ۱ کے جواب میں بیان فرمایا گیا، یہ درحقیقت بیع نہیں، بلکہ عوامی ملکیت کے لیے Contribution یا استفادہ کا معاوضہ Compensation ہے۔

رہا نجی ملکیت میں بارش وغیرہ کی وجہ آئی ہوئی مچھلیوں کو فروخت کرنا یا ٹھیکہ پر دینا تو یہ بھی جائز ہوگا، کیوں کہ مچھلیاں نجی ملکیت کے تالاب میں آجانے کے بعد اس شخص کی ملک قرار پائیں جو تالاب کا مالک ہے۔

☆☆☆

تالاب وحوض کی مچھلیوں کی فروختگی کا حکم

مفتی عبداللہ مظاہری[1]

حوض، نہر، تالاب وغیرہ کے سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں جدا جدا ہیں۔

مچھلی پر ثبوت ملکیت اور اس کے بعد بیع کا جواز وعدم جواز، اب مچھلی پر ملکیت کا ثبوت متعدد طریقہ سے ہوتا ہے، مثلاً از خود مچھلی پکڑ کر اس میں ڈال دیا، باضابطہ اس کے بچوں کو چھوڑا تو ان صورتوں میں مچھلی پر ثبوت ملکیت ہو جاتی ہے، یا از خود مچھلی تو نہیں چھوڑی، لیکن سیلاب وغیرہ کے پانی وبارش کی وجہ سے آگئی تو اسکی دو صورتیں ہیں: اگر تالاب پہلے سے مچھلی کے لیے تیار کیا گیا ہے تو مچھلی بھی صاحب تالاب کی ہوگی اور اگر پہلے سے مہیا نہیں کیا ہے تو مچھلی صاحب تالاب کی مملوک نہیں ہوگی، بلکہ جو اس کو پکڑ لے اس کی وہ مچھلی مملوک ہوگی جیسا کہ علامہ ابن الھمامؒ نے لکھا ہے۔ (دیکھئے: فتح القدیر ۶/۴۹)۔

اسی طرح تالاب کا کوئی سرا کسی نہر وغیرہ سے ملا ہوا ہو جس سے ہو کر مچھلی آیا جایا کرتی ہو، تو اس صورت میں مچھلی پر ثبوت ملکیت کے لیے تالاب کے منہ کو بند کرنا ضروری ہوگا اور اگر تالاب کے منہ کو بند کر دیا ہے، تو مچھلی اس کی ملکیت شمار ہوگی، لیکن اس میں احتمال یہ ہے کہ اگر یہ بند مالک تالاب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص لگا دے تو بند لگانے والا مالک ہوگا، یا مالک تالاب اس کا مالک ہوگا، اس سلسلے میں حضرت تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں: ''اگر پہلے سے وہ تالاب مچھلی کے لیے تیار کی گئی تھی تو مالک تالاب ہی مالک ہوگا، بند لگانے والا نہیں ہوگا، لیکن اگر پہلے سے اس مقصد کے لیے نہیں تھی تو مقتضاء قواعد کی رو سے بند لگانے والا مالک ہوگا اور مالک تالاب پر جمع کرنا نہیں ہوگا، تاہم بند لگانے والے پر فوراً مچھلی خالی کرنا ضروری ہوگا، تاکہ اس کی ملکیت مشغول نہ ہو، لیکن اگر ایسی صورت میں دونوں کا اختلاف ہو جائے اور صاحب تالاب کہے کہ میں نے مچھلی کے لیے ہی تیار کیا ہوں تو اس کے قول کا اعتبار کر کے اسی کی مچھلی تسلیم کی جائے گی۔ (امداد الفتاوی ۳/۴۶۰)۔

مچھلی پر ملکیت کے ثبوت اور عدم ثبوت کی تفصیل کے بعد دیکھنا ہے کہ کن صورتوں میں مچھلیوں پر ملکیت کا ثبوت ہوتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں: یا تو بغیر کسی حیلہ مثلاً جال کانٹا وغیرہ ڈالے ہوئے مچھلی نکال لی تو اس کو فروخت کرنا جائز ودرست ہے، اس لیے کہ یہ مملوک بھی ہے اور مقدور التسلیم بھی ہے، لہذا بیع کے عدم جواز کا کوئی سوال نہیں، لیکن مشتری کو خیار رؤیت حاصل ہوگا، پانی کے اوپر سے دیکھ لینا کافی نہیں ہوگا۔

اور اگر تالاب اور حوض اتنا بڑا ہے کہ بغیر کسی حیلہ کے مچھلی نہیں نکال سکتے تو ایسی صورت میں بغیر نکالے ہوئے مچھلی کا فروخت کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ یہ اگر چہ مملوک ہے مقدور التسلیم نہیں، چنانچہ حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے: ''قال لا تبایعوا السمك في الماء فإنه غرر'' یعنی مچھلی کو پانی میں رہتے ہوئے فروخت مت کرو اس لیے کہ یہ غرر اور دھوکہ کا باعث ہے، اس کا مطلب یہی ہے، جبکہ بڑے حوض یا تالاب میں مچھلی ہو جو بغیر حیلہ کے نہیں نکل سکتی ہو۔

چنانچہ اس تفصیل سے جمیع سوالات کے جوابات ہو گئے کہ اگر بڑے تالاب میں مچھلی ہو جو بغیر حیلہ کے مچھلیوں کا نکالنا غیر مقدور التسلیم ہو اگر چہ اس کی بیع وشراء عام ہو جائے، جائز نہیں ہے، اس لیے کہ عقد بیع کے لیے فی الحال بیع کا مقدور التسلیم ہونا شرط ہے، اگر معجوز التسلیم ہو تو عقد منعقد نہیں ہوگا (دیکھئے: بدائع ۵/۱۴۷)۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر عرف وعادت میں اس قسم کے عقود کا جواز ہوتا رہے تو پھر کوئی بھی غیر مقدور التسلیم چیزوں کا عدم جواز باقی نہیں رہے

[1] دار العلوم ہانسوٹ گجرات۔

گا، اس لیے عرف ہوتے ہوئے عدم جواز ہی کی بات کہی جائے گی، اب ٹھیکے دار کا اس قسم کی مچھلیوں کو بیچنا اور مسلمانوں کو جانتے ہوئے خریدنا کیا حکم رکھتا ہے، یہ ایک سوال ہے جس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ وہ تمام صورتیں جس میں مچھلیاں مملوک تو ہوں، البتہ غیر مقدور التسلیم ہوں ان کی بیع کرنا بیع فاسد ہے، چنانچہ ٹھیکیدار کا اس طریقہ سے کسی تالاب والے سے مچھلی خریدنا فاسد بیع کرنا ہے، اس پر ضروری ہے کہ بیع کو ترک کردے، لیکن اگر اس نے بیع کو رد نہیں کیا، بلکہ محض نکال کر بازاروں میں فروخت کردیا تو ایسی صورت میں بغیر علم کے اس کو خریدنا بلا کراہیت جائز ہے، اس لیے کہ فساد بیع کا حکم ٹھیکیدار تک ہی محصور تھا، جب اس نے غیروں کے ہاتھ فروخت کردیا تو وہ حکم زائل ہوگیا اور غیر کی ملکیت ثابت ہوگئی اور اس کے لیے اس کا استعمال کرنا جائز اور حلال ہوگیا، تاہم ٹھیکیدار کے لیے وہ کمائی حلال و پاکیزہ نہیں ہوگی، اور اگر فساد بیع کا علم ہوتے ہوئے خریدتا ہے تو ایسی صورت میں اس کے لیے خریدنا مکروہ ہے، اس سے احتراز کرنا ضروری ہوگا، البتہ حضرت علامہ شامی نے مطلقاً بیع کو مکروہ قرار دیا ہے اور دلیل یہ پیش فرمائی ہے کہ چوں کہ ٹھیکیدار تو یہ چیز ناجائز طریقہ سے حاصل ہوئی ہے، اب اگر کوئی خریدتا ہے، تو گویا جس چیز کا فسخ واجب و ضروری تھا اس سے اعراض کرنا لازم آئے گا، لہذا اشراء فی نفسہ مکروہ ہوگی۔ (شامی ۴/۱۴۵)۔

لیکن حضرت علامہ کی بات اتنی متحقق ضرور ہے، لیکن انسانوں کے ابتلاء کا بھی خطرہ ہے، کیوں کہ فاسد عقود بہت لوگ کرتے ہیں اور خریدنے والے خریدتے رہتے ہیں جس میں عالم و جاہل سب برابر ہے، تو ایسی صورت میں سبھی کے لیے مکروہ بیع کا کرنے والا لازم آئے گا، لیکن اگر اس کو وجود علم پر محمول کرلیں گے تو بہت سے لوگ اس سے نکل جائیں گے، بندہ کی یہی رائے ہے۔

نوٹ:...... جاننا چاہیے کہ علامہ شامی کے کراہت کا مطلب صرف شراء مکروہ ہے، نہ کہ وہ اشیاء، بلکہ اشیاء علی حالہ حلال و جائز ہوں گی،

قال الشامي إن نفس الشراء مكروه۔

اور وہ تمام صورتیں جس میں مچھلیاں دوسروں کے ہاتھ بیچنا ہے تو دوسروں کے لیے خریدنا نہیں، اس لیے کہ جس کی ملکیت میں کوئی چیز نہ ہو، پھر اس نے فروخت کردی تو مشتری کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی، بلکہ وہ چیز بطور امانت ہوگی اور یہ بیع از روئے شرع باطل کہلائے گی (۴/۱۱۹)۔

☆☆☆

پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت

مفتی عبدالرحمن صاحب[1]

او ۲- یہ صحیح ہے کہ ندی، نالے اور نہریں کسی شخص کی ملک نہیں ہیں، بلکہ سرکار کی ملک ہیں، لیکن ان میں موجود مچھلیاں سرکار کی ملک نہیں ہیں، اگر کوئی شخص کسی ندی، یا نالے یا نہر میں سے مچھلی پکڑ لے تو وہ ان کا مالک ہو جائے گا۔ اگر چہ اس کا یہ فعل خلاف قانون ہو، تاہم شرعاً وہ ان کا مالک ہو جائے گا، جن لوگوں نے ٹھیکہ لیا ہے انہوں نے رقم دے کر قانونی اجازت مچھلی کے شکار کرنے کی حاصل کی ہے جس کی وجہ سے قانوناً ایک خاص رقبہ سے ایک خاص مدت کے لیے شکار کرنا۔ ان کے لیے جائز ہو گیا ہے، لہذا جو مچھلی وہ پکڑیں گے ان کے وہ مالک ہوں گے اور شکار کرنے کے بعد ان کو ان مچھلیوں کا فروخت کرنا درست ہوگا، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ندی، نالے نہر کی مچھلیاں کسی کی ملک نہیں ہیں تو ان کی بیع کا بھی کسی کو حق نہیں ہے بلکہ وہ مباح الاصل ہے، جو بھی پکڑے گا وہ ہی ان کا مالک ہوگا اور مالک ہونے کے بعد ان کا فروخت کر دینا یا استعمال میں لانا درست ہوگا۔

۳- ۔ جو تالاب یا حوض کسی کی ذاتی ملکیت ہے اور اس نے مچھلی پالنے کے لیے ہی اس کو تیار کیا ہے تو جو مچھلیاں اس میں پالی گئیں ہیں وہ بھی اس کی ملکیت ہیں اور جو پانی کی فو کے ساتھ اس میں آ گئیں وہ بھی اسی کی ملکیت ہیں جس کا وہ حوض یا تالاب ہے، اگر وہ حوض یا تالاب چھوٹا ہے کہ بغیر حیلہ کے مچھلیاں اس سے پکڑی جا سکتی ہیں تو ایسے حوض یا تالاب کی مچھلیوں کا بغیر شکار کئے فروخت کر دینا درست ہے۔ اور اگر تالاب بڑا ہے کہ بغیر حیلہ کے مچھلیوں کا شکار نہیں ہو سکتا تو شکار کئے بغیر ان کا فروخت کرنا ممنوع ہے۔

۴- ۔ اگر کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہے لیکن اس کو مچھلی پالنے کے لیے تیار بھی نہیں کیا ہے اور بارش کی رو کے ساتھ جو مچھلیاں اس میں آئیں ہیں ان کے روکنے کا بھی کوئی انتظام نہیں کیا ہے تو اس صورت میں وہ مچھلیاں صاحب حوض کی ملک نہ ہوں گی اور ان کو فروخت کرنا اور ٹھیکہ پر دینا بھی درست نہ ہوگا۔ جو شخص بھی ان کو پکڑ لے گا وہی ان کا مالک ہوگا۔

اسی طرح جو تالاب عوام کی ملک ہے شخصی اور نجی نہیں ہے، اس میں بھی سب کا حق ہے، ہر شخص اس میں سے شکار کر سکتا ہے۔

"ولا يجوز بيع السمك في الماء۔ بيع السمك في البحر أو النهر لا يجوز. فإن كانت له حظيرة فدخلها۔ السمك. فإما أن يكون أعدها لذلك أولا، فإن كان أعدها فما دخلها ملكه وليس لأحد أن يأخذه ثم إن كان يؤخذ بغير حيلة اصطياد جاز؛ لأنه مملوك مقدور التسليم مثل السمكة في جب وإن لم يكن يؤخذ إلا بحيلة لا يجوز بيعه لعدم القدرة على التسليم عقب البيع۔۔۔۔۔" (فتح القدیر ۵/۱۹۱)۔

***

[1] مفتی مدرسہ امینیہ، دہلی۔

پانی میں ہوتے ہوئے مچھلی کی خرید و فروخت

مفتی احمد حسن جے پور

مچھلی کی خرید و فروخت، سڑکوں کے کنارے لگائے ہوئے درختوں کی اور خودرو پودوں کی سرکاری فروختگی، نیلامی، یا بازار کی نیلامی۔ بیع سمک کے سلسلہ میں شرعی احکام و ہدایات اور فقہاء کرام کی صراحتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رہنما ارشادات اور فقہاء کرام کی روایات سے چند امور مستفاد ہوتے ہیں:

الف- غرر خفا اور دھوکہ کی بیع ممنوع ہے۔

ب- نامعلوم و مجہول شئ کی بیع بھی منع ہے۔

ج- جب بیع کی تسلیم و حوالگی کی قدرت نہ ہو تو ایسی بیع بھی صحیح نہیں ہے۔

د- جہاں بائع کی ملکیت شئ مبیع پر تام و کامل نہ ہو ایسی بیع کی بھی اجازت نہیں۔

ھ- صحت و تکمیل بیع کے لیے قبضہ و احراز شرط ہے۔

ندیوں، بندوں، نہروں اور پوکھروں میں پائی جانے والی، پیدا کی جانے والی اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر آتی جاتی رہنے والی مچھلیاں گورنمنٹ کی ملکیت میں داخل ہیں، وہ مچھلیوں کی افزائش نسل، ان کی بقاء و حفاظت اور پیدائش کا نظم چلاتی ہے، مخصوص وقت تک شکار کرنے پر مچھلی پکڑنے پر پابندی لگا کر بڑی ندی یا نہر سے مچھلیاں بندوی تالاب میں لاکر جمع کر کے چھوٹی مچھلیاں پکڑ کر کسی گڈھے یا بندہ میں پالی جاتی ہیں، مچھلیوں کے واسطے ایک مستقل ڈپارٹمنٹ بنایا ہوا ہوتا ہے جس میں بڑی تعداد میں اسٹاف ہوتا ہے، یہ تمام تدابیر و نظم اور تحفظ مالکانہ طور پر ہی کیا جاتا ہے، اندر میں حالات گورنمنٹ کی مالکانہ حیثیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ندیوں، بندوں، تالابوں وغیرہ اور ان میں پائی جانے والی مچھلیوں کی مالک ہوتی ہے، اسے ان کی فروختگی نیلامی اور ٹھیکہ دینے کا حق بھی حاصل ہے جسے عملاً اپنایا بھی جاتا ہے، سرکاری ذمہ دار ٹھیکہ پر دی جانے والی ندی، نالوں، تالابوں، بندوں کو دیکھ کر مچھلیوں کے ہونے کا اور ان کی مقدار کا اندازہ کرتے ہیں۔ تاکہ قیمت یا ٹھیکہ کی رقم طے کی جاسکے۔

اسی طرح، بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی مچھلیوں کا خریدار یا ٹھیکہ لینے والا ان علاقوں کا سروے کرتا ہے، مچھلیوں کی نقل و حرکت سے کبھی ان مقامات پر کھانے کی اشیاء ڈال کر مچھلیوں کے جمع ہو جانے سے اور پھر اپنی مخصوص بصیرت سے مچھلیوں کی قسمیں جانتا اور ان کی مقدار کا یقین حاصل کرتا اور پھر خریداری یا ٹھیکہ لینے کیطرف قدم بڑھاتا ہے، ان حالات میں مبیع کے نامعلوم یا مجہول ہونے کی صورت باقی نہیں رہا کرتی ہے مبیع کے ایک ایک جز کا جاننا بیع کے لیے ضروری بھی نہیں ہے، شئ مبیع کی اسی قدر معلومات کافی بھی ہوتی ہے، اس کے بعد ہی وہ قیمت یا رقم بتا کر ٹھیکہ اپنے نام کرالیتا ہے، اس کے بعد مقام ٹھیکہ کی حفاظت کرتا ہے، جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں مچھلیوں کے چلے جانے کی راہیں بند کر کے قبض و احراز کی شکل پیدا کرتا ہے، بعد ازاں مدت ٹھیکہ میں مچھلیاں پکڑی اور فروخت کی جاتی ہیں، نظر بریں حالات فروختگی و ٹھیکہ کی یہ صورت پھر مچھلیوں کو شمار کر کے فروخت کرنا اور مسلمانوں کا انہیں خریدنا جائز و صحیح ہے۔

”لو سد مقام الدخول حتى صار بحيث لايقدر على الخروج فقد صار أخذاله بمنزلة مالو وقع فى شبكة فيجوز بيعه“ (عینی)۔

بڑی ندی، یا نہر سے کسی بندہ و تالاب کا تعلق ہو وہاں سے آنے والی مچھلیاں بندہ و تالاب میں آکر جمع ہوتی رہیں تو اس بندہ و تالاب کو ایک حفیرۂ کبیرہ کی حیثیت دی جائے گی اور اس کی مچھلیاں قبضہ و احراز ہی کی شکل میں مانی جائیں گی، بندوں تالابوں کا بنایا جانا پانی جمع کرنے کے لیے تو ہوتا

ہی ہے، ایک مقصد ارادی یا عملی پر بھی ہوتا ہے کہ یہاں مچھلیاں آ کر جمع ہوں تو انہیں فروخت ونیلام کیا جائے، اسی قسم کے بندوں تالابوں کی مچھلیوں کا فروخت کرنا ٹھیکہ دینا، ٹھیکیدار کا شکار کر کے بیچنا اور مسلمانوں کا خریدنا جائز وصحیح ہوگا۔

''جاز بیعه، لأنه مملوك مقدور التسليم مثل السمكة فی جب'' (فتح القدیر ملتقطاً)

اگر بندوں، تالابوں کا مقصد وغرض مچھلیوں کا جمع کرنا نہ ارادی ہو اور نہ عملی ہو تو اس صورت میں قبض واحراز بھی نہ ہوگا اور ایسی مچھلیوں کا فروخت کرنا، ٹھیکہ دینا، ٹھیکہ لینا، خریدنا جائز ودرست نہ ہوگا

''وإن لم يكن أعد لذلك لا يملك ما يدخل فيها فلا يجوز بيعه لعدم الملك'' (فتح القدیر)

وہ بندہ اور وہ تالاب وگڈھے جو خاص شخص یا خاص برادری یا خاص پنچایت کی ملک ہوں ان میں پائے جانے والی مچھلیوں کا شکار کرنا پھر فروخت کرنا بھی (مالک سے شرعی معاملہ کئے بغیر) جائز وصحیح نہیں، اور ایسی فروخت ہونے والی مچھلی کا مسلمان کے لیے خریدنا بھی جائز نہیں۔

بندوں، تالابوں میں جمع ہو جانے والی وہ مچھلیاں جن کے ندی ونہر سے آنے والے راستوں کو روک کر مچھلیوں کے واپس چلے جانے والے راستوں کو مسدود نہ کیا گیا ہو، ایسے بندوں تالابوں کی مچھلیاں بھی قبض واحراز میں شامل وداخل نہ سمجھی جائیں گی اور ان کی فروخت اور مسلمانوں کا انہیں خریدنا بھی جائز نہ ہوگا۔ سڑکوں کے کنارے سرکاری لگائے ہوئے درخت یا سرکاری زمین وپہاڑوں پر پائے جانے والے سرکار کے لگائے ہوئے یا خودرو درختوں اور ان سے حاصل ہونیوالے اجزا کی فروختگی ونیلامی پر بھی وہی فقہی فتاوی فیصلہ کن ہوں گے جنہیں مچھلی کے سلسلہ میں اوپر بتایا گیا ہے، ان درختوں کا معاملہ تو مچھلیوں سے بھی زیادہ واضح ہے، ان پر سرکار کی ملکیت تو یقینی ہے ہی اور خریدار وٹھیکہ دار انہیں چشم خود دیکھ کر معلومات ویقین بھی حاصل کر لیتا ہے، یہ درخت اور ان سے حاصل ہونے والے اجزاء موجود ہوں اور مقدور التسلیم بھی ہوں تو ان کی بیع وٹھیکہ اور فروختگی وخریداری کے جواز میں بھی شک نہیں کیا جائے گا۔

نوٹ: بازار کے سرکاری نیلامی کا معاملہ بھی بیع سمک کے ذیل میں درج شدہ روایات کی روشنی میں طے کر کے لایا جا سکے گا۔

☆☆☆

سرکاری تالاب کی مچھلیاں بغیر شکار کے خرید وفروخت کرنا

مولانا محمد زید مظاہری ندوی[1]

جواب نمبر ۱- سرکاری تالاب، ندیوں اور نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع عرف ورواج کے مطابق قطعی ناجائز ہے، لیکن مچھلیوں کے مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے نہیں (جیسا کہ سائل نے سوال میں ذکر کیا ہے)، بلکہ عدم جواز کی اصلی علت مچھلیوں کا غیر مملوک ہونا ہے، بالفرض اگر مبیع کی جہالت مرتفع بھی ہوجائے۔ اور وہ مقدور التسلیم بھی ہو تب بھی غیر مملوک ہونے کی وجہ سے اس کی بیع درست نہ ہوگی، دیکھئے: (بدائع الصنائع ۵ / ۱۴۶)۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ بیع کی صحت کے واسطے مبیع کا مملوک ہونا ضروری ہے، لہٰذا ایسی اشیاء جو مباح الاصل ہونے کی وجہ سے کسی خاص شخص کی ملک نہ ہوں ان کی بیع اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک کہ وہ بائع کی ملکیت میں نہ آجائیں، اور مباح الاصل اشیاء کا مالک ہونا یہ موقوف ہے قبضہ واحراز پر، لہٰذا جب تک مچھلیوں کا احراز وقبضہ نہ ہوجائے اس وقت تک ان کی بیع درست نہ ہوگی اور پکڑنے کے بعد جو بھی اس پر قابض ومالک ہوگا اس کا بیچنا درست ہوگا۔

صورت مسئولہ میں احراز وقبضہ اور ملک نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیع باطل ہے جس کا وجود وعدم برابر ہے۔

محقق تھانویؒ ایسی مچھلیوں کی بیع کی بابت فرماتے ہیں کہ "یہ دراصل بالکل حرام ہے، ایسی بیع بالکل درست نہیں محض باطل ہے"، دیکھئے: (صفائی معاملات/ ۶)۔

جنگل میں پائی جانے والی لکڑیاں، خودرو گھاس وغیرہ سب کا یہی حکم ہے، البتہ سرکار نے جو درخت خود لگائے ہیں، سرکار کی اجازت کے بغیر ان کو کاٹنا درست نہیں، کیوں کہ وہ سرکار کی ملک ہیں، جیسے کہ مچھلیوں کو خود پالنے سے وہ اس کی ملک ہوتی ہیں۔

سرکاری تالاب ونہروں سے پکڑی ہوئی مچھلیوں کو خریدنا:

جواب نمبر ۲- چوں کہ یہ بیع باطل ہے جس کا وجود وعدم برابر ہے، ملک نہ ہونے کی وجہ سے بیع کا انعقاد ہی نہیں ہوتا، اس لیے بیع کے بعد بھی نہ ٹھیکیدار اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ ہی ٹھیکیدار کو اس حالت میں مچھلیوں کا فروخت کرنا درست ہے، جو بھی ان مچھلیوں کو پکڑے گا وہی اس کا مالک ہوگا، اس کے لیے اس کا بیچنا، کھانا، پینا درست ہوگا۔ ٹھیکیدار بھی پکڑ کر فروخت کرے گا تو اس کے لیے بھی جائز ہوگا، اور دوسروں کے لیے اس سے خریدنا بھی درست ہوگا، لیکن یہ جواز بیع کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ پکڑنے کے بعد اب وہ اس کا مالک بن گیا۔

البتہ وہ ٹھیکیدار اس میں سے پکڑ کر جو فروخت کرے گا، چوں کہ پکڑنے سے اس کی ملک میں داخل ہوگئی یہ بیع درست ہوگی، لیکن اگر کسی غیر نے مچھلیاں پکڑ لیں اور ٹھیکیدار نے اس سے چھین کر فروخت کیں تو نہ ان کا بیچنا درست ہے اور نہ اس کا خریدنا درست ہے جس کو حال معلوم ہو (ایضا)۔

ذاتی اور شخصی تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت:

فقہاء کی تصریح کے مطابق انعقاد بیع کے واسطے جس طرح مبیع کا مملوک ہونا شرط ہے اسی طرح بیع کی صحت کے واسطے مبیع کا معلوم ومقبوض اور مقدور التسلیم ہونا بھی شرط ہے، مبیع کے غیر مملوک ہونے سے جس طرح بیع باطل ہوتی ہے اسی طرح مبیع کے مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے سے صحیح قول کے مطابق بیع فاسد ہوتی ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵ / ۱۴۷، فتح القدیر ۴ / ۱۱۳)۔

اس سلسلہ میں بعض صریح نصوص (احادیث مرفوعہ) بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی میں موجود مچھلی کی بیع جائز نہیں۔ چنانچہ مسند احمد میں

---

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مرفوع حدیث میں آیا ہے:

''لا تشتروا السمك فی الماء فإنه غرر'' (فتح الباری ۴/۴۱۸) (پانی میں موجود مچھلی کو مت خریدو کیوں کہ اس میں غرر (دھوکہ) ہے)۔

نیز حضرت عمران بن حصین اور حضرت عمرؓ سے بھی ایک روایت میں اس کی ممانعت آئی ہے (عمدۃ القاری ۹/ ۳۵۷)۔

چوں کہ پانی میں مچھلی کی بیع کا عدم جواز منصوص ہے، اس لیے نص صریح کے ہوتے ہوئے نہ تو اس میں قیاس کی گنجائش ہوسکتی ہے اور نہ ہی عموم بلویٰ وعرف عام کا سہارا لے کر نص میں تخصیص کی جاسکتی ہے، کیوں کہ وہ نص کی تخصیص نہیں، بلکہ اس سے نص کا ترک لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں، علامہ شامیؒ نے ''رسم المفتی'' میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ دیکھئے: (رسم المفتی/ ۹۹)۔

اور یہ ایک ایسا اجماعی اور متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اب اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں، دیکھئے: (موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی/ ۱۷۷)۔

البتہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ابن ابی لیلی سے مروی ہے کہ ان دونوں حضرات نے بڑے تالاب کے پانی میں بھی مچھلی کی بیع کو جائز قرار دیا ہے (رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ/ ۱۳۰)، طبری کی تصریح کے مطابق ابن سیرینؒ کے نزدیک بھی بیع غرر جائز ہے (دیکھئے: فتح الباری ۴/ ۴۱۸)، لیکن ان حضرات کے قول کی نہ تو کہیں تفصیلات ملتی ہیں، نہ اس کے حدود وشرائط اور نہ ہی مآخذ ومستدلات، نیز یہ قول نصوص صریحہ اور اصول فقہیہ کے بھی خلاف ہے، اس لیے یہ قول مردود نا قابل اعتبار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ متقدمین ومتاخرین میں سے کسی نے اس قول کو نہیں اختیار کیا، بلکہ لا یعبأ بہ سمجھ کر اکثر فقہاء نے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

علامہ عینی نے امام رافعی ونووی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اگر پانی تھوڑا اصاف شفاف ہو جس سے مچھلیاں نظر آتی ہوں اور ان کا پکڑنا آسان ہو تو قدرت علی التسلیم کی وجہ سے اس کی بیع جائز ہے، لیکن اگر پانی زیادہ یا ایسا ہو کہ مچھلیاں باہر سے نظر نہ آتی ہوں تو پھر اس کا عدم جواز متفق علیہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، دیکھئے: (عمدۃ القاری ۹/ ۳۵۷)۔

خلاصۂ بحث:

حاصل کلام یہ کہ زیر بحث مسئلہ میں پانی کے اندر پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع (گو وہ بائع ملک ہی کیوں نہ ہو) بیع فاسد اور ناجائز ہے، کیوں کہ یہ مبیع مجہول ہونے کے ساتھ ساتھ غیر مرئی، غیر مقبوض، غیر مقدور التسلیم ہے اور ان امور سے ایک علت بھی بیع کو فاسد کردیتی ہے، چہ جائیکہ کئی علتیں مجتمع ہوجائیں، جو معاملہ کو فاسد کرنے والی ہوں، اس لیے یہ بیع درست نہیں۔ ذاتی تالاب وحوض کی مچھلیوں کو بھی شکار سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں، لیکن اس کے باوجود اگر کسی نے ایسی بیع کی ہے تو وہ بیع باطل نہیں، بلکہ فاسد ہوگی، اور اس میں بیع فاسد کے احکام جاری ہوں گے، جس کے احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱- بیع فاسد میں مشتری قبضہ کے بعد مبیع کا مالک ہوجاتا ہے، لیکن یہ ملک خبیث ہوتی ہے۔

۲- اس بیع کو ختم کرکے دوبارہ صحیح طریقہ سے بیع کرنا ضروری ہے۔

۳- مشتری کے لیے قبل القبض اس میں تصرف کرنا جائز نہیں۔

۴- اور بعد القبض دیگر تصرفات مثل ہدیہ اور بیع تو جائز ہے، لیکن خود اس کو کھانا جائز نہیں۔

۵- البتہ دوسروں کے لیے اس سے خرید کر کھانا جائز ہے، نیز اس کا ہدیہ بھی جائز ہے۔

۶- لیکن چوں کہ ملک ذریعہ بیع ہوئی ہے، اس لیے عام لوگوں کو بھی جانتے ہوئے اس کا خریدنا کراہت سے خالی نہیں، بیع فاسد کے یہ احکام کتب فقہ: ''شامی وبحر الرائق'' وغیرہ میں مذکور ہیں، دیکھئے: (درمختار وشامی ۴/ ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۳۰)۔

محقق تھانویؒ فرماتے ہیں:

''بیع فاسد سے شئی مبیعہ میں جو حرمت وخباثت آتی ہے وہ صرف مشتری اول کے لیے ہے۔ اس کو واجب ہے کہ اس بیع کو فسخ کرے، اور جو شخص اس مشتری سے آئندہ خرید لے یا مشتری اس کو بطور ہدیہ دے اس کو حلال ہے، اور بیع باطل سے جو حرمت آتی ہے وہ کبھی زائل نہیں

ہوتی''۔ دیکھئے: (مرقاۃ شرح مشکوۃ ۶/ ۷۶، شامی ۴/ ۱۳۰)۔

ذاتی تالاب میں ازخود آجانے والی مچھلی کا حکم:

مچھلی کا مالک ہونا اور اس کی بیع کا جائز ہونا دونوں مسئلے علحدہ علحدہ ہیں، دونوں میں کوئی تلازم نہیں، ملک کا مدار تو مچھلی کے اخذ واحراز پر ہے، خواہ وہ احراز حقیقتاً ہو یا حکماً اور بیع کی صحت کا مدار مقدور التسلیم ہونے پر ہے، دیکھئے: (امداد الفتاوی ۳/ ۵۰، فتح القدیر)۔

لہٰذا اگر کسی شخص نے مچھلیاں پکڑ کر اپنے تالاب میں ڈالی ہیں تو پکڑنے کی وجہ سے وہ اس کی مملوک ہیں، باہر نکالنے کے بعد ان کا فروخت کرنا دوست ہے۔

اور اگر بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود مچھلیاں ذاتی تالاب میں آگئیں تو اب دیکھنا چاہیے کہ اس نے اسی مقصد کے لیے، یعنی مچھلی پالنے ہی کے لیے اس تالاب کو تیار کیا ہے، تب بھی وہ شخص ان مچھلیوں کا مالک ہوجائے گا، اور اگر اس مقصد کے لیے تالاب تو نہیں بنایا، لیکن مچھلیاں آجانے کے بعد ان کے روکنے اور مچھلیوں کے باہر جاسکنے کی کوئی تدابیر اختیار کی، مثلاً بند لگادیا تب بھی وہ شخص ان مچھلیوں کا مالک ہوگا، اور اخیر کی یہ دو صورتیں احراز حکمی کی ہیں، دیکھئے:۔ (تبیین الحقائق ۴/ ۴۵، مبسوط سرخسی ۱۳/ ۱۲)۔

لیکن اگر اس شخص نے تالاب کو نہ تو مچھلی پالنے کے لیے تیار کیا ہے اور مچھلیوں کے آجانے کے بعد نہ ہی اس نے ایسی کوئی تدابیر اختیار کی جس سے کہ وہ محفوظ ہوجائیں، باہر نہ جاسکیں، یعنی بند وغیرہ نہیں لگایا تو ایسی صورت میں وہ شخص ان مچھلیوں کا مالک نہ ہوگا گو تالاب اسی کا ہے، کیوں کہ اسباب ملک احراز حقیقتاً یا حکماً نہیں پایا گیا، یہ ساری تفصیلات فقہاء نے کتب فقہ میں تحریر فرمائی ہے، دیکھئے: (شامی ۴/ ۱۰۷، فتح المعین ۲/ ۵۶۹)۔

پھر جن صورتوں میں تالاب کا مالک مچھلیوں کا مالک ہوگا، مچھلیوں کو باہر نکالنے کے بعد ان کی بیع بھی کرسکتا ہے، پانی کے اندر مچھلیوں کی بیع نہیں کرسکتا جس کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی، اور جن صورتوں میں تالاب کا مالک مچھلیوں کا مالک نہیں ہوتا ان صورتوں میں مالک کا ان مچھلیوں کو کسی طرح بھی فروخت کرنا درست نہیں، البتہ نکالنے کے بعد جب وہ مالک بن گیا تو اب درست ہوگا، لیکن اس سے مچھلی پکڑنے کا سب کو اختیار ہے، اور جو بھی اس سے مچھلی پکڑے گا وہی اس کا مالک ہوگا۔

اور تالاب کو ٹھیکہ پر دینا تاکہ مچھلیوں کو پکڑ کر فروخت کرتا رہے یہ شکل بھی ناجائز ہے، کیوں کہ مچھلیوں کا اجارہ تو ہوتا نہیں۔ اجارہ میں تو وہ عین واپس ہوتا ہے اور یہاں مچھلیاں واپس نہ ہوں گی، اس لیے اجارہ کہنا ہی درست نہیں، علامہ شامی نے بھی اسی بناء پر اس کو ناجائز قرار دیا ہے (فتح المعین ۲/ ۵۶۹)۔

اور اگر یہ مچھلیوں کی بیع ہے تو پانی کے اندر مچھلیوں کی بیع کا عدم جواز۔ متفق علیہ ہے کما مر۔

اور تالاب کا اجارہ بھی نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ مقصود تو مچھلیوں کی خرید وفروخت ہے جس کو عرف کی اصطلاح میں ٹھیکہ کہتے ہیں اور حقیقت اس کی بیع ہے، الغرض کسی طرح ٹھیکہ والی مروج صورت کا جواز سمجھ میں نہیں آتا، البتہ اگر واقعی کوئی شخص صرف تالاب کو اجارہ پر اپنی مچھلیاں پالنے کی غرض سے لے تو یہ جائز ہوگا، لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔

☆☆☆

مچھلی کی خرید وفروخت

مفتی انور علی اعظمی [۱]

۱- سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر ان کے نکالے ہوئے ممنوع ہے، اس لیے کہ سرکاری تالاب یا ندی نالے کی مچھلیاں بارش اور سیلاب کے ساتھ آتی اور جاتی رہتی ہیں، لہذا شکار سے پہلے وہ کسی کی ملک نہیں، اس لیے ان کی بیع ایک غیر مملوک کی بیع ہے اور غیر مملوک کی بیع شرعی اصول کے لحاظ سے بیع باطل ہے۔

عرف کی وجہ سے اس مسئلہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، اس لیے کہ اولاً تو اس عرف کے صحیح ہونے میں شبہ ہے، بلکہ زیادہ رجحان اس بات کا ہے کہ یہ عرف عرف فاسد ہے۔ دوسرے یہ کہ عرف مذکور متعدد نصوص کے متعارض ہے، مثلاً:

۱ ''لا تبع ما ليس عندك'' (مغنی مع الشرح الکبیر ۲۷۲/۴)۔

۲ عن ابن عمر وابن مسعود قالا: ''لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر''۔

۳ عن أبي هريرة: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر وبيع الحصاة'' (ترمذی ۱/۱۴۷، وقال الشافعی من بيع الغرر بيع السمك (ایضا))، لہذا اس فاسد اور نصوص کے متعارض عرف کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

۲- مذکورہ بالا صورت معاملہ کے شرعاً ناجائز ہونے کے باوجود ٹھیکیدار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان شخص کا پوری صورت حال جانتے ہوئے ایسی مچھلیاں خریدنا جائز ہے۔

اس لیے کہ ندی نالے اور غیر شخصی تالاب کی مچھلیاں شکار سے پہلے کسی شخص یا سرکار کی ملک نہیں ہیں، بلکہ مباح الاصل ہیں، لہذا سرکار کی بیع ٹھیکیدار کے ہاتھ تو کالعدم ہے، لیکن شکار کے بعد وہ ان مچھلیوں کا مالک ہوگا اور اسے بیچنے کا اختیار حاصل ہوگا، اور جب اسی کا بیچنا درست ہے تو مسلمان کا باوجود صورت حال جاننے کے خریدنا بھی۔ ہے (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۷، ۸/ ۲۴، امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۸-۴۹، وفی الشامی (۴/ ۱۴۷): ''فإنه لو صاد بعد ملکه'')۔

۳- جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے ایسے حوض یا تالاب کی پالی ہوئی مچھلیوں کو شکار سے پہلے بیچنے کا حکم کیا ہوگا؟ اس میں تفصیل یہ ہے:

اگر نجی حوض یا تالاب جس میں مچھلیاں پالی گئیں اتنا چھوٹا ہے کہ مچھلیاں بغیر حیلہ کے پکڑ لی جا سکتی ہیں تو شکار سے قبل ان کی بیع درست ہے، جیسا کہ فتح القدیر (۶/ ۴۹) پر اس کی تفصیل موجود ہے (مغنی مع الشرح الکبیر ج ۴ ص ۲۷۲)۔

اور اگر نجی حوض یا تالاب اتنا بڑا ہے کہ بغیر حیلہ کے مچھلیوں کا شکار ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں مذکورہ حوض یا تالاب کے مچھلیوں کی بیع فاسد ہے، اس لیے کہ مچھلیوں کی مقدار مجہول بھی ہے اور مچھلیاں غیر مقدور التسلیم بھی ہیں۔ (فتح القدیر ۶/ ۴۹)۔

۴- عوامی ملکیت کے حوض یا تالاب کی جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود آگئی ہیں وہ کسی کی ملک نہیں ہیں، بلکہ مباح الاصل ہیں، لہذا ان کی بیع قبل الاصطیاد باطل ہے۔

نجی زمرہ کے حوض یا تالاب میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود آجائیں ان کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ مچھلیوں کے آنے کے بعد حوض اور تالاب کا مالک ان کو روکنے کے لیے کوئی بندوبست کرے، اس صورت میں ان کا مالک ہو جائے گا، اب حوض چھوٹا ہے تو قبل الاصطیاد بیع درست ہو جائے گی اور اگر حوض بڑا ہے کہ بغیر حیلہ کے شکار نہیں ہو سکتا تو قبل الاصطیاد بیع فاسد ہے، اور اگر مالک حوض یا مالک تالاب نے ان کے روکنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا تو وہ اس کی ملک نہیں ہوں گی، لہذا ان کی بیع بھی شکار سے قبل باطل ہوگی (فتح القدیر ۶/ ۴۹، امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۸، شامی ۴/ ۱۴۷)۔

☆☆☆

[۱] دار العلوم مئو، مئو۔

پانی میں مچھلی کی بیع

مولانا منظور احمد قاسمی [1]

آج کے اس دور میں خرید وفروخت کی جہاں بہت سی نت نئی صورتیں اور جدید طریقہ کار وجود میں آئے ہیں، وہیں تالاب میں مچھلیوں کی خرید و فروخت کا معاملہ بھی بکثرت رواج پا گیا ہے، اس میں بعض صورتیں اگر شرعاً درست ہیں تو زیادہ تر صورتیں غیر شرعی ہیں، اس لیے خرید وفروخت کے سلسلہ میں دو باتیں ضروری طور پر سمجھ لینی چاہیے، اول یہ کہ جو بھی کوئی چیز فروخت کرے تو وہ چیز فروخت کرنے والے کی ملکیت میں ہو، دوسری یہ کہ وہ چیز مقدور التسلیم ہو، یعنی اس کی حوالگی وسپردگی باسانی ممکن ہو، چنانچہ وہ چیز اگر ملکیت میں نہ ہو یا ملکیت میں تو ہو لیکن غیر مقدور التسلیم ہو، تو اس کی بیع درست نہیں ہے، مچھلیوں کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں بھی یہی تفصیل ہے۔

سوالوں کے جوابات ترتیب وار ذیل میں ہیں:

۱- سوال میں مذکورہ صورت کہ ایسی ندیوں، نہروں اور نالوں کے خاص حصے جسے سرکار کسی کو ایک معین مدت کے لیے معاوضہ کے طور پر دے دیتی ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اس خاص حصے سے حاصل ہونے والی مچھلیوں کی اسی خاص حصے میں پرورش بھی ہوئی ہو، بلکہ سیلاب کی آمد ورفت کے ساتھ آتی وجاتی رہتی ہیں، تو یہ ظاہر بات ہے کہ معاوضہ کے طور پر اس خاص حصے کو لینے والے کی ملکیت میں یہ مچھلیاں نہیں ہیں، کیوں کہ ملک کے لیے قبضہ یا احراز شرط ہے، جبکہ دونوں یہاں مفقود ہیں، اس لیے ایسی مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر ان مچھلیوں کو نکالے ہوئے باطل ہے۔

''(والسمك قبل الصيد) أی لم يجز بيعه لكونه باع ما لا يملكه فيكون باطلا'' (البحر الرائق ۶/۷۲)

اور یہ حقیقت ہے کہ ملکیت میں ہونا فروخت کی بنیادی شئی ہے، غیر مملوک شئی کو بیچنا گویا بیچنا ہی نہیں ہوا، اس لیے غیر مملوک کی بیع باطل ہوتی ہے اور اس میں تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا ہے، جب عدم ملک کی وجہ سے یہ صورت اصلاً بیع کی ہوئی ہی نہیں تو گو کہ یہ صورت موجودہ عرف میں عام ہو گئی ہے، اس صورت کے جواز کا فتوی دینا درست نہیں ہے، نیز ایسی صورت کا عرف بھی صحیح نہیں ہوگا، بلکہ فاسد ہوگا، اور عرف فاسد پر کسی مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی۔

۲- اور چوں کہ مذکورہ بالا صورتِ معاملہ شرعاً باطل ہے، اس لیے اس طرح سے حاصل کی ہوئی مچھلیاں بیچنا یا کسی مسلمان کو پوری صورت حال جانتے ہوئے ایسی مچھلیوں کو خریدنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ بیع باطل ہے اور ''الباطل لا يفيد ملك التصرف'' (ہدایہ ۳/ ۳۳)۔

البتہ اگر ٹھیکہ اور ان مچھلیوں کے سلسلہ میں قبضہ یا احراز کی کوئی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر ان مچھلیوں کو نکال کر بیع کرتا ہے تو درست ہے، کیوں کہ اب وہ مچھلیاں اس کی ملک ہیں اور مقدور التسلیم بھی۔

۳- جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں ہے اور وہ اس میں باقاعدہ مچھلی پکڑ کر یا خرید کر پرورش کرتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ مچھلیاں اس شخص کی ملکیت میں ہیں، لیکن اگر حوض وتالاب بڑا ہو کہ بغیر کسی تدبیر وحیلہ کے مچھلیاں شکار نہ کی جا سکتی ہوں تو ایسے حوض وتالاب کی مچھلیوں کو شکار کرنے سے پہلے فروخت کرنا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہے اور اگر حوض وتالاب اتنا چھوٹا ہو (مثلاً گڑھا وغیرہ) کہ اس میں سے جب چاہیں بلا تکلف اور بغیر کسی حیلہ وتدبیر کے مچھلیاں پکڑ لیں تو ان مچھلیوں کی بیع پانی میں بھی درست ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں یہ مچھلیاں غیر مقدور التسلیم نہیں ہیں۔

''إذا كان فی حظيرة إذا كان لا يؤخذ إلا بصيد لكونه غير مقدور التسليم، فيكون فاسدا و معناه إذا أخذه ثم

---

[1] مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڑھ۔

ألقاه فیها ولو کان یؤخذ بغیر حیلة جاز'' (البحر الرائق)۔

۴- اگر کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو یا عوامی ملکیت کا اس میں اگر مچھلیاں پالے بغیر بارش کی وجہ سے ازخود پیدا ہوگئی ہوں یا کسی ندی یا سمندر سے ازخود آ گئی ہوں، تو اس کی کئی صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ مذکورہ تالاب جس سے کوئی ندی متصل ہوگئی ہے، تالاب میں مچھلی آجانے کے بعد مدخل بند کر کے تالاب سے مچھلی نہ جانے کا انتظام کر دیا گیا ہے یا یہ کہ مدخل تو بند نہیں کیا گیا ہے یا کہ مدخل تو بند نہیں کیا گیا، لیکن وہ تالاب اسی غرض سے بنایا گیا ہے اور وہ اسی مقصد کے لیے مہیا ہے تو ان دونوں صورتوں میں تالاب میں رک جانے والی مچھلیاں مالک حوض کی ملک میں ہوں گی، اگر حوض میں بارش کی وجہ سے مچھلیاں پیدا ہوگئی ہیں تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں: اگر یہ حوض اسی غرض ومقصد کے لیے مہیا نہیں ہے، تو یہ مچھلیاں صاحب حوض کی ملکیت میں نہیں ہوں گی، خواہ وہ حوض ایسا ہی کیوں نہ ہو کہ اس کی مچھلیاں بلا تکلیف اور بغیر کسی حیلہ کے ہاتھ سے پکڑی جا سکیں۔

''فإن کانت له حظیرة فدخل السمك، فإما أن یکون أعدها لذلك أولا، فإن کان أعد ها لذلك لا یملك ما یدخل فیها الخ، فإن اجتمع بغیر صنعة لم یملکه سواء أمکنه أخذه من غیر حیلة۔أولا'' (فتح القدیر ۶/۴۹)۔

لہٰذا جن صورتوں میں کوئی مچھلیوں کا مالک نہیں ہوتا ہے اور پھر مچھلیوں کی بیع کرتا ہے تو یہ بیع باطل ہے، اور جن صورتوں میں مچھلیوں کا مالک ہو جاتا ہے تو اس میں وہی تفصیل مدنظر رہے گی کہ اگر وہ مچھلیوں کو بغیر اصطیاد کے ہاتھ سے پکڑنے پر قادر ہے تو ان کی بیع پانی میں درست ہے ورنہ نہیں۔

☆☆☆

غیر مقدور التسلیم مچھلی کی خرید وفروخت

مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی[1]

ہندوستان میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کی بعض شکلیں تو وہ ہیں جن میں مچھلی کسی کی مملوک نہیں ہوتی اور بعض صورتیں وہ ہیں جن میں مچھلی مملوک تو ہوتی ہے، لیکن مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہوتی ہے، وہ صورتیں جن میں مچھلی کسی اور شخص کی ملک ہو، دوسرے کو اس کا بیچنا درست نہیں ہے، اسی طرح وہ ندی، نالے تالاب جو کسی کی ملکیت نہیں ہیں، بلکہ وہ سرکاری ہیں اور سرکار نے اسے کسی کو ٹھیکہ پر نہیں دیا ہے، یا ملکیت تو کسی کی ہے، مگر وہ مچھلیاں پالنے کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں، بلکہ مچھلیاں اس میں از خود آ گئی ہوں، اور مالک نے اس کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہو، ان تمام صورتوں میں مچھلی کی بیع شکار کے پہلے غیر مملوک ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ "ہدایہ" میں ہے:

"ولا یجوز بیع السمك قبل الاصطیاد، لأنه باع ما لا یملكه" (باب بیع الفاسد)۔

"شامی" میں ہے: "إنه إذا دخل السمك فی حظیرة، فإما أن یعدها لذلك أولا، وفی الثانی لا یملكه، فلا یجوز بیعه لعدم الملك" (شامی ۴/۱۰۶)۔

اسی طرح وہ ندی اور نالے، اور نہریں اور تالاب جو سرکاری ہیں اور سرکار نے اس میں مچھلی پالن کے لیے کوئی اہتمام نہ کیا ہو، بلکہ سیلاب کی آمد ورفت کے ساتھ یہ مچھلیاں آتی جاتی رہی ہوں، ایسے ندی نالے وغیرہ مباح الاصل ہیں اور ان سے مچھلیاں نکال کر جو تجار بازار میں لاتے ہیں اس کی خرید وفروخت درست ہے، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ یہ مچھلیاں شکار کے پہلے کسی کی ملکیت نہیں ہیں، اس لیے ایسے ندی نالوں کی مچھلیوں کی بیع بغیر شکار کئے ہوئے غیر مملوک ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔

وہ ندی نالے، جو سرکاری ہیں اور سرکار نے اسے کسی کو ٹھیکہ پر دے دیا ہے، اور ٹھیکہ لینے والے اس میں مچھلیوں کے زیرے ڈالے ہوں، یا کم از کم اس کی گھیرا بندی کی ہو کہ مچھلیاں اس حصہ کی آراضی سے باہر نہ جا سکیں، اس صورت میں یہ بیع باطل نہیں ہوگی، کیوں کہ اس حصہ اور تالاب میں موجود مچھلیاں ٹھیکہ پر لینے والے کی مملوک ہیں۔ "شامی" میں ہے: "وإن لم یعدها لذلك لكنه أخذه وأرسله فیها ملكه" (شامی ۴/۱۰۶)۔

غیر مقدور التسلیم مچھلی کی بیع:

جن صورتوں میں مچھلیوں کی ملکیت ثابت ہے، اس صورت میں بھی بغیر شکار کئے ہوئے مچھلیوں کی بیع مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہوا کرتی ہے، اس لیے شرائط کے ملحوظ نہ ہونے کی وجہ سے ایسی بیع قضاءً فاسد ہے، البتہ دیانۃً درست ہے، کیوں کہ مبیع مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے جو فساد آتا ہے وہ شریعت کے کسی حق کی بنا پر نہیں، بلکہ اختلاف اور مفضی إلی النزاع ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، چوں کہ عرفاً وعادۃً مچھلیوں کی بیع بغیر شکار کئے ہوئے اختلاف اور نزاع کا سبب نہیں بنتا، اس لیے علت فساد کے رفع کی وجہ سے، یہ بیع دیانۃً درست ہوگی، (دیکھئے: فیض الباری)۔

لہذا اگر کسی نے اپنی ذاتی ملکیت یا ٹھیکہ پر لیے ہوئے ندی نالے یا تالاب میں مچھلیاں پالیں تو وہ اس کی ملک ہیں، اب اگر اس نے اس تالاب وغیرہ کی مچھلیوں کو بغیر شکار کئے کسی کے ہاتھ بیچ دیا تو یہ بیع مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے کے باوجود دیانۃً درست ہے، کیوں کہ یہ "مفضی إلی النزاع" نہیں ہے، پھر مچھلی خریدنے والے نے جب اسے شکار کر کے یا قبضہ میں لا کر فروخت کیا تو فروختگی کا یہ عمل ہر اعتبار سے درست ہے اور مسلمانوں کا خریدنا جائز اور اس کا استعمال کرنا حلال ہے۔ ایسے حوض یا تالاب جو نجی ملکیت کے ہوں، یا عوامی ملکیت کے، اس کو کسی خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا، بایں طور کہ اس مدت میں ٹھیکہ لینے والے ہی کو اختیار ہو کہ وہ اس تالاب کی مچھلیوں کا شکار کر کے فائدہ اٹھائے، اجارہ کی ایک شکل ہے، گویا زمین کے حصہ کو مالک نے ایک مقررہ مدت کے لیے اجارہ پر دے دیا ہے، کہ وہ اس میں مچھلیاں مارے اور فروخت کرے، اب اگر ٹھیکہ پر لینے والے نے اس حوض یا تالاب سے مچھلیاں شکار کر کے فروخت کیں تو یہ فروختگی درست ہوگی۔

☆☆☆

---

[1] نائب ناظم، امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

تالاب کی مچھلیوں سے متعلق بیع وشراء کے چند اہم مسائل

مولانا اخلاق الرحمن قاسمی [1]

۱- متذکرہ صورت یقیناً شریعت میں ممنوع ہے، جیسا کہ حضرات فقہاء کی صراحت آئندہ آرہی ہے، لیکن مذکورہ صورت ''مبیع کے مجہول یا غیر مقدور التسلیم'' کی وجہ سے اس وقت ممنوع ہے جبکہ یہ صورت مفضی الی النزاع ہو۔ لہذا جو بیع جہالت، اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے مفضی الی النزاع نہ ہو اس کے جواز سے مانع کوئی چیز نہیں بن سکتی، چنانچہ ایک مدت دراز سے ہندوپاک، نیپال اور بنگلہ دیش اور دوسرے ملکوں میں اس طرح کے عقود بکثرت عمل میں آرہے ہیں، لیکن کبھی کوئی نزاعی صورت سننے میں نہیں آئی، اور مزید برآں یہ کہ یہ معاملہ روز افزوں اور روترقی ہے، اس لیے اس وقت کے حالات کے مطابق باوجودیکہ صورت ''بیع فاسد'' کی ہے جائز اور درست ہے۔

اور فقہی اصولوں سے بھی اس مسئلہ کا جواز فراہم ہوتا ہے، چنانچہ اصول یہاں پر یہ ہے کہ جو اشیاء میں التجار کسی خاص چلن کے ساتھ فروغ پاتے ہوں وہ شروط کا درجہ اور مقام حاصل کر لیتی ہیں ''قواعد الفقہ'' میں ہے:

''المعروف بين التجار كالمشروط بينهم''۔

(یعنی جو چیزیں تاجروں کے لین دین میں معروف ہو جائیں وہ مشروط سمجھی جائیں گی)

لیکن اس کا اعتبار بھی اس وقت ہوگا جبکہ یہ نص سے متصادم نہ ہوں، ورنہ مردود قرار دیا جائے گا۔

غرض کہ ہم اس بارے میں صاف طور پر یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں گرچہ بیع فاسد کے وجوہ پائے جارہے ہیں، لیکن چوں کہ وجوہ فساد جس علت پر مبنی ہیں وہ علت چوں کہ پائی نہیں جارہی ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں حضرات اہل علم اور اہل فتاوی کو جائز ہونے کا حکم جاری کرنا چاہیے۔

۲- مذکورہ بالا صورت جائز ہے، لیکن انہی شرطوں کے ساتھ جس کا ذکر ہم تفصیلاً کر چکے ہیں، لہذا اگلی صورت بھی جائز ہوگی، اور مشتری کے لیے اس کی خرید بالکل درست اور جائز ہے، اور اگر ہم مذکورہ صورت کو ناجائز کی فہرست ہیں درج کریں تو بھی بعد کے مشتری کے لیے خریدنے میں کوئی عدم جواز کا پہلو نہیں، کیوں کہ ایسی صورت میں شریعت نے حکم فساد اس لیے جاری کیا ہے کہ متعاقدین میں سے کسی کا یا دونوں کا نقصان نہ ہو، اب اگر جہالت یا غیر مقدور التسلیم کی صورت میں فساد آیا بھی ہے تو نفس مبیع میں نہیں، بلکہ وصف میں آیا ہے اور وہ تعین مقدار جہالت ہے، پھر یہ کہ قبضہ کے بعد جو صورت نزاع کی تھی وہ نہیں رہی، تو اب بعد والے مشتری کے لیے ایسی اشیاء کی خرید میں عند الشرع کوئی امر مانع نہیں۔

۳، ۴- سوال نمبر ۳ اور سوال نمبر ۴ میں خاصا فرق نہیں ہے، اس لیے دونوں سوالوں کا حل مشترکہ طور پر یہ ہے کہ جہاں تک باہر سے پانی کی رو میں آنے والی مچھلیاں ہیں وہ جب تالاب میں آپڑیں تو وہ صاحب تالاب کی ملکیت میں شمار ہوں گی (دیکھئے: امداد الفتاوی ۳/ ۴۹)، یہ صورت جب ہے کہ باہر سے آنے کا طریقہ اپنایا ہو، لیکن اگر مچھلی خود پیدا ہوگئی تو وہ اس کی مملوک نہیں، الا یہ کہ شکار کرے، چہ جائیکہ اس سے قبل بیع کر سکتے ہیں، حوالہ بالا)۔

باقی شقوں کا جواب وہی ہے جو نمبر ۱ / نمبر ۲ / کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں، یعنی چوں کہ ابتلاء عام ہو چکا ہے اور چوں کہ نزاع کی صورت بھی جو جہالت یا غیر مقدور التسلیم کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی تھی وہ بھی نہیں، لہذا ایسے تالاب یا حوض کی مچھلیاں نکال کر ایک خاص مدت میں فروخت کرے، جبکہ مچھلیاں شکار کرنے سے قبل ہی خرید لی گئیں ہیں، اسی طرح ٹھیکہ لینے ہی والے کو یہ اختیار ہو کہ متعینہ مدت میں ٹھیکہ دار ہی حوض وتالاب کی مچھلیوں کا شکار کر کے فائدہ اٹھائے، متذکرہ ہر سہ صورت جائز ہے، جو اخیر کے دو سوالوں میں مذکور ہیں۔

☆☆☆

---

[1] جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا، دھولیہ، مہاراشٹر۔

مچھلی کی بیع سے چند مسائل

مولانا عبدالرحیم صاحب

۱- سرکاری تالابوں، یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کو پنچائیتوں، یا کوآپریٹو سوسائٹی، یا ملاحوں کو ٹھیکہ پر دینا جائز نہیں۔

۲- مذکورہ بالا صورت معاملہ تو شرعاً ناجائز ہے، لیکن ان مچھلیوں کو شکار کرنے کے بعد ٹھیکہ دار خود مالک ہو گئے، اب وہ دوسروں کو بیچیں تو مسلمان کے لیے صورت حال کو جانتے ہوئے بھی ان مچھلیوں کو خریدنا جائز ہے۔

۳: الف- جو حوض یا تالاب اتنا بڑا ہو کہ اس میں سے بغیر حیلہ کے مچھلیاں نہ پکڑی جا سکتی ہوں تو ذاتی اور شخصی ہونے کے باوجود اس میں بغیر شکار کیے مچھلیوں کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

ب- البتہ حوض، یا تالاب اگر اس قدر چھوٹا ہے کہ بغیر حیلہ کے اس میں سے مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہیں تو اس میں مچھلیاں پال کر شکار کرنے سے پہلے اس حوض و تالاب کی تمام مچھلیاں دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے۔

۴: الف- حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو، یا عوامی ملکیت کا اس میں بغیر پالے بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود آئی ہوئی مچھلیوں کا راستہ بند کر دیا گیا ہو، لیکن بغیر حیلہ کے اس میں نہ پکڑی جا سکتی ہوں تو بغیر شکار کیے مجموعی طور پر ان کو فروخت کرنا، یا اس حوض یا تالاب کو خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا شرعاً درست نہیں

ب- یہ حوض، یا تالاب اگر اتنا چھوٹا ہو کہ راستہ بند کرنے کے بعد مچھلیاں نہ نکل سکیں اور بغیر حیلہ کے پکڑی جا سکیں تو بارش کی وجہ سے اس میں آئی مچھلیوں کو مجموعی طور پر فروخت کرنا اور تالاب ٹھیکہ پر دینا درست ہے۔ (خلاصہ شامی۔ ۴/ ۱۰۶، فتاوی عالمگیری ۳/ ۱۱۳)۔

☆☆☆

مچھلی کی بیع سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا عبداللطیف پالنپوری

۱- آج کل عام طور پر سرکاری نہروں اور ندی نالوں کو ٹھیکے پر دینے کا جو رواج ہے کہ ٹھیکے پر لینے والا سرکار کو معاوضہ دیکر نہر اور ندی نالوں کے مخصوص حصہ سے مچھلیاں نکال کر بیچتا ہے یا خود استعمال کرتا ہے یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

''لم تجز إجارة بركة ليصاد منها السمك'' (درمختار)، ''لأن الإجارة واقعة على استهلاك العين، وسيأتي التصريح، بأنه لا يصح إجارة المراعي، وهذا كذلك، ولذا جزم المقدسي بعدم الصحة'' (رد المحتار علی الدر المختار ۴/۱۰۶، ۴/۱۰۷)۔

۲- ذاتی ملکیت کے حوض یا تالاب میں کوئی شخص مچھلیاں پالے اور وہ حوض یا تالاب بڑا ہو اور شکار کرنے سے پہلے حوض یا تالاب کی تمام مچھلیاں دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کردے تو یہ مچھلیاں اگرچہ اس کی مملوک ہیں، مگر غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ان کی بیع فاسد ہے، البتہ اگر حوض و تالاب اس قدر چھوٹا ہو کہ بدون تکلیف و حیلہ اس سے مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہوں اور مچھلیوں کی مقدار بھی معلوم ہو تو بیع درست ہے۔

''وفسد بيع سمك لم يصد۔۔۔۔۔أو صيد ثم ألقي في مكان لا يؤخذ منه إلا بحيلة للعجز عن التسليم، وإن أخذ بدونها صح'' (درمختار علی الشامی ۴/۱۰۶، احسن الفتاوی ۶/۴۸۰)۔

مذکورہ بالا صورت معاملہ (جو جواب نمبر (۱) میں ہے) شرعاً ناجائز ہونے کے باوجود اگر ٹھیکے دار اس نہر اور ندی میں سے مچھلیاں شکار کرکے دوسرے کے ہاتھ بیچے گا یا کوئی مسلمان ایسی مچھلی کو خریدے گا تو یہ بیچنا اور خریدنا جائز ہوگا، کیوں کہ یہ مچھلیاں مباح الاصل ہیں اور ٹھیکے دار شکار کرنے کی وجہ سے ان کا مالک ہو گیا اور اپنی مملوک چیز کا بیچنا، جبکہ مقدور التسلیم ہو جائز ہے۔

۴- جو حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو یا عوامی ملکیت کا، اگر وہ بارش کے پانی سے بھر جائے اور مچھلیاں ان میں خود بخود پیدا ہو جائیں، یا ادھر ادھر سے جمع ہو جائیں تو اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ آیا اس تالاب اور حوض کو پہلے سے اس کام کے لیے تیار کر رکھا تھا یا نہیں؟ اگر اسی کام کے لیے تیار کر رکھا تھا تو یہ مچھلیاں مالک کی ملکیت میں داخل ہو جائیں گی، لیکن ان کی بیع کے صحیح ہونے کے لیے مقدور التسلیم ہونا شرط رہے گا۔

اور اگر اس تالاب اور حوض کو اسی کام کے لیے تیار نہیں کیا تھا تو یہ مچھلیاں مالک کی مملوک نہیں ہونگی اور غیر مملوک کی بیع باطل ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے: (شامی ۴/۱۰۶)۔

البتہ ٹھیکہ پر دینا بہر صورت جائز ہوگا، جیسا کہ پہلے جواب گزر چکا۔

☆☆☆

بیع کے چند مسائل

مولانا ابراہیم بڑودوی[1]

۱- سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی بیع وشراء بغیر ان مچھلیوں کے نکالے ہوئے موجودہ عرف کو دیکھتے ہوئے آج کے حالات میں عرف کا اعتبار غیر منصوص علیہ مسائل میں ہوتا ہے، جیسا کہ مشہور اصول "الاشباہ" کے اندر ہے: "العرف غير معتبر في المنصوص عليه" اور یہ بھی عام قاعدہ ہے کہ انسان کو اپنی شخصی ملکیت کی چیز، یعنی اپنی ملک کے تالاب یا ندی کی مچھلیاں بیچ سکتا ہے، مذکورہ سوال میں جبکہ سرکار نے اس کو تالاب یا ندی کا مالک نہ بنایا ہو اور پھر بیچے تو اس میں گنجائش معلوم نہیں ہوتی، دوسری بات یہ کہ حدیث میں غیر مقبوضہ کو بیع سے روکا ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:- "ما روى أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع ما لم يقبض" اور نہی منھی عنہ کے فساد کو ثابت کرتی ہے۔

احراز سے پہلے گھاس پر قیاس کرتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت کو جائز قرار دینے میں دو محظور وممنوع لازم آتے ہیں اور وہ باقی رہتے ہیں، ایک بیع کا مجہول ہونا، دوسرا غیر مقدور التسلیم ہونا۔

مذکورہ مسئلہ میں حرج متصور کر کے اگر جواز کی صورت نکالی جائے تو بھی اس بات سے خلاف ہوگا، جو کہ وارد ہے، مشہور قاعدہ:

"إنما المروج يعتبر في موضع- لا نصّ فيه" ذكره الزيلعي في جنايات الإحرام" (مجموعة- رسائل ابن عابدين ۲/ ۱۱۳)۔

جب مذکورہ صورت میں جواز کی گنجائش کی نفی معلوم ہوئی تو ٹھیکے دار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ بیچنا یا کسی مسلمان شخص کا پوری صورت حال جانتے ہوئے اس مچھلی کو خریدنا جائز نہیں ہے۔

۳- اگر مچھلی کا شکار کئے بغیر نکالنا ممکن نہ ہو تو بیع منعقد نہ ہوگی اور اگر مچھلیوں کا شکار کئے بغیر نکالنا ممکن ہو تو مچھلیوں کو شکار کرنے سے پہلے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، جیسا کہ "أحكام المعاملات المالية في المذهب الحنفي" میں ہے: "يشترط لانعقاد البيع أن يكون المعقود عليه مقدور التسليم عند العقد، فإن كان معجوز التسليم عنه لا ينعقد، وإن كان مملوكاً له" عقد کے وقت معجوز التسلیم ہونے کی صورت میں اپنی ملکیت میں ہونے کے باوجود جائز نہیں، چنانچہ مذکورہ اصول پر ایک تفریع بیان کی:

"وعلى هذا فلا ينعقد بيع السمك التي أخذها ثم ألقاها- في حظيرة سواء استطاع الخروج عنها أولا بعد إن كان لا يمكنه أخذها بدون الاصطياد، وإن كان يمكنه أخذها من غير اصطياد يجوز بلا خلاف. لأنه مقدور التسليم عند البيع" (ص ۹۰)۔

۴- جو حوض یا تالاب ذاتی ملکیت کا یا عوامی ملکیت کا کہ جس میں مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے از خود آگئیں، انہیں کسی کے ہاتھ فروخت کرنا یا ٹھیکہ پر دینا یہ معاملہ مبیع پر ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے جو بیع وشراء کی بنیادی شرط ہے۔ "أن يكون مملوكا في نفسه"۔ درست نہیں ہے۔

"لا ينعقد البيع في الحطب والحشيش والصيود التي في البواري والطير في الهواء والسمك الذي في الماء۔(اى قيل صيدها) شکار کرنے سے پہلے یہ صورت معاملہ ناجائز ہے۔ (احکام المعاملات المالیہ/ ۷۸)۔

دیگر یہ کہ بیع کے نفاذ کی شرط ملکیت یا ولایت کا ہونا ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

مبیع میں بائع کے علاوہ کا حق بھی نہیں ہونا چاہیے، مذکورہ صورت معاملہ میں عوامی ملکیت ہے

"يشترط لانعقاد البيع شرطان، الملك والولاية والثاني أن لا يكون في المبيع حق لغير البائع" (ص ۱۸۵)۔

☆☆☆

---

[1] جامعہ علوم القرآن جمبوسر، بھروچ۔

تالاب میں مچھلیوں کی بیع کا مسئلہ

مولانا ابراہیم بارڈولی[1]

اس مسئلہ میں ''بیع قبل القبض'' کی صورت پیش آتی ہے، کہ کسی چیز کو ہمارے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی اس کو فروخت کر دیا جاتا ہے حالاں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف فرمان ہے، جس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا ہے:

''وأما الذي نهى عنه النبي صلى الله عليه وسلم فهو الطعام أن يباع حتى يقبض، قال ابن عباس: ولا أحسب كل شئي إلا مثله'' (متفق علیہ، مشکواۃ شریف)۔

(حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو منع فرمایا۔ ہے وہ غلہ ہے کہ اس کو قبضہ میں لانے سے قبل فروخت کرنا منع۔ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ۔ فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ اس بارہ میں ہر چیز غلہ کے مانند ہے)۔

صاحب ''مظاہر حق'' فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غلہ کو قبل قبضہ بیچنا جائز نہیں۔ ہے جب تک کہ وہ قبضہ میں نہ آجائے، اسی طرح کسی بھی چیز کو قبل القبض بیچنا جائز نہیں (مظاہر حق ۳/۴۹۶)۔

حاصل یہ کہ اگر کوئی شخص اشیاء منقولہ میں سے کوئی چیز خریدے پھر اسے کسی دوسرے کو فروخت کرنا چاہے تو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ پہلے اس چیز کو اپنے قبضہ میں لے اس کے بعد اسے فروخت کرے، کیوں کہ اشیاء منقولہ میں ''بیع قبل القبض'' جائز نہیں؟

لہذا فقہاء کرام نے تالاب میں مچھلیوں کی بیع کے سلسلے میں خوب وضاحت سے کام لیا ہے، کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا، اگر گہرائی سے دیکھا جائے اس مسئلہ مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں:

۱- اگر یہ تالاب شروع سے مچھلی کے لیے تیار نہیں کیا گیا، یا مالک نے خود اس میں مچھلیاں نہیں چھوڑیں تو یہ مچھلیاں تالاب کے مالک کی نہیں، او رغیر مملوک کی بیع باطل؟

۲- اور اگر ابتدا ہی سے تالاب مچھلیوں کے لیے تیار کیا گیا ہو، یا اس میں مچھلیاں خود مالک نے چھوڑی ہوں، یا نہر وغیرہ سے مچھلی تالاب میں آئیں اور تالاب کے مالک نے پانی کا راستہ بند کر کے مچھلی تالاب میں محبوس کر لیں تو یہ مچھلیاں اس کی مملوک رہیں، مگر غیر مقدور التسلیم ہو نے کی وجہ سے قبل القبض ان کی بیع فاسد۔ ہے۔

۳- اور اگر تالاب اس قدر چھوٹا ہو کہ بدون تکلیف وحیلہ اس سے مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہوں اور مچھلیوں کی مقدار بھی معلوم ہو تو بیع درست ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

''نظام الفتاوی'' میں اس طرح کا ایک سوال مذکور ہے جس کو بعینہ نقل کیا جاتا ہے:

سوال: آجکل لوگ تالاب کا ٹھیکہ مچھلی پالنے کے لیے لیتے ہیں، پھر ان مچھلیوں کو اندازہ کر کے جال وغیرہ سے تالاب کے اندر ہی پکڑنے سے قبل فروخت کرتے ہیں، کیا اس طرح مچھلیوں کی بیع جائز۔ ہے؟

جواب: ''اگر تالاب اس قسم کا ہے کہ اس میں مچھلیاں محفوظ ہیں، از خود باہر نہیں نکلتیں تو مچھلی پالنے والے کے لیے اس کو ٹھیکہ پر دینا درست ہے، اور جو مچھلیاں اس میں پالی جائیں گی وہ مملوک ہو جائیں گی، البتہ بغیر پکڑے ہوئے مقبوض نہ ہوں گی، اس لیے خود پکڑ کر یا اپنے اجیر یا ملازم سے

[1] مدرسہ اسلامیہ سورت۔

پکڑوا کر فروخت کرنا بھی جائز ہوگا، البتہ بغیر پکڑے اور قبضہ میں لائے فروخت کرنا ''بیع مالم یقبض'' ہو کر بیع فاسد ہوگی اور مملوک رہنے کی وجہ سے بیع باطل نہیں ہوگی، اور بیع فاسد ہونے کا ثمرہ یہ ہوگا کہ مالک کے قبضہ میں آئے بغیر فروخت ہو جائے اور مشتری پھر اس کو فروخت کر دے اور مالک کو اعتراض نہیں تھا بلکہ اجازت تھی تو یہ دوسری بیع جو ہوگی صحیح اور ''سمک مبیع لهذا البیع'' کا استعمال کرنا درست رہے گا۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ جس نالہ کو کسی شخص نے سرکار وغیرہ سے ٹھیکہ پر لیا اور یہ نہر، نالہ وغیرہ شروع ہی سے مچھلی وغیرہ کے لیے تیار نہیں کیا گیا، یا مالک نے یا سرکار نے اس میں مچھلیاں نہیں چھوڑیں تو یہ مچھلیاں مالک یا سرکار کی ملک نہیں اور غیر مملوک کی بیع باطل ہے۔

لہذا خاص کر ایسی صورت سے شکار کردہ مچھلیوں کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا، یا کسی مسلمان کو پوری صورت حال جانتے ہوئے ایسی مچھلی کو خریدنا جائز نہیں (هذا مستفاد من الشامی واحسن الفتاوی)۔

اور جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملک ہو اگر وہ شخص اس میں باقاعدہ مچھلی پالکر اس حوض یا تالاب کی تمام مچھلیاں شکار کرنے سے پہلے کسی دوسرے آدمی کو فروخت کر دے، تاکہ وہ دوسرا شخص ایک خاص مدت میں اس حوض یا تالاب کی مچھلیاں نکال کر فروخت کرے تو شرعاً یہ صورت معاملہ ''بیع مالم یقبض'' بیع فاسد ہوگی اور مملوک رہنے کی وجہ سے بیع باطل نہیں رہے گی اور بیع فاسد ہونے کا ثمرہ یہ رہے گا کہ مالک کے قبضہ میں آئے بغیر فروخت ہو جائے اور مشتری پھر اس کو فروخت کرے اور مالک کو اعتراض نہ ہو، بلکہ مالک کی طرف سے اجازت ہو تو یہ دوسری بیع جو ہوئی اور اس مچھلی کا استعمال درست ہوگا۔ (کما یستفاد من نظام الفتاوی)۔

اور اگر کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو، یا عوامی ملکیت کا اس میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے از خود آگئی ہیں انہیں کسی کے ہاتھ فروخت کرنا، یا اس حوض و تالاب کو کسی خاص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا اس طور پر کہ اس مدت میں ٹھیکہ پر لینے والے کو اختیار رہے کہ وہ اس تالاب کی مچھلیاں شکار کر کے استعمال کرے، فائدہ اٹھائے تو اس صورت حال کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس تالاب کے مالک نے، یا ٹھیکہ پر لینے والے نے پانی کا راستہ بند کر کے مچھلیاں تالاب میں محبوس کر لیں تو یہ مچھلیاں اس کی مملوک ہیں، مگر غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع فاسد ہے۔

اور اگر تالاب اس قدر چھوٹا ہو کہ بدون تکلیف وحیلہ اس سے مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہوں اور مچھلی کی مقدار بھی معلوم ہو تو اس کی بیع درست ہے

(هذا یستفاد من الشامی واحسن الفتاوی)۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت

مولانا خلیل احمد قاسمی[1]

مچھلیوں کی بیع کے جواز اور عدم جواز کا مسئلہ ملکیت اور مقدور التسلیم ہونے نہ ہونے کے اعتبار سے ہی واضح ہوسکتا ہے، بازاروں میں بکنے والی مچھلیاں عرف وعادت کے اعتبار سے بحیثیت مقدور التسلیم وملکیت کئی طرح کی ہیں (۱) کسی شخص نے مچھلیوں کو پکڑ کر تالاب، ندی، نالے میں بغرض افزائش ڈال دیا ہو تو وہ شخص شرعاً ان مچھلیوں کا مالک ہوگا، اب اگر ان ندیوں، نالوں، تالاب سے مچھلیوں کو پکڑ کر کسی چھوٹے برتن میں یا ایسے گڑھے میں ڈالدیتا ہو جن سے پکڑ کر مشتری کو دینے میں کوئی دقت نہ ہو ہوتی ہو تو ایسی صورت میں ان کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے چوں کہ ملکیت اور مقدور التسلیم کا ہونا پایا گیا، دوسروں کے لیے خریدنا بھی بلا کراہت درست ہے، صاحب ''ہدایہ'' نے اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مچھلیوں کی بیع قبل الاصطیاد پر بنائے عدم ملکیت جائز نہیں ہے:

''ولا یجوز بیع السمك قبل أن یصطاد لأنه باع ما لا یملکه''

مسئلہ اگر چہ عدم جواز کا ہے مگر علت سے یہ حکم مترشح ہوتا ہے کہ اگر ملکیت اور مقدور التسلیم ہو تو بلا شبہ درست ہے، اسی طرح دوسرا مسئلہ یہ ذکر کیا کہ اگر مچھلیوں کو پکڑنے کے بعد ایسی جگہ چھوڑ دی کہ اس سے دوبارہ پکڑنے کے لیے اصطیاد کی ضرورت ہو تو یہ صورت بھی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں ملکیت تو ہے، لیکن مقدور التسلیم ہے اور یہ بھی علت عدم جواز ہے۔

۱- قدرتی طور پر مچھلیاں آگئی ہوں اور اس نے کسی طرح کی کوئی تدبیر نہیں کی، یعنی نہ ان کی اور نہ روکنے کی تدبیر کی ہے تو ایسی صورت میں جب تک ان کو پکڑ نہ لے مالک نہیں بنے گا، اور ان کی بیع بھی جائز نہیں ہے، اور اس تیسری صورت کو قیاس کیا گیا دوسرے مسئلہ پر، وہ یہ ہے کہ اگر کسی کی زمین میں پرندہ بچہ دیدے تو زمین والے ان بچوں کا محض اس کی زمین ہونے کی وجہ سے مالک نہ ہوگا جب تک اس کو پکڑ نہ لے، اسی طریقے سے یہ مسئلہ ہے، یعنی محض اس کی زمین میں قدرتی طور پر مچھلیوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ملکیت میں نہیں آئے گی (دیکھئے: ہدایہ ۳/۸۸)۔

خلاصہ:

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ سوالنامہ میں مچھلی کی بیع کی جس نوعیت کو ذکر کیا گیا ہے اس میں جواز اور عدم جواز کے حکم کا مدار دو چیزوں پر ہے (۱) ملکیت (۲) مقدور التسلیم، لہذا سوال نمبر (۱) کا جواب یہ ہے کہ ذکر کردہ ملکیتوں میں سے کوئی بھی ملکیت پائی جائے اور مقدور التسلیم ہو تو جائز ہے، ورنہ نہیں، البتہ موجودہ حالات وعرف میں نوعیت فتوی کے عنوان میں آرہی ہے۔

۲- صورت بالا ابتداء اگر چہ جائز نہیں ہے، لیکن مآلاً درست ہے، اس لیے کہ شکار کرنے کے بعد مذکورہ ملکیت کی تینوں صورتوں کی روشنی میں جو فساد تھا وہ ختم ہوگیا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر اصل مالکان جن سے ندیوں، نالوں اور تالاب کو ٹھیکہ داروں نے لیا ہے وہ مالکان شرعاً مالک نہ ہوں تو اس صورت میں ٹھیکہ دار شکار کرنے کی وجہ سے خود مالک ہو جائیں گے، اگر چہ یہ مسئلہ الگ ہے کہ ایسی صورت میں چوں کہ وہ مچھلیوں کے مالک نہیں ہیں تو ٹھیکہ داروں کے ہاتھ میں فروخت کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اور اس کے عوض جو روپئے وہ وصول کریں گے وہ جائز نہیں ہوں گے، اور ٹھیکہ دار جب خود مالک ہو گئے تو بازار آنے والی مچھلیوں کو خریدنا بھی درست ہے۔

۳- یہ صورت مچھلیوں کے غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، اس لیے کہ وقت البیع وہ مچھلیاں غیر مقبوض ہیں اور عدم جواز کا حکم

---

[1] مدرسہ اسلامیہ لطیفیہ سردار شہر، راجستھان۔

عام کتب فقہ کی معروف عبارت کی وجہ سے لکھا گیا ہے۔

۴- حوض، یا تالاب جو نجی ملکیت کا ہو اس میں اگر خود بخود مچھلیاں جمع ہو جائیں، یعنی ان کو حوض یا ندی نالے میں نہ ڈالا گیا ہو، بلکہ از خود آ گئی ہیں تو ان کو حوض یا ندی یا تالاب کے مالکان کا عام فقہی عبارت کی روشنی میں فروخت کرنا، یا ٹھیکہ پر دینا روپے پیسے کے بدلے میں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ایسی مچھلیوں کی ملکیت پکڑنے کے بعد ہی ہوگی، جیسا کہ ماقبل کی تمہیدی عبارت میں اس کو واضح کیا گیا ہے حوالہ جات یہ ہیں: (فقہی مسائل/۲۳۱، ہدایہ ۳/ ۸۸، شامی ۴/ ۱۰۶۔ درمختار ۴/ ۳۸، درمختار ۴/ ۳۹، امداد الفتاوی ۳/ ۴۶-۵۰، بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۷، فتح القدیر امداد ۳۰/ ۴۹)۔

موجودہ حالات میں فتوی:

آج کل اس مشینری وسائنسی دور میں جب کہ نئے نئے آلات ووسائل ایجاد ہو گئے ہیں جنکا پہلے وجود نہیں تھا، اس لیے آج کے حالات کے اعتبار سے مسائل میں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ دور میں مچھلیوں کو تالاب میں ہوتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور ان کا اندازہ وتخمینہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں کون کون سی مچھلی کتنی مقدار کی ہے، کتنی ہے کہاں کہاں ہے، چوں کہ ایسے مشینری آلات ایجاد ہو گئے ہیں کہ آغاز سال سے ہی مچھلیوں کی مقدار کا بخوبی اندازہ لگا لیا جاتا ہے، اور معمولی محنت ومشقت سے ان کو پکڑا بھی جا سکتا ہے، چوں کہ مچھلیوں کے پکڑنے کے آلات بھی نئے نئے ایجاد ہو گئے ہیں جو پہلے نہیں تھے، اس لیے اس وقت ایسی مچھلیوں کی بیع کے اندر دونوں طرح کی خرابیاں، یعنی مجہول ہونا اور غیر مقدور التسلیم ہونا ختم ہو گئی ہیں، لہذا صورت مروجہ کو یا تو کرایہ داری کے معاملہ پر محمول کیا جائے یا ابتداء اگرچہ صحیح نہیں ہے، لیکن انتہاء صحیح کہا جائے، یا تخمینہ کا اعتبار کر کے ابتداء صحیح ہونے کا حکم لگایا جائے اور جواز کا فتوی دیا جائے۔

جواب بابت مچھلیوں کی بیع

مولانا عبدالقیوم صاحب[1]

وہ ندی نالے اور تالاب جو حکومت کی ملکیت ہیں اس وجہ سے حکومت نے ان تالابوں اور ندی نالوں کو مچھلیوں کے لیے بنایا ہے، یا کہ حکومت برسات کے بعد مچھلیوں کے روکنے کا بندوبست کر دیتی ہے، تا کہ مچھلیاں باہر نہ نکل جاویں تالاب کے مخرج کو بند کرنے کے ذریعہ، یا کہ مخرج پر باریک جالیاں لگانے کے ذریعہ تا کہ مچھلیاں نکل نہ سکیں۔

حکومت انہیں مخصوص افراد یا کسی سوسائٹی کو ٹھیکے پر دیتی ہے، تا کہ وہ لوگ اس مدت متعینہ میں تالاب کی مچھلیاں نکالیں اور فائدہ حاصل کریں۔

مذکورہ معاملہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ معاملہ شریعت کی نظر میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اگر اس کی حیثیت طے ہو جاوے تو حکم کا استخراج آسان ہو جائے۔ یہ معاملہ یا تو بیع ہے یا اجارہ ہے

(۱) بیع میں چند شرائط ہیں (۱) اول یہ کہ بائع مبیع کا مالک ہو، دوم مبیع مجہول نہ ہو اور مشتری مبیع کو دیکھ لے، تیسرے یہ کہ بائع مبیع مشتری کو حوالہ کر دے۔

تالاب میں جو مچھلیاں بیچی جا رہی ہیں ان میں صرف ایک شرط پائی جا رہی ہے، اور دو شرطیں مفقود ہیں کہ حکومت ان مچھلیوں کی مالک تو ہے، لیکن مبیع مجہول ہے، اور ٹھیکیدار نے ان کو دیکھا نہیں ہے اور جہالت مفضی الی النزاع ہو سکتی ہے، مثلاً ٹھیکہ دس ہزار روپیہ کا تھا اور جو مچھلیاں تالاب میں سے نہیں نکلی ہیں وہ صرف ۳ ہزار کی قیمت کی ہیں، نیز مبیع غیر مقدور التسلیم ہے کہ بائع مبیع کو سونپنے پر قادر نہیں ہے۔

یہ بات واضح رہے جب مذکورہ معاملہ بیع وشراء ہے تو ٹھیکے دار کو شرعاً اجازت نہیں ہے کہ وہ تالاب میں باہر سے لاکر مچھلیاں ڈالے اور ان کی افزائش کرے، اس لیے کہ معاملہ تالاب میں موجود مچھلیوں پر ہوا ہے، چنانچہ جب اس نے تالاب سے مچھلیاں نکالیں تو وہ مثلاً ثمن کے مقابلہ میں بہت قلیل تھیں، یا بہت چھوٹی تھیں، یا اچھی نسل کی نہیں تھیں، "فھذہ الجھالۃ تفضی الی النزاع" دوسری شکل یہ ہے کہ معاملہ معاملہ اجارہ ہو، یعنی کہ حکومت اپنا مملوکہ ٹھیکیدار کو اجارہ پر دے رہی تو سوال یہ ہے کہ تالاب کے اجرت پر دینے کے کیا معنی ہیں؟ یعنی تالاب کی کونسی چیز کو اجرت پر دیا جا رہا ہے، اگر کہا جائے کہ تالاب میں جو مچھلیاں انہیں اجرت پر دیا جا رہا ہے۔

اور اجارہ کی تعریف یہ ہے کہ مستاجر اجرت معینہ کے بنا متعین مدت میں شئی متاجرہ کے منافع کا مالک بن جاتا ہے، یعنی مدت معینہ میں اسکے منافع حاصل کر سکتا ہے، ایسا کوئی نفع جس میں شئی متاجرہ کا عین ضائع ہو جاوے اور ہلاک ہو جائے جائز نہیں ہے، یہ اجارہ فاسدہ ہے، لہذا صورت مذکورہ میں مچھلیوں کا اجارہ انکے عین کے استہلاک پر اجارہ فاسدہ ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

مذکورہ مروجہ ٹھیکے میں اجارہ کی ایک شکل ہے جس پر بناء کرتے ہوئے یہ ٹھیکہ صحیح ہو سکتا ہے: وہ یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے مذکورہ ٹھیکے کو اس طرح پر اجارہ کا معاملہ مانا جاوے کہ یہ اجارہ اجرت معلومہ کے بدلے معین مدت میں تالاب کے پانی سے فائدہ حاصل کرنے کا اجارہ ہو، بایں طور پر کہ وہ ٹھیکدار تالاب میں مچھلیاں لاکر ڈالے اور انکی پرورش کرے، پھر انہیں نکال کر فائدہ حاصل کرے، کھائے فروخت کرے وغیرہ۔

صورت مذکورہ میں جو مچھلیاں اس نے خود ڈالی ہیں اور ان کی افزائش کا نظم کیا ہے ان کا تو وہ مالک ہے ہی اور جو مچھلیاں تالاب میں پہلے سے موجود تھیں جو انہیں پکڑے گا اور قبضہ کرے گا تو ان کا بھی مالک ہو جائے گا، اب اس کے لیے تالاب کی دونوں مچھلیوں کو نکالکر بیچنا جائز ہے۔

واضح رہے کہ اگر ٹھیکیدار اول نے پورے تالاب کی مچھلیاں دوسرے کسی کو تالاب ہی میں بیچ دیں تو سودا جائز نہ ہوگا، ہاں باہر نکال کر فروخت کرے اور اس معاملہ کی نوعیت یہی ہوتی ہے کہ ٹھیکیدار بازار سے بچے لاکر ڈالتا ہے، ان کی افزائش کرتا ہے، اور پھر نکال کر بیچتا اور فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس طرح پر اگر محمول کر لیا جائے تو مذکورہ ٹھیکے جائز ہیں۔

☆☆☆

[1] مدرسہ فیض التبلیغ جے پور۔

مچھلی کی بیع سے متعلق سوالوں کے جوابات

مولانا عبدالقیوم پالنپوری قاسمی[1]

۱- نجی تالاب یا سرکاری تالاب ونہر وندی کی مچھلیوں کی خرید وفروخت بغیر ان مچھلیوں کے نکالے ہوئے ''عدم ملک'' یا غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اسی طرح اس کو ٹھیکہ پر دینا بھی ناجائز ہے، عرف کی بناء پر موجودہ حالات میں بھی جواز کا فتوی نہیں دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ یہ مسئلہ موجودہ دور ہی کا پیدا شدہ نہیں ہے، بلکہ بہت پہلے سے اس کا رواج اور اس کے متعلق سوالات ہوتے رہے ہیں، چنانچہ علامہ شامیؒ بھی لکھتے ہیں: ''والمسألة كثيرة الوقوع ويكثر السؤال عنها'' (ردالمحتار ۴/ ۱۴۸) لیکن کسی نے بھی عرف کی بنا پر اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

۲- سرکاری تالاب اور نہر وندی یا نجی ملکیت کے تالاب وحوض میں پائی جانے والی مچھلیاں بعض صورتوں میں تالاب وغیرہ کے۔ مالکوں کی مملوک ہوتی ہیں، اور بعض صورتوں میں ان کی ملک میں نہیں آتی ہیں، جیسا کہ مفصلاً فقہائے کرام نے بیان کیا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۹)۔

مچھلیاں تالاب وغیرہ کے مالکوں کی مملوک ہوں یا نہ ہوں، دونوں صورتوں میں ان کو نکالے بغیر خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے، مملوک نہ ہوں تو ان کی بیع باطل ہے (لعدم الملک) اور مملوک ہونے کی صورت میں غیر مقدور التسلیم ہونے کی بنا پر انکی بیع فاسد ہے۔

جن صورتوں میں مچھلیاں مالک تالاب کی ملک نہیں ہیں ان مچھلیوں کی بیع یا تالاب کو ٹھیکہ پر دینا صحیح نہیں ہے، لیکن مشتری یا ٹھیکہ دار مچھلیوں کو پکڑنے کی وجہ سے مالک ہوجائے گا، اس لیے کہ ان مچھلیوں میں سب کا اباحۃً اشتراک ہے، لہذا پکڑنے والا ان کا مالک ہوجائے گا، پس مشتری یا ٹھیکہ دار کا انکو پکڑ کر بیچنا اور اس سے دوسرے مسلمانوں کو خریدنا درست ہے، جیسا کہ خودرو گھاس کے بارے میں علامہ حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''والمراعي أي الكلاء أما بطلان بيعها لعدم الملك الدر المختار (قوله لعدم الملك) لاشتراك الناس فيه اشتراك إباحة لا ملك، ولأنه لا يحصل للمشتري فيه فائدة؛ لأنه يتملكه بدون بيع''۔ (رد المحتار مع الدر المختار ۴/ ۱۵۲)۔

اور جن صورتوں میں مچھلیاں مملوک ہیں اس صورت میں ان کی بیع بغیر نکالے فاسد ہے، لہذا مبیع واجب الرد ہے، لیکن اس مشتری یا ٹھیکہ دار نے مچھلیاں پکڑ کر دوسرے کو فروخت کی تو اس دوسرے شخص کو اس سے خریدنا مکروہ ہے، اور خریدنا مکروہ ہونے کے باوجود مبیع اس کے لیے حلال وطیب ہے، اور اس دوسرے شخص (مشتری ثانی) سے اور لوگوں کو خریدنا مکروہ بھی نہیں ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: ردالمحتار ۴/ ۱۸۰)۔

۳- نجی تالاب یا حوض کی پالی ہوئی مچھلیاں جن کو بغیر حیلہ کے پکڑنا ممکن نہ ہو اس کو بغیر نکالے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، درمختار میں ہے:

''وفسد بيع۔ سمك لم يصد۔۔۔۔أو صيد ثم ألقي في مكان لا يؤخذ منه إلا بحيلة للعجز عن التسليم، وإن أخذ بدونها صح وله خيار الرؤية'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴/ ۱۴۶، ۱۴۷)۔

۴- جو حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو یا عوامی ملکیت کا جس میں پالے بغیر مچھلیاں از خود آگئی ہوں، انہیں شکار کئے بغیر کسی کے ہاتھ فروخت کرنا یا خاص مدت کے لیے اس کو ٹھیکہ پر دینا جائز نہیں ہے (دیکھئے: درمختار ۴/ ۱۴۷)۔

☆☆☆

[1] خادم تدریس وافتاء جامعہ نذیریہ کاکوسی شمالی گجرات۔

چوتھا باب

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کا مسئلہ

مولانا نعیم اختر قاسمی

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت میں بنیادی طور پر ''غرر'' کی بحث اٹھائی جاتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غرر حقیقت جان لی جائے اور اس کا معیار متعین کرلیا جائے۔

غرر کی حقیقت:

لغت میں غرر ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کا ظاہر باطن کے مغایر ہو، چنانچہ قاضی عیاض مالکیؒ اس کی تعریف کرتے ہیں:

''هو ما له ظاهر محبوب و باطن مكروه، ولذلك سمى الدنيا متاع الغرور''

(غرر وہ ہے جس کا ظاہر پسندیدہ اور باطن ناپسندیدہ ہو، اسی لئے دنیا کو متاع الغرور کہا جاتا ہے)۔

پھر علامہ ابن رشد قرطبیؒ (م: ۵۹۵ھ) غرر کی تقسیم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ومن هذا الباب بيع الجوز و اللوز والباقلا فى قشرة. أجازه مالك ومنعه الشافعى، والسبب فى اختلافهم هل الغرر من المؤثر فى البيوع أم ليس من الموثر، ذلك أنهم أنفقوا أن الضرر ينقسم بهذين القسمين، وإن غير المؤثر هو اليسير أو الذى تدعو إليه الضرورة أوما جمع الأمرين'' (بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۵۷)۔

اخروٹ، بادام اور لوبیا کی بیع اپنے چھلکے کے اندر اسی بات سے متعلق ہے، امام مالک نے اسے جائز قرار دیا اور امام شافعی نے ممنوع، وجہ اختلاف یہ ہے کہ یہ غرر بیع کے اندر موثر ہے یا نہیں، کیونکہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ غرر کی یہی دو قسمیں ہیں اور قلیل غرر وہ ہے جو معمولی ہو، یا جس کی ضرورت متقاضی ہو، یا دونوں ہی وجہیں اس میں پائی جائیں)۔

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''وبالجملة فالفقهاء متفقون على أن الغرر الكثير فى المبيعات لا يجوز وأن القليل يجوز'' (بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۵۵)۔

(خلاصہ یہ کہ فقہاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ بیوع کے اندر غرر کثیر جائز نہیں اور غرر قلیل جائز ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیع کے اندر غرر یسیر سے احتراز بہت ہی دشوار اور ناقابل عمل امر ہے اور اس سے بیع کا سد باب لازم آتا ہے، اس لئے تھوڑا غرر جواز بیع کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا۔

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ غرر فاحش اور غرر یسیر کے درمیان حد فاصل کیا ہے تو اس سلسلے میں فقہاء نے کوئی تحدید نہیں بیان کی ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے، بلکہ اس کو لوگوں کے عرف اور ان کے تعامل پر چھوڑ دیا ہے، چنانچہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک علاقہ کے لوگوں کے حق میں قلیل ہو اور دوسرے علاقہ کے لوگوں کے حق میں کثیر، اور ایک زمانہ میں ایک غرر کثیر رہا ہو، پھر دوسرے زمانہ میں لوگوں نے اتنے سے غرر سے چشم پوشی کرکے اسے غرر یسیر کے زمرہ میں شامل کرلیا ہو، چنانچہ صاحب ''مصادر الحق'' تحریر فرماتے ہیں:

''الغرر الكثير والغرر اليسير والغرر المتوسط والغرر الذى تدعو إليه الضرورة تختلف فى تطبيقاتها فى بيئة عن بيئة وفى عصر على عصر، بل تختلف الأنظار أيضا فى البيئة الواحدة والعصر الواحد'' (مصادر الحق ۱ / ۱۵۰ الجزء الثالث)۔

(غرر کثیر، غرر یسیر، غرر متوسط اور وہ غرر جس کی ضرورت متقاضی ہو ان کا انطباق ماحول اور زمانہ کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہتا ہے، بلکہ ایک ہی ماحول اور

زمانہ میں لوگوں کی رائیں مختلف ہوسکتی ہیں)۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ تالاب کے اندر مچھلیوں کی خرید وفروخت کے غرر کو غرر یسیر میں شمار کیا جائے، کیونکہ ممانعت غرر کی اصل وجہ نزاعی کیفیت سے بچنا ہے اور فی زمانہ اس کے اندر کسی قسم کا نزاع واقع نہیں ہوتا، البتہ چونکہ مچھلیاں اس وقت غیر مقدور التسلیم ہوتی ہیں، اس لئے اس ناحیہ سے ان کی بیع درست نہ ہوگی اور پھر غرر کو یسیر ماننے کا کچھ فائدہ بھی حاصل نہ ہوگا۔

ذاتی ملکیت کے تالاب کی مچھلیوں کو شکار سے قبل بیچنا:

حوض یا تالاب اگر کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہو اور وہ اس میں باقاعدہ مچھلیوں کی افزائش کرتا ہو تو دیکھا جائے گا کہ تالاب یا حوض چھوٹا ہے یا بڑا، اگر بڑا ہو تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع درست نہیں اور اگر چھوٹا ہو تو امام مالک کے علاوہ بقیہ ائمہ اس شرط کے ساتھ درست قرار دیتے ہیں کہ بلا حیلہ پکڑی جاسکتی ہوں اور حنفیہ کے نزدیک اس صورت میں خیار رؤیت حاصل ہوگا، ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''اگر پانی چاروں طرف سے گھرا ہوا ہو، جیسے کہ تالاب کا پانی تو حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ منجملہ اس میں مچھلی کی بیع کو درست قرار دیتے ہیں، جبکہ بلا حیلہ اسے پکڑنا ممکن ہو، لیکن حنفیہ کے نزدیک خیار رویت بھی حاصل ہوگا، جبکہ امام مالکؒ نے تالاب اور حوض کے اندر مچھلی کی بیع کو مطلقاً ممنوع کہا ہے'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۴۳۱)۔

ازخود آنے والی مچھلیوں کی خرید وفروخت:

اگر کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو، یا عوامی ملکیت کا اس میں جو مچھلیاں بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود آگئی ہوں تو وہ صاحب حوض یا تالاب کی ملکیت نہیں مانی جائے گی، بلکہ جو شکار کرے گا اسی کی مانی جائے گی، البتہ اگر مچھلیوں کے آنے کے بعد تالاب کے مالک نے واپس نہ جانے کے لئے کوئی حیلہ تیار کرلیا ہو تو اب وہ اسی کی ملکیت میں مانی جائے گی، اس کو اس مشہور فقہی جزئیہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر کسی کی زمین میں پرندے نے انڈا یا بچہ دیا تو وہ اس کا مالک نہ ہوگا، کیونکہ احراز نہیں پایا جارہا ہے (العنایہ مع الفتح ۶/۴۰۹)۔

تالاب کو مچھلیوں کے شکار کے لئے ٹھیکہ پر دینا:

تالاب یا حوض کو مچھلی کے شکار کرنے کے لئے دینا گویا اجارہ پر دینا ہے، اور اجارہ میں عین شئی سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا، بلکہ اس کی منفعت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، چنانچہ اسی لئے چراگاہ کی گھاس کا اجارہ پر دینا اور دودھ پینے کے لئے جانور کو اجارہ پر لینا درست نہیں ہے، اسی طرح تالاب یا حوض کو مچھلی کے شکار کے لئے ٹھیکہ پر دینا بھی درست نہ ہوگا۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت

مولانا محمد نعیم رشیدی

موجودہ حالات:

موجودہ دور میں تالابوں اور نہروں میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کا معاملہ جس کثرت سے ہونے لگا ہے وہ ظاہر ہے، یہ جگہ اور ہر ملک میں اس طرح کی خرید و فروخت کا معاملہ عام ہو چکا ہے۔ لہذا اہل علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلہ کی نوعیت پر غور کریں۔

لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ عرف ورواج اور لوگوں کے تعامل کا اسی وقت اعتبار ہوگا جب کہ اس پر عمل کرنے سے نص کا ترک لازم نہ آئے، اگر نص کو چھوڑنا لازم آرہا ہو تو پھر ایسا عرف عرف فاسد ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، جب یہ ثابت ہو جائے کہ عرف پر عمل کرنے سے کسی نص یا اصول شریعت کا ترک لازم نہ آتا ہو تو پھر اس عرف کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلہ پر از سر نو غور کرنے کی گنجائش ہوگی۔

زیر بحث مسئلہ میں اگر حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح کے معاملات کو جائز قرار دیں تو کیا کسی نص کے خلاف لازم آئے گا؟ اس سوال کو حل کرنے کے لئے پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ تالابوں میں مچھلی کی بیع کا مسئلہ مجتہد فیہ ہے یا منصوص، یعنی اس کی ممانعت کسی صحابی سے منقول ہے، یا حضور اکرم ﷺ سے صراحۃً ممانعت وارد ہوئی ہے؟ یہ اس لئے ضروری کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے تو اس کے خلاف عرف کا اعتبار نہیں ہوگا، جیسا کہ معلوم ہوا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ صحابی سے منقول ہے تو یہ اصول کا مسئلہ ہے کہ صحابہ کے جن اقوال میں قیاس کو دخل ہے، ایسے اقوال پر قیاس کو ترجیح دی جاسکتی ہے، اور اس میں کلام کی گنجائش ہوگی۔

پانی میں مچھلی کی بیع کی ممانعت کے سلسلہ میں عام طور پر "مسند احمد" کی اس روایت کا تذکرہ ملتا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے پانی میں مچھلی کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے، چنانچہ "مسند احمد" میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے یہ روایت مذکور ہے:

"عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسو ل الله ﷺ: لا تشتروا السمك في الماء. فإنه غرر" (مسند احمد مع کنز العمال ۱/ ۳۸۸)۔

(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت نہ کرو اس لئے کہ یہ غرر ہے)۔

امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی سند سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس حدیث کو مرفوعاً ذکر کیا ہے (بیہقی ۵/ ۳۴۰، مجمع الفوائد ۱/ ۲۴۸)، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ولأحمد حديث بن مسعود رفعه: "لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر" (فتح الباری ۴/ ۲۵۷)۔

(مسند احمد میں حضرت عبداللہ مسعود کی مرفوعاً یہ روایت ہے: پانی میں مچھلی کو بہ فروخت کرو اس لئے کہ یہ غرر ہے)۔

محدثین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے یا مرفوع، اکثر محدثین کے نزدیک یہ حدیث موقوف ہے، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں مسیب بن رافع اور عبداللہ بن مسعودؓ کے درمیان ارسال ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے (دیکھئے: سنن الکبری ۵/ ۳۴۰، نیل الاوطار ۴/ ۱۴۷، مجمع الزوائد ۴/ ۱۸۰)۔

فقہاء کی تحریرات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس روایت کو موقوف کا درجہ دیا ہے، چنانچہ علامہ شرازی شافعی تحریر فرماتے ہیں:

"ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع الغرر، ولهذا قال ابن مسعود رضي الله عنهما: لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر" (المہذب مع المجموع ۹/ ۲۸۳)۔

(نبی ﷺ نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے، اسی وجہ سے حضرت ابن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا: "پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت نہ کرو اس لئے کہ یہ غرر ہے)۔

ممانعت کی علت:

اس سلسلہ میں بھی فقہاء کے مختلف اقوال ملتے ہیں، علامہ زرقانی مالکیؒ نے "شرح موطا" میں بعض اقوال نقل کئے ہیں: ایک قول یہ ہے کہ علت بائع اور مشتری کے مابین تنازع اور جھگڑے سے روکنا ہے، علامہ ماذری فرماتے ہیں کہ علت یہ ہے کہ اس میں بائع مبیع کی سپردگی اور حوالگی سے عاجز ہوتا ہے (دیکھئے: شرح زرقانی ۳/ ۳۱۳، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: عون المعبود ۹/ ۲۳۱، سبل السلام ۳/ ۸۰۷)۔

جب اتنی بات معلوم ہوگئی کہ غرر کبھی مقدور التسلیم نہ ہونے کی وجہ سے، کبھی مجہول یا معدوم ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، تو اب اس بات میں غور کرنا ہے کہ مچھلی کی ممانعت میں غرر کی علت کیا ہے، اس بارے میں تمام مکتبہ فکر کے فقہاء متفق نظر آتے ہیں کہ اگر مچھلی اس کی ملکیت میں ہے تو ممانعت کی علت مقدور التسلیم نہ ہونے کی بنیاد پر ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

"فإن أخذه ثم ألقاه فی حظیرة کبیرة فعدم جوازہ لکونه غیر مقدور التسلیم" (البحر الرائق ۶/ ۷۳)۔

(اگر مچھلیوں کو پکڑ کر بڑے تالاب میں ڈال دیا تو اب عدم جواز کی وجہ غیر مقدور التسلیم ہونا ہے)۔

مقدور التسلیم کا مفہوم:

مقدور التسلیم کا مطلب یہ ہے کہ بائع مبیع کو مشتری کے حوالہ اور سپرد کرنے پر قادر ہو اور مشتری کے لئے مبیع پر قبضہ کرنے سے کوئی چیز مانع نہ ہو، یہ ضروری نہیں ہے کہ بیع کے صحیح ہونے کے لئے بالکل بیع کے فوراً بعد ہی حوالگی عمل میں آجائے، اور یہاں پر یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ فقہاء نے بیع میں مقدور التسلیم ہونے کو اس لئے شرط قرار دیا ہے تاکہ امکانی دھوکہ کا سد باب ہو جائے، اس کے بعد فقہاء کی ان عبارات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جس میں مچھلی کی بیع کو غیر مقدور التسلیم ہونے کی بنیاد پر ناجائز قرار دیا ہے۔

فقہاء کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں مچھلی کی خرید وفروخت جو ہوتی تھی اس کی صورت حال یہ ہوتی کہ مثلاً کوئی شخص مچھلیوں کو پکڑ کر کسی بڑے تالاب میں محفوظ کر لیا، لیکن جب فروخت کرنے کی خاطر مچھلیوں کو نکالنا چاہتا تو اپنی مرضی کے موافق جس وقت چاہے مچھلیوں کو حاصل نہیں کر سکتا تھا، اور یقینی طور پر قبضہ کا وقت بھی متعین نہیں کیا جا سکتا تھا، ایسی صورت حال کے پیش نظر غیر مقدور التسلیم کہہ کر ناجائز قرار دیں تو درست تھا، جیسا کہ فقہاء نے کہا، بلکہ بعض فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلیوں کو حاصل کرنے میں اچھا خاصا وقفہ بھی لگتا تھا، جیسا کہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے۔

"وإن کانت کثیرة ویتطاول المدة فیه لم یجز بیعه للعجز عن تسلیمه والجهل بوقت إمکان التسلیم" (المغنی ۴/ ۱۴۲)

(اگر پانی زیادہ اور مچھلیوں کو حاصل کرنے میں مدت طویل ہو تو بیع جائز نہیں، اس لئے کہ سپردگی سے عاجز ہے اور حوالگی کے امکانی وقت سے ناواقف ہے)۔

حاصل اس پوری تحریر کا یہ ہے کہ مچھلی کی خرید وفروخت کا مسئلہ مجتہد فیہ ہے، منصوص نہیں اور آج مچھلی کی اس طرح خرید وفروخت کا معاملہ عرف عام کی حد تک پہنچ چکا ہے، اور نیز مقدور التسلیم ہونا، خواہ کسی بھی حیثیت سے ہو پایا جارہا ہے، لہٰذا ان وجوہات کے پیش نظر تالابوں اور نہروں وغیرہ میں مچھلیوں کی جو خرید و فروخت ہو رہی ہے اس میں جواز کا فتویٰ ہونا چاہئے۔

مذکورہ تفصیل کے بعد مختصر طور پر سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں۔

جوابات:

۱- عرف ورواج کی وجہ سے اس مسئلہ میں جواز کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے، فقہاء نے غیر مقدور التسلیم اور مجہول المبیع کی بنیاد پر ناجائز قرار دیا ہے، لیکن موجودہ حالات میں مچھلیوں کا مقدور التسلیم ہونا یا مبیع کا مجہول نہ ہونا اوپر کی تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے۔

۲- اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس معاملہ کو ناجائز کہا جائے تو ایسی صورت میں اوپر کی تفصیلات سے یہ بات معلوم ہو چکی کہ بیع بیع فاسدہ ہے اور فاسد کا حکم یہ ہے کہ جب مشتری مبیع پر قبضہ کر لے گا تو اس پر اس کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور ملکیت کے تمام تصرفات کا وہ مالک ہو جائے گا، لہٰذا ٹھیکے دار اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کو فروخت کر سکتا ہے، اسی طرح کسی مسلمان کا اس سے خریدنا بھی جائز ہوگا، اگر اس معاملہ کو جائز کہا جائے تو ایسی صورت میں مطلقاً خرید وفروخت کرنا درست ہوگا۔

۳- اس سوال کا حاصل بھی وہی ہے جو پہلے سوال کا ہے کہ تالاب میں شکار کرنے سے پہلے خرید وفروخت کرنا کیسا ہے، اوپر کی تفصیل سے معلوم ہو چکا

ہے کہ موجودہ دور میں کوئی شرعی موانع نہیں پائے جارہے ہیں، لہذا اس طرح کے معاملات جائز ہوں گے۔

۴- تالاب میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کے لئے مچھلیوں کا ملکیت میں ہونا ضروری ہے اور مچھلیوں کے مالک بننے کی تین صورتیں ہیں جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، لہذا کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو، یا عوامی ملکیت کا جو مچھلیاں پالے بغیر از خود آگئی ہیں اس میں فروخت کرنا اس وقت درست ہے، جبکہ مچھلیاں لانے یا آنے کے بعد واپس نہ جانے کی تدبیر اختیار کی گئی ہو، تاکہ ملکیت متحقق ہو جائے، ورنہ ایسی مچھلیاں فروخت کرنا درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہاں پر ملکیت نہیں ہے۔

لیکن ایک خاص مدت کے لئے ٹھیکہ پر دینا اجارہ کی صورت ہے جس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صحیح قول تو اس میں ناجائز ہونے کا ہے (درمختار ۴/۱۱۹)۔

لیکن اس کے خلاف حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جس میں آپؓ نے اس کی اجازت دی ہے، چنانچہ صاحب "نہر" نے امام ابو یوسف سے یہ روایت شامی نے بھی نقل کی ہے:

"عن أبي يوسف في كتاب الخراج عن أبي الزناد قال: كتبت إلى عمر بن الخطاب في بحيرة يجمع فيها سمك بأرض العراق أنؤجرها؟ فكتب إلى أن افعلوا، وما في الإيضاح بالقواعد الفقهية أليق" (ردالمحتار ۴/۱۱۹)۔

(کتاب الخروج میں امام ابو یوسف سے ابوالزناد کی سند سے یہ روایت مروی ہے کہ ابوالزناد نے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن خطاب کو سرزمین عراق میں واقع ایک چھوٹے تالاب کے بارے میں لکھا جس میں مچھلیاں جمع ہوتی تھیں کہ کیا ہم اس کو اجارہ پر دے سکتے ہیں، تو حضرت عمر نے جواب میں لکھا کہ تم لوگ یہ معاملہ کر سکتے ہو، اور ایضاح میں جو عدم جواز لکھا ہے سو وہ فقہی قواعد کے زیادہ مناسب ہے)۔

موجودہ حالات کے پیش نظر اس روایت کو اختیار کرتے ہوئے اس کے جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے، لیکن اس میں علامہ شامی کو اعتراض ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر اجارہ میں عین شئی، یعنی مچھلیاں ہلاک ہو رہی ہیں اور اجرت میں یہ صورت درست نہیں ہے، شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں:

"لكن قوله غير بعيد الخ فيه نظر، لأن الإجارة واقعة على استهلاك العين"

لیکن علامہ رملی کا قول بعید نہیں ہے، اس میں اعتراض ہے، اس لئے کہ اجارہ عین شئی کے ختم ہونے پر واقع ہو رہا ہے (اور یہ درست نہیں ہے)۔

یہاں پر اگرچہ مقصود مچھلیوں کو حاصل کرنا ہے، لیکن اجرت تالاب کی ہو رہی تاکہ اس سے فائدہ اٹھا سکے، لہذا اگر تالاب کو اصل بنا کر اس سے متعلقہ فائدہ یعنی مچھلیوں سے فائدہ اٹھائے تو کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت

مولانا محمد نورالقاسمی

فی زمانہ تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کا معاملہ کثرت سے رائج ہے اور بسا اوقات بعض معاملات اس میں سے غیر شرعی بھی ہوتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ احکام اچھی طرح سمجھ لئے جائیں۔

حوض یا تالاب میں مچھلیوں کی بیع کرنا:

حوض یا تالاب اگر کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے، نیز یہ کہ اس وہ باقاعدہ مچھلی کی افزائش کرتا ہے تو ان مچھلیوں کو کسی دوسرے آدمی کے ہاتھوں فروخت کرنے کی صورت میں دیکھا جائے گا کہ تالاب یا حوض چھوٹا ہے یا بڑا؟ اگر بڑا ہے تو بغیر مچھلیوں کو نکالے ہوئے فروخت کرنا درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ بائع فی الفور مبیع کو سپرد کرنے پر قادر نہیں ہے، پھر یہ کہ مچھلیوں کی مقدار بھی متعین نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ اس کی پوری بحث اوپر گذر چکی ہے، ہاں اگر تالاب یا حوض چھوٹا ہے، تو بھی امام مالکؒ کے نزدیک بیع صحیح نہیں ہوگی، البتہ ان کے علاوہ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ اس شرط کے ساتھ بیع درست ہوگی، جبکہ بغیر کسی حیلہ کے مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہوں، لیکن اس صورت میں بھی احناف کے نزدیک مشتری کو خیار رویت حاصل ہوگا کہ دیکھنے کے بعد پسند آئے اور راضی ہوجائے، جائز اور نافذ ہوجائے گی اور اگر مشتری ناپسند کردے تو بیع فسخ ہوجائے گی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۳۱-۴۳۲، نیز دیکھئے: بدایۃ المجتہد ۲/ ۱۵۶، المغنی ۴/ ۲۰۲، بدائع الصنائع ۵/ ۲۹۵)۔

چنانچہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی (حفظہ اللہ) نقل فرماتے ہیں:

''پس اگر پانی ہر چہار جانب سے گھرا ہوا ہو جیسا کہ تالاب کا پانی ہوتا ہے، تو احناف، شوافع اور حنابلہ مجملہ فرماتے ہیں کہ اس کے اندر اس شرط کے ساتھ مچھلی کی بیع صحیح ہوگی جب بغیر شکار اور حیلہ کے پکڑنا ممکن ہو، البتہ احناف کے نزدیک مشتری کو خیار رویت حاصل ہوگا، امام مالک یا حوض کے اندر مچھلی کی بیع کے عدم جواز کے قائل ہیں'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۳۱)۔

نجی تالاب میں ازخود آئی ہوئی مچھلیوں کا حکم:

وہ حوض یا تالاب جو نجی ملکیت کا ہو یا عوامی ملکیت کا، اس میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود آگئی ہیں، اس کی خرید وفروخت یا اس کو ٹھیکے پر دینے کے مسئلہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر بحث کرلی جائے کہ آیا ان مچھلیوں پر مالک تالاب یا حوض کی ملکیت بھی ثابت ہوگی یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ اصول ذہن نشین رہنا چاہئے کہ مچھلی کا مالک بننے کی کل تین صورتیں ہیں: اول یہ کہ مچھلی کی نشوونما اور افزائش کے لئے بطور خاص کسی نے تالاب میں رکھا ہے، اس صورت میں ان مچھلیوں اور ان کی نسل کا وہی مالک قرار پائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ مچھلی تو اس نے نہ ڈالی ہو، لیکن مچھلی کے تالاب میں لانے یا آنے والی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کے لئے اس نے کوئی حیلہ اور تدبیر کر رکھا ہو، اس صورت میں بھی تالاب میں آنے والی مچھلیوں کا وہی مالک ہوگا جس کا تالاب ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مچھلی کا شکار کرکے اسے اپنے برتن میں محفوظ کرلے چوتھی صورت جس میں آدمی چوتھی صورت جس میں آدمی مچھلی کا مالک نہیں ہو پاتا ہے، یا کسی کا تالاب ذاتی ہو اور اس میں مچھلیاں ازخود آجائیں، اس میں مالک تالاب کی سعی وکوشش کا کوئی دخل نہ ہو، یہاں محض یہ بات کہ تالاب اس کی زمین میں واقع ہے، اس بات کے لئے کافی نہیں کہ اس کو ان مچھلیوں کا مالک قرار دیا جائے، اس کی نظیر یہ ہے کہ فقہاء نے محض اس بات کو کہ پرندہ کسی کے کھیت میں انڈا یا بچہ دیدے اس بات کے لئے کافی نہیں سمجھا ہے کہ اس زمین کا مالک ان بچوں اور انڈوں کا بھی مالک ہو، لہذا اگر وہ بیچنا چاہے تو نہیں بیچ سکتا ہے، الا یہ کہ وہ ان کو پکڑ لے، ورنہ

جو بھی اس بچہ یا انڈا کو اٹھالے گا وہی اس کا مالک ہوگا، چنانچہ امام اکمل الدین محمد بابرتی (م:۷۸۶ھ) لکھتے ہیں:

''کما لو باض الطیر فی أرض إنسان أو فرخت فإنه لا یملك لعدم الإحراز'' (شرح العنایہ مع الفتح ۶/ ۴۰۹)۔

(جیسا کہ پرندے نے کسی آدمی کی زمین میں انڈا یا بچہ دیا تو وہ جمع نہ کرنے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا)۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹)۔

نجی تالاب یا حوض کو مچھلی کے لئے ٹھیکہ پر دینا:

تالاب اور حوض کو مچھلی کے شکار کرنے کے لئے ٹھیکہ پر دینا گویا اجارہ پر دینا ہے، اس سلسلہ میں ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اجارہ میں منفعت سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے، نہ کہ عین شئ سے، جبکہ شئ زیر غور مسئلہ میں عین شئ کا ہلاک ہونا لازم آتا ہے، اس سلسلہ میں ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں لکھا ہے:

''لکن الحنفیة لا یجیزون إجارة الآجام والأنهار للسمك'' (الموسوعۃ الفقہیۃ ۱/ ۲۷۷)۔

(حنفیہ آجام (جھاڑیوں والے حوض اور نہروں) کو مچھلی کے لئے اجارہ پر دینے کے قائل نہیں ہیں)۔

علامہ شامی (م:۱۲۵۲ھ) نے نہر اور بحر کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''قال فی النهی اعلم أن فی مصر برکا صغیرة کبرکة الفهادة تجمع فیها الأسماك هل تجوز إجارتها لصید السمك منها؟ نقل فی البحر عن الا یضاح عدم جوازها'' (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹، البحر الرائق ۶/ ۷۳)۔

(نہر میں فرمایا کہ جان لو کہ مصر میں چھوٹے تالاب مثلاً ''برکۂ فہادہ''، جس میں مچھلیاں جمع ہوتی ہیں، کیا ان کو مچھلیوں کے شکار کرنے کے لئے اجارہ پر دینا جائز ہے؟ بحر میں ایضاح سے عدم جواز کا قول نقل کیا ہے)۔

نیز بڑے فقیہ علامہ خیر رملیؒ کے قول کی تردید کرتے ہوئے علامہ شامی آگے تحریر فرماتے ہیں:

''لکن قوله غیر بعید... إلخ فیه نظر، لأن الإجارة واقعة علم استهلاك العین'' (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹)۔

لیکن ان کے ''غیر بعید'' کہنے میں نظر ہے، اس لئے کہ اجارہ عین شئ کے ہلاک ہونے پر واقع ہوا ہے۔

***

پانی میں مچھلیوں کی خرید وفروخت

مولانا احمد نادر القاسمی

شرائط انعقاد بیع:

انعقاد بیع کی شرائط میں فقہاء نے مختلف شرطیں بیان کیں ہیں، یہاں ان تمام کا احاطہ تو ممکن نہیں، البتہ دو اہم اور بنیادی شرائط جو زیر بحث مسئلہ سے متعلق ہیں ان کا ذکر کرنا گزیر ہے، کیونکہ بیع وشراء کی صحت کے لئے ان دونوں ہی باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱- جو چیز خریدی اور بیچی جارہی ہو اس پر بائع اور مشتری کی ملکیت ہو، کیونکہ خرید وفروخت کا منشا عاقدین کو باہم اپنی چیز کا مالک بنانا ہوتا ہے اور کسی چیز کا مالک اس وقت تک دوسرے کو نہیں بنایا جاسکتا ہے جب تک خود انسان کی اس پر ملکیت نہ ہو (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/۱۴۶)۔

۲- دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ بیع وشراء کے وقت بائع اور مشتری مبیع وثمن کی سپردگی پر قادر ہوں، لہذا اگر سپردگی کی قدرت مفقود ہوگی تو بیع منعقد نہیں ہوگی (حوالہ سابق)۔ انعقاد بیع کی ان دونوں شرطوں کا بیع کی صحت کے لئے پایا جانا ضروری ہے اور اس کی حیثیت کلیہ کی ہے جس پر ائمہ اربعہ اور مجتہدین کا اتفاق نقل کیا گیا ہے تفصیل کے لئے دیکھئے: (الروض المربع/۱۲-۲۰۷، بدایۃ المجتہد ۲/۱۶۹، متن الغایۃ والتقریب/۱۵۴)۔

غرر کی حقیت:

پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت کے باب میں "غرر" کو بڑی اہمیت دی ہے اور غرر ہی کی وجہ سے علماء اور ائمہ فقہ میں جواز اور عدم جواز کی رائے قائم ہوئی ہے، اس لئے یہاں غرر کی مختصر تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے، الغرض:

شرعی اعتبار سے فقہاء نے مختلف الفاظ میں غرر کی حقیقت بیان فرمائی ہے، تاہم منشا کے اعتبار سے تمام تعریفوں کا حاصل ایک ہی معلوم ہوتا ہے، فقہاء احناف نے غرر کی حقیقت کسی چیز کے انجام کی پوشیدگی بیان فرمائی ہے، چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"فان الغرر هو الذى استوى فيه طرف الوجود والعدم"

(غرر وہ اندیشہ اور خدشہ ہے جس میں کسی چیز کا وجود اور عدم دونوں برابر ہو)۔

مشہور مالکی عالم شہاب الدین قرافی غرر اور جہالت کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

"وأصل الغرر هو الذى لا يدرى هل يحصل أم لا، كالطير في الهواء والسمك فى الماء" (الفروق للقرافی ۳/)۔

غرر کی اصل یہ ہے کہ جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ آیا وہ حاصل ہوگی یا نہیں، مثلاً اڑتے ہوئے پرندے، پانی میں مچھلی۔

غرر کا تعین:

غرر کثیر اور غرر یسیر کے تعین کے سلسلے میں فقہاء کے یہاں کوئی اصول مذکور نہیں، البتہ ذکر کی گئی امثلہ، مثلاً: بیع نتاج، بیع آبق، اور بیع سمک فی الماء وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تعین کا مدار عرف اور لوگوں کے ماحول پر ہے جو لوگ جس پیشے اور کاروبار سے جڑے ہوتے ہیں اور ان کو اس سے ہمیشہ سابقہ پڑتا رہتا ہے، وہ بآسانی اس کا تعین کر سکتے ہیں کہ فلاں معاملہ یہ غرر (دھوکہ) ہے، اور یہ کم ہے یا زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ غرر کے متعین کرنے میں ہر زمانے اور ہر دور، نیز لوگوں کے نظریات وافکار کے اعتبار سے خاصا فرق نظر آتا ہے، بعض چیزیں ایسی ہیں جو کسی زمانے میں غرر سمجھی جاتی تھی اور کسی زمانے میں نہیں، اسی طرح بعض ائمہ مجتہدین کے یہاں غرر کثیر سمجھا جاتا ہے اور بعض کے یہاں یسیر، اسی بناء پر ائمہ اربعہ کے دبستان فقہ میں بھی بعض مسائل میں عدم جواز اور جواز کے جداگانہ اقوال ملتے ہیں جس سے یہ بات تو تقریباً طے ہو جاتی ہے کہ غرر کثیر اور یسیر کے تعین اور شناخت کا مدار عرف وعادت اور اہل پیشہ وحرفت کی اپنی اپنی روش رہی ہے مثلاً: شیخ منصور ابن یوسف بہوتی فرماتے ہیں:

"إذا غبن فى البيع غبنا يخرج عن العادة، لأنه لم يرد الشرع بتحديده فرجع فيه إلى العرف" (الروض المربع/۲۱۹)۔

(جب مبیع میں کسی قسم کا غبن ہوتو اس کی قلت اور کثرت کا تعین تعامل اور عرف سے کیا جائے گا، کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی تحدید مذکور نہیں، اس لئے اس معاملہ میں عرف ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

غرر کثیر اور یسیر کے احکام:

ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین کا اس باب میں اتفاق ہے کہ غرر کثیر جو بیوع میں قابل انگیز نہیں، باجماع فقہاء درست نہیں، مثلاً جانور کی تھن میں دودھ کی بیع، اڑتے ہوئے پرندے کی بیع، سیپ میں موتیوں کی بیع، پانی میں مچھلی کی خرید وفروخت وغیرہ معاملات۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع الصنائع ۵ / ۱۴۸، مقدمہ ابن رشد مع المدونہ ۳ / ۲۰۹، المجموع شرح المہذب ۹ / ۲۵۸، فقہ الاسلامی وادلتہ ۴ / ۴۳۸)۔

اور جہاں تک غرر یسیر کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ جوادنی درجہ کا غرر ہے اس سے کوئی خریدی اور بیچی جانے والی اشیاء کا محفوظ رہنا بہت مشکل امر ہے اور ہمیشہ اس طرح کی چیزوں سے انسان کو سابقہ پڑتا رہتا ہے، مثلاً سنترا، اخروٹ اور اسی قسم کی دیگر خوردنی اشیاء جس کی صرف ظاہری شکل وصورت پر خرید وفروخت ہوتی ہے، اس طرح کے معاملات عام زندگی اور رواج میں داخل ہو گئے ہیں، اس لئے غرر یسیر کو معمولی درجہ کی جہالت اور مبیع میں غیر موثر مان کر تمام فقہاء نے بالاتفاق جائز قرار دیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۵۵، المدونہ ۳ / ۲۰۹)۔

تالاب اور دریا کے مچھلی کی بیع:

اس بارے میں بنیادی طور پر یہ بات سامنے رہنی چاہئے کہ کسی بھی چیز کی خرید وفروخت کے درست ہونے کے لئے لازمی طور پر دو امور کا پایا جانا ضروری ہے، جیسا کہ شرائط انعقاد کی بحث میں بیان کیا گیا، یہ دونوں چیزیں اگر بیک وقت نہیں پائی جائیں تو بیع وشراء کا معاملہ شریعت کے مبینہ اصول کی روشنی میں قطعاً نا درست ہوگا، اب تالاب اگر کسی شخص کا ذاتی ہو اور اس نے اپنے ذاتی سرمایہ سے تالاب میں افزائش کے لئے مچھلیاں ڈالی ہوں، یا مچھلیوں کے آنے کے بعد راستے بند کر دیئے ہوں اور تالاب کی مچھلیاں اس سے نہ باہر جاتی ہوں اور نہ باہر سے سیلاب وغیرہ کی وجہ سے اندر آتی ہوں اور صاحب تالاب کسی نوعیت سے اس کی سپردگی پر قادر ہو تو فقہاء احناف کی تشریحات کے مطابق اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی، اور اگر کسی نے تالاب یا نالیاں مچھلی کی پیداوار بڑھانے اور پالنے کے لئے نہ بنایا ہو اور نہ ان کے راستے بند کئے ہوں، بلکہ اسے یونہی عام رکھا ہو تو اس صورت میں اس کی مچھلی کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی، کیونکہ وہ اس کا سرے سے مالک نہیں ہے، بلکہ وہ عام اور مباح الاصل ہے، اور سب کے لئے جائز ہے جو پکڑ لے وہی اس کا مالک ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر ۶ / ۴۰۹، بدائع الصنائع ۵ / ۱۴۸، رد المحتار ۴ / ۱۱۹)۔

خلاصہ بحث:

ائمہ اربعہ کے نظریات اور متبعین کی فقہی آراء سے یہ بات سامنے آئی کہ تالاب اور ندی نالے وغیرہ کی مچھلیوں کی خرید وفروخت ان کا اشکار اور پانی سے نکالے بغیر فی الفور غیر مقدور التسلیم اور مجہول ہونے کی وجہ سے ناجائز اور فاسد ہے، مگر یہاں دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ فی زمانہ اس طرح مچھلی کی خرید وفروخت پوری دنیا میں ہو رہی ہے جو عرف عام کا درجہ رکھتی ہے، یہ عرف فاسد ہے یا عرف صحیح؟ دوسرے یہ کہ تالاب وندی نالے حوض وغیرہ میں مچھلیوں کی خرید وفروخت کی نھی اور ممانعت کس قبیل کی ہے، نیز یہ بات بھی کہ اس طرح مچھلیوں کی خرید وفروخت آج کی دنیا میں پروجیکٹ کی صورت اختیار کر گیا ہے جو انسانی ضروریات کا ایک حصہ ہے، اگر اس کا کوئی مثبت حل سامنے نہیں آتا تو دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا تو پوری انسانیت ایک ناجائز اور غیر مشروع امر کی مرتکب ہو، یا پھر نعمت خداوندی سے محروم ہو، ظاہر ہے یہ دونوں چیزیں ارشاد باری: "إن الله يريد بكم اليسر ولا يريد بكم العسر"، اور قاعدہ "الحرج مدفوع" کی بنا پر مردود ہیں۔

دوسری طرف انسانی ضروریات اور حاجات کا تقاضا یہ ہے کہ آج کل کے تالاب کی مچھلیوں کی خرید وفروخت جو تجارت اور انسانی معاش کا ایک حصہ بن گئی ہے شریعت کے قواعد عامہ "الضرورات تبيح المحظورات، عموم بلوی" اور "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" نیز "المشقة تجلب التيسير" کے پیش نظر جائز ہونا چاہئے۔

اس لئے اس بارے میں احقر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تعامل اور عرف، نیز ضروریات انسانی کے پیش نظر تالاب وغیرہ کی مچھلیوں کی خرید وفروخت بھی فی زمانہ جائز ہوگی، رہا غرر کا مسئلہ تو متقدمین کے زمانہ میں اتنی سہولیات ان کے پرکھنے کی نہیں تھیں اور آج کے ترقی پذیر دور میں اس کے ماہرین اس سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، اس لحاظ سے بھی یہ غرر یسیر کے زمرے میں آتا ہے جس کو فقہاء نے بہ اتفاق جائز قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے جب تعامل کی بنیاد پر یہ امر جائز قرار پاتا ہے تو اس کو شکار سے قبل بیچنا بھی جائز ہوگا اور عام مسلمانوں کا خریدنا بیچنا بھی، خواہ فروخت کنندہ مسلمان ہو یا غیر مسلم جائز ہوگا۔

ذاتی تالاب یا حوض میں مچھلیاں پال کر فروخت کرنا:

یہ بات بھی تقریباً ماقبل میں ذکر کی جاچکی ہے کہ کوئی شخص مچھلیوں کے شکار یا اسے روکنے کے لئے کوئی تالاب یا گڑھا بناتا ہے یا اپنی ملک میں سیلاب وغیرہ کی وجہ سے مچھلیاں آنے کے بعد اس کے راستے مسدودہ کردیتا ہے تو وہ مچھلیاں اس کی ذاتی ملک ہوجاتی ہیں، کسی دوسرے کے لئے اس کا پکڑنا درست نہیں رہتا ہے۔

تو جب آدمی اپنے ذاتی سرمایہ سے مچھلی کی افزائش کررہا ہو تو بدرجۂ اولی اس کا فروخت کرنا جائز ہوگا، اس سلسلے میں قریب قریب ائمہ اربعہ کے یہاں نظائر موجود ہیں (دیکھئے: فتح القدیر ۶/ ۴۱۰، المغنی لابن قدامہ ۴/ ۱۴۳)۔

تالاب یا حوض وغیرہ کو ٹھیکہ پر دینا:

تالاب، حوض اور نالے کے اجارہ پر دینے کے سلسلے میں احناف کے درمیان اختلاف ہے، جمہور احناف اس بات کے قائل ہیں کہ اسے اجارہ پر دینا درست نہیں ہے، البتہ علامہ خیر رملی کا خیال ہے کہ جائز اور حضرت فاروقؓ، نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بھی جواز نقل کیا گیا ہے، حنفیہ کے پیش نظر یہ بات ہے کہ تالاب کا اجارہ پر دینا اور ان کی مچھلیوں سے استفادہ کرنا عین شئی کے استھلاک کے مرادف ہے جو اجارہ کے لئے مانع ہے، اس لئے تالابوں، حوضوں اور نالوں کو اجارہ پر دینا غیر مشروع امر ہے، تاہم حنابلہ اس اجارہ کو جائز قرار دیا ہے، (تفصیل کے لئے دیکھئے: (ردالمحتار ۴/ ۱۱۹، المغنی ابن قدامہ ۴/ ۱۴۳)۔ البتہ شافعیہ کے یہاں دو رائے ہے، ایک گروہ جواز کا قائل ہے اور دوسرا گروہ عدم جواز کا (دیکھئے: المجموع شرح المہذب ۹/ ۲۸۵)۔

ائمہ کے درمیان اس فقہی اور فروعی اختلاف سے فی زمانہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور عموم بلوی کی وجہ سے جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حنفیہ نے عموم بلوی اور انسانی ضروریات کی وجہ سے جواز کے فتوے دینے کی بات کہی ہے۔

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کا حکم

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

ذخائر احادیث میں کوئی صریح روایت نہیں ملتی جس سے تالاب میں مچھلی کی بیع کی ممانعت ہو، البتہ حضرت ابن مسعودؓ کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی میں مچھلی کی بیع جائز نہیں، کیونکہ اس میں غرر ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ اس ابن مسعودؓ کے قول کی بنیاد بھی غرر ہی ہے۔

فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کی مچھلی کی بیع کا مسئلہ مجتہد فیہ ہے، لہذا تالاب میں مچھلی کی بیع کے عدم جواز پر حضرت ابن مسعودؓ کے قول کو حجت نہیں بنایا جاسکتا، راقم آخر میں علامہ ابن حزم کی رائے قلمبند کرتا ہے۔

علامہ ابن حزم مطلقاً جواز کے قائل ہیں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کا انسان مالک ہو اس میں اس کا حکم نافذ کیا جائے گا۔

''كل ما ملكه المرء فحكمه فيه نافذ بالنص، وإن شاء أمسكه وإن شاء باعه وإن شاء وهبه وقدم بطلنا قبل قول من فرق بين الصيد يتوحش، و بين الإبل والغنم والبقر والخيل يتوحش، وكذلك لا فرق بين الصيد من السمك ومن الطير و من النحل'' (المحلی ۸/۳۸۸)۔

(جس چیز کا آدمی مالک ہو جائے اس کا حکم اس میں جاری ہوگا، چاہے تو وہ اپنے پاس رکھے رہے چاہے فروخت کردے، ہم باطل قرار دے چکے ہیں ان لوگوں کے قول کو جنہوں نے جنگلی شکار اور اونٹ، گائے اور جنگلی گھوڑے کے درمیان فرق کیا ہے، ایسے ہی کوئی فرق نہیں مچھلی اور پرندے کے شکار کرنے کے درمیان)۔

ٹھیکیدار کا مچھلی شکار کرنے کے بعد فروخت کرنا:

فقہاء احناف کے یہاں ''بیع غیر صحیح کی دو قسم ہے باطل اور فاسد، فقہاء نے تالاب میں مچھلی کی بیع کو دو وجہ سے ناجائز قرار دیا ہے: غرر و جہالت کا پایا جانا اور مقدور التسلیم نہ ہونا اور یہ دونوں بیع فاسد کے اسباب میں سے ہیں، اور چونکہ بیع فاسد قبضہ کے بعد مفید ملک ہوتی ہے، لہذا ٹھیکے دار کا اس طرح حاصل کی ہوئی مچھلیاں شکار کرنے کے بعد دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا یا کسی مسلمان شخص کا پوری صورت حال جانتے ہوئے ایسی مچھلی کو خریدنا جائز ہونا چاہئے۔

نجی تالاب یا حوض کی مچھلیوں کو فروخت کرنا:

ماقبل میں یہ بات گذر چکی ہے کہ صحت بیع کی شرائط میں سے مبیع کا مملوک ہونا اور مقدور التسلیم ہونا شرط ہے، مسئولہ صورت میں مبیع پر بائع کی ملکیت تو ہے، مگر بظاہر بائع کو قدرت علی التسلیم حاصل نہیں، تاہم پہلے سوال کے جواب کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی جائز ہونی چاہئے۔

حوض یا تالاب میں از خود آنے والی مچھلی کی بیع:

اگر حوض یا تالاب مچھلی کی افزائش کے لئے تیار تو نہ کئے گئے ہوں، یا افزائش مچھلی کے لئے بنائے گئے ہوں، لیکن ''زیرہ'' ڈالے بغیر مچھلیاں بارش کی وجہ سے از خود آگئیں، اور صاحب حوض یا تالاب یا عوامی ملکیت والے تالاب کا ذمہ دار اس کی حفاظت کرنے لگے تو حاصل شدہ مچھلیاں صاحب حوض و تالاب اور عوام کی ہی مملوکہ ہوں گی (فتح القدیر ۶/۴۱۰)۔

لہذا سوال کے جواب کی تفصیل کے مطابق یہ صورت بھی شرعاً جائز ہونی چاہئے اور موجودہ زمانہ کے پیش نظر کسی خاص مدت کے لئے ٹھیکہ پر دینا بھی درست ہوگا، چنانچہ علامہ شامی نے ''کتاب الخراج'' کے حوالہ سے ابو الزناد کا واقعہ نقل کیا ہے جس سے اس مسئلہ پر روشنی پڑ سکتی ہے (رد المحتار ۴/۱۱۹)۔

☆☆☆

مچھلی کی رائج تجارت

مولانا محمد ابرار خان ندوی

ندی یا تالاب میں مچھلیوں کی خرید وفروخت:

مچھلی کی خرید وفروخت کا مسئلہ کوئی دورنو کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ زمانہ قدیم سے ہی اس کی تجارت کی جاتی رہی ہے، البتہ عصر جدید میں اس اسکے کثیر الوقوع، اور رائج ہونے کی بناء پر مسئلہ نے غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ہے اور ارباب علم وفقہ کو فقہاء اسلام کے فتوی عدم جواز پر از سرنو غور وفکر کرنے پر مجبور کر دیا ہے، اور ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے، کہ موجودہ دور میں مچھلی کی خرید وفروخت کی جو شکلیں رواج پذیر ہیں وہ بظاہر شریعت اسلامیہ کی نظر میں اور فقہ اسلامی کی رو سے مجہول یا غیر مقدور التسلیم ہونے کے سبب ناجائز ہونی چاہئے، کیونکہ بیع وشراء کے درست ہونے کے لئے درج ذیل دو بنیادی چیزوں کا پایا جانا بہت ضروری ہے، ورنہ معاملہ ہی صحیح قرار نہ پائے گا، اول: یہ ہے کہ جو چیز فروخت کی جائے بائع اس کی سپردگی پر مکمل طور پر قدرت رکھتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ چیز مجہول وغیر معلوم نہ ہو بلکہ موجود ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

’’شرائط بیع میں سے ہے کہ مبیع عقد کے وقت مقدور التسلیم ہو، اگر عقد کے وقت اس کو سپرد کرنا ممکن نہ ہو تو بیع نہیں ہوگی، اگر وہ اس کی ملکیت کیوں نہ ہو، اور اسی کی شرائط میں یہ بھی ہے کہ مبیع وثمن معلوم ہو‘‘ (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۷)۔

ندی یا تالاب کا کرایہ پر لینا:

اس بارے میں سوال یہ ہے کہ ندی وتالاب کو ٹھیکیدار پر لینا کیسا ہے؟ اور شریعت میں کیا اسکی گنجائش موجود ہے؟ تو اس کے لئے جب ہم فقہ اسلامی کے ذخیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بات بالکل عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ تالاب کو اجرت پر لینے کے نظائر بھی موجود ہیں اور اس کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

چنانچہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

’’لو استأجر البركة أو الشبكة أو استعارها لاصطياد جاز‘‘ (المغنی ۴/ ۱۴۳)۔

(اگر تالاب یا جال کو اجرت پر لے یا شکار کی خاطر ان دونوں کو بطور عاریت لے تو جائز ہے)۔

اور احناف میں علامہ شامی نقل کرتے ہیں:

(’’نہر‘‘ میں ہے کہ معلوم ہونا چاہئے کہ مصر میں چھوٹے تالاب ہیں جیسے ’’فهادة‘‘ وغیرہ ان میں مچھلیاں جمع ہو جاتی ہیں تو کیا مچھلیوں کا شکار کرنے کی خاطر اس کو اجرت پر دینا درست ہے تو ’’بحر‘‘ میں ’’ایضاح‘‘ کے حوالہ سے عدم جواز نقل کیا ہے اور پہلے یہ نقل کیا ہے کہ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ابو الزناد سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے):

’’میں نے حضرت عمر بن الخطاب کے پاس لکھا کہ سرزمین عراق میں ایک حوض ہے جسمیں مچھلیاں جمع ہو جاتی ہیں تو کیا ہم اس کو ٹھیکہ پر دے سکتے ہیں؟ تو انہوں نے مجھے لکھا کہ ہاں: ایسا کر سکتے ہو اور جو ’’ایضاح‘‘ میں ہے وہ قواعد فقہیہ سے زیادہ میل کھاتا ہے‘‘ (رد المحتار ۴/ ۱۱۹)۔

امام ابو یوسف کی مذکورہ روایت کو علامہ شامی نے مرجوح اور ایضاح کی روایت عدم جواز کو راجح وفقہی اصول وقواعد سے زیادہ میل کھانے والا قرار دیا ہے، لیکن علامہ خیر الرملی نے امام ابو یوسف کی روایت کو قابل قبول اور لائق عمل وترجیح کہا ہے (موجوہ حالات میں اس پر فتوی دیا جا سکتا ہے)، دیکھئے: (حوالہ سابق)۔

تالاب ذاتی یا عوامی کا حکم:

حوض یا تالاب خواہ ذاتی ملکیت کے ہوں یا عوامی اور اس میں مچھلیوں کی باقاعدہ پرورش کی گئی ہو، یا بارش وغیرہ کے سبب از خود آ گئی ہوں، فقہاء کے نزدیک ہر صورت میں ان کی بیع وشراء ناجائز قرار پاتی ہے، کیونکہ مقدور التسلیم کی شرط مفقود ہے (دیکھئے: مجمع الانہر ۲/ ۵۵)۔

خلاصہ بحث:

خلاصہ کلام یہ کہ تالاب کے اندر مچھلیوں کی بیع وشراء کرنا جائز ہے، ورنہ یہ امت جو آج ہر طرف پریشان وبے چین ہے، سیاسی سطح پر بھی ظلم وزیادتی اور ناانصافی کا معاملہ کیا جارہا ہے، اپنے حقوق سے محروم ہے، اعلی سے لے کر ادنی درجہ کے مناصب سے بے دخل کردیا گیا ہے، تجارت وصنعت کے میدان میں بھی سوتیلہ پن کے سلوک سے دو چار ہے، اس لئے امت کو مصائب سے نکالنے کی تدبیریں کرنا ہے، لہذا ''المشقۃ تجلب التیسیر'' کے اصول کے تحت بھی گنجائش واباحت کا پہلو نکالا جاسکتا ہے، اور پھر سب سے بڑھ کر اس دور میں عدم جواز کے علل واسباب باقی ہی نہیں رہے، اس زمانہ میں نہ ہی مچھلی غیر مقدور التسلیم ہی ہے اور نہ جہالت کا وجود ہے، اس لئے جواز کا فتوی (موجودہ عرف وزمانہ اور حالات وترقیات کو دیکھتے ہوئے) مناسب ہوگا، البتہ ندی وسمندر میں غیر مقدور التسلیم اور جہالت'' کی علت برقرار ہے جس کی بناء پر جواز کی گنجائش تلاش کرنا مشکل ہے۔

☆☆☆

مچھلی کی بیع کے سلسلے میں ائمہ اربعہ کا مسلک

مولانا محمد قمر الزماں ندوی

حنفیہ کسی کو فروخت کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں اول یہ کہ جو چیزیں بیچی جارہی ہوں وہ بیچنے والے کی ملکیت میں ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس کی سپردگی ممکن ہو، اگر فی الحال اس کے حوالہ کرنے پر قادر نہ ہو تو بیع نہ ہوگی، مثلاً عبد آبق کی بیع یا کسی گم شدہ جانور کی بیع، گو کہ وہ اپنے اصل مالک ہی کی ملکیت میں ہے، لیکن ہر وقت اس کے حوالہ کرنے پر قادر نہیں ہے، اس بنا پر احناف کے یہاں بھی تالاب کے اندر مچھلی کی بیع ناجائز ہے، البتہ اگر تالاب اتنا چھوٹا ہو کہ بغیر حیلہ کے مچھلی نکالی جاسکتی ہو تو اس صورت میں مچھلی کی بیع تالاب کے اندر بغیر قبضہ کئے بھی جائز ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: البحر الرائق ۶/ ۷۷۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مچھلی اس شخص کی ملک میں داخل ہے اور وہ بآسانی اس کے حوالہ کرنے پر قادر ہے تو اس کی خرید وفروخت درست ہوگی لیکن اگر اس کی سپردگی پر قادر نہ ہو یا ابھی اس کا مالک ہی نہ ہوا ہو تو خرید وفروخت کا معاملہ جائز نہ ہوگا، مچھلی کے بآسانی مقدور التسلیم، یعنی حوالگی پر قادر ہونے کی ہی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ شکار کے بعد برتن میں محفوظ کر لے یا یہ کہ مچھلی کو کسی ایسے چھوٹے گڑھے میں رکھے جس سے نکالنا آسان ہو اور سہل ہو۔

شافعیہ کے یہاں بھی مچھلی کی بیع تالاب کے اندر جائز ہے علت نہی غرر اور غیر مقدور التسلیم ہونا ہے۔

''ایسی چیز کی بیع جس کی سپردگی ممکن نہ ہو، جیسے پرندے کی بیع ہوا میں اور مچھلی کی بیع پانی کے اندر اور بھاگے ہوئے غلام کی بیع جائز نہیں حضرت ابو ھریرہ کی حدیث میں مروی ہے کہ بیشک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے روکا ہے، یہی وجہ ہے کہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ پانی کے اندر مچھلی کی بیع نہ کرو، اس لئے کہ اس میں غرر ہے اور اس لئے بھی کہ بیع کا مقصد ملکیت میں تصرف کرنا ہے اور وہ ایسی چیز میں ممکن نہیں ہے جس میں سپردگی کی قدرت نہ ہو من جملہ بیع غرر میں سے مچھلی کی بیع پانی کے اندر بھی ہے'' (المهذب ۹/ ۳۶۲)۔

مالکیہ کے نزدیک پانی کے اندر مچھلی کی بیع بغیر قبضہ کئے ہوئے ناجائز ہے، لیکن اگر مچھلی اس شخص کے ملک میں داخل ہے اور وہ بآسانی اس کے حوالہ کرنے پر قادر ہے تو اس کی خرید وفروخت درست ہوگی، لیکن اگر اس کی سپردگی پر قدرت نہ ہو یا ابھی اس کا مالک ہی نہ ہو تو پھر خرید فروخت کی یہ صورت جائز نہ ہوگی (دیکھئے: الثمر الدانی/ ۸۲۱)۔

حنابلہ کے یہاں بھی پانی کے اندر مچھلی کی بیع بغیر قبضہ کئے ناجائز ہے، البتہ اگر تین شرطیں پائی جائیں تو پھر مچھلی کو تالاب کے اندر بیچا جاسکتا ہے، پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تالاب مملوکہ ہو (۲) پانی اتنا رقیق اور صاف ہو کہ مشاہدہ سے مانع نہ ہو، یعنی مچھلیاں نظر آتی ہوں، (۳) مچھلی کا پکڑنا اور اس کا روکے رکھنا بھی ممکن ہو، اگر یہ شرطیں پائی جائیں تو مچھلی کو تالاب کے اندر ہی بیچا جاسکتا ہے (دیکھئے: المغنی/ ۱۴۲)۔

خلاصہ یہ کہ جمہور علماء کے یہاں بالاتفاق تالاب کے اندر مچھلی کی بیع ناجائز ہے اور علت مبیع کا غیر مقدور التسلیم ہونا اور امکانی غرر کا پایا جانا ہے۔

اس سلسلے میں فقہاء اصول ''الضرورة تبيح المحظورات'' اور ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة'' کے فقہی اصول پر عمل کرنے کی گنجائش دی جانی چاہئے جہاں تک معدوم اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی بات ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے زمانے میں یہ امکان رہتا تھا کہ بالکلیہ تالاب میں مچھلی ہو ہی نہ، جبکہ آج کل انڈے اور بیج کی شکل میں مچھلیاں تالاب میں ڈالی جاتی ہیں اور تاجر لوگ اس کا اندازہ لگا لیتے ہیں کہ مچھلیاں کتنی ہوسکتی ہیں اور اگر اس کے باوجود غرر کی صورت پیش آتی ہے تو وہ اتنا معمولی غرر ہوتا ہے کہ جسے مشتری برداشت کر لیتا ہے، یعنی وہ غرر یسیر کے حکم میں ہوتا ہے، جہاں تک غیر مقدور التسلیم ہونے کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ وضاحت کافی ہے کہ پہلے زمانوں میں مچھلیوں کے نکالنے کا کوئی ایسا موثر ذریعہ نہ تھا جس

سے مچھلی تالاب سے بہ آسانی نکالی جاسکتی ہو، لیکن اس کے برعکس اس دور میں مچھلی نکالنے کے لئے مختلف طریقے اور سامان رائج ہو گئے ہیں جس سے مشتری اسے اپنی رضامندی سے چھوڑ دیتا ہے، مگر اس کو غرر بھی مانا جائے تو وہ غرر معمولی درجہ کی ہوتی ہے جو غرر یسیر کے حکم میں ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ مچھلی کی اس طرح خرید وفروخت اتنا عام ہو گیا ہے کہ جس سے بچنا ناممکن سا نظر آتا ہے، جو جہالت کے عام ہونے کی وجہ سے لوگوں کو اس سے الگ رکھنا بھی ایک مشکل کام ہے، خود فقہاء امت نے اس کا اعتراف کیا ہے، یہ مسئلہ آج ہی کا پیدا نہیں ہے، بلکہ کئی سو صدی قبل فقہاء نے بیع سمک کو کثیر الوقوع مسئلہ میں شمار کیا ہے، اور خود فقہاء نے اس کے حل کی ضرورت محسوس کی ہے۔

لہذا اگر تالاب کے اندر مچھلی کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا جائے تو حدیث کے مخالف عمل کرنا لازم نہیں آتا اور حدیث سے متصادم بھی نہیں ہوگا، پھر وہ غرر ممنوع بھی نہیں ہے، بلکہ غرر یسیر کو فقہا نے جائز قرار دیا ہے، اس لئے کہ بعض بیع تو وہ ہے جو غرر سے خالی ہی نہیں ہے، اصلاً ممنوع ہے تو وہ غرر ہے جو غرر فاحش ہو، جو نزاع اور افتراق کا سبب بنے، یا لوگوں کے مال کو باطل طریقے سے کھانا لازم آئے، مچھلی کی بیع تالاب کے اندر کے جواز میں غرر فاحش کا امکان قطعاً نہیں ہے جو نزاع کا سبب بنے اور ناحق کسی کا مال کھانا لازم آئے، بلکہ آجکل تاجر کو اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ اس تالاب میں کتنی مچھلیاں نکل سکتی ہیں، تو اسی کے مناسب قیمت بھی لگاتا ہے، شاذ و نادر ہی غرر کا واقعہ پیش آتا ہے۔

خود امام مالکؒ کا مسلک ہے کہ ہر اس چیز کی بیع درست ہے جس کے اندر معمولی غرر ہو اور ضرورت وحاجت اس کو مستلزم قرار دے، یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے ''القواعد النورانیہ'' میں لکھا ہے کہ بیع کے سلسلے میں امام مالک کے اصول دوسرے فقہاء کے مقابلہ میں بہتر اور عمدہ ہیں، اس لئے اس کو اختیار کیا جانا چاہئے۔

اس کی تفصیل ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی کتاب ''الحلال والحرام فی الاسلام'' میں لکھی ہے (دیکھئے: مذکورہ کتاب/ ۲۳۲)۔

اس وقت مچھلی کی بیع تالاب کے اندر حاجت ہی کی شکل میں داخل ہے جس کو اوپر بیان کیا گیا ہے اور یہ حاجت عام ہے کیونکہ جس طرح تاجر پیشہ ور لوگ اور شہر والے مچھلی کھاتے ہیں، بعینہ وہی صورت حال دیہات والوں کے ساتھ ہے، نیز یہ حاجت متعین بھی ہے، کیونکہ بازار میں آجکل جو مچھلیاں خرید وفروخت ہوتی ہیں سب اسی قبیل سے ہوتی ہیں، اس لئے لوگ مجبور ہیں کہ اس معاملہ کو غرر ہونے کے باوجود حاجت اور ضرورت کی بنیاد اختیار کریں، خود فقہاء کے یہاں اصول موجود ہے جس سے حاجت کے وقت بہت سی صورتوں کو جائز قرار دیا جائے، فقہی اصول ہے ''الحاجه تنزل منزلة الضرورة''۔

☆☆☆

ندی نالے کی مچھلیوں کی بیع

مولانا نسیم الدین قاسمی[1]

وہ ندی نالے کی مچھلیوں کی بیع جو کسی شخص کی ملکیت میں نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ سرکار کی تحویل میں ہوتی ہے اور حکومت اسے کسی خاص شخص، کوآپریٹو سوسائٹی یا گرام پنچایتوں کو بندوبست کردیتی ہے اور یہ حضرات سرکار کو معاوضہ دیکر معین جگہ سے مدت معینہ تک مچھلیاں نکالتے ہیں، خود استعمال کرتے ہیں اور فروخت بھی کرتے ہیں، اور یہی طریقہ آج کل متعارف ہے اور ندی کی مچھلیوں کا حال یہ ہے کہ وہ سیلاب کی آمدورفت سے آتی اور جاتی رہتی ہیں، اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں:

۱- جو چیزیں فروخت کی جارہی ہے اس پر بیچنے والے کی ملکیت ہو (۲) اس شئی کی حوالگی اور سپردگی ممکن ہو، جیسے گمشدہ مال یا جانور کی بیع گووہ اپنے اصل مالک ہی کی ملکیت ہے، لیکن بروقت اس کے حوالہ کرنے پر قادر نہیں ہے، اس وجہ سے اس کی بیع جائز نہیں ہے (ہدایہ ج ۳: باب البیع الفاسد)۔

یہی صورت حال دریا اور سرکاری ندی نالے کی مچھلیوں کے سلسلے میں بھی ہے کہ اگرچہ دریا کی مچھلیوں پر سرکار کی ملکیت ہے، لیکن وہ اس کی حوالگی اور سپردگی پر قادر نہیں، لہذا اس قسم کا بیع وشراء کرنا جائز نہیں ہوگا۔

''لا یجوز بیع السمك قبل أن یصطاد، لأنه باع ما لا یملکه، ولأنه غیر مقدور التسلیم'' (ہدایہ ۳/ ۵۲، امداد الفتاوی ۳/ ۴۹)۔

(مچھلی کی بیع شکار کرنے سے قبل جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس نے ایسی چیز کی بیع کی ہے جو اس کے ملک میں داخل نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ غیر مقدور التسلیم بھی ہے)۔

ٹھیکیدار کا دریا کی مچھلیوں کو شکار کرنے کے بعد فروخت کرنا:

چوں کہ بیع اول درست نہیں ہوئی ''بیع مالا یملکہ'' اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی بناء پر تو اب اس دریا، یا ندی نالے کی مچھلیوں پر سرکار کی ملکیت ہے، اب اگر ٹھیکیدار اس دریا کی مچھلی کو شکار کرکے فروخت کرتا ہے تو اس کا بیع وشراء کرنا درست ہے، بایں معنی کے شکار کرنے کے بعد اسکی ملکیت اس پر ثابت ہوگئی اور مقدور التسلیم بھی ہے

''ہدایہ'' میں ہے: ''ولا یجوز بیع السمك قبل أن یصطاد إلا بصید'' (ہدایہ ۳/۵۲)۔

حوض یا تالاب کی مچھلیوں کی بیع:

مچھلی کا مالک بننے کی تین صورتیں ہیں (۱) اس حوض یا تالاب میں باقاعدہ مچھلی پالنے کے لئے رکھا ہو (۲) مچھلیوں کے تالاب میں لانے یا حوض میں آنے والی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کے لئے اس نے کوئی تدبیر کی ہو (۳) تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی شخص مچھلی کا شکار کرکے کسی برتن میں محفوظ رکھا ہو۔

جیسا کہ ''عینی'' اور ''عنایہ'' میں ہے:

''أو سد صاحب الحظیرة علیها ملکها ولو سد موضع الدخول حتی صار بحیث لا یقدر علی الخروج، فقد صار آخذًا له'' (عنایہ ۶/ ۴۹)۔

یہ تو تفصیل ہوئی مچھلیوں کی ملکیت میں آنے کی، اب جواز بیع وعدم فساد کے لئے مملوک ہونے کے بعد یہ شرط ہے کہ وہ مقدور التسلیم ہو، چونکہ حظیرہ

---

[1] جامع العلوم افضل گڑھ بجنور۔

کبیرہ یا بڑے تالاب میں یہ قدرت نہیں ہے، اس لئے حظیرہ صغیرہ (چھوٹا گڑھا) یا حوض ہونا شرط ہے، اگر یہ شرط پائی جاتی ہے تو کسی شخص کے نجی تالاب، یا حوض کی مچھلی کو شکار کرنے سے قبل فروخت کرنا جائز ہے، اور وہ دوسرا شخص ایک خاص مدت میں حوض یا تالاب کی مچھلیاں نکال کر فروخت کرے تو شرعاً اس قسم کا معاملہ کرنا جائز ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے: (دیکھئے: فتح القدیر ۳/ ۸۲)۔

نجی یا عوامی حوض یا تالاب کی ملکیت کی مچھلیوں کی بیع:

کوئی حوض یا تالاب نجی ملکیت کا ہو، یا عوامی ملکیت کا، اس میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے از خود آ گئی ہیں تو ایسے تالاب یا حوض میں یہ دیکھا جائیگا کہ آیا اسی مقصد کے لئے اس نے تیار کیا گیا تھا کہ مچھلیاں اس کے اندر آئے، تو اس تالاب کی مچھلیاں اس کی ملکیت میں داخل ہو جائیں گی، ورنہ نہیں۔

''فتح القدیر'' میں ہے:

''چنانچہ اگر کسی شخص کی ملکیت میں گڑھا ہو اور اس گڑھے کے اندر مچھلی داخل ہوگئی ہو تو ایسی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ اس مقصد کے لئے تیار کیا گیا کہ نہیں، پس اگر اسی مقصد کے لئے تیار کیا گیا تو جو مچھلی اس کے اندر داخل ہوگی اس پر اس شخص کی ملکیت ہوگی اور کسی دوسرے شخص کو اس مچھلی کا پکڑنا جائز نہیں۔ اور اگر اس مقصد کے لئے تالاب تیار نہ کیا تھا، محض تالاب ہونے کی بنا پر ہی اس کی ملکیت نہیں ہوگی اور اس کا بیع کرنا بھی جائز نہ ہوگا، عدم ملکیت کی بناء پر'' (فتح القدیر ۳/ ۸۲)۔

یہاں محض یہ بات کہ تالاب اسکی زمین میں واقع ہے اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ مچھلی پر بھی اس کی ملکیت ہو اور اس کی نظیر یہ ہے کہ فقہاء نے محض اس بات کو کہ پرندہ کسی کے کھیت میں بچہ یا انڈا دے دے کافی نہیں سمجھا کہ اس کھیت کا مالک ان بچوں اور انڈوں کا بھی مالک ہو، بلکہ جو بھی اس بچہ یا انڈا کو اٹھائے وہی اس کا مالک ہے (عنایہ فتح القدیر ۶/ ۴۹)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حوض ذاتی ملکیت کا ہو، یا عوامی ملکیت کا اگر مچھلیاں اس کے اندر از خود پیدا ہوگئیں یا بارش کیوجہ سے آ گئیں تو اگر وہ اسی مقصد کے لئے تیار کیا گیا تھا تو اس پر اسکی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور اس مچھلی کو کسی خاص مدت کے لئے ٹھیکہ پر خرید و فروخت کرنا اس کے لئے جائز ہے، ورنہ نہیں۔

☆☆☆

مچھلی کی بیع کے چند مسائل

مولانا محمد شاہد قاسمی

مچھلی کی بیع پانی میں درست نہیں ہے، ممانعت کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''إن النبی ﷺ نهى عن بيع الغرر''، مسند احمد میں ابن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے: ''لا تشتروا السمك في الماء، فإنه غرر''، حدیث پاک میں ممانعت کی علت غرر کو قرار دیا گیا ہے، اسی بناء پر تمام فقہاء نے مچھلی کی بیع کو غرر کی وجہ سے ناجائز قرار دیا ہے۔

اب سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس کو کس فہرست میں رکھا جائے غرر موثر یا غرر موثر ؟ تمام فقہاء نے جہت غرر کی تعین کر دی ہے اور وہ معقد ور التسلیم نہ ہونا اور مبیع کا مجہول ہونا ہے۔

دیگر مسائل میں معدوم کی بیع کو محض تعامل ناس کی بناء پر جائز قرار دیا گیا ہے تو مچھلی کی بیع بھی درست ہونی چاہئے، جبکہ مچھلی معدوم نہیں مستور رہتی ہے، نیز عین غائبہ مملوکہ کی بیع حنفیہ کے نزدیک جائز ہے، اگر چہ وصف مجہول ہو (۴) البتہ مشتری کے لئے خیار روئیت رہتا ہے، اور عمر بن عبدالعزیز، ابن ابی لیلی کے نزدیک تو پانی میں مچھلی کی بیع مطلقاً جائز ہے (المحلی لابن حزم ۸ / ۴۰۰)۔

ضرورت اور عام لوگوں کو حرام سے بچانے کے لئے کوئی تدبیر نکالنا تاکہ وہ حلال طریقے سے حاصل ہو جائز ہے، جسے ''حیلہ'' کہا جاتا ہے، آج کل جب کہ بازار میں آنے والی عام مچھلیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، اس لئے اس طرح کی بیع کو جائز قرار دینا ضرورت میں داخل ہو گیا ہے، ورنہ مچھلی کھانا ہی حرام ہو جائے گا، اس ضرورت کے پیش نظر مچھلی کی بیع کو جائز قرار دیا جانا چاہئے۔

سوال نمبر ۳ کا جواب:

جو حوض یا تالاب کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہو اور وہ اس میں مچھلیاں پال کر شکار کرنے سے پہلے فروخت کرنا چاہتا ہو تو ایسا کرنا جائز ہے، چونکہ مچھلی مملوک ہے جہاں تک بات غیر مقدور التسلیم اور مبیع مجہول ہونے کی، تو یہ خاص اس مسئلے میں انعقاد بیع کے لئے مانع نہیں ہے، جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا گیا، اور مشتری کا مچھلی کو ایک خاص مدت تک کے لئے تالاب میں بائع کی رضامندی سے رکھنا جائز ہے، جیسا کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ایک مدت کے لئے اس پر باقی رکھنا بائع کی رضامندی سے جائز ہے، چنانچہ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں:

''لأنه لو شراها مطلقا و تركها بإذن البائع طاب له الزيادة'' (درمختار ۴ / ۵۵۴)۔

(اگر پھلوں کو بلا قید ترک وقطع خریدا اور بائع کی اجازت سے اس کو چھوڑ دیا، اس کے لئے زیادتی حلال ہوگی)۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

اگر حوض یا تالاب مچھلی پالنے ہی کے لئے تیار کیا گیا ہو تو مچھلیاں مملوک سمجھی جائیں گی اور اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، اور اگر وہ اس کے لئے تیار نہ کیا گیا ہو، لیکن مچھلیاں آنے کے بعد اس کی حفاظت کا انتظام کر لیا گیا تو بھی مملوک سمجھی جائیں گی اور اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، اگر مذکورہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں تو مچھلیاں اس کی مملوکہ نہیں ہوں گی، لہذا اس کو فروخت کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔

جہاں تک اجارہ کی بات ہے تو تالاب وغیرہ کو مچھلی شکار کرنے کے لئے اجرت پر لینا، یا عین سمک کو اجرت پر لینا جائز نہیں ہے، چونکہ اجارہ میں اصل کے باقی رہتے ہوئے اس کے منافع سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور مذکورہ صورت میں عین شئی (اصل) ہی ختم ہو رہی ہے، چنانچہ ''مجمع الانہر'' میں ہے:

''الإجارة بيع منفعة (احتراز عن بيع عين)'' (مجمع الانہر ۲/۳۶۸)۔

(اجارہ منفعت کی بیع ہے اس میں اصل شئی کی بیع سے احتراز ہے)۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

راقم الحروف کی رائے تو فی زمانہ پانی میں مچھلی کی بیع کے جواز کی ہے، تاہم فیصلہ رکن بیع (مقدور التسلیم) میں خلل کی وجہ سے بطلان کا ہو تو اس کی تفصیل سوال کے مطابق درج ذیل ہے۔

ماقبل میں بیان کیا گیا کہ بیع باطل میں اگر مشتری مبیع پر قبضہ بھی کر لے پھر بھی یہ قبضہ ملکیت کا فائدہ نہیں دیتا، لہذا مبیع اس کے پاس امانت سمجھی جائے گی، بیع باطل کا یہ عام حکم ہے، لیکن اگر بطلان بیع غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ہو تو اسکی تفصیل اس طرح سے ہے کہ اگر مشتری اس کے باوجود شکار کر لیتا ہے تو عقد جدید کے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اور دوسرے شخص کے لئے اس کا علم ہوتے ہوئے خریدنا جائز نہیں ہے، چونکہ وہ (مچھلیاں) بائع کی امانت ہے، لیکن اگر شکار کرنے کے بعد دوبارہ ایجاب وقبول کر لے تو پھر معاملہ درست ہو جائے گا، اس کا فروخت کرنا، دوسرے کا اس سے خریدنا صحیح اور درست ہوگا۔

چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''جمہور حنفیہ کی رائے جیسا کہ ظاہر الروایۃ میں ہے یہ ہے کہ اگر مبیع عقد کے وقت معجوز التسلیم ہو تو بیع منعقد نہیں ہوگی اگرچہ وہ مملوک ہو جیسا کہ پرندہ جو اپنے مالک کے ہاتھ سے اڑ جائے اور جیسے عبد آبق اور لقطہ کی بیع اور یہ بیع باطل ہوگی یہاں باطل ہوگی ہاں اگر اس وقت دونوں سابقہ عقد پر راضی ہوں تو یہ از سر نو بیع تعاطی سمجھی جائے گی'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۴۲۹)۔

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا محمد طاہر مظاہری

الف- حکومت چونکہ ندی نہروں اور تالابوں کو ملکیت سمجھتی ہے اور مچھلیوں کے لئے ہی خاص کر کے مالکانہ تصرف کرتی ہے اور یوں بھی عرف عام میں تالاب وغیرہ کا مچھلیوں کے لئے ہی خاص ہونا عام ہو چکا ہے، اس لئے بیع درست ہوگی، البتہ وہ ندی جس کا احاطہ نہ کیا گیا ہو تو پھر ندی ونہر کی مچھلیاں کسی بھی صورت میں ملکیت متصور نہیں ہوں گی، اس لئے اس کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہوگی، جیسا کہ فقہ کی کتاب ''بدائع، شامی'' اور ''بحر'' وغیرہ میں مذکور ہے، ہاں ندی ونہر میں مچھلی کی بیع اس صورت میں جائز ہو سکتی ہے، جبکہ مچھلیوں کو روکنے کے لئے کوئی حیلہ اختیار کر لیا جائے، مثلاً جال وغیرہ کے ذریعہ حد بندی کر دی جائے، جیسا کہ بعض جگہوں پر اس کا رواج ہے،

ب- جیسا کہ معلوم ہوا کہ بیع جائز ہونی چاہئے، لیکن اگر ناجائز بھی کہا جائے تو عند الاحناف ہی نہیں بلکہ دیگر ائمہ کے نزدیک ناجائز ہونے کی وجہ مقدور التسلیم نہ ہونا، یا مبیع کا مجہول ہونا معلوم ہوتا ہے اور ان دو صورتوں میں عند الاحناف بیع فاسد ہوتی ہے نہ کہ باطل، جیسا کہ ''بدائع'' کے حوالہ سے (ومنها أن يكون المبيع معلوما وثمنه معلوما) ظاہر ہوا، اور بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ جب مبیع پر قبضہ ہو جائے تو ملک کا فائدہ حاصل ہوگا، چنانچہ شامی کی عبارت ہے: ''لأنه فاسد يفيد الملك بالقبض'' (رد المحتار ۴/۵۴۱). اس لئے اب مسلمانوں کو صورت حال سے واقفیت کے باوجود بھی خریدنا صحیح ہوگا۔

ج- چوں کہ دور ترقی میں اب ایسے غرر کا خدشہ باقی نہیں رہا جو بیع کے نفاذ میں مؤثر ہو، اس لئے شکار سے قبل بیچنا بھی جائز ہونا چاہئے، اور یہاں خود مشتری اپنے تئیں قبضہ کرنے پر رضامند ہے اور اس سے قبل اس کی نظیر ''بدائع'' کے حوالے سے گذر چکی ہے (ولو جاء إنسان إلى مولى العبد) (بدائع الصنائع ۵/۱۴۷) اور وہاں بیع کو جائز قرار دیا ہے، بلکہ ابن حزم نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص غبن پر راضی ہے تو بھی بیع لازم ہو جائے گی، چنانچہ ''محلی'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

''لأن الغبن لا يجوز ولا يحل إلا برضاء والمغبون و معرفته بقدر الغبن و طيب نفسه به'' (المحلی ۹/۴۳)۔

د- چوں کہ مذکورہ صورت میں مچھلیاں کسی کی ملک نہیں ہوتی اور غیر مملوک کی بیع باطل ہوتی ہے ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

''السمك قبل الصيد اى لم يجز بيعه لكونه باع ما لا يملكه. فيكون باطلا'' (البحر الرائق ۶/۷۳)۔

(مچھلی کی بیع شکار سے قبل جائز نہیں ہے، اس لئے کہ بائع نے ایسی چیز فروخت کی ہے جس کا وہ مالک نہیں تو بیع باطل ہوگی)۔

اور رہا، اجارہ تالاب کا مسئلہ تو اجارہ کی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے تالاب وندی کا اجارہ پر لینا بھی جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اجارہ کے جواز کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ منفعت سے فائدہ اٹھایا جائے نہ کہ عین شئی سے اور مذکورہ صورت میں مچھلیاں عین ہے نہ کہ منفعت، اس لئے اجارہ کی شرط مفقود ہو رہی ہے۔

علامہ محقق داماد آفندی فرماتے ہیں:

''وفي الاصطلاح هي الإجارة بيع منفعة (احتراز عن بيع عين) معلومة جنسا وقدرا بعوض معلوم قدرا وصفة'' (مجمع الانہر ۲/۳۶۸)

(اور اصطلاح میں اجارہ منفعت کی بیع کا نام ہے جو جنس اور قدر کے اعتبار سے معلوم ہو، اس عوض کے بدلہ میں جو قدر اور صفت کے اعتبار سے

معلوم ہو)۔

نیز علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

''ولم تجز إجارة بركة ليصاد منها السمك۔۔۔ هل تجوز إجارتها لصيد السمك منها نقل في البحر عن الإيضاح عدم جوازها''(ردالمحتار ۵/۶۱)۔

(اور جائز نہیں ہے تالاب کا اجارہ تاکہ اس سے مچھلی شکار کی جائے، کیا تالاب کا اجارہ مچھلی شکار کرنے کے لئے جائز ہے؟ تو ''بحر'' میں ''ایضاح'' کے حوالہ سے عدم جواز نقل کیا ہے)۔

البتہ اس حیلہ سے تالاب کو اجارہ پر لینے کے لئے جواز کی صورت نکل سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مچھلی پہلے خرید لی جائے اور اس کے بعد جب تک تالاب کی ضرورت ہو دوسرے صفقہ میں معاملہ اجارہ کرلیا جائے اور اس کی نظیر مذکورہ ذیل عبارت سے محسوس ہوتی ہے:

''والحيلة أن يأخذ الشجرة معاملة على أن له جزءاً من ألف جزء أن يشتري أصول الرطبة كالباذنجان وأشجار البطيخ والخيار ليكون الحادث للمشتري، وفي الزرع والحشيش يشتري الموجود ببعض الثمن ويستأجر الأرض مدة معلومة يعلم فيها الإدراك بباقي الثمن، وفي الأشجار الموجود، ويحل له البائع ما يوجد''

(اور حیلہ یہ ہے کہ درخت کو اس شرط پر معاملہ پر لے کہ ہزارواں جز اس کا ہوگا، بایں طور کہ وہ سبزی کے پورے پودے کو خرید لے، جیسے بیگن، خربوزہ، اور کھیر کا پودا، تاکہ بعد میں رونما ہونے والی چیز مشتری کی ہو، اور موجودہ کاشت اور گھاس کو تھوڑے ثمن کے عوض خرید لے، اور زمین بقیہ ثمن کے عوض اجرت پر مدت معلومہ تک کے لئے لے لے جب تک کہ کھیتی کے پک جانے کا امکان ہو اور درختوں میں بھی موجودہ (پھل) کو خرید لے تو ایسی صورت میں بائع کے لئے ''مایوجد'' (بعد میں پیدا ہونے والا پھل) حلال ہوگا۔

اس عبارت سے علامہ حصکفیؒ نے مشتری کے لئے آسان صورت نکالی ہے تو اس پر قیاس کرتے ہوئے اگر مچھلی خرید کر تالاب کو اجارہ پر لے لیا جائے تو ایسی صورت میں اجارہ درست ہونا چاہئے۔

★★★

شکار سے قبل مچھلی کی بیع

مولانا محمد قمر عالم سبیلی

بیع کی مروجہ صورت باتفاق ائمہ اربعہ ناجائز ہے، خواہ ندی نالہ کی ہو، یا ذاتی ملکیت کے تالاب وغیرہ کی ہو۔

مذاہب کی تفصیل: حنفیہ کے یہاں مچھلی کی بیع شکار سے پہلے جائز نہیں، اور یہ حکم ندی، نالہ، اور تالاب کیلئے عام ہے، لیکن تالاب میں مچھلی کی بیع کو چند شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر تالاب ایسا ہو کہ بغیر حیلہ کے ہاتھ سے مچھلی کا پکڑنا ممکن ہو تو جائز ہے، ورنہ نہیں، اور بڑے نہر میں کسی بھی طرح مچھلی کی بیع جائز نہیں، اگرچہ معاملہ طے پاجانے کے بعد سپردگی پر قادر ہو جائے، بہرحال جن صورتوں میں قبل الاصطیاد مچھلی کی بیع جائز ہے ان تمام صورتوں قبضہ کے بعد مشتری کو قبول اور رد کا اختیار ہوگا، پانی میں دیکھ لینا کافی نہیں ہوگا۔

تفصیل کے لئے دیکھئے: (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۱۳، البحر الرائق ۶/ ۷۳)۔

امام شافعی کا مسلک بھی اس سلسلہ میں حنفیہ ہی جیسا ہے، نہر، ندی، اور بڑے تالاب میں مچھلی کی بیع جائز نہیں، تفصیل دیکھئے: (شرح مہذب ۹/ ۲۸۳)۔

حنابلہ کے یہاں بھی قبل الاصطیاد مچھلی کی بیع جائز نہیں، البتہ تین شرطوں کے ساتھ انہوں نے جائز قرار دیا ہے، یہ تینوں شرطیں ندی، نالہ اور بڑے تالاب میں مفقود ہیں، لہذا نتیجہ کے طور پر حنابلہ جمہور کے ساتھ ہیں (دیکھئے: المغنی ۴/ ۱۴۳)۔

امام مالک کے یہاں بھی جمہور کی طرح شکار سے قبل مچھلی کی بیع ناجائز ہے (دیکھئے: الثمر الدانی/ ۴۲۸)۔

۲- رہا یہ مسئلہ کہ اس طرح حاصل کی گئی مچھلیوں کا دوسرے لوگوں کے دانستہ طور پر خریدنا جائز ہے یا نہیں، تو یہ بیع اول کے فساد و بطلان پر موقوف ہے

اگر بیع اول باطل ہے تو دوسرے لوگوں کے لئے خریدنا جائز نہیں اور فاسد ہے تو جائز ہے، لہذا اس کی تعین ضروری ہے کہ بیع سمک کی مروجہ صورت باطل ہے تو دوسرے لوگوں کے لئے خریدنا جائز نہیں اور فاسد ہے تو جائز ہے، لہذا اس کی تعین ضروری ہے کہ بیع سمک کی مروجہ صورت بیع باطل ہے یا بیع فاسد۔

فقہاء کی عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ بیع سمک کی مروجہ صورت بیع فاسد ہے (۱) کیونکہ رکن بیع میں خلل نہیں (۲) مچھلی کی بیع اصل کے اعتبار سے مشروع ہے (۳) تمام ادیان سماویہ میں مچھلی کو مال تسلیم کیا گیا ہے، نیز یہ کہ اس طرح مچھلی کی بیع کو صاحب ''بحر'' نے غیر مقدور التسلیم شئی کی بیع قرار دیا ہے، اور غیر مقدور التسلیم شئی کی بیع فاسد ہے ''لکونہ غیر مقدور التسلیم فیکون فاسدا'' اس لئے کہ یہ غیر مقدور التسلیم شئی کی بیع ہے، تو یہ بیع فاسد ہوگی (البحر الرائق ۶/ ۷۳)۔

۳، ۴- تیسرے سوال کا جواب پہلے سوال کے ضمن میں مفصل بیان کیا جاچکا ہے (ملاحظہ فرمالیں) البتہ ایک جزئیہ باقی رہتا جاتا ہے کہ ذاتی ملکیت کے تالاب کو اجرت پر دینا جائز ہے، یا نہیں ''مغنی'' میں ہے کہ تالاب اور جال کو کرایہ پر لینا یا مستعار لینا جائز ہے، کرایہ پر لینے کے بعد جو مچھلیاں تالاب میں داخل ہوں مستاجر ان مچھلیوں کا مالک ہوگا، چنانچہ مغنی میں ہے:

''ولو استأجر البركة أو الشبكة أو استعارهما للاصطياد جاز وما حصل فيها ملكه'' (المغنی ۴/۱۴۲)۔

اگر کسی نے تالاب یا جال اجرت پر لیا یا مستعار لیا شکار کی غرض سے تو جائز ہے اور جو کچھ ان دونوں میں حاصل ہو مستاجر اس کا مالک ہوگا

(دیکھئے: شامی ۵/ ۶۱)۔

خلاصہ:

دلائل کی روشنی میں أظہر من الشمس ہے کہ بیع سمک کی مروجہ صورت ناجائز ہے، فقہاء اربعہ میں سے کسی سے جواز کا قول منقول نہیں، اگر تعامل ناس یا حاجت کی وجہ سے ان صورتوں میں مچھلی کی بیع کو جائز قرار دیا جائے تو یہ قواعد فقہیہ کے خلاف بات ہوگی، اس لئے کہ اس میں غرر ہی نہیں غرر کثیر ہے اور غبن فاحش ہے اور مبیع مجہول ہے، نص صریح کے مقابل عرف پر عمل نہیں کیا جائے گا، نیز یہ کہ اگر مچھلی کی بیع قبل الاصطیاد کو جائز قرار دیا گیا تو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ والی حدیث جس کو بعض نے موقوف کہا ہے اور بعض نے مرفوع کہا ہے، بہر حال اگر موقوف بھی ہے تو یہ اثر صحابی ہے اور حنفیہ کے یہاں اثر صحابی بھی حجت ہے، اس حدیث کا بالکلیہ متروک ہونا لازم آئے گا، اور ناجائز کی صورت میں یہ بات لازم نہیں آتی، تعامل او رحاجت بھی اس قدر شدید نہیں کہ اس سے بچنا ناممکن ہو، پھر یہ کہ مچھلیوں کی رائج صورت بیع فاسد کے قبیل سے ہے اور دوسرے لوگوں کے لئے خریدنا جائز ہے اس طریقہ سے امت اس نعمت سے محروم بھی نہیں ہوتی ہے، پھر تاویلات کے ذریعہ ناجائز کو جائز قرار دینا نامناسب ہے

تعارف پر عمل اس وقت جائز ہے جب اس کا ٹکراؤ نص صریح سے نہ ہو اور لوگ حرج وتنگی میں پڑ جائیں، اور صورت حال اضطراری کیفیت نہ اختیار کر جائے اور ایسی کوئی صورت نہیں پائی جاتی، جائز طریقہ سے بھی مچھلیاں حاصل کی جاسکتی ہیں، خلاصہ یہ کہ مچھلیوں کی رائج صورت اصول بیع کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، البتہ بیع باطل نہیں بلکہ فاسد ہے۔

☆☆☆

مچھلی سے متعلق چند مسائل

مولانا محمد ارشد قاسمی

ائمہ اربعہ کے مسالک اوران کی کتابوں سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ندی، نالوں میں مچھلی کی بیع ناجائز ہے، خواہ مچھلی کی پرورش کی گئی ہو، یا وہ ازخود بارش وغیرہ کے پانی سے اکٹھا ہوگئی ہو، ناجائز ہونے کی علت غرر ہے اور غرر دو جہتوں سے ہے، ایک فی الفور عدم سپردگی، دوسرے جہالت، یعنی مچھلیوں کی قلت وکثرت سے ناواقفیت، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جب سوالات پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مذکورہ تینوں سوالات (یعنی (۱) عصر حاضر میں جو حکومت ندی نالوں کی مچھلیوں کو بغیر اس کے نکالے ہوئے کسی خاص شخص، کوآپریٹیو سوسائٹی، یا مقامی پنچائتوں کے ہاتھ فروخت کرتی ہے، (۳) یا وہ تالاب جو کسی خاص شخص کی ذاتی ملکیت کا ہے اور وہ اس میں مچھلی پال کر اس کو شکار کئے بغیر کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے (۴) یا وہ تالاب جو نجی ملکیت کا ہے، یا عوامی ملکیت کا اس میں مچھلی پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود آگئی ہو اس کو فروخت کرنا، یا ٹھیکہ پر دینا بہر صورت ناجائز ہے، کیونکہ صاحب تالات اس مچھلی کا مالک نہیں ہے، اور وہ چیز جس کا مالک نہ ہو اس کو فروخت کرنا درست نہیں ہے (دیکھئے: ہدایہ ۳/ ۱۰۴)۔

رہا پہلا اور تیسرا سوال، اگران دونوں صورتوں میں دریا، نہر، تالاب کا پانی محصور ہے تو اس کو بربناء ضرورت وحاجت جائز ہونا چاہئے، جائز ہو نے کی دو وجہ بربنائے قیاس سمجھ میں آتی ہے:

۱- شامی میں ہے کہ اگر درخت کا بعض پھل ظاہر ہوا ہو اور بعض ظاہر نہ ہوا ہو تو کیا اس کو فروخت کرسکتے ہیں؟ اس سلسلے میں حلوانی نے جواز کا فتوی دیا ہے اور بطور دلیل یہ پیش کیا ہے کہ اس میں لوگوں کے تعامل کی وجہ سے مستحسن یہی ہے کہ جواز کا فتوی دیا جائے، کیونکہ لوگوں کو انکی عادت سے نکالنے میں حرج ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: شامی ۴/ ۵۵۵-۵۵۶، شرح مہذب ۹/ ۲۵۸، بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۶)۔

سوال نمبر ۲:

سوال نمبر ا کے تحت جو صورت بیان کی گئی ہے اگر اس کو ہم جائز مانتے ہیں تو پھر اس تالاب سے مچھلی نکال کر فروخت کرنا اور پوری صورت حال کو جانتے ہوئے اس مچھلی کا خریدنا جائز ہوگا، اور اگر ہم ناجائز مانتے ہیں تو پھر اس تالاب سے مچھلی نکال کر فروخت کرنا ناجائز ہوگا، کیونکہ پانی میں مچھلی کی بیع جو ہوتی ہے وہ بیع فاسد ہوتی ہے اور بیع فاسد میں قبضہ کے بعد ملکیت ثابت ہوجاتی ہے اور ملکیت کے ثبوت کے بعد اس مچھلی کو کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا درست ہوگا، البتہ پوری صورت حال جانتے ہوئے خریدنا مکروہ ہوگا:

''برخلاف اس چیز کے جو بیع فاسد کے طور پر خریدی گئی ہو جب اس کو فروخت کرے کسی دوسرے سے بطور بیع صحیح کے تو مشتری ثانی کو اس کے واپس کرنے کا حکم نہیں دیا جائے گا اگر چہ بائع کو اس کا حکم دیا گیا ہو اس لئے کہ رد کو واجب کرنے والا سبب اس کے بیع کرنے سے زائل ہوگیا، اس لئے کہ رد کا وجوب بیع کے فساد کی وجہ سے ہے اس کا حکم محدود ہے مشتری کی ملک پر اور تحقیق کہ اس کی ملک اپنے علاوہ سے بیع کرنے سے زائل ہوگئی، وہ چیز جو بطور فاسد کے خریدی گئی ہو اس کو جب مشتری اول قبضہ رکھنے کے بعد فروخت کرنے کا ارادہ کرے تو اس کا خریدنا مکروہ ہوگا'' (رد المحتار ۵/ ۹۸)۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلیوں کی بیع

مولانا محمد ایوب سہیلی

جن صورتوں میں ائمہ اربعہ نے تالاب میں مچھلی کی بیع کو جائز قرار دیا ہے ان صورتوں میں مچھلی کی بیع درست ہوگی اور جن صورتوں میں ناجائز کہا ہے تو وہاں اس کی علت غرر کثیر تھی، اب اس دور کے عرف کے لحاظ سے یہ چیزیں غرر یسیر کی طرف منتقل ہوگئی ہیں جو کہ جائز ہے، البتہ بعض ایسی صورتیں ہیں کہ اب بھی ان میں غرر کثیر ہے، جیسا کہ سمندر بڑے دریا اور بڑی نہر جس کا احاطہ نہ ہو اس میں مچھلی کی بیع درست نہیں، کیونکہ غیر مقدورالتسلیم ہے، ہاں اگر بڑی نہر میں سرکار نے بندھ لگادی ہو اور سرکار نے کسی خاص شخص کے حوالے کر دیا ہو جس کو حوالے کیا اس نے اس میں جال ڈالے رکھا ہو جس سے مچھلی اس بندھ سے باہر نہ جاتی ہو تو اگر وہ جال اٹھائے، یا دوا ڈالے جس سے مچھلی فوراً اوپر آجائے جو آج کے دور میں متعارف ہے اور وہ اس کے قبضے میں آجاتی ہے تو بیع جائز ہے، کیونکہ مقدورالتسلیم ہے، جیسا کہ مسلک احمدؒ میں گذرا چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں

''ومتى نصب شبكة أو شركا أو فخاً أو أحبولة ملك ما وقع فيها من الصيد؛ لأنه بمنزلة يده'' (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۱۴۳)۔

(اور جب جال او کانٹا یا چھوٹا جال، یا رسی نصب کیا جو شکار اس میں واقع ہو جائے تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا، کیونکہ یہ اس کے قبضہ میں ہے)۔

اور جہاں تک سرکاری تالاب یا ندی نالوں میں موجود مچھلیوں کی بیع وشراء کا مسئلہ ہے، آج کے عرف کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جو علت غرر کی تھی اور جو جہالت تھی جو کہ مفضی المنازعۃ ہے، اب یہ جہالت غیر مفضی الی المنازعۃ ہوگئی ہے اور جو غرر تھا وہ اب یسیر کے حکم میں ہے کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں رہا، کیونکہ آج کے جدید دور میں ایسے آلات تیار ہوگئے ہیں کہ چند منٹ میں پورا تالاب صاف کر دیتی ہے اور سرکار جس پنچائت کو دیتی ہے یا کسی خاص شخص کو دیتی ہے تو یہ لوگ ایسی دوائیں استعمال کرتے ہیں جس سے مچھلی باہر آجاتی ہے اور باسانی اس پر قبضہ ہو جاتا ہے، اور بعض بڑے تالاب والے تالاب کے اردگرد چھوٹے چھوٹے پوکھرے رکھتے ہیں، جب فروخت کرنے کا موقع آتا ہے تو پورے پانی کو پوکھروں میں چھوڑ دیتے ہیں اور پانی جانے کے راستوں میں جال ڈال دیتے ہیں جس سے مچھلی باہر نہیں جاسکتی ہے، پوری مچھلی تالاب میں رہتی ہے، اب اس کا فروخت کرنا شرعاً جائز ہے، کیونکہ اگر اس میں رکھ کر بھی فروخت کرے گا تب بھی فی الفور مقدورالتسلیم ہونے کی وجہ سے ہر صورت میں بیع جائز ہوگی (دیکھئے: رد المحتار ۵/ ۶۱، رحمۃ الامہ ۱/ ۱۷۰)۔

اور بعض تبع تابعین نے مطلقاً بڑے تالاب کی مچھلیوں کی بیع جائز قرار دیا ہے ان میں عمر ابن عبدالعزیزؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ ہیں، چنانچہ رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ میں ہے:

''فان عمر بن عبد العزيز. وابن أبي ليلى أنهما أجاز بيع السمك في بركة عظيمة''

(رحمۃ الامہ فی اختلاف الائمہ ۱/ ۱۷۰، نیز دیکھئے: فتح القدیر ۶/ ۴۰۹)۔

۲- آج کل بازار میں خرید وفروخت کی چیز حرام وحلال سے ملی ہوئی ہیں، اس لئے ایسے بازاروں کے بیع وشراء کا حکم یہ ہے کہ اگر حرام غالب ہو تو اس سے بچنا چاہئے، لیکن اگر خریدے تو وہ چیز حلال وحرام اسطرح مل جائے کہ کوئی پہلو راجح معلوم نہ ہو، تو پھر وہاں سے خریدنا درست ہے، ہاں اگر معین طریقہ سے معلوم ہو جائے کہ فلاں چیز حرام ہے تو پھر خریدنا درست نہیں ہے، اور ایسے ہی مچھلی کے بارے میں۔

۳- اگر کسی کا ذاتی تالاب ہو جس میں مچھلیوں کی نشوونما کرتا ہو تو وہ مچھلیاں اس کی مملوک ہوں گی، کیونکہ آج کے عرف میں ذاتی تالاب جس کے پاس ہوتا ہے اس کے پاس بڑے جال ہوتے ہیں جو کہ پورے تالاب کو گھیرے ہوئے رہتے ہیں جب چاہے مچھلی پکڑ لے جال ڈالا جاتا ہے او

ریوری مچھلی اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے، تو ایسی صورت میں مچھلیوں کے پانی مین رہتے ہوئے فروخت کرنا جائز ہے، چنانچہ ابن ہمام نے لکھا ہے
''تو اگر مچھلی کے لئے ہی تیار کیا گیا ہے تو جو اس میں داخل ہو جائے گی وہ اس کا مالک گا اور کسی کے لئے یہ حق نہیں کہ اس سے مچھلی پکڑے، پھرے دیکھا جائے کہ اگر بغیر حیلہ کے پکڑ سکتے ہیں تو بیع جائز ہے، کیونکہ مملوک مقدور التسلیم ہے، جیسے کہ چھوٹے کنویں میں مچھلی رکھی ہوئی ہے'' (دیکھئے: فتح القدیر ۶ / ۴۰۹)۔

۴- تالاب خواہ اپنی زمین میں واقع ہو یا عوامی تالاب ہو، لیکن اس میں مچھلی بارش کی وجہ سے آگئی ہو تو مالک تالاب کا اس کے آنے میں کوئی دخل نہ ہو تو مالک تالاب کا اس میں مچھلی کو فروخت کرنا درست نہ ہوگا، اور نہ اس کا اجارے پر دینا جائز ہوگا، البتہ وہ خود اس سے مچھلی پکڑ کر کھا سکتا ہے اور دوسرا کوئی مچھلی پکڑے تو روک نہیں سکتا، چنانچہ شامی ہے:

''مگر جبکہ مچھلی خود اس میں جمع ہوگئی ہوں اور مچھلیوں کے داخل ہونے کی جگہ کو بند نہ کیا ہو تو ملکیت کے نہ ہونے کی وجہ سے بیع جائز ہوگی اور ایسے تالاب کا اجارہ پر دینا جائز نہ ہوگا کہ اس سے مچھلی کا شکار کیا جاسکے، نہر میں ہے:
جان لو کہ مصر میں چھوٹے تالاب جیسا کہ فہادہ کا تالاب جس میں مچھلی جمع ہوتی ہے، کیا اس کا اجارے پر دینا جائز ہوگا تا کہ شکار کر کے اس سے مچھلی حاصل کر سکے تو بحر میں اس کا عدم جواز نقل کیا گیا ہے'' (شامی ۵ / ۶۱-۶۲، البحر الرائق ۶ / ۸۶)۔

☆☆☆

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت

مولانا محمد مرشد صاحب

سوالات کے جوابات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

سرکاری تالاب، ندی، نالوں اور دریا میں پائی جانے والی مچھلیاں کسی کی ملک نہیں ہیں، بلکہ مباح ہیں، بیع شکار کر لینے سے پہلے مچھلی کی بیع اور تالاب کو ٹھیکہ پر دینا حکومت کے لئے جائز نہیں ہے

''ولا یجوز بیع السمك قبل أن یصطاد، لأنه باع ما لا یملکه'' (ھدایہ اخرین ۳/ ۳۴، عین الہدایہ ۳/ ۷۲، کنز الدقائق/ ۲۳۹، البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۶/ ۷۳، ردالمحتار ۴/ ۱۱۹، الفتاوی الہندیہ ۳/ ۱۱۳، فتاوی عبدالحی/ ۲۷۵)۔

''عن أبي هريرة قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر''

(رواہ مسلم مشکوۃ شریف ۲/۲۴۷، روی الامام احمد مرفوعاً: لا تشتروا السمك في الماء فانه غرر البحر الرائق ۶/۷)۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ پانی میں مچھلی مت خرید و کہ غرر ہے، یعنی اس میں دھوکہ ہے (رواہ احمد عین الہدایہ ۳/ ۷۳)۔

ولم تجز إجارة بركة ليصاد منها السمك (درالمختار علی ہامش ردالمحتار ۴/ ۱۹۹، ردالمحتار ۴/ ۱۱۹، البحر الرائق ۶/ ۷۳، منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۶/ ۷۳)۔

لیکن اگر گورنمنٹ نے شکار کرنے سے پہلے ہی ان کو کسی سامان کے عوض فروخت کر دیا تو وہ بیع فاسد ہے اور اگر دراہم و دنانیر کے بدلے فروخت کی تو بیع باطل ہے، بصورت بطلان مشتری کے قبضہ کر لینے کے باوجود ملکیت ثابت نہیں ہوتی، پس مشتری کے تصرفات ہبہ و بیع نافذ نہ ہوں گے اور خریدار کے لئے کھانا بھی جائز نہیں ہے، کسی مسلمان شخص کا پوری صورت حال جانتے ہوئے ایسی مچھلی کو خریدنا جائز ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: در مختار علی ہامش ردالمحتار ۴/ ۱۹۹، ردالمحتار ۴/ ۱۹۹، فتاوی عبدالحی/ ۲۷۶، ''والبیع الباطل (حکمه عدم ملک المشتری ایاہ) اذا قبضه''، در مختار علی ہامش ردالمحتار ۴/ ۱۱۸، البحر الرائق ۶/ ۶۹، فتاوی محمودیہ ۴/ ۱۹۶، عین الہدایہ ۳/ ۷۰)۔

مچھلی کی پرورش کے لئے اگر تالاب بنایا گیا ہو، پھر بیرونی مچھلیاں اس تالاب میں آگئیں ہوں تو اس کے بعد آنے کا راستہ بند کر دیا گیا ہو تو وہ مچھلیاں مملوک ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: مذکورہ حوالہ جات)۔

بیع فاسد کو ختم کرنا واجب ہے، لیکن اگر بائع کی اذن سے خریدار نے قبضہ کر لیا تو مالک ہو جائے گا، پھر مشتری کے تصرفات ہبہ وغیرہ مچھلی میں نافذ ہو جائیں گے اور دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دینا بھی مشتری کے لئے جائز ہے، مگر بیع فاسد کی صورت میں مشتری کے لئے خریدی ہوئی مچھلی کا کھانا درست نہیں (دیکھئے: البحر الرائق ۶/ ۶۸، ہدایہ آخرین ۳/ ۴۶-۴۷، درالمختار فی ہامش ردالمحتار ۴/ ۱۳۸، درالمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۴ ص ۱۳۹)

تاہم علم کے بعد ایسی مچھلی خریدنے سے بھی احتیاط کرنا چاہئے (فتاوی محمودیہ ۴/ ۱۹۷)۔

۳- ایسے تالاب یا حوض کی مچھلیوں کو شکار کرنے سے پہلے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا ناجائز ہے اور بیع فاسد ہے۔

۴- اگر حوض یا تالاب کسی کی ذاتی ملکیت ہو، یا عوامی ملکیت ہو اس میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش، یا سیلاب کی وجہ سے ازخود آگئیں ہوں انہیں تالاب سے نکالنے کے بعد کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے۔

☆☆☆

بیع وشراء کے بعض مسائل

مولانا اختر قاسمی[1]

۱- دور جدید کے بدلتے ہوئے احکام میں مچھلی کے معاملے میں توسع سے کام لینا چاہئے، اس لئے سرکاری تالاب وغیرہ کی خرید وفروخت مچھلیوں کی جنس میں سے بعض کا تعین کر کے کی جاسکتی ہے، اس صورت میں بیع حیز مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے سے نکل کر معلوم اور مقدور التسلیم کے حیز میں آئے گی، تالاب کی بعض مچھلیوں کا یقین کر کے تعین چاہے، قیمت میں فروخت کرسکتا ہے، اگر ایک پیسہ کی چیز سو روپے میں فروخت کردے تو اس کی بھی اجازت ہے، بشرطیکہ خریدار سے کسی طرح کا دھوکہ نہ کرے، بلکہ صاف کہہ دے کہ میں اتنے میں فروخت کروں گا، تو یہ صفائی معاملات۔

۲- ٹھیکہ دار کا مچھلی کی خرید وفروخت کرنا بیع فاسد ہے اور کسی دوسرے مسلمان کے لئے خریدنا جائز رہے گا، ضابطہ یہ ہے کہ جو شئی بالاصالہ حلال ہو اس میں کسی عارض کی وجہ سے کراہت آجائے تو وہ دوسرے کے لئے بلاکراہت صحیح ہوجائے گی، جیسا کہ تمام بیوع فاسدہ کا حکم ہے۔

۳- حوض یا نجی تالاب میں مچھلی کا تعین کئے بغیر اور شکار کئے بغیر بیچنا جائز نہ ہوگا، اگر اس حوض یا تالاب کو ایک مدت تک کے لئے کرایہ پر دے دے اور اس سے جو فوائد ہوسکتے ہوں، وہ خاص مچھلیوں کے ڈالنے کا ہو یا دوسرے میں استعمال کرے، ایسی صورت میں یہ امور جائز ہوجائیں گے۔

۴- جو مچھلی پالے بغیر خود آگئی ہیں، اگر وہ حوض یا تالاب ذاتی ہے تو ان مچھلیوں کا وہ شخص مالک متصور ہوگا اور اگر عمومی ہے تو اس ندی نالے میں سے اگر کچھ حصہ باندھ لگا کر الگ کرلیا گیا ہو اور اس کو شکار پکڑنے کے لئے روک لیا گیا ہو تو روکنے والا ان مچھلیوں کا مالک متصور ہوگا، لیکن فروخت کرنا پکڑنے کے بعد ہی جائز ہوگا۔

☆☆☆

---

[1] ریڈ تمی تاجپورہ، مظفر نگر۔

مناقشہ:

مچھلی کی خرید وفروخت

ڈاکٹر وہبہ مصطفی زحیلی:

اس مسئلہ میں فقہاء اور مجتہدین کی آراء میں فقہی اور اجتہادی اختلاف مندرجہ ذیل امور میں منحصر ہے:

۱- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام معاملات کو غرر کے زمرے میں شامل فرمایا جن میں مبیع کی سپردگی فوری طور سے انسان کی قدرت میں نہ ہو، مثلاً ہوا میں پرواز کرتے ہوئے پرندے، پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں اور بھاگے ہوئے غلام، اس سلسلہ میں دو روایتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، ایک روایت: ''نہی عن بیع الغرر'' ہے اور دوسری روایت میں ہے: ''نهى عن الغرر'' اور غرر ایسی چیز کی خرید وفروخت کا نام ہے جس کا وجود اور عدم دونوں محتمل ہو، یعنی اس کا مشتری کے سپرد نہ کیا جانا مشکوک ہو، جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ محتمل بیع، بیع غرر ہے، اور بیع غرر ممنوع ہے تو ہمیں اس نتیجہ تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں کہ مچھلی کی خرید وفروخت کا یہ معاملہ شرعاً ممنوع قرار پائے گا اور اس ممانعت کی چاہے جو بھی شکل ہو، فاسد کہیں اسے آپ یا باطل، جیسا کہ ہمارے بعض شرکاء نے باطل اور فاسد کے اختلاف کا تذکرہ کیا ہے، لیکن راجح بات یہی ہے کہ صرف غرر کسی معاملہ کے وجود پذیر ہونے میں مخل نہیں ہے، بلکہ شرائط انعقاد بیع کے بعض شرائط کے پائے جانے میں مخل ہے، مثلاً معدوم کی بیع، اسی طرح اس چیز کی بیع جس کی سپردگی پر مشتری قادر نہ ہو، اور یہی دراصل بیع کے باطل ہونے کا تقاضا کرتا ہے، بعض حنفیہ نے اس معاملہ کے فاسد ہونے کی بات کہی ہے، جبکہ اکثر حنفیہ کے بقول اس طرح کا ہر معاملہ ہی سرے سے باطل ہے جس میں غرر پایا جائے، اور یہی باطل ہونے کی بات دوسرے دبستان فقہ کے علماء نے کہی ہے، چنانچہ امام نووی کہتے ہیں:

''النهي عن الغرر أصل من أصول التشريع''۔

اب جبکہ ہم نے اس ترجیحی اصول وقواعد کی وضاحت آپ کے سامنے کردی تو اب ہمارے لئے زیادہ آسانی ہے کہ ''پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت'' کی تفصیلات آپ کے سامنے رکھوں، چنانچہ علماء حنفیہ اور دیگر علماء کے درمیان اس بارے میں اتفاق ہے کہ اگر مچھلی کسی بڑے نہر یا دریا میں ہو تو یہاں غرر کثیر اور غرر فاحش پایا جاتا ہے اور اس صورت میں اگر کوئی شخص بغیر شکار کئے ہوئے ان مچھلیوں کو فروخت کرتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خرید وفروخت بیع باطل کے قبیل سے ہے اور باطل ہے، اور اس کے بطلان کے لئے صرف احتمالات اور عرف ورواج یا عموم بلوی اور اباحت اصلیہ (اشیاء میں اباحت ہے) وغیرہ ہی کے اصول نہیں ہیں، بلکہ اس بیع کی ممانعت پر صریح نص موجود ہے، اور یہ مشاہدہ بھی ہے اور آپ دیکھتے ہوں گے کہ کبھی کبھی بہت سے ماہی گیر سمندر کے کنارے جال اور کانٹے لے کر گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں، اور خالی ہاتھ لوٹتے ہیں پانی میں رہتے ہوئے اور بغیر شکار کے مچھلیوں کی بیع میں اس سے بڑا اور کیا غرر ہوگا، اس لئے یہ عرف اور مشاہدہ تو عام ہے کہ اگر نہریں بڑی ہوں اور اس میں پانی زیادہ ہو یا سمندر ہو یا اس قسم کے دوسرے جھیل تو اس میں غرر کثیر پایا جاتا ہے۔

البتہ اگر مچھلیاں کسی حوض یا چھوٹے تالاب میں ہوں، یا جہاں پانی بہت کم ہو اور مچھلیوں کو پکڑنا آسان ہو اور صاحب حوض وتالاب کی مملوکہ ہوں، نیز اسے روکے رکھنے کا اہتمام کیا ہو جیسے کسی پرندے کا شکار کرنے کے لئے کوئی جال لگا دیا ہو اور اس میں آکر پرندے پھنس گئے ہوں تو یہ اس کے مملوکہ ہیں اور ان کو فروخت کرنا اس کے لئے حلال ہے، اسی طرح ان مچھلیوں کو فروخت کرنا بھی مملوک ہونے کی وجہ سے حلال ہے۔

رہ گیا مسئلہ تالاب یا حوض کے چھوٹے ہونے میں شکار پر قدرت کا تو اس میں بھی غرر ہے، مگر غرر قلیل اور یسیر ہے جو معاملات میں انگیز کیا جاتا ہے، کیونکہ اس صاحب تالاب اور شکار کرنے والے نے مچھلی کو روکنے کے لئے جو تدبیریں کیں ہیں اور اسے روکنے کا اہتمام کیا ہے اس سے وہ مچھلیاں مقید بھی ہوگئی ہیں، اور مملوک بھی ہوں اور ان کا شکار کرنا بھی اس طرح کے تالاب اور حوض میں کوئی مشکل نہیں ہے اور غرر بھی یسیر ہے، اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر غرر یسیر ہو تو اس کی خرید وفروخت درست اور مباح ہے۔

تیسرا مسئلہ اس میں سرکاری ندی نالوں اور عوامی تالابوں کی مچھلیاں پکڑنے کے ٹھیکہ کا ہے، اس میں بھی وہی حکم ہے کہ اگر حوض، تالاب اور جھیل چھوٹی ہو تو اس کا اجارہ اور ٹھیکہ درست ہے اور اگر بڑے تالاب، نہریں اور سمندر ہوں اور پانی زیادہ ہو جس میں مچھلیوں کو ایک حد میں روکے رکھنا ممکن نہ ہو تو اس طرح کا اجارہ فاسد ہوگا، اسی طرح حنفیہ سمندر اور ندی نالوں کے اجارہ اور ٹھیکہ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں چونکہ استہلاک عین لازم آتا ہے، اس لئے اس طرح کا ٹھیکہ درست نہیں، مجھے بھی کسی کا قول معلوم نہیں جس میں اس صورت کے جواز کی بات کہی گئی ہو، لیکن حنابلہ کے یہاں یہ بات ملتی ہے کہ اگر تالاب چھوٹا ہو یا حوض ہو تو اس کے اجارہ اور ٹھیکہ کا معاملہ درست ہے، اسی بنیاد پر میرا بھی رجحان ہے کہ اگر کسی تالاب و حوض وغیرہ کے اجارہ اور ٹھیکہ کے لئے مخصوص سالانہ رقم مقرر کردی جائے جس میں مچھلیاں رک جاتی ہیں تو مچھلیوں کے پکڑنے کا یہ ٹھیکہ جائز ہونا چاہئے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور نہ ہی اس میں عین کے استہلاک کا قصد کیا جارہا ہے، بلکہ اس میں بھی دیگر اجارے کے معاملہ کی طرح تالاب کے منافع سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے جو اس تالاب میں ہیں اور وہ عین نہیں ہے، بلکہ منفعت ہے، اس لئے فقہاء حنابلہ نے اس طرح کے ٹھیکہ کی اجازت دی ہے، البتہ اس کی خرید وفروخت کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ تفصیل کے مطابق رہے گا اور اسی پر عمل واجب ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا،

فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔

مفتی شیر علی گجراتی:

یہ مسئلہ جو ہے میں اپنی رائے جیسے بہت سے حضرات کا بھی سنا یہ تالاب ہیں ندیاں ہیں اور حوض ہیں جو محدود ہے تو میرے خیال میں یہ بجائے بیع کے اور جیسے کہ ٹھیکہ وغیرہ کا لفظ ہے یہ اجارہ ہے، اور اس میں بیع کا کوئی سوال نہیں ہے، حکومت بھی مالکین بھی زمین کسی کو ٹھیکہ پر دیدیتے ہیں ایک سال کے لئے دو سال کے لئے کچھ زمانے کے لئے متعین کردیتے ہیں، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ حکومت مدد کرتی ہے پہلے تیار کر کے دیدیتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود وہ آدمی وہ زمین کو حوض بنالیتا ہے اور مچھلیاں لاکر کے اس میں ڈالتا ہے اور پالتا ہے، تو یہ ان کی ملکیت ہے یا اجارہ پر لے رکھی ہے، اور یہ اجارہ منافع پر وارد ہوتا ہے عقد، یہاں منافع زمین ہیں یہ بھی ایک منفعت ہے کہ میں اس میں کھیتی کروں یا میں اس میں شکار کروں یا میں اس میں خود رہوں، چاہے میں کچھ کروں، میں نے ایک سال کے لئے یہ زمین کرایہ پر لے لیا۔ اب مجھے حق ہے کہ میں کسی کو یہاں آنے نہیں دوں گا، ان کو حق ہے کسی کو بھی پکڑنے سے منع کرنے کا۔ لہٰذا مدت معینہ میں جو وہاں مچھلی پالی جاتی ہے چاہے وہ بڑا حوض ہو یا اور وسیع جگہ ہو تو وہ چونکہ محدود ہے، انہوں نے وہ کرایہ پر لے رکھا ہے اور کرایہ منافع یہی ہے کہ میں اس میں مچھلیاں پالوں گا جیسے اور جانور پالتا ہے اور اس میں رکھنا وہ جائز ہے، اور اگر کسی نے اپنی مملوکہ زمین محدود کردیا اور اس میں خالص لکڑیاں اور گھاس بویا تو گھاس اور لکڑیاں سارے فقہاء صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ گھاس ان کی مملوک ہے وہ کسی کو آنے سے منع کرسکتا ہے، اسی طریقہ پر یہاں بھی حق ہے کہ دوسروں کو پکڑنے سے منع کردے، چاہے وہ زمین انہوں نے کرایہ پر لے رکھی ہو، چاہے وہ ان کی مملوکہ ہو۔

یہ میری اپنی رائے ہے کہ یہ کرایہ ہے مدت معینہ تک کے لئے جتنا چاہے وہ اپنی ملک میں مچھلیاں پالتا رہے اور دوسروں کو روک سکتا ہے بالکل ان کو حق ہے کہ میں نے یہ زمین کرایہ پر لے رکھی ہے میں نے پانی اس میں بھر رکھا ہے یا پانی کا انتظام کر رکھا ہے اور میں اس میں مچھلیاں پالتا ہوں میں اور کام کرتا ہوں، اس میں بھینس پالتا ہوں تو مچھلیاں کیوں نہیں پال سکتا ہوں، میں اس میں گھاس اور درخت لگا سکتا ہوں سارے فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ وہ گھاس ان کی مملوک ہوگئی اور وہ لکڑیاں اس کی مملوک ہیں تو مچھلیوں کا بھی میرے خیال میں یہ اجارہ ہے اس کو بیع کہنا میرے خیال میں ٹھیک نہیں ہے، اور چنانچہ ان کا عنوان یہی ہے کہ وہ ٹھیکہ پر لیتے ہیں اور اجارہ میں مدت معینہ تک اس میں مچھلیاں بھی پال سکتے ہیں، اس لئے یہ سوالات کہ یہ غرر ہے، یا یہ مجہول ہے یا غیر مقدور التسلیم ہے اس کا سوال ہی ختم ہوگیا وہ تو ٹھیکہ پر لے رکھا، کرایہ پر زمین لے رکھی ہے مچھلیاں پالنے کے لئے اس لئے یہ جائز ہے اب وہ چاہے بعد میں خود پکڑ کر کے بیچے پالکر کے، یہ تو بعد کی بات ہے یہ چند باتیں میں نے عرض کردی ہے۔

مولانا سعود عالم قاسمی:

یہ ندی نالے اور مچھلیوں سے متعلق جو مسئلہ زیر بحث ہے اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک نص قطعی موجود ہے اور وہ نص قطعی جو ہمارے مختلف

حضرات نے کوڈ بھی کیا ہے کہ پانی میں مچھلی کو نہ خرید و یہ بیع غرر ہے، نص قطعی کے موجود ہوتے ہوئے اس میں کسی اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، سچی بات یہ ہے کہ ندی نالے یا سمندر جہاں پر پانیوں کی آمد و رفت ایسی ہو جہاں کوئی حد بندی نہ کی جاسکتی ہو، وہاں مچھلی کو بیچنا فی الحقیقت ایک ایسی چیز کو بیچنا ہے کہ جس پر آدمی قبضہ نہیں دے سکتا اور جو مقدور التسلیم نہیں ہے اور جو ملکیت میں بھی نہیں ہے تو اس لئے وہ حضرات جن لوگوں نے عرف کو بنیاد بنا کر اس کو بھی جائز قرار دیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ نص کے مخالف ہے اور اس پر نظر ثانی ہمکو کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دوسرا مسئلہ کہ جو تالاب یا حوض یا اس طرح کے جو چھوٹے گڑھے بنا لیتے ہیں لوگ، ان میں مچھلیوں کی آمد و رفت ایسی نہیں ہوتی جس وقت آپ چاہیں مچھلیوں کا حجم ناپ سکتے ہیں، مچھلیوں کا سائز ناپ سکتے ہیں، مچھلیوں کی تعداد ناپ سکتے ہیں، یہاں تک کہ تالاب کے سائز کے جال اور دوسرے ایسے آلات موجود ہیں کہ جن سے ان کو آپ حاصل کر سکتے ہیں تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ اس میں غرر کا اندیشہ کم یا بالکل نہ کے برابر ہے، صرف لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ ندی نالے کی مچھلیاں آج بھی اسی طریقہ سے غرر ہے اس میں، جس طریقہ سے اس زمانے میں تھے،

دوسری بات یہ مجھے عرض کرنی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مچھلیوں کا جو عام رواج تھا یہ ہماری طرح مچھلی پالن کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ اس زمانے میں جو سمندر کی مچھلیاں تھیں وہ ہی ہوتی تھیں، ہمارے زمانے میں مچھلی پالنا جیسا کہ آپ نے بھی فرمایا اور دوسرے لوگوں کے یہاں بھی مقالات میں شامل ہے یہ کاشتکاری کی طرح مستقل ایک پیشہ ہے، ایک فن ہے، وہ سارے لوازمات موجود ہیں، اس لئے جس طرح ہم کاشتکاری پر جب غور کرتے ہیں اسی طرح ہم اس پر غور کرتے ہیں، اس میں غرر نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس کو جائز قرار دیتے ہیں، مجھے ایک بات جو پہلے کہنی تھی اب میں کہہ رہا ہوں وہ عرض مسئلہ پر مجھے مولانا شاہین جمالی صاحب سے یہ گزارش کرنی ہے کہ آپ کی ساری باتیں مجھے تسلیم ہیں اتفاق کرتا ہوں، لیکن جب عرض مسئلہ پیش کیا جائے تو جو علماء کی رائے ہے ان کو اسی طرح پیش کردیجئے جب مناقشہ ہو تو اس پر جو بھی تبصرے فرمائیں، اس سے ہو یہ ہوگا کہ وہ علماء جنہوں نے محنت کر کے اپنی رائے قائم کی ہے ان کی حوصلہ شکنی ہوگی اور پھر جلدی سے مسئلہ کا جواب دینے کی ہمت نہیں کریں گے تو ذرا سا اس میں ٹون بدل دیجیے تو اچھا ہوگا۔

مفتی نسیم احمد قاسمی:

تالاب اور نہر کے سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ اس کو زمین کے مخصوص حصہ کا اجارہ قرار دیا جائے بیع قرار نہ دیا جائے اور چونکہ مخصوص حصہ کا اجارہ ہوتا ہے جس میں منفعت جس کو آپ حق شکار سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہاں پر متعین ہے، اس لئے اس اجارہ کے جواز میں کسی طرح کا کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، ہم اگر استہلاک عین کی بنیاد پر اس اجارہ کے جواز کی بات کرتے تو وہاں پر یہ اشکال ہوسکتا تھا، اس سلسلے میں خود ہمارے یہاں فقہاء کی کتابوں میں بعض عبارتیں ایسی ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کے سلسلہ میں صراحت ہے کہ مچھلی پالنے کے لئے اجارہ پر لیا جاسکتا ہے ''مغنی'' میں یہ عبارت ہے:

''لو استاجر البركة أو الشبكة أو استعارهما للاصطياد جاز وماحصل فيه ماملكه''.

اس عبارت سے صراحتہً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مچھلی پالنے کے لئے بھی تالاب اور حوض کو اجارہ پر لیا جاسکتا ہے، یعنی اصالتاً حنفیہ مچھلی کی خاطر نہر یا تالاب کے اجارہ اور گھاس کے لئے چراگاہ کے اجارہ کو تو جائز قرار نہیں دیتے، البتہ اس کے لئے صرف زمین اجارہ پر لی جاسکتی ہے اور اجارہ پر لینے کے بعد جب زمین پر اسے حق انتفاع حاصل ہوگیا تو اب اس میں مچھلی کی کاشت کرے یا کسی طرح سے اس سے انتفاع حاصل کرے اسے یہ حق حاصل ہوگا۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

یہ جو مسئلہ چل رہا ہے مچھلیوں کی بیع کا یا ٹھیکہ پر دینے کا اور اس سلسلے میں جو روایت پیش کی جارہی ہے ایک تو بیع غرر سے منع کرنے کی روایت ہے، ایک عام روایت ہے اور اس کے ذیل میں گویا ''بیع السمک'' بھی آئی، تو ایک روایت وہ ہے جو خاص طریقہ سے بیع السمک فی الماء کے بارے میں ممانعت کے تعلق سے وارد ہوئی ہے۔ یہ روایت اکثر محدثین کے یہاں تو موقوفاً ہے ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں کہ: جو مچھلی پانی کے اندر ہے اسے نہ خریدو، اس لئے کہ وہ غرر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے یا غرر سے منع فرمایا ہے، تو اگر حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہوا کہ انہوں نے یہ بات فرمائی ہے تو پھر تو یہ قول صحابی ہوا اور انہوں نے گویا جو بات فرمائی ہے اس کی علت بھی واضح فرمادی کہ "لأنه غرر" تو پھر غرر کی احادیث کے بارے میں جو رویہ ہمارے محدثین اور فقہاء کا رہا ہے وہ یہاں پر پیدا ہوگا اور اس پر بحث ہوگی کہ غرر کس درجہ کا قابل معافی نہیں ہے اور کون سا غرر معفو عنہ ہے، لیکن یہی روایت حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی وارد ہے، بعض طرق میں، اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ کیا اس روایت کا وقف صحیح ہے یا رفع صحیح ہے، ایک تو رجحان یہ ہوتا ہے کہ اگر اس روایت کے راوی مرفوع روایت کے رواۃ اس درجہ کے ہیں کہ حسن بھی روایت قرار پاتی ہو، یا یہ کہ اس کی روایت کا رفع بھی ثابت ہوگا، وقف بھی ثابت ہوگا تو رفع پر محمول کیا جائے گا، بعض حضرات نے تو یہ رویہ اختیار کیا ہے، اور بعض حضرات کا طریقہ یہ ہے کہ انہوں نے دونوں روایتوں میں موازنہ کیا ہے، اور چونکہ جو روایت موقوف ہے وہ زیادہ قوی ہے اپنے راویوں کے اعتبار سے اور تعداد کے اعتبار سے، اس لئے اس کو راجح قرار دیا ہے، اصح قرار دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں اصل گویا موقوف ہونے کو اصح قرار دیا ہے اور مرفوع ہونے کو مرجوح قرار دیا ہے، مجھے کہنا یہ ہے یہاں پر کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً بیع السمک فی الماء سے منع فرمایا ہے تو یہ تو خاص اسی مسئلہ کے بارے میں حدیث وارد ہوئی اور جب کسی خاص مسئلہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے تو اس میں گویا اجتہاد کی اور تخصیص کی گنجائش ہے ہی نہیں، بیع السمک فی الماء کو اگر ہم مرفوع مانتے ہیں تو اس کا مطلب تو یہ ہونا چاہیے کہ جو مچھلی پانی کے اندر ہے چاہے وہ مقدور التسلیم ہو یا نہ ہو، حوض چھوٹا ہو کسی برتن میں پالی گئی ہے وہاں مچھلی رکھی ہوئی ہے تب بھی اس کی بیع جائز نہیں ہونی چاہیے، لیکن چونکہ علت کی صراحت حدیث میں موجود ہے کہ غرر کی بنیاد پر اس کی ممانعت ہے، تو غرر کی جس درجہ گنجائش ہے شریعت میں جس غرر کے باوجود عقود درست قرار دیتے جاتے ہیں اگر اس درجہ کا غرر ہے اس صورتِ حال میں جس پر ہم بحث کر رہے ہیں تب تو اس بیع کو درست ہونا چاہیے، اور جو غرر قابل معافی نہیں ہے جس کو شریعت نے منع کیا ہے اور اس کی گنجائش نہیں ہے، غرر کثیر ہے اس کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، تو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے اگر ہم اس مسئلہ پر غور کریں کہ یہ صورت حال بیع کی ہے کہ مچھلی کی بیع ہو رہی ہے، سمندر کی مچھلی ہو یا تالاب کی مچھلی ہو، تو ظاہر بات ہے کہ سمندر کی مچھلی میں اور تالاب کی مچھلی میں غرر تو ہے ہی، چاہے جتنے بھی آلات ترقی یافتہ ہو گئے ہوں۔

لیکن ابھی تک میں سمجھتا ہوں کہ سمندر کی مچھلی کی جو بیع ہوتی ہے، خاص علاقے تک یا دریا کی مچھلی اگر بڑا دریا ہے تو اس میں غرر کی وہ شکل تو پائی جاتی ہے جس کو ہم غرر کثیر کہیں، اس لئے وہ تو ممنوع ہوگا، لیکن دوسرا پہلو جو غور کرنے کا ہے وہ یہ کہ یہ مسئلہ اصل میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مچھلی کی بیع کا نہیں بلکہ مسئلہ حق اصطیاد کا ہے، خاص طور سے ندی نالے میں جو صورت حال ہو رہی ہے۔ ایک تو تالاب کی بات ہوئی۔ تالاب میں تو عام طریقہ سے گویا مچھلی کی ہی بیع ہوتی ہے اس میں بھی شکلیں مختلف پیدا ہوں گی۔

لیکن ندیوں میں بڑی ندیوں میں اور سمندر میں جو معاملات ہو رہے ہیں حکومت کی طرف سے اس میں ایسا معلوم ہوتا ہے جو صورت حال چل رہی ہے کہ یہاں مچھلی کی بیع نہیں ہو رہی ہے بلکہ حق اصطیاد کی بیع ہو رہی ہے، شکار کے حق کی بیع ہو رہی ہے اور صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک سال کے لئے آپ نے ٹھیکہ پر لیا ہے ایک خاص حصہ ہے ندی کا یا سمندر کا اس میں اگر آپ نے سال بھر مچھلی کچھ بھی نہ نکالی، ایک کلو مچھلی بھی آپ نہیں نکال سکے آپ گئے ہی نہیں شکار کرنے کے لئے تب بھی آپ کو وہ جو ٹھیکہ پر طے ہوا معاوضہ وہ ادا کرنا ہوتا ہے اور یہ صورت حال وہی ہے جیسے ندیوں میں جو ریت ہوتا ہے، یا ندیوں جیسی جو اور چیزیں نکلتی ہیں ان کا بھی ٹھیکہ ہوتا ہے، یہاں سے وہاں تک ریت نکالنے کا ٹھیکہ فلاں کو دیا جا رہا ہے اور فلاں جگہ تک نکالنے کا ٹھیکہ فلاں کو دیا جا رہا ہے، یہاں پر گویا حق کا ہی معاملہ ہو رہا ہے تو گویا ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ یہ جو حق کی بیع ہو رہی ہے حق اصطیاد کی یا اور اس کو آگے کر لیجیے اور مسائل میں بھی، تو یہ حق کی کونسی قسم ہوتی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو مچھلی یا چھوٹے تالابوں کی مچھلی کا مسئلہ ہے تو شاید ہم کسی حد تک اس میں اتفاق رائے کر سکیں، لیکن جو دوسرا مسئلہ ہے بہت ہی وسیع الاطراف، اس میں در اصل حق کی بیع ہو رہی ہے اور آج کل اس بیع کی ہزاروں شکلیں پائی جا رہی ہیں، اجارہ ہے یا حق کی بیع ہے اور یہ حق کونسی قسم کا حق ہے، قابل بیع ہے یا قابل بیع نہیں ہے؟ ان سارے پہلوؤں پر غور کرنا ہمارے لئے ضروری ہے، تب ہی ہم کوئی آخری بات اس میں کہہ سکتے ہیں۔

یس احمد ندوی:

رت ابن مسعودؓ کی موقوف حدیث معنوی طور پر مرفوع ہے، کسی بھی صحابی سے اس کے خلاف کوئی قول نہیں منقول ہے، دوسری بات یہ ہے کہ
بھی وہ حسن کے درجہ کی حدیث ہے، اس لئے موقوف ومرفوع اور اجماع صحابہ سے یہ مسئلہ منصوص طور پر ثابت ہے اور یہ نص قاطع نص مطلق
کسی سرکار، حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تالاب، سمندر یا کسی جگہ کی مچھلی فروخت کرے، نہ غیر سرکار کو حاصل ہے، نہ شخصی ملکیت کہ حوض والی
لاب والی مچھلی نہ غیر شخصی ملکیت کہ جب مطلقاً ممانعت ہے پانی کی مچھلی کی فروخت سے تو یہ ممانعت مطلق رہے گی۔ وہ مسئلہ دوسرا ہے کہ حق شکار
یدوفروخت ہوسکتی ہے یا نہیں ہوسکتی ہے، یہ تو دوسرا مسئلہ ہے، لیکن مچھلی پانی کے اندر بیچی جاسکے، اس کے لئے تو یہ نص قاطع اور اجماع سے بھی
ہے، اس لئے اس میں کسی قسم کے اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے غرر ہے یا نہیں ہے اور کم ہے غرر یا زیادہ ہے، اور کیا ہے، نہ حکومت کو یہ ملکیت
ہے کہ مچھلی بیچ دے اور نہ کسی شخص اور فرد کو یہ ملکیت حاصل ہے کہ بیچ دے، یہ دوسری بات ہے کہ شکار کر لینے کے بعد اس کو ہر شخص بیچ سکتا ہے،
خرید سکتا ہے یہ مسئلہ الگ ہے، یہی بات میرے خیال سے مولانا مجاہد الاسلام صاحب کی بات سے مترشح ہورہی ہے، میں جہاں تک سمجھا ہوں
ملہ یہی ہے کہ جب نص قاطع موجود ہے تو ہم کو کسی قسم کے اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے کسی فرد بشر کو، حکومت ہو، کوئی امام ہو کسی قسم کا کوئی مولوی
ق کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے، ویسے اپنی اپنی رائے زنی جو بھی کرے اس طرح سے بولنے کا اختیار تو سب کو ہے، لیکن شرعی طور پر کسی کو بولنے کا
یں ہے۔

اختر امام عادل:

نی صاحب نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ معقود علیہ کیا ہے اس میں؟ اجارۂ مچھلی ہے یا اجارہ حق شکار ہے تو اگر فقہاء کی اس عبارت کو اپنے سامنے
وکئی کتابوں میں آئی ہے اس سے روشنی ملتی ہے اس پر کہ اگر کوئی آدمی نہر کو اجارہ پر لیتا ہے یہ کہہ کر کہ اس سے میں مچھلی کا شکار کروں گا، اگر یہ کہہ
رہ پر لیتا ہے کہ میں مچھلی کا شکار کروں گا تو اس میں اجارہ معقود علیہ مچھلی کو قرار دیا ہے، جیسا کہ عبارت سے سمجھ میں آتا ہے:

استاجر حوضًا او بركة يسقى منه ماء لايجوز، لأن هذا استيجار الماء وكذا لو استاجر نهراً ليصيد منه
ك، لأن هذا استيجار السمك''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی آدمی نہر کا اجارہ لے یہ کہہ کر: ''لیصید منہ السمک'' کہ مچھلی کا شکار کریگا تو اس میں معقود علیہ مچھلی بنتی ہے اور یہ
ں ہوگا، یہ (بدائع الصنائع جلد ۶، صفحہ نمبر ۱۸۹، شامی جلد ۵، ۴۶، اور طحطاوی علی الادر المختار جلد، ۳، ۶۷) تین کتابوں سے یہ ماخوذ ہے۔

نعمت اللہ (جامعہ رحمانی مونگیر):

ں کو عام رہنے دیا جائے اسی طرح پانی کے سلسلہ میں جو بڑے تالاب اور بڑی بڑی ندیاں ہیں نہریں ہیں اس سلسلہ میں بھی اپنی رائے یہی
ود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں مباح ہیں پانی اور گھاس اور آگ ان کی اباحت عامہ کا بھی تقاضا یہ ہے کہ بڑے تلاب
ے بڑے نہر اور ندیاں جو ہیں وہ مباح الاصل ہوں اور اس پانی کا اجارہ یا اس زمین کا اجارہ یا اس میں موجود مچھلیوں کا اجارہ یا اصطیاد وغیرہ کسے
ں جو کچھ بھی معاملات طے کرتے ہیں باہم فریقین، وہ بالکل کالعدم ہونا چاہئے وہ حکومت ہو یا ٹھیکہ دار ہو اب جس شخص نے بھی مچھلیاں شکار
اس کی ملکیت ہوگئیں، اب بازار میں وہ مچھلیاں آتی ہیں تو بازار میں خریدنے والے لوگوں کے لئے ان کا خریدنا اور ان کا اپنے استعمال میں لانا
ئز ہے۔

سری شکل یہ ہے کہ آبادیوں میں جو تالاب اور حوض ہیں اور وہ کسی شخص کی ملکیت نہیں ہے جس کو سرکاری تالاب سے ہم لوگ تعبیر کرتے ہیں اس
ں ہم نے یہ پڑھا ہے کتب فقہ میں کہ آبادی کے آس پاس جو زمینیں اس آبادی میں بسنے والے جتنے لوگ ہیں ان کے مفاد کے لئے وہ زمینیں
ں اور اس میں اس طرح عمل اور دخل کہ وہ کسی شخص کے لئے مخصوص کردے یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس تالاب کو جو آبادی کے اندر

ہے یا اس حوض کو جو آبادی کے اندر ہے حکومت سے اگر ٹھیکہ کا معاملہ کر لیتا ہے تو اس کا ٹھیکہ کا معاملہ کرنا صحیح نہیں ہوگا، وہ مباح الاصل ہے جس شخص نے اس تالاب سے مچھلی شکار کر لیا اس کی ملکیت ثابت ہوگئی، اور اس نے بازار میں اگر فروخت کر دیا تو خریدنے والے کے لئے اس کا خریدنا اس کا استعمال میں لانا بالکل جائز ہے۔

تیسرا مسئلہ نجی تالاب کا ہے، اس سلسلہ میں اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ مچھلیاں ڈالی گئیں تو مچھلیاں مملوک ہیں، اب اگر تالاب کے اندر مچھلیوں کو فروخت کیا تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کی بیع فاسد ہوگی، لیکن خریدنے والے نے جب خرید لیا اور اس پر قبضہ کر لیا اور پھر بازار میں لے جا کر اسے فروخت کیا تو اس کا فروخت کرنا اور بازار میں خریداروں کا خریدنا یہ سب صحیح اور اس کا استعمال کرنا بھی صحیح، لیکن خریدار اول کے لئے جواب مچھلی کے فروخت کرنے کے بعد رقم آ رہی ہے اس رقم کا استعمال کرنا اس کے لئے جائز ہوگا یا نہیں ہوگا؟ ایک علیحدہ مسئلہ ہے، لیکن مارکیٹ سے جو خریدنے والے لوگ ہیں ان کے لئے ان مچھلیوں کا استعمال کرنا جائز ہوگا، لیکن از خود مچھلیاں اس نجی تالاب کے اندر اور حوض کے اندر آ گئی ہیں یا سیلاب اور بارش کی وجہ سے اس میں مچھلیاں پیدا ہوگئی ہیں تو اس سلسلہ میں اباحت اصلیہ کو اور احراز وقبضہ اور ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ متعین کرنا ہوگا کہ کس شکل کے اندر صرف ملکیت ثابت ہوئی اور کس شکل کے اندر ملکیت اور قبضہ دونوں کا تحقق ہو چکا ہے، اسی لحاظ سے بیع کے فساد اور بطلان کا حکم لگایا جائے گا، لیکن بیع کے بطلان کی شکل میں تو پھر جو رقم حاصل ہوگی تالاب کے مالک کو اس رقم کا استعمال کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا، لیکن جن خریداروں نے بازار میں خریدا ہے مچھلیوں کو ان کے لئے اس کا استعمال کرنا جائز ہوگا۔

مولانا جمیل احمد (دار العلوم وقف):

حکومت کی مملوکہ چیزیں ہونے کے بعد ان کو اگر اجارہ پر دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، یہاں معقود علیہ نہ مچھلی ہے، نہ معقود علیہ حق اصطیاد ہے، بلکہ معقود علیہ منفعت اصطیاد ہے اور اس سلسلہ میں شامی کی عبارتیں بھی شاہد ہیں حضرت امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت نقل کی گئی ابو الزناد نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو لکھا ہے: ''كتبت إلى عمر رضي الله عنه في بحيرة يجتمع فيها السمك أنوجرها؟ فكتب إلى أن افعل وهو غير بعيد عن القواعد''۔ ابو الزناد یہ لکھتے ہیں کہ مچھلیاں جو بحیرہ کے اندر جمع ہو جاتی ہیں تو کیا ہم ان کو کرایہ پر دے سکتے ہیں تو عمر بن الخطاب نے جواب کے اندر کہا کہ یہ کام کرو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور علامہ شامی بعد میں لکھتے ہیں: ''وهو غير بعيد عن القواعد'' یعنی یہ قواعد کے کوئی خلاف بھی نہیں ہے۔

''ومرجعه إلى إجارة موضع مخصوص لمنفعة معلومة هي الاصطياد''۔

یعنی اصل بات یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص حصہ کا اجارہ ہے، منفعت معلومہ کے لئے اجارہ ہے، وہ منفعت معلومہ اصطیاد ہے، تو اس کے لئے حق اصطیاد کا لفظ استعمال ہی نہ کیا جائے وہ منفعت اصطیاد ہے، مثلاً ایک آدمی نے زمین کرایہ پر لی کھیل کا نفع اٹھانے کے لئے، ایک آدمی نے زمین کرایہ پر لی جلسہ کرنے کے لئے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں یہ درست اور جائز ہے، لیکن اسی وقت ہے جب کہ ندی نالوں کو حکومت کی مملوکہ چیز مان لیا جائے۔ آگے ایک ''بحر الرائق'' میں عبارت نقل کی گئی، امام ابو یوسفؒ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ حماد سے روایت کرتے ہیں وہ عبد الحمید بن عبد الرحمن سے انہوں نے عمر بن عبد العزیز کو لکھا اور سوال کیا عن بیع صید الآجام۔۔۔۔۔۔'' کی بیع یہاں صید کی بیع سے مراد وہ بیع نہیں اجارہ ہی ہے، اس لئے کہ اجارہ کے لئے بھی بیع کا لفظ بول دیا جاتا ہے، فقہا کے یہاں اس روایت میں ہے: ''فكتب إليه عمر أنه لا بأس'' اس میں کوئی حرج نہیں، مچھلیوں کا شکار کرنے کے لئے تالاب کو کرایہ پر دے دیا جائے اور عرفاً جو ٹھیکہ کا لفظ استعمال کیا ہے یہ بھی اجارہ ہی کے لئے ہے، یہ بیع کے لئے نہیں ہے۔

رہا وہ تالاب کہ جن کے اندر مچھلیاں چھوڑی گئیں اور بچہ اس میں ڈالا گیا تو اس کے بارے میں ایک درخواست کروں گا کہ فقہاء نے اس میں ایک فرق بیان کیا ہے، ایک تو ہے عین کا مجہول ہونا، عین اگر مجہول ہوتا ہے کہ یہ چیز موجود ہے یا نہیں تو واقعتاً یہ بیع باطل ہے، یہ بیع درست نہیں، جائز نہیں، فاسد ہے، ایک ہے مقدار کا مجہول ہونا، مقدار کے مجہول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ چیز تو موجود ہے یقینی طور پر موجود ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کی مقدار کیا ہے؟ تو فقہاء یہ لکھتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی عین معلوم ہو اور مقدار مجہول ہو، شاید اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے تو اس کی بیع کے اندر کوئی

مضائقہ نہیں، جیسے ایک آدمی غلہ کا ڈھیر فروخت کرتا ہے، تو جن تالابوں کے اندر مچھلیاں چھوڑی جاتی ہیں تو بالعموم ہم نے دیکھا کہ وہ مچھلیاں نظر آتی ہیں ساری نظر نہیں آتیں لیکن ان کا ایک مخصوص حصہ نظر آتا ہے تو اگر یہ کہہ کر ان کو بیچا جائے کہ اس تالاب کے اندر یہ مچھلیاں اتنے پیسوں میں ہم نے فروخت کی اور وہ تالاب مملوکہ ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، یہ مچھلیاں مملوک بھی ہیں مقدور التسلیم بھی ہیں، اور ان میں مقدار کی جہالت اشارے کی وجہ سے بالکل ختم ہوگئی یہ جہالت اثر انداز نہیں ہوگی بیع کے فساد میں، تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ندی نالے کی شکل میں اجارہ کی صورت اور تالابوں کی شکل کے اندر بغیر شکار کئے ہوئے مچھلی کے بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ:

اس سلسلہ میں ایک درخواست چھوٹی سی یہ ہے کہ مولانا نے شامی کی طرف جو بات منسوب کی ہے تو وہ شاید اوپر سے پڑھا جائے تو یہ خیر الدین رملی کا قول ہے، شامی کی رائے یہ نہیں ہے۔ دوسری بات حضرت عمر فاروق کی طرف اس قول کا انتساب ایک ایسی غلطی پر مبنی ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ہوتی چلی آئی، یہ دراصل حضرت عمر بن عبد العزیز کا مسئلہ ہے یہ ابوالزناد کی لقاء یا ابوالزناد نے حضرت عمر کا دور نہیں پایا ہے، ان کا وصال ۱۳۰ھ میں ہوا ہے اور پیدائش ان کی ۱۶۰ھ یا ۱۶۶ھ میں ہوئی ہے، اس لئے کوئی سوال نہیں ہے کہ انہوں نے لکھا ہو حضرت عمر فاروقؓ کو، ہاں عمر بن عبد العزیز کی بات ہو سکتی ہے اور جس کتاب کا حوالہ دیا ہے کتاب الفرائض امام ابو یوسف کا اس کتاب کو اگر آپ نکال کر دیکھیں تو اس میں پائیں گے آپ کہ یہ قول عمر بن عبد العزیز کا ہے اور نسخہ تیموریہ میں یہ غلطی ہے جس غلطی کو بار بار دہرایا جاتا رہا ہے تو اتنی سی وضاحت کے بعد میں آگے بڑھتا ہوں۔

مولانا محمد آل مصطفی مصباحی:

جب ندی نالے خشک ہوجاتے ہیں تب بھی اسے ٹھیکہ پر دیا جاتا ہے، مثلاً امسال بارش نہیں ہوئی اور وقت آگیا ٹھیکہ پر دینے کا جب ہی ٹھیکہ پر دیا جاتا ہے، تین سال کے لئے یا دو سال کے لئے ایسا ہوتا ہے، اس لئے اسے حق اصطیاد کا ٹھیکہ نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لئے یہ متعین ہے کہ یہ اجارہ مچھلیوں کا ہوتا ہے جو استہلاک عین پر اجارہ ہونے کی وجہ سے فاسد ہے، دوسری بات اس میں یہ ہے کہ فقہاء کرام نے جو اس مسئلہ کو اٹھایا ہے اس میں حق اصطیاد کا لفظ کہیں نہیں ہے، بلکہ صاحب در مختار ہوں یا علامہ شامی وغیرہ ہوں سب نے تالاب کے اجارے کی بات کہی ہے، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے سے لے کر اب تک جو اس سلسلے میں معاملات اور عمل چلا آرہا ہے وہ حق اصطیاد کا اجارہ نہیں ہے کہ وہ بحث یہاں اٹھائی جائے اور حق مؤکد کہہ کر اس کے جواز کی راہ فراہم کی جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ حق اصطیاد حق مؤکد ہے، اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن ندی اور نالوں میں جو الفاظ اجارہ کے وقت استعمال کئے جاتے ہیں وہ لفظ ٹھیکہ استعمال کیا جاتا ہے عربی میں ہو۔ چاہے اردو زبان میں ہو اور ٹھیکہ کا لفظ میرے خیال میں یہ اجارہ کے مرادف ہے، اس لئے بیع کا یہاں پہلو نہیں ہوتا، بلکہ اجارہ کا ہی پہلو ہوتا ہے، اور اجارہ کا پہلو حق اصطیاد میں نہیں، بلکہ صرف ندی اور نالوں میں ہے۔

مفتی شبیر احمد صاحب میرٹھی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، تالاب اور نہر کے متعلق جو بحث چل رہی ہے اس میں کچھ باتیں ایسی بھی آئی ہیں جو قابل غور ہیں، ایک بات ابھی جو قاضی صاحب بھی فرمارہے تھے صاحب بحر اور شامی نے بھی نقل کیا ہے۔ صاحب بحر نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے خط کا جواب جو نقل کیا ہے اس کے بعد آخر میں انہوں نے کہا ہے کہ ثم رأیت فی۔ کہہ کر کے عبارت انہوں نے نقل کی اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے خط کا جواب جو تھا اس پر رد کر دیا ہے، اور یہ جو بار بار کہا جارہا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر جو ہے، اس کے بارے میں کہ یہ نص قطعی ہے یا نص قاطع ہے یہ بار بار کہا جارہا ہے، قابل غور بات یہ ہے کہ یہ نہ تو نص قاطع ہے نہ ایسی روایت جس کی تاویل نہ کی جاتی ہو یا نہ کی جاسکتی ہو، بہر حال یہ صحابی کا اثر ہے قابل تاویل ہے، ظنی الدلالۃ ہے، اس میں تاویل کی بھی گنجائش ہے اور ثبوت بھی ظنی ہے قطعی نہیں ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ اس نص کے مخالف ہونے کی وجہ سے جو یہ اجارہ یا عقد ناجائز ہونا چاہئے ٹھیک ہے، لیکن حضرات فقہاء نے اس پر بحث کر کے باقاعدہ شرعی طور پر عموم بلویٰ اور لوگوں کے تعامل کی وجہ سے

اجازت دی ہے، ایک آدھ عبارت میں آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں: رافعی نے ایک عبارت نقل کی ہے، بہت واضح عبارت ہے:
''فلا يصح إجارة لصيد السمك ورفع القصب وقطع الحطب أو لقى أرضه أو غنمه وكذا إجارة المرعى والحيلة أن يستاجر موضعاً معلوماً''

یہ عبارت میرے خیال میں زیادہ مسئلہ کے حل کے لئے مددگار ہوگی۔ ''ہندیہ'' نے ایک عبارت نقل کیا ہے: ''فلا یجوز إجارة ماء فی نهر وإن استاجر النهر أو القناة مع الماء لم يجز أيضاً، لأن فيه استهلاك العين أصلاً والفتوى على الجواز لعموم البلوى'' اسی طرح کی عبارت صاحب نے بھی نقل کیا ہے اس قسم کی عبارات کے ذریعہ سے مسئلہ کا حل ہوسکتا ہے، ساتھ ساتھ یہ بھی مسئلہ ہے کہ نہر اور بڑے تالاب سے متعلق جو ہے، جیسے قاضی صاحب نے فرمایا ہے یہ مسئلہ تو واضح ہو چکا ہے کہ اس کو شکار کرنے کا حق جو ہے اس پر بیع ہوتی ہے۔ بیع اسی پر ہوتی ہے مچھلی ہوتی اور حق بیع سے متعلق ہمارا سیمینار بھی ہو چکا ہے اور بحث ہو چکی ہے۔

مولانا محمد مصطفی مفتاحی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مچھلیوں کی بیع کے تعلق سے گفتگو ہو رہی ہے، اس سلسلے میں مقالہ نگار حضرات کے آراء کی جو تلخیص آئی ہے اس نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے بیع کی کسی شکل کو ناجائز لکھا ہے، بیع کی ایک قسم باطل ہے اور دوسری قسم فاسد ہے ناجائز کا لفظ عام ہے فاسد دونوں کو شامل ہے، اس لئے وضاحت ہونی چاہیے اور صاف آنا چاہیے کہ ناجائز سے مراد کیا ہے باطل ہے یا فاسد ہے، دوسری بات کرنے کی ہے کہ ''فیض الباری'' میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بیوع فاسدہ کے تعلق سے یہ بات لکھی ہے کہ بیوع فاسدہ کے جواز و تعلق عوام کے باہمی معاملات سے نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ اگر اپنے طور پر جو کچھ کرتے ہیں جائز ہے، اس کا تعلق صرف عدالت اور قضا مچھلیوں کی بیع پر جب ہم گفتگو کر رہے ہیں تو ہم چاہیں گے کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کی اس عبارت کو بھی اور وضاحت کو رکھیں تو نتیجہ تک پہنچنے میں ہمیں سہولت ہوگی۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحبؒ:

ابھی قاضی صاحب نے فرمایا تھا کہ اس میں صورت مسئلہ کیا ہے، یعنی معقود علیہ اس میں حق اصطیاد ہے یا سمک ہے میں نے اس سلسلہ تھا کہ حق اصطیاد اگر ہے تو کیا بیع موقت صحیح ہوگی؟ اگر اسے بیع قرار دیتے ہیں تو کیا بیع موقت مطلقاً آپ فقہ میں پڑھتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں میں اجارہ اگر قرار دیں حق کا اجارہ تو وہ تو بات ہوسکتی ہے، لیکن اسے بیع قرار دیں تو ذرا یہ قابل غور ہے، یہ سوال میرے ذہن میں تھا میں نے ندی یا تالاب کے اجارہ یا ٹھیکہ کے سلسلہ میں اگر معقود علیہ کو حق اصطیاد ٹھہرایا جائے تو اس میں کچھ تفصیل یہ ہے کہ حق اصطیاد خصو عمومی اگر حق اصطیاد خصوصی ہے، مثلاً کسی کے ذاتی تالاب میں اس کی مملوک مچھلیاں ہیں تو یہ حق اصطیاد خصوصی ہے اور حق خصوصی کا اجارہ ٹھیکہ دینے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی ہے اور دوسرا حق اصطیاد عمومی ہے تو اس میں تفصیل ہے حق اصطیاد کسی شخص کے ذاتی زمین میں ہو ذاتی تالاب میں ہوگا۔ اور دوسرے یہ ہے کہ وہ حق اصطیاد کسی شخص کے ذاتی تالاب ذاتی زمین میں نہ ہو جیسے سمندر بڑے بڑے تالاب وغیرہ اگر وہ کسی شخص کے ذاتی تالاب میں ہے تو اس میں اس کو حق اصطیاد کی بناء پر اجارہ پر دینا جائز نہیں، کیونکہ اس میں تمام مسلمان عمومی ہیں، البتہ زمین کا حیلہ اختیار کرنا اس میں لابدی وضروری ہوگا زمین کو اجارے پر دے، اور حق اصطیاد عمومی جو ہے مثلاً بڑے تالاب نالے وغیرہ تو اس میں اس کے اجارہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اجارہ پر دینے میں عوامی فائدہ اس سے زیادہ ہو جو باقی رکھنے میں ہے تو اس کا جائز ہے اور یہ خاص ہے امام کے لئے کہ امام ایسا کرسکتا ہے یا جس کو وہ اپنا وکیل بنادے کہ تم کو ایسا کرنے کی اجازت ہے وہ کرسکتا ہے اور اگر عوام کا فائدہ کم ہے اور اس کو مباح رکھنے میں زیادہ ہے اور تخصیص کرنے میں کم ہے فائدہ تو اس صورت میں کسی کو حق اجارہ کی تخصیص کرنا جائز

محی الدین صاحب:

حق اصطیاد کے بارے میں یہ عرض ہے کہ ایک جو مملوک تالاب یا چھوٹے تالاب یا محدود ہیں ان کے بارے میں تو مچھلی کی بیع ہی شمار ہو، لیکن جو بڑی ندیاں، دریا اور سمندر میں اس میں جو سرکار ٹھیکہ دیتی ہے تو اس بارے کے اندر حق اصطیاد کے متعلق ہم سوچ سکتے ہیں اور اس پر مبنی ہو سکتا ہے، مسئلہ اب اس میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ جو حکومتیں جس طرح ان کا حق زمینوں پر ہے اور زمینوں میں وہ حق مرور کا اختیار رکھتی ہیں تو اسی طرح سمندر میں حق مرور کا اختیار حکومتوں کو ہے، جیسا کہ اس زمانے میں حق مرور خاص طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس لحاظ سے اگر ان حکومتوں کو حق اصطیاد مل رہا ہے اور وہ اس لحاظ سے ٹھیکہ پر دے رہی ہوں تو یہ ٹھیکہ جائز ہو سکتا ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ:

مسئلہ کی مزید تنقیح کرلی جائے اور جو کمیٹی بیٹھے وہ ان سوالات اور ان تنقیحات کا جواب طے کرے ان مباحث کی روشنی میں جو ہمارے علماء اور فقہا نے آج صبح سے اب تک یہاں کی ہیں، صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کا ذاتی تالاب ہے اور اس میں وہ مچھلی پالتا ہے، مچھلی پالتا نہیں مگر اس میں مچھلیاں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ اس کا شکار خود کرتا ہے یا کسی اور سے کراتا ہے اپنے لئے یا اس کو ایک مدت معینہ کے لئے اجارہ پر دے دیتا ہے، ٹھیکہ دیدیتا ہے کہ اتنی مدت تک اس مچھلی کا جو اس پانی میں ہے شکار کرنے اور اس سے مچھلی نکالنے کا فلاں شخص کو حق حاصل ہوگا، دوسری صورت وہ جائداد، تالاب کسی شخص کی ذاتی ملک نہیں ہے، بلکہ غیر مزروعہ عام ملک سرکاری ہے، اور سرکاری معروف قواعد کے مطابق گرام سماج کی یا پنچایت کے مصرف کی چیز سمجھی جاتی ہے، گرام سماج یا گرام پنچایتیں اس کو بندبستی پر دیتی ہے اور اس سے آنے والی آمدنی کو سرکار کے مصرحہ قانون کے مطابق اس گرام اور بستی کے مفاد عامہ کے مصارف پر صرف کیا جاتا ہے۔ تیسری صورت عام ندی نالے ہیں جن میں مچھلیاں آتی اور جاتی رہتی ہیں، عام ندیاں اور عام نالے، نہریں، چاہے وہ سرکار کی تیار کی ہوئی نہریں ہوں یا وہ قدرتی طور پر بہنے والی ندیاں ہر دو صورتوں میں سرکار کی ملک تصور کی جاتی ہیں، جب تک سرکار کسی شخص کو کسی خاص حصے کو کسی خاص مدت کے لئے کسی خاص شخص کو کسی خاص رقبے کو کسی خاص مدت کے لئے اجرت لے کر مخصوص نہیں کر دیتی تب تک اس میں جو چاہے شکار کرتا ہے، مچھلیاں نکالتا ہے، لیکن جب سرکار اس کو کسی شخص کے نام خاص اور محدود رقبے کی حد تک اور خاص اور مخصوص مدت کی حد تک اجرت لے کر کسی شخص کو دیدیتا تو پھر دوسرے لوگوں کے لئے اس میں شکار کا حق نہیں ہوتا ہے، چوری چھپے کر لے الگ بات ہے، لیکن پھر یہ عرف ہے کہ کبھی بنسی سے شکار کو اعتراض نہیں کیا جاتا، لیکن اگر جال ڈال کر شکار کرے گا تو اسکو روکا جاتا ہے ان ساری صورتوں میں سوال یہ ہے لیکن باقی صورتوں میں سوال یہ ہے کہ یہ بیع ہے یا اجارہ؟۔ پہلا سوال۔

پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ بیع ہو یا اجارہ بہر صورت معقود علیہ سمک ہے یا معقود علیہ حق اصطیاد ہے، پھر تیسرا سوال اگر معقود علیہ حق اصطیاد ہے تو حق مؤکد ہے یا یہ حق مجرد ہے، اس کے بعد اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام غیر شخصی جائدادیں، تمام وہ جائداد جو کسی مملکت میں چاہے جائداد بری ہو یا بحری ہو جو کسی شخص خاص کی ذاتی ملک نہیں ہے وہ ساری کی ساری جائداد حکومت کی ملک مانے جائیں یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں، کہیں کہ عوام کی اجتماعی ملک تصور کی جائیں گی یا نہیں؟ اور عوام کی اجتماعی ملک میں کوئی فرد بحیثیت فرد مالک نہیں ہو سکتا، لیکن جو ان افراد کے مجموعہ کا نام دولۃ ہے، مملکت ہے وہ ان افراد کی اجتماعی ملک کی نمائندگی کرتی ہے یا نہیں۔

اگر نہیں کرتی ہے تو عوام میں سے مختلف افراد کا زیادہ سے زیادہ ان املاک سے استفادہ کی کوشش کرنا اور اس کی وجہ سے مفادات کا ٹکراؤ پیدا ہو اور اس کی وجہ سے تنازع اور خصومت کے پیدا ہونے کا کیا حل ہوگا؟ اور اگر اس کو ہم محسوس کرتے ہیں کہ عوام کے اجتماعی مفادات جس میں حق ہر فرد کا ہے، مگر ملک جماعت کی ہے حق استفادہ اور انتفاع ہر فرد کا ہے اور ملک اجتماعی ہے ایسی صورت میں ایسے اصولوں کا انضباط حکومت کی طرف سے ہو جس کے تحت تنازع نہ پیدا ہو، پھر حکومت کے کسی تصرف کو دولۃ اور امام کے کسی تصرف کو اس کسوٹی پر جانچنا کہ ”تصرف الامام منوط بالمصلحة“ جو قواعد میں ایک بنیادی حیثیت ہماری دستوری فقہ میں رکھتا ہے کہ امام اور حکومت کے کسی بھی تصرف کو ہم اس صورت میں چیلنج کر سکتے ہیں کہ اس تصرف مفاد عامہ میں کس حد تک ہے اور پھر یہ مسئلہ قضاء میں جاتا ہے کہ قاضی یہ طے کرے کہ امام کا کونسا تصرف اگر اس کے سامنے کوئی درخواست آئی

ہے مفاد عامہ کی جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے اس کے مطابق ہے اور کونسا تصرف مصلحت عوام کے خلاف ہے وہ اس کو باطل کرسکتا ہے اور مصلحت عام کے مطابق ہے تو وہ نافذ کرسکتا ہے یہ ایک دستوری قانون کا حصہ ہے، جو یہ سوال بار بار ہم لوگوں کے ذہن میں آرہا ہے کہ حکومت کا کیا استحقاق ہے نہیں ہے؟ یہ حصے جو ضمنی طور پر اس سوال میں پیدا ہوئے ہیں۔

آگے چلئے؟ کیا اس بات کا تعین وہ تمام محل جو صراحتاً مورد نص میں آتے ہیں وہ تمام محل جو اس نص کے مورد کے طور پر متعین ہیں قطعی طور پر کہ تالابوں میں رہتے ہوئے مچھلی کی بیع کر دینا جائز نہیں ہے۔ ''لاتبیعوا السمک فی الآجام''، یا ''لاتبیعوا السمک قبل أن یصطاد''۔ تو مچھلی کے تالاب میں رہتے ہوئے بیع کر دینا جائز ہے، میں اس بحث میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ حسن ہے یا کیا ہے؟ لیکن یہ مان کر کہ یہ نص اپنے موضوع پر نص ہے اور قطعی صراحت کا درجہ رکھتی ہے، تو تھوڑی دیر کے لئے اس کی سند کی بحثوں کو اور حسن اور صحت وغیرہ کی بحثوں سے الگ ہوکر، پھر اس میں کئی بحثیں ہیں کہ اگر قول ابن عمر بھی ہے تو ''فیما لا یدرک بالقیاس'' ہے یا ''مایدرک بالقیاس'' ہے، میں ان بحثوں میں ابھی نہیں جانا چاہتا اور میں صرف آپ حضرات سے جو اس کمیٹی میں بیٹھیں گے اور دیگر علماء سے بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس پر اب ایک اور پہلو سے غور کریں کہ اس کا صحیح تجزیہ کریں کہ اس مسئلہ میں واقعی حاجت اس صریح مورد کو چھوڑ کر اس مسئلہ میں واقعی حاجت اور عالم بھر کا تعامل کیا اس درجہ میں ہے کہ اگر فقہ حنفی کی کوئی صراحت اس کے لئے جواز کی گنجائش نہیں نکالتی تو کیا اس کی گنجائش ہے؟ ضرورت اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ضرورت اس درجہ کی ہے؟ کہ اس مسئلہ میں جیسا کہ دکتور نے فرمایا کہ حنابلہ کے یہاں اس کا جواز ہے، اسی لئے میں نے ''المغنی'' بھی منگائی تھی، صاحب المغنی کہتا ہے کہ: ''ولو استاجر البرکة أو الشبکة واستعارهما للاصطیاد جاز وماحصل فیها ملک'' تو یہ ہے اور اس کے آگے پیچھے بھی کچھ، تو مسلک حنابلہ کا صحیح تعین، ضرورت اور حاجت کا صحیح تعین اور عدول عن المسلک کے اصولوں کے مطابق کیا اگر ایسی ضرورت ہے تو اس صورت میں آپ کے لئے حنابلہ کے اس مسلک پر فتویٰ دینا صحیح ہوگا یا نہیں ہوگا؟ ویسے حضرت تھانویؒ نے بکریوں کی پرورش حصہ داری کے ساتھ جیسے بٹائی داری کے ساتھ کرنے کی اجازت دی اور فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں گنجائش نہیں، لیکن عرف عام ہے تعامل تو خیر ہے ہی، ضرورت عام ہے، اس لئے اس میں فقہ حنبلی کے جزئیہ پر عمل کیا جانا چاہیے، بہر حال میں نے کہا کہ یہ سارے وہ سوالات ہیں جن کو بیٹھنے والی کمیٹی بھی اور ہمارے فیصلہ کرنے والے حضرات علماء بھی محض ایک سوال کی حیثیت سے ذہن میں رکھ کر کوئی پختہ واضح تجویز اس کے لئے طے کریں۔ یہ ہماری درخواست ہے۔

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

بیع الوفاء

بیع وفاء، موجودہ معاشی تناظر میں

(تعارف و تجزیہ)

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

پیش لفظ

شریعت کے بعض احکام عبادات سے متعلق ہیں اور بعض معاملات اور دیگر مسائل زندگی سے، عبادات کے معاملے میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ ان کے مقاصد بھی متعین ہیں اور ان کے طریقہ کار اور ظاہری شکل کو بھی پوری طرح متعین کر دیا گیا ہے، جیسے نماز کا مقصد فحشاء ومنکر سے بچانا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نماز کا پورا طریقہ نیت اور تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک قرآن وحدیث میں بیان کر دیا گیا ہے، اس میں قیاس اور اجتہاد کی بہت کم گنجائش رکھی گئی ہے، اس کے برخلاف مثلاً خرید وفروخت کا معاملہ ہے، اس کا مقصد بنیادی طور پر ملکیت کی منتقلی ہے، جب کسی چیز کی بیع ہوتی ہے تو وہ بیچنے والے کی ملکیت سے نکل کر خریدنے والے کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے، اس سلسلے میں صرف بنیادی اصولوں کی راہ نمائی فرمائی گئی ہے، جیسے یہ کہ ایسے معاملات باہمی رضامندی سے طے پانے چاہئیں، ایسا ابہام نہ ہونا چاہئے جو نزاع کا سبب بن جائے، جب تک کوئی چیز ملکیت اور قبضہ میں نہ ہو اگلے شخص سے اس کو بیچنا درست نہیں ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچنے والا اس شئی کو مہیا نہ کر پائے اور خریدار دھوکہ کھا جائے، اس طرح کی تمام تفصیلات کو قرآن وحدیث میں متعین نہیں کیا گیا ہے، تاکہ انسان کو اس میں آزادی حاصل رہے۔

غرض کہ احکام شریعت میں اشکال کی بھی اہمیت ہے اور مقاصد کی بھی، کسی فعل کو انجام دینے کے لئے جو صورت انجام دی جائے، اس کو بھی اہمیت حاصل ہے اور اس کے پیچھے جو مقاصد کارفرما ہیں وہ بھی اہم ہیں، لیکن معاملات کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو شکل کے اعتبار سے درست نظر آتی ہیں، مگر مقاصد کے اعتبار سے شریعت کے مزاج سے متصادم، جیسے: بیع عینہ، بیع عینہ دو افراد کے درمیان ہوتی ہے، جس میں ایک شخص اپنا کوئی سامان نقد کم قیمت میں فروخت کرتا ہے اور پھر اسی بیچنے والے شخص سے وہی چیز ادھار زیادہ قیمت میں خرید کر لیتا ہے، اس طرح نقد بیچنے والے کو نقد رقم حاصل ہو جاتی ہے، جس کی اس کو ضرورت تھی اور دوسرے فریق کو زائد رقم مل جاتی ہے، جو اس کا مقصود تھا، ظاہری شکل کے اعتبار سے یہ خرید وفروخت کا معاملہ ہے، لیکن مقصد اور مآل کے اعتبار سے سود کی شکل معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص کو قرض کی ضرورت تھی اس نے نقد رقم حاصل کرنے کے لئے زیادہ پیسے ادا کئے اور کم پیسے حاصل کئے، اس لحاظ سے اس کو جائز نہیں ہونا چاہئے، فقہاء نے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے اسے حرام تو نہیں کہا، لیکن مکروہ تحریمی قرار دیا۔

اسی طرح کے مسائل میں ایک ''بیع وفاء'' کا مسئلہ ہے، جس کا رواج زمانہ قدیم سے رہا ہے اور اس کے تعامل کو دیکھتے ہوئے بعض متاخرین فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، بیع وفا کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص کو نقد پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے شخص کو رہائش کے لئے مکان یا تجارت کے لئے دکان کی، پہلا شخص دوسرے شخص کو اپنا مکان یہ کہہ کر دیتا ہے کہ یہ مکان میں آپ سے فروخت کرتا ہوں، آپ اس سے فائدہ اٹھائیں، لیکن جب مجھے اتنے پیسے ہو جائیں گے تو یہ پیسے ادا کر کے میں آپ سے مکان واپس لے لوں گا، یعنی خرید لوں گا، ظاہری شکل کے اعتبار سے یہ خرید وفروخت کا ایک معاملہ ہے جو آپسی رضامندی سے طے ہو رہا ہے، شکل کے لحاظ سے اسے جائز ہونا چاہئے، لیکن مقصد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ رہن کی ایک صورت ہے، پہلا شخص مکان رہن رکھ کر قرض حاصل کرتا ہے اور دوسرا شخص رہن پر مکان حاصل کر کے اس سے استفادہ کرتا ہے، گویا یہ رہن سے استفادہ کرنے کی ایک صورت ہے اور رہن سے استفادہ

کرنا سود کے دائرہ میں آجاتا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرض پر جو بھی نفع حاصل کیا جائے وہ ربا ہے، "کل قرض جر نفعا فھو ربا" اب بعض فقہاء نے معاملہ کی ظاہری شکل پر نظر رکھتے ہوئے اور بیع تصور کرتے ہوئے اسے جائز قرار دیا اور بعض نے مقصد کو سامنے رکھا اور قرض پر نفع حاصل کرنے کی ایک شکل قرار دیتے ہوئے اس کو منع فرمایا۔

چونکہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے ہے اور بڑے شہروں میں کثرت سے اس کا رواج ہے، نیز دونوں فریق اس کو اپنے لئے نفع بخش خیال کرتے ہیں اور اس میں ان کی رضامندی شامل ہوتی ہے اور دونوں کی ضرورت اس سے پوری ہوتی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس مسئلہ پر موجودہ حالات کے پس منظر میں غور کیا جائے، چنانچہ موضوع سے متعلق بڑے اہم مقالات آئے اور سیمینار کے درمیان مناقشات ہوئے، اکیڈمی ہمیشہ ایسے مسائل میں احتیاط اور اعتدال کی راہ اختیار کرتی ہے، اس لئے اس صورت میں عدم جواز کو ترجیح دی گئی، لیکن معاملے کی ایک صورت یہ ہے کہ معاملہ طے پاتے وقت دوبارہ واپس خرید کرنے کی بات نہ کہی جائے، البتہ دونوں فریق کے دل میں یہ بات ہو کہ اگر بیچنے والا اسی قیمت میں دوبارہ خرید کرنا چاہئے تو اس سے یہ شئی بیچ دی جائے، تو یہ صورت جائز ہوگی، کیونکہ شریعت کے احکام اس گفتگو پر جاری ہوتے ہیں جو فریقین کے درمیان طے کرتے وقت ہوتی ہے، اس بات پر نہیں جو کسی معاملے کے طے کرنے سے پہلے ہو، یا طے کرنے کے بعد ہو، یا جس کو دل میں چھپا کر رکھا گیا ہو۔

ان مقالات ومناقشات کے مجموعہ کو محب عزیز مفتی احمد نادر القاسمی (رفیق شعبۂ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی) نے بڑی محنت اور سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا ہے، امید ہے کہ اکیڈمی کے دوسرے مجلّات کی طرح اسے بھی شوق کے ہاتھوں لیا جائے گا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے۔ آمین

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری)

۲۹ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ / ۳۱ جنوری ۲۰۱۴ء

خطابات

اجتماعیت کے ساتھ ہونے والا ہر کام طاقتور ہوتا ہے

حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب[1]

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وعلى أله وأصحابه أجمعين اما بعد۔أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم، ''فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون''

صدر محترم! علماء کرام، محققین عظام ودانشوران قوم اور طالبان علوم نبوت اور بزرگان دین، یہ پروگرام جو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا یہاں منعقد ہورہا ہے، یہ ایک طرف جہاں جامعہ کے لیے بہت بڑی سعادت کی بات ہے، وہیں فقہ اکیڈمی کے لیے بھی ہے کہ اس کو ایسا اسٹیج ملا، ایسا مقام ملا کہ جہاں بڑے بڑے محققین، محدثین اور اہم علماء کرام پیدا ہوئے اور جو ایک تاریخی شہر بھی ہے، جیسا کہ تعارفی کلمات میں ابھی آپ نے سماعت فرمایا، میرا اس جامعہ سے والہانہ تعلق ہے اور یہ جامعہ کے ارباب بست وکشاد بھی مجھ سے بڑی محبت فرماتے ہیں اور ویسے بھی ہمارے وطن کے صحن میں ہے، یوں تو مجھے اس حیثیت سے کہ میں آپ حضرات کے لیے میزبانوں کی فہرست میں شامل ہوں، یوں بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے، بہرحال ایسے مجمع میں جہاں علوم نبوت کے بڑے بڑے محققین، فقہاء محدثین اور محدثین فقہاء، یہ حضرات اور دانشوران قوم جمع ہیں اس میں، میں کیا لب کشائی کروں، بہر حال یہ اکیڈمی کی بڑی اہم خدمات ہیں، اسے اس کے بانی کا اخلاص کہئے، یا موجودہ حضرات کا جو اس کو چلارہے ہیں اور ان کے تحت یہ کام ہورہا ہے اور اتنا صالح دینی اور طاقتور مواد قوم کو مل رہا ہے، کتنی تحقیقات ونشریات سامنے آرہی ہیں، میرا احساس ہے کہ بڑا علمی کام ہورہا ہے، ظاہر ہے کہ علماء کرام اور فقہاء عظام کا ہاتھ ملت کی نبض پر ہوتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ دور حاضر میں زمانے کی نبض، ملت اسلامیہ کی نبض کس طرح حرکت کررہی ہے، اس کو کیسی دوا اس کے مرض کے مطابق اور کونسی دوا اس کے لیے تجویز ہونی چاہئے۔

یہ علماء کرام برابر سوچتے رہتے ہیں اور اس طرح کا تحقیقی کام پہلے بھی ہوتا رہا ہے، لیکن اجتماعیت کے ساتھ جو کام ہوتا ہے اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے اس میں بڑا وزن ہوتا ہے، تو بہرحال انہیں کاموں کی فہرست میں اس کے یہ سمینار بھی ہیں، جگہ جگہ یہ جو سمینار ہوتے ہیں اور ان میں ہمارے یہ علماء کرام اور فقہاء عظام اپنی اپنی تحقیقات پیش کرتے ہیں، ان سے ملت کو بڑا فائدہ ہوتا ہے، ہمارے اکابر، ابتدائے اسلام اور شروع ہی سے اور عہد نبوت سے برابر یہ غور وفکر کا کام کرتے چلے آرہے ہیں، قرآن پاک کے اعلان کے مطابق ''فاعتبروا'' کے تحت ''رد الشئ إلى نظيرہ'' کے تحت، آپ اعتبار کی تعریف جانتے ہیں، اس میں یہ قیاس بھی آتا ہے، تحقیق بھی آتی ہے، تو اس فن کے شناور برابر غوطہ زنی کرکے آبدار موتی نکالتے رہتے ہیں، قیمتی موتی نکالتے رہتے ہیں، غور وفکر کرتے رہتے ہیں، مجھے ایک واقعہ اس پر یاد آرہا ہے، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں ''سورۂ نحل'' کے شروع میں جہاں یہ آیتیں آئی ہیں: "والخيل والبغال والحمير لتركبوها وزينة ويخلق مالا تعلمون" (سورۂ نحل:۱۶) اس کے تحت لکھا ہے کہ: حضرت مولانا یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہ جو سب سے پہلے صدر مدرس ہیں، دار العلوم دیوبند کے اور حجۃ الاسلام امام نانوتویؒ کے ہم سبق ساتھی ہیں، بہرحال وہاں انہوں نے واقعہ اس آیت: "الخيل والبغال لتركبوها وزينة ويخلق مالا تعلمون" (سورۂ نحل:۱۶) کے تحت لکھا ہے کہ جہاں اس آیت میں سواریوں کا ذکر کیا جارہا ہے کہ اللہ نے گھوڑوں کو پیدا کیا، خچروں کو پیدا کیا، آرام وراحت کے لیے، سواری کے لیے، آرائش کے لیے اور وہیں یہ بھی فرمایا: "ويخلق مالا تعلمون" (سورۂ نحل:۱۶) اللہ تعالی ایسی چیزیں بھی پیدا کرنے والا ہے جو اس وقت حاشیہ خیال تک میں بھی نہیں ہیں، حضرت مولانا یعقوب صاحب نے اس کی روشنی میں فرمایا: ٹرین کا ثبوت قرآن پاک سے ملتا ہے، ان کے

[1] نائب مہتمم دار العلوم دیوبند، سہارنپور (یوپی)

شاگرد حیرت میں پڑ گئے، ان کے شاگردوں میں بیان کرنے والے کون ہیں؟ حضرت مفتی شفیع صاحب کے والد مولانا یسین صاحبؒ وہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ حضرت مولانا یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند (جو سب سے پہلے صدر مدرس ہیں) نے فرمایا کہ ٹرین کا ثبوت قرآن پاک سے ملتا ہے، شاگردوں نے کان کھڑے کیے، کہ یا اللہ کس طرح یہ ثبوت ہوسکتا ہے، قرآن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں ہے دور دور تک، تو فرمایا کہ یہ تو کہا گیا ہے قرآن میں: "ویخلق مالا تعلمون" (سورۂ نحل: ۱۶) کہ عنقریب ایسی سواریاں وہ وجود میں لانے والا ہے منصۂ شہود پر، ایسی ایسی سواریاں آنے والی ہیں، جو تمہارے حاشیہ خیال تک میں بھی نہیں ہیں، اس سے یہ ٹرین کا ثبوت ملتا ہے، تو مفتی شفیع صاحبؒ اس کے تحت لکھتے ہیں کہ اگر اس زمانے میں ہوتے حضرت تو فرماتے کہ جہاز کا ثبوت بھی قرآن پاک سے ملتا ہے کہ ایسی ایسی سواریاں آنے والی ہیں کہ جن کو ابھی ظاہر نہیں کیا جاسکتا، لیکن عنقریب وجود میں آنے والی ہیں جو تمہارے حاشیہ خیال میں بھی نہیں، یہ ہے ان حضرات کا انداز غور وفکر۔

حضرت مفتی نسیم صاحب فریدی کا ابھی تعارفی کلمات میں ذکر ہوا ان ہی کا ایک واقعہ دارالعلوم دیوبند کے رسالہ میں چھپا تھا، حضرت مولانا نسیم صاحب فریدی نے، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ سے ابوداؤد شریف پڑھی تھی، وہ اپنے سبق کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ طلب حدیث کا ذکر آ گیا، حضرت نے اس موقع پر فرمایا کہ یہ جو طلبا کے لیے رجسٹر حاضری ہوتا ہے اس کا ثبوت حدیث شریف سے ملتا ہے، طلباء کو حیرت ہوئی کہ یا اللہ یہ رجسٹر کا ثبوت کیسے حدیث سے دیں گے، تو حضرت نے وہ جو روایت میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ جمعہ سے پہلے اذان کے بعد فرشتے رجسٹر لے کر دروازے پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور جتنے لوگ خطبہ سے پہلے مسجد میں آتے ہیں ان کا نام رجسٹر میں درج ہوتا رہتا ہے، اور جب خطبہ کا وقت ہوتا ہے اذان ہوتی ہے- ''إذا خرج الإمام فلا صلوة ولا کلام'' اب نہ نماز کی اجازت ہے، نہ کلام کی اجازت ہے- امام آ گیا اور خطبہ شروع ہونے والا ہے، تو اس وقت یہ رجسٹر بند کر کے خطبہ سننے بیٹھ جاتے ہیں، تو حضرت نے فرمایا کہ دیکھئے! یہ جو حدیث شریف میں ہے کہ اذان کے بعد خطبہ سے پہلے پہلے آ گئے انہیں حسب مراتب اور درجات کے اعتبار سے ان کی حاضری ہوتی رہتی ہے، اس سے رجسٹر حاضری کا ثبوت ملتا ہے۔

بہر حال یہ ہمارے اکابر اور اسلاف ہیں:

''أولئك أبائی فجئنی بمثلهم إذا جمعتنا یا جریر المجامع

یہ علماء برابر کام کرتے رہیں گے "لیتفقهوا فی الدین" (سورۂ توبہ: ۱۲۲) کے تحت، تفقہ اور تحقیقات کا کام ہوتا رہے گا، اس کے لیے اللہ نے ان حضرات کو کھڑا کیا ہے، یہ جو کام ہو رہا ہے اس کی آواز پر آپ حضرات نے ماشاء اللہ لبیک کہا اور امت کا مکھن یہاں جمع ہو گیا ہے، بہت سے مقالات وتحقیقات سامنے آئیں گی ان شاء اللہ، اس کا بھی فائدہ ہوگا۔

مسائل کا حل اور رہنمائی علماء کی ذمہ داری ہے

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب[1]

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين

محترم ذی وقار صدر مجلس، علماء کرام، عمائدین ملت، حضرات اساتذہ، عزیزان گرامی طلباء، آج آل انڈیا اسلامک فقہ اکیڈمی کا بائیسواں اجلاس تاریخی جامعہ "جامعہ اسلامیہ عربیہ امروہہ" میں منعقد ہو رہا ہے اور ہم سب اس مبارک موقع پر یہاں جمع ہیں، الحمد للہ خطبہ استقبالیہ میں جامعہ کا تعارف آپ کے سامنے آیا، یہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے یہاں علوم دینیہ کی تعلیم، اعلی درجہ کی اخلاقی تربیت جو یہاں دی جاتی رہی ہے، آج سے سال قبل جب میں اس جامعہ میں حاضر ہوا تھا اس وقت مجھے اس جامعہ میں ایک ایمانی اور روحانی کیفیت کا مشاہدہ ہوا اور آج جب کہ جامعہ ترقی کی مدارج طے کر رہا ہے، الحمد للہ یہاں تعمیرات کا بھی ایک بڑا حصہ انجام پایا ہے، اور تعلیم بھی دورہ حدیث اور تخصصات اور حفظ وتجوید ہو رہی ہے اس میں حاضر ہونے پر اور اس کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی اور اس بات کی زیادہ خوشی ہوئی کہ ہمارے اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں نے مبارک جگہ کا انتخاب کیا، جو تاریخی بھی ہے اور ہمارے اکابر علماء کی جولان گاہ اور ان کی خدمات کا مرکز بھی ہے، جس کی تفصیل آپ سن چکے ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا) نے بہت جامع انداز میں فقہ اکیڈمی کا تعارف ہمارے سامنے کہ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟

۱۲/اپریل ۱۹۷۳ میں باضابطہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آ گیا تو مسلم پرسنل لا کے قیام عمل کے بعد طرح طرح کے مسائل سامنے آنے لگے، نکاح، طلاق، وراثت، گارجین شپ، حضانت، وقف وغیرہ کی شرعی حیثیت سے متعلق، اس وقت یہ خیال ہوا کہ آل انڈیا پرسنل لا بورڈ کے ماتحت ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کیا جائے جس میں ہمارے چند علماء ہوں اور ماہرین بھی ہوں، وہ علماء کی جماعت شریعت اسلامی مطابق ان مسائل کی تحقیقات کرے جو مسلم پرسنل لا کو درپیش ہیں، لیکن جب اس پر گفتگو ہوئی تو بورڈ کے پاس اتنی استطاعت نہیں تھی، لیکن یہ ہم لوگوں کے درمیان طے پائی کہ اس سے علاحدہ ایک ایسا تحقیقاتی ادارہ قائم ہونا چاہئے، تاکہ مسلم پرسنل لاء کے علاوہ اور بھی جو نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں عوام کو ہمارے فیصلہ کا انتظار ہوتا ہے، وہ ادارہ جواب دے سکے، چنانچہ اس کے لیے مستقل ایک تحقیقاتی ادارہ اسلامک فقہ انڈیا کے نام سے قائم ہوا اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ نے جس کی تاسیس فرمائی، جس میں ملک کے سبھی گوشے سے علماء نے شرکت کی، یہ اس ادارہ کا پس منظر ہے، یہ اس کی ضرورت ہے اب جب قیام عمل میں آ گیا تو دونوں کی اہمیت بڑھتی چلی گئی، مسلم پرسنل لاء سامنے بھی مسائل کی اہمیت بڑھتی چلی گئی، فقہ اکیڈمی کے سامنے بھی، اس کے سمینار ہوتے رہے، الحمد للہ یہ بائیسواں سمینار ہے جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اجتماع علماء کا جو سمجھئے کہ منتخب حضرات ہیں جو قرآن پاک میں کہا گیا ہے: "هو اجتباكم" اللہ تعالی نے تم کو منتخب کر لیا ہے، "وما جعل عليكم في الدين من حرج" (سورۂ حج: ۲۹) اور دین میں کوئی تنگی باقی نہیں رکھی، کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ جس کا جواب شریعت اسلامی میں نہ ہو، اس کی اس حیثیت سے جو اس ادارے کی خدمات ہیں بڑی لائق قدر اور لائق تحسین ہیں اور اس میں جو حضرات حصہ لیتے ہیں وہ بھی قابل مبارکباد ہیں، بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کی ذمہ داری ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر رہے ہیں۔

آج الحاد، بے دینی، فحاشی اور عریانیت بڑھتی جا رہی ہے اور مختلف طریقوں سے وہ برائیاں جو پورے معاشرے میں پھیل جاتی ہیں اس کو جواز کا درجہ دیا جا رہا ہے، بے پردگی، بے حیائی، مخلوط تعلیم، جنسی تعلیم اور بہت سی صورتیں ایسی ہیں جب پھیل جاتی ہیں لوگوں میں تو بڑے چھوٹے سب ملوث ہو جاتے ہیں، اس لیے اس ابتلاء عام کے زمانے میں ہماری ذمہ داری بڑھتی ہے کہ ایک طرف تو یہ تحقیقی کام آپ کر رہے ہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری طرف جہاں آپ اداروں سے منسلک ہیں جہاں آپ مدارس میں ہیں، جہاں جماعتوں میں ہیں، جہاں خود آپ کا اپنا مقام ہے، اپنے

[1] امیر شریعت بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ۔

اپنے مقام پر گویا آپ مرجع ہیں، آپ عوام کے رہنما ہیں، مرجع ہیں، پیشوا ہیں، اس لیے ان کے اندر چار صفات کا ہونا ضروری ہے، اول تو یہ کہ استقامت علی الحق ہو، دوسرے استغناء عن الخلق، خلق سے وہ مستغنی ہو، صرف ان کے مالیات سے نہیں صرف ان کے نذرانے سے نہیں، بلکہ مدح سرائی سے بھی بے نیاز ہو، کون ہمارے حق کی بات کی تعریف کرتا ہے اور کون ہمارے حق بات کی مذمت کرتا ہے اس سے بے نیاز ہونا چاہئے، یہ استغناء کی صفت ہمارے اکابر میں تھی، ہم نے خود دیکھا ہے، تیسری صفت داعیانہ کردار ہے، آپ جہاں بھی ہوں آپ داعی ہیں اسلام کے، آپ کا سراپا، آپ کا لباس، آپ کی وضع قطع، آپ کے مدرسوں کا رنگ، آپ کے طلبہ یہ سب ایک پیغام ہوں لوگوں کے لیے، مثالی نمونہ ہوں، کہ اسلام ایسے ہی انسان پیدا کرتا ہے، ایسے ہی کردار سازی کرتا ہے تو اس طرح سے ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس چیز پر اپنے داعیانہ کردار کو کبھی فراموش نہ کریں، کہ آپ بہر حال علوم نبوت کے وارث ہیں، اس کے حامل ہیں، اس کو پھیلانا اس کو عوام تک پہنچانا ان کی اصلاح کی ذمہ داری ہم پر ہے، اگر وہ گمراہ ہوتے ہیں اگر وہ خرافات میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہم اس کے جواب دہ ہوں گے، اگر ہم اس کو دیکھتے ہوئے خاموش رہتے ہیں تو ہم اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کر رہے ہیں، آپ اس سے متعلق حدیث سن چکے ہیں: ''من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ... الخ'' (مسلم) منکر کو مٹانا معروف کو پھیلانا ہماری ذمہ داری ہے۔

چوتھی صفت ہے عالمانہ وقار: عالمانہ وقار آپ کے اندر ہونا چاہئے، عامیانہ نہیں، لوگ آپ کو اپنی خواہشات کی طرف لے جائیں، ایسا نہ ہو، بلکہ آپ لوگوں کی خواہشات کو دین کی طرف موڑیئے، ہم تو دیکھتے ہیں، اکثر و بیشتر الحمد للہ یہ جگہ تو بہت بہتر ہے، ہمارے بزرگوں کی جگہ ہے، لیکن بہت سی جگہ مدرسوں میں اب جو جلسے ہوتے ہیں تو عوام کی خواہش کے مطابق ہوتے ہیں، نعت خوانوں کا ایک گروہ ہوتا ہے، چندہ کرنے والے مقررین کی تقریروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، اصل فائدہ مدرسہ کے جلسہ کا ہونا چاہئے دعوتی کام وہ نہیں ہو پاتا، اس کے لیے مزاج بنانے کی ضرورت ہے، جب ہمارے علماء کا مزاج عالمانہ وقار بن جائے گا تو وہ عوام کو اپنی رائے کی طرف موڑیں گے اور بتائیں گے، ہونا کیا چاہئے اور کس طرح ہو، اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں گے، اپنی باگ دوڑ ان کے ہاتھ میں نہ دیں گے، اور میں اس کی بہت مثالیں دیتا ہوں، میں نے حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا مدنیؒ، حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کو دیکھا اور بھی بہت سے بزرگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم کو ان کے راستے سے ہٹنا نہیں چاہئے، ہم جس قدر اپنے اکابر اور اسلاف کے راستے پر قائم رہیں گے، اتنا ہی زیادہ ہم عوام کو دین پر قائم رکھ سکیں گے۔

یہ بڑے فتنہ کا دور ہے، قدم قدم پر فتنہ ہے، اب دیکھئے! پچاس فیصد عورتوں کو پنچایت الیکشن میں کھڑے ہونے کی اجازت ہے، اب پنچایت الیکشن میں مکھیا کی پوسٹ پر عورتیں آئیں گی، اگر نہیں آتی ہیں تو مسلمانوں کی ہر جگہ سیٹیں حذف ہو جائیں گی، نتیجہ یہ ہے کہ بہار میں تقریباً ۵۲ سیٹیں مکھیا کی مسلمانوں کی جو تھیں وہ ختم ہوگئیں، اور غیر مسلم عورتیں مکھیا کی جگہ پر آئیں، عورتوں کی آزادی، عورتوں کو بااختیار بنانا، حقوق نسواں کا نعرہ لگایا جارہا ہے، یہ سب الحاد اور بے دینی کی فضا ہے، یہ سب عمل میں لایا جارہا ہے، دیکھتے دیکھتے یہ سب چیزیں مزید پھیل جائیں گی، ہمارے پاس لوگ مسئلہ پوچھنے کے لیے آتے ہیں، کیا کریں؟ مکھیا تھے، علاقے میں ہمارا نام تھا، اب یہ سیٹ عورت کے نام پر ہوگئی، ہم اپنی بیوی کو مکھیا کی سیٹ پر کھڑی کر سکتے ہیں یا نہیں، عورت مکھیا کا الیکشن لڑ سکتی ہے یا نہیں، مکھیا بن سکتی ہے یا نہیں، اب یہ مسائل آپ کے سامنے آئیں گے، وہ نگر نگم میں، یعنی کارپوریشن میں چیئر مین ہو سکتی ہے یا نہیں؟

مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسی بہت سی باتیں گھر کرتی چلی جاتی ہیں، جو ہم کو اسلاف کے راستے سے ہٹاتی ہیں، ہمیں بتانا ہوگا، آج مولانا نے اپنے خطبہ میں جس لڑکی کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، آج چاروں طرف سے صدا بلند ہوئی کہ موت کی سزا دینا چاہئے، موت کی سزا دینا چاہئے، پھانسی دینا چاہئے، اور کل تک کیا تھا کہ اسلام میں سزائیں بڑی بے رحمی کی سزا ہے، لیکن آج وہی لوگ وہی حضرات اور میڈیا اور وہ سیاست داں جو کل تک اسلام کی سزاؤں کو، اس کی تعزیرات کو برا بھلا کہتے تھے آج اس سے بڑھ کر مطالبہ کر رہے ہیں۔

اسلام نے تو رجم کی سزا، زنا کی سزا پر ایسی شرائط رکھی ہیں، کہ ان کو پورا کرنا ہی مشکل ہے، اور تاریخ میں مشکل سے ہی سنگسار کی مثالیں ملتی ہیں، اس لیے کہ چار عینی شاہدین اور وہ بھی مرد ہونا ضروری ہے، دوسری قوموں نے ان سزاؤں کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا، لیکن اتنا جان گئے کہ آج زنا کی دو قسمیں پائی جارہی ہیں: ایک زنا بالجبر اور ایک زنا بالرضا، زنا بالجبر تو قابل سزا جرم ہے اور زنا بالرضا قابل سزا جرم نہیں، غور فرمائیے: یہ سوسائٹی

انسانوں کی باقی رہے گی؟، ہماری آنکھوں کے سامنے ہورہا ہے، اسی طریقہ سے انہوں نے شراب کی دو قسمیں رکھیں: ایک قانونی شراب، اور ایک غیر قانونی شراب، لوگ بغیر لائسنس کے جو شراب بناتے ہیں دوکان کھولتے ہیں وہ غیر قانونی ہے، اور حکومت جن کو شراب بنانے یا بیچنے کا لائسنس دیتی ہے وہ قانونی شراب ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، نتیجہ یہ کہ بہت سے جاہل مسلمان محض پیسے کی آمدنی کے لیے بہت سی جگہوں پر لائسنس لے کر شراب کی دوکانیں کھول رہے ہیں، شراب کو حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی قسمیں کی جارہی ہیں، اخبارات میں، یہ سارے مسائل ایسے ہیں جن پر ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو واقف کرائیں کہ حقیقت میں یہ چیزیں تم کو کہاں لے جائیں گی۔

ہم جس جمہوری حکومت میں رہتے ہیں وہاں ہم کو اپنی رائے دینے کا حق ہے، اور وہاں ہم اپنے عقلی دلائل دے سکتے ہیں، میں اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ بنگال اسمبلی میں ''لے پالک بل'' کی شہادت دینے کے لیے گئے تھے، جو غلط تھا، تو ہم لوگوں نے نہ تو قرآن کی ایک آیت پڑھی نہ کوئی حدیث پڑھی اور نہ یہ کہا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے، ہم نے کہا کہ یہ پورا قانون ہم نے آپ کا پڑھا ہے، یہ نا قابل عمل ہے، بیکار ہے، چلنے کا نہیں، اور اس پر عقلی دلائل پیش کیے، جس کی اسمبلی کے چیئرمین نے کافی تعریف کی اور آخر میں وہ بل واپس لے لیا گیا، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ منطق اور علم کلام پڑھنے کو کام میں لانا ہے، یہ موقع ہے کہ ہم اپنے علم کلام کے ذریعہ سے اسے جاری کریں کہ شراب کی دو قسمیں نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ ایک ہی قسم ہے جو انسانی زندگی کو برباد اور تباہ کردیتی ہے۔

آج دیکھئے! تمباکو کے خلاف قانون بنایا جارہا ہے، تمباکو مت پیو، تمباکو تو ایک آدمی کو نقصان پہنچاتا ہے جو پیتا ہے اور شراب تو پورے معاشرے کو برباد کرتی ہے، ایک شخص شراب پی کر اپنے بوڑھے ماں باپ کو پیٹتا ہے، شراب پی کر اپنی بیوی بچوں پر غصہ نکالتا ہے، چوری، قتل، آبرو لوٹنا وغیرہ، پورے معاشرے کے لیے ناسور کی حیثیت ہے، اس کی ضرورت ہے کہ ہمیں ایسے مسائل پر غور کر کے ایسے مضامین ہم کو سامنے لانا چاہئے جس کو حکومت کے سامنے بھی پیش کیا جاسکے، ہمیں حق ہے، یہاں دستور ہمیں پوری طرح سے اس کا حق دیتا ہے کہ ہم اپنی بات کہہ سکیں، یہ الگ بات ہے کہ ہم اس طرح سے نہ کہیں، بلکہ اس طرح سے کہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہے، جس طرح اب یہ قانون آیا کہ ہم جنسی کی شادی، یعنی مرد کی شادی مرد کے ساتھ اور عورت کی شادی عورت کے ساتھ، اب غور فرمائیے، اس میں کیا معقولیت ہے؟ یہ فیصلے سپریم کورٹ کے جج کریں، تعلیم یافتہ لوگ کریں اور ہم اس کا کوئی جواب نہ دیں، ہمیں معقولیت کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہئے اور ان زبانوں میں اس کو شائع کرنا چاہئے جو زبانیں آج سمجھی جاتی ہیں، یا ان اصطلاحات کے ساتھ کہنا چاہئے کہ جو اصطلاحات رائج ہیں اور قانون بنانے والے ان کا استعمال کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس ملک کے اندر اسلام کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے، سوال یہ ہے کہ ہم اس میں شامل ہوتے ہیں یا نہیں، اللہ تعالیٰ جن لوگوں کے ذریعہ سے اس ملک میں اسلام کو زندہ رکھے گا ہم اس جماعت میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں، اس جماعت میں شامل ہونے کے لیے ہمارے اندر قربانی کا جذبہ ہونا چاہئے، اللہ کا بھیجا ہوا یہ دین رحمت سب کے لیے رحمت بن جائے اور یہ اسلام بازاروں میں، پارلیمنٹ میں، اور مختلف فکر میں چلتا پھرتا نظر آئے، میں کیا کہوں، ہمارے مسلم سماج میں شادیوں کا جو رنگ ڈھنگ نظر آنے لگا ہے اس نے ہمیں شرمندہ کردیا ہے، ورنہ اسلام میں جو شادی کا مقام ہے، آپ اس کو نکاح کے خطبہ میں بیان کیجئے، غیر مسلم کا مجمع ہو تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں جو عزت عورت کو ہے وہ دنیا کے کسی مذہب میں نہیں، اسلام میں جو طریقہ شادی بیاہ کا ہے وہ سب سے زیادہ آسان ہے، ہم تلک اور جہیز سے جتنے نالاں ہیں دوسری قومیں اس سے زیادہ نالاں ہیں، ہم اسلامی معاشرہ کے لیے اپنی قوم کو جب تیار کریں گے تو یاد رکھیں کہ صالح مسلم معاشرہ کی ہی نہیں تعمیر و تشکیل ہوگی، بلکہ انسانی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل ہوگی، ایمانداری آئے گی، آج بڑے سے بڑا وزیر، بڑے سے بڑا لیڈر گھوٹالہ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا ہے، اگر ہم ایمانداری والی سیاست لائیں، ہم بتائیں کہ سیاست کیا ہے؟ ہم بتائیں کہ تجارت کیا ہے، سرکاری عہدوں پر قائم رہ کر کس طرح سے نظم وضبط کو قائم کیا جاتا ہے، کیا ایمانداری اس میں ہونی چاہئے؟ اگر ہم یہ ذمہ داری لیں اور مجلسوں میں اپنے داعیانہ کردار کو ثابت کریں، تو سمجھئے کہ بہت جلد ہی انقلاب آئے گا، دنیا منتظر ہے، دنیا بداخلاقی اور روحانی زوال سے تنگ آچکی ہے اور ظلم و تشدد سے دنیا کافی پریشان ہے، ایسے میں آپ امن کا، انصاف کا، انسانی مساوات کا پیغام لے کر کے دنیا میں جاسکتے ہیں، اور ایسی مثالیں اپنے اعمال اور اخلاق سے پیش کرسکتے ہیں جس کی دنیا منتظر ہے اور دنیا اس کی تقلید کرنے کے لیے تیار ہے، اور اگر ہم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ کے مطابق اپنی زندگیوں کو، اپنی اولادوں کی زندگیوں کو اپنے تلامذہ کو سنوار دیں اور جماعت تیار کردیں اسلام پر عمل کرنے والوں کی تو انشاء اللہ عظیم روحانی اور اخلاقی انقلاب اس ملک میں آئے گا، اللہ ہم اور آپ کو نیک توفیق عطا فرمائے۔

اظہار مسرت واستقبال

جناب محمود صاحب (وزیر)

السلام علیکم! چونکہ میں یہاں مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہوں، اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ آج جو مجمع ہے وہ میری تقریر سننے کے لیے نہیں بیٹھا ہے۔ میں استقبال کرتا ہوں مجمع کے صدر عالی جناب عزت مآب حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی صاحب کا، اس کے بعد عالی جناب عزت مآب حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ اور امیر شریعت بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ) عالی جناب حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)، عالی جناب حضرت مولانا مفتی اشرف علی بنگلوری (امیر شریعت کرناٹک)، عالی جناب عزت مآب ڈاکٹر عبدالرزاق قسوم (الجیریا)، عالی جناب عزت مآب ڈاکٹر سید طارق، عالی جناب عزت مآب مولانا ابراہیم بہام (افریقہ)، عالی جناب مولانا عبداللہ مغیثی، عالی جناب مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب (ندوۃ العلماء لکھنو) مفتی عبد الرحمن صاحب، جناب ڈاکٹر رجب شان ترک (ترکی)، ڈاکٹر نجم الدین (ترکی)، شیخ معشوق یماک (ترکی) اور ڈائس پر بیٹھے دیگر علماء کرام، اور اس شہر میں باہر سے آئے سبھی قابل احترام علماء کرام، اور ادارے کے طلبا کا۔

آج مجھے بے پناہ خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے اپنے شہر میں وہ بڑی شخصیتیں، وہ علماء کرام جنہوں نے ملک اور دنیا کو علم اور قرآن کے دائرہ میں رہ کر ایک نصیحت دی کہ ملک اور ایمان کس طرح سے چلتا ہے، میں ان کا بار بار دل کی گہرائیوں سے اپنی طرف سے اور اپنے شہر والوں کی طرف سے اور آپ سبھی حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں امید کرتا ہوں کہ علماء کرام اور عالم دین کی طرف سے اس امن پرستی کی بستی سے ہم کچھ ایسی نصیحتیں ضرور لے کر جائیں گے۔

میں سرکار کا نمائندہ اور وزیر ہونے کی حیثیت سے اس تاریخی اور اکابر واسلاف کے شہر میں ایک بار پھر آپ سب کا استقبال کرتا ہوں کہ آپ حضرات نے یہاں تشریف لا کر ہم سب کو، اہل شہر کو اور اس جامعہ کو خدمت کا موقعہ عنایت کیا، اور ہماری عزت میں اضافہ فرمایا۔

☆☆☆

تحفظ دین کا سلسلہ اور تجدید

مولانا عبداللہ مغیثی صاحب [صدر، آل انڈیا ملی کونسل]

نحمده و نصلي على رسوله الكريم، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

''إن الله عزوجل يبعث لهذه الأمة على رأس كل مأة من يجدد لها دينها''۔

عالی قدر محترم اور حضرات علماء کرام! ابھی جو جنرل سکریٹری صاحب نے تعارف کلمات کے نام سے آپ حضرات کو مفصل خطبہ سنایا اسی میں صفحہ چار پر یہ حدیث بھی ہے جو میں نے پڑھی ہے، سنن ابوداؤد کی، یہ حدیث بتارہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دین کے تحفظ اور اسلام کی حفاظت کے لیے اللہ رب العالمین نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قیامت تک کے لیے مکمل انتظام فرمادیا ہے، ہر دور میں ہر زمانے میں ایسے بزرگ رہے ہیں، اسی بنیاد پر حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے کھڑے ہوکر یہ فرمایا تھا کہ لوگ مرتد ہونے کا ارادہ کررہے ہیں، اگر وہ رسی بھی نہیں دیں گے جو اونٹ کے باندھنے کی ہے، زکوۃ کے اندر اور دورنبوت میں وہ دے رہے تھے تو میں جہاد کروں گا، یہ پہلا مجدد ہے ملت کا، اور پھر ملت میں اللہ رب العالمین نے حدیث کے مطابق جب جب بھی سوسال کی مدت پوری ہوئی اور حالات بگڑے، خرافات نے وسیع پیمانے پر اپنا دامن پھیلا دیا اور علاقے کے علاقوں کو ارتداد کی شکل میں اور خرافات کی شکل میں مختلف شادیوں کی اور جہیز اور تلک کی لعنت میں گرفتار کرلیا تو اللہ نے ہر دور میں کوئی نہ کوئی مجدد پیدا کردیا، یہ تفصیل کا وقت نہیں ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وہ مجدد ہیں کہ جنہوں نے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پورے عالم کا رخ بدلا، اور اس کے بعد میں یہ بھی فرمایا ہے ہمارے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے کہ مجدد کے لیے ضروری نہیں ہے کہ فرد ہی ہو جماعت بھی ہوسکتی ہے، اللہ نے اس کے بعد میں شاہ ولی اللہ صاحب کی امانتوں کی حفاظت کے لیے دیوبند کے اندر دارالعلوم دیوبند قائم فرمادیا تو ''من'' اس پر صادق آرہا ہے، اور صادق کیسے نہیں آئے گا اس وقت جتنی پیداوار یہاں بیٹھی ہے یہ ساری کی ساری اللہ کے فضل سے مجاہدین اور دین کے محافظین کی ہے یہ سب دارالعلوم دیوبند ہی کا فیض ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ملک کے اندر ہر دور میں ہر زمانے میں ایسے ادارے اور ایسے افراد اللہ نے پیدا کیے ہیں کہ جنہوں نے دین کی ہمیشہ حفاظت کی، حق پرستوں کی ایک جماعت ہمیشہ رہتی ہے اور اللہ کا فضل ہے کہ آج بھی وہ جماعت موجود ہے، مختلف علاقوں میں مختلف انداز سے مختلف تنظیمیں اپنے اپنے طور پر ملت کی اور اسلام کی حفاظت کرنے کے لیے رات دن سرگرداں رہتی ہیں، سن ۱۹۷۲ میں یہاں ہمارے جنرل سکریٹری صاحب تشریف فرما ہیں مسلم پرسنل لابورڈ قائم ہوا، اس پرسنل لاء بورڈ سے بھی پہلے اسلام کی حفاظت ہوئی، اور نازک صورت حال پیدا ہوئی تو اللہ رب العالمین نے پھر ہمارے ان اکابر کو پرسنل لاء بورڈ کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں دے دیا، ہمارے سامنے کھڑا کردیا وہ کونسی منزل ہے جس منزل میں مسلم پرسنل لابورڈ نے آنکھیں ملا کر حکومت سے بات نہ کی ہو اور اسلام کا تحفظ نہ کیا ہو، اسی قافلہ میں ایک قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ بھی تھے وہ بھی اسی جماعت میں شامل تھے، انہوں نے محسوس کیا اور ہمارے جنرل سکریٹری صاحب نے بھی، جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ پرسنل لاء بورڈ نے یہ محسوس کیا کہ خاص کمیٹی جو تحفظ شریعت کے لیے بنیادی طور پر آنے والے مسائل کا حل پیش کرے، جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان کا حل پیش کرے، اس کے لیے اللہ رب العالمین نے ان حضرات کے دماغ میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو منتخب کیا، انہوں نے اسی انداز سے ترتیب دیا، اسی انداز سے اس کو سنوارا اور بنایا۔

آج یہ فقہ اکیڈمی کا اجلاس اللہ کا شکر ہے تاریخی اجلاس ہے اور تاریخی مقام پر ہے، اور آج یہ کان کھول کر دنیا سن لے کہ ہمارے سارے کے سارے بزرگ جو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں خدا کے فضل سے وہ بھی سب جمع ہیں، تو کوئی بھی حکومت اتنے بڑے اکابر حق پرستوں کی

موجودگی میں میں سمجھتا ہوں کہ کوئی غلط فیصلہ شاید نہیں کرے گی انشاء اللہ، اس لیے کہ یہ اکابر یہ بزرگ یہ اولیاء اللہ جو بیٹھے ہیں اور جو انبیاء کے وارث ہیں کیا ان کی موجودگی میں کوئی غلط فیصلہ ہوسکتا ہے؟ نہیں یہ اپنی جانوں پر کھیل گئے، انہوں نے اپنے وطن چھوڑ دیئے، ان حضرات کی موجودگی میں غلط فیصلہ نہیں ہوسکتا، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ بھی اسی قافلے کے، اسی کارواں کے ایک خادم تھے۔ ان کی نگاہیں بہت دوررس تھی اور وہ بہت دور بینی کے ساتھ وہ دیکھا کرتے تھے، تو انہوں نے باقاعدہ یہ اسلامک فقہ اکیڈمی جن حالات میں قائم کی اللہ کا شکر ہے کہ ان کی امید آج نظر آرہی ہے اور اتنی بڑی تعداد میں حق پرست علماء یہاں جمع ہیں، اور یہ دل والا مدرسہ ہے اللہ کے فضل سے اس نے اپنا دل بچھا دیا تمام علماء کے لیے اور یہ وہ ادارہ ہے جس سے شیخ الاسلام اور بڑے بڑے اکابر امت کا نام جڑا ہوا ہے، اور یہ وہ ادارے ہیں جو دارالعلوم دیوبند کو افراد تیار کر کے دیتے ہیں، اور پھر وہ دین، شریعت اور تقوی للّٰہیت کا رنگ چڑھا کر ملت میں خدمت کے لیے اور اسلام کی سربلندی کے لیے بھیجتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند جو ہے وہ اصل میں ہم سب کی ماں ہے، ہم اسی کی چھاتیوں سے دودھ پیئے ہیں، اور یہاں جمع ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں اور بھی تنظیمیں ہیں جو کام کر رہی ہیں وہ ساری کی ساری اللہ کا شکر ہے کہ اپنے باپ کی اور اپنی ماں کی وفادار ہیں، غدار نہیں ہیں، اور دارالعلوم دیوبند جس نے ہمیں یہ علم دیا ہے اسی نے یہ سبق بھی دیا ہے کہ ہم ایک ساتھ متحد ہو کر اور اتفاق واتحاد کے ساتھ بیٹھیں اور امت کے مسائل کا حل تلاش کریں۔

آخری ایک بات عرض کردوں وہ یہ کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار میری نگاہ میں بہت اہم ترین کام ہے اور بہت اہم ترین ضرورت کی تکمیل ہے، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم کر کے ایک نئی نسل، ایک نئی روح تیار کردی ہے جو آئندہ ان بزرگوں کے اللہ کے یہاں چلے جانے کے بعد- خدا کرے کہ ابھی ان کی عمر میں برکت ہو- اس کام کو آگے بڑھاتی رہے گی، یہ بیداری اسلامک فقہ اکیڈمی نے دی اور اسی پر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی نگاہ تھی، بار بار وہ فرماتے تھے، بہت خوشی ہے کہ ہمارے مفتیان کرام اور نئی نسل ہماری جو دارالعلوم سے، مظاہر علوم سے امروہہ سے، شاہی مراد آباد سے اور دیگر مدارس سے تیار ہو رہی ہے ان کو موقع مل رہا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس میں شریک ہو کر کہ ان کے ہاتھ میں قلم آجائے اور منہ کے اندر زبان آجائے تو انشاء اللہ آپ ہی حضرات دین کے محافظ ہوں گے اور دین کی حفاظت اور تجدید کریں گے۔

☆☆☆

دنیا آپ کی طرف دیکھ رہی ہے اور لو لگائے ہوئے ہے

• ڈاکٹر محمد منظور عالم [جنرل سکریٹری، آل انڈیا ملی کونسل]

بسم اللہ الرحمن الرحیم، نحمده و نصلی علی رسوله الکریم أما بعد

صدر جلسہ! علماء کرام، نوجوانان ہند! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں اس موقع پر وقت زیادہ لیے بغیر تین باتیں آپ لوگوں کی خدمت میں رکھنا چاہتا ہوں جس میں ایک اور دو باتیں تاریخ اسلامک فقہ اکیڈمی کے اوراق سے تعلق رکھتی ہیں، ایک تو یہ ہے کہ جب پہلی کانفرنس ہمدرد یونیورسٹی کے اندر رکھی گئی تھی، اس وقت کے تمام معروف علماء کرام، تمام مفتیان کرام جو اس وقت بہت اہم شخصیات تھیں، اس وقت ان کی اکثریت اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، اس موقع پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک جملہ کہا تھا جس کو میں اس وقت دہرانا چاہتا ہوں، اور آل ریڈی یہ ریکارڈیڈ بھی ہے ان کا یہ اسٹیٹ منٹ، انہوں نے کہا تھا کہ میری عمر تقریباً ساٹھ سال کی ہو رہی ہے میرے بیس سال کو کم کر دو میں جب جوان تھا، چالیس سال میں ایسا پروگرام جو اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذریعہ اس وقت ہو رہا ہے کبھی نہیں ہوا تھا، جہاں تمام اکابرین ایک ساتھ جمع ہیں، اور سب مل کر تمام مسائل پر غور وخوض کر رہے ہیں، یہ وہ تاریخی بیان تھا جس کا ثمرہ آج کوئی بھی دیکھ سکتا ہے، جو اس اسٹیج پر آیا ہے، یا جب بھی کبھی اسٹیج پر آتا ہے۔

دوسرا اسی طرح کا بیان خود حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا تھا، اس وقت کچھ لوگوں نے یہ بات کہی تھی کہ بہت سے ایسے نوجوان علماء کرام اسٹیج پر شامل ہو رہے ہیں جو ابھی اس لائق نہیں ہیں، ذرا غور سے سنئے ان کا جملہ، انہوں نے کہا تھا کہ ''آج کے صغار کل کے کبار ہیں''، آج کے صغار اگر یہ چیز سیکھ لیں گے تو کل کبار ہو کر اجتماعیت کا بہتر نمونہ اور ثبوت پیش کریں گے، ان کی یہ بات آپ لوگوں تک میں اس لیے پہنچا رہا ہوں کہ جب میں یہاں کھڑا ہو کر دیکھ رہا ہوں تو پوری دنیا میں جس طرح سے ساٹھ فیصد نوجوان پائے جا رہے ہیں، یہاں بھی تقریباً اسی تناسب میں نوجوان علماء، دانشور اور فقہاء کرام کا مجمع نظر آ رہا ہے۔

میں تمام اکابرین سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک نگاہ پوری دنیا پر ڈالیے، گذشتہ پچہتر سالوں سے پوری دنیا بانجھ ہو گئی ہے، جو کوئی ازم، چاہے وہ کمیونزم ہو، سوشلزم ہو، کیپٹلزم ہو، دنیا میں انسانوں کی بنائی ہوئی ازم آج پچہتر سالوں سے منظر عام پر نہیں آ رہی ہے، اس لیے انسان ہر جگہ رہبر کی تلاش میں ہے، انسان ہر جگہ اپنے مسائل کا حل چاہ رہا ہے اور اس کا حل صرف اور صرف قرآن ہے، جس قرآن کو اللہ نے خود اپنی حفاظت میں لیا ہے، کیا یہ ضروری نہیں ہے ہمارے لیے کہ پوری انسانیت کے دکھ کو ایڈرس کرنے کے لیے ہم اس سے استفادہ کریں، چونکہ آپ وارثین انبیاء کرام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ کے پاس تراث اسلامی ہے، آپ کو زمانے کے تقاضے کو سمجھنے، اس کا تجزیہ کرنے، قرآن سے رہبری حاصل کرنے، انسانیت کے فروغ کے لیے کھڑے ہونے، عزم کا اظہار کرنے اور لوگوں کے سامنے اس بات کو پیش کرنے کہ اسلام ہرگز ہرگز صرف مسلمانوں کا دین نہیں، بلکہ سارے انسانوں کا دین ہے اور سارے انسانو! اسلام کی رحمت سے واقف ہو جاؤ، اسلام کی رحمت کو سمجھو، اسلام وہ راستہ تمہیں دے گا جو اسلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کرام کے ذریعہ تمام انسانوں کو ایڈرس کیا تھا، اس کا موقع ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم اس پہلو کو اختیار کریں تو دنیا میں اس وقت اسلام کو قبول کرنے کی ایک چاہت ہے، لیکن اس کی ظاہری رکاوٹیں ہیں اور جب تک کہ ظاہری رکاوٹیں نہیں ہوں گی آپ اسلام کی جڑ میں نہیں جا سکتے، اور انسانیت کے فروغ کے لیے راہ نہیں نکال سکتے، میں اس گذارش کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ بات صحیح ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بھی ایک تحقیقی ادارہ بنانے کی بات کہی تھی، لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر اس مسجد نبوی میں بیٹھ کر اس کا خاکہ بنایا تھا جس خاکے کو رنگ بھرنے کے لیے بہت سے لوگوں کا انتخاب کیا، اب ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ رہے ہیں، اس زمانے میں انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں نوجوانوں کو اس انداز سے تیار کرنا ہے کہ میرے بعد خلا نہ پیدا ہو، الحمد للہ آج میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ان کی یہ خواہش اللہ نے قبول فرمائی، اور آج کوئی خلا نہیں ہے، بلکہ نوجوانوں کے اندر ایک نئی صفت نظر آ رہی ہے، حالات کو سمجھنے، قرآن سے تاویل کرنے کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت واقوال کو سمجھنے کی اور زمانے میں ایک حل دینے کی۔

غور وفکر کا یہ سلسلہ ساؤتھ افریقہ میں بھی شروع ہو

مفتی زبیر بیات (جنوبی افریقہ)

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى اما بعد قال الله تبارك وتعالى:

''وأما ما ينفع الناس فيمكث في الأرض، كذلك يضرب الله الأمثال''۔

اکابرین عظام! علماء کرام، طلباء عظام! اور معززین سامعین حضرات، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں پیشگی معذرت پیش کروں گا اس لحاظ سے کہ مجھے برجستہ کچھ عرض کرنے کے لیے کہا گیا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ اسٹیج پر میرے اساتذہ کرام موجود ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایک طالب علم کو جب اساتذہ کرام کے سامنے کچھ عرض کرنا ہوتا ہے تو اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور ان کے سامنے ایک طالب علم کو لب کشائی کرنا مشکل کام ہوتا ہے، بہر حال الأمر فوق الأدب کے طور پر کچھ عرض کروں گا۔

یہ مبارک اور عظیم اجلاس، یہ اکیڈمی، یہ مدرسہ، یہ علماء کرام، یہ طلباء یہ سب کے سب الحمد للہ اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ اسلام زندہ ہے اور مسلمان ترقی پذیر ہیں اور الحمد للہ! مسلمان اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اس وقت سارے عالم میں جو مایوس کن حالات ہیں ان حالات میں ان جیسی مجلسیں امید کا ایک روشن مینارہ ہیں، اللہم زد فزد

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد مبارک آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طوبى لمن جعله الله مفتاحا للخير ومغلاقا للشر'' اور اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ''مَن'' سے جہاں مراد فرد ہے وہاں جماعت بھی ہے اور ہم اللہ تعالی کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور ان کی بنائی ہوئی یہ عظیم اکیڈمی اس کا پورا کا پورا مصداق ہے اور اس کے موجودہ اساطین واکابرین جن میں حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا عتیق احمد بستوی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا محمد عبید اللہ اسعدی صاحب دامت برکاتہم اور جتنے بھی حضرات اس میں شریک ہیں سب کے سب اس عظیم فضیلت کے مصداق ہیں، اللہم اجعلنا جمیعا منہم، اللہ ہم سب کو اس حدیث کا مصداق بنائے کہ ہم مفتاح للخیر بنیں اور مغلاق للشر۔

بہر حال جیسا کہ عرض کیا گیا کہ میرا تعلق ساؤتھ افریقہ سے ہے اور ہمیں اس بات پر خوشی ہے کہ من وجہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی تاسیس کی ایک وجہ ہمارے ملک کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ جنہوں نے ہمارے ملک کے متعدد بار اسفار کیے اور جہاں کے مسلمان حضرت کے فیض سے خود مستفید ہوئے، ان ہی اسفار میں سے ایک موقع پر حضرت کے ایک اجلاس میں مسلم اطباء جمع ہوئے تھے اور انہوں نے حضرت کے سامنے مختلف سوالات طب کے لحاظ سے پیش کیے تھے، یہ احقر بھی اس مجلس میں موجود تھا، یہ تقریباً تیس سال یا اس کے قریب پہلے کی بات ہے، حضرت نے اس موقع سے کچھ جوابات عنایت فرمائے، لیکن حضرت کو اس بات کی فکر ہوئی کہ ان جیسے جدید مسائل پر بجائے ایک مفتی کے جوابات کے جماعت کو تیار کرنا چاہئے جو اس پر غور وفکر کرکے اور اس سے متعلق تحقیق کرکے اس کا جواب دے، چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھی ایک وجہ بنی ہے اسلامک فقہ اکیڈمی کے تاسیس کی، تو ساؤتھ افریقہ کا اس اکیڈمی کے ساتھ تعلق اس لحاظ سے قائم ہے اور ہم امید کرتے ہیں یہ تعلق انشاء اللہ مستقل باقی رہے گا۔

الحمد للہ!

اس وقت یہاں علماء کرام کا ایک وفد بھی تشریف لایا ہوا ہے، جن میں جمعیۃ علماء کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا ابراہیم بھام صاحب اور جن کی طرف سے میں نیابت کررہا ہوں اصل میں مولانا کی تقریر مکرر ہوئی تھی، اس موقع پر اور اسی طرح حضرت مولانا یوسف کران صاحب، جو مجلس العلماء کے مفتی کبیر ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں اور ہمارے ملک کے عظیم شافعی مفتی ہیں اور جنہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کے فضائل کی کتاب کا انگریزی میں بہترین ترجمہ کیا ہے، حضرت مولانا بھی یہاں موجود ہیں اور اسی طرح نو جوان علماء بھی تشریف لائے ہوئے ہیں ساؤتھ افریقہ سے اور اس موقع کی مناسبت سے میں گذارش بھی کروں گا کہ استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم سے کہ جس طرح وہ یہاں ہندوستان میں فقہ اکیڈمی کو نہایت عمدہ طریقہ سے چلا رہے ہیں، اسی طریقہ سے ہمارے ملک میں بھی آ کر کے اس کی بنیاد ڈالیں، تاکہ وہاں کے علماء بھی اسی طریقہ سے تحقیق اور مسائل کے حل میں لگ جائیں، حضرت سے امید ہے کہ اس گذارش کی طرف توجہ فرمائیں گے اور اس کو منظور فرمائیں گے انشاء اللہ تعالی۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ جس طرح سابق سمیناروں میں مسائل کو باحسن طریق حل کیا گیا اسی طرح موجودہ سمینار میں جو اہم ترین مسائل ہیں اور جن کا سابقہ ہمیں بھی اپنے ملک میں پڑتا رہتا ہے، جیسے کہ سیاسی مسائل ہیں جتنی بھی مسلم اقلیتیں ہیں ان کو اس سے سابقہ پڑتا ہے، الیکشن میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے جائز ہے یا ناجائز ہے، اگر جائز ہے تو کن کن صورتوں میں اور کہاں تک گنجائش ہے اور ان مشاکل میں اس کا کیا حل ہے؟، امید ہے کہ انشاء اللہ تعالی ان تمام مسائل کا بہترین جواب اور اسی طرح دوسرے اہم موضوعات بیع الوفاء اور اسلامک بونس جس کو صکوک کہا جاتا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی، انشاء اللہ۔

☆☆☆

علماء اپنی ذمہ داری صحیح طریقہ سے نبھائیں

مفتی ابراہیم بہام (جنوبی افریقہ)

صدر جلسہ، محترم علماء کرام واکابرین عظام!

اتحاد واتفاق کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں، اتحاد واتفاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت میں کوئی اختلاف نہ ہو اور اختلاف رائے نہ ہو، اختلاف رائے پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گا، بقول مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صحیح اختلاف نہ اتحاد میں مانع ہے اور نہ باہمی توقیر واحترام میں، لیکن اگر اختلاف کے صحیح حدود کا لحاظ نہ رکھا گیا تو شاید اس کی تلافی ممکن نہ ہو اور تاریخ ہمیں معاف نہ کرے، ہم جب آج کل نوجوان سے بات کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ علماء کے حدود اختلاف کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے، وہ زیادہ سے زیادہ دین اور علماء سے بیزار اور بدظن ہورہے ہیں، اور علماء دین کے علم بردار ہونے کی وجہ سے اس کی وجہ سے دین سے بھی اللہ معاف کرے، بیزار ہورہے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کا رجحان زیادہ سے زیادہ جدید فکر کے دانشوروں سے وابستہ ہورہا ہے، جو بظاہر ان کے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر علماء لوگوں کو متاثر اور ان کی صحیح قیادت نہیں فرمائیں گے تو لوگ متاثر ہونے کے لیے دوسرے راستے تلاش کریں گے، تو یہ علماء کے اوپر بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔

امام سفیان ثوریؒ کا ایک مقولہ ہے، وہ فرماتے تھے کہ فقیہ تو وہ ہے جو لوگوں کے مسائل کو سلجھاتے اور صحیح تجویز وسلوشن پیش کرتے ہوں، ورنہ یہ بات کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے یہ تو سب کرسکتے ہیں، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ جب جنوبی افریقہ تشریف لائے تو ایک مرتبہ علماء سے مخاطب ہوکر کہا کہ ایک فرد بے عزت ہوجائے تو یہ اتنی بڑی مصیبت اور المیہ کی بات نہیں ہے، لیکن کوئی عالم دین اپنی نسبت کی وجہ سے بے عزت ہوجائے تو یہ ایک بڑی آفت ومصیبت اور المیہ بن جاتی ہے، اس لیے ہمیں بیحد اور حد سے زیادہ مسرت ہے کہ علماء کرام اور اکابرین عظام ہندوستان میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی ماتحتی میں عصر حاضر میں نئے شرعی مسائل پر اجتماعی غور وفکر کا سلسلہ انجام دے رہے ہیں، ہم مندوبین جنوبی افریقہ اور علماء جنوبی افریقہ کی طرف سے اسلامک فقہ اکیڈمی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور وہ واقعی اس کے مستحق ہیں۔

اظہار تشکر

حضرت مولانا عتیق احمد بستوی صاحب[1]

الحمد لله رب العالمین والصلوۃ والسلام علی خاتم النبیین محمد وعلی اله وصحبه اجمعین۔اما بعد

صدر اجلاس، اکابر علماء ونوجوان فضلاء! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کروں، لیکن وقت اتنا گذر چکا ہے اور آپ نے اتنے صبر سے اور بہت دلچسپی سے اس پروگرام کو سنا ہے اور سن رہے ہیں کہ شاید اگر میں شکریہ ادا نہ کروں تو آپ لوگ میرے شکر گذار ہوں گے، اور ابھی شکریہ کا وقت بھی نہیں آیا ہے، اب اصل نشستیں شروع ہوں گی، اس میں مناقشے ہوں گے، گفتگو ہوں گی، جب ساری نشستوں میں ہم اسی طرح بیٹھیں اور حصہ لیں دلچسپی کے ساتھ تب گویا شکریہ کے مستحق ہوں گے، لیکن میں اس وقت ضروری سمجھتا ہوں کہ جو ہمارے مہمان باہر سے آئے ہیں، ترکی، الجزائر اور ساؤتھ افریقہ سے ان کا شکریہ میں ضرور ادا کروں، وہ پتہ نہیں کس نشست میں ہوں اور کس میں نہ ہوں۔

مجھے آپ حضرات سے عرض کرنا ہے، آپ نے جو ارادہ کیا ہے وہ انشاء اللہ کریں گے، یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے، رکاوٹیں ہر کام میں آتی ہیں کچھ مخالفتیں بھی ہوتی ہیں، یہ اگر ہم سوچیں کہ سو فیصد سب لوگ متفق ہوکر کام شروع کریں گے تو اتفاق کے انتظار میں، ہم کام کو ملتوی کرتے رہیں یہ بات صحیح نہیں ہے جو حضرات بھی اس طرح کے کاموں کو مفید سمجھتے ہیں ان کو ساتھ لے کر ہم کام شروع کریں، اگر مخالفت کی آوازیں کہیں ہیں تو ہم اس کو سنیں، تحمل سے کام لیں اس کے خلاف ری ایکشن میں زیادہ نہ آئیں، کوئی بات ہم کہیں تو علمی اور سنجیدہ انداز میں کہیں، اگر آپ اس کام کو شروع کریں گے، اور وہاں رفتہ رفتہ اس کی جڑیں مضبوط ہوں گی تو وہاں کے جو مسائل ہیں انشاء اللہ وہ حل ہوں گے۔

مجھے معلوم ہے کہ ساؤتھ افریقہ میں مسلم پرسنل لا کی منظوری کا موقع تھا مسودہ، قانون ترتیب پایا، مختلف مراحل سے گذرا اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں اس قانون کو، اسلامی قانون اور احوال شخصیہ کو منظور کرادے، صحیح صورت میں اور وہاں وہ نافذ ہوجائے، انشاء اللہ۔

آپ حضرات کی یہ تشریف آوری، اکیڈمی سے رابطہ انشاء اللہ یہ خیر کا ذریعہ بنے گا اور بہت سے نیک کاموں میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ آگے بڑھیں گے، میں یہاں کے اس ادارہ کے ذمہ داران کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے بزرگوں کی جگہ ہے بار بار یہ بات آئی ہے اور ان کے انوار وبرکات ہم محسوس کرتے ہیں، ہم بے حس ہونے کے باوجود محسوس کرتے ہیں کہ اس ادارہ میں اور اس علاقہ میں ان کے انوار وبرکات اور ان کے فیوض جاری ہیں اور عوام کا جو اس ادارے سے تعلق ہے جس طریقہ سے وہ اس ادارے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرتے ہیں، محبت کے ساتھ وہ ہمارے ان بزرگوں کی قربانیوں اور ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے، بہر حال میں ان ہی چند کلمات کے ساتھ اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

☆☆☆

[1] سکریٹری برائے علمی امور (اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا) واستاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا مفتی عفان صاحب

جامعہ قاسمیہ شاہی، مراد آباد

حضرت صدر محترم! اسٹیج پر تشریف فرما نہایت ہی قابل قدر حضرات علماء کرام، مفتیان عظام واکابرین ملت!

سب سے پہلے میں سپاس شکر نذر کرتا ہوں اس رب دوجہاں کی بارگاہ میں جس کی توفیق ازرانی سے ہمیں اس علمی وفقہی کارواں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا اور آپ حضرات جیسے بالغ نظر، مستند، معتبر علماء کرام نیابت حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضے کو انجام دیتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے پرچم تلے اجتماعی طور پر مختلف مسائل میں شرعی نقطہ نظر سے غور وفکر کے لیے اس قدیم ترین دینی درسگاہ کے احاطے میں مجتمع اور اکٹھا ہوئے۔

ثانیاً:...... میں مشکور ہوں ادارے کی جانب سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے حضرات سرپرستان صدر عالی وقار، استاذ گرامی قدر حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی مدظلہ العالی، نائبین صدور حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقوی صاحب دامت برکاتہم، جنرل سکریٹری حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم اور دیگر اراکین مجمع الفقہ الاسلامی کا جنھوں نے ہمارے اس ادارے کو اس عظیم عالمی اور فقہی سمینار کے میزبان کے طور پر قبول فرمایا۔

ثالثاً:...... میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں ان تمام مندوبین کا اور مہمانان کرام جو سفر کی صعوبتوں کو برداشت کر کے یہاں تشریف لائے، اور خاص طور سے ہمارے وہ بزرگ اور معزز مہمانان عظام جو اپنے ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود اپنے نہایت قیمتی وقت کو فارغ فرما کر یہاں تشریف لائے، یقیناً ان حضرات کو سفر میں دشواریاں بھی ہوئی ہوں گی، اور بعض حضرات کو اسٹیشن پر انتظار کی زحمت بھی گوارہ کرنی پڑی ہوگی، میں نہایت شکر گزار ہوں اپنے ان تمام مہمانان اور مندوبین کرام کا جنھوں نے اپنے قدوم میمنت سے اس تاریخی اور قدیم دینی درسگاہ کو مالا مال فرمایا۔

رابعاً:...... میں مشکور ہوں اہلیان شہر کا اور خصوصاً ہمارے اس جامعہ اور اس سمینار کے خصوصی معاونین کا جنھوں نے قدم قدم پر ہمارا تعاون کیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے دل کھول کر رکھ دیا ہے، اللہ ان کو دینی ودنیوی ہمہ جہت ترقیات سے خوب مالا مال فرمائے، ان کی جان ومال اپنے دین متین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے۔

☆☆☆

پہلا باب:......تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ:

بیع الوفاء

۱- بیع وفا کے موضوع پر تمام مقالات، تحریروں اور بحث ومباحثہ کے بعد شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ ہمارے معاشرہ سے باہمی تعاون اور قرض حسنہ کا جذبہ کم اور قرض کی واپسی میں ٹال مٹول کا مزاج بڑھتا جارہا ہے، اس لیے سمینار امت مسلمہ سے اپیل کرتا ہے کہ قرض حسنہ کی جو فضیلت ہے اس کو حاصل کرنے اور قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کی قباحت سے بچنے کی فکر پیدا کی جائے، ساتھ ہی ساتھ شریعت اسلامی سے اس بارے میں جو رہنمائی ملتی ہے اس پر عمل کیا جائے۔

۲- شریعت میں رہن کا مقصد قرض کی وصولیابی کو یقینی بنانا ہے، لہٰذا قرض دہندہ کے لیے مال مرہون سے استفادہ کرنا جائز نہیں، یہ غریبوں کا استحصال اور سودخوری کا ایک ذریعہ ہے۔

۳- اگر قرض دہندہ مال مرہون سے فائدہ اٹھائے تو انتفاع کے بقدر رقم قرض سے منہا ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ اگر قرض کی پوری رقم کے بقدر انتفاع کر چکا ہو تو مال مرہون بغیر کسی مطالبہ کے مقروض کو واپس کرنا واجب ہوگا۔

۴- اگر کوئی شخص سخت ضرورت مند ہو، اس کو نہ قرض حسن ملے اور نہ ہی رہن پر قرض ملے اور وہ نقد رقم حاصل کرنے کے لیے اپنی کوئی چیز کسی کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، جب کہ اس کا ارادہ ہو کہ بعد میں اس کو دوبارہ خرید لے گا تو اس کی گنجائش ہے، البتہ واپس خریداری کا ذکر اس معاملے کے کرنے کے درمیان نہ کیا جائے؛ بلکہ اس سے الگ باہمی معاہدہ ہوجائے کہ خریدار اسے اسی قیمت پر دوبارہ بائع کو فروخت کردے گا تو ایسا کرنا درست ہوگا، اس صورت میں کہ خریدار کے لیے مبیع سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، تاہم اس سے احتیاط کرنا بہتر ہے۔

۵- کسی بھی جائداد- دکان ومکان- کو کرایہ پر لین دین کے لیے ضمانت کے نام سے لی جانے والی رقم شرعاً قرض کے حکم میں ہے۔

۶- قرض کی بنا پر کرایہ میں مروجہ اجرت کے مقابلہ میں غیر معمولی کمی (غبن فاحش) "کل قرض جر نفعا فهو حرام" کے تحت ناجائز ہے۔

سوالنامہ:

بیع وفاء

ضرورت ایجاد کی ماں کہلاتی ہے، ضرورت کی وجہ سے، بہت سی اشیاء وجود میں آتی ہیں اور مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور پیدا کیے جاتے ہیں لوگ حالات کا شکار ہوتے ہیں تو ان حالات سے نمٹنے کے لیے طرح طرح کی شکلیں تجویز کرتے ہیں تا کہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرسکیں جس میں بسا اوقات اس سے صرف نظر ہوتا ہے کہ شرعی حکم کیا ہے اور کبھی اس کی رعایت بھی پیش نظر ہوتی ہے تو واضح طور پر ممنوع و منکر سے بچنا مقصود ہوتا ہے۔

خرید وفروخت کے باب میں "بیع وفاء" بھی ضرورت وحالات کے تحت اختیار کی جانے والی ایک شکل ہے جس کو کھلے طور پر سودی معاملات سے بچنے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا اور زمان ومکان کے فرق کے اعتبار سے اس میں وسعت وکثرت اور تنوع بہت پایا جاتا رہا اور پایا جاتا ہے، ہندوستان کے بعض خطوں میں اس کا کافی رواج پایا جاتا ہے، اسی لیے مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) نے اپنے آئندہ سیمینار کے موضوعات میں اس کو بحث میں شامل کیا ہے تا کہ اس بابت تحقیق ومذاکرہ کے بعد امت کی رہنمائی کے لیے کوئی مناسب راہ تجویز کی جاسکے۔

بیع وفا کی بنیادی شکل یہ ہے کہ ایک آدمی ضرورتمند ہوتا ہے، غیر سودی قرض ملتا نہیں اور سودی قرض لینا نہیں چاہتا تو وہ اپنے کسی سامان (زمین وجائیداد وغیرہ) کا سودا یوں کرتا ہے کہ تم اتنی قیمت میں اس کو لے لو اور اتنی مدت کے بعد یا جب بھی میں اس قیمت کو واپس کرنے کے حال میں ہوں تو یہ سامان تم مجھ کو اسی قیمت پر دیدینا کسی دوسرے کو مت بیچنا۔

معاملہ یہ ہے کہ خرید وفروخت سے بیچی جانے والی شے بیچنے والے کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور خریدنے والا اس کا مکمل مالک بن جاتا ہے اور خرید کردہ شئے میں اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ کچھ بھی کرے بیچے، ہبہ کرے، کرایہ پر دے وغیرہ اور فروخت کردہ شئے سے سابق مالک وفروخت کنندہ کا کوئی واسطہ نہیں رہ جاتا، بیع وفا کا معاملہ اس سلسلہ میں اس سے مختلف ہے، تو اس بیع کی شرعی حیثیت اور اس کا حکم کیا ہے؟

(۱) یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید وبند کے ساتھ ہوتا ہے شرعا منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر شرعا منعقد اور درست ہے تو حکما یہ بیع ہے یا نہیں۔

(الف)...... بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

(ب)...... مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

(ج)...... خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

(د)...... خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

(۲) اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو

(الف)...... جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟۔

(ب)...... اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟۔

(ج)...... اس عرصہ میں خریدار اس شئے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟

(د)...... خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

(۳) آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے، تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہیے لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپے کرایہ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے؛ کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لیے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت ورہن کی، اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

بیع وفاء، موجودہ معاشی تناظر میں

تعارف وتجزیہ

مفتی احمد نادر القاسمی [رفیق شعبہ علمی امور، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)]

آج کی تیز رفتار ترقی اور نت نئی تبدیلیوں نے انسانی سماج میں جہاں حصول زر کے بے شمار طریقوں کو جنم دیا ہے، وہیں حصول معاش کی راہ میں بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں ہیں، بالخصوص مسلمانوں کے لیے، کیونکہ دنیا کی دوسری قوموں کے یہاں تو جائز وناجائز کا کوئی تصور نہیں ہے، ان کے پیش نظر صرف منافع کا حصول ہوتا ہے، اس لیے ان کو تو کوئی پریشانی نہیں، مشکلات اور پریشانیاں تو مسلمانوں کو ہوتی ہیں، اور بدقسمتی یہ ہے کہ دنیا کے سارے بینکوں اور معیشت وتجارت اور کاروبار کے ضوابط وشرائط مقرر کرنے کی کلید اس وقت بین الاقوامی سطح پر غیر مسلموں کے ہی ہاتھوں میں ہے، بزنس اور تجارت کے طریقوں کی ایجادات اور دولت کی تقسیم کے سارے معیار اور پیمانے بھی وہی طے کرتے ہیں۔

اب معاش ومعاد کی اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے دو چیلنجز در پیش ہیں:

ایک یہ کہ ان کو شریعت کے طے کردہ خطوط کی پاسداری کرنی ہے، اور دوسرے یہ کہ موجودہ پیچیدگیوں کے تناظر میں وسائل زندگی کی حصول یابی کو یقینی بنانا ہے، اور اسی معاشی دنیا میں جس میں کے بے شمار قباحتیں شرعی تناظر میں پائی جاتی ہیں، جینے کی راہ تلاش کرنی ہے اور یہ مسلم ہے کہ:

"مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند"

اب اس صورت حال میں اگر کوئی ایسی شکل سامنے آجاتی ہے جس میں اسلامی بنیادوں پر سرمایہ کاری اور منافع کا حصول ممکن ہو تو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور اس کی عملی صورت دنیا کے سامنے پیش کرنا ہماری اہم دینی ذمہ داری ہے:

"فإذا قضيت الصلاة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله واذكروا الله كثيرا لعلكم تفلحون" (سورہ جمعہ:۱۰)۔

(پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو اور اللہ کو خوب یاد کرو تو فلاح پا جاؤ گے)۔

اسی کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے "بیع وفاء" سے متعلق سوالنامہ مرتب کر کے ملک وبیرون ملک کے ارباب افتاء، علماء، فقہاء اور ماہرین معاشیات کے پاس بھیجا، اور اس سوالنامہ کی روشنی میں جو جوابات، مقالات وآراء کی شکل میں تحریریں اور مباحث تادم تحریر اکیڈمی کو موصول ہوئے ان کی تلخیص، دلائل اور تجزیہ یہاں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے "وماذلک علی اللہ بعزیز"۔

"بیع وفاء" کی اصطلاح:

بیع وفاء سے متعلق حضرات مقالہ نگار کی آراء پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیع کن کن ناموں سے اسلامی تجارہ اور فقہ اسلامی میں مشہور اور جانی جاتی ہے، اس کی تفصیلات بھی قارئین کے سامنے ہوں، غرض فقہی کتابوں میں تلاش وجستجو سے یہاں تک رسائی ممکن ہو سکی ہے کہ فقہ اسلامی اور چاروں دبستان فقہ میں اس بیع کو تیرہ ناموں سے موسوم کیا گیا ہے جو یہ ہیں:

۱-بیع وفاء، ۲-بیع الإطاعہ، ۳-بیع الطاعہ، ۴-بیع المعاد، ۵-بیع البدلین (مبادلۃ المال بالمال)، ۶-بیع الأمانہ، ۷-بیع العہدۃ، ۸-بیع الثنیا، ۹-الرھن المعاد، ۱۰-بیع المعاملہ، ۱۱-بیع الجائز، ۱۲-الرھن الحیازی، ۱۳-بیع الناس۔

بیع وفاء کی حقیقت:

"بیع وفاء جس کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا سامان کسی کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرے کہ خریدار ایک متعین مدت کے بعد اتنی ہی قیمت میں یا اس سے

بڑھا کر دوبارہ فروخت کنندہ ہی کے ہاتھ فروخت کردے، یا بائع پوری رقم واپس کر کے مبیع اپنے قبضہ میں لے لے (تفصیلات وحوالہ جات آگے مقالات میں آرہے ہیں)، اس سے متعلق کل ۹۷ مقالات تلخیص کرتے وقت راقم ملخص کو موصول ہوئے، یہ مقالات سوالنامہ کے کل ۳ مرکزی سوالات اور ۷ ذیلی (الف بائی) اجزاء، جن کو مستقل سوال بھی کہا جاسکتا ہے، کے جوابات پر مشتمل ہیں اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرات علماء کے آراء کی تفصیلات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سوالنامہ کا پہلا سوال یہ ہے:

سوال نمبر ۱: یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعا منعقد اور درست ہے یا نہیں، اگر شرعا درست ہے، تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

اس بارے میں مقالہ نگاروں کے درمیان دونوں طرح کی رائے پائی جاتی ہے، یہ بیع بھی ہے اور رہن بھی، منعقد بھی ہے، مشروط بھی ہے، فاسد بھی ہے، اور مشروط، فاسد، رہن وغیرہ تمام معاملات سے مرکب عقد بھی ہے، ان اختلافی آراء اور اہل علم کے درمیان پائے جانے والے مختلف نظریات کی روشنی میں، اگر بیع ہے تو پھر مشتری کو اس سے فائدہ اٹھانے کے تمام اختیارات ہوتے ہیں، اور بائع ہی کو فروخت کرنے والی شرط صرف وعدہ ہے، اور وعدہ پورا کرنا ایک مومن کی حیثیت سے لازم ہے، نہیں کرتا ہے، تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

اس پہلے سوال کے جواب میں ۴۳ مقالہ نگار حضرات نے "بیع وفاء" کو منعقد اور حکماً بیع قرار دیا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا محمد فاروق، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا روح الامین، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا غلام اللہ کاوی، مولانا حفیظ الرحمن خیر آبادی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا عمران ندوی، مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی خالد حسین نیموی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ میر کشمیری، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مراد آباد)، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبد الشکور قاسمی، مولانا عبد الخالق رامپور، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی عبد الرزاق قاسمی (امروہہ)، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی (بڑودہ) مولانا عبد التواب اناوی، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (مئو)، مفتی رجیب قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی محمد زاہد، مفتی محمد مقصود فرقانی اور مولانا یوسف علی (کریم گنج)۔

نیز یہ کہ مذکورہ مقالہ نگاران ہی میں سے کچھ حضرات نے اس بیع کو بیع فاسد قرار دینے کے باوجود مفید ملک مانا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبد الشکور قاسمی۔

جبکہ مندرجہ ذیل حضرات نے ضرورت وحاجت، نیز تعامل وعرف اور استحسان کی وجہ سے مطلقاً اس معاملہ کو بیع اور درست قرار دیا ہے:

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی دیولوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مراد آباد)، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا عبد الخالق رامپور، مفتی عبد الرزاق، سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا عبد التواب اناوی، مفتی محمد شاہد قاسمی (امروہہ)، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی سعید الرحمن قاسمی۔

اور مفتی عبد الرحیم قاسمی صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ بیع میں شرط لگانا تقاضائے بیع اور اصول کے خلاف ہے، اس لیے یہ بیع درست نہیں ہے، اور مفتی راشد حسین صاحب کی رائے میں یہ بیع اور رہن کا مجموعہ ہے، اور مفتی شیر علی گجراتی نے بیع وفاء کو بیع مکرہ کے مشابہ قرار دیا ہے۔

(دیکھئے مقالہ: مفتی راشد حسین ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی اور مفتی شیر علی گجراتی)۔

مذکورہ حضرات کے علاوہ ۲۹ مقالہ نگاران اس بیع کو سرے سے رہن ہی قرار دیتے، اور رہن کے ہی احکام جاری کرنے کا عندیہ پیش کرتے ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی جنید بن محمد، مفتی عبد الرشید قاسمی کانپور، مفتی عادل خاں ندوی، مفتی عبد القیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی عبد اللطیف پالنپوری، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی اشرف عباس قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبد الحی مفتاحی، مولانا

محمد صادق مبارکپوری، مولانا حذیفہ لوناواڑہ، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا زین العابدین کیرالا، مفتی جنید عالم ندوی، قاسمی، مفتی محمد یوسف جودھپوری۔

مجوزین کے دلائل:

''وجوّز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما'' (شامی ۷/۵۴۶) (مولانا محمد فاروق)، نیز موصوف اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں کہ ضرورت اور حاجت ناس کی وجہ سے مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ، مشائخ بخاری اور امام نجم الدین نسفی اور صاحب نہایہ وغیرہم کے فتوی کے مطابق اس زمانہ میں بیع وفاء کے جواز پر فتوی دینا اولی اور انسب ہوگا، (بحوالہ ایضاح النوادر ر ۳۷ مؤلفہ مفتی شبیر احمد قاسمی مرآباد، دیکھئے: مقالہ مولانا محمد فاروق)۔

☆ ''يسرا ولا تعسرا'' (حديث عن معاذ بن جبل)۔

☆ ''الدين يسر'' (سنن نسائي رقم الحديث: ۵۰۳۴)۔

☆ ''صاحب المنظومة أنه قال: اتفق مشائخ الزمان على صحة هذا البيع؛ لأنهما تلفظا بلفظ البيع ولاعبرة بمجرد النية بلا لفظ. فإن من تزوج امرأة بنية أن يطلقها إذا مضى سنة لا يكون متعة'' (فتاوی بزازیہ ۱/۲۵۱ طبع جدید)

☆ ''ومن مشائخ سمر قند من جعله بيعا جائزا مفيدا لبعض أحكامه منهم نجم الدين نسفي فقال: اتفق مشائخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا لبعض أحكامه، وهو الانتفاع به، دون البعض''
(تبیین الحقائق للزیلعی ۶/۲۳۷)۔

☆ ''وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل، وجوز الاستصناع لذلك''
(تبیین الحقائق ۶/۲۳۷، مقالہ مولانا محمد فاروق سورت)۔

☆ ''الضرورات تبيح المحظورات'' (دیکھئے مقالہ: مفتی شیر علی گجراتی)۔

☆ ''ولو بعده على وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح'' (درمختار ۴/۲۷۵) (دیکھئے مقالہ: مفتی جمیل احمد نذیری)۔

☆ ''وما ضاق على الناس أمر إلا اتسع حكمه'' (درمختار)۔

☆ ''الصحيح أنه ان وقع بلفظ البيع لا يكون رهنا، وإن ذكر البيع بلا شرط، ثم شرطاه على وجه المعاودة جاز البيع، ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فرارا من الربا'' (البحر الرائق ۶/۱۲، الفتاوی الهندیہ ۳/۲۰۹)
(تفصیل کے لیے دیکھئے مقالات: مولانا خورشید احمد اعظمی، محمد شکیل اسلام پوری، مفتی انور علی اعظمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد زاہد امروہہ، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودہ)۔

☆ ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة، ومن هذا القبيل تجويز البيع الوفاء حيث أنه لما كثرت الديون على أهل بخارى مست الضرورة إلى ذلك وصار مرعيا'' (مجلة الاحكام العدلية المقالة الثانية اعادة: ۳۲)
(دیکھیے مقالات: مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہہ، مفتی حذیفہ محمود لوناواڑہ)۔

☆ ''قال صاحب النهاية: وعليه الفتوى'' (تبیین الحقائق ۵/۱۸۳)۔

شیخ ڈاکٹر محروس المدرس نے عراقی قانونی دفعات کے حوالہ سے اس معاملہ (بیع وفاء) کو ''الرهن الحيازي'' کا نام دیا ہے، اور تفصیلات لکھنے کے بعد وہ فرماتے ہیں: ''لكن مشائخ بلخ استحسنوا ذلك، فأخذوه لتعامل الناس به، وبه تأخذ'' اس کے بعد بیع وفا کو جائز قرار دینے والے علماء و مشائخ کے اقوال و دلائل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

☆ ''ويكون الأخذ به أولى، فجاز الأخذ ببيع الوفاء لتعارف بعض البلاد بذلك، وبه أخذ الكثير''
(دیکھئے: موصوف کے عربی مقالہ کا ترجمہ)۔

گویا حضرت موصوف بھی بیع وفا کے لوگوں کے عرف و تعامل کی وجہ سے جواز کے قائل ہیں۔

بیع وفا کو رہن قرار دینے والے حضرات کے دلائل:

جن مقالہ نگار حضرات نے بیع وفاء کو سرے سے رہن ہی قرار دیا ہے ان کے دلائل وشواہد اور تائیدات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ ''نهى رسول الله ﷺ عن بيع و شرط'' (رواہ الطبرانی فی المعجم الوسیط، نصب الرایہ ۴/ ۱۷)۔

☆ ''عن النبى ﷺ: لا ترتكبوا ماء ارتكبت اليهود وتستحلوا محارم الله بأدنى الحيل'' (اغاثة اللهفان ۱/ ۳۳۲)۔

☆ ''عن النبى ﷺ: قاتل الله اليهود حرمت عليهم الشحوم فجملوها فباعوها'' (حوالہ سابق)۔

☆ ''عن النبى ﷺ: يأتى على الناس زمان يستحلون الربا باسم البيع'' (ایضا حوالہ مذکور) (دیکھئے مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)

☆ ''البيع الذى تعارفه أہل زماننا احتيالا للربا وسموه بالوفاء ہو رہن فى الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكه وهو ضامن لما أكل من ثمره، وأتلف من شجره، ويسقط الدين بهلاكه، ... لا فرق عندنا بينه وبين الرهن فى حكم من الأحكام'' (شامی ۴/ ۲۴۶)۔

☆ ''إن العبرة فى العقود للمقاصد و المعانى، لا للالفاظ والمبانى'' (شرح القواعد الفقہیہ قاعدہ: ۵۵)۔

☆ ''قال فى الخيرية: والذى عليه الأكثر أنه رہن لا يفترق عن الرهن فى حكم من الأحكام، قال السيد: قلت للإمام الحسن الماتريدى: قد فشأ ہذا البيع بين الناس، وفيه مفسدة عظيمة، وفتواك أنه رہن، وأنا أيضا على ذلك، والصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على ہذا ونظهر بين الناس، فقال: المعتبر اليوم فتوانا، وقد ظهر ذالك بين الناس، فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم دليله'' (شامی ۴/ ۲۴۶) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہد علی قاسمی، حیدرآباد، مفتی حذیفہ محمود)۔

☆ ''حكمه حكم الرهن لا يملكه المشترى'' (فتاوی ہندیہ ۲/ ۱۶۴)۔

☆ ''لأن صاحب المال لا يقرض إلا بنفع، والمستقرض محتاج، فأجازوا ذلك لينتفع المقرض بالمبيع وتعارفه الناس، لكنه مخالف للنهى عن بيع و شرط، فلذا رجحوا كونه رہنا'' (ردالمحتار ۷/ ۵۵۱) (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ''حكمه حكم الرهن فى أرجح الأقوال عندنا'' (فقہ السنہ لسید سابق ۱/ ۹۰) (دیکھئے مقالہ: مولانا کلیم اللہ عمری)۔

ان دلائل کے علاوہ مذکورہ حضرات میں سے بعض مقالہ نگاران نے ماضی قریب کے اصحاب افتاء کے فتاوی بھی نقل کیے ہیں، جن میں بیع وفاء اور رہن کی تفصیلات پر بحث کی گئی ہے۔

بیع وفاء کو بیع فاسد قرار دینے والے کے دلائل:

☆ ''بيع المعاملة و بيع الوفاء واحد، وإنه بيع فاسد، لأنه بيع لا يقتضيه العقد، وأنه يفيد الملك عند اتصال القبض به، كسائر البيوع الفاسدة'' (فتاوی سراجیہ علی ہامش فتاوی قاضی خاں ۳/ ۱۶۲) (دیکھئے مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

☆ ''قبض المشترى المبيع فى البيع الفاسد بأمر البائع، وكل من غويضه مال ملك المبيع بقيمته'' (کنز الدقائق)۔

☆ ''أن بيع العهدة المذكور لا أعرف حقيقة على التعيين والقول الفصل فيه أن البيع إن اقترن به شرط فاسد كأن يقول له بعتك هٰذا بعشرة؛ فإذا رددتها إليك رددته إلىّ ... كان فاسدا، فلا ينتقل الملك فى المبيع عن مالكه ولا فى الثمن عن مالكه، بل هما باقيان على ما كان عليه''۔

(الفتاوی الفقہیۃ الکبری ۲/ ۱۵۷) (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد یار علی نعمانی)۔

☆ ''شرط الثنيا يفسد البيع ولو اسقط، ويعتبر عنها فى مصر بالبيع المعاد'' (شرح الزرقانی علی مختصر خلیل ۵/ ۱۵۵)۔

☆ ''مذهب المالكية والحنابلة والمتقدمون من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء فاسد، لأن اشتراط البائع أخذ المبيع إذا رد الثمن إلى المشترى يخالف مقتضى البيع... وأيضا يقصد من ورائه الوصول إلى الربا المحرم وهو اعطاء المال إلى أجل ومنفعة المبيع هى الربح، والربا باطل فى جميع حالاته'' (موسوعہ فقہیہ مادہ: بیع الوفاء)

(دیکھیے مقالہ: مفتی روح اللہ قاسمی، نیز مزید تفصیل کے لیے دیکھئے مقالات: مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عبد الشکور قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا محمد یار علی

نعمانی، مفتی شیر علی گجراتی وغیرہ)۔

ان تمام ہی حضرات نے علماء کے مزید وہ اقوال بھی نقل کیے ہیں جن میں رہن، فساد، اور صحت بیع کی بات کہی گئی ہے۔

۲- الف: ......سوال: بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں ۴۳ مقالہ نگار حضرات نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ بیع مکمل ہونے کے بعد اگر بائع اور مشتری کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اس بیع کو بائع ہی کے ہاتھ مشتری فروخت کرے، دوسرے کے ہاتھ نہ بیچے تو اس کی حیثیت وعدہ کی ہوگی جس کو مشتری کے لیے پورا کرنا، بعض حضرات کے نزدیک اخلاقاً، بعض کے نزدیک دیانۃً اور بعض کے نزدیک قضاءً و قانوناً اور بائع کے مضطر ہونے کی وجہ سے واجب ہوگا۔

اس موقف کو اختیار کرنے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی اشرف قاسمی، مولانا غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا محمد فاروق، مولانا حفیظ الرحمن خیر آبادی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی ارشاد دساوا، محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی شبیر احمد قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا مغفور باندوی، مفتی خالد حسین نیموی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا عظمت اللہ میر، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی جنید بن محمد، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا محمد صادق مبا کپوری، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودہ، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی رجیب قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

دلائل:

مذکورہ بالا حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں قرآنی آیات، احادیث اور فقہاء کی مندرجہ ذیل عبارات پیش کی ہیں:

☆ "وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (سورۂ اسرا: ۳۴) (دیکھئے مقالات: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی)۔

☆ ''عن زيد بن أرقم عن النبي ﷺ قال: إذا وعد الرجل أخاه ومن نيته أن يفي له، فلم يف ولم يجي للميعاد، فلا إثم عليه، قال الاشرف: هذا دليل على أن النية الصالحة يثاب الرجل عليها، وإن لم يقترن معها المنوى وتختلف عنها، ومفهومه أن من وعد وليس من نيته أن يفي ولم يف، فعليه الإثم سواء وفى به، أو لم يف، فإنه من أخلاق المنافقين ولا تعرض فيه لمن وعد ونيته أن يفي فلم يف بغير عذر'' (مرقاۃ المفاتیح ۶۱۵/۸، کتاب الآداب باب الوعد، الفصل الثانی، وفیض القدیر ۸۹۱/۲، رقم الحدیث ۷۹۴) (دیکھئے مقالہ: مولانا غلام اللہ کاوی)۔

☆ ''عن النبي ﷺ: المؤمنون عند شروطهم إلا شرطا أحل حراما وحرم حلالا'' (جامع الصحيح للبخاري) (دیکھئے مقالہ: محمد شکیل اسلام پوری)۔

☆ ''عن النبي ﷺ: العدة دين، فيجعل هذا الميعاد لازما لحاجة الناس''
(زیلعی ۱۸۴/۵، بحوالہ فتاوی محمودیہ ۲۸۰/۲۴) (دیکھئے مقالہ: مولانا حفیظ الرحمن مدنی خیر آبادی)۔

☆ ''عن النبي ﷺ. المؤمن إذا وعد وفا'' (حديث:)۔

☆ ''وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزم الوفاء بالوعد، كذا في فتاوى قاضي خان'' (الہندیہ ۲۰۹/۳)۔

☆ ''وفي الدر المختار: ولو بعده على وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح، كما في الكافي والخانية'' (۵۴۷/۷، اس قسم کی فقہاء کی عبارتوں کے لیے مزید دیکھئے مقالات: مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد عفان

منصور پوری، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی عبدالتواب اناوی، مفتی جمیل احمد نذیری، محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی اور مفتی سعید الرحمن قاسمی پٹنہ وغیرہ)

اس مسئلہ میں عام طور سے مقالہ نگار نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر وعدہ خلافی کرتا ہے تو گنہگار ہوگا، البتہ مفتی ارشاد دساوا اور مفتی جنید عالم ندوی قاسمی صاحبان نے اپنے مقالہ میں یہ تفصیل لکھی ہے کہ اگر کسی مجبوری یا کسی مصلحت کی وجہ سے واپس نہ کرے تو گنہگار نہ ہوگا، بلکہ گنہگار اس وقت ہوگا جبکہ وعدہ کرتے وقت ہی وعدہ کو پورا کرنے کی نیت نہ ہو (دیکھئے مقالہ مفتی جنید عالم قاسمی) اور مفتی ارشاد دساوا لکھتے ہیں: اگر مشتری کو اس کی ضرورت ہو یا کسی مصلحت کی بنا پر واپسی میں دشواری ہو تو...... گنہگار بھی نہ ہوگا (دیکھئے: مقالہ موصوف)۔

شرط فاسد ہے اور مقتضائے عقد کے خلاف ہے:

اس سوال ۲ (ا/الف) کے جواب میں دوسرے مقالہ نگاران کا موقف یہ ہے کہ بیع وفاء میں بائع کی طرف سے مبیع کو اسی کے ہاتھ فروخت کرنے کی شرط، شرط فاسد اور مقتضائے عقد کے خلاف ہے، اور بعض حضرات انہیں میں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ جب معاملہ سرے سے رہن ہی ہے، تو پھر اس شرط کا کوئی معنی اور مفہوم نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں رہن یا مبیع تو خود بخود بائع یا راہن کے پاس واپس جائے گی ہی تو اس کے لیے شرط لگائے، یا نہ لگائے کوئی فائدہ نہیں، اس لیے یہ شرط لغو ہے، اور مشتری کے لیے واجب الایفا نہیں ہے، اس رائے کے حامل مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور، مولانا محمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ارتقاء الحسن قاسمی، محمد یار علی نعمانی، مولانا حذیفہ محمود لوناواڑہ، مولانا عبیداللہ ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا عبدالخالق (رامپور) مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی، مولانا زین العابدین کیرالا، مفتی محمد یوسف قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد زاہد، مولانا محمد کلیم اللہ عمری، مولانا عبدالشکور قاسمی۔

دلائل:......ان حضرات نے اس کے لیے چند دلائل بھی ذکر کیے ہیں جو اس طرح ہیں:

☆ ''نهى رسول الله ﷺ عن بيع و شرط'' (اعلاء السنن ۱۴۶/۴، حدیث نمبر ۴۶۶۶)۔

☆ ''عن النبي ﷺ: لا يحل سلف و بيع وشرطان في بيع'' (ترمذی، عن عبداللہ بن عمرو، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراھیۃ بیع مالیس عندک ۱/۱۴۸، رقم: ۱۲۳۴) (دیکھئے مقالات: مفتی شاہد علی قاسمی حیدرآباد، مولانا محمد حذیفہ محمود لوناواڑہ، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

☆ ''فمذهب المالكية والحنابلة والمتقدمين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء فاسد، لأن اشتراط البائع أخذ المبيع إذا رد الثمن إلى المشتري يخالف مقتضى البيع وحكمه'' (موسوعہ فقہیہ ۲۶۰/۹) (ماخوذ از مقالہ مفتی شاہد علی قاسمی)

☆ ''ولا بيع بشرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما'' (ردالمحتار ۲۸۱/۷)

(تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ''ولأن البيع على هذا الوجه لا يقصد منه حقيقة البيع بشرط الوفاء، وإنما يقصد من ورائه الوصول إلى الربا المحرم... والربا باطل جميع حالاته'' (موسوعہ فقہیہ ۲۶۰/۹)۔

☆ ''وخرج المبيع من أن يكون معتحق الرد على البائع لحصول البيع من المشتري، بتسليطه، وكذلك لو رهنه المشتري بطل حق الفسخ وولاية الاسترداد'' (بدائع الصنائع وکذا فی الدرالمختار ۲۹۲/۷، ۲۹۴)۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے مقالات: مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی حذیفہ محمود لوناواڑہ، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ)۔

جبکہ بائع کی طرف مبیع کی واپسی کی شرط کے سلسلہ میں مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور، مفتی عادل خاں، مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا یار علی نعمانی، مفتی یاسر قاسمی، مولانا عبدالحی مفتاحی، مولانا قمر الزماں ندوی نے بیع وفا اور رہن کی تفصیلات اور فقہاء کے اقوال نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے، اپنی کوئی رائے واضح نہیں کی ہے کہ مشتری کا یہ شرط لگانا کیا حیثیت رکھتا ہے اور وہ شرائط واجب الایفاء ہیں یا نہیں۔

سوال نمبر ا (ا/ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ۳۸ حضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ بائع اول سے بیچنے کی صورت میں سابقہ قیمت ہی لازم ہوگی، مشتری زائد کا مطالبہ نہیں کرسکتا، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا محمد فاروق، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی جنید بن محمد، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور، مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مولانا

محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی خیر آبادی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی خالد حسین نیموی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ میر کشمیری، مفتی شیر علی گجراتی، قاضی وصی احمد قاسمی (پٹنہ)، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی یاسر قاسمی، مفتی اشرف عباس قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی (امروہہ) مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا محمد جعفر ملی۔

دلائل:......مذکورہ حضرات نے اس زیادتی کو ربا اور قرض سے نفع اٹھانا قرار دیا ہے، اور اس سلسلہ کی وہ آیات جو ربا کی حرمت کے سلسلہ میں وارد ہیں ان سے استدلال کیا ہے، اور فقہاء کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں، مثلاً:

☆ ''أحل البيع وحرم الربا'' (سورۂ بقرہ: ۲۷۵)۔

☆ ''وذروا ما بقي من الربا'' (سورۂ بقرہ: ۲۷۸)۔

☆ ''كل قرض جر نفعا فهو ربا'' (منصف ابن ابي شيبه، رقم الحديث: ۲۱۰۷۸)۔

☆ ''أما الذي يرجع إلى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جر منفعة'' (بدائع ۵۱۸/۶)۔

☆ ''لا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له في الربا، لأنه يستوفى دينه كاملا، فتبقى له المنفعة فضلا، فيكون ربا'' (درمختار مع الرش ۸۳/۱، وكذا في ملتقى الأبحر، كتاب الرهن ۲۳۷/۴، والهداية ۵۲۲/۴) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد یوسف قاسمی جودھپور)۔

☆ ''كل قرض جر نفعا حرام، فكره للمرتهن سكنى المرهونة بإذن الراهن'' (درمختار فصل في القرض ۱۹۴/۴ رشیدیہ کوئٹہ) (مولانا صادق مبارکپوری)۔

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ معاملہ حکماً بیع ہے اور اس معاملہ کو جب بیع قرار دے دیا گیا تو مشتری کو اختیار ہے کہ چاہے تو مشتری سابقہ قیمت ہی پر بائع اول کو بیع واپس کردے، یا چاہے تو اس پر اضافی قیمت لے، البتہ بعض حضرات اس مسئلہ میں اس کی قید لگاتے ہیں کہ اگر بائع اول سے فروخت کرے تو اخلاقاً سابقہ قیمت ہی لے، اس سے زائد کا مطالبہ نہ کرے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا روح الامین، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عمران ندوی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت ممبئی، مفتی سعید الرحمن قاسمی (پٹنہ)، مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مرادآباد)، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا عبدالخالق (رامپور)، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی عفان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود لوناواڑہ، مفتی محمد زاہد (گڑھی سلیم پور) مفتی روح اللہ قاسمی (مدھوبنی) مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی۔

یہ حضرات چونکہ بیع وفاء کے معاملہ کو بیع قرار دیتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک جس طرح عام خرید وفروخت میں منافع مباح ہے، اسی طرح یہاں بھی مشتری کے لیے منافع مباح ہے، اور دلائل عام طور سے فقہاء کی: ''الصحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهنا... الخ'' یا اس سے ملتی جلتی عبارت ذکر کی ہے، مسئلہ چونکہ واضح ہے، اس لیے یہاں فقہاء کی عبارتوں کو چھوڑا جاتا ہے (دلائل اور عبارات کے لیے مقالات کا مطالعہ مفید رہے گا)۔

سوال نمبر (۱رج): خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

مشتری کے لیے مبیع سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل ۴۸ مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ مبیع چونکہ مشتری کے قبضہ میں ہے، اس لیے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، نیز مجوزین میں بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ راہن کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، اور بعض کے خیال میں مبیع کی مالیت کے بقدر ہی فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے:

مفتی جنید بن محمد، مفتی عبدالرشید قاسمی (کانپور)، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی اشرف قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا عمران ندوی، مولانا یوسف علی، محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، محمد شکیل اسلامپوری، مولانا خالد حسین نیموی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ میر، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی اشرف عباس قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالخالق رامپور، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی عبدالرزاق قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی محمد ارشاد دساوا، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی امروہہ، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

دلائل وشواہد:

مندرجہ ذیل فقہی عبارات اس کے جواز میں مختلف حضرات نے پیش کیے ہیں:

☆ ''قال رسول اللہ ﷺ: الظهر يركب إذا كان مرهونا، وليس الدريشرب إذاكان مرهونا، وعلى الذى يركب و يشرب نفقته، هذا حديث حسن صحيح... وفيه حجة لمن قال: يجوز لمرتهنا لانتفاع بالرهن إذا قام بمصلحته، ولولم باذن المالك'' (تحفۃ الاحوذی ۴/۲۰ ۴باب الانتفاع بالرہن) (مقالہ مولانا ابرار خاں ندوی)۔

☆ ''أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكام... من حل الانتفاع به'' (شامی ۵/۲۷۷)۔

☆ ''صحيح فى بعض الأحكام كحل الانزل ومنافع البيع'' (ہندیہ ۴/۴۰۹)۔

☆ ''وذكر الزيلعى أن الفتوى على أنه بيع لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغى'' (البحر الرائق ۶/۱۲)۔

☆ ''ولعله بنى على أنه بيع صحيح لحاجة التخلص من الربا حتى يسوغ للمشترى أكل ريعه'' -()

☆ ''ومنها أن هذا الملك يفيد المشترى انطلاق تصرف ليس فيه انتفاع بعين الملك بلا خلاف بين أصحابنا كالبيع والهبة والصدقة والاعتاق والتدبيروالكتابة والرهن والإجارة ونحوذ لك مما ليس فيه انتفاع بعين المبيع'' (بدائع ۴/۵۹۰) (ماخوذ از مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

البتہ مبیع سے فائدہ اٹھانے کے مسئلہ میں مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور کی رائے یہ ہے کہ صرف ادا کردہ قیمت کے بعد اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب کی رائے یہ ہے کہ اس کے عین سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، مولانا یوسف علی کے خیال میں بیع سے قضاءً فائدہ اٹھانا جائز ہے، دیانۃً نہیں، مفتی حذیفہ لوناواڑا کے خیال میں رہائش، بار برداری، وغیرہ کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں، البتہ خرید وفروخت اور رہن کا معاملہ کرنا جائز ہے (دیکھئے: مذکورہ حضرات کے مقالات)۔

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں ۱۵ حضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ مشتری کے لیے مبیع سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، ان میں سے بعض اس مبیع کو امانت قرار دیتے ہیں اور بعض مال مرہون سے انتفاع کی ممانعت والے قول کی وجہ سے مشتری کو فائدہ کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ اس صورت میں مشتری کو حق ملکیت حاصل نہیں ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا محمد اعظمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا ارتقاء الحسن قاسمی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبیداللہ ندوی، مفتی یوسف قاسمی جودھپوری، مولانا ابرار خاں ندوی۔

دلائل:......ان حضرات نے عام طور سے فقہاء کی ذیل کی عبارتوں سے استیناد کیا ہے:

☆ ''أما التصرف الذى فيه انتفاع بعين المملوك كأكل الطعام ولبس الثوب، وركوب الدابة، وسكنى الدار، والاستمتاع بالجارية والصحيح أنه لا يحل، لأن الثابت بهذا البيع ملك خبيث، والملك الخبيث لا يفيد

اطلاق الانتفاع، لأنه واجب الرفع'' (بدائع الصنائع ۴/ ۵۹۰) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ''وزوائد المبیع وفاءً کزوائد المبیع فاسدا، فیضمنه وفاقا ویضمنها بالتعدی لا بدونه، کزوائد الغصب'' (جامع الفصولین ۱/ ۱۴۰) (مقالہ: مولانا محمد یار علی نعمانی)۔

☆ ''کل قرض جر نفعا فهو ربا'' (الجامع الصغیر للسیوطی ۲/ ۲۸۴)۔

☆ ''ولا یحل له أن ینتفع بشئ منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن، لأنه أذن في الربا'' (رد المحتار کتاب الرهن) (دیکھئے مقالہ: مفتی سلمان پالنپوری)۔

☆ ''ولا ینتفع المرتهن استخداما وسکنی ولبسًا وإجارة وإعارة، لأن الرهن یقتضی الحبس إلی أن یستوفی دینه دون الانتفاع'' (البحر الرائق کتاب الرهن ۶/ ۴۳۸ طبع رشیدیه کوئٹه)۔

☆ ''قلت: وهذا مخالف لعامة المعتبرات من أنه یحل بالإذن'' (شامی ۷/ ۵۱۰) (دیکھئے مقالہ: ابرار خاں ندوی)۔

سوال نمبر (۱رد): خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں ۴۵ مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ مشتری بیع وفاء میں- جو صورۃً اور ظاہراً بیع ہے اور حقیقۃً رہن ہے- مبیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے، مانعین میں سے بعض حضرات نے اس کی بھی قید لگائی ہے کہ خرید وفروخت کا یہ معاملہ بائع کی اجازت پر موقوف ومعلق رہے گا، جس کا مفہوم بھی یہی نکلتا ہے کہ مشتری خرید وفروخت میں آزاد نہیں ہے، ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی جنید بن محمد، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی حفیظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (دیولوی)، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی خالد حسین نیموی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، محمد عظمت اللہ میر کشمیری، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی (پٹنہ)، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مفتی محمد اشرف عباس قاسمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی منصف بدایونی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا عبد الحئی مفتاحی، مولانا عبد القیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا محمد حذیفہ محمود لوناواڑہ، مولانا عبد اللہ ندوی، مفتی محمد رجیب قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا زین العابدین (کیرالہ)، مولانا محمد زاہد (گڑھی سلیم پور) مولانا مجتبی قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی۔

مذکورہ حضرات مانعین نے مندرجہ ذیل دلائل کا اس کے لیے سہارا لیا ہے:

☆ ''باع کرمه من آخر بیع الوفاء وتقابضا، ثم باعه المشتری من آخر بیعاتاما وسلم وعاب. فللبائع أن یخاصم المشتری الثانی ویسترد منه الکرم'' (الفتاوی الہندیہ ۳/ ۲۰۹) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد مغفور باندوی)۔

☆ ''ولیس للمرتهن أن یبیعه إلا برضاء الراهن، لأنه ملکه ومارضی ببیعه'' (الہدایہ مع الفتح ۵/ ۵۳۸) (مولانا عبد الحئی مفتاحی)

☆ ''فإنه لا یملك بیعه'' (رد المحتار ۷/ ۵۴۸) (مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

☆ ''قلت: هذا العقد مرکب من العقود الثلاثة کالزرافة فیها صفة البعیر والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إلیه بشرط سلامة البدلین لصاحبهما'' (البحر الرائق ۶/ ۱۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا عفان منصور پوری)۔

☆ ''وفیه من معنی الرهن أن المشتری لا یملك حق استهلاك المبیع ولا نقل ملکیته إلی أحد بعوض ولا بغیر عوض ولا أن یرهنه ولا ینشئ علیه حقا عینیا لأحد، بل یجب علیه حفظه وصیانته، وأن المشتری ملزم برد المبیع بالوفاء إلی البائع متی رد هذا إلیه الثمن، وهذا معنی الوفا فی تسمیته'' (المدخل الفقہی العام ۱/ ۶۱۱)۔

☆ ''اذا باع باتا أو وفاءً أو وهب، إن هذا التصرف، فلا یصح، وإذا مات المشتری وفاءً فورثته یقومون مقامه فی أحکام الوفاء'' (بزازیہ ۴/ ۴۰۶، وباعه المشتری للبائع اوورثته حق الاسترداد او مع الرد ۷/ ۵۴۸) (اشرف عباس قاسمی)۔

اس کے علاوہ سابقہ سوالات کے جوابات میں پیش کی گئی عبارتوں کو پیش کیا ہے، جن کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

مجوزین (دوسری رائے):

مشتری کے لیے دوسرے سے اس مبیع کو فروخت کرنے، مزید قیمت وصول کرنے اور استفادہ کے متعلق دوسری رائے یہ ہے کہ مشتری کو اس کی اجازت ہے، مشتری فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور فروخت بھی کر سکتا ہے، اس رائے کو اختیار کرنے والے ۲۲ مقالہ نگار حضرات ہیں، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی اشرف عباس قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا عبدالخالق رامپور، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی (امروہہ)، مفتی محمد ارشاد دساوا، مولانا عبیداللہ ندوی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مفتی یوسف قاسمی، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی شبیر احمد قاسمی (امروہہ)۔

ان حضرات نے بنیادی طور پر اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ جب اس کو بیع تسلیم کر لیا گیا تو مشتری اس کا مالک قرار پایا، جب مالک ہوا تو وہ اپنی ملکیت سے فائدہ اٹھانے کا اور اس کی قیمت طے کرنے وغیرہ کا اختیار خود رکھتا ہے، اس سے مشتری کو روکا نہیں جا سکتا۔

دلائل:..... حضرات مجوزین نے اس سلسلہ کی بہت سی فقہی عبارتیں پیش کی ہیں، مثلاً:

☆ ''لأن الثمن حق العاقد، فلا ينبغي له أن يتعرض لحقه''

☆ ''بعض مشائخ زماننا قالوا: الشرط لولم يكن في العقد جعلناه بيعاً صحيحا في حق المشتري حتى ينتفع بالمبيع كسائر أملاكه'' (جامع الفصولین ۱/ ۲۳۷)۔

متفرق رائے:

البتہ بعض حضرات کی رائے اس میں یہ ہے کہ فروخت کر سکتا ہے، قیمت اضافہ کر کے نہیں لے سکتا۔

بعض مقالہ نگار نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر دوسرے سے فروخت کرے تو قیمت زیادہ لے سکتا ہے، بائع اول سے فروخت کرنے کی صورت میں اضافی قیمت نہیں لے سکتا (دیکھئے: مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی اشرف قاسمی امروہہ کہتے ہیں کہ اگر مبیع بیچ دے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، مزید قیمت لینے سے متعلق مولانا یوسف علی کہتے ہیں: مزید قیمت لے تو قضاء جائز ہے، دیانۃ جائز نہیں ہے، مولانا قاضی محمد کامل صاحب اس مسئلہ میں کہتے ہیں کہ بیع میں نقص پیدا ہونے کی وجہ سے ثمن بائع اور مشتری کے درمیان تقسیم ہوگی، مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ بائع اول سے پوچھ لے تو بہتر ہے، ان تمام مسائل و مشکلات اور ضرورت وحاجت کے پیش نظر مفتی شبیر احمد قاسمی مرادآباد، اور مفتی عمران اللہ قاسمی کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بیع وفاء کے جواز پر فتوی دینا اولی اور انسب ہوگا (دیکھئے: دونوں حضرات کے مقالات)۔

سوال نمبر ۲: اگر بیع وفاء کو رہن قرار دیا جائے تو!

(۲/الف) جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

۷۴ر حضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ اگر بیع وفاء کو رہن قرار دیا جائے تو مشتری کے لیے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں ہے، اس کا فائدہ اٹھانا قرض وامانت سے فائدہ اٹھانے کے مترادف ہوگا، جو سود ہے اور ممنوع ہے، اس رائے کے حامل مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا محمد فاروق، مفتی جنید بن محمد، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی (امروہہ)، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی جمیل احمد نذیری، محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مفتی محمد عادل خاں، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلیمان قاسمی پالنپوری، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت ممبئی، مولانا عظمت اللہ میر، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مفتی یوسف قاسمی (جودھپور) مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا محمد یاسر قاسمی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالخالق رامپوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عبد

الرزاق قاسمی (امروہہ)، مولانا سید قمر الدین بروڈہ، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مفتی عبدالتواب اناوی، مولانا محمد حذیفہ محمود، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا عبیداللہ ندوی، قاری ظفر الاسلام صدیقی، مفتی رجیب قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد جعفر ملی، مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی، مولانا زین العابدین کیرالا، ڈاکٹر شیخ محروس المدرس (عراق)، مفتی شاہجہاں ندوی۔

دلائل:.....ان حضرات نے عام طور سے قرض وامانت سے استفادہ کی ممانعت کو پیش نظر رکھا ہے، مثلاً:

☆ ''كل قرض جر نفعا فهو ربا'' (حوالہ اوپر گزر چکا ہے)۔

☆ ''عن النبي ﷺ: لا يغلق الرهن من صاحبه الذي رهنه، له غنمه، وعليه غرمه''
(صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۵۹۳۴) (مقالہ مولانا شاہجہاں ندوی)۔

☆ ''نهى رسول الله ﷺ عن صفقتين في صفقة واحدة''
(ابن حنبل رقم الحدیث: ۳۷۸۲، ابن حبان رقم الحدیث: ۱۰۵۳، ۵۰۲۵) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد یار علی نعمانی)۔

☆ ''فان رسول الله ﷺ: الظهر يركب إذا كان مرهونا، ولبن الدر يشرب إذا كان مرهونا، وعلى الذي يركب ويشرب نفقته'' (هذا حديث حسن صحيح...ومنه حجة لمن قال يجوز للمرتهن الانتفاع بالرهن إذا قام بمصلحته، ولولم يأذن المالك، وهو قول احمد و اسحاق وطائفة...وذهب الجمهور إلى أن المرتهن لاينتفع من المرهون بشئ وتأولوا الحديث (تحفۃ الاحوذی ۴/ ۴۶۱) (دیکھئے مقالہ مولانا ابرار خاں ندوی)۔

☆ ''فاذا كان رهنا لايملكه ولاينتفع به، وأى شئ كل من زوائد يضمن ويسترده عند قضاء الدين''
(تبیین الحقائق ۵/ ۱۸۳)

☆ ''وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن'' (ملتقی ۱/ ۲۷۳)۔

☆ ''وكذا ليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون حتى لو كان الرهن عبداليس له أن يستخدمه، وإن كان دابة ليس له أن يركبها، وإن كان مصحفا ليس له أن يقرأفيه، لأن عقد الرهن يفيد ملك الحبس لا ملك الانتفاع، بأن انتفع به فهلك في حال الاستعمال يضمن كل قيمته، لأنه صار غاصبا''
(بدائع الصنائع ۵/ ۲۱۲) (دیکھئے مقالہ: راشد حسین ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ''لايجوز للمرتهن أن يتصرف في غير المركوب والمحلوب وهو الصحيح، وعليه أكثر الأصحاب'' (الانصاف ۵/ ۱۳۱)

☆ ''الثابت في مذهب أئمتنا الحنفية: عدم جواز انتفاع المرتهن بالرهن، أنه غير ماذون بذلك، وله ولاية الحبس فقط، وحتى لا يحصل على منفعة زائدة، وفي ذلك شبهة الربا، لعدم وجود المقابل لهذه الزيادة، إذ نماء الرهن للراهن دون غيره'' (دیکھئے: مقالہ شیخ ڈاکٹر محروس المدرس)۔

☆ ''والغالب من أحوال الناس أنهم يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع'' (شامی ۵/ ۳۴۳)۔

☆ ''قلت: وهذا مخالف لعامة المعتبرات من أنه يحل بالاذن، إلا أن يحمل على الديانة، وما في المعتبرات على الحكم، ثم رأيت في جواهر الفتاوى: إذا كان مشروطا صار قرضا فيه منفعة وهو ربا''
(شامی ۵/ ۳۴۳) (دیکھئے مقالہ: راشد حسین ندوی)۔

ان مذکورہ عبارات کے علاوہ بہت سے مقالہ نگار حضرات نے اردو فتاوے بھی نقل کیے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ: مولانا حذیفہ محمود، مفتی یاسر قاسمی وغیرہ)۔

دوسری رائے:

دوسری رائے بیع وفاء کے رہن قرار دینے کی صورت میں انتفاع کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اس سے انتفاع کی گنجائش ہوگی، اس میں بعض حضرات تو مالک کی اجازت کو شرط قرار دیتے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ بقدر صرفہ، بعض حضرات اس کو رہن ہی نہیں مانتے، اور بعض مجوزین مطلقا اس کی اجازت کے قائل ہیں، ان کے

اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا روح الامین، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا محمد اعظمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی خالد حسین نیموی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی (امروہہ)، مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی۔

دلائل:

☆ ''ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشائخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه وهو الانتفاع به، دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل، وجوز الاستصناع لذلك، وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى'' (تبيين الحقائق ۲۲۵/۱۵)۔

☆ ''وهذا البيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن لا يملكه... إلا بإذن مالكه'' (عالمگیری ۲۰۹/۳) (مفتی ریاست علی قاسمی)

☆ ''وقيل: بيع يفيد الانتفاع به'' (درمختار ۵۴۶/۷ باب الصرف)۔

سوال نمبر ۲/ب: اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل ۳۸ حضرات کا خیال یہ ہے کہ اس طرح خرید وفروخت کا معاملہ اور پھر کرایہ داری اور اس میں معمول سے کم کرایہ کی ادائیگی یہ شکل جائز نہیں ہے:

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد فاروق، مولانا جنید بن محمد، مفتی اشرف قاسمی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا محمد قمر الزماں، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی روح اللہ قاسمی، محمد عظمت اللہ میر، مولانا شیر علی گجراتی، ارتقاء الحسن کاندھلوی، محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، محمد یاسر قاسمی، مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالخالق (رامپور)، مفتی عبدالرزاق امروہہ، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا عبدالحی مفتاحی، مفتی محمد ارشاد دساوا، مولانا عبید اللہ ندوی، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی رجیب قاسمی، مولانا مغفور باندوی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا مجتبیٰ قاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا زین العابدین کیرالا، مفتی محمد عادل خان۔

دلائل:...... ان حضرات کے نزدیک عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ یہ شکل دراصل قرض سے فائدہ اٹھانے، نیز ایک معاملہ میں دو معاملہ کرنے کے زمرے میں داخل ہے، جس کی شریعت نے ممانعت کی ہے۔

☆ ''كل قرض جر نفعا فهو ربا'' (حوالہ اوپر گزر چکا ہے)۔

☆ ''عن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: لا يحل سلف و بيع''

(ابوداؤد باب في الرجل يبيع ماليس عنده، ترمذی باب ماجاء في كراهية بيع ماليس عندك)۔

☆ ''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط'' (نصب الرايہ)۔

☆ ''مالا يحتاج إلى مؤنة (قوت) كالدار والمتاع ونحوه، لا يجوز للمرتهن الانتفاع به بغير إذن الراهن بحال، لأن الرهن ومنافعه ونمائه ملك الراهن، فليس لغيره أخذها بغير إذنه، فإن أذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بغير عوض، وكان دين الرهن من قرض لم يجز، لأنه قرض يجر منفعة، وذلك حرام... وإن الانتفاع بعوض هو أجر المثل من غير محابات جاز في القرض وغيره لكونه لم ينتفع بالقرض بل بالإجارة، ...والخلاصة أن الانتفاع إن كان بعوض جاز في القرض وغيره إن كان بأجر المثل، وإن كان بغير عوض لا يجوز

فی القرض'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۵۸-۲۵۹) (دیکھئے مقالہ: مولانا حذیفہ محمود)۔

☆ ''وكذلك لو باع عبدا على أن يستخدمه البائع شهرا أو دار اعلى أن يسكنه أو على أن يقرضه المشترى درہما أو على أن يهدى له هدية، لأنه شرط لا يقتضيه العقد، وفيه منفعة لأحد المتعاقدين، ولأنه شرط عليه السلام ''نهى عن بيع وسلف''، ولأنه لو كان الخدمة والسكنى يقابله شئ من الثمن يكون إجارة فى بيع، ولو كان لا يقابله يكون اعارة فى بيع، وقد نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن صفقتين فى صفقة''
(ہدایہ ۳/۴۴-وردالمحتار ۱۰/۱۳۰) (دیکھئے مقالہ: خورشید احمد اعظمی)۔

نیز اس مسئلہ میں مفتی جنید عالم ندوی قاسمی نے یہ تفصیل ذکر کی ہے کہ:

''کرایہ دار سے کرایہ کے علاوہ جو کثیر رقم لی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہیں:

الف:......ایک تو یہ کہ وہ رقم بہ طور ضمانت لی جاتی ہے، کرایہ دار جب مکان ودوکان خالی کرتا ہے تو اس کی وہ رقم واپس کردی جاتی ہے، ایسی صورت میں مذکورہ رقم کی حیثیت رہن کی ہے، اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، اور وہ رقم مالک مکان ودوکان کے پاس امانت رہے گی، وہ اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا، اس صورت میں کرایہ معمول کے مطابق ہی لیا جاتا ہے، اگر مالک مکان ودوکان اس رقم کو بہ طور قرض اپنے استعمال میں لاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ کرایہ معمول سے کم لیتا ہے تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، یہ اپنے قرض پر نفع اٹھانا ہے جو حرام ہے......اگر کسی خاص مصلحت کے تحت وہ کرایہ کم لیتا ہے تو شرعاً یہ جائز ہے، ''کل قرض جر نفعاً فھو ربا'' کے تحت نہیں آئے گا، اس لیے کرایہ دار نے جو رقم دی ہے وہ قرض نہیں ہے، بلکہ بہ طور ضمانت اور بہ طور رہن ہے (دیکھئے: مقالہ موصوف)۔

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ مشتری یا مرتہن کے لیے کم کرایہ ادا کرنے کی سہولت سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، ان میں سے بعض حضرات تو مطلقاً اس کو معاملہ بیع کی وجہ سے درست قرار دیتے ہیں، بعض حضرات اجرت مثل ادا کرنے کی شرط پر اس کی اجازت دیتے ہیں، جبکہ مجوزین میں سے بعض حضرات رہن کو باطل قرار دے کر اجارہ کا معاملہ تصور کرتے ہیں، اور مستاجر کے لیے کم یا زیادہ کرایہ سے فائدہ اٹھانا امر مباح ہے۔

اس موقف کو اختیار کرنے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا غلام اللہ کادوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا معز الدین قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی محمد عادل خاں، مولانا محمد اعظمی، مفتی خالد حسین نیموی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد اشرف قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی منصف بدایونی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا محمد حذیفہ لوناواڑہ، مفتی محمد یوسف قاسمی (جودھپور)، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبدالقیوم پالنپوری، مفتی شاہجہاں ندوی۔

دلائل:......بنیادی طور پر مذکورہ حضرات نے اس معاملہ کو ''قرض'' سے نفع اٹھانے کے زمرے میں نہیں تسلیم کیا ہے، اس کے علاوہ فقہاء کی ان عبارتوں کو استشہاد میں پیش کیا ہے جس میں مال مرہون سے مرتہن کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا گیا ہے، مثلاً:

☆ ''قال الله تعالى: إلا أن تكون تجارة عن تراضى منكم'' (سورۂ نساء: ۲۹)۔

☆ ''عن النبى ﷺ: لا يحل مال امرأ مسلم إلا بطيب نفس منه'' (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۴۸۸، مسند ابی یعلی ۱۵۷۰، دارقطنی ۲۸۸۵) (مقالہ مولانا شاہجہاں ندوی)۔

☆ ''عن جابر بن عبد الله أن النبي ﷺ قال: لا يبيع حاضر لباد دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض''
(سنن ابن ماجہ ۱/۱۵۷)۔

☆ ''عن أنس بن مالك قال: غلا السعر فى عهد رسول الله ﷺ: فقالوا: يا رسول الله! قد غلا السعر، فسعرلنا، فقال: إن الله ہو المسعر القابض الباسط الرازق'' (حوالہ مذکور ۱/۱۵۹) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد عمران ندوی اورنگ آباد)۔

☆ ''والجمهور على جواز الغبن فى التجارة، مثل أن يبيع رجل ياقوتة بدرهم وہى تساوى مأة، فذلك جائز،

وأن المالك الصحيح الملك جائز له أن يبيع ماله الكثير بالتافة اليسير، وہذا مالا اختلاف فيه بين العلماء إذ عرف قدر ذلك'' (تفسیر القرطبی ۴۰۰/۵)۔

☆ ''فهو عقد مزيج من بيع ورہن، لكن أحكام الرهن فيه ہي الغالبة ففيه من معنى البيع احكام، أہمها أن المشترى بالوفاء يملك بمقتضى العقد منافع الشئ المبيع وفاء، فله أن ينتفع به بنفسه، وأن يستغله بإيجاره للبائع ذاته أو لغيره'' (المدخل الفقہی العام ۶۱۱/۱) (دیکھئے مقالہ: محمد عفان منصور پوری)۔

☆ ''فالمستأجر... إن كان ہو المرتهن وجدد القبض للإجارة أجنبيا بمباشرة أحدهما العقد بإذن الآخر بطل الرہن والأجرة للراہن وولاية القبض للعاقد'' (ردالمحتار ۱۳/۱۵، الفتاوی الهندیه ۴۵۶/۵، وفی البداء ايضا: ولو آجره من المرتهن صحت الاجارة وبطل الرهن إذا جدد القبض للاجارة، بدائع ۲۱۳/۵)
(دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

☆ ''استحسانا للتعامل بلانكير (الدر المختار) قوله استحسانا أى يصح البيع ويلزم الشرط استحسانا للتعامل... ولو حدث عرف فی شرط غير الشرط فی النعل والثوب القبقات أن يكون معتبرا إذالم يؤ د إلى المنازعه'' (شامی ۸۸/۵) (دیکھئے مقالہ: مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری)۔

متفرق آراء:

اس مسئلہ میں مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی، محمد عمران ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ جواز کے لیے ضروری ہے کہ کرایہ اجرت مثل سے کم نہ ہو، اور مفتی جمیل احمد نذیری کہتے ہیں کہ اس میں اگر مالک مکان یا زمین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم کرایہ مقرر کیا گیا ہو تو کراہت سے خالی نہیں ہے، اور مولانا حذیفہ لوناواڑہ کہتے ہیں کہ یہ صورت اس وقت جائز ہے، جبکہ بائع کی لی ہوئی رقم کو مرہون قرار دے کر اس کا استعمال اس کے لیے ممنوع قرار پائے (تفصیل کے لیے دیکھئے: مذکورہ حضرات کے مقالات)۔

ڈاکٹر شیخ محروس مدرس حنفی عراقی نے بھی رہن میں اجارہ کا مسئلہ اٹھایا ہے، تاہم انہوں نے بھی امام محمد سے امام ابوحنیفہ کی قرض سے نفع اٹھانے والی مکروہ والی روایت اور امام کرخی کی وہ روایت جس میں اگر معاملہ کے اندر نفع اٹھانا مشروط نہ ہو تو اس صورت کو جائز قرار دیا گیا ہے، نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے، انہوں نے اپنی طرف سے کوئی رائے اس مسئلہ میں نہیں دی ہے (دیکھئے: شیخ کا عربی مقالہ کا اردو ترجمہ)۔

سوال نمبر ۲/ج: اس عرصہ میں خریدار اس شئ سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل ۴۴ مقالہ نگاران، یعنی اکثر کی رائے یہ ہے کہ مشتری اس بیع سے کاشت یا اجارہ داری وغیرہ کے ذریعہ فائدہ نہیں حاصل کرسکتا:

مولانا محمد فاروق، مفتی جنید بن محمد، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلمان پالنپوری قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عبدالرزاق (امروہہ)، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مفتی عبدالتواب اناوی، مولانا محمد حذیفہ محمود لوناواڑا، مفتی محمد ارشاد دساوا، مولانا عبیداللہ ندوی، مفتی رجیب قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد جعفر ملی، مولانا محمد مجتبی قاسمی، مولانا زین العابدین، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مفتی محمد یوسف قاسمی۔

دلائل:...... ان حضرات کے پیش نظر وہی اسباب ووجوہ ہیں جو سوال اول کے ضمن میں بیع وفاء سے استفادہ کی بابت پیش کیے گئے ہیں، اس لیے ان دلائل کو تکرار کی وجہ سے یہاں سے حذف کیا جاتا ہے (حسب ضرورت وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)۔

دوسرا نقطہ نظر:

اس مسئلہ میں دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مشتری کے لیے اس بیع سے کرایہ داری اور کاشت کاری کے ذریعہ فائدہ اٹھانا درست ہے، جبکہ مجوزین ہی میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مرتہن راہن کی اجازت سے ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے، بغیر اس کی اجازت کے نہیں اٹھا سکتا، گویا مشروط اجازت یہاں بھی مشتری یا مرتہن کو حاصل ہے، اس رائے کے حاملین میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مرادآباد)، مفتی عبد الرشید قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی اشرف عباس قاسمی، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی خالد حسین نیموی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا شیر علی گجرات، مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی (پٹنہ)، قاضی وصی احمد قاسمی (پٹنہ)، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا عبد الشکور قاسمی، مولانا عبد الخالق (رامپور)، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی (امروہہ)، مولانا سید قمر الدین محمود، مفتی محمد یوسف قاسمی، مفتی محمد زاہد۔

دلائل:...... حضرات مجوزین کے پیش نظر فقہاء کے وہی اقوال ہیں جن میں راہن کی اجازت سے اجارہ اور کاشت کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کو درست قرار دیا گیا ہے، مثلاً:

☆ ''وإن أجر المبيع وفاء من البائع ممن جعله فاسدا، قال: لا تصح الإجارة...ومن أجازه جوز الإجارة من البائع وغيره وأوجب الأجر'' (فتاوی بزازیہ ۴/ ۱۳۲ مع الهندیہ)۔

☆ ''أن كل ما يصح بيعه قبل قبضه تجوز إجارته، ومالا فلا.وبيع العقار قبل القبض جائز، فكذلك اجارته'' (حوالہ سابق)۔

☆ ''وهو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكه'' (شامی ۷/ ۵۴۶)۔

☆ ''البيع الذي تعارفه أہل زماننا احتيالا للربا وسموه بيع الوفاء، وهو رهن في الحقيقة، لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكه'' (شامی ۵/ ۲۴۶)۔

متفرق آراء:

بعض مقالہ نگار حضرات نے پھر وہی بحث چھیڑی ہے کہ اگر بیع ہے تو جائز اور رہن ہے تو ناجائز، جیسے مفتی غلام اللہ کاوی، وہ لکھتے ہیں: اس کی انکم راہن کی ہوگی، ''فالغالب من أحوال الناس أنهم يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم، وكذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع'' (شامی ۵/ ۴۱۱-۴۱۰) (دیکھئے: مقالہ موصوف)۔

مولانا شیر علی گجراتی اور مفتی اشرف عباس قاسمی کے خیال میں کاشت وغیرہ کے ذریعہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، کرایہ داری کا معاملہ نہیں کر سکتا۔

(دیکھئے مقالات: مفتی شیر علی گجراتی، مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

مفتی شبیر احمد قاسمی مرادآباد کے خیال میں مشتری کے لیے نفع کی اجازت ہے، ان کے الفاظ میں: ''لہذا اراجح یہی ہوگا کہ مبیع کو کرایہ پر دے کر اجرت حاصل کرنا مشتری کے لیے اس وقت تک جائز ہوگا جب تک بائع ثمن دے کر بیع واپس نہ لے گا''۔

مزید اس سلسلہ کی فقہی عبارتیں اوپر گزر چکی ہیں، حسب ضرورت سوال نمبر ایک کے ضمن میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر ۲/د: خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام ہی مقالہ نگاران کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مشتری کے لیے مبیع یا رہن کو فروخت کرنے کا کوئی اختیار اور حق نہیں ہے، اور اگر فروخت کر بھی دیتا ہے تو بائع کی اجازت پر بیع کا نفاذ موقوف رہے گا (چوں کہ یہ رائے تقریباً اتفاقی ہے، اس لیے اسمائے گرامی کی فہرست چھوڑی جاتی ہے)۔

اس مسئلہ میں متفرق آراء:

اس مسئلہ میں مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد سالم اعظمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی شاہد علی قاسمی نے اس کی صراحت کی ہے کہ

مشتری بائع کی اجازت سے مبیع کو فروخت کرسکتا ہے، اور مولانا جنید بن محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر مدت مکمل ہوجائے تو فروخت کرسکتا ہے، اور مفتی جمیل نذیری کا خیال ہے کہ فروخت تو نہیں کرسکتا، الایہ کہ مشتری کو اپنا حق وصول کرنے میں کوئی دشواری اور مجبوری پیش آجائے، گویا ان حضرات کی آراء کا حاصل بھی جب بائع کی اجازت پر موقوف ٹھہرا تو عدم جواز ہی نکلتا ہے، صرف مفتی اشرف قاسمی کا خیال ہے کہ اس کے لیے فروخت کرنا جائز ہے، اور جو قیمت زیادہ ملے گی اسے بائع کو لوٹانا ضروری ہوگا۔

مفتی زاہد (گڑھی سلیم پور) اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: زیر بحث صورت مسئلہ میں اگر مشتری وفاء بائع کے علاوہ دیگر کے ہاتھ مبیع وفاء فروخت کردے تو وہ بیع نافذ ہوگی اور مشتری ثانی کے لیے مبیع حلال ہوگی (دیکھئے: مقالہ موصوف ر ۹۲)۔

دلائل:...... دلائل وہی نقل کیے ہیں جو رہن کے احکام سے متعلق سوال نمبر ۲ کے الف اور ب میں گزر چکے ہیں، مثلاً:

☆ ''ولو باعه المشتری فللبائع أو ورثته حق الاسترداد، أی علی القول بأنه رہن، وکذا علی القولین قائلین، بأنه بیع یفید الانتفاع به، فإنه لایملك بیعه کما قدمنا'' (شامی ۷/۵۴۸، مکتبہ زکریا دیوبند) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد منصف بدایونی)۔

☆ ''وعلیه الفتوی أعنی لایملك المشتری بیعه من الغیر کما فی بیع المکرہ'' (البحر الرائق ۶/۱۳)۔

☆ ''فلیس لأحد من البائع والمشتری أن یبیع مبیع الوفاء من آخر بدون إذن الآخر''
(درر الحکام ۱/۳۶۵، مجلۃ الاحکام دفع: ۳۹۷) (دیکھئے مقالہ: محمد شاہجہاں ندوی)۔

سوال نمبر: ۳- آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے، تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہئے، لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپے کرایہ لینے پر آمادہ ہوجاتا ہے؛ کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لیے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہوجاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت ورہن کی، اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

اس سوال کے جواب میں ایک رائے یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہے، اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ قرض سے فائدہ اٹھانا ہے، جو شرعا سود میں شامل ہے اور ممنوع ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے۔

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد فاروق، مفتی جنید بن محمد، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا عبداللطیف، مفتی سلمان قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا ارتقاء الحسن قاسمی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مفتی عمران اللہ قاسمی، مولانا عبدالخالق (رامپور)، مفتی عبدالرزاق قاسمی (امروہہ)، مولانا عبدالحئ مفتاحی، مولانا محمد حذیفہ محمود لوناواڑہ، مولانا محمد ارشاد دساوا، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی رجیب قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی ابوسفیان مفتاحی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد مجتبی قاسمی، مفتی محمد یاسر قاسمی، محمد سالم اعظمی۔

دلائل:...... اس کے دلائل واضح ہیں، اور تقریبا مقالہ نگاران نے اسی کو استدلال میں پیش کیا ہے۔ یعنی: ''کل قرض جر نفعا فهو ربا'' (حوالہ گزر چکا)، 'وأحل الله البیع وحرم الربا' (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ زر ضمانت کی ضرورت موجودہ عہد میں عام طور سے مالک دکان ومکان کے ضرر سے بچنے کے لیے پڑتی ہے، اور مشاہدہ میں بھی یہ بات آئی ہے کہ جس مکان اور دکان پر پہلے ہی سے زر ضمانت ادا کیا گیا ہوتا ہے، اس میں کرایہ دار اور مالک دونوں کو اطمینان رہتا ہے، نہ کرایہ دار کو اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ مالک اس سے خالی کرائے گا، اور نہ مالک کو خوف ہوتا ہے کہ کرایہ دار خاموشی سے بھاگ جائے گا، یا میری ملکیت کو نقصان پہنچائے گا، اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو موجودہ دور کی یہ ایک ضرورت ہے اور کرایہ دار کی جانب سے رضا کارانہ طور پر یا عرف وحالات کی وجہ سے دی جانے والی رقم ہے، کرایہ

کی کمی یا زیادتی، یا اس کی وجہ سے کرایہ دار کی منفعت کو نہیں جوڑا جاسکتا۔

اس رائے کے حامل مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی غلام اللہ کاوی، مولانا حفیظ الرحمن ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد خالد حسین نیموی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد عفان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا عبیداللہ ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا محمد جعفر ملی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مولانا محمد یوسف قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی۔

دلائل: ......ان حضرات نے جو دلائل دیئے ہیں ان کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ چونکہ زرضمانت کی شکل میں کرایہ میں کمی یہ قرض سے نفع اٹھانے کے دائرے میں نہیں آتا ہے، بلکہ معاملات کی بہتری کے لیے اختیار کیا جانے والا جدید طریقہ ہے۔

☆ ''يعتبر ويراعى كل ما اشترط العاقدان في تعجيل الأجرة وتأجيلها وفي موضع آخر: يلزم الأجرة بشرط التعجيل، يعني لو شرط أن تكون الأجرة معجلة لزم المستأجر تسليمها''

(شرح المجلہ ۲۶۱/۱، ۲۶۵، بحوالہ فتاوی محمودیہ ۵۸۳/۱۶) (مقالہ: مفتی محمد عفان منصور پوری وغیرہ)۔

☆ قاعدہ: ''الغرم بالغنم'' (دیکھئے: مقالہ مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی)۔

☆ ''هو عقد مخصوص يرد على دفع مال مثلي لآخر ليرد مثله'' (شامی ۳۸۸/۷) (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

متفرق آراء:

اس مسئلہ میں مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی عادل خاں، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی معزالدین قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی عظمت اللہ میر، مفتی منصف بدایونی، مولانا سید قمر الدین محمود نے اپنی کوئی رائے نہیں دی ہے۔

نیز بیع وفاء کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا یوسف قاسمی، مفتی محمد زاہد (گڑھی سلیم پور)، اور شیخ ڈاکٹر محروس المدرس نے عرف وعادت کے اصول وضوابط پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، جسے پیش نظر رکھ کر غور کیا جاسکتا ہے۔

☆ ڈاکٹر محروس مدرس کے خیال میں یہ رائے زیادہ درست ہے کہ بیع وفاء کا معاملہ درست نہیں ہے، ان کے الفاظ ہیں: ''مانرا في المسئلة''

☆ اولاً: نحن نتفق مع الذين لا يعتبرون هذا العقد بيعا'' (بحجة: لا عبرة بمجرد النية بلا لفظ)

(تفصیل کے لیے دیکھئے: شیخ کے عربی مقالہ کا اردو ترجمہ)۔

☆ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ زرضمانت والے مسئلہ میں اگر پیشگی رقم کو قرض تسلیم کرلیا جائے تو زیادہ بہتر ہے وہ کہتے ہیں: ''احقر کے خیال میں قرض ماننا زیادہ موزوں ہے، کیونکہ رہن ماننے کی صورت میں بعض فقہاء کے نزدیک اجازت کے بعد بھی انتفاع درست نہیں ہے...... لہذا اگر وہ کرایہ (جس کی کمی قرض سے نفع اٹھانے کے مترادف ہے) اجرت مثل قرار دیا جائے، تو یہ اعتراض بھی ختم ہوجائے گا، اس طرح زرضمانت والے مسئلہ میں اجرت مثل کی شکل اختیار کرکے قباحتوں کو ختم کیا جاسکتا ہے (تفصیل کے لیے موصوف کے مقالہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے)۔

☆ ☆ ☆

عرض مسئلہ:

بیع الوفاء

(سوال نمبر ۱، ۲)

مفتی عبدالرزاق امروھوی [استاذ حدیث و فقہ جامعہ إسلامیہ عربیہ امروہہ]

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بائیسویں فقہی سیمینار کے ایک موضوع ''بیع الوفاء'' سے متعلق سوالنامہ کے ابتدائی ایک اور دو سوالات کا عرض احقر کے ذمہ کیا گیا تھا، عرض مسئلہ کے لیے کل ۷۰ مقالات اکیڈمی کی جانب سے بھیجے گئے، ان میں سے تین مقالے عربی زبان میں ہیں اور ۶۷ مقالات اردو زبان میں، پھر کچھ مقالات تو تفصیلی ہیں مگر اکثر مقالات مختصر ہیں، تمام مقالات کے مطالعہ کے بعد تجزیہ یہ سامنے آیا کہ ''بیع الوفاء'' کے عنوان سے کیا جانے والا عقد (۴۵) مقالہ نگار حضرات کی نظر میں عقد بیع ہے جس کی ضرورت شدیدہ کے وقت چند شرائط کے تحت اجازت ہے ان حضرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا غلام اللہ کاوی، مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا روح الامین صاحب، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری سعادتی، مولانا محمد فاروق قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا یوسف علی صاحب، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی رجیب قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد ارشاد صاحب وسادا، مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی، مولانا عبدالتواب صاحب اناوی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی امروھوی، مفتی ریاست علی قاسمی رامپوری، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالخالق ندوی، مولوی زین العابدین، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا اشرف عباس قاسمی، مولانا شاہین جمالی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی شبیر احمد قاسمی، ڈاکٹر محروس المدرس، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ ہدایت اللہ میر، مفتی محمد عارف باللہ القاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد روح اللہ قاسمی، مفتی انور علی قاسمی، مفتی محمد خالد حسین نیموی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی محمد زاہد۔

۱۷ مقالہ نگار حضرات کا کہنا ہے کہ خاص قید و بند کے ساتھ کیا جانے والا یہ معاملہ ''عقد رہن'' ہے ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی سلمان پالن پوری قاسمی، مولانا عبداللطیف پالن پوری، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالن پوری، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا محمد عادل خاں ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محمد حذیفہ بن محمود ٹیلر داحودی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبدالحیٔ مفتاحی، مولوی محمد سالم اعظمی، مفتی محمد ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی۔

(۴) مقالہ نگاروں کی نظر میں یہ معاملہ نہ بیع ہے نہ رہن، بلکہ یہ عقد فاسد ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی شیر علی، مولانا محمد اعظمی۔

جبکہ (۴) حضرات نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ صرف اقوال کو نقل کر کے چھوڑ دیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی محمد کامل قاسمی۔

اب ہمارے سامنے درحقیقت تین رائیں ہو جاتی ہے: ہر ایک رائے کے تعلق سے دلائل ہیں جو مختلف انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ہم اولاً ان حضرات کے دلائل کو نقل کرتے ہیں جو اس عقد کو کسی نہ کسی شکل میں جائز قرار دیتے ہیں۔

مفتی شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورت اور تعامل ناس جواز کے قائلین کے موافق ہے اور تعامل ناس و عرف کو شرعی طور پر ''الثابت بالعرف کالثابت بالنص'' کے قاعدہ سے حجت شرعیہ کا درجہ بھی حاصل ہے، لہٰذا ضرورت و حاجت ناس کی وجہ سے مشائخ سمرقند، مشائخ بلخ، مشائخ بخارا، امام نجم الدین نسفی اور صاحب نہایہ وغیرہم کے فتوی کے مطابق اس زمانے میں بیع الوفاء کے جواز پر فتوی دینا اولی اور انسب ہوگا، حضرت مفتی صاحب نے ضرورت و عرف کا لحاظ کیا ہے۔

مفتی جمیل احمد نذیری صاحب اختلاف اقوال کو نقل کرنے کے بعد بیع الوفاء کی پوری صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوئی ضرورت مند جو اپنی ضرورت کے معاملہ میں اضطرار شدید کو پہنچ چکا ہو اس کو غیر سودی قرض نہ ملتا ہو اور اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زمین جائداد بیچنے پر مجبور ہو تو وہ بیع الوفاء کرے تو وہ حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں "بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے۔" جو اس کے جواز کے قائل ہیں اور مشتری پر وعدہ یا شرط جو بھی ہو پورا کرنا لازم ہوگا، اور وعدہ کے پورا کرنے کے لزوم پر "درمختار" کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے:

"ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قدتكون لازمة كحاجة الناس، وهو الصحيح۔"

آگے پھر انہوں نے اس معاملہ کو بیع مانتے ہوئے احکام کا ترتب ذکر کیا ہے، نیز یہ بھی لکھتے ہیں کہ جواز کی بات ضرورت کی وجہ سے ہے، اگر ضرورت شدیدہ نہ ہو تو پھر یہ معاملہ رہن ہوگا اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔

مفتی محمد سعید اسعد قاسمی کہتے ہیں کہ شریعت مطہرہ میں عرف وعادت وہ اصول ہیں جن پر بے شمار احکام شرعی کی بنیاد ہے، جیسا کہ "بیع استصناع" اور ایسا عرف جو لوگوں کے درمیان متعارف ہو اور لوگوں کی حاجت وضرورت اس کی داعی ہو تو یہ استحسان قرار پائے گا، جو مبنی بر عرف ہوگا، اور حاجت وعرف کی بنا پر نص میں تخصیص جائز ہے، استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "الضرورات تبيح المحظورات" اسی طرح "الامر اذا ضاق اتسع" فقہ کے مشہور قواعد ہیں۔

مفتی ریاست علی صاحب اور مفتی شاہد صاحب اختلاف اقوال کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ معاملہ استحساناً بیع ہی ہے کہ متعاقدین کے لیے اس چیز سے انتفاع جائز ہو جائے۔

مولانا روح الامین صاحب اصولی گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ: بیع وفاء سے مقصود یہ ہے کہ راہن کو اعتماد میں لیا جائے اور وہ شی مقبوض سے انتفاع بھی کر سکے، البتہ تعبیر اور لفظ کے پیش نظر یہ معاملہ بیع ہے اور یہی قول راجح ہے اور ترجیح کی چند وجوہ ہیں:

(۱) بدون تلفظ محض نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کسی نے ایک عورت سے اس نیت کے ساتھ عقد کیا کہ ایک سال پورا ہو جائے گا تو وہ اسے طلاق دے دے گا تو محض اس نیت سے وہ متعہ قرار نہیں پائے گا۔

(۲) بیع کا لفظ نہ لغۃً رہن پر دلالت کرتا ہے نہ عرفاً، اس لیے لفظ بیع سے رہن کا قصد معتبر نہیں، بخلاف کفالہ اور حوالہ کے یہ دونوں عرفاً "ضم" کے معنی میں مشترک ہیں، لہٰذا ایک سے دوسرے کا ارادہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳) اگر معانی ومقاصد کا اعتبار ہے تو اس معاملہ میں جہاں عاقدین کا مقصود استیثاق ہے، وہیں ان کا مقصود یہ بھی ہے کہ مقبوض سے انتفاع کرے، لہٰذا انتفاع کی رضامندی کے بعد رہن قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں، پھر مولانا نے اس کو عقد بیع قرار دینے کے بعد اس کی چار صورتیں نقل کی ہیں:

(۱) بغیر کسی شرط کے بیع کی جائے، محض دل میں یہ نیت ہو کہ بائع جب ثمن واپس کرے گا تو مشتری بیع واپس کر دے گا، یہ صورت جائز ہے۔

(۲) بغیر شرط کے بیع کی پھر وعدے کے طور پر شرط پر اتفاق کیا، یہ صورت بھی جائز ہے۔

(۳) عقد سے پہلے شرط پر اتفاق کر لیں پھر عقد کے وقت شرط کا ذکر نہ کریں، اکثر کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔

(۴) عقد کے وقت ہی فسخ کی شرط لگا دیں تو یہ اصول کے اعتبار سے فاسد ہے، کیونکہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے، مگر شرط فاسد متعارف ہو تو وہ شرط جائز ہوتی ہے اور معاملہ درست ہوتا ہے، کیونکہ انوار رحمت کی عبارت میں: "إلاأن يكون متعارفاً لأن العرف قاض على القياس" استثناء موجود ہے، لہٰذا مذکورہ صورت اصولاً ناجائز ہے، لیکن اس کا تعامل مسلم ہے پھر اسے بھی جائز قرار دینا چاہیے، مولانا اپنی اس ساری بحث میں عرف اور تعامل کو بنیاد بنا کر جواز کی بات کہہ رہے ہیں۔

مفتی عارف باللہ صاحب نے بھی ضرورت کی وجہ سے اس کو جائز مانا ہے اور استدلال میں "الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة" کے اصول کو پیش کیا ہے۔

مولانا یوسف علی صاحب بھی یہی لکھتے ہیں کہ: ضرورت وحاجت کو مدنظر رکھ کر بیع بالوفاء کو جائز قرار دیا جائے، اور چونکہ اس کے جواز میں قواعد کا خلاف ہے، اس کے حل کے لیے فقہ کی عبارت "وماضاق على الناس امر اتسع حكمه" اور "القواعد تترك بالتعامل" وغیرہ کی طرف نظر کر کے غور کر لیا جائے۔

مفتی انور علی اعظمی، مولانا عبدالخالق صاحب رامپوری اور مفتی خالد حسین قاسمی صاحب اس معاملہ کو ضرورت کی وجہ سے بیع کہتے ہیں، لیکن ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ مشتری اگر مالک اول کے ہاتھ فروخت کرے تو سابق ادا کردہ قیمت سے زائد بھی لے سکتا ہے، مفتی انور صاحب تو لکھتے ہیں کہ اخلاقی طور پر مشتری کو

سابقہ قیمت کا مطالبہ کرنا چاہیے، لیکن چونکہ مشتری بیع کا مالک ہے، اس لیے اپنی چیز کو بیچتے وقت وہ اس قیمت سے زیادہ کا یا ثمن مثل کے مطالبہ کا قضاء مجاز ہے، البتہ اس صورت میں وعدہ کے عدم ایفاء کا گنہگار ہوگا۔

مولانا وصی احمد صاحب قاسمی لکھتے ہیں کہ: موجودہ دور میں جبکہ سودی نظام معیشت مکمل شباب پر ہے ایسی صورت میں امت کو سود جیسی لعنت سے بچانے کی یہی شکل ہے کہ عرف کا اعتبار کرتے ہوئے لوگوں کی حاجت اور ضرورت کے پیش نظر بیع الوفاء کو جائز قرار دیا جائے، مولانا نے عرف پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے مثالوں سے یہ سمجھایا ہے کہ حضرات فقہاء نے عرف کی دونوں قسموں: عرف عام اور عرف خاص کا اعتبار کیا ہے، عرف عام کی مثال "بیع استصناع" سے دی ہے، اور عرف خاص کی مثال "مکان کی فروختگی میں مکان کی سیڑھیاں بیع میں داخل ہیں۔" سے پیش کی ہے۔

مولانا یار علی صاحب یہ لکھتے ہیں کہ ضرورت وتعامل کی وجہ استحساناً اسے جائز تو قرار دینا چاہیے، اب اس میں مزید توسیع اختیار کرنا کہ صلب عقد کے اندر بھی شرط کو نافذ اور صحیح قرار دیا جائے خلاف اجماع ہے اور ضرورت سے زائد ہے اور ضابطہ ہے کہ "ماابیع للضرورۃ یقدر بقدرھا" اس لیے اگر روپے کی واپسی پر سامان کی واپسی کی شرط بطور معاہدہ عقد سے پہلے ہو یا عقد کے بعد ہو اور صلب عقد میں اس کا ذکر نہ ہو تو عقد صحیح ہوگا اور روپے کی واپسی پر سامان کی واپسی لازم ہوگی۔ مولانا نے دوسرے جزئیہ زائد کا مطالبہ نہ ہونے کی دلیل یہ لکھی ہے کہ در حقیقت اس صورت میں عاقدین کا بدلین سے تبادلہ ہوگا کوئی نیا عقد نہیں ہوگا، لیکن مولانا نے تیسرے جزئیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ مشتری کے لیے اس مبیع سے فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں ہے۔

مولانا اشرف عباس صاحب لکھتے ہیں کہ بیع وفاء اپنی اصل کے اعتبار سے تو درست نہیں، کیونکہ اس میں شرط کے ساتھ میں بیع ہے، مگر جواز کا مدار عرف اور تعامل پر ہے، لہٰذا اگر عرفاً اس میں غبن فاحش ہوجائے کہ مدت لمبی گزر چکی ہو تو مشتری اسی تناسب سے زائد قیمت لے سکتا ہے اور اگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد واپسی ہورہی ہے تو اصل قیمت ہی پر واپسی ہونی چاہئے اور اس حوالہ سے درج ذیل جزئیہ سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے:

ولو قال البائع: بعتك بيعاً باتا فالقول له إلا أن يدل على الوفاء بنقصان الثمن كثيراً إلا أن يدعي صاحبه تغير السعر (درالمختار ۷/۵۰۰)۔

مولانا عمران اللہ صاحب قاسمی نے بھی لوگوں کی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے اس کو جائز کہا ہے، البتہ بطور مشورہ کے یہ بات تحریر کی ہے کہ "مبیع کو ثمن اول کی ادائیگی پر واپسی کی شرط" دوران عقد نہ لگائی جائے، بلکہ بعد میں یا پہلے بطور وعدے کے متعین کرلیا جائے۔

مولانا عمران اللہ صاحب ندوی اس معاملہ کو شکلاً بیع تو مانتے ہیں، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ مشتری اگر مالک اول کو بیچے تو سابق ادا کردہ قیمت لازم نہ ہوگی، بلکہ اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ بیع کے اندر دونوں فریق کے مفاد کا لحاظ ضروری ہے "بیع وفاء" تو ضرورت مند آدمی کو غیر سودی قرض فراہم کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے، اس کے اندر مشتری کا فائدہ نہیں کے برابر ہے، اور اگر سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم کردی جائے تو اس افراط زر کے زمانے میں ایک سال کے اندر زمینوں کی قیمت دوگنی ہوجارہی ہے۔ لہٰذا سابق ادا کردہ قیمت لازم کرنے میں مشتری کا نقصان ہی نقصان ہے، اس لیے کہ بائع کوئی زمین بیع وفاء کے طور پر ایک لاکھ میں فروخت کرتا ہے اور مشتری سے وہ پیسے وصول کر کے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، پانچ سال کے بعد اس زمین کی قیمت پانچ لاکھ ہوجاتی ہے تو بائع تو ایک لاکھ دے کر پانچ لاکھ کی زمین واپس لے لے گا اور بے چارہ مشتری ایک لاکھ لے کر کف افسوس ملتا رہے گا کہ کاش میں نے ایک لاکھ روپے میں کوئی زمین رجسٹری کرائی ہوتی تو آج حلال طریقہ سے میرے پاس پانچ لاکھ روپے ہوتے۔

احقر کی رائے یہ ہے کہ بیع وفاء کے اندر زمین ومکان وغیرہ کی قیمت ثمن خلقی سونے سے طے کری جائے تو بہتر ہے اور سابقہ اور لاحقہ قیمت کا جھگڑا بھی پیدا نہیں ہوگا، مولانا کی یہ رائے اچھی معلوم ہوتی ہے، بیع سے فائدہ اٹھانے کی بابت مولانا نے لکھا ہے کہ اس کی حیثیت امانت کی ہے بائع کی اجازت سے استعمال کرنا درست ہے، اور اگر بغیر اجازت کے استعمال کرے تو ہلاکت کی صورت میں ضامن ہوگا، اس سلسلے میں مولانا نے ان فقہی عبارات سے استدلال کیا ہے جن میں عین رہن کو مرتہن کے ہاتھ میں امانت قرار دیا گیا ہے، نیز خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس سلسلے میں مولانا کا کہنا ہے کہ یہ بیع بائع اول کی اجازت پر موقوف ہوگی اور اس سلسلے میں استشہاد "فتاوی عالمگیری" کی عبارت سے کیا ہے: "باع کرمه من آخر بيع الوفاء وتقابضا ثم باعه المشتری بيعا باتا ففبل البائع ان يخاصم المشتری الثانی ويسترد منه الکرم" (۳/۲۰۸)

مفتی محمد ارشاد صاحب نے بیع الوفاء کی دو صورتیں لکھی ہیں ایک صورت میں بیع کے احکام جاری ہوں گے اور ایک صورت میں رہن کے احکام جاری ہوں گے، جس صورت میں بیع کے احکام جاری ہوں گے وہ تو یہ ہیں کہ مجلس عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا بعد میں کسی اور مجلس میں واپسی کا تذکرہ

ہوگیا اور مشتری نے اس کو منظور کرلیا تو شرعاً یہ بیع درست ہے، اور جب مشتری اس چیز کا مالک ہو چکا ہے تو بائع کی طرف سے واپسی پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، ہاں وہ وعدہ دے چکا ہے، اس لیے دیانۃً واپسی کرنی چاہئے، نیز وعدے کے مطابق زیادہ قیمت بھی نہیں لینی چاہئے، اور چونکہ یہ عقد بیع ہے اس لیے مشتری کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے۔

اور دوسری صورت جس میں رہن کے احکام جاری ہوں گے یہ ہے کہ بیع ہونے کے وقت ہی بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا تذکرہ کرلیا گیا اور مشتری نے اس کو منظور کرلیا تو اس شرط کے تقاضۂ عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوجائے گی ہاں یہ شکل چونکہ بعینہ رہن کی ہے اور عقود میں معنی کا اعتبار ہوتا ہے لہٰذا حکماً یہ معاملہ رہن کا ہوجائے گا اس لیے رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے۔

مولانا محمد شکیل اسلام پوری نے قاضی خاں کی تفصیلی عبارت نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ عقد بیع ہی ہے، یہی مسلک صاحب نہایہ اور ابن نجیم کا بھی ہے، ہمارے اکابرین نے بوقت ضرورت اس کی اجازت دی ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے فتاوی خلیلیہ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے اور بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے، تاکہ فقہائے متاخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہوجائے، پھر مولانا نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اس کو رہن کہتے ہیں، مولانا لکھتے ہیں کہ اس کو رہن کہنا بدون وجہ ناممکن ہے ایک تو اس لیے کہ عاقدین نے اپنے کلام میں رہن کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ کیا ہے تو صرف بیع کا اور قاعدہ مسلمہ ہے کہ ایک لفظ بولا جائے اور دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو اس میں کسی نہ کسی علاقہ کا پایا جانا ضروری ہے اور لفظ بیع اور رہن میں کوئی بھی علاقہ نہیں، نہ عرفاً نہ لغۃً۔

دوسرے یہ کہ جب تک لفظ کا تکلم نہ کیا جائے نیت مخفی کا اعتبار نہیں چنانچہ آپ دل میں لاکھ طلاق کے ارادے کرلو، جب تک زبان سے نہیں نکالو گے طلاق واقع نہیں ہوگی، اسی طرح محشی ہدایہ نے زین الدین العراقیؒ کے حوالہ سے نکاح مؤقت میں ایک جزئیہ اسی طرح کا ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص عقد نکاح میں توقیت کی شرط کا ذکر نہیں کرتا لیکن دل میں ارادہ ہے کہ اتنی مدت مثلاً ایک ماہ بعد طلاق دیدوں گا تو اس نکاح کی صحت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

پھر مولانا نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اس عقد کو ناجائز قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں کہ جو حضرات اس بیع کو ناجائز کہتے ہیں ان کے پیش نظر دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ ان حضرات نے اس کو ہزل پر محمول کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقیس اور مقیس علیہ کے مابین کوئی مناسبت نہیں، اس لیے کہ ہازل تو بیع کا ارادہ ہی نہیں کرتا جبکہ بیع وفاء میں بائع کا ارادہ حقیقۃً بیع کا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ "بیع بات" کرنا نہیں چاہتا۔

دوسرے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ربا اور سود کو حلال کرنے کا ایک طریقہ ہے اس لیے ناجائز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ایجاب وقبول لفظ بیع کے ساتھ پایا جائے تو بیع تام ہوجاتی ہے اور یقیناً یہ ربا سے بچنے کا ایک حیلہ ہے، اور حیلہ علی الاطلاق ممنوع نہیں پھر حیلہ کے جواز پر مولانا نے متعدد امثلہ پیش کیے ہیں۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ بیع وفاء کی وہ صورت جس میں قرض کا وجود نہ ہو بلکہ معاملہ بیع کا اور جب ثمن واپس کردے گا تو مبیع اسے واپس لوٹادی جائے گی۔ یہ عرف وحاجت کی بنیاد پر استحساناً درست ہے، پھر مفتی صاحب نے "فتاوی بزازیہ"، "البحر الرائق" وغیرہ کی عبارت سے استدلال کیا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ اگر شرط کا ذکر نفس عقد میں ہے تو یہ بیع فاسد ہوگی۔

مفتی معزالدین قاسمی صاحب نے اختلاف آراء کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس اختلاف کے بعد کسی ایک جہت کو متعین کرنا دشوار ہے، البتہ جو چیز قدر مشترک سب کے یہاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ رہن کا پہلو ہر ایک کے یہاں غالب ہے، اس لیے کہ وفاء فروخت شدہ چیز کی زکوۃ کے سلسلہ میں فقہاء کرام رہن کو غالب رکھ کر بائع پر ہی وجوب زکوۃ کے قائل ہیں۔ "وفی بیع الوفاء یجب زکوۃ الثمن علی البائع" (فتح القدیر ۴۸۶/۳)۔

اس لیے بیع الوفاء کو رہن ہی کے درجہ میں رکھنا چاہیے اور چونکہ فقہائے کرام نے ضرورت کی بنیاد پر اس کو جائز بھی کہا ہے اس لیے اس سے انتفاع بھی جائز ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب کے نزدیک بعض جہتوں (انتفاع وغیرہ) کے اعتبار سے بیع کے درجہ میں ہے، اور واپسی کا تذکرہ وعدے کے طور پر ہو معاملہ اس پر موقوف نہ ہو تو درست ہے اور ایفاء وعدہ لازم ہے، ڈاکٹر صاحب نے "تبیین الحقائق" "ہدایہ" "عنایہ" "فتح القدیر" اور مباحث فقہیہ کی عبارات کو تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے جن میں ضرورت وعرف کی وجہ سے بیع وفاء کے جواز کی بات مذکور ہے، ان عبارات کے بعد لکھا ہے کہ ان دلائل کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ بعض احکام کے اعتبار سے اس کو بیع قرار دیا جانا انسب ہے۔

مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی صاحب نے بھی ضرورت شدیدہ کے وقت جواز کی بات لکھی ہے اور یہ کہا ہے کہ عقد بیع میں واپسی مشروط نہ ہو، بلکہ آگے پیچھے یہ وعدہ کرلیا جائے تو بیع منعقد ہوجائے گی اور وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اور استدلال میں حضرت تھانویؒ کے فتاوی کو پیش کیا ہے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب ندوی نے ''بیع الوفاء'' کے سلسلے میں مختلف آراء اور دلائل کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بربنائے تعامل اور ضرورت درست اور جائز ہے بشرطیکہ وقت اور مدت کی تعیین ہو اور سال بھر کے اندر اندر ہو، اور بہتر صورت یہ ہوگی کہ واپسی کی شرط عقد کے اندر نہ ہو بلکہ بعد میں کوئی معاہدہ کرلیا جائے۔

مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری تحریر کرتے ہیں کہ بیع وفاء جیسے معاملات کا بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت سہارا لینے کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے، پھر اس کی بہتر شکل یہ نکل سکتی ہے کہ مجلس عقد میں شرط یا وعدہ کے طور پر واپسی کا کوئی ذکر نہ ہو، بلکہ روزمرہ کے عام معاملات کی طرح اس کو بھی انجام دیا جائے، پھر کسی دوسری مجلس میں بائع مشتری سے اس رعایت کی درخواست کرلے اور مشتری منظور کرلے اب یہ معاملہ منعقد ہوجائے گا اور دیانۃ مشتری پر وعدہ کا پورا کرنا لازم ہوگا اور چونکہ یہ معاملہ من کل الوجہ بیع نہیں ہے، اس لیے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی۔

تقریباً یہی تفصیل مفتی محمد منصف صاحب بدایونی نے بھی کی ہے، البتہ انہوں نے دو شرطوں کا اضافہ کیا ہے۔

ایک تو یہ کہ بیع ثمن مثل یا غبن یسیر کے ساتھ کی جائے، چاہے ثمن کے بعض حصہ کو مؤجل رکھے، لیکن غبن فاحش کے ساتھ نہ کی جائے، خصوصاً اس بدعہدی کے دور میں تاکہ اگر مشتری وفائے عہد نہ کرسکے تو بائع کا بڑا نقصان نہ ہو۔

دوسرے یہ ہے کہ بدلین صحیح سالم اور محفوظ بھی ہوں۔ مفتی رجیب قاسمی صاحب نے ضرورت وحاجت کی وجہ سے اس معاملہ کو بیع مانا ہے اور ضرورت کے وقت اس پر عمل جائز رکھا ہے اور یہ لکھا ہے کہ بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس شرط کو پورا کرنا قضاء اور دیانۃ لازم ہوگا، اور اس لزوم کی دو وجہیں لکھی ہیں:

(۱) لوگوں کی ضرورت وحاجت۔ (۲) یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا اگرچہ قضاءً لازم نہیں، لیکن تعلیق کی صورت میں لازم ہوجاتا ہے۔

قال فی البزازیة: ''إذا کفل معلقا بأن قال: إن لم یود فلان أو أن أدفعه الیك ونحوه یکون کفالة بما علم أن المواعید باکتساء صور التعلیق تکون لازمة۔''

اور زیر بحث مسئلہ میں معنی تعلیق کا وجود ہے، اس طرح کہ مشتری پہلے یا بعد میں کہتا ہے کہ اگر تم میرے پیسے واپس لاؤ گے تو میں تم کو اس کو بیچ دوں گا، لہذا یہ وعدہ پورا کرنا مشتری پر لازم ہے۔

مفتی مقصود صاحب فرقانی نے اس معاملہ کے جواز وعدم جواز کے دلائل کو نقل کرنے کے بعد یہ تحریر کیا ہے کہ اگر یہ معاملہ مقتضائے عقد کے خلاف شرط سے خالی ہو تو اس پر بیع کا اطلاق ہوگا، اور شرعاً وہ بیع منعقد ہوگی، اور بیع منعقد ہونے کے بعد بائع کی طرف سے بیع کے لیے مشتری سے یہ شرط کہ دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے یہ بیع سے متعلق حکم نہیں ہوگا، بلکہ یہ ایک وعدہ ہوگا جو مشتری کو قبول کرنے کے بعد اسے پورا کرنا لازم ہوگا، اور جب اس پر بیع کا اطلاق ہو رہا ہے تو مشتری کے لیے بائع کے ہاتھ فروخت کرنے نہ کرنے دونوں کا اختیار ہوگا۔

مفتی محمد زاہد صاحب سلیم پوری تفصیلی احکامات واختلافات کو نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع ہے، کیونکہ یہ معاملہ لفظ بیع کے ذریعہ منعقد ہوتا ہے، اور عرف میں لفظ بیع کے اطلاق سے معنی بیع ہی مراد ہوتے ہیں، اور حاجت شدیدہ کے وقت محتاج شخص کے لیے بقدر حاجت جائز ہے، اور بیع کی واپسی کی شرط اگرچہ مقتضائے عقد کے خلاف ہے، لیکن بربنائے حاجت مشتری پر ثمن وصول کرنے کے لیے شرط رہن کے مانند ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ قول مفتی بہ کے مطابق مشتری کو اس کی وفاء پر مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ وفاء شرط نہ ہونے کی وجہ سے بائع کو خیار فسخ حاصل ہوگا، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ مشتری وفا نے کسی دوسرے کے ہاتھ بیع وفا پر عقد تام نہ کیا ہو۔

مولانا روح اللہ قاسمی پانچ اقوال مع ادلہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بیع وفاء کا مقصود رہن سے انتفاع حاصل کرنا ہے، اس لیے اگر اس کے معنی ومقصود پر نظر رکھی جائے تو قول اول (یہ بیع فاسد ہے) اور قول ثانی (یہ خالص رہن ہے) کو ترجیح حاصل ہوتی ہے اور اگر اس کے الفاظ پر نظر رکھی جائے تو پھر ان اقوال (قول ثالث، رابع، خامس) کو ترجیح حاصل ہوتی ہے جن میں فی نفسہ اسے جائز ہونے کی بات کہی گئی ہے، جیسا کہ متاخرین احناف کا مسلک ہے، ہم نے تین اقوال بیان کیے ہیں جن میں اس معاملہ کو جائز کہا گیا ہے، پہلا یہ کہ بعض احکام کے لیے مفید ہے دوسرا قاضی خان کا مختار قول ہے جس میں مسئلہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے،

تیسرا قول جسے قول جامع کا نام دیا گیا ہے، ان اقوال میں قول جامع کی ترجیح سمجھ میں آتی ہے، پھر مولانا نے اس کی وجوہ ترجیح تفصیل سے بیان کی ہیں:

(۱) علامہ سمرقندی نے مشائخ زمان کا اتفاق نقل کیا ہے، زیلعی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے، صاحب نہایہ کے ذریعہ "علیہ الفتوی" کی صراحت ہے۔

(۲) اس قول کی نظیریں کتب فقہ میں موجود ہیں، جیسا کہ مضاربہ۔

(۳) صاحب بحر نے کہا ہے: "وینبغی أن لا یعدل فی الافتاء عن القول الجامع"۔

(۴) قول جامع کو ہی "مجلة الاحکام العدلیه" میں اختیار کیا گیا ہے۔

(۵) شیخ مصطفی الزرقاء نے لوگوں کی حاجت وضرورت کو بھی وجہ ترجیح بنایا ہے، ان وجوہ ترجیح کے بعد مولانا نے اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ یہ معاملہ درحقیقت ربا کو حاصل کرنے کا ایک حیلہ ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی صاحب نے بیع الوفاء کی حقیقت اور اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کرام کی آراء کو تفصیل سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ رائے اختیار کی جائے جس کی ترجمانی علامہ ابن نجیم کر رہے ہیں، یعنی یہ بیع ورہن سے مرکب ایک عقد ہے، بعض معاملات میں بیع ہے تاکہ اس سے انتفاع کا دروازہ کھلا رہے، اور بعض معاملات میں رہن ہے، تاکہ مشتری کو ایسا اختیار نہ ہو جو کہ بائع کے لیے مضر، نیز شریعت میں اس کی ایسی نظیر موجود ہے، جہاں دو حکموں کو ایک کر دیا گیا ہے، حالت مرض میں ہبہ، وہ وصیت بھی ہے اور ہبہ بھی، اسی طرح ہبہ بالعوض معاملات میں بیع کا حکم رکھتا ہے، اور بعض معاملات میں ہبہ کا، اسی لیے شفعہ کا لزوم نہیں ہوتا، کیونکہ حقیقت میں یہ مبادلة المال بالمال نہیں ہے، جبکہ موہوب لہ سے رجوع کے باب میں ہبہ کی بجائے بیع کا درجہ دیا گیا ہے، "ہندیہ" میں ہے: " ولو وهب عقارًا من غير شرط العوض، ثم إن الموهوب له عوضه من ذلك دارًا فلا شفعة في الدارين لا في دار الهبة ولا في دار العوض" اس لیے مرکب معاملہ ماننا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مفتی عبدالتواب صاحب اناوی نے فقہاء کرام کی تصریحات اور ان کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ شرعاً یہ بیع صحیح ہے اور ضرورت کے وقت ایسی صورتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور دلیل یہ دی ہے کہ "مبادلة المال بالمال" جو بیع کی اولین شرط ہے وہ یہاں پر بھی موجود ہے، اور متعاقدین شرعاً لائق عقد ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں جو انعقاد عقد کے خلاف ہو تو پھر بیع کے منعقد اور درست نہ ہونے کے کیا معنی، اور یہ اسی صورت کا بیان ہے جب شرط وفاء صلب عقد میں نہ ہو۔ خواہ قبل العقد ہو یا بعد العقد۔ آگے لکھتے ہیں کہ چونکہ اس بیع کو بر بنائے عرف استحساناً اور "ضرورةً فراراً عن الربا" جائز قرار دیا گیا ہے اور اس میں باعتبار احکام دو چیزوں کو شامل کیا گیا ہے، یعنی حکم بیع اور حکم رہن سے مرکب کیا گیا ہے اور مشتری کے حق میں بیع اور بائع کے حق میں رہن مقرر کیا گیا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ مشتری بیع سے منتفع ہو اور بائع کی شئ مرہون بوقت ادائے ثمن واپس ہو، اور یہ بجز اس صورت کے نہیں ہوسکتا کہ مشتری وقت معینہ پر بائع کو اس کا سامان باعتبار معاہدہ یا باعتبار اقالہ یا باعتبار ثمن جدید مثل میں واپس کر دے۔

مولانا راشد حسین ندوی بھی اس بیع کو جائز اور مرکب مان رہے ہیں اور لکھتے ہیں کہ صلب عقد میں واپسی کی شرط لگانا تو مفسد عقد ہوگا، البتہ اصل عقد کے بعد وعدہ کے انداز میں شرط لگائی جاسکتی ہے، اور اس کا پورا کرنا ضروری ہوگا، اور اس کے جواز کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کو ایسی بیع قرار دیا جائے جس میں اقالہ کی شرط ہے، دوسری یہ کہ اسے خیار شرط سے ملحق مانا جائے جس میں مبیع واپس کرنے کی اجازت ہوتی ہے، فقہاء کی عبارات سے یہ جہت زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے، پھر اس کو خیار شرط قرار دیں تو واپسی کے وقت قیمت میں اضافہ کی گنجائش نہیں، اور اگر اقالہ قرار دیں تو صاحبین کے نزدیک کسی نہ کسی صورت میں افاضہ ممکن ہے، لیکن امام صاحب کے نزدیک اضافہ کی قطعاً گنجائش نہیں، اور فتوی امام صاحب کے قول پر ہے، نیز اگر قیمت بڑھا کر خریدنے کی پوری طرح اجازت دے دی جائے تو اس میں پوری طرح سود کی صورت پائی جاتی ہے، اور پھر جب اس کو اقالہ یا خیار شرط کے ساتھ ملحق کر دیا تو اس سے نفع اندوز ہونا بھی درست ہوگیا۔

اور اس سلسلہ میں احقر کا نظریہ بھی یہی ہے کہ "بیع الوفاء" ایسی بیع ہے جو بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے خریدار کا فروخت شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا، اور بعض احکام کا فائدہ نہیں دیتی جیسے دوسرے کے ہاتھ بیچنا، اور ہماری اس رائے کی وجوہات ترجیح یہ ہیں۔

(۱) متعاقدین نے لفظ بیع کا تلفظ کیا ہے اور لغۃً وعرفاً بیع سے بیع ہی مراد ہوتی ہے نہ کہ رہن۔

(۲) لوگوں کو اس کی حاجت وضرورت بھی ہے اور پھر تعامل وعرف بھی ہے۔

(۳) "مجلة الاحکام العدلیه" نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔

(۴) ہمارے اکابر علماء میں سے حضرت تھانوی اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ حضرات نے بھی ضرورت شدیدہ کے وقت متاخرین احناف کے قول کو

اختیار کیا ہے۔

(۵) اگر اس معاملہ میں معانی ومقاصد کو ملحوظ رکھا جائے تو بھی بیع ہونا ہی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس معاملہ میں جہاں عاقدین کا مقصود استیثاق ہے وہیں یہ بھی کہ شئ مقبوض سے انتفاع کرے، اور جب فریقین انتفاع پر رضامند ہیں تو پھر اس کو رہن قرار دینا کسی بھی طرح صحیح نہیں۔

(۶) ضرورت کی وجہ سے قصداً جائز واسطہ کو استعمال کرتے ہوئے کسی حکم کو بدلنا حیلہ شرعی ہے اور جائز ہے اور مسئلہ بیع الوفاء میں بھی ایسا ہی ہے، کیونکہ بیع کی حقیقت رہن تھی اس رہن کو بیع سے تبدیل کردیا گیا اور بیع ایک جائز واسطہ ہے اور جائز واسطہ کے ذریعہ ایک حکم کو بدلا جارہا ہے، جو کہ جائز ہے، رہا مسئلہ یہ کہ بیع وفاء میں واپسی کی ایک شرط لگی ہوئی ہے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے مفسد بیع ہے، لہٰذا اس شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہوگئی۔ مگر ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ بیع وفاء کی وہی شکل تو جائز ہے جس میں شرط صلب عقد میں نہ ہو، بلکہ عقد کے تام ہونے کے بعد ثمن کی واپسی پر بیع کو واپس لینے کا معاملہ وعدے کے طور پر کیا جائے، اور اس وعدہ کی تکمیل دیانۃً وقضاءً ضروری قرار دی جائے، اور رہا یہ اشکال کہ عقد کے بعد لگائی جانے والی شرط بھی تو صلب عقد کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسا ہو گیا جیسا کہ صلب عقد میں شرط لگی ہو، مگر اس سلسلہ میں صاحبین کا قول راجح ہے جو یہ کہتے ہیں کہ عقد کے تام ہونے کے بعد جو شرط طے ہوگی وہ اصل عقد کے ساتھ لاحق نہ ہوگی اور حنفیہ کے نزدیک یہی راجح بھی ہے، اب رہ جاتا ہے ان حضرات کا بیان جو اس معاملہ کو رہن قرار دیتے ہیں اور پھر تمام احکامات رہن کے جاری کرتے ہیں۔

مفتی محمد یاسر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ اصل قواعد کی رو سے بیع الوفاء قصداً رہن ہے، احکام رہن اور احکام بیع الوفاء کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اور اگر عقد میں فسخ کی شرط لگی ہو تو بیع فاسد ہے جو قواعد کی رو سے واجب الفسخ ہے۔ بیع الوفاء میں بظاہر دونوں لفظ بیع کا تلفظ کرتے ہیں، مگر ان دونوں کا مقصود بیع نہیں ہوتا چنانچہ مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوتا، جیسے بیع ہزل میں مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوتا، نیز بیع الوفاء میں بیع مکرہ کی بھی جھلک ہے، چنانچہ بیع مکرہ میں مشتری دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوتا یہی صورت حال بیع الوفاء میں بھی پائی جاتی ہے، لہٰذا بیع الوفاء یا تو فاسد ہے جس سے انتفاع حرام ہے، یا بیع ہازل یا بیع مکرہ کی طرح باطل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیع الوفاء رہن ہے پس بلا ضرورت اس عقد کی کوئی گنجائش نہیں اور شئ مرہون سے انتفاع جائز نہیں۔ اس کے بعد مولانا نے تبیین الحقائق موسوعۃ الفقہیہ وغیرہ سے وہ عبارتیں نقل کی ہیں جن سے اس بیع کا فساد اور رہن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ مفتاحی صاحب بھی اس کو رہن قرار دے کر اس پر رہن کے احکامات جاری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔

مفتی جنید بن محمد صاحب ومفتی سلمان پالن پوری صاحب اس عقد کو مانتے تو رہن ہیں اور رہن ہی کے احکام جاری کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اگر سودی معاملات سے بچنے کے لیے یہ صورت اختیار کرلی جائے کہ مجلس عقد میں بیع کی واپسی کا کوئی ذکر نہ ہو، بلکہ بعد میں بطور وعدے کے ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی منظور کرلیں تو اس کی گنجائش ہے۔

مفتی محمد حذیفہ صاحب نے اس موضوع پر تفصیلی مقالہ لکھا ہے اور عربی واردو کتب فقہ وفتاوی سے بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں اور اخیر میں خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں کہ بیع الوفاء اگر چہ ظاہر الفاظ اور عنوان کے اعتبار سے بیع اور شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہے۔ مگر مقصود اور معنی کے لحاظ سے رہن ہے، اس لیے بائع راہن، خریدار مرتہن، مبیع شئ مرہون اور ثمن مرہون بہ ہے، یہی اکثر فقہاء اور اصحاب افتاء کی تحقیق ہے، لہٰذا اس شئ مرہون سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا مرتہن کے لیے جائز نہیں نہ بائع یعنی راہن کی اجازت سے اور نہ بلا اجازت، اور اگر ساتھ میں کرایہ داری کا معاملہ کرلیا ہے تو اس شئ سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، کرایہ چاہے مروج ہو یا مروج سے کم، مگر اس صورت میں بائع کے لیے لی ہوئی رقم کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں یہ رقم شئ مرہون ہے۔

اور اگر اس رقم کو قرض سمجھ کر استعمال کیا جارہا ہے تو پھر وجہ کرایہ ہونا ضروری ہے، ورنہ کرایہ کی کمی قرض سے استفادہ ہو کر سود اور ممنوع ہوگی۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ معاملہ باطل ہے اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، یہ بیع اس لیے نہیں کہ یہ حرام سود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے جس میں عظیم فساد ہے نام وشکل بدلنے سے حلال نہیں ہوگا۔ اگر اس طریقہ کو ڈاکٹر مریض کے ساتھ اپنالیں کہ ضرر رساں چیزوں کا نام اور شکل بدل کر استعمال کرنے کے لیے دے تو مریض زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالن پوری صاحب لکھتے ہیں کہ: بیع وفاء صورۃً بیع بشرط اقالہ ہے پس اس عقد میں بیع اور شرط جمع ہو رہے ہیں "اور حضور اقدس ﷺ نے بیع وشرط سے منع فرمایا ہے۔" یہ نص عام ہے اور بیع میں شرط اقالہ کا عرف خاص ہے، اصل مذہب کے اعتبار سے عرف خاص سے نص عام کی تخصیص جائز نہیں ہے، پس یہ عقد خلاف مقتضی عقد شرط جس کو عرف عام حاصل نہیں کی وجہ سے فاسد ہوگا، اور معنی رہن ہے، اس لیے فاسد قرار دینے کے بجائے اکثر

فقہائے کرام نے اس کو رہن قرار دیا ہے بندہ کے نزدیک راجح یہی ہے کہ اس کو رہن قرار دیا جائے۔
ہاں البتہ اگر اس عرف عام ہونا طے ہوتا تو یہ بیع صحیح قرار دی جا سکتی تھی، اور شرط بھی معتبر مانی جاتی۔
علامہ شامی لکھتے ہیں: ''إن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص إنما هو فيما إذا عارض النص الشرعي فلايترك به القياس ولا يخص به الأثر بخلاف العرف العام''۔
مفتی عبدالرشید صاحب قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کے تعلق سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشتری جو سامان خرید رہا ہے یا بالفاظ دیگر قرض دے رہا ہے اس کا منشاء کیا ہے؟ قرض دینا ہے یا سامان خریدنا اگر وہ قرض دے رہا ہے تو نقصان اٹھانے کو تیار رہنا چاہئے، کیونکہ قرض دینے میں تو نقصان ہوتا ہے ہی، اور اسی لیے وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے، اور اگر سامان بحیثیت مشتری خرید رہا ہے تو پھر بیع کو تام ہونا چاہیے اور جملہ احکام بیع کے لاگو ہونے چاہئیں۔
اسی لیے اکثر فقہاء کرام اور ارباب افتاء نے بیع وفاء میں مبیع کو رہن قرار دیا ہے تا کہ اس دور فساد میں فتنہ کا دروازہ نہ کھل جائے اور اس حیلہ سے لوگ سود کمانے والے نہ بن جائیں، کیونکہ عام رواج ہونے کے بعد بسا اوقات شرائط کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ ہاں بیع وفاء کی ایک شکل ایسی ضرور نکلتی ہے جو جائز ہے اور وہ یہ کہ شرط وفا عقد کے تام ہونے کے بعد ہو اور ایفائے عہد اخلاقی ہو، لیکن اس سے بائع کا مقصد تو حل نہ ہوگا، کیونکہ بائع کا مقصد اپنے سامان کی حفاظت تھی، لیکن بیع تام ہونے کے بعد مشتری اس میں من چاہا تصرف کر سکتا ہے بائع قانوناً اس کو پابند نہیں کر سکتا، ممکن ہے، بہت سے لوگ مصنوعی مجبوری دکھا کر من چاہا تصرف کر لیں، اور ایفائے وعدہ نہ کر کے اپنا الو سیدھا کر لیں۔
رہا عرف کا مسئلہ تو آج کے دور فساد میں نہ جانے کن کن چیزوں کا عرف ہو گیا ہے اور نام بدل بدل کر لوگ سود کھانے کے عجیب عجیب طریقے اختراع کر رہے ہیں، مثلاً کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مکان اور گاڑی کے کرایہ کی طرح سونے اور چاندی کو کرایہ دیں تو کیا حرج ہے۔
مولانا نعیم اختر قاسمی صاحب کہتے ہیں کہ بیع وفا میں متعاقدین ایسی شرط لگاتے ہیں جو اسے بیع کی حقیقت سے یکسر خارج کر دیتی ہے کیونکہ بیع کی روح یہ ہے کہ متعاقدین ایک دوسرے کی چیز کے اس طرح مالک بن جائیں کہ ایک کو دوسرے کی چیز سے کوئی سروکار نہ رہے اسی لیے بیع موقت درست نہیں۔
بدائع میں ہے: '' والملك يقتضي اطلاق التصرف في المملوك''۔
آگے مولانا نے شروط بیع کے صحیح ہونے کی چار صورتیں لکھی ہیں:

(۱) بیع خود اس شرط کی متقاضی ہو، مثلاً تسلیم بدلین کی شرط۔
(۲) شرط مقتضائے عقد کے موافق ہو مثلاً ادھار بیع میں یہ شرط لگائے کہ ثمن کے بدلہ مشتری کوئی سامان رہن رکھے۔
(۳) شریعت میں اس کا ثبوت ہو، جیسے خیار شرط۔
(۴) اس شرط کا تعامل ہو، جیسے تسمہ لگانے کی شرط پر نعل خریدنا بیع وفاء میں جو شرط لگائی جاتی ہے وہ اس کے خلاف ہے، لہٰذا اس کو کم از کم بیع کا نام تو نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کو کالعدم قرار دینا چاہئے مگر فقہ کا ایک قاعدہ ہے کہ ''اعمال الكلام أولى من إهماله' اب اس کو لغو ہونے سے بچانے کے لیے دیکھا تو اس کی صورت رہن کی سی ہے، اور شریعت نے اس مقصد کے لیے رہن کو شروع کیا ہے، لہٰذا معانی کا اعتبار کرتے ہوئے اس پر رہن کے احکامات جاری ہونے چاہئیں۔

آگے لکھتے ہیں کہ اس معاملہ کو بیع کا نام دے کر دائن کا اپنے دین کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کا ایک حیلہ ہو اور ایسا حیلہ جس سے کسی حکم شرعی کا مقصد ہی فوت ہو جائے درست نہیں، پھر اگر کسی علاقہ کا عرف بھی ہو گیا تو نص سے متصادم ہونے کی وجہ سے عرف فاسد ہے جو معتبر نہیں۔
مولانا شاہد علی قاسمی تحریر کرتے ہیں کہ یہ معاملہ رہن ہی ہے، لیکن اگر خریدار مکان، دوکان، کھیت وغیرہ سے فائدہ اٹھانا ہی چاہے تو ضروری ہوگا کہ وہ اس کا عوض ادا کرے اس کے لیے وہ اجارہ کا عقد کر لے اور معروف اجرت کر کے فائدہ اٹھائے، ایسی صورت میں وہ قرض سے فائدہ اٹھانے والا نہ ہوگا، بلکہ یہ فائدہ بالعوض ہوگا جس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ ایسی صورت اختیار کرنے میں مال مرہون رہن کے حکم میں باقی نہ رہے گا، بلکہ مبیع کی حیثیت مال مستاجر کی ہوگی، اور عقد اجارہ کے احکام جاری ہوں گے۔
فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر مرتہن مال مرہون کو اجارے پر لے لے تو عقد رہن باطل ہو جائے گا، کیونکہ ایک چیز میں دو جمع نہیں ہو سکتے۔
نوٹ:...... جو حضرات اس قاعدہ کو رہن مان رہے ہیں، ان میں سے بعض حضرات نے اس شکل کے جواز کی بات کہی ہے جبکہ مبیع کی واپسی کی شرط عقد تام ہونے

کے بعد لگی ہو۔

چار حضرات وہ ہیں جو اس عقد کو فاسد قرار دیتے ہیں۔

مولانا شبیر علی صاحب نے تو اس کو بیع مکرہ پر قیاس کیا ہے، جس طرح بیع مکرہ فاسد ہے اسی طرح بیع وفاء بھی فاسد ہے، مولانا محمد اعظمی نے دلیل یہ دی ہے کہ اس پر بیع کے شرعی معنی کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ بیع کا شرعی معنی ہے: ''مبادلة المال بالمال تمليكا وتملكا'' اور یہاں مشتری کا تملک وتصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ نیز یہ شرط کہ بائع کے علاوہ دوسرے کو نہ بیچا جائے مقتضائے عقد کے خلاف ہے اس لیے بھی یہ معاملہ درست نہیں، اور جب بیع ہی درست نہیں تو اس سے انتفاع بھی جائز نہ ہوگا۔ مولانا عبدالشکور قاسمی لکھتے ہیں کہ اس شکل کو رہن بھی نہیں کہا جاسکتا، اس لیے کہ شئ مرہون سے نفع حاصل کرنا سود ہے اور سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

مولانا کلیم اللہ عمری صاحب نے ''مجمع الفقہ الاسلامی جدہ'' کے فیصلہ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

بیع الوفاء

(سوال نمبر ۳)

مولانا محمد منصف بدایونی
[استاذ حدیث وفقہ، جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ]

دوکان ومکان وغیرہ کو کرایہ پر دینا اجارہ کہلاتا ہے، جس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اجیر کو اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو (ابن ماجہ کتاب الاحکام)، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی کو اجیر رکھے تو وہ اس کی اجرت اسے بتلادے (ہدایہ ۳؍ ۲۹۳)، اس سے معلوم ہوا کہ اجارہ کے جواز کے لیے یہ شرط ہے کہ معقود علیہ ''منفعت'' معلوم ہو اور اجرت ومدت اجارہ متعین ہو، لیکن آج کل ہر بڑے شہر میں اجارہ کے معاملہ میں رقم ضمانت یا ڈپازٹ کے نام پر مالکان کرایہ دار سے ایک موٹی رقم لیتے ہیں اور وہ اس رقم سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں، اس سلسلہ میں اکیڈمی کی جانب سے حضرات مفتیان کرام کی خدمت میں مندرجہ ذیل سوال بھیجا گیا تھا:

سوال: آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک مکان یا دوکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہئے، لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپے کرایہ لینے پر آمادہ ہوجاتا ہے، کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لیے زرضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہوجاتی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ زرضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت ورہن کی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا۔

اکیڈمی کی جانب سے احقر کو ۱۷ مقالے موصول ہوئے۔ ان مقالات کے سوال (۳) کے جواب کو دیکھ کر مندرجہ ذیل آراء سامنے آتی ہیں:

(۱) زرضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی کو قرض سے فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا اور ربوا ہونے کی وجہ سے وہ کمی ناجائز ہوگی اور اجرت مثل واجب ہوگی۔ یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات مفتیان کرام کی ہے:

مولانا محمد الاعظمی مئو، مولانا محمد حذیفہ بن محمود ڈیلر، مولانا محمد روح اللہ قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محمد اشرف قاسمی، مولانا عبدالرزاق قاسمی، مولانا عبدالحی مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا شبیر احمد دیولوی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا محمد فاروق، مولانا جنید بن محمد، مولانا لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد اشرف قاسمی۔

ان حضرات نے ''کل قرض جر نفعا حرام'' اور ''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' سے استدلال کیا ہے۔

مفتی انور علی اعظمی صاحب نے ''رجل استقرض دراهم واسكن المقرض فى دار قالوا يجب اجر المثل على المقرض'' (شامی ص ۷۵) اور مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی عمران اللہ قاسمی ''التحرز عن حقيقة الربا وعن شبهته واجب'' (بدائع الصنائع ۷؍۳۹۵) سے استدلال کیا ہے۔

مفتی محمد یار علی نعمانی نے ''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صفقتين فى صفقة واحدة'' (مسند امام احمد حدیث ص ۳۷۸۲ وصحیح ابن حبان ۱۰۵۳) کو مستدل بنایا ہے۔

مفتی رجیب قاسمی لکھتے ہیں: اگر کرایہ پر لینے والا اجرۃ مثل دینے کو تیار نہ ہو تو وقف میں ضرورۃ جائز ہے۔ اور الا ان يكون ما قبضه المتولى صرفه فى عمارة الوقف (رد المحتار ۷؍۴۰۰) سے استدلال کیا ہے۔

مفتی محمد زاہد لکھتے ہیں کہ اجرت مثل کے بغیر ناجائز ہے۔ اگر مقرض نے شرط لگائی ہے تو حقیقت ربوا اور اگر کمی کا عرف ہو تو المعروف کالمشروط کی وجہ سے شبہ

ربوا ہونے کی وجہ سے البتہ اگر تبرعاً تخفیف کردی ہو تو جائز ہے، التحرز عن حقيقة الربوا وعن شبهة الربوا... الخ (بدائع الصنائع ۷/۳۹۵) سے استدلال کیا ہے۔

دوسری رائے:......رقم ضمانت کرایہ دار سے دکان یا مکان خالی کرانے کے حق سے دستبرداری کا عوض ہے نہ قرض ہے اور نہ امانت ورہن۔

یہ رائے ہے مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی کی اور مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی۔

ان دونوں مفتیان کرام کی رائے ہے کہ اگر اس رقم سے انتفاع کی اجازت نہ ہو تو امانت ہے ورنہ حق انتفاع کا بدل ہے اور اس کو کل قرض جر نفعا کے تحت داخل نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا عبدالشکور، مولانا عبدالخالق صاحب کی بھی یہی رائے ہے اور انہوں نے ''فيفتي بجواز النزول عن الوظائف بمال'' (درمختار، کراچی ۴/۵۱۹) سے استدلال کیا ہے۔

مولانا غلام اللہ کاوی لکھتے ہیں: اس رقم کی وجہ سے دکان کی مالیت میں بھی نقص آجاتا ہے، اس لیے کرایہ میں کمی جائز ہوگی۔

تیسری رائے:......زرضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں ہونے والی کمی ''كل قرض جر نفعا حرام'' کے تحت داخل نہیں ہوگی۔

مفتی جمیل احمد نذیری تحریر فرماتے ہیں کہ:

اس کمی کو ''كل قرض جر نفعا حرام'' کے تحت لاکر قرض سے فائدہ اٹھانا نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ یہ تو ابن سلمہ کے قول: ''بل هذا بيع جر منفعة وهي القرض'' (شامی ۴/۱۹۶) کے انداز پر ہے۔ ''بل هذا اجارة جر منفعة وهي القرض''۔

دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ مقرض کو یہاں کوئی نقد یا عین حاصل نہیں ہورہا ہے اور فقہاء نے جرنفعا کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

''سواء كانت لمنفعة نقدا أو عينا كثيرة أو قليلة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۷۲۶)۔

۲۔ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی لکھتے ہیں کہ اجرت قلیلہ کو ہی اجرت مثل قرار دیا جائے گا، فقہاء نے جہاں زرضمانت کا تذکرہ فرمایا ہے، وہاں اجرۃ مثل کی وضاحت ان الفاظ سے کی ہے: فإذا كان بحيث لو رفعت عمارته لا تستاجر بأكثر تترك في يده بأجرا لمثل'' (شامی ۹/۳۵)، ''والواقع في زماننا أنه يستأجر بدون أجر المثل بكثير ويدفع بعض الأجرة ويقطع بعضها من العمارة وقد يقال لجوازه وجه وذلك أنه لو أراد آخر أن يستأجره ويدفع للأول ما صرفه على العمارة لا يستأجره إلا بتلك الأجرة القليلة'' (ردالمحتار ۹/۳۴)۔ لہٰذا اس اجرۃ قلیلہ کو ہی اجرۃ مثل قرار دیا جائے گا۔

مفتی حفیظ الرحمن مدنی کہتے ہیں:

اجارہ کے فاسد ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس شرط زائد نے رواج کا درجہ حاصل نہ کرلیا ہو اور اس شرط نے رواج کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔

''أما في زماننا فالعبد يأكل من مال المستاجر عادة كذا في الظهيرية'' (ہندیہ ۴/۴۴۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۳۸۲۲)۔

چوتھی رائے:......یہ ہے کہ رقم ضمانت قرض ہے۔

اس شرط کے ساتھ کہ اجارہ اور قرض دونوں معاملوں کو الگ الگ صفقہ میں کیا جائے، یعنی کرایہ میں کمی کو قرض کے ساتھ شرط کے طور پر ذکر نہ کیا جائے تو جائز ہے اور اگر کرایہ میں کمی کو قرض کے ساتھ شرط کے طور پر ذکر کیا جائے تو ناجائز ہے۔

مفتی خورشید احمد اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد منصف بدایونی، مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی۔

''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صفقتين في صفقة''

(ہدایہ، مسند امام احمد حدیث: ۳۷۸۲، وفی روایۃ عن بیعتین فی بیعۃ (سنن ترمذی ۱/۲۳۳ وسنن ابوداؤد ۲/۴۹۵)۔

''كل قرض جر نفعا حرام اى اذا كان مشروطا كما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة'' (ردالمحتار ۷/۳۹۵)۔

''وفي الذخيرة: وإن لم يكن النفع مشروطا في القرض فعلى قول الكرخي لا بأس به ... ثم رأيت في جواهر الفتاوى إذا كان مشروطا صار قرضا فيه منفعة وهو ربا وإلا فلا بأس به'' (ردالمحتار ۷/۳۹۵)۔

مولانا شاہین جمالی لکھتے ہیں کہ وقف کی جائیداد جب کرایہ کی کمی کے ساتھ رقم ضمانت لے کر دینا جائز ہے تو یہاں بھی جائز ہوگا، استدلال میں پیش کی ہے:

''الثانية أن يكون لمسجد مثلاً حوانيت موقوفة عليه واحتاج المسجد لتكميل أو عمارة الخ''
(حاشیۃ العدوی علی الخرشی ۷؍۷۹)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: یہ کرایہ میں کمی ایسی ہی ہے، جیسا کہ نقد اور ادھار بیع میں ثمن کی کمی زیادتی ہوتی ہے، حالاں کہ بالکل واضح ہے کہ ادھار بیع میں ثمن کی زیادتی اجل کے بدلے میں ہوتی ہے۔

پانچویں رائے: ......رقم ضمانت کو قرض قرار دیا جائے اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی اصلۃً قرض سے فائدہ اٹھانا ہی ہے، لیکن ضرورت اور عرف عام اور عموم بلوی کی وجہ سے جائز ہونا چاہیے۔

مفتی عبدالتواب، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا مجتبیٰ قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا زاہد حسین ندوی، مفتی عبدالرشید قاسمی نے ''الضرورات تبیح المحظورات'' اور ''المشقة تجلب التيسر قواعد'' سے استدلال کیا ہے۔

مفتی شاہد علی قاسمی نے استصناع، بیع سلم اور خیار شرط پر قیاس کیا ہے۔

رائے (۶): ......زر ضمانت اصلاً امانت ہے، لیکن کرایہ دار کی طرف سے استعمال کی اجازت ہونے کی وجہ سے قرضہ شمار ہوگی اور کرایہ میں کی جانے والی کمی بھی جائز ہوگی۔

مولانا عبیداللہ ندوی لکھتے ہیں:

جس طرح بائع کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا سامان کم قیمت پر بیچے یا زیادہ میں اسی طرح مالک کو اختیار ہوگا کہ وہ کرایہ کم متعین کرے یا زیادہ۔

مفتی رحمت اللہ ندوی:

اصلاً امانت ہے، لیکن اس کا مدار عرف اور رواج پر ہونا چاہیے۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

رہن وامانت ہے۔ اگر کرایہ دار (مقرض) اپنی خوشی سے استعمال کی اجازت دے دے تو استعمال کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے۔ اس طرح یہ کل قرض جر نفعا کے تحت نہیں آئے گا اور اگر یہ رقم ضائع ہوجائے تو ضامن قرار دیا جائے گا۔ اس طرح یہ ''الغرم بالغنم'' قاعدہ کے تحت قرض پر فائدہ اٹھانا نہیں سمجھا جائے گا۔

مفتی محمد حذیفہ:

رہن ماننے کی صورت میں استعمال کی اجازت نہیں ہوگی اور کرایہ میں کمی جائز ہوگی اور قرض ماننے کی صورت میں استعمال کی اجازت ہوگی، لیکن کرایہ میں اجرت مثل سے کمی جائز نہیں ہوگی۔

مولانا محمد عمران ندوی:

رہن وامانت ہے، لیکن ضرورت ناس کی وجہ سے اجرت مثل سے کمی کی اجازت ہونی چاہیے۔

مفتی محمد خالد حسین نیموی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی کی رائے ہے کہ امانت ہے، مالک کی اجازت سے تصرف جائز ہوگا، لیکن اجرت مثل سے کمی جائز نہیں ہے۔

مولانا یوسف علی لکھتے ہیں:

امانت ہے اور کرایہ کی کمی جائز ہوگی، کیونکہ یہ تراضی طرفین سے ہے۔

رائے نمبر ۷: ......زر ضمانت میں واپسی کی شرط نہ ہو اور اس کو موجر کی ملک سمجھا جائے تو یہ اجرت معجلہ ہے اور مثلاً ماہ بماہ دی جانے والی اجرت، اجرت مؤجلہ ہے۔

رائے دہندگان: محمد منصف بدایونی، مولانا محمد یاسر قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالخالق ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا محمد اعظمی، میں سمجھتا ہوں کہ اس رائے میں کسی کا اختلاف نہیں ہوگا۔

''نعم جرت العادة أن صاحب الخلو حين يستأجر الدكان بالأجرة اليسيرة يدفع للناظر دراهم تسمى خدمة هي في الحقيقة تكملة أجرة المثل أو دونها، فهذه تحسب من الأجرة ايضا'' (ردالمحتار ۴؍۱۷، فتاویٰ محمودیہ ۵؍۱۲۷)۔

رائے نمبر ۸: ......یہ معاملات کی جدید شکل ہے۔

جس طرح بیع سلم میں بائع اور مشتری دونوں ایک دوسرے سے مستفید ہوتے ہیں اسی طرح یہاں موجر اور مستاجر بھی ایک دوسرے سے مستفید ہوتے ہیں اس لیے کرایہ کی کمی درست ہے۔

یہ رائے ہے: مولانا کلیم اللہ عمری۔

البتہ مولانا محمد سالم اعظمی نے اس زرضمانت کے لینے کو ہی ناجائز لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: کیونکہ یا تو یہ زرضمانت قرض ہے یا رشوت یا حقوق مجردہ کی بلاعوض بیع ہے اور ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے۔

تیسرے سوال کا جواب نہ لکھنے والے حضرات:

مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد کامل قاسمی، مولانا زین العابدین، مفتی ریاست علی رامپور، مولانا سید قمر الدین محمود، مفتی محمد عادل خان ندوی، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی روح الامین، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری۔

مذکورہ مفتیان کرام کے مقالات میں تیسرے سوال کا جواب احقر کی نظر کی گرفت میں نہیں آسکا۔

احقر کی رائے میں رقم ضمانت قرض قرار دیا جائے، البتہ قرض کا معاملہ الگ کیا جائے اور دوسری مجلس میں کرایہ داری کا معاملہ کیا جائے یا اس کے برعکس پہلے اجارہ کا معاملہ کرلیا جائے پھر قرض کا معاملہ ہو۔ اس طرح کرایہ کی کمی جائز ہوگی اور اس کو قرض پر فائدہ اٹھانا نہیں کہا جائے گا۔

(۱) ''كل قرض جر نفعا حرام أى إذا كان مشروطا كما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة وفى الذخيرة: وإن لم يكن النفع مشروطا فى القرض، فعلى قول الكرخى لا بأس به... ثم رأيت فى جواهر الفتاوى إذا كان مشروطا صار قرضا فيه منفعة وهو ربا، وإلا فلا باس به'' (رد المحتار باب المرابحه والتوليه، مطلب كل قرض جر نفعا حرام) ۔علامہ شامی نے قلت کے تحت فرمایا:'' ويؤيد ما ذكروه فيما لو اهدى المستقرض للمقرض ان كانت بشرط كره وإلا فلا'' (حوالہ مذکورہ)۔

(۲) اگر مستقرض (قرض دار) مقرض (قرض خواہ) سے کوئی معمولی چیز زیادہ ثمن کے بدلے خریدے تو کرخیؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک بلاکراہت جائز ہے۔

''فشراء الشئ اليسير بثمن غال لحاجة القرض يجوز ويكره اى يصح مع الكراهة، وهٰذا لو الشراء بعد القرض لما فى الذخيرة، وإن لم يكن النفع مشروطا فى القرض ولكن اشترى المستقرض من المقرض بعد القرض متاعا بثمن غال فعلى قول الكرخى لا بأس به... ومحمد لا يرى بذلك بأسا''۔

اور خصاف کے نزدیک یہ صورت مکروہ ہے: وقال الخصاف ما احب له ذلك، اور اگر بیع پہلے ہو اور قرض کا معاملہ بعد میں ہو تو خصاف اور محمد بن سلمہ امام بلخ کے نزدیک بلاکراہت جائز ہے۔

ہذا اذا تقدم الاقراض على البيع فإن تقدم البيع... ذكر الخصاف أنه جائز وهٰذا مذهب محمد بن سلمة امام بلخ۔

اور شمس الائمہ حلوانی خصاف کے اسی قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ''وكان شمس الائمة الحلوانى يفتى بقول الخصاف''۔

البتہ بہت سے مشائخ بلخ اس کو قرض پر فائدہ اٹھانا ہی قرار دیتے ہوئے اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔

''وكثير من مشائخ بلخ كانوا يكرهونه ويقولون: إنه قرض جر منفعة إذ لولاه لم يتحمل المستقرض غلاء الثمن''،

جبکہ دیگر مشائخ فرماتے ہیں کہ اگر معاملہ الگ الگ مجلس میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

''ومن المشائخ من قال يكره لو كانا فى مجلس واحد وإلا فلا باس به'' (ردالمحتار ۷/ ۳۹۷)۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امام کرخی اور امام محمدؒ کے نزدیک دونوں معاملے اگر الگ الگ ہوں تو بلاکراہت جائز ہے اور اگر بیع یا اجارہ پہلے ہو اور قرض کا معاملہ بعد میں ہو تو خصاف، محمد بن سلمہ اور شمس الائمہ حلوانی بھی بلاکراہت جائز قرار دیتے ہیں۔

قرض کے ساتھ اجارہ کا جواز عرف عام کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا ''المشقة والحرج إنما يعتبر فى موضع لا نص فيه، وأما مع النص بخلافه فلا... ولا اعتبار عنده بالبلوى فى موضع النص كما فى بول الآدمى فإن البلوى فيه اعم'' (الاشباہ والنظائر ص ۱۳۸)۔

اب رہا قرض میں تاجیل کا مسئلہ: تو اس میں یہ عرض ہے کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے۔ حنفیہ کی دلیل مہلت نہ دینے کے سلسلہ میں یہ ہے کہ قرض ایک تبرع ہے اور

مہلت دینا یہ دوسرا تبرع ہے اور ایک تبرع سے دوسرا تبرع لازم نہیں ہوتا۔

یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ کیا تعامل کی وجہ سے تاجیل کو لازم کیا جاسکتا ہے یا نہیں، احقر کی رائے میں یہاں عرف وتعامل مؤثر ہونا چاہئے اور اگر اس کو مؤثر نہ مانا جائے تو قرض میں تاجیل کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقرض نے مستقرض کو مہلت دینے کا ایک وعدہ تو کیا ہی ہے کہ میں فلاں وقت تک تم سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کروں گا اور وعدہ پورا کرنا بھی لازم ہو جایا کرتا ہے۔

''وقد یلزم الوعد لحاجة الناس'' (البحر الرائق ۶ / ۱۲) کیونکہ مہلت کو اگر لازم نہ قرار دیا جائے تو مستقرض کا مقصد اور ضرورت پوری نہیں ہو سکتی اور کبھی اس کو بہت بڑا نقصان بھی اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ الغرض رقم ضمانت کے نام سے لی گئی رقم کو قرض ماننا ان وجوہات کی بناء پر راجح ہے:

(۱) قرض ماننے کی صورت میں مالک مکان اس رقم سے بلا خطر فائدہ اٹھا سکتا ہے، برخلاف رہن سے انتفاع کے کہ اجازت کے بعد بھی اس میں کلام ہے۔

(۲) رہن سے انتفاع کی اجازت سے وہ رقم رہن سے نکل کر قرض کے دائرہ میں ہی آجاتی ہے۔

(۳) قرض ماننے کی صورت میں کرایہ دار یا مالک مکان میں سے کسی کے انتقال کے بعد کوئی پیچیدگی لازم نہیں آئے گی کہ اس کو ترکہ سے وصول کرلیا جائے گا برخلاف رہن کے کہ اس میں پیچیدگی پیش آسکتی ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب:...... تفصیلی مقالات

بیع وفاء اور رہن سے استفادہ کا شرعی حکم

ڈاکٹر شیخ محمد محروس المدرس الاعظمی الحنفی، عراق[1]

ائمہ حنفیہ کے نزدیک ثابت شدہ حکم:

مال مرہون سے انتفاع کا عدم جواز ایک ثابت شدہ امر ہے، کیونکہ:

☆ مرتہن کو اس کی اجازت نہیں ہوتی، بلکہ اسے مال مرہون کو اپنے پاس صرف روکے رکھنے کا حق ہوتا ہے۔

(الاختیار لتعلیل المختار للموصلی الحنفی (متوفی: ۶۸۳) ۲/۶۶، مطبع بابی الحلبی قاہرہ ۱۳۷۰، مطابق ۱۹۵۱ھ، باہتمام محمد ابو دقیقہ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للکاسانی متوفی: ۵۸۷ھ، ۸/۴۱۷۲، مطبع عاصمہ قاہرہ، تقدیم احمد مختار عثمان)۔

مال مرہون سے حاصل ہونے والی آمدنی سے بھی استفادہ نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اس زائد آمدنی کے مقابلہ میں کسی چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ربا (سود) کا شبہ ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ رہن سے حاصل ہونے والی آمدنی کا حقدار راہن کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

مشائخ بلخ نے اس میں حیلہ سے کام لیا ہے اور مشائخ بخاری نے اسی وجہ سے اس کا نام "بیع وفاء" رکھا ہے۔

بیع وفا کی دو صورتیں ہیں:

۱- مشتری بائع سے کہے کہ اس سامان کو میں اس دین کے عوض فروخت کر رہا ہوں جو تمہارا ہمارے ذمہ ہے۔

۲- یا یہ کہے کہ میں اس سامان کو تم سے اس شرط پر فروخت کر رہا ہوں کہ جب میں تم کو اس کی قیمت ادا کردوں گا تو تم واپس مجھے ہی فروخت کردینا

(رد المحتار علی الدر المختار ۵/۲۷۶، مطبع مصطفی الحلبی قاہرہ)۔

اس کے جائز قرار دینے کی وجہ: یہ ہے کہ اہل بلخ میں عام طور سے دین اور اجارہ کا رواج تھا- جس کی صورت ابھی آگے رہی ہے- اور دین اور اجارہ کروم (انگور کے باغات میں) درست نہیں ہوتا ہے۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قرض لینے والا ایک مخصوص اور متعین مقدار قرض لیتا ہے اور قرض لینے والا قرض دہندہ کو کوئی اپنی چیز کرایہ پر دیتا ہے اور اس کی حفاظت کے بدلہ ہر ماہ ایک متعین مقدار میں رقم بھی ادا کرتا ہے جو اس چیز کی قیمت سے زائد نہیں ہوتی

(الاشباہ والنظائر لابن نجیم متوفی: ۲۷۰ / ۱۲۰، موسسۃ الحلبی ۱۹۶۸)۔

اور اہل بخاری طویل مدت تک کے اجارہ کے عادی تھے اور یہ درختوں میں ممکن نہیں تھا (بزازیہ ۱/۴۰۸، الاشباہ والنظائر/ ۱۰۳، سابقہ دونوں مراجع، صاحب اشباہ نے ان دونوں مراجع سے استشہاد کیا ہے)، اور اپنی گفتگو میں قاعدہ: "العسر تجلب التیسیر" بھی پیش کیا ہے۔

سوال:...... یہاں یہ سوال ہے کہ اگر قرض دینے والا یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کے قرض سے اس کو نفع پہنچے تو اس کے لیے کون سا حیلہ اختیار کیا جائے کہ اس کا نفع حرام نہ ہو، تو اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ سے منقول ہے، جیسا کہ امام محمد نے (کتاب الصرف) میں نقل کیا ہے کہ "یکرہ کل قرض جر نفعا" (ہر وہ قرض جو نفع کو کھینچے وہ مکروہ ہے) (الفتاوی الہندیہ ۳/ ۲۰۲- ۲۰۳، طبع بولاق ۱۳۱۰ھ مکتبۃ المثنی بغداد، بدائع الصنائع ۱۰/ ۴۹۸۳، رد المحتار علی الدر المختار ۵/۱۶۶، ۱۶۷)۔

---

[1] عربی سے اردو ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی (رفیق شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)۔

اور کرخی (حنفی فقیہ اور اصولی عالم جن پر بغداد میں حنفیت کی سرداری ختم ہوگئی (متوفی: ۳۴۰ھ)) کہتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب صلب عقد میں نفع مشروط ہو، اگر مشروط نہ ہو تو نفع جائز ہے، اس طرح کہ وہ اس کی طرف سے جو اس نے لیا تھا اس سے اچھی چیز لوٹا رہا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص دوسرے کو اس طرح قرض دے کہ اس سے زیادہ قیمت کا سامان خرید دے تو یہ مکروہ ہوگا، اگر اس کی قرض دیتے وقت شرط لگا دے، اگر زیادہ قیمت کا خریدنے کی شرط نہ لگائے اور وہ خرید لے تو کرخی کی رائے کے مطابق کوئی حرج نہیں ہے (سابقہ مراجع)۔

اور خصاف کہتے ہیں کہ میں دونوں صورتوں میں اسے مناسب نہیں سمجھتا، اور شمس الائمہ حلوانی کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے، اور کتاب الصرف میں امام محمد شیبانی سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ سلف نے تمام کے مکروہ ہونے کی صراحت کی ہے، اس کے باوجود امام موصوف کہتے ہیں کہ اگر قرض لینے والا قرض دہندہ کو ہدیہ کچھ پیش کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے (مذکورہ حوالہ جات)۔

اور محمد بن سلمہ بلخی کی رائے یہ ہے کہ بیع کو قرض پر مقدم رکھا جائے گا، اور اسی کو خصاف اور حلوانی نے اختیار کیا ہے۔

اس کی صورت یہ ہے کہ قرض دینے والا کوئی چیز جس کی قیمت بیس درہم ہو چالیس درہم میں بیچ دے اور پھر اسی کو ساٹھ درہم قرض دے تو اس کے ذمہ سو درہم ہو جائے گا، اور محمد بن سلمہ کی رائے میں اس سامان کو اسی طرح فروخت کیا جاتا ہے، ان کی رائے میں جواز کے لیے ایک دوسرا حیلہ بھی ہے، جس کی رو سے بلا کراہت انہوں نے جائز قرار دیا ہے، اور متاخرین کے مقتدر حضرات نے ان کی متابعت کی ہے، وہ یہ ہے کہ قرض لینے والا قرض دہندہ کو کسی چیز جیسے چھری اور کنگھی کی حفاظت یا دین کے دستاویز کی حفاظت کے لیے اس کو اجیر مقرر کرلے (تو یہ بلا کراہت جائز ہے) (فتاوی ہندیہ ۳/ ۲۰۲، ۲۰۳)

اور دوسرے حضرات نے دین کے وثیقہ (دستاویز کی حفاظت کو اس کے اپنے لیے حفاظت قرار دیا ہے، اس لیے وہ اجیر مقرر ہونے کے باوجود اس پر اجرت کا مستحق نہیں ہوگا (فتاوی ہندیہ ۴/ ۵۲۲، الفتاوی البزازیہ ۲/ ۴۹، ۵۰ طبع بولاق ۱۳۱۰ھ)۔

بعض حضرات اس اجارہ کے مطلقا عدم جواز کی طرف گئے ہیں، اور بعض کراہت کے ساتھ جواز کی طرف اور کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ دو عقد دو مجلس میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر ایک مجلس میں ہو تو مکروہ ہے (بزازیہ، درمختار ردالمحتار سابقہ صفحات، ہندیہ ۳/ ۲۰۲، ۲۰۳)۔

سوال:.....سوال یہ کہ قرض خواہ (دہندہ) اگر یہ چاہتا ہو کہ مقروض کے گھر میں بغیر اجرت کے رہے تو اس میں حیلہ کی کیا شکل ہوگی؟

ابوبکر اسکاف کی رائے یہ ہے کہ اگر معلوم اجرت اور کم مدت کے لیے مقروض کا گھر کرایہ پر لیتا ہے اور پھر قرض دہندہ مقروض سے کوئی چیز اسی اجرت کے بدلہ معمولی قیمت میں خریدتا ہے، یہاں تک کہ اجرت اس قیمت کا بدلہ اور عوض قرار پا جائے جو اس نے قرض لینے والے سے بیچا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے (دونوں کے برابر سرابر ہونے کی ہونے کی وجہ سے) (فتاوی خانیہ ۲/ ۳۰۹)۔

یہاں ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ اس طرح کے مسائل کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے (انہیں میں ابوالقاسم صفار بلخی ہیں وہ ایک مسئلہ: اگر قرض دہندہ مقروض کے ترازو کا باٹ روزانہ کرایہ پر لیتا ہے، تو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر اس باٹ اور پتھر کی کوئی اجرت نہ ہو اور نہ لوگوں میں اس کو کرایہ پر لینے کا رواج ہو تو اجرت واجب نہیں ہوگی (دیکھئے ہماری کتاب: مشائخ بلخ من الحنفیۃ وما انفردوا بہ من المسائل الفقہیہ ۲/ ۷۹۸ طبع وزارت اوقاف عراق/ ۱۹۷۹) میں ذکر کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر ان اقوال کی نسبت محمد بن سلمہ بلخی اور ابوبکر اسکاف کی طرف درست ہے، اور جو ان کے اقوال ہونے کی بنیاد پر لیا جا رہا ہے، تو اس میں سود کی نیت ظاہر ہے، جس کے جواز کی طرف اس میں رہنمائی کی گی ہے تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اجرت کے نام پر سود خوری ہے، اور اس کو اس شرعی وصف کے ساتھ متصف کرنا بھی نہ تو قطعا مناسب ہے اور نہ ہی اس کی شریعت میں کوئی گنجائش ہے۔

البتہ میں نے اس کو شرعی ضابطوں یا حیلوں کے ذریعہ قبول کرنے کے سلسلہ میں، اپنے جامعہ ازہر کے پی ایم ڈی کے مقالہ میں چند شرائط وقیود لگائے ہیں جو اس طرح ہیں:

۱- اس کے ذریعہ حرام سے نکلا جا سکتا ہو اور حلال تک رسائی حاصل ہو سکتی ہو (درالحکام شرح مجلہ الاحکام علی حیدر ۲/ ۳۹۱)۔

۲- یہ کہ اس حیلہ کی وجہ سے، الف: کسی شرعی حکم کا ابطال لازم نہ آتا ہو۔

ب- یا کسی حرام کو حلال قرار نہ دیا جا رہا ہو۔ ج- یا اس میں عمومی مقاصد شرعیہ سے انحراف لازم نہ آتا ہو۔

۳- کسی آدمی کے حق کا ابطال نہ ہوتا ہو۔

۴- کسی معتبر اصل شرعی، یا ایسے مقاصد جن کی حفاظت ورعایت شرعا مطلوب ہو ان کے ابطال کا سبب نہ بنے۔

(دیکھئے: ہماری کتاب: مشائخ بلخ ۲/۷۸۹، ۷۹۱، نیز سابقہ مراجع: ہندیہ ۶/ ۳۹۰، بدائع الصنائع ۶/ ۲۷۵۱، ردالمحتار ۳/ ۷۸۴)۔

اور حضرات فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ اس بارے میں اس مفتی سے مسئلہ بھی دریافت نہ کیا جائے جن کے بارے میں فتوی میں تساہل برتنا یا غلط اور فاسد مقاصد کے لیے حیلے اختیار کرنا مشہور و معروف ہو (فتاوی ہندیہ ۳/ ۳۹۰)۔

نیز اس کی صحت کے بارے میں معاصر علماء میں سے سابق شیخ الازہر مرحوم عبد الرحمن تاج نے بھی اختلاف کیا ہے۔

(دیکھئے: ہماری کتاب: مشائخ بلخ ۲/ ۸۰۰ اور سابقہ مراجع)۔

مذکورہ تفصیلات کے بعد اب ہم بیع وفاء کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں:

اس بیع کے جواز اور کیفیات کے سلسلہ میں شروع سے ہی متعدد اقوال چلے آرہے ہیں، یہاں تک کہ نو اقوال تک کا احاطہ کیا گیا ہے (دیکھئے: ہماری کتاب: مشائخ بلخ ۲/ ۸۰۰، اور سابقہ مراجع) تاہم ہم نے اس کو صرف دو نقطہ نظر میں محدود و محصور کرنے کی کوشش کی ہے:

اول: یہ کہ یہ جائز ہے اور عقد صحیح ہے، لہذا مشتری کو فی نفسہ مبیع وفاء سے بھی انتفاع کی گنجائش اور اس سے جو منافع ہوں گے اس سے بھی یہاں تک کہ خود بائع کو کرایہ پر دے کر بھی فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور خریدار مبیع وفاء سے حاصل ہونے والی آمدنی اور نمو کا مکمل مالک ہوگا۔

دلیل: اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے معاملہ کرتے وقت لفظ بیع کا استعمال کیا ہے اور معاملات میں بغیر لفظ کے صرف نیت کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص ایک سال کے بعد طلاق دے دینے کی نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے تو اس کا نکاح منعقد ہوگا اور یہ متعہ قرار نہیں پائے گا۔

(دیکھئے: ردالمحتار و درالمختار، بزازیہ دونوں کے سابقہ مقامات و صفحات)۔

اصحاب رائے اس معاملہ میں اس نتیجہ تک پہنچے ہیں، کہ ابوبکر اسکاف کہتے ہیں کہ مشتری نے بائع سے مبیع لوٹاتے وقت کرایہ داری سے جو آمدنی حاصل ہوئی ہو اس کے واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا، تو وہ وعدہ نہ تو لازم ہوگا اور نہ ہی اس کی واپسی ضروری ہوگی، اور اگر مشتری نے وعدہ پورا نہیں کیا تو اس پر کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوگا اور بائع مشتری سے ادنی اجرت کا بھی مستحق نہیں ہوگا۔

اگر صلب عقد میں شرط لگادی جائے تو بیع فاسد ہوگی (دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۴/ ۵۲۸)۔

دوم: دوسرا قول یہ ہے کہ یہ معاملہ حقیقت میں رہن ہے، اور اس کے مندرجہ ذیل احکام ہیں:

- مبیع پر مشتری کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی۔
- بغیر بائع کی اجازت کے کسی طرح کا بھی نفع نہیں اٹھا سکتا۔
- اگر اس میں سے کچھ کھالے تو ضامن ہوگا۔
- اگر کچھ تلف کردے تو بھی ضامن ہوگا۔
- مبیع ہلاک ہوجائے تو دین ساقط ہوجائے گا۔
- ہلاک شدہ مبیع کی قیمت سے جو زائد ہوگا امانت کی طرح ضامن نہیں ہوگا۔
- اور دین ادا کرتے وقت اس کو واپس کرے گا۔

دلیل یہ ہے کہ اس میں عاقدین کے مقاصد کا اعتبار ہے، اور اس کو جائز قرار دینے میں سود خوری کا حیلہ ہے۔

میں کہتا ہوں:

- یہ نقطہ نظر جسے "مجلة الاحکام العدلیہ" میں معاملات کے مغربی نظریہ (شہری قوانین) کے ڈھانچہ سے اخذ کیا گیا ہے، اور کتاب کی جلد اول کی چھٹی فصل میں مذکور ہے، اور جس کے مادے کے نمبرات یہ ہیں: ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳۔

ان مذکورہ مادوں اور دفعات سے یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ یہ امانات کے احکام سے اخذ کیا گیا ہے، مثلاً رہن حیازی (صرف مالکانہ حیثیت کا رہن) ان مادوں کے اجمالی مفاہیم اسی پر دلالت کرتے ہیں، اگرچہ اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے، نیز فقہ اسلامی میں دونوں رہنوں (رہن تامینی، رہن حیازی) کے درمیان فرق بھی نہیں کیا گیا ہے، اسی لیے اگر رہن کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے رہن حیازی ہی مراد لیا جاتا ہے، اسی لیے انہوں نے از اول تا آخر کہیں الگ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

۲- اور عراق کا شہری قانون جو ۱۹۵۱ء میں مرتب ہوا تھا اس کے مادہ (۴۱) میں اس کی صراحت ہے کہ بیع وفا ''رہن حیازی'' ہے، جس کی قانونی دفعہ (۱۳۳۳) ہے، ان میں رہن حیازی کے مندرجہ ذیل احکام بیان کیے گئے ہیں:

بیع وفاء کی حقیقت:

اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں دو بنیادی معاملے ہیں:

اول: سوال یہ ہے کہ اس کے احکام کی بنیاد عرف عام پر ہے، یا مطلق عرف پر ہے (اشباہ لابن نجیم/۱۰۲)، یہاں پر ہمارے لیے بنائی کی اجرت اور بازار میں آواز لگانے والے اور دلال کی اجرت (اجارہ کی بحث میں) کا مسئلہ قابل غور ہے کہ کیا یہ جائز ہے کہ اس کو طحان (پسائی) کی اجرت پر قیاس کیا جائے، جس کی ممانعت سنت میں وارد ہے: ''نهى رسول الله ﷺ عن قفيز الطحان'' (نصب الرایہ ۴/۱۴۰ طبع المجلس العلمی الہند ۱۳۵۷ھ، ۱۹۳۸ء)۔

اس کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا گندم، پیسنے والے کو پیسنے کے لیے دے اور پسائی کی اجرت اسی آٹے سے ادا کرے، اس کی ممانعت آئی ہے۔

اور نساج کا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص بنائی کے لیے کسی کو دھاگا دے، جس سے وہ کپڑا بنے اور اس میں ایک تہائی یا ایک چوتھائی اجرت میں لے لے، تو اس کی ممانعت کو قفیز طحان، ہی کی ممانعت پر قیاس کیا گیا ہے۔

لہذا ان معاملات کا حکم یہ ہوگا:

- عامل کام کرنے والا اجرت مثل کا حقدار ہوگا، جو اجرت مسمی سے زائد نہ ہو اور معاملہ درست ہو جائے گا۔
- جواز کے باوجود جانبین کی طرف سے اسے فسخ قرار دیا جائے گا۔
- یہ معاملہ درست ہو جائے گا، فساد کے اسباب ختم ہو جانے کی وجہ سے اور فساد کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

محل کا مجہول ہونا۔

عاقدین میں سے کسی ایک کے لیے نفع کی شرط لگانا۔

معاملہ کے اس جز کا درست ہونا جس طرح سے شروع ہوا ہے۔

بیع فاسد کا عمومی حکم یہی ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ قفیز طحان کی شرط کے باوجود یہ معاملہ درست ہے، لہذا اس کے لیے اس پسے ہوئے آٹے میں سے بھی اجرت دینا جائز ہوگا اور اس کے علاوہ سے بھی، اس لیے کہ اس کا ناپ معلوم ہے (المبسوط للسرخسی (متوفی ۴۸۳) ۵/۸۹، ہدایۃ المہتدی شرح بدایۃ المبتدی للمرغینانی (متوفی ۵۹۳) ۳/۲۸۹، مطبع حصصفاتی لکھنؤ ۱۳۰۴، بتعلیق محمد عبدالحئ اللکنوی الحنفی (متوفی: ۱۳۰۴ھ))۔

مشائخ بلخ، بخاریٰ اور خوارزم اور ابوعلی نسفی کی رائے یہ ہے کہ غزل اور نسخ (بنائی) میں بھی عرف کی وجہ سے اسی میں سے مزدوری دینا جائز ہے۔
(درمختار و ردالمحتار ۵/۲۸۰، بزازیہ ۲/۳۰۵، فتاوی ہندیہ ۴/۴۴۵)۔

اور قاضی خاں کی عبارت ان کے فتاوی میں ہے: ''اس میں بطور خاص علماء بلخ کا قول ہے''، اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کو اختیار کیا ہے (النوازل للسمرقندی (متوفی ۳۷۵ھ)، ردالمحتار ۵/۲۸۰)۔

اور جو کچھ نوازل ابواللیث سمرقندی میں ہے، اس سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ابونصر سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر لوگوں پر کسی طرح کی کوئی شرط نہ لگائی جائے تو یہ جائز معاملہ ہے، اور اگر شرط لگادی جائے تو محمد بن سلمہ کے قول کی رو سے یہ جائز نہیں ہے اور نصیر اور فقیہ ابواللیث کہتے ہیں کہ متقدمین علماء کی رائے کے مطابق کپڑا بنائی میں تہائی اور چوتھائی کی اجرت والی شرط جائز نہیں ہے، لیکن مشائخ بلخ اسی کو بہتر اور تعامل ناس کی وجہ سے جائز قرار دیتے ہیں، اور میں فقیہ ابواللیث کی اس رائے کو اختیار کرتا ہوں (النوازل للسمرقندی ابواللیث باب الاجارات)۔

مجوزین کے دلائل:

قیاس کو عرف اور تعامل کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے اور ان کے شہروں کا عرف اور لوگوں کا تعامل یہی ہے، چنانچہ امام سرخسی کہتے ہیں:

۱- قیاس کو عرف کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے، جیسا کہ استصناع میں ہوتا ہے۔

۲- پھر یہ کہ اس میں منفعت بھی ہے کہ اس کی وجہ سے بنائی والا جلدی بن دے گا، اور بالخصوص اس وقت جب اس کپڑے میں سے اس کا بھی حصہ ہو (مبسوط للسرخسی ۱۵/۹۰)۔

لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نص کی تخصیص عرف خاص کی وجہ سے جائز ہے۔

۲- عرف خاص کی وجہ سے قیاس ترک کردیا جاتا ہے تو:

عرف خاص کو مندرجہ ذیل مقامات میں اختیار کرنا درست ہوگا:

الف- جس میں کوئی نص نہ ہو۔

ب- اور جہاں کوئی قیاس نہ ہو۔

بلکہ یوں کہیے کہ اس کو اختیار کرنا اولی ہوگا، لہذا بیع وفاء کو اختیار کرنا بعض ممالک اور بلاد کے تعارف کی وجہ سے درست ٹھہرا، اور اسی کو بڑی تعداد (علماء کی) نے اختیار کیا ہے۔

اور جو لوگ عرف خاص کو معتبر نہیں مانتے ان کے نزدیک اور یہ کہا گیا ہے کہ یہی مذہب ہے کہ کوئی عام حکم خاص عرف سے ثابت نہیں ہوسکتا، تو وہ تو عام ہی سے ثابت ہوگا (الاشباہ والنظائر/ ۱۰۲، ۱۰۳ اور اس کے بعد کے صفحات)۔

جبکہ علماء اور فقہاء کی بڑی تعداد ایسی ہے جس نے مشائخ بلخ کی رائے اختیار نہیں کی ہے، یہاں تک کہا گیا کہ فتوی کتاب کے جواب کے مطابق ہونا چاہیے، اس لیے کہ اس پر نص موجود ہے، ورنہ نص کا ابطال لازم آئے گا (کتاب سے مراد مبسوط ہے، اور اس میں ظاہر روایت کو نقل کیا گیا ہے، رد المحتار ۵/ ۲۸۰)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشائخ بخاری جنہوں نے کتاب کے جواب کو اختیار کیا ہے وہ حضرات نساج کی اجرت کے جواز کا فتوی نہیں دیتے تھے، لہذا قفیز طحان کے معنی کی طرح کہ برابر سرابر تو جائز ہے، زیادتی ممنوع۔ (فتاوی ہندیہ ۵/ ۲۷)۔

جبکہ ماقبل میں جو ذکر کیا گیا ہے یہ اس کے خلاف ہے، لہذا جب کتاب کے جواب کو اختیار کرنا درست ہے، تو جواز کا قول بھی تو بطور خاص مشائخ بلخ کی رائے ہے اس سے تو مزید احتمال اور قوی ہوجاتا ہے، اور جواز کے قائلین کی دلیل کو صدر الشہید کے قول سے پہلے ہی رد کیا جاچکا ہے، ان کا قول ہے: "میں مشائخ بلخ کے استحسان والے قول کو اختیار کرنے کی بجائے اپنے اصحاب متقدمین کے قول کو اختیار کرتا ہوں، اس لیے کہ کسی ایک شہر کا تعامل جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، جب تک کہ وہ شروع دور سے نہ چلا آرہا ہو، تب جاکر وہ تقریرات نبی کی طرح دلیل بنے گا اور اس سے حکم شرعی کو ثابت کیا جاسکے گا، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر لوگوں کا تعامل حجت نہیں بنے گا، اگر تمام کے تمام لوگ، اور تمام شہروں کے لوگ کسی چیز کو برتتے ہوں تو وہ اجماع قرار پاجاتا ہے، اور اجماع حجت ہے، آپ اس پر غور نہیں کرتے کہ اگر شراب کی خرید وفروخت اور سود خوری کا لوگوں میں تعامل اور عرف ہوجائے تو بھی اس کی حلت کا فتوی نہیں دیا جائے گا" (رد المحتار سابق مقامات وصفحات)۔

فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ دلالت النص نہ تو عام ہوتی ہے اور نہ اس کے ذریعہ عرف میں سے کسی عرف کی تخصیص کی جاسکتی ہے، جیسا کہ مشائخ بلخ سوچتے ہیں، اور غلہ کو بعض غلہ لانے والے کے ڈھیر سے اٹھا لینے کو اور کپڑا بنائی میں اس سے کپڑا لے لینے کو جائز کہتے ہیں عرف اور اہل بلاد کے تعامل کی وجہ سے، اور جو حضرات اس کو جائز نہیں کہتے وہ اس کو قفیز طحان پر قیاس کرتے ہیں اور قیاس عرف کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے۔

اور اگر ہم یہ کہیں کہ یہ جواز قیاس کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ نص کی اس دلالت کی وجہ سے ہے جو اس کو شامل ہے تو پھر نص عرف کے لیے مخصص ہوگی، آپ غور نہیں کرتے کہ استصناع کی وجہ سے قیاس کو ترک کردیا جاتا ہے، اور اعراف وتعامل کی وجہ سے ان قواعد سے اس کی تخصیص کرتے ہیں جن سے استصناع ممنوع قرار پاتا ہے، جبکہ ہمارے مشائخ اس تخصیص کی اجازت نہیں دیتے، اس لیے کہ یہ کسی ایک شہر کے لوگوں کا تعامل ہے اور اس کی وجہ سے کسی اثر اور نص کو خاص نہیں کیا جاسکتا، برخلاف استصناع کے کہ اس کا تعامل تمام شہروں اور ممالک میں ہوتا ہے اور اس قسم کے عمومی اعراف وتعامل کی وجہ سے قیاس کو بھی ترک کردیا جاتا ہے اور نص کی تخصیص بھی ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے قیاس کو نہیں چھوڑا ہے، بلکہ قفیز طحان کے بعض معنی کی دلالت کی وجہ سے عرف کے سبب تخصیص کی گئی ہے، جیسا کہ مشائخ بلخ نے کپڑے کی بنائی والے مسئلہ میں لوگوں کے تعامل کی وجہ سے کہا ہے، تو پھر نص کی دلالت میں اتنا عموم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے تخصیص کی جائے (رد المحتار ۶/ ۵۸ اور اس کے بعد کے صفحات) تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ عرف کی وجہ سے قیاس کو ترک کردینے کا مسئلہ تمام معتبر فقہی متون اور کتابوں میں مصرح ہے (الدر المختار ۴/ ۳۶۴)۔

لہذا مندرجہ ذیل دو معاملوں میں حکم محصور ہو جائے گا:

الف- وہ قیاس جس کو عرف کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے۔

ب- وہ عرف جس کو قیاس کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اور یہ اس وقت ہوگا جب اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ قفیز طحان والی نص عام ہے، تاکہ عام نہ ہونے کی صورت میں عرف کے ذریعہ اس کو خاص کیے جانے کی تحقیق کی جائے، میرا قلبی رجحان اس طرف ہے کہ وہ عرف جس کی وجہ سے کسی عام حکم کو خاص کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ:

۱- عرف عام ہو۔

۲- عرف پہلے سے چلا آرہا ہو، حادث نہ ہو

الا یہ کہ اگر عرف حادث ہو تو وہ نص قطعی یا شریعت کے عمومی قواعد سے متصادم نہ ہو۔

اسی اختلاف پر یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر کسی آواز لگانے والے کو کوئی سامان کسی نے دیا تاکہ وہ آواز لگا کر فروخت کرے، اور اس نے آواز لگائی اور خریدار آ گئے، مگر صاحب سامان اسے فروخت کرنے سے مکر گیا تو آواز لگانے والا اجرت کا مستحق ہوگا یا نہیں؟ تو ابو نصر بلخی کہتے ہیں وہ اجرت مثل کا حقدار ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ عرف تو یہ ہے کہ آواز لگانے والے نے سامان فروخت نہیں کیا تو اجرت کا مستحق نہیں ہوتا، تو اس کا جواب یہ دیا کہ یہ کوئی بات نہیں ہے، اس لیے یہ اجارہ فاسد ہے، لہذا وہ اجرت مثل کا حقدار ہوگا، فقیہ ابو اللیث کہتے ہیں یہ قیاس ہے، اور استحسان یہ ہے کہ کچھ بھی واجب نہ ہو، کیوں کہ اجرت مثل تجار کے تعامل سے طے ہوتا ہے، اور تجار اس اجرت سے ناواقف ہیں (النوازل للسمرقندی باب الاجارات)

اور محمد بن سلمہ بلخی سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں امید کرتا ہوں کہ کثرت تعامل کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے فاسد ہے، جبکہ اس باب کے بہت سے مسائل ناجائز ہیں، لیکن لوگوں کی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے، جیسے دخول حمام کے مسئلہ میں (حمام میں جب انسان جائے گا تو یہ نہیں معلوم کہ کتنا پانی صرف کرے گا، کتنی دیر اس میں رہے گا اور اس جہالت کی وجہ سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس کے تعارف اور تعامل کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا گیا ہے، اسی کے مشابہ اجرت دے کر میلے اور نمائش، نیز باغ میں داخل ہو کر اپنی مرضی سے طے کردہ وقت کے مطابق جتنا چاہے پھل توڑنا، سیل لگی ہوئی مارکیٹ میں سامانوں میں سے کسی کو بھی اٹھانا ہے، اور اسی طرح مخصوص رقم کے آفر میں مول وغیرہ میں جانا، سامان خریدنا اور کھانا پینا جو موجودہ زمانے میں رائج ہے، کو قیاس کیا جا سکتا ہے) (دیکھئے: رد المحتار لابن عابدین ۶/ ۶۳)۔

میں کہتا ہوں کہ:

۱- فقیہ ابو اللیث کی رائے میں یہی مختار ہے (الخانیہ ۲/ ۳۲۷)۔

۲- ابو نصر بلخی کے جواب سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں اس موقف کو اختیار نہیں کرتے جو اس سے پہلے بیان ہوا، یعنی عرف کی وجہ سے قیاس کی تخصیص، یہاں تک کہ اس قیاس کی تخصیص جو بعض قیاس کو قیاس سے خاص کیا جائے، بایں طور کہ بنے ہوئے کپڑے میں بعض کو اجرت قرار دے کر بنائی کو جائز قرار دینا، اس وقت یہاں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس جگہ عرف کو اختیار نہیں کیا جائے گا، باوجود اس کے کہ عرف عام ہے، قدیم ہے اور ہم لوگ واقف ہیں کہ آواز لگانے والا اس وقت اجرت کا حقدار نہیں ہوتا جب تک معاملہ پورا نہ ہو جائے، اگرچہ قیاس کا تقاضا ہے کہ اسے اجرت مثل دیا جائے، اور عراق میں اس کا اس وقت رواج بھی ہے۔

نیز میرا رجحان اس مسئلہ میں سمرقندی کی رائے کو قبول کرنے کا ہے، اس لیے کہ

۱- وہ عرف جس کی بات ہم کر رہے ہیں، وہ عرف عام ہے۔

۲- یہ عرف متوارث اور قدیم ہے، اور ابو اللیث اس کے قدیم ہی ہونے کو اپنی کتاب "النوازل" میں ثابت کیا ہے اور آج تک اس کا معمول چلا آرہا ہے۔

۳- یہ عرف اس باب میں وارد کسی نص قطعی سے متصادم نہیں ہے۔ اور اسی سے قریب یہ مسئلہ بھی ہے کہ جب منادی لگانے اور دلال کو مبیع حوالہ کر دی گئی اور اس نے اپنی محنت بھی اس کے لیے صرف کی، لیکن وہ کام کو مکمل نہ کر سکا، پھر صاحب سامان نے دوسرا بروکر اور آواز لگانے والا دلال کر لیا تو کیا پہلے والے کے لیے اجرت ہوگی؟

اس کے جواب میں ابو القاسم صفار بلخی کہتے ہیں کہ پہلے والے کو اپنی محنت اور عمل کے بقدر اجرت ملے گی۔

(خانیہ سابقہ ذکر کردہ صفحات، بزازیہ ۲ / ۴۸، ہندیہ ۴ / ۴۵۱)۔

فقیہ ابواللیث اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو کچھ ابوالقاسم نے کہا ہے وہ قیاس ہے اور استحسان یہ ہے کہ جب دلال اول نے چھوڑ دیا، اور دوسرے نے اس کو فروخت کردیا تو اس کو اجرت نہیں ملے گی، اس لیے کہ دلال اس صورت میں عرف یہی ہے کہ بغیر فروخت کے اجرت نہیں لیتا (سابقہ حوالہ جات)۔

دوسرا معاملہ یہ ہے کہ عقد میں لفظ کا اعتبار ہے یا عاقدین کی نیت کا؟ تو مذہب میں معتبر قول یہی ہے کہ ''عقد میں مقاصد اور معانی کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا'' (مجلہ الاحکام العدلیہ مادہ: ۳، اشباہ والنظائر / ۲۰۷، ۲۰۸ اور سابقہ دونوں مراجع)۔

جن لوگوں نے اس پہلو کو غالب اور راجح قرار دیا ہے انہوں نے اس بیع وفاء کو رہن تصور کیا ہے، اور یہ بات میں نے ''مجلہ الاحکام العدلیہ'' سے لی ہے، اس میں ہے: ''بیع وفاء میں رہن کا حکم جاری ہوگا'' (دیکھئے: سابقہ دونوں مراجع جو پیچھے حاشیہ میں گزرے)

نیز ہم نے اس کو اہم اور معتبر فقہی کتابوں سے بھی لیا اور انہیں کتابوں کی عبارتوں کی اساس پر مسائل وفروعات اور جزئیات بیان کیے گئے ہیں۔

یہاں پر وہ حضرات جو اس بیع کے جواز کے قائل ہیں اس طرف گئے ہیں کہ بغیر لفظ کے صرف نیت کا معاملات میں اعتبار نہیں ہوتا، اور کوئی شخص بیع کے لفظ کے ساتھ بیع کرے گا تو وہ بیع ہی ہوگا (رد المحتار علی الدر المختار ۵ / ۲۷۶)۔

خلاصہ بحث:

اس پوری بحث کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مندرجہ ذیل ہے:

اول: میں اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتا ہوں جس میں اس کو بیع تسلیم نہیں کیا گیا ہے، البتہ وہ لوگ جو اس کو بیع مانتے ہیں انہوں نے ''لا عبرة بمجرد النية بلا لفظ'' کو بنیاد بنایا ہے، اور طلاق کی نیت سے نکاح کرنے والے کے نکاح کو درست قرار پانے والے مسئلہ پر قیاس کیا ہے، جو مردود اور نادرست ہے، اس لیے کہ بیع وفا میں اس کی نیت عقد میں شرط لگانے کی وجہ سے ظاہر اور باہر ہے، جس کی وجہ سے یہ معاملہ اپنی حقیقت سے دوسری جانب منصرف ہوجاتا ہے، لہذا قضاء کے وقت اس کی نیت کالعدم قرار پائے گی، جب تک کے وہ عقد کے وقت طلاق کی نیت کی طرح بالکل واضح نہ ہو (درالحکام شرح مجلۃ الاحکام ۱ / ۱۷)۔

ثانیا: مذکورہ تفصیلات کو بنیاد بناتے ہوئے قاعدہ فقہیہ ''الامور بمقاصدھا'' (الاشباہ ۵ / ۳۷) کی روشنی میں اس معاملہ کو حل کیا جاسکتا ہے، اور عاقدین کا ارادہ ربا تک پہنچنا ہے، جو حرام ہے اور واضح ہے، لیکن اس کے لیے عاقدین نے رہن کا نام جائز اور معاملہ کار کھا ہے، رہن کا بھی ان کا مقصد نہیں ہوتا، تا کہ وہ اس سے منفعت حاصل کر سکے، اگر اس کا نام رہن رکھ دیتے تو اس سے نفع نہیں اٹھا سکتے تھے، نہ ہی اس سامان سے اور نہ دین کے مقابلہ میں۔

لہذا اگر ان کی نیت زائد نفع کے حصول سے خالی ہوگی تو اس پر ہم اس قاعدہ کو منطبق کر سکتے ہیں: ''العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للالفاظ والمباني'' اور ہم اس کی وہی صورت بیان کرتے جو ان کی نیت کے موافق ہوتی۔

ہم مذکورہ امور کی روشنی میں بھی اس عقد کے بطلان کی طرف گئے ہیں، نیز ان وجوہات کی وجہ سے بھی:

۱- رباخوری کو چھپانے کے لیے جائز معاملہ کا نام دینے والی بری نیت کو رد کرنا۔

۲- اس رہن کے معاملہ کو معتبر ہونے کے ممکن نہ ہونے کی وجہ سے، اس لیے کہ عاقدین نے اس سے معاہدہ کا ارادہ نہیں کیا کہ اس معاملہ کو اقرب کا اعتبار کرتے ہوئے جائز تصرف کی طرف پھیرا جائے۔

۳- دونوں کی نیت کسی ایک معاملہ پر جامع نہ ہونے کی وجہ سے، کیوں کہ ان دونوں کا مقصد قرض کا ایسا معاملہ کرنا ہے جس سے قرض خواہ کو نفع پہنچے، قرض دہندہ نے قطعی اس گھر کے مالک بننے کی نیت نہیں کی، جس طرح قرض لینے والے نے مکمل طور پر مالک بنانے کی نیت نہیں کی تھی، بلکہ دونوں کا ارادہ محض نفع وصول کرنے اور پہنچانے کا تھا۔

۴- جس نفع کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے وہ عقد کے مقتضیات میں سے نہیں ہے، نہ تو عقد اس کو ثابت کرتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی نص ہے، اور نہ ہی اس کا ایسا عرف ہے جس میں کوئی اختلاف نہ ہو اور یہ میرا وہ موقف ہے جو ماقبل کی صراحت کے مطابق ہے، کہ کسی چیز کی حلت اور حرمت کو نیت سے جوڑا جاتا ہے (الاشباہ، سابقہ ذکر کردہ صفحات)۔

نیز یہ بھی کہ اگر واقعی بائع اور مشتری نے اس معاملہ کو باطل کرنے کا ارادہ نہیں کیا، اور دونوں نے یہ کہا کہ ہم نے تو حرام سے دور رہنے کے لیے ایسا کیا ہے

تو پھر اس معاملہ کو درست کہا جائے اس طرح کہ ایک عاقل بالغ کے کلام کو مہمل قرار دینے سے اس کو ذو معنی بنانا زیادہ بہتر ہے ''اعمال الکلا أولی من إہمالہ'' (الاشباہ/۱۳۵، نیز مجلۃ الاحکام العدلیہ مادہ: ۶۰)، لہذا بجائے معاملہ کو باطل قرار دینے کے اسے رہن کی طرف پھیر دیا جائے اور رہن سے حاصل ہونے والی آمدنی سے قرض دینے والا کوئی فائدہ نہ اٹھائے، اور مبیع ہلاک ہونے، اس سے آمدنی حاصل ہونے والے تمام امور میں رہن کے احکام کو ہی اس پر منطبق کیا جائے۔

جس طرح یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ اس کو یہ کہا جائے کہ یہ مبیع ہے اور اس کے ساتھ فاسد شرط کو ملا دیا گیا ہے، لہذا عقد بیع درست اور شرط باطل اور لغو ہو کر بیع یقینی ہو جائے، امام زفر کے نکاح مؤقت والے قول پر قیاس کرتے ہوئے کہ ان کے نزدیک اس معاملہ میں شرط باطل ہے اور نکاح منعقد، اسی طرح یہ معاملہ بیع بالکل درست ہو جائے (الاختیار ۸۹/۳، بدائع الصنائع ۱۴۲۱/۳، مبسوط ۱۵۳/۵)۔

اور یہ اس وجہ سے کہ:

اول: نکاح کی نیت عقد نکاح کے مکمل ہونے کی جہت کو متعین کرتی ہے، اور عقد مؤبد کے ساتھ منافی شرط لاحق ہوگئی ہے جو ایک عارض ہے، لہذا شرط اصل عقد کے لیے مفسد نہیں ہوگی، اسی لیے امام زفر نے اس شرط کو لغو قرار دیا ہے۔

دوم: جس طرح سے شوہر تاقیت کی شرط کے باطل ہونے کی صورت میں جس کی وجہ سے علاحدگی کا ضامن ہوتا ہے، اگر اس کی نیت کرلے تو اس کو حق طلاق اور خلع کا مالک بنادیتی ہے، اور جس طرح عورت اس شرط کی وجہ سے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کی پوزیشن میں ہو جاتی ہے اگر نکاح میں اس کی شرط لگادے اور شوہر اسے قبول کرلے۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کی نیت اصل عقد کے منعقد ہونے پر متفق ہے، لہذا ہمارے لیے شرط کو لغو قرار دینا اور عقد کو درست تسلیم کرنا جائز ہو جائے۔

لہذا بیع وفاء میں ان دونوں کی نیت بنیادی طور پر شرط کو لازم کرنے سے واسطہ ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی بھی قیمت پر دونوں معاملہ نہ کرتے، اس لیے معاملہ کو درست قرار دینا اور شرط کو باطل ماننا درست نہیں ہے، اس لیے کہ ان دونوں کی نیت اس کے علاوہ کسی مستحکم معاملہ پر متفق ہی نہیں ہے، لہذا ان دونوں کی نیت نہ ہونے اور امر ممنوع کے ارتکاب کی وجہ سے اس معاملہ کو ہی باطل قرار دینا لازم ہے، جس طرح سے اگر کوئی شخص کسی سے مردار، شراب اور خنزیر کی بیع کرلے تو حرام قرار دیا جاتا ہے، سوائے اس کے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اس نے اپنی نیت میں مستحکم معاملہ کا ارادہ کیا تھا، تو جو کچھ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے اس کو سامنے رکھا جائے اور درست ہونے کی وہ شرائط جو مذکور ہوئیں پیش نظر ہوں۔

بیع بالوفاء کے شرعی احکام

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی [1]

بیع بالوفاء کی تعریف:

کتب فقہ میں بیع بالوفاء کی دوصورتیں بتائی گئی ہیں:

الف- کسی کے ذمہ کسی کا دین ہو اور مدیون دائن سے کہے کہ میں تم سے اپنا یہ سامان اس شرط پر فروخت کررہا ہوں کہ جب میں تمہارا دین ادا کردوں تو تم میرا سامان مجھے واپس کردینا یا میرا سامان میرا ہوجائے گا۔

ب- دوسری شکل یہ ہے کہ فروخت کرنے والا خریدار سے یہ کہے کہ یہ سامان تمہارے ہاتھ اس شرط پر فروخت کررہا ہوں کہ جس وقت میں ثمن واپس کردوں اس وقت تم میرا سامان مجھ سے فروخت کردینا۔ درمختار میں ہے:

''صورته: أن يبيعه العين بألف على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين''
(الدر المختار مع رد المحتار کتاب البیوع مطلب فی بیع الوفاء ۷/۵۴۵)۔

(یعنی بیع بالوفاء کی صورت یہ ہے کہ کسی سامان کو ایک ہزار کے بدلہ اس شرط پر فروخت کرے کہ جس وقت اس کو ثمن واپس کرے گا اس وقت وہ (خریدار) اس کا سامان واپس کردے گا)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے:

''وفي الكفاية عن المحيط: هو أن يقول البائع للمشتري: بعت منك هذا العين بما لك علي من الدين على أني متى قضيت فهو لي، وفي حاشية الفصولين من جواهر الفتاوى: هو أن يقول: بعت منك على أن تبيعه مني متى جئت بالثمن'' (الدر المختار مع رد المحتار کتاب البیوع مطلب فی بیع الوفاء ۷/۵۴۵)۔

(اور محیط کے حوالہ سے کفایہ میں ہے کہ ''بیع بالوفاء یہ ہے کہ بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تم سے اپنا سامان تمہارے قرض کے بدلہ میں جو مجھ پر ہے اس شرط پر فروخت کیا کہ جب میں اس قرض کو ادا کردوں تو وہ سامان میرا ہوجائے گا، اور حاشیۃ الفصولین میں جواہر الفتاوی کے حوالہ سے ہے کہ فروخت کرنے والا یہ کہے کہ میں نے تم سے اس شرط پر بیچا کہ جب میں ثمن ادا کردوں تو تم مجھ سے اس کو فروخت کردو)۔

بیع بالوفاء کا شرعی حکم:

اس طرح کی بیع جس کو بیع بالوفاء کہتے ہیں شرعاً صحیح ہے یا نہیں اور خریدار کے لیے خریدی ہوئی شیٔ میں مالکانہ تصرف کا اختیار ہے یا نہیں اور ثمن یا قرض کی واپسی کے وقت خریدار پر سامان کی واپسی ضروری ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں فقہاء کے مابین کافی اختلاف نظر آتا ہے، ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے یہاں تو بہت زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے، البتہ فقہاء حنفیہ کے یہاں بہت زیادہ تفصیل ہے، علامہ ابن نجیم نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''البحر الرائق'' میں ''بزازیہ'' کے حوالہ سے اس سلسلہ میں آٹھ اقوال نقل کیے ہیں اور ہر ایک کی تفصیل بیان کی ہے۔

فقہاء کے اقوال پر غور کرنے سے بنیادی طور پر تین قول سامنے آتے ہیں:

۱- بیع وفاء شرعاً جائز و درست ہے اور خریدار کے لیے خریدی ہوئی شیٔ سے انتفاع حلال ہے، البتہ چوں کہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ ثمن یا قرض کی ادائیگی کے وقت شیٔ مبیعہ کو واپس کردے گا، اس لیے اس کے لیے دوسرے سے فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، اس کے قائل مشائخ سمرقند ہیں، ان میں سے امام نجم

[1] صدر مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ و جھارکھنڈ، پھلواری شریف پٹنہ۔

الدین نسفی بھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہمارے مشائخ اس کے جواز پر متفق ہیں، ''تبیین الحقائق'' میں ہے:

''ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعًا جائزًا مفيدًا لبعض أحكامه و هو الانتفاع به دون البعض و هو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه'' (تبیین الحقائق کتاب الاکراہ ۵/۸۳، ۸۴)۔

''البحر الرائق'' میں ہے:

''الثانی أنه بيع صحيح باتفاق مشائخ الزمان للعرف'' (البحر الرائق کتاب البیع باب خیار الشرط ۶/۱۲)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے اس پر مشائخ کا اتفاق ہے اور یہ عرف کی وجہ سے ہے۔ ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ہے:

''وذهب بعض المتأخرين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء جائز مفيد لبعض أحكامه و هو انتفاع المشتری بالبيع دون بعضها و هو البيع من آخر'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۹/۲۶۰)۔

حنفیہ اور شافعیہ میں سے بعض متاخرین کی رائے یہ ہے کہ بیع وفاء جائز ہے اور بیع کے بعض احکام کے لیے مفید بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشتری مبیع سے انتفاع کر سکتا ہے، البتہ دوسرے سے فروخت نہیں کر سکتا ہے۔

علامہ ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے:

''وذكر الزيلعی أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا يملك بيعه للغير'' (البحر الرائق باب خیار الشرط ۶/۱۲)۔

(اور زیلعی نے ذکر کیا ہے کہ فتوی اس پر ہے کہ یہ بیع جائز ہے اور بعض احکام کے لیے مفید ہے، یعنی اس سے انتفاع حلال ہے، البتہ وہ دوسرے سے فروخت کرنے کا مالک نہیں ہے)۔

۲- بیع بالوفاء شرعاً صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ فاسد ہے، حقیقت میں یہ بیع نہیں ہے، بلکہ یہ رہن ہے اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، لہذا ایسی صورت میں خریدار خریدی ہوئی شیئ کا مالک نہیں ہوگا اور اس سے فائدہ اٹھانا اس کے لیے حرام ہوگا اور قرض کی ادائیگی کے بعد اس پر اس شیئ کی واپسی لازم ہوگی۔ اس کے قائل حنفیہ میں سے ابوشجاع، علی السغدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی ہیں اور مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین شافعیہ بھی بیع الوفاء کے فاسد ہونے کے قائل ہیں۔

''تبیین الحقائق'' میں ہے:

''ومنهم من جعله رهنًا منهم السيد الإمام أبوشجاع والإمام السغدی والإمام القاضی أبو الحسن الماتريدی قالوا: لما شرط عليه أخذه عند قضاء الدين أتى بمعنى الرهن لأنه هو الذی يؤخذ عند قضاء الدين'' (تبیین الحقائق کتاب الاکراہ ۵/۱۸۳)

اور ان میں سے کچھ فقہاء نے اس کو رہن قرار دیا ہے، ان میں سے سید امام ابوشجاع، امام علی السغدی اور امام قاضی ابوالحسن ماتریدی ہیں، یہ حضرات کہتے ہیں کہ جب اس نے دین کی ادائیگی کے وقت اس سامان کو واپس لینے کی شرط لگادی تو یہ رہن کے حکم میں ہوگیا، اس لیے کہ شیئ مرہون ہی دین کی ادائیگی کے وقت واپس لی جاتی ہے۔

''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ہے:

''اختلف الفقهاء فی الحكم الشرعی لبيع الوفاء۔ مذهب المالكية والحنابلة والمتقدمين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء فاسد'' (الموسوعۃ الفقہیہ بیع الوفاء ۹/۲۶۰)۔

(بیع وفاء کے حکم شرعی میں فقہاء کا اختلاف ہے، مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین حنفیہ وشافعیہ کی رائے یہ ہے کہ بیع وفاء فاسد ہے)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''ردالمحتار'' میں ''جامع الفصولین'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

''البيع الذی تعارفه أهل زماننا احتيالًا للربا وسموه بيع الوفاء، و هو رهن فی الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا

یإذن مالکه و هو ضامن لما أکل من ثمره وأتلف شجره ویسقط الدین بهلاکه لو بقی ولا یضمن الزیادة وللبائع استرداده إذا قضی دینه لا فرق عندنا بینه وبین الرهن فی حکم من الأحکام'' (رد المحتار کتاب البیوع مطلب فی بیع الوفاء ۷/۵۴۶)۔

(وہ بیع جو سود سے بچنے کے لیے ہمارے زمانہ کے لوگوں میں متعارف ہے جس کو وہ لوگ بیع وفاء کہتے ہیں وہ درحقیقت رہن ہے، خریدار اس کا مالک نہیں ہوگا اور مالک کی اجازت کے بغیر وہ انتفاع نہیں کرسکتا ہے اور اگر اس کا پھل کھایا یا درخت کو نقصان پہنچایا تو وہ اس کا ضامن ہوگا اور اس شیٔ کے ہلاک ہونے کی صورت میں اگر دین باقی ہو تو وہ ساقط ہوجائے گا اور خریدار اس زیادتی کا ضامن نہیں ہوگا اور بائع جب اپنا دین ادا کردے تو وہ اس کو واپس لے سکتا ہے اور ہمارے نزدیک بیع وفاء اور رہن میں کسی بھی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے)۔

۳- تیسرا قول جس کو قاضی خان نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ اگر لفظ بیع کا ذکر ہو تو وہ رہن نہیں ہوگا، بلکہ اس کو بیع قرار دیا جائے گا، البتہ اگر عقد بیع کے وقت بائع اور مشتری دونوں یا ان دونوں میں سے کسی ایک نے عقد فسخ کرنے کی شرط لگادی یا قرض کی ادائیگی کے وقت مبیع کو واپس کرنے کی شرط کے ساتھ بیع کی یا بیع کے وقت اس طرح کی شرط نہیں لگائی، لیکن بائع اور مشتری دونوں اس بیع کو لازم نہیں سمجھتے تو ان صورتوں میں بیع فاسد ہوگی اور اگر بیع کے وقت اس طرح کی شرط نہیں لگائی، بلکہ بیع مکمل ہوئی، البتہ بعد میں ان دونوں نے قرض یا ثمن کی ادائیگی کے وقت بیع واپس کرنے یا اسی قیمت پر فروخت کرنے کا معاہدہ کیا تو ایسی صورت میں یہ بیع صحیح ہوگی اور خریدار کو اس میں مالکانہ تصرف کا اختیار ہوگا، البتہ چوں کہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ ثمن کی ادائیگی کے وقت مبیع واپس کردے گا اور وعدہ کو پورا کرنا شرعاً لازم ہے، اس لیے وہ وعدہ کے مطابق ثمن کی ادائیگی کے وقت مبیع واپس کردے گا۔

''البحر الرائق'' میں ہے:

''الثالث ما اختاره قاضی خان وقال: الصحیح إن وقع بلفظ البیع لا یکون رهنا ثم إن شرطا فسخه فی العقد أو تلفظا بلفظ البیع بشرط الوفاء أو تلفظا بالبیع وعندهما هذا البیع غیر لازم، فالبیع فاسد، وإن ذکر البیع بلا شرط ثم شرطاه علی وجه المواعدة جاز البیع ولزم الوفاء، وقد یلزم الوعد لحاجة الناس فرارًا من الربا''

(البحر الرائق باب خیار الشرط ۶/ ۱۲)۔

جن لوگوں نے بیع وفاء کو صحیح قرار دیا ہے ان کے دلائل:

جن حضرات نے بیع وفاء کو جائز و درست قرار دیا ہے ان کے پیش نظر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ لوگوں کی ضرورت ہے، غیر سودی قرض ملتے نہیں، اس لیے سود سے بچنے کا ایک حیلہ ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کا عرف ہو چکا ہے اور عرف کی وجہ سے قواعد ترک کردیئے جاتے ہیں، یعنی گرچہ یہ عقد قواعد شرع کے خلاف ہے، کیوں کہ اس میں مقتضاء عقد کے خلاف شرط لگائی جاتی ہے کہ یہ بیع لازم نہیں ہوگی، بلکہ جس وقت بائع دین یا ثمن ادا کرے گا اس وقت خریدار کو مبیع واپس کرنی ہوگی اور مقتضاء عقد کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے عقد فاسد ہوجاتا ہے، لیکن چوں کہ اس بیع کا تعامل اور عرف ہے، اس لیے عرف پر عمل ہوگا اور قواعد کو ترک کردیا جائے گا جیسا کہ استصناع میں ہوتا ہے کہ وہاں مبیع موجود نہیں ہوتی، بلکہ آرڈر دے کر خرید و فروخت کا معاملہ ہوسکتا ہے اور جب مبیع نہ ہو تو بیع صحیح نہیں ہوتی، لیکن چوں کہ ضرورت بھی ہے اور عرف و تعامل بھی ہے، اس لیے قواعد کے خلاف ہونے کے باوجود یہ بیع جائز و درست ہوتی ہے۔

''وحجتهم فی ذلك: أن البیع بهذا الشرط تعارفه الناس وتعاملوا به لحاجتهم إلیه، فرارًا من الربا، فیکون صحیحًا لا یفسد البیع باشراطه فیه، وإن کان مخالفًا للقواعد، لأن القواعد تترك بالتعامل کما فی الاستصناع''

(الموسوعۃ الفقہیہ بیع الوفاء ۹/ ۲۶۰)۔

(اور بیع وفاء کے جواز کے سلسلہ میں ان فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ لوگ سود سے بچنے کے لیے اپنی ضرورت کے پیش نظر اس شرط کے ساتھ اس طرح کی بیع کرتے ہیں، ان میں اس کا عرف اور تعامل ہے، لہٰذا یہ بیع صحیح ہوگی اور اس میں شرط لگانے کی وجہ سے بیع فاسد نہیں ہوگی گرچہ یہ قواعد شرع کے خلاف ہے، اس لیے کہ تعامل کی وجہ سے قواعد ترک کردیئے جاتے ہیں، جیسا کہ استصناع میں ہوتا ہے)۔

بیع وفاء کو رہن قرار دینے والے حضرات کے دلائل:

جن فقہاء کرام نے اس کو رہن قرار دیا ہے، انہوں نے اس بیع کو سود کھانے کا حیلہ قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ عقود میں معانی کا اعتبار ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا، یہی وجہ ہے کہ اگر ہبہ عوض کی شرط کے ساتھ ہو تو وہ بیع ہے، اس لیے کہ اگر چہ ہبہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لیکن اس میں بیع کا مفہوم پایا جاتا ہے، اسی طرح اگر کفالہ میں یہ شرط ہو کہ اصیل کو بری قرار دیا جائے تو پھر وہ لفظاً کفالہ ہوگا، لیکن حقیقۃً حوالہ ہوگا اور اگر حوالہ میں اصیل کی عدم براءت کی شرط ہو تو وہ کفالہ ہوگا، نہ کہ حوالہ اور استصناع میں اگر مدت متعین ہو جائے تو وہ سلم ہو جائے گا۔ ان کے علاوہ کتب فقہ میں بہت ساری مثالیں موجود ہیں، لہٰذا بیع وفاء میں گرچہ بیع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ رہن ہے، اس لیے کہ دین کی ادائیگی کے بعد اصل شیٔ کی واپسی رہن ہی میں ہوتی ہے، بیع تو لازم ہوتی ہے اور شیٔ مبیعہ خریدار کی ملکیت میں آجاتی ہے اور اس کو ہر طرح کے مالکانہ تصرف کا اختیار ہوتا ہے۔

''تبیین الحقائق'' میں ہے:

''قالوا لما شرط علیه أخذه عند قضاء الدین أتی بمعنی الرهن، لأنه هو الذی یؤخذ عند قضاء الدین والعبرة فی العقود للمعانی دون الألفاظ حتی جعلت الکفالة بشرط براءة الأصیل حوالة وبالعکس کفالة والاستصناع عند ضرب الأجل سلمًا'' (تبیین الحقائق کتاب الاکراہ ۵/۱۸۳)۔

تیسرے قول کے دلائل:

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ عقد کے وقت یا اس سے قبل واپسی کی شرط لگانے سے عقد فاسد ہو جائے گا، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کی شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہے، کیوں کہ عقد بیع کا تقاضا تو یہ ہے کہ لازم ہو، خریدار کو ہر طرح کے جائز تصرف کا اختیار ہو، وہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت بھی کر سکتا ہو اور کسی کو ہبہ اور وصیت بھی کر سکتا ہو، لیکن مذکورہ بیع میں خریدار کو اس طرح کا کوئی اختیار نہیں ہے اور جب صلب عقد میں مقتضاء عقد کے خلاف کوئی شرط لگا دی جائے تو عقد فاسد ہو جاتا ہے، نیز بائع اور مشتری کے نزدیک اس عقد سے حقیقت بیع مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اس کے پیچھے کچھ مدت تک کے لیے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے جو سود ہے اور سود کی حرمت وشناعت ہر حال میں ہے (دیکھئے الموسوعۃ الفقہیہ ۹/۲۶۰)۔

قول راجح اور اس کے دلائل:

بیع وفاء کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے تین بنیادی اقوال اور ان کے دلائل مذکور ہوئے۔ ان میں کونسا قول راجح اور اقرب إلی الفقہ ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا قول، یعنی بیع وفاء کے جواز اور صحت کا قول سمجھ سے باہر ہے، وہ قواعد شرع سے دور اور سود کھانے کا ایک حیلہ معلوم ہوتا ہے، چوں کہ لوگوں میں غیر سودی قرض دینے کا مزاج نہیں ہے وہ اپنے قرض سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں جس کا یہ طریقہ تلاش کیا گیا ہے، ظاہری بات ہے کہ جب ایجاب وقبول کے ذریعہ بیع مکمل ہو گئی تو بائع ثمن کا اور مشتری مبیع کا مالک ہو گیا، ان دونوں کو اپنی ملکیت میں مالکانہ تصرف کا پورا اختیار ہونا چاہیے، یہ شرط لگانا کہ مشتری مبیع کو فروخت نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا مالکانہ تصرف کر سکتا ہے، بلکہ صرف ایک خاص مدت کے لیے انتفاع کر سکتا ہے اور دین یا ثمن کی ادائیگی کے وقت اس پر مبیع کی واپسی لازم ہے، یہ بیع نہیں، بلکہ بیع کا مذاق ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض مشائخ نے اس کو باطل قرار دیا ہے، اور مذاق سے تعبیر کیا ہے:

''ومن المشائخ من جعله باطلًا اعتبره بالهازل'' (تبیین الحقائق کتاب الاکراہ ۵/۱۸۴)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے خیریہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سید امام نے امام الحسن ماتریدی سے کہا کہ بیع وفاء لوگوں میں عام ہے اور آپ کا اور میرا فتوی یہ ہے کہ یہ رہن ہے تو کیوں نہیں، ائمہ اور علماء کو جمع کر کے ہم اس مسئلہ پر اتفاق کر کے لوگوں کے سامنے پیش کریں تو ابو الحسن ماتریدی نے کہا کہ اس وقت ہمارا ہی فتوی معتبر ہے اور یہی لوگوں کے درمیان شائع ورائج ہے، جو شخص ہماری مخالفت کرتا ہے وہ سامنے آئے اور دلیل پیش کرے۔

''فمن خالفنا فلیبرز نفسه ولیقم'' (رد المحتار کتاب البیوع باب الصرف ۷/۵۴۶)۔

بیع وفاء کو جائز اور صحیح قرار دینے والوں کی دو بنیادیں ہیں، ایک عرف، دوسری ضرورت، معلوم نہیں کہ ہندوستان کے کس حصہ کا عرف بیع وفاء کا ہے، اس سلسلہ میں ہر خطہ کے علماء ومفتیان کرام سے ان کے علاقہ کا عرف معلوم کرنا چاہیے، جس سے پتہ چلتا کہ کس علاقہ کا عرف بیع وفاء کا ہے، اس سے اس کی وضاحت بھی ہو جاتی کہ یہ عرف عام ہے یا عرف خاص پھر دونوں کے احکام پر بحث ہوتی، بہار میں تو کہیں بھی یہ عرف سمجھ میں نہیں آتا ہے، بہار کے کسی علاقہ میں سود بھرنا اور

کسی علاقہ میں زرپیشگی سے یاد کیا جاتا ہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ضرورت مند کسی شخص سے بہ طور قرض کچھ رقم لیتا ہے اور اس قرض کی ادائیگی کے وقت تک کے لیے اپنی زمین قرض دینے والے کے پاس رکھتا ہے جس کی آمدنی سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے، میری معلومات کی حد تک بہار میں کہیں بھی بیع کا معاملہ نہیں ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ صریح رہن کی شکل ہے جس میں قرض دینے والا شیئ مرہون سے انتفاع کرتا ہے جو "کل قرض جر نفعًا فهو ربا" کے تحت حرام ہے۔

جہاں تک ضرورت وحاجت کا تعلق ہے تو اس کا تحقق قرض لینے والے کے ساتھ تو ہوسکتا ہے، اس کو قرض کی ضرورت پڑسکتی ہے اور غیر سودی قرض نہ ملنے پر زمین وغیرہ رہن رکھنے پر مجبور ہوسکتا ہے، اس لیے بدرجہ مجبوری اس طرح رہن رکھ کر قرض لینے کی اجازت ہوسکتی ہے، لیکن قرض دینے والے کے ساتھ کونسی مجبوری ہے کہ سود کھائے اور صریح حرام کا ارتکاب کرے۔ حضرت تھانویؒ نے "امداد الفتاوی" میں اس طرح کے ایک استفتاء کے جواب میں لکھا ہے:

"اور رہن قصداً اور بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں، سو اصل قواعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے اور انتفاع اس سے حرام ہے اور اگر وہ بیع ہے تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطرار شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطرار شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتوی متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطرار نہیں" (امداد الفتاوی کتاب البیوع ۳/۱۰۸)۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیع وفاء کو عرف وحاجت کی بنیاد پر صحیح قرار دے کر خریدار کے لیے شیئ مبیعہ سے انتفاع کو جائز قرار دینا صحیح نہیں ہے، یہ ربا کے دروازہ کو کھولنا ہے، حقیقت یہ ہے کہ:

الف- اگر معاملہ لفظ بیع کے ساتھ نہ ہو، بلکہ قرض لے کر زمین ومکان یا کوئی دوسری چیز بہ طور ضمانت رکھی جائے اور قرض کی ادائیگی کے وقت وہ شیئ واپس لے لی جائے تو یہ رہن ہے، جیسا کہ دوسرا قول ہے اور شیئ مرہون سے انتفاع حرام ہے، البتہ اگر مالک انتفاع کی اجازت دے دے اور وہاں شیئ مرہون سے انتفاع کا عرف بھی نہ ہو اور قرض دینے والے کی طرف سے کسی طرح کا اشارہ بھی نہ ہو تو اس صورت میں شیئ مرہون سے انتفاع کی گنجائش ہوتی ہے۔

ب- اور اگر لفظ بیع کے ذریعہ معاملہ طے پایا ہو اور عقد سے قبل یا صلب عقد میں دین یا ثمن کی ادائیگی کے وقت مبیع کی واپسی کی شرط لگادی گئی ہو یا اس وقت تو شرط نہیں لگائی گئی، لیکن دونوں فریق نے اس کو غیر لازم بیع سمجھ کر کیا تو ان سبھی صورتوں میں لفظاً بیع ہوگی اور حقیقۃً رہن یا یوں کہیں کہ یہ بیع شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہوجائے گی اور دونوں فریق پر اس عقد کو ختم کرنا لازم ہوگا۔ خریدار کے لیے خریدی ہوئی شیئ سے انتفاع حرام ہوگا۔

ج- اگر معاملہ لفظ بیع کے ذریعہ طے پایا اور عقد سے قبل یا عقد کے اندر کسی طرح کی شرط نہیں لگائی گئی اور بیع تام ولازم سمجھ کر ہوئی پھر بعد میں دونوں فریق نے باہمی رضامندی سے دین یا ثمن کی ادائیگی کے وقت مبیع کی واپسی کا معاہدہ کیا تو ایسی صورت میں یہ بیع لازم ہوگی اور خریدار کے لیے مبیع میں ہر طرح کے جائز تصرف کا شرعاً اختیار ہوگا۔ وہ کسی سے فروخت بھی کرسکتا ہے اور کسی کو ہبہ ووصیت بھی کرسکتا ہے، بائع خریدار کو مبیع کی واپسی پر مجبور نہیں کرسکتا ہے۔

ایفاء عہد کا حکم:

اب ایک بحث یہ آتی ہے کہ جب بیع مکمل ہوجانے کے بعد خریدار نے دین یا ثمن کی ادائیگی کے وقت مبیع کی واپسی کا ارادہ کیا تو کیا خریدار پر اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ خریدار پر قضاءً وعدہ کو پورا کرنا لازم نہیں ہے، اگر وہ مبیع واپس نہ کرے اور معاملہ قاضی شریعت کی شرعی عدالت دار القضاء میں پہنچے تو قاضی شریعت اس کی واپسی کا فیصلہ نہیں دے سکتے ہیں، البتہ دیانۃً اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہے، کیوں کہ کتاب وسنت میں ایفاء عہد کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں "أوفوا بالعهد" (بنی اسرائیل: ۳۴) کہا گیا ہے یعنی ایفاء عہد کا حکم دیا گیا ہے۔

یہاں امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر خریدار وعدہ کو پورا نہ کرے اور مبیع کی واپسی سے انکار کردے تو وہ شرعاً گنہگار ہوگا، لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ اس کے ساتھ کوئی مجبوری پیش نہ آئے اور اس کے سامنے کوئی حکمت ومصلحت نہ ہو۔ اگر اس کے ساتھ کوئی مجبوری ہو یا واپسی میں کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو پھر وہ گنہ گار بھی نہیں ہوگا، اس لیے کہ وعدہ کو پورا کرنا اس وقت باعث گناہ ہے، جبکہ وعدہ کرتے وقت ہی پورا نہ کرنے کی نیت ہو، کیوں کہ یہ منافق کی علامت ہے اور اگر وعدہ کرتے وقت ایفاء عہد کی نیت ہو، لیکن بعد میں کوئی رکاوٹ پیش آجائے، اس کے سامنے کوئی مصلحت ہو تو پھر گناہ نہیں ہے۔

"مشکوۃ شریف" میں ابوداؤد شریف اور ترمذی شریف کی روایت ہے:

"عن زيد بن ارقم عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا وعده الرجل أخاه ومن نيته أن يفي له فلم يف ولم يجيء

للميعاد فلا إثم عليه'' (رواہ ابوداؤد والترمذی؛ مشکوۃ شریف باب الوعد:۴۱۶)۔

(حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی اپنے بھائی سے وعدہ کرے اور اس کی نیت اس وعدہ کو پورا کرنے کی ہو اور وہ (کسی عذر کی وجہ سے) پورا نہ کرسکے اور وقت پر نہ آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا)۔

ملا علی قاری ''مشکوۃ شریف'' کی شہرۂ آفاق شرح ''مرقاۃ المفاتیح'' میں مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(فلم يف) أي بعذر (ولم يجيء للميعاد) أي لمانع (فلا إثم عليه) قال الأشرف: هذا دليل على أن النية الصالحة يثاب الرجل عليها وإن لم يقترن معها المنوي وتخلف عنها... الخ، ومفهومه أن من وعد وليس من نيته أن يفي، فعليه الإثم سواء وفي به أو لم يف، فإنه من أخلاق المنافقين'' (مرقاۃ المفاتیح باب الوعد ۶۴۷/۴)۔

((اس نے پورا نہیں کیا) یعنی عذر کی وجہ سے (وہ وقت پر نہیں آیا) یعنی کسی مانع کی وجہ سے (اس پر کوئی گناہ نہیں ہے) اشرف نے کہا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اچھی نیت پر آدمی کو ثواب ملے گا گرچہ جس چیز کی نیت کی ہو پوری نہ ہو، اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص وعدہ کرے اور اس کی نیت پورا کرنے کی نہ ہو تو اس پر گناہ ہوگا، خواہ اس کو پورا کرے یا نہ کرے اس لیے کہ یہ منافقین کے اخلاق میں سے ہے)۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- اگر فریقین کے درمیان معاملہ لفظ بیع کے ساتھ نہ ہو، بلکہ قرض لے کر زمین ومکان بہ طور ضمانت رکھا گیا ہو تو یہ رہن ہے، اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، قرض دینے والا اس شیٔ مرہون سے کسی طرح کا انتفاع نہیں کرسکتا ہے، اس کے لیے اس سے انتفاع حرام ہے، نیز وہ اس میں کسی طرح کا مالکانہ تصرف بھی نہیں کرسکتا ہے، یعنی نہ تو کسی دوسرے سے اس کو فروخت کرسکتا ہے اور نہ ہی ہبہ ووصیت کرسکتا ہے، اس سے جو آمدنی ہوگی وہ بھی مالک زمین ومکان کی ہوگی اور قرض کی ادائیگی کے وقت شیٔ مرہون کی واپسی ضروری ہوگی۔

۲- اگر معاملہ لفظ بیع کے ساتھ طے ہوا اور عقد سے قبل یا عقد کے اندر یہ شرط ہو یا وعدہ ہو کہ بائع جس وقت دین یا ثمن ادا کرے گا اس وقت خریدار پر مبیع کی واپسی لازم ہوگی جس کو بیع وفاء کہتے ہیں، جیسا کہ بیع وفاء کی تعریف میں مذکور ہوا تو یہ لفظاً بیع ہے، لیکن حقیقۃً رہن ہے، اس پر بھی رہن ہی کے احکام نافذ ہوں گے، یا یہ کہیں گے کہ چوں کہ مقتضاء عقد کے خلاف شرط لگائی گئی ہے، اس لیے یہ شرط فاسد ہے اور شرط فاسد کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوئی، بائع اور مشتری دونوں پر لازم ہوگا کہ اس عقد کو ختم کریں، خریدار کے لیے شیٔ مبیعہ سے انتفاع یا کسی طرح کا مالکانہ تصرف حرام ہوگا۔ بیع وفاء کو حاجت وضرورت اور عرف کی بنیاد پر جائز قرار دینا اور شیٔ مبیعہ سے خریدار کو انتفاع کی اجازت دینا شرعاً صحیح نہیں، یہ سود کے دروازہ کو کھولنا ہے اور سود کھانے کا ایک حیلہ اختیار کرنا ہے۔ اس طرح کے حیلہ کی گنجائش خود بائع کے لیے تو ہوسکتی ہے، جبکہ اس کو بلاسودی قرض کسی جگہ سے نہ ملے اور اس کو انتہائی مجبوری ہو، لیکن خریدار کے لیے کوئی مجبوری نہیں ہے کہ وہ شیٔ مرہون سے انتفاع کرکے صریح حرام کا مرتکب ہو۔

۳- اگر لفظ بیع کے ساتھ معاملہ ہوا اور بیع کا معاملہ جس طریقہ پر ہوتا ہے اس طریقہ پر مکمل ہو، عقد سے قبل یا صلب عقد میں عقد کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کسی طرح کی شرط یا وعدہ نہ ہو، بلکہ بیع کا معاملہ مکمل ہوجانے کے بعد کسی دوسری مجلس میں بائع اور مشتری کے درمیان ثمن کی ادائیگی کے وقت مبیع کی واپسی کا معاہدہ ہو تو بیع شرعاً صحیح ودرست ہوگی، بائع ثمن کا اور مشتری مبیع کا مالک ہوگا، کسی دوسرے کے ہاتھ موجودہ قیمت پر یا اس سے زائد قیمت پر فروخت کرنے کا حق ہوگا اور وہ زائد قیمت خریدار ہی کی ہوگی، نیز وہ اس میں کوئی دوسرا مالکانہ تصرف بھی کرسکتا ہے۔ اس پر قضاءً اس کی واپسی ضروری نہیں ہوگی، البتہ دیانۃً اور اخلاقاً ثمن کی ادائیگی کے وقت خریدار پر مبیع کی واپسی ضروری ہوگی، لیکن اگر کسی مجبوری یا کسی مصلحت کے پیش نظر واپس نہ کرے تو گنہ گار بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ گنہگار اس وقت ہوگا، جبکہ وعدہ کرتے وقت ہی وعدہ کو پورا کرنے کی نیت نہ ہو۔

۴- اگر رہن کی صورت ہو اور جس کے پاس رہن رکھا جائے وہ قرض تو تبرع کے طور پر دے اور شیٔ مرہون کو کرایہ پر لے کر اس کو استعمال میں لائے، لیکن عام کرایہ سے کم کرایہ دے تو یہ جواز کا ایک حیلہ ہوگا، انتہائی ضرورت پر اس کی گنجائش ہوگی، عام حالات میں اس سے احتراز ہی

کرنا چاہیے، ''فتاوی محمودیہ'' میں مفتی محمود الحسن صاحبؒ نے اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

''یہ معاملہ شرعاً کرایہ اور ٹھیکہ ہے، مگر حیلہ کی صورت ہے، اس لیے بوقت ضرورت ایسی صورت پر عمل کرنا شرعاً درست ہے'' (فتاوی محمودیہ ۱۶/۲۶۷)۔

۵- کرایہ دار سے کرایہ کے علاوہ جو کثیر رقم لی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- ایک تو یہ کہ وہ رقم بہ طور ضمانت لی جاتی ہے، کرایہ دار جب مکان ودکان خالی کرتا ہے تو اس کی وہ رقم واپس کردی جاتی ہے، ایسی صورت میں مذکورہ رقم کی حیثیت رہن کی ہے اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے اور وہ رقم مالک مکان ودکان کے پاس امانت رہے گی، وہ اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا ہے، اس صورت میں عام طور سے کرایہ معمول کے مطابق ہی لیا جاتا ہے، اگر مالک مکان ودکان اس رقم کو بہ طور قرض اپنے استعمال میں لاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ کرایہ معمول سے بہت کم لیتا ہے تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، یہ اپنے قرض پر نفع اٹھانا ہے جو شرعاً حرام ہے، اور اگر مالک مکان ودکان کے پاس زر ضمانت کی رقم بہ طور امانت رہتی ہے وہ اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاتا ہے اور کسی خاص مصلحت کے تحت وہ کرایہ کم لیتا ہے تو شرعاً یہ جائز ہے، یہ ''کل قرض جر نفعاً فھو ربا'' کے تحت نہیں آئے گا، اس لیے کہ کرایہ دار نے جو رقم دی ہے وہ قرض نہیں ہے، بلکہ بہ طور ضمانت اور بہ طور رہن ہے۔

ب- دوسری صورت پگڑی کی ہے کہ مالک مکان ودکان کرایہ کے علاوہ ایک خطیر رقم لیتا ہے اور وہ عرفاً اس رقم کا مالک بھی ہوتا ہے، اس کی واپسی کا وہ پابند نہیں ہوتا ہے، ایسی صورت میں مالک مکان ودکان ایک خاص رقم لے کر اپنے حق انتفاع سے دست بردار ہوتا ہے اور کتب فقہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ کوئی رقم لے کر اپنے حق سے دست بردار ہونا شرعاً جائز ودرست ہے، لہٰذا پگڑی کی صورت میں مالک مکان ودکان پگڑی کی رقم کا شرعاً مالک ہوگا، اس کو اس میں مالکانہ تصرف کا اختیار ہوگا اور کرایہ دار کو بھی اختیار ہوگا کہ جس حق انتفاع کا وہ مالک ہوا ہے کسی دوسرے سے رقم لے کر خود اس حق سے دستبردار ہوجائے، وہ زائد رقم بھی لے سکتا ہے، ایسی صورت میں مالک تو اپنے حق انتفاع سے دست بردار ہوا، لیکن ابھی اس مکان ودکان کا مالک ہے، چوں کہ وہ مالک ہے، اس لیے وہ کچھ کرایہ بھی لیتا ہے تو شرعاً جائز ودرست ہے، اس کو ''کل قرض جر نفعاً فھو ربا'' کے تحت نہیں لاسکتے ہیں، اس لیے کہ کرایہ دار نے جو رقم دی ہے وہ قرض نہیں ہے، بلکہ حق انتفاع کا عوض ہے۔

☆☆☆

موجودہ حالات میں بیع الوفاء میں مبیع سے استفادہ کا حکم

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی[1]

بیع بالوفاء بشرط واپسی یا بمعاہدہ واپسی کسی سامان کو فروخت کرنا عالمی طور پر ایک متعارف بیع ہے اسے فقہاء احناف بیع بالوفاء یا بیع جائز کہتے ہیں (فتاوی قاضی خان ۲/ ۳۵۳)، بعض حنفیہ نے اسے "بیع المعاملہ" سے بھی تعبیر کیا ہے (فتاوی سراجیہ علی ہامش فتاوی قاضی خان ۳/ ۱۶۲)، مالکیہ اسے بیع الثنیا کہتے ہیں (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/ ۹۹)، اور شوافع "رہن معاد" قرار دیتے ہیں۔ اہل مصر اسے "بیع امانت" اور اہل شام اسے "بیع الاطاعہ" کہا کرتے ہیں (قاموس الفقہ ۲/ ۳۶۶)، لیکن بہار کی عوامی زبان میں اسے "سود بھرنا" کہا جاتا ہے۔

اس مخصوص طریق خرید وفروخت کی مختلف جہات کے اعتبار سے مذکورہ ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے، بیع الوفاء کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید نے کسی ضرورت کے تحت عمر سے اپنا سامان زمین مکان دکان اس شرط پر ایک ہزار روپے نقد کے بدلے فروخت کیا کہ جب زید کے پاس یہ رقم فراہم ہوجائے گی تو وہ عمر کو ادا کردے گا اور عمر خریدی ہوئی چیز زید کو واپس کردے گا۔

اس صورت میں بظاہر بیع کے طور پر متعاقدین، یعنی فروخت کنندہ اور خریدار کے قبضے میں سامان اور اس کی قیمت واپس کردے گا، تو وہ اسی قیمت پر دوبارہ اپنے قبضے کا سامان بیچ دے گا، یہ شرط، خواہ بلفظ بیع طے کی گئی ہو یا آپس میں دونوں نے بطور معاہدہ معاملہ کیا ہو، بہر صورت سامان پر خریدار کا قبضہ اس شرط یا معاہدہ کی وجہ سے عارضی ہے، جبکہ بیع کا تقاضا سامان پر خریدار کا دوامی قبضہ ہے جس سے وہ مال مقبوض میں مکمل تصرف کا حق دار ہوتا ہے اور یہ چیز یہاں مفقود ہے اور معاہدہ بھی چوں کہ واجب الایفا ہے، اس لیے ایسے معاہدے سے حاصل شدہ قبضہ بھی محض وقتی قبضہ ہے جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں، لہذا تقاضائے عقد کے خلاف اس شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی اور اس طرح خرید وفروخت کا معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، اس مسئلہ کو لفظ بیع سے تعبیر کرنے کا تقاضا بھی یہی ہے، تاہم عمومی طور پر حصول قرض کی مجبوری میں اس کا تعامل عام ہے، اس لیے اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور وخوض ضروری ہے۔

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید وبند کے ساتھ ہو شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ بوقت عقد لفظ بیع یا بیع بشرط الوفاء یا بیع الجائز کہہ کر اصل معاملہ کیا گیا ہے، اس لیے یہ بیع اصول شرعی کے مطابق منعقد اور درست ہوجائے گی، مگر شرط فاسد کی وجہ سے بیع بھی فاسد قرار دی جائے گی اور اس کو معاملہ رہن بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ عقد میں رہن کا ذکر نہیں کیا گیا تھا، لیکن شرط فاسد کے باوجود فروخت کردہ سامان پر اگر خریدار نے قبضہ کرلیا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور خریدار کو اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا حق حاصل ہوجائے گا وہ حق بیع، وشراء، حق ہبہ، اور حق رہن، وغیرہ جملہ حقوق کا مالک بن جائے گا۔

"فتاوی سراجیہ" میں ہے:

"بيع المعاملة وبيع الوفاء واحد وأنه بيع فاسد؛ لأنه بيع لا يقتضيه العقد وإنه يفيد الملك عند اتصال القبض به، كسائر البيوع الفاسدة مذكورة في فتاوى ابي بكر ابن الفضل" (فتاوی سراجیہ علی ہامش فتاوی قاضی خان ۳/ ۱۶۲ مطبوعہ مصطفائی دہلی)

(بیع المعاملہ اور بیع الوفاء ایک ہی ہے اور یہ بیع فاسد ہے، کیوں کہ یہ ایسی بیع ہے جس کا تقاضا عقد نہیں کرتا، مگر قبضہ حاصل ہوجانے پر یہ مفید ملک ہوجاتا ہے، جیسا کہ ساری بیوع فاسدہ کا یہی حکم ہے، یہ بات فتاوی ابی بکر ابن الفضل میں مذکور ہے)۔

"قبض المشتري المبيع في البيع الفاسد بأمر البائع وكل من عوضيه مال ملك المبيع بقيمته" کی شرح کرتے ہوئے اس کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ

"لنا أن ركن البيع صدر من أهله مضافًا إلى محله فوجب القول بانعقاده ولا خفاء في لأهلية والمحلية، وركنه مبادلة المال بالمال وفيه الكلام، والنهي يقرر المشروعية عندنا لاقتضائه التصور. فنفس البيع مشروع، وبه تنال نعمة الملك

---

[1] شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام صدر بازار میرٹھ، یوپی۔

إنما المحظور ما يجاوره، كمافي البيع وقت النداء'' (البحر الرائق شرح كنز الدقائق ۶/۱۵۰ مطبوعہ زکریا دیوبند)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ رکن بیع اہلیت بیع رکھنے والے سے صادر ہوا ہے اور محل بیع کی طرف نسبت بھی صحیح ہے، لہذا اس کو منعقد قرار دینا واجب ہے اور اس میں کوئی پوشیدہ بات نہیں کہ اہلیت، محلیت، اور رکن بیع، یعنی مال کا تبادلہ مال سے اپنی جگہ صحیح ہے اور گفتگو بھی اسی میں ہے، لہذا انعقاد بیع میں کوئی مانع نہیں اور حدیث میں جو ''نهى النبي ﷺ عن بيع و شرط'' وارد ہے اس سے مشروعیت ہی ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ اصل میں مشروعیت کا تصور کیا جاسکتا ہے، لہذا نفس بیع مشروع ہے اور اسی مشروعیت کے واسطے سے نعمت ملک بھی حاصل ہوجاتی ہے، رہی بات نہی اور ممانعت کی تو وہ اقتضاء بیع کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے ہے، نہ کہ اصل بیع کی وجہ سے، جیسا کہ بوقت اذان جمعہ بیع کی ممانعت بوقت اذان، بیع کرنے کی وجہ سے ہے نہ کہ اصل بیع کی وجہ سے)۔

غالباً امام اسبیجانی نے اصل بیع کی حقیقت کو دیکھتے ہوئے اسے بیع جائز قرار دیا ہے۔

''فتاوی سراجیہ'' میں ہے:

''عن الشيخ القاضي الإمام الإسبيحاني أنه بيع جائز ويوفي بالوعد'' (فتاوی سراجیه علی ہامش فتاوی قاضی خاں ۳/۱۶۳)۔

(اور شیخ قاضی امام اسبیجابی سے منقول ہے کہ انہوں نے اسے جائز بیع قرار دیا ہے اور خریدار پر وعدے کا پورا کرنا بھی لازم ہے)۔

الف- بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

بیع فاسد میں شرط فاسد کی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع اور شرط دونوں فاسد ہوتے ہیں۔

لہذا اگر متعاقدین نے عقد بیع کے ساتھ ہی شرط فاسد کو منظور کیا ہے تو اب مبیع (سامان، مکان، دکان، وغیرہ) کو قبضہ کے بعد خریدار کسی بھی شخص سے بیچ سکتا ہے اور بائع اول نے اس سامان کی جو قیمت آپس میں طے کی تھی وہ بھی بطور ثمن برقرار نہیں رہے گی، بلکہ بازاری قیمت پر اس کو فروخت کرنے کا حق ہوگا چاہے اسے پہلا فروخت کنندہ خریدے یا دوسرا، اس قیمت میں کمی بیشی کا اختیار بھی خریدار اول کو ہوگا، اور پہلے بائع سے دوبارہ بیع کی اس کی لگائی ہوئی شرط کالعدم ہوجائے گی، خریدار اول کو بائع اول سے بھی زائد قیمت لینے کا اختیار ہوگا، البتہ قرآن وحدیث میں ایفاء وعدہ کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر بائع اول سے بیچتے وقت اپنے وعدے کا وفادار ہونا چاہیے۔

لیکن اگر عقد کے وقت مذکورہ شرط نہیں لگائی گئی، بلکہ بلاشرط معاملہ طے ہوا پھر مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد آپس میں سابقہ قیمت پر ادائے ثمن کے بعد واپسی کا معاہدہ ہوا اور خریدار نے بیع بشرط واپسی طے کردی تو اب خریدار پر صرف بائع اول سے بیچنا اور صرف پہلے طے شدہ دام پر بیچنا اور وعدہ پورا کرنا واجب ہے، اللہ تعالی کا حکم ہے: ''أوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً'' (بنی اسرائیل: ۳۴)، (اور وعدے کو پورا کرو اس کے بارے میں خدا تم سے پوچھے گا)۔

''فتاوی قاضی خاں'' میں ہے: ''فتجعل لازمة لحاجة الناس'' (فتاوی قاضی خاں ۲/ ۳۵۳)۔

(پس اس وعدہ کو بھی لازم قرار دیا جائے گا عام لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (پاکستان) لکھتے ہیں:

''حنفی اور مالکی فقہاء نے وعدے کے وجوب کی بنیاد پر بیع بالوفاء کو جائز قرار دیا ہے۔ اس بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اگر دوبارہ خریداری کو اصل اور پہلی بیع کے لیے شرط بنایا جائے تو یہ معاملہ صحیح نہ ہوگا، اور اگر فریقین نے پہلی بیع غیر مشروط طور پر کی ہے، لیکن بائع نے علیحدہ اور مستقل طور پر اس بیچی ہوئی جائیداد کو دوبارہ خریدنے کے وعدے پر دستخط کیے ہیں تو وعدہ کرنے والے پر اس کا ایفا لازم ہوگا اور عدالت کے ذریعہ بھی اس پر عمل کرایا جاسکے گا، اس صورت میں ایفا کے وجوب کو حنفیہ اور مالکیہ دونوں نے تسلیم کیا ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۵ / ۹۸، الخطاب تحر الکلام: ۲۳۹ مطبوعہ بیروت ۱۴۰۴ھ)۔

ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

مجلس عقد میں بیع بالشرط کی صورت میں جب شرط کالعدم ہوگئی تو خریدار کو ہر طرح اختیار ہے جس سے چاہے بیچے اور جس قیمت پر چاہے فروخت کرے۔ البتہ خارج عقد بشرط واپسی کے وعدے کے بعد خریدار کو بہر حال بائع اول سے ہی بیچنا اور سابقہ طے شدہ قیمت پر ہی بیچنا لازم ہے وہ اضافی قیمت کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

ج- خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

اب جبکہ اس بیع کو اصل کے اعتبار سے جائز بتایا جاچکا تو مبیع پر خریدار کا حق تصرف نافذ ہوگا وہ جزوی طور پر ہر طرح نفع حاصل کرنے کا حقدار ہوگا، البتہ بعد

العقد آپسی معاہدے کے تحت واپسی کی شرط کے بعد سامان خریدار کے پاس بطور امانت محفوظ رہے گا اور خریدار اسے نہ کسی دوسرے سے فروخت کا مجاز ہوگا، نہ اسے کسی تصرف اور نفع اٹھانے کا اختیار ہوگا۔

د- خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

اصل عقد میں واپسی کی شرط والی صورت میں خریدار سامان پر قبضہ کے بعد دوسرے سے بیچ دے تو بیع جائز ہوگی، اور زائد قیمت وصول کرے تو یہ بھی جائز ہوگی، لیکن بعد العقد آپسی معاہدہ والی صورت میں نہ دوسرے سے بیع جائز ہوگی نہ زائد قیمت پر فروخت کرنا درست ہوگا۔

۲- اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو؟

اکثر مشائخ احناف اس صورت بیع کو بیع کی جگہ رہن قرار دیتے ہیں، انہیں فقہاء ومشائخ میں سید امام ابوشجاع اور امام ابوالحسن علی الماتریدی والقاضی السغدی۔ اور علامہ ابن عابدین شامی اور ہمارے دور کے مفتیان کرام اور دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب قدس سرہ شامل ہیں (فتاوی قاضی خاں ص: ۳۵۳ مطبوعہ مصطفائی دہلی)۔

علامہ سراج الدین اوشی نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے:

''وللبائع استرداده إذا قضى دينه متى شاء، لأنهم يريدون به الرهن حقيقة'' (فتاوی سراجیه علی ہامش قاضی خاں ۲/۱۶۳)۔

(اور بیچنے والا جب خریدار کا قرضہ چکا دے تو وہ جب چاہے اپنا سامان واپس لے سکتا ہے، کیوں کہ فقہاء اس کو حقیقت میں رہن قرار دیتے ہیں)۔

رہ گیا یہ اشکال کہ جب لفظ بیع کے ساتھ بشرط واپسی معاملہ ہوا ہے تو اسے بیع کے ظاہر لفظ سے رہن کے معنی کی طرف کیسے منتقل کیا جا سکتا ہے۔

تو علامہ اوشی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

''والعبرة للمقاصد لا للألفاظ، ألا ترى أن الكفالة بشرط برائة الأصل حوالة والحوالة بشرط مطالبة الأصيل كفالة'' (فتاوی سراجیه ۲/۱۶۳)۔

(بات یہ ہے کہ اعتبار مقاصد کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا، چنانچہ اصل معاملہ کرنے والے کی براءۃ کی شرط کے ساتھ کفالہ کرنا حوالہ ہوتا ہے، نہ کہ کفالہ۔ اسی طرح اصیل سے مطالبہ کی شرط سے حوالہ کرنا کفالہ ہوتا ہے، نہ کہ حوالہ)۔

الف- جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

خریدار کی حیثیت امانت دار کی ہوگی وہ امین ہونے کی حیثیت سے اس بیع کو رہن قرار دینے کی صورت میں نہ مال مرہون کا مالک ہوگا نہ اس سے کوئی نفع اٹھا سکے گا، بلکہ اس کی حفاظتی غفلت کے سبب سامان کے ہلاک وضائع ہو جانے پر خریدار سے اس کی قیمت کا تاوان وصول کیا جائے گا، البتہ خود بائع کی اجازت سے وہ حصول منافع کا حق دار بن سکتا ہے۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس صورت میں اکثر فقہاء کے نزدیک خریدار کا کم کرایہ پر معاملہ کرنا ناجائز ہے، کیوں کہ خریدار مرہون مبیع (مکان، دکان، زمین) سے مروجہ کرائے سے کم کرایہ کا معاملہ کر کے جو نفع اٹھا رہا ہے وہ درحقیقت اس ثمن پر اٹھا رہا ہے جو بیچنے والے کے ذمہ قرض ہے اور حدیث میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''كل قرض جر منفعة فهو ربا'' (السیوطی، الجامع الصغیر ۲/ ۹۴) (ہر ایسا قرضہ جو نفع کھینچے وہ ربا ہے)۔

یہ روایت صحابہ کرامؓ کے آثار واقوال کے طور پر سب کے نزدیک قابل اعتماد ہے اور بہت سارے صحابہ کرام سے منقول ہے، مثلاً حضرت فضالہ بن عبید کا اثر ''سنن بیہقی'' میں مذکور ہے۔

''كل قرض جر منفعته فهو وجه من وجوه الربا''۔

بیہقی فرماتے ہیں کہ بالکل یہی اصول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروی ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۶ / ۸۴)۔

اور اسی اصول پر فقہاء کرام نے بہت ساری فقہی جزئیات کا استنباط کیا ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں:

''من أسلف سلفًا فلا يشترط أفضل منه، وإن كان قبضة من علف فهو ربا'' (موطا امام مالک ص: ۶۱۳ مطبوعہ نور محمد کراچی)۔
(جو شخص کسی کو قرضہ دے وہ اس سے بہتر واپس دینے کی شرط نہیں لگا سکتا، یہاں تک کہ اگر ایک مٹھی بھر چارہ زائد لے لے تو وہ بھی ربا ہے)۔

امام بیہقی سے منقول ہے: ''ایک شخص نے عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا کہ میں نے ایک شخص سے پانچ سو اس شرط پر قرض لیئے ہیں کہ میں اسے اپنا گھوڑا سواری کے لیے عاریۃً (مفت) دوں گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا تمہارا قرض خواہ جو بھی نفع اس گھوڑے سے حاصل کرے گا وہ ربا ہے (بیہقی السنن الکبری ۵/ ۳۵۰)۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ خریدار نے جو مکان دکان خریدا ہے وہ بشرط واپسی بیع ہونے کی وجہ سے اس کے پاس رہن سے ہے اور رہن صرف باذن بائع مناسب نفع اٹھایا جاسکتا ہے زائد نفع نہیں اٹھا سکتا مثلاً:

''إذا ارتهن شاة شرب المرتهن من لبنها بقدر علفها، فإن استفضل من اللبن بعد ثمن العلف فهو ربا''
(الشوکانی نیل الاوطار ۵/ ۱۹۸)۔

(کسی نے کوئی بکری رہن رکھی تو مرتہن اس کے چارہ کھلانے کے بقدر دودھ پی سکتا ہے اگر دودھ اس کے چارہ سے زیادہ مہنگا ہے تو یہ اضافہ بھی ربا ہے)۔

اس ساری گفتگو کے بعد مسئلہ پر ایک اور نقطۂ نظر سے بھی غور وفکر ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جو قرض براہ راست حصولِ نفع کا ذریعہ بنے وہ بلا شبہ ربا (سود) ہے، لیکن جو قرض بصورت بیع، ثمن ہو اور کسی شرط فاسد کی وجہ سے وہ حکماً قرض بن جائے تو ایسے قرض حکمی کے زیر اثر حاصل ہونے والے نفع کو ربا نہیں کہا جاسکتا۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ''کل قرض جر نفعاً فهو ربا'' کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''مندرجہ بالا روایت میں لفظ ''قرض'' کے ساتھ ''جر'' کا لفظ مذکور ہے جس کے لغوی معنی کھینچنے کے آتے ہیں، لہٰذا اگر پورے جملے کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ہر ایسا قرض جو اپنے ساتھ نفع کھینچ کر لائے وہ ربا ہے، اس عبارت کے الفاظ یہ واضح کرتے ہیں کہ ربا سے مراد صرف وہ معاملہ ہے جہاں پر قرضہ اپنے ساتھ نفع کھینچ کر لائے کہ گویا عقد قرض نفع کے ساتھ مشروط ہو، لہٰذا اس سے مقروض کی جانب سے از خود رضا کارانہ طور پر دیا جانے والا نفع ربا کی تعریف سے خارج ہو جاتا ہے'' (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۶/ ۸۵-۸۶ فیصل دیوبند)۔

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ خریدار نے بیچنے والے شخص سے کم کرایہ پر جو معاملہ کیا ہے وہ اگر رضا کارانہ ہے تو خریدار کے لیے مروجہ کرایہ سے کم کرائے پر معاملہ کرنا جائز ہے اور یہ معاملہ ربا کی حد میں داخل نہیں ہے۔ ایک اور فقہی جزئیے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نقد داموں پر ایک روپیہ کے بیس سیر گیہوں بکتے ہیں، مگر کسی کو ادھار لینے کی وجہ سے اس نے روپے کے پندرہ سیر گیہوں دیئے تو یہ بیع درست ہے، مگر اسی وقت معلوم ہونا چاہیے کہ ادھار مَول لے گی (بہشتی زیور ص: ۲۲۹ چوتھا حصہ، فرید بکڈپو دہلی)۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا اس صورت بیع کے جواز پر اتفاق ہے (دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۴/ ۱۷۷، المبسوط للسرخسی ۱۳/ ۸، الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳/ ۹۸، مغنی المحتاج للشربینی ۲/ ۳۱، سنن ترمذی کتاب البیوع باب نمبر: ۱۸، حدیث نمبر: ۱۲۳۱، جدید معاشی مسائل ۳/ ۹۳)۔

اور اس بیع میں بائع نے ادھار خریداری پر جو پانچ سیر گیہوں کا زائد نفع حاصل کیا ہے وہ دراصل اس ادھار ثمن کا عوض ہے جو خریدار پر قرض ہے، کیوں کہ بیع موجل میں بیع مکمل ہوتے ہی ثمن مشتری کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے'' (جدید معاشی مسائل ۳/ ۹۵)۔

لہٰذا اس قرض سے بائع نے ادھار ہونے پر نفع حاصل کیا ہے جو بذریعۂ بیع درست قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا صورت مسئلہ میں بھی کم کرایہ داری پر معاملہ جائز ہونا چاہیے۔ کیوں کہ صاحب حق کو اپنے بعض حصۂ حق سے دست بردار ہو جانے کا حق ہے۔

یہاں ایک صورت اور بھی ہے جو خریدار کے حق میں بالاتفاق سند جواز فراہم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ:

''رجل أقرض إنسانًا دراهم وأراد أن يسكن دار المستقرض بغير أجر قال أبو بكر الإسكاف يستاجر المقرض دار المستقرض مدة معلومة: سنة أو أكثر بأجر معجل، ثم يبيع من المستقرض شيئًا يسيرًا بتلك الأجرة حتى يصير الأجرة قصاصًا بثمن ما باع من المستقرض'' (فتاوی قاضی خاں ۲/۹ مصطفائی دہلی)۔

(کوئی آدمی کسی شخص کو چند دراہم قرض دے اور وہ قرض لینے والے کے مکان میں بلا اجرت رہائش کرنا چاہے تو اس کی جائز صورت جیسا کہ امام ابوبکر

الاسکاف نے فرمایا یہ ہے کہ قرض دینے والا قرض لینے والے سے اس کا مکان ایک متعین کرایہ نقد ادا کر کے ایک سال یا زیادہ کی مدت تک کے لیے لے لے، پھر قرض دینے والا قرض لینے والے سے کوئی معمولی چیز اسی اجرت (کرایہ جو قرض دینے والے نے قرض لینے والے کو دیا تھا) کے بدلے بیچ دے تو یہی اجرت مستقرض سے بیع کا ثمن برابر بن جائے گی اور معاملہ جائز ہو جائے گا)۔

ج- اس عرصہ میں خریدار اس شیٔ سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

جن فقہاء نے بیع بالوفاء کے طور پر خریداری کو رہن حقیقی کے حکم میں رکھا ہے ان کے نزدیک نہ بائع کو حق انتفاع حاصل ہے، نہ خریدار کو۔

حضرت مفتی اعظم دار العلوم دیوبند نے لکھا ہے:

"اگر بیع نامہ میں یا اس سے پہلے بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا ذکر آچکا ہے تو یہ بیع رہن کے حکم میں ہے کل جائیداد جس کی بیع ہوئی ہے رہن رہے گی، مگر (خریدار) کو اس سے انتفاع ناجائز ہے، نہ اس کی آمدنی لے سکتا ہے، نہ اس کو بیع کر سکتا ہے، نہ اجارہ نہ رہن نہ ہبہ، بلکہ اس جائیداد کا محض محافظ اور امین رہے گا، اور اس کی جس قدر آمدنی ہوگی وہ بھی تمام رہن رہے گی، روپیہ وصول ہونے پر اس جائیداد کے ساتھ اس کی آمدنی کی بھی واپسی ضروری ہوگی، جس طرح بکر (خریدار) کو اس جائیداد سے اس عرصہ میں نفع حاصل کرنا ناجائز ہے، اسی طرح زید (بائع) کو بھی نفع کا حق نہیں (فتاوی محمودیہ ۶/ ۲۸۷)۔

لیکن فقہاء کی صراحت کے مطابق اگر بائع نے انتفاع کی اجازت دی ہو تو خریدار اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جیسا کہ ماقبل میں سوال (ب) کے ذیل میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے، پھر بھی زیادہ بہتر اور معتبر شکل یہ ہے کہ خریدار شروع میں تو بلا شرط واپسی پختہ بیع کر لے، پھر مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد بائع سے وعدہ کر لے کہ جس وقت وہ اس خریدی ہوئی جائیداد کا پورا ثمن (جس کو طے کر کے خریداری کی گئی تھی) واپس ادا کر دے تو خریدار اس بیع کا سابقہ ثمن پر ہی اقالہ (واپسی کر لے گا۔ اور چوں کہ اس درمیانی عرصے میں وہ جائیداد خریدار کی ملکیت میں ہوگی تو وہ اس سے بلا شبہ فائدہ اٹھانے کا حقدار ہوگا اور اس طرح کے وعدے محض نمائشی وعدے نہیں ہوتے، بلکہ انسانی حاجات کے پیش نظر یہ واجب الایفاء ہوتے ہیں۔

"وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس" (فتاوی قاضی خاں ۲/۲۵۳ مصطفائی دہلی)۔

یہی بات فتاوی سراجیہ میں بھی کہی گئی ہے (دیکھئے: فتاوی سراجیہ علی ہامش قاضی خاں: ۱۶۳)۔

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ اسلام اور جدید معاشی مسائل (۵/ ۷۲) میں لکھتے ہیں:

فقہاء نے اس طریقۂ کار کو جائز قرار دیتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ "قد تجعل المواعيد لازمة لحاجة الناس" (ضرورت کے وقت وعدوں کو عدالتی طور پر بھی لازم قرار دیا جا سکتا ہے) حتی کہ اگر وعدہ بیع کے موثر اور نافذ ہونے کے پہلے کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد بیع بغیر شرط منعقد ہوتی ہے تو ان فقہاء کے نزدیک ایسا کرنا بھی جائز ہوگا (دیکھئے: جامع الفصولین ۲/ ۲۳۷، رد المحتار ۲/ ۱۳۵)۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے۔

اگر یہ بیع حکم رہن میں داخل ہے تو خریدار کو اس کو کسی بھی قیمت پر بیچنے کا حق حاصل نہیں ہے اور اگر بیع بشرط واپسی بیع جائز کے حکم میں ہو، جیسا کہ امام اسبیجابی نے کہا ہے تب بھی نہیں بیچ سکتا، کیوں کہ یہ مقصد بیع بالوفاء کے خلاف ہے، البتہ جن فقہاء نے بیع فاسد قرار دیا ہے، جیسا کہ پیچھے نقل کیا جا چکا ہے ان کے نقطۂ نظر سے مبیع پر قبضے کے بعد ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اسی لیے کسی بھی قیمت پر بیچ سکتا ہے۔

۳- کثیر رقم ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا۔

مالک مکان ودکان کے لیے مکان ودکان پر یکمشت کثیر رقم حاصل کرنا جائز ہے، اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

ایک یہ کہ مکان ودکان کے کرایہ دار سے پیشگی طور پر ماہانہ یا سالانہ طے شدہ کرایہ کے حساب میں شامل کیا جاتا ہے تو یہ بلا شبہ درست ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ وہ از سر نو کرایہ داری کے معاملہ پر رقم حاصل کرلے اور مارکیٹ ویلو کے مطابق ہی کرایہ طے کرے اور اسی رقم میں سے ماہانہ یا سالانہ علی الحساب مروجہ کرایہ وصول ہوتا رہے۔ یا یہ کثیر رقم سیکورٹی کے طور پر مکان ودکان کے مالک کے پاس جمع رہے اور مدت کرایہ داری ختم ہونے پر وہ پوری رقم دینے والے کو واپس کر دی جائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ یہ کثیر رقم مالک مکان ودکان کے پاس بطور امانت ودیعت محفوظ رہے گی اور اس میں امانت ہی کے احکام جاری ہوں گے اور اگر مکان ودکان کے مالک نے اس کثیر رقم کو اپنے تصرف میں لانے کی اجازت کے ساتھ حاصل کیا ہے تو وہ قرض کے حکم میں ہے اور اس

پر قرض کے ہی احکام نافذ ہوں گے۔

آج کل شہروں میں زر ضمانت کے عنوان سے جو کثیر رقم حاصل کی جاتی ہے وہ امانت ودیعت نہیں، بلکہ قرض ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ:

''قال عبد اللہ بن الزبیر وإنما کان دینه الذی علیه أن الرجل یأتیه بالمال، فیستودعه إیاه، فیقول الزبیر لا، ولکنه سلف فإنی أخشی علیه الضیعة'' (محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری ۱/۴۴۱)۔

(عبد اللہ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ ان کے والد حضرت زبیر پر جو قرض تھا اس کی صورت یہ تھی کہ لوگ ان کے پاس امانت رکھتے تھے تو وہ فرماتے ہیں کہ امانت مت رکھو، بلکہ اسے بطور قرض میرے پاس رکھ دو، کیوں کہ مجھے اس کے ضائع ہوجانے کا ڈر ہے (اور اس شکل میں تمہاری امانت ضائع ہوجائے گی اور شرعاً میں واپسی کا ذمہ دار نہیں ہوں گا اور قرض کے طور پر رکھو گے تو ضائع ہوجانے پر ادائیگی کی ذمہ داری میرے اوپر رہے گی)۔

اور صورت معاملہ سے واضح ہے کہ زر ضمانت کے نام پر حاصل کی جانے والی یہ کثیر رقم اسی غرض سے حاصل کی جاتی ہے کہ لینے والا اسے اپنی ضرورت میں استعمال کرنے کا مجاز ہوگا، لہٰذا یہ قرض کے حکم میں ہے۔ امانت ودیعت بالکل نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ مالک مکان ودکان اس کثیر رقم پر مکان ودکان میں مروجہ کرایہ سے کم کرایہ کی ادائیگی پر رقم لینے والے سے معاملہ کرلے تو اسے سود قرار دے کر حرام سمجھا جائے گا یا نہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ کثیر رقم دینے والے نے رقم دیتے وقت مروجہ کرایہ سے کم کرایہ داری کی شرط پر دی ہے تو مقرض (قرض دینے والے) کے لیے قرض پر سود کا نفع حاصل کرنے کی وجہ سے یہ معاملہ کرنا حرام ہوگا۔

اور اگر یہ رقم مقرض ومستقرض کے درمیان کم کرایہ داری کی شرط کے بغیر مطلقاً کرایہ داری کے معاملہ پر حاصل کی گئی اور کرایہ کا معاملہ طے کرتے وقت مالک مکان ودکان نے رضا کارانہ طور پر مروجہ کرایہ سے کم کرایہ پر دینا طے کردیا تو یہ صورت جائز ہوگی، کیوں کہ اس شکل میں دین پر حصول نفع کا اطلاق نہیں ہوگا۔ جیسا کہ وقف کی جائیداد میں یہ کمی بیشی کا معاملہ درست قرار دیا گیا ہے (دیکھئے: حاشیۃ العدوی علی الخرشی ۷/۷۹)۔

خلو کی دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد پر چند دکانیں وقف ہیں، مسجد کی تکمیل یا نئی تعمیر کے لیے سرمایہ کی ضرورت پڑی۔ ایک دکان کا ماہانہ کرایہ تیس درہم ہے کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں ہے جس سے مسجد کی تکمیل یا تعمیر نو کی جائے۔ لہٰذا مسجد کا متولی دکانوں کے کرایہ داروں سے خاص مقدار کی رقم مسجد تعمیر کرنے کے لیے ان سے وصول کرے اور ماہانہ کرایہ تیس درہم کے بجائے پندرہ درہم کردے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ دکان کی منفعت صاحب خلو کرایہ دار اور وقف کے درمیان اس مقدار میں مشترک ہوجائے گی، جتنے پر صاحب خلو اور متولی وقف از روئے مصلحت راضی ہوجائیں۔ جیسا کہ الناصر کے فتوی سے معلوم ہوتا ہے

(اسلام اور جدید مسائل ۳/ ۷۴)۔

اس مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے زیر بحث مسئلہ میں یکساں حکم جاری کیا جاسکتا ہے، اگرچہ بعض فقہاء نے ذاتی اور شخصی ملکیت والے مکان ودکان اور وقف کی دکان ومکان میں فرق کیا ہے اور جواز صرف ملکیت وقف والی جائیداد میں رکھا ان کا کہنا ہے کہ:

شخصی ملکیت اور وقف میں فرق یہ ہے کہ جو مکان شخصی ملکیت ہو اس کا مالک مکان کبھی اس کو کرایہ پر دینے سے باز آجاتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ خود اس میں رہائش اختیار کرلے یا اسے فروخت کردے یا معطل چھوڑ دے، لیکن جو مکان وقف کی ملکیت ہے اور کرایہ دینے کے لیے بنایا گیا ہے، اس کے بارے میں وقف کے متولی کو کرایہ پر دینے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/۷۸)۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ وجہ فرق خلو (پگڑی) کے مسئلہ میں تو چل سکتی ہے ذاتی مکان ودکان کی کرایہ داری کے مسئلہ میں نہیں چل سکتی۔ کیوں کہ مکان ودکان سے حصول منفعت شخصی اور وقف ملکیت دونوں میں یکساں ہے۔ اس لیے رہائش یا فروخت یا مصلحتاً تعطیل بھی منفعت سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا دونوں ملکیتوں میں یکساں حکم جواز دیا جاسکتا ہے۔ اور ذاتی مالک مکان ودکان کو بھی مروجہ کرایہ وصول کرنے کے پورے حق میں سے آدھے حق سے دست بردار ہوکر کم کرایہ پر معاہدہ ومصالحت کرلینے کا بھی حق ہے، جیسا کہ مذکورہ مسئلہ میں وقف کے متولی کو یہ حق حاصل ہے۔

رہ گیا قرض پر حصول منفعت کا رہا ہونا اور اس بنا پر حرمت کا حکم لگانا تو وہ یہاں مفقود ہے، اس لیے کہ قرض پر وہ نفع ممنوع ہے جو عقد قرض کے ساتھ مشروط ہو، لہٰذا اس سے مقروض کی جانب سے از خود رضا کارانہ طور پر دیا جانے والا نفع ربا کی تعریف سے خارج ہوجاتا ہے۔

قرآن وحدیث کی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں کہ رأس المال پر وصول کی جانے والی کوئی بھی اضافی رقم، خواہ کم ہو یا زیادہ اگر عقد قرض میں مشروط ہوگی تو وہ ربا کہلائے گی، لہٰذا وہ حرام ہوگی (مفتی محمد تقی عثمانی: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۶/ ۸۶)۔

بیع وفا، مسائل اور احکام

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

بیع وفا کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ بائع خریدار سے کہتا ہے کہ آپ کا جو دین مجھ پر ہے، اس کے بدلہ میں یہ سامان میں آپ کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، اس شرط کے ساتھ کہ جب میں آپ کا دین واپس کردوں گا تو یہ سامان میرا ہو جائے گا، یا بائع یہ کہتا ہے کہ یہ سامان آپ کے ہاتھ اتنی قیمت میں فروخت کرتا ہوں اس شرط پر کہ جب میں ثمن آپ کو واپس کردوں گا تو آپ یہ سامان مجھ کو دے دیں گے۔

"وصورته: أن يقول البائع للمشتري: بعت منك هذا العين بدين لك عليّ على أني متى قضيت الدين فهو لي أو يقول البائع: بعتك هذا بكذا متى دفعت لك الثمن تدفع العين إليّ" (البحر الرائق ۶/۸، العنایہ ۱۲/۱۵۶)۔

(اس کی صورت یہ ہے کہ بائع خریدار سے کہے کہ میں نے یہ عین آپ سے اس دین کے بدلہ میں فروخت کیا، جو آپ کا میرے اوپر ہے، اس شرط پر کہ جب میں دین ادا کردوں گا تو یہ عین میری ہو جائے گی، یا بائع کہے کہ یہ آپ سے اتنے میں فروخت کیا جب میں ثمن آپ کو دیدوں گا تو آپ عین مجھ کو دیدیں گے)۔

فقہ حنفی میں بیع وفا کے بارے میں اچھی خاصی تفصیل ملتی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان خاصا اختلاف بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ صاحب "البحر الرائق" نے "بزازیہ" کے حوالے سے کل آٹھ اقوال نقل کیا ہے اور ہر ایک کی تفصیل ذکر کی ہے۔ دوسرے فقہاء کے یہاں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے، فقہ حنبلی میں اس کو "بیع الامانہ" کہتے ہیں، ان کے یہاں یہ عقد باطل ہے، کشاف القناع (۴۰۵/۸) کتاب البیع میں ہے:

"قال الشيخ بيع الأمانة هو الذي مضمونه اتفاقهما أي اتفاق البائع والمشتري على أن البائع جاء بالثمن أعاد إليه المشتري ملك ذلك ينتفع به أي بالمبيع المشتري بالإجارة والسكنى ونحو ذلك كركوب ما يركبه وحلبه و هو أي البيع إذن عقد باطل بكل حال ومقصودهما إنما هو الربا بإعطاء دراهم إلى أجل ومنفعة الدار أو نحوهما هي الربح فهو في المعنى قرض بعوض"۔

(شیخ نے کہا: بیع الامانہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ بائع اور خریدار دونوں اس پر متفق ہوں کہ جب بائع ثمن واپس کرے گا تو خریدار اس کی ملکیت کو لوٹا دے گا، خریدار مبیع سے فائدہ اٹھائے گا، خواہ اجارہ پر دے، یا رہائش اختیار کرے یا سواری کرے یا دودھ حاصل کرے، یہ عقد بہر حال باطل ہے، دونوں کا مقصد کچھ مدت تک کے لیے دراہم دے کر سود حاصل کرنا ہے، گھر وغیرہ کی منفعت یہی نفع ہے، یہ حقیقت میں قرض بامعاوضہ ہے)۔

بعینہ یہی عبارت بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مطالب اولی النہی (۲۸۶/۷) کتاب البیع اور الاقناع (۵۸/۲) شروط البیع میں بھی ہے۔

فقہ شافعی میں اس کو "بیع العہدہ" کہتے ہیں، اگر صلب عقد میں شرط فاسد لگادی جائے گی تو یہ بیع فاسد ہوگی، اور اس پر بیع کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اور اگر بیع سے قبل اس شرط فاسد پر اتفاق کرلیں گے، لیکن بیع میں صرف ایجاب وقبول کریں گے، شرط صرف ان کے دل میں پوشیدہ ہوگی، بیع میں اس کا ذکر نہیں ہوگا، تو امام شافعی کے نزدیک بیع صحیح ہوگی۔ بعض علماء یمن نے اس کے جواز کا، جبکہ دوسرے بعض نے اس کے بطلان کا فتوی دیا ہے، "الفتاوی الفقہیہ الکبری" میں اس اختلاف پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ عقد میں شرط فاسد کے ہوتے ہوئے اس کو صحیح کہنا یا شرط فاسد کے ذکر کے بغیر اس کو باطل کہنا نا قابل اعتبار ہوگا۔

"وبلغني عن بعض علماء اليمن أنه أفتى بصحة بيع العهدة وبعضهم أفتى ببطلانه واختلافهم عجيب، فإن القول بالصحة عند اقتران الشرط الفاسد بالعقد وبعدمها عند إضماره قول ساقط لا يعول عليه ولا يلتفت إليه بل المنقول في مذهب الشافعي رضي الله عنه من غير خلاف يعتد به في ذلك هو ما قررته فاعتمده ولا تغتر بما سواه والله سبحانه وتعالى اعلم" (الفتاوی الفقہیہ الکبری ۲/۱۵۷)۔

(بعض علماء یمن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیع العہدہ کے صحیح ہونے کا فتوی دیتے ہیں، جبکہ بعض اس کے باطل ہونے کا فتوی دیتے ہیں، ان کا

[1] قاضی شریعت دار القضاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

اختلاف بھی عجیب ہے، اس لیے کہ عقد کے ساتھ فاسد شرط کے ملے ہونے کے وقت اس کو صحیح کہنا اور شرط کے پوشیدہ ہونے کے وقت اس کو باطل کہنا ناقابل بھروسہ اور ناقابل توجہ ہے، بلکہ امام شافعی کے مذہب میں اس سلسلہ میں بلا اختلاف قابل اعتماد قول وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے، لہٰذا اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے، اس کے علاوہ کسی قول سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے)۔

فقہ مالکی میں اس کو بیع الثنیا کہتے ہیں، اگر ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی کی شرط عقد ہی میں ہو، یا عقد سے قبل دونوں اس پر متفق ہو جائیں پھر عقد کریں تو یہ بیع فاسد ہوگی، اگرچہ بعد میں اس شرط کو ساقط کردیں اور اگر عقد کے وقت یا اس سے قبل شرط نہ لگائی جائے، بلکہ مطلق بیع ہو، بیع کے بعد مشتری ثمن کی واپسی پر مبیع کے واپس کرنے کا وعدہ کرلے تو یہ بیع صحیح ہو جائے گی، مگر ثمن کی واپسی کے وقت مبیع کو واپس کرنا مشتری پر واجب نہ ہوگا، بلکہ مستحب ہوگا، ان کے یہاں بیع فاسد میں اگر مشتری مبیع پر قابض ہوگا تو اس کی آمدنی کا مالک ہوگا، اس لیے کہ وہ شیٔ اس کے ضمان میں رہتی ہے، حاشیہ دسوقی، حاشیہ صاوی علی الصغیر اور بلغۃ السالک میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے، عربی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''معلوم ہونا چاہیے کہ بیع فاسد میں آمدنی خریدار کی ہوگی اگرچہ بیع الثنیا میں ہو جو راجح قول کے مطابق ممنوع ہے، بیع الثنیا وہی ہے جو مصر میں بیع المعاد کے نام سے مشہور ہے، یعنی بائع خریدار پر یہ شرط لگائے کہ جب وہ ثمن اس کو واپس کردے گا تو وہ مبیع اس کو واپس لوٹا دے گا، لہٰذا اگر وہ شرط بیع کے وقت لگائی جائے یا عقد کے قبل اس پر دونوں اتفاق کرلیں تو بیع فاسد ہو جائے گی، اگرچہ بعد میں شرط کو ساقط کردے، اس لیے کہ واضح نہیں ہوگا کہ ثمن قرض ہے یا ثمن ہے۔ اگر خریدار مبیع پر قبضہ کرلے گا اور واپس کرنے سے قبل اس سے آمدنی حاصل کرے گا تو آمدنی اس کی ہوگی اور یہی راجح ہے، اس لیے کہ وہی ضامن ہے۔ البتہ اگر خریدار بیع کے بعد بطور تبرع بائع سے وعدہ کرلے اور بیع کے لازم ہونے کے بعد اس سے کہے جب تم مجھے ثمن واپس کروگے تو میں مبیع تم کو دیدوں گا، تو بیع صحیح ہو جائے گی، لیکن اس وعدہ کو پورا کرنا خریدار پر لازم نہیں ہوگا، بلکہ محض مستحب ہوگا''

(حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۱۱/۲۹۹ - ۳۰۰، حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر ۶/۳۶۷، بلغۃ السالک لأقرب المسالک ۳/۶۵)۔

فقہ حنفی میں تفصیلی بحث ملتی ہے، صاحب ''البحر الرائق'' نے ''بزازیہ'' کے حوالہ سے آٹھ اقوال نقل کیا ہے، جیسا کہ اوپر اس کا ذکر ہوا، کچھ لوگوں نے اس کو ناجائز کہا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس کو جائز کہا ہے، عجیب اتفاق ہے کہ جو لوگ اس کو جائز کہتے ہیں وہ اس کو ربو سے بچنے کا حیلہ قرار دیتے ہیں اور جو لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں وہ اس کو ربو کھانے کا حیلہ قرار دیتے ہیں، بعض لوگوں نے تو اس کو مذاق سے تعبیر کیا ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری نے آٹھویں قول کو جامع قول کہا ہے، اس کو بعض محققین کی رائے قرار دیا ہے، ان کے نام نہیں بتائے ہیں اور ان کی رائے ہے کہ اسی جامع قول کے مطابق فتوی دینا چاہیے، اس قول کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیع بعض احکام کے اعتبار سے فاسد ہے، جس کا اثر یہ ہے کہ دونوں فریق میں سے ہر ایک کو حق ہوگا کہ اس عقد کو فسخ کردے، بعض احکام میں صحیح ہے، جس کا اثر یہ ہوگا کہ مشتری کے لیے مبیع کے منافع اور آمدنی حلال ہوگی، بعض احکام کے اعتبار سے رہن ہوگا اور مشتری دوسرے سے فروخت نہیں کرسکے گا وغیرہ۔

''القول الثامن الجامع لبعض المحققين أنه فاسد فی حق بعض الأحكام حتی ملك كل منهما الفسخ وصحيح فی حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع ورہن فی حق البعض حتی لم يملك المشتری بيعه من آخر ولا رهنه ولم يملك قطع الشجر ولا هدم البناء وسقط الدين بهلاكه وانقسم الثمن إن دخله نقصان كما فی الرهن۔ وينبغی أن لا يعدل فی الإفتاء عن القول الجامع'' (البحر الرائق ۶/۹)۔

(آٹھواں جامع قول جو بعض محققین کا ہے کہ وہ بعض احکام کے اعتبار سے فاسد ہے، چنانچہ دونوں میں سے ہر ایک کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا اور بعض احکام کے اعتبار سے صحیح ہے، جیسے مبیع کے منافع اور آمدنی کا حلال ہونا اور بعض احکام کے اعتبار سے رہن ہے، چنانچہ خریدار کسی دوسرے سے فروخت کرنے یا اس کو رہن رکھنے کا مالک نہیں ہوگا، درخت کو کاٹنے اور مکان کو منہدم کرنے کا مالک نہ ہوگا اس کے ہلاک ہونے کی وجہ سے دین ساقط ہو جائے گا، اگر اس میں کوئی نقص ہو جائے تو ثمن کم ہو جائے گا، جیسا کہ رہن میں ہوتا ہے)۔

عاقدین نے لفظ بیع کا استعمال کیا ہے اور کوئی شرط فاسد نہیں لگائی ہے، اس لیے بعض حضرات کی رائے ہے کہ اسے جائز ہونا چاہیے، مجھ کو سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ کی بازیگری سے حقائق کیسے بدل جائیں گے، شراب کے بوتل پر شربت کا لیبل لگا دینے سے اس کی حقیقت کیسے بدل جائے گی؟

میرے وطن میں سودی قرض کے لینے دینے کے بہت سے طریقے رائج تھے، ان میں سے ایک طریقہ تقریباً تیس برس پہلے یہ تھا کہ مدیون نقد سود

دینے کے بجائے اپنی کوئی زمین دائن کے پاس رہن رکھ دیتا تھا، اس کی رجسٹری بھی ہوتی تھی اور اس کو رہن لکھا جاتا تھا، اس کی ایک مدت بھی متعین ہوتی تھی، اس مدت کے گزرنے سے قبل مدیون دین واپس کر کے اپنی زمین واپس نہیں لے سکتا تھا۔ الا یہ کہ دائن بھی راضی ہو، البتہ اس مدت کے گزرنے کے بعد جب چاہتا دین واپس کر سکتا تھا، حکومت نے تقریباً تیس برس قبل ایک قانون بنایا اور ایک مدت مقرر کر دی کہ اتنی مدت تک اگر کسی دائن نے رہن کی زمین سے فائدہ اٹھالیا، تو اس کا دین ساقط ہو جائے گا اور مدیون دین سے بری ہو جائے گا، اس کو دین کا کچھ حصہ واپس کیے بغیر اپنی زمین واپس لینے کا حق ہو جائے گا، چنانچہ بہت سے لوگوں نے اپنی زمین واپس لے لی، اس کے بعد بھی قرض لے کر زمین رہن رکھنے کا رواج رہا، مگر اس کا نام رہن سے بدل کر ''بیع واپسی'' رکھ دیا گیا، اور اس میں مدت کی کوئی تعیین نہیں رہی، یعنی مدیون جب چاہے دین واپس کر کے اپنی زمین لے سکتا ہے، ظاہر ہے، لفظ ''رہن'' کو لفظ ''بیع واپسی'' سے بدل دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدل گئی، اور کل اگر وہ رہن کی شکل میں سودی کاروبار تھا تو آج بیع واپسی کی شکل میں سودی کاروبار سے نکل کر حلال کاروبار نہیں ہو جائے گا، چنانچہ جن فقہاء نے اس کو رہن قرار دیا ہے، انہوں نے وضاحت کی ہے کہ عقود میں الفاظ وبیان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ مقاصد ومعانی کا اعتبار کیا جائے گا، اسی لیے اگر کفالہ میں اصیل کے بری ہو جانے کی شرط لگادی جائے تو وہ حوالہ ہوگا، نہ کہ کفالہ اور اگر حوالہ میں اصیل کے بری نہ ہونے کی شرط لگادی جائے تو وہ حوالہ نہیں رہ جائے گا، بلکہ کفالہ ہو جائے گا۔

''درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام'' میں قاعدہ کلیہ ذکر کیا ہے کہ عقود میں الفاظ وبیان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ مقاصد ومعانی کا اعتبار ہوگا، اسی وجہ سے بیع الوفاء میں رہن کا حکم جاری ہوگا۔

''(المادة ۳): العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للألفاظ والمباني، ولذا يجري حكم الرهن في البيع بالوفاء ...''۔

(مادہ ۳: عقود میں الفاظ وبیان کے بجائے مقاصد ومعانی کا اعتبار کیا جائے گا، اسی وجہ سے بیع الوفاء میں رہن کا حکم جاری ہوگا)۔

اس کے علاوہ انہوں نے پانچ مثالیں اور بھی دی ہیں جن کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ عقد میں الفاظ وبیان کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ معانی ومقاصد کا اعتبار کیا جائے گا، سب کو ذکر کرنا طوالت کا سبب ہوگا۔

بعض معاصرین نے ثمن کے نقد اور دین ہونے میں فرق کیا ہے، یعنی اگر ثمن نقد ہو اور واپسی کی شرط صلب عقد میں نہ ہو تو یہ بیع وفاء جائز ہے اور اگر ثمن دین ہو، یعنی مشتری کا دین بائع کے ذمہ میں ہو اور اس دین کے بدلہ میں بائع بیع وفاء کرے تو یہ رہن ہے، ثمن کے نقد یا دین ہونے میں فرق کیوں ہوگا، میں نہیں سمجھ سکا۔

اہل بلخ دین اور اجارہ کے عادی ہو گئے تھے، اہل بخاری طویل اجارہ کے عادی ہو گئے تھے، اور یہ درختوں میں صحیح نہیں ہے، اس لیے وہ بیع وفا کرنے پر مجبور ہو گئے، لیکن ان کو بیع بات کرنے میں کیا مجبوری تھی، میں نہیں سمجھ سکا، فقہاء کے یہاں اکثر وبیشتر ضرورت وحاجت کا ذکر ملتا ہے، مگر خود ہندوستان میں بیع بات میں کیا دشواری ہے وہ کون سی حاجت وضرورت ہے جس کی وجہ سے یہاں بیع وفاء کی اجازت دی جائے، ابھی تک مجھ کو سمجھ میں نہیں آیا، بیع سلم کو مثال میں پیش کیا جاتا ہے، بیع سلم کے جواز میں جو مجبوری ہے، وہ تو سمجھ میں آتی ہے، کاشتکار کو کبھی اس کے غلہ کے تیار ہونے سے قبل کوئی ناگہانی ضرورت پیش آجاتی ہے، اور قرض نہیں ملتا تو بیع سلم پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن زمین کی بیع بات کرنے میں کیا دشواری ہے، وہ بیع وفاء پر مجبور ہو جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے، سوائے اس کے کہ ایک آدمی کے پاس ایک ایکڑ زمین ہے اور نہیں چاہتا ہے کہ اس میں سے چند ڈسمل زمین بھی اس کی ملکیت سے نکل جائے، چاہے اس کے لیے اس کو سود ہی کیوں نہ دینا پڑے، اس لیے وہ بیع وفا کرتا ہے۔

امام نسفی کی طرف جواز وعدم جواز دونوں کی نسبت کی گئی ہے، صاحب ''تبیین الحقائق'' نے ان کی طرف جواز کی نسبت کی ہے۔

''ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا لبعض أحكامه منهم الإمام نجم الدين النسفي فقال: اتفق مشائخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعًا جائزًا مفيدًا بعض أحكامه''۔

(سمرقند کے بعض مشائخ نے اس کو بیع غیر لازم اور بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے، انہی میں امام نجم الدین نسفی بھی ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ نے متفقہ طور پر اس کو بیع غیر لازم اور بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے)۔

''درر الحکام شرح غرر الاحکام'' میں ان کی طرف عدم جواز کی نسبت کی گئی ہے۔

''قال الشيخ الإمام نجم الدين النسفي في فتاواه البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالًا للربا وسموه بيع الوفاء هو في الحقيقة رهن، وهذا المبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن'' (درر الحكام شرح غرر الاحكام ۲/۲۳۷)۔

(امام نجم الدین نسفی نے اپنے فتوی میں کہا ہے کہ ہمارے اہل زمانہ میں ربا سے بچنے کے لیے جو بیع متعارف ہے، جس کا نام انہوں نے بیع وفار کھا ہے، یہ درحقیقت رہن ہے اور خریدار کے قبضہ میں مبیع ایسی ہی ہے جیسے مرتہن کے قبضہ میں رہن ہوتا ہے)۔

پھر تفصیل کے ساتھ اس کے رہن ہونے کی وجہ اور اس کا حکم ذکر کیا ہے۔

''المحیط البرہانی'' میں فتاوی نسفی سے عدم جواز ہی منقول ہے۔

''وفی فتاوی النسفی أن البیع الذی تعارف (علیه) أهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزًا عن الربا فی الحقیقة رهن، والمبیع فی ید المشتری کالرهن فی ید المرتهن''۔

(فتاوی نسفی میں ہے کہ وہ بیع جو اہل سمرقند کے یہاں متعارف ہے، جس کا نام انہوں نے سود سے بچنے کے لیے بیع وفاء رکھا ہے، حقیقت میں رہن ہے، خریدار کے قبضہ میں مبیع کی وہی حیثیت ہے جو مرتہن کے قبضہ میں رہن کی ہوتی ہے)۔

علامہ شامی کا رجحان بھی عدم جواز کی طرف ہی ہے۔

''قلت: ینبغی لزومها علی المشتری فقط علی القول الذی علیه العمل الآن من أن بیع الوفاء منزل منزلة الرهن وعلیه، فیکون الثمن دینا علی البائع'' (رد المحتار ۲/۲۶۱، مطلب فی زکوۃ ثمن المبیع وفاء)۔

میں کہتا ہوں کہ اس قول کے مطابق جس پر آج کل عمل ہے کہ بیع وفاء رہن کے درجہ میں ہے اور ثمن بائع پر دین ہے، مناسب ہے کہ زکوۃ صرف خریدار پر واجب ہو۔

میرے نزدیک ان فقہاء کی رائے راجح ہے، جو بیع وفا کو رہن قرار دیتے ہیں، البتہ راہن کی اجازت سے مرتہن کے لیے شیٔ مرہون سے استفادہ کو صحیح قرار دینا، موجودہ حالات میں جائز نہ ہوگا۔ اس لیے کہ شیٔ مرہون سے مرتہن کے لیے استفادہ اس وقت جائز ہوتا ہے، جبکہ استفادہ کی شرط عقد میں نہ ہو یہاں تو یہ عقد شیٔ مرہون سے فائدہ حاصل کرنے ہی کے لیے کیا جاتا ہے، اس لیے راہن کی اجازت سے بھی مرتہن کے لیے شیٔ مرہون سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہ ہوگا۔

''قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم إنما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف کالمشروط وهو مما یعین المنع، والله تعالی أعلم'' (حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار ۴/۲۳۶)

(میں کہتا ہوں، کہ آج کل اکثر لوگ رہن رکھتے وقت اس سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر فائدہ حاصل کرنا ہو تو وہ قرض دیں گے ہی نہیں، اور یہ شرط کے درجے میں ہے، اس لیے کہ مشہور قاعدہ ہے: ''المعروف کالمشروط'' یعنی جس چیز کا رواج عام ہو جائے وہ شرط کے درجے میں ہے، اس سے ناجائز ہونے کی تائید ہوتی ہے)۔

ان تفصیلات کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے دراصل بیع نہیں ہے۔

الف، ب، د- جب یہ بیع نہیں ہے، بلکہ رہن ہے تو فروخت کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔

ج- خریدار کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے، عام طور پر فقہاء نے لکھا ہے کہ مرتہن، راہن کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اس قول کا تعلق اس صورت سے ہے، جبکہ فائدہ اٹھانا مشروط نہ ہو، یہ معاملہ تو شیٔ مرہون سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہی کیا جاتا ہے، اس لیے راہن کی اجازت سے بھی فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

۲- وہ رہن ہے۔

(الف)......اس کا حکم اوپر ''ج'' میں گزر چکا۔ (ب)......جائز نہ ہوگی، یہ قرض سے فائدہ اٹھانا ہے، جو ربا ہے اور حرام ہے۔ (ج)......نہیں۔

۳- زرضمانت کے نام پر لی گئی رقم دراصل رہن نہیں ہے، بلکہ بیع وفاء کی طرح قرض سے فائدہ اٹھانے کی ایک صورت ہے، اس لیے کہ کرایہ دار کو اگر مناسب کرایہ سے کم کرایہ پر مکان نہ دیا جائے تو ضمانت کے نام پر اتنی بڑی رقم وہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا، اسی طرح اگر مالک مکان کو روپیہ نہ دیا جائے، بلکہ اس رقم سے زائد قیمت کا زیور دے دیا جائے، تا کہ وہ اس کو اپنے پاس محفوظ رکھے تو وہ مکان کا کرایہ کم نہیں کرے گا، الغرض مالک مکان زرضمانت کے نام سے رقم لے کر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی لیے اس کے بدلے میں کم کرایہ پر مکان فراہم کرتا ہے اور کرایہ دار موٹی رقم فراہم کرتا ہے اور اس کے بدلے میں کم قیمت پر مکان حاصل کرتا ہے، اس لیے یہ: ''کل قرض جر نفعا'' میں داخل ہو کر سود ہے اور حرام ہے۔

بیع الوفاء کی شرعی حیثیت

مفتی شبیر احمد قاسمی [خادم الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یوپی)]

بیع الوفاء کے اسماء:

اس عقد کو حسبِ ذیل ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے:

(۱) بیع الوفاء (۲) بیع الامانت (۳) بیع الاطاعت (۴) بیع المعاملہ (۵) البیع الجائز (۶) بیع الرھن اور الرھن المعاد رکھا ہے۔

یہ چھ نام ہمارے سامنے ہیں، حضراتِ فقہاء نے ان مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے اپنے طور پر اس عقد کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے اور ان ناموں کی وجہ تسمیہ بھی پیش کی ہے، چنانچہ "درمختار" میں ہے:

"وَبَيْعُ الْوَفَاءِ صُورَتُهُ أَنْ يَبِيعَهُ الْعَيْنَ بِأَلْفٍ عَلَى أَنَّهُ إِذَا رَدَّ عَلَيْهِ الثَّمَنَ رَدَّ عَلَيْهِ الْعَيْنَ وَسَمَّاهُ الشَّافِعِيَّةُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ، وَيُسَمَّى بِمِصْرَ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَبِالشَّامِ بَيْعَ الْإِطَاعَةِ (وَتَحْتَهُ فِي الشَّامِيَّةِ) وَوَجْهُ تَسْمِيَتِهِ بَيْعَ الْوَفَاءِ أَنَّ فِيهِ عَهْدًا بِالْوَفَاءِ مِنَ الْمُشْتَرِي بِأَنْ يَرُدَّ الْمَبِيعَ عَلَى الْبَائِعِ حِينَ رَدِّ الثَّمَنِ، وَبَعْضُ الْفُقَهَاءِ يُسَمِّيهِ الْبَيْعَ الْجَائِزَ وَلَعَلَّهُ مَبْنِيٌّ عَلَى أَنَّهُ بَيْعٌ صَحِيحٌ لِحَاجَةِ التَّخَلُّصِ مِنَ الرِّبَا حَتَّى يَسُوغَ لِلْمُشْتَرِي أَكْلُ رِيعِهِ وَبَعْضُهُمْ يُسَمِّيهِ بَيْعَ الْمُعَامَلَةِ وَوَجْهُهُ أَنَّ الْمُعَامَلَةَ رِبْحُ الدَّيْنِ وَهٰذَا يَشْتَرِيهِ الدَّائِنُ لِيَنْتَفِعَ بِهِ بِمُقَابَلَةِ دَيْنِهِ (وَقَوْلُهُ) بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَجْهُهُ أَنَّهُ أَمَانَةٌ عِنْدَ الْمُشْتَرِي (وَقَوْلُهُ) وَفِي بَعْضِهَا بَيْعَ الطَّاعَةِ وَهُوَ الْمَشْهُورُ الْآنَ فِي بِلَادِنَا"

(اور بیع الوفاء اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری کے ہاتھ عینِ مبیع کو بیچے مثلاً ایک ہزار عوض میں اس شرط کے ساتھ کہ جب ثمن واپس کردے گا تو عینِ مبیع بھی واپس کردے گا، اور شافعیہ نے اس کا نام "الرھن المعاد" رکھا ہے، اہل مصر نے اس کا نام "بیع الامانۃ" رکھا ہے، اور اہل شام نے اس کا نام "بیع الاطاعۃ" رکھا ہے، اس کے نیچے شامی میں ہے کہ اس کا "بیع الوفاء" نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں مشتری سے وفاداری کا عہد کیا جاتا ہے، بایں طور کہ مشتری مبیع کو واپس کردے گا جس وقت بائع ثمن واپس کردے گا، اور بعض فقہاء نے اس کا نام "البیع الجائز" اور "البیع الصحیح" رکھا ہے، اور شاید اس کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ عقد بیع ربا سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے صحیح اور جائز ہے، یہاں تک کہ مشتری کے لیے اس کا نفع کھانے کی گنجائش ہے اور بعض فقہاء نے اس کا نام "بیع المعامله" رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دین سے نفع اٹھانے کا معاملہ پایا گیا اور یہ اس طور پر ہے کہ قرض دینے والے نے مبیع کو خریدا ہے؛ تاکہ اپنے دین کے مقابلہ میں اس مبیع سے نفع اٹھائے، اور "بیع الامانۃ" اس کا نام اس لیے ہے کہ مبیع مشتری کے پاس بطورِ امانت رہتی ہے اور بعض نسخوں میں "بیع الطاعة" ہے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے بلاد میں اس وقت یہی مشہور ہے)۔

اور "الاشباہ والنظائر" میں ہے کہ:

"وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَائِخُ بَلْخٍ وَبُخَارَىٰ تَوْسِعَةً" (الاشباه والنظائر قديم ۱۳۰)۔

(اور اسی قبیل سے ہے، بیع الامانۃ جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری نے لوگوں سے تنگی کو دور کر کے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے)۔

بیع الوفاء کی حقیقت:

کوئی شخص صاحبِ ضرورت ہے اس کو روپیہ کی ضرورت ہے، اور کہیں سے ادھار بھی نہیں ملتا، اور اس کے پاس مکان یا دوکان یا زمین وغیرہ موجود ہے، اور اس کو رہن میں رکھ کر روپیہ حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر رہن میں رکھنے کی صورت میں مرتہن اس سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا، اس لیے کوئی شخص رہن رکھ کر بھی قرض دینے پر تیار نہیں، اور صاحبِ جائداد اس ضرورت کی وجہ سے اپنی ہمیشہ کی جائیداد کو بالکلیہ فروخت کرنا بھی نہیں چاہتا، تو اس طرح حاجت مند کی ضرورت پوری

کرنے کے لیے فقہاء نے عقد کی ایک نئی شکل نکالی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مکان یا دکان یا زمین وغیرہ صاحب ضرورت شخص اس طرح فروخت کرے کہ فروخت شدہ جائیداد مشتری کے پاس من کل الوجوہ امانت تو نہیں، مگر مثل امانت کے ہوگی، کہ مشتری اس سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے، مگر اس کو فروخت نہیں کر سکتا۔ اور فائدہ اٹھانے کا سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک بائع لی ہوئی رقم واپس نہ کر دے، اور جب بائع رقم واپس کر دے گا تو مشتری پر لازم ہوگا کہ اتنی ہی رقم لے کر جائیداد واپس کر دے جتنی میں بائع نے مشتری کو دیا تھا۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ "البحر الرائق" اور علامہ فخر الدین زیلعیؒ "تبیین الحقائق" میں اس عقد کی نوعیت کو ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں:

"وَصُوْرَتُهُ أَنْ يَقُوْلَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِيْ بِعْتُ مِنْكَ هٰذَا الْعَيْنَ بِدَيْنٍ لَكَ عَلَيَّ عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى قَضَيْتُ الدَّيْنَ فَهُوَ لِيْ أَوْ يَقُوْلَ الْبَائِعُ بِعْتُ هٰذَا بِكَذَا عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى دَفَعْتُ الثَّمَنَ تَدْفَعُ الْعَيْنَ إِلَيَّ الخ" (البحر الرائق کراچی ۶ / ۷، زیلعی ۵ / ۱۸۳، ایضاح النوادر ا / ۶۹)۔

(اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بائع مشتری سے یوں کہہ دے کہ میں تیرے ہاتھ یہ شئی اس قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں جو تیرا میرے اوپر لازم ہے، اس شرط پر کہ جب میں قرض ادا کر دوں گا تو وہ شئی میری ہو جائے گی، یا یوں کہہ دے کہ یہ شئی اتنے میں اس شرط کے ساتھ تیرے ہاتھ فروخت کرتا ہوں کہ جب میں ثمن واپس دے دوں گا تو وہ شئی مجھ کو واپس کر دے گا)۔

بیع الوفاء کا جواز:

اس عقد کے جواز اور عدم جواز میں فقہاء متأخرین میں دو فریق ہو گئے ہیں:

فریق اول:

حضرت امام ظہیر الدین اور صدر الشہید اور تاج الاسلام وغیرہؒ نے شرطِ فاسد کی وجہ سے اس عقد کو فاسد قرار دیا ہے، اور امام ابو شجاع، امام علی سغدیؒ اور قاضی ابو الحسن ماتریدیؒ وغیرہ نے اس عقد کو رہن کی طرح اور رہن کے حکم میں قرار دیا ہے، اور مرتہن کے لیے رہن سے انتفاع جائز نہیں ہے، اور بیع الوفاء میں مشتری مبیع سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لیے یہ عقد ان کے نزدیک جائز ہے۔

علامہ زیلعیؒ اس کو ان الفاظ سے نقل فرماتے ہیں:

"مِنْهُمُ الإِمَامُ ظَهِيْرُ الدِّيْنِ وَالصَّدْرُ الشَّهِيْدُ حُسَامُ الدِّيْنِ وَالصَّدْرُ السَّعِيْدُ تَاجُ الإِسْلَامِ فَجَعَلُوْهُ فَاسِدًا بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ (إلى قوله): وَمِنْهُمْ مَنْ جَعَلَهُ رَهْنًا، مِنْهُمُ السَّيِّدُ الإِمَامُ أَبُوْ شُجَاعٍ وَالإِمَامُ عَلِيُّ السُّغْدِيُّ وَالإِمَامُ الْقَاضِيْ أَبُوْ الْحَسَنِ الْمَاتُرِيْدِيُّ قَالُوْا: لَمَّا شُرِطَ عَلَيْهِ أَخْذُهُ عِنْدَ قَضَاءِ الدَّيْنِ أَتٰى بِمَعْنَى الرَّهْنِ (إلى قوله)، فَإِذَا كَانَ رَهْنًا لَا يَمْلِكُهُ وَلَا يَنْتَفِعُ بِهِ" (زیلعی ۵/۱۵۳)۔

فقہاء میں سے امام ظہیر الدین، صدر الشہید امام حسام الدینؒ اور صدر السعید تاج الاسلامؒ نے اس کو فسخ کی شرط کی وجہ سے عقد فاسد قرار دیا ہے۔ (زیلعیؒ فرماتے ہیں) اور فقہاء میں سے جن لوگوں نے اس کو رہن قرار دیا ہے ان میں سید امام ابو شجاع اور امام علی سغدیؒ اور امام ابو الحسن ماتریدیؒ وغیرہ شامل ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ جب قضاء دین کے وقت واپسی کی شرط لگائی ہے، تو یہ عقد رہن کا معنی ادا کرتا ہے۔ پس جب رہن ثابت ہوگا تو مرتہن اس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ ہی اس سے انتفاع جائز ہوگا۔

فریقِ ثانی:

مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے مفلسین اور حاجت مندوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ بیع الوفاء کو جائز قرار دیا ہے، اور امام نجم الدین نسفیؒ نے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانہ کے تمام مشائخ نے متفق ہو کر اس معاملہ کو جائز قرار دیتے ہوئے بہت سے احکام بیع کے لیے مفید ثابت کیا ہے۔

اور صاحب نہایہ نے اس کے جواز کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے، اور علامہ زین الدین ابن نجیم مصریؒ نے دیون کی کثرت کے زمانہ میں بیع الوفاء کی صحت و جواز پر فتویٰ کا حکم فرمایا ہے۔

"وَمِنْ مَشَايِخِ سَمَرْقَنْدَ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيْدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَمِنْهُمُ الإِمَامُ نَجْمُ الدِّيْنِ النَّسَفِيُّ فَقَالَ اِتَّفَقَ مَشَايِخُنَا فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوْهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيْدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْاِنْتِفَاعُ بِهِ دُوْنَ الْبَعْضِ وَ هُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ

وَلِتَعَامُلِهِمْ فِيْهِ (إِلَى قَوْلِهِ): وَقَالَ صَاحِبُ النِّهَايَةِ: وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ'' (تبیین الحقائق ۵/۱۸۳، ایضاح النوادر ۱/۷۱)۔

(اور مشائخ سمرقند میں سے وہ مشائخ بھی ہیں جو اس بیع کو جائز قرار دیتے ہیں، جو بعض احکامِ بیع کے لیے مفید ہے، اور ان میں سے امام نجم الدین نسفیؒ نے کہا کہ اس زمانہ کے مشائخ اس عقد کے جواز پر متفق ہیں، یہ عقد بعض احکام کو مفید ہے، مثلاً مبیع سے انتفاع حاصل کرنا اور بعض کو مفید نہیں (مثلاً فروختگی کے عدمِ جواز) اور یہ عقد لوگوں کی ضرورت اور تعامل کی وجہ سے جائز ہے اور صاحبِ نہایہ نے کہا ہے کہ اس کے جواز ہی پر فتویٰ ہے)۔

اور علامہ ابن نجیم مصریؒ الاشباہ میں اس کے جواز کو ان الفاظ میں بھی نقل فرماتے ہیں:

''وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَايِخُ بَلْخٍ وَبُخَارىٰ تَوْسِعَةً... الخ'' (الاشباہ والنظائر قدیم/۱۳۰)۔

اور اسی قبیل میں سے بیع الامانت ہے، جس کو بیع الوفاء کہا جاتا ہے، اس کو مشائخ بلخ و مشائخ بخاریٰ نے لوگوں کے لیے وسعت دیتے ہوئے جائز قرار دیا ہے۔

''وَمِنْهَا الإِفْتَاءُ بِصِحَّةِ بَيْعِ الْوَفَاءِ حِيْنَ كَثُرَ الدَّيْنُ عَلىٰ أَهْلِ بُخَارىٰ، وَهٰكَذَا بِمِصْرَ وَسَمُّوْهُ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّوْنَهُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ'' (الأشباہ والنظائر قدیم ۱۳۹، انوار رحمت ۲۱۵، ۲۱۹)۔

(اور ان میں سے بیع الوفاء کی صحت پر فتویٰ ہے، جب اہلِ بخاریٰ پر دیون کا سلسلہ زیادہ ہو گیا تھا، اور اسی طرح مصر میں بھی جواز کا فتویٰ ہے اور اس کو بیع الامانۃ کہا جاتا ہے اور شافعیہ نے اس کا نام ''رہنِ معاد'' رکھا ہے)۔

مناسب و معتدل حکم

اب معلوم ہوا کہ بیع الوفاء کے جواز و عدمِ جواز میں فقہاءِ متأخرین اور اساطینِ امت کے مابین اختلاف واقع ہو چکا ہے، اور دونوں طرف ایسے ایسے فقہاء ہیں جن کے قول و رائے کو دلیل شرعی مانا جاتا ہے، اور لوگوں کی ضرورت اور تعاملِ ناس جواز کے قائلین کے موافق ہے۔ اور تعاملِ ناس اور عرف کو شرعی طور پر ''اَلثَّابِتُ بِالْعُرْفِ كَالثَّابِتِ بِالنَّصِّ'' (عقود رسم المفتی ۹۴) کے قاعدہ سے حجتِ شرعیہ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اور حضرت تھانوی قدس سرہ نے ''امداد الفتاویٰ'' میں فریقِ اول کے دلائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اصولاً عدمِ جواز کو ثابت کیا ہے، اور بوقتِ ضرورت فریقِ ثانی کے قول پر عمل کی اجازت دی ہے (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۱۰۷)۔

اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوریؒ نے ''فتاویٰ خلیلیہ'' میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور مبیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے؛ تاکہ فقہاءِ متأخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہو جائے۔

(مستفاد: فتاویٰ خلیلیہ ۱/۹۵، ۳۹۵، ایضاح النوادر ۱/۷۳)۔

اس لیے ضرورت اور حاجتِ ناس کی وجہ سے مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ اور مشائخِ بخاری اور امام نجم الدین نسفیؒ اور صاحب نہایہ وغیرہم کے فتویٰ کے مطابق اس زمانہ میں بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ دینا اولیٰ اور انسب ہوگا۔

بیع الوفاء کے بارے میں مفصل بحث اور فقہاء کی آراء:

بیع الوفاء کو فقہی نقطۂ نظر سے کس اصول اور ضابطہ کے دائرہ میں داخل کیا جائے؟ تو اس سلسلہ میں فقہاءِ متأخرین کے مختلف نظریات اور مختلف اقوال پر غور کرنے کے بعد حضراتِ فقہاء کے سات فریق اور سات اقوال و آراء ہمارے سامنے ہیں، جن کو ترتیب وار یہاں پر درج کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

فریقِ اول بیع صحیح کے قائلین:

مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ جاری فرمایا ہے اور مشائخ سمرقند میں سے امام نجم الدین نسفیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کو لوگوں کی ضرورت اور اس میں تعامل کی وجہ سے بیع صحیح کے اصول و ضابطہ کے دائرہ میں داخل کر کے صحیح قرار دیا جائے گا، اس لیے کہ زمانہ کے تمام مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ایسی بیع ہے جو جائز ہے اور بہت سے احکامِ بیع کو محیط اور مفید ہے، اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا ہے، اور امام زیلعیؒ نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ اور علامہ ابن نجیمؒ نے ''الاشباہ'' میں بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے اور اس کی صحت پر فتویٰ نقل فرمایا ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔ حضراتِ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

''وَمِنْ مَشَايِخِ سَمَرْقَنْدَ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيْدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ مِنْهُمُ الإِمَامُ نَجْمُ الدِّيْنِ النَّسَفِيُّ فَقَالَ اِتَّفَقَ مَشَايِخُنَا فِيْ

هٰذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوْهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيْدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ دُوْنَ الْبَعْضِ وَهُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَلِتَعَامُلِهِمْ فِيْهِ وَالْقَوَاعِدُ قَدْ تُتْرَكُ بِالتَّعَامُلِ وَجُوِّزَ الْإِسْتِصْنَاعُ لِذٰلِكَ وَقَالَ صَاحِبُ النِّهَايَةِ''۔

اور مشائخ سمرقند میں سے کچھ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اس کو بیع صحیح اور بیع جائز کے دائرہ میں داخل کیا ہے، جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، انہیں مشائخ میں سے امام نجم الدین نسفیؒ ہیں، پس وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے مشائخ نے متفق ہو کر اس بیع کو جائز قرار دیا ہے جو عقد بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اور وہ اس بیع کے بعض منافع سے فائدہ اٹھانا ہے، بعض سے نہیں (جیسا کہ مشتری اس کو بیچ نہیں سکتا) اور لوگوں کے اس بیع کی ضرورت ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کے اس میں تعامل ہونے کی وجہ سے اس بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے، اور کبھی تعاملِ ناس کی وجہ سے ''وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ'' (تبیین الحقائق قدیم ۵/ ۱۸۳-۱۸۴)۔ قواعد وضوابط کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بیع استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے اور صاحب نہایہ نے کہا کہ اس کے بیع صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔

اور علامہ شامیؒ نے اس کے بیع صحیح ہونے کو زیلعی کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، نیز علامہ ابن نجیم مصریؒ نے بھی اسی طرح کے الفاظ نقل فرمائے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''أَنَّهُ بَيْعٌ صَحِيْحٌ يُفِيْدُ لِبَعْضِ أَحْكَامِهِ مِنْ حِلِّ الْإِنْتِفَاعِ بِهِ إِلاَّ أَنَّهُ لَا يَمْلِكُ بَيْعَهُ، قَالَ الزَّيْلَعِيُ فِي الْإِكْرَاهِ: وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ'' (شامی زکریا ۷/ ۵۴۶، کراچی ۵/ ۲۷۷، وہکذا فی البحر الرائق کوئٹہ ۶/ ۷، زکریا ۶/ ۱۲)۔

(بے شک یہ بیع صحیح ہے جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اس کے ذریعہ نفع کے حلال ہونے کی وجہ سے، مگر یہ کہ مشتری اس کو بیچنے کا مالک نہیں ہوگا، زیلعی نے کتاب الاکراہ میں فرمایا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے)۔

''الاشباہ والنظائر'' میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

''وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بَيْعُ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَايِخُ بَلْخٍ وَبُخَارىٰ تَوْسِعَةً'' (الاشباہ والنظائر قدیم ۱۳۰)۔

(اور اسی قبیل سے بیع الامانہ ہے جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے لوگوں سے تنگی دور کر کے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے)۔

اور ''الاشباہ والنظائر'' میں دوسری جگہ صاف الفاظ کے ساتھ مذکور ہے کہ بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''وَمِنْهَا الْإِفْتَاءُ بِصِحَّةِ بَيْعِ الْوَفَاءِ حِيْنَ كَثُرَ الدَّيْنُ عَلىٰ أَهْلِ بُخَارىٰ، وَهٰكَذَا بِمِصْرَ، وَقَدْ سَمُّوْهُ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّوْنَهُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ'' (الاشباہ والنظائر قدیم ۱۴۹)۔

(اسی قبیل میں سے بیع الوفاء کی صحت پر فتویٰ جاری کرنا ہے جس وقت اہل بخاریٰ پر دیون کی کثرت ہوگئی تھی اور ایسا ہی مصر میں ہوا ہے اور یقیناً اس کا نام مشائخ مصر نے بیع الامانہ رکھا ہے اور شوافع نے اس کا نام ''الرھن المعاد'' رکھا ہے)۔

فریقِ ثانی بیع فاسد کے قائلین:

امام ظہیر الدین ابوبکر محمد بن احمد البخاری اور امام شہاب الدین احمد الجلبی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء میں مقتضائے عقد کے خلاف شرط فاسد پائی جاتی ہے، اس لیے بیع الوفاء کو بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کیا جائے گا اور بائع کے ثمن اور دین کی واپسی کے موقع پر مبیع کی واپسی کو بیع فاسد کے اصول وضوابط کے مطابق واجب الاسترداد قرار دیا جائے گا؛ لہٰذا اس کا حکم تمام بیوع فاسدہ کے حکم کی طرح ہوگا، اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد بیع کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، اس کو حضراتِ فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''وَاخْتَارَهُ الْإِمَامُ ظَهِيْرُ الدِّيْنِ أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ فَلَوْ تَبَايَعَا ثُمَّ قَالَ أَحَدُهُمَا: ''چون سیم آدیم بیع بمن باز دہ'' فَقَالَ: نَعَمْ لَا يَفْسُدُ الْبَيْعُ، أَمَّا لَوْ شَرَطَاهُ فِي الْبَيْعِ يَفْسُدُ'' ۔ (الجامع الوجیز للبزازیۃ علی الھندیۃ ۴/ ۴۰۷)۔

(اسی کو امام ظہیر الدین نے اختیار فرمایا ہے بایں طور پر کہ یہ بیع فاسد ہے؛ لہٰذا اگر طرفین نے عقد کرلیا ہے، پھر ان میں سے ایک نے کہا جب میں ثمن لاکر کے واپس کردوں گا تو میری بیع مجھے واپس کردینا، دوسرے نے کہا جی ہاں! تو بیع فاسد نہیں ہوگی، بہرحال اگر دونوں نے عقد بیع میں اس کی شرط لگادی ہے تو بیع فاسد ہوجائے گی)۔

''وَالْأَصَحُّ عِنْدِيْ أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ يُوْجِبُ الْمِلْكَ بَعْدَ الْقَبْضِ وَحُكْمُهُ حُكْمُ سَائِرِ الْبِيَاعَاتِ الْفَاسِدَةِ؛ لِأَنَّهُ بَيْعٌ بِشَرْطٍ

لَا يَقْتَضِيهِ الْعَقْدُ، وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعٍ وَشَرْطٍ... الخ'' (حاشيه شلبی علی تبيين الحقائق ۵/۱۸۴)۔
(اور زیادہ صحیح میرے نزدیک یہی ہے کہ بیع الوفاء بیع فاسد ہے جو قبضہ کے بعد ملکیت کو لازم کرتا ہے اور اس کا حکم تمام بیوع فاسدہ کی طرح ہے؛ اس لیے کہ یہ بیع ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہے جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا، حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے)۔

فریقِ ثالث بیع صحیح یا بیعِ فاسد کے قائلین:

امام فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی وغیرہ نے فرمایا کہ بیع الوفاء رہن کے دائرہ میں نہیں ہو سکتی؛ بلکہ صحیح بات یہی ہے کہ وہ عقد بیع ہی کے دائرہ میں داخل ہوگی؛ لہٰذا اگر صلبِ عقد میں اس بات کی شرط لگائی ہے کہ ثمن کی واپسی پر مبیع بھی واپس ہو جائے گی تو صلب عقد میں مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی، اس لیے حضرات صاحبین فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہے، اور اگر صلبِ عقد میں شرط نہیں لگائی ہے؛ بلکہ اولاً بغیر شرط کے عقد بیع وجود میں آ جائے پھر اس کے بعد آپس کی تراضی سے اس بات کی شرط لگا دی جائے کہ ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی لازم ہو جائے گی تو ایسی صورت میں چوں کہ صلب عقد میں شرطِ فاسد نہیں پائی گئی ہے، اس لیے یہ عقدِ بیع صحیح کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگا، اور وعدہ کے مطابق ثمن کی واپسی پر مبیع کا استرداد لازم ہو جائے گا، جیسا کہ فقہاء کی حسبِ ذیل عبارات سے واضح ہوتا ہے:

''وَالصَّحِيحُ أَنَّ الْعَقْدَ الَّذِي جَرَى بَيْنَهُمَا إِنْ كَانَ بِلَفْظِ الْبَيْعِ لَا يَكُونُ رِهْنًا ثُمَّ يُنْظَرُ إِنْ ذَكَرَا شَرْطَ الْفَسْخِ فِي الْبَيْعِ فَسَدَ الْبَيْعُ، وَإِنْ لَمْ يَذْكُرَا ذٰلِكَ فِي الْبَيْعِ وَتَلَفَّظَا بِلَفْظِ الْبَيْعِ بِشَرْطِ الْوَفَاءِ أَوْ تَلَفَّظَا بِالْمَبِيعِ الْجَائِزِ وَعِنْدَهُمَا هٰذَا الْبَيْعُ عِبَارَةٌ عَنْ بَيْعٍ غَيْرِ لَازِمٍ، فَكَذٰلِكَ وَلَفْظَةُ صَاحِبِ الْبَحْرِ، فَالْبَيْعُ فَاسِدٌ، وَإِنْ ذَكَرَا الْبَيْعَ بِلَا شَرْطٍ، ثُمَّ شَرَطَاهُ عَلَى وَجْهِ الْمُوَاعِدَةِ جَازَ الْبَيْعُ وَلَزِمَ الْوَفَاءُ وَقَدْ يَلْزَمُ الْوَعْدُ لِحَاجَةِ النَّاسِ فِرَارًا مِنَ الرِّبَا'' (قاضي خان على الهندية ۲/۱۶۵، تبيين الحقائق للزيلعي ۵/۱۸۴، البحر الرائق كوئٹه ۶/۸، فتاوىٰ بزازيه على الهندية ۴/۴۰۶)۔

(اور صحیح یہی ہے کہ بے شک وہ ایسا عقد ہے جو متعاقدین کے درمیان میں جاری ہوا ہے، اگر لفظ بیع کے ساتھ عقد ہوا ہے تو وہ رہن نہیں ہو سکتا، پھر دیکھا جائے کہ اگر صلب عقد میں فسخ کی شرط کا ذکر کیا ہے تو بیع فاسد ہو جائے گی، اور اگر صلب عقد میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا ہے اور دونوں نے لفظ بیع کا تلفظ وفا کی شرط کے ساتھ کیا ہے، یا دونوں نے بیع جائز کے ساتھ تلفظ کیا ہے اور ایسی بیع کا نام حضرات صاحبینؒ کے نزدیک بیع غیر لازم ہے، تو بھی ایسا ہی حکم ہوگا اور صاحب بحر کے الفاظ یہ ہیں کہ ایسی صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی اور اگر بغیر شرط کے دونوں نے عقد میں لفظ بیع کا ذکر کیا ہے، پھر اس کے بعد معاہدہ کے طور پر وفا کی شرط لگائی ہے تو بیع جائز اور صحیح ہو جائے گی اور وفا بھی لازم ہو جائے گی، اور کبھی سود سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے وعدہ کا پورا کرنا لازم ہو جاتا ہے)۔

فریقِ رابع رہن کے حکم کے قائلین:

امام سید ابوشجاع اور امام ابوالحسن علی السغدی اور امام قاضی ابوالحسن الماتریدی اور ائمہ خوارزم اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ وغیرہ بیع الوفاء کو رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کرتے ہیں، اور اس کو رہن ہی تسلیم کرتے ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ ائمہ خوارزم بعض شرائط کے ساتھ رہن تسلیم کرتے ہیں اور امام سیف الدین عصبہ علی الاطلاق اس کو رہن تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ امام ابوشجاع اور قاضی ابوالحسن علی سغدی بھی بیع الوفاء کو علی الاطلاق رہن کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کر کے اس کے اوپر رہن کے حکم کی طرح حکم لگاتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوگا اور مبیع سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا مشتری کے لیے جائز نہیں ہوگا؛ البتہ رہن کی طرح مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھانا جائز ہو سکتا ہے، اور رہن کی طرح مبیع کے ہلاک ہونے کی وجہ سے دین بھی ساقط ہو جائے گا؛ لیکن ائمہ خوارزم اس کو تین باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ مشروط کرتے ہیں:

(۱) بوقتِ عقد بیع مطلق رکھی جائے اور بوقتِ واپسی جب بائع ثمن لے کر حاضر ہو جائے گا تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لیے کسی کو وکیل بنا دے۔
(۲) بیع مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہو جائے کہ جب بائع ثمن لے کر آئے گا تو خود بخود بیع فسخ ہو جائے گی۔
(۳) عقد کے بعد مشتری اصل مال پر نفع کی شرط لگا دے تو ان تینوں صورتوں میں ائمہ خوارزم بیع الوفاء کو رہن کے درجہ میں قرار دیتے ہیں۔

اور یہ حضرات بیع الوفاء کو رہن کے حکم میں قرار دینے میں حسبِ ذیل نظائر پیش کرتے ہیں:

(۱) اس بیع میں مشتری کو مبیع کی فروختگی کا حق نہیں۔ (۲) مبیع کو دوسرے کے ہاتھ رہن میں رکھنے کا حق نہیں۔
(۳) مبیع اگر باغ ہے تو اس کے درختوں کو کاٹنے کا حق نہیں۔ (۴) مبیع اگر عمارت ہے تو منہدم کرنے کا حق نہیں۔
(۵) مشتری کے ہاتھ میں اگر مبیع ہلاک ہوجائے تو ثمن اور دین ساقط ہوجاتا ہے؛ لہٰذا بائع سے ثمن کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔
(۶) اگر مبیع میں نقصان اور کمی آجائے تو رہن کی طرح ثمن اور دین طرفین کے درمیان نقصان کے تناسب سے تقسیم ہوجاتا ہے (بزازیہ ۴/۴۰۹)۔
(۷) جس طرح معاملہ رہن میں مرتہن کے مال رہن کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کردینے پر راہن کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ بیع باطل کر کے مال رہن کو اپنے قبضہ میں لے لے، اسی طرح بیع الوفاء میں بھی مشتری جب مبیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے گا تو مالک کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ بیع ثانی کو باطل کر کے مشتری ثانی سے مال مبیع اپنے قبضہ میں لے لے، ہاں البتہ یہ بات الگ ہے کہ مرتہن کو اپنے قرض کے وصول ہونے تک لوٹ کر مال رہن کو اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے، اسی طرح بیع الوفاء میں بھی مالک کے قبضہ میں پہنچ جانے کے بعد مشتری اول کو اپنے ثمن کے وصول ہونے تک مالک سے مال مبیع اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے (بزازیہ ۴/۴۰۶، شامی زکریا ۷/۵۴۸)۔

ان تمام نظائر کی وجہ سے ان حضرات نے اس کو رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کردیا ہے، اور ان لوگوں کی رائے کے مطابق مشتری بائع کی اجازت کے بغیر مال مبیع سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتا جو حسب ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

''قَالَ أَكْثَرُ الْمَشَايِخِ مِنْهُمُ السَّيِّدُ الْإِمَامُ أَبُو شُجَاعٍ وَالْقَاضِيْ الْإِمَامُ أَبُو الْحَسَنِ عَلِي السُّغْدِيْ، حُكْمُهُ حُكْمُ الرَّهْنِ لَايَمْلِكُهُ الْمُشْتَرِيْ وَيَضْمَنُهُ الْمُشْتَرِيْ بِالْأَكْلِ مِنْ ثَمَرِهِ وَلَا يُبَاحُ لَهُ الْإِنْتِفَاعُ وَلَا الْأَكْلُ إِلَّا بِإِبَاحَةِ الْمَالِكِ وَيَسْقُطُ الدَّيْنُ بِهَلَاكِهِ إِذَا كَانَ بِهِ وَفَاءٌ بِالدَّيْنِ وَلَا يَضْمَنُ الزِّيَادَةَ إِذَا هَلَكَ لَا بِصُنْعِهِ وَلِلْبَائِعِ أَنْ يَسْتَرِدَّ إِذَا قَضَى الدَّيْنَ''

(فتاوىٰ قاضي خان على الهندية ۲/۱۶۵، تبيين الحقائق للزيلعي ۵/۱۸۳)۔

(اکثر مشائخ نے کہا جن میں سید امام ابوشجاع اور قاضی امام ابوالحسن علی السغدی وغیرہ ہیں کہ اس بیع کا حکم رہن کے حکم کی طرح ہے، اس میں مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوگا اور اس کے پھل میں کھانے کی وجہ سے مشتری اس کا ضامن ہوجائے گا، اور مشتری کے لئے مبیع سے انتفاع مباح نہیں ہے، اور نہ ہی اس میں سے کچھ کھانا جائز ہے، مگر مالک کی اجازت سے جائز ہے اور مبیع کی ہلاکت کی وجہ سے دین ساقط ہوجائے گا، جب مبیع دین کے برابر ہو، اور زیادہ کا تاوان لازم نہیں ہوگا، جب مشتری کی تعدی اور لاپرواہی کے بغیر ہلاک ہوجائے اور بائع کو مبیع واپس لینے کا حق ہوگا جب دین ادا کردے)۔

اور ''الجامع الوجیز'' میں حافظ الدین بزازیؒ نے ائمہ خوارزم کی رائے کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

''وَاخْتَارَهُ أَئِمَّةُ خَوَارِزْمَ أَنَّهُ إِذَا أَطْلَقَ الْبَيْعَ لَكِنْ وَكَّلَ الْمُشْتَرِيْ وَكِيْلًا بِفَسْخِ الْبَيْعِ إِذَا أَحْضَرَ الْبَائِعُ الثَّمَنَ أَوْ عَهِدَ عَلَى أَنَّهُ إِذَا أَوْفَاهُ فَسَخَ الْبَيْعَ وَالثَّمَنُ لَا يُعَادِلُ الْمَبِيْعَ، وَفِيْهِ غَبْنٌ فَاحِشٌ أَوْ وَضَعَ الْمُشْتَرِيْ عَلَى أَصْلِ الْمَالِ رِبْحًا بِأَنْ وَضَعَ عَلَى مِائَةٍ عِشْرِيْنَ دِيْنَارًا فَرَهَنَ (إِلَى قَوْلِهِ) وَاخْتَارَ خَاتَمُ الْمُجْتَهِدِيْنَ مَوْلَانَا سَيْفُ الدِّيْنِ الْعَصَبَةُ أَنَّهُ رَهْنٌ''

(بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۴/۴۰۷)

(جس کو ائمہ خوارزم نے اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ جب بیع کو مطلق رکھا جائے؛ لیکن جب بائع ثمن لے کر کے حاضر ہوجائے تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لیے کسی کو وکیل بنادے یا بیع مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہوجائے کہ جب بائع ثمن لاکر پیش کردے گا تو عقد بیع خود بخود فسخ ہوجائے گا اور ثمن مبیع کے برابر نہ ہو اور اس میں غبن فاحش ہو یا مشتری عقد کے بعد اصل مال پر نفع کی شرط لگادے مثلاً ہر سو دینار پر بیس دینار نفع کا رہے گا، تو ان تمام صورتوں میں یہ عقد رہن کے حکم میں ہوگا، اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے کہ وہ رہن ہی ہوگا)۔

فریق خامس بیع المکرہ کے حکم کے قائلین:

مشائخ بخاریٰ میں سے امام صدر الشہید حسام الدین اور امام صدر السعید تاج الدین امام علاء الدین بدر اور صاحب ہدایہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی اور اس کو بیع فاسد قرار دینا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ امام ظہیر الدین بخاریؒ نے اس کو بیع فاسد بھی تسلیم کیا اور بیع مکرہ کے درجہ میں بھی قرار دیا جو کہ درست نہیں ہے؛ بلکہ بیع مکرہ کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کرنا زیادہ صحیح ہے، امام زیلعیؒ نے ''تبیین الحقائق'' میں امام ظہیر الدین بخاریؒ کو بیع مکرہ کے قائلین کی فہرست میں شمار فرمایا ہے، حالاں کہ وہ بیع فاسد کے قائلین کی فہرست میں شامل ہیں، اسی وجہ سے ''بزازیہ'' میں اس بات کو صاف

واضح کردیا گیا ہے کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل ہے، اس لیے بیع الوفاء بیع مکرہ کی طرح ہوگی۔

اور بیع فاسد کے اصول وضوابط میں داخل نہیں ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء کا حکم بیع فاسد کی طرح نہیں ہوگا؛ بلکہ بیع مکرہ کی طرح ہوگا اور امام ظہیر الدین بخاری نے دونوں کو مخلوط کردیا ہے، اور امام علاء الدین بدرؒ فرماتے ہیں کہ جنہوں نے دونوں کو مخلوط کردیا ہے وہ درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ دونوں کے شرائط وضوابط الگ الگ ہیں؛ لہٰذا بیع الوفاء واجب الاسترداد ہونے میں بیع مکرہ کی طرح ہوگی، بیع فاسد کی طرح نہیں۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمایئے:

''وَمِنْ مَشَایِخِ بُخَارِیْ مَنْ جَعَلَ بَیْعَ الْوَفَاءِ کَبَیْعِ الْمُکْرَہِ مِنْهُمُ الإمَامُ ظَهِیْرُ الدِّیْنِ وَالصَّدْرُ الشَّهِیْدُ حُسَامُ الدِّیْنِ وَالصَّدْرُ السَّعِیْدُ تَاجُ الاسْلَامِ، وَصُوْرَتُهُ أَنْ یَقُوْلَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِیْ: بِعْتُ مِنْكَ هٰذَا الْعَیْنَ بِدَیْنٍ لَكَ عَلَیَّ عَلٰی أَنِّیْ مَتٰی قَضَیْتُ الدَّیْنَ فَهُوَ لِیْ، فَجَعَلُوْهُ فَاسِدًا بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ عِنْدَ الْقُدْرَةِ عَلٰی إِیْفَاءِ الدَّیْنِ یُفِیْدُ الْمِلْكَ وَعِنْدَ اتِّصَالِ الْقَبْضِ بِهٖ وَیَنْقُضُ بَیْعُ الْمُشْتَرِیْ کَبَیْعِ الْمُکْرَہِ؛لِأَنَّ الْفَسَادَ بِاعْتِبَارِ عَدَمِ الرِّضَا، فَکَانَ حُکْمُهٗ حُکْمُ بَیْعِ الْمُکْرَہِ فِیْ جَمِیْعِ مَا ذَکَرْنَا'' (تبیین الحقائق ۵/۱۸۳)۔

(مشائخ بخاریؒ میں سے جنہوں نے بیع الوفاء کو بیع مکرہ کی طرح قرار دیا ہے ان میں سے امام ظہیر الدینؒ اور صدر الشہید حسام الدینؒ اور امام صدر السعید تاج الاسلامؒ (وغیرہ) ہیں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ یہ چیز میں نے تمہارے ہاتھ تمہارے دین کے بدلہ میں بیچ دیا ہے اس شرط پر کہ جب میں تمہارا قرض ادا کردوں گا تو وہ چیز میری ہوجائے گی، توان حضرات نے اس عقد کو دین کی ادائیگی پر قدرت کے وقت فسخ عقد کی شرط کا اعتبار کرتے ہوئے عقد فاسد قرار دیا ہے، جو اتصال قبضہ کے وقت ملکیت کا فائدہ دیتا ہے اور دوسرے کے ہاتھ مشتری کی بیع ٹوٹ جایا کرے گی جیسا کہ مکرہ کی بیع ٹوٹ جاتی ہے؛ اس لیے کہ عدم رضا کی وجہ سے اس میں فساد آیا ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء کا حکم بیع مکرہ کے حکم میں ہوگا، ان تمام امور میں جو ہم نے ذکر کیے ہیں)۔

اور اس حکم کو امام حافظ الدین بزازی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

''أَجَابَ عَلَاءُ الدِّیْنِ بَدْرٌ أَنَّهٗ لَایَصِحُّ وَعَلٰی هٰذَا اخْتِیَارُ صَاحِبُ الْهِدَایَةِ وَأَوْلَادِهٖ وَمَشَائِخُ زَمَانِنَا وَعَلَیْهِ الْفَتْوٰی أَعْنِیْ لَایَمْلِكُ الْمُشْتَرِیْ الْبَیْعَ مِنَ الْغَیْرِ کَمَا فِیْ بَیْعِ الْمُکْرَہِ لَا الْبَیْعِ الْفَاسِدِ بَعْدَ الْقَبْضِ'' (بزازیہ ۴/۴۰۸)۔

امام علاء الدین بدر نے اس طرح سے جواب دیا ہے کہ یہ بیع صحیح نہیں ہے اور اسی کو صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور ہمارے زمانہ کے مشائخ نے اختیار کیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، یعنی مشتری دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا مالک نہیں ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بیع مکرہ میں ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہے، جیسا کہ بیع فاسد میں قبضہ کے بعد ہوتا ہے۔

فریقِ سادس بیع اور رہن سے مرکب کے قائلین:

امام فخر الدین زاہد وغیرہ نے اس عقد کو من وجہٍ بیع صحیح اور من وجہٍ رہن تسلیم کیا ہے، یعنی صلب عقد میں جب شرط کا ذکر نہ ہو تو مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اور مبیع کی آمدنی کا مشتری مالک ہوا کرے گا اور بائع کے حق میں یہ عقد رہن ہوگا، اس لیے مشتری مبیع کے قبضہ اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کرسکتا، نہ دوسرے کو بطورِ ہدیہ دے سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو فروخت کرسکتا ہے، اور نہ ہی دوسرے کے ہاتھ میں رہن کے طور پر رکھ سکتا ہے اور جب بائع ثمن واپس کردے گا تو مشتری کو مبیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا؛ لہٰذا بیع الوفاء میں من وجہٍ بیع صحیح کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گی اور من وجہٍ رہن کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گی، اور اس عقد زرافہ کی طرح دو چیزوں سے مرکب مانا جائے گا جیسا کہ زرافہ گردن کے اعتبار سے اونٹ کی طرح ہے اور پیروں کے اعتبار سے گائے اور بیل کی طرح ہے، اسی طرح اس عقد کا حال ہے کہ مشتری مبیع کی آمدنی کا مالک ہوجاتا ہے اور مشتری مبیع سے ہر طرح کا نفع اٹھا سکتا ہے، تو اس اعتبار سے بیع صحیح ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں قبضہ کو منتقل نہیں کرسکتا اور دوسرے کو مالک نہیں بنا سکتا، اور ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی لازم ہوجاتی ہے تو اس اعتبار سے یہ عقد رہن کی طرح ہے۔ فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''اَلْقَوْلُ السَّادِسُ مَا اخْتَارَہُ الْبَعْضُ وَاخْتَارَہُ الإمَامُ الزَّاهِدُ أَنَّ الشَّرْطَ إِذَا لَمْ یُذْکَرْ فِی الْبَیْعِ نَجْعَلَهٗ صَحِیْحًا فِیْ حَقِّ الْمُشْتَرِیْ حَتّٰی مَلَكَ الْأَنْزَالَ وَرَهْنًا فِیْ حَقِّ الْبَائِعِ فَلَمْ یَمْلِكِ الْمُشْتَرِیْ تَحْوِیْلَ یَدِہٖ وَمِلْکَهٗ إِلٰی غَیْرِہٖ وَأُجْبِرَ عَلَی الرَّدِّ إِذَا أَحْضَرَ الدَّیْنَ؛لِأَنَّهٗ کَالزِّرَافَةِ مُرَکَّبٌ مِنَ الْبَیْعِ وَالرَّهْنِ'' (فتاوی بزازیہ ۴/۴۰۸)۔

(قولِ سادس وہ ہے جس کو بعض فقہاء نے اختیار فرمایا ہے اسی کو فخر الدین زاہد نے پسند فرمایا ہے، بایں طور پر کہ جب عقد بیع کے اندر شرط کا ذکر نہ کیا ہو تو اس کو

مشتری کے حق میں بیع صحیح قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری مبیع کی آمدنی کا مالک ہوجائے اور بائع کے حق میں رہن قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری مبیع کا قبضہ اور مبیع کی ملکیت کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا مالک نہ ہوجائے اور مشتری کو مبیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا جب بائع دین ثمن لاکر پیش کردے؛ اس لیے کہ یہ عقد زرافہ کی طرح بیع اور رہن سے مرکب ہے)۔

فریقِ سابع بیع صحیح اور بیع فاسد اور رہن تینوں سے مرکب کے قائلین:

امام حافظ الدین بزازی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کے اندر تین صفتیں موجود ہیں:

(۱) یہ بیع بیع تلجئہ کے مشابہ ہے، بیع تلجئہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع صحیح ہے اور صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں ہے؛ لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے اوپر بیع صحیح کا حکم لگادیا جائے گا؛ لہٰذا مشتری اس عقد کی مبیع سے فائدہ اٹھاسکتا ہے، اور حضرات صاحبینؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے بعض احکام کے اعتبار سے اس کے اوپر بیع فاسد کا حکم لگادیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مقتضائے عقد کے خلاف شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہوجاتی ہے، اسی طرح اس عقد کے اندر بھی واپسی کی شرط بیع فاسد کے اصول کے مطابق شرط فاسد ہے، اور ان لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے جنہوں نے بیع الوفاء کو رہن کی طرح قرار دیا ہے اس کے اوپر رہن کا حکم لگادیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مرتہن کو مالِ رہن دوسرے کے قبضہ میں دینے اور دوسرے کو مالک بنانے کا حق نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اس عقد کے اندر مشتری کو دوسرے کی ملکیت میں دینے کا حق نہیں ہے، اس لیے اس کے اوپر معاملہ رہن کا حکم لگادیا جائے گا؛ لہٰذا بیع الوفاء تین قسم کے عقود سے مرکب ہے، بیع صحیح اور بیع فاسد اور رہن ان تینوں سے مرکب ہے، جیسا کہ ایک جانور جس کا نام زرافہ ہے تین قسم کے جانوروں کی صفتوں کے ساتھ وہ جانور متصف ہے کہ گردن کو دیکھا جائے تو اس کے اندر اونٹ کی صفت ہے اور پیروں کو دیکھا جائے تو اس کے اندر گائے اور بیل کی صفت ہے اور رنگوں کو دیکھا جائے تو اس کے اندر چیتے کی صفت ہے تو جس طرح ایک جانور تین قسم کے جانوروں کی صفات کے ساتھ متصف ہوکر وجود میں آیا ہے اور اس طرح کا جانور وجود میں آنا صحیح اور درست ہے، اسی طرح بیع الوفاء بھی تین قسم کے عقود کی صفتوں کے ساتھ متصف ہوکر وجود میں آئی ہے۔ اور وجود میں آنا درست ہے اور اسی وجہ سے اس کو عقد صحیح اور عقد جائز ہی قرار دیا جائے گا اور جب اس عقد کے اندر یہ تینوں صفتیں موجود ہیں تو ان تینوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟ تو بزازیہ میں ہے کہ بیع صحیح کے پہلو کو ترجیح دینا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے؛ اس لیے کہ اس کو بیع صحیح قرار دینے میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دینا ثابت ہوتا ہے، اور صاحب مذہب کے قول کو ترجیح دینا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہوا کرتا ہے، عربی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''قُلْتُ هٰذَا الْعَقْدُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْعُقُوْدِ الثَّلَاثَةِ كَالزَّرَافَةِ فِيْهَا صِفَةُ الْبَعِيْرِ وَالْبَقَرِ وَالنَّمِرِ جُوِّزَ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ بِشَرْطِ سَلَامَةِ الْبَدَلَيْنِ لِصَاحِبِهِمَا (إِلٰى قَوْلِهِ) لِأَنَّهُ يُشْبِهُ بَيْعَ التَّلْجِئَةِ وَإِنَّهُ صَحِيْحٌ عِنْدَهُ لَا عِنْدَهُمَا فَأُعْطِيَ لَهُ حُكْمُ الصَّحِيْحِ عَمَلًا بِقَوْلِهِ وَحُكْمُ الْفَاسِدِ فِيْ بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلًا بِقَوْلِهِمَا وَحُكْمُ الرَّهْنِ فِيْ بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلًا بِقَوْلِ النَّاسِ كَمَا ذَكَرْنَاهُ فِيْمَا تَقَدَّمَ وَإِذَا وَقَعَ التَّرَدُّدُ فِيْ إِلْحَاقِهِ بِالْفَاسِدِ أَوِ الصَّحِيْحِ فَإِلْحَاقُهُ بِالصَّحِيْحِ أَوْلٰى تَقْلِيْلًا لِلْفَسَادِ وَتَرْجِيْحًا لِقَوْلِ الْإِمَامِ فَيُعْتَبَرُ الْمَذْكُوْرُ ثَمَنًا لَا الْمَأْخُوْذُ'' (فتاویٰ بزازیہ ۴/۴۱۰، البحر الرائق کوئٹہ ۶/۸)۔

(میں کہتا ہوں یہ عقد عقود ثلاثہ سے مرکب ہے جیسا کہ زرافہ اس میں اونٹ، بیل اور چیتے کی صفت ہوتی ہے، اس کی طرف لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز قرار دیا گیا ہے، متعاقدین کے لیے بدل کی سلامتی کی شرط کے ساتھ اور مصنف کا قول اس لیے کہ یہ عقد بیع تلجئہ کے مشابہ ہے، اور بے شک بیع تلجئہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح ہے، صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں؛ لہٰذا امام صاحب کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کو بیع صحیح کا حکم دیا جائے گا اور صاحبین کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں بیع فاسد کا حکم دیا جائے گا اور دوسرے لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں رہن کا حکم دیا جائے گا، جیسا کہ ماقبل میں دوسرے کا قول ہم نے ذکر کردیا ہے اور جب اس کو بیع فاسد یا بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنا درست ہے تو بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنا زیادہ بہتر ہوگا فساد کی کمی کو ثابت کرنے کے لیے اور امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دینے کے لیے؛ لہٰذا ذکر کی گئی چیز کو ثمن قرار دیا جائے گا نہ کہ ماخوذ اور مقبوض کو)۔

مبیع کو کرایہ پر دینے کا حکم:

بیع الوفاء میں مشتری مبیع کو کرایہ پر دے کر اس کی آمدنی حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ بات خوب ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کے درمیان کافی اختلاف واقع ہوچکا ہے، جس کو ہم نے اس مقالہ کے اندر واضح کردیا ہے کہ بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو رہن کے درجہ

میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع فاسد کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع مکرہ کے درجہ میں قرار دیا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ان تمام صورتوں میں مشتری کی ملکیت نہیں ہوسکتی، اسی پر علاء الدین حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ کا رجحان ہے۔

اور اس کے برخلاف بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن سے مرکب عقد قرار دیا ہے، اور ساتھ میں یہ فرمایا ہے کہ مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اسی لیے مشتری مبیع کی آمدنی اور پیداوار کا مالک ہوجائے گا اور بائع کے حق میں رہن ہے اس لیے مشتری مبیع کو بیچنے اور دوسرے کے ہاتھ رہن رکھنے کا مجاز نہ ہوگا، اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن اور بیع فاسد تینوں سے مرکب زرافہ کی طرح الگ سے ایک عقد تسلیم کیا ہے، اور بعض فقہاء نے تعاملِ ناس اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے، ان تمام فقہاء کے قول کے مطابق بیع الوفاء صحیح اور جائز عقد ہے؛ لہٰذا ان سب حضرات کے نزدیک مشتری کے لیے مبیع سے فائدہ اٹھانے اور مبیع کے ذریعہ سے آمدنی حاصل کرنے کا حق ہے اور آمدنی کا ایک ذریعہ اجارہ اور کرایہ پر دینے کا بھی ہے، اس لیے ان تمام فقہاء کے نزدیک مشتری کے لیے مبیع کو بائع کے ہاتھ یا کسی دوسرے کے ہاتھ کرایہ پر دینا جائز ہے؛ لہٰذا اگر کھیتی کی زمین ہے تو مشتری اس زمین کو خود بائع کے ہاتھ میں یا کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ یا بٹائی پر دے کر نفع حاصل کرسکتا ہے، اور اگر عمارت ہے اس کو بھی کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرسکتا ہے، اور متأخرین کا فتویٰ اسی پر جاری ہوچکا ہے کہ آمدنی مشتری کی ملکیت ہوگی؛ لہٰذا راجح یہی ہوگا کہ مبیع کو کرایہ پر دے کر اجرت حاصل کرنا مشتری کے لیے اس وقت تک جائز ہوگا جب تک بائع ثمن دے کر مبیع کو واپس نہ لے گا، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''وَإِنْ آجَرَ الْمَبِيْعَ وَفَاءً مِنَ الْبَائِعِ مِمَّنْ جَعَلَهُ فَاسِدًا قَالَ لَا تَصِحُّ الإِجَارَةُ (إلى قَوْلِه) وَمَنْ جَعَلَهُ رَهْنًا كَذٰلِكَ لَمْ يَلْزَمِ الْبَائِعَ الأَجْرُ، وَمَنْ أَجَازَهُ جَوَّزَ الإِجَارَةَ مِنَ الْبَائِعِ وَغَيْرِهِ وَأَوْجَبَ الأَجْرَ''

(فتاویٰ بزازیہ علی الہندیۃ ۴/ ۴۱۲، شامی زکریا ۷/ ۵۴۸، کراچی ۵/ ۲۷۸)۔

اور اگر مبیع کو بیع الوفاء میں بائع کے ہاتھ اجرت دیا ہے تو جن لوگوں نے اس کو بیع فاسد قرار دیا ہے تو انہوں نے کہا کہ اجارہ صحیح نہیں ہوگا اور جنہوں نے رہن قرار دیا ہے ان کے نزدیک ایسے ہی اجارہ صحیح نہ ہوگا اور بائع پر اجرت لازم نہ ہوگی اور جن لوگوں نے بیع الوفاء کو بیع صحیح قرار دیا ہے ان لوگوں نے مبیع کو بائع کے ہاتھ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ پر دینے کو بھی جائز قرار دیا ہے، اور اجرت بھی لازم ہوجائے گی۔

''(وَقَوْلُهُ) وَذَكَرَ فِي الإِيْضَاحِ أَنَّ كُلَّ مَا يَصِحُّ بَيْعُهُ قَبْلَ قَبْضِهِ تَجُوْزُ إِجَارَتُهُ وَمَا لَا فَلَا وَبَيْعُ الْعَقَارِ قَبْلَ الْقَبْضِ جَائِزٌ فَكَذٰلِكَ إِجَارَتُهُ'' (فتاویٰ بزازیہ ۴/۴۱۳)۔

(اور ایضاح میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہر وہ شئ جس کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے اور جس کو قبل القبض بیچنا صحیح نہیں اس کو اجارہ پر دینا بھی صحیح نہیں ہے اور عقار کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے؛ لہٰذا اس کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہوجائے گا)۔

بیع الوفاء میں مبیع کی آمدنی کا حق دار کون؟

جب لوگوں کی ضرورت اور تعاملِ ناس کی وجہ سے بیع الوفاء کو جائز قرار دیا گیا ہے تو مشتری کے لیے مبیع کی واپسی تک اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے اور مبیع سے جو آمدنی پیدا ہوگی وہ آمدنی بھی مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہٰذا اگر مبیع کے ذریعہ سے کچھ آمدنی حاصل ہوجائے یا مبیع عقار ہے اور کھیتی کی زمین ہے اس میں سے پیداوار حاصل ہوجائے تو وہ ساری کی ساری مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہٰذا اگر آمدنی اور پیداوار ضائع ہوجائے یا مشتری نے ضائع کردیا ہے تو اس کا تاوان بائع کے لیے مشتری پر لازم نہیں ہوگا، یہی فقہاء کا آخری قول ہے اور صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا فتویٰ اسی پر جاری ہوچکا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''اَلَّذِيْ اسْتَقَرَّ عَلَيْهِ فَتْوٰى صَاحِبِ الْهِدَايَةِ وَأَوْلَادِهِ وَمَشَايِخِ الْعَهْدِ أَنَّ الْمِلْكَ يَثْبُتُ لِلْمُشْتَرِيْ فِيْ زَوَائِدِهِ وَلَا يَضْمَنُهُ بِالإِتْلَافِ'' (فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیۃ ۴/۴۱۰)۔

(جس کے اوپر صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا فتویٰ مسلسل جاری ہوچکا ہے وہ یہی ہے کہ بیع الوفاء میں مبیع کی پیداوار اور آمدنی میں مشتری کی ملکیت ثابت ہوجائے گی اور آمدنی کو ضائع اور ہلاک کردینے سے مشتری بائع کے لیے ضامن نہیں ہوگا)۔

بیع الوفاء میں مبیع کے نقصان کی تلافی:

اگر بیع الوفاء میں مشتری کے یہاں مبیع ہلاک ہوجائے تو ثمن کی ادائیگی ساقط ہوجاتی ہے؛ لیکن اگر مبیع ہلاک تو نہیں ہوئی ہے؛ لیکن اس میں نقصان آجائے تو اس نقصان کی تلافی کی کیا شکل ہے؟ تو اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ مبیع میں جتنا نقصان ہوا، دینِ ثمن میں سے اتنا مجریٰ ہوکر ساقط ہوجائے گا، مثال کے طور پر ایک ہزار روپیہ لے کر کے مبیع مشتری کے قبضہ میں دی گئی ہے اور مبیع کی قیمت پندرہ سو روپیہ ہے اور مبیع میں پانچ سو روپیہ قیمت کا نقصان ہوجائے تو ثمن میں سے پانچ سو روپیہ کی ادائیگی ساقط ہوجائے گی، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

''وَالَّذِیْ اسْتَقَرَّ عَلَیْهِ فَتْوَی الأَئِمَّةِ وَالْأَسَاتِذَةِ فِيْ مَسْئَلَةِ نُقْصَانِ الْمَبِیْعِ وَفَاءً سُقُوْطُ حِصَّةِ النُّقْصَانِ مِنْ مَالِ الْوَفَاءِ وَهُوَ الثَّمَنُ وَیُقَسَّمُ مَالُ الْوَفَاءِ عَلٰی قِیْمَةِ الْبَاقِيْ وَالْهَالِكِ فَیَسْقُطُ قِسْطُ الْهَالِكِ وَیَبْقٰی حِصَّةُ الْبَاقِيْ بَیَانُهٗ اشْتَرٰی دَارًا بِالْوَفَاءِ قِیْمَتُهَا تُسَاوِيْ أَلْفًا بِمِائَةٍ فَخَرِبَتْ الدَّارُ حَتّٰی صَارَتِ الْقِیْمَةُ خَمْسَ مِائَةٍ تَسْقُطُ مِنَ الثَّمَنِ خَمْسُوْنَ''
(فتاویٰ بزازیہ ۴/ ۴۱۲)۔

بیع الوفاء میں مبیع کے نقصان کے مسئلہ میں اساتذہ اور ائمہ کا فتویٰ اس بات پر جاری ہوچکا ہے کہ مالِ وفا یعنی ثمن میں سے نقصان کا حصہ ساقط ہوجائے گا اور ثمن وفا مبیع کے باقی حصہ پر اور مبیع کے ہلاک شدہ پر تقسیم ہوجائے گا؛ لہٰذا ہلاک شدہ کا حصہ بائع کے اوپر سے ادا کرنا ساقط ہوجائے گا اور باقی کا حصہ باقی رہے گا، اس کی وضاحت یوں ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر ایک مکان خریدا ہو جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ کے برابر ہے اس کو سو روپیہ میں خریدا ہے پھر مکان منہدم ہوجائے یہاں تک کہ اس کی قیمت پانچ سو روپیہ رہ جائے تو ثمن میں سے پچاس روپیہ ساقط ہوجائیں گے۔

بیع الوفاء میں ثمن کی زکوٰۃ کون ادا کرے؟

یہاں یہ مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مشتری کے قبضہ میں مبیع ہوتی ہے اور بائع کے قبضہ میں ثمن ہوتا ہے اور مبیع چوں کہ مالِ نمو نہیں ہوتی ہے، اس لیے مبیع کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی؛ لیکن ثمن مالِ نمو ہوتا ہے، اسی لیے اس کے اوپر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور یہ مال فی الحال بائع کے قبضہ اور ملکیت میں ہے، اس اعتبار سے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع کے اوپر لازم ہوگا اور مشتری کے اوپر اس لیے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے کہ اس نے ثمن کے بدل پر قبضہ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے ثمن در پردہ اس کی ملکیت ہے، اس لیے مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوجائے گا، اور چوں کہ عقود و فسوخ میں، یعنی عقد کے منعقد ہونے میں اور عقد کے فسخ ہوجانے میں نقود متعین نہیں ہوتے ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک مالِ متعین کی زکوٰۃ دو آدمیوں پر لازم آرہی ہے؛ بلکہ لاعلی التعیین اتنے مال کی زکوٰۃ بائع کے اوپر بھی لازم ہے اور مشتری کے اوپر بھی لازم ہے جو فقہاء کی اس طرح کی عبارات سے واضح ہوتا ہے:

''وَزَکٰوةُ مَالِ الْوَفَاءِ عَلَی الْبَائِعِ لِأَنَّهٗ مِلْکُهٗ بِالْقَبْضِ وَعَلَی الْمُشْتَرِيْ أَیْضًا لِأَنَّهٗ یُعَدُّ مَالًا لَهٗ مَوْضُوْعًا عِنْدَ الْبَائِعِ لَیْسَ فِیْهِ زَکٰوةُ مَالٍ عَلٰی رَجُلَیْنِ لِأَنَّ النُّقُوْدَ لَا تَتَعَیَّنُ فِي الْعُقُوْدِ وَالْفُسُوْخِ وَعَلَیْهِ صَاحِبُ الْهِدَایَةِ وَالإِمَامُ الْبَزْدَوِيُّ''
(فتاویٰ بزازیہ ۴/ ۴۱۲)۔

(بیع الوفاء کے مالِ ثمن کی زکوٰۃ بائع کے اوپر اس وجہ سے لازم ہوگی کہ قبضہ کی وجہ سے بائع اس کا مالک ہوچکا ہے اور مشتری کے اوپر بھی اس لیے واجب ہے کہ وہ مشتری ہی کا مال شمار ہوتا ہے جو بائع کے یہاں رکھا ہوا ہے اور اس میں ایک متعین مال کی زکوٰۃ کا ادا کرنا دو آدمیوں پر اس لیے لازم نہیں آتا ہے کہ عقود و فسوخ میں نقود یعنی ثمن متعین نہیں ہوا کرتا ہے، یہی صاحب ہدایہ اور امام بزدوی کی رائے ہے)۔

بائع اور مشتری کا اختلاف:

اگر بائع اور مشتری کے درمیان اس طرح اختلاف ہوجائے کہ دونوں میں سے ایک اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی ہوچکی ہے واپسی اور استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں اور دوسرا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی نہیں ہوئی؛ بلکہ بیع الوفاء کے طور پر عقد ہوا ہے؛ لہٰذا ثمن کی واپسی پر مبیع کا استرداد لازم ہے اور دونوں نے اپنے اپنے دعویٰ پر بینہ اور گواہ پیش کردیا ہے تو ایسی صورت میں کس کو ترجیح دی جائے؟ تو اس سلسلہ میں صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ استحساناً بیع الوفاء کا دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے؛ لیکن اس کے نیچے شامی نے ملتقط کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ اولاً مت أخرین نے بیع قطعی کا دعویٰ کرنے والے کے بینہ کو ترجیح دینے پر فتویٰ دیا ہے، پھر اس کے بعد بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے بینہ کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور اس کے اوپر استحسان کا نشان لگایا ہے،

اس کے بعد یہ وضاحت نقل فرمائی ہے کہ اگر مشتری نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا ہے کہ بیع مکمل ہو چکی ہے، اب استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور بائع دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں اگر دونوں نے بینہ پیش کیا ہے تو بائع کے گواہ کو ترجیح دی جائے گی اور اگر بینہ پیش نہیں کیا گیا؛ بلکہ دونوں کا محض دعویٰ ہے، تو ایسی صورت میں بیع قطعی کا دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے گی، ہاں البتہ اگر مبیع کے مقابلہ میں ثمن کی کمی پر واضح دلیل اور قرینہ موجود ہو تو ایسی صورت میں بیع الوفاء کا دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح ہوگی؛ تاکہ بائع غبن فاحش کے نقصان کا شکار نہ ہو تو حاصل یہ نکلا کہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں اگر بیع الوفاء کا قرینہ موجود ہو، مثلاً مبیع کے مقابلہ میں ثمن کی مقدار کم ہے تو ایسی صورت میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے بیع الوفاء کا حکم صادر کر دیا جائے گا اور دونوں کو اس کا پابند بنایا جائے گا اور اگر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے اور ثمن اور مبیع کے درمیان تناسب میں تفاوت نہیں ہے اور نہ ہی غبنِ فاحش لازم آسکتا ہے تو ایسی صورت میں مشتری کے قول کا اعتبار کر کے بیع قطعی کا حکم جاری کر دیا جائے گا۔

فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

''إِنَّ الْقَوْلَ لِمُدَّعِي الْوَفَاءِ اِسْتِحْسَانًا، وَلَوْ قَالَ الْبَائِعُ بِعْتُكَ بَيْعًا بَاتًّا فَالْقَوْلُ لَهُ إِلاَّ أَنْ يَدُلَّ عَلَى الْوَفَاءِ بِنُقْصَانِ الثَّمَنِ كَثِيْرًا (وَتَحْتَهُ فِي الشَّامِيَةِ) قَوْلُهُ: هُنَ اسْتِحْسَانًا يَقْتَضِي تَرْجِيْحَ مُدَّعِي الْوَفَاءِ فَيَنْبَغِي تَقْيِيْدُهُ بِقِيَامِ الْقَرِيْنَةِ (إلى قَوْلِهِ): وَإِنِ ادَّعَى أَحَدُهُمَا بَيْعًا بَاتًّا وَالآخَرُ بَيْعَ الْوَفَاءِ وَأَقَامَ الْبَيِّنَةَ كَانُوْا يُفْتُوْنَ أَنَّ الْبَاتَّ أَوْلَى؛ ثُمَّ أَفْتَوْا أَنَّ بَيْعَ الْوَفَاءِ أَوْلَى وَهٰذَا اِسْتِحْسَانٌ (إلى قَوْلِهِ) وَلَوْ قَالَ الْمُشْتَرِيْ اشْتَرَيْتُهُ بَاتًّا وَقَالَ الْبَائِعُ؛ بِعْتُهُ بَيْعَ الْوَفَاءِ (إلى قَوْلِهِ) أَنَّ الْاِسْتِحْسَانَ فِي الْاِخْتِلَافِ فِي الْبَيِّنَةِ تَرْجِيْحُ بَيِّنَةِ الْوَفَاءِ وَفِي الاخْتِلَافِ فِي الْقَوْلِ تَرْجِيْحُ قَوْلِ مُدَّعِي الْبَتَاتِ (إلى قَوْلِهِ): وَهُوَ كَوْنُ الْقَوْلِ لِمُدَّعِي الْبَتَاتِ بِمَا إِذَا لَمْ تُقِمِ الْقَرِيْنَةُ عَلَى خِلَافِهِ'' (الدر المختار مع الشامی زکریا ۷/ ۵۵۰، شامی کراچی ۵/ ۲۷۹)۔

(بے شک استحسانا بیع الوفاء کے مدعی کا قول معتبر ہوگا اور اگر بائع نے کہا کہ میں نے تمہارے ہاتھ بیع قطعی کے طور پر بیچا ہے تو اس کا قول معتبر ہوگا؛ لیکن اگر بیع الوفاء پر ثمن کے کثیر نقصان کی وجہ سے دلالت کرنے والی کوئی دلیل ہو تو بیع الوفاء کا اعتبار ہوگا اس کے نیچے شامی میں ہے کہ یہاں استحسانا کا لفظ بیع الوفاء مدعی کے دعویٰ کی ترجیح کا تقاضا کرتا ہے؛ لہٰذا اس کو قیامِ قرینہ کے ساتھ مقید کرنا زیادہ مناسب ہے اور اگر دونوں میں سے ایک نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا اور دوسرے نے بیع الوفاء کا اور دونوں نے بینہ قائم کر دیا تو فقہاء متأخرین اس بات پر فتویٰ دیتے تھے کہ بیع قطعی کی ترجیح کو اولیٰ قرار دیا جائے پھر اس کے بعد بیع الوفاء کی ترجیح کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دینے لگے اور بیع الوفاء کو ترجیح دینا مستحسن ہے اور اگر مشتری نے کہا کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں بینہ کے ساتھ میں اختلاف کی صورت میں مستحسن یہی ہے کہ بیع الوفاء کے بینہ کو ترجیح دی جائے اور بغیر بینہ کے قول میں اختلاف کی صورت میں بیع قطعی کے مدعی کے قول کو ترجیح دی جائے اور بیع قطعی کے مدعی کے قول کی ترجیح اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ جبکہ اس کے خلاف پر کوئی قرینہ قائم نہ ہو)۔

اور ''الاشباہ والنظائر'' کے حاشیہ حموی میں صاف الفاظ کے ساتھ بائع کے قول کو ترجیح دی گئی ہے کہ جب مشتری اور بائع کے درمیان اس طرح کا اختلاف ہو جائے کہ مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرے اور بائع بیع الوفاء کا دعویٰ کرے تو ایسی صورت میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے اس معاملہ کو بیع الوفاء قرار دیا جائے گا؛ اس لیے کہ بیع قطعی ہونے کی صورت میں مشتری کا فائدہ ہے اور بائع کا نقصان ہے اور بیع الوفاء ہونے کی صورت میں کسی کا نقصان نہیں؛ کیوں کہ مشتری کو اپنا ثمن واپس مل جاتا ہے اور بائع کو اپنی مبیع واپس مل جاتی ہے۔

''وَفِي الْفُصُوْلِ الْعِمَادِيَةِ إِذَا اخْتَلَفَ الْمُتَبَايِعَانِ فَقَالَ الْمُشْتَرِيْ: اشْتَرَيْتُهُ شِرَاءً بَاتًّا، وَقَالَ الْبَائِعُ: بَيْعَ الْوَفَاءِ، فَإِنَّ الْقَوْلَ قَوْلُ الْبَائِعِ؛ لِأَنَّ الْمُشْتَرِيَ يَدَّعِيْ زَوَالَ عَيْنِهِ بِالْبَتَاتِ وَمُدَّعِي الْوَفَاءِ يُنْكِرُ الزَّوَالَ، فَيَكُوْنُ الْقَوْلُ قَوْلَهُ''
(حاشیہ الحموی علی الأشباہ قدیم ۱۳۰)۔

(فصول عمادیہ میں ہے کہ جب متبائعین میں اختلاف ہو جائے تو مشتری کہتا ہے کہ میں نے عقد لازم اور عقد قطعی کے طور پر خریدا ہے اور بائع کہتا ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر میں نے بیچا (اور تم نے خریدا ہے) تو بائع کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی؛ اس لیے کہ مشتری معاملہ قطعی کے ذریعہ سے عین مبیع کے زوال کا دعویٰ کرتا ہے اور بیع الوفاء کا مدعی زوال کا انکار کرتا ہے؛ لہٰذا اسی کے قول کا اعتبار ہوگا)۔

☆☆☆

حکم بیع الوفاء، بصورتِ عقد بیع

مولانا محمد سلمان منصور پوری [1]

جواب (۱) الف:- بیع الوفاء (یعنی ثمن اول کے ساتھ اقالہ بیع کے وعدہ پر عقد کرنا) کی حقیقت میں فقہاء کی آراء مختلف رہی ہیں، جن میں سے تین اقوال درج ذیل ہیں:

قولِ اول: بہت سے حضرات نے اس بیع کو مطلقاً رہن کے حکم میں رکھا ہے، اور مشتری کے لیے مبیع (مرہون) سے انتفاع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ عقود میں الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا؛ بلکہ مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے، جیسا کہ اگر عقد کفالت میں اصیل کی برأت کی شرط لگائی جائے تو وہ عقد حوالہ بن جاتا ہے، اور اگر حوالہ کے الفاظ استعمال کیے جائیں؛ لیکن اصیل سے مطالبہ کی شرط ملحوظ ہو تو یہ عقد کفالت بن جاتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے عقود میں محض الفاظ کو نہیں دیکھا جائے گا؛ بلکہ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

علامہ علی بن عثمان بن محمد التیمی الحنفیؒ "فتاویٰ سراجیہ" میں لکھتے ہیں:

"وعن السيد الإمام أبي شجاع والقاضي الحسن ماتريدي والقاضي الإمام على الصغدي أن بيع الوفاء رهن حقيقةً، ولا يطلق الانتفاع للمشتري إلا بإذن البائع فهو ضامن لما أكل واستهلك، وللبائع استبداده إذا قضى دينه متى شاء؛ لأنهم يريدون به الرهن حقيقة، والعبرة للمقاصد لا للألفاظ، ألا ترىٰ أن الكفالة بشرط براءة الأصيل حوالة، والحوالة بشرط مطالبة الأصيل كفالة" (فتاویٰ سراجیہ ۴۲۲)۔

"درمختار" اور "شامی" میں ہے:

"قيل: هو رهن فتضمن زوائده (درمختار) وقال الشامي: وفي حاشية الفصولين عن جواهر الفتاوىٰ: هو أن يقول: بعت منك على أن تبيعه مني متى جئت بالثمن، فهٰذا البيع باطل، وهو رهن، وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح ... الخ۔ قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من الأحكام۔ قال السيد الإمام: قلت للإمام الحسن الماتريدي: قد فشا هٰذا البيع بين الناس۔ وفيه مفسدة عظيمة، وفتواك أنه رهن، وأنا أيضًا على ذٰلك، فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على هٰذا ونظهره بين الناس، فقال المعتبر اليوم فتوانا وقد ظهر ذٰلك بين الناس، فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم دليله... الخ۔

قلت: وبه صدر في جامع الفصولين فقال رامزاً لفتاوىٰ النسفي: البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالاً للربا وسموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكه، وهو ضامن لما أكل من ثمره وأتلف من شجره ويسقط الدين بهلاكه لو بقي ولا يضمن الزيادة وللبائع استرداده إذا قضى دينه لا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام الخ. ثم نقل ما مرّ عن السيد الإمام"

(درمختار مع الشامی بیروت ۷/ ۴۲۴-۴۲۵، ہندیہ ۳/ ۲۰۹، خانیہ علی الہندیہ ۲/ ۱۶۴-۱۶۵)۔

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہوا کہ ان علماء وفقہاء کے نزدیک مقصد عقد کا اعتبار کرتے ہوئے بیع الوفاء پر رہن کے تمام احکامات جاری ہوتے ہیں اور یہ معاملہ ظاہراً بیع اور باطناً رہن کا ہے، اور اصولی اعتبار سے اس معاملہ میں عدم جواز کا پہلو غالب ہے۔ چناں چہ فقیہ النفس حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری نور اللہ مرقدہ وغیرہم کی رائے یہی ہے۔ حضرت سہارنپوریؒ کی تحریر کے الفاظ درج ذیل ہیں: "بیع الوفاء مروجا اگرچہ مختلف فیہ ہے؛ لیکن برائے قواعد شرعیہ عدم جواز سے خالی نہیں" (فتاویٰ خلیلیہ ۱/ ۳۹۵)۔

---

[1] خادم فقہ وحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد۔

قولِ ثانی: بیع الوفاء کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں بعض پہلوؤں کے اعتبار سے اگرچہ فساد پایا جاتا ہے؛ لیکن انجام کار یہ ایک جائز عقد بن جاتا ہے، جس کے ذریعہ مشتری کے لیے مبیع پر قبضہ کے بعد اس سے انتفاع حلال قرار دیا جاتا ہے، جیسا کہ دیگر بیوعاتِ فاسدہ میں قبضہ کے بعد ملکیت مان لی جاتی ہے، نیز لوگوں کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے شرطِ فاسد کو بھی اس عقد میں گوارا کرلیا گیا ہے۔ ''فتاویٰ سراجیہ'' میں ہے:

''بيع المعاملة وبيع الوفاء واحدٌ وإنه بيع فاسد؛ لأنه بيع بشرط لا يقتضيه العقد، وإنه يفيد الملك عند اتصال القبض به كسائر البيوع الفاسدة مذكورة في فتاوىٰ أبي بكر بن الفضل'' (فتاوىٰ سراجيه ۴۲۲)۔

اور ''درمختار'' میں ہے:

''وقيل: بيع يفيد الانتفاع به وفي إقالة شرح المجمع عن النهاية: وعليه الفتوىٰ'' (درمختار)۔

اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''هٰذا محتمل لأحد القولين، الأول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه۔ قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوىٰ۔ الثاني القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ صحيح في حق بعض الأحكام: كحل الإنزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدين بهلاكه، فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما۔ قال في البحر: وينبغي أن لا يعدل في الإفتاء عن القول الجامع۔ وفي النهر: والعمل في ديارنا على ما رجحه الزيلعي'' (شامي زكريا ۴۲۵/۷)۔

اور ''تبیین الحقائق'' میں ہے:

''ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعًا جائزًا مفيدًا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي فقال: اتفق مشايخنا في هٰذا الزمان، فجعلوه بيعًا جائزًا مفيدًا بعض أحكامه و هو الانتفاع به، دون البعض، و هو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل، وجوز الاستصناع لذٰلك، وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوىٰ'' (تبیین الحقائق دیوبند ۶/ ۷ ۲۳)۔

اور علامہ چلپی ''تبیین الحقائق'' کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

''والأصح عندي أنه بيع فاسد يوجب الملك بعد القبض، وحكمه سائر البياعات الفاسدة، لأنه بيع بشرط لا يقتضيه العقد، وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع وشرط'' (حاشية چلپي تبيين الحقائق ۶/۲۳۸)۔

اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اضطرار شدید کے موقع پر بائع کے لیے اس قول کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے (دیکھئے: امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۰۸)۔

قولِ ثالث: لوگوں کے عرف وتعامل اور ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض حضراتِ فقہاء نے اس عقد کو دائرۂ جواز میں لانے کے لیے یہ حیلہ پیش فرمایا ہے کہ اولاً بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور پھر مجلس عقد کے بعد آپس میں یہ طے کرلیا جائے کہ جب ثمن کی واپسی ہوگی تو اس بیع کا اقالہ کرلیا جائے گا، گویا بیع الگ ہو اور وعدہ الگ، دونوں آپس میں مشروط نہ ہوں۔ ہمارے اکابر میں ناظم مظاہر علوم حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ نے ایک طویل فتویٰ میں اسی قول پر فتویٰ دیا ہے جو فتاویٰ خلیلیہ (۱/ ۳۹۵) پر درج ہے۔ ''فتاویٰ سراجیہ'' میں ہے:

''وعن الشيخ القاضي الإمام الاسبيجابي أنه قال: إنه بيع جائز، ويوفي بالوعد، قال بعض مشائخنا: من أراد أن يرتهن شيئًا ويباح له الغلة فالوجه أن يشتري المحدود شراء باتًّا، ثم يقول المشتري للبائع: بعد التفرق عن مجلس العقد أن يقيل هٰذا البيع إليه إذا أوفى إليه جميع ما أدى من الثمن... إلخ'' (فتاوىٰ سراجيه ۴۲۲)۔

اور ''تبیین الحقائق'' میں ہے:

''وإن ذكرا البيع من غير شرط ثم ذكرا الشرط على الوجه المعتاد جاز البيع ويلزمه الوفاء بالميعاد؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة، قال عليه الصلوٰة والسلام: العدة دين'' (معجم الطبراني فى الأوسط رقم: ۱۵۱۳، مجمع الزوائد وقال فيه

حمزۃ بن داؤد ضعفہ الدار قطني ۱۶۲/۳) ''فیجعل ھٰذا المیعاد لازمًا لحاجۃ الناس إلیہ'' (تبیین الحقائق دیوبند ۶/۲۳۷)۔

اور بعض فقہاء نے اس میں یہ شرط بھی بڑھائی ہے کہ یہ بیع مطلق عن الشرط ثمن مثل پر یا غبن یسیر (یعنی قیمت مثل سے معمولی کمی) کے ساتھ ہونی چاہیے۔ پس اگر غبن فاحش کے ساتھ یہ بیع ہوگی تو اصل مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ معاملہ بیع کا نہ ہوگا؛ بلکہ صرف رہن کا ہو جائے گا اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔

''قال الشامي: قلت وھٰذا ظاھر علی ھٰذا القول، بأنہ بیع صحیح لا یفسد الشرط اللاحق، فلا ینافي ما یأتي عن الشرنبلالیۃ، ھٰذا وفي الخیریۃ: فیما لو أطلق البیع ولم یذکر الوفاء إلا أنہ عھد عن البائع أنہ إن أوفی مثل الثمن یفسخ البیع معہ۔ أجاب: ھٰذہ المسئلۃ اختلف فیھا مشائخنا علی أقوال ونص في الحاوی الزاھدي أن الفتویٰ في ذٰلک أن البیع إذا أطلق ولم یذکر فیہ الوفاء، إلا أن المشتري عھد إلی البائع أنہ إن أوفی مثل ثمنہ فإنہ یفسخ معہ البیع، یکون باتًا، حیث کان الثمن ثمن المثل أو بغبن یسیر، وبہ أفتی في الحامدیۃ أیضًا، فلو کان بغبن فاحش مع علم البائع بہ فھو رہن الخ'' (شامي بیروت ۷/۴۲۵)۔

بہر حال یہ قول دراصل جواز کا ایک حیلہ ہے، تاہم اس میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں:

اول یہ کہ یہ معاملہ معروف ہونے کی بنا پر شرط نہ لگائے جانے کے باوجود مشروط ہی کے درجہ میں ہے۔

دوسرے یہ کہ عمومًا یہ بیع ثمن مثل پر نہیں ہوتی؛ بلکہ غبن فاحش کے ساتھ ہوتی ہے۔ مثلاً اصل زمین کی قیمت اگر دس لاکھ روپے ہے تو اس پر دو لاکھ روپے ثمن کے طور پر طے ہوتے ہیں، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں بیع مقصود نہیں؛ بلکہ رہن ہی مقصود ہے۔

انہی سب وجوہات کی وجہ سے اکابر علماء نے اس بیع کو مشتری کے لیے مشتبہ قرار دیا ہے۔ اس بارے میں مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانیؒ کا درج ذیل فتویٰ بہت چشم کشا ہے، حضرت بیع الوفاء سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ صورت بیع الوفاء کی ہے اور اس کے جواز وعدم جواز میں اختلاف ہے، اور نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس طریق سے عقد کرنا بیع ہے یا رہن؟ اگر رہن ہے تو ظاہر ہے کہ بائع راہن ہوگا اور مشتری مرتہن، اور مرتہن کو شئ مرہونہ سے نفع حاصل کرنا علی الاصح ناروا اور سود ہے۔

''لأن کل قرض جر نفعًا فھو ربا'' (فتح القدیر کتاب الحوالۃ ۶/۳۵۵، مصنف ابن ابی شیبۃ بیروت ۴/۳۲۳)

اور اگر بیع ہے، جیسا کہ ظاہر ہے تو اس بیع میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ پندرہ سال کے اندر اگر بائع ثمن کو واپس کردے تو مشتری مبیع کو واپس کردے اور یہ قاعدہ فقہیہ ہے کہ ایسی شرط سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، پس بہر حال عقد مذکور شرعًا صحیح نہیں ہے، اور مشتبہ ہونے میں تو اس کے کچھ شبہ ہی نہیں ہو سکتا؛ لہٰذا ترک کرنا اس کا لازم ہے؛ کیوں کہ مشتبہات سے بچنا بھی مامور بہ ہے، اور اتقاء شبہات موجب حفاظت دین ہے'' (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۱۴/۳۲۶)۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ عقد شبہ سے خالی نہیں ہے۔ اب رہ گئی یہ ضرورت کہ بغیر اس طرح کے معاملہ کے ضرورت مند غریب کو قرض نہیں مل پاتا، تو اس کی بنیاد پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ایسے ضرورت مند کے لیے اسی طرح گنجائش نکالی جائے، جیسے محتاج شخص کے لیے سود پر قرض لینے کی گنجائش ہوتی ہے۔

کما في الأشباہ: ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''۔

لیکن قرض دینے والوں کے لیے مبیع یا مرہون سے انتفاع کی حلت یقینا مشتبہ ہے، اور بالخصوص بہار وغیرہ کے علاقوں میں اس معاملہ کے جواز کا بہانہ بنا کر غریب کاشت کاروں کی زمینوں کے ساتھ امیر لوگوں کا جو استحصال عرصوں سے جاری ہے وہ صریح ظلم ہے، اس کی ہرگز تائید نہیں کی جا سکتی۔ ہونا یہ چاہیے کہ مرتہن جائیداد کو نفع بخش بنائے اور اس کی آمدنی جمع کرتا رہے، اور جب دین کے بقدر آمدنی ہو جائے تو اپنا قرض وصول کرلے اور جائیداد اصل مالک کو واپس کردے، یہی شکل بے غبار ہے، اور شبہ سے خالی ہے۔

جواب (ا) ب:- اس عقد کو خواہ رہن مانا جائے یا بیع، بہر صورت سابقہ ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا؛ رہن ماننے کی صورت میں تو یہ حکم ظاہر ہے، اور بیع ماننے کی صورت میں یہ یا تو بیع فاسد ہے جس کا فسخ ثمن مثل سے ضروری ہوتا ہے، یا عقد بیع سے الگ وعدۂ اقالہ ہے، اور اقالہ ثمن اول ہی پر ہوا کرتا ہے، اور یہ وعدہ کم از کم دیانۃً لازم ہے۔

''وقیل: إن بلفظ البیع لم یکن رھنًا، ثم إن ذکرا الفسخ فیہ أو قبلہ أو زعماہ غیر لازم کان بیعًا فاسدًا۔ ولو بعدہ علی وجہ المیعاد جاز، ولزم الوفاء بہ؛ لأن المواعید قد تکون لازمۃ لحاجۃ الناس وھو الصحیح''

(درمختار مع الشامی بیروت ۷/ ۴۲۵- ۴۲۶)

جواب(ا) ج:- اس صورت میں خریدار کا مبیع سے فائدہ اٹھانا بالکل حرام تو نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ مالک کی طرف سے اس سے انتفاع کی صراحۃً یا دلالۃً اجازت موجود ہے؛ البتہ مشتبہ ضرور ہے؛ اس لیے کہ اس میں ربا کا شبہ پایا جاتا ہے، جیسا کہ اوپر جواب [(ا) الف] میں گزر چکا ہے۔

جواب(ا) د:- اگر بیع مطلق واقع ہوئی ہے تو اصولاً بیع تام اور نافذ ہوچکی، اور مشتری کو مبیع کے اندر ہر طرح کا تصرف بشمول بیع کرنے کا حق حاصل ہوگیا؛ لیکن چوں کہ اس میں عقد سے ہٹ کر دوسرے کے ہاتھ بیع نہ کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے، اس لیے اس وعدہ کے پیش نظر مشتری اس کے بیچنے کا حق نہ رکھے گا، اور اس معاملہ میں یہ تصرف شئے مرہون میں تصرف کے مثل ہوگا، حتیٰ کہ جو حضراتِ فقہاء اس طرح کی بیع کو مطلق جائز کہتے ہیں وہ بھی بیع ثانی کے حق میں اس عقد کو رہن کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

''الثاني القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، صحيح في حق بعض الأحكام: كحل الإنزال و منافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر'' (شامي زكريا ۷/۴۲۵)۔

رہن ماننے کی صورت میں مروجہ بیع وفا کا حکم:

جواب(۲) الف:- اگر اس معاملہ میں بیع کا لفظ استعمال نہ ہو؛ بلکہ صرف رہن کا ذکر ہو، جیسا کہ عام رواج ہے کہ لوگ اس طرح کے لین دین کے وقت بیع کا ذکر نہیں کرتے؛ بلکہ رہن ہی کے ارادہ سے معاملہ کرتے ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ اگر راہن اجازت دیدے تو مرتہن کے لیے جائیداد سے انتفاع جائز ہوگا یا نہیں؟ تو اس بارے میں فقہاء کی دو رائے ہیں:

(ا) یہ کہ اس اجازت کا کوئی اعتبار نہیں اور مرتہن کے لیے یہ نفع اٹھانا سراسر سود ہے، یہ رائے سمرقند کے بڑے عالم علامہ عبداللہ بن محمد اسلم سمرقندیؒ کے حوالہ سے علامہ شامیؒ نے ان الفاظ میں نقل فرمائی ہے:

''لا يحل له أن ينتفع بشيئ بوجه من الوجوه؛ وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربوا، لأنه يستوفي دينه كاملًا فيبقى له المنفعة فضلًا، فيكون ربًا، وهذا أمر عظيم'' (شامي زكريا ۷/۱۳، مجمع الأنهر ۴/۲۷۳ مكتبه فقيه الأمة ديوبند)

(۲) دوسری رائے جو فقہ حنفی کی عام کتابوں میں مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ اگر راہن اجازت دیدے تو مرتہن کے لیے شئ مرہون سے نفع اٹھانا سود نہیں ہے؛ بلکہ فی نفسہٖ جائز ہے:

''وليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون، إلا بإذن الراهن، فإذا أذن له جاز أن يفعل ما أذن له فيه''
(البحر الرائق ۸/ ۲۳۸، مجمع الأنہر ۴/ ۲۷۳ مکتبۃ فقیہ الأمۃ دیوبند)۔

اب ان دونوں متعارض اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے فقہاء نے دو توجیہیں پیش فرمائیں:

توجیہ ا:- علامہ سمرقندیؒ کا فتویٰ احتیاط اور دیانت پر مبنی ہے، جبکہ عام معتبر کتابوں میں اصل مسئلہ بیان کیا گیا ہے؛ لیکن اس توجیہ کو علامہ حمویؒ نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ سود سے متعلق مسائل میں دیانت اور قضا دونوں کا حکم یکساں ہوتا ہے، اس لیے یہ تطبیق بے نتیجہ ہے۔

توجیہ ۲:- دوسری توجیہ یہ ہے کہ اگر رہن کا عقد کرتے ہوئے یہ شرط لگادی جائے کہ مرتہن شئ مرہون سے فائدہ اٹھائے گا تو یہ معاملہ ناجائز ہوگا اور اگر شرط نہیں لگائی؛ بلکہ بعد میں ویسے ہی اجازت دے دی تو یہ درست ہوگا، اور اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر مستقرض کسی سے قرض لینے کے بعد اپنی خوشی سے اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کرے تو اگر یہ ہدیہ قرض میں مشروط ہے تو ممنوع و مکروہ ہوگا، اور اگر شرط نہ ہو تو گنجائش ہوگی۔

یہ توجیہ بظاہر قواعد کے موافق ہے، اور بہت سے علماء نے اس تفصیل کو قبول کیا ہے؛ لیکن علامہ شامیؒ نے بعض فقہاء کے حوالہ سے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ چوں کہ متعارف یہی ہے کہ مرتہن شئ مرہون سے نفع اٹھاتا ہے، اور اگر کسی مرتہن کو یہ پتہ چل جائے کہ اسے مرہون سے نفع کی اجازت نہ ملے گی تو وہ ہرگز قرض دینے پر آمادہ نہ ہوگا؛ لہٰذا ''المعروف کالمشروط'' کے ضابطہ سے یہاں بھی ممانعت ہی کو ترجیح ہوگی۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''قلت: وبهذا مخالف لعامة المعتبرات من أنه يحل بالإذن، إلا أن يحمل على الديانة وما في ''المعتبرات'' على الحكم، ثم رأيت في جواهر الفتاوى: إذا كان مشروطًا صار قرضًا فيه منفعة و هو ربا، وإلا فلا بأس... الخ، ما في

المنح ملخصًا۔ وأقره ابنه الشيخ صالح۔ وتعقبه الحموي، بأن ما كان ربًا لايظهر فيه فرق بين الديانة والقضاء۔ وعلى أنه لا حاجة إلى التوفيق بعد أن الفتوىٰ على ما تقدم: أي من أنه يباح۔

أقول: ما في الجواهر يصلح للتوفيق و هو وجيه، وذكروا نظيره فيما لو أهدى المستقرض للمقرض: إن كانت بشرط كره، وإلا فلا۔ وما نقله الشارح عن الجواهر أيضًا من قوله: لا يضمن يفيد أنه ليس بربا؛ لأن الربا مضمون فيحمل على غير المشروط، وما في الأشباه من الكراهة على المشروط، ويؤيده قول الشارح لاآتي آخر الرهن: إن التعليل بأنه ربا يفيد أن الكراهة تحريمية، فتأمل۔ وإذا كان مشروطًا ضمن كما أفتى به في الخيرية فيمن رهن شجر زيتون على أن يأكل المرتهن ثمرته نظير صبره بالدين۔

قال: قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط و هو مما يعين المنع، والله تعالى أعلم

فائدة: قال في التاترخانية ما نصه: ولو استقرض دراهم وسلم حماره إلى المقرض ليستعمله إلى شهرين حتى يوفيه دينه أو داره ليسكنها فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله فعليه أجر مثله ولا يكون رهنًا... الخ۔ وقدمناه في الإجارات، فتنبه'' (شامي بيروت ۷/۱۱۰)۔

''وقد علمت ترجيح القول بأنه رهن، وأنه لا تصح إجارته من البائع'' (شامي بيروت ۷/۴۲۷)

اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی اس بحث کا خلاصہ درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے، جو قابل لحاظ ہے:

''وإذا أذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بالمرهون، جاز مطلقًا عند بعض الحنفية۔ ومنهم من منعه مطلقًا؛ لأنه ربا أو فيه شبهة الربا، والإذن أو الرضا لا يحل الربا ولا يبيح شبهته۔ ومنهم من فصل فقال: إن شرط الانتفاع على الراهن في العقد، فهو حرام؛ لأنه ربا، وإن لم يشرط في العقد، فجائز؛ لأنه تبرع من الراهن للمرتهن۔ والاشتراط كما يكون صريحًا، يكون متعارفًا، والمعروف كالمشروط۔

وهذا التفصيل هو المتفق من روح الشريعة، والغالب من أحوال الناس أنهم عند دفع القرض إنما يريدون الانتفاع، ولو لاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط، و هو مما يُعيّن المنع، كما قال ابن عابدين۔

وأرى أن الاحتياط في الدين أمر واجب، وكل قرض جر نفعًا مشروطًا أو متعارفًا فهوعند الحنفية ربا، وقد صرح ابن نجيم في الأشباه أنه يكره (أي تحريمًا) للمرتهن الانتفاع بالرهن۔ وقال في التاترخانية ما نصه: ولو استقرض دراہم، وسلم حماره إلى المقرض ليستعمله إلى شهرين، حتى يوفيه دينه، أو داره ليسكنها فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله فعليه أجر مثله، ولا يكون رهنا۔ وعليه نرى أن ما اعتاده الناس في زماننا من رهن الدور على أن يسكنها المرتهن، ريما يرد إلى الراهن دينه، و هو قرض، غير جائز باتفاق المذاهب۔ وليس العقد من قبيل بيع الوفاء، لعدم انصراف مقاصد الناس إلى البيع'' (الفقه الإسلامي وادلته ۵/۱۳۶۱۴۷)

اور علامہ عبد الرحمن الجزیری نے اس مسئلہ کی تلخیص درج ذیل عبارت میں فرمائی ہے:

''أما المرتهن بأن في جواز انتفاعه بالمرهون بإذن الراهن خلافًا: فبعضهم يقول: لايحل الانتفاع بالمرهون ولو أذنه الراهن، سواء كان سبب الدين بيعًا أو قرضًا، لأنه يستوفي دينه كاملًا۔ فتبقى له المنفعة زيادة بدون مقابل، وهذا هو عين الربا، ولكن الأكثر على أنه يجوز انتفاع المرتهن بالمرهون إذا أذنه الراهن بشرط أن لايشترط ذلك في العقد؛ لأنه إذا شرطه يكون قرضًا جر نفعًا و هو ربًا۔ ونظير ہذا ما لو اقترض من شخص مالًا ثم أهدى له هدية، فإن كانت الهدية مشروطة، فإنها تكون مكروهة، أما إذا كانت بدون شرط، فإنها جائزة له،

وإذا أذنه فليس له الرجوع، فإذا استعمل المرتهن المرهون بإذن الراهن وهلك أثناء استعماله، فإنه يهلك أمانة، فلا شيء على المرتهن ويبقى دينه، أما إذا هلك بعد استعماله أو قبله، فإنه يهلك بالدين''

(الفقه على المذاهب الأربعة مكمل بيروت ۵۸۲)۔

اس سب تفصیل کا خلاصہ یہی نکلا کہ مرتہن کے لیے مرہون سے انتفاع شبہ سے خالی نہیں ہے اور اس سے احتراز لازم ہے۔

گویا کہ راہن اگر قرض لینے میں مجبور ہو تو اس کے لیے تو گنجائش نکل سکتی ہے؛ لیکن مرتہن کے لیے انتفاع بہر حال مشتبہ ہوگا، اکثر محققین علماء ومفتیان کی رائے یہی ہے۔

جواب (۲) ب:- مرتہن کا شئ مرہون کو کرایہ پر لینا عقد رہن کو باطل کر دیتا ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں رہن کا معاملہ ختم ہو جائے گا، صرف قرض اور کرایہ داری کا معاملہ باقی رہے گا، اور یہ کرایہ راہن کا حق ہوگا۔ اور مروجہ صورت میں چوں کہ کرایہ کی کمی کی بنیاد قرض پر ہے، اس لیے قرض پر نفع اٹھانے کا محظور پایا جائے گا اور یہ بھی ممنوع ہے۔

''قال في الشامي: وأما إذا آجره المشتري وفاءً بإذن البائع فهو كإذن الراهن للمرتهن بذلك، وحكمه أن الأجرة للراهن... إلخ۔ قلت: وإذا آجره بإذنه يبطل الرهن، كما ذكره في حاشيته على الفصولين۔ (شامي بيروت ۷/۴۲۷)

قال الشيخ عبد الرحمن الجزيري: الحالة الثانية أن يكون المستأجر هو المرتهن وجدد استلام المرهون بالإجارة أو يكون المستأجر أجنبيًا عنهما بإذنهما، وفي ہذه الحالة يبطل عقد الرهن، وتكون الأجرة للراهن''

(الفقه على المذاهب الأربعة، مكمل ۵۸۳)

جواب (۲) ج:- اس جزء کا جواب [(۲) الف] میں آچکا ہے۔

جواب (۲) د:- مرتہن کو عام حالات میں شئ مرہون کو فروخت کرنے کا حکم نہیں ہے؛ لیکن اگر راہن اجازت دیدے تو اس کی بیع نافذ ہو جائے گی اور وہ شئ مرہون کو بیچ کر اپنا قرض وصول کر کے مابقیہ رقم راہن کو لوٹا سکتا ہے، قرض سے زائد رقم وصول کرنا درست نہ ہوگا۔

''ليس للمرتهن بيع ثمرة الرهن (درمختار) وفي الشامي: أي إذا لم يبحها له الراهن'' (شامي بيروت ۱۰/۹۳)۔

''ولا يملك راهن ولا مرتهن بيعه بغير رضى الآخر'' (تنوير الأبصار مع الدر المختار ۱۰/۹۷)۔

کرایہ داری کے معاملہ میں زرِ ضمانت کا حکم:

جواب (۳):- یہاں اصل معاملہ کرایہ داری کا ہے، اور اس پر جو رقمِ ضمانت دی جاتی ہے، یہ ابتداءً امانت ہوتی ہے، جس میں اصولاً مالک مکان کو تصرف کا حق نہیں ہوتا؛ لیکن آج کل عمل اور عرف یہ ہے کہ مالک مکان کرایہ دار سے بڑی رقم لے کر اس میں بلا تکلف تصرف کرتا ہے، جس کی کرایہ دار کی طرف سے دلالۃً اجازت بھی ہوتی ہے، اس صورتِ حال کی بنا پر یہ رقم امانت بالآخر دین مضمون بن جاتی ہے، اب اگر باقاعدہ شرط لگا کر اس دین کی بنیاد پر مکان یا دوکان کے کرایہ میں کمی کی جائے گی تو یہ قرض پر نفع ہی کی ایک شکل قرار پائے گی، جو ممنوع ہے؛ لہٰذا جواز کی شکل سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ کرایہ داری کے معاملہ کو زرِ ضمانت کے ساتھ مشروط نہ قرار دیا جائے، اور زرِ ضمانت کے تناسب سے کرایہ متعین نہ ہو؛ بلکہ اجرتِ مثل متعین کی جائے، خواہ ضمانت کی رقم کتنی ہی کیوں نہ ہو؛ تاکہ قرض پر نفع کا شبہ نہ رہے۔ ''لأن كل قرض جر نفعًا فهو ربا'' (فتح القدیر کتاب الحوالۃ ۶/۳۵۵، مصنف ابن ابی شیبۃ بیروت ۴/۳۳۳)۔

واضح ہو کہ اس معاملہ کو رہن کے درجہ میں نہیں رکھا جا سکتا؛ کیوں کہ اگر کرایہ دار کو مرتہن مانا جائے گا تو عقد اجارہ ہوتے ہی عقد رہن خود بخود باطل ہو جائے گا، جیسا کہ فقہاء نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

''قال في الشامي: وأما إذا آجره المشتري وفاءً بإذن البائع فهو كإذن الراهن للمرتهن بذلك، وحكمه أن الأجرة للراهن... إلخ۔ قلت: وإذا آجره بإذنه يبطل الرهن، كما ذكره في حاشيته على الفصولين'' (شامي بيروت ۷/۴۲۷)۔

''قال الشيخ عبد الرحمن الجزيري: الحالة الثانية أن يكون المستأجر هو المرتهن وجدد استلام المرهون بالإجارة أو يكون المستأجر أجنبيًا عنهما بإذنهما، وفي هذه الحالة يبطل عقد الرهن، وتكون الأجرة للراهن''

(الفقه على المذاهب الأربعة مكمل ۵۸۳)۔ ★★★

بیع وفاء کے احکام اور متبادل کی تلاش

ڈاکٹر و مفتی محمد شاہجہاں ندوی [1]

سوال نمبر (۱) کا جواب:

یہ معاملہ جو ''بیع وفاء'' کے عنوان سے خاص قیود و بند کے ساتھ ہوتا ہے، میرے نزدیک شرعاً منعقد اور درست نہیں ہے، کیوں کہ یہ نہ ہر پہلو سے بیع صحیح ہے، اور نہ رہن ہے، بلکہ اس کے اندر بیع مطلق کی بھی کچھ مشابہت ہے، اور بیع فاسد کی بھی مشابہت ہے اور رہن کی بھی مشابہت ہے، اور جو عقد ایسا ملغوبہ ہو، وہ کیسے درست ہوسکتا ہے؟ جہاں یہ عقد بیع کرنے والا بائع سودی قرض سے بچنا چاہتا ہے، وہیں مشتری اپنے قرض پر نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، اور بائع کی حاجتمندی کا خوب فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یہ استحصال کی بدترین شکل ہے، کیوں کہ عام طور سے ''بیع وفاء'' میں فروخت ہونے والی چیز کی قیمت کم رکھی جاتی ہے، نیز اس کی شناعت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے، جب مشتری بائع ہی کو خرید کردہ مکان یا جائیداد کرایہ پر دے، کر معمولی کرایہ سے بڑھ کر اس پر کرایہ عائد کرتا ہے، چنانچہ ان قباحتوں کو دیکھتے ہوئے یہ بیع میرے نزدیک شرعاً منعقد اور درست ہی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بیع کے عام اصول کے خلاف ہے، اور اس میں سود کا شائبہ ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف سود ہی سے منع نہیں فرمایا ہے، بلکہ سود کے ذریعہ اور دھویں سے بھی ممانعت فرمائی ہے۔

نیز مقاصد شریعت کا بھی تقاضا ہے کہ ہر ایسے عقد کو جو کسی بھی شکل میں سود یا سود کے شائبہ پر مبنی ہو درست نہ قرار دیا جائے۔

بعض حضرات نے لوگوں کے غیر معمولی تعامل کے پیش نظر ''بیع وفاء'' کو رہن قرار دے کر خریدار مرتہن کے لیے اس سے استفادہ کو درست قرار نہیں دیا ہے، لیکن میرے نزدیک، خواہ عملاً اس کی صورت بالکل رہن کی سی ہو چوں کہ ''بیع وفاء'' کرنے والے کا مقصد وفائی مبیع سے فائدہ اٹھانا ہے، لہذا یہ معاملہ سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے درست ہی نہیں ہے، چنانچہ خود شیخ مصطفی احمد زرقاءؒ کو اعتراف تھا کہ عام طور سے بیع وفاء میں ثمن مبیع کی قیمت سے بہت کم ہوتا ہے، اور اکثر وفائی خریدار سودخوروں میں سے ہوتے ہیں، اور مصر میں عام طور سے ''بیع وفاء'' میں یہ شرط لگائی جاتی تھی کہ اگر بائع ایک معینہ مدت تک ثمن واپس نہیں کرے گا، تو بیع قطعی ہوجائے گی، اور اس طرح قلیل رقم دے کر لوگوں کی جائیداد ہڑپ کرلی جاتی تھی، اسی لیے ۱۹۴۹ھ میں جدید مصری سول قانون نے ''بیع وفاء'' کو باطل قرار دیا، تاکہ وفائی سودخوروں کے مظالم سے محتاج مقروض محفوظ رہیں، اگرچہ فقہاء احناف نے بیع کے قطعی ہونے کی شرط باطل قرار دی تھی (دیکھئے: شرح باز دفعہ ۳۹۶ کے ذیل میں)، لیکن عام لوگ کسی چیز کے رائج ہونے کی صورت میں دقیق فقہی فرقوں کا خیال نہیں رکھتے ہیں، لہذا بیع وفاء کو باطل قرار دینا ہی شریعت کی روح سے ہم آہنگ اور بیع کے عام اصول کے موافق ہے، تاکہ سماج میں نفع خوری کے جذبہ کی بجائے ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پروان چڑھے۔

عقد بیع سے پہلے یا بعد کی شرط کی تفصیل:

واضح رہے کہ متاخرین حنفیہ کی ایک جماعت نے یہ فتوی دیا ہے کہ اگر کوئی وعدہ عقد بیع سے بالکل جدا ہو، چاہے وہ عقد بیع سے پہلے کیا جائے یا بعد میں کیا جائے، دونوں صورتوں میں وہ وعدہ اصل عقد بیع کے ساتھ ملحق نہیں ہوگا، اور اس وعدہ کی وجہ سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ یہ بیع شرط کے ساتھ ہوئی ہے، اور نہ یہ لازم آئے گا کہ یہ ''صفقة فی صفقة'' (عقد در عقد) ہے، چنانچہ ابن قاضی سماوہ حنفی رقمطراز ہیں:

''شرطا شرطًا فاسدًا قبل العقد، ثم عقدا لم یبطل العقد، ویبطل لو تقارنا'' (جامع الفصولین ۲/۲۳۷)

(عاقدین نے عقد بیع سے پہلے باہم کوئی شرط فاسد کرلی، اس کے بعد آپس میں عقد بیع کیا، تو اس صورت میں (سابق شرط کی بنا پر) عقد باطل نہ ہوگا، البتہ اگر وہ شرط عقد بیع کے اندر ہوتی تو عقد بیع باطل ہوجاتا)۔

خاص بیع وفاء کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں: ''وکذا لو تواضعا الوفاء قبل البیع، ثم عقدا بلا شرط الوفاء، فالعقد جائز، ولا عبرة بالمواضعة السابقة'' (جامع الفصولین ۲/۲۳۷) (ایسے ہی اگر عاقدین عقد بیع سے پہلے قیمت واپس دینے کی صورت میں مبیع کے لوٹانے کا وعدہ

---

[1] استاذ حدیث شریف و فقہ اسلامی جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، پٹی کاڈ، مالاپورم کیرالہ۔

کرلیں، پھر وفاء کی شرط کے بغیر عقد بیع کرلیں، تو یہ عقد جائز ہے، اور سابقہ اتفاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے)۔

میرے نزدیک یہ موقف درست نہیں ہے، کیوں کہ سابقہ وعدہ اور اتفاق کی صورت میں اگرچہ عقد کے اندر کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے، لیکن یہ بلا شرط عقد کا وجود سابقہ وعدہ پر مبنی ہے، جو اگر نہ ہوتا تو بائع یہ عقد بیع نہیں کرتا، چنانچہ علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں:

''وينبغي الفساد لو اتفقا على بناء العقد عليه، كما صرحوا به في بيع الهزل'' (ردالمحتار ۷/ ۲۸۲) (اگر عاقدین سابقہ شرط کی بنیاد پر اس عقد کو انجام دیں تو اس صورت میں یہ عقد فاسد ہونا چاہیے، جیسا کہ ''بیع الہزل'' کی صورت میں فساد کی صراحت فقہاء نے کی ہے)۔

اگرچہ علامہ محمد خالد الاتاسیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ بیع الہزل میں بیع مقصود ہی نہیں ہوتی، لہذا اس عقد کی بنیاد پر دوسرا عقد کرنا گویا اصلاً بیع نہ کرنا ہے (دیکھئے: شرح المجلۃ للأتاسی ۲/ ۶۱) جبکہ بیع وفاء'' میں یہ صورت نہیں پائی جاتی ہے، لیکن میرے نزدیک راجح علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی بات ہے، کیوں کہ سابقہ وعدہ پر یہ بلا شرط عقد مبنی ہے، جو اگر نہ ہوتا تو اس عقد کا وجود نہ ہوتا، لہذا یہ ایک عقد میں دوسرے عقد کی شرط کے درجہ میں اگرچہ حقیقتاً نہیں ہے، لیکن حکماً ضرور ہے، اسی لیے زیادہ تر فقہاء عظام نے عقد کے بعد وفاء کی شرط لگانے کی بات تحریر کی ہے، چنانچہ علامہ قاضی خاں تحریر فرماتے ہیں:

''وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع، ويلزمه الوفاء بالوعد، لأن المواعدة قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس'' (الفتاوى الخانيه، فصل في الشروط المفسدة في البيع ۲/۱۳۸)

(اگر شرط کے بغیر بیع کی جائے اور اس کے بعد بطور وعدہ شرط کو بیان کردیا جائے تو بیع جائز رہے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا، اس لیے کہ باہمی وعدہ کبھی لازم بھی ہوتا ہے، لہذا اس وعدہ کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم قرار دیا جائے گا)، اور علامہ شامی رقم طراز ہیں:

''وفي جامع الفصولين أيضًا: لو ذكر البيع بلا شرط، ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع، ولز الوفاء بالوعد، إذ المواعيد قد تكون لازمة، فيجعل لازمًا لحاجة الناس'' (رد المحتار باب البيع الفاسد مطلب في الشرط الفاسد إذا ذكر بعد العقد أو قبله ۷/۲۸۱)

(جامع الفصولین میں یہ عبارت بھی موجود ہے کہ اگر عاقدین کسی شرط کے بغیر بیع کریں، اور بعد میں شرط کو بطور وعدہ ذکر کریں، تو بیع جائز رہے گی، اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا، اس لیے کہ باہمی وعدے کبھی لازم ہوجاتے ہیں، لہذا یہاں بھی لوگوں کی ضرورت کی بنیاد پر لازم قرار دیا جائے گا)۔

اور ''الدر المختار'' میں ہے:

''ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعًا فاسدًا، ولو بعده على وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء به؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس'' (الدر المختار بہامش ردالمحتار کتاب البیوع باب الصرف مطلب فی بیع الوفاء ۷/ ۵۴۶)

(پھر اگر عاقدین بیع کے اندر یا بیع سے پہلے فسخ کا ذکر کریں، یا بیع کو غیر لازم سمجھیں تو یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر عقد بیع کے بعد بطور وعدہ ذکر کریں، تو یہ جائز ہے، اور اس کو پورا کرنا لازم ہے، اس لیے کہ وعدے کبھی لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہوتے ہیں)۔

مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ اگر بیع شرط کے بغیر منعقد ہوجائے، پھر اس کے بعد خریدار فروخت کنندہ سے یہ وعدہ کرلے کہ جب وہ قیمت واپس لائے گا، اس وقت وہ اس کو واپس بیچ دے گا، اس صورت میں یہ وعدہ درست ہوجائے گا، اور خریدار کو یہ وعدہ پورا کرنا لازم ہوگا، چنانچہ علامہ حطاب رعینی مالکی تحریر کرتے ہیں:

''قال في معين الحكام: ويجوز للمشتري أن يتطوع للبائع بعد العقد بأنه إن جاء ه بالثمن إلى أجل كذا، فالمبيع له، ويلزم المشتري متى جاء بالثمن في خلال الأجل أو عند انقضائه، أو بعده على القرب منه، ولا يكون للمشتري تفويت في خلال الأجل، فإن فعل ببيع أو ہبة أو شبه ذلك، نقض إن أراده البائع ورد إليه''

(حطاب رعینی تحریر الکلام/ ص ۲۳۹، مواہب الجلیل ۶/ ۲۴۴)۔

(''معین الحکام'' میں فرمایا کہ خریدار کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ عقد ہونے کے بعد بائع کو بطور احسان یہ کہے کہ اگر وہ اتنی مدت تک ثمن لے آئے گا، تو یہ مبیع اس کی ہوجائے گی، چنانچہ اگر مدت کے اندر اندر یا مدت پوری ہونے پر یا مدت پوری ہونے کے کچھ بعد فروخت کنندہ ثمن لے آئے، تو خریدار کو اپنا وعدہ پورا کرنا لازم ہوگا، اور خریدار کے لیے جائز نہیں کہ وہ مدت کے اندر مبیع کو فوت کردے، سو وہ اگر دوسرے سے بیع یا ہبہ وغیرہ کردے، تو اگر بائع چاہے تو خریدار کا کیا ہوا معاملہ

توڑ دیا جائے گا، اور مبیع اسے قیمت کی واپسی کے بعد لوٹا دی جائے گی)۔

لیکن اس عقد بیع کے بعد ہونے والے وعدہ کی حیثیت میرے نزدیک ادبی اور اخلاقی نوعیت کی ہوگی، قانونی حیثیت نہ ہوگی۔

جوابات:

اب سوال میں فرض کی گئی شقوں کا جواب اپنی رائے اور بعض دیگر فقہاء کے مسلک کے مطابق اختصار کے ساتھ درج ہے:

الف- یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے میرے نزدیک شرط فاسد ہے، اس لیے کہ ہر وہ شرط جو تقاضائے عقد کے خلاف ہو اور اس میں عاقدین میں سے کسی کا نفع ہو، اور اس کے ساتھ تعامل بھی جاری نہ ہو، اور نہ ہی شریعت اس کے جواز کے ساتھ وارد ہو، وہ شرط فاسد ہے، "الدر المختار" میں ہے:

"لا يقتضيه العقد ولا يلائمه، وفيه نفع لأحدهما، أو فيه نفع لمبيع هو من أهل الاستحقاق للنفع، بأن يكون آدميًا، ولم يجر العرف به، ولم يرد الشرع بجوازه" (تنویر الابصار مع الدر المختار کتاب البیوع باب البیع الفاسد ۲۸۲/۷، ۲۸۳)۔

(ایسی شرط جو عقد کے تقاضے کے مطابق نہ ہو اور نہ اس کے مناسب ہو اور اس میں عاقدین میں سے کسی کا نفع ہو یا اس میں مبیع کا نفع ہو، جبکہ وہ نفع کا استحقاق رکھنے والوں میں سے ہو، جیسا کہ وہ آدمی ہو، اور اس کا رواج بھی نہ ہو اور نہ اس کے جواز کے ساتھ شریعت وارد ہو (وہ شرط فاسد ہے، اس سے عقد بیع فاسد ہو جائے گا)۔

جبکہ بعض وہ فقہاء جو "بیع وفاء" کو حکماً بیع مانتے ہیں، جیسا کہ "الدر المختار" میں ہے:

"وقيل: بيع يفيد الانتفاع به" (حصکفی: الدر المختار کتاب البیوع باب الصرف مطلب فی بیع الوفاء ۵۴۶/۷)۔

(اور کہا گیا ہے کہ یہ بیع ہے جو مبیع سے فائدہ اٹھانے کو مفید ہے)۔

ان کے نزدیک یہ شرط درست ہے اور خریدار کو دوسرے سے بیچنے کا اختیار نہیں ہے، چنانچہ "ردالمحتار" میں ہے:

"إلا أنه لا يملك بيعه" (ابن عابدین، ردالمحتار کتاب البیوع ۷/۵۴۶) (مگر یہ کہ مشتری اس کو بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے)۔

ب- میرے نزدیک تو یہ بیع درست ہی نہیں ہے، لہذا یہ حکم مرتب ہی نہیں ہوگا۔

البتہ ان بعض فقہاء کے مسلک کے اعتبار سے جو "بیع وفاء" کو بعض احکام کے سلسلہ میں صحیح مانتے ہیں، مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہ ہوگا، کیوں کہ مشتری فروخت شدہ سامان کی ذات کا مالک نہیں ہوتا ہے، بلکہ صرف اس کی منفعت کا مالک ہوتا ہے، اسی لیے مشتری اس کے اندر کوئی ایسا تصرف نہیں کرسکتا ہے جو اسے کلی یا جزئی طور پر ختم کردے، کیوں کہ وہ مبیع کی ذات کا مالک نہیں ہے، اسی وجہ سے حق شفعہ بائع کو حاصل ہوگا، نہ کہ مشتری کو۔

ج- میرے نزدیک یہ بیع درست ہی نہیں ہے، لہذا وفائی مبیع سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے۔

البتہ بعض وہ فقہاء جو بیع وفاء کو بعض احکام کے حق میں مفید مانتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق خریدار کے پاس جب تک وہ سامان رہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، "البحر" میں ہے:

"وذكر الزيلعي أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير" (ابن نجیم، البحر الرائق کتاب البیع، باب خیار الشرط ۶/ ۱۲)۔

(امام زیلعی نے ذکر کیا ہے کہ فتوی اس پر ہے کہ بیع وفاء جائز اور اپنے بعض احکام کے لیے مفید ہے، یعنی مبیع سے فائدہ اٹھانا حلال ہے، البتہ خریدار دوسرے سے بیچ نہیں سکتا ہے)۔

د- خریدار کو کسی دوسرے سے بیچنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ یہ بیع میرے نزدیک درست ہی نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ وہ بعض فقہاء جو "بیع وفاء" کو بعض احکام کے حق میں مفید مانتے ہیں، ان کے نزدیک بھی خریدار کو کسی دوسرے سے بیچنے کا حق نہیں ہے، اور نہ ہی مزید قیمت لینے کا حق ہے، اس کی بیع توڑ دی جائے گی، اور بائع یا اس کے ورثہ کو قیمت لوٹا کر مبیع واپس لینے کا حق ہوگا، "الدر المختار" میں ہے:

"ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد" (الدر المختار ۵۴۸/۷)

(اور اگر خریدار سے بیچ دے تو بائع یا اس کے ورثہ کو واپس لینے کا حق ہے)۔

۲- میرے نزدیک ''بیع وفاء'' ہر صورت میں درست نہیں ہے، کیوں کہ عقد ''بیع'' کے نام سے ہوا ہے، نہ کہ رہن کے طور پر، تو پھر کھینچ تان کر اسے ''رہن'' قرار دینا عاقدین کے لفظ اور مقصود کو نظر انداز کر کے عقد کو ایک فرضی شکل دینا ہے، اس کی اصل اور حقیقی شکل ایک عارضی اور مؤقت بیع کی ہے جو بیع کے عام اصول کے خلاف ہونے اور سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے۔ البتہ بیع وفاء کو رہن قرار دینے والے فقہاء کی اکثریت ہے، چنانچہ علامہ شامی تحریر کرتے ہیں:

''وفی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی: هو أن یقول: بعت منك علی أن تبیعه منی متی جئت بالثمن، فهذا البیع باطل، وهو رهن، وحکمه حکم الرهن، وهو الصحیح'' (ردالمحتار ۷/۵۴۶)۔

(جامع الفصولین کے حاشیہ پر جواہر الفتاوی کے حوالہ سے بیع وفاء کی تعریف اس طرح درج ہے کہ وہ، یعنی بیع وفاء یہ ہے کہ آدمی کہے کہ میں نے تجھ سے بیچا بشرطیکہ تم مجھ سے بیچ دو جب میں قیمت لے آؤں، تو یہ بیع باطل ہے، اور وہ رہن ہے اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے، اور یہی صحیح ہے)۔

آگے تحریر کرتے ہیں:

''قال فی الخیریة: والذی علیه الأکثر أنه رهن لایفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام، قال السید الإمام: قلت للإمام الحسن الماتریدی: قد فشا هذا البیع بین الناس، وفیه مفسدة عظیمة، وفتواك أنه رهن، وأنا أیضًا علی ذلك، فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق علی هذا، ونظهره بین الناس، فقال: المعتبر الیوم فتوانا، وقد ظهر ذلك بین الناس، فمن خالفنا فلیبرز نفسه ولیقم دلیله... إلخ، قلت: وبه صدر فی جامع الفصولین فقال رامزًا لفتاوی النسفی: البیع الذی تعارفه أهل زماننا احتیالًا للربا، وسمّوه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة، لا یملکه ولا ینتفع به إلا بإذن مالکه، و هو ضامن لما أکل من ثمره، وأتلف من شجره، ویسقط الدین بهلاکه لو بقی، ولا یضمن الزیادة، وللبائع استرداده إذا قضی دینه، لا فرق عندنا بینه وبین الرهن فی حکم من الأحکام'' (مرجع سابق ۷/۵۴۶)۔

(الخیریہ نامی کتاب میں درج ہے کہ جس موقف پر اکثر فقہاء ہیں وہ یہ ہے کہ بیع وفاء رہن ہے، رہن سے کسی حکم میں جدا نہیں ہے، سید امام نے کہا کہ میں نے امام حسن ماتریدی سے عرض کیا کہ یہ بیع وفاء لوگوں میں عام ہوگئی ہے، اور اس میں بڑا بگاڑ ہے، اور آپ کا فتوی ہے کہ یہ رہن ہے، اور میں بھی اسی کا قائل ہوں، چنانچہ درست طریقہ یہ ہے کہ ہم ائمہ کو جمع کریں، اور اس پر اتفاق کرلیں، اور لوگوں کے درمیان اس کا اعلان کردیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ آج کے دور میں ہمارے فتوی کا اعتبار ہے، اور یہ لوگوں کے درمیان ظاہر ہوگیا ہے، سو جو ہمارا مخالف ہو، اسے خود کو ظاہر کرنا چاہیے، اور اپنی دلیل قائم کرنی چاہیے (الخیریہ کی عبارت مکمل ہوئی)۔

میں (یعنی علامہ شامی) کہتا ہوں کہ جامع الفصولین میں اس کے رہن ہونے کی صراحت کے ساتھ ہی آغاز کیا ہے، اور فتاوی النسفی کی طرف رمز واشارہ کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ وہ بیع جو سود سے بچنے کے حیلہ میں ہمارے زمانہ کے لوگوں میں رائج ہے، اور اس کا نام وہ بیع وفاء رکھتے ہیں، وہ حقیقت میں رہن ہے، خریدار اس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور اس کے پھل سے جو کھائے اور اس کے درخت سے جو ضائع کرے، وہ اس کا ضامن ہوگا، اور اس کی ہلاکت سے دین ساقط ہوجائے گا، اگر دین باقی ہو اور دین سے زائد قیمت کا ضامن نہ ہوگا، اور بائع کو واپس لینے کا حق ہوگا، جبکہ اس کا دین ادا کردے، ہمارے نزدیک اس کے اور رہن کے درمیان کسی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے)۔

اس اس تفصیل کے بعد سوال نمبر (۲) کے تحت مذکور شقوں کا جواب درج ہے:

الف- شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا یغلق الرهن من صاحبه الذی رهنه، له غنمه، وعلیه غرمه'' (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۵۹۳۴، اور اس کی سند صحیح ہے)۔

(شئ مرہون کو چھڑانے کا حق اس کے گروی رکھنے والے مالک سے ختم نہیں ہوسکتا ہے، اس کے منافع اور زوائد گروی رکھنے والے مالک کے ہیں، اور اس کی ہلاکت اور نقصان بھی اسی کے ذمہ ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ رہن کے منافع راہن کی ملکیت ہیں، لہذا خریدار مرتہن کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، کیوں کہ یہ فرمان نبی